یہ دِل یہ سودائی

سعدیہ عزیز آفریدی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

یہ دل یہ سودائی...... سعدیہ عزیز آفریدی

وہ اس وقت بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

ایک نئے پروجیکٹ پر بحث جاری تھی۔ چلتی ہوئی پارلیمنٹ اور سیلز مارکیٹنگ سیل کی رپورٹس اور اس نئے پروجیکٹ سے منسلک کھاتے اور اسے پروجیکشن دینے والے نکات زیر بحث آ رہے تھے مگر وہ پھر بھی غیر متعلق بیٹھا لاتعلق پڑے پیپر پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے کے سوا کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔

"شہریار عبدالرحمٰن! مجھے لگتا ہے آپ اس وقت میٹنگ میں بالکل دلچسپی نہیں لے رہے۔" بہت سارے بازوں اور ماتحتوں میں سے ایک سخت تنبیہی آواز ابھری تو اس نے چونکا۔ ایم ڈی کی کرسی پر بیٹھے مسٹر عبدالرحمٰن ابھی تک اسے ہی گھور رہے تھے اسے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا الفاظ کہیں کھو سے گئے تھے۔

"مسٹر شہریار! کیا آپ بتا سکتے ہیں، آپ نے زیر بحث آنے والے کتنے پوائنٹس، ٹیک اپ کیے ہیں؟" سوال ہنوز قائم تھا اور جواب سوچا نہیں جا رہا تھا۔

دراصل ان کا دماغ کل رات کے اپنے ہونے والے ایکسیڈنٹ میں الجھا ہوا تھا۔ اس ایکسیڈنٹ کی معمولی سی بھی وہ زخم... چکا تھا۔ چوٹوں میں تکلیف کی شدت باقی تھی مگر اس کی فکر بھی صرف اسے ہی تھی ماں نے کسی اور کا خیال کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا (ہمیشہ کی طرح) اس کا خیال تھا کہ یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ لیکن مسٹر عبدالرحمٰن..... وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں بے وفائے ناقابل معافی انداز میں کیا ہوا ہر اقدام ناپسند ہی نہیں تھا۔ یہی تھا کہ انہوں نے کبھی اپنے بچوں سے بلند آواز میں بات نہیں کی تھی لیکن وہ جس انداز میں مخاطب ہوتے تھے پھر اس پر کوئی صفائی کوئی معذرت نہیں سنتے تھے۔ باقی ہمیشہ ان کا فیصلہ اور وہ خاموش ہو جایا کرتی تھیں۔ اس لیے ان کی کہی بات ہمیشہ فرض ہوتی تھی اور ان کی نظر عتاب کا شکار ہونے کی کوشش کرتا کہ قصہ جلد سے جلد ختم ہو جائے کہ وہ زندگی کی طرف نظر کے ہو گئی صورت حال اس وقت بھی در پیش تھی۔

"مسٹر شہریار! اگر آپ اس وقت کمپوز نہیں ہیں تو اپنے چیمبر میں ریلیکس کر سکتے ہیں۔" حسب توقع لہجہ وہی تھا جس سے شہریار عبدالرحمٰن چڑتا تھا، اس لہجے میں خفگی نمایاں تھی۔ معذرت غیر ضروری تھی اس لئے وہ خاموشی سے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، مجھے واقعی ریلیکس کرنا چاہیے۔" وہ بڑبڑاتا ہوا ڈریسنگ روم سے باہر آگیا۔

اس وقت اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ رات کے ایک بجے کے بعد سے [illegible] اس نے گھر میں [illegible] ہونے سے بہتر سمجھا تھا کہ وہ فریج کا ہی قصد کر لے۔

گھر میں اور کوئی نہیں تھا، جو اس کی حاضری کا نوٹس لیتا۔ حسن دادا عبدالرحمن اور حارث عبدالرحمن کا [illegible] عبدالرحمن تھا اس لئے ان دونوں کی توجہ سے [illegible] اس کا خیال تھا [illegible] اپنی زندگی کی لسٹ سے باہر نکال دیں..... [illegible] کبھی نہ پوچھیں کیا [illegible] اکیلے بچے، وہ تمہارے اندر کی تنہائی تمہیں زندگی کے ساتھ کیسے باندھتی ہے.....؟

کیا کبھی تمہارے حصے میں تم بھی آئے یا سارے کے سارے دکھ اور خاموشی کے دامن میں بندھے رہ گئے؟

وہ بات کرکے کبھی نہ پوچھیں، اگر وہ ایک بار بھی خود کو مر جانے دیں [illegible] حسن دادا ایسا نہیں کرنے والے تھے [illegible]۔

دادا عبدالرحمن اور حارث عبدالرحمن، حسن کا صرف ولدیت کے خانے میں لکھا ہوا نام ان کا تھا [illegible] اس کی کوئی خاص رشتہ داری [illegible] جسے وہ بچا جیتے ہوئے بھی اپنا سب کچھ مانتا تھا۔

خون کے رشتے بھلے حقیقت ہوں، گھر والوں کی بے پرواہی میں ایک وراثت بنا کے [illegible] رشتے کبھی مکمل [illegible] نہیں ہوتے۔

وہ سوچ رہا تھا حالانکہ اس وقت کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ ڈریسنگ روم کے صوفے پر بیٹھا ہوا [illegible] تھا جب ایک مترنم سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"سر! کیا آپ بتا سکتے ہیں مسٹر عبدالرحمن کا نمبر کون سا ہے؟"

اس نے بند آنکھوں کو کھول کر [illegible] آواز کے معاملے میں [illegible] ایک ہی [illegible] تھی۔ وہ اسے دیکھتا گیا۔

متناسب آنکھیں، چھوٹی سی ناک، گلابی لپ اسٹک سے کلر کرتے ہونٹ، متناسب قد، گندمی رنگ، دبلا پتلا، سادہ، لائٹ پنک جارجٹ کا سوٹ، بال کھینچ کر بنایا ہوا جوڑا وہ وہاں دوسروں سے صرف ورکنگ تھی۔ فیشن دفاتر میں کام کرنے والی کوئی ایک بھی عادت اس میں موجود نہیں تھی اور شہریار عبید الرحمٰن کو لگتا، اگر وہ یہاں کسی سفارش پر یا مسٹر عبید الرحمٰن کی ہمدردانہ فطرت پر نوکری کے خیال سے آئی ہے تو وہ جی جان کر کوشش بھی کر لے تب بھی شو آف پرسنالٹی نہیں بن سکتی۔ کوئی ایسی خوبی نہیں تھی اس میں، جو اپنی طرف متوجہ کرتی۔ اور یہ دفتر یہاں تو صرف خوب صورتی کا کاروبار زیادہ تھا۔

وہ ایک بین الاقوامی ڈریس کلیکشن سے متعلق لوگ تھے۔ بہترین ڈریس ڈیزائنر، بہترین بوتیک چین، وہ کپڑے بھی صرف اپنے بوتیکس کے لیے بناتے تھے بلکہ اگر کوئی اور آرڈر پر رجوع کرتا تھا تو وہاں کے لیے بھی ڈیزائن کرتے اور بہترین کپڑے کی فراہمی سے لے کر مارکیٹ میں کلیکشن لانچ کرنے کی سہولت بھی مہیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کئی افراد اس فیلڈ میں ان کی اسی خاص مہربانی سے آج نام کمائے بیٹھے تھے۔ وہ کسی بھی بزنس سیاست کا شکار نہیں ہوئے تھے اس لیے ان کے نام کی ایک ساکھ تھی اور لوگ ان کی محبت، خلوص اور مہربانی کا دم بھرتے تھے۔ اپنے کلائنٹ کی نظر میں وہ بہترین جانے جاتے تھے۔

فیشن اینڈ اسٹائل کی ایک دوسری شاخ ایڈورٹائزنگ زون تھا، جس کا مجموعی کام ایڈ بنانے کا تھا۔ اگر کوئی کلائنٹ چاہتا تو وہاں کی کمپنی سے یہ خصوصی مراعات بہترین کارکردگی کے ساتھ بک کر لیتا تھا۔ اسٹائل و زون خود میں ہر جہت کامیابی اور کارکردگی سنبھالے بیٹھا تھا۔ شہریار عبید الرحمٰن اسٹائل زون ہی کے ایڈورٹائزنگ کے شعبے میں جز وقتی لازم تھا، مگر زیادہ تر سالار عبید الرحمٰن اس معاملے کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

سالار عبید الرحمٰن مسٹر عبید الرحمٰن کے تین بیٹوں میں سے ایک تھے۔ سالار عبید الرحمٰن کے دوسرے بھائی عدیل عبید الرحمٰن ان تمام کاموں سے جان چھڑاتے تھے اس لیے انہوں نے پولیس جوائن کر لی تھی۔ وہ شادی شدہ تھے۔ ان کا تبادلہ آج کل لاہور میں تھا مگر اس وقت مسئلہ یہ نہیں تھا۔ یہ سب باتیں تو شاید اس لڑکی کو دیکھ کر اس کے ذہن میں آ گئی تھیں۔

وہ اس لڑکی کو اس دفتر میں سیٹ کرنے کے چکر میں اپنے اردگرد کا پورا چکر لگا آیا تھا۔ وگرنہ اسے تو مضمون خود کو ہائی کرنا یاد نہیں رہتا تھا۔ وہ اب اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

کیا بات ہے؟ اس لڑکی میں جو یہ مجھے ماضی کی طرف کھینچ لیے جا رہی تھی؟ وہ تھکے ہوئے انداز سے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ مسکرا کر ہونٹوں میں ہنسے جا رہی تھی۔

”آپ مسٹر عبید الرحمٰن سے کس سلسلے میں ملنا چاہ رہی تھیں؟“

یہ سوال اسے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا لیکن وہ اپنے اردگرد سے ایسے غافل ہوا کہ اسے یہ سوال کرنا ہی یاد نہیں رہا مگر اب وہ اس ٹرانس سے باہر آ چکا تھا۔

"جی! میں ایک ہسپتال کی طرف سے یہاں آئی تھی۔ میری کل مسٹر عبدالرحمٰن سے بات ہوئی تھی۔ ہم ہسپتال کے چیریٹی ڈونرز سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ہر سال کچھ پروگرام ترتیب دیتے ہیں جن میں آپ جیسے متمول افراد کی شرکت سے ان مریضوں کے لئے فنڈ ریزنگ کی جاتی ہے، جو مہنگے علاج معالجے کی استطاعت نہیں رکھتے۔"

"چیریٹی شو؟" وہ مسکرانے لگا۔ پتہ نہیں اُسے اس طرح کے کام کرنے والوں سے کیوں چڑ سی ہوتی تھی۔ شو آف اور ڈرامہ...... عزت نفس کی پامالی...... یہ سب چیریٹی ہے۔

اس کی مسکراہٹ ہمیشہ کی طرح زہریلی ہونے لگی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتا تھا اس کی مسکراہٹ میں زہر ہے یا زہر میں اسی جیسی مسکراہٹ کسی نے دل جلانے کے لئے گھول دی ہے......

وہ لڑکی اب عجیب کو مگو حالت میں اُسے تکنے لگی تھی۔

"کیا آپ مجھے مسٹر عبدالرحمٰن کا چیمبر بتا سکتے ہیں؟" لڑکی کے لہجے...... اُسے حیرت ہوئی اتنی جلدی رویہ بدلنے پر تو وہ خود کو یدِ طولیٰ سمجھتا تھا، لیکن یہ لڑکی......

"آپ فرسٹ فلور کے سیکنڈ روم میں جا سکتی ہیں۔ مسٹر عبدالرحمٰن وہیں ہوتے ہیں اور آپ جیسے لوگوں کے لئے خوشخبری ہے کہ چیریٹی کرنا ان کی ہابی ہے، وہ آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔"

"آپ کا نام...... کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟"

وہ چلتے چلتے مڑا۔ ایک تیکھی سی نظر اس پر ڈالی، پھر کڑوے لہجے میں بولا۔ "شاید یہ آپ کے لئے ضروری نہیں ہے، میرا کیا نام ہے کیونکہ مجھے چیریٹی کا یا چیریٹی کے نام پر شہرت کمانے کا قطعاً شوق نہیں ہے۔"

لڑکی نے اُسے تیز نظروں سے گھورا تھا۔ یہ شہریار عبدالرحمٰن کا ذاتی خیال تھا۔ کیونکہ وہ ان جذبات کو گردانتا نہیں تھا۔ بس اُسے اپنی پشت پر غصے سے جلتی نگاہوں کی تپش محسوس ہوئی تھی۔ مگر ان نگاہوں کی اُسے کچھ ایسی عادت پڑ چکی تھی کہ اب کچھ بھی غیر معمولی نہیں لگتا تھا۔

وہ دفتر سے نکل کر اب متناسب قدموں سے چلتا ہوا پارکنگ لاٹ کی سمت بڑھ رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ ایک تیز خنجر کی طرح کاٹتی چیز اس کے بازو کو زخمی کرتی دوسری کار کی فرنٹ ونڈ اسکرین میں جا گھسی۔

"اُف......" وہ بجلی کی تیزی سے نیچے جھک گیا اور یہی حرکت اُسے بچا گئی۔ کیونکہ پہلی کوشش ناکام دیکھتے ہی دوسری گولی چلائی گئی تھی۔

ANCHAL.COM.PK

تیسری گولی کی آواز......

سارے علاقے کی کھڑکیاں کھلنے بند ہونے لگی تھیں۔ سالار کی گاڑی کا اس بار یہ حشر ہو گیا تھا۔ مجرم نے دوسری اور تیسری گولی کے بعد فرار ہو گئے تھے۔

وہ منظر بچ پایا تھا۔ اجنبی کے ساتھ کل رات کا تھا۔ وہ زخمی جسم بری طرح سے ہسپتال میں آ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کئی فرمانے پولیس کو فون کر دیا تھا۔ تاہم چونکہ کیس شلی تھا اس لئے سالار فوراً ہی سنائی دینے لگے تھے۔ وہ سب اندر آ کر دیکھ چکا تھا۔

مسز عبدالرحمٰن، سالار عبدالرحمٰن اور سائنی دور کر باہر آ چکے تھے۔ ابھی تک نہ جانے کس بے چارے کو تکا تھا۔ سامنے شہریار عبدالرحمٰن کو دیکھ کر مسز عبدالرحمٰن کانپ گئے تھے۔

"یہ سب کیا تھا؟...... وہ کون تھا جس نے تم پر گولیاں چلائی ہیں؟"

حیرت ایک ایک لفظ میں تھی۔ وجہ یہ کہ بڑا تھا اندر تک جا پہنچے ہوئے کی بے یقینی کی یہ انتہا تھی اس جملے میں کئی طرح کی شکایت تھی کہ یہ حملہ کامیاب ہو جاتا تو وہ اس وقت اپنے بیٹے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے۔ اب وہ پاپا کی بات پر اس کی "یہ" جو وجود کا حصہ ہے، وہ "تھا" بن کر کھو دوں تک باتوں میں بن چکا ہوتا پھر وقت بھی کم ہو جانے اور شہریار عبدالرحمٰن بھی ایسا نہ ہونے پر جان جانے کوئی بات نہیں کہا جاتا۔

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں...... شہریار یہ سب کیا تھا؟ کون تھے وہ لوگ؟"

اس نے ماتھے بحال کی غرض سے سر جھکا کر کہا۔ "پتہ نہیں پاپا! میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ حملہ غیر متوقع تھا۔"

"تو کیا تمہیں کسی قسم کے حملے کی توقع پہلے سے؟"

مسز عبدالرحمٰن بہت سارے سوال کرنے والی تھیں مگر وہ سب اتنی جلدی اس کی کسی بات سے مطلب اخذ کر لیں گے وہ توقع نہیں کر پا رہا تھا۔

"پاپا! ان کے کندھے سے خون بہہ رہا ہے۔" سالار عبدالرحمٰن کی نگاہوں نے اپنے حصار میں لیا تو وہ موقع سے بھاگنے کے راستے ڈھونڈنے لگا۔

"میں ڈاکٹر شاہ کے کلینک چلا جاؤں گا پاپا! ڈریسنگ کروا لوں گا...... بہت معمولی زخم ہے۔"

بابا کچھ نہیں بولے۔ گمبھیرتا لیے اسے دیکھتے رہے۔

فنڈ کے ورکرز اسے بچانے کی کوششوں کو پلٹ گئے تھے۔ پولیس پہنچ چکی تھی۔ جائے وقوعہ کا معائنہ جاری تھا۔ گولی چلنے کا تو ثبوت کیا جا رہا تھا۔ کار میں پیوست گولیاں اور ان کے خول اٹھائے جا رہے تھے۔ سو شہریار عبدالرحمٰن کا اب بچنا بالکل ناممکن ہو گیا تھا۔ سالار عبدالرحمٰن نے ہوا کر شاید کو فنڈ پہنچنے کا پیغام دے دیا تھا۔ وہ مسز عبدالرحمٰن کے نمبر مل نہ سکے تھے۔ شہریار عبدالرحمٰن نے فنڈ میں داخل ہوتے ہی کسی کو دعوت دینا چاہا تھا مگر فنڈ خالی ہو چکا تھا۔

پولیس انسپکٹر اس سے حادثے کے متعلق مختلف سوالات کر رہا تھا جس سے وہ تقریباً ذہنی طور پر تھک رہا تھا۔ یہاں تک کہ انسپکٹر سوالات سمیٹ کر چلا گیا۔

"آپ کہنا چاہتے ہیں یہ سب کچھ بالکل اچانک ہوا ہے۔ آپ کو کسی پر شک بھی نہیں ہے۔ نہ ہی آپ کی اس طرح کی کسی سے دشمنی ہے کہ بات قاتلانہ حملے تک جا پہنچے۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے مسٹر حسن۔" اس نے اختصار سے جواب دے کر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ یہاں پہ وہ تھک چکا تھا۔ اب ان کی کالی فنڈ کے ایک کونے پر مسز حامد کھڑی جا چکی تھی۔

یہ سب کچھ ایک گھنٹے کی کارروائی تھی۔ ان کی بدولت تمام جانے والے ہر صورت سے بچا ہو گیا تھا۔ پھر اپنے اہلکاروں کے ساتھ جا چکا تھا اور اب کمرے میں صرف وہ بیٹھا تھا یا مسز عبدالرحمٰن کھڑے تھے۔ اسے یقین تھا اب وہ بہت چپ رہیں گے۔ سچ کی حقیقت میں قدم پہنچیں اور وقت...... امامہ ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اب متوازن قدم رکھتے اس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"تم سمجھتے ہو کیا اس قسم کے کسی حملے یا ایسے کسی خطرے کے منتظر تھے؟ اپنے ہونے والے کسی واقعے کی وجہ سے تمہارا دشمن تو پیدا نہیں ہو رہے تھے؟"

مسز عبدالرحمٰن بہت ذہین تھے۔ جنرل ایس پی سہیل عبدالرحمٰن کے باپ تھے۔ وہ جواب سوچنے لگا تھا کیا جانے وہ رو دیا ہے۔

"آجاؤ سالار!" مسز عبدالرحمٰن نے دور تک سے بیٹے کو پہچان لیا اور وہ مڑ چکا تھا۔ وہ ایسے ہی تھے۔ بہت زیادہ حساس، بہت زیادہ خیال رکھنے والے۔ لیکن کبھی کبھی خلاف مرضی کام سے بگڑ جاتے تھے۔

پھر ان کا غصہ الامان الامان......

وہ دروازے سے داخل ہونے والے سالار عبدالرحمٰن کو دیکھ رہا تھا مگر ان کی پشت کے پیچھے کھڑی رہی......

"لیکن ابھی تک یہاں ہے؟" اس کی نگاہ امامہ اس کی طرف ہو گئی تھی۔ سالار کی آواز ابھری۔

"میں نے پچاس ہزار کا چیک اکاؤنٹ سے مس ثانیہ کے حوالے کر دیا ہے پاپا! اور کل کے پیپر بن ہوگئی بس سیٹوں کے ٹکٹ بھی لے لیے ہیں۔ اور کوئی حکم؟"
مسٹر عبدالرحمٰن مسکرانے لگے۔ "نہیں، بس یہی کافی ہے۔ ٹھیک ہے بیٹا! ہم جس قدر آپ کے ساتھ ہو سکتے تھے ہوئے، میرے خیال میں ہم ہو چکے ہیں۔ مجھے لگتا ہے، میں نے آپ کو مایوس نہیں کیا ہے؟"
ثاقبہ کی آنکھوں میں چمک لہرانے لگی۔ "نو سر! آپ نے ہمیں جس قدر عزت دی ہے، ہم اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے۔ لیکن ہماری عزت افزائی ہوگی اگر آپ ۲۹ اکتوبر کو ہمارا شو دیکھنے کے لیے اپنے قیمتی وقت میں سے وقت نکال کر آ سکیں۔"
"میں کوشش کروں گا، شاید!" مسٹر عبدالرحمٰن نے مسکرا کر جواب دیا اور وہ [illegible] لہجے کو پا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ فارک نا ان کوٹ کی آستین خون سے بھر گئی تھی۔ اسے عجیب سی تکلیف ہونے لگی تھی۔
"آپ اب کیسے ہیں سر؟"
"ٹھیک ہوں۔" سپاٹ لہجے میں کہہ کر وہ کوٹ اتارنے لگا تھا۔
ثاقبہ جمیل نے ذرا سنجیدگی سے اس کی بلیک شرٹ کو دیکھا تھا۔
وہ ایک خوش جمال شخص تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت اور تیزی ساتھ ساتھ جھلکتی تھی۔ گندمی رنگت، ستواں ناک اور [illegible] کے ساتھ وہ ایک پُرکشش شخصیت رکھتا تھا۔ وہ ایک ہی نظر میں جانچ کر بڑھ گئی تھی۔ حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ فوراً سے بیشتر اس کے زخمی بازو کی ڈریسنگ کروا لے۔ یہ اس کا فرض بھی تھا اور [illegible] کا حصہ بھی..... لیکن یہاں وہ مجبور تھی، سو کمرے سے خاموشی سے نکل گئی۔
مگر جب وہ خارجی دروازے سے نکل رہی تھی تب اس نے مسٹر شاہ جہانی کی کار کو اندر داخل ہوتے دیکھا تھا اور سکون کا سانس لیا تھا۔
مسٹر شاہ جہانی میڈیکل فیلڈ میں ایک جانے مانے ڈاکٹر تھے۔ مشکل سے مشکل سرجری کیس وہ اس قدر آسانی سے کر ڈالتے تھے کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔ کہنے کو وہ ایک اچھے ڈاکٹر، سرجن ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے انسان بھی تھے، اسی لیے سب اسٹاف اور عام لوگوں میں انہیں اس قدر عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے ہسپتال کے [illegible] کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ بھی تھے اور کئی دوسرے پرائیویٹ ہسپتالوں کے لیے اعزازی اور رضاکارانہ خدمات سرانجام دینے میں بھی پیش پیش رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ثاقبہ جمیل انہیں اپنا آئیڈیل گردانتی تھی اور اس کا خیال تھا، جہاں مسٹر شاہ

AANCHAL.COM.PK

ہمدانی: ہیں وہ وہاں سے تنگ آ کر یوں بھاگی ہے یہاں......

بس یہی وجہ تھی کہ وہ پُرسکون ہو گیا بجز کے یہ آگاہی تھی کہ اس وقت کی لمبی انتظار اسے جیسے گھر سے دور کر گیا تھا۔

❁❁❁

"یہ معاملہ کیا ہے عبدالرحمٰن؟"

ان کی فرصت ذرا جاگی تھی۔ ڈاکٹر شاہ ہمدانی ان کے زخم کی ڈریسنگ کر چکے تھے اور اطمینان سے انہوں نے ان کو پہلا سوال یہی کیا تھا جسے وہ شاید بار بار پوچھنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سوال ان سے کیا گیا تھا اور وہ شاید بار بار سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بغیر جواب دیے ذرا خاموشی کی صورت پا کر گلا کھنکھار کر بولے۔

"میں اس سلسلے میں بتانے سے قاصر ہوں۔ ڈاکٹر ہمدانی! اچھا کہ تم اس وقت تو ذکر ہی نہ کرو جو ہو چکا ہے۔ شاید کبھی بتا دوں ابھی تم اس سلسلے میں حقیقت بتانے سے گریز کر رہے ہو۔"

مسٹر عبدالرحمٰن بہت غصے میں بہت زیادہ آپ جناب سے بات کرنے لگے تھے۔ وہ تم تک پہنچ رہے تھے۔ وہ جانتا تھا وہ بہت خفا ہیں لیکن وہ حقیقت بتا کر معاملے کی سنگینی کو وہ جانے کے لیے یہ نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس بات کی سنگینی تو ان پر گولی چلنے سے پہلے تک نہیں کھلی تھی۔ یہ تو کار ایکسیڈنٹ جیسے وہ سمجھ رہا تھا۔ یہ سب معاملات آپس میں گہرا تعلق رکھتے تھے۔

"کیا بات ہے عبدالرحمٰن آج کل بہت چپ چپ رہنے لگے ہو...... نہ ہنستے ہو نہ بات کرتے ہو۔" ڈاکٹر ہمدانی نے دکھانے کی کوشش کی۔

اس جملے پر اس کے ہونٹوں پر زہر بھری مسکراہٹ نے جنم لیا مگر نظر میں احترام برقرار تھا۔ وہ اب پھر سے شرٹ پہن کر کوٹ پہن رہا تھا، اپنا کام ختم ہو چکا تو وہ لہجے سے بولا۔

"کوئی خاص وجہ نہیں ہے انکل! بس زندگی اکتا گئی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ہنستا رہوں، نہیں رہتا۔ ہاں ضرور وہ اور ہر لحظہ کے اصولوں پر ہنستا، یہاں تک کہ قہقہے لگاتا، یہی تو ہوتا ہے ہر قدم... میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ہنسنے کی عادت نہیں ہو گی... بات چیت کی تو تنہائی سے بہت اچھی گزر رہی ہے آج کل۔"

شاہ ہمدانی اسے حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔ وہ ہمدانی صاحب دور ہو کر ترو تازہ تھا لیکن ان کی حد سے زیادہ بے زار لگ رہا تھا۔

"تم زندگی سے اکتا کیوں گئے ہو؟" وہ اپنا بیگ بند کرتے ہوئے کھڑے ہوئے اور وہ گہری نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

بات سمجھ آ رہی تھی لیکن اس بات کی وضاحت میں وہ جو جملہ استعمال کرتا وہ مزید سوالات کو جنم دیتا اور وہ اس وقت صرف خاموشی اور سکون چاہتا تھا۔ جواب کے لئے اس نے ایک بھی لفظ استعمال نہیں کیا اور اپنی کار کی چابی اٹھانے لگا۔

”تم...... مجھے لگتا ہے تم لوگوں سے، رشتوں سے فرار چاہتے ہو۔“

وہ چونک کر مڑا۔ سامنے مسٹر عبدالرحمٰن کھڑے تھے۔ ڈاکٹر شاہ صمدانی اور ان کی رائے قبول آ جو گئی تھی۔ جب اس کی زبان کو ایک نئی طرح سے روانی ملی نے تاثر بخشا۔

”مجھے لوگ اور رشتے، دنیا سب پسند ہو سکتے ہیں لیکن جب سے میں نے یہ جانا ہے کہ رشتے، دنیا اور لوگوں کی پسند بدلتی رہتی ہے۔ میں جان ہار کر بھی برا نہیں لگتا۔ اب سے میں نے یہ بھی کسی کو چھوڑ دی ہے۔ میں زندہ ہوں تو اس لئے نہیں کہ زندگی مجھے راس ہے بلکہ اس لئے کہ مجھے پتا ہے موت بھی قبول کرنے میں ایک بار ضرور ہچکچائے گی۔“

وہ جواب کی بازگشت نہیں تھا اور مسٹر عبدالرحمٰن اس کے وجود کے ساتھ کتنی دیر سے گئے تھے۔

”یا ابھی تک وہ بات نہیں بھولا ہے صمدانی، وہ بات جسے گزرے ہوئے پانچ برس گزر چکے ہیں۔“

ڈاکٹر شاہ صمدانی دوسری کرسی پر بیٹھ گئے اور بے چارگی سے بولے۔

”جاناں کے معاملے میں ہم سب نے اس سے انتہا لیا ہے عبدالرحمٰن، اگر وہ اپنے رویے میں حق بجانب ہے۔ وہ کیوں نہیں تم سے اور گھر سے جتنا بھی تھا ہمیں کے جس معاملے پر اسے مجبور کیا جاتا تھا اس نے اس کی شخصیت کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ رہی سہی کسر جاناں کے حادثے نے پوری کر دی۔ وہ اب اپنے آپ سے ناراض ہو گیا ہے اور تم جانتے ہو وہ کتنا ضدی اور کتنا خود سر ہے۔ جب تک وہ خود نہیں چاہے گا کوئی اس کے دل کی تنہائی نہیں لے سکتا اور وہ اس کی اجازت بھی کسی کو نہیں دے گا۔“

مسٹر عبدالرحمٰن تاسف سے انہیں دیکھ کر خاموش رہ گئے اور وقت کے اور دلوں کے کرتا گئے کی کہانی بنتے چلی گئی۔

❁ ❁ ❁

وہ گھر سے نکل تو آیا تھا لیکن اس وقت اس کا اندر تک لرز گیا تھا۔ اسے لگتا نہیں کہ اس نے موت کو کتنے قریب سے دیکھا تھا اور وہ خود بھی تھا اسے زندگی سے کبھی بھی محبت نہیں رہی تھی لیکن وہ خوف زدہ تھا

کیا اگر اس وقت واقعی جازی عبدالرحمن اپنے پروگرام کے مطابق ڈرسے ادھر لینے آ گیا ہوتا؟ اگر اس وقت پارکنگ لاٹ میں اس کے ساتھ وہ نہیں ہوتی؟

بس یہیں آ کر اس کے اندر اضطراب سا ہو جاتا۔ موت انسان کے اپنے لئے ذرا بہت کم رکھتی ہے۔ وہ لوگ جو محبت سے زندگی سے پیار کرتے ہیں صرف وہ لوگ موت سے ڈر سکتے ہیں اور اس جیسے زندگی سے اکتائے ہوئے لوگ..... وہ صرف اپنوں کی موت سے ڈر کر موت سے ڈرتے ہیں۔

بظاہر آپ زندگی سے کتنا بھی بیزار ہوں، محبت آپ کے اندر بہر حال کہیں نہ کہیں باقی رہتی ہے..... اور بس..... پھر اپنوں سے محبت کے رنگ میں آپ کو بے رنگ ہونے کے باوجود زندگی کی طرف دیکھنے پر مجبور کئے رکھتی ہے۔

بظاہر بغیر کسی مجبوری کے اس طرح اس کا سڑک پر نکلنا غیر محفوظ تھا لیکن اس وقت بھی وہ اکیلا تھا اس لئے مطمئن تھا۔

موت بچا کر ہو گئی ہیں مل سکتی..... اکیلے مر جانے میں جو سکون ہے، وہ بہت سے لوگوں کے درمیان اکیلے رہنے، جینے سے کہیں بہتر تھا۔

اس کا دماغ اس وقت معاملے کو کتنا نپٹانے کا بہتر ہو سکتا ہے سوچ رہا تھا اس نے بظاہر نرم لہجے میں دیکھا تھا لیکن ایک چند پہلے والی لڑائی اس کے ذہن میں پھر سے تازہ ہو گئی تھی۔ لڑائی ذہن میں تازہ ہوئی تو شیو کو وہ بالکل ذہن میں لائی جس کی حفاظت کا اس نے عہد کیا تھا۔

ڈیش بورڈ پر رکھے موبائل کو بائیں ہاتھ سے اٹھا کر اس نے نمبر ملایا۔ لیکن تھا اس لئے بات اس کے لئے مشکل نہیں تھی۔ فون سب کے دو چند لمحہ بعد کال ریسیو کی گئی تھی۔

"جی وی فرمائیے..... آپ کس سے بات کرنی ہے؟"

"میں شہریار بات کر رہا ہوں، طلیبا! میں آدھے گھنٹے میں تم تک پہنچ رہا ہوں۔ تم اپنا کچھ ضروری سامان پیک کر کے رکھنا، میں تمہیں کسی اور محفوظ جگہ پہنچانا چاہتا ہوں۔"

"مگر شہریار صاحب! آخر آپ ایسا کب تک کرتے رہیں گے؟" دوسری طرف سے جھنجھلائی ہوئی آواز گونجی اور وہ ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

"میں جب تک تمہارا کوئی پکا بندوبست نہیں کر لیتا، یہ در بدری باقی رہے گی۔"

لائن ڈس کنیکٹ کی جا چکی تھی اس لئے اس کا رخ اپنے فلیٹ کی جانب تھا۔ یہ ایک گزرگاہ فلیٹ تھا جسے وہ ملک سے باہر کی پارٹیز کے لئے بیٹھا ہوا رکھا تھا۔ پھر دوستوں کی گیدرنگ کے لئے یہ فلیٹ

AANCHAL.COM.PK

جمشید بلوچ رہا کرتا تھا۔ یہ ایک پوش علاقے کی ایک بہترین عمارت تھی جس کے نیچے انڈر گراؤنڈ پارکنگ تھی، الگ سیکیورٹی سسٹم تھا۔ پانچ کمرے، ڈائننگ، ڈرائنگ روم کے ساتھ یہ ایک بہترین لوکیشن تھی۔
وہ گاڑی پارک کر چکا تھا اب اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔
کچھ ساعت گزری اس نے بیل دی۔ دروازہ کھلنے کا انتظار کیا۔ قدموں کی آواز سنائی دی اور کچھ لمحوں بعد ایک خوب صورت لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ گیا تھا۔
پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، علینہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔
"تم نے فون کیا تھا شہری! ہم کہاں جانے والے ہیں؟"
وہ حیرت سے مڑا پھر ذرا کھانسی سے بولا۔ "کیا ہم کہیں ایسے بے تکلفی سے جا سکتے ہیں؟" اس نے ہاتھ چھڑایا اور وہ غیر متوقع رونے لگی۔
"تم...... اب تم مجھے چھوڑ دینا چاہتے ہو شہری! تم نے ہی تو کہا تھا تم مجھے ایک خوبصورت گھر دو گے۔"
"ہاں...... آں......" وہ گڑبڑا گیا تھا۔ "لیکن کورٹ میرج..." میرج کے بارے میں وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ سوال کو ٹالنے کے لیے کوٹ کی جیب سے رومال نکالا، پھر منہ صاف کرنے لگا۔
"تم دل چھوٹا نہ کرو۔ میں تمہیں ایک خوبصورت گھر دوں گا لیکن جو تم کہنا چاہتی ہو میرا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا۔"
"پھر کیا تھا تمہارا مطلب؟"
بہت غیر متوقع تھی اس کے لیے یہ آواز...... اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنا پستول پشت کے پیچھے کیا تھا۔ سامنے ایک نہایت خوبصورت وجیہہ شخص کھڑا ہوا تھا۔ چہرے پر ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ وہ خطرناک لوگوں کی لسٹ میں شامل سمجھا جا سکے۔ لیکن شہری جانتا تھا وہ اپنے بے ضرر حلیے کے باوجود اس کے لیے کتنا خطرناک تھا۔
وہ ایک بہت بڑے صنعت کار کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ پارٹی میں ... سے آج کل پاور میں تھا۔ وہ درحقیقت سیاست میں کبھی خود حصہ نہیں لیتا تھا بلکہ سیاسی گلیمر سے اور یورپی اخبارات میں چھپنے والے اشتہارات اور ... میں بہت زیادہ دلچسپی ... ہونے والی پارٹی پر بے حد پیسہ لگاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ... میں اس کے کام کا طوطی بولتا تھا۔ وہ کبھی نقصان کا سودا نہیں کرتا تھا اور وہ اس کا حق بنتا تھا۔ کسی نقصان کا سودا وہ کبھی نہیں کرتا تھا لیکن اگر پارٹی کا شک ہونے لگتا تو وہ ساری گیم ہی الٹ دیا کرتا تھا۔ ان کے اشارے پر ہونے والے قتل اتنے ... کہ ... بھگتنے کے لیے بھی ...

بار بار کہہ رہی تھی۔ وہاں کا شک واضح یقین ہو گیا تھا کہ اس پہ بار بار کیے جانے والے قاتلانہ حملے کس کی ایما پر ہو رہے تھے۔

ایک ماہ پہلے جو طاقت کی جنگ شروع ہوئی تھی یہاں کا ڈراپ سین تماشا تھا۔

اس وقت وہ پوری طرح چوکس تھا۔ جس قدر ہوشیار کے وہ اس کے ارد گرد اس کے جن باڈی گارڈز کے سامنے چارے کی طرح تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ ان ہنگامی صورت حال میں کیا چال چل کر اسے مات دے سکتا ہے کہ اس کی ساری سوچیں یکلخت سے اڑ گئیں۔

وہ جو ایک لڑکی تھی.....

یا جہان کی مظلوم سی لڑکی......!

جسے اس نے حفاظت کے لیے اپنی پشت پر رکھا اس کے دماغ کا بیڑا اٹھایا تھا۔ وہی اس کے سامنے کمزوری دکھائی دے گئی تھی......

سوچوں کے سفر پر وہ بامشکل جبڑا کسے اس سے چالی؟ وہ حیران ہونے کی خواہش کے باوجود حیران نہیں ہوا۔

"اچھا تو وہ ادراک لگ گئے۔ یہ شخص مجھے پورے مہینے سے بہرہ کر رہا تھا کہ میں کسی طرح تمہیں مجبور کر کے اپنا لوں۔ لیکن یہ نہیں جانتا تھا تمہارے تعلقات اتنے کمزور نہیں۔"

شہریار عبدالرحمن سکتے کی حالت میں وہیں کا وہیں رہ گیا ایک ماہ پہلے ہی کی تو بات تھی۔ جب ایک ڈنر پارٹی میں اس نے اس لڑکی کی تصویریں دی تھیں اور ہاتھ سے گلاس رکھا۔ وہ دوروں کے مقابلے میں زیادہ حساسیت سے اس واقعے کی طرف متوجہ تھا جس میں تمام رنگین طبیعت افراد کے جمع ہونے سے۔ تب پوچھا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے ماموں؟"

اسے بہت اچانک بہت ڈھیر سارا غصہ آ گیا تھا۔ زاد حسن بھی اس طرح کی آفت ہو گیا تھا کہ بُری طرح ڈری ہوئی تھی۔

"اچھا ڈیئر مائی کراؤنڈ! تمہیں ہماری تمہاری محبت کی قسم۔"

"زاد یہ سب کیا ہے؟ تم انہیں روک سکتے تو پھر کیوں ہو؟"

دعا آہستگی سے لڑکی کا ہاتھ چھڑاتے ہوئے نصیحتی انداز میں بولی تو اس کا دوست مامون اس کے قریب آگیا۔

"خیر یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے۔ سب سے پہلے زخم دیکھو اور پٹی کی بہت اچھی طرح ایک دوسرے کو چیک کریں گے۔"

اس نے مڑ کے دیکھا اور وہ دھاڑیں رونے لگی۔

"پلیز سر میری مدد کیجیے۔"

اس نے حیرت سے مامون کو دیکھا۔

"ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔ پتہ نہیں کون ہے بے چاری ہے۔"

مامون اسے کھینچ کر آگے لے گیا۔ سارے مجمع سے الگ۔ پھر خفگی سے دھیمے لہجے میں بولا۔

"مجھے تمہاری سمجھ نہیں آئی۔ جہاں لڑکی نے ذرا آنسو بہائے وہیں تمہارا دل پسیجنے لگتا ہے۔ کہنے کو یہ شہر مشہور ہے، لیکن بہت آسانی سے مار دیا جا سکتا ہے اپنی اسی ہمدردی پالیسی کے سبب۔"

"کیا کہہ رہے ہو مامون۔ تو جانتا ہے ہاں میں سب کی مدد بغیر کرتا ہوں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی عورتوں کی تذلیل...... چاہے وہ کوئی بھی کرے، کسی بھی وجہ سے ہو۔"

دعا ہاتھ چھڑا کر جانے کو تھا جب مامون کا ہاتھ۔ بار کتنا اشتعال [illegible] بہت غصے سے لفظ چبا چبا کر بولا۔

"عورتوں کی تذلیل...... عورتوں کی تذلیل سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ پتہ نہیں تم بھول کیسے جاتے ہو اپنی ہی تذلیل...... جس میں عورت ہی پیش پیش تھی۔"

"یہاں اس عورت کا ذکر کیا...... لڑکی جا رہی ہے بہت خستہ حال لگ رہی ہے ماں کے چہرے پہ تشویش لکھا ہے، جو کہتا ہے میری حفاظت کرو، مجھے بچا لو۔"

دعا اب رکا نہیں تھا اور مامون ساتھ چلتے ہوئے بھنا کر رہ گیا تھا۔

"ہاں ہاں...... جتنا مرضی آگے کر لو سوشل ورک...... مگر سوچ لو اس عورت ذات کے پیچھے جو ذلت اور خواری ہوئی ہے۔"

اس نے سنی ان سنی کر دی۔ اب وہ اپنے گھر کے کافی قریب [illegible] زمان حسن کے ساتھ [illegible] رحم اور ذاتی

میں کوئی جال مکمل نہیں تھا۔

ماموں دروازے سے پرے کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ اپنے بغلی ہولسٹر پر رکھ لیا تھا۔ وہ کرائم برانچ کا ایک ذہین دماغ تھا۔ حکومت کی طرف سے اسے کچھ خاص مراعات بھی حاصل تھیں، اس لئے وہ یہاں الرٹ تھا۔ شہریار کے سیڑھیاں چڑھتے ہی اس نے کسی بھی ممکنہ صورت حال کے لئے اپنی فورس کے کچھ خاص ارکان کو اپنے کاشن کا منتظر رہنے کو کہہ کر الرٹ کر دیا تھا مگر یہاں شہریار عبدالرحمن بہت آہستگی سے طوری کی سیڑھیاں چڑھا اور شکوک کائی کی طرح چھٹتے چلے گئے۔

"پلیز شہریار، میری پارٹی کو برداشت کرو۔ میری ماں کا سوال ہے۔" مسٹر ہمدانی لجاجت سے بولے۔ وہ ساری صورت حال میں ماش بنے آپ چپ رہے تھے اور اب مکمل طور پر صبر کھو چکے تھے۔

شہریار نے انہیں ہراساں دیکھا تو ان کے کندھے پر ڈھارس سے ہاتھ رکھا پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "آپ بے فکر رہیے مسٹر ہمدانی! ہم آپ کی پارٹی کو جواب کیے بغیر معاملہ طے کر لیں گے۔"

پھر شہریار نے زوار حسن کا ہاتھ پکڑا۔ لڑکی وہ ملتے ہی پھر سے کمل سی گئی تھی۔ زوار حسن نہ جانے کس وجہ سے آؤٹ آف کنٹرول تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا اس کے سامنے زیادہ دیر کھڑا رہنا دشوار تھا۔ شہریار نے لڑکی کو اپنی کسٹڈی میں لیا۔

زوار حسن نے مدہوش انداز میں دیکھا۔ کچھ احتجاج کی طرح کا جذبہ بھی بے قابو ہونے کو بے تاب ہوا مگر وہ اپنے اس جذبے کا بوجھ نہیں سہار سکا۔ اس کے باڈی گارڈ آگے بڑھے مگر ماموں عبدالکریم کی تنبیہی نظر کے باعث اپنے باس کو سنبھالتے خارجی دروازے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

ماموں عبدالکریم شہریار کو جاتا دیکھ کر گاڑی تک چھوڑنے آیا پھر وہ کار چلاتا گیٹ سے باہر نکل چکا تھا جب اس لڑکی کے رونے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"اب کیوں رو رہی ہو؟" بے ارادہ ہی لہجہ درشت ہو گیا تھا اس لئے لڑکی کی ہچکیاں تیز ہو گئی تھیں۔ اس نے گاڑی ایک جگہ سڑک سے سائیڈ پر روکی، پھر ٹشو دیتے ہوئے بولا۔

"تم لڑکیاں روتے وقت یہ کیوں نہیں سوچتی ہو کہ تمہیں بلاوجہ کی امیدیں ہی رلاتی ہیں۔ ہمیشہ آنسو پونچھنے کے لئے ٹشو پیپر بڑھانے والا کوئی مل جائے ضروری نہیں...... اپنے اوپر انحصار کرنے کی عادت تم لوگوں میں کبھی نہیں آسکتی۔ پہلے سہارے ڈھونڈتی ہو پھر اس سہارے کے جدا ہونے پر زمین آسمان ایک کر دیتی ہو...... سنو لڑکی! آنسو بہانے والوں کو یہاں لوگ ایک ٹھوکر مار کر اپنی زندگی سے باہر نکال دیتے ہیں، دل نہیں کرتے۔ ٹشو پیپر دیکھا ہے، گھر سے نکلی ہوئی لڑکی اسی کی طرح ہوتی ہے مرداں...... صرف کے بعد بے کار......"

وہ بھی خاصی تفریح کر چکا تھا اسباب اٹھا کر گاڑی میں رکھنے لگا... وہ کے لیے چپ ہوا تھا لڑکی اب اس کا خاموشی سے بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" اس نے لہجے کا اثر زائل کرنے کو اس بار نرمی سے پوچھا۔

"ایلیا...... ایلبار جم۔" مدھم لہجے میں اس نے جواب دیا۔

"گھر جانا چاہتی ہو؟" مزید نرم لہجے میں دوسرا سوال۔

وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"کیوں؟..... گھر میں کوئی پرابلم ہے؟" کار دوبارہ اسٹارٹ کر کے سڑک پر لاتے ہوئے پوچھا اور اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

"میرا کوئی گھر نہیں ہے... میرے ماں باپ بھی نہیں ہیں، میری نانی ہے وہ بہت ظالم ہے مجھے بہت مارتی ہے اسی لیے میں نے گھر چھوڑ دیا۔"

اس کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھری۔

"مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔ کیا میں نہیں جانتا یہ کہانی کتنی گھسی پٹی کہانی ہے؟ اگر تم کہیں نہیں تم گھر نہیں جانا چاہتیں تو میں سمجھتا ہوں تم ایک اچھی لڑکی ہو۔ لیکن جو تمہاری مدد کا عہد کیا ہے تو تمہارے ساتھ مجھے دے رہنے سے زیادہ مجھے اپنی اچھائی پر بھروسہ کرنا ہو سکے گا۔"

ایلبار جم بیان دے رہی اپنے بارے میں رائے بن کر رہ گیا تھا۔ لیکن ایلبار جم کی آنکھوں میں ایک عزم تھا۔ جیتنے کا عزم......

پھر بارگی کے دل اس عزم کو پورا کرنے میں مصروف ہو گئے تھے مگر شہریار اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔ محبت کیا جاتا تھا کبھی...... لیکن اب اس جذبے سے ہی جڑ گیا تھا اور آج...... آج اپنے حسن کے جال اور اپنے جسم کے حربے کی چال میں ناکامی پر ایلبار جم نے نئی چال چلی تھی۔ سارا انتقام دیا تھا۔ وہ گزرنے والے واقعے سے حال میں لوٹ آیا تھا لیکن ماضی ایک بار پھر اس پر انکشاف کر رہا تھا۔

گزرنے والا لمحہ گزر جاتا ہے لیکن ہماری زندگی ان کے درمیان کہیں رک کر رہ جاتی ہے۔ ہم آگے کو قدم آگے آ جاتے ہیں مگر سوچتے ہیں زندگی کہیں پیچھے رہ جاتی ہے۔ جس صفحے میں

تمہیں کچھ بھی ہوتی...... اور ہم جیسے ہم سی زندگی گزرتے اور کسی اور مقام پر دیکھو کہ جہاں رہ جاتے ہیں کہ ہم کیا جیتے ہیں...... اور کیا بھول گئے۔ تحسین یہاں...... وقت خود کو ہم لئے ہی تھمی ہے رہا تھا۔

ایک بار پھر مجرم بنا کھڑا تھا لیکن مجرم کے سامنے خود مجرم بن کر کھڑے رہنا حماقت کے سوا کیا تھا۔

یکدم اُسے لگا اندر پھر سے ایک مقابلہ اور جیت لینے کی لہر اٹھی تھی۔ وہ اب دو سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

"اگر تم سمجھتے ہو سالار تم ان چار گارڈز کے ساتھ مجھے دھمکا سکتے ہو تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ اس لڑکی کا بیان میرے وکیل کے پاس محفوظ ہے اور میرا بیان وہ آخر ہے تمہارے لئے...... میں جانتا تھا سالار تم سے یہ تم سے ملا۔ تم نے کا اندازہ بھی کچھ ہو جانا چاہئے۔ اب تمہیں مجھے بار بار لڑکی کو کچھ ہوا تو میرا وکیل تمہیں اگلے ہی سیکنڈ میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دے گا۔"

زوار حسن کے چہرے پر شرارت ابھری اور وہ مسکرا دیا۔

"کیا تم ابھی تک یہ سمجھتے ہو کہ لڑکی میرے پاس میرے خوف کی وجہ لوٹ رہی ہے۔ سالار عبدالرحمن تم ابھی بچے ہو۔ جو دادا گئے وہ سب ہو وہ میں حقیقت بتا سکتا ہوں۔ اگر تم کہو تو ڈوب چکا کہ تمہاری بیر سمت کی داستان سنا دے۔ تمہارا کمیں اپنے آپ مر جائے گا اور میں تمہیں بدنام کرنے کے لئے ایسا ہی کروں گا...... ایسا ہی کروں گا تاکہ تمہیں پتہ چلے دوسروں کی عزتیں اچھالنے والوں کا انجام کتنا بھیانک ہوتا ہے۔ میں تمہیں بتا دوں گا کہ بدنامی کیا ہوتی ہے۔"

"تمہیں واقعی لگتا ہے زوار تم ایسا کچھ بھی کر سکو گے۔"

ایک نئی گمبھیر سی بھاری آواز سنائی دی۔ پہلے صرف حیرت تھی آنکھوں میں لیکن اب رعب آ گیا تھا۔ سالار عبدالرحمن اُن کے سامنے کھڑے تھے۔

"مسٹر سالار! میں آپ کی شخصیت کا معترف ہوں لیکن میں اپنی دشمنی بھول جاؤں یہ نہیں ہو سکتا۔"

سالار عبدالرحمن کھڑے تھے اور وہ سہارے تک لگ گئے۔ انہیں وجہ بتا رہا تھا۔ کچھ کہے اپنی ذات کی منافقت...... سالار عبدالرحمن اور ان کے درمیان ایک عرصے سے Conflict چل رہا تھا۔ سالار عبدالرحمن کا گھر بسانے کے چکر میں اُس نے بہت سے الزامات اپنے سر لئے تھے مگر یہ الزام......

اس کی آواز کہیں اندر سے مر گئی تھی۔ بس سالار عبدالرحمن اس کے سامنے کھڑے تھے۔

AANCHAL.COM.PK

"تمہیں دوسروں کی محبتیں چرانے کا کتنا شوق ہے سالار شہریار! آخر تم لوگ سمجھتے کیا ہو؟" وہ غصے سے پھنکارا اور اس کے اندر مر جانے والی انا نے آخری سانس بھرا۔

"سنی بھائی! آپ اس بار بھی مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔" شاہزر دانت لف مجمع کے گرد و پیش کی طرف سے ہمیشہ کی طرح کمر سوز کر زوار حسن سے مخاطب ہوئے۔

"زوار! ایک بات بتاؤ تم مطمئن ہوا؟"

"کس بات پر مسٹر سالار؟" اس نے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے جواباً کہا۔

"یہی بات کہ مسٹر زوار حسن! کسی ایک فرد کی غلطی کی سزا سارے خاندان کو نہیں دی جاتی۔ دیکھیے میں اچھی طرح جانتا ہوں میرے بھائی کی عادتیں ناقابل برداشت ہیں۔ ہم بھی ان عادتوں کو برا سمجھتے ہیں۔ لیکن پلیز بہتر ہے آپ بھی ہماری طرح انہیں نظر انداز کر دیں کیونکہ ہمیں ان کمینوں میں ایک دوسرے کے بارے کی ضرورت پڑتی ہی رہتی ہے۔ پھر آپ ہی بتائیے ہم ہی ایک دوسرے کا خیال نہ کریں تو کون کرے گا؟"

زوار حسن نے انہیں ڈھیلے اعصاب سے دیکھا۔

"جیسے آپ کی مرضی مسٹر سالار، ویسے بھی شکر ہے کہ عبدالرحمن فیملی میں آپ جیسے معاملہ فہم لوگ بھی موجود ہیں ورنہ مسٹر شہریار نے تو آپ کی فیملی کا نام ڈبونے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

"برداشت...... یہ سب برداشت سے باہر تھا۔" وہ تڑپ کر آگے ہوا۔

"سنی بھائی! آپ کو میرے بارے میں بہت زیادہ غلط فہمی ہے۔"

"ٹھیک کہا تم نے تمہارے بارے میں مجھے تو کیا اور بھی بہت سے لوگوں کو غلط فہمی ہے۔ لیکن یہ صرف میں جانتا ہوں کہ تم کیا ہو۔"

سالار عبدالرحمن نے ایک اہانت بھرے انداز سے اپنی بات ختم کر دی۔ وہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا، خاموشی اس کے اندر تک اتر گئی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے اندر بھی بہت کچھ ٹوٹ چکا تھا، اس کا اندر جو بہت خالی تھا اور وہ ذات خالی ہتھیلی سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔

اور پھر یہی تو طے ہے، جب کسی کسی دل میں آپ رو گردانی کے لئے ہوں، کوئی آپ سے نفرت کرنے کی حد تک اجنبیت اختیار کرے تو شخصیت کا زوال کہاں ہوتا ہے۔

AANCHAL.COM.PK

دل کی طرح سب کچھ ٹوٹ جایا کرتا ہے...... اور لوگوں کو آپ کی ہر درست بات بھی غلط لگنے لگتی ہے۔ معمولی سا بھی معمول سے ہٹا ہوا عمل ناقابل برداشت جرم ہو جایا کرتا ہے...... اور یہ بات وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ گھر میں حاذق عبدالرحمٰن کا بچہ ہونے اور اپنا عبدالرحمٰن کا بیٹا جھگڑا کے ساتھ جو بن رہا تھا جو کسی کی بھی بات پر صدقہ کرتا تھا۔ کبھی وہ تھے اس کی زندگی کی کہانی...... جن کی خوشیاں صرف اس کی ذات میں پنہاں تھیں۔ جن کے لئے وہ خود بھی شاید مر جانے کے لئے ایک لمحہ بھی نہیں سوچ سکتا تھا اور مر جانے کو ترجیح دیتا۔ حسن عبدالرحمٰن......

وہ گھر سے نکل گیا تھا اس لیے سب نے پنچم دروازہ بند کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا آج رات کے کھانے میں کون سی بات مسند پر بیٹھا تھا کے صدر اور کھایا تھا اور کے بھائی لگتی تھی وہ جانتا تھا۔ اور یہ جان لیوا اذیت عذاب ہے۔ اگر کبھی انسان کو خوشی ملی ہو تو خوشیاں ہوتی ہیں۔ جنت ہے۔

وہ سوچ رہا تھا جب اس کے موبائل پر بیل ہوئی۔ اس نے جہاں کی سرحدوں پر کھڑے ہو کر بے جہانی کو حسرت سے دیکھا۔ وہ بالکل ان کو لیا ہے جانے بغیر کہ دوسری طرف کون ہے۔ اور ایسا ہوتا ہے، جب آپ کی ذات، ذاتی ملکیت نہیں رہ جاتی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ پہلا قدم کون اٹھاتا ہے یا ذات کے بکھرنے کے لئے پہلا ڈنکا کون اٹھاتا ہے؟

"ہیلو......!"

محسن اس کے لہجے سے ہی ٹوٹ پھوٹ کا اندازہ لگا چکی تھی۔ منزل کا گمان ہو تو چلنے کی تھکن تھکا نہیں سکتی، چلنے کی لگن جوش بھر دیتی ہے۔ لیکن اگر منزل سراب ہو تو قدم کا یقین ہو تو انسان یونہی تھک جاتا ہے۔

"ہیلو!...... کون بول رہا ہے؟" دوسری طرف کی خاموشی سے جھنجلا کر اس نے اس بار تیزی سے پوچھا۔ دوسری طرف کھلکھلاتی ہنسی ابھری

وہ چونک گیا۔

"کون بول رہا ہے؟" تجسس اس کے لہجے سے جھانک رہا تھا جب بہت حیرت سے پوچھا گیا تھا۔

"یہ کیا خبر نہیں اتنی جلدی بھول گئے مجھے؟ اپنی سب سے پیاری گرل فرینڈ کو؟"

ناز و ادا جیسی سب اس کے لہجے میں در آیا تھا اور حسن عبدالرحمٰن...... اس کے چہرے سے لگتا تھا اگر اس کا بس چلتا تو وہ کب کا اس چہرے کو مٹا چکا ہوتا۔ اس ہیرے کو جس نے اسے ستایا تھا......

AANCHAL.COM.PK

"جاناں تم...... تمہیں فون کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ کیا زندگی میں کوئی اور نام آگیا ہے یا کوئی سانحہ ہے یا اچھا نہیں رہا؟"

لفظ چبا چبا کر وہ اس طرح بول رہا تھا جیسے جاناں نے بھی کوئی زیادتی کی تھی۔ مگر وہ شاید نہیں انسان تھی اس لیے اسی انداز سے بول رہی تھی۔

"بہت جلدی ذہن میں آگیا تم کب تک مجھ کو گھسیٹ کر رہا تھا۔ بڑے مسائل ہونے والے لوگ دنیا میں کم نہیں ہوتے لگے۔ آپ کی حالت خالی نہیں ہے دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ اور بات تو تم نے بیک بینک میں نے بہت وقت ہو کے کام کی ہے۔ مجھ جیسی پرانی عمارت کہاں اس کا بار اٹھا سکتی ہے۔۔۔ ہے نا؟"

وہ پھر کھلکھلانے لگی تھی اور بے ارادہ جاتا تھا۔ اس کی بات کا ابھی مقصد ہو رہا ہے پانا کیونکہ وہ جانتا تھا وہ بہت کسی دل کو کھانے کی عادت بھی اسی طرح کھلکھلا کر ہنسا کرتی تھی اور جب تک وہ دروازہ بند نہ ہو جب تک اسے فون کرتی رہتی۔ موبائل آف ہوتا تو گھر کا فون ہوتا اور گھر کا فون بند ہوتا اور نکھی ان سبھی کی رنجش اور اعتماد۔ سب کی نظریں اس پر اٹکی جاتیں۔ وہ نظریں جن میں حیرت، خفگی، ناپسندیدگی ہوتی۔ کبھی وہ بیج تھی وہ اب اس معاملے میں کافی محتاط ہو گیا تھا۔

وہ پھر مسکرا دی تھی جو کبھی سمجھ میں آتی جو زبان کھینچیں اور اس نے کہا۔

"تم نے اچھا موبائل آف نہیں کیا، بری خاموشی کے باوجود؟ خیر تم مجھے کتنا جاننے لگے ہو ان؟ ویسے سچی بات مجھے لگتا ہے کہیں تم واقعی مجھ سے محبت تو نہیں کرنے لگے؟ سنا ہے محبت میں ہی الہام اترا کرتے ہیں۔"

"پلیز جاناں، اس فضول باتوں کرنے کے لیے بھی فارغ نہیں ہوتا۔"

اس نے دوبارہ کہا ہے یا ہنسی یا پھر میں غصہ کیا اور دوسری طرف لمبی ٹھنڈی سانس خبر کر لیا گیا۔

"ہائے...... کاش میں واقعی تمہارے دل کی جاناں ہوتی۔ لیکن شہاب کی مجھے چاہنے و پسند کرنے والے کم تو نہیں۔"

"کیا تم نے صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے؟" وہ تپ کر بولا کہ جاناں رو دی۔

"چپ چپ...... خیر یہ تمہیں بتا دوں وہ بولتا سب نہیں کیونکہ تمہاری شخصیت پر صرف رونا ہی سجتا ہے۔ ویسے تمہیں صرف ایک بات ریمائنڈ کروانی تھی۔ شاید تمہیں یاد ہو، کچھ ماہ پہلے تم نے مجھ سے کہا تھا،

AANCHAL.COM.PK

اب حالات بہت مختلف ہیں جاناں۔ اب تم مجھ پر پہلے کی طرح اٹیک نہیں کر سکتیں کیونکہ اب مجھے اپنی شخصیت کے کسی پہلو کی دھجیاں اڑنے کا خوف نہیں۔ میں سب گنوا چکا ہوں...... لیکن تم تو ڈرتے تھے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں تم اب بھی اپنے سے ہر منسوب رشتے کے لیے اتنے ہی حساس ہو جتنا پہلے تھے۔ بچھڑنے کے باوجود ہر رشتے کے بچھڑنے سے خوف زدہ...... اور تمہیں معلوم ہے اس خوف زدہ انسان کو ڈرانے میں کتنا مزہ آتا ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" وہ چونکا تھا۔

"کنیا...... میں علیا رحیم اور زودار حسن کی بات کر رہی ہوں شہری، تم پر مجھے ترس آتا ہے کیونکہ تم پرانی کہانی پر آج پھر سے نئے طریقے سے پذیرپ ہوئے ہو...... اور میں جب چاہوں، جتنی بار چاہوں، تمہیں کسی بھی کہانی میں لا کر لائم لائٹ کے مرکز میں لا سکتی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں میرے جملوں میں بلا کا جادو ہے۔ تمہیں بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہوگا...... ہے نا؟"

وہ کچھ کہے بغیر فون آف کر چکا تھا۔ بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس نے صرف ایک بڑا حساب بے حساب سے جوڑا تھا لیکن وہ خسارے کا اندازہ کر سکتا تھا۔

اس نے اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھا، وہ پہلے سے زیادہ خالی تھے۔ اس میں گھر جانے کی ہمت نہیں تھی مگر وہ پھر بھی اٹھا تھا، باہر آیا تو زخم چیخ چیخ کر آرام کی تلقین کر رہا تھا۔ بخار سے بدن پھنک رہا تھا مگر وہ پھر بھی گاڑی میں آ گیا تھا۔ گاڑی باہر نکالی تو ارادہ گھر جانے کا کیا تھا لیکن قدم کسی اور راستے کی سمت اٹھنے پر بضد تھے۔

اس راستے پر پہلے وہ کبھی کتنا چلا تھا۔ اس نے اندازہ کیا اور جانا کہ شاید وہ یہاں آنکھیں بند کر کے بھی آ سکتا تھا۔ سامنے عقیدہ ہارٹس کی عمارت کھڑی تھی۔ سوچنے میں آدھے گھنٹے کا راستہ صرف کر کے چند سیکنڈوں میں در آیا تھا۔ اس نے سوچا، کبھی یہاں سے گھر تک کا فاصلہ کتنا لمبا ہو گیا تھا۔ صدیوں قرنوں تک کا...... اور وہ کیسا چپ چاپ ناپ گیا تھا۔ نہ سایہ تھا نہ کوئی دلاسہ...... بس وہ تھا اور وقت کی اٹکی تھی۔ سانس بخار کی حدت سے اس وقت بھی تیز تھی مگر آج اس کے پاس کھونے کے لیے تھا ہی کیا۔ ہر تعلق، ہر رشتہ تو وہ بہت سال پہلے کھو چکا تھا۔ آج وہ یہاں تھا تو صرف اس کی ذات اس کی پونجی تھی۔ سب بے کار چیزیں، جن کے ہونے کا نہ دلاسہ ہو نہ کھونے کا دکھ، ان کو گنوا دینے پر کیا پچھتاوا......

وہ کار کا ہارن بجا رہا تھا۔ باوردی گارڈ نے دروازہ کھولا تھا۔

"آپ مسٹر شہریار عبدالرحمٰن ہیں سر؟" شائستہ لہجے میں پوچھا گیا تھا۔

تو اُسے یقین تھا میں یہاں آؤں گا...... اُس نے بے دلی سے سوچا اور ایک خیال آیا کار بیک کر کے واپس موڑ لے مگر وہ کام کی تیز آواز میں وہ گھٹے لہجے میں پکاری تھی۔

"شہریار! ماما ٹھیک اپنی جگہ مگر جس بات کو کہنے کے لیے یہاں آئے ہو، وہ تو کہہ ہی سکتے ہو۔ میں بڑی میزبان نہیں ہوں تم جانتے ہو۔"

تب وہ گاڑی اندر لے آیا تھا۔ پھر اندر کی رہنمائی کون سی مشکل تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں پہنچا تو حیران رہ گیا تھا۔ سردار حسن، علیا رحیم بھی ساتھ ساتھ تھے اور بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔

"مجھے بہت افسوس ہے شہری! تمہارے ساتھ جو ہوا اچھا نہیں کیا زمانے نے۔"

اُس نے گلاس اُس کی سمت بڑھایا مگر وہ لڑکھڑا گیا۔ پھر دونوں کی نظروں کے حصار میں لے کر پکارا۔

"تم دونوں نے جو کچھ کیا، میں بھولا نہیں ہوں۔ اور جانانہ! تم جانتی ہو میں پیار اور ضد بھی کبھی نہیں رکھتا۔"

جانانہ کی ہنسی دلکش نقرئی گھنٹیوں کی طرح ارد گرد کھنکتی تھی، ایک لمحے کو اس کے دل کی دھڑکن پر ... سنبھل گیا۔ سامنے جو کچھ بھی تھا محض جرم تھا، دھوکا تھا۔

"اتنا حیران کیوں ہو شہری! لگتا ہے تم مجھے بھول گئے تھے؟" اُس نے ادا سے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور وہ کرنٹ لگنے جیسی کیفیت سے دو چار ہو کر اُسے گھورنے لگا۔ لفظ گویا اندر مر رہے تھے، پھر رہے تھے۔ ایسے جیسے رنگ بہ گئے سانپ۔ کتنا زہر بھرا تھا ان لفظوں میں، وہی جانتا تھا۔ کسی کا وجود جلا رہا تھا جیسے ... روح نیلی پڑ گئی تھی۔ جو کچھ بھی تھا، چہرے سے اس کے سامنے آگیا تھا۔ خود بخود اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئی تھیں۔

"میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا جانانہ اور تمہیں بھولنا، وہ تو ایسے ہے، جیسے میں اپنے ہر زخم، ہر درد کو بھول جاؤں۔ میں تمہیں یاد رکھتا ہوں، تبھی تو مجھے وہ فریب یاد رہتی ہے، جو کبھی میں نے تم سے کی تھی، میری تنہائی نے مجھ سے روا رکھی اور خود میں نے تنہائی میں بارہا اپنے آپ سے محسوس کی...... جانانہ! میں تمہیں نہیں بھول سکتا، جس طرح تم مجھے نہیں بھول سکتیں۔"

جانانہ نے پھر سے گلاس اُس کی طرف بڑھایا یوں جیسے وہ مدتوں بعد ملے ہوں اور ان میں کبھی کوئی بدگمانی تک نہ رہی ہو۔

شہریار نے اُس کے اطمینان کو دیکھا تھا۔ علیا رحیم اور سردار حسن کی دلچسپ نظروں کو اپنے اندر کھبتے محسوس کیا تھا۔ تبھی اس نے فیصلہ کیا اور ایک جھٹکے سے کھینچ لیا تھا۔ گلاس اب اُس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ عادی بادہ نوش نہیں تھا مگر کبھی کبھی بزنس پارٹیز میں یا بزنس ٹور کے لیے ایک دو پیگ لے لیا کرتا تھا۔ یہاں پر وہ ڈرنک صرف جانانہ کو یہ دکھانے کے لیے پی رہا تھا کہ وہ اُس کی کسی بھی بات سے ڈسٹرب نہیں ہوا تھا۔

"آج بھی تم Neat ہی لیتے ہو۔ تمہاری عادتیں نہیں بدلیں شیری! تم پہلے ہی کی طرح ہاٹ اینڈ کول ہو۔" لہجے میں تو عجب تھی مگر وہ مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔

"اگر تمہیں لگتا ہے تم مجھے بے وقوف بنا سکتی ہو تو یہ بھول ہے تمہاری...... تمہیں پتہ ہے، میں عام مردوں کی طرح تم جیسی عورتوں کے چکر میں نہیں آیا کرتا۔ یہ میرا ڈیپارٹمنٹ ہے ہی نہیں۔"

"تم کتنے سنگ دل ہو شیری اور خوب صورت لڑکیوں کے سامنے ان کی خوب صورتی کے جادو سے انکار کر رہے ہو۔ دیکھو یہ سراسر ناانصافی ہے۔"

شہریار نے اُسے نظر بھر کر دیکھا اور ایلیا اس کے دونوں کاندھوں پر بازو ڈالے لگی۔ لمس میں شدت تھی اور انداز میں خود سپردگی...... اس نے سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"یہ چہرہ کتنا معصوم ہے، کتنا زیادہ معصوم کہ انسان اس کے آنچل کی پاکیزگی کی قسم اٹھانے میں ایک پل نہ ہچکچائے مگر اس کا عمل......"

اس نے ہولے سے اس کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیے۔ "تمہیں اپنی شکست پہ افسوس ہوگا ایلیا اور میں لڑکیوں کے دل کو ٹوٹنے یا ٹوٹ جانے کی تکلیف دینے سے ہمیشہ اجتناب کرتا ہوں۔" وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر مدھم بولا۔ "مجھے کبھی اپنی پاکبازی کا دعویٰ نہیں رہا۔ میں بہت آئیڈیل انسان نہیں رہا نہ ہی فرشتہ ہونے کا کوئی دعویٰ کیا ہے میں نے...... ہاں، مگر ایک عام انسان کی جتنی بھی خامیاں مجھ میں ہیں ان میں سے عورت کی تذلیل، خواہ کسی بھی نوعیت کی ہو، قطعاً میرے کردار کی جگہ نہیں پاسکتی ہیں۔ اس لیے شاید میں تمہارے لحاظ سے قطعاً بے کار شخص ہوں۔"

ایلیا نے نیا گلاس اُسے سرو کیا اور زوار حسن اُسے دیکھتا گیا۔

"تم آج شیری ڈرنک کرتے ہو اور چیونگم چبانے والی عمر کی باتیں لے بیٹھے۔ یہ وقت صرف عیش کرنے کا ہے۔ یہ زندگی اور جوانی، یہ بہت کم مدت کی ہیں۔ جتنا خود کو کیش کروا لو گے اتنا ہی زندگی میں لطف اور تحرک رہے گا۔"

شہریار عبدالرحمٰن نے اُسے یوں دیکھا، جیسے کوئی بڑا کسی بچے کی نا سمجھی پر نمائش سے دیکھے، لیکن اس نے جواباً کچھ نہیں کہا تھا۔ کیونکہ بہرحال جانتا تھا، زندگی کا کوئی بھی روٹ ہو ایک بار کوئی انسان چل پڑے تو وہ ون وے روٹ بن کر رہ جاتا ہے۔ کبھی دل واپس پلٹنے میں ساتھ نہیں دیتا، کبھی وقت اور حالات دھوکا دے جاتے ہیں اور سفر...... سفر کسی بھی طرح کا ہو، بالآخر طے ہو کر رہتا ہے۔ چاہے منزل ملے یا منزل کی تلاش میں دھوکا...... یا چاہے منزل ملنے کی حسرت میں پہنچے موت...... انجام کچھ بھی ہو انجام وراثت کی طرح ضرور تقسیم ہوتا ہے...... اور وہ چاہے یہ مانے یا نہ مانے آج تک اس رب کی کسی بھی تقسیم پر اس نے احتجاج نہیں کیا تھا، سو یہاں بھی اس نے خاموشی اختیار کی تھی۔ پھر اس سے بھی زیادہ خاموشی سے چابیاں اٹھائی تھیں۔ لیکن جب کھڑا ہوا تو لامحالہ چکرا گیا تھا۔ زوار حسن اور جانے والے

ہی بیٹھے رہے۔ بس ایلیا کے وجود میں حرکت ہوئی تھی۔ وہ اسے سنبھالنا چاہتی تھی مگر وہ خود کو اس وقت تک سنبھال چکا تھا۔ وہ وہاں سے صرف پانچ قدم ہی دور کھڑی تھی جب اس نے کہا۔

’’انسان اگر اکیلا چلے تو وہ گرتا نہیں ہے۔ گرتا ہے تو سہارے ہی یا سہارے کا دھوکا تم کہیں سے بھی چلی ہو اکیلی چلی تھیں، پھر گرنے کی حسرت میں سہارے کیوں ڈھونڈ رہی ہو؟ گرنا ہی جب مقدر ہو تو کسی سہارے کا بھی کیا احسان لینا...... تم اچھی نہیں ہو، یہ تم سمجھتی ہو۔ پتہ نہیں میرا دل کیوں کہتا ہے کہ تم بری بھی نہیں ہو۔‘‘

ایلیا کے اندر سنسناہٹ سی ہوئی۔ پتہ نہیں کس سالفت کس کی کمزوری پر ضرب بن گیا۔ اندر کچھ چٹخنے لگا تھا۔ مگر وہ جہاں تک آ چکی تھی وہاں سے واپسی ممکن ہی کب تھی۔ اس لیے دونوں آنکھیں سپاٹ چہرہ لیے اسے پھر سے تکنے لگی۔

شہریار نے ایک لمحے کو دیکھا اور پھر پشت موڑ لی۔ قدم ایک کے بعد ایک اٹھتے گئے اٹھتے ہی چلے گئے۔ گھر کار تک پہنچا تو مصنوعی قسم کی ہمت منہ کے بل زمین پر آ گری۔ تکلیف، گھٹن، تذلیل، بےزاری، صدمہ اور ذلت بیک وقت سب نے مل کر اسے پچھاڑ دیا تھا۔ وہ کار میں بیٹھا خود پر ہنس رہا تھا۔ رات کے دو بج رہے تھے اور وہ اپنی کار میں تنہا بیٹھا تھا۔

’’میں کہاں ہوں، کوئی نہیں جانتا...... مجھے کہاں جانا ہے، میں نہیں جانتا...... مجھے کہاں ہونا چاہیے، زندگی لاتعلق ہے اور میں حسرت جاگیاں بیٹھا ہوں۔ مجھے کس کی تلاش ہے؟ میرا کیا کھو گیا ہے؟ وقت نے مجھے کہاں گنوا دیا ہے؟ سب کچھ لاعلمی کی چادر میں گم ہے۔ میرا انتظار کہاں ہو رہا ہے اور میں کہاں کس کے لیے بھٹکا جا رہا ہوں؟ سوچنا ہی عبث ہے۔‘‘

اس کے دل میں جتنی جلدی منفی سوچیں پیدا ہوئی تھیں، اس نے اتنی ہی جلدی انہیں سر سے جھٹک دیا تھا۔ گاڑی کے اگنیشن میں چابی گھما کر اس نے کار اسٹارٹ کر کے ریورس گیئر شروع کر دی تھی۔ واچ مین گیٹ کھول کر واپس اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔

شہریار کا کوٹھی سے نکلتا ہوا باہر سڑک پر آ گیا تھا۔ طویل سڑک طویل زندگی کی طرح خالی پڑی تھی مگر تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اسے چلنا تھا۔

کار تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔ اس نے کار میں FM لگا لیا تھا۔ اندر کا شور بڑھ جائے تو باہر کے شور سے اسے بھرنے کی ناکام سی کوشش ہر کوئی کرتا ہے اور اس لمحے بھی وہ یہی کر رہا تھا۔ سامعین اور پروڈیوسر کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔ کوئی لڑکا اپنی چھوٹی بہن کو تحفہ دینے کی وش کر رہا تھا۔

15 جولائی...... یکدم اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ آج تو رانیا کا بھی برتھ ڈے تھا۔

اُف! وہ اسی لیے جازی مجھے دفتر سے پک کرنے آنا چاہتا تھا۔ کوئی سرپرائز پارٹی رکھی تھی دونوں نے اور میں......

اس نے رسٹ واچ دیکھی۔ ڈھائی بج رہے تھے۔ کوٹ کی جیب میں موبائل ٹٹولا مگر شاید فلیٹ میں رہ گیا تھا۔ وہ تیزی سے ڈرائیو کرتے فلیٹ پہنچا۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اندھیرے فلیٹ میں موبائل کی آواز خاصی پراسرار لگ رہی تھی۔ حالت ایسی تھی کہ دل و دماغ اندھیرے میں ڈوب جانے کو بے قرار تھے۔ سڑک پر بھی اس نے گاڑی بہت بے خبری سے چلائی تھی۔ اگر ٹریفک ہوتا تو ایکسیڈنٹ لازمی تھا مگر خیر جو بھی کہ وہ بہ عافیت گھر پہنچ گیا تھا۔ پھر وہ گلاس ٹیبل کے سامنے کھڑا تھا جہاں موبائل کی بیپ اور جگنو جیسی روشنی ایک ساتھ تھی۔ اس نے صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے موبائل اٹھا لیا۔ کوشش یہی تھی موبائل آف ہو جائے یا کرنے والا تھک جائے لیکن وہ جانتا تھا اس وقت شہر میں اگر اس کے لیے کوئی پریشان ہوگا تو جازی عبدالرحمٰن یا دادا عبدالرحمٰن کے سوا کوئی اور نہیں ہوگا اور اس لمحے ڈرنک کر لینے کی وجہ سے وہ ان دونوں میں سے کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گھر میں سب جانتے تھے، وہ چاہے جتنی جازی اور دادا ہمیشہ اس بات کی مخالفت کرتے تھے۔

"ہمارے شیری بھائی ایسے نہیں ہو سکتے۔"

اور آج وہ ان کا پھر خوش کن چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ موبائل آف ہو چکا تھا۔ وہ ابھی اسے رکھنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ پھر سے بجنے لگا۔ ریسیو کرنا مجبوری تھی۔

"ہیلو شہریار۔"

لہجے میں تحمل ہی تحمل تھی اور دوسری طرف بلا کا حساس جازی عبدالرحمٰن......

"بھائی! کہاں ہیں آپ؟...... میں گیارہ بجے سے آپ کا موبائل ٹرائی کر رہا ہوں۔ پاپا نے بتایا تھا دفتر میں آپ کا ایک ہاتھ پاؤں پر کا ورکر...... آپ کا زخم کیسا ہے بھائی! بتائیں ناں آپ کیسے ہیں؟"

موبائل کان سے لگا تھا مگر وہ ایک لفظ بھی نہیں بول رہا تھا۔

کبھی کبھی سچ ہے ناں آپ کتنی ہی کسی سمت بھاگے جا رہے ہوں تو کیا ہونے پر بھی تحمل آپ کو جھٹنے پر نہیں آسکتی۔ دراصل آپ جانتے ہیں آپ اس کی مہمانداری کر ہی نہیں سکتے۔ لیکن اگر کوئی بازو تھامے آپ کے سامنے آکھڑا ہو تو پھر...... پھر آپ کو لگتا ہے وہ قدم بھی چلنا شاید ممکن نہیں ہے۔ بس اس لمحے بھی یہی ہوا تھا۔ وہ جازی عبدالرحمٰن کی آواز کی بانہوں میں اپنی سماعت دے کر صوفے پر ڈھے سا گیا تھا۔ لفظ، کوشش، ہمت سب جواب دے گئی تھیں اور دوسری طرف کی بے قراری......

AANCHAL.COM.PK

"بھائی! کہاں ہو آپ؟.....اپنے فارم ہاؤس میں؟" وہ مختلف لوکیشنز دہرا رہا تھا اور جواب میں اس کی زبان صرف نہیں کا لفظ ادا کر پا رہی تھی۔

"کیا میں مرجانے والا ہوں؟....." گھٹن سے سانس کہیں اٹکنے لگی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں بات دہرائی، ہتھیلی کی گرفت وہ کپ کا اعتراف کر بیٹھ چکا تھا۔ ذرا خنک روم میں اے سی کی کولنگ تھی لیکن اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا۔

"جازی!" جانے کیسے اس کے حلق سے نحیف سے لہجے میں یہ لفظ نکلا۔

"شیری بھائی! کیا ہوا؟.....آپ ٹھیک تو ہیں؟" جذبات کا ابال وہاں تک پہنچ گیا تھا اور تبھی کسی نے موبائل چھین لیا۔

"شیری بھائی! آپ بتاتے کیوں نہیں ہیں آپ کہاں ہو؟ کس حالت میں ہو؟"

اس نے اپنے آپ کو دیکھا۔ وہ جس حالت میں تھا اس میں کسی کی توجہ، کسی اپنے پن کی شدید طلب تھی۔

"بابا! آج تمہاری سالگرہ تھی۔"

"آپ کہاں ہو؟" بابا کی گھبراہٹ زدہ آواز ابھری۔

اور یہی وہ آخری احساس تھا جس نے اس کے وجود کو جھنجھوڑا۔ موبائل ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ اس نے موبائل اٹھانے کے لیے جھکنے کی کوشش کی اور بس۔ پھر وہ خود بھی گرتا چلا گیا۔ خود کو روکنے کی کوشش میں ٹیبل پر ہاتھ رکھا۔ گلاس اور بوتل بھی چھناکے سے ٹوٹ گئے۔ کچھ لمحے وہ ساکت رہا۔ موبائل میں سے جازی اور بابا کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں لیکن اس کی حسیات اندھیرے کی چادر میں گم ہو چکی تھیں۔

"کیا کہہ رہے تھے بھائی؟ بابا جان! آپ بتاتے کیوں نہیں ہیں؟" جازی نے بابا کو کندھے سے ہلا کر رکھ دیا۔ موبائل وہ چھین چکا تھا۔ رابطہ ابھی منقطع نہیں ہوا تھا۔ سو وہ پھر سے چیخنے لگا۔ "شیری بھائی!.....شیری بھائی!"

بابا نے اس کی طرف خالی نظروں سے دیکھا۔ "پتہ نہیں شہریار بھائی....." وہ کچھ کہنے سے پہلے ہوش کھونے لگے تھے کہ اس کے ہاتھ سے فون چھوٹنے لگا۔ جیسے کو وہاں نے کہا تھی۔ اور جازی وہاں سے کتنی دیر پاگل تھا۔ تبھی گھر کے نمبرز سے شہریار کے دوستوں سے ان کے متعلق پوچھنے لگا مگر وہ کہیں نہیں تھا۔

"جازی! ایک نمبر رہ گیا ہے وہاں ہمیں پہلے ہی فون کرنا چاہیے تھا۔" لہجے میں عجیب کرب تھا۔

"آپ جلالہ کی بات تو نہیں کر رہیں؟"

نانا نے یوں سر جھکا لیا جیسے کوئی چوری پکڑے جانے پر شرمندہ ہو جائے۔

"آپ نے ایسا کیوں سوچا کہ شہریز بھائی ابھی تک جلالہ سے رابطے میں ہیں؟"

نانا کچھ نہیں بولیں، جازی تیزی سے ایک نمبر پش کرنے لگی۔

گھنٹی دیر تک بجتی رہی، پھر کسی کی جھنجھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "کون دانی، جلدی تم سے پیار بہت ہونے والا ہے...... مجھے اندازہ نہیں تھا۔ شہریز تم مجھے اب فون کرنے لگے ہو؟"

"بیٹو میں نانا بول رہی ہوں۔" نور نے کھینچ کر اس نے مخاطب کیا اور دوسری طرف چند ساعت خاموشی چھا گئی جیسے کوئی خود کو مخاطب سنبھال لینے پر کمربستہ ہو۔ گلا کھنکھارا گیا تھا پھر وہی سریلی آواز سنائی دی تھی۔

"نانا کون؟ کیا شہریار کی ممی بول رہی ہیں؟"

"جی ہاں! مسز شہریار عبدالرحمن کی ماں بول رہی ہوں۔ پلیز کیا آپ بتا سکتی ہیں شہریار بھائی سے کہاں آپ کی ملاقات ہوئی تھی؟"

لہجے میں التجا تھی کہ وہ اس سوال کا جواب لینے میں وہ گھبرا رہی تھیں اسے شکست ہو رہی تھی۔ جازی نے ریسیور لے کر [illegible] اور یہاں سے چلے جانے کی پوری تفصیل سے منظر نامہ بیان کر دی تھی۔

نانا سنتی رہیں پھر ریسیور رکھ دیا۔

"جازی! میرے ساتھ چلو...... میں شاید اب جان چکی ہوں شہریار بھائی کہاں ہوں گے۔"

جازی عبدالرحمن پارکنگ کی چابی لے کر اس کے ہمراہ کمرے سے نکلا۔ وہ بہت زیادہ خاموش تھا۔ یوں جیسے کوئی آتش فشاں پھٹنے سے پہلے چند لمحوں میں کسی [illegible] سے بارش ہو کر [illegible] جائے۔
نانی نے زیر لب [illegible] سے اسے ایک بار دیکھا تھا پھر خاموشی سے اس کے پیچھے پارکنگ [illegible] گئی تھی۔ وہ بے حد خاموشی سے مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑا رہا تھا جب بہت

اچانک وانیا نے کہا۔

"ہو سکتا ہے، جانان نے تمہیں پھر سے شیری بھائی سے بدگمان کرنے کی کوشش کی ہو کیا پتہ، وہ وہاں گئے ہی نہیں ہوں اور بس وہ تمہارے دلوں میں ان کی طرف سے فاصلے بڑھانا چاہتی ہو۔"

"کیا آپ کب سے جانتی ہیں بھو! کہ بھائی اب بھی جانان سے ملتے رہتے ہیں؟"

شاکڈ بیجی خالی آنکھیں...... وانیا کو لگا اس سے کوئی بہت بڑی بھول ہو گئی ہے۔ جازی شہریار کے متعلق جتنا حساس تھا اس کے پیش نظر اسے یہ سچ اتنی جلدی اگلنا نہیں چاہیے تھا۔ لیکن اب اسے بات سنبھالنی مشکل ہوئی جا رہی تھی مگر اسے یہ کرنا تھا۔ جازی عبدالرحمن کو منتشر خیالات سے بچانے کے لئے یہ لازمی تھا۔

"سنو! اگر تم نے میری کسی بات سے کوئی غلط مطلب لیا ہے تو پلیز اسے جھٹک دو۔ تم جانتے ہو جازی! تم پانچ سال پہلے جس طرح بھائی کو بدگمان کر چکی ہے، آج بھی اس کے دل کی یہ خواہش ختم نہیں ہوئی ہے۔ وہ اب بھی انہیں نئے سے نئے الزامات کے پھندے لگا کر بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔"

"بھو پلیز! آپ کی محنت تو کارگر نہیں رہے گی۔ شیری بھائی کے متعلق میری بہت سی غلط فہمیاں آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی ہیں۔ انسان اچھا ہو تو کوئی کیسے اس کی گواہی دے رہا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ساری دنیا صرف کسی ایک انسان ہی کو بدنام کرنے پر تل جائے؟...... آپ بھول سکتی ہیں، بڑے بھیا کے انتقال کے بعد ان کے سوکالڈ فیملی فیٹ کی رنگینیاں...... مگر مجھے پتہ نہیں، کیوں لگتا ہے، ہم آج تک ایک غلط انسان پر اپنی محبتیں لٹاتے آ رہے ہیں۔"

وانیا کے ہاتھوں نے اس کے کندھوں کو بے بسی کے دباؤ سے چھوا۔

"جازی! مجھے حیرت ہوتی ہے تم بھائی سے اتنی جلدی بدگمان ہو سکتے ہو۔"

"اتنی جلدی؟...... پورے سترہ سال سے میں ان کی حمایت کر رہا ہوں اور خود آپ تو اس سے بھی زیادہ سالوں سے ان کی حمایت کی پاداش بھگت رہی ہیں۔ آپ کی زندگی کی اولین خوشی بھائی نے چھین لی لیکن پھر بھی آپ ان کے ہاتھوں عقیدت سے بیدم رہی ہیں۔ آپ کو اپنی تمناؤں کا خون ان کے ہاتھوں پر کیوں نظر نہیں آتا؟ سالار بھیا کے دل کا درد کیوں نہیں دکھتا آپ کو؟...... وانیا کی خاموش آنکھوں میں بکھرے ٹیلا کرب کیوں آپ کے دل کی ویرانیاں نہیں اگلتے؟ اور میرا...... میرا درد...... میں نے بھائی کو کتنا اونچا اور بلند انسان سمجھا تھا لیکن بھائی...... آج کے بعد میں کبھی آئیڈیل نہیں

بتاؤں گا۔ سارے مما کے سارے چچا، تایا، انکل سب میری نظر میں جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہے۔"
نانا کہہ رہا تھا وہ شاید بوڑھے ہو گئے ہیں مگر وہ یکدم ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔
"جازی! کیا ہوا؟" انہوں نے اس کا شانہ تھپکا اور وہ سر چھپائے کسی معصوم بچوں کی طرح رونے لگا۔
"جازی! کیا ہوا میری جان؟...... تم تو بہت بہادر بچے ہو بیٹا!"
"بیٹا! ہم ان کے نظریات نہیں جانتے ہیں۔ کیا پتہ وہاں تمہیں کیا دیکھنے کو ملے۔"
جانے وہ کیا کہنا چاہتا تھا اور کیا کہنے سے خود کو روک رہا تھا۔ نانا نے اسے چپ کرانا چاہا۔ پھر نرم لہجے میں بولے۔
"کیا پتہ جازی! تمہاری باتیں بجا ہیں، ویسے تو وہ ہم سب کو اجنبی سمجھنے لگے ہو...... ہو سکتا ہے اس وقت انہیں تمہاری سخت ضرورت ہو، بیٹا! ایک بار اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو تسلی رہے گی۔ پھر ضبط صرف اس
ست کی کمزوری پڑ رہی ہے سامنے قریب آ کر۔ یونہی واپس چلے جانا تو صرف حماقت کے سوا کچھ نہیں۔"
جازی عبدالرحمٰن نے اثبات میں سر ہلایا۔ نانا نے اپنے پوتے سے اس کے آنسو صاف کئے۔ اسے مصلحت کی شفقت بھری پیاری مسکراہٹ سے...... ہاں بس ان مسکراہٹ میں ہلکا سا درد بھی تھا، جو کچھ
ساعت ہی میں دل میں کسک جاتا تھا۔
جازی یا تب اسٹارٹ کر چکا تھا۔ وہ پھر پہلے کی طرح سڑک پر رواں دواں تھا۔ ٹھیک ست بعد وہ... اب آئی کمشنر جتوئی کے شاندار بنگلے کے سامنے تھے۔
صبح کے چار بج رہے تھے۔ سیکیورٹی گارڈ نا تجربہ کار تھا۔ جازی عبدالرحمٰن نے اسے بتایا کہ بصورتِ حال بتائی۔ اس نے انٹرکام پر اندر کے سیکیورٹی روم میں پیغام دیا۔ جب خود کار گیٹ کھلتا چلا گیا۔ باقاعدہ اندرونی
حصے میں ان کا اندراج کیا گیا۔ سیکیورٹی لحاظ سے چھان بین کی گئی تب انہیں اندر جانے کی اجازت ملی۔ جازی کا موڈ سخت خراب تھا۔ سیکیورٹی افسر راحیل اقبال نے معذرتی لہجے میں الوداعی مصافحہ
کرتے ہوئے کہا۔
"مجھے افسوس ہے سر! لیکن حالات آج کل اتنے خراب ہیں کہ کسی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اسے آپ صرف فارمیلٹی سمجھ کر درگزر کر دیجئے گا۔"

AANCHAL.COM.PK

جازی نے بے دلی سے سر ہلایا اور شہریار کے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ان کا فلیٹ تیسری منزل پر تھا۔ وہ دونوں کب سے دروازے کو دیکھ رہے تھے۔

"بیل دو بجاؤ!" وہ دانستہ اس معاملے کے ہر پہلو سے بچنا چاہ رہا تھا۔

تانیا نے سر ہلایا۔ بیل دی۔ مگر چھ سات بیلز پر بھی دروازہ ویسے ہی بند تھا۔

"اب کیا کریں؟"

تانیا نے خفت سے اسے دیکھا پھر مدھم لہجے میں بولی۔ "ڈپلی کیٹ چابی لے آؤ۔ میں یہیں کھڑی ہوں۔"

جازی خاموشی سے نیچے چلا گیا۔ پھر فلیٹ کی انتظامیہ کے ایک فرد کے ساتھ واپس آیا۔

"آپ ڈپلی کیٹ چابی کیوں چاہتی ہیں میم! ہو سکتا ہے اندر جو صاحب ہیں وہ بہت گہری نیند سو رہے ہوں یا......" ایک خان جی نے جو کہ ان دونوں کو چھوڑ کر ان دونوں کو مشکوک نگاہوں کے سامنے سوال ڈال دیا۔

"شہریار عبدالرحمٰن میرے بھائی ہوتے ہیں اور مجھے لگتا ہے وہ اس وقت کسی پرابلم کا شکار ہیں...... ان کا موبائل بھی تب سے آف ہے۔ بیل ان کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی۔"

"او سوری میم! شہریار صاحب بیمار تو نہیں تھے۔ سوچنے کی بات ہے۔ آپ کے بھائی کی وجہ سے موبائل آف کر کے بھول گئے ہوں یا پھر......"

"یا پھر کیا؟" تانیا عبدالرحمٰن کی آواز خود بخود تیز ہو گئی۔

سامنے کھڑا منتظم واقعی ہو گیا۔ پھر دروازہ کھولتے ہوئے مدھم لہجے میں بولا۔ "یا پھر میم! ہو سکتا ہے انہوں نے اوور ڈوز کر لی ہو یا کوئی بے ہوش ہو گئے ہوں۔"

جازی نے تانیا کو مزید بولنے سے روکا اس لئے اس کے ہونٹ کھلے مگر بند ہو گئے۔ جازی اب چابی لے چکا تھا۔

"آپ جائیے سر شکریہ! ہم یہ چابی واپس آپ کو دے جائیں گے۔"

وہ نہیں چاہتا تھا جس سر پانچ منٹ سے وہ گزر رہے اس کا گھر کوئی اور بھی دیکھے۔ بحث کی وجہ بھی وہ جان گیا تھا۔ یہ پوش علاقے کے فلیٹس تھے جہاں بہت کم فیملیز رہتی تھیں۔ زیادہ تر
فلیٹ دیئے گئے تھے اور انتظامیہ کی ذمہ داری تھی کہ یہاں رہنے والوں کی پرائیویسی متاثر نہ ہونے پائے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اگر جازی اسے نہ بھیج دے

رہتا تو شاید وہ پچھلے دو دن ان کے کام میں مداخلت کرتا رہتا۔

دانیا چابی لے کر کی ہول میں لگا کر گھما چکی تھی۔ دروازہ ٹک کی آواز کے ساتھ کھل چکا تھا۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔

سارا فلیٹ گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ جازی اور وہ اس کے بیڈروم کے سامنے کھڑے تھے۔ دانیا کی جگہ جازی نے دروازہ ناک کیا مگر جواب نہ پا کر کھول دیا۔ لائٹ آن کی تو کمرے کو خالی پایا۔ پھر وہ ہر کمرے کو دیکھتے ہوئے ڈرائنگ روم کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ ڈرائنگ روم بلیک کلر سے مزین کیا گیا تھا اسی لائٹنگ کی وجہ سے ہر طرف سے گھپ اندھیرا تھا۔ جازی نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے دروازہ باہر کھینچا۔ دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ سے کھلتا چلا گیا۔ جازی نے سوئچ بورڈ ڈھونڈ کر ٹیوب لائٹ آن کی اور پھر دونوں کے دل جہاں تھے وہیں تھمنے لگے۔

"شیری بھائی......!" وہ جو سہارے سے اسے اٹھا رہا تھا چیخنے لگا تھا۔ دانیا کا چہرہ بھی سفید ہونے لگا تھا۔

شہریار عبدالرحمن گولڈن ٹیبل کے پاس بے ہوش پڑا تھا اور اس کے ماتھے پر لگی چوٹ سے خون نکل کر بلیک کارپٹ پر جذب ہو رہا تھا۔ دانیا نے اسے سیدھا کیا تھا اور جازی اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔

"بھائی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ہمیں انہیں فوراً ہسپتال لے کر جانا ہوگا۔ قریبی ہسپتال کون سا ہے؟"

پھر اسے بازوؤں کے سہارے لے کر وہ دونوں باہر آ گئے۔ سیکیورٹی کا بندہ جو اس کے سامنے چلا گیا تھا ان کو لیتے ہوئے اٹھا کر ان کے سامنے آ گیا۔ پھر اسے جس حالت میں دیکھا وہ بھی گھبرا گیا تھا۔ "سر! آپ ایمبولینس کیوں نہیں منگوا لیتے؟" اس نے مشورہ دیا لیکن جازی نے پکارا۔

"تم بھائی کی کار کی چابیاں اٹھا کر لائیں جلدی۔" دانیا اندر دوڑ گئی اور جازی اس کی طرف مڑا۔ "میں یہاں ایمبولینس آنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔ بھائی کی حالت مجھے کافی خراب لگتی ہے۔"

دانیا دروازہ لاک کر چکی تھی۔ وہ بمشکل اسے سنبھالتے کار تک لائے۔ جازی پیچھے شہریار کے ساتھ بیٹھا اور دانیا ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر اپنی اس وقت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے لگی۔

"میرا بائیک سیکیورٹی ہے سر مظفر ہاؤس میں دوبارہ آ کر لے جاؤں گا۔ پلیز! آپ اسے پورچ میں سیف کروا دیجیے گا۔" جازی نے چابی اس کی طرف اچھالی اور گاڑی برق رفتاری سے ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔

ایمرجنسی میں اسے فوراً لے لیا گیا تھا۔ جازی اپنے فیملی ڈاکٹر شاہ ہمدانی کو فون کر رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس کا دل بہت گھبرانے لگا تھا۔ فون ڈاکٹر ہمدانی نے ہی اٹھایا تھا۔ وہ اس وقت فجر کی نماز پڑھ کر ڈیک پہ بیٹھے ہوئے تھے تبھی اس کی آواز سن کر حیران ہو کر بولے۔

"کیا بات ہے جنگ میں ایسا شور نے پانچ بجے تمہیں اپنے آفس کی کیوں یاد ستانے لگی؟ خیریت تو ہے؟ عبدالرحمٰن تو ٹھیک ہے نا؟"

ان کی تین منسٹر عبدالرحمٰن یا ڈاکٹر ذوقی، جو بلڈ پریشر اور ہارٹ اٹیک جیسے تھے اس لیے لامحالہ ان کا خیال ان کی طرف ہی گیا تھا۔ شہریار کا سن کر وہ بہت زدہ ہو گئے تھے۔ پھر انہوں نے ہسپتال پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"میرے خیال میں زخم اتنا گہرا تو نہیں تھا، پھر یہ بلیڈنگ کیوں ہوئی؟" وہ نجمہ کو روک کے پھر غصے سے بولے۔ "میں جانتا ہوں اس نے قطعاً آرام نہیں کیا ہوگا، اس لیے زخم پھر سے کھل گیا ہوگا اور یہ بھی ان دونوں معاملوں کی نقاہت کا شاخسانہ ہے۔ تم فکر مت کرو، میں اس کا کیس ہینڈل کرنے والے اسٹاف سے مل کر آتا ہوں۔"

وہ چلتے ہوئے ان دونوں کے سامنے سے غائب ہو گئے۔ وہ کس کمرے میں گئے تھے، وہ نہیں جانتے تھے اس لیے وہ وہاں سے ویٹنگ روم کے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گزرا تھا جب ڈاکٹر صدیقی ان دونوں کے لیے چائے اور سینڈوچ لیے ان کے پاس پہنچے۔ چہرے سے اطمینان ظاہر کر رہے تھے، وہ بتا رہے تھے، تسلی دینے میں کمال کرنے والوں میں سے تھے، انہوں نے جازی کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولے۔

"گھبراؤ مت۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ وجہ بات وہی تھی اس لیے بہت جلدی کور کر لیا ہے انہوں نے۔" پھر وہ ماما کی طرف مڑے، اشارہ کیا اور آگے کوریڈور میں چلنے لگے۔

ماما ان کے پیچھے ہی تھیں مگر جازی ساری رات کی تھکن اور غصے سے تناؤ میں بیٹھا تھا، اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں، صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر اس نے اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے اور دوبارہ اس کے اعصاب اچانک ڈاکٹر صدیقی کے سوال پر بیدار ہو گئے تھے۔

"شیری کب سے ورکنگ کر رہا ہے؟"

وہ چلتے چلتے رک گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کیا جواب دے کہ وہ پھر سے پکارے۔

"یہ سمجھو کہ بہت عرصے سے کر رہا ہے نا بابا؟"

"جی انکل!" اس نے سر جھکا لیا تھا۔

AANCHAL.COM.PK

ڈاکٹر صمدانی کی آنکھیں بہت کچھ سوچنے لگی تھیں۔ دانیہ نے جھکا ہوا سر اٹھایا تو اسے ان آنکھوں میں تشویش صرف نظر آ رہی تھی۔

"آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں انکل!"

ڈاکٹر صمدانی نے گہرا سانس لیا، پھر گلا کھنکھار کر بولے۔ "یہ بات مجھے تم سے کہنی نہیں چاہیے کیونکہ تم بہت حساس ہو اور جذباتی بھی...... لیکن جتنی تم شہریار کے قریب ہو شاید کوئی ہے ہی نہیں اس لئے پلیز تم اسے سنبھالو۔ اسے کسی بھی طرح ڈرنک اور اسموکنگ سے دور کرو۔ تم نہیں جانتیں صرف 30 سال میں اس کا بلڈ پریشر اتنا شوٹ کر چکا ہے کہ میں بتا نہیں سکتا اس کی نسبت سے یہ نہیں جان سکتا کہ اس خاموش قاتل نے اسے کتنا نقصان پہنچا دیا ہے۔ ہر وقت پریشانی، فرسٹریشن اور اپنی ذات کی جنگ لڑتے رہنے سے اس کے اعصاب اتنے تھک چکے ہیں کہ اس دن جب اسے ہسپتال لایا گیا تھا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ زخم اتنا کاری نہیں تھا، جتنا بلڈ پریشر کی شدت اور مایوسی نے مل کر اسے کسی طرح زندگی کی طرف سے منہ موڑنے پر اکسایا تھا۔ اگر اس وقت وہ بے ہوش نہیں ہوتا تو شاید مر چکا ہوتا۔ اس کا فی الحال تو خواب آیا ہے سائیکی تک۔ واللہ روشن ہے دانیہ!"

"بھائی...... بھائی ٹھیک تو ہو جائیں گے نا انکل؟" دانیہ کی کٹورا سی آنکھیں لبالب بھرنے لگیں۔

ڈاکٹر صمدانی نے ہولے سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "جس بھائی کے پاس تم جیسی اچھی بہن ہو اسے بھلا کیا ہو سکتا ہے؟ بس ہاں، پلیز چیئر اپ۔"

دانیہ نے دوپٹے سے آنسو صاف کئے، پھر شکستہ لہجے میں پکارا۔ "میں بھائی سے مل سکتی ہوں؟ پلیز انکل! میں بالکل نہیں روؤں گی۔ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہوں گی، بس ایک بار۔"

دانیہ کا انداز ایسا تھا کہ وہ ہولے سے سر ہلا کر ڈاکٹر زروم کی طرف بڑھ گئے۔ کیونکہ جانتے تھے مکمل حالت بحال ہونے کے پیچھے اس خانہ ابدالی شخص کو چھوڑ کر جا بھی کیسے سکتے تھے۔ بے شک وہ اور بچوں کی طرح ان سے فرق نہیں تھا لیکن اب حرام کے ساتھ لئے بیٹے سے زیادہ اس کا انداز انہیں ہمیشہ اس سے قریب کئے رکھتا تھا۔

دانیہ انہیں جاتا دیکھتی رہی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی جازی کے پاس آ کر رک گئی۔

"جازی بھائی کیا آپ میرے ساتھ چلیں گے؟"

جازی نے سرخ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا، جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن آنکھوں میں اتنی واضح خفگی تھی کہ وہ یکدم ڈر گئی۔

"تو تم نہیں ملنا چاہتے بھائی سے۔" ایک قدم وہ اٹھا پائی، دوسرے قدم پر اس کا ہاتھ جازی کے ہاتھ میں تھا۔
"بھولا! آپ جانان کی طرف سے بھی پہلے سے جانتی تھیں اس کی منگنی ہو رہی تھی؟ کیسے جانتی ہیں؟" وہ نظریں چرانے لگی اور وہ اس کے سامنے ان کھڑا ہوا۔ "آپ کو کیسے پتہ تھا جانان سے اب بھی بھائی کا رابطہ ہے؟" لہجہ تلخیت لیے ہوئے تھا۔
"نہیں..." وہ مدھم لہجے میں بولی۔ "وہ ایک بار بھائی کے موبائل پر اس کا میسج آیا تھا۔ کافی بار اس کی مس کالز میں نے بھائی کے موبائل پر دیکھی تھیں۔ لیکن جب بھی میں بھائی سے اس سلسلے میں کچھ پوچھتی، بھائی کہتے پاگل لڑکی ہے۔ وہ دوبارہ کہ بھائی کا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔"
"بھائی ٹھیک کہتے ہیں۔" جازی کے چہرے پر ناپسندیدگی اور غصہ واضح تھا۔ نیلو فر کا ہاتھ تھامنا چاہتی تھی لیکن وہ اس سے دو قدم دور جا چکا تھا۔ پھر دکھ دینے والے لہجے میں بولا تھا۔ "واقعی بھائی ٹھیک کہتے ہیں۔ وہ بڑی پاگل ہی ہے جو بھائی کے پیچھے اپنا کیریئر برباد کر رہی ہے۔ بھائی نے اسے بتایا نہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ پاکستان میں نہ ہو، کتنی چاہت رکھتا ہے ان کی دوستی پر، کتنے سال نہیں کہا...... واقعی محبت کرنے والے پاگل ہوتے ہیں۔ میں، آپ اور دوجانہ......" وہ سانس لینے کو رکا پھر کھردرے لہجے میں پکارا۔ "یہاں صدانی انکل جب ان سے کچھ دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ گاڑی بھی میں رکھوں گا۔ کسی کام کے سلسلے میں ضرورت ہو تو بلا لیجیے گا۔"
نانا نے آگے جانے دیا۔ وہ بھی چاہتی تھی کہ وہ اس وقت شہریار کے سامنے جائے۔ اگر غصے میں اس نے اسے کچھ کہا دیا تو؟ اس کی طبیعت سنبھلنے کے بجائے اور بگڑ جاتی تھی۔ اپنا بیگ جازی کو سب بتا کر گیا۔ وہ دن کر رہا تھا لیکن یہاں سوچ رہی تھی۔ وہ مارکا نہیں تھے۔ اس لیے اس نے یہ کام پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھا۔ وہ اندر قدم اٹھاتی اس کے پاس جہاں وہ مدھم کے سامنے آ گئی۔ کچھ ساعت اپنا حلیہ درست کیا، پھر اندر داخل ہوئی۔
شہریار کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ابھی بھی اس کی نبض تھام کر بیٹھی ہوئی تھی۔
"بھائی اب کیسے ہیں؟" اس نے بہت مدھم لہجے میں پوچھا تھا۔ اس کے وجود میں کسمساہٹ ہوئی تھی۔
"پہلے کے مقابلے میں تو ٹھیک ہیں لیکن بلڈ پریشر کنٹرول نہیں ہو رہا۔ ڈاکٹر صدانی نے جو انجکشن تجویز کیا تھا وہ بھی دیا ہے لیکن مریض کسی بھی طرح کا رسپانس نہیں دے رہے۔"

بابا کہتی ہو، تب تک اس کا چہرہ بھیگی رہی۔ گندمی رنگت کتنی جلدی کملا گئی تھی۔ وہ وہ لے سے زبیر کی چھوڑی گئی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ ای سی جی مانیٹر ابھی تک آن تھا۔ کبھی اس کی دھڑکن تیز ہو جاتی، کبھی نارمل...... وہ بہت دیر سے یہ سب ہوتا دیکھ رہی تھی۔ جتنی دعائیں اسے یاد تھیں، اس نے ساری اس پر پڑھ کر پھونک دی تھیں۔ اس کے ہونٹ اب بھی ہل رہے تھے، جب کہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مندی مندی آنکھوں سے اس نے دیکھا اور تیزی سے اٹھنے کی کوشش کی مگر بابا نے اسے روک دیا۔

”آپ لیٹے رہیے۔ ڈاکٹرز نے آپ کو آرام کرنے کو کہا ہے بھائی!“

اس نے خالی الذہنی کی حالت میں اسے دیکھا۔ زخم میں ٹیس اب بھی اٹھ رہی تھی مگر بے ہوشی کی حالت اور تھی۔ ہوش مندی میں اسے اپنی تکلیف کی نمائش کرنا قطعاً ناپسند تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ڈاکٹرز کے چیکنگ کے سامنے خود کو بہت فریش ظاہر کیا تھا مگر جب ڈاکٹر صدیقی کمرے میں داخل ہوئے تو اس کے چہرے پر ایک تناؤ سا آگیا۔

”انکل صدیقی! آپ یہاں؟“ اس نے کف فولڈ کرتے ہوئے انجکشن کے لیے بازو کو تیار کیا۔

ڈاکٹر انجکشن لگا چکے تو مسکرا کر بولے۔ ”مسٹر صدیقی کسی زمانے میں ہمارے استاد رہ چکے ہیں، اس لیے ان کے یہاں آنے پر حیران نہ ہوں۔ مسٹر شہریار، بے شک اگر آپ ٹھیک ویشن نہیں لیتے تو آپ کو ہم نہیں سنبھال سکتے تھے۔ بہت خوش قسمت ہیں، بچ گئے آپ۔“ اس نے کسی بھی قسم کی تشویش کا اظہار نہیں کیا۔

وہاب بھی خاموش تھا۔ ڈاکٹر صدیقی کو کہہ کر بابا نے جو چار بجے سے اب تک کی اس کی ای سی جی اور بلڈ پریشر رپورٹ پڑھ رہے تھے۔

”میں اس وقت بالکل ٹھیک ہوں...... کیا میں گھر جا سکتا ہوں انکل؟“

”گھر؟ ...... وہاں جا کر تم کیا کرو گے؟ میں نے گھر کو یہاں ہسپتال میں بلوا لیا ہے۔ تمہاری گھر سے مراد گھر والے ہیں نا؟“

انہوں نے چہرے سے اسے نظر انداز کرنے کے لیے پن کیا اور وہ بھی سمجھ گیا تھا۔ انہوں نے کچھ نہیں سمجھایا۔

”تم نے کچھ کہا نہیں، تمہیں میرا یہ فیصلہ کیسا لگا؟“

اس نے آنکھیں دیکھا، پھر ہنس کر بولا۔ ”گھر اور گھر والے شاید ان دونوں کا مطلب کسی زبان میں ایک ہوتا ہو گا لیکن میرے لیے یہ صرف میرا کمرہ ہے۔ میرا کمرہ...... خالی اور بری طرح اکیلا......

AANCHAL.COM.PK

ڈاکٹر صمدانی اس کے قریب آگئے پھر محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "آخر تم اتنے زیادہ مایوس کیوں ہو؟...... تمہیں کیوں لگتا ہے، کسی کو تم سے محبت نہیں ہے؟"

اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کو کوئی لہر سی اتری، مگر دوسرے ہی پل اس کی آنکھیں شفاف تھیں۔ شفاف مگر بے تاثر...... ڈاکٹر صمدانی نے اسے پھر سے ٹھہرا تب اس نے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

"حقیقت میں جانتا ہوں وہ بات آپ کچھ دیر بعد جان جائیں گے۔ پھر آپ کو پتہ چل جائے گا محبت کیوں میرے لیے نہیں ہے، میں کیوں سمجھتا ہوں، مجھے سیراب کرنے کے لیے کوئی نہیں آئی گی۔"

کمرے میں اس وقت وہ دونوں ہی تھے۔ دانیہ باہر تھی۔ ڈاکٹرز کے چیک اپ کرنے کی درخواست پر وہ کمرے سے باہر چلی گئی تھی لیکن دس منٹ بعد جب سب ڈاکٹرز باہر آگئے تو وہ ڈاکٹر صمدانی کی موجودگی کے بے شک خیال کر کے اندر داخل ہوئی۔ اس نے ان دونوں کو ایک لمحے سے الجھا ہوا پایا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر صمدانی نے اچانک اس سے پوچھا۔

"تمہارا بی پی اور تمہاری ای سی جی جو یہ بتا رہا ہے شہریار! کیا واقعی تمہیں کبھی انجائنا کی تکلیف ہوئی ہے؟"

شہریار نے چونک کر دانیہ کو دیکھا۔ ڈاکٹر صمدانی کی اس کی طرف پشت تھی اس لیے وہ اس کی طرف سے بے خبر تھے۔ مگر پھر...... دانیہ اس کے پاس تیز قدموں سے پہنچ گئی تھی۔

"انکل! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟...... بھائی! آپ کو یہ تکلیف کب ہوئی، آپ نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔"

شہریار انکار کرنا چاہتا تھا کیونکہ سینے میں اٹھنے والا درد اتنا جان لیوا نہیں ہوتا جتنی تکلیف دانیہ کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ اس کی پریشانی دیکھ کر اس نے ڈاکٹر صمدانی کو شکوے سے دیکھا تھا مگر آج ڈاکٹر صمدانی قطعاً درگزر کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔

"دانیہ! تم اس کی گاڑی سے اس کی دوائیں لے کر آؤ۔ میں بھی تو دیکھوں اس نے اپنے معاملات کس حد تک بگاڑ لیے ہیں۔"

دانیہ کی شکوہ کناں نگاہیں اس کے چہرے پر جم گئی تھیں۔ وہ چلی گئی تھی مگر اسے لگ رہا تھا وہ اب بھی امید و بیم کی کیفیت میں اس کے سامنے کھڑی ہے۔

"آپ کو یہ بات اتنی جلدی آؤٹ نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اگر آپ جان بھی گئے تھے تو کیا یہ ضروری ہے کہ اسے سنسنی خیز بنا کر پیش کیا جاتا۔"

ڈاکٹر صمدانی کچھ نہیں بولے اور وہ یکدم کھڑا ہو گیا۔

"میں اب یہاں سے چلنا چاہتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے مجھے اب مزید کسی ٹریٹمنٹ کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بیڈ سے کھڑا ہوا اور یکدم چلا گیا۔

"تمہیں بھی آرام کی ضرورت ہے شہریار ابراہیم کیوں اپنے دشمن بنے ہوئے ہو؟"

اس نے ان کا ہاتھ اپنے کاندھے سے ہٹایا، پھر تلخی سے بولا "ساری دنیا ہی میرے خلاف ہے، میرے دشمن سے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ میں بھی یہ سلوک خود سے روا رکھتا ہوں۔"

جواب ابھی جواب کرنے والا تھا مگر ماما کی آمد سے ڈاکٹر صمدانی کو جو سہارا ہوا تھا ایک انجکشن کی ٹرے کے سامنے ٹرے میں جا تھا۔ ماما کے ہاتھ خالی تھے۔

"انکل! مجھے بھائی کی گاڑی میں کوئی دوا نہیں ملی۔"

شہریار کے چہرے پر سکون آ گیا۔ ماما نے اب بتانا لگا تھا کہ اس کی دوا کی ضرورت پڑ گئی تو وہ دوا اس نے استعمال کے بعد اپنے ہی کوٹ میں ڈال دی تھی جو ڈاکٹر کے کمرے میں پڑا تھا۔

"مجھے لگتا ہے۔" اس نے موضوع اور حالات سازگار دیکھ کر تمہید باندھی، پھر سنجیدگی سے بولا "مجھے لگتا ہے انکل صمدانی کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے ماما! بھلا مجھے کیسا ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے؟" اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر مشفقانہ انداز میں دیکھا پھر دور کھڑی ہونے والی اس کی ماں کو دیکھ کر کہا "پلیز آپ پریشان ہونے کا کوئی وقت یا تمہارے جانے دینا کو اس تمہیں سب راجر انہوں نے اطلاع دی۔ راجر تمہارے ساتھ نہیں بیٹھنے لگے۔

مگر ڈاکٹر صمدانی خاموشی سے جس طرح اس کا جائزہ لے رہے تھے اس سے اسے الجھن ہونے لگی تھی۔

"اب کیا آپ مجھے بیمار کر کے ہی چھوڑیں گے؟"

بولتے ہوئے اسے لگا کہیں کوئی نمی اٹھی تھی۔ ڈاکٹر صمدانی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے اس لئے اس درد کو پڑھ گئے اس کی تکلیف انہوں نے واضح اس کی آنکھوں میں پڑھ لی تھی۔

"شہریار ابراہیم اس وقت تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ میں ڈاکٹر سہیل کو بلا کر حاذق کو اس کے ٹیسٹ بھیج کر اس کی دوائیں کلیکٹ کرواتا ہوں۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں انکل!"

"بکواس بند کرو اور لیٹ جاؤ ابراہیم۔" انہوں نے اس بار اسے زبردستی لٹا دیا اور ان کی ماما جو دروازہ پر ہی کھڑی تھیں شرٹ کے بٹن بھی کھول دیے گئے تھے اور ماما کی آنکھیں خوف سے پھٹنے لگی تھیں کیونکہ اب شہریار عبدالرحمن کو سانس لینے میں دقت ہونے لگی تھی۔

AANCHAL.COM.PK

دفتر پہ واپس ہوتی باہر نکل گئی تھی اور گاڑی کا دروازہ پوری قوت سے بند کیا تھا۔ جازی نے پانچ بجے سگنل پہ دروازہ کھولا تھا۔ پھر اس کے چہرے پہ رونق دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"کیا ہوا بجو، پریشان ہے؟ آپ تھوڑی دیر پہلے تو کہہ رہی تھیں بھائی بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں۔"

مانیا اس کو بس دیکھے جا رہی تھی۔

"بجو! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ اس طرح کیوں رو رہی ہیں؟ بھائی تو ٹھیک ہیں؟" ساری خوشی ہوا ہو گئی تھی۔ اس بار اس کی آواز تیز تھی۔ تبھی مانیا نے بے قراری سے کہا۔

"تم فوراً بھائی کے فلیٹ جاؤ۔ ان کی چیزوں میں کہیں بھی دوا ہو تو لا دو۔ وہ دوا کی بوتل ملیں تو ان کا ٹیسٹ ضرور کروا لینا۔"

"دوائیں، بھائی کی؟ ...... مگر بھائی کون سی دوائیں استعمال کرتے ہیں؟ ...... ہم نے تو انہیں کبھی بیمار ہوتے نہیں دیکھا۔"

مانیا کو اس وقت ہوش ہی کہاں تھا مگر اتنا مشکل معاملے کی سنگینی ظاہر کرنے کے لیے اسے بتانا ہی پڑا۔

"بھائی نشے کی دوا لیتے رہے ہیں۔ تم سمجھتے ہو ناں اس کا کیا مطلب ہے؟"

جازی کی آنکھیں پھیل گئیں وہ سب حیرت سے دیکھنے لگا۔ اسٹیئرنگ پہ اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ "تم یہ مت سوچو ابھی بجو! آپ بھائی کے پاس جاؤ۔"

"گاڑی احتیاط سے چلانا جازی!"

اس نے سر ہلا کر گاڑی اسٹارٹ کر دی اور وہ گیٹ سے نکلتے ہوئے اسے دیکھے بغیر واپس اندر چلی گئی۔ ذرا سی دیر میں کمرے کے باہر ایمرجنسی لگ گئی تھی۔ اس نے دروازہ ناک کیا۔ ڈاکٹر صمدانی ڈاکٹر نبیل کے ساتھ مشورہ کرنے میں مصروف تھے اور شہریار کو ٹریٹمنٹ دی جا رہی تھی۔

"جازی کہاں ہے؟" ڈاکٹر صمدانی نے اسے دیکھ کر سوال کیا۔

"وہ بھائی کی دوا لینے گیا ہے۔" اس نے شہریار کے قریب ہونے کی کوشش کی اور ڈاکٹر صمدانی تشویش سے بولے۔

"میں نے شہریار سے اس کی دواؤں کے نام لکھوا لیے ہیں اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اسی حساب سے ٹریٹمنٹ دے رہا ہوں۔" لمحے بھر رک کے وہ تاسف سے بولے۔ "ایم ڈی کے نے بتایا کہ

بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ دانیہ! بس دعا کرو میری مسیحائی کام آ جائے ورنہ......"

"ورنہ کیا انکل؟" وہ رونے کو بالکل تیار بیٹھی تھی جب انہوں نے اس کی ڈھارس بندھانے کو پوچھا۔

"یہ عبدالرحمن تمہارے ماما اور گھر کا کوئی بھی فرد ابھی تک ہسپتال نہیں آیا۔ فون کیے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا ہے۔ تم پتہ کرو کیا بات ہے؟"

وہ جانا نہیں چاہتی تھی لیکن پھر بھی ڈاکٹرز روم کے ٹیلی فون سے گھر رابطہ کیا۔

"کہاں سے بول رہی ہو تم؟" فون ماما نے اٹھایا تھا۔

"میں لائف کیئر ہسپتال سے بول رہی ہوں ماما! یہاں شہری بھائی ایڈمٹ ہیں۔"

"تم گھر کب تک آ جاؤ گی؟" ماما نے بنا کسی تشویش کے صرف اس کے آنے کے لیے پوچھا تو دانیہ کو

اسے عجیب سا لگا لیکن دل کڑا کر کے بولی۔ "پاپا، ماما اور بھائی، کیا کوئی بھی ہسپتال کے لیے روانہ نہیں ہوا؟"

"نہیں۔ تمہارے پاپا سو رہے ہیں۔ رات کو کافی دیر تک انہوں نے شہریار کا انتظار کیا تھا اس لیے میں نے انہیں جلدی جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ ابھی تک اٹھے نہیں ہیں۔ رہا ساحر! تو تم جانتی ہو اسے مجھ سے یا پھر ماں سے کسی بھی فرد کو شہریار کی فکر ہو بھی، اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کا دل چاہا دانیہ کسی کے کندھے سے سر ٹکا کر رو دے۔ شہریار جس کے کاندھے سے سر ٹکا کر رو سکتی تھی وہ خود بستر پر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ کمرہ نمبر 34 کے سامنے بے حد غم سے کھڑے شہریار کی طرف مڑی تو وہ واپس کمرے کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھی۔

اس وقت ڈاکٹر عثمان کے چہرے پر پہلے کے مقابلے میں کچھ تشویش تھی مگر معاملہ خطرناک نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے شہریار کے بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

شہریار نے دانیہ کے ہاتھ کو چھونے کی کوشش کی اور آنکھیں کھول دی تھیں۔ "پاگل لڑکی! زندہ ہوں۔ کیا اس بات پر اتنی فکر مند ہو رہی ہو؟"

"شہری بھائی! آپ...... آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں ناں۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں شہریار! یہ تو بس انکل صمدانی ہیں، کہتی اور ڈاکٹری تیمی چلی تو مجھے ہی تختۂ مشق بنالیا ہے انہوں نے۔"

"آپ اتنی خاموشی سے اتنی بڑی بیماری سنبھالے رہے اور ہمیں پتا ہی نہیں چلا ماما بہت پریشان ہیں بھائی ابہت زیادہ......" وہ اس کے ہاتھ پر سر رکھ کر رونے لگی۔

شہریار نے بائیں ہاتھ سے اس کے بالوں کو ہولے سے چھوا پھر گہری ہوتی چھوٹی سی لٹ کھینچ کر بھولی ہوئی سانسوں میں بولا۔

"پاگل لڑکی! شہریار تمہاری اور جازی کی محبت ہی میں تو زندہ ہے۔ میں کہیں بھی رہوں، مجھے معلوم ہے تم اور جازی میرا انتظار ضرور کررہے ہو گے۔ اس بھرے پرے شہر میں اکیلے دل کے لیے یہ سہارے کم تو نہیں دانیا! مائی سویٹ سسٹر! تم جانتی ہی نہیں ہو تم اور جازی میرے لیے کیا ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جس دن تم دونوں بھی مجھ سے بدل گئے، میں شہریار دنیا چھوڑ دوں گا لیکن آئی پرامس جس دن ایسا ہوا تم مجھے اس دن کے بعد زندہ نہیں دیکھو گی۔"

"چھن چھناک......" تیز آواز پر اس نے سر موڑ کر دیکھا جازی خالی ہاتھ کھڑا تھا اس کے قدموں میں دوا کی بوتل ٹوٹی پڑی تھی۔ سفید ماربل کے فرش پر سرخ رنگ کی لکیریں عجیب تاثر دے رہی تھیں۔

"لو آ گئے ایک اور شہزادے صاحب۔ اب مجھے ان کا دماغ بھی درست کرنا پڑے گا۔" تقاضا کرتے کرتے اس نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ "انکل صمدانی......!" وہ تکلیف سے پکارا۔

ڈاکٹر صمدانی جو کرسی پر بیٹھے اس کی ایمرجنسی میں دی گئی رپورٹس دیکھ رہے تھے اس کی آواز پر گھبرا کر اٹھے۔

"کیا ہوا؟ تم ٹھیک تو ہو؟"

اس نے کچھ نہیں کہا۔ دانیا اور جازی کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں مانیٹر شور کرنے لگا۔ وہ دونوں ہولتے ہو کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔ ڈاکٹر سہیل اور ڈاکٹر صمدانی نے انجکشن سے اس کی دل کی دھڑکن کو متوازن کرنے کے لیے مصروف عمل ہو گئے تھے۔ فوری طور پر اسے آکسیجن دے دی گئی تھی۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ دانیا اور جازی ایک کونے میں کھڑے اسے جان کنی سے دیکھے جا رہے تھے۔

"بھیا! بھائی کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ تو ہمیشہ سے اسٹرونگ مین تھے۔ انہیں تو کبھی کھانسی بھی نہیں ہوئی پھر......؟"

دانیا نے اس کا ہاتھ تھام کر ہولے سے تھپتھپایا۔ "بی بریو! بھائی کو کچھ نہیں ہوگا۔"

وہ موبائل لے کر باہر نکل گئی تھی۔ پھر اس نے نمبر ڈائل کیا تھا۔ موبائل آف ریسپونس دے رہا تھا۔ اس نے گھر کا نمبر ڈائل کیا مگر وہاں سے بھی کسی نے نہیں اٹھایا۔ دس بار وہ نمبر ملا کر دس تنگ آکر کے

AANCHAL.COM.PK

جب اس نے پھر ملایا تو ماما نے فون آف کر دیا۔ اس نے غصے سے پھر موبائل ملانا کیا، پاپا کا، پھر وہی جواب آیا۔ تب اس نے سالار بھائی کا موبائل ملایا۔ آواز سالار بھائی ہی کی تھی۔ اس نے پہچان کر بلکتے لہجے میں پکارا۔

"بھائی پلیز، وہ روشنی اپنی جگہ لیکن آپ پاپا کو کہیے، میرا فون اٹینڈ کریں۔ میں اس وقت ہسپتال سے بول رہی ہوں۔"

"ہسپتال میں؟..... تم وہاں کیا کر رہی ہو؟ بھائی بچے تک تو تم گھر میں تھیں۔ میں نے سونے سے پہلے تک تمہارے کمرے کی لائٹ جلتی ہوئی دیکھی تھی۔"

وہ جیسے تیسے کر کے تفصیل بتانے لگی۔ جانتی تھی، سالار بھائی کا اس میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہوگا لیکن وہ جانتی تھی، سالار بھائی خاندان میں ماما کی طرح انتہا پسند نہیں تھے اور یہ بات کچھ دیر بعد ثابت بھی ہو گئی، جب آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں پاپا اپنی گاڑی میں ہسپتال پہنچے۔ سالار بھائی اور ان کی بیوی عائشہ ساتھ تھیں۔ لیکن ماما اب بھی نہیں آئی تھیں۔ سالار بھائی خفگی سے گاڑی میں بیٹھے رہے تھے، صرف پاپا اور عائشہ بھابی ماہا تک پہنچے تھے۔

"شہریار اب کیسا ہے ماہا؟" پاپا نے ہچکچاتے انداز میں پوچھا۔

اس نے صرف اس کی معمولی طبیعت کو بیان کیا تھا لیکن اگر انہیں پتہ چل جاتا وہ اس وقت کس کنڈیشن میں ہے تو..... اس نے انہیں بتا دیا تھا مگر شہریار کے کمرے تک لے جانے سے گریزاں تھی۔

"شہری بھائی کس کمرے میں ہیں ماہا؟" عائشہ بھابی نے فکرمندی سے پوچھا۔ اب کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔ سو وہ انہیں شہریار عبدالرحمن کے کمرے تک لے آئی۔

"بھائی کی طبیعت تھوڑی سی زیادہ اپ سیٹ ہے اور پاپا! آپ کو دیکھ کر وہ بالکل ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ لیکن پلیز! آپ کسی بھی معاملے میں فی الحال بازپرس مت کیجئے گا۔" پاپا نے سوالیہ انداز میں شکایتی نظروں سے اسے دیکھا اور دروازہ ناک کیا۔ دروازہ کھولنے والے ڈاکٹر صمدانی تھے۔

"او ینگ مین! میں تمہارا کب سے انتظار کر رہا تھا تو وہ شاید میں غلط کہہ رہا ہوں، کیونکہ مجھ سے کہیں زیادہ شہریار تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

پاپا اور عائشہ بھابی تیزی سے کمرے میں آئے تو انہیں دیکھ کر جاذب کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ شہریار عبدالرحمن کی طبیعت پہلے سے بہتر تھی مگر وہ ابھی تک سخت صدمے کی زد میں تھا۔

"شہری! تمہیں ہوئے سے اس کے رخسار کو سہلا کر پاپا نے اسے پکارا تو اس نے بیزاری سے آنکھیں کھولیں۔

"پاپا......!" اس نے اٹھنے کی کوشش کرنی چاہی مگر جازی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ ڈال کر اسے اٹھنے نہیں دیا۔

"لیٹے رہیے پاپا...... بڑی مشکل سے تو آپ کی دھڑکن معمول پر آئی ہے اور آپ پھر سے ......؟" وہ رنجیدہ ہو گیا۔

شہریار نے اس کی محبت سے لطف لیتے ہوئے ہنسنے کی کوشش کی مگر کراہنے لگا۔

"مت ہنسیے...... ہم پریشان ہیں پاپا آپ سے......" جازی نے چڑ کر کہا۔

وہ اسے ستانے کو پھر سے ہنسا اور پھر کچھ ساعت بعد بولا۔ "میرا ادارہ اور میرا قلم ہی سب ہے یار۔"

وہ بظاہر دل میں خوفزدہ تھا لیکن طبیعت کے باغی نظریہ اپنی وابستگی کے تحت مصنوعی خوش مزاجی میں اپنا خوف چھپا گیا تھا۔

پاپا اس کا ہاتھ پکڑ کر وہیں بیٹھ گئے تھے۔ اس نے پاپا کی جانب ایک نظر دیکھا پھر عائشہ خانم اور پاپا کو ان کے چہرے سے کچھ مایوس سا ہو گیا۔

"تو مینی بھائی اب بھی نہیں آئے۔ وہ اب بھی ہم سے خفا ہیں۔"

ڈاکٹر صدیقی تیزی سے اس کے قریب آ گئے۔ "ستار صاحب آپ اپنی شخصیت کو اس کا ثابت کرنے کے بجائے اپنی صحت و بہبود کی طرف دیکھئے وہ کہہ گئے؟ تمہیں معلوم ہے ایک بہتر موقع ہے خبر......
اگر وہ اندر سے مطمئن ہے تو میرے خیال میں تمہیں اسے اس لیے کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

پاپا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے تائیدی انداز میں سر ہلایا جیسے وہ ڈاکٹر صدیقی کی ایک ایک بات سے متفق ہوں۔ ان کے انداز میں خفگی نہیں تھی ایک باپ کی محبت تھی اور دعائیں تھیں وہ بھی لگ رہا ہوں اس کے لیے بھی کافی تھا۔ یہ مضبوط ہاتھ اور یہ روشن آنکھیں بچپن ہی سے عبدالرحمن ہاؤس میں لے رکھی تھیں ان آنکھوں میں اگر اعتبار باقی تھا تو دل خوشی تھی وہ اسے کوئی دھکا دے کر اس گھر سے نہیں نکالے گا۔

انسان بھی کتنی اور کیسی روح پھونکی گئی گھر کی چاہ و پناہ رہتی ہے۔ انسان محنت سے دولت سے دنیا سے عالیشان سے عالیشان گھر بنا سکتا ہے لیکن اگر اس کی دہلیز پر کوئی محبت سے آپ کا انتظار کرنے والا ہی نہ ہو تو کیسا گھر کیسی زندگی۔ زندگی تو رشتوں سے مربوط ہے۔ تعلق تو دل کے ہی سچے ہیں...... ہاں یہ بھی درست تھا اس کے معاملے میں یہ تعلق، یہ رشتے کچھ کمزور رہے لیکن وہ بھی وہاں تو نہیں

AANCHAL

تھا ہاں...... اسے لگنے لگا تھا مگر، پاپا کا تعلق نہ صرف بے جوڑ بلکہ بے معنی رشتے اپنا ادا نہیں ہو جتنا کچھ ایسا اختیار بھی نہیں۔
"کیا سوچ رہے ہو؟" پاپا نے جیسے پٹری بدل کر اُسے خاموش دیکھا تو پھر سے متوجہ کیا اور چمکتی ہی ہنسی سے انہیں دیکھتا رہا۔
"سنی بھائی ملنے کیوں نہیں آئے؟"
"وہ تو آفس گئے ہوئے ہیں۔" ایک دم عائشہ بھابی کی زبان پھسلی اور پاپا نے تاسف سے دیکھا۔ عائشہ سادہ اور بہت کم دماغ کا استعمال کرتی تھیں۔ مصلحت اور جھوٹ سے بالکل، انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔
بہت بولنے کی عادت ہونے کی وجہ سے ان کا کام خراب کر دیتی تھیں اور ان کی وجہ سے باقی گھر والوں کا بھی......
عائشہ بھابی نے پاپا کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ کچھ غلط ہو گیا ہے۔ وہ بات ان کے قریب کر دی تھی۔ شہریار نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ پہ پیار ڈالتے ہوئے عائشہ بھابی کا سر جھکا ہوا دیکھ لیا تھا، تبھی پاپا نے گلا
کھنکارا، پھر مدھم لہجے میں بولے۔
"وہ بلاوجہ تو نہیں گیا ہوگا آفس میں کوئی بہت اہم میٹنگ ہے جس کی وجہ سے وہ مجھے باہر سے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔"
جنید اور عائشہ بھابی کو پاپا نے دیکھا تو بولیں۔ "پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہ صبح بہت جلدی میں تھے لیکن شام کو چکر لگانے کا کہہ گئے تھے۔"
شہریار نے گہری سانس لی۔ اسے سالار بھائی کی طبیعت اچھی طرح معلوم تھی۔ وہ کسی سے ایک بار تعلق منقطع کر لیتے تو پھر کبھی بات نہیں کرتے تھے۔ پچھلے پانچ سال سے انہوں نے اس سے
سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔ خود سے ہی انہیں تاشب کرنا پڑتا تھا اور اس وقت پاپا کہہ رہے تھے وہ آئے ہیں اور عائشہ بھابی کہہ رہی تھیں وہ شام کو آنے کا کہہ گئے ہیں......
جلد ہی اسے اپنی حماقت پہ ہنسی آنے لگی۔ لوگ تو اس سے کنارہ کشی کے لئے بہانہ ڈھونڈنا بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے...... اس نے پاپا کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا پھر کرب چھپا کر مسکراہٹ ہونٹوں پہ
سجا کر بولا۔
"آپ بہت معصوم ہیں پاپا! جو سمجھتے ہیں میں بہلاووں میں آ سکتا ہوں..... سالار بھائی مجھے یقین ہے آپ کی ساری زندگی میں مجھ سے ملنا بھی نہیں آئے گا۔"
عائشہ سالار شرمندہ ہو گئیں۔ وہ اپنی آنکھوں میں نمی چھپا گئیں کہ کوئی تو تھی جو اپنے آپ کا کیا ہوا ہونے کو شرمندگی سے کہتا ہے شہریار نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن وہ شرمندگی میں بہت سے تنہائی کا درد سے سکا

تھا اس نے دے لیا تھا اور حیرت انگیز طور پر اس لمحے اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب بھی نہیں ہوئی تھی۔ پاپا انابیہ حازق بھی میرے کے ناگن کی طرح اس کی مٹھی میں تھے۔ جس دن یہ ناگن چھوٹے گی پھر وہ سوچتا بھی کہ اور زندگی کیا ہے۔ زندگی کو ایک ہی ٹھوکر سے موت کی سنگلاخ چٹانوں سے نیچے دھکیل کر فنا کر ڈالتا ہے......

وہ سوچے جا رہا تھا اور پاپا اُسے پریشانی سے دیکھے جا رہے تھے۔ وہ کتنا کھویا تھا اور اسی کھوئے پن نے تو اُسے اس حال کو پہنچایا تھا۔

وہ چاروں اس کے دل کی حالت سے بے پروا اس سے اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھے اور دوسری طرف سالار عبدالرحمٰن تھے، جو گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بور ہونے لگے تھے۔

آخر معاملہ کیا ہے؟ اُسے دیکھنے گئے ہیں یا وہیں قیام کا ارادہ کر لیا ہے؟...... انہوں نے کچھ سوچا اور گاڑی سے باہر آ کر مسلسل بیٹھے رہنے سے قدرے سن اعضا کو حرکت دینے لگے۔ کچھ اطمینان محسوس کیا تو اردگرد کا جائزہ لینے لگے۔

ان کی پشت کار کے فرنٹ ڈور سے لگی ہوئی تھی اس لئے انہیں احساس نہیں ہوا مگر یکایک ایک تیز خوشبو کے ذریعے ان کے اندر پہنچی تو کہیں اندر ہلچل محسوس ہوئی۔ بظاہر تو یہ خوشبو کسی کی بھی لگ سکتی تھی لیکن جس طرح ان کے دل کی دھڑکن نے اپنی تال بدلی تھی، اس نے انہیں باور کروا دیا تھا کہ وہ دشمنِ جاں کہیں قریب ہی ہے......

انہوں نے دیوانوں کی طرح چاروں طرف دیکھا اور وہ کوشش کے بعد نظر آ گئی۔ بلیو جینز اور ڈارک بلیو شرٹ پہنے، بوائے کٹ بالوں کو جھلاتی وہ اندرونی دروازے کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اور بس پھر انہیں خود پر اختیار رہنا ہی کیسے ممکن تھا؟ اُسے دیکھ کر وہ وقت، حالات، اپنی شخصیت سب کچھ بھول جایا کرتے تھے۔ شہریار ہونے والے انداز میں اس کے پیچھے بھاگے تھے۔ لیکن اس کے قریب ہونے والے تھے کہ بجلی کے کوندے کی طرح ان کے دل میں خیال آیا شہریار ہسپتال میں تھا اور جانان یہاں موجود تھی...... تو کیا آج بھی شہریار کے لئے وہ اسی طرح جذباتی لگاؤ سے سوچتی ہے......؟ وہ اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر اُسے دیکھنے آئی ہے شاید...... شہریار عبدالرحمٰن کو؟

❁❁❁

یکدم پانچ سالہ پرانی رقابت پھر سے چنگاری کی طرح راکھ میں سے اُبھری اور ان کے تن من دل کو جلا کر خاکستر کر گئی۔ مگر اس کے باوجود اسے قریب سے دیکھنے کی تمنا میں وہ دھیرے دھیرے چلتے گئے۔ یہ اور بات کہ وہ جانتے تھے، پبلک پلیس میں جانان سے گفتگو کے خاطر خواہ جواب کا مطلب ہے اپنی شخصیت کا تماشہ بنا لینا۔ سو وہ اسے قریب سے محسوس کرنا چاہتے تھے لیکن اس سے ان کا ٹکراؤ بھی ہو اس

نیا نشہ تھا انہوں نے دبا لیا تھا۔

وہ واپس چلتی ہوئی چیا جی تنی شہریار کے روم والی کوریڈور میں چلنے لگی۔ مگر وہ روم نمبر 13 کے بجائے روم نمبر 17 کے آگے جا کر رک گئی تھی۔

اس روم میں کون ہو سکتا ہے......؟

وہ کچھ سوچ میں لگ گئے۔ جانے سے متعلق کوئی تجسس آمیز پہلو منتظر ہے کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنی مصروفیات کو اہمیت دے؟ وہ وہیں رک کر کسی نرس کا انتظار کرنے لگے۔ جب تک بہتر انہیں اس کمرے میں ٹھہرے مریض کا کرنے والی نرس کا پتہ چل گیا۔ وہ عام انداز میں نرس کے سامنے جا کر بولے، اس وقت وہ اپنی ساتھی نرس کے ساتھ چائے پینے میں مصروف تھے۔

"جی فرمائیے میڈم! ہم آپ کے لیے کیا خدمت انجام دے سکتے ہیں؟"

سالار عبدالرحمٰن نے سر سے پیر تک انہیں دیکھا پھر متوجہ ہوئے۔

"یہ وی آئی پی رومز کو لک آفٹر کرنے والے صاحب کون ہوتے ہیں؟"

انہوں نے ذہن پر زور دیا جیسے اچانک وہ نام بھول گئے ہوں۔ دونوں لڑکیاں انہیں حیرت سے دیکھنے لگیں، پھر وہاں کی جو روم نمبر 17 سے نکلی تھی، ہمدردی کے خیال سے فوراً بولی۔

"شاید آپ مسٹر اکرم رانجھا کا نام لینا چاہ رہے ہیں۔ جی ہاں سر! ان وی آئی پی رومز کو وہی لک آفٹر کرتے ہیں۔"

سالار عبدالرحمٰن سر ہلا کر یوں دیکھنے لگے جیسے وہ کسی جواب کے منتظر تھے مگر ابھی ان کی پشت ہوتے ہی ان دونوں نے اپنے کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ وہ پھر سے مڑے۔

"کیا آپ روم نمبر 17 میرے دوست کے لیے سیٹ کر سکتی ہیں؟...... دراصل وہ دل کا مریض ہے اس لیے وہ کچھ دن ہر طرف سے دور ہو کر آرام کرنا چاہتا ہے۔"

"آرام...... اور وہ بھی یہاں میں؟"

"کیوں، کیا یہاں کسی اور کا! آپ حیران ہو رہی ہیں؟" انہوں نے یہ کوشش نام اگلوانے کے لیے کی تھی کہ روم نمبر 17 میں ٹھہرے مریض کی شخصیت جان جائیں۔ نرس اسپتال اور آرام کا کیا تعلق ڈھونڈنے لگی تھی انہیں کنفیوز ہونے لگی تھی، جب انہوں نے سمجھایا۔

"کبھی کبھی ڈپریشن میں آرام ضروری ہوتا ہے اگر یہ ڈپریشن کام کی زیادتی سے پیدا ہو۔ اگر نہ ضروری ہے کہ ڈپریشن میں انسان جتنا مصروف رہ سکتا ہے مصروف رہے۔ آپ کے خیال میں آپ کے دوست ڈپریشن کی کس کیفیت سے تعلق رکھتے ہیں؟"

وہ کافی بہت باذوق تھی۔ لیکن یہاں کی شہر کا تقاضا تھا۔ ابھی وہ مشکل سے انیس سال کی تھی اور اس عمر میں انسان ذہین بھی ہو تو اس سے ملازموں سے باتیں کرنے کا اتنا شوق نہیں ہوتا ہے کہ پھر جہاں ایک جملے سے بات ختم ہو سکتی ہے وہاں پر دلچسپی آنی کافی لگتی ہے۔

"آپ نے روم نمبر 17 کے متعلق نہیں بتایا۔ کیا وہ روم میرے دوست کو مل سکتا ہے؟" انہوں نے جھنجھلا کر اسے بحث سے اپنے مطلب کی بات کی طرف لانے کی کوشش کی۔ مگر وہ خاموش رہی اور دوسری طرف آسیہ عظیم ہمسائیت سے مخاطب ہوئی۔

"نہیں روم نمبر 17 آپ کو دینے میں کوئی دلچسپی نہیں تھا مگر لیکن یہ روم پہلے سے ہی کسی کے پاس موجود ہے۔"

"پہلے سے ہی کسی کے پاس موجود ہے...... لیکن کیا میں جان سکتا ہوں وہ کون صاحب ہیں؟"

"سوری سر! یہ ہمارے رولز کے خلاف ہے۔ آپ خود سوچیے اگر کوئی شخص یہاں آپ کے دوست کی طرح آ جائے اور ہم ہر کسی کو اس کی بابت بتانے لگ جائیں تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں، ہمارے کلائنٹس ہمارے متعلق کیا رائے رکھیں گے۔"

انہوں نے واضح ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ جہاں وہ اپنے جذبات کو چھپا نہیں پائے تھے۔ وہ واقعی بہت جذباتی تھے۔

نمی اسما نے کاروباری انداز میں انہیں پھر سے مخاطب کیا۔ "اگر آپ چاہیں سر! تو روم نمبر 13 ابھی بھی خالی ہے۔ ہم یہ روم آپ کے دوست کے لیے بک کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے...... اسے 13 نمبر کا ہندسہ خاصا ناپسند نہیں ہے، چلو ٹھیک ہے آپ سے خوب ملاقات رہی۔ میں اب چلتا ہوں۔" انہوں نے کاؤنٹر پر رکھی اپنی گاڑی کی چابیاں اٹھائیں اور مناسب قدموں سے چلتے ہوئے روم نمبر 15 پہ جا کر رک گئے تھے۔

"مجھے اندر سے جلن ہو رہی ہے......" انہوں نے خود کو تسلی دی۔ حالانکہ وہ اندر سے کافی چیخ چیخ کر انہیں مجبور کر رہا تھا کہ وہ ایک نظر ہی سہی پلٹ کر دیکھتے ہوئے جلیں۔ کوئی بھی خوشی نہیں جیسے مرنے کے لیے...

جتنے بھی ناطے توڑ دئے گئے ہیں، کیا ہوا اگر وہ یہاں تک آ گئے ہیں تو شہریار عبدالرحمن سے بھی مل لیں۔

وہ مٹھیاں کھولتے بند کرتے رہے مگر دماغ سے دل نہیں جیت سکا۔ تب انہوں نے موبائل پہ پاپا کو نمبر ڈائل کیا تھا۔

کمرے کے اندر بیٹھے پاپا نے کوٹ کی جیب میں بجتا موبائل ہاتھ میں لیا۔ شہریار ان کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا اس لئے بیل کے بعد نام پڑھ کر جو تاثر پاپا کے چہرے پہ ابھرا اس نے اسے یہ باور کروانے میں تامل نہیں کیا کہ دوسری طرف سالار عبدالرحمن کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

"پاپا مجھے دیں گے اپنا موبائل؟" اس نے ہاتھ پھیلایا۔ پاپا نے شہریار کی حالت پیش نظر رکھ کر دیکھا وہ بچگی سی مسکراہٹ "بیٹھ جاؤ پلیز۔ کوئی جھگڑا نہیں کیا ان سے۔ بس یوں ہی ذرا بات پوچھوں گا۔"

پاپا نے اس کی بیکلی دیکھی تو بنا کچھ کہے سیل فون دے دیا۔ تب تک موبائل بج بج کر بند ہو گیا تھا۔ شہریار نے سالار عبدالرحمن کا نمبر پش کیا۔ دوسری طرف نمبر فوراً ہی پک ہوا۔ انہوں نے کال ریسیو کی اور چھوٹتے ہی بولے۔

"کیا ہے پاپا! آپ نے میری کال کیوں نہیں ریسیو کی؟ بتائیے آپ کا آفس کا ارادہ ہے یا سوئٹزرلینڈ میں ہی وقت ضائع کریں گے؟"

شہریار کے چہرے پہ ایک سایہ سا آ کر گزر گیا، پھر اس نے کھنکھار کے کہا۔

"آپ بے فکر رہئیے۔ پاپا کا کبھی وقت میں فضول ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ لیکن یہ بتائیے آپ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟" اس نے دوستانہ انداز اپنایا تھا مگر انہیں اس کی آواز کیوں چبھنے لگی تھی۔ تھے۔ ان کا خیال تھا اس نے صرف گل کے معاملے کو بنانے کے لئے ہسپتال ضروری روکی تھی۔ ان کا خیال تھا دنیا جہان کے بعد بس شہریار کوشش کر رہا ہے کہ ان کی جان نہیں چھوڑ رہی۔

"کیا ہوا بھائی! کہاں گم ہیں؟ کہیں مجھ پہ چیز تو نہیں پہنچنے والے؟" شہریار نے دوبارہ کسمسایا تو وہ کھردرے لہجے میں پکارے۔

"میرے پاس فرصت بہت کم ہوتی ہے شہریار! پلیز فون پاپا کو دو۔ مجھے تم سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس بتا دو تم میرے لئے صرف ایک مذاق ثابت ہو گے اور کچھ نہیں۔"

شہریار نے گہری سانس لے کر سیل فون پاپا کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے چہرے کے تاثر بتا رہے تھے کہ گفتگو کا اختتام بہت برے موڑ پہ ہوا ہے۔

عائشہ بھابی اپنے شوہر کا مزاج جانتی تھیں اور دونوں کے درمیان کا جھگڑا بھی۔ سو شہریار کو کال ہونے کے بعد سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر ممتا بھرے انداز میں بولیں۔ "تم اپنے بابا کا مزاج جانتے ہو۔ پھر ان کی باتوں کو دل پہ کیوں لیتے ہو؟"

"ارے کہاں بھائی! مجھے کیا ضرورت ہے دل ہارنے کی؟...... اگر نہیں جانتا ہوتا کہ وہ مجھ سے دل ہی دل میں کتنی محبت کرتے ہیں تو یقیناً دل افسردہ کرتا۔ یہ تو بس یونہی جو لگ رہے ہیں اگر ایسا ہوتا تو
تو آپ کے چہرے پر اس طرح کی مسکراہٹ آسانی سے دیکھنے کو ملتی؟"

وہ جھوٹ پہ جھوٹ بولے جا رہا تھا۔ ایک دو بار ماہنور نے شور بھی کیا تھا اسے ٹوکنے کے لئے مگر پھر بہت جلد اس نے خود کو سنبھال لیا۔

پاپا اور ماہنور بھائی اسے خدا حافظ کہہ کر جا چکے تھے۔ ماہا کرسی پر آکر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر بہت سنجیدگی تھی۔ اس نے اس کی ہتھیلی اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے دیکھا۔

"بی بی کیا ہوا؟ کچھ نہیں ہوا مجھے۔ ابھی شکل بنا کر رکھو گی تو ٹھیک ہونے کو میرا دل ہی نہیں چاہے گا۔ ہنسا کرو بی! تمہاری مسکراہٹ تو ہر غم کے سامنے سایہ ہے۔ کیا تم مجھے ہارتے دیکھنا چاہتی ہو؟" اس نے
گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

جازی نے اس کی طبیعت کے پیش نظر بھی تو گھر جانے کے بہانے ڈھونڈنے لگا۔ شہریار نے بچ بچا کر اس کا خاموشی سے جائزہ لیا پھر ہنس پڑا۔

"تم بھی گئے ہاتھ سے میرے۔ تمہیں چھوڑو، پہلے صرف گمان تھا مگر اب تمہاری آنکھیں پڑھ کر یقین ہو گیا ہے کہ صاحب بہت ہی میرے ہیں۔"

"نہیں تو بھئی جان! آپ کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔ ویسا کوئی بات نہیں۔"

شہریار نے جان کر اس کی بات پر زور نہیں دیا، ماہنور بھائی کے خوف سے دل کو بچتے دیکھا مگر ہنس کر رہ گیا۔ "اچھا! تمہیں آج کالج کے لئے دیر ہو گئی ہے۔ تم گھر جاؤ۔ جلدی جانے کی تیاری بھی تو کرنا ہے۔"

"نہیں بھائی! آج مجھے کہیں نہیں جانا۔ میں دو تین دن کی چھٹی کر لوں گی۔ آپ کے پاس بھی تو کسی کو رہنا چاہئے ناں۔"

اس نے اس کی ملازمت کا سوچ کر دیکھا وہ جیسے سمجھ کر بولا۔

"ٹھیک ہے کالج نہیں جانا تو ٹھیک ہے گھر جا کر آرام کرو۔ ساری رات سے جاگ رہی ہو۔ مجھے پہلے یہ خیال نہیں آیا۔ سوری گڑیا تم جازی کے ساتھ گھر جاؤ۔ میں بالکل ٹھیک ہوں پھر بھی اگر کسی قسم
کی ضرورت ہوئی تو انکل صدانی تو ہیں ناں یہاں۔ تم شام کو پھر آ جانا۔"

وہ بات بالکل ماننا نہیں چاہتی تھی مگر اس نے اتنا زور دیا تھا کہ اسے اور جازی کو گھر کے لئے روانہ ہونا ہی پڑا۔

کار دانیا ڈرائیو کر رہی تھی اور جازی اُس کے برابر میں بیٹھا جمائیاں لے رہا تھا۔ بہت خاموشی سے کٹ رہا تھا اُن کا سفر کہ اُس نے دانیا کو مخاطب کیا۔

"پھوپھو! کیا آپ بھائی سے پھر ناراض ہو گئی ہیں؟"

دانیا نے پُرسوچ انداز میں اُسے دیکھا۔ وہ کچھ نہیں بولی اور سنجیدہ نظر آنے لگی۔

"بھائی جان بیمار ہو جاتے ہیں تو میں بتاؤں میں اُن سے کتنا خفا ہوں۔ فی الحال تو مجبوری ہے۔"

دانیا نے اُسے غور سے دیکھا اور سوچا...... محبت اختیاری جذبہ ہے ہی کب... یہ تو بس ہو جاتی ہے بتائے بنا...... مجبوری کی کوئی زنجیر محبت کو نہیں باندھ سکتی۔ دل مجبوری کو مانتا ہی کب ہے۔ لیکن شہریار عبدالرحمٰن کے معاملے میں ساری خفگی، ساری ناراضگی کے باوجود وہ پیار وہ محبت آمیز رویہ رکھنے پر مجبور تھی۔ لیکن کیا وہ بہت عرصے تک اُس کی اس مجبوری سے لاعلم رہ سکتا تھا؟..... اُس کے دل پر تو الہام اُترتے تھے۔ مگر وہ کیونکر نہیں پہچان سکتا تھا کہ اُس کے سہاروں کا آخری سہارا دانیا عبدالرحمٰن بھی اُس سے چھوٹ رہا ہے......

کار تیز رفتاری سے گھر کی طرف بڑھتی جا رہی تھی اور وقت سا تھم گیا لگ رہا تھا کہ گھٹن سے کہیں زیادہ وہ بہت کی جہاں نہیں اُس پر بھاری ہو جو کسی طرح گھٹتی جا رہی تھی جیسے وہ خاموش سمندر تھی اور محبت بھاری پتھر کی طرح اُس کی گہرائی میں اترتے لگے بے قرار تھی۔ لیکن گھر میں داخل ہوئی تو جس سے سامنا پڑا اُس نے اُس کی آنکھوں میں مروتیں سی بھر دیں۔ وہ چاہتی تھی، ماما اُسے نہ دیکھیں اور وہ چپکے سے اپنے کمرے میں جا کر ساری گھٹن خود پر سے اتار پھینکے مگر بہت سی دعائیں پوری کب ہوتی ہیں۔ ماما نے بس ہلکی سی جھجک میں ہی اور اُسے پکار لیا۔

کہتے ہیں، جنگل ہو یا ویران راستہ، پیچھے سے تمہارا نام لے کر کوئی پکارے تو کبھی پلٹنا نہیں چاہیے انسان پتھر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ زندگی کے اس ویران راستے پر پکار لیا گیا تھا۔ وہ آہستہ سے گھر کے مڑی تاکہ دل یکبارگی رنجیدہ وقت ہو جائے۔ سامنے عزہ کھڑا تھا۔ وہی عزہ، جو بہت پہلے بہت کچھ تھا اُس کا...... اُس کی ... سب سے انمٹ مرتوشی۔ مگر اب......

"تم دونوں بیٹھ کر باتیں کرو، میں تمہارے لئے چائے بھیجتی ہوں۔"

ماما ہمیشہ کی طرح ان دونوں کو اکیلا چھوڑ کر کچن میں چائے کا حکم دینے چلی گئیں۔ اسے ماما کی اس معصوم خوشی چھپانے کی تمنا نے کتنی دیر تک اندر ہی اندر جلتے رہنے پر مجبور کیے رکھا مگر جلنے کے بعد خاموشی نے تو اُس کی آنکھوں اور اُس کے ہونٹوں کو چھوا تو تھی اور حسرت بھری آہ کے سوا نمی کچھ بھی نہیں تھی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ خاموشی سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا، پھر کچھ دیر بعد بولا۔

"تم بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو...... خیریت؟"

اُسے لگا تھا وہ پوچھے گا، آج غیر متوقع طور پر وہ کالج کے بجائے گھر میں کیوں ہے۔ لیکن وہ اس سے زیادہ جانتا تھا، تبھی سوالوں میں اُلجھنے کے بجائے ڈائریکٹ اصل بات کی طرف لوٹ آیا تھا۔

وہ چپ رہی تھی۔ ابھی تک جواب ہنوز حل طلب تھا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے پہلے سوال سے نیا سوال کر ڈالا۔

وہ پھیکی ہنسی سے ہنستے ہوئے بولی۔ "میری طبیعت ٹھیک ہے۔ وہ بس کل اچانک شیری کی بات پر طبیعت بگڑ گئی تھی۔"

حمزہ حامد کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔ جیسے غلطی سے نامعقول ہستی کا ذکر ہو گیا۔ عبدالرحمٰن تھے تو بھی اس سے ناراض تھی مگر کسی اور کا اس طرح اس کے بارے میں جذباتی اظہار کرنا کھلنے لگا تھا۔

"تمہیں کیا ہوا؟ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی کیا؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔

اس نے چپ سے اسے دیکھا، پھر مدھم لہجے میں بولی۔ "تم جانتے ہو شیری بھائی کے لئے کسی کا بھی غلط انداز اپنانے کے علاوہ سیاہ ناراضگی بھی پسند نہیں آتا۔"

"تم!" وہ اسے چبھتے ہوئے انداز میں دیکھتا رہا، پھر یکدم کھڑا ہو گیا۔ لمحہ بھر کو اسے تیز نظروں سے گھورتا رہا، پھر تیز آواز میں بولا۔ "میں سمجھتا تھا ان پانچ سالوں میں تمہیں شہریار کی خود غرضی اور اپنا خیال بنا اتنی اچھی طرح سمجھ آ چکا ہوگا کہ مجھے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہوگی اور تم میرا ساتھ دینے اٹھ کھڑی ہوگی۔ مگر اب تک...... اب بھی تمہیں شہریار عبدالرحمٰن کی ذات عزیز ہے۔ آخر تمہارا پرابلم کیا ہے؟ جب آنٹی انکل راضی ہیں، میں راضی ہوں تو تم خوشی خوشی بن کر میرے گھر کیوں نہیں آ جاتیں؟"

بات وہیں آ کر رک گئی تھی، جہاں وہ چاہتی تھی کہ اب کبھی نہ آئے لیکن جواب لازمی تھا۔ سو وہ جی کڑا کر کے صوفے سے اٹھ گئی، پھر مضبوط لہجے میں بولی۔

"کسی کو اعتراض نہیں، نہ سہی۔ لیکن کسی کے گھر خوشی خوشی بن کر جانے کے لئے خوشیوں بھرا ساگت، دعا ہوتے، دعا بنتے لمحے بھی تو درکار ہوتے ہیں...... میں کیسے ماما کی افسردہ آنکھوں میں خوشی کے استحقاق سے دیکھوں گی؟ چلو آنٹی کو جب جب مجھ سے کلام کرنا پڑے گا، انہیں لگے گا کسی ناتمام دعا سے ان کا گلا چھیل دیا ہے لیکن مستجاب کسی اور کی جھولی میں ڈال دی گئی ہے۔ میں کسی کے دکھ سے خوشی

محفلوں میں میلنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بس سمجھ لو ہم یہاں کمسنی کے ساتھی تھے۔"

حمزہ جاہد مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ چائے کے لیے رکا نہیں تھا۔ ماما نے کچھ دیر بعد ڈرائنگ روم کا چکر لگایا تو اسے مجسمے کی حالت میں یونہی بیٹھا دیکھا۔

"کوئی بات ہوئی پاپا؟"

وہ جو کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے اسے تنہا کر رہی تھیں، وہ آج ہمیشہ کی طرح اپنے سوال کے بعد اس کی خاموشی سے افسوس کے پھول چن رہی تھیں۔ افسوس کے پھول...... زرد بے حد زرد......

اس میں ان کا سامنا کرنے کی بھی ہمت نہیں تھی اور ماما شہریار عبدالرحمٰن کی بے بسی پہ اشکبار ہی تھیں۔

"نہ جانے کون۔ منحوس گھڑی تھا، جب وہ اس گھر میں آیا۔ یہ گھر اس کی نحوست سے اجڑ گیا ہے۔ میں مجبور ہوں مگر تمہارے پاپا کی آنکھوں پہ اس کی محبت کی جو پٹی بندھ گئی ہے، وہ اترتی ہی نہیں ہے۔ پتہ نہیں، کیا جادو کر کے چھوڑا ہے اس نے ان پہ۔ میرے کہنے میں تو آتے ہی نہیں سارا تم...... تم ہی اچھے ہاں کی ایک ہو۔ دوسروں کی خوشیوں کے لیے اپنی زندگی برباد کرنے میں بھی تمہیں کوئی عار نہیں۔"

وہ کیا کہتی، کان دبا کر سنتی رہی۔ یہ اور بات کہ جب رات گئے شہریار عبدالرحمٰن نے تنہائی سے گھبرا کر اس کے سیل پر فون کیا تو وہ خود کو اس سے بات کرنے کے لیے راضی نہیں کر سکی۔ مصلحت اندیشی کے تحت اس نے ہسپتال جانے کے لیے شام کو تیاری بھی کی تھی مگر پھر سوپ اور کھانا اس نے ڈرائیور کے ہاتھ ہسپتال بھجوا کر گھر میں بند کر لیا تھا۔

جاری بھی پہلے جیسے موڈ میں واپس آ چکا تھا اس لیے اس نے بھی ہسپتال کی طرف رخ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پاپا تو وہ دفتر سے آتی رات گئے فارغ ہوتے تھے کہ صرف ہیلو ہائے کر کے گھر چلے آتے تھے۔ وہ رکنا چاہتے تھے مگر شہریار عبدالرحمٰن نے انہیں زبردستی گھر بھیج دیا تھا۔ لیکن اس لیے وہ رات کے ڈیڑھ بجے پاپا کو فون کرنے سے خود کو روک نہیں پایا تھا۔

"میں اس لمحے آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے لگتا ہے، اگر آج میں نے اس لمحے آپ سے بات کرنے کی کوشش کی تو شاید ساری زندگی آپ بات کرنے بولنے کی ہمت نہیں کر سکیں گے......"

وہ بہت اٹھی رہی مگر وہ گھنٹی شدت سے بار بار اس کا نمبر پریس کر رہا تھا اس سے الجھن ہونے لگی تھی۔ گھنٹی وہ بیٹھا اس نے انتظار کیا وہ تھک جائے مگر وہ شخص ضدی ہی رہا تو اس نے سیل آف کر دیا۔

آج کی رات وہ صرف خود سے ملنا چاہتی تھی، خود سے...... جہاں صرف وہ ہوتی...... وہ اپنے بیڈ پہ آ کر لیٹ گئی۔ وہ تنہا رہنا چاہتی تھی، لیکن اندر کی دنیا چلتے ہوئے بچے کی طرح اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑا کر پانچ برس پیچھے جا کھڑی ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ کالج اسٹوڈنٹ ہوا کرتی تھی۔

کتنے غضب صورت بن گئے۔ وہ شہریار احمر جاوید، سلامہ ارسلان اور عارف بیگ جن میں رہا جہاں کی انقلابیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور وہ ناکس کے بجائے خم ٹھونک کر کھڑے ہوتے تھے۔
اور شور ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے کھولیں تو منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ ماضی اس کے سامنے فلم کی طرح چل رہا تھا۔

❀❀❀

بابا عبدالرحمن صبح کے چھ بجے اٹھ گئی تھیں۔ یہاں کا روز کا معمول تھا۔ وہ فجر کی نماز کے لیے روز اٹھا کرتی تھیں۔ فجر نماز کے بعد کالج کا کوئی کام ہوتا تو وہ کرتیں نہیں ہوتا تو روز ایک رکعی فجر پڑھتی اور ساڑھے پانچ بجے ان کے قدم کسی کی طرف اٹھتے چلے جاتے۔ جو روزن کی مزم گہا ان پر وہ ننگے پیر چلنے کی خواہش میں بیڈ روم سلیپر پہننے کی زحمت بھی نہیں کرتی تھیں۔ پازیب کی جھنکار ان کی آمد کا اعلان کر دی جاتی اور وہ صبح نیند کے مزے سے ازلی جب انگلی کی بجتی تو وہ اٹھ بیٹھتا تھا۔ جو روز کی طرح آج بھی وہ باہر کھڑی دستک دے رہی تھی مگر جواب ندارد تھا۔
"شہری نماز ادا کر دو کوئی ماں!" اس نے خود کھڑکی سے ہی پکارا۔ تب کہیں دروازہ کھلا تھا مگر شہری عبدالرحمن نہیں سلامہ ارسلان آنکھیں ملتا کھڑا تھا۔ اس نے دو چند دست کیا اور حیرت سے سوال کیا۔
"سلامہ! تم یہاں کیسے پائے جاتے ہو؟"
"وہ بس سلامہ ارسلان کو تو اسوقت وہ جاتے۔ شہری نکا۔ جست سے موڑ نے پاؤں پھار کر لوا۔" وہ وہی سسرا کیا ہے ہوم ورک کہانی اعتذی کر رہے تھے ہاں اس لیے کب آنکھ لگی پتہ ہی نہیں چلا۔
بس جہاں بیٹھے پڑھ رہے تھے وہیں سو گیا۔"
بابا عبدالرحمن نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ سلامہ ارسلان ہو یا عاطف بیگ وہ دونوں تعلیم سے یوں بھاگتے تھے جیسے الیکشن کے بعد عوام سے امیدوار..... سو درست وہ اترائی تھی سانس کی آنکھیں اب بھی اس پر جمی ہوئی تھیں اس لیے وہ کسمسایا تھا۔
"کیا ہے بابا سسرا! تم تو یوں گھور رہی ہو جیسے انویسٹی گیشن افسر ہو۔"
اس نے دو قدم اندر رکھے اور جھک سے اس کا ماتھا اٹھنے لگا۔ سارا کمرہ بستر بیٹ کے کونوں سے بکھرا ہوا تھا۔ سارا کمرہ باہر کی طرف ساری کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں مگر بہر حال کمرے کی گھٹن بدبو سے آرام

سے کمرے سے غائب ہو گئی تھی۔ وہ دو دن سے ...... اس نے اچانک شہریار کا دروازہ کھولا اور شہریار فون بند کر کے دیکھنے لگا۔ ماہ فرشتہ اپنے سامنے میز پر بیٹھے ہوئے اپنی ہمدردی چھپانا چاہتا تھا مگر وہ غم، چھپا نہ پا رہا تھا۔

"ہاہاہا کیا ہے بھئی؟ تم کب سے اس قدر بد تمیز ہو گئی ہو؟ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کسی کے روم میں جانے سے پہلے دروازہ ناک کیا جاتا ہے۔"

"ہاں شاید اسی طرح جس طرح کسی کو کرنے میں کوئی جرم نہیں ہے۔" اس نے نرمی سے دیکھا پھر اس کے سینے پر ہاتھ مار کر اسے دوبارہ لگائی جیسے غصے سے پھنکاری۔ "شہری بھائی! یہ کیا بات اسلام کی ہے یا سگریٹ نوشی کا مقابلہ؟...... وہ ایش ٹرے بھری پڑی ہیں۔ کوئی خوف لگتا ہے آپ کو کیا اتنا کوئی کہاں گیا ہوگا؟"

اس نے مسکین شکل بنائی اور ہے بیٹھا کہ وہ جب غم ہوتی تو اس پہ حاوی ہونے کی کوشش کرتا اور اس کا مزاج گرم ہو جاتا تو مسکین صورت بنا کر اس کی ہمدردی سمیٹنے کی کوشش کرتا۔ شاید وہ اس حربے میں کامیاب بھی ہو جاتا مگر وہ ابھی عبدالرحمٰن کی زیر نظر کتاب اس نے ٹی وی اور لائٹس سمیت اشیا ہی دیکھی مارک کر لیا تھا۔

"اوہ اچھا...... اچھا تو کہا تو اسلام ہو رہی تھی کافی زوروں پہ تعلیم کا حصول۔"

شہریار نے کمرے کے سامان و سامان کو دیکھا۔ یہ سب اس کی شادی کا حصہ تھی مگر یہ معصوم میاں بیوی کب سے گزر رہا تھا لیکن آج تک نہیں پکڑا گیا تھا۔ جب جب یہ شوق پڑتا تو وہ دروازہ لاک کر دیا کرتا تھا۔ سگریٹ نوشی بھی ہمیشہ یہ ہی کرتا تھا لیکن کل ہی اچانک ماما سامان نے اسے احساس دلایا اور آخر شہزادی میں آ گیا ہے۔ بقول ان کے جوان ہو گیا ہے اس لئے اتنی تو ان کی ... کرنے کی جسارت تو ماننی ہی چاہئے۔ لیکن یہ کل کی ہمت اس کی آج کی حالت نے واضح کر دی تھی۔

"بھائی! آپ بول کیوں نہیں رہے ہیں؟ یہ خطرناک مشاغل ہیں آپ کے۔"

پولیس افسر اندازہ تھا اس کا۔ رواں ہو ہو یہ بڑی کو گرا کر سے کے سوا کچھ نہیں تھی اس لئے اس نے فوراً اسے کندھوں سے پکڑ کر بیٹھا یا مجرمانہ ہچکچاہٹ سے بولا۔

"ہاہاہا یار یہ کبھی کبھی ہو جاتی ہے بس غلطی۔"

"غلطی...... تو آپ اسے غلطی سمجھتے ہیں؟ یعنی آپ اسے پھر کبھی نہیں دہرائیں گے؟"

واضح اشارہ تھا۔ گو بیت ذیشان کی طرف تھا اور شہریار جان کی میں لٹک گیا۔ کیونکہ وہ جو وعدہ بھی کر سکتا تھا لیکن اس ضمیر کا ایسا پکا تھا کہ سارے عہد سے وفا کرنے کی نیت سے کرتا تھا اور ابھی چپ تھی کہ بہت کم وعدے کرتا تھا۔

بابا نے والدہ دیکھ رہی تھی۔ تب اس نے گلا کھنکھار کے کہا۔ ”تم جانتی ہو بابا اس میں جھوٹ نہیں بولا۔“ مجبوری بتا کر سر جھکا لیا۔

سالار ارمان پڑ کر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ شہریار نے پریشانی سے بولا۔ ”بابا! کیوں تم سمجھتی ہو کہ شہریار کے بیرا ٹھے وہ سے کی ذمہ داری تم پر ہے؟ آخر آن مسز اماں اب تو سمجھے ہیں۔ کہا ما ہے شہریار اگر تھوڑی سی اپنی مرضی کر لیتے ہیں؟“

”آپ کے لئے نہیں ہوگا جس میں شہریار بھائی کی تباہی کی طرف نہیں جاتا۔ دیکھ سکتی ہو؟“

”پلیز بابا یہ بہت زیادہ ہے۔ دیکھو ہم بہت زیادہ رعب والے بنی کوشش کر رہی۔ دیکھا تو شہر میں، میں تم سے بڑا ہوں۔“

”مگر میں تو ہے وہ نے کا کیا مطلب ہے کہا آپ کو کس چیز کی پڑ گئی؟ جتنی مرضی ان نے اسموگنگ کریں؟“ غصے سے منع کر بولی اور وہ ساڑھے آف کے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے تمام بات کسی حد تک اپنے خلاف دیکھتے سالار ارمان پر پڑ چڑھ دوڑی۔

”آپ بہت ہی معصوم سالار بھائی!! آپ کو کیوں لگتا ہے کہ اسموگنگ کے بغیر آپ کی سیاسی سرگرمیاں نہیں چل سکتیں؟“

سالار جواب بھی نہیں دے پایا تھا کہ وہ پھر سے شہریار کے سوا کوئی اور ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”آپ معقول ہیں..... سیاست میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ جانے کیسے کیسے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے، کس کس کو مشورہ دینا پڑے گا! آج کل کسی نے کہا اسموگنگ سے بھی آپ ڈیفنس میں نہیں لگ رہے تو پھر تو کیا لٹ لگا نہیں گے؟“

وہ کچھ نہیں بولا۔ کیونکہ اس نے صحیح تجزیہ کیا تھا۔ سیاسی سرگرمیوں میں مدد۔ لیکن جہاں بھی وہ زیرک ہوتا وہیں مشورہ دیتا ہنگامہ سے بچ نکلتے۔ خود کو فخر کسی کام کا نہیں ہے اگر بندہ اسموگنگ نہ کرے تمہیں معلوم نہیں ہے شہر بیت ذیشان ہی سے ذرا مرد کی شان ہوتی ہے لڑکیاں مرتی ہیں ایسے بندے پر...... اور یہی بات اس نے اور سالار ارمان اور عاطف نے اسموگنگ شروع کر دی تھی ایسے کرا آج

دو سال بعد تک وہ اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکے تھے۔

دادا ابو دونوں کو دیکھ رہی تھیں گنگ ہو بیٹھیں...... پھر اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا: "آپ نے صبح فجر کی نماز پڑھی تھی بھائی؟ میں نے ٹھیک وقت پہ آپ کے موبائل پہ الارم لگایا تھا۔"

مجتبیٰ نے گردن جھکائی اور جھک گئی۔

"وہ...... رات کو دیر تک جاگتے رہے، اس لیے نماز قضا ہو گئی دادا!"

دادا نے سنا تو بھینچی ہوئی آنکھوں سے گھورنے لگی۔

شہریار بے کل سا ہو گیا۔ وہ سے ہونے کا رعب سارا اس کے چہرے کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ ویسے پریشان تھا۔ سارا رمضان اُسے دیکھتا رہا۔ برداشت نہ ہو سکا تو پکارا۔

"کیا ہے یار! یہ منہ کیوں اترا ہوا ہے تیرا؟"

شہریار نے اُسے دیکھ کر بجھے منہ سے بولا۔ "یار دادا ابو روٹھ گئی ہے۔ بہت برا ہوا ہے۔ میں نے نہ جانے کتنے دنوں سے اُنہیں راضی ہونے کا چانس نہیں دیا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ "پاگل ہو گیا ہے۔ اس کے ڈرانے ہونے سے ایسا مزاج بگڑا ہے سارے یار! یہ کبھی کبھی ان کا رویہ ہوتی ہیں؟ ان کے دل اتنے سے ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر نازک اور رحم سے بھرے ہوتے ہیں...... ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر ناراض ہو جاتی ہیں۔ تم بھی ایسا کرنا۔ صبح سے جلدی ناشتہ کر لینا چاہیے۔ اچھا۔ وہ دن، تیرے چھیچھڑے کھرے کی۔"

اس نے تفصیل سے اسے دیکھا اور جلدی سے درست کرتا آنکھوں کے پیچھے دروازے سے باہر نکل گیا۔

پھر وہ دادا نے پاپا سے شہزادے کے حوالے سے کہا تھا کہ گھر میں وہ سے محبت سے داخل ہوئے دیکھ کر یہ جان سکے کہ وہ حقیقت رات کو کتنے بجے گھر آیا تھا۔ شہزادے بہت ہی کم گھر سے غائب ہوتا تھا۔ کبھی ٹی وی آن کر دیتا۔ کبھی اپنی آواز میں ریکارڈ کیسٹ لگا دیتا۔ جس میں وہ تندہی سے پڑھائی میں مصروف ہوتا۔ پاپا باہر سے ان کی ہی مشغولی ہو کر واپس لوٹ جاتے۔ شکیل دنیا پاکستان کے ساتھ ہی کالج میں بھی اس لیے ان کی پلاننگ سے آگاہ ہو جاتی تھی اور یوں اس کی یہ کبھی کبھی کی بھری چوری پکڑی جاتی تھی۔ وہ بیرون ملک جانے پہ بہت بسورا کرتی کہ کتا اور وہ اس کی مسکین صورت دیکھ کر جس پڑتی۔ اسے اپنا غصہ بھی ہر کتنا ہی شدید لگتا تھا۔

بچپن سے ہی وہ ان کے زیادہ قریب رہی تھی۔ دونوں بڑے بھائی اس سے چند سال بڑے تھے پھر شہریار تھا اور وہ شہریار سے پورے دو سال چھوٹی تھی۔ بظاہر اس کا اور شہریار کا خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا مگر سالار اور عدیل بھائی کے تین سال بعد جو کزن عنایہ آئی تھی انہیں دونوں پاپا گھر لے آئے تھے۔

وہ محض تین دن کا تھا اور پاپا بھی تین دن بعد گھر آئے تھے۔ بظاہر ان کے لیے اس کا وجود ناپسند رہا تھا تبھی بابا کی برداشت اور خوشدلی ممتا کے جذبے نظر وقتی طور پر اس کے وجود کے وقت ہونے کا سوال بھول گئیں اور بس وہ اور عنایہ ایک ساتھ پل کر بڑا ہوا اور تب شہزر کرنے لگے۔

پھر وہ دو سال کا تھا جب اچانک عنایہ اسپتال کے گئی جانے کی وجہ سے عنایہ ... بن گئی۔ پھر جو سوال وقتی طور پر مٹنے سے رہ گیا تھا وہ ماما کی اپنی اولاد کے اٹھ جانے کی وجہ سے شدت پکڑتا چلا گیا۔ وہ ماما کا معتوب ٹھہرا۔ پھر وہ خود کو بہت اکیلا اور تنہا محسوس کرتا تھا۔ جب دادا اور دادی نے ... بابا کی توجہ بچی کی طرف واپس مڑ گئی۔ ایک بچی کے چلے جانے سے وہ اپنا مزاج بھول گئی تھیں۔ وہ بار روتی کے ملنے ہی وہ بچے میں گم ہو گئیں۔ اب وہ ماں سے سوا اختیار رکھتیں ماں کی جان ... بس جیسے بس وہ بچے ہی تھا ان کا...... اور بس تبھی سے وہ اور شہریار دوست بنتے چلے گئے۔

پھر سارہ دنیا آئی جانی رہی تبھی شہریار کے لیے دادا عبدالرحمن اور دادیا عبدالرحمن کے لیے شہریار عبدالرحمن ... ہر کر دو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ ماما ان کے اس قدر سمجھانے پر بھی آزردہ رہتا تھا۔

"آپ بھی تب تنہا ہو کر بیزار نہیں ہوئے؟" کیونکہ اس خاموشی میں ... ان سے ختم رہنے کو ... تھا۔

"اب ناشتہ کرنے کے لیے کیا دادا سارا سال کرنا پڑے گا؟" اس نے دادا کا چہرہ دیکھا جو قطعی ... تھا ... اس کی ... بہت مشکل تھا۔

"بابا! تم مجھ سے ناراض ہو گیا؟"

بابا نے جواب نہیں دیا ماں کے لیے... بس خاموش لگا تی رہی۔

"بابا! ناپسند ہی اب سارا قصہ تھا۔"

اس نے پھر سے غور سے دیکھا تبھی اس سے پہلے ... کہ وہ ... جواب دیتی شہنشہ تیز اور کرخت آواز ان کے درمیان گونجی۔

"اچھا تو یہاں کے خون سے کھائے جا رہے ہیں۔ میں بھی کہوں اچانک تمہیں ناشتے کو بار بار ... کہاں مصروف ہونے لگی ہے۔"

"بانو پلیز!" رابعہ نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

شہریار کے جاتے ہی ایک گہری سانس خارج ہوئی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ ذرا سختی ابھی نہیں۔ وہ بھی کہ کھانا بچا ہی الگ کر، یعنی شروع سے وہ کھانا خود ڈالنا ایک عادت تھی۔ ... کے سامنے عادی تھے کہ ایک دوسرے کے بغیر خود سے اپنا مشغلہ ہی لگتا تھا۔ اس وقت کا احتجاج بھی اس لئے کیا گیا تھا کہ بانو نے غصے میں اس کی اس کمزوری کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔

"اسے لڑکے کیا سمجھ رہی ہو۔ بے ساختگی کی عادت کب سے پڑ گئی؟" انہوں نے چشمے سے گھوری آنکھیں ان پر جما دیں۔

وہ ان سے ... بولے۔ اپنے مخصوص انداز سے مخاطب کرنے لگا۔

بانو کی اور اس کی کوئی نہیں بنتی تھی۔ بانو نے اس سے کبھی نرم لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ وہ اس میں اور گھر کے افراد میں کوئی فرق روا نہیں رکھتی تھیں۔ بالکل اسی طرح وہ ماں کے علاوہ انہیں غیر ضروری مخاطب کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتا تھا اور یہی وجہ تھی دونوں کے تعلق ہمیشہ کشیدہ رہنے کا سبب بنتے۔ اس وقت بھی وہ غصے میں غیر کی کمان کے قریب آگئی تھیں۔

"میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔"

"بانو! آپ سمجھتی ہیں یہ بات بے وقت ہے۔ وہ میں ... کر رہا تھا، اس لئے کچھ دیر سے آنکھ کھلی تھی۔"

"میرے سامنے زیادہ ہوشیار بنا ... میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس لئے کیا کام کیا ہے ہماری بانو؟ علی...... کے کی ہوا، اماں بابا کا پیسہ تو اڑاتے ہو، میرے دل بھی دکھتا۔ یہاں تو دادی بھی بیٹھی لکھ رہا ہے۔ اور آپ جناب ہیں کہ گلی گلی پھرتے آوارہ ہیں، جب باپ کا پیسہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں۔ تمہاری صورت میں جانے کن سے گناہوں کی سزا ملی ہے میری بچی کو۔"

اس نے ذرا سا بانو کی ... شروع کی۔ بانو دل لگی تھیں۔ وہ وہ وقت بیٹا بھی رہتا تھا۔ لیکن اب ان کے لئے ... مشغلہ ہے تھی جیسے کوئی اس کے کوٹ سے مٹی جھاڑ دے ... بانو کے ساتھ ان کی انگلیوں میں بھی جا چائے ہاتھوں میں ویسی ہی روانی تھی۔

[illegible] سے اس سارے معاملے میں لاتعلقی برت رہی تھی۔ اس لئے تو نے جواب پر ... کا فائدہ ... نے دیکھا تو چائے کا کپ اس کے لئے تیسری دفعہ ... کرنے دیکھا تو پوچھنے لگے۔

"خدا کا خوف کرو لڑکی! اچھی بچی ... وقت میں آ... سے کہا ہوا اس لڑکے کے ... اس لڑکے کے مزاج ... بگڑے ہوئے ہیں ... اپنا ... غلط ہے۔ پتہ نہیں کیا سمجھنے لگا

بے خودی۔ یوں اکڑ کر چلتا ہے، جیسے راجہ اندر ہو اور یہ کالج کی لڑکیاں...... یوں اس پہ جھپٹ جھپٹ کرتی ہیں، جیسے......"
وہ تشبیہ ڈھونڈنے کو رکی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر وال اسٹینڈ سے تولیہ اٹھایا اور عام سے لہجے میں تلخی بھر کر بولا۔

"شاید آپ کہنا چاہتی ہیں لڑکیاں مجھ پر ایسے جھپٹ جھپٹ کرتی ہیں، جیسے بکرے کے بھیڑ پر چھیاں......" محمد عمر کو رکا پھر مزید تلخی سے بولا۔ "آپ مجھ سے اتنی نفرت شو کرنا چاہتی ہیں؟ ایک بار ہی کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ نانو اماں کے بعد کیا آپ بھی سکون سے رہیں اور میں بھی...... سنا تو! آپ صبح شام یہ ذکر کیوں کرتی ہیں، جب بھی میں یہ بات ایک لمحے کے لیے نہیں بھول سکتا کہ پاپا نے مجھے کن حالات میں اپنا نام دیا۔ پاپا اور ماما کی ان خیرات کو میں عمر بھر نہیں بھول سکتا۔ مر کیا آپ کی اس احسان مندی نے میرا سر جھکا ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی آپ کو مجھ سے شکایتیں ہیں۔ میں کیسے دور کر سکتا ہوں ان شکایتوں کو؟"

"چلے جاؤ تم یہاں سے۔ چلے کیوں نہیں جاتے؟ اب اچھے بھلے جوان ہو، اپنا جہان خود ڈھونڈو۔ کب تک عبدالرحمٰن کے ٹکڑوں پہ پلتے رہو گے؟"

ماما کب سے خاموش کھڑی تھیں۔ شہریار عبدالرحمٰن کا دل کرلایا۔ اسے اب تک تو؛ لوگ کئی پہلے سے برے ہو کر اس کی ذمہ داریں بن جانا چاہیے تھا، مگر وہ خاموش کھڑی رہی۔ اس نے شکوہ بھری نگاہ اس پہ ڈالی اور شاور کے لیے واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ سانو، جو کتنی دیر سے ان اعتاب کے جاری تھیں، بس چاپ کبھی اس کی خاموشی پہ حیران رہ گئی تھیں۔ بہت کم ہوتا تھا وہ ان کی بات کا جواب نہ دے۔ لیکن آج ایسا ہوا تھا۔ وہ جاچکی تھیں اور وہ بھی کالج کے لیے تیار ہونے چل دی تھی۔ لیکن جب باہر آ کر اس نے شہریار کو ڈھونڈا تو ندارد پایا۔

"ماما! آپ نے شہری بھائی کو کہیں دیکھا ہے؟" وہ سوال کرتی اندر واپس پلٹی۔

"مجھے اس لڑکے کے شب و روز سے کوئی سروکار نہیں۔ کب آتا ہے، کہاں سے آتا ہے، کیوں آتا ہے، آئی ڈونٹ کیئر۔" ماما کا لہجہ جیسا اندر تھا۔

وہ دل گرفتہ ہو گئی۔

اپنے سب بھائیوں میں اُسے شہریار عبدالرحمٰن سے خاص اُنس تھا۔ بچپن سارا اُس کی گود میں گزرا تھا۔ اُس کے بڑا ہونے کی ذمہ داری خود بخود اس نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ ماما سے اُسے اس معاملے میں بھی سخت سست سننے کو ملتیں۔ نخرہ دیکھاں کرتا تھا۔ وہ پاپا کی اسکولنگ، اس کی پڑھائی، اسکی ٹیوشن سے لانا، لے جانا، یہ سب خود بخود وہی دیکھتا۔ وہی اس کی پڑھائی میں مدد کرتا۔ راتوں کو جاگ جاگ کر امتحانات میں اس کو تیاری کرواتا۔ گیس پیپرز (GuessPapers) خود بناتا اور بہت زیادہ اس کا گیس درست ہی نکلتا...... اور کامیابی پر ہونے والی پارٹی میں اپنی ساری کی ساری فال درست

کہتے ہوئے اٹھ گئیں۔

"یہ تو میری مجبوری ہے، جو میں نے ہزاروں پاؤنڈز کا انعام دے کر کھیلا ہے تب کہیں مسٹر شہاب کو اس نوکری پہ رکھا۔ وہ سخت تو انتہائی ہیں لیکن اچھا ہے مشہور دیکھ کر ہر کوئی مچل جاتا ہے۔ میرے گھر سے دور دور تک بے لیاقتی، بدحالی پھیلی ہوئی ہے، تب کہیں یہ دن دیکھنے کو ملا۔ بچوں کی پڑھائی واقعی بہت بڑا مسئلہ ہے۔"

وہ ماما کی بڑی تھیں جتنا وہ ان کی فرینڈز کی ستائش پا کر ہوا اور ایک کونے میں کھڑے ہو کر دانیہ کو پارٹی میں فیری لینڈ کی پری بن کے گھومتے دیکھ کر خوش ہوا اور وہ پارٹی کے بعد اپنی پاکٹ منی سے خریدا گیا کوئی تحفہ اسے ضرور دیتی۔ وہ منع کرتا رہ جاتا مگر کبھی گھڑی، کبھی شرٹ، پرفیوم یا کوئی اچھی کتاب......

وہ جتنا اس کے لیے اہم رہتا تھا، کوئی کوشش سے باہر اس کے بھرپور تحفظ کی خاموش یقین دہانی ہی تھی کہ وہ بہت بڑا اعتماد تھی۔ لیکن اس نے محسوس کیا تھا وہ بہت کم اس کی طرف توجہ دے پاتی تھی۔ گھر میں چھوٹی تھی، بچپن کی دوستی سب بڑوں کے سامنے نہ...... سو بہت کم وہ اس کی سائیڈ لے پاتی۔ منمناتی سی آواز بلند کی تو ہونے پاتی کہ اپنی موت آپ مر جاتی۔ پھر یہ بھی تھا اس نے جب بھی اس کی حمایت کرنے کی کوشش کی تھی گھر میں ان ہی دونوں شہریار عبدالرحمن پر زندگی تنگ ہو جاتی۔

دونوں بھائیوں میں سے صرف عدیل بھائی کچھ نرم رویہ رکھتے تھے۔ سالار بھائی، مانو، ماما اور ان کے منہ چڑھے ملازم اس کی حیثیت دو کوڑی کی کر دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کی حمایت سے اجتناب کرتی تھی۔ لیکن آج صبح جس طرح اس کی تذلیل کی گئی آنکھیں اس پہ آ ٹکی تھیں، وہ اسے احساس جرم میں مبتلا کئے دے رہی تھیں اور اس کا خیال تھا، بائیک پہ اس کے ساتھ جاتے ہوئے وہ اپنی پوزیشن واضح کر کے اسے منا لے گی۔ لیکن اس نے اسے یہ موقع نہیں دیا تھا۔

وہ کھڑی تھی۔ کالج کا وقت بہت اپ سیٹ ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے کالج جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ پھر وہ بھی پاس کا انتظار کرتی رہی۔ شہریار کی پروا کرنے والے واحد ملازم کریم بابا سے پتہ چل گیا تھا، وہ خفا خفا سا کالج چلا گیا تھا۔ کریم بابا نے دانیہ کے ساتھ جانے کی وجہ پوچھی تو وہ ترش ہو کر بولا تھا۔

"اسے کالج لے جانے والے بہت ہیں۔ اس گھر میں کیا ساری میری ہی ذمہ داری ہے؟ مجھے دیر ہو رہی ہے، اسے کہیے کہ عدیل بھائی یا سالار بھائی کے ساتھ کالج آ جائے۔"

وہ فرائے بھرتا گیٹ سے باہر نکل گیا تھا اور وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

اتفاق تو انہیں بھی اس کا کرتی تھیں۔ اس کی دلداری کے لئے نہیں، بلکہ اس وقت پیچھے یہ ان کا خیال تھا اور یہ وہی پرانا خیال تھا۔ پتہ نہیں ماما اس خیال سے باہر کیوں نہیں نکلتی تھیں۔ لیکن بہرحال ان کا خیال تھا کہ وہ گھر آئے پر اس کی اچھی طرح کی خبر ضرور کریں گی۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ جس وقت کھانا کھاتا ہے، جیب خرچ کو پیسہ لیتا ہے، اچھے کپڑے پہنتا ہے اور بس نہیں ہوتا تو اس سے اس گھر کے کسی کام میں ہاتھ بٹانے کو کہو تو نہیں ہوتا۔ آخر کیا ہے وہ ان کے داماد کے کام کے بغیر...... لوگ تو ملازم بھی نام نسب دیکھ کر رکھتے ہیں۔ اگر وہ اس کے سر سے ہاتھ اٹھا لیں تو کوئی ایک بھی نہیں ہوگا جو اس کے قریب پھٹکنے کی کوشش کرے گا......

بس یہی زخم اور اس کی طرف کی بدگمانی تھی جس نے ماما کو کبھی دل سے اس کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا تھا۔ لیکن وہ تو پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھی۔ لیکن وہ شام تک نہیں آیا تو وہ فون اٹھا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے دھڑکتے دل سے فون ڈائل کیا مگر اس کا موبائل آف آ رہا تھا۔ دل میں عجیب عجیب طرح کے خیال آ رہے تھے۔ تبھی اس نے سلامہ کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ فون سلامہ کی امی نے اٹھایا۔ اس نے جلدی جلدی ان سے سلام دعا کیا اور سلامہ سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ کسی وقت شاور لے رہا تھا اس لئے اسے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ پھر اسے سلامہ کی چہکتی آواز سنائی دی۔

"ہاں بھئی کہاں ہو؟ کیا آج تم کالج آ گئیں، وہ صاحب بہادر تمہارے برادر صاحب...... آج تم دونوں نے مل کر تو دور کیا ہے ناں۔ ویسے کل تک تو تم دونوں کا پروگرام تھا کالج آنے کا۔"

وہ اس نئی افتاد پر ساکت ہو گئی۔ وہ تو اب تک یہی سمجھ رہی تھی وہ صرف عارضی ناراضگی پر کالج سے کسی دوست کی طرف چلا گیا ہے۔ لیکن یہاں......

اس نے گھبرائے دل کو سنبھالا اور جرح کے ڈر سے کی ساری بات گول کر کے سے کر دی۔ سلامہ، وہ اور شہریار باقی دوستوں کے مقابلے میں ایک دوسرے سے زیادہ قریب تھے، اس لئے ان کے درمیان کسی بھی بات کا حجاب نہیں تھا۔ وہ شہریار سے گھر بھر کی ناپسندیدگی اور اس کی حساسیت سمیت محبت رکھتا تھا۔ اس کا ایک ہی خیال تھا۔

"مجھے اس سے کیا تمہارے علاوہ پریشان کیا تھے۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں تم کیا ہو، اتنے پیارے، اتنے آدرشی، اتنے بے حد منکسر...... اور بس یہی بات مجھے تمہاری طرف کھینچتی ہے۔ ورنہ تم جانو میں مزدور پارٹی یونین کا کتنا متحرک کارکن ہوں۔"

یہ بات وہ ہنس کر کہتا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ پارٹی کے خلاف لکھتا تھا ان کے خلاف ہر طرح کی سورس کا استعمال نافذ نہیں گردانتا تھا۔ ہاں، بس سر عبدالرحمن کی شیک ہاتھ ای اور شہریار کی زندگی کا چین لے اڑے ان سے کبھی طور پر گفتگو نہیں کر پایا تھا۔ یہی وجہ تھی دو ماما کا فون آتے ہی گھبرا اس نے بات ہنسی میں اڑا دی تھی لیکن پریشان ہو کر اپنے میلتھ کلب جانے کا پروگرام ملتوی کر کے اسے ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا تھا۔

ساحل سمندر، جم، کلب، اس کے پسندیدہ ریسٹورنٹ ہر جگہ ڈھونڈا گیا۔ رات آٹھ بجے تک رہا لیکن ناکام ہو کر بابا جان کے سامنے کھڑا تھا۔

"پتہ نہیں کہاں چلا گیا ہے بڈھ کا...... مجھے تو ہول اٹھ رہے ہیں اگر جذباتی ہو کر کوئی غلط قدم اٹھا بیٹھا تو......"

بابا کچھ بولے بغیر رہ گئے۔ لالی نے ہونٹوں کو کاٹتے ہوئے اسے دیکھا، پھر گھبرا کر بولی۔ "آپ ہی بتائیے ناں شہریار بھائی آخر کہاں جا سکتے ہیں؟" وہ یکلخت گھبرا گئی، پھر روہانسی ہو کر مزید بولی۔ "مجھے کہا تھا وہ میری اتنی چھوٹی سی کوتاہی پر خفا ہو جائیں گے۔ شہریار بھائی تو کسی ڈھنگ سے خفا بھی نہیں ہوتے...... اس لئے انہیں کیسے منایا جائے یہ تو کبھی نہیں سیکھا ہے میں نے۔"

"اگر کام نے کا تو اسی وقت ناں، جب وہ سامنے ہو گا۔ پتہ نہیں کہاں جا کر غائب ہوا ہے۔" سالار سالان بھی پریشان ہو رہا تھا، جب عاطف بیگ کا اس نے فون کیا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟"

عاطف گھر نکلنے کا سوچ رہا تھا، عجلت سے بولا۔ "کیا کہوں، میں کہاں ہوں۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"شہریار ہے تیرے پاس؟" سالار نے ورکر کے اگلا سوال پوچھا۔

"خدا کا شکر کرو، کیوں مجھے خوش نہیں دیکھ سکتے؟" کو بچہ مار کو تم گیر ہوا۔ "جہاں شہریار عبدالرحمن ہو وہاں خیر و خوشی ہو سکتی ہے؟ ان کی تلاش؟ اللہ اللہ...... لیکن تمہیں یہ کیوں شبہ ہوا کہ وہ کہیں فرار ہو گیا ہے؟"

سالار سالان نے سمجھ لیا وہ مخمصے کا شکار کرنے کے موڈ میں ہے، اس لئے اس نے خدا حافظ کہے بغیر ریسیور رکھ دیا۔

بابا اب پریشان ہو چکے تھے۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر خاموشی بیٹھی رہی، پھر بے چینی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سالار اس کے پیچھے لپکا۔ وہ کچن کی طرف جا رہی تھی۔ پھر اس نے موبائل اٹھایا اور بہت غیر متوقع انداز سے کال ملا رہی تھی۔ سالار سالان اور اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں کیونکہ آواز بجنے سے آ رہی تھی۔ سارا شہر گنگنا رہا تھا۔ سالار سے کمرے میں بانس بال ... اور گھنشم ... میں منہ چلائے بیٹھا تھا۔

بابا کا پارہ چڑھنا ... اس کا مزاج ضرور برہم ہے لیکن وہ کسی اس سے ناراض نہیں ہو سکتا، یہی سوچ کر اس نے اس کے کمرے پر دستک دی مگر جواب ندارد......

"یہ شہریار بھائی دروازہ کیوں نہیں کھول رہے؟" اس کی آواز کانپ گئی۔

AANCHAL.COM.PK

سالار سلطان ہنسنے لگا۔ "بس بس اب زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے ہی موڈ خراب ہوگا اس لیے نہیں کھول رہا۔ تم ذرا گیٹ کی چابی لاؤ۔"

وہ واپس پلٹ گئی۔ پانچ منٹ بعد وہ واپس آگئی۔ سلامہ نے دروازہ کھولا۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ کمرہ سگریٹ کی بو سے بسا ہوا تھا اور وہ کارپٹ پر کشن ڈالے کروٹ کے بل لیٹا تھا۔

"شیری بھائی......!"

وہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی۔ سالار سلطان ساتھ تھا۔ لائٹ آن ہو چکی تھی لیکن ابھی تک اس نے آنکھیں کھولنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

"شہریار کے بچے! یہ کیا ڈرامہ بنا رکھا ہے؟ اور یہ سموکنگ پورے مہینے کی ایک دن ہی کیوں کرلی؟ تم بہت فضول خرچ ہوگئے ہو۔ یار دوست مر گئے تھے؟ ہمارے حصے پر ڈاکا ڈالا ہے تم نے اسموک کرکے!"

وہ لہجے کو خاص طور پر ہلکا پھلکا بنا کر بولا تھا۔ لیکن جواب ندارد...... یقیناً بہت سخت ناراض ہے...... دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں رائے دی اور ایک ساتھ اس پر ہلہ بول دیا۔

"شیری بھائی! بس ہوگیا۔ اب یہ ناراضگی کا چیپٹر کلوز کر دیجیے، ورنہ میں رو دوں گی۔" سلامہ سلطان نے بال مٹھی میں پکڑ کر کھینچے، تب وہ سی کرتے اٹھا اور غصے سے۔ "اوہ ماں! ہاں!"

"اے لڑکی! اب تم مجھے بچے رونے کا ڈرامہ مت رچانا آج کے بعد۔ کیونکہ میں نے تمہیں اپنی دوستی کی لسٹ سے آج ہی نکالا ہے۔ سلامہ کی بجائے تم سے بات بھی کر رہا ہوں کیونکہ تم اس کے ساتھ آئی ہو۔"

دانیا عبدالرحمن کا چہرہ فق ہوگیا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہ گئی۔ اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ شہریار عبدالرحمن کی زبان سے اس لہجے میں ایسی بات بھی کہی جا سکتی ہے۔ مگر وہ مسکرا رہا تھا اپنے اس بیان کے بعد ایک لفظ نہیں بولا اور سلامہ سے رات کے پروگرام کی بابت تبادلہ خیال کرنے لگا۔ وہ کونے میں بیٹھی اُسے خاموشی سے دیکھتی رہی۔ ان کی باتیں ان کی سیاسی چپقلش تھی اور آج کل کے حالات...... یکدم وہ آگے بڑھ آئی اور اضطراری انداز میں پکاری۔

"شیری بھائی! آج آپ کہیں نہیں جائیں گے، بس حالات بہت خراب ہیں، حکومت کسی بھی مارشل لاء میں زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔"

وہ پھر بھی مگن رہا تو وہ روہانسی ہوگئی۔ "میں آپ سے کچھ کہہ رہی ہوں شیری بھائی!"

"لیکن کیا میں نے کسی بھی بات میں تمہاری رائے لی ہے؟"

"بس یہ وہ لمحہ تھا جب اس کا صبر جواب دے گیا۔ وہ بس رونے جا رہی تھی۔ شہریار نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا مگر پھر بھی کمزوری نہیں دکھائی اور سلامہ کے ساتھ اسی تیزی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ دانیا اسے جا

بھٹی رہی، پھر غصے میں بھری ہوئی اپنے کمرے کی سمت بڑھ گئی۔

"آپ چاہے کتنی ہی دلیلیں دیں میں نہیں مانوں گی۔ آخر مجھے کیا ہیں لوگ؟"

ساری رات غصے میں تپتی رہی۔ رات کی نماز بھی اسی غصے کی نذر ہو گئی۔ کیونکہ عصر کھانے کھاتے وہ جانے کب سو گئی تھی۔ آنکھ کھلی تو 3 بج رہے تھے۔

شہریار بھائی آ گئے ہوں گے...... اس نے سوچا اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ ناراض ہیں بات کا جواب ہو سکتا ہے نہ دیں، پھر بھی اپنا زعم بھلا کے اس کا موبائل ملانے لگی۔ تھوڑی دیر بجنے پر بھی مگر جواب ندارد...... اس نے کچھ منٹ بعد پھر نمبر ملایا تب کسی کی درشت آواز آئی۔

"ہیلو! کون بول رہے ہو تم؟"

وہ گنگ رہ گئی۔ یہ طرز تخاطب تو شہریار کے کسی فرینڈ کا نہیں ہو سکتا۔ شہریار کہاں گیا؟ سیل فون اس کا ہے تو ریسیو بھی تو اسی کو کرنا چاہیے۔

"مجھے شہریار بھائی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کون بول رہے ہیں؟"

دوسری طرف کسی نے پہلے کچھ توقف کیا، پھر گھمبیر آواز آئی۔ "ہم پولیس والے ہیں بچے۔ جس کا یہ سیل فون ہے وہ تو بیچارا جا چکا، اس وقت ہماری پانچویں گشتی میں رکھی ہیں۔"

"کون؟...... کون بول رہے ہیں آپ؟" اس نے فون کو سوالیہ دیکھا۔ سامنے کوئی موجود نہیں تھی لیکن اس کی پیشانی پر پسینہ جاری تھی، حوصلہ کھو دے رہی تھی۔ کیونکہ سامنے والا پہنچا ہوا لگتا تھا نہیں لگ رہا تھا۔ تمہی زور دار طیبہ کی آواز کہیں گہرائی میں گم ہو گئی۔

"انسپکٹر صاحب...... بول رہے ہیں آپ؟" اس نے انسپکٹر صاحب کہہ کر خود اعتماد سے بات کی اور دوسری طرف سب انسپکٹر کھل اٹھا۔

"آپ کی زبان مبارک ہو جی۔ لیکن آپ کون ہو شہریار صاحب کی؟"

"میں جی...... ان کی سسٹر ہوں..... کیا میری ان سے بات ہو سکتی ہے؟"

دوسری طرف سے مثبت جواب سن کر وہ دوسری آواز شہریار کی سننے والی تھی مگر رکا...... اس نے موبائل آف کر دیا تھا۔ وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی۔ جیسا ہر جیب گری کی۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا۔

AANCHAL.COM.PK

معدیل عبدالرحمن جیپ کی پچھلی نشست سے اتر رہے تھے۔ ڈرائیور نے جیپ روک کر جیپ سے اتر کر ان کے باہر آنے تک ایک کیس لے لیا تھا۔ جیپ ان کی ذاتی تھی۔ وہ ایک بہت ایماندار اور بہت اچھے افسر تھے۔ یہ اس لئے نہیں تھا کہ وہ اس کے بھائی تھے، بلکہ اس لئے تھا کہ وہ واقعی اپنے عہدے کی لاج رکھنے والے انسان تھے۔ ورنہ ڈی ایس پی کی پوسٹ کے بجائے وہ پولیس میں بیجا جب نوکری کر رہے ہوتے۔

مگر شہریار بھائی......!

گندم اس کے ذہن میں جیسے شہریار سا ایک ہوا اور وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر لاؤنج میں پہنچی۔ اس کی ماں بچھڑی ہوئی تھی۔ معدیل عبدالرحمن نے اس طرح اسے جاگتے پایا تو حیران ہو گئے، پھر گال تھپتھپا کر بولے۔

"خیریت گڑیا! تم اس وقت تک کیوں جاگ رہی ہو؟ تمہیں پتہ ہے نا اچھے بچوں کو رات جلدی سو جانا چاہئے۔"

"اچھے بچوں کو......؟" اس نے دانتوں تلے زبان دبائی۔ جانتی جو تھی شہریار کے متعلق سوال کرنے کی وہ یہیں ہو جانے۔

"کیا بات ہے، کچھ پوچھنا چاہتی ہو؟" اسے گومگو کی کیفیت میں دیکھ کر وہ اس کے قریب آ گئے، پھر ہنس کر بولے۔ "گھبراؤ نہیں، شہریار بالکل ٹھیک ہے۔ بس تھوڑی سی نارمل ٹینشن کے لئے اسے حوالات کی نذر کیا گیا ہے۔ شام تک وہ گھر آ جائے گا۔"

"لیکن انہوں نے کیا کیا ہے؟" اگلا سوال ڈرتے ڈرتے کیا۔

وہ حیرت سے تکنے لگا کہ اس بھولی بھالی سی لڑکی کو وہ دیکھنے لگے، جو ان کی ماں جائی تھی اور بہت حساس بھی تھی۔ ہر ایک کے لئے جس کی زبان پر نا نہیں کہتے کہتے نہیں تھکتی تھی اور جو سب بھائیوں میں شہریار کو سب سے زیادہ محبت کرتی تھی۔ پھر اس کی طرف سے ملنے والی پریشانی اسے ایسا ہی خوف زدہ کرنے کے لئے کافی تھی۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے گڑیا! بس شہر میں دفعہ ۱۴۴ کے تحت جلسے جلوس پر پابندی لگائی گئی ہے۔ شہریار صاحب شہر سے جلوس لے کر نکلے، تو پولیس نے روکا، وہ پھر بھی اپنی سیاسی میٹنگ کرنے پہنچ گئے۔ اوپر کے حکم پر بھی ان کے ڈر سے انہیں گرفتار کرنا پڑا۔ چونکہ انہیں گرفتار کر کے صرف نکالنے کے بجائے ڈرانا اور پھر ان کی اصلاح کرنا مقصود تھا۔ شام تک سب کو رہا کر دیا جائے گا۔"

اسے ان کو ہنسی ہوئی پھر ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ''آپ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔ میں آپ کے لئے کافی بناؤں؟''

''ہوں...... اگر تمہارا اپنا پینے کا ارادہ ہو تو ضرور بناؤ۔ تھکن بھی بہت ہے لیکن بچے ادویسے ہی بہت ہو بھول گئی ہے۔''

عدیل بھائی ایسے ہی تھے بہرا کسی کی پروا کرنے والے دھیمے لہجے دھیمے انداز میں بات کرنے والے...... بچپن سے ہی مکمل طور پر ستر فیصد بابا پر گئے تھے۔ ان ہی کی طرح کا غصہ ان کی طرح کا رول...... ان کی طرح ہی خوبصورت ان کی طرح ہی ہر دلعزیز...... بہت خاموشی سے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں آپ کے اردگرد کے ماحول وہ بہت بلکہ رنگ سب پر نظر رکھتے ہوئے آپ کی پشت پر بچے تھے۔ انہیں کبھی ان کے اس رویے سے پرابلم نہیں ہوئی تھی۔ یہ الگ بات کہ عبدالرحمن ہمیشہ ان کے اس رویے سے خار کھاتا تھا۔

وہ کوریڈور میں چلتے چلتے سوچے جا رہی تھی۔ بہن جب کچن میں پہنچی تو عدیل بھائی اس سے پہلے وہاں موجود تھے۔

''آپ...... بیٹھئے بھائی! میں بنا لیتی ہوں کافی۔''

''کافی خاک بناؤ گی، پہلے خیالات کی کھچڑی تو پکا لو۔ مجھے تم سے بیمار رہیں لگا۔ دو کچن میں سو جو ہوں اور خواب کی ریڈ رولا سفر ہے۔'' عدیل بھائی کہنے لگے۔

''وہ بھائی...... بس ویسے ہی کچھ سوچ رہی تھی۔''

وہ چینی کا تناسب رکھتی ہوئی ہمیشہ کی طرح ہونے والی دست بستہ کی نذر کر کے ایک بھری خاموشی میں لپٹ گئی۔ عدیل بھائی کپ میں چمچ ہلاتے لگے پھر مسکرا کر بولے۔

''مگر بابا گئے تم نے کبھی بنا تب بھی پتہ چل جاتا تمہاری فرمانبرداری ہے...... تنہا سوچ کے سمندر میں غوطہ زن ہیں محترمہ۔ ویسے میں بھی بتا سکتا ہوں کہ تم سوچ کیا رہی تھیں اور اس وقت کس کس کا خیال تم پر غالب ہے؟''

وہ آخر کو جھینپ کر کے کچن کا ڈبہ پھر اسی انداز میں بیٹھ گئے اور وہ کپ سے کافی سپ کرنے لگے۔ انکار کی کا ڈبہ رکھتے ہوئی پھر مسکرا کر بولی۔

''مجھے معلوم ہے آپ اپنی کمزوری سے نہیں سمجھتے ہیں کہ کوئی شک نہیں رہا ہے۔ بابا اور شہریار بھائی کے بعد آپ کو میری زندگی پر وہ اختیار حاصل ہے۔''

انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ بنا بات پوچھو کیا کہاں کو شہریار کے بعد کیوں رکھا۔ سا اور عبدالرحمن ہوتے تو اب بھی تھینک انتظار ہے۔

"سالار بہت اچھا انسان ہے گڑیا!...... بس بہت سارا جذباتی ہے اس لیے مسائل کی بات کرتا رہتا ہے۔"

"آپ کو کیسے پتہ؟ میں کیا سوچ رہی تھی؟" اس نے بات چھپا کر سوال کیا۔

وہ ہنسنے لگے، پھر مسکرا کر بولے۔ "ایک لڑکی ہے بہت اکیلی، کچھ الجھی الجھی سی، تنہا، اس کی ماں باپ، بھائیوں پر مشتمل ہے دوست وہ نہیں، پھر تمہارا انداز وہ کیا مشکل ہے کہ اس لڑکی کا ہر وقت بھائیوں کی عادت، انداز کو نقل کیا جائے، بیٹھے گڑیا رہتا ہوگا۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ عدیل بھائی کو جیسے سونے کی رات میں شہریار کی ماں کی یاد کا ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔

وہ کافی لے کر جب لاؤنج آئے تو وہ جا چکے تھے۔ پھر کب تک وہ ان کی باتیں سوچتی رہی اسے پتہ ہی نہ چلا۔ عدیل بھائی مندی مندی آنکھوں سے اٹھ کر چلے گئے تھے اور وہ نماز پڑھنے کے خیال سے اپنے بیڈروم میں آ گئی تھی۔

نماز پڑھ کر پھر بیٹھی تو لگی ہی مسکرا کر بہت سوچوں کو پھر سوچ کر رہی تھی، جیسے سمندر کی لہریں کنارے کو چھو کر رہ جاتی ہیں...... وہ آج تک نہیں جان سکی تھی کہ کنارہ بنا اور اور کنارہ ہے یا سمندر...... لیکن یہ طے تھا وہ کبھی اپنی جو دوست بنانے سے پہلے ڈرتی تھی، بہت خاموشی سے حرا علیزے کی باتوں کی ہر سے محو سے جاتی تھی جاری تھی۔ آنکھوں کے اپنے محبت کا احساس حصار وہ بنتا قائم ہو جاتا تھا۔

پتہ نہیں یہ محبت تھی بھی یا محض اس عمر میں محسوس ہونے والا جھکاؤ...... لیکن وہ جب بھی حرا علیزے کو دیکھتی تو اسے لگتا آج تک ان کا ایسا کوئی نہیں تھا۔ اور جس دن وہ نہیں دکھائی دیتا اسے لگتا آج کا دن سورج کی کرنوں میں صرف ناامیدی بکھیر کے گیا ہے۔

چاند کو کیا جا کر کہنے ، محبت کو دوڑ دھوپ کرنے والے دن کے حصے میں سورج کی کرنیں ناامیدی جیسے بکھیر کر کیوں ڈالتی ہیں......؟

کہتے ہیں وقت وہی لوٹاتا ہے جو اسے دیا جائے...... لیکن کبھی کبھی دنیا میں دوسروں کی لوٹائی گئی چیزیں آپ کے حصے میں آ جاتی ہیں، جیسے تمام کوششیں...... جیسے محبت...... محبت کی حسرت......! ماراضگی میں بچھا محبت کا پالنے ہی کی ہمک......

وہ پتہ نہیں، کس فکار میں تھی؟ وہ اندازہ کرتی رہی، لیکن اسے نیند نے بہت جلد اس جگہ سے نکال لیا تھا۔

صبح دو کلاسیں بنک کر کے کالج پہنچی تھی حالانکہ اسے شہریار سے ملنے عدیل بھائی کے فنرل جانا تھا لیکن بس رہ گئی۔ دماغ بھی سنک گیا تھا۔
دراصل تھکی ہوئی تھا۔ صرف ان کا مشغلہ نہیں، پیپر ابھی تو تین ہے۔ رول کرتی رہے، کلاسیں بھی رہی۔ پھر اٹھ کر اسے اچانک عاطف بیگ نظر آ گیا اسے دیکھ کر افسوس کرنے لگا۔ اس کی چیخ چیخ جانے کب تک چلتی رہتی۔ ذہنی نے اس کے منہ میں چکن رول ڈال کر منہ کا جو بہت بھوک کی وجہ سے اس نے گاڑی کے انتظار کے لئے لیے تھے۔ عاطف بیگ رول کھاتے کھاتے اس کے ہاتھ میں پکڑے رول کو بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا تو اسے کہنا ہی پڑا۔

"اخلاقاً اچھا نہیں ہوتا...... ویسے بھی سیاست میں آ گئے ہو تو ان کے طور طریقے سیکھو۔"

وہ بھی کہاں ماننے والا تھا، جھٹ بولا۔ "مسز اوشا تو کہہ رہا ہوں کامیاب سیاست دان وہی ہے جو اپنی پلیٹ چھوڑ کر دوسرے کی پلیٹ پر نظر رکھے اور اسے اڑا لے جانے کی کوشش کرے۔ ویسے ایک بات تو طے ہے، میں سیاست دان ہوں نہ ہوں تم ایک مکمل سیاست دان کی بن گئی ہو۔"

"کیا مطلب؟" اس نے رول سے انصاف کرتے کرتے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا۔

"مطلب سیدھا سا ہے، جو جو آپ پہ کھلے گا وہ فوراً زبان کرنے کو چھوڑ دے۔ وہیں اس کے منہ میں تو تالے... وہیں احتجاج انقلاب بند ہو جائے گا...... ویسے مسز اوشا ایک بات کا ہمیشہ دکھ ہے مجھے۔"

"کس بات کا دکھ ہے آپ کو؟" اس نے نخوت سے ہاتھ صاف کرتے سنجیدگی سے دیکھا اور وہ اس سے بھی زیادہ سنجیدگی سے بولا۔

"یہی کہ اس وقت تمہاری جتنی ضرورت ہوتی اس سے پہلے کسی کی محسوس نہ ہوئی ہوگی۔ لیکن تم ہو کہ ان کی تربیت دریافت کرنے کے بجائے کالج آ گئی ہو اور بحث میں کل بیٹھی ہو۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے، میں قیمتی چیزوں کی طرح آنچل میں منہ دے کر روتی رہوں گی؟ جبکہ میں جانتی ہوں میرا انسانی فطرت کا جو جانتی کی ہے اور مجھ منافق تم خود بھی تو یونیورسٹی میں آ کر حسین چہروں سے آنکھیں سینکنے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ مجھے الزام دے رہے ہو۔"

اس نے پورا کا پورا احساس بے جان کر دیا۔ کیونکہ اس کا موڈ اس لئے بھی خراب تھا کہ حسن جا رہے تھے کراچی نہیں ہوا تھا۔ مہر ان کا خیال تھا شہریار بہت سادہ بلوچ کا تھا جسے ... اور عاطف بیگ دونوں نے سیاست کی لت لگا دی تھی۔

عاطف بیگ اس کے چہرے کے تاثرات بہت سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا اس لیے فوراً بولا۔ "مسز امروز تمہارا دوست ہی ساتھ رہتا تھا، شہری کی بات کیا ہوئی؟"

اس نے جھٹکا...... ابرو وضاحت دی۔

"تم بہت دیر سے ہو عاطف! ایسی دوستی ہوتی ہے کہ دوست کنویں پر تشکیل کر شور زور لگا رہے ہو، ابھی دونوں تب تھا کہ شہری بھائی کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے۔"

وہ جس کو درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا، پھر رسان سے بولا۔

"میں کہتا ہوں ایک وقت ہوا ایک طریقہ ہوتا ہے مسز امروز کام ہینڈل کر رہا تھا اور بہیز بالکل پیچھا ہو میں اس میں ان کی معروف تھا ساتھ ہی شہریار اور کرنل کی قسمت کی طے کر دیے تھے اس لیے وہ نشانہ بنے۔"

"کیونکہ سالار امام اور شہری بھائی مہینہ بانی لاک میں رہتے ہیں کہیں نہیں تھے یقیناً پھر ترس؟" فرار کیا جا سکتا تھا جو تمہیں سمجھ نہ آئے؟"

وہ کچھ نہیں بولا۔ اس وقت وہ اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ ابھی اس کا کام ادھورا تھا۔ شہریار نے خود ہی اسے ہراول دستے کے طور پر بچا کر رکھا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلسہ ہو تب بھی ان کی آواز اونچے ایوانوں میں سنی جائے۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا تھا جب وہ اپنا کوئی نمائندہ باہر رہنے دیتا۔ سو وہ نمائندہ بن سے بچے گھر میں پیدا گیا تھا۔ وہ ایک متوازن کے ساتھ کل کر وہ شہری کی آگ بجھانے میں مصروف تھے۔ سو وہ خاموشی سے اٹھ گیا۔

❀ ❀ ❀

دانیا عبدالرحمٰن نے اس کی اس شرارت کو تب سے دیکھا تھا اور پھر تنہا سے اچکا۔ وہ اپنی گاڑی کا انتظار کرنے لگی تھی اور یہ اتفاق ہی تھا کہ اس کے عین سامنے حمزہ عابد کی گاڑی آن رکی۔

"کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟ کہاں جانا ہے؟"

وہ گومگو کی حالت میں اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔ رہا حمزہ عابد ان کے گروپ میں شامل ہو گیا تھا لیکن ابھی اس سے اتنا فرینک نہیں ہوا تھا۔

وہ کیا جواب دے... دل کا مطلوب سامنے کھڑا تھا۔ لیکن فطری شرم و حیا مانع تھی۔ وہ ہی مجھ کو ... ہے جہاں کہنا ہی تھا...... اس نے سوچا اور جو جملہ وہ منہ سے بولی وہ اتفاقی اعتنا تھا۔

"کیا بات ہے آج آپ کے ساتھ تو ڈرائیور نظر نہیں آرہا؟"

وہ جواب دینے کے بجائے اس کے سوال پر مسکرایا پھر مصنوعی خفگی سے بولا۔

"بس ماما! اب سب کے نہ ہونے پر بھی میں خاصا شریف انسان ہوں۔ مجھے اپنی حدود و قیود پتا ہیں۔ ماما یہ ممکن ہے اپنی جگہ لیکن کچھ اور لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو آپ کے دل میں خاص احترام سے دیکھے جاتے ہیں، جن کی پروا کسی کو اچھا لگتا ہے۔"

اس کے چہرے سے نے یکدم محسوس کیا تھا۔ ہاں مہر ماہ خاموشی سے اس کی کار میں بیٹھ گئی تھی۔ موبائل پر اس نے ڈرائیور کو بھی ادھر آنے سے منع کر دیا تھا۔

گاڑی ہلکی رفتار سے جاری تھی اور وہ مکمل خاموشی میں پتا نہیں دل کی بات کیسے اسے بتاتی تھی۔

دل سامنے ہو تو دل کو اچھا لگنے سے روکنا کار دشوار ہوا کرتا ہے...... خواب نیند کی پلکوں پر آ کر ٹھہرنے لگتے ہیں جیسے کوئی شام کو کہیں ٹھٹک جائے کوئی تحفظ سلسلہ ڈھونڈے..... بظاہر اس کی زندگی نے ابھی وقت سے بازی لگا کر پہلا قدم اٹھایا تھا۔ لیکن محبت......!

کم بخت خاموش محبت نے خاص طرح سے اس کے دل کو چھو لیا تھا......

وہ مسلسل باہر دیکھ رہی تھی، جب حمزہ دادا نے اسے بولنے پر اکسایا۔

"کیا تم اتنی ہی کم گو لڑکی ہو یا؟ یا صرف دوستوں میں ہی ہنسنے کے بولنے کی ہمت کرتی ہے؟"

اس کا دل چاہا وہ کہہ دے وہ بھی دشمنوں میں سے نہیں...... لیکن وہ کچھ نہیں کہہ پائی۔ صرف خفگی سے سانس لینے کے سوا...... حمزہ دادا تھا جو تنگ میں ہے اسی کو ہم پارلر کے سامنے جا کر گاڑی روک کر کے پوچھنے لگا۔

"تمہیں میرے ساتھ اچھا لگ رہا ہے؟ ہم کھانے پینے کی کوئی اعتراض نہیں ہے؟"

"نہیں...... لیکن بہتر تھا ہمارے ساتھ ماہ رخ جو آپ اپنی بھابی بھی ہوتی تو زیادہ اچھا لگتا ہمیں اکیلے......"

"کیا ہم اکیلے؟ تمہیں میرے خلوص پر کوئی شک ہے کیا؟ اور پھر کیا ضروری ہے ہم ہمیشہ سہاروں کے سہارے چلیں؟ اتنا تو حوصلہ ہونا چاہیے کہ اکیلے بھی کوئی کام کر لو۔"

ANCHAL.COM

اس نے چونک کر اسے دیکھا مگر وہاں صرف وہی جذبہ تھا، جس سے وہ بچنا چاہ رہی تھی۔

"پلیز حمزہ! آپ آئس کریم کپ لے کر چلتے نہ کریں۔ میں ہمیشہ اپنے مخصوص وقت پر گھر پہنچنے کی عادی ہوں۔"

حمزہ عابد نے خوبصورتی سے بال کو اسے دیکھا پھر چہرے کے زاویے درست کرتے ہوئے آئس کریم لے کر گاڑی ایک سڑک کے کنارے روانی میں بہا لایا۔

ناچار سر جھکائے وہ آئس کریم کھا رہی تھی۔ جیسے اس سے بڑھ کر کوئی اور کام ضروری نہیں تھا۔ جبکہ وہ کیا کر رہی تھی اس کے گرد ہمیشہ سے ایسے ہی رشتے تھے۔ جن کے ساتھ وہ کر اس نے تحفظ کا احساس پایا تھا۔

شہریار کے نام دوست بھی اسے بہن کی طرح ہی ٹریٹ کرتے تھے۔ لیکن حمزہ طلحہ کے ساتھ کی بات کو اسے بہت مضطرب کرنے لگی تھی۔

گاڑی تیز رفتاری سے چلتی چلی جا رہی تھی۔ گھر کب آیا اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ پورچ میں رکی تو اس نے چونک کر حمزہ عابد کو دیکھا یوں حسرت سے، جیسے سفر ابھی کچھ اور طویل ہوتا تو لمحے اس پر رشک کرتے...... اس کے دل کے لئے خوشبو خواب بنا تے ہوئے وہ لمحے کس قدر مختصر ہو گئے تھے۔

کاش اب ساتھ ہمیشہ کے لئے اس کا ہوتا...... اس نے سوچا اور آواز متوازن کر کے بولی۔ "پلیز حمزہ! اگر میں چلتے۔ میری ماما اور بابا تو آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔"

حمزہ عابد نے چند سیکنڈ لئے اور پھر باہر آ گیا۔ جیسے وہ خود بھی اس ہمسفری کی خوبصورتی سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔

ماما اور بابا نے اسے بہت محبت سے خوش آمدید کہا تھا اور بابا عبدالرحمٰن اس کے لئے کسی طور پر بہتر شخصیت کی نمائندگی کے لئے خوبصورتی میں بتلی گئی تھیں۔

ایک بہت اچھا وقت تھا، جو اس کے گھر میں اگرچہ گزارا جا رہا تھا، اس نے حمزہ عابد کے کپ میں دو چائے انڈیلی اور ابا نے کہتے ہوئے... پہلی بار اس نے کوئی نماز قضا کی تھی۔

کیا کبھی ایسا بھی ہو سکتا تھا؟

ایک سوال اندر رہ گیا اور وہ حمزہ عابد کے جانے کے بعد کتنی دیر تک اس کے ہونے کے احساس میں گم بیٹھی رہی۔ یوں لگتا تھا جیسے حمزہ عابد باہر نہیں کہیں اندر گہرائی تک بنا سا گیا ہو...... کیا یہ ذات اس کی ذات کا حصہ محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے آج پہلی بار آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔

وہی ہر روز جیسا شگفتہ چہرہ، روشن آنکھیں......

کوئی جو شکار سے باہر جھانکنے لگا تھا......

اس کی آنکھوں میں اس کا دل آن بیٹھا تھا اور دل کا تخت...... اس پہ وہ کب براجمان ہو گیا پتہ ہی نہیں چلا۔

❁❁❁

"تم بہت ذہین انسان ہو...... مجھے تم اس لئے پسند ہو کہ تمہاری اور میری عادتیں ایک جیسی ہیں۔"

ہال میں ڈائننگ ٹیبل پہ پلیٹ میں چمچ چلاتی ایک بہت سریلی آواز سنائی دی۔ لیکن آواز ہی تھی کہ سماعت کچھ دیر کے لئے اچھا اور رنگ ضرور کر گئی۔

ماحول کی ساری تابناکی جیسے اس چہرے پہ آ کر ٹھہر گئی تھی، جیسے آدھی صبح آدھی شام ہو گیا تھا...... سامنے بیٹھا خوبرو نوجوان اس چہرے کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ ہی اس کی زندگی کا حاصل تھا حاصل، سب ہی کچھ......

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو حمزہ......؟"

آواز میں واضح غرور تھا۔ وہ جانتی تھی اس کی ذات میں ایسا سحر تھا کہ نگاہ ٹھہرے بغیر آگے بڑھ ہی نہیں سکتی تھی اور سامنے بیٹھا خوبرو نوجوان وہ ایک عام سا مرد تھا ایک بہت عام سا مرد...... جس کے لئے کبھی کبھی خوب صورت چہرہ بھی اتنا ضروری نہیں ہوتا جتنا یہ بات سے کھلتا ہے...... وہ حسن کا دم بھرتا ہے...... بہرحال اس عورت کو کوئی دم زدنی سے اس جیسے عام مرد کو کوئی سروکار نہیں ہوتا......اور وہ بھی کمزوری بنتا اسے طریقے سے کوشش کی جاتی تھی۔

وہ مسکرا رہی تھی اور وہ پلک جھپکے بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ خاموشی میں سے لفظوں نے ہلکا سا سر ابھارا۔

"تم جانتے ہو وہ لڑکی عام نہیں ہے۔"

اس نے شرارت سے اسے دیکھا اور خوشی سے بولا۔ "میرے لئے کوئی بھی لڑکی عام نہیں ہوتی۔ میں لڑکیوں کی بہت قدر کرتا ہوں۔"

"قدر کی عزت کرنے سے بہتر ہے۔"

AANCHAL.COM.PK

عجیب فلسفہ تھا اُسے اعراض ہوا بھی تو کہ جیسے عشق کی آب جو میں بہتا جا رہا تھا، پھر سب کچھ بھول گیا تھا، ہوش آیا تو وہ ایک نیا جنم لے رہا تھا۔

"میں نہیں جانتا، تمہیں بابا عبدالرحمٰن سے کیا گلہ ہے۔ لیکن تمہارے لئے میں اُسے ضرور ختم کردوں گا۔ پھر چاہے تم اُسے کسی بھی طرح کا سزاوار ٹھہراؤ۔ وہ بیٹی کی وجہ کم حسین نہیں اور تم جانتی ہو، کسی حد سے حد بڑھ کے بولتا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ میں اپنے ہوتے ہوئے کسی اور کو یہاں تک نہیں جانے دے سکتی۔"

"پتا نہیں تمہارے سامنے کے بچے کا کب وہ شوہر جانے گا تمہارا دیدار کی ہے۔ ارے لیکن سچ کہنا کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتی ہو؟"

ایک طنزیہ قہقہہ اس کی سماعت کی باہوں میں بانہہ ڈال کے بیٹھ گیا اور وہ اُسے دیکھے گیا جب خاموشی نے سوال کیا۔

"تم...... کیا تم مجھ سے واقعی محبت کرتے ہو حمزہ؟"

حمزہ عابد چونک گیا۔ ہر لفظ میں محبت کی اس کا مستقبل تھا۔ زندگی صوفی حسنی کے سوا کچھ اور نہیں تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کسی سچی محبت کرے گا اور پھر بھی پالے گا۔ لیکن پوچھنے والے ہونٹ اتنے دلربا تھے کہ زندگی میں ایک طرح بے بس جسے نہ لینے کی گنجائش تو نکالی ہی جا سکتی تھی۔ اس نے شدت آمیز نگاہوں اور ان کے ہونٹوں کے قریب انجام کے کہا تھا۔

"محبت میرے لئے تمہارے سوا کچھ اور نہیں۔"

اس نے شرارت سے حمزہ عابد کو دیکھا، پھر ادا سے بولی۔ "تو زندگی میں پچھتاوا ہونے کا باقی رہ جانے والا احساس ہے اس کی بہت ضرورت ہے۔ زندگی کے نئے دروازے کھولنے کا تجسس اور کچھ پالینے کی لگن، یہی زندگی ہے اسے کھونے مت دینا۔ تمہیں نہیں معلوم لیکن زندگی کی رات بہت بھیانک ہوا کرتی ہے۔"

"مگر میں نے تو زندگی کی شام بھی تجھی کو مانی ہے۔"

اس نے دونے لئے بغیر خوشی سے تعلیم کے لئے نیا تقرر تو الگ انسا را وہ ایک لفظ نہیں بولی خاموشی سے کھانا کھاتی رہی، پھر اسی خاموشی سے اٹھ گئی۔

حمزہ عابد بہت دل گرفتگی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ مسند بار کی عمارت کے سامنے وہ اس کے ہاتھ ہاتھوں میں لئے خاموش کھڑا تھا۔ پھر اس نے اسے دکھ بھری حسرت سے کہا۔

"کیا کبھی ایسا نہیں ہوگا کہ میں تمہیں تمہاری مرضی سے پاسکوں گا؟...... کیا کوئی دن ہوگا جب تم مجھے خود اپنی اس سفید ماربل کی عمارت میں داخل ہونے کا سندیسہ دوگی؟... میں کب اس طرح تم سے ملوں گا کہ میری ذات اور تمہاری ذات الگ الگ ہونے کا احساس کھو دیں...... ایک......؟"

نیلم نے اسے اپنی اسی چنچل سے دیکھا جس چنچل سے اس کے اندر کا موم پگھل سکتا تھا...... مرد کی محبت موم کی طرح ہے ایک نگاہ کی تپش نہیں سہہ پاتی اور بار بار پگھل کر بہہ جاتی ہے......

عورت کی محبت لوہے کے ٹکڑے کی طرح ہے جتنی تپتی رہے جب تک کسی ایک بہت اپنی شکل بدلتی ہے...... اور پھر وہ شکل مدتوں برقرار رہتی ہے...... کبھی کبھی اس شکل سے ہٹ کر کچھ ڈھالنا چاہو تو ٹکڑا بھی نہیں رہتا بکھر و ٹوٹ کر ریزہ ریزہ پگھل کر اپنا آپ ختم کر لیتا ہے۔

شاید وہ جانتی تھی وہ ایسی عورت نہیں ہے اور سامنے والا مرد نہیں ہے جس کے لئے ایک پل کو ٹی ہو جائے وہ اس نے اس کی طرح کا جھوٹ گھڑا۔

"بہت جلد ہم اس طرح بہت جلد ملیں گے۔ لیکن اس کے لئے تمہیں اپنا عبدالرحمن کا مان وغیرہ سب میرے قدموں میں لا کر ڈالنا ہوگا...... میں جانتی ہوں وہ تمہاری محبت میں پاگل ہو جائے گا تم سے پہلے پکڑا دے۔ پھر جب وہ تمہارے قدموں میں سر جھکا دے تمہیں مانگے تو تم اسے ٹھکرا دو اپنی شدت سے کہ اس کے پندار اور انا کا شیشہ کرچی کرچی ہو جائے...... اور پھر تمام عمر وہ ان ہی کرچیوں پر چلتا رہے چلتا رہے...... اس کا وجود ختم ہو جائے اس کے اندر کا انسان۔"

"نیلم! تمہیں اس سے اس طرح کی نفرت کیوں ہے؟"

"بس یونہی۔ کبھی کبھی پرانے حساب نئے طریقے سے جوڑنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ اور پھر اس لڑکی کو پہچانو ہے کہ وہ کوئی نہیں ہے مجھے بہت خاص ہے اس میں۔"

"وہ اور خاص لڑکی......؟"

نیلم نے قہقہہ لگایا وہ ایک نئے طرح سے اپنی معصوم کی سادگی پہ ہنسے اور چہرہ چھپانے کا رد کرنے کے واپس سڑک پر ڈال دی۔

اس کے انداز میں کامیابی کا خمار بولتا تھا اور ہاتھ اس کی چوکی کے لمس سے جل رہے تھے۔ وہ یہاں پہ جا کر پھر چھوڑ گئی تھی جیسے جام ابھی تک اسے کھولنے لے... یہی وجہ تھی کہ اس نے گھر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ اس کی سمت اپنے دوست کی کوٹھی تھی جہاں سب کی عیاشیوں کے لئے ایک عمر بھر کا سامان تھا اب تک۔

ولی محمد نے اُسے دیکھ کر دروازہ کھولا تھا۔ وہ گاڑی اندر لیتا چلا گیا تھا پھر اس نے چابی گی گاڑی وہیں چھوڑی اور اندرونی سمت بڑھتا چلا گیا تھا۔ ولی محمد نے اس کی کار کو آگے لے جا کر گیراج میں پارک کر دیا تھا۔ پھر جب وہ چابی واپس لینے ڈرائنگ روم میں پہنچا اس وقت تک عمر دستاویز نے فریج سے اپنے ریفریشمنٹ کا سامان جمع کر لیا تھا۔ وائن، سوڈا، جام اور ان سب سے بھی پہلے ہیٹ ہو جانے کے لئے بیف سینڈوچ جو گلنار بتا رہی تھی اس کے حکم پر کچن میں تیار کر رہا تھا۔ سوڈا اور وائن کی بوتل ہاتھ میں لیے آج کی شام کے لئے ساتھی ڈھونڈنے لگا تھا کہ نمبر ڈائل کرنے کے بعد کسی زرش سے رابطہ ہو گئی تھی۔

وہ اور زرش پچھلے دو سال سے بہت اچھی شاموں کے لطف اٹھانے والوں میں سے ایک تھے۔ اور آج کی یہ تقسیم تنہائی صرف زرش جیسی گرم جوش پارٹنر ہی دور کر سکتی تھی۔ بار بار اس کے ہاتھوں میں تھام کے ہاتھوں کا لمس لو دینے لگا تو دل میں حدت بڑھنے لگی۔ وہ کسی بجھتا جا رہا تھا جیسے وہ اس کیفیت سے اور اس حالت میں سکون بھی محسوس کر رہا تھا۔

پھر کتنی ساعتیں گزریں، جب زرش اس کے سامنے آن بیٹھی۔ سینڈوچ، وائن اور زرش کا حسن...... وہ آدھے گھنٹے ہی میں آؤٹ ہو گیا تھا۔ وہ حسن کے سامنے سر جھکائے دوزانو تھا اور کتنی قریب محبت تھی کہ اس دھوکے پر خوب ہنستی تھی ساتھ رہا اور...... کہ جب وہ ہنستے ہنستے رکی تو اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور کوئی نہیں جانتا تھا یہ بھیگی آنکھیں کس کا نصیب بنی تھیں۔

❀❀❀

"میں تو ہوں ہی بے مروت، لیکن لڑکی! تم نے تو حد ہی کر دی ہے۔ آج سارے رشتے، ہر تعلق کیسے بے مقصد بنا دیا ہے تم نے۔ مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔"

شہر یار عبدالرحمن، دانیا عبدالرحمن کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ بھی ابھی ریلیز ہوا تھا۔ لیکن دانیا عبدالرحمن جیسے اس سے کوئی تعلق ہی نہیں کے موڈ میں بیٹھی تھی۔ آخر کو اس نے بڑی محنت کر کے جو ستایا تھا۔ پھر کچھ اسے ستانے کا حق بھی تو حاصل تھا اسے۔

سلامہ اور سلمان، عاطف بیگ تینوں کچھ دیر پہلے ہی میجر جنرل عبدالرحمن کی کلاس لے کر باہر آئے تھے اور عاطف بیگ باہر نکل کر بھی ان دونوں کو رگید رہا تھا۔ کیونکہ ان دونوں کی وجہ سے آج وہ شہادت کے رتبے پر فائز ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ وہ تو بھلا ہو میجر جنرل عبدالرحمن کا وجود بے قدموں سے شہر یار عبدالرحمن کی عاقبت نا اندیشیوں سے منافق کرتے پھر رہے تھے، ورنہ انہیں پتہ بھی نہ چلتا اور ایک جیتا جیتا وضوح آرٹیکل کی صورت اخبار کی زینت بن کر ان تینوں کے لئے موت کا پروانہ ثابت ہوتی۔ نیم مارشل لا میں ہلکی سی بات بھی بہت وزن رکھتی ہے، اوپر سے نیچے تک سارا سسٹم ہل کر رہ جاتا ہے۔ بظاہر کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں کے باوجود پر وہ بہت کچھ سوچتا ہے اور شہر یار عبدالرحمن کی ٹیم نے اسی خطرناکی کو بھانپ لیا تھا۔ میجر جنرل عبدالرحمن نے اس آرٹیکل کو نکلتی ورکر کے طور پر روکا تھا اور یہی بات وہ انہیں

سمجھا رہے تھے کہ ”میرے یار ذرا سنبھل کے“ بظاہر وہ ان کی بات سے متفق نظر آرہے تھے لیکن کہیں نہ کہیں بغاوت جیسی کوئی چنگاری آنکھوں میں کوند رہی تھی۔

عاطف بیگ اور ساجدہ سلطان جا چکے تھے۔ وہ ان تینوں کو اپنے متعلق اپنے حال پر چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ چکی تھی۔ وہ پہر کی بائیکاٹ والی بات پھر سے ذہن میں کلبلا رہی تھی۔ ماما، بابا سے ماموں اور ممانی کے درمیان ہونے والی گفتگو خود بخود دہرائے جانے پر آمادہ کر رہی تھی۔

محبت وقتی اگر تھی تو اس نے اس کے دل پر دستک دے کر خاموش انتظار سے مات کر دیا تھا۔ وہ ”دوزخ“ پڑھ رہی تھی۔ جب شہریار عبدالرحمن پھر سے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ کتاب پر نظر پڑی تو کھنکتے لہجے سے بولا۔

”کسے دوزخ میں لٹکا رکھا ہے؟“ شرارت سے کہہ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گیا۔ ”محبت ہے جان دوزخ میں بابے جاری نی صنم آ......؟“

”آپ سے مطلب؟“ اس نے اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے غصے سے کہا اور وہ ہنسنے لگے۔ ”اچھا تو بڑا راضی ناراضگی کیوں؟ ام سے بی بی خفا“

”ہاں ہے۔ تو پھر؟“ وہ ہاتھ میں آ جانے والی تھی۔ اسے وہ ساری تکلیف یاد آ گئی تھی جو اس سے ناراضگی جتانے میں اٹھانی تھی۔ مجھے خبر میں کیسا پاپا ماما کہا تھا اور اب منانے کی ضد تھی تو اسے اڑانے کی بات...... دیکھیں زرکشا چاہتے ہیں لیکن کوشش تو بیگ منانے کا بھلا ہے......

”کیا ہے بی بی! بگڑی ہی ناک غصے سے اور بگڑا ہوا بگڑی ہے۔ آخر کیا ارادہ ہے؟“ وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ بابا نے باقاعدہ نظر اس پر سے ہٹائی۔ وہ اس وقت کسی بھی قسم کی کمزوری نہیں دکھانا چاہتی تھی۔

”تو تم نہیں مانو گی۔“ اس نے تیوری چڑھا کر سنجیدگی سے پوچھا۔

اس نے جواب دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور پھر بس شہریار عبدالرحمن اٹھ کھڑا ہوا۔

”ٹھیک...... بہت زیادہ مت تنگ کیا کرو تم جانتی ہو میں ایک ہی بار سارے بدلے لے لیا کرتا ہوں۔ مانتی نہ مانتی تو تمہاری جوتیاں بھی مانوں گا نہیں کبھی۔“

”مت مانیں۔ مجھے کیا آپ راضی ہیں یا ناراض...... آخر کس میں کی کیا آپ کی؟...... چلیں بتا آپ کے آپ نے مجھے اپنی دوستی کی لسٹ سے خارج کر دیا ہے۔ ریا بن ہونے کا ارادہ ہے

AANCHAL.COM.PK

میں مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔"

جگنی کے جواب میں بے پروائی دکھاتی وہ شہریار عبدالرحمٰن پشت موڑ کر اس کے کمرے سے نکل گیا۔

وہ تکی ہوئی بیٹھی رہی مگر دروازہ بند ہوتے ہی تیزی سے کھڑی ہوئی۔ اسے غصہ آ رہا تھا کہ شہریار عبدالرحمٰن کیوں اس طرح ناراض ہو رہا تھا۔ وہ اتنا خاص تھا نہیں...... کیا تھا جو وہ بالوں کو جنبش کر لیتا۔ وہ جانتے ہی تو والی تھی وہ ان کے لئے اس نے سرپرائز کی خاطر کیک منگوا کر رکھا تھا......"

اسے یکدم حارث عبدالرحمٰن اس وقت بہت یاد آیا تھا۔ وہ اس ٹائم میں زندہ تھا اور بہت کم گفتگو کیا کرتا تھا۔ جگنی وہ جانتی تھی شہریار عبدالرحمٰن کے لئے حارث عبدالرحمٰن جان کی طرح تھا۔ وہ اس کی کوئی ضد وہ اس کی کوئی بات ٹالنے کی جسارت نہیں کرتا تھا۔ جگنی اس کے نہ ہونے سے کتنا کچھ فرق پڑ گیا تھا۔

وہ بہت الجھن میں اٹھی کچھ دیر سے بے ساختہ گھبرا گئی۔ سنبھلی ہی تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔ سامنے دلاور خان کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔

"آپ گئے نہیں تھے؟ میں تو سمجھی آپ جا چکے ہیں۔" جگنی حیرت سے بے ساختہ سوال تھا۔ اسے دل کی ترتیب تو عجب تھی جیسے سامنے والے کو چپکے سے جتا جائے کہ "ارے تم یہاں؟ تم گئے کیوں نہیں؟ ہم تم سے اتنا نہیں چاہتے۔" جگنی سامنے دلاور خان تھا اس لئے بنا مانے بغیر کہا۔

"وہ شہریار نے فون کیا تھا کہ وہ کسی پرابلم میں ہے...... مجھے لگتا ہے وہ پرابلم تم تو نہیں ہو؟"

وہ ایک تالیاں تھا فوراً سمجھ گیا اس کا خیال تھا وہ شاید عبدالرحمٰن کے کمرے ہی میں پایا جائے گا۔ جگنی یہاں نہیں تھا اس کا اول اول شبہ تھا۔

"کیا بات ہے جگنی! کیا ابھی تک ناراض ہو وہ ڈر رہا ہے؟"

وہ کمرے میں آ کر بے صبری سے سوال کرنے لگا تھا اور اس نے خفگی سے کندھے اچکا کر کہا۔

"میں کون ہوتی ہوں دلاور خان سے ناراض ہونے کی جسارت کر سکوں؟ آخر کو آپ مستقبل کے ایم این اے جو ٹھہرے۔"

"ہمم...... یار بہت ناراضگی ہے۔ جگنی سنو! اظہار سے متعلق بہت سیاسی ماحول ہے۔"

اس نے طرح دی اور اس کے ہونٹوں پہ بغاوت کی سی مسکراہٹ ابھرنے لگی۔ اس نے یکدم پینٹ کی۔ لمبی سیاہ پلکیں کھل جائے۔

”تمہارا غصہ آہستہ آہستہ کم کیوں نہیں ہوتا ہے ناں؟“

ماتو غصہ ہے، بغاوت ہو کر ماسٹر کے کہنے پر...... صاحب زادی ماں نے ہنس کر دیا اور کچھ کہنے کے بجائے یکدم دروازہ کھول دیا۔

اور پھر بغاوت کیسی تھی، وہ کب رکی تھی۔ ثمینہ کے لیے ڈرائنگ روم میں ڈرامہ کی طرح تخت بند، بہروپی طرح چہرا آگیا تھا۔

محبت کسی بھی طرح ہو گی، وہ کسی بھی رشتے میں ہو تو ادب کی ہوتی ہے...... شہریار عبدالرحمن نے دل میں سوچا اور ثمینہ عبدالرحمن نے ہاتھ پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا اور پھر ان کی ہو لی۔

”اب کہیے، آئندہ کبھی اس طرح ناراض ہونے کا چکر رہیں گے؟“

شہریار نے غلطی میں سر ہلا کر مسکراہٹ اور کھلکھلا کر ہنس پڑی، پورے دل سے...... بہت لاڈلی تھی۔ وہ تیزی سے کچن کی طرف بھاگی۔ آئس کریم کیک اور مٹھائی لے کر وہ کمرے کی طرف دوڑی ہی تھی کہ ملازم نے پیزا لا کر پہنچا دیا۔

”شہریار صاحب نے آرڈر کیا تھا چھوٹی صاحبہ......!“

”ہاں ہاں ٹھیک ہے...... لاؤ مجھے دے دو۔“ اس نے دونوں ڈبے ہاتھوں میں مشکل سنبھالے اور کمرے میں آئی۔

”لیجیے ماما بھائی! میری طرف سے پیزا اور آئس کریم کھائیے۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے کس سخی سے پالا پڑا تھا۔“

شہریار نے منہ کھولا مگر پھر مسکرا کر چپ ہو گیا۔

پیزا کے ساتھ ساتھ انہوں نے آئس کریم بھی کھائی اور پھر ایک انتہائی محبت سے گلے مل کر رخصت ہوتی چلی گئی۔

❁ ❁ ❁

زندگی پہلے جیسی ڈگر پہ چل رہی تھی۔ آج بھی شہریار عبدالرحمن اور عاطف بیگ ایک پارٹی کی کوٹنگ میں شریک تھے۔ وہاں وہ مادر فریز بہ مدی تھیں کہ اچانک پولیس سائرن سے مکمل گونج گئی تھی۔

AANCHAL.COM.PK

کے حالات کے پیش نظر دفعہ 144 لگی ہوئی تھی اس لئے جس کے سینگ جہاں سمائے وہ وہاں بھاگ کھڑے ہوئے۔ عاطف بیگ اور شہریار بھی وہاں سے نکلنے کی آنک کا ذہن فوراً ہی بدل گیا۔
عدیل بھیا بہت سخت خفا ہوں گے۔ اس نے پہلی بار سوچا۔ یا پھر بھی چھوڑو۔ بھاگنے سے بھی معاملہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ سوچ رہی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ یہ سوچتے کہ [illegible] سبھی
اوسان بھی خطا ہو کر رہ گئے۔ جیپ سے عدیل بھائی اتر رہے تھے۔

"بہت ہو گئے چھپنے یار! آج تو اچھی خاصی طبیعت صاف ہو کر رہ جائے گی۔" وہ کراہا۔

عاطف بیگ نے مسکینی سی شکل بنائی پھر چہرے پہ [illegible] بولا۔ "کیوں نہیں، وہاں پیچھے ہی تو ہم تھے، اس لئے لگ رہے ہو سمجھے؟"

عاطف بیگ خوبصورت چشم و چراغ تھا [illegible] کا آج نکلا تھا۔ وہ دوسرے [illegible] گیا تھا۔ عدیل بھائی نے بہت سنجیدگی سے اسے جیپ میں بٹھانے کے آرڈر دیے تھے۔ وہ خاموشی سے کسی پولیس اہلکار کی کارروائی سے پہلے ہی جیپ پر جا بیٹھا تھا۔

پھر تھانے میں وہ کہا! خفا عاطف بیگ یا عدیل بھائی۔ وہ بہت غصے میں تھے۔ [illegible] رہے تھے یہاں تک کہ وہ اس قابل ہوئے کہ ان سے سوال جواب کر سکیں۔

اس نے تو تعجب [illegible] کیا۔ [illegible]...... وہ دوسرے [illegible] بھی [illegible] کھڑے تھے۔

"شہریار عبدالرحمٰن! آپ آخر کب تک اس دوہری کا بہانہ بنائے رہیں گے؟"

ذہن میں کچھ [illegible] کیا کہتا خاموش کھڑا رہا اور صرف عبدالرحمٰن اس خاموشی کو دوہری سمجھ [illegible] گئے۔

"آخر ہم آپ کو کیا سمجھتے کیا ہیں؟"

"انسان!..... یا پھر شہریار عبدالرحمٰن!" دل نے جواب دیا زبان قاصر رہی۔ یہاں تک کہ عدیل بھائی بالکل آؤٹ ہو گئے۔ عاطف بیگ نے صورت حال [illegible] سے بولا۔

"شہری کی خاموشی [illegible] بھائی جان! [illegible] آپ کے سامنے گھبرا کر چپ [illegible] ہماری پارٹی کا نہایت [illegible] ہے۔"

"جی ہاں! [illegible] ان کی کارکردگی۔" وہ [illegible] کے [illegible] سے بولے۔ "آخر تم اپنے [illegible] کیوں [illegible] ہو؟ [illegible] سیاست [illegible] تعلیم [illegible] یار

سیاست دان ہیں تم جیسے نوجوانوں کو پیسے ہی چاہیے ہوں گے کہ تمہاری جوانی تمہارے آدرش تمہارے ساتھ کھیلتے ہیں۔ حوصلہ طاقت تمہاری ہوتی ہے، کمی کسی اور کی رہتی ہے۔ ذہن تمہارا رہتا ہے تو تم ان کی پارٹی لگا لیتی ہے یا خدانخواستہ سمجھدار بچے ہو کہ اس جال میں کیسے پھنس گئے ہو؟"

اس نے ناگواری سے دیکھا مگر کچھ نہیں کہا۔ عاطف بیگ نے بھی اس نکتے سے اتفاق کیا۔ عدیل بھائی نے پھر دیکھا تو پھر سے دونوں کو وارننگ کے ساتھ بند کر دیا۔ یہاں تک کہ پوچھا انہیں پھر سے باہر نکلوا لیا گیا۔

عدیل بھائی اب...... "اس نے ادھر ادھر سوچا مگر کہیں پر کسی اور کو سمجھا [illegible] ساتھ تھا دوست داری نبھا چکا تھا، اسے کسی طرح کے واقعات یاد آ کر دوبارہ سے پہلے کی طرح عاطف بیگ کی طرف دیکھا۔ عدیل بھائی کی صورت نکالی ہوئی۔ وہ پیچھے مڑے کہ ہاتھ پکڑے سے منع سامنے سالار بھائی بھی تھے۔

"میں جانتا ہوں میرا بھائی بچہ اور کافی ضدی ہے، لیکن آپ جانتے ہیں اس عمر کے بچے اپنے ضدی ہوتے ہیں۔"

شہیر نے ہاں میں [illegible] سالار بھائی یہاں سے خفا ہو گیا تھا مگر جب عدالت کے کاغذات دے کر طرف سے ریلیز کرنے لگے تو رک سا گیا۔

"عاطف بھی میرے ساتھ جائے گا بھائی!" اس نے جملے سے سالار بھائی کے بازو کے پاس [illegible] اور بہت ضدی سے کہا۔

عدیل بھائی کاغذات پر دستخط کر کے پیچھے مڑے اس لیے نرمی سے پکارے۔

"عاطف بیگ کل تک ریلیز کر دیا جائے گا شہیر! آج یہ ہمارے لیے ممکن نہیں۔"

"آخر کیوں ممکن نہیں ہے؟ جب میں جا سکتا ہوں تو عاطف بھی ضرور جائے گا ورنہ ہم میں سے کوئی نہیں جائے گا۔" وہ اپنی بات پر قائم تھا۔

عدیل بھائی اسے دیکھتے رہے، پھر کندھے اچکا کر بولے۔ "ٹھیک ہے تمہاری ضد ہے تو پھر ضدی رہو۔ عاطف بیگ کسی صورت ریلیز نہیں کیا جا سکتا، اس پر سنجیدہ نوعیت کے چارجز ہیں۔"

شہیر یار عبدالرحمن کو پہلی بار لگا سیاست اچھی چیز نہیں ہے۔ وہ کبھی اس میدان میں نہیں آیا تھا، وہ تو صرف دوستی میں اس میدان میں لے آیا تھا اسے کہاں معلوم تھا یہ رنگین دنیا ہوں کی سیاست انہیں اس مقام پر بھی لا کھڑا کر سکتی ہے۔ اس نے آج تک جو کچھ دیکھا سیکھا پایا تھا صرف نعرے لگانے تک ہی تھا۔ پارٹی میں پڑھی جان دار تقریر کوئی بھی کر سکتا ہے

پچھلے کئی دنوں سے وہ گھر والوں میں ان رہنے کی ایک معصوم کوشش محسوس کر رہے تھے لیکن یہ عجیب ذہنیت سے چار ہے.......

"آپ جائیے بھائی! میں عاطف کے ساتھ یہیں رہنا چاہتا ہوں۔" اس نے صاف منع کر دیا۔

سالار بھائی بھنا کر چلے گئے۔ عدیل بھائی کوشش کے باوجود اسے ساتھ لے جانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

اور دوسرا دن...... وہ خبر دی کی جیسے اس تک پہنچا تھا۔ عاطف بیگ اور ان کے پول کھل گئے۔ ہر جگہ ہرافی کی گئی تھی۔ جو صحافی ان کے کہنے پر مخالف پارٹیز کے لیے کالم لکھتے تھے، انہوں نے اس کی ذات کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیے تھے۔ کرپٹ کردار، کرپٹ سوچ کے...... ایسی گندی سیاست کہ مسٹر عبدالرحمن کی بزنس میں شہرت حاصل کرنے کی سستی کوشش کی گئی تھا۔ عاطف بیگ پر فراڈ کا کیس بنا دیا گیا تھا۔ الیکشن میں حکومتی املاک کو نقصان پہنچانے کی کوشش پر ایف آئی آر کاٹی گئی تھی اور شہریار عبدالرحمن پر رسوخ کے ناجائز استعمال اور لوگوں کو ہراساں کرنے کا کیس دائر کیا گیا تھا۔

دیا اخبار پڑھ کر گم صم تھا اور عاطف پریشان کھڑا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا ہم اب اس جال سے باہر نکل سکتے ہیں۔ شیری تم نے بھی کمال کیا، کل باہر چلا جاتا تو ان ساری خرافات کا مقابلہ کر سکتا تھا۔"

شہریار عبدالرحمن نے نمالی الطفی سے اسے دیکھا، پھر بولا۔ "مجھے کیا معلوم تھا ساری گڑبڑ کے پیچھے یہ میرا بھائی چھپا ہے۔ محفوظ تھا، عام سی کارروائی ہے۔"

عاطف بیگ نے دیکھنے کا، پھر سرد سے لہجے میں بولا۔ "شیری کہیں ہم استعمال تو نہیں کیے جا رہے؟"

"مطلب؟" اس نے حیرت سے دیکھا۔ اس کا دماغ تو پاپا کے بیان سے ہی اڑ چکا تھا۔ سوں کی ساکھ اور عزت اس کی وجہ سے مشکوک بن رہی تھی، سو دماغ کا خالی ہو جانا فطری عمل تھا۔

عاطف بیگ اس کی کیفیت سے قطع نظر اس کے قریب آ بیٹھا، پھر سنجیدگی سے بولا۔ "یہ تی صاحب کا بیان تم نے پڑھا ہے؟"

"ہاں، انہوں نے ہمیں بے وقوف کیا ہے کہ اگر ہمیں کچھ ہوا تو وہ حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔" شہریار نے سادگی سے جواب دیا۔

عاطف غصے سے جھنجھلا کر بولا۔

"تم...... شیری کے بچے!...... تمہیں سیاست میں آنے کی کس نے اجازت دی تھی؟ ذرا سی عقل سوچ لے کر صرف بڑھ ماری کرتے ہو۔" کچھ لمحے رکا، پھر بولا۔ "شہریار عبدالرحمن! تم اور تمہارے...ب

کیے گئے ہیں۔۔ ہماری پارٹی کو ان ہونے کے لئے کرسی میں جانے کا کوئی ارادہ...... تم سمجھتے ہو، ہاں اس بات کا مطلب؟"

اس نے چمکتی آنکھوں سے عاصم کو دیکھا۔ پھر اور مجھ کچھ جاننے کا، انہیں عدیل عبدالرحمن کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ عدیل بھائی اسے تیز نظروں سے ہی گھور رہے تھے۔ پھر اخبار ٹیبل پر ڈال کر درشتی سے بولے۔

"یہ کیا، کیا ہو گیا ہے تمہاری حماقت سے...... میں جانتا تھا اندرون خانہ یہ کارروائی ہونے والی ہے۔ اس لئے ڈی سی اور ایس پی کی منت کر کے میں نے عدالت کے آف ہونے کے باوجود جو ان کے دوست کے ایک ذریعے تمہارے کاغذات ضمانت تیار کروائے ہیں تاکہ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ لیکن تم......"

"آئی ایم سوری بھائی!...... میں جانتا ہوں کہ......"

"تم کچھ نہیں جانتے۔" عدیل نے اس کی بات کاٹ دی۔ پھر سانس ہموار کرتے ہوئے بولے۔ "تم سمجھتے ہی نہیں، جانتے بھی نہیں، پس بل پیش کرنے کے لئے اس میدان کارزار میں کود پڑے ہو۔ سیاست کا میدان ہے، اسکول کالج کا پلے گراؤنڈ نہیں۔ تمہیں پتہ ہے تمہارے شیخ صاحب اندرون خانہ بھائی کی شخصیت پر کیا داؤ کھیلنا چاہتے ہیں؟"

پھر کچھ وقفہ لیا بات میں اور وہ پھر گویا ہوئے۔

"وہ ہمارے ذہن سے اپنی سیاست چمکانا چاہتے ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو ان کو کوئی بہت صبر ہے کہ پولیٹیشن بن گئے ہیں، پھر مشہور شخصیت ہو کر اخبار تمہاری تحریروں سے بھرے پڑے تھے؟...... بے وقوف لڑکے! وہ صرف تمہیں نوجوانی اور جذبات کے فائدہ اٹھانے کے لئے۔ پر تم غلط رہے تھے۔ پاپا کے نام کو کیش کرنے کے لئے انہوں نے تمہیں۔ اب کیا، تم ایک صنعت کار کے بیٹے ہو، تمہیں اگر کچھ ہوتا ہے تو ساری صنعت کار برادری حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوگی۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟"

عاصف بیگ نے اس کا ہاتھ پکڑا، پھر مدھم ہو کر عدیل بھائی سے بولا۔ "کیا ایسا ممکن نہیں کہ کل کی ہڑتال میں سے آپ نمبر پی کو رابطہ کروا دیں؟"

"ایسا صرف کل تک ممکن تھا، اب یہ ممکن نہیں ہے عاصف!" عدیل بھائی نے تاسف سے کہا۔

پولیس کے کچھ لوگ پانچ منٹ بعد ہی تھانے آنے والے تھے۔ یہ معاملہ بامعنی جب نکل گیا تھا۔ عاصف بیگ خاموش کھڑا تھا۔ شہر بھر کے بااثر بلند ہو کر جن کی وجہ سے پریشان تھا۔ مراجسنگی اس وقت اور

بندھ گئی تھی کہ پاپا یہاں آنے والے ہیں۔ پولیس کے سامنے وہ اپنا اچھا تاثر بھی بنانا چاہتے ہیں۔

"خیریت..... انکل اس معاملے کو ویسے ہی ہینڈل کر رہے ہیں، جیسے ہماری پارٹی چاہتی ہے۔ انکل کو چاہیے، کوئی رائے نہ دیں۔" عاطف بیگ نے مشورہ دیا۔

ملک سرمد ملان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تسلی دی۔

"تم فکر نہیں کرو، تم دونوں کے لیے میں ایسا کام کر رہا ہوں کہ تمہیں حکومتی پارٹی تو ویسے ہی ریلیز کرنے کی کوشش میں ہے۔ مخالف پارٹی یعنی ہماری پارٹی بھی روڑے اٹکانے کی کوشش ترک کر دے گی۔ تم فکر نہیں کرو، بس آج کی رات ہے، کل تم لوگ چھوٹ جاؤ گے۔"

عدیل بھائی دونوں کی رائے سے متفق نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے اور شہریار عبدالرحمٰن خود کو ذلیل درجے کا احمق محسوس کر رہا تھا۔ دھواں دھار تقریریں کرنا، جلسے کو کنٹرول کرنا، بڑے کارندوں کا پانی رائٹ مائیک کر کے سوشل میڈیا پر سب ذہانت مگر یہ طے تھا وہ اس میدان کے لیے نہیں بنا۔

"یہاں سے نکلتے ہی میں سیاست کو دو حرف کہنے کی جسارت کروں گا اور تم......؟" اس نے عاطف بیگ کی طرف دیکھا اور وہ بشاشت سے ہنسنے لگا۔

"مجھے کچھ نہیں آتا، سوائے گڈ بک میں رہنے کے علاوہ۔ سو میں تو یہیں رہوں گا۔ ہاں، بس جوشیلا شیر جوان بننے سے ذرا احتیاط برتوں گا۔ تم تو جانتے ہو، پچھلے کتنے پولیس ریکارڈ ہی ہوا، وائرل دونوں کی پانچوں انگلیاں گھی میں رہتی ہیں۔ اور اگر وہ مجھ جیسا زیرک ہو یعنی جاوید کروا دیتے لینے والا تو سمجھو حکومت کسی کی بھی ہو، دست ہمارے ہی ہاتھ میں رہتی ہے۔ وزیر سے لے کر وزیر اعظم اور بہت زیادہ پیسہ کرنے والے بیوروکریٹ ان سب کو انگلیوں پر نچانا بہت آسان ہے۔ بس 'سب اچھا ہے' کا ٹیپ چلاتے رہو، کام نکالتے رہو۔"

شہریار عبدالرحمٰن اسے گھور کر دیکھتا چلا گیا، پھر سکتے سے نکلا تو خفگی سے بولا۔ "مجھے پہلے ہی تیری ایمانداری پر شک تھا۔ ہر موقع پر پیچھے سے غائب ہو جاتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا تو ہم سے بھی سیاست کر رہا ہے۔ ویسے پلان تیرا اچھا نہیں ہے۔ کسی کام کا نہ ہو گیا تو بہت کام نکلواؤں گا میں اپنے، پرمٹ این او سی لینے کے لیے، بس تیری عدالت میں ہی جانا ہے پہلے۔"

عاطف بیگ ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا، پھر شرارت سے بولا۔ "کام نکلوا لوں گا تیرے۔ لیکن دیکھ، ابھی اس میں یاری نہیں چلے گی۔"

شہریار عبدالرحمٰن نے اس کے بال کھینچ لیے، پھر اسی کے سے لہجے میں بولا۔ "میں جانتا ہوں، ایک نمبر کا خبیث ہے تو۔ یار، یہ تو اپنا جگاڑ بھی کس کر دے۔"

عاطف بیگ نے اپنے کالریوں کو آگے جیسے شہریار عبدالرحمن نے اُس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہوں۔

وہ دونوں باتوں میں مصروف تھے، جب پریس کے سامنے انہیں ریلیز کیے جانے کی چھوٹی سی تقریب رکھی گئی۔ ایسا لگتا تھا، وہ اچانک کوئی بہت بڑے سے لیڈر بن گئے ہوں۔ پاپا باہر گاڑی میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے پریس کانفرنس سے مخاطب ہونے کا ارادہ عدیل بھائی کی ایما اور نقطہ نظر سمجھانے پر ترک کر دیا تھا۔ بالآخر دو گھنٹے بعد وہ دفتری کارروائی کے بعد پاپا کی گاڑی میں آ کر بیٹھ سکا۔

پاپا کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ انہیں یہ سیاست اور وقت کا زیاں قطعاً پسند نہیں تھا۔ ہمیشہ اگر وہ چپ رہ جاتے تھے تو صرف اس لیے کہ اس عمر میں بچے غیر نصابی سرگرمیاں اختیار کرتے ہی ہیں۔ لیکن یہ سرگرمیاں یہاں تک اور اس نوعیت کی ہو جائیں گی، انہیں تو توقع نہیں تھی۔

گاڑی میں بالکل خاموشی تھی، جب پاپا نے ناگواری سے پوچھا۔ "تم نے اسموکنگ کب سے شروع کی؟"

اُسے اس اچانک سوال پر جھٹکا سا لگ گیا۔ تین دن سے وہ دن بھر کے اسموکنگ کر رہا تھا اور پاپا کی ناک اتنی حساس تھی کہ اس کی شرٹ میں بسی ہوئی خوشبو کو وہ نظر انداز کر ہی نہیں سکتے تھے۔

"تمہیں لگتا ہے، کسی اور طریقے سے سمجھانا پڑے گا۔" اس کی خاموشی سے پاپا کو غصہ آ گیا اور وہ دھمکی آمیز لہجے میں کہنے لگے۔ بہت سی غیر ضروری اور فضول باتوں اور مینشن کی اس اسموکنگ کا سارا الزام ٹھہرا کر وہ صاف بچ نکلنا چاہتا تھا لیکن یہ ہوا اس کی کم عقلی تھی...... اگر وہ اچھا وکیل ہوتا تو خوامخواہ کیوں کورٹ میں پڑا رہتا!!

وہ کمرے تک سے ہوئے پاپا کو موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش میں لگا رہا مگر گھر آنے تک وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

پھر گھر میں داخل ہوتے تو ہنگامے اُس کے منتظر تھے۔ ماں نے اس کی اچھی طرح گوشمالی کر دی۔ دنیا نے الگ اس کو عاطف بیگ اور سیاست کو ملا جلا کر اتنی سنائی تھیں کہ ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی تھی۔

اس کے ہر جملے کا اختتام اس جملے پر ہوتا۔ "اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو؟"

اور وہ اس جملے میں چھپی محبت اور اس کی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو خوب انجوائے کر رہا تھا۔ پاپا اور عدیل بھائی کا غصہ الگ تھا۔ وہ یہ سب کچھ برداشت کر جانے کے موڈ میں تھا لیکن پہلے دو سالہ ارسلان عرف راجو صورتے بنے کا شتانی تھا جو کہ وہ جان گئے، یہ معاملہ اس نے اتنے آرام سے کیسے ہینڈل کر لیا۔

بمشکل وہ دنیا کی عدالت سے چھوٹا ہی تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ کوریڈور میں تیز قدموں سے نکلتا چلا گیا۔ گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ بج بج کر خاموش ہو جانے والا موبائل پھر بجنے لگا۔ اس نے اجنبی نمبر

بیچ کی بات ان کو لنک کر دی گئی، کچھ دیر بعد پھر بیل ہونے لگی تو اطلاع آئے رسیو کیا ہی تھا کہ سب کی ثابت اس نے بے ساختہ سامنے والے کو سنا دی تھی۔ جب دکان ”شہریار بھائی!“ کی پکار پر اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

”جازب عبدالرحمٰن......!“

وہ شرمندہ ہوگیا اور مسکرائے جا رہا تھا۔ اپنا کی طرح اس کی بھی بہن نہیں تھی۔ ”آپ ٹھیک تو ہیں اسماعیل بھائی نے بتایا تو نہیں کیا؟ آپ بالکل ٹھیک ہیں نا؟“ اور وہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ تبھی وہ جازب عبدالرحمٰن جو کیا جوان کی بات پر یقین کرلے جب ماموں نے کی ثابت سے گھر آنے کی اطلاع دے کر اس کی جان چھوڑی۔

اس نے بائیں ہاتھ سے کارڈ رائیو کرتے ہوئے ملامہ کے گھر سے پھر ایک کپ تک پوری فون کا اختتام ہوا کیا اور گھر میں داخل ہوا تو بہت فریش تھا۔

ایک انسان جو محبت سے بھرا ہو۔ جواب میں صرف ایک دل کی محبت بھی پاس ہو جیسے دل سے لگتا ہے...... جب کوئی وہ جو احساس دے تو تمہارے مرنے سے زندگی میں زندگی کم لگتی ہے اور وہ جانے کی تو پھر یہ احساس پورے وجود میں محبت کی خبر کی نئی کونپل دیتا ہے...... اس کے اندر بھی یہ زندگی بچ رہا تھا۔ بابا عبدالرحمٰن، جازب عبدالرحمٰن، ملامہ ارسلان یہ سب محبت کرنے کے حسین سہارے تھے۔

وہ جب بھی گھر میں داخل ہوا۔ ملامہ کی ای ٹاکر یہ ان سے ہیں ملامہ سمیت وہ بھی پیارے ہاں ہی کہتا تھا بخت پر ان کی نظر آئیں۔ دل ایک دم اٹھا تھا۔ گھر میں ماما کے مرنے کی وجہ سے مرجانے والی محبت کو دیکھتے ہوئے آگے نئے سرے سے جلا دیتا تھا۔

”السلام علیکم اماں جی!“ وہ ان کے تخت پر بیٹھ گیا۔ ماں کی مارکر بیٹھتے ہوئے عرض بھیجا رہا تھا۔

شاکرہ بانو نے سلام کا جواب محبت سے دیا اور ان کی مسکراتے ہوئے بھری آنکھیں اسے دیکھ کر جگمگانے لگیں۔ ملامہ ارسلان ان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ تین بیٹیوں کے بعد اللہ نے اس نعمت سے سرفراز کیا تھا۔ انہیں لگتا تھا وہ جتنا ملامہ سے محبت کرتی ہیں اتنی شاید دنیا میں کسی سے کسی کو بھی نہیں۔ تبھی تین سال پہلے جب پہلی بار وہ ملامہ کے ساتھ گھر آیا تو شاکرہ بانو تک غلط سوچتی رہی تھیں۔ محبت تو دل کی بیماری میں رکھا ایسا خزانہ ہے کہ جتنا آپ اسے دوسروں کو دان کرتے جاتے ہیں اور آپ کو لگتا ہے آپ کے اندر یہ ختم ہو چکا ہوگا تبھی دل کی بیماری پھر سے بھرتی لگتی ہے...... جب آپ سمجھتے ہیں، یہ کوئی

دُعا ہے جو آپ کی روح کو لگ گئی ہے، جو تاعمر زائل ہونے والی نہیں۔

محبت اوپر والے کا تحفہ ہے...... دینے والا ہاتھ...... سالار اسے ہاتھ جھکا کر لیتا ہے جب مانگتا تھا۔

اسے وضع دار ذوق بھی کہہ سکتے ہیں اور سادہ دل بھی......

محبت وضع دار اور سادہ ہو تو خوب رونق لگاتی ہے...... آنکھ اور بے بہرہ ہو تو خود بھی روتی ہے، دوسروں کو بھی افسردہ کرتی ہے...... رنگ چاہت کا لگتی ہے، بے رنگ کر دیتی ہے......

مگر تایا جان کو خیال تھا وہ جس شہریار عبدالرحمٰن پر محبت نچھاور کرتی ہیں وہ خود بھی وضع دار ہے اور محبت کی وضع داری کو بھی سمجھ لینے والا ہے۔ احسان کا سلوک اس کے ساتھ ہر روز پہلے سے زیادہ بڑھتا چلا گیا۔ کبھی کبھی تو سالار سارا دن بھی ڈسٹرب ہو جاتا۔

"میری ماں کو چپکے چپکے چرا رہا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں تیری چالاکی۔"

وہ منہ بنا کر ہنسی کے مخصوص انداز میں جاتا، پھر شرارت سے کہتا۔ "ارے بالکل اللہ بھی ہوتی ہے تجھے۔ یہ تو ماں ہیں تو ہیں۔ میں کون سا انہیں گھر لے جا رہا ہوں۔ ہاں بس تھوڑی محبت کی مٹھاس ہے جو دل لینے سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ دل بے چارے کے سو خون معاف، یہ معصوم سی بہو ہے۔"

سالار کندھے پر ہاتھ مار کے کہتا۔ "بس بس...... لفظوں سے نہ کھیل، تجھے تو رائٹر ہونا چاہیے یا صحافی۔"

وہ دونوں کو ہاتھ ہلا کر کہتا۔ "نہ بابا نہ۔ مجھے دونوں میں سے کچھ نہیں بننا۔ سیدھا سادہ کاروبار پڑھوں گا، تعلیم کے بعد پاپا کا بزنس سنبھالوں گا اور......"

"......اور عیش کروں گا......" سالار اسے طرح دیتا تو وہ ہنسنے لگتا۔

بابا کے دفتر میں کام کرنے والے ملازم بڑے کم عمر لگتے۔ ان کی آنکھوں میں چمک تیرتی رہتی۔ وہ محبت سے بابا بچہ بن جاتا...... بالکل ایسے ہی جیسے امی ابو کے زانو پر سر رکھ کر آرام سے لیٹا ان کے ہاتھ سے مٹی ہوئی سونف نکال نکال کر چبا لیتے۔ ہاں سے کھانا دے رہا تھا۔

اس نے آج دوبارہ سالار کو نہیں پوچھا تھا حالانکہ وہ یہاں صرف انہی سے ملنے آیا تھا۔ لیکن اس گھر کا ماحول اسے اپنی طرف یوں کھینچتا تھا کہ سوچا سمجھا سب بھول جاتا تھا۔

WWW.ANCHAL.COM.PK

ثاکرہ بانو اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔۔۔ وہ بھی آنے کی وجہ نہیں جاننا چاہتی تھیں۔ شدید سوال کرکے اس کا موڈ غارت کرنا نہیں چاہتی تھیں کہ اسے لگے اسے اپنے گھر آنے کے لئے بھی وجہ کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ ان کے گھر کے دروازے ان کے دل کے دروازے کی طرح پاٹوں پاٹ کھلے تھے اور شہریار شہباز اس گھر میں مکین کی طرح حق سے رہتا تھا۔

"آج کتنے دن سے تم کہاں تھے؟ بالکل عید کا چاند ہو گئے ہو۔"

"بس...... ویسے ہی، کچھ مصروف تھا۔" اس نے بات ٹالی۔

ماں تھیں، ٹی وی اور اخبار سے الگ تھلگ رہتی تھیں کیونکہ اپنے دل کی دنیا بہت نازک تھی، ان کا بی پی لو ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی اس کی غیر موجودگی کی اصل وجہ کا انہیں علم نہیں تھا۔ مگر زہرہ پرویز کا جو آج کل بچوں کی چھٹیوں کی وجہ سے گھر آئی ہوئی تھی، سو فوراً حاضر ہوئی۔ بانو اس کی پسندیدہ کمال خاں بدنیتی تھی۔ وہ ثاکرہ بانو کے قریب آ گئی پھر اس کے بال مٹھی میں لے کر مصنوعی غصے سے بولی۔

"آپ کو معلوم بھی ہے ماں! آپ کا لاڈلا اتنے دن کہاں غائب ہو کر آ رہا ہے؟"

اس نے لاڈ کو گھورا مگر بھی ایک آنکھ کے کونے میں چھپائی مگر زہرہ کہاں ماننے والی تھی، پوری دلداہ سامنے بیٹھ گئی۔

ثاکرہ بانو نے ساتھ ہی کلیجہ تھام لیا، پھر وہ کہنے لگیں: "وہ بھی کیا اچھا بھلا ہے، پھر سے پوچھنے لگیں۔" "کہیں غلط تو نہیں پکڑا پولیس نے؟"

"غلط رہے...... امی جان! بس بھائی کے گھر گئی ہے۔ ترچھی آنکھ سے دیکھتی تو بھائی کے بھائی آنکھ نکالے...."

"زہرہ بچی!...... خدا کا واسطہ ہے، کیوں پیچھے پڑ گئی ہو میرے؟" وہ زہرہ کی زبان کی طراری سے تنگ آ کر فوراً ہاتھ جوڑ کر منتیں کرنے لگا۔ "ہاں ہاں امی ایسا کچھ نہیں ہے، حیا زہرہ کو غلط فہمی ہو گئی ہیں۔ وہ بس کچھ غلط فہمیاں تھیں اپنے بارے میں، بس وہ مٹ گئیں کہ سیاست کا کھیل اچھے لوگوں کا نہیں ہے۔ اب آپ بے فکر رہیں، آپ کا بیٹا اچھا بچہ بن گیا ہے۔ ویسے صاحب بہادر کہاں ہیں؟ اس سے ذرا مذاکرات کرنے تھے۔" اب اس نے ثاکرہ بانو کی حمایت کی کھیپ میں ہاتھ مارا تھا۔

ثاکرہ بانو شوہر کی مصروفیت کا تذکرہ کر رہی تھیں کہ شاید دو ڈھائی گھنٹے میں وہ گھر آنے والا تھا۔ وقت گزارنے کے لئے اس نے ٹی وی کھول لیا، پھر زہرہ کی باتیں سن رہی تھیں کہ پاپا اور ماما ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔

"ارے زہرہ..... تم دونوں تو وزیروں، سفیروں سے بھی دو ہاتھ آگے نکلے۔ سارا میڈیا پاگل کر کے رکھ دیا۔"

"کچھ نہیں کرتے" اس نے شرمندگی سے اس کے منہ پر کشن کھینچ کر مارا، پھر چائے زہرہ کے ہاتھ سے لے کر تپائی پر رکھی، پھر بایاں ہاتھ بڑھا کر سلامہ کو اپنے قریب کھینچ کر بولا۔ "اب بتاؤ کیا جادو کیا تھا تُو نے؟ قسم سے مجھے تو لگتا تھا میری اور عاطف کی سیاسی موت لکھی جا چکی ہے۔"

سلامہ شہریار کے لہجے کی گھبراہٹ کا لطف لیتے ہوئے ہنسنے لگا، پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔

"سیدھی سی بات ہے، یوسف صاحب نے جو گیم تمہیں لانگ لائٹ میں لانے کے لیے کھیلی تھی، میں نے وہی گیم ان پر الٹا دی۔ جتنی پکی ان کے رسوخ بھی ہیں، بھائی کا بھی جرم ہے، دو چار صحافی تو اپنی بھی جیب میں رہتے ہیں، سو میں نے اپنی پارٹی کی مخالفت میں دو تین آرٹیکل چھپوا دیے کہ یہ پارٹی کی طرح تم جیسے کردار افراد کو سیاسی بھینٹ چڑھا جاتی ہے۔ سارے بڑے اخباروں میں یہ آرٹیکل لگے تھے، سو حکومت کو تو تمہیں چھوڑنا ہی تھا، لیکن اپنی پارٹی جو چاہ رہی تھی، وہ سب سے اب بار آ پڑی۔ سارا کیس کی بات تھی یار، اب تمہیں تو یہ فیصلہ لینا ہی تھا، ورنہ پھنسی والی صورت حال میں تو کچھ رقم دے کر کام ایسے ہو جاتا کہ عدیل بھائی تک کو خبر نہیں ہوتی۔ قانون کی ناک کے نیچے جرم کیسے ہوتا ہے، میرے خیال میں اب تمہارے لیے یہ مبہم سوال نہیں ہوگا۔ ویسے آپس کی بات ہے، سیاست کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے جناب؟" سلامہ نے بھنویں اچکا کے دیکھا۔

شہریار نے کانوں کو ہاتھ لگائے، پھر مسکین صورت بنا کر بولا۔ "بھئی یہ سیاست تو جس کا شدہ ہو، بچائے وہی باپ ہے، میری تو توبہ جو پھر ان خرافات میں پڑوں۔ اماں بابا کا بزنس کیا برا ہے، ہزاروں پہ حکم چلاؤ، آرام سے عیش کرو اور بس۔ یہ سیاست کا جنجال تو نہیں ہم سے۔ زندہ ہو تو مرا اور مر جاؤ تو حرام موت۔ کوئی مجھ پہ آنسو بھی نہ بہائے۔ سو سمجھو اب خیر سے باز آ گئے ہیں۔"

سلامہ اس کی باتوں پہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور زہرہ یکدم درمیان میں آ ٹپکی۔ "ایک منٹ، اگر یہ کوئی خوشی والی بات پہ ہنسنا ہنسانا ہے تو میرے خیال میں شیری کو آج کی ٹریٹ دینی پڑے گی۔"

شہریار نے محبت سے زہرہ کو دیکھا، پھر مسکرا کر بولا۔ "آہو جی، میری پیاری بیگم، اگر یہ ہنسنا اپنی حالت پر طنز سے ہنسنا ہوتا تو بھی تمہاری ٹریٹ پکی۔ چلو تیار ہو جاؤ، آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔"

"شیری! صرف آئس کریم؟"

زہرہ جنید نے منہ بسورا تو وہ ہنس پڑا، پھر شرارت سے بولا۔

"بھئی اگر آپ دو بچوں کی والدہ محترمہ ہوکر بھی فن لینڈ گھومنے کا شوق رکھتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

زہرہ جنید نے بسکٹ پلیٹ سے اٹھایا پھر شوہر کی سمت دیکھ کر بولیں۔ "دونوں بچے اپنے ابا کے پاس ہیں، ان کا دل لگا ہوا ہے، اپنے ابا سے فرمائش کرکے گزر رہے ہیں اور ہم...... ہم اپنے بھائی کے گھر میں فی الحال۔ سو بھائیوں پر ذمہ داری ہے کہ کچھ خاطر مدارات کی جائے۔"

شہریار نے سر جھکا کر بہت ہی باادب بن کر مسکرا کر بولا۔ "آپ کی فرمائش سر آنکھوں پر۔ بھائیوں کے لئے اعزاز ہے کہ بہنیں یہ عنایت۔ چلئے دس بجے چلتے ہیں۔ شام کی چائے اور ڈنر کرکے کھانا کھاتے ہوئے دس بجے گھر آجائیں گے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں، رات کا کھانا بھی میری طرف سے ہو جائے گا۔ اور کچھ خدمت؟"

"بس اتنا ہی کافی ہے باقی پھر کسی دن لگا کے لوں گی۔" زہرہ جنید کہتے ہوئے اٹھ گئیں۔

شہریار ہنسنے لگا اور ملاحہ پر سوچتی نگاہ ڈال کر بولا۔ "ناشر کو ہمارا پروگرام پتہ چلا تو وہ بہت خفا ہوگی، میرا خیال ہے راستے میں سے اسے اس کے ہاسٹل سے لیتے ہوئے نہ چلیں؟"

شہریار نے ملاحہ کا پروگرام سنا تو فوراً بولا۔ "ارے ماہا بھی تو ہے۔ ٹھیک ہے میں اسے میسج کر دیتا ہوں، وہ بھی آجائے گی تو وقت اچھا کٹ جائے گا۔"

ملاحہ نے اس کے پروگرام کو فائنل کر دیا۔ سو وہ تینوں باہر آگئے۔ گاڑی ملاحہ چلا رہی تھی اس لئے شہریار راستے بھر میسج کرتا رہا۔

❁ ❁ ❁

جب وہ ہاسٹل پہنچے تو ایک حیرت ان کا انتظار کر رہی تھی۔

"ناشر کہاں ہے؟"

"وہ ہاسٹل کے کسی فرینڈ کے ساتھ گئی ہوئی ہے۔"

ملاحہ نے سوال کیا، شہریار نے جواب دیا اور زہرہ جنید نے کسی انہونی کی طرح دروازے سے اندر جھانکتے دیکھا۔

اندر سے آنے والی ہر لڑکی تو ایسا لگ رہا تھا جیسے باہر سے آنکھیں اندر جھانک رہی ہوں... کسی تماشے کا حصہ بننے والے تھے؟...... انہوں نے ایک ہی بات سوچی تھی۔

سلامہ اور سلمان کا گھرانہ روشن خیال تو تھا لیکن ایک حد تک۔ حدود و قیود کا قائل تھا۔ لڑکوں کے ساتھ لکھنا پڑھنا، تعلیمی سرگرمیاں برقرار رکھنا سب کچھ ٹھیک لیکن پرسنل قسم کے کاموں..... سلامہ اس کے سخت خلاف تھا۔ وہ واچ مین سے معلومات لے رہا تھا۔ انشا یعنی خود ہی آیا جایا کرتی تھی۔ کبھی اس نے کسی معاملے میں روک ٹوک نہیں کی تھی۔ لیکن آج اس کی دی گئی آزادی اس پر طعنہ زن ہوگئی تھی۔ وہ بھائی ہو کر باپ کی سی محبت سے دیکھ بھال میں مگن تھا اور یہاں..... وہ یہاں سے اکثر کسی کی گاڑی میں روز آدھے گھنٹے کے لئے چلا جایا کرتی تھی۔ کہاں؟ واچ مین خود لاعلم تھا۔ سلامہ نے اسے زیادہ کریدا نہیں تھا لیکن واچ مین کی آنکھوں میں جتنا طنز جتنی تضحیک ان دونوں کے لئے تھی، اس نے اس کا دماغ گھما ڈالا تھا۔ وہ دونوں واپس لوٹ رہے تھے۔ گاڑی کے باہر کھڑی زہرہ جبیں نے انہیں اکیلے آتے دیکھا تو جھنجھلا کے بے ساختہ سلامہ کا ہاتھ تھام کر بے قراری سے پوچھا۔

"کچھ پتہ چلا انشا کہاں ہے؟"

شہریار جو اپنی ہی سوچوں میں گم تھا، ان کے لہجے پر چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ زہرہ ہلدی کی طرح پیلی ہو رہی تھیں۔ شہریار نے آنکھ کے اشارے سے سلامہ کو متوجہ کیا۔ سلامہ نے فوراً اپنے چہرے پر تسلی کا تاثر لایا۔

"پلیز آپ پریشان نہ ہوں..... واچ مین کہہ رہا تھا وہ اپنی کسی دوست کی امی کی اچانک طبیعت کی خرابی کا سن کر اس کے ساتھ ہاسپٹل گئی ہیں۔ ہم اس کا گھر میں ویٹ کر لیتے ہیں۔ شہریار کی ڈنر پھر کسی دن پہ انحصار رکھتے ہیں۔ کیوں شہریار؟" سلامہ نے شہریار کو دیکھا۔

"کیوں نہیں ڈیئر مدر، پھر کسی دن سہی۔ لیکن آپ پریشان نہ ہوں، وہ ابھی کچھ دیر میں آجائے گی۔"

جھوٹی تسلی نے انہیں مزید پریشان کر دیا تھا..... سلامہ واپس گھر چلا گیا تھا اور شہریار نے بھی ڈیوٹی پر واپسی کی تھی کیونکہ اس نے دنیا اور کرنٹ چھوڑ کر ہی وہاں آنے کا عندیہ دیا تھا۔ ابھی ظاہر ہے وہاں کے ساتھ ہی ہوئی تھی۔ سو یقیناً وہ بھی کہیں کھڑی تپ رہی ہوگی۔ وہ بظاہر گاڑی چلا رہا تھا لیکن دماغ شہر میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ انسپکٹر ذوقی کے تبادلے کے مطابق وہ بہت کم انسپکٹر آیا کرتی تھی۔ سلامہ اور شہریار نے یہ باتیں سن کر ہضم کر لی تھیں اور واچ مین سے اس دوسرے فرد کی بابت پوچھتے رہے۔ وہ اس سارے معاملے میں دو ٹوک تھا۔ شہریار نے زہرہ کی وجہ سے گاڑی لے جانے کو بھی کہا تھا لیکن وہ اپنی جھونک میں زہرہ کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ گیا تھا۔ بقول اس کے یہی پارکنگ کا مقرر ان کے لئے عام بات تھی مگر یہ سفر شہریار کے لئے قطعی غیر دلچسپ سفر تھا۔ سوائے کی پیشکش کو مسکراہٹ میں رکھ کر وہ اسے واپس کر گیا تھا۔

شہریار بروقت میں ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ دانیا حسب توقع پاپ کارن لئے ایک بینچ پر اکیلی بیٹھی تھی۔ معمول کے برخلاف صرف اس کی محبت کی وجہ سے ان معاملے کی ٹینشن لئے ہوئے اس کے ہمراہ لہجے میں اس کے کان کے قریب پکارا۔

"ہیلو ڈول! مجھے معلوم تھا تم ضرور یہیں ملو گی گھر رک ہی نہیں سکتیں۔ بھوت کا سن کر تمہارے منہ میں پانی آ ہی جاتا ہے۔" اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو شہریار کی ہنسی ... حسب توقع اسے گھورنے لگی۔ وہ بینچ پر بیٹھا چلا گم لگا کر پھر شرارت سے بولا۔

"تم اس طرح گھورتی ہو تو بالکل ڈائن لگتی ہو اور تمہیں پتا ہے مجھے ان سے کتنا ڈر لگتا ہے۔"

"جانتی ہوں میں، آپ ڈائن کے کتنے جیسے فرزند ہیں۔" دانیا نے چڑ کر اور رہتے ہوئے منہ سامنے کر لیا تھا۔

"چلو، آؤ کہ ہم کھا لو۔ ... کچھ سوچو نہیں رہا بھوت تم پر ادھار رہی۔"

"تم پر ادھار رہی؟" اس نے انگلیوں کو لب دبنے کی کوشش کی تو وہ شرارت سے ہنسنے لگا پھر ہار مان کر بولا۔

"او کے بھائی کی جان! تمہاری بھوت مجھ پر ادھار رہی۔ پھر کبھی سہی۔" اس نے قریب کے آفس کی [illegible] داخل ہوئے پھر رُک رہے تھے کہ دانیا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"کیا تم کسی کے ساتھ بیٹھی ہو بھائی؟"

اس نے دانیا کی آنکھوں کو تعاقب کیا اور دانیا سے کہیں زیادہ حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ چہرہ وہ کیسے بھول سکتا تھا اس چہرے نے اس کی زندگی میں تب کو تعارف پر نیب دیا تھا۔

"آپ جانتے ہیں اسے؟" دانیا نے اس کی آنکھوں میں شناسائی پڑھ لی۔

"نہیں تو۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ پتہ نہیں وہ اسے کیوں تکنے لگا تھا کہ وہ یکدم ایک مجمع [illegible] گر گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ ان جگہوں سے بھاگنے میں کامیاب ہو پاتا۔ شرم اس کا نظر میں دیکھ کر مسکرانے لگا۔

بہر طور قسمت ساتھ نہیں دیتی ماں اور اس کی قسمت...... اس نے اللہ سے خوب شکوہ کیا مگر بات شکوہ سے آگے نکل گئی تھی...... سو وہ مجبور نڈھال خراماں خراماں اس کے تخیل کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"ہیلو شہریار کیسے ہو؟"

دانیہ آئس کریم کھاتے کھاتے چونک کر اس پری تمثال کو دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں سوال تھا۔ شہریار نے سوال سے جان بچانی تو اس نے کھٹاک سے پوچھ لیا۔ "آپ کی تعریف، بڑے بھائی!"

"شہریار سے کیا پوچھتی ہو، میری تعریف تم اس کی زبان کب سے رطب اللسان ہے۔ لیکن یہ ماننا کی نیس ہے، ویسے مجھے جانانہ کہتے ہیں۔"

"جانانہ......" اس نے زیرِ لب دہرایا اور ساری نظر شہریار پر جھک گئی۔ وہ بیوقوفی کی حد تک پہنچنا چاہتی تھی لیکن شہریار کی نظر میں یہ بات قطعی غیر اہم تھی سو وہ زیادہ اہم بات کی طرف لوٹ آیا۔

"تمہارے ساتھ یہ لڑکی کون ہے جانانہ؟" لہجے میں خاص شیرینی تھی اور اس کو تعریف کی توقع...... دانیہ کو ماننا پڑا وہ اس کی آواز میں بہت رس ہے۔ مردوں کو متوجہ کرنے کے لئے اسے خاص محنت کی ضرورت نہیں تھی...... اور دانیہ اس صلاحیت سے خود بھی آگاہ تھی، سو تیسری کرسی پر بیٹھ کر بتانے لگی۔

"ایک مڈل کلاس گھر کی لڑکی ہے۔ بے وقوف لڑکی۔ کم وقت میں زیادہ آسائشیں حاصل کرنا چاہتی ہے...... ویسے یہ مڈل کلاس کے لوگ شارٹ کٹ کیوں مارنا چاہتے ہیں؟"

"شارٹ کٹ مارنے کی خواہش کسی کلاس سے مختص نہیں ہے۔ خواہش کے پیچھے دوڑنے والوں کا دم ہے۔ عجیب خواہش ہے کہ مجھی میں مستعد ہو۔ مستعدی میں لینے کی تمنا تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔"

دانیہ کو بہت برا لگا اس طرح ریمارکس دیا جانا...... خود اس کے گھر یقیناً مڈل کلاس سے تھے اور بہت اچھے، لیکن وہ تھی بیچاری۔ پھر یہ لڑکی صرف مڈل کلاس کو کیوں رگید رہی تھی۔ جانانہ نے لہجے کی تیزی دیکھی تو شہریار کے قریب جھک کر بولی۔

"تمہاری بہن تو غصے کی بہت تیز لگتی ہے، کہیں بہن مرچیں تو نہیں کھاتی؟"

اتنا صاف! ایک...... وہ بھنا گئی۔ آخر یہ محترمہ تھیں کون؟ اور اچانک رنگ میں بھنگ ڈالنے کیوں چلی آئیں؟ شہریار کی عادت تھی، بچپن سے چھوٹی بات بھی دانیہ سے کہے بغیر نہیں رہتا تھا۔ پھر اتنا بڑا چیپٹر اس کی زندگی کی کتاب میں اضافی طور پر شامل ہو گیا تھا اور اس نے اس کی خبر تک نہیں کی تھی اسے...... شہریار دانستہ دانیہ کی آنکھوں سے نظر بچا کر واپس مائرہ کے معاملے کی طرف آ گیا تھا۔

"تم اس لڑکی کی کیا مدد کر سکتی ہو؟ تم کوئی ویسا بیک کی چیئر پرسن تو ہو نہیں۔"

"ہاہاہا..... ایک اور قہقہہ..... اس نے تمسخر بھری آنکھوں سے اسے دیکھا، منظر میں لگا دنیا اچانک تبدیل ہونے لگی تھی۔ شہریار کو کبھی کبھی کم عقل لگ رہا تھا مگر مجبوری تھی سو بس کہہ دیا۔

"اس میں ناچنے کی کیا بات ہے؟ میں نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی تھی؟"

اماں نے اسے دیکھا، پھر غرور لہجے میں بولی۔ "بیٹا میری سوچ پر تم جب بھی سوچو گے تمہیں شکست ہوگی، تمہاری پرواز خیال میرے خیال کی حد کو بھی نہیں چھو سکتی۔ جہاں سے تمہاری سوچ ختم ہوتی ہے وہاں سے میرے ذہن کی سوچ شروع ہوتی ہے۔ ایک کہاوت ہمارے ہاں بڑی مشہور ہے۔ رہی اس لڑکی کی بات تو یہ خوب صورت ہے، کم عمر ہے، اچھے چہرے کا پیار باتی ہے، ہمارے مزاج کی ہے، ہمارے کام کی ہے، وہاں تعلقات ہیں، تمہارے مزاج میں اچھے مددگار ثابت ہوتے ہیں سب بے چاری لڑکی اداکاری کا شوق رکھتی ہے، جس میں اس سے ماڈلنگ کراؤں گی اور پھر کیسے کب یہ میری ہوگی، پتا بھی نہیں چلے گا، اسے معلوم بھی نہیں ہوگا۔"

بابا بانی تو ہے برداشت جواب دے گئی۔ وہ شہریار کیسے لوگوں کو دوست بنانے لگا ہے۔ جس شہریار کا ان سے پر خلوص تعلق تھا وہ اس کی جاسکتی تھی کہ وہ کسی لڑکی سے محبت کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔

"بھائی! گھر نہ چلیں؟" اس نے شہریار کی آنکھوں کا پیچھا کرتے ہوئے کہا۔ اسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ کمرہ سیاست کی طرح بھی اس کا کوئی نتیجہ نہ تھا۔ وہ بار بار اسے دیکھ رہا تھا نے بحث سے اسے دیکھا۔

"ہم! کمرہ کیا نہیں لے گئی، کیوں نہیں جارہے بھائی؟" اس نے سوالیہ بھائی کی طرف دیکھا۔

"ہم اسے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ وہ جانان کے ساتھ ہے، تم نہیں جانتیں جانان کون ہے؟" اس نے کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ انھیں کمرہ کا پتہ بتا کر.... میں کمرہ سامنے آ گیا۔

"تانیہ کس کے ساتھ ہے؟" ملائکہ کی جان آنکھوں میں آگئی تھی۔ شہریار نے ہولے سے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مدھم لہجے میں کہا۔

"وہ جانان کے ساتھ ہے اور سب سے بہتر ہے۔"

ملائکہ اور ماں نے تیزی سے اعصاب سے اندر کی طرف قدم بڑھائے۔ شہریار ایک دروازے پر کھڑا تھا۔ جب اس نے جانان کے کمرے کی طرف دیکھا تو سب کچھ کہا... وہ کمرے کی طرف بڑھا

ANCHAL

گیا سنہرا سے خوشی تھی۔

''تم اسے لے جانا چاہتے ہو لے جاؤ لیکن یاد رکھو اب یہ تمہاری نہیں ہو سکتی۔ جس کے دماغ میں تمہیں باتوں والا بھر سکتا۔ وہ کچھ نہیں سوچتا۔ پھر بھی سلطان کی بیٹی نہیں ہے۔ تم اسے اپنی بیٹی بنا کر گھر میں نہیں رکھ سکتے۔ یہ دنیا داری ہے۔ پہناوے سے صبح شام یاد رہو [illegible] کے فلسفے سے بچے ہوئے افسانے سنا کر تم اسے ساتھ کی باقی کی زندگی نہیں بنا سکتے...... یہ ہوتی ہے اسے کامیابی اور [illegible] کرتی ہے جو کامیابی دروازوں کے اندر بیٹھ کر بھی نہیں ملتی۔ اس کے لیے دروازے پاٹوں پاٹ کھلے رکھنے پڑتے ہیں۔''

''یہ دروازے اور گھر...... تم کیا جانو یہ کس عافیت کے استعارے ہیں۔ تم جیسے لوگ کہاں......''

سالار [illegible] نے اپنی طبیعت کی نفاست کے تحت تحت جملے کہے کہے [illegible] ہاں شاید وہ کوئی ریمارک ضرور دے دیتا لیکن بیٹی کا ہاتھ تھامے ہوئے بھائی کی زبان تھم سی گئی تھی۔ سامنے کو چہرہ [illegible] دیکھا تھا لیکن وہاں اپنی کسی غلطی کا احساس مفقود تھا۔

''[illegible] ام سوری ہم اندر سے بھائی آپ کو نہیں سمجھ سکتے۔''

''[illegible] جلدی۔'' مامہ نے اسے زور سے اپنے ساتھ کھینچا اور پہلے سے رکی ہوئی ٹیکسی میں بٹھا کر وہ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جانانہ نے ارد گرد [illegible] بھی اور کسی شرمندگی کے بجائے [illegible] سے بولی۔ ''بیٹا...... یہ مجھے کبھی نہیں سمجھ سکتی۔ دنیا کی [illegible] ہماری مرضی کے بغیر [illegible] رہے گی اور میری سوچ پیدا [illegible] نئے سفر کی جستجو کرنے کو شکل کھڑی ہو گی۔ یہ دروازہ [illegible] اللہ نام [illegible] بھی......''

وہ [illegible] بچیاں اندر [illegible] شہریار نے پلٹ کر دیکھا اور کار میں فرنٹ سیٹ پر [illegible] جانان بابا نے تیز نظروں سے اپنے [illegible] بھائی کو گھور کر دیکھتے ہوئے [illegible] سے پکارا۔

''آج آپ کا ارادہ گھر جانے کا ہے یا ابھی بھی جانانہ صاحبہ کے جلووں کے ساتھ کھڑے کھڑے صبح کریں گے؟''

اس نے عجیب بے بسی سے اسے دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے [illegible] کے [illegible] میں بہنے لگا۔

گھر پہنچا تو [illegible] کی منتظر تھی۔ سالار بھائی کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ وہ [illegible] کا کھانا کھا کر [illegible] رہے تھے۔

"آخر ہیتی افتاد کیا پڑی۔ مزاج تیز تو ہے مگر اب کس بات پہ موڈ بگڑا ہوا ہے۔ بیٹر سے خوا اچھا بھلا آیا تھا۔" ماما تو سے چیکنگ کرنے سے زیادہ وہاں ان کے کمرے کے باہر کھڑی ہول رہی تھیں۔

"کہیں عائشہ نے تو فون پر کوئی الٹی سیدھی بات نہیں کردی؟" نانو نے خیال ظاہر کیا جو ماما نے فوراً سے مسترد کر دیا۔

"کہاں اس ماشاء اللہ کیسی بچی ہے کہاں؟ سیدھی سادی اللہ میاں کی گائے ہے وہ تو۔"

"ہاں کہنے کو تو ٹھیک رہی ہو۔ مگر سنا ہے لگائے بجھی کبھی کبھی کی تمہاری دیتی ہے۔"

ماما پھنے گئیں۔ پارٹی مینشن میں جتنا عجیب کی ڈیکش۔ سالار بھائی کا مزاج تو پہلے ہی کچھ گھنٹے کا ہی رہتا تھا اسے انہیں عادت ہو گئی تھی اب وہ پریشان ہونے کے بجائے رنجیدہ رہ کر جل بھن کر رہی تھیں۔ ان لئے صبح سے لے کر اب تک کی باتیں وہ دہرائے جا رہی تھیں جن میں سے کسی پر شبہ بیجا ہو رہا تھا۔ ابھی کی بھی دعوت نے کیا کام کوشش کی جا رہی تھی جنہیں ہنوز رو رہا ول تھا جہاں تک کہ دادیا نے ان کے درمیان آ کر سوال کر ہی ڈالا۔

"سالار بھائی کے سامنے شاندار وڈی ہیپ؟"

شہریار نے گھر چھوڑ کر واپس ہوا ہی کی طرف چلا گیا تھا۔ ماما تو اس کے آنے یا جانے سے غرض ہی کہاں تھی۔ وہ انہوں نے اسے نظر انداز کر کے دادا کو سالار عبدالرحمٰن کے مزاج کی گرمی کی وجہ ڈھونڈنے کا کام سونپ دیا۔

"میں اندر جاؤں؟" اس نے سر پہ ٹن باندھتی بیگم کی سی ترجیح کر رہی تھیں مگر ماما نے اسے اندر دھکیل دیا۔

سالار بھائی کے ہاتھ میں جو تھا جسے وہ اٹھا کر دروازے پہ مارنے ہی والے تھے کہ اچانک اسے سامنے دیکھ کر ہاتھ روک لیا۔

"تم...... فرصت مل گئی شہریار عبدالرحمٰن کی کمپنی سے؟"

ایک نیا سلسلہ...... غصے کی وجہ کو بھی رہی ہو۔ ہے سمجھا کہ اس وقت ان کی رخ شہریار کی طرف مڑ گئی تھی۔ وجہ اس کے دو نفیس انہیں یہ بدگمانی تھی کہ شہریار عبدالرحمٰن کو پاپا اور دادا جتنا پیار کرتے ہیں، وہ ان کے حصے کی محبت میں ڈاکہ ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ ان کے خیال میں وہ ان کی قلوبی گئی تھی اس لئے سب سے زیادہ حق ان کا تھا [illegible] سے اس کی زیادہ شہریار سے ٹھنی تھی۔

اب دل پر زور نہیں، محبت سب سے تھی اُسے مگر ماں کو جیسے کوئی ایک بچہ زیادہ عزیز ہوتا ہی ہے، اسی طرح اسے شہریار عبدالرحمٰن جیسا فرد لگتا تھا اور یہ بات سالار عبدالرحمٰن سے مخفی نہیں ہوتی تھی۔ وہ جانے سوچتے دماغ کو قابو کیا اور دھیرے دھیرے بیڈ پہ بیٹھے بے یار و مددگار جیسی شکل بنائے، سالار عبدالرحمٰن کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اس وقت ایک ماں ہی کی طرح اس کا دل بھائی کی محبت سے بھر گیا تھا۔

”سالار بھائی! کیا ہوا؟.....کوئی پرابلم ہے؟“ وہ ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان کا ہاتھ، ہاتھوں میں لے کر لجاجت سے بولی اور سالار بھائی تھے کہ جانے کون سی حمایت کو جو گئی یہ جذباتی تسلی..... فوراً پلکوں پہ آنسو آن رکے، اس کی تو جان ہی نکل گئی۔ سالار بھائی آنسوؤں کو جذبات کو حماقت گنتے تھے اور آج یہ اتنے دل گرفتہ سے......

”کیا ہو گیا ہے بھائی! بزنس میں کوئی پرابلم ہے یا عائشہ بھابی سے جھگڑا ہو گیا ہے؟“

اس نے امکانات گنوائے۔ وہ ماہ پہلے ہونے والے نکاح کے تحت ایک لڑکی کو بیاہنے کے لیے اچھا سا خطاب دے کر سوال کیا مگر وہ کچھ نہیں بولے۔ انہوں نے اب چہرے کے تاثرات یوں کرو ڈ کر لیے تھے، جیسے جذباتی کمزوری کا لمحہ آ کر گزر گیا تھا۔

”کچھ نہیں گڑیا!..... کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ بس ویسے ہی بزنس میں تھوڑی پرابلم تھی، جس نے ڈسٹرب کر دیا تھا۔“ وہ صاف مُکر گئے۔

وہ جانتی تھی، وہ صاف جھوٹ بول رہے ہیں، لیکن یہ طے تھا، ان کی مرضی کے بغیر ان سے کچھ اگلوانے کی کوشش عبث ہی تھی۔

”میں ماما سے کہہ کر آپ دونوں کی خوشی کو رخصت کروانے کا کام بہرحال ہیومنٹ کروانی ہوں۔“ اس نے ماحول کو ہلکا کرنے کے لیے ان کی اور عنایہ کی شادی کی بات چھیڑی، لیکن سالار بھائی پر اس کا اثر بہت حیرت انگیز ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

”عائشہ.....!“ وہ عائشہ کا نام زیر لب دہرا کر یوں خاموش ہو گئے، جیسے کوئی غلطی کر کے اُسے چھپانے کی کوشش کرے۔

”اچھا بیٹا! کیا تم میرا کمرہ ٹھیک کر دو گی؟ میں دراصل کچھ دیر سونا چاہتا ہوں۔“

وہ بیڈ سے کھڑے ہو کر سوالیہ بولے تو اس نے دوسرا لفظ کہے بغیر اُن کے کمرے کی بے ترتیبی کو ترتیب دینے کی سعی شروع کر دی۔ بکھری ہوئی چیزوں کو کمرے کے ڈسٹ بن کی نذر کر کے وہ بیڈ کی چادر درست کر رہی تھی، پھر تکیہ اٹھا کر اس کا غلاف ٹھیک کرنے کے خیال سے اس نے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ سالار بھائی نے تیزی سے اسے ہاتھ کے قدم سے روک دیا تھا۔

"اسے رہنے دو۔ گھر جا کر میں خود ٹھیک کر لوں گا۔"

"ایز یو وش بھائی!" وہ کندھے اچکا کر دوپٹہ درست کرتی باہر نکلتی چلی گئی۔

اس کے باہر نکلتے ہی سالار عبدالرحمن واپس اپنے بیڈ پر آن بیٹھے۔ تکیے کے نیچے رکھی تصویر ایک بار پھر سے ان کی انگلیوں کے لمس سے جیسے زندہ ہو اٹھی تھی۔ پتہ نہیں، یہ محبت تھی یا اٹریکشن لیکن انہیں اس لڑکی کے لیے اپنے اندر بہت کچھ محسوس ہوتے تھے...... انہیں اچانک ایک پی ویڈنگ پارٹی یاد آگئی تھی۔ جس میں وہ پاپا کی جگہ دعوت دینے گئے تھے۔ ان کا موڈ پارٹنر سے بیزار ہو کر جلا کرتا تھا اس لیے یہاں آ کر بھی وہ تعارف کے بعد ایک صوفے پر بیٹھے کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ آنکھیں محفل میں شریک لوگوں سے معائنہ کر کے لوٹ رہی تھیں کہ کوئی ان کے بہت قریب آن کر بولا۔

"ہیلو! کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟"

انہوں نے چونک کر دیکھا اور دل، دل ان کے اختیار میں کہاں رہا تھا۔ پتہ نہیں، حسن کی کوئی مثال ہوتی بھی تھی یا نہیں، لیکن انہیں لگنے لگا تھا، جیسے حسن اپنا وجود رکھتا ہو وہ ان کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

پنک کلر کی نیٹ میں سادہ سی سلیولیس بلاؤز شیفون کٹ بال...... گویا گلاب کا مہکتا پھول......

خوشبو اتنی خوب صورت ہو سکتی ہے، پہلے وہ خوشبو کو محسوس کرتے تھے، لیکن آج خوشبو ان کی وجہ سے معطر ہو رہی تھی۔

"اگر آپ نے میرا ٹھیک ٹھاک جائزہ لے لیا ہے تو کیا میں یہاں بیٹھ جاؤں؟" آواز بے باک لہجہ...... انہیں تھوڑا سا عجیب لگا لیکن حسن کسی بھی لہجے میں ہو وہ حسین لگتا ہے۔ انہوں نے خوشی سے اس لڑکی کے لیے اپنے صوفے پر جگہ بنائی۔ وہ ڈرنک کا گلاس لیے ان کے برابر آن بیٹھی پھر سالار عبدالرحمن کی طرف دیکھ کر بولی۔

"کیا ہے مسٹر سالار! آپ اتنی اچھی پارٹی کا مزہ خراب کرنے کے لیے یہ کیا کافی لے کر بیٹھ گئے ہیں؟"

سالار عبدالرحمن نے کافی کا کپ ایک لمحے میں گلاس ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ ان کے اس بے ساختہ ردعمل پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ سالار عبدالرحمن اس کی ہنسی میں کھو سے گئے۔

"آپ کا نام؟" یکدم انہوں نے تعارف چاہنے کی شدید خواہش کو دبانا نامناسب سمجھا اور وہ حسین مجسم مسکرا کر انہیں دیکھنے لگا۔

"جانانہ...... مجھے جانانہ کہتے ہیں۔ ویسے لوگ جو بہت بے تکلف ہوں، ان کے لبوں سے مجھے صرف جان سننا بھی اچھا لگتا ہے۔"

"جان؟...... واقعی آپ ہیں اتنی خوب صورت کہ اگر جان آپ جیسی ہو تو کون کافر جینا نہ چاہے گا؟"

"ہاہاہا......" ایک فطری قہقہہ...... وہ لمحے بھر کو رکی، پھر بولی۔ "آپ مجھے تو کہیں سے بھی بزنس مین نہیں لگتے۔ خشک بحثیں یا تقریریں مجھے تو کبھی اچھی نہیں لگتیں۔ مگر دوستوں کا اصرار ہو تو پھر مجبوراً آنا پڑتا ہے۔ مگر میں نے طارق سے پہلے کہہ دیا تھا مجھے تمہارے خشک ذہن پارٹنرز سے گفتگو کرنے کا کوئی شوق نہیں ہوگا۔ اگر مجھے بلا رہے ہو تو کوئی اچھی گفتگو کرنے والا ڈھونڈ کر رکھنا۔ سو اس نے ہی آپ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میری دلچسپی کی گفتگو صرف آپ سے ہو سکتی ہے۔ سو میں نے ایک سیکنڈ نہیں لگایا اور چلی آئی۔ ویسے دوستی کرنے کے لیے اگر آپ بھی کوئی ڈرنک گلاس لے لیتے تو......" اس نے کمال مہارت سے اکسایا تھا۔ مگر ظاہر یہ کیا کہ فیصلے کا اختیار سالار عبدالرحمن کے پاس ہی ہے اور یہ چال بری نہیں رہی تھی۔ انہوں نے قریب سے گزرتے ویٹر کو ڈرنک سرو کرنے کا عندیہ دیا۔ پھر پانچ سیکنڈ بعد وہ شیری کا گلاس تھامے ہوئے تھے۔ وہ کوئی عادی پینے والے نہیں تھے لیکن کبھی کبھار پارٹیز میں ایسا سب چلتا تھا۔ ان کی پیشہ ورانہ مجبوری تھی۔ مگر وہ شیری سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ بقول ان کے دوستوں کے، وہ قطعاً خواتین نشہ کرنے کی عادی ہیں۔ شیری بھی کوئی ان جیسے بندے کو بد لحاظ کرتی ہے؟ مگر وہ لا کو ملامت کرنے پر بھی اس سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ انہوں نے پہلا سپ لیا تھا پھر جانانہ کی طرف دیکھا۔ وہ انہیں دلچسپ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"کوئی خاص بات ہے؟" سالار عبدالرحمن نے اس کی دلچسپ نظروں کا تعاقب سوال سے کیا اور وہ شیری کے گلاس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"مجھے لگتا ہے آپ عادی نہیں ہیں ان چیزوں کے...... کیا آپ کو لگتا ہے ڈرنک کرنا آپ کے بس کی بات نہیں، تو یہ چسکی لے رہے ہیں؟"

سالار عبدالرحمن ایک لڑکی کے سامنے ہلکی ہونے کے خیال سے مسکرا کر بولے۔ "نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں کہ میں ڈرنک کر کے آؤٹ ہو جاؤں گا۔ بس مجھے اس لائف اسٹائل کی عادت ہی نہیں۔ بزنس کے نقطہ نظر سے جو ضروری ہو وہ بدل کر لیتا ہوں۔ مگر ہمیشہ بچا پایا...... مجھے کچھ اتنا خاص نہیں لگتا۔"

جانانہ اسٹائل سے پہلو بدل کر انہیں دیکھنے لگی۔ سالار عبدالرحمن اسے ہی دیکھ رہے تھے اس لیے فوراً نظر چرا کر کے بے وقت بولے۔

"جانانہ! آپ کو معلوم ہے آپ کتنی خوب صورت ہیں؟"

جانانہ نے فطری لہجے سے ان کے اس جملے کا استقبال کیا، پھر ادا کر کے بولی۔ "کیا آپ کو لگتا ہے مسٹر سالار! پھول خود اپنی خوشبو سے اس کی تاثیر سے آگاہ ہوں؟"

"پھر آپ اس طرح کی خالص مردانہ پارٹیز میں کیوں آ گئی ہیں؟" وہ کہنا نہیں چاہتے تھے مگر روانگی میں کہہ گئے تھے، تبھی ان کے دوست آفندی نے ان کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔
"کیا کہتے ہو سالار، اب خالص کا تو مت نکالو۔ جاناں اگر ہماری پارٹیوں میں آنا چھوڑ دے تو ہم پارٹی دینے والے کا کنٹرول کیوں چھپائیں؟ ہاں یار اسی سے تو ہماری محفل تھی ہے، یہ تو واقعی آرام ہا گئی ہے۔ لیکن تم مشکل ہو کر مت سوچا کرو کہ حسن ہو تو کواڑ کے پیچھے رہے۔ بھئی میں کہتا ہوں، حسن ہو تو سب کے سامنے ہو، سب پر ظاہر ہو، جیسے ماہ کامل کی روشنی چھپائے نہیں چھپتی اسی طرح حسین عورت کے چہرے پہ اس سے ملنے ملتے رہنے کی چمک ہو، وہ کب مرتی ہے۔"
سالار عبدالرحمٰن کے چہرے پر ناگواری آ گئی۔ جس قسم کے ماحول میں وہ رہ رہے تھے وہاں میں کسی عورت کے متعلق اتنی عامیانہ گفتگو کب ہوا کرتی تھی؟ سو انہیں یہ سب کچھ عجیب لگا تھا لیکن صرف شروع میں...... پھر وہ پارٹیز میں جانے کے، جاناں سے ملنے کے کافی عادی ہو گئے تھے کیا انہیں ایسی پارٹیز کے طور طریقے بھی از بر ہو گئے تھے اور ایسی پارٹیز میں جانے کے ڈھنگ بھی آ گئے تھے۔
جاناں ان سے اتنی مہربانی میں بہت فرینک ہو گئی تھی اور وہ جان گئے تھے، جاناں کس مارکیٹ میں چکر کی پروردہ ہے، انہیں قبول کر صرف جاناں کے ادا چاہیے تھے۔ سب کچھ بہت اچھا چل رہا تھا۔ ان کی دوستی تھا محبت، جاناں کی ادا رسائی کی قربت، محبت کی مدت سب کچھ متوازن تھا کہ اچانک ان کی زندگی میں رقیب چلا آیا۔ وہ پہلے تو جان ہی نہیں پائے، ان کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ وہ جاناں کی محبت کو بھی اپنی محبت کا حق سمجھ رہے تھے، اس محبت کو دونوں ہاتھوں سے وصول کر رہے تھے کہ ساؤ لپیٹ دی گئی۔ وہ منید مارش کی عمارت کے دن میں کئی کئی مرتبہ چکر لگا لیتے، مگر جاناں کی ایک جھلک دیکھنے کو ترس جاتے۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ دو رخافت منید مارش کی عمارت میں داخل ہو گئے۔
سب کچھ بہت اچانک ہوا تھا اور جو شخص جاناں کے ساتھ بیٹھا تھا وہ اس سے بھی بڑا دھچکا تھا ان کے لئے......
"شہریار عبدالرحمٰن......!" تمام عمر انہوں نے اس شخص سے جتنی نفرت کی تھی، انہیں لگ رہا تھا کہ اتنے سالوں کی ساری نفرت بس اس ایک لمحے کی نفرت پر حاوی جاتی، جب بھی سالار عبدالرحمٰن کے اندر کی نفرت اپنا حق ادا کر رہی تھی۔
"تم نے مجھ سے چیٹنگ کی ہے۔" انہوں نے شہریار کو ایک طرف کر کے صرف جاناں سے شکوہ کیا۔
وہ مسکرا دی گئی، پھر عام سے لہجے میں بولی۔ "تمہیں تو معلوم ہے سالار، میں محبت کو میڈل کی طرح گلے کی زینت نہیں بنا سکتی۔ تم مجھے متلون مزاج بھی کہہ سکتے ہو، ایک انسان کے ساتھ مسلسل ملتے رہنا،

تمہاری خوب صورتی کے باوجود مگر کیسے تمہارا ہی ہو جاتی...... آخر کب تک میں نے سوچا اس محبت کا بھی مزہ چکھ لوں۔ جب شہری نے مجھے پروپوز کیا تو میں نے یونہی کنوارا بیٹھا تھا سو اندر کے لئے ساتھ رہنا میرے
مجھے اس کے سانولے رنگ نے ڈس لیا ہے۔ یہ حسین نہیں مگر ہے بہت چارمنگ۔" وہ طنزیہ بولی، پھر روئی "بڑی بات ہے چیٹنگ کی تو تم نے بھی تو مجھ سے محبت کی ہے۔ محبت کا دم بھرتے رہے، گھر میں بسانے کے ارادے بھی رکھتے مگر نکاح کرنے کے باوجود اس بات سے کبھی مجھے آگاہ نہیں کیا۔ ایک طرح سے تم پہلے سے شادی شدہ تھے مگر پھر بھی تم نے یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی؟ تمہیں پتہ ہے، مجھے جھوٹ بولنے والے کتنے برے لگتے ہیں۔ اگر تم مجھ سے ایسا نہیں کرتے تو ہماری دوستی تاحال قائم رہتی۔ پھر شہریار عبدالرحمن بھی ہمارے درمیان کبھی نہیں آ سکتا تھا۔"

سالار عبدالرحمن شہریار کو دیکھتے رہے وہ دیکھتے رہے۔ پھر پشت موڑ کر رو دیے۔

"مجھے تم سے اتنی نفرت ہے شہریار! کہ اگر نفرت خود مجسم ہو کر بھی آ جائے تو میرے دل کی نفرت کے احساس سے اس کا کلیجہ بھی پھٹ جائے گا۔"

شہریار عبدالرحمن انہیں خاموشی سے دیکھتا رہا۔ عائشہ بھابی کی کراہت نے اس کے قدم روک لیے تھے۔

"کیا میں واقعی اسے بغیر طلاق کا بدل لوں کہ میں دوسری ہوں شہری؟ تمہیں میں نے اپنے چھوٹے بھائیوں کے جیسا سمجھا ہے تو کیا تم اپنی بہن کا گھر بسنے سے پہلے اجڑتا دیکھ سکتے ہو؟"

بس یہ وہ لمحے تھے جنہوں نے شہریار عبدالرحمن کو سالار عبدالرحمن کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

پھر ایسے کئی مواقع آئے تھے اور آج جب کسی پرانی پارٹی کے تذکرے میں دوستوں نے کسی طرح سے جانا اور شہریار کو تو وہ گھر آ کر بھی اپنے اندر کا غصہ فوری طور پر نکال نہیں پائے تھے۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ شہریار ان کے سامنے ہو تو وہ پہلی فرصت میں اسے گولی مار دیں۔

شہریار نے ہمیشہ ان کی زندگی کو اپ سیٹ ہی رکھا تھا۔ پاپا ہر معاملے میں سالار کے مقابلے میں شہریار کو فوقیت دیتے تھے۔ عدیل عبدالرحمن کو یہ سب برا نہیں لگتا تھا لیکن جب سے انہیں امی نے بتایا تھا کہ وہ ان کا سگا بھائی نہیں ہے، بلکہ پاپا اسے کہیں سے اٹھا کر لائے تھے اور وہ ان کی زندگی میں زبردستی شامل ہوا ہے، تب سے ان کی جلیسی نے نفرت کا روپ دھار لیا تھا۔ بقول نانو کے...... وہ ان کے گھر میں نقب لگانے آیا ہے۔ پتہ نہیں کس کی اولاد ہے؟

نانو کے اس جملے کے بعد ایک لمبا گیپ آتا تھا اور سالار عبدالرحمن بڑی سے بڑی بات اور بڑے سے بڑے واقعے سے اس گیپ کو بھرتے چلے جاتے۔ وہ شہریار سے اتنے الرجک ہو چکے تھے کہ اگر وہ ان کے

AANCHAL.COM.PK

بیدہ بھی ان بچوں تو بغیر اٹھائے کبھی اور چلے جاتے۔ وہ انہیں آوازیں دیتی، کبھی اسکول کے سوم روم میں ان کی مدد لیا جاتا تو وہ حقارت سے ان کی کتابیں اپنی ڈائننگ ٹیبل سے اٹھا کر پھینک دیتے۔
کبھی شہریار عبدالرحمٰن ان کا برتھ ڈے پارٹی کا پلان کینسل کر دیتا، کبھی اس کی آنکھیں گیلی ہو جاتیں، سالوں کے سیٹ اپ میں انہیں لگا شہریار عبدالرحمٰن نے اپنے سارے بدلے چکا لیے تھے۔

”مجھے تم سے نفرت ہے۔ میرا دل چاہتا ہے موت آئے، مجھے کسی کے نام کی بھی۔ اور میں موت کو جیت کر کے تمہیں اسے سونپ دوں۔ تم مرجاتے تو شاید مجھے اپنے دل کے زیاں کا احساس کم تر لگے گا مگر جب تک تم زندہ ہو مجھے زندگی سے بھی نفرت رہے گی۔ پھول، خوشبو، رات اور چاند سب میری شاعرانہ فطرت کے استعارے ہیں مگر آج کے بعد یہ سب مجھ پر حرام ہیں، قطعی حرام ہیں۔“

انہوں نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا تھا۔ پھر دل قابو میں آیا تو وہ منہ دھونے واش روم میں چلے گئے۔ واپس لوٹے تو دانیہ کو چائے کی ٹرے لیے کھڑے دیکھا۔

”موڈ ٹھیک ہو گیا ہے آپ کا؟“

”ہاں، ہاں...... مجھے کیا ہوا ہے؟“ انہوں نے صاف انکار کیا۔

دانیہ کچھ دیر تو انہیں دیکھتی رہی، پھر آہستگی سے بولی۔

”کوئی پرابلم ہے تو مجھ سے شیئر ضرور کیجئے گا۔ آپ کو معلوم ہے، میں کتنی اچھی رازداں ہوں۔“

سالار عبدالرحمٰن نے چائے کا کپ ٹرے سے اٹھایا، پھر آہستگی سے بولے۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے کوئی پرابلم ہوئی تو تمہیں بتاؤں گا، تمہارے علاوہ اتنا اچھا رازداں کہاں ملے گا؟“

اس نے تعریف سے نچلے کے لیے ہنس کر کہا۔ ”ہاں، یہ تو ہے۔ لیکن مجھ سے زیادہ بلکہ بہت زیادہ اچھے رازداں تو شیری بھائی ہیں۔ ان کی مرضی کے بغیر کوئی ان سے کوئی بات پوچھ نہیں سکتا اور راز تو کوئی بھی نہیں اگلوا سکتا۔ وہ بڑے پکے ہیں اس بارے میں۔“

سالار عبدالرحمٰن جو بمشکل کمپوز ہوئے تھے، اس نام پر پھر سے بے ترتیب ہونے لگے تھے۔ ”پلیز دانیہ! مجھے کچھ دیر آرام کرنے دو، شدید سر میں درد ہو رہا ہے۔“

”جیسے آپ کی مرضی بھائی!“ وہ آہستگی سے کہتی باہر نکل گئی۔ لیکن اس لمحے دانیہ عبدالرحمٰن کی آنکھوں میں ایک ناقابل فہم بات چکراتی محسوس کی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ ان کہی کیا تھی۔ مگر اس کے لیے کچھ انتظار کرنا باقی تھا۔ اس لیے اس نے ماما کے کمرے کی راہ لی تھی۔ بیڈ پر سل ماں کی خوشخبری دے کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی یہ ان کہی صرف شہریار عبدالرحمٰن کی تحقیق ڈھونڈ سکتا ہے۔

AANCHAL.COM.PK

سامنے شہریار کے نمبر ہونے کا نقش ہونے لگا۔ اس کا موبائل نمبر ڈائل کیا تو دوسری طرف سے موبائل آف جواب آیا۔ وہ مایوس ہو کر پڑھائی کے لیے اپنی کتابیں کھول کر بیٹھ گئی مگر ان کی کتاب کے ہر لفظ میں نمبر ہی نمبر روشن تھی۔

❁❁❁

شہریار رملہ کے گھر میں داخل ہوا تو شاکر بابا نے اسے پریشانی سے دیکھا۔ رملہ تخت پر خاموش، دل گرفتہ سا بیٹھا تھا۔ وہ اس کے برابر جا کر بیٹھ گیا۔ پھر لے کے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تسلی کی کمک پہنچانے کی کوشش کی مگر رملہ اندر سے ٹوٹ رہا تھا، اس کے اندر کی شکست...... وہ بے بس ہو کر ٹوٹ رہا تھا۔ کچھ گھٹنوں میں لگتا تھا۔ بالوں کا سفر اس کے کندھوں پر آن پڑا تھا اور چہرہ کا بوجھ اس کے کندھے جھکائے دے رہا تھا۔

"آخر تمہیں بتائے بغیر کسی لڑکی کے ساتھ بھی جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اچھی بھلی لوگ تمہیں نہیں ہے وہ یقین کر رہی تھیں تمہیں پہنچا نہیں اگر تم مجھ سے اجازت لے کر کسی سہیلی کے ہاں یا اس کے ساتھ جانے کی خواہش کرتیں تو کیا میں تمہیں منع کر دیتا؟ کیا میں نے کبھی تم بچوں کو جاہل اور سخت گیر باپ کی طرح پالا ہے جو تم نے مجھ سے غلط بیانی کی؟"

وہ سر جھکائے کرسی پر بیٹھی رہی۔ بالکل بتلی کے مانند کی طرح...... شاکر بابا نے اس کا کندھا ہلایا۔ شہریار کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں تم نے گھر سے بالکل الگ جگہ کیوں چنا؟"

وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ شہریار نے دیکھا اس کی آنکھوں میں لحاظ، مروت اور ادب کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی پرانے سے غم ...... پتہ نہیں ہر بگڑی تھی یا ضد ...... وہ جان نہیں پایا۔ اس نے اس کی طرف دیکھا ایسا ہی اس کی آنکھوں میں جل بجھ رہا تھا۔ کہیں کوئی ایسا بھی نہیں۔ کچھ کہنا چاہتی تھی، بغیر کسی کمزوری کے بولی۔

"مجھے شناخت چاہیے اپنی۔ اپنی ماں کی طرح پالا گیا جو چھپا چاہتی۔"

"شناخت کا کیا طریقہ ہے کہ اپنا خود کو سب سے پہلے کھو دو۔ رکھو اور یہ جو لوگ جھوٹ کی بات کا کیا مطلب؟ تم کیا ہو تم ان کے علاوہ اور کیا ہو گی؟ یہی طرز معاشرت ہے۔ زبردستی نہ ہو، بے شک قابلِ احترام ہے لیکن پھر بھی باورچی خانے سے اس کی زرا گنجائش نہیں ہے۔"

"نہیں بھی۔ وہ زہرہ بیگم تھیں سالن کا اور میرا ذائقہ الگ کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن آپ کی یہ بات زہرہ بیگم، عارفہ اور علامہ بھائی سے شروع ہو کر ان پر ہی ختم ہونے کا نام ہے۔ میں اب جا چکی ہوں کہ بہت سارے لوگوں کی باتوں کا آغاز اور انجام میرے نام سے ہوتا ہے۔"

علامہ کے جسم میں غصے سے جھرجھری پیدا ہوئی مگر شہر بانو نے اسے روک لیا تھا۔ "ان کو بات کرنے دو۔ بیٹیوں سے صرف ماں طریقے سے بات کر سکتی ہے، تم نہیں۔"

علامہ نے بمشکل خود پر قابو پایا اور شاکر ہاؤس نے نئی اپنائی۔ بیٹی کا لہجہ ہائے میرا اچھا اور شرافت کرنے سے ہی بنایا جا سکتا تھا۔ انہوں نے نئی حکمت عملی اپنائی تھی۔ بیٹی کا ہاتھ سے پکڑ کر اپنے قریب کر لیا تھا پھر پچکار کر بولی تھی۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے بچی امبر سے لے کر عارفہ، زہرہ اور تم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ زہرہ نے میری اتنی ذمے داریاں اپنے کندھوں پر اٹھائی تھیں۔ چھوٹی سی عمر سے تمہارے بابا کے انتقال کے بعد وہ کیسے کیسے جتن کر کے گھر کو سنبھالتی رہی ہے۔ علامہ کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے میں جس نے جان ماری۔ اتنا میرا دل اس کے اس احسان کے بعد ممتا سے بھر گیا۔ وہ میری بچی ہی تو ہے اور بچہ ہر گھر میں ساتھ ہوتا ہے ان کے لیے تھا اور محبت بھی تو اس کی بنتی ہے۔۔۔۔ عارفہ تم سے چھوٹی ہے ابھی سکول میں پڑھتی ہے۔ بچپن سے باپ مر چکا تھا ان کے کم عمری میں بھی انتہائی ہے۔ اس نے صرف تمہارے بابا کے حصے کی محبت بھی اسے دینے کی کوشش کی تھی میں نے۔۔۔۔ وہ تم کو نظر انداز تو کبھی نہیں کیا۔ بیٹی جتنی دعائیں ان سب کے لیے مانگی ہیں تمہارے حصے میں زیادہ خاص آئی ہیں۔ اب تمہاری بھی اچھی نیت پیدا کی ہے۔ بس یہ کہ تمہیں اپنی بیٹیوں کی طرح میرے ماتھے چومتے رہنا ہے۔۔۔۔ شام کو مل بیٹھ کر کھانا کھانے میں جتنی باتیں ہو سکتی ہیں، صرف تم نے ہی لفظ تم نے مجھ سے بانٹے ہیں۔ لگاوٹ کا اظہار دونوں طرف سے ہوتا ہے بچے! اکیلی ماں کب تک محبت بانٹتی رہے؟"

"ہاں، تو سب کچھ کر سکتی ہے صرف آپ ان کے کوئی بچے خاص نہیں ہیں۔"

"تو کیا بات کرنے کا کون سا طریقہ ہے؟" علامہ یکدم تیز لہجے میں کھڑا ہو گیا۔

ماں کے سیدھے چہرے پر شکن جھلکنے لگا۔

"بس ہو گیا اب بھائی میرے نہ کو زخم۔۔۔۔ ساری آپ لوگ، ہر نخرے میں عارفہ تک کا استعمال ہی کیا جاتے ہیں۔ عمران صرف عمران کا زخم۔۔۔۔ جنت۔"

عائمہ کے لہجے میں حقارت بھی در آئی تو شاکر بانو نے حیرت سے بیٹی کو دیکھا۔

یہ انداز...... یہ انداز آج کل کے تو نہیں تھے۔ یوں لگتا تھا کسی نے بہت محنت سے اسے تیار کیا ہے اور بہت خاموشی سے اس پر محنت کی ہے۔

"آخر کون ہے وہ، جس نے تمہارے اندر کا انداز و فکر بدل دیا ہے؟" زہرہ جو میرا یک کا انداز و ملاحظہ کرتے دیکھ رہی تھیں، یکدم سامنے آ کر تنتنا کر بولیں۔ اور یہی غلط بھی تھا۔ وہ جس لہجے میں بول رہی تھی تو کی پنی رکھنا اب ان پر بھی کہاں فرض رہا تھا۔ سو زہرہ جنید نے شاکر بانو کو منظر سے ہٹا دیا تھا۔ اب بہن کے سامنے بہن کھڑی تھی۔ بڑی بہن ماں جیسی ہی تھی۔ عائمہ کی آنکھ میں کسی بھی رشتے سے کوئی بھی حرارت نہیں پھوٹ رہی تھی۔ شناخت کا بحران ہر چیز پر حاوی ہو گیا تھا۔ اس لئے زہرہ نے بات کا سرا وہیں سے پکڑا تھا۔

"تمہیں کیسی شناخت چاہیے؟" سوال کیا گیا اور اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"مجھے ایسی شناخت چاہیے کہ پھر مجھے کسی اور کے حوالے کی ضرورت نہ رہے۔ ایسی شناخت چاہیے کہ میرے نام کے ساتھ بابا کا نام نہ بھی ہو، تب بھی لوگ مجھے ایک مکمل شخصیت تسلیم کرتے ہوں۔"

"آر یو میڈ؟" زہرہ جنید بہن کی اس گوہر افشانی پر حیران رہ گئی۔ "تم پاگل ہو گئی ہو۔ ہنس کی چال چلنے میں کہیں اپنی چال تو نہیں بھول رہی ہو؟ جس معاشرے پر تم چلنا چاہتی ہو، اب وہاں کے لوگ بھی اس سے اوب گئے ہیں۔ وہاں شناخت کا بحران اس نوعیت کا ہے، جس نوعیت اور شدت سے تم یہاں پھیلانا چاہتی ہو۔ بچے کے لئے ماں باپ ہی اس کی مکمل شناخت ہوتے ہیں۔"

زہرہ نے سمجھانے کی کوشش ہی کی تھی۔ جانتی تھیں، یہ سب کچھ کارگر نہیں ہو گا لیکن وہ ہار نہیں ماننا چاہتی تھی اور یا تو وہ بھی ہار نہیں چاہتی تھی، سو حتی الامکان سے بولی۔

"میں یہی کہہ رہی ہوں، جب ہم عمر کی منزلیں طے کرتے چلے جاتے ہیں تو پھر کیلی شناخت کو کیوں لگ کر رکھا جائے؟...... میں اگر ایک نیا راستہ وضع کرنا چاہتی ہوں، جس پر مجھ سے پیچھے کے آنے والے چل سکیں تو آپ کیوں جیلس ہو رہی ہیں؟"

"جیلس...... میں تم سے جیلس ہوں گی؟" زہرہ کو جھٹکا لگا۔ اس کی زبان کی روانی میں تو کانٹے ہی کانٹے تھے۔ "تمہیں یہ کیوں لگا کہ میں تمہاری ذات کے حوالے سے جیلس ہو سکتی ہوں؟" آنکھیں دکھ ہو رہا تھا، جو کہہ کر کم نہیں ہو سکتا تھا۔

اور وہ اس دکھ سے بے پروا ہو کر بولی۔ "سیدھی سی بات ہے آپو! میں بہت کم عرصے میں آپ کی تعلیم سے کم تعلیم یافتہ ہو کر آپ کے سال کے بعد کی تنخواہ جتنی الاؤنس کچھ مہینوں میں کما لوں گی۔ دیگر

آ جاتا ہے، الگ تو یہ کہ میرے مذہبوں میں بھی نہیں کی تو آپ سے یہ سب برداشت کیونکر ہوگا؟"

"تاشہ تم اپنی حد پار کر رہی ہو۔" کرم صاحب نے ہاتھ اٹھایا مگر شہریار نے بازو پکڑ کر انہیں روک لیا اور چند قدم آگے بڑھا۔

"تم پیسہ کیوں کمانا چاہتی ہو؟" شہریار نے نرمی سے اس کا بازو تھام کر بات کی تو وہ مسکرا دی تھی۔

"آپ...... آپ کیا جانیں شہریار بھائی! لوگ پیسہ کیوں کمانا چاہتے ہیں۔ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والے لوگ مجبوری یا غربت کی بات کیا سمجھ سکتے ہیں؟"

شہریار کو اس کی مثال پسند آئی تھی۔ اس نے اس جیسی شناخت کی جھلک دیکھی جو بہ ظاہر کہتا تھا حالانکہ زندگی بھر اس سب سے لاتعلق ہی رہا، اس وقت وہ اس کے قریب جا پہنچا تھا۔ شہریار اسے بولا تھا۔

"میری گڑیا! تمہیں کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟"

"بہت سارے روپے...... لیکن مجھے رونق اپنی ذات کے لئے نہیں چاہئیں، اپنی محنت سے کمانا چاہتی ہوں میں...... میں ساری دنیا کمانا چاہتی ہوں۔"

"یہ غیر ضروری ہے۔" اس نے بات کو ٹال دیا اور وہ طنز سے ہنسی۔

"آپ...... یہاں کون ہے ویسے آپ غیر ضروری کی بات کر رہے ہیں۔ یہاں ہر ایک کے پیر اپنی چادر سے باہر ہیں اور غربت کی چادر میں پیر سکیڑ کر مرنا پڑتا ہے۔ اور میں ایسی زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔ کیا ضروری ہے جو باپ زندگی گزار رہے ہیں، بچے بھی وہی تنگی کی زندگی گزار کر مر جائیں؟...... شہری بھائی! ساری زندگی صبر کے سوا اس گھر میں، میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ ابا کی فوتگی کے بعد بھی ملا... بھائی کما کر لاتے ہیں کہ ہم صرف تین وقت کا کھانا ہی کھا پاتے ہیں۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے اس شہر میں کتنے لوگ ہیں جو تین وقت کا کھانا بھی نہیں کھا پاتے ہوں گے؟" اس نے اس کی بات سے الگ بات اٹھائی مگر وہ سننے کے موڈ میں نہیں تھی چیخ کر بولی۔

"پلیز! آپ مجھے کسی بین الاقوامی ادارے کے اعداد و شمار سنانے بیٹھ جائیں گے۔ مجھے خود نمائی کی عادت نہیں ہے۔ میں اپنی قسمت خود بنانا چاہتی ہوں۔"

وہ ان کی موجودگی سے بے نیاز تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ شہریار نے گہرا سانس لیا اور ان کی طرف دیکھا، وہ سب سے بے خبر سادہ نرم آنکھوں سے اس کی طرف تک رہی تھیں۔

شہریار غزنوی نے ان کی طرف دیکھا پھر لجاجت سے بولا "ماں جی! پلیز آپ اس طرح نہ بولیں ... بیٹے ... بچی ہے ... میں یہ ... جانے گا ... کا ... بس وجہ ... ہوری ہے۔"

ثنا کہہ رہی تو ٹھیک ہی رہی تھیں وہ کمرے میں بیٹھی ... بڑا سا سامان ... ہاتھ ... ہوگئی۔

"بابا ان کے لیے کتنے خوش تھے بھائی! کہ وہ ان جیسا بنے جیسے لوگوں میں رکھتی چاہیے۔ ماما پاپا کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ابھی گاڑی اچھے سے اچھے کپڑے پہنے بابا جو کو دیکھ کوئی بھی لڑکی ان جیسی زندگی گزارنے کی آرزو کرتی ہے۔ ثنا یہ شروع سے ایسی ہی رہی ہیں پھر وہ کیسے یہ فرق سمجھتی ہیں کہ ہم لوگ جان مار کر بھی شہریز بھائی جیسی زندگی نہیں گزار سکتے۔"

"ثنا......"

ثنا کی دادو نے اس کے چہرے کا رنگ اڑتے دیکھا۔ ... کوشش کی ... کب تھی وہ تیزی کی طرح واپس کمرے میں چلی گئی تھی۔ شہریار ... ثنا کی دادو کے پاس تخت پر بیٹھ گیا تھا۔

... ماما نے لاکھ اسے اس غم سے نکالنے کی کوشش کی مگر جانے نادیہ کہاں جاتی تھی کہ نہیں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔

"... ماں!...... میں نے بابا جانے کبھی اور اسمارٹ ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ... رہنے کی رکھنا چاہتے تھے جیسے آپ ہیں۔ لیکن پھر بھی اگر بیٹا ... ہے نہ میں......" شہریار کے لفظوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ آنکھوں میں نمی آگئی۔

تبھی ثنا کی دادو نے اُسے سینے سے لگا لیا بے حد ... ہوگئیں۔

"قصور تمہارا نہیں ہے۔ میری ہی تربیت میں کوئی کمی رہ گئی جو وہ دولت سے زیادہ شناخت کے خفقان میں مبتلا ہوئی ... بہت ... ہے شہریار! اگر وہ ... بچوں کی طرح انسان سے محبت کرنے کا ہنر سیکھتی تو ... انسان کی دولت ... سے آگے نہیں سیکھتی۔ کمی اس میں ہے تم میں کوئی کمی نہیں ہے۔"

مگر اس کے اندر اطمینان ہو کر نہیں رہا۔ وہ ... شہریار ... بے بسی سے بولا۔

"پتہ نہیں میری خاک میں ہی ... میرے نصیب میں کیا ہے۔ ہمیشہ اچھا کرنے کی کوشش میں ... رہا۔ چاہتا ہوں لوگ محبت سے ... مگر ... ان کی آنکھوں میں ... جاتی ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔ لیکن مجھے تاعمر خود سے شکایت رہے گی۔" شہریار ... سے باہر نکلتا چلا گیا تھا۔

AANCHAL.COM.PK

پھر تیسرا دن تھا، جب اچانک علامہ نے اس کو اس کے گھر آ لیا۔

"کیا ہو گیا ہے صاحب؟ گھر ہی تمہیں اتنا [illegible] یونیورسٹی میں بھی کم آ جاتا ہے، ایسے ہوتے ہیں دوست؟..... مشکل میں ہاتھ چھڑا کر الگ ہو گئے۔"

وہ شرمندہ ہو گیا۔ جانتا تو علامہ بھی تھا کہ کترانے کی وجہ [illegible] سے آنکھ ملا نہیں پا رہا تھا اس لئے [illegible] بلانے کے لئے علامہ نے ہی پیش قدمی کی تھی۔ [illegible] کے معاملے سے [illegible] لیکن چپ لگی تھی
کہ [illegible] گئی تھی۔

وہ اس وقت بھی سنجیدہ بیٹھا ہوا کتابیں پڑھنے کا ناٹک کر رہا تھا، اگر [illegible] علامہ کے گھر ہی میں [illegible] تھا۔

"تمہیں پتہ ہے ان تین دنوں میں اماں جی نے تمہیں کتنا یاد کیا ہے۔ وہ [illegible] کے جلوس [illegible] بہت [illegible] خدا ہی نہیں ہو گیا ہے۔"

"یار اماں جی سے کہو میں [illegible] آؤں گا [illegible] قدم [illegible] آتے ہوئے ڈرنے لگے ہیں [illegible] انہیں نے تو [illegible] خطا نظر آنے لگا۔"

"تم بھی شبیر ہی کے بچے! فضول باتوں میں الجھنے لگے ہو۔"

اس نے [illegible] علامہ [illegible] کر بولا۔ "[illegible] ہے [illegible] بھی [illegible] ہے۔"

"کیا مجھ میں [illegible] بات سے، کیا ہماری تمہاری دوستی ختم؟" اس نے [illegible] ہاتھ [illegible] سے بولا۔

"نہیں، ہماری دوستی ختم ہونے جیسی نہیں۔ لیکن یار گھر آنے کی خدمت کر [illegible] کوئی [illegible] برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب ہے بات تیرے دل کو لگ گئی ہے۔" علامہ نے [illegible] سے اسے دیکھا اور پھر اس کا جواب سنے بغیر اس کے گھر سے نکلتا چلا گیا [illegible] چائے اور [illegible] لائی تھی [illegible] رہ گئی۔

"مجھے [illegible] بھائی آج جلدی میں کیسے تھے؟ اتنی جلدی تو کبھی جان [illegible] چھوڑتے۔ شبیر بھائی [illegible] جگہ تو نہیں [illegible] آپ کا؟" اس نے [illegible] کی طرف چائے کا کپ بڑھایا۔
[illegible] اس کا دل [illegible] جا رہا تھا [illegible] محبت کے [illegible] اس نے کپ پکڑ لیا تھا [illegible] چہرے پر [illegible] رہی تھیں۔

"آپ [illegible] ٹھیک [illegible] پریشان کیوں ہیں بھائی؟"

ضرب ٹھیک چوٹ پر لگی تھی، یکدم کپ سے چائے چھلک گئی تھی۔ بظاہر یہ گرم چائے سے جلا تھا، لیکن محسوس ہوتا تھا روح پر چھالا پڑ گیا ہو۔

''اُف... یہ تم کو کیا ہوا ہے؟ ہاتھ تو نہیں جلا......'' سب نے سوٹ تو نہیں کیا، وہ اچھی بھلی یہی سمجھ رہی تھی۔

''ہاں، بس تم ذرا سی... سب ہو گئی ہے۔'' اس نے تفصیل دینے کے بجائے بات گول کر دی۔

شہریار ایک ہفتے تک ماں باپ سے نہیں مل سکا تھا۔ کچھ مصروفیات تھیں، کچھ ذہنی مصروفیات کا دھوکا...... وہ ہفتے کے روز عاطف بیگ کی طرف نکل گیا تھا مگر وہاں جا کر حامدہ کے بارے میں جو سنا اس نے اُسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ گھر سے سیدھا ہسپتال پہنچا تھا۔

''کیا ہو گیا تمہیں، ممی؟ کب سے ان تم جیسا سہارا بندے کے صرف [illegible] نہیں۔ یہ ہم جیسے اندر سے کھوکھلے لوگوں کا آخری سہارا ہے۔''

وہ کچھ نہیں بولا، نہ ہی جواب دے پایا، [illegible] مسکراتے سینچے میں ہوئی۔

''تائی جان پہلے بغیر بتائے کہیں چلی گئی ہے۔ میں، جنید اور [illegible] ہر جگہ ڈھونڈ چکے ہیں لیکن وہ کہیں نہیں ملی۔ لوگوں کی باتیں خطرہ بنتی جاتی ہیں...... حامدہ نے کہی بات دل پر لے لی ہے۔''

شہریار کے چہرے کا رنگ یکسر زرد ہو گیا۔ اسے اس بات کی توقع نہیں تھی۔

''اس نے یہ قدم کیوں اٹھایا؟ اتنا انتہائی قدم...... کیا ایسا بھی ہو سکتا تھا ہم کوئی درمیانی راستہ نکال لیتے؟'' وہ جانے کیا کہنا چاہتا تھا اور جانے کیا کہہ رہا تھا۔ لیکن اتنا پتہ تھا رات کی ایک ایک بات اس کے اندر [illegible] جاری تھی۔ اس کا دم گھٹتا جا رہا تھا۔ دل چاہتا تھا وہ ماضی کے پانی میں [illegible] باہر بہہ نکلے۔ مگر وہ بھی کہاں...... ایک بڑا سوالیہ نشان......

وہ کھڑے سے بیٹھ گیا تھا۔ [illegible] جنید کی طرف دیکھ کر بولا۔

''ہوا کیا تھا؟''

اپنے سوال کی [illegible] کرنے کی کوشش کرتے ہوئے شہریار عبدالرحمٰن کو تک رہا تھا [illegible] ہو گیا ہے۔ انسان اپنی غلطیاں اپنے کندھے پر اٹھا سکتا ہے مگر جب کسی اور کی غلطی بھی آپ کے کندھے پر [illegible] کی طرح لادی جائے تو روح ایسے ہی بوجھ تلے [illegible]۔ وہ بظاہر سوال کر رہا تھا لیکن درحقیقت وہ چاہتا تھا [illegible] سے اس سارے معاملے سے بے [illegible] کر دیں......

AANCHAL.COM.PK

شک کا فائدہ دے کر......

رحم کھا کر......

یا اُس کو اپنی اچھائی کا ثبوت دے کر...... کچھ بھی کر کے دوری کم کر دیا جائے۔

زہرہ جنید خاموشی سے شہریار عبدالرحمٰن کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔ اُن کے اندر کی کشمکش کا اندازہ کر رہی تھیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے مائدہ کے واقعے سے توجہ ہٹانے کے لیے اُن کی تعلیم کی بات چھیڑ دی۔ مگر وہی تھا کہ بات گھوم کر پھر حامد... اور حامد سے حالات پلٹ کر مائدہ تک آ پہنچی تھی۔ شہریار عبدالرحمٰن نے اندر کی جنگ سے تھک کر زہرہ جنید کا ہاتھ تھام کر بے بسی سے پوچھا۔

"کیا کیا تھا؟...... مائدہ نے تمہیں بتایا تھا؟"

زہرہ بیگم بہت خاموش رہیں پھر دھیرے سے بولیں۔ "حامد کا خیال تھا اگر اس کی شادی کر دی جائے تو شاید اس کے دماغ سے خناس نکل جائے۔ تم تو جانتے ہو ہمارے معاشرے میں ہر مسئلے کا حل شادی سمجھا جاتا ہے۔ مجھے بھی اس وقت یہی لگا تھا کہ شاید اپنے گھر کی ذمہ داریوں میں وہ سب بھول جائے گی۔ میں نے اپنے گھر میں بند کر کے... جس کے لیے کہاں ... جاری تھیں، اس کے سلسلے میں جنید سے بات کی۔ جنید ایک لمحہ لگائے بغیر راضی ہو گئے۔ ... شادی کی ... رات ... بھاگ گئی۔ ... رسوائی گھر کا دروازہ ... اندر تک آنکھیں جھک گئی تھیں اور باہر کی آنکھیں ... رسوائی کا سمندر ... جس میں میرے بابا کی عزت ... سب ... کہاں گھر میں ... کے اس طرف رہنے والوں کی بے بسی کا امتحان کیوں لیا جاتا ہے؟...... شہریار تمہیں نہیں معلوم جنید کی سمجھداری کے باوجود اس گھر میں میری حیثیت کتنی کمزور ہو گئی ہے اور حامد وہ تو بالکل ٹوٹ گیا ہے۔"

"یہاں ملامت کون ہے؟"

جانے اُس نے جواب کیا تھا زہرہ جنید سے کہا تھا یا خود سے۔ لیکن اس کے شکستہ قدم کمرے کی طرف اُٹھتے چلے جا رہے تھے۔ وہ جب کمرے میں داخل ہوا تو مائدہ کو دیکھ کر جنگ لڑنے سے پہلے ہی ہارنے لگا تھا۔ جب بہادر لڑنے کا کوئی پلان، دشمن کی فوج سے جا ملے تو کون ہے جو جنگ جیت سکے...... جنگ حوصلے سے لڑ کر جیتنے کی بات ہے اور ... قدموں ... گیا تھا۔

جینے کی بات ان کی ہو گئی تھی اور ان کی، ہر ایک کے لئے نااہل قرار دی گئی ہے......

شہریار عبدالرحمٰن نے پوری طرح اُسے اپنی آنکھوں کے حصار میں لے لیا تھا۔ وہ کسی طرح سے اس کا ہاتھ تھاما تھا مگر سلاما سلطان کے چہرے سے محبت بلند تھی۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد کچھ بھی نہیں بولا تھا۔

"پلیز سلاما! اتنی کو سمجھاؤ یار، تم تو ہمارا حوصلہ ہو اور حوصلہ کم کرنے کا کام تم کرو گی تو ہم کم حوصلہ لوگوں کی ہمت کون بڑھائے گا؟"

"پتہ نہیں، عجیب سا لگتا ہے شہریار کہ ابا کی ذمہ داری اچھی طرح نہیں نبھا پایا۔ میں غلطی کا کام ہو گیا ہوں۔ غلطی کا کام....." سلاما نے بولتے بولتے خاموشی کا احساس لیا۔ شہریار نے کم عقلی سے اسے دیکھا مگر وہ کچھ نہیں پا رہا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ ایک خاموش ان کہی ان دونوں کے درمیان چپ کر رہی تھی۔

تیسرے دن وہ دوبارہ اس سے ملنے آئے تھے کہ اچانک زہرہ جبین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"کچھ ہو گیا تم دونوں؟"

شہریار نے فوراً خوش آمدید استقبال کیا پھر سے نرم ہو کر دیکھا پھر بولے سے بولا۔ "شہریار نے زہرہ سے پوچھا سلاما کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں ہاں......" زہرہ جبین نے یوں چونک کر اسے دیکھا جیسے جواب کے لئے مناسب لفظ تلاش کرنے میں دقت ہو رہی ہو۔ اس نے چپ کر لی، تبھی تو بے قراری سے پوچھا۔

"کیا ہوا بتائیں، سلاما تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں وہ ٹھیک ہے۔ پہلے سے کافی امپروو کر رہا ہے۔ جیسی فضا بنا کر رہنے والے ڈاکٹر کا خیال ہے، سلاما اسی وقت صحت یاب ہو سکتا ہے، جب تک اسے بیمار کرنے والے حالات میں شامل ان افراد سے دور رکھا جائے جنہیں دیکھ کر اسے پھر سے سارے حالات یاد آ جاتے ہوں۔"

شہریار عبدالرحمٰن فق چہرے سے انہیں دیکھے گیا۔

کیا ایک وہی تو عنصر تھا جو اس کی زندگی میں اس میں بھی زہر گھولا گیا تھا......

یہ جو پیار ہوتا ہے، جس میں محبت ابھی زیادہ جلدی آ جاتی ہے......

انسان کی شخصیت ماں باپ، بہن بھائیوں اور دوستوں کے مجموعے سے مکمل ہوتی ہے۔ ماں باپ اخلاق دیتے ہیں، بہن بھائی اچھے برے حالات میں اپنے ہونے کا احساس، مان اور حوصلہ دیتے ہیں اور دوست چہرے پہ شرارت بھری مسکراہٹ بکھیرنے والے کردار......

"کیا ماما کبھی نہیں چاہتیں... میں ان سے ابھی ملوں؟" شہریار کے لہجے میں حسرت تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی بات ہوئی وہ اس نے سنی تھی مگر اس کا دل اس طرح نہیں کٹا تھا شاید اس یقین کی وجہ سے کہ وہ جب چاہے گا ان سے مل لے گا۔ لیکن آج بالکل الگ طرح سے دل سے جھٹکا دیا گیا تھا۔ اس سے ضبط نہیں ہو رہا تھا۔ زہرہ جنید خاموش ہو گئی تھیں۔

دانیا نے شہریار کو جیسے الجھن کا شکار ہوتے دیکھا تھا۔ بہرحال اپنے بھائی سے اسے بھی محبت تھی اور انسان سے زیادہ محبت تھی اس لئے اس طرح روکے جانے پر اسے بھائی کی تسلی قبول ہو گئی تھی۔

"چلیں شیری بھائی، ماما گھر میں انتظار کر رہی ہوں گی۔"

وہ جانتی تھی وہ ایک دل فریب جھوٹ بول رہی تھی کہ ماں شہریار کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ لیکن سچ سے بہتر تھا۔ جھوٹ اس سچ سے بہتر تھا کم از کم وہاں کوئی اس کا دل اس طرح جھٹکتا نہیں۔

شہریار نے دانیا کے کہنے سے قدم موڑ لئے تھے۔ ماما کے لئے لایا گیا گلدستہ دانیا کے ہاتھ میں تھما دیا گیا، گلدستہ زہرہ جنید کی طرف بڑھا کر بولی۔ "آنٹی ہم سوری، ہم نے آپ کا بہت سارا وقت ضائع کیا۔"

زہرہ نے اس کے ہاتھ سے گلدستہ لے لیا تھا۔ پھر بولیں سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ دلگیر لہجے میں بولیں "شیری بہت پیارا بچہ ہے۔ مجھے بابا کو اس سے کوئی شکایت نہیں۔ جو کچھ ہوا ہماری قسمت میں لکھا تھا۔ لیکن جس طرح تمہیں اپنے بھائی کی تسلی برداشت نہیں ہوئی اس طرح مجھے بھی مہربانی سے اپنے بھائی کی زندگی سے محبت ہے۔ پلیز دانیا! کوشش کرنا کہ شہریار اب ماما سے کبھی نہ ملے اس حادثے کو بھلانے کے لئے حادثے کے محرک کو بھلانا ضروری ہے۔ تم سمجھ رہی ہو ناں۔"

دانیا نے کچھ نہیں کہا۔ مڑی اور پلٹ گئی۔ لیکن یہ بلند انسانی غضب تھا۔ شہریار جو ہمدردی سے آگے بڑھ گیا تھا جانے باتوں کے دوران کب واپس اسے لینے پلٹ آیا تھا۔ اس کے چہرے پہ کوئی رنگ نہیں تھا بالکل سادہ ہر تاثر سے بے نیاز......

"شیری بھائی!" دانیا نے اس کا ہاتھ تھاما اور گاڑی کی طرف کھینچا..... وہ کچھ نہیں بولا اس کے تھامے ہوئے ہاتھ پہ اپنا بازو دراز کر دیا۔

"گھر چلو دانیا! میں نے کچھ بہت ضروری کام نمٹانے ہیں۔"

زبیر و جنید بہت کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے مگر کچھ کہے بغیر لب بھینچ لئے۔ ضروری نہیں تھا کسی کے مرنے پر ہی نوحہ کیا جاتا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے کاریڈور کے موڑ پر گم ہو گئے۔
زبیر و جنید خان کاریڈور کو دیکھتی رہی۔ جہاں تک کہ نظر واپس پلٹی تو اس میں نمی کے سوا کچھ نہیں تھا۔
شہریار گھر آ گیا تھا لیکن مسکراہٹ جیسے ہمیشہ کے لئے اس کے ہونٹوں سے غائب ہو گئی تھی۔
بابا مسلسل اسے بدلا ہوا محسوس کر رہے تھے لیکن وہ ہر بار ریلنگ تھامے اُن سے کترا رہا تھا۔
دوبارہ سے وہی روٹین، وہی ماحول، وہی سب کچھ تھا لیکن ایک چیز بھی کہیں بات کرنی بھول گئی تھی۔ شہریار عبدالرحمن تھا کہ سلامہ والے واقعے کے بعد سے کچھ زیادہ ہی بے وقت گزارنے لگا تھا۔
آخر وہ کہاں جاتے ہیں؟ اس کے دل میں خیال آیا۔ وہ پوچھے مگر اس نے اس قدر سنجیدگی اوڑھ لی تھی کہ وہ اس سے بات کرتے کرتے ہچکچانے لگی تھی۔ یونیورسٹی میں بھی اب اس کا انداز لئے دیئے ہوتا۔
کوئی بات کرتا اب ان سے دوستی کرنے کی کوشش کرتے تو وہ سب نظر انداز کر جاتے اور وہ خود بھی ان سے کٹا۔
”سوری میں نے دوست بنانے چھوڑ دیئے ہیں۔ ویسے بھی میں دوست صرف اپنی کلاس میں بناتا ہوں۔“ وہ ساتھ عاطف اس کا منہ دیکھتے رہ جانے ایک واقعے نے اسے اتنا گھمبیر کر دیا تھا۔
”بہت مغرور ہو گئے ہو شہری!“ بالآخر ایک دن عاطف نے اس کی کلاس لے ڈالی، وہ کچھ کہے بغیر سامنے رکھی کتاب میں گم نظر آنے کی کوشش کرتا رہا۔
”اسموکنگ کرتا ہے اب؟“
شہریار نے گھور کر دیکھا تو بتانے لگا۔
”میں نے کہا شاید چچا جان بھائی نے دوستی کے معیار بدل لئے تو کیا پتہ اسموکنگ جیسا بیہودہ چھوٹی کوئی بری عادت بھی اختیار کر لیا ہو۔“
شہریار اب بھی کچھ نہیں بولا خاموشی سے سگریٹ اور لائٹر نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ عاطف بیگ نے دونوں چیزیں لینے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا تو چونک کر سر اٹھایا۔ ”کیا ہوا ہے؟...... اب سے کیوں نہیں رہے ہو؟“ سوال کیا۔
عاطف قریب بیٹھا شہریار نے کہا۔ ”سب ٹھیک ہوں بس کچھ اچھا رہا ہے سو کہا پتہ دوستی کو شمار کرنے کی فرصت نہ ملے۔ مجھے پسند کلاس کا بندہ ہوں اس لئے ایسا کام اچھا نہیں لگے گا۔“

شہریار عبدالرحمٰن نے سگریٹ اور لائٹر دونوں جیب میں واپس رکھ لیے، پھر روڈ لہجے میں بولا۔ "بہتر ہے تم کسی مڈل کلاس کو ڈھونڈ لو۔ شاید ہم بہت زیادہ ساتھ نہ چل سکیں۔" عاطف کو دھچکا لگا۔ اس کا خیال تھا ایسے بات جملوں پہ وہ اپنے اندر کا غصہ باہر نکال کر پُرسکون ہو جائے گا۔ لیکن اس نے اس کے خلاف توقع عمل دہرایا تھا۔

"کیا واقعی تمہیں لگتا ہے ہماری دوستی میں کلاس بہت بڑا ایشو ہو گیا ہے؟"

عاطف بیگ نے خجل سے سامنے تلاش کیا۔ انیا نے سنجیدگی سے عاطف بیگ کو اس کے پیچھے لگا رکھا تھا۔ شہریار بھی یہ بات جانتا تھا لیکن بہر حال جو خلا اندر ہو گیا تھا اس کا فوری تدارک ممکن نہیں بات تھی۔

وہ خاموشی سے اب بھی خلا میں دیکھ رہا تھا۔ علامہ صحت یاب ہو گیا تھا۔ انہوں نے یونیورسٹی چھوڑ کر مکمل طور پہ بابا کا جنرل سٹور چلانا شروع کر دیا تھا۔ اور شہریار عبدالرحمٰن تھا اسے یہ بات نہیں بھولتی تھی کہ وہ بھی بہت اچھے دوست تھے۔ ادھر عاطف بیگ تھا وہ اسے اس قید سے نکالنا چاہتا تھا۔

زندگی کتنی عجیب سی ہو کر گزر رہی تھی کہ حمزہ عابد کا ایشو شہریار کی زندگی میں در آیا تھا۔ حمزہ عابد جو اس کے بابا کے گھر آنے جانے لگے تھے۔ تب شہریار نے پہلی بار انیا عبدالرحمٰن کو غور سے دیکھا۔ وہ چھوٹی سی بچی یکدم بڑی بڑی لگنے لگی تھی۔ مگر سلامہ کے بعد انیا سے چھوٹ جانے کا خیال نہایت روح فرسا تھا۔ وہ اس کے لالئی کیں؟ بکھر رہا تھا۔ آج کے سر سے حمزہ عابد کی فیملی گھر میں آئی تھی اور انیا خود بہ خود نفیس نفیس کچن میں ملازمین کی مدد کے ساتھ دیر ضیافت کی چیزیں تیار کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ شہریار بھی اس کی نظر سے محو ہو گیا تھا۔ تب وہ جان کنی میں اٹک گیا تھا۔ کبھی باقی بھائیوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھتا۔ کبھی خاموشی سے اٹھ کر کچن کا دروازہ کھول کر کچن میں جا گھستا۔ کچھ کہنے کے لیے لب کھولتا۔ انیا عبدالرحمٰن کے چہرے پہ نظر پڑتی تو لفظ کہیں اندر ہی رک رک جاتے۔

یہ محبت تھی یا محض دوستی...... وہ اس کے چہرے سے جانچ نہیں پا رہا تھا۔ رنگ تو تھے مگر یہ رنگ کس جذبے سے کھل رہے تھے، وہ جاننا چاہتا تھا۔ لیکن وقت، تنہائی اور انیا دونوں میسر نہیں تھے۔ یہاں تک کہ وہ انیا ڈرائنگ روم میں پہنچا کر خود اس کو ڈھونڈتی ہوئی اپنے کمرے تک آئی۔ چھٹی والے دن اس کا قیام یہیں ہوتا تھا۔

"شہری بھائی! آپ کو پاپا اور حمزہ علی بھائی ڈرائنگ روم میں بلا رہے ہیں۔"

شہریار عبدالرحمٰن ٹیرس سے لگا سگریٹ پی رہا تھا۔ یکدم اس کی آواز سن کر اس نے سگریٹ بجھائے بغیر ٹیرس سے نیچے پھینک کر پلٹ کر اسے دیکھا۔ انیا کی حس شامہ بہت تیز تھی۔ وہ اسے گھورنے لگی۔

"آپ نے پھر اسموکنگ کی ہے نا؟" اسموکنگ کی بو اس کے کپڑوں میں بسی ہوئی تھی۔ وہ بھی کہ ابھی چار سگریٹ پھونک چکا تھا اس لیے جھوٹ بولنا بے سود تھا۔ اس نے سر جھکا لیا تھا۔

"وہ بس ویسے ہی، کچھ اکیلا پن محسوس کر رہا تھا۔"

بابا اسے دیکھنے لگی ایک نئے انداز سے...... شہریار کی آنکھوں میں جو بے چینی تھی، وہ اس کا محرک جانتی تھی۔ شاید اس نے سوچا بھی تھا کہ اس گھر میں اس کے جانے پر سب ہی افسردہ ہونے تھے لیکن شہریار شاید وہ واحد انسان تھا جس کی زندگی اس کی وجہ سے پرسکون اور مطمئن ہو جاتی۔ اس نے ایک اندازہ لگایا تھا ان کی دسترس تو اس کے انداز سے بھی جھلک رہا ہوتی۔

"آپ کچھ پریشان لگتے ہیں بھائی؟" اس نے جان کر چھیڑا تاکہ اندر کا ابال نکل جائے اور یہ فطری شوق بھی تھا کہ جان سکے اس کا بھائی اس کی کمی کس حد تک محسوس کرے گا اور وہ مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"ابھی تو تم یہیں ہو پھر یہ سوال کیوں بابا......؟" اس نے بہت دیر کے بعد مناسب لفظوں کا انتخاب کیا۔ بابا کو اپنے بھائی کے اس معصوم جملے پر ہنسی بھی آ رہا تھا اور پیار بھی۔

"پہلے میں واقعی رہی ہوں، لیکن آپ کو جانا ہے، میری تعلیم کی اتنی فکر کیوں ہو گئی ہے؟" وہ اس سے کرید کر اس کے کندھے سے لگ کر پوچھنے لگی۔

"کیا مطلب، تمہاری تعلیم اور تمہاری فکر، میں نے کب نہیں کی؟"

اس نے الٹا سوال داغ دیا تو وہ مسکرانے لگی پھر جذبہ محبت سے اس کے کندھے پر اپنا سر ٹکا کر یقین سے بولی۔

"آپ کی توجہ اور فکر ہی سے تو میرے لیے زندگی کے راستے آسان ہوئے ہیں۔ اب میری راہ ساتھ زندگی نہیں بدل گئی۔ ہاں مگر میں یہ ضرور جاننا چاہتی ہوں میرے شہری بھائی ایسی کون سی بات ہے جو ایسا ہے کہ ان کے ہونٹوں سے مسکراہٹ تک غائب ہو گئی ہے۔"

شہریار عبدالرحمن نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا پھر آہستگی سے بولا۔ "حرا کسی خاص نوعیت کی بات کرنے آئے ہیں۔"

"آئے ہیں؟...... حرا صرف ایک ہے شہری بھائی! اس لیے آیا ہے، کہیے اگر عزت سے کا شوق چرایا ہے تو اور بات ہے۔ ورنہ خاص نوعیت...... تو یہ ابھی مجھ پر بھی روشن نہیں۔" بابا نرمی پھر یکدم موڈ بدل کر مصنوعی خفگی سے بولی۔ "اس لیے تو کہہ رہی تھی، ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھئے۔ اگر کوئی خطرناک لفظ بولا ہو تو تنبیہات تو ظاہر ہو گئیں۔ آپ تو جانتے ہیں باقی گھر کے افراد کتنے چپکے ہیں۔ یہ بات ختم کر جائیں گے۔"

شہریار نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا پھر اس کی ناک پکڑ کر شرارت سے بولا۔ "جنگلی لڑکی! مجھے بتاؤ میں...... سمجھا ہوں؟"

AANCHAL.COM.PK

"نہیں تو بھئی! آپ لوگ خواہ مخواہ دوسرے طریقوں پر شک کر رہے ہیں۔" ابا پانی پی کر نظریں چرانے کی کوشش میں مصروف ہونے لگی۔

شہریار ہونٹ بھینچ کر مدھم لہجے میں بولا۔ "تمہیں پسند ہے وہ؟"

ابا کو یکدم لگا کہ کوشش کے باوجود چوری پکڑی گئی ہے۔

"نہیں تو بھئی! وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔ اسے ہی جیسے واقف ہو ویسا دوسرے یونیورسٹی فیلو۔"

شہریار نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ پھر ہولے سے اس کی تھوڑی چھو کر بولا۔ "خیر! اچھا لڑکا ہے۔ مجھے وہ اچھا لگا۔ سچ کہوں، تمہیں اس گھر سے بھیجنے کے خیال سے ہی سانس رکنے لگتی ہے۔ تمہارے، سارا اور جازی کے علاوہ اس گھر میں ایک ہی مجھے جانتا ہے۔ اور میں ابھی اتنی جلدی تمہیں خود سے دور نہیں جانے دوں گا۔"

ابا نے کچھ نہیں کہا۔ بعض دفعہ کچھ کہنا اتنا ضروری بھی کہاں ہوتا ہے...... اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کے ہاتھ پر دھیرے سے ہاتھ رکھ کر اپنی اس طرح کی اٹینشن ظاہر کی جس کی شہریار عبدالرحمن کو توقع تھی اور ضرورت بھی۔

وہ دونوں ساتھ کھڑے تھے۔ یونیورسٹی کے بارے میں ہر روز کے معاملات پر گفتگو جاری تھی کہ اچانک ساری ہی بھائی کی خفگی بھری آنکھیں ان دونوں پر جمیں۔

"شہریار! تمہیں شہری کو بلانے کے لیے بھیجا تھا۔ خود بھی اسی کی کہانی میں گم ہونے کا کہا تھا؟ وہاں سب کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ شہری کی اداسی اہم نہیں، جتنی تمہاری سارا، زمار دونوں اس معاملے کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، تمہیں اس کی اہمیت کا احساس ہے؟"

شہریار عبدالرحمن نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "چلو بھئی! وہ ایک دم ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میری آمد کہیں بھی ضروری نہیں۔"

ابا نے کسی قدر شکایتی نظروں سے دیکھا تو وہ اس کی انہی میں پھر سے الجھنے لگا۔

"اچھا آؤ! بابا تم چلو میں آتا ہوں۔ دراصل شہریار بہت ٹینشن میں ہے۔ اسے چیک کرنا ضروری ہے بابا۔"

سارا اور عبدالرحمن کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ دونوں کب جا کر تھک کر کمرے سے نکلے۔ ڈرائنگ روم میں جس وقت پہنچا اس وقت وہ سب جانے سے پہلے کے آخری جملے ادا کر رہے تھے۔

"کبھی آپ بھی آ جائیے ہمارے ساتھ چکر لگانے کے لیے ہم نے۔ سچ بتائیے بھائی! کیا واقعی آپ کا دل ہمارے گھر آنے کو نہیں کرتا؟" بیگم عابد نے محبت سے مما کا ہاتھ تھام کر لگاوٹ سے کہا اور مما انہیں مصنوعی لگاوٹ دکھانا بہت اٹریکٹ کرتا تھا۔ دراصل جس قسم کی گیدرنگز میں وہ اٹینڈ کرتی تھیں، وہاں ویسے ہی رویے نوٹ کیے جاتے تھے۔ کس نے کتنی مرتبہ آپ کو ٹچ کیا ہے، دیکھا، کس کی پرسنالٹی کس سے زیادہ ہے، کس کے تعلقات کہاں سے کہاں تک ہیں اور کس کس جگہ آزمائے جا سکتے ہیں...... کام نکلوانے کا دوسرا نام اپر کلاس میں ریلیشن شپ ایٹی کیٹ تھا......

شہریار، مما کی اس عادت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دروازے میں کھڑا تھا۔ پاپا نے ایک نظر اسے خفگی سے دیکھا اور پھر بہت غیر متوقع اسے آواز دی۔

"ان سے ملئے...... یہ شہریار ہے میرا از راہِ کرم سے چھوٹا بیٹا...... دوسرے بیٹوں سے بالکل الگ سوچتا ہے۔ اور سچ پوچھیے مجھے اس کی یہی عادتیں اچھی لگتی ہیں۔ محبت اور گھر کا دوسرا نام شہریار عبدالرحمٰن ہے۔"

پاپا نے ہاتھ کھول کر اس کے لیے اپنی وارفتگی دکھائی کہ ایک لمحے پہلے کا سالار ریحان کو کبھی پیار سے یاد نہیں رہا تھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ان کے پہلو میں آ کھڑا ہوا تھا۔

اسے دیکھ کر جہاں بیگم عابد اور مسز عابد سمیت ماریہ کی آنکھوں میں رونق آئی تھی وہیں سالار ریحان کے تیور بگڑ گئے تھے۔ انہوں نے اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر ڈرائنگ روم میں رکھے کرسٹل کے واز پر ٹکا دی تھی اور رہی مما تو وہ ہمیشہ ہی کی طرح ایموشنل کھڑی تھیں۔ وہ اسے پسند کرتی تھیں، نہ ہی ناپسند...... ہاں، کبھی کبھی اپنے سب بچوں کی کارکردگی سے اس کی کچھ زیادہ بہتر کارکردگی دیکھتیں تو جب کر ملازمین کی ڈانٹ میں در پردہ کچھ نہ کچھ روک کر اس کی طرف بھی تھوڑی پازیٹو رہتیں، سو وہ بور ہو کر مہمانوں کو دیکھ رہا تھا۔ حمزہ عابد اس کی وجہ سے چہرے سے چڑ گیا تھا۔ عدیل بھائی نے دانیال کو ماریہ کا بتا کر دکھانے کی فرمائش کر رہی تھی۔ اس لیے وہ مہمان جو جانے کے لیے رتی جھلا ادا کر رہے تھے، پھر سے بیٹھ گئے تھے۔ مسٹر عابد اور بیگم عابد اس سے پچھلے دنوں ہونے والی سیاست میں قلابازی کی بابت دریافت کر رہے تھے۔ عدیل بھائی ہنس ہنس کر کم سے کم لفظوں میں اس کارکردگی کی وضاحت کر رہے تھے اور وہ عدیل بھائی کی بات غالباً کی داد دے رہا تھا۔ تالیاں تو وہ کبھی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت اچھا تو نہیں ہوتا تھا لیکن بہرحال کم لفظوں میں بات کہنے کی کوشش کیا کرتا تھا اسی لیے باقی لوگوں پر اس کو ہمیشہ رشک آتا تھا۔

عدیل بھائی، مسٹر عابد سے مصروف گفتگو تھے۔ مما اور ماریہ بیگم عابد کو بور نہیں ہونے دینا چاہتی تھیں۔ رہ گئے پاپا تو وہ معذرت کر کے کچھ فاصلے پر رکھے صوفے پر بیٹھے اپنے موبائل کے ذریعے اپنے ایک کلائنٹ کو مطمئن کرنے کی کوششوں میں تھے۔

کمرے کا سارا منظر آوازوں سے بھرا ہوا تھا لفظ یہاں سے وہاں تیرتے پھر رہے تھے، یوں جیسے تھکے بیٹھے ہوں اور الگ سے کوئی ٹیپ چل رہی ہو۔ کسی کے چہرے پر اطمینان نہیں تھا۔ سب نے خود کو

مصنوعی مصروفیت سے ہم آغوش کررکھا تھا۔

کوئی لفظ، کوئی جملہ دل سے نہیں نکل رہا تھا۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا پھر خاموشی سے اٹھ کر واپس اپنی منزل کی ذہن کے لئے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یہاں پاپا کی چھوٹی سی لائبریری تھی، جس میں وہ اکثر گم ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ کبھی کوئی تیز نظر یا سخت لفظ سنے بغیر پاپا سے محبت وہ زینے کے پیچھے سے یہاں آکر پاپا کے ساتھ وقت گزارتا۔ اس کمرے میں شہریار، عبدالرحمٰن، ماما اور جازی کے ساتھ کسی کو آنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ پاپا ہر کام پوری یکسوئی سے کرنے کے عادی تھے لیکن ان بیٹوں کے لئے کچھ الگ سا ماحول تھا۔ ہمیشہ برقرار رہتا تھا۔ عبدل بھائی تو بہت مانتے تھے، سمجھتے بھی تھے لیکن ماما اور بھائی اس بات میں اختلافی پہلو نکال کر کبھی کبھار۔ ماما کہتے تھے۔ مگر وہ انہی کی بات بہت کرتا تھا۔

سیڑھیاں طے کرکے وہ یہاں آیا تھا اسے کسی کے ہونے کی امید نہیں تھی۔ وہ ماما کے کمرے میں اس خیال سے نہیں گیا تھا کہ وہاں ماما اور ماریہ گفتگو ہوں گی لڑکیوں کی باتوں میں مشغولات کے، سب سے بڑی ملاقات وہی مگر یہاں بالکل غیر متوقع ماریہ کا دیکھ کر اسے کچھ عجیب سا لگا تھا۔

"کیسی ہو ماریہ؟" اس نے گلا کھنکھار کے اپنی آمد کا اعلان کیا اور ماریہ جو گنگنانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، چونک کر مڑی۔

ماریہ کے چہرے پر شہریار کے لئے بلا کی اجنبیت تھی۔

"ارے آپ......؟" وہ فقط کہہ کر ماریہ کی باتوں میں خاموشی کا وقفہ آیا۔ بہرحال دونوں کی بات پاپا سے زیادہ نہیں تھی اس لئے شاید جواب مرا کھڑی تھی۔

"پاپا کہاں ہے؟" بہت دیر بعد اسے معقول سوال سوجھا تو ماریہ مسکرا کر بولی۔

"کافی بنانے کچن میں گئی ہے۔ کہہ رہی تھی وہ بہت اچھی کافی بناتی ہے۔"

"واقعی اس میں کیا شک وہ واقعی بہت اچھی کافی بناتی ہے۔" شہریار کے لہجے میں ماں کے لئے محبت جھلکتا تھا۔

ماریہ نے شہریار کو دیکھتے ہی پھر مسکرا کر کہا۔ "مجھے لگتا ہے آپ کو پاپا سے بہت محبت ہے۔"

"ویسے تو یہ انتہائی پرسنل سوال ہے، لیکن بہرحال دونوں کی وجہ سے کوئی قباحت نہیں یہ کہنے میں کہ مجھے اپنی ماں سے دنیا کے ہر بھائی سے زیادہ محبت ہے اور یہ نہیں کہ یہ میری حساسیت کی وجہ سے ہے، جو

پلیز! مجھے کافی ہوا دیا، مجھے صرف ایک جملے کے دوران رات کے بعد اگر کوئی مجبور رہا ہے تو کوئی بھی محبت کرنے میں تو کیا مجبور رہا ہے۔ وہ تو دنی اتنی پیاری ہے کہ اس سے... بلکہ حقیقت یہ ہے، مجھے رشتوں سے فطری ہے
کھانا لا دو بہت بھوک لگی ہے، میں کہاں سے اپنے بستر سے اٹھ کر کے اٹھ جاتے تو پھر میرا دل کیوں نہ چاہے کہ میں ان کی پروا کروں، محبت دوں۔"

"نانی، ماما بہت لکی ہیں، انہیں اتنی ڈھیر ساری محبتیں ملی ہوئی ہیں۔ سب سے بڑھ کر آپ جیسا بھائی ہے ان کے پاس۔" اریبہ نے رشک سے کہا تو وہ کھلکھلائی۔

"پلیز ماما! ابھی بھی کوئی بات نہیں۔ یہ تو فطری تقاضا ہے، آپ سے جو محبت کرے، آپ اس سے محبت کریں۔ لیکن ہاں، میرا خیال ہے کہ میں ان سے بھی محبت کرتا ہوں، جنہیں مجھ سے محبت نہیں ہوتی۔"

"وہ خوش قسمت ہوتے ہیں جنہیں آپ محبت کرتے تھا۔"

شہریار نے چونک کر اریبہ کو دیکھا، بظاہر تو یہ کسی بھی طرح کا اضافی جملہ نہیں تھا مگر ان جملوں سے سامنے کھڑی لڑکی کی آنکھوں میں کچھ جھلکا تھا...... کوئی حسرت، ناامیدی...... یا خوش گمانی کی کرن سی کوئی......

وہ آفس سے آیا تو ان دونوں نے ان بازوؤں پر بہت کچھ بنا دیا تھا، جس میں اس کی پسند کی اضافی ڈشیں بھی تھیں۔ سب نے فوراً پلیٹ لینے کے لیے ... اور چائے کا اہتمام کیا۔ پھر وہ کرسیوں پر بیٹھے جہاں وہ بحث کر رہے تھے جب اچانک وہ کپ لیے چلتی ہوئی آئی۔ شہریار نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"تمہیں کیسے پتا میرے کپ کا اضافہ سمجھا جا سکتا ہے؟"

ماما مسکرا کر بولیں۔ "اس طرح، جب آپ کسی بے وقوف لڑکی کا ذکر کر رہے تھے، میں اس وقت وہ کپ لے کر آئی تھی، آپ محبت کے سمندر میں گم ہو گئے تھے، ... پلٹ جاتا ہے۔
اب مارے ہے آپ اپنی جھوٹ موٹ کا بچے کا محبت نامہ کر رہے تھے تو ... آپ کی محبت دکھانے کے لیے عمل کا آغاز کیجئے۔"

"یہ سب جھوٹ تھا؟" اریبہ شہریار کی طرف حیرت سے پلٹی اور شہریار ہنسنے لگا۔

"بکواس کر رہی ہیں۔ دراصل یہ جگہ کام کر کے ان کا شوق پورا کرنے سے کترانی ہیں۔"

ماما نے آنکھیں دکھا کر اس کے کندھے پر چپت رسید کی اور ماریہ ہنسنے لگی۔ شہریار کی شکل ہی کچھ ایسی مسکین ہو گئی تھی۔

"پلیز ماں، بھائی پر اتنا ظلم نہ کریں۔"

"اچھا، پھر کتنا قیام کرنا چاہتے ہیں؟" نانا نے جواباً مسکرا کر پوچھا۔

"ختم کرنا ہے کیونکہ بے چارے بھائی برداشت کر سکے۔" شہریار مسکرایا۔

نانا نے فوراً بھرپور انداز سے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے آئندہ خیال رکھوں گی۔"

پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید باتیں کرتے عدیل بھائی انہیں بلانے آگئے۔ "چلو بچو! آپ کے پاپا آپ کو بلا رہے ہیں۔"

ار بیٹھے درست کرتا بیچ میں ہی۔ شہریار اور دانیال اٹھ کھڑے ہوئے۔ عدیل بھائی شہریار کے ساتھ ساتھ قدم ملا کر چل رہے تھے۔ پھر رستے میں انہیں کیا سوجھی انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک پل میں پوچھا سوال کر ڈالا۔ شہریار نے "ہوں۔ بھائی! ایسی کوئی بات نہیں۔" "ارے جان چھڑانی۔" عدیل بھائی مسکراتے رہے۔ یوں جیسے انہیں اس کی بات پر اعتبار نہ ہو اور وہ جانتے ہوں.....

اور گھر سے نکلتے ہوئے حمزہ عابد دانیال کی گاڑی کے پیچھے پیچھے لفظوں میں الجھتا ہوا بند ہوتا دروازے کے ذہن میں سمیت گھر سے جا رہا تھا۔ پھر پاپا اور ہما بھی کر رہے تھے اور ہما نے بہت ستائش سے کہا تھا۔

"عبدالرحمن صاحب مجھے حمزہ سے اچھا لگا اپنی نانا کے لئے پھر نہیں ملے گے۔ آخر آپ کو اس معاملے میں کیا پایا اہم ہے؟"

مسز عبدالرحمن نے آہستگی سے بیگم کی طرف دیکھا۔ پھر مدھم لہجے میں بولے۔

"کوئی شک نہیں کہ حمزہ عابد ایک اچھا نیا ہی بنا ہے۔ لیکن پتہ نہیں میری چھٹی حس کس خطرے کا اعلان کرتے ہوئے بھی رہی۔" بیگم کے تیور دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولے۔ "ٹھیک ہے بھئی کچھ وقت سمجھنے کے لئے بیٹھ۔ تم تو جلدی پڑی ہو رسول جانے کچھ ہو۔"

ہما نے آخری بار پرسکون کا سانس لیا اور شہریار سے بند موں واپس دانیال کو گھر کرنے کے خیال سے اس کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

❀❀❀

حمزہ عابد پچھلی کئی گھر سے گاڑی کا رخ واپس موڑ چکا تھا۔ وہ سے نکلنا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ان کی تھی اور اب وہ تیزی سے واپس آ رہا تھا۔ اس کا رخ دریا نے درجے کے سکون کی طرف تھا۔

بیان دونوں کا خیال تھا کہ وہ جس کالج سے تعلق رکھتے ہیں وہ اس کی وجہ سے انہیں اپنی کلاس کے آخرے بچے کی جگہوں میں فقط انہیں ملنا چاہیے، جب تک وہ اپنے بعد سے پہلا انداز جانے۔ دیگر کچھ بھی

سی وال میں اُبھری تھی کہ اُسے اس چیز سے کیا کام ہے۔ بلا شوار تگ رہا تھا۔ اس کے فرمانبرداری کی فہرست بہت طویل تھی۔ سب کے ساتھ بہت اچھا وقت بھی گزر رہا تھا لیکن نیلم کے متعلق وہ تنہائی میں جب بھی سوچتا تھا ایک نئے لطف سے آشنا ہوتا تھا اور اس وقت وہ اسی کے پیغام پر سر کے بل دوڑا چلا آیا تھا۔

پھر اُسے گھنٹے کا راستہ دو ہی منٹ میں طے کر کے کوئی رفیق پہنچا۔ نوکر کی رہنمائی میں نیلم کی بیٹھک کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ سامنے پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا تو آنکھوں کی روشنی کئی گنا بڑھتی چلی گئی تھی اور دھڑکنوں کی شکایت ہونے لگی تھی اور لبوں پر چمک سی آ گئی ہے۔

"تم میری نیلم ہو تم نے جیسے ہی پیغام دیا میں نے ایک سانس بھی نہیں لیا، پیغام کی رفتار سے دوڑا چلا آیا ہوں۔"

سامنے خوب صورت وجود میں ہنسی کی لہر دوڑ گئی۔ شہزادگی ہنسی نے جیسے اُس کی دھڑکنوں کو ستائش سے بھر دیا تھا۔

اُس نے بے ساختہ اُس کا ہاتھ تھام لیا تھا، پھر جذب سے بولا تھا۔

"تم سے جب ملتا ہوں نیلم! سوچتا رہتا ہوں تم سے بات کروں، تمہیں دیکھوں یا تمہاری ہنسی میں ڈوب جاؤں۔"

"ڈوب جاؤ تو بہتر ہے، ہو سکتا ہے اس سمندر سے اُبھر کر صحرا پیاسے ہی رہ جاؤ گے۔ پھر مت کہنا یہ صحرا بڑا عجیب کیوں ہے۔" نیلم نے اداسی سے بے نیازی سے کہا اور وہ مخمور لہجے میں پکارا۔

"تمہاری چاہت میں صحرا بھی نصیب ہو جائے تو خوش قسمتی ہے میری۔ مگر وہ ڈوبنے نہ دے وہ۔ ڈوب جانے کا اشارہ دے اور انکار کرے وہ کافر۔"

ایک نیا قہقہہ بکھیرا ہنسی سے گھنگھرو سے بجنے لگے تھا۔ حمزہ عابد نے سوفے پر بیٹھ کر بے تکلف ہونے کی راہ ہموار کی تھی۔ اچانک نیلم کے چہرے پر ملال کی سنجیدگی چھا گئی۔ "تمہیں جو کام کہا ہے وہ تم ابھی تک کر نہیں پائے ہو۔ پھر میں کیسے تمہاری خواہش پوری کروں؟"

حمزہ عابد کے چہرے پر پہلے سے زیادہ خمار آ گیا اور وہ مسکرا کر بولا۔ "صرف باقاعدہ منگنی کا انکشاف ہونے کی دیر ہے، اس کے بعد تم جانتی ہو میں کتنا مناسب ہوں۔"

"مجھے تمہاری شاعری سے کیا سروکار، جب تک میں اس لڑکی کا سر جھکتے نہ دیکھ لوں۔ اس کی آنکھوں کے آنسو بارش کی طرح جھر جھر نہ گریں...... تم نہیں جانتے امارت و دولت کے باوجود اپنے وجود کے ساتھ ایک سوال ہو جائے گی تو میں کسی سے ایک سوال ضرور پوچھوں گی۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں وہ کیا سوال ہوگا؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔" اس نے فرائز منہ میں رکھتے ہوئے دیکھا اور کہا۔ "مجھے کسی سے پوچھنا ہے وہ بھی ذہین، بہت اعلیٰ تعلیم کے باوجود غلط راستے کی راہی کیوں بنی؟ میں اس بحث کا مذاق جو کسی نے ماضی میں کیا، اڑایا تھا اور پھر ماضی نے خود کو دہرایا تھا۔ کیوں؟ کس سزا کے تحت زہر کا اس پر اثر تھا جانتی ہوں۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں، وہ کون تھا...... کیا شہریار......؟"

وہ یوں ہنسنے لگی جیسے کسی کی بچگانہ بات پر ہنسے کوئی جا رہے۔ مگر اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ "شہریار! اس کا حسب کا کچھ شمار ہے میری جان! ایک تم ہو اور میری مت پوچھو۔ جو کہہ رہا ہے وہ کہ وہ تو پھر میرے گھر کے دروازے سے ہمیشہ کے لیے تم بھی نکل جاؤ گے۔"

حمزہ حامد کی آنکھوں میں طمانیت یوں بکھرنے لگی، جیسے وہ مگر اس کے لیے ایک جام کی طرح خوشی میں جیسے ٹکرا تھا۔ حمزہ حامد کھانے کا آرڈر دے رہا تھا۔ پھر ان دونوں نے کھانے کے بعد کافی پی تھی۔ باہر نکلتے ہوئے کہا کہ ایک اسے اجنبیت سا لگا تھا۔ ان کی جان پہچان والا یہاں کون آگیا تھا۔ وہ تعارف نے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا کہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اف ہینڈل کا لوں تو بے تکلفی کی دعوت......" اس نے پلٹ کر دیکھا اور چہرے کے تاثرات تیزی سے بدل گئے۔

سامنے عاطف بیگ دانت نکالے کھڑا تھا۔ شہریار سے ہاتھ رکھنے کے لیے اس کے ہاتھوں سے بچنا بالکل مشکل تھا۔

"آپ؟ ارے تم یہاں...... ہمارے سامنے آتے ہیں؟" وہ سنانا چاہ رہا تھا کہ مجھے وہ بے تکلف ہو گیا تو اسے زبردستی مسکرا کے بولا۔ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے جلدی سے اس نے گلا کھنکھار کے کہا۔

"کبھی بار بھی یہاں سے گزرا تھا تو کافی کی اتنی طلب ہوئی کہ بس اندر چلا آیا۔ یہاں بہت چاؤ سے تم اس ہوٹل کی کافی بہت مزے کی ہوتی ہے۔"

"کافی...... ہاں یار! یہاں کا کھانا بہت بہت اچھا ہے۔ تم بھی وہ دکھاؤ...... تم جیسوں کو بہت اچھا لگے گا کبھی اور بھی مل سکتا۔"

"اچھا...... لیکن آج میں نے صرف کافی ہی پی ہے۔"

وہ کہہ کر جیسے ہی کھائی کی طرح جھکا تھا۔ کیونکہ وہ کھانے کا بل پلیٹ میں رکھ کر اس کے سامنے لے آیا تھا۔ عاطف بیگ کو ایسے مواقع پر دینا فوراً تیار کر دیا۔

"بیٹھو تو...... جھوٹ بولتے ہو۔" وہ پھر ہنس کر بولا۔ "اچھا اچھا...... تم کلاس کو نسنس ہو رہے ہو گے۔ لوگ جانیں گے تم نے یہاں کا ... کھا لیا ہے، ... تم سے معاف کریں۔"

لمحہ بھر کو خاموش رہا پھر زور سے ہاتھ تھام کر بولا۔ "یار جانی! یہ کلاس کا خشک فلسفہ ولیات کے سوا کچھ نہیں ہے۔ تمہیں تو پتہ ہے، میں پکا مسلمان کمیونسٹ ہوں۔"

"کمیونسٹ اور مسلمان؟...... دونوں چیزیں ایک جگہ نہیں مل سکتیں۔" اس نے ویٹر کی پلیٹ میں ان کے پیسے رکھتے کہا۔

اور وہ ہنس کر بولا۔ "انصاف پسندی، ہر انسان کو برابر ... کی ہر چیز مساوات سے تقسیم ہو، سب اللہ کے بندے ہوں، کوئی حاکم نہ ہو سوائے خدا کے ... یہ اسلام کا فلسفہ ہے۔ بس ہمیں والوں نے چرا لیا ہے اور ہم ٹھہرے مسلمان۔ سو ابھی تک اس کے پیچھے ... ہے تاکہ پتا ... کی ... نعمت ہے۔"

حمزہ عابد کا اس کو فلسفہ سمجھ نہیں آیا ... ہوٹل سے نکلتا چلا گیا۔ شہریار سے ملاقات ہوئی تو سب سے پہلے عاطف بیگ نے بھی یہ پوچھا۔

"شہریار تم ... ہو رہے ہو ... صاحب آج کل رونق جیسے ہوٹل میں پائے جانے لگے ہیں۔ پتہ ہے یار! کیا ... کلاس کو نسنس ... کی گلیوں کی خاک کیوں چھان رہا ہے۔"

شہریار جو نیا نیا ... میں ... چونک گیا۔ سامنے کی بات تھی ... عاطف بیگ اور سارا سے ... کا قائل تھا، وہ ... فرینڈ شپ کے باوجود شہریار کی جیب سے رشتے نبھانے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ شخص رونق ... میں دکھائی دے جائے تو یہ بات نا قابل یقین تھی۔

"تم نے اسے کب دیکھا تھا؟"

"ابھی...... کل بار ... ایک منٹ پہلے......"

اس نے کچھ کہنے سے پہلے خاموشی کا وقفہ لیا۔ شہریار کا دل ... بات بہت کڑی تھی ... کر جھوم کر بولا۔

"تمہاری یہ سسپنس کی عادت اگر یونہی رہی تو ... ہو جاؤ گے۔ چھوڑو، اب معقول بات کرو اور جلدی سے بتاؤ کہ ... کہانی کیا ہے؟"

"دراصل شہریار ابھی میں کچھ شک جیسی کیفیت کا شکار ہوں، سوچ رہا ہوں، پہلے واقعی معاملہ سمجھ لوں تو تمہارے آگے کھولوں۔"

شہریار نے آنکھیں دکھائیں، پھر بھی نہیں مانا تو غصے سے بولا۔ "کسی بات چھپانے کا کیا مطلب ہے یار! تجھے معلوم ہے، یہ میری ماما کی زندگی اور خوشی کا سوال ہے۔"

عاطف بیگ نے شائستگی سے گلا کھنکھار کے مدھم کہنے کی کوشش کی۔

"اسی لیے تو کچھ کہنے سے کترا رہا ہوں۔ ویسے یہ بات میں نے وداکیا اور فرینڈز سے سنی ہے کہ وہ ڈاکٹر کسی بڑی فیملی کے ساتھ گھومتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ مجھے کبھی کبھی شک سا ہوا تھا۔ کیونکہ وہ بڑی فیملی اس کے ساتھ بیاہی کسی کمیشن سے بنی تھی۔ میں نے تو اسے تو ادوید نو بجی کی نے سارب تن سے حمزہ وغیرہ سے لاتعلقی اختیار کر لی اور ان سے آگے گزر رہی چلی گئی۔ شہریار کا کلاس فیلو رہی تھی۔"

شہریار نے خالی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ تبھی اس نے اس کے ذہن میں ایک سوال ڈالا۔ "عدیل بھائی پولیس فورس میں ہیں۔ تم تو آسانی سے ان کو نبیل بیگ کو جان سکتے ہو۔ وہ کون ہیں، معاشرے میں ان کا کیا مقام ہے؟"

شہریار نے سر ہلایا۔ سامنے کی بات تھی حمزہ وعابد کو وہ سب ابھی جانتے تھے۔ حقیقت ویسے ہی میں شوق کرنا تھا۔ کہاتے پیتے گھرانے کا منظر بنا وہ جس سے گھومتا۔ اس کے بابا کیا کرتے ہیں؟ وہ کون ہیں؟ آج تک وہ ان کے گھر تو گئے نہیں سنے کہ وہ ایک آف لائف کا اندازہ ہو سکتا۔ سوال شہریار کا تھا اس کے ذہن میں اٹھنے والا سوال جس سلسلے میں عدیل بھائی کا ذکر آیا کہ معاملے کی چھان بین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سوال نے سوچوں کو یک دم روک دیا عاطف بیگ کا یا کیا تھا۔

"پکا منہ کر وہ گئے اب بھی وہ کہیں نظر آئے تو مجھے فوراً کال کرنا اور نبیل بیگ کو ڈھونڈ جانا تیرے لیے کوئی مشکل کام نہیں، میں جانتا ہوں۔"

عاطف بیگ نے مصنوعی خفگی سے اسے دیکھا۔ شہریار دھیرے سے بولا۔ "تجھے کیا نہیں شادی کی جلدی لگی ہوئی ہے، بابا کا غصہ تو..."

"تو میری جان، یہ تیری اور میری بہن کے مستقبل کا سوال ہے اور میں جانتا ہوں مجھ سے زیادہ تجھے عزیز ہے یہ سب۔"

عاطف بیگ کے کندھے ذرا جھک گئے مگر اس نے پھر بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم بہت شاطر ہو، وقت آنے پر بات کو گھما جاتے ہو۔ وہ بیچارا ڈاکٹر بیگ صاحب کا اردو ادب کا زبانی شاعر ہے؟"

سنانے کی بات کو ٹال دیا اور شہریار نے کندھے سے تھام کر محبت سے کہا۔ "میری جان! ابھی کام مکمل ہونا ہے تم سے، اس لیے اردو کی لغت کی اور انگلش ڈکشنری کی جگہ ڈیفینیشن دیکھ کر درست ہوگا۔"

"اچھا جی!" اس نے کان پکڑ کر سر ہلایا۔ شہریار نے قہقہہ لگایا مگر پھر بھی کہیں نہ کہیں وہ اس کے ساتھ دل سے ڈر گیا تھا۔ ویسے بھی ان کی زندگی سے نکلا تھا وہ سوچوں سے دور نہیں اور دل کی ہر خوشی میں وہ اسے بہت یاد کیا کرتا تھا۔

"سلامہ کو مس کر رہا ہے نا؟" عاطف بیگ نے چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھ کر ٹھیک اندازہ لگایا۔ سامی نے سر جھکا لیا پھر مدھم ہو کر بولا۔

"پتہ نہیں سلامہ اب کیسا ہو گا۔ تیری بچی تو اس سے ٹھیک سلیک نہیں رہی۔ میں ٹھیک نہیں ہوں، حالانکہ میں تو اپنا ساتھ اس کے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔"

عاطف بیگ نے سنجیدگی سے اسے دیکھا پھر پشت موڑ کر بولا۔

"میں نے اس دن تم سے جھوٹ بولا تھا شہری!...... وہ اصل سلامہ نے ہی مجھ سے کسی بیویار کیا تھا۔ اس کا خیال ہے، میں بہت لاابالی انسان ہوں، جو زندگی میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں صرف اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں اور اب وقت ضائع نہیں کرتا ہے۔ شہریار! وہ پورا کا پورا بدل گیا ہے۔ سائرہ کے بعد سے اس نے دنیا کو دنیا کی طرح دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ اس نے اس علاقے سے گھر بدل لیا ہے۔ کسی فلیٹ میں رہتا ہے۔ رات کو پڑھتا بھی رہا ہے، کالم بھی لکھنے لگا ہے۔ بہت پڑھے لکھوں کے ساتھ مشورہ و سوچ بچار ہو چکا ہے۔ اس نے اپنا قلم فارسل کر رکھا ہے۔ کبھی کسی سیاسی بندے پر کوئی جھوٹ شخص کالم لکھ ڈالتا ہے۔ وہاں سے اعتراض ہوتا ہے تو وہ فوراً اس کا ملک کو چھوڑنے کے لئے ٹکٹ کی اپلیکیشن کر دیتا ہے۔ معاملہ طے پا جاتا ہے تو ایک نام سے اسی اخبار کو کالم بھیج دیتا ہے۔ شہری! وہ بہت بدل گیا ہے۔ کہتا ہے دنیا میں صرف دولت کی عزت ہے اور کوئی سوچ معیار یا اخلاقی اقدار کی بات کرتا ہے تو مجھے اب ایسی باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ دنیا میں ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ مشین بن گیا ہے۔ اس نے تو میری مذاق میں کی بات کو نقطۂ نظر بنا لیا ہے۔"

شہریار نے تاسف سے اس کی باتوں کو سنا تھا۔ دماغ دوبارہ سے ماضی کی طرف چلی گئی تو وہ ملاقات بھی یاد آ گئی جو کسی دن اس نے جاناں سے کی تھی۔ وہ بہت تپا ہوا اس تک گیا تھا۔ لیکن اس کا جواب تھا "یہ کمائی ہے۔ یہاں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کے بہت سے ٹھکانے ہیں اور تم جانتے ہی ہو ان سب کا کیوں جاتا ہے اور کہانیاں یاد رکھنا فرض نہیں ہیں۔"

"لیکن وہ تمہارے بہکاوے پر ہی گھر سے گئی تھی۔" اس نے پھر سے سوال داغا تھا۔

تب اس کی ہنسی کانوں میں چبھنے لگی تھی۔ ہنسی رکی تو اس نے اگلا تیر چھوڑا۔ "وہ کم سن بچی نہیں تھی کہ بہکائی جائے۔ وہ بالغ لڑکی تھی۔ اس نے زندگی کو اپنی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ کامیاب رہی یا ناکام، میں نہیں جانتی۔ رہی ماڈلنگ تو تم جانتے ہو وہ اتنی خوبصورت بھی نہیں تھی کہ ماڈلنگ میں سروائیو کر سکتی۔ اب گھر سے نکل کر اس نے کیا ذریعہ معاش اپنایا ہے، مجھے نہیں معلوم۔ رہی سوالات کی بوچھاڑ تو تم جانتے ہو، مجھے سوالات کے جوابات دینے کی عادت نہیں۔ اب تک تمہاری باتوں کے جواب بھی اس لئے دیئے ہیں کہ مجھے تم سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔"

"محبت...... تمہیں معلوم ہے محبت کیا ہوتی ہے؟"

"نہیں...... لیکن تم جانتے ہو۔ بس یہی میرے لئے کافی ہے۔"

شہریار اسے دیکھتا رہ گیا۔ گھر بچانے کے چکر میں اس نے ذکیہ جیسے دلدل میں پھنسی تھی اور اس نے اپنے آپ کو آگ کی نذر کر دیا تھا۔ کسی ایک کی موت اگر بہت سوں کی خوش و خرم زندگی کا ضامن ہو سکتی تھی تو...... تو وہ ایسا ہی تھا کہ اس موت کو جائز سمجھتا۔

اور یہ موت اس نے قبول کر لی تھی۔

اس کی آنکھیں اس کے چہرے پہ ٹکیں، جب جاناں نے اقرار کیا۔

"مجھے معلوم ہے، میں بہت خوب صورت ہوں۔ مگر جب تم اپنی ساحرانہ آنکھیں مجھ پہ ڈالتے ہو تو مجھے لگتا ہے، میری خوب صورتی کا سب سے خوب صورت اعتراف میرے سامنے ہے۔"

شہریار نے کچھ نہیں کہا تھا۔ کیونکہ وہ وہاں وقت گزاری کرنے شہباز ملک کی عمارت سے نکلتا چلا گیا تھا اور آج...... محض اتفاقاً ایک بار پھر سے آ نکلا تو کچھ اسے اندر تک شرمندہ کر گیا تھا۔

عاطف بیگ نے اسے کہیں دور دیکھا تو کچھ فوراً ہی تھام کر وہیں بلا لیا۔ اس نے ان کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کیا اور گہری سانس لے کر حال میں لوٹ آیا۔ چہرہ سفید سا ہوا۔

"پتہ نہیں، وہ بے وقوف لڑکی کہاں ہو گی۔ میں نے اپنی کوشش کر لی تھی۔ کہیں نہیں ملی وہ۔ میری جان، تم تو جانتے ہو اس کے رسوخ کتنے ہیں۔ اوپر سے یہ بھی ہے کہ سب نے اس کے ساتھ تعلق توڑا، یہی مجبوری ہے۔ ابھی اس سے اپنا لو مکمل ہوا ہے اس لئے کوئی بھی خبر نہ رکھتا۔"

"ہاں، وہ معاملہ کل جیسا تو نے بتایا تھا ویسا ہی ہے۔" اس نے جاناں کے پیالے سے سر سے توجہ کہا۔

شہریار نے اسے دیکھ کر گہری سانس کھینچی۔ پھر بے بسی سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "میری پوری کوشش تو یہی ہے کسی طرح معاملہ نمٹا دوں، اپنا وقت بدل لوں۔ لیکن بار بار جو جانتا ہے اس معاملے میں سازش ہے کہ یہی بھائی اس کے رعب کے جال سے نکل ہی نہیں پا رہے۔ اور ان کی ان باتوں کا حال کوئی جان بھی سکتا ہے۔ یہ سب باتیں میں وہ اس کے ساتھ مل کر رہے ہیں۔ روپیہ پانی کی طرح اس پر بہاتے ہیں۔ پاپا تک معاملہ ابھی تک پہنچا نہیں ہے۔ چند دن سے انہیں دبی دبی زبان میں کہنے کی کوشش بھی کی مگر پاپا اپنے ہی گھر میں اتنا مصروف رہتے ہیں کہ وہ بات کی

تب تک پہنچے ہی نہیں یا شاید وہ جان کر اگنور کرتے ہیں۔ ادھر عائشہ بھابی ہیں، ہر روز ان کا روتا دھوتا فون آجاتا ہے۔ میں سخت قسم کی ٹینشن میں ہوں، مجھے نہیں آتا، کون سی جادو کی چھڑی گھماؤں کہ سب کچھ بدل جائے، اپنی مرضی کا ہو جائے۔"

عاطف بیگ کچھ نہیں بولا۔ وہ ان تینوں دنوں شہریار کے جتنا قریب آ گیا تھا اس کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ بہت کم گو بہت زیادہ تھے۔ سو وہ معاملہ فہمی سے سر ہلا کر اُسے دیکھنے لگا، پھر کچھ ساعت بعد بولا۔ "آج گھر نہیں جانا تم نے؟ اور یہ دانیہ بابا ابھی تک لائبریری سے نکلی کیوں نہیں ہے؟"

شہریار نے پھیکی مسکراہٹ سے اُسے دیکھ کر کہا۔ "پڑھاکو بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہمارے تمہارے جیسے نکمے لوگ بس کیمسٹری ہو جاتے ہیں، وہی بہت ہے۔"

عاطف بیگ نے مسکرا کر اُسے دیکھا، پھر کہا۔ "ٹھیک کہتے ہو۔ پڑھاکو بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ساری محنت، جو اپنی بجائے تم ان پر گزارتے ہو، وہ محنت ایسی بھی گئی گزری نہیں کہ اسے سراہا نہ جائے۔ سچ پوچھو تو دانیہ کی پڑھائی میں ننانوے فیصد تمہاری کارکردگی بولتی ہے۔"

"بس، اب کوئی فائدہ نہیں۔ اگر وہ ذہین نہ ہوتی میں لاکھ مار کر بھی اُسے کچھ پڑھا نہیں سکتا۔" شہریار نے بات ختم کی۔

وہ دونوں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے، یہاں تک کہ آدھے گھنٹے بعد شہریار نے اس کے موبائل پر مسڈ کال دی۔ لیکن مسڈ کال کے باوجود مزید ایک گھنٹے سے پہلے نہیں آسکی تھی۔ عاطف بیگ اُسے دیکھ کر منہ بسورنے لگا تھا۔

"سوری مسٹر اجم، کیا کر بھی تو سکتی ہوں لیکن ہم ذہین لوگ ہیں، ہمیں بھوک پیاس سب ستاتی ہے۔ کیوں بھول جاتی ہو یا چاچا؟"

دانیہ عبدالرحمٰن ہنسنے لگی پھر لجاجت سے بولی۔ "سب خطائیں معاف کر دیجئے۔ آج تو آپ دونوں کا مرے علی ادب پر چاہت میں...... کیسا؟"

شہریار تنویر اور سالار والے معاملے کی وجہ سے سنجیدہ تھا اس لئے دونوں کی باتوں میں حصہ لئے بغیر خاموشی سے چلنے لگا۔ دانیہ نے بے چینی بھانپ لی پھر آگے بڑھ کر بولی۔ "آپ اسموکنگ کرنا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لئے آپ کو ہم سے الگ ہونا پڑے گا۔ بقول آپ کے، بری عادت میں بھی ایک حجاب لازم ہے۔" لمحہ بھر کو رکی، پھر محبت سے بولی۔ "آپ اتنی محبت کرتے ہیں مجھ سے کہ اسموکنگ کے دھوئیں سے بھی مجھے تکلیف نہ پہنچے اس خیال سے اسموکنگ کرتے وقت تنہائی چاہتے ہیں۔ پھر یوں کیوں نہیں ہو سکتا کہ آپ اس بری عادت ہی کو ترک کر دیں۔ اسموکنگ چھوڑنا مشکل ضرور ہے، مگر

ناممکن تو نہیں ہے۔"

عاطف بیگ نے تاسف سے دانیا کو دیکھا۔ دانیا کے دل ٹوٹنے کا خطرہ ہوتا تو وہ ضرور رہتا، کہ شہریار اسموکنگ کی تھیں وہ ترک بھی کرنے لگا ہے۔ کچھ فرضی مجبوریوں کی وجہ سے وہ سمجھا جاتا۔ بازی وغیرہ کا بچانے کے لئے اور کچھ تلخ حالات سے تنگ آکر جوانی میں فوری پابندی کو محسوس کرنے کے لئے...... اس کا خیال تھا بے زاری میں جو مزہ ہے، وہ ہوش میں نہیں...... عاطف بیگ اسے کئی مرتبہ سمجھا چکا تھا۔ کئی مرتبہ اس کی انہی عادتوں کی وجہ سے وہ شہریار کو چھوڑنے کا ارادہ بھی کر چکا تھا۔ لیکن جب اس کی خالی زندگی کی طرف نظر کرتا تو اسے لگتا، سانس لینے کے لئے وہی کا بیدردی کا رشتہ ہی اس کی مجبوری ہے۔ سلامہ کی طرح؟ وہ کبھی اسے چھوڑ کر جاتا تو خوشی سے اس پاگل کا دل پھٹ جائے گا۔ کوئی کندھا نہ ہوتا جس پر سر رکھ کر وہ رو سکے۔

عاطف کی آنکھیں شہریار پر ہی مرکوز تھیں جب شہریار سے بات ختم کر کے دانیا عبدالرحمٰن نے اس کا کاندھا ہلا کر اسے ہوش و حواس میں واپس آنے پر مجبور کیا۔ وہ یک ٹک دانیا کو دیکھ رہا تھا، جب اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کیا سوچنے لگے تھے؟ کہیں میرے پوچھنے سے آپ ہرٹ تو نہیں ہوئے کہ شہریار بھائی کے ساتھ آپ بھی اسموکنگ چھوڑنے پر بضد ہیں؟ ویسے اگر آپ ایسا سوچتے ہیں تو غلط نہیں سمجھتے۔"

عاطف بیگ ہنسنے لگا، پھر رسان سے بولا۔

"مسز! مجھے اسموکنگ کی عادت لت کی طرح نہیں ہے۔ میں شہریار کی طرح چین اسموکر بھی نہیں۔ بس کبھی ٹینشن میں ان شوق سے زیادہ نہیں لیتا۔ یقین ہے کہ میں اگر چاہوں تو فوراً چھوڑ سکتا ہوں۔ بات صرف اتنی سی ہے، مجھے اپنی ماں سے ذرا کم محبت ہی ہے۔ بس......"

شہریار جو دانیا کے جملوں سے بےچین ہو گیا تھا، کیونکہ اس کے اندر وہ جواں پھر سے لگے سال...... پاؤں کو سب سے کھٹکا ہوا بدلا ہوا تھا۔ لیکن عاطف ابھی اسے اتنا نہیں جانتا تھا، جتنی ملامہ کی طرح اس نے بھی عاطف سے اپنا آپ چھپا رکھا تھا۔ بس ملامہ کے زندگی سے نکل جانے کا ہی عاطف اس کی زندگی میں داخل ہو چکا تھا۔ لیکن بہرحال ملامہ کے متعلق وہ پھر بھی زبان بندی کے شوق لے برقرار رکھتا تھا۔

"گھر چلیں دانیا!" اس نے ناچ کی طرف قدم بڑھاتے۔ دانیا نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ عاطف بیگ نے جلدی سے ہاتھ لہرا کر اسے کہنے سے روکتے ہوئے کہا۔

"تکلف نہیں مسز! بے فکر ہو، آج کا لنچ تم پر ادھار ہے۔ تم جانتی ہو میں بھوک کھانے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہوں۔"

دادا عبدالرحمن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ کچھ نہیں بولے۔ لیکن ان کے بات سنبھالنے کے انداز پر تشکر سے دیکھ کر وہ شہریار کی طرف متوجہ ہوگئی جہاں وہ پلنگ پر بیٹھا اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

* * *

وسیع و عریض ہال کمرے میں اس وقت مسٹر عابد اور مسز عابد بیٹھے تھے اور دونوں کے درمیان کچھ دنوں سے ہونے والی بات چیت ایک بار پھر سے دہرائی جا رہی تھی مگر لگتا تھا دونوں ایک دوسرے کو مطمئن کرنے میں ناکام رہے تھے۔ کیونکہ بیگم عابد کے چہرے کے تاثرات اچھے نہیں تھے۔ مسٹر عابد کچھ دیر تو ان کے چہرے کے زاویے دیکھتے رہے، پھر معاملہ جوں کا توں برقرار رہا تو انہوں نے لگاوٹ سے پوچھا۔

"جمیلہ! کیا ہو گیا ہے؟...... کیا واقعی ناراض ہو گئی ہو؟"

بیگم عابد نے شوہر کی لگاوٹ پر دل میں خوش ہوتے ہوئے بھی بظاہر خفگی کا مظاہرہ برقرار رکھتے ہوئے روٹھے سے لہجے میں کہا۔ "ناراض نہ ہوں تو کیا کروں، آپ کو میری ہر بات ہی ناقابل عمل لگتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے اگر شہریار اچھا لڑکا ہے تو کیا برائی ہے اپنی ماریہ کے لیے اس کا ہاتھ مانگنے میں؟"

"کوئی حرج نہیں ہے لیکن ہمیں یہ بھی تو دیکھنا ہے، وہ لوگ اس میں دلچسپی رکھتے بھی ہیں یا نہیں؟ ہم خوامخواہ ٹھکرانے سے گھبراتے ہیں۔"

"لیکن اگر ہم انہیں دباؤ کے تحت اس فیصلے کی طرف لے آئیں تو......" بیگم عابد کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ شاطرانہ چالوں میں وہ یدطولیٰ رکھتی تھیں۔ مسٹر عابد تو ان کے حکم کے غلام تھے، سو ان کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر انہوں نے نیم رضامندی سے بیگم کو دیکھا پھر کسمسا کر بولے۔

"جمیلہ! تمہیں کیا لگتا ہے، کیا ہم اس مقام پر ہیں کہ مسٹر عبدالرحمن کی فیملی پر کوئی دباؤ ڈال سکیں؟"

بیگم عابد فوراً مسکرا کر بولیں۔ "کیوں نہیں۔ ہم ایسے مقام پر ہیں کہ مسٹر عبدالرحمن قطعاً انکار نہیں کر سکتے۔ تمہیں نہیں پتہ، حمزہ میرا بیٹا ہے، اس کی ساری عادتیں مجھ پر گئی ہیں اور میں جانتی ہوں میرا بیٹا صرف محبت کے لیے شادی کی خرافات میں نہیں پڑ سکتا۔ زندگی نبھانے کرنے کی ذہنیت اس میں آپ جیسی ہے، اس لیے کسی ایک لڑکی کا ہو کر رہنے کا سودا وہ صرف کسی بڑے منافع کے طور پر تو قبول کر سکتا ہے، صرف محبت کے لیے نہیں..... اور شہریار جانتا ہے لڑکیوں کو محبت کے خواب کیسے دکھائے جاتے ہیں۔"

"ہاں وہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن مسٹر سلیم بہت جلد پاکستان آنے والے ہیں۔ ان کا خیال پاکستان میں مستقل قیام کا ہے۔ دراصل ان کی دونوں بچیاں بڑی ہو گئی ہیں۔ میں اس لیے ابھی اس معاملے میں نہیں

AANCHAL.COM.PK

پڑنا چاہتا تھا۔ بظاہر میں نے بچے کے منہ کو کھا لیا ہے، لیکن بہر حال وہ مسٹر عبدالرحمٰن شیخ کے حساب سے کافی ہے۔ حمزہ نے ایک دم لیں شروع کیا ہے لیکن وہ بھی اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر ہے۔"
نیلم نے یہ سوچ کر انہیں دیکھا، پھر ایک منٹ سے بھی کم مدت میں بولیں۔ "وہ انگلینڈ کا جواد حسن، وہ کس کام آئے گا؟ آخر ہماری الٹ پھیر کی وجہ سے کما کھا رہا ہے۔ اگر ہم مسٹر حلیم کے سامنے اس کی ایمانداری، وفاداری کا پرچار نہ کرتے، جو اس میں بالکل نہیں ہے تو مسٹر حلیم اسے اپنے ایڈیشنل منیجر کے طور پر کبھی نہ لے جاتے۔ آپ کے پاس اس کی کچھ کمزوریاں ہیں، آپ اس سے کہیں، وہ مسٹر نعیم کو ابھی کچھ اور سال انجوائے کرنے دے۔ کم از کم پانچ سال تو ضرور ہی...... تاکہ ہم اپنا گھر اور بزنس اچھی طرح سیٹ کر لیں۔ پھر اگر مسٹر نعیم پر آپ کی کرپشن کا عقدہ کھلتا بھی ہے تو تب تک ہماری پوزیشن اتنی مضبوط ہو چکی ہو گی کہ وہ مسٹر عبدالرحمٰن کے سمدھی ہونے کی وجہ سے دس دفعہ ہم پر ہاتھ ڈالتے ہوئے سوچیں گے۔"

مسٹر عابد کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ پھر لاڈ ان کی آواز میں بھرتا چلا گیا۔ انہوں نے نیلم کو پچکار کر شوخی سے کہا۔ "لوگ ٹھیک کہتے ہیں، ہر کامیاب آدمی کے پیچھے کوئی نہ کوئی عورت ضرور ہوتی ہے۔ میں جب بچہ تھا تو سمجھتا تھا وہ عورت میری ماں ہے۔ لیکن جب ماں کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر ناکام رہ گیا تو پتہ چلا، میں کانٹوں پہ چلنے لگا ہوں۔ ہر شخص یہی کہتا تھا تم کس زمانے کی باتیں کرتے ہو۔ ایمانداری سے صرف دو وقت کھانا کھایا جا سکتا ہے۔ اور زندگی کبھی کی وہ بھی نہیں۔ میں نے یہی بات ماں سے کہی تو انہوں نے مجھے دنیا کے حوالے کر دیا۔ شاید تھوڑی سی نادانی کر رہا ہوں میں یہاں۔ انہوں نے نہیں، میں نے خود ہی خود کو دنیا کے سپرد کر دیا تھا کہ میں دنیا کی طرح جی سکوں۔ تب تم ملیں اور تمہارے آنے سے جس طرح مجھ پر زندگی مہربان ہوئی ہے اس پر میں بجا طور پہ کہہ سکتا ہوں، ہر آدمی کے پیچھے جو کامیاب عورت ہوا کرتی ہے، میری زندگی کی وہ عورت تم ہو۔"

نیلم شرمانے لگیں اور تب ہی حمزہ نے انٹری دی۔ وہ خاموشی سے پیچھے کھڑا پہلے سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ انہیں خاموش ہوتے دیکھ کر باپ کو آنکھ مار کر تیکھی آواز میں بولا۔

"اوہو...... تو رومانس ہو رہا ہے۔ میں بھی سوچتا تھا اتنا رومانس مجھ میں کہاں سے آیا۔ اب معلوم ہوا یہ وراثتی جراثیم ہیں۔"

نیلم بیگم آنکھیں نکال کر بیٹے کو دیکھنے لگیں۔ پھر اس کے کندھے پر لاڈ سے تھپڑ مار کر بولیں۔ "بہت خراب ہو گئی ہے تمہاری صحبت۔ پتہ نہیں چلتا باپ سے بات کر رہے ہو یا دوست سے...... ہم تو ایسی کسی بات کو کہنے کے لیے سوچ کر ہی پانی پانی ہو جاتے تھے اور تم کیا کر رہے ہو۔"

مسٹر عابد نے بیٹے کو محبت سے دیکھ کر جواب دیا۔ "سیدھی سی بات ہے نیلم، بیٹا جوان ہو جائے تو باپ کے جوتوں کی طرح وہ باپ کی ہر چیز میں ایڈجسٹ ہو جاتا ہے، جیسے کوئی یار۔ پھر میرا بیٹا کوئی

ہماری طرح کے سخت ماحول میں تھوڑی پالا جاتا ہے، جو کنفیوز رہے گا اسے اپنی زندگی کی سمت بھی معلوم ہے اور منزل پر بھی اس کی نظر ہے۔"

حمزہ عابد نے چونک کر باپ کو دیکھا، پھر صوفے کی بیک سے چھلانگ لگا کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ڈیڈ! آپ بھی نا......" وہ کچھ کہتے کہتے رکا، پھر شوخی سے بولا۔ "پہلے مجھے لگتا تھا میرے اندر بلا کی کنفیوژن بھری ہوئی ہے، لیکن اب لگتا ہے، یہ سب آپ کی نظر کا کرشمہ ہے۔ ویسے جو آپ پوچھنا چاہتے ہیں، میری گاڑی اس ٹریک پہ مناسب رفتار سے دوڑ رہی ہے۔"

مسٹر عابد نے بیٹے کو پہلے جیسی شفقت سے دیکھا اور وقت مسکراتا ہوا ان کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔

❀ ❀ ❀

عاطف بیگ کو شہریار نے جس کام میں لگایا تھا، اس نے ایک مہینے کے اندر اندر رپورٹ شہریار کے سامنے پیش کر دی تھی۔ شہریار خاموش بیٹھا تھا اور عاطف بیگ اسے تک رہا تھا۔ کتنی خاموش ساعتیں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دوڑتے گزر گئیں۔ تب عاطف بیگ نے کہا۔

"پھر تمہارا کیا خیال ہے، وہ مسٹر عابد جیسے کرپٹ آدمی کا بیٹا ہے، وہ کیونکر وفادار ہو سکتا ہے۔ وہ شخص جس کا اپنا گھر ٹھیک نہیں ہے، وہ دنیا کا ہاتھ کیسے تھام سکتا ہے؟ تم انکل کو اعتماد میں لے کر بتا سکتے ہو کہ حمزہ عابد کسی بھی طرح دانیہ کے لیے موزوں نہیں ہے۔ کام ہی کے لئے مجھے بلا لینا۔"

شہریار اسے پرسوچ نظروں سے دیکھتا رہا، پھر آہستگی سے بولا۔ "وہ لڑکی کون تھی؟ تم نے اندازہ لگایا حمزہ عابد کے ساتھ ... کی تمثال کا شہرہ ہے؟"

عاطف بیگ نے نفی میں سر ہلایا، پھر آہستگی سے بولا۔ "میں کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ چلیں دیکھو کیا علم میں آتا ہے۔ ویسے تیرا اٹیچمنٹ کہاں تک پہنچا ہے؟"

شہریار نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر بے بسی سے بولا۔ "بہت برا پھنس گیا ہوں میں۔ جتنا جاننے کے معاملے میں آ گیا ہوں، مجھے لگتا ہے میری واپسی کی کوئی راہ نہیں بچی ہے۔ جاننے کے ساتھ سالار بھائی نے مجھے میری مرضی کی وجہ سے بہت دفعہ ڈھیل دی ہے، ان کا غصہ الگ ہے۔ وہ پھٹ پڑنے کے منتظر ہیں۔ مگر جانے کون سی بات انہیں روکے ہوئے ہے۔ تمہیں معلوم ہے، بھائی نے کئی دفعہ مجھ سے پوچھ گچھ کی، انہیں اپنی بات بھی کر چھوڑ رکھی ہے۔ میں پاپا کے سامنے اس معاملے کو لانے کی جتنی کوشش کرتا ہوں، مجھے لگتا ہے جیسے سالار بھائی اس معاملے میں توجہ کرنی اہمیت کرنے کی کوشش کرتے ہیں...... میں دو طرف میں بٹ گیا ہوں۔ سمجھ نہیں آتا، کس جگہ توجہ زیادہ خرچ کروں۔ سالار بھائی کی زندگی بھی کم تر حیثیت نہیں رکھتی، وہ دنیا کی خوشیوں بھری زندگی تو میری زندگی کا ہی

اٹھا ہوتا ہے۔ مجھے نہیں پتا، کس طرح اس سچ کا سامنا کروں گی حمزہ! عابد کتنا بدل گیا۔ پتہ ہے۔ اس کے نفرت کی داستان اماں ابا کے سامنے آنے کا مطلب ہے کہ بابا کا دل ٹوٹ جانے۔ حمزہ! عابد کو کوئی فرق نہیں پڑتا، صرف میری ممی زندہ ہوتے ہوئے مر جائیں گی۔ جتنی شدت سے میں نے ان سے محبت کے شعر گنگنانے دیکھا ہے، میں اندازہ لگا سکتی ہوں، ان محبتوں کے لئے اتنی حساس ہو گئی ہیں، تو ٹوٹیں گی بھی کتنی شدت سے ٹوٹنے لگی۔"

عاطف بیگ نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلایا پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"پتہ نہیں، میں اس سلسلے میں کچھ کر بھی سکوں گا یا نہیں۔ کون کیا سوچ رکھتا ہے، یہ تو سچ ہے لیکن میں گا۔ دیکھو کیا ہوا لکھا ہے اور کون ان کی دروازے پر کھڑی ہے۔" کیسے کیسے تمہارا بچہ آہستگی سے بولا۔ "حمزہ! ہم کبھی بظاہر مت ہوتے دیا کہ ہم اس کی اصلیت جان چکے ہیں۔ اس سے اسی طرح سے ملنا جلنا ہے، مسلسل نظر میں رکھو اور پتہ کرو وہ کس کے ہوتے ہوئے وہ اماں کی نفسی کتنی محبت سے کھیلنا چاہتا ہے۔"

عاطف بیگ نے سر ہلا کر اس کی بات پر عمل کرنے کا عندیہ دیا اور ایک ہفتے بعد کی بات تھی، جب بہت اچانک عاطف بیگ کا فون اس کے سیل فون پر آیا۔ وہ بجلی کی تیزی سے اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا۔ یہ بھی دو جانے درجے کا ایک بہت مقبول قسم کا ہوٹل تھا۔

"کہاں ہے حمزہ؟" شہریار کے چہرے کی ساری رنگت اڑی ہوئی تھی۔ اس کی آواز خود عاطف کو بھی بہت اجنبی لگ رہی تھی۔

"پہلے تم وعدہ کرو کہ غصے میں کوئی الٹی سیدھی حرکت نہیں کرو گے۔" عاطف بیگ نے اس کا ہاتھ تھام کر تشویش سے لہجے میں سوال کیا۔ شہریار نے پتھریلی آنکھوں سے اسے دیکھا پھر سرسراتے لہجے میں بولا۔

"میں نہیں جانتا، میں حمزہ کو کسی اور کے ساتھ دیکھ کر کیا ردعمل ظاہر کروں گا لیکن... مجھے یہ میرا اسے قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

عاطف بیگ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، وہاں صرف غصے کے سوا کچھ نہیں دکھ رہا تھا پھر تسلی بھی تھی کہ وہ اس کے ساتھ ہے۔

"کہاں ہیں دونوں؟" اس نے نظر دوڑاتے ہوئے ماحول کے بعد تلخی سے سوال کیا۔ تب اس نے کیبن کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ دونوں وہاں اس کیبن میں ہیں۔"

سو شہریار نے تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کیبن کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ جو کوئی بھی تھی شریف النفس ہوئی تو اس کی آمد پر گھبرا جائے گی اگر بے سہارا ہوئی تب بھی اس طرح کے معاملات میں لڑکیاں عموماً کمزور پڑ جاتی ہیں۔ رہا حمزہ تو شاید وہ اس طرح چوری پکڑے جانے پر شاید اس رشتے کو قائم رکھنے کے لئے تائب ہونے کی اداکاری کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرہی گزرتا...... لیکن اس سے پہلے کہ شہریار کیبن کا پردہ اٹھاتا حمزہ عابد خود کیبن سے نکلتا دکھائی دیا۔ شہریار نے تیکھی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ گویا اسی کا منتظر تھا۔ شہریار نے تیزی سے پشت کرلی تھی۔

"یہ ہے تمہاری کمٹمنٹ مرد کی؟" وہ آہستہ سے بڑبڑا رہا تھا۔

شیو عاطف نے بھی بڑا بن لیا تھا بغیر کسی کے جسے لگا تھا۔ شہریار نے کچھ نہیں کہا لیکن اس کے سامنے ہو لئے اور یہ سب حارث سمیت دیکھ چکا تھا۔ وہ جب نہیں رہتا آ گیا تھا اور آئندہ دو روز سے کہیں زیادہ خوش تھا۔

"تمہیں پتہ ہے اس سچائی کا بوجھ سنبھالے سنبھالے میرے دماغ کی رگیں پھٹنے لگی ہیں۔ بہتر ایک ہفتے سے شوٹ کر گیا ہے۔ بولا تھا میں پھر بھی فرق نہیں پڑتا سیدھی سی بات ہے مسئلہ اندر سے تو بیرونی امداد وہ اس کی صورت ان کیوں نہ ہو شرکیے کرے گی۔"

عاطف بیگ نے پریشانی سے اسے دیکھا پھر خفگی سے بولا۔ "تمہیں اپنی پروا کرنی چاہئے شہری! اپنے لئے نہیں تو ماما کے لئے، انکل کے لئے، بھائیوں کے لئے، انکل کے لئے ان کے دل کی مریض ہیں تمہیں جان سکتا۔ لیکن تمہیں پتہ ہے بچی کا انکل کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک ضرور دکھائی ہے۔ میں چاہتا ہوں ان کی آنکھوں پہ چمک ہمیشہ برقرار رہے۔"

"چمک مجھے مجھ کو...... ہاہا......"

وہ زیر لب قہقہہ لگا کر سمندر کو دیکھنے لگا۔ اس سمندر کی قسمت کتنی ملتی جلتی تھی۔ اس سمندر کی طرح اس نے بھی ظرف آزمایا تھا پیاس بجھائی بھی تھی، پیاسا بھی رہتا تھا۔ لہروں کی صورت ساحل سے ٹکراتا بھی تھا اور معلوم صورت ریت کے ذروں میں جذب ہو کر مرجاتا بھی تھا۔ سمندر کے پانی کی طرح وہ بھی زندگی دینا چاہتا تھا لیکن شدت سے پیاسے ہونے کے باوجود بھی اس کی محبت کو کھارے پانی کی طرح تھوک دیا کرتے تھے۔

کھارا سمندر...... کھاری محبت......

AANCHAL.COM.PK

واقعی محبت آنسو کے سوا کچھ نہیں، اسی لیے اس کا مزہ تمام عمر دوسرے کو بھی کھارا رہتا ہے۔ کتنی مٹھاس ڈالو کتنی ہی توجہ دو کھارے پانی اور خالی شور کے سوا تم کچھ نہیں آتا۔

خاموشی بہت گہری ہو گئی تھی، جب عاطف بیگ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسے سے کہا تھا۔ "میں نہیں جانتا تمہاری اصل پرابلم کیا ہے، لیکن تمہاری کوئی بھی ان کہی ہماری تمہاری دوستی میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ رہی ٹینشن تو اگر یہ حمزہ کی وجہ سے ہے تو جان لو ہم اس کا کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیں گے۔"

شہریار نے اس کی طرف خالی آنکھوں سے دیکھا پھر سنجیدگی سے بولا۔ "لیکن مجھے لگتا ہے میں اس معاملے میں کچھ نہ کر پاؤں گا۔ دنیا کی مسکراتی خوب صورت آنکھیں ہیں ایک طرف تو دوسری طرف عدیل بھائی ورکا ہیں، پاپا کی خوشی ہیں۔ آج کل تو نانو جیسی سخت مزاج خاتون بھی بات بے بات مسکرانے لگی ہیں۔ ان کی ہر بات کا رخ دنیا کی شادی پر جا رکتا ہے۔ ماما اور پاپا بھی اس بات کے حق میں ہیں۔"

"اور سالار بھائی کو اپنی شادی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" عاطف بیگ نے سوال اٹھایا۔

"سالار بھائی...... وہ تو لگتا ہے، بچولتی سے کانٹوں پر گھسیٹنے لگے ہیں۔ بظاہر لگتا نہیں ہے کہ انہیں کسی کے دل ٹوٹنے یا بستر پر نہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر وہ ابھی تک ہمت نہیں کر پائے ہیں کہ یکدم کہہ سکیں کہ عاتقہ سے شادی کرنے کا خیال ان کی زندگی کی سب سے بڑی بھول ہے۔ مجبوری ہے، انہیں اتنا نیا ہونے دے ٹھیک دنیا پر رہا ہے کہ تنہائی میں مجھے خود پر غصہ آتا ہے۔ جانانہ کے ساتھ کہیں باہر نکلتا ہوں تو جان کر انہیں جتاتا ہوں، میں کہاں جا رہا ہوں، کتنا وقت ان کی محبت کے ساتھ گزار کے آ رہا ہوں اور دونوں پر ہم سنتے رہتے ہیں۔ کبھی جو سامنا ہو جائے تو ان کی آنکھوں میں اتنی بے چارگی اتنی ٹوٹی ہوتی ہے کہ مجھے اپنی شکل دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔ مجھے لگتا ہے، میں ان کے بن روئے آنسوؤں میں کسی دن ڈوب کر رہ جاؤں اور یہ کھارا پن مجھے آہستہ آہستہ گلا دے گا۔"

عاطف بیگ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا پھر فکر مندی سے بولا۔ "تجھے محسوس ہو رہا ہے یا نہیں، لیکن میں دیکھ رہا ہوں تجھے بات کرنے میں بہت دقت ہونے لگی ہے۔ اتنی سانس کیوں چڑھ آتی ہے تیری؟ سچ بتا صرف بلڈ پریشر ہے نا؟ یا کوئی اور گل کھل رہا ہے؟"

شہریار نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ جیب میں رکھی شیشی سے گولیاں نکالیں اور ہاتھ میں پکڑی منرل واٹر کی بوتل سے نگل لیں۔ عاطف بیگ نے دیکھا تو بوتل چھین لی، پھر تپ کر بولا۔ "تم اتنے اسٹوپڈ کب سے ہو گئے؟ یہ دوا کیوں زکیا بھائی لیتے ہیں۔ ابو دواخانے کے مریض ہیں۔"

شہریار نے پھیکی ہنسی کے ساتھ اسے دیکھا پھر آہستگی سے بولا۔ "بس ایویں شوق کر رہے تھے پتہ نہیں کتنی بڑی بیماری ہو گئی ہے۔ ہاں یار میرے لیے یہ رازل ہے۔ دل دھڑکتا ہے تو خبر نہیں ہوتی زندہ ہوں یا

نہیں۔ درد ہوتا ہے تو احساس رہتا ہے کہ ابھی زندگی کی قطار میں کھڑا ہوں اور جینے کے امتحان اور بھی ہیں۔“

عاطف بیگ کے تاثرات پھر بھی نہ بدلے تو وہ دوبارہ بولا۔

”میری جان! دو سال سے اس بیماری کی ناز برداری کر رہا ہوں۔ ابھی تک تو زندہ ہوں۔ تُو نے تو ایسے تاثرات دینے شروع کر دیے جیسے میرا آخری دیدار کرنے کا وقت قریب ہو۔“

”بکواس مت کر۔ عجیب آدمی ہے تُو۔ کسی بات سے پریشان نہیں ہوتا۔ اپنے اوپر کچھ بھی گزر جائے، سب برداشت کر لیتا ہے۔ فکر رہتی ہے تو گھر والوں کی، ان لوگوں کی، جو بہت کم تیری پروا کرتے ہیں۔“ تو عاطف پھر رکا پھر آہستگی سے بولا۔ ”کیا ان کو پتا ہے تیری بیماری؟“

شہریار عبدالرحمن نے اس کی جذباتی حالت دیکھی تو اُسے کندھوں سے تھام کر بولا۔ ”یار عاطف! تُو تو مجھے ایموشنل ہیرو بنانے پر تلا ہوا ہے۔ میرے سامنے ہی میرے گھر والوں کی کم توجہ پر مجھے پر... رہے ہیں۔ سارے بیمار اور انسان اپنی زندگی کے معمولات پہلے سے طے کر کے لاتا ہے۔ کتنا جینا ہے، کتنا رونا ہے، کتنا ہنسنا ہے، زندگی میں آخری بار مرنے سے پہلے کتنی بار مرنا ہے، سب کچھ۔ پھر میں کس بات کا شکوہ کروں؟...... رہی میری بیماری...... تو خدا کا خوف کرو عاطف! مجھے کوئی اتنی شدید نوعیت کا انجائنا نہیں ہے۔ بس بلڈ پریشر شوٹ کر جاتا ہے تو کچھ پرابلم کری ایٹ ہو جاتی ہیں، ورنہ طبیعت نارمل ہی رہتی ہے۔ رہی دنیا کی باخبری تو میرے بھائی! ایک پرانی قسم کے ناول کی چوپشن نہیں ہے جس میں ہر آدمی میری بیماری کا راز دوسرے کو دے کر اس بات کو راز رکھنے کی قسم لیتا ہے اور آخری صفحات تک ناول کے سارے کردار چھپ چھپ کے روتے ہو کر مریض کو مرنے سے پہلے ہی شرمندہ کر کے مار دیتے ہیں۔ مجھے میرا تو خیال ہے انسان کو جتا کر مرنا بھی نہیں چاہیے۔ بقول غالب، نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا والا مصرعہ ہو تو زندگی مزے میں گزر جاتی ہے۔“

عاطف بیگ کچھ نہیں بولا تھا اور وہ دونوں اپنی اپنی راہ کے مسافر ہو گئے تھے۔ شہریار نے اُسے باہر سے ہی چھوڑ دیا تھا۔ تب کے بعد سے اب وہ بہت کم دوستوں کے گھروں کے اندر کی زندگی کو جینے کی حسرت کر پاتا تھا۔ کبھی کبھی عاطف خود کہتا بھی تو مہمان خانے سے آگے کا راستہ طے کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ عاطف اس کی لاجک سمجھتا تھا اس لیے اعتراض نہیں کرتا تھا۔ سو اس وقت بھی وہ اُسے باہر سے چھوڑ کر گھر کے لیے راستہ طے کر رہا تھا۔ جب اس نے کمرے میں قدم رکھا تو رک کر گہری سانس لی تھی کہ اُسے اپنی پشت پر کسی کی جلتی نگاہیں محسوس ہوئیں۔

”سالار بھائی......“ اس کی چھٹی حس نے الارم دیا مگر وہ پلٹا نہیں۔ وہ جان کر ان کے چہرے کی کیفیت سے بچنا چاہتا تھا مگر سالار عبدالرحمن اس کی سوچ کے برخلاف اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔

"مجتبیٰ بھائی! آپ......" بمشکل اس نے جملہ جوڑا اور سالار عبدالرحمٰن کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"تم...... آخر تم کو کیا لگے گا میری محبت ثابت کرنے میں؟...... تم جانتے ہو میں جانتا ہوں کہ کس قدر ٹوٹ کر محبت کرتا ہوں، پھر بھی تم میری راہ میں آ رہے ہو؟ تم جانتے ہو میں محبت میں انتہائی ہوں کہ کچھ بھی کر جاتا ہوں۔"

"آپ مجھے جان سے نہیں مار سکتے اتنا میں جانتا ہوں۔" وہ طبیعت کے برخلاف استہزائیہ ہنسا۔

سالار عبدالرحمٰن نے اس کا شانہ سختی میں بھینچ لیا اور غصے سے پھنکارے "تم اگر ایسا سمجھتے ہو تو تم غلطی پر ہو۔ میں محبت میں مار دینے اور مر جانے پر یقین رکھتا ہوں اور پھر تم...... تم کون سے میرے سگے بھائی ہو کہ تمہیں مارتے ہوئے میرا دل کانپے۔"

شہریار عبدالرحمٰن نے کوشش کی وہ ان کے غصے پر پُرسکون رہے مگر کوشش کے باوجود اس کے اندر جذبات کا ابال اٹھنے لگا تھا۔

"آپ مجھ سے اتنی نفرت کرتے ہیں کہ آپ کا دل چاہتا ہے، میں مر جاؤں؟"

سالار عبدالرحمٰن نے بڑی سفاکی سے خنجر پر ہاتھ رکھا۔ "ہاں...... میں تم سے اتنی ہی نفرت کرتا ہوں کہ میرے اختیار میں ہو تو کسی اور کے کام کی موت تمہارا پیچھا کرے اور کہیں مر جاؤ۔ اگر کسی کو جینے کا حق نہیں ہونا چاہیے تو وہ صرف شہریار عبدالرحمٰن ہے...... شہریار عبدالرحمٰن...... جس کے لیے کسی کے دل، کسی کی محبت اور کسی کی زندگی کا کوئی مطلب نہیں ہے۔"

اس نے کھڑکی سے ٹیک لگا کر اتنی ہی تلخی سے سنا تھا جتنی سفاکی سے کہا گیا تھا۔ دل کی بے چینی جب حد سے گزری...... اس نے دل میں ہوک لگائی۔ "سالار بھائی! کاش آپ کو معلوم ہوتا آپ سے محبت کی پاداش میں مجھے زندگی کتنی سفاکی سے ادا کرنی ہے...... مگر مجھے مرنا ہے...... اور میں شکوہ کرنے کی جسارت نہیں کر پاتا......"

"کیوں خاموش ہو؟...... اب بولو ناں، کیوں؟ تم اتنے ظالم؟...... اتنے ظالم کہ مجھے تمہاری زندگی کی بد دعا دینی پڑتی ہے؟"

اس نے کچھ کہے بغیر کھڑکی سے باہر جھانکنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بھی ظالم وقت تھا، شہریار عبدالرحمٰن...... محبت تھی...... اور بہرحال...... کچھ تو تلخ بھی تھا۔ سو وہ چاند کی اوٹ تلے باہر کی خاموشی سے اپنے اندر کے شور کو کم کرنے کی سعی کرنے لگا تھا۔

سالار عبدالرحمٰن کچھ دیر تو اُسے ایسے ہی دیکھتے رہے، پھر جس طرح تن فن کرتے آئے تھے اسی طرح واپس چلے گئے۔ اُن کے جاتے ہی شہریار نے لائٹ آف کر کے کمرہ لاک کر لیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا، سالار عبدالرحمٰن کا اس کے کمرے کی طرف آنا دیکھ کر بیوی نہیں رک سکتا تھا کہ دانیال اِدھر کا رخ نہ کرتی۔ پھر شام کی چائے کا بھی وقت ہو چلا تھا سو لازمی وہ اس کو بلانے آتی اور اس وقت وہ اتنا پریشان ہو گیا تھا اپنے آپ سے کہ اگر کسی کا ہلکا سا بھی آسرا ملتا تو شاید تڑپ کر رو دے مگر نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر تنگ چادر تان کر سلیپنگ پلز لے کر وہ سونے کی سعی کرنا چاہتا تھا۔ کہتے ہیں نیند آدھی موت ہوتی ہے اور وہ اس آدھی ادھوری زندگی کی تلخی کو آدھی موت سے پاٹنا چاہتا تھا۔ کیا پتہ پوری مدت کب اس پر مہربان ہو جاتی......

دانیال کافی دیر تک اس کا دروازہ ناک کرتی رہی۔ پھر حیران ہو کر واپس سالار عبدالرحمٰن کو ڈھونڈنے کے مشن پر جت گئی مگر غیر متوقع عدیل عبدالرحمٰن سے ٹکرا ہو گیا۔ عدیل عبدالرحمٰن نے پریشان دیکھا تو فوراً کلائی تھام کر پکارے۔

''کیا بات ہے گڑیا جی! کس بات پر مزاج برہم ہیں؟ ویسے آج کل گھر میں زیادہ تر لوگوں کے مزاج کو کچھ نظر ہی لگ گئی ہے۔'' پھر اُسے سوالیہ دیکھا تو صوفے پر دھکیل کر بٹھاتے ہوئے بولے۔ ''تمہیں سمجھیں تو میں سمجھاتا ہوں۔'' تھوڑا توقف کیا پھر آہستگی سے بولے۔ ''اپنے حمزہ صاحب ہیں نا ان...... اُن کی ایک سسٹر ہوتی ہیں ماریہ۔ مسٹر عابد چاہتے ہیں شہریار سے اُن کی بیٹی کی بات پکی ہو جائے تو وہ اس خوشی کو دھوم دھام سے منائیں۔ تمہاری بات ٹھہر تو گئی ہے مگر پھر بھی سوسائٹی کے پیش نظر مسٹر عبدالعزیز جاہا ایک بڑا فنکشن کرنے کے خواہشمند ہیں۔ مگر ماما روحیل میں نہیں ہیں۔ اُن کا خیال ہے وہ شہریار جیسے لاابالی اور احمق انسان پر...... مجھے مت گھورو، یہ میرے نہیں ماما کے کمنٹ ہیں تو ہاں وہ یہ کہتی ہیں کہ وہ شہریار پر اتنا اعتبار نہیں کر سکتیں کہ تمہارا دوسرا رشتہ طے کر دیں۔ اُن کا خیال ہے جس طرح شہریار لاابالی ہے، اگر اسکا سوز گڑ گیا تو ہمارے سے نباہ نہیں کر سکا تو تم پر حرف آ جائے گی۔ رہے پاپا تو ان کا مزاج اس لئے خراب ہے کہ بقول ان کے ماما نے ان کے سب سے چہیتے بچے کو صدمہ پہنچایا ہے، نہ تو یوں بھی ہمیشہ خراب مزاج کے ساتھ نمبروں کی پوزیشن پر رہتی ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان سب کے برخلاف آج کل اپنے امیوشنل بابا دل عظیم بنی سالار عبدالرحمٰن کا مزاج کیوں برہم رہنے لگا ہے۔''

عدیل عبدالرحمٰن نے مدبر کالی رنگت کے مالک سالار عبدالرحمٰن کو پوائنٹ آؤٹ کیا۔ کچھ وہ خوب صورت بھی تھے اور کچھ اس بات سے خوفزدہ بھی کہ وہ چپ تھے۔ ہیں تو زیادہ چپ تھے۔ وہ جو کہتے ہیں تو زمانے کی سانس بھی رک جاتی ہے۔ سو عموماً تو وہ اپنی ذات سے باہر نکلتے نہیں تھے اور اگر خود پسندی سے باہر نکل کر دیکھتے بھی تو بہت کم معمولات میں اپنی رائے دیتے، یا خاموش رہتے۔ اس لئے اگر ان کا مزاج

ہم تھا، کوئی خاص بات ہی ہو رہی تھی۔"

دادا ابا انہیں پرسوچ نظروں سے دیکھتے ہوئے بتانے لگے۔ تب عدیل عبدالرحمن ایک نظر کے ذریعے ان کے چہرے سے فوراً معاملے کو بھانپ کر بولے۔

"سنی کا کسی سے جھگڑا ہوا ہے؟ کیا پھر کسی بات پر شہریار سے... وہ تو نہیں ہو گئی بحث ان کی؟"

دادا ابا نے شانے اچکا کر بے بسی سے بھائی کو دیکھا۔ عنبرا آہستگی سے بولی۔ "معاملہ ہمیشہ کی طرح شہریار بھائی اور سنی بھائی کا ہی لگتا ہے۔ کیونکہ میں نے انہیں شہریار بھائی کے کمرے کی طرف جاتے اور پھر غصے سے بھنا کر واپس آتے دیکھا ہے۔ سنی بھائی کے مزاج کی وجہ سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ آخر کس بات پر بگڑ گیا ہے۔ سوچا تھا شہری بھائی سے تفصیل جان لوں گی مگر ان کے روم کی طرف گئی تو ان کے کمرے کی لائٹ آف ہے اور وہ بیزار دستک پر بھی دروازہ نہیں کھول رہے۔"

"اہم...... معاملہ تو گمبھیر لگتا ہے آخر ایسا کیا ہو گیا ہے۔" جویریہ نے شرارتی انداز سے پلکیں جھپکائیں۔

"فضول باتوں کی بجائے بیٹا! آپ...... آپ بندے کو فکرمندی کرنے دیجئے میں عزت دے دیجئے۔"

عدیل عبدالرحمن مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں بولے۔ "بھئی اگر میں اس گھر میں ہی رہا تو گھر کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر مجھے لگتا ہے تم لوگ سنجیدہ ہی مر جاؤ گے۔ اتنی بیزاری بھری منتخب باتوں کے بجائے بہتر ہے بندہ پانچ منٹ ہنس ہی لے۔"

دادا ابا نے مسکرا کر اسے دیکھا اور اسی معاملے پر بات کی کوشش کی۔ عدیل عبدالرحمن یا تبصرہ کرتے رہے۔ دراصل وہ سنجیدگی سے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے جھنجھلائے انداز اپنا رہے تھے تاکہ گھر کا ماحول خراب ہونے سے بچ جائے۔ اسی وقت انہوں نے جان کر دادا ابا کے سامنے ایسا ظاہر نہیں کیا تھا کہ پریشانی کی بات کوئی نہیں ہے تاکہ وہ بلاوجہ مزید پریشان نہ ہوں۔ مگر گھر سے نکلنے سے پہلے انہوں نے ایک ضروری کام کی تھی۔ سالار عبدالرحمن کی دوستی کا حساب کیا تھا پھر دس منٹ بعد وہ شہریار کے سامنے کھڑے تھے۔

"یہ جانا کا کیا معاملہ ہے؟"

شہریار کے ہاتھ میں کافی کا مگ کانپ گیا تھا۔ "آپ کو کس نے اس مسئلے سے آگاہ کیا؟" اس نے سوال کیا تو وہ مسکرا کر بولے۔

"میری محبت نے مجھے اس بات پر مجبور کیا کہ میں وہ پاگل فرد میں جا کر زبردستی سندس سے اُن کی حمایت کے کان کھینچ سکوں۔ سچ بتاؤ، یہ سالار اور قہار سے بچ کر لڑکی کیوں آئی؟ اور وہاں تم بھی کرن...... جا ڈالتی گریبان سے مسا بھی پہناتی۔"

شہریار زیر لب کچھ نہیں بولا، وہ کس طرح وضاحت کرے۔ عدیل عبدالرحمٰن کی نو ساتی کوشش کو وہ کرچکی تھی، آسان نہیں تھا عدیل عبدالرحمٰن اس پر تو ہنس بھی دیتے اس نے گلا کھنکھار کے کہا۔

"عدیل بھائی! محبت کے لیے ذات پات کی قید نہیں ہے۔ پھر یہ کیا کہ دو دکان سے ہمیشہ نہ ہو بات ہے۔ مجھے محبت اس سے پہلے ہو گئی تھی وہ کون ہے، یہ تو بہت بعد کو پتہ چلا تھا۔ پھر جب سمندر میں اترا تو پانی گہرا ہے یا اتھلا...... پانی سختیں گے کہ مر تک ڈوب جاؤں، اس کا فیصلہ کب رہتا ہے۔ محبت سمندر بھی ہے دلدل بھی۔ دونوں میں موت مقدر ہے۔ سو جینے کی تمنا نہ رکھنے والوں کے لیے تو یہ بالکل آسان کام ہے۔"

عدیل عبدالرحمٰن اسے اپنے والد نظروں سے دیکھتے رہے، پھر مدھم لہجے میں بولے۔ "تمہارا کیا خیال ہے، وہاں اپنی بات منوانے کے بعد گھر میں کیا تحریک بن رہی تھی؟"

شہریار نے سر ہلایا پھر آہستگی سے بولا۔ "سننے میں آرہا تھا کہ مزید بات مارنے سے پہلے کے جانے کی پٹیشن ڈالی جا رہی ہے۔ مگر دیکھئے تو سے بھائی! اس جس محبت کے جھولے میں جھول رہا ہوں اس سے اتارا جانا میں ہرگز گوارا نہیں کروں گا۔"

عدیل عبدالرحمٰن نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی پھر مسکرا کر بولے۔ "میرے بیٹے! کیا تمہیں لگتا ہے تمہاری بات سے شادی ہو جانا آسان کام ہے؟ سالار کا معاملہ بھی ہو تب بھی گھر میں کوئی بھی اس مسئلے میں تمہاری حمایت نہیں کرے گا۔"

"کیوں...... مگر مجھے یقین ہے آپ میرا ساتھ دیں گے۔ سالار کا ہم میں کبھی اتنی بے تکلفی نہیں رہی کہ میں ایسا سوچنے کی جسارت کروں۔ مگر کبھی آپ کو دیکھتے ہی مجھے احساس ہوتا ہے، جیسے آپ بابا کے وجود کا پتہ ہیں۔ بابا کی طرح ہی دل ہی دل میں مجھ سے محبت کرتے ہیں۔"

"اچھا جناب لڑکی بہ فیصلہ سوچیں استعمال کی جا رہی ہے...... سوشل بلیک میلنگ کیا جا رہا ہے مجھ معصوم کو۔" شہریار ہنسنے لگا۔ مگر اس کی ہنسی دو کپ ٹک گئے، اچانک سالار بھائی نے انٹری دی تھی۔

"تمہیں بابا پکار رہے ہیں۔"

AANCHAL.COM.PK

وہ چونی سے کترا رہا تھا جیسے سالار بھائی کے حکم سے وہاں سب سے منظم گھر تھا۔ وہ ان کے اس انداز پر چڑ گئے تھے اس لیے جتنی تیزی سے آئے تھے اتنی ہی تیزی سے واپس مڑ گئے تھے۔

عدیل عبدالرحمن نے ان کی پشت کو دیکھ کر مدھم لہجے میں کہا۔ "بھائی بہت غصے میں ہے آج کل۔ اگر بھسم کرنے کی صلاحیت ہوتی نا تو وہ تمہیں دیکھ کر سیکنڈوں میں راکھ کر دیتے۔ چونکہ وہ سب سے زیادہ بابا کے دربار میں حاضری بھی بغیر کسی مطلب کے نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے مارب کے سلسلے میں تمہاری رائے لی جانی ہو گی۔"

"پھر کیا کہوں گا میں؟" اس نے بے چینی سے کہا۔

تب عدیل عبدالرحمن نے نرم لہجے میں کہا۔ "جو دل میں ہے وہ کہہ دو..... یاد رکھنا... کا فیصلہ میرا ہے۔"

شہریار نے شرارت سے دیکھا۔ پھر جتاتے ہوئے بولا۔ "ہاں..... آپ کی دستاویزی کا تجربہ... ہمارا مضبوط بھی نہیں ہے۔ اگر ہم ہوتا تو رابعہ بھائی کا معاملہ حل کر چکے ہوتے آپ۔"

"رابعہ کا..... معاملہ.....؟" انہوں نے نحیف سی کھنکار کر پھر مسکرا کر بولے۔ "ہاں اسے بات پہنچ چکی ہے میں نے۔ عائشہ کے ساتھ رابعہ کا معاملہ بھی طے پا چکا ہے۔ ہم دونوں کی شادی ایک ساتھ ہی ہو گی۔"

"اچھا..... اندر ہی اندر اتنے بڑے بڑے فیصلے ہو گئے اور ہمیں خبر تک نہ لگنے دی گئی۔ بڑی بات ہے بھئی۔"

اچانک آئی جھٹکے بتانے آئے لگے تو وہ ہنسنے لگے پھر مسکرا کر بولے۔ "میرے پاس تو اور بھی بہت سارے معاملات ہیں اگر فرصت میں ہو تو بتا سکتی۔"

بابا جانی سے ان کے پاس ہو رہے تھے، ان جیسی میز پر بیٹھے۔ "بتائیے ناں کیا کیا خبریں ہیں آپ کے پاس؟"

عدیل عبدالرحمن نے شہریار کو دیکھا پھر شوخی سے بولے۔ "اپنے شہریار کو ہی لے لو..... آج کل تمہیں معلوم ہے محبت کے چکر میں گرفتار ہے آپ اور کہتے ہیں.."

بابا کھنکھار کر ہنسنے لگی پھر زبان سے بات اچک کر بولی۔

"مجھے معلوم ہے شہریار بھائی کی محبت کا قصہ۔ میں تو بہت خوش ہوں۔ مارب واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔"

عدیل عبدالرحمن منہ کھولے بابا کو دیکھتے رہ گئے۔ شہریار نے منہ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ دیا مگر پھر بھی عدیل عبدالرحمن کھنکھار کر بولے۔

"آپ کو کس نے اطلاع دی ہے کہ شہریار مارب سے محبت کرتے ہیں؟"

"سالار بھائی کہہ رہے تھے ماہ رُخ اور حمزہ کا بھی یہی خیال ہے کہ اس رشتے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ سالار بھائی نے بتایا محبت کی اس کہانی کو موڑ دیا ہے انہوں نے ہی تو پاپا کی ماما کو راضی کیا ہے۔ شیریں بھابی کی چھپے چھپے محبت کے بارے میں بھی ماہ رُخ نے انہوں نے پاپا کو بتا دی ہے۔ سالار تو بہت زیادہ خوش تھا۔ بتاتے ہیں وہ ممی بھی انہیں منع نہیں کر سکی تھیں۔ مگر...... مگر آپ نے ایسا کیوں کیا کہ تم بھی بھائی جیسے کسی اور سے محبت کرتے رہیں گے؟"

عدیل عبدالرحمٰن اسے دیکھتے رہے۔ پھر شہریار سے نظر ہٹا کر محبت سے یمنیٰ کو مخاطب کر کے بات سنبھالنے کو بولے۔ "صبح ہی بات ہے بار ایک بات اتنی سی کہ صبح کرنا اس وقت سے پہلے ایک آدھ بار حیران کرتی ہی ہے اب بھی دیکھو یمنیٰ نے مختار بھائی سے حرکت کی ہے کسی کو لائق بات کرنی اس طرح سرعام لانا کوئی اچھی بات ہے؟"

دادا عبدالرحمٰن شفقت سے نظر آنے لگی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی دادی کی آواز نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

یمنیٰ کے جاتے ہی عدیل عبدالرحمٰن کا رُخ پھر سے شہریار کی طرف ہو گیا تھا۔

"اب بتاؤ بیٹا! کیسے نمٹو گے اس مسئلے سے؟ سالار تو تم سے کہیں آگے نکل گیا۔ کتنے باقاعدہ طریقے سے اس نے تمہیں گھر سے باہر کیا ہے۔ وہ بے قطع نظر اس چالاکی کے یہ بتاؤ کہ اپنی ماں باپ کے نام سے محبت کیوں درج کروا دی تھی؟ جانتے ہو جان چھڑکتے ہو؟"

شہریار نے ہچکچاتے لہجے میں کہا۔ "میں نے تو صرف محبت پہ خیال آرائی کی تھی اپنے حصے کی محبت کی کمی میں الفاظ لکھے تھے۔ فقط محبت کو پانے کی ہمت کی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ سالار بھائی میری اس محبت کی کہانی میں ایسا موڑ لے آئیں گے۔"

عدیل عبدالرحمٰن نے اس کے دونوں کندھوں پہ ہاتھ رکھا پھر کہا۔ "جو بیٹے اس کا مقابلہ کرے گا وہ شادی کے سلسلے میں تم پہ کوئی دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔"

"آپ ایسا سوچتے ہیں مگر دادا ابا کے چہرے پہ چھپے رنگ...... میں ان سے کس طرح نظر چراؤں؟"

وہ کچھ کہنا بھی چاہتا تھا اور کچھ کہنے سے بہت سے معاملے بگڑ جانے تھے اس لئے کہنے کی خواہش کے مطابق کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ خاموشی سے جانا ہی اس کے اختیار میں تھا۔ سو وہ پاپا کے کمرے میں پوری طرح کمپوزڈ ہو کے جا رکا تھا۔ پاپا نے صورت دیکھی تو حیرت سے بولے۔

AANCHAL.COM.PK

"آ گئی ہو بیٹا! میں نے آپ کو کتنا پہلے بلایا تھا؟" شفق کی ماما کے لہجے کا اضطراب سے ظاہر ہو گئی تھی۔

ماما کے چہرے پر بھی گھبراہٹ تھی، وہ تو بھی شفق سے نئے ہوئے اعصاب سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ سوال نے گہرا سانس لے کر بمشکل عدیل بھائی سے ضروری بات کرنے میں مدد ہونے کو بہانہ کر کے دامن بچایا۔ پاپا کے چہرے سے کی شفق کم ہو گئی تھی۔ وہ انہوں نے خود بڑی قریب بٹھا کر محبت سے پوچھا تھا۔

"شہری! ہم سب کا خیال ہے، جس طرح سامہ علی اور سارہ کی ایک گھر سے شادی طے پائی ہے اسی طرح تمہاری اور حماد کی بات کر دی جائے۔ میں کہہ رہا ہوں تم دونوں بہت اچھے ہو اور حنا کو بھی ہو اور شاید ایک دوسرے کے لئے پسندیدگی کے جذبات بھی رکھتے ہو، تو میں نے سوچا کیوں نہ تمہاری رائے لے کر ایک ہی تقریب میں دونوں کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ شادی تو بہرحال تمہارے مکمل ہو جانے کے لائف میں آنے کے بعد ہی کی جائے گی۔ فی الحال ہم اور مسز عابد تھوڑی منگنی کرنا چاہتے ہیں۔" تفصیل سے کہہ کر وہ اسے دیکھنے لگے۔

کچھ چیزیں جس طرح بدل جانے کے لئے ہوتی ہیں، اسی طرح کچھ چیزیں اور عادتیں ہمیشہ قائم رہنے کے لئے فطرت میں شامل رہتی ہیں، انہیں آپ جان مار کر بھی نہیں بدل سکتے۔

اس کی گہری سوچ اس کی آنکھوں سے ہویدا تھی۔ پاپا نے اس کی حالت دیکھی تو محبت سے بولے۔

"تمہیں کوئی جلدی نہیں ہے، تم سوچ سمجھ کر فیصلہ دینا۔ اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ فیصلہ ہمارے حق میں ہی ہو، جو بھی ہو۔ اگر تمہارا جواب انکار میں ہو تب بھی میں تم سے خفا نہیں ہوں گا۔ یہ تمہاری زندگی کا فیصلہ ہے، اس لئے اس کا اختیار بھی تمہارے پاس ہے۔ میں تو اتنا چاہتا ہوں اگر کوئی شرم حائل ہے تو بھی اسے ترک کر دیا جائے۔ اگر دونوں کے معاملے کو لے کر کوئی الجھن ہے تو اس کو بھی دور کیا جا سکتا ہے۔"

مسز عبدالرحمن نے نادری کی بات ہضم کر لی تھی۔ مبہم لہجے میں رونے لیتے کی کوشش کی تھی اور وہ سر ہلاتا ہوا فیصلے کی گھڑی سے بچتا ہوا اٹھ گیا تھا۔ تو نے اس کی پشت کو دیکھا تو ہنکارا بھرا اور پھر اس کو سنانے کو بولیں۔

"عجیب ہو عبدالرحمن آپ بھی۔ تمام عمر تمہارے نخرے اٹھاؤں، پالا ہے، کیا اتنا بھی حق نہیں ہے تمہارا کہ اپنی مرضی سے اس کا بیاہ کر سکیں؟ اور پھر حماد کون سے ایسے گئے گزرے انسان ہیں، کبھی نہیں ہیں کہ ان کی شادی ہو جائے گی، اچھے خاصے دولت مند ہیں۔ شہزادہ کوئی ہوں اب تمہیں انسان کی زندگی بن جائے گی۔ بیکار کا شور مچا اور روپیہ بول اڑاتا پھرتا ہے، جسے روپیہ خرچ کرنے کا پتا ہے۔"

مسز عبدالرحمٰن نے اپنی ساس کو تیز نظروں سے گھورا۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ ان کی عزت میں کوئی فرق نہ آئے۔ انہیں ان کے کسی عمل سے یہ نہ لگے کہ وہ اپنے بیٹے کے گھر میں مہمان ہیں۔ کیونکہ بہر حال بزرگوں کا احترام ان کی تربیت میں شامل تھا۔ اس لئے اس بار بھی وہ خاموشی سے اپنے کمرے سے ملحق اسٹڈی روم میں چلے گئے تھے اور ماما نو کے سامنے صفائی تھیں۔

”مجھے اس لڑکے پر ایک لمحے کا بھی اعتبار کرنا اچھا نہیں لگتا۔ پتہ نہیں کیسی کیسی بری عادتوں میں پڑا ہوا ہے۔ یار دوست، رات گئے گھر سے غائب رہنا، سگریٹ پینا، کوئی بھی عادت ایسی نہیں ہے کہ پسند ہو۔ کہا ہے ساماں! مجھے ڈر لگتا ہے اگر یہ ہمارا کوشش نہ رکھ سکا تو میری بیٹیا کو اس کی غلطی کے کانٹے اپنی پلکوں سے اٹھانے پڑیں گے۔ میری ایک ہی بچی ہے، میں اس کے حق میں یہ نہیں چاہتی۔ مگر مسز عابد، پتہ نہیں انہیں یہ ضد کیوں ہو گئی ہے کہ دونوں طرف اللہ دل ہی کیا جا رہے۔ پہلے تمہی عقل لڑکیاں کی بات عقل ہو گئی تھی مگر اب......“ وہ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔

شہریار کو بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کیسے اس چومکھی سے نمٹے۔ جلال کی تلوار سر پہ لٹکی تھی ادھر سے حرا عابد کی مشکوک سرگرمیاں...... وہ کیسے اپنے فطرت انسان کو اپنی انا کی پیاری مٹی سونپ دے۔

شہریار دروازے سے ٹیک لگائے سنتے رہتے۔ یکدم گلا کھنکھارنے سے چونکا تھا۔ عدیل بھائی اس کے سر پہ کھڑے تھے۔ اس کی کلائی تھام کر اپنے کمرے میں لے گئے تھے، پھر شرارت سے بولے تھے۔

”بری بات بچے! ایسے کسی کے کمرے سے کان لگا کر باتیں نہیں سنتے گناہ ہوتا ہے۔“ اس کے چہرے کی سنجیدگی کم نہ ہوئی تو انہوں نے اس کی طرف غور سے دیکھ کر کہا۔ ”تم فکر نہ کرو، تم کہو تو میں پاپا سے بات کرتا ہوں، تمہارا کیس لڑنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔“

شہریار نے ان کی طرف توجہ سے دیکھا پھر گہرا سانس کھینچ کر بولا۔ ”نہیں، رہنے دیں، بڑے بھیا! میں خود اپنا معاملہ حل کرنے کی کوشش کروں گا۔“

اس نے کہہ تو دیا تھا مگر اسے کوئی راہ نہیں سوجھ رہی تھی۔ عاطف بیگ بھی اس کے لئے اپنی خدمات پیش کرنا چاہتا تھا لیکن وہ ایسے کسی بھی عمل سے بچنا چاہتا تھا جس سے اس کے گھر کا نقصان کسی بھی صورت میں نکلنے کا امکان ہو۔ سو ہر خیال پس پشت ڈال کر وہ جاننے کے دل میں زیادہ سے زیادہ گھر کرنے کے، سالار عبدالرحمٰن کا دل جیتنے کی طرف سے اجازت لینے کے مشن پہ جتا ہوا تھا۔ محبت کی زیادہ سے زیادہ شیرینی گھولتا رہتا تھا۔ جان جان کر جانے کو سوچ سالار عبدالرحمٰن کی زندگی میں در آتا تھا۔

ایسے ہی ایک دن اچانک اس کے سر پہ بم پھٹ پڑا۔ وہ شید مارٹ کی عمارت میں جانے کے باہر سے سرو کی گئی ڈرنک کا دوسرا پیگ لے رہا تھا کہ اس کے سامنے ہال کے کمرے میں جو وجود داخل ہوا وہ اس کی جان آنکھوں میں کھینچ لینے کے لئے کافی تھا۔

"شہریار! مجھے آپ سے ایسی توقع نہیں تھی۔"

اس نے خالی آنکھوں سے مسز عبدالرحمن کو دیکھا۔ ماہ رخ عبدالرحمن ایسے ہی سے آئے، وہ مجبور تھے۔ اور یہی اس وقت بابا نہ جس لمحہ ایمان میں سامنے سے سونیوں کی لڑکی کا وہ جملہ فی الفور ہوا تھا، وہ شہریار عبدالرحمن کے تابوت میں آخری کیل کے لیے کافی ہوا اور یہی تھا۔

زندگی نے بہت برے طریقے سے اس سے دشمنی نبھائی تھی۔ کابیں اس نے تنکے پر رکھ دیا تھا اور اول و دراصل آنکھوں سے بابا کو کسی کرنے کی کوشش کی تھی۔ مسز عبدالرحمن کی نیند تو ابھی تک اس کے وجود میں کھب رہی تھی، لیکن ان کی نظر میں مرد ہونا، غصہ بھی ایسا کچھ نہیں بچا تھا کہ اس کے اندر سے زندہ رہنے کی خواہش تک ختم ہو گئی۔ والیز کو چھونے لگی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان سے کس طرح ڈیل کرے۔

"بابا! آپ کس کا ساتھ دے رہے ہیں۔" اس کی زبان نے بے ساختہ جملہ کہا۔

وہ صوفے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ بابا قدم بقدم کرتے اس کے پاس آ گئے تھے۔ پھر انہوں نے اسے کندھے سے تھام کر بٹھا دیا تھا۔

"ہاں، میں بہت عرصے سے کس کا ساتھ دے رہا ہوں۔ تمہارے متعلق میں نے سوچ کا ایک زاویہ ہمیشہ رکھا تھا، یہی سمجھتا تھا، سمجھتا تھا۔ مگر اب لگنے لگا ہے، میں بہت بڑی بھول کر رہا تھا۔ اور جب آپ کے قدم کے نیچے ہو جائے تو وہ بچے نیچے خود ہی لگتی ہے۔ اپنی مرضی سے جینا چاہتی ہے۔" انہوں نے کہا، بغیر بے چارگی سے بولے۔ "مگر شہریار عبدالرحمن! کیا آپ بتا سکتے ہیں، جو کچھ میں نے آپ کی زندگی کے لیے، تب وہ اس میں کیا غلطی تھی؟ میں نے چاہا کہ آپ بہت بلند کردار بنیں، بچپن سے آپ کو آئیڈیل رکھیں تو پھر کس زاویے سے غلط ہے؟...... میں سمجھتا تھا اگر کسی میں میری ذات کی جھلک ہے تو وہ صرف آپ ہو۔ مگر آج یہاں اس جگہ اور اس پوزیشن میں آپ کو دیکھ کر مجھے کہنا پڑ رہا ہے، میں غلط تھا۔ بہت زیادہ غلط......"

"بابا پلیز! آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔" بابا کے لہجے کا درد اس کے سینے میں چبھنے لگا تھا۔ اس نے آخری کوشش کی تھی مگر جانتا تھا، وہ جس طرح جس پوزیشن میں بابا کو ملا ہے، وہ اس کی ہر قسم کی برأت کو بے وجہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

اس نے بابا کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی تھی مگر انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا، غیر متوقع سے بولے تھے۔ "شہریار! آپ بہت کھو چکے ہیں۔ میری محبت کا حق میرے بیٹے سے لگنے کا حق میری توجہ کو

حق دار تھیں میں نے آپ کو اپنی زندگی کے ہر موسم سے بے دخل کر رکھا ہے۔"

ایک دفعہ پھر سے میں آپ کو ان کی بات میں، پھر انہوں نے تحریر کیا۔ "جو کہ میری محبت میں کہاں کی رہ گئی کہ آپ کو ہماری محبت سے زیادہ اس محبت میں کشش دکھائی دیا..... اس محبت میں جو ہر آن رنگ بدلنے کے لئے تیار رہتی ہے۔"

جانان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ یکدم اس نے پاپا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ پھر نخوت سے بولی۔

"آپ کی ساری محبت کی دنیا اور اس کی کوشش مجھے ازبر ہے مسٹر عبدالرحمٰن! آپ کو جتنی کہیں سمجھنا تھا آپ میرے گھر میں کھڑے ہو کر مجھ پر ہی طعنہ زنی کریں۔ یہ سب ان کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔"

شہریار نے پاپا کے چہرے کے رنگ کو بجھتے ہوئے دیکھا تو فوراً ٹوک کر بولا۔ "جانان پلیز! یہ میرے پاپا ہیں۔"

جانان نے وہی لہجہ برقرار رکھ کر جواب دیا۔ "میں بھی انہیں یہی جتانا چاہتی ہوں کہ وہ کہیں اور رہتے ہیں تمہارے پاپا ہیں، مجھ پہ رعب ڈالنے کا انہیں کوئی حق نہیں ہے۔"

پاپا نے سالار شہباز کا ہاتھ تھاما پھر نہایت سنجیدگی سے بولے۔ "شہریار! مجھے ساری زندگی یہ افسوس رہے گا کہ میں نے کبھی آپ کو بہت محبت دی تھی مگر آپ...... آپ میری بے نیازی کے قائل ہی نہیں تھے۔ آج بہت دل دکھا ہے میرا، بہت زیادہ۔ شاید ساری زندگی اس کا مداوا نہ ہو سکے۔"

انہوں نے واپسی کے لئے قدم موڑ لئے۔ شہریار پاپا کے پیچھے بے قراری سے دوڑا بھی تھا مگر وہ اس سے پہلے کار میں بیٹھ چکے تھے۔ جانان کی بات پر کھڑی [illegible] بغور ان کی کلائی تھام کر روک رہی تھی۔

"چھوڑ دو انہیں، اپنی ڈوئی اولاد کبھی انگلی تھام کر چلانا چاہتا ہے۔"

شہریار نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔ کچھ کہنا [illegible] سے جو زندگی میں زہر بھر گئی تھی [illegible] جانان کے پاس ٹھہرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ سب کو اس نے گھر کی راہ لی تھی۔

راستے بھر اسے لگا تھا جیسے وہ کسی تپتی صحرا میں جھلس رہا ہے۔ بار بار گھر سے سانس لے رہا [illegible] تھا مگر [illegible] سالار بھائی نے رقابت میں کتنا نقصان کیا تھا اس کا...... اسے لگنے لگا تھا وہ چیلنج جیسے میں بغیر سائبان کے کھڑا کر دیا گیا ہے اور اس سے ڈرا کا کوئی احتمام بھی ممکن ہے۔

وہ چپکے سے اپنے روم میں آ کر لیٹ گیا تھا۔ موبائل تک اس نے آف کر دیا تھا۔ مگر ساری رات اسے لگا تھا وہ کانٹوں میں [illegible] تھا اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی تھی۔ آج پاپا کی آنکھوں

میں پہلی بار اس نے آنسو دیکھے تھے اور یہ آنسو اس کے کام کے مٹنے/ان کی وجہ سے تھے......

وہ کروٹ پہ کروٹ بدل رہا تھا مگر نیند نہیں آئی تھی۔ رات کا کون سا پہر تھا جب وہ اٹھا تھا۔ پاپا سے سچ کہنے کی ہمت اب تھی مگر پاپا کے کمرے کے سامنے پہنچا تو اس کے قدموں سے جیسے جان نکل گئی تھی ساتھ شدت سے پاپا رو رہے تھے کہ کمرے کے باہر ماما کا سامنا اور پاپا کا سامنا دونوں چھپاتے ہوئے آنسو کے گرد... وہ الٹے قدموں پیچھے چلے گئے تھے۔

"مجھے یقین نہیں آرہا میرا شہریار ایسا کر سکتا ہے۔ وہ ڈرنک کرنے لگا ہے اور سوسائٹی گرل ٹائپ لڑکی سے محبت کی ہے اس نے مار کر جھکا رہا ہے۔ زندگی میں اس کا نام لکھنا ہے اور محبت کسی اور سے نبھانا ہے۔ تمہیں نہیں معلوم آج میں اندر سے کتنا شکستہ ہو گیا ہوں۔ مجھے لگتا ہے سب سے پیاری اولاد نے توڑ دیا ہے۔ عالیہ! مجھے لگتا ہے جیسے اس غم سے میرا سینہ پھٹ جائے گا۔"

"حوصلہ کریں۔ پلیز عبدالرحمن! اپنے لئے نہ سہی میرے لئے حوصلہ کریں۔ نہ اپنے کی کوشش کریں۔ جو ہوا ہے، کسی باپ نے بھی نہ سمجھا لیجئے گا اچھے دل کو کہ شاید یہ نسل اس کی رگوں میں دوڑنے خون کا اثر ہے اور دوسری خصلت کبھی بھی خون کے آگے ماند پڑ جاتی ہے۔"

شہریار نے ہونٹ بھینچ کر بات سنی۔ پاپا ہمیشہ تو کہاں اس قسم کے جملوں پاس کا ... کرتے تھے کسی ایٹ ویل سے کام نہیں لیتے تھے مگر آج پاپا نے ماما کی زبان سے نکلی بات پر بھی خاموشی اختیار کر لی تھی۔ کیا پاپا بھی یہی سمجھتے ہیں، میرا خون ناپاک ہے، کون ہوں میں؟...... کس کے وجود کا حصہ ہوں؟...... کون ہے وہ عورت جس کے حصے کی سزا اس کے بعد بھی ختم نہیں ہوئی...... جو شوہر گھر چھوڑ گئی تھی تو اپنی اولاد میں اپنی وراثت منتقل کر کے آج بھی ٹھکرائے جانے کا عذاب چکھ رہی ہے۔

وہ پشت موڑ کر اپنے روم کی طرف واپس لوٹ آیا تھا۔ حالانکہ قدم چلنے سے انکاری تھے اور دل کا درد ایسا تھا کہ جسم ٹوٹ کر بکھر جائے...... مگر اس نے پھر بھی سر جھکا کر چلنا لیا تھا۔

پھر سوچتے سوچتے نہ جانے کب نیند آئی، پتہ نہیں چلا۔

آنکھ کھلی تو ماما کو اپنے کمرے میں پایا۔

"آج آفس نہیں جانا کیا، یونیورسٹی نہیں ہے کیا؟" محبت بھری آواز میں بولیں۔ "جلدی سے تیار ہو کر ڈائننگ ٹیبل پر آ جاؤ۔ تمہارے پاپا بیٹھ کر انتظار کر رہے ہیں۔"

وہ ناشتہ نہ کرنا چاہتا تھا۔ پاپا کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا مگر ماما نے اتنے اصرار سے کہا تھا کہ پندرہ منٹ میں تیار ہو کر کھانے کے کمرے میں پہنچ گیا۔

AANCHAL.COM.PK

پاپا کے چہرے میں غصے، دیکھ کر نظر آ گیا تھا۔ سالار رحمانی کی آنکھوں میں غصے سے سرخی پھر گئی تھی۔ پاپا کا انداز بھی پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ بدل گیا تھا۔ تبدیلی بھائی تو جانتے تھے اس لیے وہ قطعی دادا پاپا کے رحم و کرم پر تھا۔

دادا پا کا انداز پہلے جیسا تھا۔ شاید وہ ابھی تک کل کے واقعے سے لاعلم تھے۔ اس نے سکون کا گہرا سانس لیا اور تمام مصروفیات سے وقت نکال کر پاپا کے دفتر چلا گیا۔ دفتر میں بھی پاپا مصروف ہوں گے۔ کام سے جان جان کر کام ختم کر رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر بھی کم کر رہا تھا۔ کبھی خود بھی آپ کے دفتر مصروفیت کی سمجھ گیا تھا۔

شہر پاپا کے ہونے کی وجہ کے باوجود وہ زندگی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ ہر وقت ہر جگہ عاطف نے اسے بہت پہلے کی طرح ایک ہوٹل میں پہنچنے کا کہا تھا۔ شہریار حمزہ ساجد کا دام میں کر رہی ہو رہا تھا۔ ہوٹل کے کونے میں ایک کیبن میں بیٹھا تھا۔ لڑکی شہریار کی طرف پشت کیے بیٹھی تھی مگر حمزہ صاف نظر آ رہا تھا۔ دونوں مسکرا کر ماحول کا جائزہ لے رہے تھے۔ حمزہ ساجد اردگرد بھی دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ بیرے کے جاتے ہی اس نے بہت محبت پاش نظروں سے سامنے بیٹھی لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ جن نظروں سے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھ رہا تھا شہریار کا خیال تھا ان نظروں کی محبت کا حق صرف اس کی دانیہ کے واسطے کوشش تھا۔

"میں ابھی کے ابھی اس کمینے کا دماغ درست کر دوں گا۔"

وہ غصے میں جھٹکا کر کے کھڑا ہوا مگر عاطف بیگ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تھام لیا اور سرعت سے بولا۔

"بہتر ہے کہ معاملات کو احسن طور پر ہینڈل کیا جائے۔ زیادتی کسی بھی مسئلے کا حل نہیں۔"

شہریار نے ساتھ ہی وہیں بیٹھ کر دیکھا کہ اس نے حمزہ ساجد کو کسی جھوٹ کے کھڑا ہوتے دیکھا۔ وہ اس لڑکی سے بہتر طور پر بات کرنے کی پوزیشن میں آ گیا تھا۔ قدرت نے اسے موقع دے دیا تھا۔ اس کے قدموں میں تیزی آ گئی تھی۔ عاطف بیگ اس کے ساتھ تھا۔ عاطف بیگ کی نظر سامنے بیٹھی لڑکی پر پڑی تو اس نے بے ساختہ کہا۔

"ہاں، یہی ہے وہ لڑکی جس کے ساتھ میں نے حمزہ کو دیکھا ہے۔"

شہریار کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ کہاں وہ غصے میں مارنے مرنے پر تلا بیٹھا تھا، کہاں وہ سامنے بیٹھی لڑکی جو مجسم حسن تھی، کے سامنے ہم ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔ پھر مرے لہجے میں پکارا۔

AANCHAL.COM

"تم نے مجھے چیٹ کیا ہے جاناں!"

وہ بے وقت ہی ہنس دی۔ اور قہقہہ اطراف میں بکھرتا چلا گیا۔ پھر ہولے سے لب ہنسے تو لفظوں نے زبان پائی۔

"میری زندگی جگسا پزل گیم کی طرح ہے آخری ٹکڑے تک کیا صورت ہو گی، کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا اور یہی تھرل مجھے پسند ہے۔ ویسے آج کے لئے میں تمہارے سامنے مظلوم کا ایکٹ کر رہی ہوں۔ حمزہ سمجھتا ہے، میں اس کے بچپن کی کسی کہانی کی مظلوم پری جیسی ہوں۔ میں نے بھی اسے اس فیری ٹیل سے باہر نکلنے نہیں دیا۔"

"تم نے اس زاویے سے چوٹ کیوں ماری؟" وہ کھڑے سے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

عاطف بیگ کا چہرہ حیرت سے سپاٹ ہوا تھا۔ یہ جاناں تھی تو واقعی وہ انگلیوں پر نچانے کا ہنر جانتی تھی۔ مگر اس زمانے میں کیا ضروری تھا کہ شہریار عبدالرحمن بھی شامل ہوتا......

سوال ہنوز برقرار تھا۔ تب اس نے جوس کا سپ لیتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔

"تمہیں کیا لگتا تھا کیا واقعی مجھے سالار عبدالرحمن سے طوفانی عشق ہو گیا تھا؟ وہ خوبصورت ہے مگر میری نظر اس پر اس لئے ٹھہری تھی، کیونکہ وہ مسٹر عبدالرحمن کا بیٹا تھا...... اور تمہارے باپ سے میرے کچھ حساب نکلتے ہیں۔ میں نے سالار سے جی بھر کر کھیلا۔ مگر میری کوشش تھی کہ میں کسی طرح تم سے متعارف ہو سکوں۔ تم اپنے باپ کے سب سے بااصول بیٹے تھے۔ تمہاری تربیت پر تمہارے باپ کو ناز تھا اور میں چاہتی تھی وہ ناز، وہ بھرم ٹوٹ کر رہ جائے۔ اس لئے میں نے معاملات اس نہج پہ پہنچا دیئے کہ تمہیں میدان میں اترنا ہی پڑا......

شہریار عبدالرحمن! تمہیں اپنے باپ کی ناجائز اولاد ہونے کے علاوہ بھی تحفہ دیا تھا میرے دل نے...... مگر اس حساب کا کوئی ذکر کبھی نہیں ہوا۔ مگر یہ طے ہے تم چاروں طرف سے ڈیپ ہو چکے ہو۔ حمزہ عابد میرے ساتھ صرف چند گھنٹے گزارنے کے لئے تمہاری دنیا الٹ کر رکھ دینے سے بھی نہیں چوکے گا۔ تمہیں معلوم ہے حمزہ عابد بھی میرا ہی اسسٹنٹ تھا۔ وہ مجھے پاگل پن کی حد تک چاہتا بھی...... اس لئے میری جھوٹی محبت کو واقعی جھوٹی محبت سمجھنے کے باوجود وہ اس ساری کہانی میں موجود رہا۔ بقول اس کے میرا ساتھ دینے سے اُسے دلی سکون ملتا تھا اور میرے مشورے پر عمل کرنے سے تمہارے باپ کی دولت اور تمہارے باپ کے کام سے منسلک مالکانہ شہرت بھی اور بغیر کسی محنت کے ایک پکی ملازمت بھی حاصل کرنے کا ٹرمپ کا پتہ ایسا تھا کہ وہ انکار کر ہی نہیں سکے۔"

"تم...... تم بہت ظالم ہو جاناں! تم نے مجھ سے کتنوں کے دل تڑوائے، میری ذات کو کہاں کہاں سوالیہ نشان بنا دیا۔ کیا کبھی ایک لمحے کے لئے بھی تمہیں میرے دل پر رحم نہیں آیا؟"

"رحم...... ہاہاہا...... یہ لفظ میری ڈکشنری میں کبھی نہیں آتا۔ اگر میں رحم کرنے لگ جاؤں تو آج اس مقام پر نہ ہوتا جہاں ہوں؟...... شہریار عبدالرحمن ہو سکتا ہے کسی پہ مجھے بھی رحم آ جاتا بھی۔ وہ لیکن جیسے سوچ کر ہمیشہ میرا دل چاہتا ہے، میں تمہیں چاروں طرف سے تنہا کر دوں۔ تمہارے پاس کوئی رشتہ کوئی ساتھی نہ ہو۔ تم صحرا میں صدا دیتے رہو۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے پھیرتے پیاس سے مر جاؤ اور تمہیں کوئی سیراب نہ کرے۔ کوئی بھی نہیں۔"

عاطف بیگ نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی مگر شہریار عبدالرحمن نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے چپ رہنے پر مجبور کر دیا تھا اور جانانہ آگے بولی تھی۔

"میرے کمال کو جادو دیکھا تم جانتے ہو، میں نے تمہیں چت کیا ہے۔ تم جانانہ سے حمزہ عابد کو چھین پھر بھی تم کچھ نہیں کر سکے۔ تم مجھے نہیں چھوڑ سکے۔ تم حمزہ عابد کو اپنا بیٹا ہونے سے روک نہیں سکے...... تم عدیل عبدالرحمن کی محبت چھننے سے بچا نہ سکے اور عائشہ سالار کو گھر میں با عزت طریقے سے لانے کی حسرت میں کچھ بھی نہیں کر سکے۔ تم میرے خلاف نہیں جا سکتے۔ تم مجھ سے شدت کی نفرت کرنے کے باوجود اب بھی مجھ سے دور نہیں ہو سکتے...... ہے نا کمال؟"

وہ پھر سے ہنسنے لگی تھی۔ شہریار عبدالرحمن خاموشی سے اس کے چہرے پر نظریں ٹکائے بیٹھا تھا۔ بار بار اس کی نظریں اب بھی حمزہ عابد کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

"بے فکر رہو...... وہ بہت کم ہمت ہے۔ میدان چھوڑ کر نہیں بھاگے گا۔" جانانہ نے اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر جواب دیا۔ عاطف بیگ نے اشارے سے کچھ کہنا چاہا مگر وقت ختم کی اطلاع نے شہریار عبدالرحمن کے سامنے ان کو کھڑا کیا تھا۔

جانانہ کو دیکھ کر بھی عاطف بیگ مطمئن رہا تھا مگر ماہا اور عبدالرحمن کے ساتھ دیکھا تو دیکھ کر اس کی جان نکل گئی تھی۔

یہ بھی زندگی تھی ماں...... یہ آخر کس کس کا دامن میرے ہاتھ سے چھڑائیں گے۔ میرے پاس کھونے کے لئے ہے ہی کیا جو یہ مجھ سے سانس لینے کا اختیار بھی چھین لینا چاہتے ہیں؟...... شہریار نے بے بسی سے سوچا تھا۔

ماہا شہریار کے سامنے ان کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا مگر اس کی آنکھوں کا کرب......

حمزہ عابد ماہا کے آتے ہی جانے کہاں سے نکل کر سامنے آ گیا تھا۔ پھر شہریار اپنی صفائی میں کچھ کہہ بھی نہیں پایا تھا کہ ماہا نے سوال کیا۔

AANCHAL.COM.PK

”یہ ہے جانانہ...... یہ وہی لڑکی ہے پاپا، جس نے نائمہ کو در بدر کر دیا۔ سلار بھائی کو بھی ساری شرمندگی بخشی...... یہی ہے پاپا جانانہ، جس کی وجہ سے شاکرہ آنٹی کی ایک بیٹی زمانے کی بھیڑ میں گم ہو گئی اور ایک بیٹی ہنستے بستے گھر سے واپس اپنے گھر میں لاٹھی گئی۔ جنید بھائی نے قطعے تحت آپشن کے بجائے اور سانی کا زہر پیا لیکن پھر بھی ملے ہے پاپا شہری بھائی، ہمارے آپ سب اس جانانہ کی وجہ سے ہماری زندگی میں در آئے...... تم آپ پھر بھی اسی کا دم بھرتے ہیں؟ کل سالار بھائی نے سفید مارش کے گھر کی کہانی سنائی، میں نے پاپا کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے مگر پھر بھی تم رگی کہ شاید تم وسنگ ہے شاید آپ لوگوں کبھی ٹھیک نہیں سمجھ رہا۔ کل حمزہ نے مجھے آپ کی غیر انیشنل مصروفیات کی تفصیل سے آگاہ کیا تو میں حمزہ سے لڑ پڑی۔ میں آپ کے لئے ساری دنیا سے لڑ پڑی اور آپ...... آپ اس وقت بھی؟...... آپ کو پتہ ہے، میں اس وقت بھی حمزہ کو غلط کہتے ہوئے اس کے خون پرپنی بھائی کے ساتھ آئی تھی مگر شہری بھائی......“

شہریار عبدالرحمٰن کی آنکھوں میں نمی اور چہرے پر ایک ساتھ بکھر گئی تھی۔ غروب ہوتے سورج کی نارنجی شعاعوں میں جانانہ، حمزہ وجاہد اور دانیا تینوں کے چہرے کسی ایشن کی طرح دکھائی دیتے تھے، جو ملے دکھائی دیتے تب بھی الگ الگ لگتے تھے۔ انہیں الگ رہنا بھی چاہئے تھا۔ دانیا معصوم تھی۔ حمزہ وجاہد دانیا جیسی لڑکی کا جیون ساتھی بننے کا مستحق نہیں تھا۔ دانیا کا دل حمزہ وجاہد سے بدگمان کیا جا سکتا تھا وہ تو اتنی محبت کی ماری تھی کہ خود اس کی غلطیوں کا انکار کر چکی تھی، پتہ پھر حمزہ وجاہد تھا۔ اس کو منتشر...... ۔

وہ کیا کرے کہ یہ ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ جائے...... سالار عبدالرحمٰن اور دانیا اور اس کا گھر سب بچ سکتے تھے۔ مگر کس طرح؟...... اس نے اندر جھانکا اور پھر زیرک ذہن سے نئی چال چلی۔ بہت تاسف کا تاثر دے کر بولا۔

”مجھے افسوس ہے، میں تمہاری مرضی کے مطابق عمل نہیں کر سکا۔ میں نے بہت چاہا میں جانانہ کی طرف سے دل موڑ لوں، لیکن اس کی محبت سے دامن چھڑانا میرے لئے مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ دانیا! میں چاہ کر بھی اپنے دل کو مار کے شادی پر راضی نہیں کر سکا ہوں۔“

جانانہ نے اچانک پانسہ پلٹتے دیکھا تو حیرت سے شہریار کو دیکھنے لگی۔ حمزہ وجاہد کے چہرے سے بھی رنگ آ کر گزر گیا۔ اس نے تو نہایت مہارت سے عاطف بیگ کو نوٹوں کے ہار پہنچ کر یہ گیم کھیلا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سچویشن میں شہریار کا پاکر سلامہ کی طرح دانیا بھی اس سے نفرت کرنے لگے گی، اس کے کردار کی پستی دیکھے گی تو خود ہی اسے دھتکار کے لئے اسے دھتکار کر کے اپنی آپ خود سے باز آ کر خاموشی سے اس کی محبت کے جھانسے میں آ جائے گی۔ اس کا گھر دولت سے بھر دے گی۔ جانانہ کا ذہن، اس کا پلان خمر کا سیاب ہو جائے گا۔ مگر اس لمحے چہروں کے مہرے پلٹ گئے تھے۔ شہریار نے جانانہ کی انگلی سے بی

رنگ نکال کر بعد غازی اُس کی سیدھے ہاتھ کی بیچ کی انگلی میں پہنا کر مخصوص لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”آئی ایم سوری جاناں، یہ موقع بس اچانک ہی چلا آیا ورنہ میں نے اس منگنی کے لئے بے حد خوب صورت پروگرام ترتیب دیئے تھے۔ آج اس لمحے سے بھی تمہیں اپنانے کا عہد کرتا ہوں۔ اب تم پر کوئی شخص انگلی نہیں اٹھا سکتا۔“

سالار عبدالرحمٰن نے دانیا کا ہاتھ پکڑا تھا۔

”بھائی! گھر چلیں، مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔“ دانیا رونے لگی تھی۔ لیکن پھر رکی اور پھر شہریار کو دیکھ کر بولی۔ ”شہری بھائی! اچھے نہیں لگتا، یہ آپ ہیں۔ آپ کا دل تو کتنا صاف ہوتا تھا مگر آج اپنی خوشی کے آگے آپ کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ میری خوشی بھی نہیں...... آپ بدل چکے ہیں...... آپ بہت بدل گئے ہو۔“

وہ پشت موڑ کر سالار بھائی کے ساتھ تیز قدموں سے ہوٹل کی سیڑھیاں اترتی چلی گئی تھی۔ شہریار نے ایک لمحے کے لئے مڑ کر دیکھا تھا پھر محبت سے تھاما ہوا جاناں کا ہاتھ تیزی سے جھٹک دیا تھا پھر تیزی کی تیزی سے مڑا تھا۔

”تمہارا وہ تم اپنی جگہ مگر آج کے بعد دانیا اور سالار بھائی پر تم کوئی ستم نہیں کھیل سکتیں۔ وہ بہت حساس ہیں اور جذبات کی بہت زیادہ...... وہ کسی کی استعمال کی ہوئی چیز تو کیا کسی چیز پر اگر کسی کا نام بھی لے لیا جائے کہ اس شخص کی ہے تو بھی وہ انتہائی ضرورت میں بھی اس چیز کو چھوتے تک نہیں ہیں۔“

وہ مڑا پھر حمزہ عابد کو دیکھ کر بولا۔ ”دانیا کی شادی تم جانتے ہو اس لئے تم اندازہ کر سکتے ہو تمہارا کتنا بڑا نقصان ہو گیا ہے۔“

حمزہ عابد تن فن کرتا گھر روانہ ہو گیا تھا۔ صرف شہریار، عبدالرحمٰن، عاطف بیگ کا ہاتھ تھام کر باہر نکل آیا تھا۔ پھر کھلی ہوا میں سانس لے کر اس نے عاطف بیگ کو مخاطب کیا۔

”میں نے تمہیں پہلے سب کو ان کے نقصان سے آگاہ کیا مگر عاطف! سب سے زیادہ تو خسارہ میرے حصے میں آیا ہے۔ میں کیا کروں، اپنی تنہائی کا ماتم کس طرح کروں کہ دل قرار آ جائے؟“

عاطف نے اس کے لہجے سے گھبرا کر اس کا ہاتھ تھاما تھا اور وہ جو سگریٹ کو شعلہ دکھا رہا تھا، یکدم بے قراری سے عاطف کی طرف دیکھ کر نیچے لہجے میں بولا تھا۔ ”عاطف! آئی نیڈ آ ڈاکٹر۔“

عاطف بیگ، جو اس کے ہاتھوں کی ٹھنڈک سے پہلے ہی ہراساں ہو رہا تھا اس جملے پر گھبرا گیا تھا۔ تیزی سے اس نے فرنٹ ڈور کھولا تھا۔ شہریار بدقت فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ عاطف نے کار کو بہت تیز

رفتاری سے گاڑیوں کے سیل رواں میں ڈالا تھا۔ شہریار نے سرعت سے ٹوکا تھا۔ تب اچانک عاطف بیگ نے کہا تھا۔

"زبان کے نیچے گولی رکھو۔"

اور وہ مسکرا دیا۔ ہوگیا تھا کہ یہ سامنے کی بات اُسے یاد نہیں رہی تھی۔ عاطف بیگ نے ہی اس کے بتانے پر ڈیش بورڈ میں سے اس کی دوا نکال کر دی تھی۔ زبان کے نیچے گولی رکھنے کے باوجود آج درد لگتا تھا کہ سب کچھ ریزہ ریزہ کر کے جائے گا۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں تب اچانک عاطف نے اس کا کاندھا تھام لیا۔

"قریب ہی ہسپتال ہے بابا... بس آپ ریلیکس رکھیے آنکھیں کھولے رکھیے۔ جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ سمجھنے کی کوشش کریں بابا آپ کو نجانے کیا ہو رہا ہے... میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

شہریار نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور مدہم لہجے میں بولا۔

"ریلیکس مجھے نہیں، تمہیں ہونے کی ضرورت ہے۔ میری کنڈیشن ابھی اتنی خراب نہیں ہوئی ہے تم آرام سے گاڑی....."

وہ سا جملہ پورا نہیں کر پایا تھا کیونکہ عاطف بیگ نے بہت سختی سے تنبیہ کی تھی اس نے گھبرا کر ہونٹ بھینچ لیے۔ گہرے گہرے سانس لینے کی کوشش کی تھی مگر لگتا تھا ساری آکسیجن ہوا سے کسی نے ایک ہی سانس میں پی لی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ عاطف بیگ بالکل ہی ہمت چھوڑ بیٹھتا وہ ہسپتال پہنچ گئے تھے۔

ڈاکٹرز بہت پہلے سے اس کا کیس ہینڈل کر رہے تھے اس لیے ٹریٹمنٹ کرنے میں دشواری نہیں ہوئی تھی۔ کافی کوشش کے بعد اس کی حالت بہتر ہوئی تھی۔

عاطف بیگ بیٹھا رہا۔ جب اس کے سامنے گیا تو عرق آلود پیشانی کے ساتھ بھیگی ہوئی سانسوں میں وہ صرف عاطف کا ہاتھ تھام سکا تھا۔ کوئی لفظ معنی نہیں رکھتا تھا۔ شہریار کے ہاتھ کا دباؤ سب کہہ گزرا تھا۔ ڈاکٹرز نے اسے بولنے سے منع کر رکھا تھا سو عاطف بیگ چند لمحے ٹھہر کر باہر چلا گیا۔

"پتہ نہیں مجھے خدا سے شکوہ کرنا چاہیے یا نہیں۔ زندگی سے بہت خوش تھا مگر اس میں کچھ کمی رہ گئی... معلوم نہیں موت بالکل قریب ہے پھر بھی دل ایک بار جینے کی ہمک کیوں کرتا ہے۔"

ہسپتال میں یہ ان کا دوسرا دن تھا جب اس نے یہ جملہ کہا تھا۔ عاطف بیگ جواب میں کچھ نہیں بولا تھا۔ وہ کل رات سے جاگ رہا تھا۔ ابھی تک اس کی آنکھوں میں کچھ نیند کا خمار تھا۔ وہ بس اس کی

کمپرومائز نے ہی کیا تھا۔

پھر یہ تیسرے دن کی بات تھی، جب وہ دسیاں چیک کر کے اپنے روم میں آیا تھا۔ کمرہ پوری طرح کسی کی محنت کا غماز تھا۔

دادی کی ناراضگی کے باوجود وہ سب کی طرح اس سے قطع تعلق نہیں کر سکی تھی۔ اسے ان پر بے حد پیار آیا تھا۔

وہ عاطف کے روم میں چھوڑ کر اندرونی سمت میں بڑھتا چلا گیا تھا کہ ڈرائنگ روم میں پہنچا ہی تھا کہ حمزہ عابد کی آواز نے اسے ٹھٹکا دیا تھا۔ پھر تیز قدموں سے اندر پہنچا تھا۔ شہریار کی آمد پر ہی حمزہ عابد نے اس کی طرف انگلی اٹھا کر تنبیہی انداز میں کہا۔

"دیکھ لیجئے انکل! یہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ خود پوچھ سکتے ہیں کہ اس کی زندگی کے شب و روز کس حساب سے بسر رہے ہیں۔ دانیال ہی سے اس کی وجہ سے پریشان ہے، جسے وہ سمجھ نہیں پا رہا ہے۔ وہی حال ہے جو پہلے تھی، سب کچھ ہے، جانا نکا سہارا آپ کے لئے بھی اب صرف ہم لوگ ہیں، انہیں یہ بتایا جائے میری ماں نے شہریار کی آس میں جو دعا کی تھی، رشتے مسترد کئے، اس کا نقصان کس طرح پورا ہوگا؟ آپ جانتے ہیں ماں، جانا نہ کس قسم کی لڑکی ہے اور شہریار اس کے ساتھ کیسا ہے۔"

اس نے بے چارگی سے پہلو بدلا۔ بہن کو دیکھا اور سمندر کی طرح خاموش پایا کہ...... غلطی ہو تو کر لیتا ہوں، بلند ہونے سے دل کو تسلی ملتی ہے۔ لیکن اگر معافی دے دی جائے تو احساس زیاں زور پکڑنے لگتا ہے۔ صرف عدیل بھائی اس سارے معاملے میں اس کی حمایت کر رہے تھے اور یہ بات کہ تمہی دن کی طرح غیر حاضری اور انہی بے تکلفانہ نفسیات نے ان کے اندر بھی شکوہ بھر دیا تھا۔ شکوے سے خفیف نظر وہ بھی اسے سپورٹ کر رہے تھے۔ مسٹر عبدالرحمٰن کتنی دیر اس کے چہرے کو دیکھتے رہے، پھر حیرت سے بولے۔

"کیا آپ واقعی ہی جانانہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں شہریار عبدالرحمٰن؟"

اس نے سر جھکا لیا تھا۔

پاپا اس کی خاموشی سے شاکڈ رہ گئے تھے۔ ان سے کچھ بولا نہیں گیا تھا اور اس عرصے میں ماما اس کے قریب آ چکی تھیں۔ بہرحال ان کا غصہ بلند ہوا تھا اور اس کے چہرے پر تنا ہوا چھوڑ گیا تھا۔ غصے میں پھنکار کر انہوں نے کچھ ساعت بعد کہا تھا۔

"ہم...... مجھے پہلے ہی معلوم تھا تم جیسی اولاد کبھی سکھ نہیں دے سکتی۔ پتہ نہیں مجھ سے کیا غلطی ہوئی جو تم جیسے کو عبدالرحمٰن نے میری بیٹی کے سر تھوپ دیا۔ تم جیسے کیڑے مکوڑوں کو پکڑ کے جیل میں ٹھونس دینا چاہیے یا کسی جہنم خانے میں ڈال کر بھول جانا چاہیے۔ عبدالرحمٰن نے سب سے بڑی غلطی کی ہے جو تمہیں اپنا نام دے کر...... تم نے اس نام کی عزت کی دھجیاں جس طرح اڑائی ہیں اس پر خدا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

شہریار کا چہرہ شدت سے سرخ ہو گیا تھا مگر پاپا نے انہیں کسی بھی لمحے چپ نہیں کروایا تھا جیسے وہ ان کی ایک ایک بات سے متفق تھے اور یہ بات اس کے دل میں انی کی طرح کھب گئی تھی۔

سب اس کے خلاف تھے سوائے عدیل بھائی کے۔ اس نے دل میں سوچا اپنے دل کی تسلی کرنے میں ماریہ بھی اس کے لیے کوئی رائے ضرور رکھتی ہوگی۔ وہ کیا رائے ہوگی؟

وہ یہاں سے جانا چاہتا تھا مگر جاننا چاہتا تھا کہ ماریہ کا اس معاملے میں کیا فیصلہ ہے۔ ماریہ کچھ دن پہلے کی ملاقات کوئی خوش گمانی اختیار کرنے سے روک رہی تھی مگر اپنا کر وہ جیسے وہ اس کی یادوں کو زندگی کا ایک اہم حصہ ضرور لینا چاہتا تھا۔

وہ بھی ایک مجرم کی طرح کھڑا تھا۔

"تم ماریہ کی شادی تمہارے ساتھ نہیں کر سکتے۔ بس ہو گیا فیصلہ۔ ماریہ بھی بس اتنا ہے تم عزت بخشو۔" ماما نے جیسے اعلان کیا۔

حمزہ عابد ماما کو ساکت دیکھنے لگا۔ ماما نے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھے تو بے حد شرمندگی سے بولیں۔ "حمزہ بیٹا ہم تم سے بہت شرمندہ ہیں لیکن ہم اس معاملے میں قطعی بے بس ہیں۔ جو ہم نے سوچا تھا وہ اب ہونے کا امکان بے حد معدوم تھا۔ ماریہ جیسی پیاری لڑکی کو تمہاری طرح کا کوئی پیارا انسان ہی ملنا چاہیے۔ وہ بھی ذہن رکھتی ہے۔"

ماما کے فقرے سے حمزہ عابد اداس ہونے کی اداکاری کرنے لگا۔ پھر مسکرانے لہجے میں بولا۔ "آنٹی! غلطی شہریار کی ہو سزا ماریہ کو کیوں ملے؟ آپ میری طرف سے اسے سمجھانے کی کوشش کریں اور کہ وہ شہریار کے کردار کا خطے میں اپنی خوشیاں کیوں قربان کرنے لگی؟ یقین کریں آنٹی اس سارے معاملے کے بگاڑ کے باوجود مجھے ماریہ کو اپنا کر خوشی ہوگی۔"

وہ ثمین حمزہ عابد کی اس نئی چال کو سمجھنے لگا۔ معاملہ وہیں ہنوز رہا تھا تو پاپا کے سر لینے کا کیا مقصد رہ جاتا تھا۔

"پاپا! میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" اس نے ہمت مجتمع کر کے کہا۔ ہر کسی کی نگاہ اس کی جگہ اٹھ گئی تھی جو نفرت سے اسے گھور رہے تھے۔ پھر اس سے بھی زیادہ نفرت سے کہا تھا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو، کیا نہیں ہم میں سے کسی کو اس میں دلچسپی نہیں۔ تم یہاں سے دفع ہو سکتے ہو، اس سے پہلے کہ میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاؤں۔"

اس نے پاپا کو دیکھا، پاپا نے اس کی حمایت میں کوئی لفظ نہیں کہا اور وہ تیزی سے باہر آ گیا۔ اپنے کمرے میں لوٹا تو عاطف بیگ کو اپنا منتظر پایا۔

"کہاں رہ گئے تھے؟ ہو گئی وانیا مسز سے بات؟" رسالہ رکھ کر توجہ سے اس کی طرف متوجہ ہوا مگر اس کے چہرے پہ نظر گئی تو پریشان ہو گیا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" ٹھنڈے یخ ہاتھ تھام کر پریشانی سے دیکھا۔

"حمزہ جناب ڈرائنگ روم میں ہے۔ وہ اپنا کیس نئے سرے سے لڑ رہا ہے اور میں کچھ نہیں کر پا رہا ہوں۔ کوئی ایک بھی وہاں میری حمایت میں نہیں ہے۔ وہ سب جانانہ کے معاملے میں مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں کہ میری تین دن کی غیر حاضری کو بھی وہ جانانہ کے ساتھ وقت گزاری کا پیش خیمہ سمجھ رہے ہیں۔ کسی نے بھی میرے چہرے کی تھکن پہ غور نہیں کیا۔ میری آنکھوں کی تکلیف کسی نے مارک نہیں کی۔ سارا رونا دھونا...... وہ بڑی مہارت سے کر کے اپنے کمرے میں اپنی جنت میں ہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکا۔ عاطف! اگر یہی رہا تو میرا دل پھٹ جائے گا۔" وہ بیڈ پہ بیٹھ گیا۔

عاطف کچھ دیر تو اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ سب لسٹ سے زیادہ ہے۔"

کچھ دیر تو اس کی طرف سے کسی جملے کے آنے کا انتظار کیا مگر اس کی خاموشی سے بالآخر عاطف بیگ پھٹ پڑا۔

"مجھے تمہاری مجبوری سمجھ نہیں آتی۔ تم نے دیکھا اس شاطر نے بگڑا ہوا معاملہ کس طرح اپنے حق میں کر لیا۔ اگر تم یہاں انکل سے پہلے گزرتے تو وہ اس وقت ایک لفظ کہنے کے قابل نہیں رہتا۔ یہ کیا بے وقوفی ہے کہ سالار بھائی، عائشہ بھابی کے ہوتے ہوئے جانانہ میں دلچسپی لیں تو بھی تم اپنی جان پیش کر دو...... رابعہ بھابی اور سہیل بھائی کی محبت، جو وہ کالج کے زمانے سے کرتے آ رہے ہیں، سالار بھائی کی نا سمجھی سے اس محبت میں خسارہ آئے تو بھی تم اپنی ذات پیش کر دو...... حمزہ جناب کی فرسٹریشن کا کوئی وانیا کی زندگی میں نہ آئے، وہ یہ بھی نہ جان سکے کہ حمزہ جناب کتنا برا انسان ہے، اس کے لئے بھی ساری نفرت تم سمیٹ لو...... وانیا محبت سے محبت کرتی رہے، محبت کے نام پہ وہ مر نہ جائے...... شیری! مجھے بتاؤ، جانانہ کا کسی اور کا کیا گیا؟ حالات نے چاروں طرف سے صرف تم سے کھیلا ہے اور تم اس گیم میں ہار گئے ہو۔ کچھ معاملوں میں بہت زیادہ سوچنا سب سے بڑی غلطی ہوتی ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے، عائشہ بھابی کبھی یہ کہیں گی کہ انہوں نے تمہیں اپنا گھر بچانے کی قسم دے کر جانانہ کے سامنے چارے کی طرح لے جا کر پھینکا تھا؟ کوئی تمہاری گواہی نہیں دے گا۔ تم بدنام ہو گئے ہو۔ تمہیں معلوم ہے بدنامی کیا ہوتی ہے؟"

ثریا نے زہریلے انداز میں منتخب لگایا۔ پھر سرسراتے لہجے میں بولا "ہاں، میں جانتا ہوں یہ ایسی کہانی ہے۔ یہ بانی کو دہرا الام شہریار ہے...... پھر کیا فرق پڑتا ہے۔ میری زندگی سب سے بڑی
جانی ہے۔"
آج جو جواب ملا تھا، خوش گیا تھا۔ وہ عاطف جنگ کے سامنے بالکل ویسا کھڑا تھا جیسے اپنی جوانی میں خود کو ملتا تھا۔ اس لئے کہ اس کے اندر اپنی ذات کا بچہ۔ مرنے کا جو ہلکا سا احساس تھا آج اس احساس کو بابا کے جملوں نے مار دیا تھا۔ وہ پاپا کی ذات اور ان کی توہین کی وجہ سے اپنی ذات کی جنگ لڑ لیا تھا۔ لیکن آج اسے لگا تھا جیسے پاپا نے ان کے جملے پر کوئی ردعمل نہ دے کر بہت کمزور کر دیا تھا کہ جیسے وہ واقعی ان پر بوجھ ہیں......
وہ بت کی طرح بیٹھا تھا جب عاطف نے اس کی آواز سے اس کی محویت توڑی تھی۔
"تمہارا بلڈ پریشر شوٹ کر رہا ہے، پھر سے کوئی مسئلہ نہ بن جائے۔ ڈاکٹرز نے تمہارا فالج اٹیک تو ٹھیک کر دیا ہے مگر احتیاط کی بات ابھی بھی ضروری ہے۔"
"بات کچھ کی ہے عاطف! اب مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ زندگی طویل ہے یا مختصر...... بس اتنا علم ہے کہ زندگی تم کے سوا کچھ نہیں ہے میرے لئے......"
"تم صرف مایوسی سے بول رہے ہو۔ یہ زندگی بامعنی ایسا کچھ نہیں ہے جسے محنت سے بدلا نہ جا سکے...... ہم ان سب کو تھوڑی سی کوشش کی ضرورت ہے۔ زندگی پہلے جیسی ہو سکتی ہے۔"
شہریار عبدالرحمن اسے دیکھتا گیا، پھر کچھ نہیں بولا۔
"کچھ دیر کے لئے سب بھول جاؤ یار کیا ہوا۔"
"یار فاطمہ سحرت کے گھر والے بتا رہے تھے۔ جانے لوگ یہ طرح سے کیوں کہتے ہیں؟" وہ استہزائیہ مسکرایا۔
عاطف جنگ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر محبت سے بولا۔ "فضول سوچوں کو چھوڑ دو۔ مایوسی کی باتیں تم پر جچتی نہیں ہیں۔ کسی کے لئے نہ سہی، میرے لئے زندہ رہو۔ تم نہیں جانتے تم میرے لئے کتنے ضروری ہو۔"
"اچھا...... میں اور تمہارے لئے ضروری ہوں۔" وہ ہنسا، پھر اس کی صورت کی گھبراہٹ سے ڈر گیا۔ وہ اسے جھنجھوڑ کر بولا۔ "تیرے لئے میں ضروری ہوں۔ اگر یہ بات تیری روٹی

فرنوز کو پتہ چل گیا ہاں زندہ ہو گیا۔"

عاطف بیگ نے مطمئن ہو کر اس بار اطمینان سے مسکرایا، پھر شجاعت کے لہجے میں بولا۔ "میرے لئے وہ ورثہ جو فرنوز نے دیا، کبھی بھی چھوڑا جا سکتا ہے یا شاید اسے ذکر تیرے سے جتنا بلے میں کچھ واسطے کر۔ خسارہ کیوں ہے تم نے؟"

"عاطف! بہت زیادہ ہے ویسے اچھا میں نے وہ کھانا ہے اب زیادہ مسکرامت لگاؤ۔" تو بیٹھے پھر رک کر لب کر مسکرایا۔

عاطف کرسی پر بیٹھ گیا، پھر آہستگی سے بولا۔ "سنیے میں اب تہہ دل سے بھائی صاحب کچھ ٹھیک ہے نا؟"

وہ جانے کیا جاننا چاہ رہا تھا۔ شہریار عبدالرحمن کو ان کی بے لوث محبت پہ بے اختیار پیار آ گیا۔ اس نے ان کے ہاتھ محبت سے ہاتھ میں لے کر چاہت سے کہا۔

"سب ٹھیک ہے۔ اب میں پہلے کی طرح حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"تم جیسے بہادر انسان سے مجھے یہی توقع تھی۔" جملہ ادا ہوا تھا کہ شاہ خاموش بیٹھا تھا۔ عاطف نے پلٹ کر دیکھا شہریار کی نظروں میں وہ چہرہ مس ہو گیا تھا۔

"عدیل بھائی!" شہریار کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

وہ ان کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئے، پھر آہستگی سے بولے۔ "حالات کا مقابلہ بہادر لوگ ہی کیا کرتے ہیں اور مجھے یقین تھا تم ہمت نہیں ہارو گے۔" لمحہ بھر کو توقف کیا، پھر گویا ہوئے۔ "میں وہاں کھڑا تھا سب کے بیچ محسوس کرتا تھا کچھ مس ہو رہا ہے۔ یہ احساس بھی تھا کچھ غلط کیا اور وہ نہیں کر سکتا۔ شہریار کا دل جتنا سوفٹ ہے، کبھی کبھی تک ہے وہ سب کر ہی نہیں سکتا۔ سو یہی سوال مجھے یہاں کھینچ لائے۔ فکر کے زیادہ تر اظہار غلط ہونے کو سوچ رہا ہے، پر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے سوچا ایک بار تم سے تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھوں، سچ کیا ہے۔"

"اگر سچ وہی ہو تو؟" شہریار نے جانے کیوں پوچھا۔

عدیل بھائی جو بات میں کبھی کہاں تھے فوراً اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر بولے۔ "مجھے تم پر جتنا یقین ہے مجھے لگتا ہی نہیں تھا کہ میں تمہیں غلط سمجھتا، اور اگر بالفرض وہ کیا گیا سچ ہوتا تب بھی میں تمہاری ہی حمایت کرتا۔ کیونکہ میں اس بات سے آگاہ ہوں کہ انسان کو زندگی ایک بار ملتی ہے اور ایک بار ملنے والی زندگی کو بندہ اپنی مرضی سے ہی گزارے۔"

ثریا تکیے کے سہارے بیٹھی مسکرا کر بڑی دلچسپی سے بولی۔ "آپ کی سب باتوں میں صرف ایک بات اچھی لگی مجھے۔"

"کون سی بات؟" عدیل بھائی بے چینی میں بولے اور وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"یہی کہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔ خدا کی قسم اگر مجھے اختیار ہوتا تو پہلی بار بھی شکریے کے ساتھ زندگی کا آپشن رد کر دیتا۔"

عدیل بھائی نے سنا تو کان مروڑ کر بولے۔ "تجربہ بولتا ہے...... ابھی کہاں ہاں زندگی کا تجربہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، کیسے وہ تلخی ہی تجربہ ہے۔ جس وقت تک [illegible] سے مٹ کا جو مزہ ہے وہ زندگی کے مزے کو دوبالا کر دیتا ہے۔"

"بالکل جناب! آپ کا تجربہ سر آنکھوں پر۔" وہ ذرا سی ذرا اٹھا کر پھر سے لیٹ گیا۔

عاطف کے چہرے پر اس کے لیٹنے سے بے چینی پھیل گئی تھی۔ تو عدیل بھائی نے بھی اس حوالے سے پکارا تھا۔

"تم ٹھیک ہو نا؟...... اپنی یا تم؟"

اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر انہیں نظاروں سے دیکھا پھر آہستگی سے بولا۔

"کوئی خاص بات نہیں۔ شاید وہاں کا اثر ہے۔ تھوڑی خصوصی ممبری سے اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

عدیل بھائی نے سر ہلایا اسے سونے کا مشورہ دے کر کھڑے ہوئے۔ انہیں اٹھتا دیکھ کر وہ بھی اٹھا۔ جب اس کا ہاتھ تھاما پھر آہستگی سے بولا "پاپا مجھ سے سخت ناراض ہیں اور شاید وہ کبھی میری صورت نہ دیکھیں۔ آپ بتائیے پھر معاملات کیسے سدھارے جا سکتے ہیں؟"

"کوشش کرو۔ دیکھنا کچھ دن کے لیے مشکل ہی آئے گا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ پاپا کو اس گھر میں سب سے زیادہ تم عزیز رکھتے ہو۔ تم ہی اس معاملے کو ہینڈل کرو۔ تم سے تمہاری بہن کی خوشی کے لئے اٹھائے جانے والے کسی قدم پر کوئی سوال نہیں اٹھائے گا۔"

"عدیل ٹھیک کہہ رہا ہے...... میں بھی اس بات سے متفق ہوں۔"

ANCHAL.COM.PK

شہریار یکدم واقعی کچھ بیٹھا تھا ایسے جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ بابا بے حد شکستہ حالت میں ان کے سامنے کھڑے تھے۔ پھر قدم بہ قدم چلتے وہ ان کے قریب آئے اور بے چارگی سے بولے۔

"غیر اخلاقی حرکت ہے یہ۔ بچپن کی کسی چیز کو چھپ کر بار بار سننے سے بہت سی باتوں سے پردہ ہٹ جاتا ہے۔ یہ بات وہاں ختم ہو گئی ہیں اور بڑی بی بی جی..... میرے لئے یہ تجربہ سوہان روح ہوتے ہوئے بھی کہ اس وقت تمہاری ذات نہیں، بہر حال یہ سچ ہے کہ وہ بدلی تھی اور جانتے ہو ہارے ہوئے شخص کے لئے اچانک جیت جانے کا احساس کس قدر فرحت بخش ہوتا ہے۔"

شہریار بت کی طرح انہیں دیکھتا رہا۔ اسے یہ باتیں چند لمحوں کی کہانی لگی تھیں، ان کا دل چل رہا تھا۔ بس وہ بے حس آنکھوں سے دیکھتا رہا تھا۔

حافظ بیگ نے اسے چھوڑا۔ اس کی آنکھوں کی بے حسی سے زیادہ وہ اس کا ملیح ہوتا۔

وہ ان لمحے جانتے تھے کہ یکدم گزری ایک رات کی تڑپ سے ایک بار پھر خود سے واقف ہو گیا تھا۔ تبھی وہ بابا سے ذرا سا خفا اور ان لوگوں کے سامنے آپ انہیں بچوں کے کتنے ہی چہرے دکھا دیں وہ اگر روشنی دینا چاہیں تو آپ انہیں زندگی کی طرف دیکھ کر مسکرانا نہیں سکھا سکتے۔

عدیل بھائی نے ان کا بابا کے کندھوں پر ہاتھ ڈال کر ہولے سے بولے۔ "انہیں شہریار کو پھر سے اپنی طرف لوٹنے کے لئے کچھ وقت دینا ہوگا۔"

بابا اثبات میں سر ہلا کر ان کے ساتھ دروازے کی طرف مڑ گئے۔

حافظ نے اداکاری سے انکار کر دیا کیونکہ انہیں دروازے تک چھوڑنے کے لئے شہریار اٹھے تھے۔ وہ خفگی سے لمبائی کی سستی کی وجہ سے حافظ کچھ نہیں بولا۔ وہ اس وقت جس کیفیت کا شکار تھا اس وقت کوئی تسلی دلاسہ نہیں بن سکتا تھا۔ کوئی لفظ تسلی کا کندھا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ محض ان کے آنسو بہنے کے بجائے جم گئے تھے اور جو آنسو جم جاتے ہیں ان کا بوجھ دل کو کرچی کرچی کر کے جانے لگتا ہے۔ سارے جذبے، ساری سانسیں خاک ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ کوشش کے باوجود زندگی کی طرف مڑا تھا اور وقت کی تلخی کے ہاتھوں رہن رکھ گیا تھا۔

حافظ بیگ کچھ بولنے سے رکتا رہا۔ پھر اس خیال سے کہ تنہائی شاید شہریار کے دل کا غبار نکل جانے دے، وہ اجازت چاہنے لگا۔

"پھر کل ملتے ہیں۔"

شہریار نے سر ہلایا، کچھ نہیں کہا۔ بیڈ پر لیٹا اسے بھی جاتے دیکھتا رہا۔

واپسی کے قدموں کو گنتے ہی گنتے اُس کی عمر پوری ہوئی تھی...... اس تک آنے والے قدم بہت کم اُس تک پہنچ پاتے تھے...... محبت اور اس کے بیچ تنہائی کا شوں شوں کرتا سمندر تھا......

وہ کتنی دیر یکسانیت تنہائی سے دل جلاتا رہا، پھر لیٹے لیٹے تھک گیا تو بے وقت اُٹھا، اُسے دانیا کا خیال ہراساں کر رہا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی......

اپنے کمرے سے نکل کر گھر کی طرف آنے کے لیے لان سے ہو کر گزرا، پھر سیڑھیاں چڑھتی ہی تھیں کہ نوری سے پہلے ٹکراؤ ہو گیا۔

"آپ کیا لینے آئے ہو؟ اس گھر کا سکون برباد کر کے بھی تمہیں چین نہیں ملتا؟ کیا رہ گیا ہے برباد کرنے کے لیے، جو پھر اپنے منحوس قدم لے کر چپکے چلے آ رہے ہو؟"

شہریار کے قدم وہیں رک گئے۔ اس نے پہلی بار نوری کو پلٹ کر جواب نہیں دیا، بس دیکھتا رہا۔ نوری نے حیرت سے اُسے چونک کر دیکھا، پھر جانے اُس کی آنکھوں میں کیا نظر آیا کہ وہ اس کے راستے سے ہٹتی چلی گئی تھیں۔

جو دل جلتے ہیں...... ان کے دل ان کی آنکھوں میں آن بیٹھتے ہیں۔ شعلہ لگا دو تو بھڑ بھڑ جلنے لگتے ہیں...... اور کبھی کبھی ان شعلوں کے آپ ہی راکھ ہو جاتے ہیں...... اس وقت اُس کی آنکھوں میں ایسی ہی بے بسی تھی...... جلنے دو، نہیں بجھاؤ مت...... ہوا تو خاموشی کے اس شور سے ڈر گئی تھیں۔ کیا پتہ کوئی چنگاری اُڑ کر انہیں بھی خاکستر کر دیتی۔

وہ مناسب قدم اُٹھاتا دانیا کے کمرے میں آ گیا تھا۔

دانیا حسب توقع بیڈ پہ اداس بیٹھی تھی۔ منگنی کی انگوٹھی اُتار کر اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی تھی۔

"دانیا......!" اُس نے نام پکارا۔ دانیا نے اُسے دیکھا مگر کچھ نہیں بولی۔ وہ شہریار قدموں سے چلتا ہوا اس کے سامنے بیڈ پر آن بیٹھا۔ "تم...... تم مجھ سے ناراض ہو؟"

دانیا نے نفی میں سر ہلایا، پھر آہستگی سے بولی۔ "پہلے ناراض تھی شاید آپ سے ناراض ہوئی تھی مگر پھر تجزیہ کیا تو مجھے لگا میری ناراضگی زیادتی کے سوا کچھ نہیں۔" اس نے توقف کیا، پھر اسی لہجے میں بولی۔

"جب میں جانتی ہوں کہ اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق ہر انسان کو ہے تو اس میں کیا برائی ہے اگر آپ ایک آزادانہ فیصلہ لینا چاہتے ہیں۔ آپ مریم سے نہیں رباب سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو مجھے آپ کی مخالفت کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے۔ میں تو آپ کی بہن ہوں اور آپ کو خوش ہی دیکھنا چاہوں گی نا۔"

شہریار کو لگا ان جملوں سے اندر جمے ہوئے آنسوؤں میں کسی نے چنگاری ڈال دی ہو۔ برف پگھلنے لگی تھی کہ اچانک دروازہ کھلا۔ ماما سامنے کھڑی تھیں۔ وہ اس چونکنے کو سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ غصے سے بولیں

میں مخاطب ہوئیں۔

"شہریار! میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ تم نے میری بیٹی کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھینی ہے۔ یہ لڑکی اسے اب بھی تمہاری محبت کے آگے اپنی خوشی ہیچ لگتی ہے۔ اس کے پاپا نے کہا ہم کچھ سوچ کر پہلے رشتے کو قائم رکھنے یا ختم کرنے کا فیصلہ کریں گے اور اس نے بغیر سوچے کہہ دیا، مجھے شیری بھائی کی خوشی عزیز ہے۔ اگر وہ جانان سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ رہی حمزہ سے شادی تو اب شاید یہ رشتہ برقرار نہیں رہے گا۔ یہ لڑکی ماریہ کی اداس آنکھوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔ صرف تمہاری وجہ سے شیری!...... صرف تمہاری وجہ سے میری بیٹی کی خوشی اس سے منہ موڑ گئی ہے۔ تمہیں ایک لمحے کے لیے دانیہ کا تو سوچنا تھا مگر نہیں تم سوچتے ہی تو یہ ہوتا...... تم اتنے خود غرض اتنے بے حس ہو سکتے ہو مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا۔"

ماما یہ کہہ کر جس طرح آئی تھیں، اسی طرح چلی گئی تھیں۔ شہریار نے ایک لفظ معافی میں نہیں کہا تھا۔ دانیہ بھی اپنے ہی خاموش تھی، جیسے وہ یہاں تھی ہی نہیں۔ شہریار جانتا تھا وہ یہاں ہے اور یہاں کیوں نہیں ہے......

دل کے بھید دل والے ہی جان سکتے ہیں اور محبت کو وہ اتنی سی سرعت سے یا ننا تھا کہ کوئی اور شخص خواہ اس محبت کو اس کے دل سے کبھی دانستہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ کہے بغیر...... اور دانیہ سامنے خلاء میں یوں تک رہی تھی، جیسے کھوئے ہوئے خوشی کے لمحے اس کمرے میں دھواں بن کر تحلیل ہوئی ہو......

شہریار کچھ دیر تو اسے دیکھتا رہا، پھر خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ پھر ساری رات اس نے ٹیرس میں سموکنگ کی یا ٹہلتے گزار دی۔ آنکھ کھلی تو ناشتے کی میز پر بانو ماما اور سالار بھائی کے وہی خاموش چہرے نظروں سے ٹکرائے تھے۔

"وہ کبھی کبھی کتنی کیا کس طرح کا بچہ بن جاتا ہے، تمہیں دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے۔" سالار بھائی نے جان کو اس سے واسطہ کرنے کی کوشش کی۔

وہ سر جھکا کر ناشتہ کرتا رہا۔ پاپا اور عدیل بھائی اپنے دفتر جا چکے تھے۔ دانیہ نے آج یونیورسٹی سے چھٹی کی تھی۔ وہ آج دیر تک سونا چاہتی تھی۔ پھر نہیں سونا چاہتی تھی بلکہ رونا چاہتی تھی...... شہریار نے بخوبی اندازہ لگایا اور سوچا کاش وہ خوش گمانی کا ہاتھ تھام کر زندگی کا ایک مارجن پا سکتا مگر سالار بھائی......

اس نے چائے پیتے پہلی بار سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ انہوں نے اسے اس طرح دیکھنے پر جواب محسوس کیا اور بولے "تم کیا اب اسی طرح سر اٹھا کر دیکھنے کی جسارت کر سکتے ہو؟ تم...... کیا تم میں

حیا ام کا کوئی خانہ ہے؟"

"کہاں ماؤں جیسے بچے...... ان کے پاس حیا کہاں ہوتی ہے؟ جن کی پیدائش غلط، وہ ان کی زندگی ٹھیک کیسے ہو سکتی ہے؟" سالار بھائی نے طنز بالا کہا۔

شہریار کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔ انہوں نے اب بھی کچھ نہیں کہا تھا۔

سالار بھائی نے جواب نہ پا کر ایک دم اس کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے، پھر چلا کر بولے۔

"تم چپ رہ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم کوئی بہت اعلیٰ ہستی ہو؟ جانتے تم کیا ہو؟ کیا ہوتا ہے دوسروں کی محبتیں لوٹ کر؟ بولو کون ہو تم؟...... کیوں آئے ہماری زندگیوں میں؟...... کیا کمی تھی دنیا میں جو تمہیں دنیا میں بھیجنا ضروری سمجھا گیا؟ کاش امی نے اسقاط کروا دیا ہوتا تو تم کہیں کسی یتیم خانے یا ہاسٹل میں بھٹک رہے ہوتے [illegible] کے باوجود ہماری صورت تمہاری شکل دکھائی دے۔ تم مر کیوں نہیں جاتے؟ بولو! کیوں زندہ ہو؟" سالار بھائی جیسے [illegible] ہو گیا تھا انہوں نے اسے کھینچ [illegible] ہو گیا تھا۔ ان کے ماتھے پر [illegible] ہو گئی تھیں۔

"بابا...... بابا......!" تانو چیختے جا رہی تھیں۔

اور وہ خاموشی سے کھڑا بے بسی سے انہیں دیکھ رہا تھا جیسے یہ سب کسی اور کے ساتھ ہو رہا تھا۔

"سنی بھائی!...... سنی بھائی!" ان کے غصے میں چلتے ہاتھوں اور کف اڑاتے لہجے کے درمیان کھیوم بابا کی آواز گونجی۔ وہ انہیں مشکل سے روک رہی تھی۔

"آپ بتا دیں ناں کیوں نہیں کر رہے شہری بھائی؟...... کیا آپ کو چوٹ نہیں لگ رہی؟" وہ رو رہی تھی۔

شہریار کا ضبط بس چھوٹ گیا تھا۔ [illegible] سے بہ کر گردن تک آ رہی تھی۔ جسم پھر رُخ ہو گیا۔ بلڈ پریشر شوٹ کر گیا تھا مگر اس کی آنکھیں ان میں ابھی تک ویسی ہی خاموشی تھی۔ کرداریا کانپ گئی تھی اور سالار بھائی نے کرختی سے [illegible] کے باوجود [illegible] جا رہے تھے۔

"چھوڑو...... میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا...... اس نے ہماری زندگی کتنا تماشا کر رکھا ہے...... کیا حق تھا اسے ہماری خوشیوں سے کھیلنے کا؟ چھوڑ دو مجھے۔"

وہ اب بھی پلٹ پلٹ کر اس پر ہاتھ اٹھا رہے تھے۔ بابا نے انہیں مشکل سے ملازمین کی مدد سے ان کے کمرے تک پہنچایا تھا اور باہر سے لاک لگا دیا تھا۔

نانو نے فرسٹ ایڈ بکس منگوایا تھا۔ کچھ بھی تھا بہرحال فرسٹ ایڈ تو کرنی ہی تھی..... اور وہ جتنا اسے جیسے اس فرسٹ ایڈ کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ دانیہ اس کی بینڈیج کر رہی تھی۔ نجمہ نے بے ساختگی سے بار بار کی جگہ دانیہ نے بھر دی تھی۔ وہ ویسے ہی بے حس بیٹھا تھا۔ دانیہ اپنا کام مکمل کر چکی تو اس نے فرسٹ ایڈ بکس بند کر کے خفگی سے اس سے پوچھا۔

"سالار بھائی ہوش میں نہیں تھے، آپ تو ہوش میں تھے۔ انہیں روک نہیں سکتے تھے؟ اگر آپ کو نقصان زیادہ ہو جاتا تو......" وہ ابھی تک ہی روئی تھی۔ شہریار نے جواب نہیں دیا تھا اور خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف واپس چلا گیا تھا۔

دانیہ دوپہر کا کھانا لے کر اس کے کمرے کی طرف گئی تو وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھا تھا۔

"شہری بھائی! کھانا کھا لیجیے۔"

شہریار نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر نفی میں سر ہلا کر بولا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے دانیہ!" خفگی روکا گیا وہ بے لہجے میں بولا۔ "جس طرح سنی بھائی مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں دانیہ! تم بھی مجھ سے ایسی ہی نفرت کرو۔ مجھے پیار اور محبت اب تسکین نہیں دے سکتی۔ تم جتنا مجھ سے اٹیچڈ ہو گی، مجھے اتنی ہی تکلیف ہوتی چلی جائے گی۔ میں نے تمہارے ساتھ برا کیا ہے، تم اظہار بھی کرو۔ تم ہر چیز درگزر کیوں کر دیتی ہو؟ تم کیوں چاہتی ہو، تمہارے اس رویے پر مجھے خود سے نفرت ہونے لگے؟"

دانیہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور نم آواز سے بولی۔ "دیکھیے ہم اپنی قسمت سے تو نہیں لڑ سکتے۔ قصور آپ کا نہیں قسمت کا تھا۔ پھر سزا آپ کو کیوں ملے؟"

"سزا مجھے کیوں نہ ملے؟" وہ یکدم بیڈ سے کھڑا ہو گیا، پھر بھرائے لہجے میں بولا۔ "تمہاری آنکھیں کچھ نہیں دیکھتیں۔ جس پاپا کی بیٹی کو میں نے ہی ختم کر ڈالا ہے۔ میں بہت برا بھائی ہوں، بہت ہی برا بھائی ہے نا؟" شہریار نے اس کے کندھے پر شکستگی سے ہاتھ رکھا تو دانیہ کو بہت برا لگا۔

"آپ کو بخار ہو رہا ہے اور آپ نے بتایا ہی نہیں؟"

"بتانے سے بخار مجھے چھوڑ سکتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو میں ہر چیز سے پہلے زندگی سے کہتا مجھے چھوڑ دے۔ میں اس بدن، اس دھڑکن سے اکتا گیا ہوں۔"

وہ پھر سے بیڈ پر بیٹھ گیا تھا اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ قریب جا بیٹھی تھی۔ پھر اداس ہو کر بولی تھی۔

"آپ کے سر میں درد ہو رہا ہے، میں ابھی شہریار بھائی کو فون کرتی ہوں وہ آپ کو ڈاکٹر صمدانی کے کلینک لے کر جائیں۔"

بابا بزنس سے باہر نکلی شہریار نے جانا وہ کچھ بار بار کس بات سے بچنے کے لئے اس نے کمرے سے غائب ہو جانے ہی میں عافیت جانی۔

بابا واپس لوٹی تو وہ کمرے میں موجود نہیں تھا۔ اس نے اسے ہر جگہ ڈھونڈا موبائل پہ کال کی مگر کہیں سے رزلٹ نہ نکلا۔ وہ خالی کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ خالی کمرہ ایک خلا کی طرح اس کے اندر تک پھیلتا چلا جا رہا تھا۔

یہ وہ لمحہ تھا جب اس نے محسوس کیا تھا اس کی زندگی میں اس کا وہ بارش والا بھائی کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔ وہ کیسا بھی ہو جائے کتنا ہی برا، اب بھی وہ اس کے لئے شہریار بھائی ہی رہے گا۔

"میں آپ سے ناراض نہیں ہو سکتی...... میں آپ کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی...... آپ میری زندگی کا حصہ ہیں......" اس نے خاموشی سے کہا۔

اور کمرے کی خاموشی اس کے اندر تک سرسراتی جاگ اٹھی۔ اس نے بڑھ کر دیکھا ماضی کی بھول بھلیوں سے وہ اچانک ہی لوٹ آئی تھی۔

وہ شیڈ وہ میں لوٹ کر پہلا خیال شہریار ہی کا آیا۔ یکدم دل میں ہوک اٹھی۔

"شہریار بھائی......" اس نے موبائل اٹھایا فون بند رہنے سے پہلے بار بار شہریار کی ہی مسڈ کالز اس کی منتظر تھیں۔

اسے اپنے پہلے کے رویے پر حد درجہ افسوس ہو رہا تھا۔ پتا نہیں وہ جذبات کی کس رو میں بہتی گئی تھی کہ ہر چیز ہر بات اس کی نظر سے ہٹ گئی تھی۔ صرف اپنا حصار باقی رہ گیا تھا؟ اسے رد کر گیا تھا۔ وہ جتنی شہریار سے محبت کرتی تھی اتنی ہی وہ اس کی ذات کا حصہ ہو گئی۔ چند گھنٹے شہریار کو کس قدر تکلیف دہ ہو سکتے تھے اسے تو یہ حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کیسے شہریار کو اسپتال میں اس حالت میں چھوڑ کر آ گئی۔ اسے وہ کتنے ہی لمحے یاد آ گئے جب وہ بیمار ہوتی تو شہریار ساری ساری رات اس کے بیڈ کے پاس پٹی کرتے بیٹھے ہوئے جاگ کر گزار دیتا تھا۔ صبح اس کی آنکھ کھلتی تو مدہم پیار بھرے لہجے سے کہتے۔

"بابا ڈارلنگ! مجھے لگتا تھا کسی بخار سے زیادہ تمہیں اور کوئی بیماری نہیں ہو سکتی۔ لیکن میری جس طرح تمہارے لئے بچے جیسی ہی لگتا ہے تمہاری بیماری میں لگتا ہے میری محبت اس کی خوبی کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔"

بابا کو وہ دن بھی اچانک یاد آنے لگے تھے، جب محض اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کے چکر میں اس کی نمازوں میں بڑی ترتیب آ جایا کرتی تھی اور وہ شرارت سے کہتا۔

"بہت زبردست جھگڑا ہوگا، جب اللہ میاں کے سامنے جاؤں گا۔ پوچھتے تو کہیں گے کیوں شہریار! کیا ہم سے بھی پیاری تھی تمہیں اپنی بہن؟ ہمارے لئے کبھی تہجد نہیں پڑھا اور مسکہ لگانے کے لئے سجدے پہ سجدے...... ویسے آپس کی بات ہے میری بہن اتنی مسکین ہے، زیادہ چانس اس کا ہے وہ کوئی سوال نامہ دیں گے ہی نہیں اور فوراً پاس کر دیں گے۔"

بابا اس کی اس وجہ محبت پر بیماری کے باوجود ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتی تھی اور وہ تھا کہ سوپ اور ایسی ہی چیزیں، جو وہ کسی کے ہاتھ سے لیا کرتا، منع کرتی تھی وہ شہریار کے ہاتھ سے بند کرنے کے باوجود کھا لیتی تھی۔ ایسے موقع پہ اماں کے رویے میں بھی شہریار کے لئے نرمی آ جایا کرتی تھی...... اس کی کوئی اس چیز سے جب بھی کھاتی، اس کی شرمندگی بڑھ جاتی۔

موبائل پہ کال جاری تھی مگر اس کی سوچوں کی طرح کال کی بھی کوئی حد نہ تھی نہ رکتی تھی۔

"شہریار بھائی سو گئے ہوں گے۔" اس نے دل کڑا کیا، ڈیل دی اور موبائل آف کر دیا، پھر بیڈ پہ پہنچی ہی تھی کہ اچانک شہریار کا نمبر اسپارک کرنے لگا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے موبائل آن کیا۔

"کیا بھائی! کب سے ٹرائی کر رہی تھی۔ کیا سو رہے تھے؟"

"ہمم...... دانیہ بول رہی ہو؟" بالکل الگ آواز۔ وہ چونک گئی۔

"آپ کون؟" سوال سے زیادہ خوف تھا اور دل بے اختیار مناجات کر رہا تھا کہ اس کا بھائی خیریت سے ہو۔

"شہریار اس وقت سو رہا ہے گڑیا!" اس بار آواز پہلے سے زیادہ صاف اور واضح تھی۔ وہ فوراً پہچان کی سیڑھی چڑھ گئی۔

"حافظ بھائی! آپ...... آپ کو کیسے پتہ چلا؟"

"بس ویسے ہی، دل کچھ پریشان سا ہو رہا تھا۔ پچھلے چار سال سے رابطہ واجبی سا تھا، لیکن صبح سے اتنی شدت سے یاد آیا، پتہ ہے کراچی جس ڈیل کی وجہ سے آیا تھا، وہ ذہن سے نکل گئی بس یاد رہا تو ایک خیال کہ کسی طرح شہریار سے ملاقات کر لی جائے...... ساری مصروفیات کینسل کر کے اس کے دفتر پہنچا، پتہ چلا وہ دفتر ہی نہیں آیا۔ فوراً موبائل پر رنگ کیا۔ بہت وقت بعد فون ریسیو کیا اس نے۔ ضرورت سے زیادہ شگفتہ لگ رہا تھا۔ اس وقت باتوں باتوں میں فارمیلٹی کا تو کچھ نکل آیا، میں نے کہا ملنا چاہتا ہوں، کہنے لگا آج نہیں پھر کبھی...... موڈ خراب ہو گیا اس کی بات سے، دل تو چاہا تھا دوبارہ کال

AANCHAL.COM

ہی نہ کریں مجھے اندر ہی بے چینی..... صبح نماز کے لئے اٹھا تو پھر فون کیا۔ کب تک آٹھ فون سنائی دیتی رہی پھر کال ریسیو کی تو اس کی جگہ انکل ہمدانی تھے۔ معلومات کیں تو پتا چلا، صاحب بہادر ہسپتال میں داخل ہوئے ہیں۔ سو نماز تک چھوڑ کر اس کے لئے بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچا۔" ایک لمحے کو تفصیل دے کر چپ ہوا پھر شکوے سے بولا۔ "مگر لڑکی! مجھے تم سے بہت شکایت ہے۔"

"کس بات پہ عاطف بھائی؟" دانیہ نے مدھم ہو کر سعادت مندی دکھائی۔

"شکایت نہیں، بلکہ غصہ ہے۔ یہاں اتنا کچھ ہو گیا لیکن تم نے مجھے ایک فون کال ضروری نہیں سمجھی۔" عاطف بیگ ڈپٹ کر بولا۔ "اور دوسری بات یہ کہ تم نے اپنا موبائل کیوں آف کر رکھا تھا؟ تمہیں پتہ ہے، جب میں ہسپتال پہنچا ہوں تو شہریار کتنا پاگل ہو رہا تھا اگر بروقت میں اس کی دل جوئی نہ کرتا تو...... تم نے تو آج اسے گنوانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ڈاکٹر ہمدانی تک پریشان ہو کر تمہارے پاپا کو فون کرنے والے تھے۔ دانیہ کی بچی! وہ کس قدر تمہارے بارے میں حساس ہے معلوم ہے کچھ؟ مجھے دیکھ کر اس نے کچھ نہ کہا مگر اس کی آنکھوں کا کرب...... آخر تم آج اتنی روڈ کیوں ہو گئی تھیں؟"

دانیہ سے کچھ نہیں کہا گیا۔ جو شرمندگی اس پہ طاری تھی، وہ اب آنسو بن گئی تھی۔

"مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی عاطف بھائی! لیکن میں کیا کروں، ماضی جب بھی میرے سامنے آتا ہے، مجھے شیری بھائی ایک لمحے کے لئے اچھے نہیں لگتے۔ مجھے ماریہ یاد آ جاتی ہے جو دھاڑیں نہیں بھولتا اور وہ لڑکی جانا نہ...... وہ دماغ میں کسی بدی کی یاد کی طرح ایسی بیٹھ گئی ہے کہ نکلتی ہی نہیں ہے۔"

عاطف بیگ کچھ نہیں بولا۔ لیکن اس کے چپ ہونے پہ مدھم ہو کر اس نے جواباً کہا۔

"کچھ باتوں پہ ضروری ہے، خود جواب طلب کرنے کے بجائے وقت کو جواب دینے کی ذمہ داری سونپ دی جائے۔ مزاج و رویّہ کا تو اندازہ انسان اسی وقت تھام سکتا ہے، جب وہ عقل کل ہو اس سے کوئی غلطی نہ ہوئی ہو۔ کیا تم ایسی ہی شخصیت ہو؟"

دانیہ نے ہاں میں جواب دیا، پھر گھبراتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "شہریار بھائی اب کیسے ہیں؟ اب تو کوئی گھبرانے والی بات نہیں ہے ناں؟ ویسے شیری بھائی جتنا ان چار سال میں بدل گئے ہیں، آپ سے ملنے کا انداز کیا تھا ان کا؟"

عاطف بیگ کے مخصوص انداز میں ہنسنے کی آواز سنائی دی، پھر اس نے کہا۔ "وہ پہلے سے بہت میچور ہے۔ رہی بدلاؤ کی بات تو وہ تو سر سے لے کر پیر تک بدل گیا ہے۔ اتنا ٹھنڈا، اتنا سرد مزاج۔ بیر بنی

کے نام پر جو پہلے ہزاروں روپے اڑا دیتا تھا اب اس کام سے ہی کان پکڑتا ہے۔ تمہیں کیا بتاؤں، کچھ روپے قرض مانگے تھے اگرچہ اتنی بری حالت میں بھی مرجزاجی سے بولا۔ "میں نے ادھار دینا بند کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اتنا روپیہ لے کر کہاں جاؤ گے؟" کہنے لگا۔ "بے فکر رہو مر گیا تب بھی تمہارے سے عام نہیں کروں گا۔"

"لو بھلا۔ دوستوں کو دوستوں پر حق نہیں ہوگا تو ہوا شا کا ہوگا؟" دانیا ٹینشن کے باوجود اس کے انداز پر ہنسنے لگی۔ پھر گھڑی کی طرف نظر گئی تو بولی۔ "فجر کی نماز کا وقت تو نکل گیا۔ سونے کی کوشش کروں گی وزٹ آورز میں سب سے پہلے ہسپتال پہنچ جاؤں۔ بس آپ تب تک بھیا کو بہلا کر رکھیے گا۔"

"جیسے میری بہن کا حکم۔ مرتابی کی کسے مجال ہے۔" عاطف نے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا۔

دانیا تیزی سے کچن کی طرف بھاگی۔ کورن فلیک تیار کرنے کے لیے چین چولہے پر رکھا ہوا ہے اور عاطف کے لیے کافی اور سینڈوچ بنانے کی تیاری کرنے کا سامان ہٹا ہی رہی تھی کہ اچانک کچن کا دروازہ کھلا۔ اس کا خیال تھا وہ یقیناً کچن کی لائٹ کھلی دیکھ کر آئی ہوں گی۔ مگر سامنے جسے دیکھا۔ دانیا کی حالت اپنا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی اس کے سینے سے جا لگی۔

"عدیل بھائی! شیری بھائی......" اس سے کچھ نہیں کہا گیا۔ بس روئے جاتی تھی۔ اور عدیل عبدالرحمن اس کی پشت تھپکنے کے سوا کچھ نہیں کہہ پا رہے تھے۔ وہ رات ہی آئے تھے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ صبح پاپا کا فون جاتے ہی انہوں نے چھٹی کی درخواست دے دی تھی۔ عموماً نوکری کے معاملے میں وہ بہت ذمہ دار تھے۔ اس لیے ایک ہفتے کی چھٹی آسانی سے مل گئی تھی۔ ہسپتال میں وزیٹ آورز نہیں تھے لیکن ڈاکٹر کی وجہ پر ... سیدھے ہسپتال ہی گئے تھے اپنی آنکھوں سے جب تک شہریار کو انہوں نے ... دیکھ نہیں لیا تھا تب تک سکون نصیب نہ تھا دل کو۔ تسلی ہونے پر انہوں نے اب گھر کی راہ لی تھی اور حسب توقع یہاں دانیا عبدالرحمن کو ان کی اموشنل سپورٹ کی ضرورت تھی۔

"اب بس بھی کرو دانیا! تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ وہ اب خیریت سے ہے۔ میں خود اسے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے اب پلیز! یہ رونا دھونا بند کرو۔"

وہ آنکھیں مسلتی ہوئی عدیل عبدالرحمن کے شانے سے الگ ہوئی۔ گلابی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ ہو گئی تھیں۔ عدیل بھائی کرسی پر بیٹھتے تھے پھر خود ہی لہجے میں بولے تھے۔

"شیری کی کماٹنے کے ساتھ اگر مجھے بھی اشتعال چلانے تو تمہیں پتہ ہے پاپا نے جب شہریار کے اوپر ذمہ داری کی اطلاع دی تھی تب بھی میں مر گئی تھی۔ دفتر جانے کا خیال ذہن سے نکل گیا تھا۔ پھر رابعہ نے پریشانی دیکھ کر کہا۔ آپ شیری سے خود بات کر لیں تاکہ آپ کی تسلی ہو جائے۔ سچ پوچھو تو اس سے بات کرنے کے باوجود دل کو تسلی نہیں ہوئی۔ دل کی ضد تھی اپنی آنکھوں سے جب تک نہ دیکھ لوں،

قرار نہیں پاؤں گا۔" دو دو میٹنگ تک چھٹی کی درخواست دے دی۔ دوسری شام کو سامان پیک کیا اور نکل کھڑا ہوا۔ یہاں پہنچا تو پھر شہریار کو فون کیا۔ کیونکہ اس وقت صرف وہی جاگتا ہوا ہوتا ہے۔ زخمی بازو کے باوجود مجھے یقین تھا وہ مجھے پک کرنے آجائے گا۔ مگر کتنی دیر تک کسی نے فون ریسیو نہیں کیا اور پھر ترنم آواز سنائی دی اور گھبرا دینے والی اطلاع۔ میرا تو یہ حال تھا کہ اگر شہریار ٹھیک حالت میں نہ ملتا تو دوسرا ہارٹ اٹیک ہو جانا لازمی تھا۔ خیر صاحب راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔ تو ناشتے کا سوال جواب لیے بغیر نہیں مانے گا۔ کل صبح کا کچھ کھایا ہوا ہے۔ صاحب پیٹ میں چوہے دوڑنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

دانیا ان کے ہلکے پھلکے انداز پر ہنسنے لگی۔ پھر ان کا خصوصی پسندیدہ ناشتہ بنانے کے لیے آٹا گوندھنے لگی۔ دانیا کے ہاتھ کے پراٹھے انہیں بہت مرغوب تھے۔ ایک چولہے پر چائے چڑھی ہوئی تھی اور دوسرے چولہے پر دوبارہ پراٹھا ڈال رہی تھی۔ رات کے رکھے ہوئے کبابوں کے ساتھ جب اس نے چند منٹ بعد [illegible] عدیل عبدالرحمن کے سامنے ٹیبل پر ناشتہ چنا تو عدیل عبدالرحمن کے چہرے کی مسکراہٹ بہت دلفریب تھی۔

"ٹھیک کہا، تم اتنی تیزی سے کام کرتی ہو۔ وگرنہ دو بجے دو گھر میں اس قسم کے ناشتے کا تصور بھی تو میرا ذہن بھی نہیں گیا تھا۔ بہت سست ہے وہ اسی لیے پراٹھے کا ناشتہ خواب ہو گیا۔ کبھی کبھی کہتی بھی ہیں محترمہ آپ کے لیے پراٹھے بناؤں؟ میں کہتا ہوں سوری میرے پاس فرصت نہیں۔ جب ریٹائر ہو گیا ہوں تب پراٹھے پکانا۔ تب وقت کی ناقدری ہو جائے گی۔ مجھے...... ویسے اس عمر میں وہ ایک پراٹھا کم از کم تین دن میں توے سے اتار لیا کرے گی؟"

دانیا ہنسنے لگی۔ پھر مسکرا کر بولی۔ "کیا یہ حساب کا کوئی سوال ہے کہ بار بار کی رفتار حاصل ضرب کر کے بتائی جائے؟"

نیا پراٹھا توے سے اتار کر اس نے عدیل کے سامنے رکھا اور عدیل عبدالرحمن ناشتے میں ایسے مگن کہ اس کا جواب دینا بھول گئے۔ کپ خالی ہو گیا تھا۔ دانیا چائے سے پھر کپ لبریز کر رہی تھی۔ عدیل عبدالرحمن کے کھانے کے دوران ایک وقفہ آیا تھا۔ وہ اسے کپ میں چائے انڈیلتا دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنا کام کر چکی تو بولے۔

"تم اتنی پیاری ہو گڑیا کہ بس..... میں نے تو ابھی سے کہہ دیا ہے لائبہ سے اپنی پھوپھو کی طرح بننا۔ ورنہ میری محبت نہیں پا سکو گی۔ لائبہ بھی ماں کی طرح مجھے لیزی ہے۔ پھر بھی بہت خیال رکھتی ہے ابھی سے۔ مجھے کبھی کبھی لگتا ہے تم دوبارہ چھوٹی ہو کر میرے گھر میں بھاگنے دوڑنے لگی ہو۔"

دانیا کچھ نہیں بولی۔ عدیل عبدالرحمن کے ریمارکس اسے اندر سے خوشی دیتے رہے۔ وہ سینڈوچ بنانے میں مگن تھی۔ عدیل عبدالرحمن ناشتہ کر چکے تو اس کی مدد کرنے لگے۔ کافی بنانے کی ذمہ داری انہوں

نے لے لی تھی۔ پھر وہ نماز پڑھ کر لوٹی تو تھی کہ کچن کے شیلف پر ہر چیز تیار تھی۔ اس کا خیال تھا وہ کچن میں نماز کے بعد لوازمات رکھے گی مگر عدیل عبدالرحمٰن یہ کام پہلے ہی کر چکے تھے۔ اسے بھائی پر بے اختیار پیار آ گیا تھا۔ کچن خالی تھا۔ گھر کا کک جو کوارٹرز میں رہتا تھا اب کچن میں آ چکا تھا۔

”آپ کے لئے ناشتہ بناؤں بی بی؟“ اس نے خیر سگالی دکھائی اور دانیا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”سوری، میں اس وقت ناشتہ نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ ایک ایک کر کے چیزیں اٹھا کر باسکٹ میں رکھنے لگی تھی۔ پھر باسکٹ اٹھانے والی تھی کہ عدیل بھائی شاور لے کر ڈریس اپ ہو کر خود کچن میں چلے آئے۔

”تم گاڑی میں بیٹھو، میں باسکٹ لا رہا ہوں۔“ وہ باسکٹ پکڑ کر کے پھر بولتے بولتے رکے۔ ”تم نے جازی کو نہیں اٹھایا؟ کیا وہ ہمارے ساتھ ہسپتال نہیں چلے گا؟“

دانیا نے نظریں چرا لیں۔ عدیل عبدالرحمٰن نے استفہامیہ دیکھا پھر قدرے حیرت سے بولے۔ ”پچھلے سال جب میں اس سے ملا تھا تو وہ کانوونٹ چھوڑنے کے لئے بہت پُر جوش تھا۔ اس کا خیال تھا وہ گھر کے معاملات سے بالکل الگ تھلگ کر دیا گیا ہے۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے، کیا نہیں، وہ جان نہیں پاتا۔ اس کی بات صرف اتنی ٹھیک ہے، جتنی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ وہ شہریار کی طرفداری کے خیال سے بھی کانوونٹ میں نہیں پڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے سنا تو دل کو تسلی ہوئی تھی کہ شیری کے لئے محبت کا راستہ بالکل ہی ناساز گار نہیں۔ مگر ابھی لگتا ہے تم کہہ دو گی کہ جازی شہریار سے ملنا نہیں چاہتا۔“

وہ جو کہنا چاہتی تھی، وہ اس کی نظر چرانے سے پہچان گئے تھے۔ دانیا کچھ دیر تو چپ رہی، پھر ہولے سے بولی۔ ”وہ دراصل جازی، جانے کیوں کچھ اپ سیٹ ہے۔“

عدیل عبدالرحمٰن کچھ نہیں بولے۔ دانیا نیچے چلی گئی۔ عدیل عبدالرحمٰن نے باسکٹ اٹھا لی تھی۔ پھر جانے سے پہلے انہوں نے ماما کے کمرے میں دستک دی تھی۔ تیسری دستک پر دروازہ کھلا۔ ماما سلیپنگ گاؤن پہنے متورم آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگیں۔ پھر شعور بیدار ہوا تو ان کے چہرے پر خفگی دکھائی دینے لگی۔ پھر گھبرائے لہجے میں بولیں۔

”آ گئے تم؟“ کچھ خاموشی کا وقفہ دیا، پھر وہ تیکھے پن سے بولیں۔ ”پچھلے سال میں نے کتنا کہا تھا تم سے کہ تم گھر آ جاؤ، دانیا کے سلسلے میں میری مدد کرو، میں فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن تم نے دفتری مجبوری کا بہانہ بنایا تھا اور آج گھر سے بھاگے بھاگے چلے آئے ہو۔ یعنی یہ سچ ہو گیا کہ تمہیں تمہارے بابا کی طرح شہریار زیادہ عزیز ہے۔“

عدیل عبدالرحمٰن نے خاموشی سے ماں کا شکوہ سنا۔ پھر گھبرائے لہجے میں بولے۔

”اگر وہ ایسا ہے کہ اس سے محبت کی جائے تو پھر کسی کو کیا اعتراض؟..... ویسے میں تو یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ ہم ہسپتال جا رہے ہیں، آپ ہمارے ساتھ جانا چاہیں گی؟“

ماما نے تیوری پہ بل ڈال کر انہیں دیکھا پھر مرجھائے لہجے میں بولیں۔

"پھر نہیں کیا جا سکتا ہے اس میں۔ تم سب ان کے حجرے میں قید ہو۔ مگر مجھے ایسا کوئی دورہ نہیں پڑا۔ میرے شیخ وہ پہلے دن سے مجبوری کے دائرے میں ہیں۔ اپنے بچوں کے لئے میں نے تمہارے پاپا کا ہر جائز حکم مانا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ ورنہ اگر مجھے فیصلے کا حق دیا جاتا تو میں اسے پہلی فرصت میں کسی چائلڈ ہوم میں داخل کروا دیتی۔" وہ تلخ لہجے میں پھر گویا ہوئیں۔ "وہ جیسا ہے ویسا نہیں۔ زندہ ہے یا نہیں۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اور میں چاہتی بھی نہیں ہوں کہ اس کے سلسلے میں کوئی مجھ پر دباؤ ڈالے۔"

عدیل عبدالرحمن نے سر ہلایا۔ کچھ کہے بغیر پشت موڑ کر زینے اترنے لگے۔ پارکنگ تک پہنچے تو وانیا کو اپنا منتظر پایا۔ یک لخت انہوں نے پچھلی سیٹ پر احتیاط سے رکھی۔ وانیا ان کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگاتی رہی۔ وہ فرنٹ ڈور کھول کر اس کے برابر آن بیٹھے۔ واچ مین گیٹ کھول چکا تو انہوں نے کار اسٹارٹ کی پھر وانیا کی طرف دیکھ کر بولے۔

"ڈونٹ وری۔ وہ بالکل ٹھیک ہو گا اور ہم پھر سب مل کر اس کی دل جوئی کریں گے تو آپ دیکھنا ٹھیک ہو جائے گا۔"

وانیا نے کوفت سے انہیں دیکھا پھر مدھم لہجے میں بولی۔ "آپ نے ماما سے ہسپتال چلنے کی بات کی تھی؟ انہوں نے کیا جواب دیا؟"

عدیل عبدالرحمن نے گہرا سانس کھینچا پھر بھرائے لہجے میں بولے۔ "ہمیشہ کی طرح ان کے انداز میں سرد مہری کے سوا کچھ نہیں تھا پاپا میں نے۔ پتہ نہیں وہ ماں ہو کر اپنے ایک بچے سے انکاری کیسے ہو سکتی ہیں۔"

"وہ شیری بھائی کو اپنی اولاد سمجھتی ہی نہیں ہیں۔" وانیا نے بے بسی سے کہا۔

عدیل عبدالرحمن نے تیز نظروں سے اسے دیکھا پھر غصے سے بولے۔ "مجھے یہی تو سمجھ نہیں آتا کہ اگر ماما کو اس سے اتنی ہی نفرت تھی تو اسے اپنی کوکھ میں اٹھایا ہی کیوں؟ اور اگر مشرقی مجبور بیوی کی طرح انہوں نے یہ ذمہ داری لے ہی لی تھی تو اسے نبھا کیوں نہیں رہیں؟" وہ لمحہ بھر رک کے پھر تیز لہجے میں بولے۔ "یہ سراسر ان کی کارستانی ہے۔ انہیں گھریلو سیاست کا بہت شوق ہے۔ بس فارغ وقت میں کچھ بھی کر کے خود کو مصروف رکھنا۔ پھر چاہے وہ کسی کی زندگی ہی سے کھیلا جا رہا ہو انہیں اس سے کوئی مطلب نہیں۔"

وانیا نے کچھ نہیں کہا لیکن ان کے ایک ایک لفظ سے متفق تھی۔

پھر تیس منٹ بعد وہ ٹھیک ساڑھے سات بجے ہسپتال کے پارکنگ لاٹ میں داخل ہو رہے تھے۔ وانیا نے عاطف بیگ کی آمد سے عدیل عبدالرحمن کو آگاہ کر دیا تھا۔ دراصل وہ عدیل عبدالرحمن کے

ہسپتال سے لوٹ جانے کے بعد آیا تھا اس لئے ان کے لئے یہ خبر خوشگوار تھی۔

نافث بیگ۔ انہیں ہسپتال کی لابی ہی میں مل گیا تھا۔ عدیل عبدالرحمن کو دیکھ کر اس نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا تھا۔ عدیل عبدالرحمن اسے دیکھ کر بے ساختہ بولے تھے۔ "اب مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ شہریار کی اچھی یاری تم سے ہے، تمہیں دیکھ کر وہ دوگنی ہو گئی ہوگی۔ مارفی سے میں دوستوں کی خاطر یہ جا سکتا کام کافی ہے۔"

نافث نے مسکراہٹ سے عدیل بھائی کو دیکھا، پھر ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "شاید اس بار ایسا کچھ ہونے کی امید نہیں ہے۔ عجیب کھلنڈرا سا ہو گیا ہے۔ کسی بات کا ڈھنگ سے جواب ہی نہیں دیتا۔ بات اس سے کرو تو لگتا ہے میں کسی سے بول رہا ہوں۔ مرمزاجی انتہا کی مجبوری ہے۔ عدیل بھائی! جب میں کہتا تھا تب تو شہریار بھی قائل قبول تھا۔ اب تو ایسا کچھ ورلڈ کپ ہو گیا ہے کہ ہاں ہاں ہاں۔" وہ اب کہہ رہا تھا وہ اس سے پیچھے تھے۔ کمرے سے ڈاکٹر عارف نکل رہے تھے۔ نافث کو دیکھا تو مسکراتے ہوئے بولے۔

"مسٹر نافث! اچھا ہوا آپ آ گئے۔ مسٹر شہریار اس وقت بھاگ بیٹھے ہیں اور سب معمول کے مطابق کام پر غصہ کر رہے ہیں۔ ویسے کل آپ نے اچھا نہیں کیا تھا۔ آپ کا ایک دم سے فیڈ آؤٹ ہونا ان جیسے جذبات کے لئے بالکل صحت ہے۔ میرا خیال ہے اب آپ احتیاط کریں۔"

نافث نے اثبات میں سر ہلایا۔ عدیل عبدالرحمن ڈاکٹر عارف سے صورت حال پوچھنے لگے تھے۔ پہلے کے مقابلے میں کنڈیشن اطمینان بخش تھی۔ وہ دروازہ ناک کئے بغیر داخل ہوئے تھے۔ شہریار آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ زخمی نیلی سوجی آنکھیں بیک اپ پٹی اس کے وجود میں اتری ہوئی تھیں۔

"شہری بھائی! دیکھئے تو میں کس کے ساتھ آئی ہوں۔" نادیہ نے خوشگوار لہجہ اختیار کیا۔ شہریار نے اس کی آواز پر ایک دم سے آنکھیں کھول دیں۔ عدیل عبدالرحمن پر نظر پڑی۔ لگا کہیں دور ہی میں بیٹھے ہوئے کسی شخص نے سر اٹھایا ہے۔ جس کا چہرہ بجھا بجھا اور رنگ پیلا پڑ گیا ہے۔

"ارے آپ کو کیوں تکلیف کی۔"

عدیل عبدالرحمن مسکراتے ہوئے بیٹھ گئے۔ کچھ نہیں بولے۔ خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ دونوں کی نظروں سے جان پڑ رہا تھا۔ تم کب تک؟ ... اللہ نظریں چار ہوئیں اور عدیل عبدالرحمن کا شفقت بھرا لہجہ ابھرا۔

"بہت بُرا ہوا۔ مجھے تم سے ایسی کسی جذباتی حماقت کی توقع نہیں تھی۔ تم جیسے خوبرو جوان مسز کی نذر ہو، یہ تو زندگی کا المیہ ہے۔ ہاں بار بار زندگی ابھی اتنی بھی بے قدر نہیں ہے۔ ہاں تم ضرور کچھ

AANCHAL.COM.PK

فضول۔ مگر بہر حال زندگی میں ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ گزارا کرنا پڑتا ہے۔“
پہلی بار شہریار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھری۔ وہ جانتا تھا بلکہ اُن کے لئے ذہن کے سوا کچھ نہیں۔ ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ گزارا کرنے کا مشورہ اس لئے تھا کہ وہ کسی بھی بات کو جان پاتے کیسے۔
”سوات“ کی خوش رنگ نے اندر سے جیتے۔ وہ جانتا تھا۔ یہ سب کچھ بہت آسان ہے اگر انسان تھوڑا سا بے حس، تھوڑا سا جلنٹس ہو۔ لیکن اندر سے ملی زندہ دوہ ہر لفظ سمجھتا۔ کیا وہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔
کوئی بھی بات اگر زبردستی ہی تھی۔ اور خبر کل کی بات.....
اُس نے سنبھالا لے کر آنکھیں رگڑیں۔ دادا ابا اب بھی چپ ہی تھا۔
عاطف بیگ اُس کا ہیڈ شیلف آگے سرکا کر باسکٹ میں سے کارن فلیکس نکال رہا تھا۔
اچانک ہی اُس نے جلدی جلدی بڑھا دیا تھا۔ دادا ابا اور سبھی سے گریز کرتے ہوئے اُس نے بابا جی کے اشارے سے منع کر دیا تھا۔
”میرا دل نہیں چاہ رہا اس وقت۔ تھوڑی دیر بعد دیکھوں گا۔“
عدیل بھائی نے دادا کے چہرے کی طرف دیکھتے ہی فوراً بولے۔
”بڑی بات ہے شہری! تم نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ صبح ناشتہ کیا۔ مجھے دیکھنے کے باوجود تم نے ایک لقمہ بھی نہیں توڑا تھا۔ میں جانتا ہوں دادا کو بچپن سے تمہارے ساتھ کھانا اچھا لگتا ہے۔
اب اگر وہ مر جائے تم کو کیا فرق پڑتا ہے تو اور بات ہے۔“
شہریار نے ٹوٹی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ غصے کی گہری تہہ اب بھی اس کی آنکھوں سے مٹی نہیں تھی۔ پچھلی ساری رات اس سے روٹھ جانے کی کوشش کی دادا نے کیوں ہاتھ جھٹکا؟..... یہ سوال بار بار دل سے یوں
نکل رہا تھا کہ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔
”آئی ایم سوری..... کل میں بہت تھک گئی تھی، اس لئے یہاں سے جاتے ہی سو گئی تھی۔“ اس نے کان پکڑ کر ایک بے غرض سا مجھے دادا ابو نے مجھے پن سے اسے دیکھ کر کہا مجرم تم ہو کر رہا۔
”تمہیں پتہ ہے؟ آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلے میں نے موبائل پر تمہاری مسڈ کالز دیکھی تھیں۔ ساری رات تم میری کال کرتا رہا۔ تمہیں جانے کا تو کہہ دیا تھا مگر ہسپتال میں اکیلے لیٹے رہنا بہت بورنگ ہے

تمہیں ہی میں سوچ رہا تھا کہ میں سوچتا اور زندگی ہی نہ رکا تو؟ خاموشی کی دہشت زندگانی کی موت اچھی نہیں ہوتی ہے دشمن کو بھی اچانک ملنے نے چاہا تھا وہاں تمہیں ہونا چاہیے تھا اگر جاتے وقت ایک تلخ احساس نہ رہے کہ تمام ناپسندیدگی کے باوجود کوئی ہر سے لئے رو سکتا ہے۔“

”فضول مت بولیں پاپا..... کچھ نہیں ہو رہا آپ کو۔ معمولی سی پرابلم ہے احتیاطاً کر لیں گے۔“ وہ مسکرائیں لیکن آنکھیں نم ہو گئیں۔

وہ ان کی باتوں سے ہی رو دیتی تھی۔ عدیل بھائی نے بغور شرفین سے دیکھا۔ عاطف بیگ نے بال ہی کھینچ لئے۔ شہریار کی چیخ نکل گئی تو جتانے کو بولا۔

”شہروز نے بکواس ہے تو بس یونہی شور کرتا ہے کہ سب سے تنگ ہے۔ ایوان نے جب بھی دیکھا ہے۔ ذرا سا بھی محبت کو مسلا تھی شہریار.....“

اس نے کچھ نہیں کہا۔ پاپا کے اسپون پر منہ کھول دیا۔ کاران خلیک مزے کا تھا لیکن وہ دو ہی اسپون کھا سکا تھا کہ ڈاکٹر ہمدانی کمرے میں داخل ہوتے چلے گئے۔ ڈاکٹر ہمدانی .... اور جیسی نکل گئی۔ انہوں نے ماہرانہ ہاتھ سے کاران خلیک ڈسمسٹ لیا اور پھر تیزی سے بولے۔

”بے وقوف لڑکی! کاران خلیک کھلا کر مارنا ہے بھائی کو؟ شوگر تو پہلے ہی ان کا کولیسٹرول لیول بہت ہائی ہے۔“

انابیہ نے کرنٹ لگنے کی رفتار سے پیالہ پیچھے کر لیا اور بے بسی سے مسکرانے لگی۔

شہریار نے حالت تشویش ناک دیکھتے ہوئے بولا۔ ”شاباش! آپ بھی ان..... بس تمہاری کمی تھی اب کے سوا کچھ نہیں کہ......“

انابیہ نے ڈاکٹر ہمدانی کو دیکھا، بغور مسکرائی۔ ”آپ بھائی تو ٹھیک ہو جائیں گے؟“

”ایسے ہی کریں گے جیسا بھی کہہ رہے ہیں مگر بتا دو کہ ہماری اسٹائل کی ضرورت نہیں لیکن بے آرام سے زندگی شروع کر سکتا ہے۔“ تحمل سے مسکرا کے پھر گویا ہوئے۔ ”خیر! آج بھی گھر سے منگوا لیا ہے سادہ دلیہ۔ تمہاری آنٹی کچن کے ٹوپ میں سادہ دلیہ بہت اچھا پکاتی ہیں۔“

انابیہ نے سکون کا سانس لیا مگر شہریار دوبارہ نظر آنے لگا تھا۔ ”انکل! پاپا کو کب تک ہسپتال رہنے کا سین کرنا پڑے گا؟“

ڈاکٹر ہمدانی اس کی ذرا سی پریشانی پر ہنستے ہوئے بغور بولے۔ ”تمہارے پاپا کا دل پر انحصار ہے۔ ابھی جانے دو تو... بھی تمہیں بتا دوں گا۔“

AANCHAL.COM.PK

"ٹھیک ہے پھر میں شام تک آپ کے کہنے پہ عمل کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر شاہ صمدانی نے جواب دینے کے بجائے نرس کو اس کی ڈریس میں پہلے سے موجود دوا کی مقدار بڑھانے کا حکم جاری کیا۔

"شہریار ٹھیک ہے لیکن ڈیڈ! دل پہ بوجھ بہت زیادہ ہے۔ تم سمجھ لو بارود کے ڈھیر پہ بیٹھے ہو۔ اسموکنگ کی عادت سے خون میں الجھاؤ کا سبب بن بھی بڑھ جاتا ہے۔ تم دوہرے طریقے سے خطرے کے نشان کو چھو رہے ہو۔ تمہارے بابا ہسپتال آ جائیں تو میں تمہاری انجیوگرافی ضرور کرنا چاہوں گا۔ دیکھوں تو رکاوٹ کتنی ہے اور کہاں ہے۔"

شہریار نے غصے سے انہیں دیکھا اور گھبرائے لہجے میں بولا۔ "بس کریں انکل! اب میں یہ بیماری نامہ نہیں سننا چاہتا۔ بہت بُرا ہوں پہلے سے انجیوگرافی زندگی میں کبھی ہو جائے گی۔ ویسے میرا خیال ہے ایسا معاملہ اتنا بڑا نہیں ہوگا۔"

وہ جان کر بات ختم کرنا چاہتا تھا کیونکہ دادا جان زور و شور سے رونے پہ کمر باندھ چکی تھیں۔ عدیل بھائی اور عاطف بیگ کے چہروں پہ بھی مسکراہٹ تھی اور وہ بڑے قائل تھے کہ اپنی ذات سے کسی قسم کی تکلیف کسی کو دینا کوئی اچھی بات نہیں۔"

"کیا معاملہ سیریس ہے انکل؟" عدیل عبدالرحمن گھبرا کر دوسرے سے رپورٹس پڑھنے لگے تھے اور ان کے چہرے کا رنگ بدلا تھا، شہریار بہانے سے بولا۔

"سب کے سب ہمارے گھر میں ٹینشن ختم ہی نہیں ہوتی۔ بات ذرا سی بھی ہو بیمار تو خیر ہو ہی جاتا ہے۔ تم بے فکر رہو۔ میں کل اپنی امی کو سمجھا دوں گا اور انہیں پتہ نہیں چلنے دوں گا۔ بہت خوش ہوں۔" نانا کے چہرے سے پہلے کے تاثرات زائل ہو سکے۔ تب ہی وہ پڑ گیا۔

"اب بس بھی کریں ماں۔ کیا واقعی یہ جتانا ضروری ہے کہ آپ کتنے خطرناک موڑ پہ کھڑے ہیں۔ زندگی موڑ در موڑ راستہ ہی تو ہے۔ پھر کیا لگتا ہے اگر اس موڑ کا کوئی رخ مجھے تم سے زندگی سے دور لے جائے؟ زندگی سے کبھی زیادہ موت میں سہولت ہے۔ انسان کو جو تکلیف ملتی ہے وہ ایک بار ملتی ہے۔"

نانا بابا سکتے میں چپ بیٹھے کر رکھے گئی تھی۔ عاطف بیگ کھانا کھا چکا تھا۔ نانا نے صرف ایک کپ کافی ہی پی تھی۔ عدیل عبدالرحمن، مسز شاہ صمدانی سے الگ ہو کر بیٹھے مشورے لے رہے تھے۔ عاطف بیگ بھی عدیل بھائی کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر گھبرا رہے تھے کہ وجود کی احساس کر کے اور دی۔ بابا ان کے چہرے پہ سب ہی نے چال رہنے تھے۔

AANCHAL.COM.PK

شہریار کچھ دیر برداشت کرتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔ "کل حمزہ آیا تھا گھر؟"

مانا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ شہریار کو کیسے پتہ چلا؟ کیا ان پر الہام بھی اترتے ہیں؟

شہریار عبدالرحمن نے اس کی قیاس آرائی سے حظ لیا، پھر مسکرا کر نیچے بتانے لگے۔ "کل اماں کا فون آیا تھا۔ بالکل ٹھیک، بہت پریشان تھیں۔ باتوں باتوں میں حمزہ کا ذکر بھی نکل آیا۔" کچھ لمحے رک کر، پھر آہستگی سے بولے۔ "کل میرا فون بار بار بزی کیوں مل رہا تھا؟ تمہیں انصاف کرنے اور محبت نبھانے میں جو الجھن تم سے ہو رہی تھی، میں ان کے سلوشن کے لیے تمہیں کال کر رہا تھا۔"

مانا نے بے ساختہ اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ شہریار کچھ کہہ بھی نہیں پائی [illegible] کر بولا۔

"تم بھول جاؤ میں تم سے اپنی زندگی سے کیا چاہتا ہوں۔ تم بس یہ یاد رکھو، وہ تمہارے جینے میں کیا ہے تم آج ہو [illegible] کی عزت، باقی سب کی طرح مجھے اگنور کرنا چاہتی ہو تو بیچ میں سے [illegible] سمجھو مجھے تم سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں۔ یہ ساری محبت کی بات ہے، آپ کو جو ہر [illegible] تکلیف میں [illegible] برداشت کر ہی نہیں سکتے۔"

مانا دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر سر جھکا گئی۔ اس نے ہولے سے کہا۔

"آپ ناراض تو نہیں ہو گئے مجھ سے؟"

مانا نے سر اٹھایا اور پلکوں پر ٹھہرے آنسو رخساروں پر بہہ گئے۔ دل کی گرہ کھل گئی [illegible] تمام رات جو [illegible] ناراضگی خسارے کے باوجود۔ کسی بھی طرح اچھے پیارے بھائی کو کھونا نہیں چاہے گی۔

"ماما نے واقعی تمہیں بہت پہنچی تھی؟" اس نے آنسو دوپٹے سے پونچھ کر سوال کیا۔ اس نے اپنا موبائل اس کی طرف بڑھایا۔ ماما کی پوری کال ٹیپ تھی۔

جتنے بھی سوال ہو سکتے تھے وہ ماما نے فون پر اس مختصر کال میں دے دیے تھے۔ وہ سچی تھیں۔ مانا کی نظروں میں سب سے بڑی رکاوٹ شہریار ہی ہے۔ ماما نے جان کے معاملے کو بھی نپٹا لیا تھا۔

سارے [illegible] اس کے حصے میں آئے تھے۔

مانا سے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا اس لیے اس نے بیچ میں سے موبائل آف کر دیا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا ایسا کچھ ہے۔ میں ماما کی کسی بات سے متفق نہیں ہوں۔"

اس نے معلوم نہیں دل کو سمجھانے کے لئے یہ جملے کہے تھے یا شہریار کو دل سپورٹ دینے کے لئے...... بس پتا کون کے بعد ماما یا ڈاکٹر صدانی کے گھر سے آئے دلیے کو جو نے پیالے میں ڈال رہی تھی۔ ماما کے لئے بھی سینڈوچ آئے تھے۔ شہریار نے ہاتھ کے اشارے سے اسے ناشتہ کرنے کی نشست کی۔ وہ جھک کر دونے کے باوجود سینڈوچ کھانے لگی تھی۔ یہاں تک کہ پاپا کے آنے کے بعد شہریار کے لئے حالات پہلے سے زیادہ ناسازگار ہو گئے تھے۔

"پلیز پاپا! میں کسی کیمو تھراپی کے حق میں نہیں ہوں۔ میں جیسا ہوں ویسا ٹھیک ہوں۔" اس نے حتمی اور چٹخ سے کہا۔

پاپا کے چہرے سے بے بسی چھا گئی۔ عبدالرحمن، ماما اور ماما مجھر کسی قسم کی بات نہیں کر سکے۔ یہاں تک کہ دو دن کے لئے ارل چیک اپ کے لئے ایک بار وہ گئے تو ڈاکٹر صدانی نے سرد سے لہجے میں پوچھا۔

"اس بیماری کی طرف مجھے لگتا ہے تمہیں ابھی معلوم ہے نقصان کتنا اور کہاں ہے۔"

اس کلینک بیڈ پر بیٹھو کو جھوڑنے لگا تھا۔ ڈاکٹر صدانی نے لاؤڈ اور [illegible] اس کے سامنے کہا۔

"تمہیں شاید کنسلٹنسی میں اس کی ضرورت خصوصی بہتری ہے۔"

اس نے ان سے نظریں چراتے ہوئے بکھرے لہجے میں بولا۔ "آپ جانتے ہیں سب کچھ پھر کیوں بے مصرف محنت کرنا چاہتے ہیں؟ پلیز! دنیا میں مجھ سے کہیں زیادہ بے لوث بکھرے پڑے ہیں، جن کی زندگی کی کنٹرول جانی چاہیے، جنہیں واقعی زندہ رہنے کی حسرت ہے اور واقعی انہیں ان سے محبت کرنے والوں کے لئے زندہ رہنا چاہیے۔"

اس نے ڈاکٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ ڈاکٹر صدانی نے [illegible] سے اشارہ کیا تھا۔ پھر وہ شفقت سے بولے تھے۔ "مجھے نہیں معلوم غلطی کہاں ہے۔ لیکن غلط ہے جو تم کر رہے ہو۔ زندگی کو تم ان ناموافق حالات سے ایک دم کیوں ختم کرنا چاہتے ہو۔ کیوں کہ جانے کی کوشش کر رہے ہو۔ لیکن تمہارے اندر ابھی امید کی چنگاری باقی ہے۔ تم مسلمان ہو نا! اور مسلمان کبھی مایوس نہیں ہوتے۔"

شہریار نے کچھ نہیں کہا۔ سر جھکائے پڑتال کر رہا تھا۔ مشورے سے نظریں ہٹا گیا۔ چیک اپ کے بعد پاپا نے کیمو تھراپی کا کہا۔ پھر ڈاکٹر صدانی بولے۔

ANCHAL.COM

"بہتر کوشش کریں گے۔ رزلٹ سامنے آنے تک ٹینشن بہت بہتر ہے اگر تعاون کرتا رہا شہریار تو چند روز میں تیار ہو جائے گا۔"
شہریار نے سکون کا سانس لیا تھا۔

❁❁❁

عدیل عبدالرحمن اس وقت عاطف بیگ کے ساتھ باہر کوریڈور میں بیٹھے رات کو شہریار کے ساتھ ہونے والی گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک ان کی آنکھوں میں شناسائی جھلکی۔
"وہ عاطف! اگر میں ٹھیک پہچان رہا ہوں تو یہ جا رہی ہے ناں؟" آسمانی بلیو جارجٹ کی ساڑھی پہنے وہ فریحہ بیگ جمالی ہی تھی جو پاس سے گزرتی عاطف بیگ کی نظر سے گزری وہ آگے نکلتی چلی گئی تھی۔
"کیا وہ شہریار سے ملنے آئی ہے؟" عدیل بھائی نے دوسرا سوال کیا اور عاطف کی زبان سے اگلا سوال ابھرا۔
"کیا اسے معلوم ہے شہریار بیمار ہے اور اس ہسپتال میں ہے؟"
"شاید...... وہ جتنی بے باک... یقیناً ہے میرے خیال میں اس کے لیے یہ ناممکن نہیں ہے۔"
"چلئے تو پھر کریں۔ کہیں وہ بیمار سے ہیرو کو پھر کسی عذاب و پریشانی میں لے جا کر کھڑا کر دے۔" اس کا اشارہ فریحہ کی طبیعت کی ذہانت کی طرف تھا۔ عدیل بھائی تیزی سے اٹھے تھے جبکہ ابھی وہ پارک سے نکلے بھی نہیں تھے کہ رک گئے۔ "یہ ما اور ہسپتال میں...... ہیریٹیج!"
"ہم... وہ شہریار کو دیکھنے آئے ہیں تو میں مر کر بھی یقین نہیں کر سکتا۔ ویسے اپنی اس رائے پر مجھے افسوس ہے۔" عاطف نے کہا اور عدیل عبدالرحمن کے سنجیدہ چہرے کو دیکھا۔ بہر حال وہ ان کا بھائی تھا۔ اس کی رائے کا وہ ابھی احترام کر سکتے تھے مگر تسلی ہوئی جب انہوں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
"تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں کہاں تک... اعتماد کی بات نہیں۔ جہاں تک میرا خیال جاتا ہے وہ یہاں جانے کے پیچھے آیا ہے تم نے دیکھا نہیں وہ شک میں پانچ منٹ کے وقفے سے زیادہ نہیں تھی۔"
عاطف کی یہ بات غلط بھی نہیں تھی۔ پھر اندازہ عدیل عبدالرحمن جیسے زیرک ذہین بندے نے لگایا تھا جس میں غلطی کا خدشہ کم سے کم ہی رہتا۔
وہ دونوں بہت خاموشی سے... عدیل عبدالرحمن کو نظر میں رکھے ہوئے چل رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ کوریڈور کے کمرہ نمبر 17 پر جا کر ٹھہر گئے۔

"یہاں کون ہے جس کے لئے سالار بھائی اتنی سکیورٹی کا مظاہرہ کر رہے ہیں؟" عاطف نے متفکرانہ نظروں سے عدیل بھائی کی طرف دیکھا جنہوں نے کندھے اچکائے، پھر آنکھ کے اشارے سے عاطف بیگ کو اپنے پیچھے آنے کو کہا، وہ ہسپتال کے استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ آج اسٹاف الگ تھا۔

"آپ کا اسم گرامی؟" عاطف بیگ نے ازلی جملوں کی ادائیگی کی۔

مترنم مسکراہٹ کے ساتھ کہا گیا۔ "مجھے عامرہ فیروز کہتے ہیں۔ جی فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

عاطف بیگ نے ہاتھ کے اشارے سے عدیل کو کام کا سوال کرنے کے لئے اشارہ کیا، ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے اپنا کارڈ نکال کر سامنے رکھا، عامرہ فیروز نرم لہجے میں بولے۔ "مجھے امید ہے، جو سوالات میں آپ سے کرنے جا رہا ہوں، وہ آپ انتہائی سیکرٹ رکھیں گی؟"

"کوشش کروں گی سر! اگر بات میرے اختیار کی ہوئی تو ضرور تعاون کروں گی، سوال اگر انتظامیہ سے منسلک ہوا تو ہم بغیر جواب دینے کے مجاز ہیں۔"

لڑکی ذہین تھی، خاموش طبع بھی تھی، ایسے لوگ جو کم بولتے ہیں اور زیادہ سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور جو زیادہ سنتے ہیں، زیادہ معلومات بھی انہی کے پاس ہوتی ہیں۔ اس لئے عامرہ فیروز ایک بالکل ٹھیک آپشن تھی۔

"کمرہ نمبر 3 کے متعلق آپ کے پاس بتانے جیسا کچھ ہے؟"

عامرہ فیروز نے سامنے رکھا رجسٹر کھولا، کچھ دیکھا پھر بولیں۔ "کمرہ نمبر 3 ہمارے ہسپتال کے وی آئی پی روم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں زیادہ تر وی آئی پیز آرام کرنے کی غرض سے قیام کرتے ہیں۔ یہاں وہ ٹوٹل بالکل پرائیویٹ ہیں کہ کسی بھی طرح کوئی رابطے کا ذریعہ مشغول نہیں کرنا چاہتے۔ جو مہمان یہاں ٹھہرتے ہیں، ان کی مکمل معلومات ہماری اعلیٰ انتظامیہ کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہوتی۔"

عدیل عبدالرحمٰن نے ترچھی نظروں سے عاطف کو دیکھا پھر پلٹ کر بولے۔ "کیا ابھی بہت بزی ہو گیا ہے ادارہ؟ گیسٹ ہاؤسز کے علاوہ اب وی آئی پیز ہسپتال میں بھی قیام کرتے ہیں۔"

عاطف بیگ کچھ نہیں بولا، عدیل عبدالرحمٰن دوبارہ سے مخاطب ہو کر بولے۔ "آپ کی یہاں انتظامیہ کن لوگوں پر مشتمل ہے؟"

"آپ ڈاکٹر نذر کے کمرے میں جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں مسز اکرام ہی آپ کو بہتر گائیڈ کر سکیں گے۔ گراؤنڈ فلور روم نمبر دس۔"

عدیل عبدالرحمن مڑ کر لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔ کچھ دیر بعد وہ ڈاکٹر نور کے کمرے کے سامنے کھڑے تھے۔ دستک دی گئی۔

"کم ان" کی آواز سنائی دی تو دونوں اندر بڑھتے چلے گئے۔

فائلوں سے سر اٹھاتے ڈاکٹر نور نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نظر پڑتے ہی چہرے پر شناسائی کی جھلک ابھری۔ رسمی خیر و عافیت کی جانے لگی۔ عدیل عبدالرحمن نے سہولت سے بات ٹال دی۔ پھر فوراً اپنے مختصر سوال پر آ گئے۔

"کیا آپ اپنے روم نمبر 17 کے وی آئی پی پیشنٹ کی بابت کچھ معلومات شیئر کر سکتے ہیں؟"

"سوری سر! یہ ہمارے اصولوں کے خلاف ہے۔ ویسے یہ روم نمبر 17 میں ایسی کیا خاص بات ہے؟ ایک دو دن پہلے بھی ایک صاحب اس روم کی بابت پوچھ رہے تھے۔"

عدیل عبدالرحمن جان گئے تھے۔ وہ کوئی اور کون ہو سکتا تھا؟ یقیناً سالار عبدالرحمن ہی کا اشارہ تھا کہ اس روم میں کون تھا؟

"وی آئی پی روم کی ڈیمانڈ کیا صرف کی گئی ہے؟" انہوں نے اگلا سوال داغ دیا۔

ڈاکٹر نور نے تولنے والی نظروں سے انہیں دیکھا۔ پھر بولے۔ "سیدھی سی بات ہے۔ وی آئی پی پیشنٹ کسی نہ کسی کے ریفرنس پر ہی ایڈمٹ کرتے ہیں۔ سو جس ان کی شخصیت پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ جانے والے لوگ جب دنیا کی مصروفیت سے تنگ آ جاتے ہیں تو پھر وہ چاہتے ہیں انہیں پرائیویسی میں رکھا جائے جو ان کی سیکیورٹی کے ساتھ ساتھ ہو۔"

"یعنی آپ ہسپتال میں پانچ ستارہ ہوٹل جیسی سہولت دیا کرتے ہیں۔ کیا یہ غیر قانونی نہیں؟ کیا کسی ہسپتال میں ایسی کوئی گنجائش نکالی جا سکتی ہے؟"

ڈاکٹر نور کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ پھر وہ دھیمے لہجے میں بولے۔ "مجھے یہاں بیٹھے ہوئے کئی برس ہو گئے ہیں۔ آپ کی بات غلط نہیں ہے۔ لیکن بہرحال گنجائش تو نکالی جا سکتی ہے۔ اگر کبھی آپ کو ایڈمٹ کرنے کا پروگرام ہو تو ہم آپ کو بھی ایسی ہی سہولتیں دیں گے۔ لیکن اگر آپ کسی قسم کی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ کو مایوسی ہو گی۔"

عدیل عبدالرحمن جانتے تھے گنجائش کہاں کہاں اور کیسے کیسے نکالی جاتی ہے۔ سو انہوں نے سوال بدل کر بے ساختہ پوچھا۔ "روم نمبر 17 میں مس جانا کے کوئی رشتے دار ہوتے ہیں؟"

ڈاکٹر نور کے چہرے پر ایک سایہ سا گزر گیا مگر پھر بھی انہوں نے سنبھال لیا۔

"آپ کس جانا کی بات کر رہے ہیں؟ میں تو اس نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔"

عاطف بیگ نے پوری ہوکر عمر یل عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا تو وہ اختتامی جملے ادا کرتے اٹھ گئے۔ کمرے سے باہر نکلے تو انہوں نے عاطف کو دیکھا پھر بے چارگی سے بولے۔ "اگر معاملہ کچھ نوعیت کا ہوتا تو اب تک میں سرچ وارنٹ لا چکا ہوتا۔"

"سرچ وارنٹ؟" عاطف بیگ ہنسے پھر شرارت سے بولا۔ "آپ کا کوئی بھی حق نہیں بنتا گا ہوا نہیں ہے جو سرچ وارنٹ کا راگ چلنے لگا اور پھر یہ پرائیویٹ ہسپتال میرے خیال میں اپر کلاس میں آتا نہیں ہے کہ اگر کوئی کارروائی کی تو پولیس کے شکنجے میں آ جائے گی۔ آپ کو نہیں معلوم لیکن ایک دفعہ علامہ نے اس پرائیویٹ ہسپتال کے ان دو نئی پیزروں کی داستان کو ہلکا سا چھیڑا تھا۔"

"پھر؟" عمر یل عبدالرحمٰن نے دلچسپی سے دیکھا۔

عاطف بیگ نے چلتے چلتے مدھم ہو کر کہا۔ "پھر کیا، اوپر نیچے بھونچال آ گیا تھا۔ ہسپتال والے مرجانے کا دعویٰ کرنے کی بات کی تھی۔ علامہ نے دوسرے دن پھر ایسے تار چھیڑ دیئے کہ دوسرے دن غائب اور علامہ کا کالم پھر چھپا نہیں...... دراصل وہ اپنے بات اشوز پہلے ہوم ورک مکمل کر لیتا ہے۔ پھر جاتے کے لئے تار چھیڑنے کے لئے کالم میں ایک دو جملے ہوتا ہے۔ سمجھنے والے سمجھ جاتے ہیں ہوم ورک کتنا مکمل ہے یا نامکمل...... بات کرنے کا خدشہ ہوتے بیک ڈور ڈیل طے پا جاتی ہے اور علامہ خوش اس کے قلم کا ہدف بننے والا بھی خوش۔ کیا سمجھے؟"

"اچھا علامہ آج کل اس قسم کی صحافت کرنے لگا ہے۔ پانچ سال پہلے میرے خیال میں وہ بہت آدرش پسند ہوا کرتا تھا۔"

"ہاں ایسا تھا۔ لیکن جب سے اس کی ٹی وی اینکر سے لگی ہوئی ہے تب سے وہ صحافت کا طریقہ، زندگی گزارنے کا طریقہ، محبت نفرت کا فلسفہ سب بھول چکا ہے۔"

عمر یل عبدالرحمٰن افسوس سے اسے دیکھتے رہے، پھر مدھم ہو کر بولے۔ "تم نے اس سے رابطہ کیوں ختم رکھا؟ میں نے سنا ہے دوست اگر ساتھ ہوں تو انسان بڑے سے بڑے حادثے سے گزر جاتا ہے اور اس کی ہمت ٹوٹی نہیں ہوتی۔"

عاطف بیگ نے ایک نظر انہیں دیکھا، پھر صاف سے بولا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بھیا! لیکن اگر دوست یہ سمجھنے لگے کہ جو دکان نے جگا ہے وہ اس کے دوستوں کا دیا گیا تحفہ ہے تو؟"

"دراصل پہلے اس کی سوچیں مختلف تھیں مگر جب سے اس نے "ہاؤس آف پیٹی" جوائن کیا ہے، تب سے اس کی سوچ یکسر بدل گئی۔ یوسف صاحب کی سیاست بازی میں وہ ہر پروہ ساتھ دیتا ہے اور آپ جانتے ہیں مسٹر یوسف کس قدر جذباتی انسان ہیں۔ "مارو یا مر جاؤ" اس کے علاوہ انہوں نے کبھی تیسرا راستہ نہیں اختیار کیا۔ سو علامہ بھی اب ویسا ہی ہو گیا ہے۔ اب وہ ہر دولت مند شخص کو پیچھے رکھ کا سبب

سمجھتا ہے۔ ان کے خلاف لکھ کر بھی اس کے اندر کی بھڑاس نہیں نکلتی ہے۔ پھر بھلا وہ مجھ سے یا شہریار سے کیوں رابطہ رکھے گا؟" مدلل جواب دے کر اس نے عدیل بھائی کو دیکھا تو وہ مسکرانے لگے پھر مدھم سا ہو کر بولے۔

"مجھے ایسے ہر انسان سے ہمدردی ہے، جو انسان سے انسان کا تعلق محض کرامات کے بل پر کسی کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ کرتا ہے۔ پانچوں انگلیاں کب برابر ہوتی ہیں؟"

عاطف بیگ نے سر ہلا کر تائید کی۔

"میں تو متفق ہے جو لوگ نہیں سمجھتے۔ نہ بہت زیادہ دولت کسی کی برائی کا پیمانہ ہے نہ بہت غربت کسی کی اچھائی کا پیمانہ...... پیمانہ تو صرف انسان کی روح اور اس کا ضمیر ہے۔ اگر وہ کسی میں مر جائیں تو بے نیکی کا سلسلہ بھی کبھی نہیں رکتا۔ مجھے لگتا ہے کوئی اس نیکی کا اجر سمجھے یا انجان بن کر عمر بھر اس کی مخالفت کرتا رہے۔"

عدیل بھائی نے عاطف بیگ کے کندھے پر ہاتھ مارا، پھر مسکرا کر بولے۔ "بچے! تم تو بہت اچھا بولنے لگے ہو...... یہ شہریار کی صحبت کا اثر ہے یا......"

عاطف بیگ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ "یہ اولی بات ہی درست ہے۔ آپ نے خود اندازہ لگا لیا ہو گا، وہ کتنا اکل کھرا ہو گیا ہے۔ ہر چیز، ہر انسان سے عاری۔ آپ سے بھی تو ڈھنگ سے گفتگو نہیں کر رہا۔"

عدیل بھائی نے گہری سانس لی، پھر ہولے سے بولے۔ "قصور اس کا نہیں ہے عاطف یار! یہ بے رخی ہمیشہ سے ہماری طرف سے رہی ہے۔ دراصل بچپن میں جب وہ مجھ سے گھلنے ملنے کی کوشش کرتا تھا تو مجھے کتابوں سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ سالار صاحب نے ہمیشہ اسے دشمن کی نظر سے دیکھا۔ رہی دنیا تو سارا وقت بابا ہی کے ساتھ گزارنے کے بعد جب وہ مجھے اپنی طرف سے غافل دیکھتا تو لامحالہ آنے میں سالار کی کھڑکی کو بند دیکھتا ہوں گا مگر گھر کا ماحول...... اس کی حمایت کرنے پر ماما اس پر اور زیادہ سختی کرتیں۔ آنٹی سے اٹھتے بیٹھتے بے بھاؤ کی سنانے لگتیں۔ پاپا کی حمایت کا بھی کچھ یہی ری ایکشن ہوتا تھا۔ ماما چاہتی تھیں اسے کوئی منہ نہ لگائے، کیونکہ وہ بدقسمتی ان کی زندگی میں شامل کر دیا گیا تھا۔ سو ہم سب نے، میں نے بھی اور پاپا نے بھی خاموشی میں ہی اس کی عافیت سمجھی۔ مگر وہ اب یہ کہتا ہے اور شاید ٹھیک ہی کہتا ہے...... وہ سمجھتا ہے کہ مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ چاند کے معاملے میں بھی میں نے اور پاپا نے اس کے خیال کے مطابق خاموشی اختیار کر لی، وہ وجہ جانتا ہے، یہی درست فیصلہ ہے، لیکن اس کا دل یہ چاہتا ہے اندر سے، کہ کوئی تو ہو جو اس کے لئے اسٹینڈ لے۔ بس بچپن کی یہی حمایت نہ ہونے کی حسرت نے اسے بہت ضدی بنا دیا ہے۔"

تجزیہ بہترین تھا اس کی شخصیت پر اس لئے عاطف بیگ نے کوئی سوال نہیں اٹھایا اور ہاتھ کے اشارے سے اس کے روم کی طرف چلنے کی پیشکش کی۔ عدیل بھائی خاموشی سے چلنے لگے۔ گرو روم نمبر 17

کی شخصیت پہ اب بھی اُن کی ساری سوچیں مرکوز تھیں۔

شہریار کا موڈ آچکا تھا۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ دانیہ کو اپنے سیب چھیل چھیل کر کھلاتے دیکھا تو شرافت محسوس کی۔ عدیل بھائی صوفے پہ بیٹھ گئے، پھر گھڑی کی طرف نظر گئی تو بولے۔

"دانیہ بیٹا! اس وقت ساڑھے بارہ بج رہے ہیں، تم لنچ کے لیے گھر چلی جانا۔"

دانیہ نے پلٹ کر عدیل بھائی کو دیکھا، وہاں مسکینیت کے ساتھ بھوک کی شدت صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ عدیل بھائی شروع سے بھوک کے کچے تھے۔ لیکن مصروف ہوتے تو انہیں کھانا کبھی یاد نہیں رہتا تھا۔ ہاں نارمل اوقات میں اُن کی ساری سوچیں صرف بھوک پر رکتا اور دل جلانے کی بھوک میں مبتلا ہو جاتیں۔ سو اس وقت بھی وہ اسی دور سے گزر رہے تھے۔ دانیہ نے سیب کی پلیٹ ان کی طرف بڑھائی تو عاطف نے اُچک لی، پھر شہریار کو نظر میں رکھ کر بولا۔

"نیب جتنی ہو رہے ہیں اگر یار انھوں نے کوئی شوق ہے تو پہلے بتا دیا اس کے لیے یہاں کی شرط تو نہیں ہے۔ ہم تو پہلے ہی تیرے بیماروں میں شامل ہیں۔"

شہریار عبدالرحمٰن نے کوٹ سے اُسے دیکھا، اندر کوئی ہلچل نہیں بچی اس کے جملے سے۔ یہ تیس جذبات کی کشتیوں میں بہیں جن پہ وقت نے برقاب باندھ کر زندگی منجمد کر دی تھی۔

"یہ کیا ہر وقت چپ شاہ کا روزہ رکھ لیتا ہے؟ ہنسنا بولنا کیا بالکل بھول گیا ہے؟" دانیہ کے کمرے سے نکلتے ہی عاطف اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر اس سے سوال دہرانے لگا۔

شہریار نے آنکھیں سامنے رکھے گلدان پہ ٹکا دیں پھر سرسراتے لہجے میں بولا۔

"پھول گلدان میں تو ذرا لگانے سے پھولوں کی زندگی کتنی مختصر ہو جاتی ہے۔"

"ہاں مگر شاخ پہ کھلے ہوئے پھول بھی تو مرجھا جاتے ہیں۔"

عدیل بھائی نے عاطف بیگ کی خاموشی کو آزردہ اور وہ ان کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ "ہاں شاخ پہ کھلے پھول بھی مرجھا جاتے ہیں، مگر ان کی پتیاں جب تیز ہوا سے جھڑتی ہیں تو اس پودے کے اطراف ہی گرتی ہیں۔ وہ پھول کے ہاتھ میں اپنی خوشبو کے ٹکڑے کی طرح یاد رکھ دیتا ہے، وہ کہاں کھلا، وہ کہاں بکھرا...... مگر جو پھول ایسے گلدانوں میں سجا دیے جاتے ہیں ان کی قسمت سوائے سوکھ جانے کے کچھ نہیں ہوتی۔ خوشبو کا تجربہ بھی ان کی در بدری کی سمت نہیں بھول پاتا۔"

AANCHAL.COM.PK

عاطف بیگ نے دیکھا، اس کی آنکھ کے کونے میں کوئی آنسو اٹکا تھا مگر عیاں ہو کر بھی بہا نہیں جاتا تھا۔

"تم دل کھول کر رو کیوں نہیں لیتے؟ ایک بار شکوہ کر لو ساری دنیا سے، پھر کہتے ہیں دل کو قرار آ جاتا ہے۔"

شہریار نے عاطف بیگ کو دیکھا، پھر ہنسا۔ مگر عدیل بھائی کو محسوس ہوا وہ ہنسنے کے بہروپ میں شاید رو رہا تھا..... پھر کسی قدر رک کر بولا۔

"اگر کوئی وجود ہی نہ رہے، صرف آنسو ہو تو پھر وہ کیسے روئے؟ روئے گا تو ختم نہ ہو جائے گا؟ شکوہ ذات میں ہو تو سوال بھی اٹھائے کوئی، جس کی ذات ہی شکوہ بن جائے تو زندگی کا گلہ بھی نہیں جائے گا مالک رہے؟ قرار و قرار ہو، دل ہو تو قرار کی حاجت بھی کرے کوئی، دل ہی بے قراری کی نذر ہو کر رہ گیا ہو تو کون سے چاک پہ جا کر اس دل کی صورت گری کریں؟"

عدیل بھائی اٹھ کر اس کے قریب آ گئے تھے اور ولایہ جو عدیل بھائی کے کہنے پر باہر جا کر ہوٹل سے دوپہر کے لنچ کے لیے مینیو لکھوا کر واپس پلٹی تھی، کمرے کی انتہائی خاموشی سے ٹھٹک سی گئی تھی۔

"کیا بات ہے؟ آپ لوگ اتنے خاموش......"

عاطف بیگ نے چونک کر ولایہ کو دیکھا جو مصنوعی تعجب لگا کر بولا۔ "کیا مطلب مسز! ہم خواتین تو نہیں جو کے خاموش رہنے پر تمہیں اتنی حیرت ہے؟"

عدیل بھائی نے دیکھا تو کہا۔ "تم ابھی تک یہیں ہو؟ میں تو سمجھا تھا کہ کچن میں کھڑی کچھ نہ کچھ پکانے لگی ہو گی۔"

ولایہ ہنسنے لگی، پھر مسکرا کر بولی۔ "لگتا ہے بڑے بھیا! آپ کو بہت بھوک لگ رہی ہے۔ ٹھیک ہے، میں خود ہی جاتی ہوں۔ دراصل کمرے میں سگنل نہیں آ رہے تھے اس لیے گارڈن میں جا کر رفعت سے بات کرنے کی کوشش کی۔ مگر آپ تو جانتے ہیں ناں، وہ بھی رابعہ باجی سے کم لیزی نہیں۔ لہٰذا خود جائے بغیر اب لگتا ہے کوئی چارہ نہیں۔ گاڑی کی چابی۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔

عدیل بھائی نے جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ ولایہ نے چلنے سے پہلے شہریار کی طرف دیکھا۔ "آپ کے لیے کچھ لاؤں شیری بھائی؟"

شہریار نے پہلی بار یوں دیکھا، جیسے وہ اس کی آمد سے اب تک بے خبر تھا۔ خاموشی سے وہ اندر کی گہرائی کو چھو کر پلٹ آیا تھا۔ بہن کی آنکھوں میں سوال جوں کا توں برقرار دیکھا تو بولا۔ "نہیں، میرا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا، تم کوئی زحمت مت کرو۔"

ولایہ دروازے سے لوٹ آئی، پھر محبت سے بولی۔ "کھائیں گے نہیں تو کمزوری نہیں ہو جائے گی؟ کچھ تو لیں۔ ٹھیک ہے، میں چکن سوپ لے آؤں۔"

شہریار نے ہاں کہا تو منال اور عاطف بیگ بولا "ہاں ہاں آؤ شہریار میرے لئے چکن کارن سوپ ہو تو کیا ہی کہنا۔ مجھے تمہارے ہاتھ کا چکن کارن سوپ بہت پسند ہے۔"
بابا چپ ہو گئی۔ شہریار کے ہاتھ پر دھاری کا تعویذ رکھتے ہی وہ باہر کی سمت بڑھتی چلی گئی۔ عدیل بھائی، عاطف بیگ دونوں اُسے فارم میں لانے کے لئے مختلف باتوں سے اس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی۔ پاپا صبح دس بجے ہاسپٹل سے ہی دفتر چلے گئے تھے شہریار کو چیک کرتے ہوئے اس لئے وہ تو نہیں ہو سکتے تھے۔ ڈاکٹر دو گھنٹے پہلے ہی گیا تھا۔ پھر یہ کون تھا؟ چند پل گھمانے جانے کے دو سیکنڈ بعد دروازہ کھل چکا تھا۔ اسکائی بلیو ساڑھی کے آنچل میں لپٹا وجود سامنے کھڑا تھا۔ شہریار کے ماتھے میں یکدم آئی کی بارش سی تیز ہو کر مدھم ہوئی تھی۔ عاطف بیگ نے عدیل بھائی کی طرف دیکھا تھا اور پھر دونوں نے مل کر جانان کو اپنے حصار میں لیا تھا۔ خاموشی پھر بھی برقرار رہی تو عاطف بیگ نے پوچھ لیا۔

"دشمنوں کو خبر کیسے ملی؟"

جانان اماں سے چلتی کمرے میں داخل ہوئی، پھر مسکرا کر بولی۔ "سیدھی سی بات ہے، آپ تو انڈیا دوست کہہ سکتی ہے یا دشمن کو۔ مجھ سے یہ خبر کیوں کر چھپ سکتی تھی؟" وہ پھر جتانے کو بولی۔ "یہ لوگ جیسے میری انویسٹی گیشن کرتے پھرتے ہیں تو جواباً مجھ کو آنکھیں کھلی رکھنا فرض ہے ناں۔" عدیل بھائی کی طرف جواب اچھال کر شرارت سے شہریار کی طرف دیکھ کر بولی۔ "ویسے مجھے امید نہیں تھی کہ تم اندر سے اتنے کمزور ہو گے کہ محبت کا نیا الزام بھی تمہارے لئے وبال بن جائے گا۔ ویسے اوقات سے بڑھ کر عزت افزائی ملنے لگتی کچھ لوگ یونہی اتراتے پھرتے ہیں۔"

شہریار کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔ اس کی بس آنکھیں اُسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ نجانے کہاں تھا، کہاں نہیں شہریار بھی جان نہ پائی۔

شہریار کی حالت جب اسی طرح رہی تو عدیل بھائی نے پہلی بار جانان کو مخاطب کیا۔

"تمہیں آخر شہریار سے پرخاش کیا ہے؟ آخر تم اسے مارنے کے در پے کیوں ہو؟ کیوں بابا اس پر جھوٹے الزام لگا کر اسے ذہنی اذیت دینا چاہتی ہو؟"

"بابا بابا....." ایک طویل قہقہہ گونجا پھر جانان سنجیدگی سے بولی۔ "موت میرے اختیار میں ہوتی تو میں اس شخص پر زندگی کا تنا بچا کم کر دوں کہ یہ ایک ایک لمحے میں ہزار بار مرے مگر پھر بھی موت اسے نہ چھو سکے۔ مسٹر عدیل! کچھ لوگوں کا زندہ رہنا موت سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔" وہ لمحے بھر کو رکی پھر بولی۔ "ویسے مجھے کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے اس جیسا شخص اندر سے اتنا کمزور کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسے بے حس لوگ تو بہت کم کسی بات کو دل سے لگاتے ہیں۔ الیاء حشیم سے جانان کا کوئی واسطہ..... شہریار کو فرق تو نہیں پڑنا چاہیے پھر یہ کیوں دل پہ لیتا ہے ان ناموں کے غم کو؟"

انداز تضحیک آمیز تھا۔ شہریار کے چہرے پہ ایک دم کرب آ گیا تھا۔ آنکھوں میں بے یقینی تھی، دل کی دھڑکن بکھرنے اپ سیٹ ہونے لگی تھی۔ تبھی عاطف بیگ غصے سے پھنکارا تھا۔ "آخر کیا بگاڑا ہے اس نے؟" جاناں ملول سی کچھ کہنے کو لپکی اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر شہریار نے کپکپاتے ہاتھ سے اس کی کلائی تھام کر آنکھ کے اشارے سے ارادے سے باز رکھا۔

جاناں نے لفظوں کی زبانی کشش خاطر خواہ پایا کہ اسے دلچسپ نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔ پھر کچھ ساعت بعد سرسرائے لہجے میں بولی تھی۔ "پتہ نہیں کیوں، لیکن مجھے اپنے جیسے بے وفا لوگوں سے نفرت کر کے پیار ہو جاتا ہے۔ پھر چاہے سامنے والا کتنا بھی دامن بچائے میری طرف سے کوئی کمی نہیں ہوتی۔ بس یہی وجہ ہے، شہریار سے میں پیار ترک نہیں کر پاتی۔ مجھے بے وفا لوگ اچھے لگتے ہیں اور اچھے لگنے والوں کے پیچھے بھاگتی رہتی ہوں، نہ رہیں، یہ تو ان کی قسمت ہے۔ بس مجھے...... مجھے آپ کے شہریار سے بھی پیار سا ہو گیا ہے۔"

عدیل بھائی اتنے بے باک لہجے پہ گڑبڑا کر رہ گئے۔ عاطف بیگ کی حالت بھی کچھ عجیب سی تھی۔ صرف شہریار اسے تولنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پہلے والی کیفیت پہ اس نے قابو پا لیا تھا اور اب وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے جانتا ہو جاناں کی آمد بے مقصد نہیں تھی۔

"تم جو کیا کہنے آئی ہو وہ بتانا پسند کرو گی؟"

اس کی بے ساختہ قسم کی خاموشی سے گھبرا کر شہریار نے بالآخر ایک جملہ جوڑا اور جاناں اسے پہلے سے بھی زیادہ دلچسپ نظروں سے دیکھنے لگی۔ کتنی ہی ساعتیں اس شرارت کی نذر ہوئیں، تب اس نے کہا۔

"زوار حسن نے سالار سے جو عہد کیا تھا اسے نبھانے کا حق بھی اسی پہ ہے۔ لیکن اگر میں یہ اسٹوری تمہارے گھر پہنچا دوں، کچھ اور جب سے صرف لیلیٰ کی تصاویر اور ایک اور ہاٹ اسٹوری تیار، تم تو یونہی بدنام ہو، تمہاری بات پہ کسے یقین آئے گا؟"

شہریار نے خالی آنکھوں سے اسے دیکھا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "میں یقین کی حد سے نکل چکا ہوں، تم میری زندگی کو بے یقینی سے جتنا مشکل کرتی ہو مجھ پہ زندگی اتنی ہی سہل ہو جاتی ہے۔ تمہیں نہیں پتہ، لیکن یہ حقیقت ہے، ذات کا یقین ہاتھ میں ہو تو رشتے، جذبے، دل سب کا حق یاد رہتا ہے۔ بے یقینی حد سے سوا ہو جائے تو پھر کسی بھی سچائی سے تکلیف بھی بار جیسی نہیں ہوتی۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے، لیلیٰ کی کہانی کل رات بھی کھانے کی میز پہ ڈسکس ہو چکی ہے۔ رہی اخبارات کی بات تو لوگ ایسی خبروں پہ اب دھیان نہیں دیتے۔ جو دیں گے کچھ کیا کہیں گے زیادہ سے زیادہ...... جتنے بھی تلخ الفاظ زبان و بیان میں ہوتے ہیں، وہ میں پہلے سے اپنی ذات کو بیکار رو کے طور رکھتا ہوں، اس لئے زیادہ کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ یوں سمجھو! کچھ دھول جھڑ جائے گی۔"

ایسا لگتا تھا وہ اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا۔ جانانہ نے بے کیفیت، کبھی تو مصنوعی خفگی سے بولی "ابھی تو مت کو شیری، امیر اہل نذٹ جائے گا۔ تمہیں تو معلوم ہے مجھے اپنی ذہانت پہ کتنی ناز ہے اور
مشتعل ہو جاتی ہوں۔ ویسے افسوس رہے گا مجھے سارا اس نے میرے سامنے لٹنے کا موقع نہیں دیا۔ گھر شیریار زندہ محبت باقی۔"

شہریار نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

معید بھائی اس کی بیوی دلبری پہ غش غش کرتے رہے کہ وہ شہریار کے جیل ممبر کے سامنے محبت کا اقرار کر کے بھی اپنا بھرم رکھنا چاہتی ہے۔

جانانہ شہریار کی طرف سے رخ پھیر چکی تھی۔ اب وہ ان کی نظر کے حصار میں... شہریار نے معید بھائی کی آنکھوں کے سوال کا بڑے ثبات جا بکدستی سے سمیٹ لیا تھا۔ قدم قدم چلتا ہوا ان کے قریب آ کر رک گیا۔

"شہریار کے گھر میں کون کون اس کا دادی ہے، کون نہیں مجھ سے زیادہ کون جانتا ہو گا۔ ... آپ سب کو جانتے ہیں۔ مجھے ویسے بھی اسے کسی الزام سے مدد نہیں کرنا تھی۔" وہ لمحہ بھر کو رکی، پھر خان اتنی جلدی کر دی۔

"روم نمبر 17 بیگم طلعت جہاں کے نام الاٹ ہوتا ہے۔ وہ ان میں موجود شخصیت کا... جہاں ہمیشہ ایک ہی فرد مہمان رہے مہمان خانہ ہے اور مہمان آتے رہتے ہیں جاتے رہتے ہیں۔ آپ کس کس کا پتہ رکھیں گے؟ سوئی المال ان کی تابعداری کی بھی ضرورت ہے۔ آپ کو اس پر... کتنا ضروری ہے۔"

ناسمجھ... مجبوراً وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی چلتی چلی گئی۔ شہریار اس کے سامنے تو بیٹھ رہا تھا مگر اس کے جاتے ہی اس نے تکیے کے نیچے سے سگریٹ اور لائٹر نکال لیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب نے سختی سے منع کیا ہے سموکنگ کو۔" عاطف نے لائٹر لینے کی ضد کی مگر اس نے سختی سے اسے دیکھا اس کا ہاتھ فوراً کھینچ گیا۔ "یہ شوگی ہے ابھی تم کر رہے ہو۔" وہ پھر بھی منع کرنے اپنی بات پہ جما رہا۔

معید علی عبدالرحمن اسے خاموشی سے دیکھتے رہے اور وہ گہرے گہرے کش لے کر اندر کا حبس باہر نکالتا رہا۔

❁❁❁

"آ گئی ماں کی جان!" اس نے کار سے نکل کر اندرونی دروازے سے داخل ہو کر پہلی سی صدا میں مسکراہٹ کو چھوا۔ اُسے دنیا میں اپنی ماں سے زیادہ کوئی عزیز نہیں تھا۔ دنیا کچھ بھی کہتی رہتی یہ طے تھا، جانانہ کو سطوت جہاں کے نام سے پہچان پانا ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا۔ وہ بیگ صوفے پر ڈال کر صوفے پر بیٹھی ماں کے گلے کا ہار بن گئی۔ پھر اترا کے بولی۔

"آپ نے مجھے مس کیا تھا ماں؟"

سطوت جہاں کا قہقہہ دوآتشہ تھا، جس میں بیٹی کے لیے محبت بھی تھی اور اپنی ذات کی اہمیت کا نشہ بھی۔ صاحبوں نے جانانہ کو چھیڑنے کو کہا۔ "کہاں، میں کوئی ولی ہوں جو تجھے یاد کروں؟ اور پھر چند گھنٹوں ہی تو ماں سے دور ہوتی ہے تو، پھر بھی تجھے مس کروں؟"

جانانہ صوفے پر بیٹھ کر سطوت جہاں کی گود میں سر رکھ چکی تھی، نروٹھے پن سے بولی۔ "بھلے ایک پل دور رہوں، لیکن آپ مجھے ایسے یاد کرتی رہو جیسے کوئی مر جانے والے کو یاد کرتا ہے۔"

"ہائے اللہ بری بات منہ سے نہ نکال۔ مریں تیرے دشمن......" سطوت جہاں نے جانانہ کے منہ پہ ہاتھ رکھا اور رو پڑنے لگی۔

"تمہاری یہی محبت تو میری طاقت ہے تم ساتھ ہوتی ہو تو مجھے لگتا ہے، میں ساری دنیا کو جیت سکتی ہوں۔"

سطوت جہاں مسکرا کر جانانہ کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگیں، پھر جیسے کچھ یاد آنے پر بولیں۔ "وہ شہریار کا کیا ہوا؟ میں ایک ہفتے بعد لوٹی تو لیلیٰ نے بتایا وہ یہاں آیا تھا، لیکن بغیر کسی رسپانس کے واپس چلا گیا۔ تو نے اُسے ایسے ہی جانے دیا، کیوں؟"

جانانہ نے سطوت جہاں کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر محسوس کیا، پھر بولی۔ "اسے کہاں جانے دیا ماں! دروازے پہ پوری کم ظرفی سے پلٹ دی تھی۔ مس لیلیٰ نے یہ نہیں بتایا، جب وہ سالار کے سامنے کھڑا تھا تو بالکل بھیگا ہوا اُلو لگ رہا تھا، پھر ماں! پھونک پھونک کر کھانے میں تم ہی تو بتاتی ہو، مزہ نہیں آتا۔"

سطوت جہاں نے بیٹی کے رخسار کو دلار سے چھوا، پھر پہلے سے مختلف پُرغرور لہجے میں بولیں۔ "میری وصیت ہے تجھے شوہد الرحمن کے دیے ہوئے زخم کو کبھی مت بھولنا۔ تجھے اپنی خالہ کی اذیت ناک موت کبھی بھولو تو میں تجھے کبھی اپنا دودھ نہیں بخشوں گی۔"

جانانہ کچھ نہیں بولی وہ آنکھیں بند کیے لیٹی رہی، اُسے سطوت جہاں کی گود میں اس طرح لیٹے رہنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اور پھر جب وجود کی طرح حسن سے مغرور ہو تو یہ آسرا بہت خوب صورت لگتا تھا۔

"چلو اب اسے اٹھنے کے بعد لے جاؤ۔ پھر کھانا لگوا دیتی ہوں۔" سلطنت جہاں نے اس کے رخسار کو چھوا۔

وہ تھکے ہوئے انداز میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

سلطنت جہاں کمرے میں آئیں تو [illegible] ان کے چہرے پر ایسی حیا آلود چمک تھی کہ ان کی [illegible] نہیں تھی۔ انہوں نے گہرا سانس کھینچا پھر غور سے دیکھتی رہیں۔ "عبدالرحمٰن غلطی تم نے کی تھی، تم دونوں نے [illegible] میں دیکھے تھے جو تم نے جہیز تیار کیا ہے، وہ [illegible] کی [illegible] سامنے کھڑا کرنے، مجھ سے اونچی آواز میں بات کرنے کا حوصلہ تم نے کبھی کیا تھا، وہی تخت لیے ہے جو میں نے تمہیں لوٹایا ہے...... کہتے ہیں انسان اپنے اوپر بیتنے والی تکلیف بھول جاتا ہے، لیکن اپنی سب سے پیاری اولاد کی تکلیف سے [illegible] ہے۔ شہریار کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ تمہارا بیٹا ہے اور تمہیں اولاد کی تکلیف [illegible] بہت بھاری ہے ماں۔"

وہ پھر سے ہنسنے لگی تھیں۔ [illegible] سفید رنگ کے [illegible] لباس میں بال [illegible] خشک کرتی ان کے پاس آ بیٹھی۔

"ماں! کیا حمزہ/عابدہ کا فون آیا تھا؟"

سلطنت جہاں نے چونک کر پلٹ کر اسے دیکھا پھر اس کے قیامت خیز روپ [illegible] ان کی آنکھوں میں چمک [illegible] ابھی زندگی [illegible] کیونکہ ان کی کمائی کا ذریعہ بہت [illegible] تھا۔

"[illegible] میری بات کا جواب نہیں دیا؟" اس نے [illegible] اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

سلطنت جہاں آنکھوں میں شرارت بھر کر بولیں۔ "تم پہلے سے زیادہ خوب صورت ہوتی جا رہی ہے۔ آج کل کس کے خیال [illegible] کہ تجھے اتنا خوش رکھنے لگے ہیں؟"

جانان نے ماں کو دیکھا پھر [illegible] ہنس کر بولی۔ "بس ماں! تمہیں تو پتہ ہے، میں جب جب شہریار کو پہلے سے زیادہ [illegible] ہوں تو مجھے لگتا ہے، میں نے بہت [illegible] کامیابی کمائی ہے...... اور کامیابی پر خوش ہونے کا حق تو سب کو ہے ماں۔"

سلطنت جہاں نے اثبات میں سر ہلایا پھر کھانے کا حکم دینے چلی گئیں۔ [illegible] سب ان کے کہنے پر [illegible] تھیں۔ [illegible] اپنی زندگی کی عیش پسندی پر [illegible] انہیں اس کا غم نہیں تھا کہ [illegible] جانان سب [illegible] کوئی [illegible] طرح [illegible] سلطنت جہاں [illegible]

تھیں۔ کھانا بہت خوشگوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ چائے کا دور چلا تو سطوت جہاں نے سب سے ان کی محنت کی کمائی پر بات چھیڑ دی۔ سب اپنی اپنی پارٹی کو خوش کر کے کچھ نہ کچھ کما کر لائی تھیں۔ صرف نیلی افسردہ تھی۔ اس کی پارٹی بہت کنجوس ثابت ہوئی تھی۔ پانچ ہزار سے زیادہ ہاتھ پہ نہیں رکھ سکی تھی۔ سطوت جہاں نے افسردگی کا تاثر گہرا دیکھا تو آگے خود سے لپٹا کر بولیں۔

”بس میرے بچے! اداس مت ہو۔ مجھے کیا پتہ تمہارا وہ آقا کنگلا ہوگا۔ مجھ سے تو پچاس ہزار کی بات کی۔ میں نے سوچا پچاس ہزار دینے والا اتنا کنجوس ہوگا۔ کل مجھ سے دس ہزار لے لینا۔ جی بھر کر شاپنگ کر لینا اب تو خوش رہے۔“

نیلی پھیکی سی ہنسی ہنسنے لگی۔ ساری لڑکیاں جیسے آئی تھیں ویسے ہی اپنے اپنے کمروں میں لوٹ گئیں۔ جاناں نے ملازمین کو کھانا اٹھاتے ہوئے خاموشی سے دیکھا پھر جمائی لی تو بولی۔

”اماں! مجھے تمہارا یہ بھولا پن اچھا نہیں لگتا، جو تم کرتی ہو۔ اس سے لڑکیاں نڈر ہو سکتی ہیں۔ تمہارے سامنے آ کر اپنا حق مانگ سکتی ہیں۔ دبا کر رکھو گی انہیں تو ان کا ہاتھ تمہارے لینے والے ہاتھ سے نیچے رہے گا۔ کیا سمجھیں؟“

سطوت جہاں نے بیٹی کی طرف ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پہ چٹکی بھر کر کہا۔ پھر سنجیدگی سے بولیں۔ ”تم بالکل جھلی ہے یہاں! تجھے نہیں معلوم...... لڑکی کسی نے کہا ہے اسپرنگ کی طرح ہوتی ہے۔ جتنا تیزی سے دبا دو اتنی ہی طاقت سے واپس پلٹتی ہے۔ اسے تو نرمی کی مار ہی مار کر رکھتی ہے۔ میرا یہ سلوک یاد رہے گا انہیں۔ کوئی مجھے چھوڑ کر جانے کی بات نہیں سوچیں گی۔ میرے گھر کے علاوہ انہیں کہیں عافیت دکھائی نہیں دے گی۔ مگر یہ سب تم نہیں سمجھو گی۔ اور پھر تیری عمر بھی نہیں کھٹنے والی۔ اس عمر میں تو بس تو تو تنگ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اپنے دماغ کو مت تھکایا کر فضول باتوں کے لیے۔“

جاناں نے متفق ہوتے ہوئے سوتے کی چٹکی ماری پھر سطوت جہاں کے قریب آ کر بیٹھی ہی تھی کہ ایک کارڈ اس کے ہاتھ میں تھما دیا گیا۔ ”حمزہ عابد۔“

اس نے ڈرائنگ روم میں بلانے کا حکم دیا پھر سنبھل کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ سطوت جہاں پان دان اٹھا کر اندرونی کمروں کی طرف چلی گئیں۔ اب ڈرائنگ روم میں وہ اکیلی تھی۔

حمزہ عابد ملازم کے ساتھ چلتا ہوا ڈرائنگ روم کی دہلیز پر آن رکا۔ پھر اس پہ نظر پڑی تو اس کی آنکھوں کی چمک دگنی ہوگئی۔

حسن اتنا بے حجاب ہو تو نظر میں ایک پل کے لیے بے باکی آنا نظر کا حق ہے۔ وہ متوازن چلتا ہوا اس کے سامنے والے صوفے پر آن بیٹھا پھر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”حسن کی حکومت کیا کسی دن ہمارے ہاتھ آئے گی؟ دیکھو ظالم! ایسی تو اس حکومت کے ملنے پر چار دن ہونے کا شکوہ بھی نہیں کروں گا۔ بس اتنا کرو کہ وہ چار دن کے جو دن ہیں انہیں انتظار سے ضرب دے کر

بحال کی شام میں تھی کہ.... دل والوں پر تمہارا پڑنا ہی ہوگا۔"

"ہاہاہا...." ایک طویل جلترنگ بجا، عجیب ساتی وہ! پھر اس نے اسے ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا، پھر مسکرا کر بولی۔ "حسن محبوب نے کی چیز نہیں محسوس کرنے کی چیز ہے۔ لوگ صدیاں گزار دیتے ہیں تب بھی وہ حسن کی تعریف نہیں کر پاتے۔"

حمزہ عابد نے اس کے ہاتھ کی پشت سے تھاما پھر مخمور لہجے میں بولا۔ "ایک بار وہ تعریف تو کیا حسن کی ساری وضاحت کرکے دکھاؤں گا تمہارے واسطے....."

"وہ تھا جسے ایک بار دیکھنا
اور پھر زندگی دوبارہ دیکھیں"

شعر پڑھ کر جسے ہنسی سے دیکھا تو جانان ہنستے ہوئے اٹھی۔

"کیا بات ہے حمزہ جی بڑا...."

"کبھی کا اسک چیز یاد دلا کر تمہارے سامنے جھکا دوں اور پھر گزرنے کا افسوس نہ ہو۔"

جانان دوسرے کمرے میں چلی گئی اور روانی کی ٹرے اٹھا لائی۔

حمزہ عابد نے جام بنانے کی ذمہ داری لے لی تھی سو وہ اسٹائلش شیشے کے گلاس میں برف کے ٹکڑے ڈالنے لگا تب جانان بولی۔ وہ جانب سے مصروف تھا تبھی اس نے کہا۔

"تم نے دوپہر سے فون پر رابطہ کیوں نہیں کیا تھا؟ کوئی خاص کام تھا کیا؟"

حمزہ عابد نے نفی میں سر ہلایا پھر جام کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ "کوئی خاص کام نہیں تھا تمہارا موبائل آف جا رہا تھا اس لئے گھر کا نمبر ملایا تھا۔ تمہاری آواز سننے کی طلب ہو رہی تھی اور پھر ایک خبر بھی دینی تھی۔"

جانان نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر اسے منہ پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا کہتی ہوئی بولی۔

ANCHAL.COM.PK

"میں جانتی ہوں تم کیا تبصرہ کرنا چاہتے ہو۔ شہریار کی بیماری کی گتھی سلجھانا چاہتے تھے۔" اُسے پھر کوئی جواب نہ ملا۔ "بے فکر رہو میں اس بیماری سے ڈر گئی ہوں وہاں کی بیماری کی اذیت بھی پہلے سے بڑھ جاتی ہوں۔"
"اور کے کوئی نئی تم؟...... ویسے مجھے عمر بھر افسوس رہے گا، میں تمہاری اس خواہش کو پورا نہ کر سکا جس کے پورا کرنے کے لیے تم نے بہت پاپڑ بیلے تھے۔"
"بشت...... میں پاپڑ بیلوں گی؟" ہنس کر اُسے دیکھا، پھر ادا سے بولی۔ "میری ایک نظر جانتے ہے مسٹر حمزہ عابد! میری نظر میں وہ لطافت ہے کہ پھر دنیا بھی توجہ نہیں کر سکتی۔ جو نظر مجھ پر پڑے، پھر وہ میری ملکیت اور جو جیسا ہو، اُسے بے جا محنت کی کیا ضرورت۔ ہاں، بس مجھ میں جو لطف دوبالا کر جاتی تھی، وہ محسوس کر پائی۔ شہریار یہاں اچھی، گم تخیل کیا اور بس...... مگر دنیا کا ہر ہاتھ سے نکلتا اب بھی نہیں ہے، تمہاری صورت میں اب بھی میں جب چاہوں اُسے اُٹھا دوں لا سکتی ہوں۔ ویسے یہ ورزش تمہیں آج کل اتنا کام کیوں دینے لگی ہے؟"
"مطلب؟" حمزہ نے چونک کر دیکھا۔ "یہ ورزش سے جنگ سے والی بات تو اتفاقیہ نکلی تھی، پھر...... جانانہ سے کیا کوئی تمہیں چپ بھی سکتی ہے؟...... اُس نے گلاس میز پر رکھ دیا تھا۔
جانانہ نے بحث کر کہا تھا۔ "اچھے بُھلے تو چل رہے تھے، تمہارے تعلقات، یہ یکدم دراڑ کیوں پڑ گئی؟"
حمزہ عابد نے ٹھنڈی سانس لی، پھر کراہ کر بولا۔ "پتہ نہیں، کس نے اُس کے دماغ میں گھر گرہستی کا خواب جگا دیا ہے۔ اب تو اس سے دوڑ جانے کے لیے کوئی بُخسن کا ذکر چھیڑوں، تو فوراً ہاتھ تھام کر کہتی ہے، اتنا پیار کرتے ہو تو گھر میں کیوں نہیں بسا سکتے...... سارا موڈ چوپٹ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب کون جائے اس احمق لڑکی کو کہ تم اس جیسی لڑکی سے گھر نہیں بسائے جا سکتے۔ ہم مرد لوگ، ہمیں تو بیوی ایسی چاہیے ہوتی ہے، جس کی صورت کی کرن بھی کوئی نہ دیکھ سکے۔ کسی آنکھ نے اس کا ملوہی روپ کبھی نہ دیکھا ہو۔ ہمیں تو آنکھ بچاکر چپ شاید تم لڑکی کی اٹریکٹ کرتی ہے، جو ہمارے کہنے سے دن کرے، ہمارے کہنے سے رات۔"
جانانہ کا قہقہہ اس کے جملے پر ایسا تھا کہ حمزہ عابد چونک کر اُسے دیکھنے لگا، پھر مست ہو کر خفا سے بولا۔ "تمہارے وجود میں وہ بات ہے، دیکھتے ہی کسی چیز کی حاجت نہیں رہتی، بس صرف تمہارا خمار رہتا ہے، تمہیں دیکھتے رہنے کی حاجت کے سوا سب خواہشیں، تمنائیں، اور دبے کوئی کرتے ہے۔"
"ہاہا...... "جانانہ نے ایک اور قہقہہ لگایا، پھر شرارت سے بولی۔ "تم...... تم بہت جھوٹے ہو۔ اگر میں تمہیں نہیں جانتی ہوتی تو شاید تمہاری باتوں پر یقین کر لیتی، لیکن......"
ایک لمحہ توقف کیا، پھر اسی لہجے میں بولی۔ "لیکن ایک بات طے ہے حمزہ، تم سو کالڈ شرفا اندر سے ایک ہی طرح کے گارے مٹی سے بنائے جاتے ہو، جو کسی بھی سوچ کی گنجائش نہیں رکھتی۔ تم لوگ جتنا بھی

پتہ چلو تمہارے اندر کا یہ جو روایتی مرد ہے جہاں یہ کبھی نہیں بدلے گا۔ ویسے ایک بات تو بتاؤ۔ زرش کے بعد والے اینالا کا معاملہ کیا سچا ہے؟ نہیں گھبراؤ نہیں، اینالا کا معاملہ فی الحال زرش تک نہیں پہنچے گا۔ ویسے آپس کی بات ہے، یہ اینالا تمہارا آخری پڑاؤ ہے۔"

حمزہ حامد نے زور سے قہقہہ لگایا۔ وائن کا نشہ اس کے حواس پر چھاتا چلا جا رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے آنے والی پروائی ہوا اس کے سر کو سہلاتی ہوئی لطف دو آتشہ کرتی گزرتی چلی گئی۔ جانانہ جانتی تھی وہ آؤٹ ہونے والا ہے۔ لیکن ایسے بہت سے کیس نمٹانے میں اسے مہارت تھی۔ وہ اب بھی ہنس رہا تھا پھر یکدم چپ ہوا تو ترنگ سے بولا۔ "یہ حسن والے زندہ کب رہنے دیتے ہیں؟ اور پھر آخری پڑاؤ...... یہ ہم جیسے مردوں کی زندگی میں کب آتا ہے؟ یہ تو بس منزل کا پہلا میل کا پتھر ہے۔ آخری پڑاؤ زندگی ہوتی ہے جب دیکھو اسے آخری پڑاؤ سمجھا ہے، ورنہ ہر مرد کا دل وہ سرائے ہے، جہاں ہر طرح کی مخلوق آتی اور جاتی رہتی ہے۔ کیا سمجھیں؟"

جانانہ نے اس کے جام کو پھر سے بھر دیا پھر مسکرا کر بولی۔ "میں کوشش کروں گی زرش کو بھی باتوں ہی باتوں میں چلتا کر دوں۔ ہو سکتا ہے، وہ ہمارے کسی کام میں آگے تک کام کرنے کا باعث ہو جائے۔ بس اسے بہلاتے رہو۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو منگنی بھی کرنی پڑے تو کر لینا۔"

"تم بے فکر رہو ایسا ہی ہوگا۔ میرے لیے تمہارا حکم ہر بات سے زیادہ اہم ہے۔"

"میں جانتی ہوں تم کتنے چہیتے ہو اس لیے زیادہ مکھن مت لگایا کرو۔" جانانہ نے مصنوعی خفگی دکھائی اور وہ جسے کوئی جواب نہیں آیا بلکہ ترنگ میں بولا۔

"تم کچھ بھی کہہ لو لیکن تمہارے لیے فیلنگ میں کچھ خاص ہے ضرور۔ وہ کیا خاص ہے، میں خود بھی نہیں جانتا۔ لیکن بہرحال یہ ساری سوچیں ہمیشہ کے لیے اس خیال سے مکمل کر کے خوش ہو جاتی ہیں کہ جب ہم ملیں گے تو زندگی کیسی بحال ہو جائے گی۔"

"ہاں ہاں... تم سوچو اچھی طرح سوچو۔ لیکن میں ابھی کچھ تھکی ہوئی ہوں مسٹر......" اس نے اس کے رخسار کو چھوا۔

"اوکے اوکے...... آرام کرو تم۔ میں یہاں ٹھیک ہوں ابھی چلا جاؤں گا۔ بس کچھ دیر مجھے اس جنت سے مت نکالو۔" اس نے اپنے رخسار پر رکھے ہاتھ کو بے قراری سے چوما۔ اپنے لیے کی تڑپ صدق دل کی تھی مگر وہ کب کی تھی۔ تیزی سے اندر چلی گئی تھی۔ پھر اپنے کمرے کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھ کر تھی کہ سلوت جہاں اس کے سر پر آکھڑی ہوئیں پھر محبت سے بولیں۔

AANCHAL.COM.PK

"جان! بیرو کو مجھے ٹھیک نہیں لگتا۔ مجھے تیرا اس کے ساتھ بہت زیادہ میل ملاپ اچھا نہیں لگتا۔ دیکھو جانانہ! جو لوگ حقیقی رئیس ہوں ناں، ان کے نشست و برخاست میں ہوش اور بے خودی میں بھی ایک توازن ہوتا ہے۔ مگر جو لوگ ایسے میلے سو کر دولت کما کر رئیس بنیں ناں تو وہ لوگ اندر سے ویسے ہی تھرڈ کلاس رہتے ہیں۔ اعتبار کے قابل نہیں ہوتے، کبھی بھی دھوکا دے جاتے ہیں۔"

جانانہ نے طلعت جہاں کے تجزیے سے اتفاق نہیں کیا۔ طلعت جہاں کا اندازہ تھا، پھر مسکرا کر بولی۔ "بے فکر رہو ماں! میں تمہاری ہی بیٹی ہوں، ہر ایک پر اعتبار نہیں کرنے لگ جاتی۔ اور پھر یہ تو حمزہ عابد ہے، ایک ایسا نوجوان جو صرف عیش پرستی کو زندگی سمجھتا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں، میرے ساتھ اُسے کسی قسم میں کیا دی حیثیت اختیار کر سکتا ہے، مگر....." ایک لمحے کو رکی پھر بولی۔ "تم یہ تو جانتی ہو ماں! اگر دشمن کو چاروں طرف سے دباؤ میں رکھو تو وہ زیادہ اذیت میں رہتا ہے۔ پھر جتنا اذیت کا شکار شہریار رہے گا، عبدالرحمٰن کو وہ اذیت دگنی ہو کے لگے گی ناں۔ مجھے ان دونوں سے جو حساب لینا ہے وہ اتنا آسان نہیں۔ سو مجھے اس اذیت کا حساب مت مانگو کہ وہ میری ذہانت پر شک کیا گیا۔ ویسے میں پہلے سے جانتی تھی حمزہ عابد نہیں پا سکے گا۔ شہریار اب اتنا بھی گیا گزرا نہیں کہ اس کی تمنا کو نہیں سمجھ سکے گا۔"

طلعت جہاں نے بیٹی کو تیکھی نظروں سے دیکھا، پھر شبہے سے بولیں۔

"شہریار..... جان! کہیں تم واقعی اس سے محبت تو نہیں کرنے لگی ہے؟..... محبت کے ہاتھوں کوئی کسی کی ذہانت پہ وار نہیں کرتا۔"

جانانہ نے ہنس کر طلعت جہاں کے کندھے پر ہاتھ رکھا، پھر مسکرا کر بولی۔ "ہاں! کہتے ہیں، دشمنی میں کسی طرف کا ساتھ دینے والے بندے کا نسب نہیں پڑتا۔ اب ہم میں نسب داری نہ رہے تو عام لوگوں میں اور ہم میں کیا فرق رہ جائے گا؟" اس کے لہجے میں طنز ہی طنز تھا۔

طلعت جہاں مسکرا دیں۔ آنسو جھلکنے لگیں، پھر کون میں ممکنا کر بولیں۔ "تیری پہلی بات مرا آنکھوں پر، مگر مجھے کیوں یقین نہیں آتا کہ تیرا دل شہریار سے صرف دشمنی نبھا رہا ہے۔ میرا خیال تم جانتی ہو، دل کبھی غلط نہیں کہتا۔"

جانانہ نے طلعت جہاں کے گلے میں بانہیں حمائل کر دیں، پھر نرمی سے بولی۔

"تم جانتی ہو ماں! میں تم سے جھوٹ نہیں بولتی۔ شہریار کے لیے اگر میرے دل میں کوئی نرم گوشہ ہوتا تو میں تم سے کیوں چھپاتی؟" لمحے بھر کو رکی، پھر دوبارہ سے بولی مگر اس بار اس کے لہجے میں روح کے داغ جل اٹھنے کی اذیت سی اذیت تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی کا ایک موتی چمک اٹھا تھا، جیسے تیز بارش سے پہلے تیز ہوا..... اور وہ کہہ رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے ہاں! اگر شہریار مجھے شہرازی سے پہلے کے کسی گزرے موسم میں ملا ہوتا اس کے نام کا کوئی کونا دل کے حصے میں بنایا جاتا تو ہوسکتا ہے وہ میرے دل میں کوئی چور دروازہ کھول لیتا لیکن اس کی بدقسمتی ہے کہ وہ مجھے شہرازی کے بعد ملا اور یہ سچ ہے، شہرازی کے بعد ملنے والے ہر مرد پر میرے دل کا ہر دروازہ بند ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں وہ تکلیف جو پہلی محبت نے میرے دل کو سوغات کی، نہیں بھول سکتی۔"

وہ رکی نہیں تھی، کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی تھی۔

حشمت جہاں پر وہ دروازہ بند ہو گیا تھا مگر ان کے چہرے پر گہری سوچ کا ایک جیسی کہانی کا دروازہ کھلنے لگا تھا۔ انہوں نے بے ساختہ اپنی آنکھیں بند کیں۔

"ہائے میری جان! مجھے تیرے اس غم پر ہمیشہ دکھ ہی رہے گا۔ جانے کون سی گھڑی تھی جب تو نے شہرازی کو دل دیا اور ساری جوانی کے لئے ایک ادھورا بوجھ لے لیا۔ وفا چیزیں ہمیشہ باقی کے لئے سر پر لٹکتی تلوار کی طرح ہوتی ہیں، جانے کب بھی ڈھیلی ہو اور زخم سر کے دل کے دو ٹکڑے کر دے۔ رب جانے کون جانے...... اور یہ نجانے کتنی تقدیر ہے۔"

وہ مدھم سرگوشی میں کہتی ہوئی کمرے میں ان کہانی کے قدم رکھتی ہوئی باہر چلی گئیں، جیسے راہ میں بازو پھیلا کر سے نکے بادل...... اور وہ جانتی تھیں زرد پتوں اور پھولوں پر پیر رکھ کر کس طرح زندگی کا فاصلہ طے کیا جاتا ہے۔

❀❀❀

"آپ آرام سے سمجھیں گے کہ زندگی اتنی آسان نہیں جتنی آپ سمجھ بیٹھے ہیں؟"

بیگم عاقبہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ کچھ چڑے ہوئے لہجے میں پکار رہی تھیں اور وہ بری طرح سے مسز سلیم چونک کر بیوی کو دیکھنے لگے۔ عاقبہ بانو اپنے موڈ میں بہت کم آیا کرتی تھیں۔ ہمیشہ ان کا لہجہ نہایت دھیما ہوتا تھا مگر اس لمحے اگر وہ اس مزاج سے مخاطب تھیں تو یقیناً کوئی خاص وجہ ہی ہوگی۔

انہوں نے ایک جھٹکے سے فون بند کیا تھا، شہریار نیند سے جاگ کر بھاگتے ہوئے وہاں آیا۔ عاقبہ نے اپنی طرف سے ذرا پیچھے ہٹ کر ایک معصوم سی خواہش کے اظہار کی کوشش کی۔ عاقبہ بانو تپ کر اٹھتے ہوئے ان کے بائیں صوفے پر آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ ان کے انداز میں خیر پا کر مسز سلیم نے معاملے سے پوچھا تھا۔

AANCHAL.COM

"جی بیگم صاحبہ! اب کہیے کیا بات ہے، جس نے آپ کو اتنا پریشان کر رکھا ہے؟"
بیگم نافیہ کچھ دیر کشمکش کی حالت میں ان کو دیکھتی رہیں، پھر مدھم ہو کر بولیں۔
"آپ یہ کیوں نہیں سوچ رہے کہ پچھلے پانچ سال سے عابد صاحب آپ کو پاکستان آنے کیوں نہیں دینا چاہتے؟"
مسٹر نعیم بیوی کی خیال آرائی پر مسکرائے، پھر ہنس کر بولے۔ "خدا کی بندی! وہ ایسا کیوں چاہیں گے؟ انہوں نے تو ہمیشہ میری پاکستان آمد کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ہر چھ ماہ میں، میں ایک چکر لگا ہی لیتا ہوں۔ ہاں، یہ ضرور ہے، کچھ یہاں کی مصروفیات مجھے سانس نہیں لینے دے رہی ہیں کہ میں پاکستان کے بزنس کے حسابات کا ٹھیک طرح سے آڈٹ کر سکوں۔"
بیگم نافیہ نے انہیں غور سے دیکھا، پھر دھیمے لہجے میں بولیں۔ "آپ کو مسٹر جواد حسن کیسے آدمی لگتے ہیں؟"
مسٹر نعیم نے چونک کر بیوی کو دیکھا، پھر رسانیت سے بولے۔
"ان کا لائف اسٹائل سننے میں آیا ہے، کچھ ٹھیک نہیں ہے مگر بزنس کے اسرار و رموز وہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ کبھی کبھی میں اگر کہیں پھنس جاتا ہوں تو وہی میری امداد کرتے ہیں اور بہت احسن طور پر ٹھیک راہ سجھاتے ہیں۔ بظاہر انہیں یہاں آئے کم مدت ہوئی ہے مگر حیرت انگیز طور پر وہ یہاں کے قانون اور بزنس کی چھوٹی چھوٹی باریکیاں مجھ سے بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ سچ پوچھو نافیہ! ان کے یہاں ہونے سے میں بہت مطمئن رہتا ہوں۔ عابد کا بھی مجھ پر ایک بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اپنی طرح کا ایمان دار اور وفادار شخص میری مدد کو بھیجا ہے۔ میں آنکھ بند کر کے مسٹر جواد حسن پر اعتبار کر سکتا ہوں۔"
بیگم نافیہ نے شوہر کو تاسف سے دیکھا، پھر بھرائے لہجے میں بولیں۔
"کیا واقعی ایک انسان کو اتنا اندھا اعتبار کرنا سوٹ کرتا ہے، جبکہ وہ اس کے ماضی میں ہی اعتبار اور اندھے اعتماد نے تلخی سے بھری زندگی گزارنے کی سزا بھی دی ہو؟...... کیا یہ اندھا اعتماد واقعی جائز ہے اس انسان پر جس پر ابھی مزید دو بیٹیوں اور ایک کم عمر بیٹے کی ذمہ داری بھی ہو؟"
مسٹر نعیم نے ہاتھ بڑھا کر انہیں خود سے قریب کر لیا، پھر محبت سے بولے۔ "میں کیا کروں، ماضی کی ہر تلخ یاد کے باوجود مجھے لوگوں کی طرف سے اعتبار کرنے کی خوشی کی طرف بڑھنے ہی نہیں دیتی۔ تم ٹھیک کہتی ہو اگر میں اپنا ماضی یاد کروں تو شاید ہر تخلیق اتنی کڑی ضرور تھی کہ مجھے اپنے اوپر بھی اعتبار کرتے ہوئے دس بار سوچنا پڑے گا۔ مگر نافیہ! یہ بزنس ہے اس میں سارا کاروبار اعتماد اور اعتبار ہی پر تو چلتا

ہے۔ کسی بڑی کامیابی تک پہنچنے کے لیے ہمیں اپنے درگزر کا اختیار کرنا ہی پڑتا ہے۔ شک کسی بھی نوعیت کا ہو کسی بڑی کامیابی کی خوش لائن کو کبھی چھونے نہیں دیتا۔"

بیگم عائشہ خاموش ہو گئیں۔ یہ خاموشی ان کے متفق ہونے کی علامت تھی لیکن کچھ ساعت گزری تھی کہ وہ پھر کچھ یاد آنے پر بولیں۔

"آپ کی یہ بات ہضم کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے، انوشے اور عارف آج کل کتنے کلو فریڈ زین بچتے ہیں۔ کیا یہ اچھی بات ہے؟ اقبال سے علیحدگی کے بعد یہ دونوں کس رنگ میں وقت گزار رہے ہیں آپ کو معلوم ہے؟" وہ توقف کر کے کہیں، پھر بولیں۔ "میں نے کتنی مرتبہ انوشے کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کی نظر سے زندگی دیکھنے کی عادت ڈالے۔ ہمیشہ وہی نہیں ہوتا جو ہم چاہتے ہیں، بہت سی باتوں پر صبر کرنا پڑتا ہے، کبھی رواداری کرنا پڑتا ہے۔ مگر وہ میری بات کہاں سنتی ہے، جیسے بے کار کی لن ترانی ہے۔ سلیم! مجھے ڈر ہے، اگر اس کا یہ رویہ برقرار رہا تو وائما اور مراد بھی مجھے ایگنور کرنا شروع کر دیں گے۔ اور اگر ایسا ہوا تو میں تمہارے گھر کی ذمہ داری نبھانے کے لئے نہیں جاؤں گی۔"

مسٹر سلیم نے بیگم عائشہ کی آواز میں آنسوؤں کی جھلک پائی تو بے چین ہو کر انہوں نے بیوی کے چہرے پر نظر ڈالی، پھر ماحول کو ہلکا کرنے کو بولے۔ "آہا وہ تو یہ بات ہے۔ آپ کو لگتا ہے آپ کے بچے آپ کا گھر پسند کیا جا رہے ہیں اس لئے آپ کو پاکستان یاد آ رہا ہے۔ مسٹر جواد سے بھی اس لئے ملنے کی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ عارف کی وجہ سے انوشے آپ کے کہنے میں نہیں رہی ہے۔ میں بھی کہوں آپ جیسی اعلیٰ ظرف عورت، نام نسبت کو بالائے طاق رکھ کر اور انسانیت سے بڑھ کر کیسے سوچنے لگی؟"

وہ توقف کر کے پھر پر یقین لہجے میں بولے۔ "ٹھیک ہے آپ بے فکر رہیں۔ اس بار ہم پاکستان ضرور چلیں گے اور میں کوشش کروں گا کہ پاکستان ہی میں مستقل ہو لیا جائے۔ آپ کی تمنا ہر چیز سے پہلے....." بیگم عائشہ کا ہاتھ تھام کر وہ میٹھے لہجے میں بولتے بولتے رکے پھر آہستگی سے بولے۔ "تمہاری جو تمنا ہے، یہ تمنا کب سے میرے دل میں بھی پل رہی ہے۔ مگر میں ہر مرتبہ اس خواہش کو یوں دبا لیتا تھا کہ میری طرح آپ کی بھی پاکستان سے کچھ اچھی یادیں وابستہ نہیں ہیں۔ پھر جہانیاں بیگم کا رسوخ اور اس کی دنیا کے بارے میں جب بھی سوچتا ہوں تو مجھے اپنے بچوں کا مستقبل غیر محفوظ سا نظر آنے لگتا ہے۔ مگر خیر، پھر سوچتا ہوں، پہلے کی بات اور تھی، اب میری حیثیت اتنی اسٹرونگ ضرور ہے کہ جہانیاں بیگم یا ان کی گدی نشین ہماری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ہزار بار سوچے گی۔ ویسے ہم پاکستان جا رہے ہیں۔ رہا ہوٹل مینجمنٹ تو اسے مسٹر جواد بھی اچھی طرح سے دیکھ ریکھ کر سکتے ہیں۔" انہوں نے بیگم عائشہ کو محبت سے دیکھا، پھر مسکرا کر بولے۔ "دل پر بار مت لیا کرو، تم اپنی پریشانی مجھ سے شیئر کرتی رہا کرو کہ تمہارے ہونٹوں کی مسکراہٹ کے لئے یہ ذرا سی چیز کچھ بھی داؤ پر لگا سکتا ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے تمہارے چہرے پر ہلکا سا فکر کا سایہ بھی برداشت نہیں ہوتا۔ عائشہ! تمہیں معلوم ہی نہیں ہے تم

میرے لئے کیا ہو؟...... تمہارے چہرے کی مسکراہٹ میرے لئے کتنی بڑی مورل سپورٹ ہے۔ آئی سویئر تم میرے ساتھ جہاں بھی ہوتی ہو، مجھے لگتا ہے ایک کامیابی ہے، جو میری زندگی سے ڈھل جاتی ہے...... جہاں تم میسر نہیں ہوتی ہو، وہاں تمہارا خیال مجھے تقویت دیتا ہے کہ کامیابی ہر حال کامیابی کی ہی کنجی ہوتی ہے اور جب میں یہ سوچتا ہوں تو ناکامی زندگی سے دامن چھڑا کر کامیابی کا ہاتھ میری طرف بڑھا دیتی ہے۔ عافیہ! میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ تم نے مجھے اس وقت سہارا دیا تھا، جب میں اکیلا تھا۔ میری پہچان بے یارو مددگار تھی اور میرے لئے کوئی راستہ نہیں بچا تھا جس پر چل کر میں کسی کامیابی کی امید کرتا۔"

بیگم عافیہ نے مسٹر سلیم کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ "چھوڑیئے، کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ کتنے اعلیٰ ظرف انسان ہیں سلیم! کہ میرا سہارا بن کر آپ سہارا دینے کا کریڈٹ بھی مجھے دے کر مجھے اپنی ہی راہوں پر جھیل جانے والی ہر اذیت، ہر شرمندگی سے بچا لیتے ہیں۔ مجھے آپ کا ساتھ، آپ کا محبت بھرا ہر سانس کے گرد رکھے جانے کا ہر وعدہ بھی قبول ہے۔ میں زندگی چھوڑ سکتی ہوں مگر آپ کا ساتھ ناممکن......"

مسٹر سلیم نے بیوی کا ہاتھ تھام کر اسی جذباتی لہجے میں کہا۔ "ہاں...... مجھے تمہاری یہی طوفانی محبت ہی تو پرجوش رکھتی ہے۔ ہر مشکل تمہارے اس اظہار کے آگے بے بس ہونے جیسی لگتی ہے۔"

عافیہ کی آنکھوں میں شوہر کی اس بے پناہ محبت پر موتی سے چمکنے لگے۔

یہ آنسو بھی کیا ہوتے ہیں، دکھ میں کسی دوست سے پہلے باری نبھانے آ جاتے ہیں اور خوشی میں بھی سب سے پہلے ساتھ نبھانے کو موجود ہوتے ہیں۔ تبھی انہیں ہونے دیتے اور ان کی یہی صفت دل کو بھلی لگتی تھی۔ وہ کمرے سے جا چکی تھیں جب چاپنگ کرکے انوشے داخل ہوئی۔ مسٹر سلیم نے بیٹی کو دیکھا، ٹھیک پانچ کی جگہ پر آب کتابی انتظار آپ بیٹھے ہوئے وہ کسی انگریز سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ انہیں ماڈرن سے بہت کم فرصت ملتی تھی کہ وہ اولاد کی طرف توجہ دے، مگر انہیں اس کا بھی یقین تھا کہ گھر میں ان کی بیٹیوں کی نگہبان ہوتی ہے، وہ اپنی جان تو دے سکتی ہے مگر ان کے گھر پر آنچ نہیں آنے دے سکتی۔ یہی یقین انہیں دنیا سے لڑتے رہنے میں مضبوط رکھتا تھا۔ مگر آج جس طرح عافیہ بانو کی آنکھ میں آنسو آئے تھے، ان کی روح تک پر اس کا افسوس پتھر باندھ کر بیٹھتا چلا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج انوشے کے آتے ہی انہوں نے اس کے حلیے پر غور کیا۔ وہ کہیں سے بھی پاکستانی لڑکی نہیں لگ رہی تھی۔ رسم و رواج تو دور کی بات، وہ تو عام انداز میں بھی پاکستانی جھلک دینے میں ناکام رہی تھی۔

انوشے نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی کیونوں بیگ صوفے پر اچھالا تھا، پھر چیونگم چباتی وہ بالکل ان کے سامنے والے صوفے پر بے ڈھنگے انداز سے بیٹھ گئی تھی۔ آدھی صوفے پر تھی، آدھی صوفے

AANCHAL.COM.PK

سے باہر نکلی ہوئی موبائل پر گیم کھیلنے میں مصروف تھی۔ اس نے اتنی توجہ تک دینا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ باپ کو غیر متوقع گھر میں دیکھ کر وہ سلام ہی کر لیتی۔

"انوشے......!" مسٹر سلیم نے لہجے کو بے حد نرم رکھ کر اسے پکارا۔

انوشے سلیم نے باپ کی آواز پر بے پروائی سے ذرا ان کو دیکھا، پھر نظر موبائل پر جمائے ہوئے بولی۔ "کہیں پاپا! کیا کہنا ہے؟...... میں بہت مصروف ہوں۔"

سلیم صاحب کو لگا وہ کسی عالیہ یا کوئی ذہنی اذیت سہہ رہی تھیں۔ ان کا ایک منٹ میں حساب خراب ہونے لگا تھا۔ یہی حیثیت تھی، وہ ٹی وی کی مصروفیات چھوڑ کر یکدم مکمل طور پر بیٹی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"یہ تم نے کس قسم کا لباس پہن رکھا ہے؟" پہلا سوال ہی چبھتا ہوا تھا۔ مگر وہ لڑکی جس نے باپ کی بات پر انتہائی حیرت سے دیکھا تھا۔

"پاپ کو میرے لباس میں کیڑے کیوں نظر آنے لگے؟" اس نے توقف کیا، پھر چڑ کر بولی۔ "یقیناً ماما کی کارستانی ہوگی۔ انہیں ہی ہم سے عجیب پرخاش رہتی ہے۔"

مسٹر سلیم کچھ کہہ بھی نہیں پائے تھے کہ وہ پہلے سے زیادہ خراب لہجے میں بولی۔ "پاپا! آپ کو کس نے کہا تھا کہ شادی جیسی گھٹیا گھٹن میں ڈالو؟ وہ بیٹیاں تو تم بھی پال سکتے تھے۔ اب ذمے داریوں کی لسٹ دیکھو۔ ہم کہتے تھے کہ ماما کی بیٹی اور ایک یتیم خانے کے بچے کی ذمے داری بھی تمہارے سر آ گئی؟ پاپا! تم نے اپنی زندگی کی بہت غلط پلاننگ کی ہے۔"

مسٹر سلیم کو لگا ان کے دماغ میں کسی نے ہتھوڑا سا مار کر ان کی پن کھینچ کر مٹھی میں بند کر لی ہو اور ان کی ذات کے پرخچے اڑنے میں صرف تیس سیکنڈ ہوں۔ یہ ان کی بیٹی تھی...... انہیں حیرت نے گھیر لیا تھا۔

انہوں نے تو بہت پیار محبت سے پالنے کی کوشش کی تھی، پھر کیوں خراب لگتا تھا۔ محبت کا عنصر زیادہ ہی غالب آ گیا تھا۔ مسٹر سلیم نے اپنی بیگم کے سامنے کو معاف کیا تھا؟ انوشے باب سوچ رہی تھی مگر اس کی باتیں ان کے دماغ میں ابھی تک گونج رہی تھیں۔ وہ لاپروا تھی۔ کچھ کہہ کر لینا، یہ دیکھنا کہ اس کے لفظوں سے کسی کے دل پر کیا گزر رہی ہے، ابھی تک اس کی یہ عادت نہیں تھی کہ وہ خیال کرتی...... مگر جو عادت انسان میں نہ ہو ضروری نہیں تمام عمر یہ صفت پیدا ہی نہ کی جا سکے۔ انہیں یاد آ رہا تھا، جب وہ وقت کی پابندی میں کوتاہی کرتے تھے تو ان کے بابا نے اپنے مرحوم کا شیڈول ان کے ہاتھ میں لا رکھا تھا۔

"میں مصروف رہتا ہوں بیٹا! ذرا سی دیر کی ڈائری سے دیکھ کر بتاؤ... مجھے کس وقت کیا کیا کام سرانجام دینا ہے؟" اور وہ ڈائری ہاتھ میں لیے بابا کے حکم پر سارا دن ڈائری میں لکھے وقت کو ہو بہو منٹ مکمل خرچ دے کر بابا کی گزارش کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ کوئی میٹنگ بھول جاتے مگر مسٹر سلیم ایک ایک سیکنڈ کا حساب رکھتے اور پھر جب ان کی یہ عادت پختہ ہو گئی تو بابا نے ایک دن مسکرا کر کہا۔

"کیوں بیٹا! وقت کی قدر آئی؟ اب تو میرے خیال میں تمہیں ایک ایک منٹ، سیکنڈ کا حساب کتاب رکھنا آ گیا ہوگا۔"

ابا جیسا اور ہمدرد کہاں سے لاؤ گے؟ بکھرے رہ گئے۔ کبھی چالاکی سے انہوں نے انہیں وقت کی پابندی کا سکھایا تھا۔ سالوں لگے تھے انہوں نے ابا کی طرح سوچ کر اپنے اندر داخل ہونے والے لالچ کو روکا تھا۔
"بہت پیار سے سمجھاتے تھے ابا جی۔ ذات پہ رشتے میں کام مگر بھی سکتا ہے۔" حافیہ نے انہیں جاتے جاتے سمجھایا بھی تھا۔ سو وہ گنگناتے کھانے کے کمرے میں آ گئے۔
لنچ کا وقت تھا۔ حافیہ کچن میں کھڑی سبزی کاٹ رہی تھی اور تیہ بنانے میں مصروف تھیں۔ مسز سلیم ان کی پشت کو دیکھتے رہے۔ یہ عورت ان کے لئے بڑی قربانی دی تھی۔ وہ کتنا نیچے گر گئے تھے تب بھی اس عورت نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں مزید گرنے سے بچا لیا تھا۔ تمام عمر یہ عورت سمجھتی رہی سلیم افسر نے انہیں سہارا دیا ہے۔ مگر یہ سلیم افسر جانتے تھے اس لمحے اگر حافیہ بانو کا ہاتھ انہیں نہ تھامتا تو شاید وہ کبھی اپنے پیروں پر کھڑے نہ ہو سکتے تھے۔ یہ عورت کتنی عظیم تھی۔ اس نے عزت کے لئے اپنی ممتا کو کھو دیا تھا۔ سب سے کڑا امتحان تھا وہ...... وہ لمحہ جس میں انہیں لگا تھا شاید انہوں نے سب کچھ گنوا دیا ہے۔
ابا کی ساری کمائی دولت، عزت اور کردار کھا کر...... وہ قلاش ہو گئے تھے۔ ان کے لئے کوئی راہ نہیں بچی تھی۔ جب انہوں نے آخری جوا کھیلا تھا۔
سلیم افسر کی نظریں حافیہ بانو کی پشت پر اب بھی ٹکی ہوئی تھیں مگر وہ جیسے کہیں ماضی میں کھو گئے تھے۔
ابھی کل ہی کی تو بات تھی۔ جب چاکما ابا نے اپنی طبیعت کی ناسازی کے تحت سارے کاروبار ان کے نام منتقل کروا دیے تھے۔ افسر سلطان ایک فارماسیوٹیکل کمپنی کی اونرشپ رکھتے تھے۔ بڑے بڑے لوگوں میں ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ باہر سے ادویات کی ترسیل بھی ان کا ایک کمپنی شعبہ تھا۔ ڈیکلیئرڈ میڈیسن کو ... قیمت کے ساتھ مکمل اعتماد کے اضافی چارج لئے بغیر ڈیلیور کرتے تھے۔ نیکی اور ایمانداری ان کی اس کاروبار میں بہت اچھی ساکھ تھی۔ وہ برسوں سے یہ کام کر رہے تھے لیکن جب یہی کام سلیم افسر نے پہلی بار کیا تو ان کی پہلی ہی کھیپ سیل کر دی گئی۔ ان کی منگوائی گئی ادویات میں کچھ ایسی ادویات شامل تھیں، جو کہ نہ صرف پابندی تھیں بلکہ ان کے ساتھ منشیات ساری دنیا میں حتمی تاریخ کے اعتبار سے خطرناک تھے۔
تب افسر سلطان نے پہلی بار بیٹے کے ساتھ سختی کی اور سوال کیا۔
"پیسہ تمہارے لئے کتنا ضروری ہے؟"
"صرف ابا! اگر عزت سے ملے تو بڑی نعمت ہے۔ میرے لئے بزنس صرف دولت کمانے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ میں اس کا اپنے لئے حساب اس لئے رکھتا ہوں کہ مجھے معلوم ہے میرے کام سے ہزاروں لوگوں کا روزگار جڑا ہے۔"

مسٹر افسر سلطان نے بیٹے کو دیکھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بس، مجھے تسلی ہو گئی۔ میرا خون خراب نہیں ہے۔ اب بھلے مجھے اس بزنس میں نقصان ہو یا اس کیس میں تم ہار جاؤ یہ مجھے سے، میں سر اٹھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی اولاد کی بہت اچھی تربیت کی اور اس خدا نے میری اس تربیت کو شرف قبولیت بخشا کہ تمہارے دل کو اندر سے اتنا نرم کیا کہ اس میں نیکی کے بیج بونے کے لئے مجھے بہت محنت نہیں کرنی پڑی۔"

افسر سلطان نے بیٹے کو سپورٹ کیا تھا۔ خود سلیم افسر ذاتی طور پر اس سلسلے میں بھاگ دوڑ کرنے میں مصروف تھے۔ مگر اوپر سے لے کر نیچے تک ہر شخص جیسے ایک ان دیکھا اکاؤنٹ بھرنے کے لئے سامنے آن بیٹھا تھا۔ وہ معاملات سدھارنے کی کوشش میں تھے کہ جان بچانے والی ادویات کی شارٹیج ہو جانے کو اخبارات میں خوب اچھالا جانے لگا تھا۔ ان کا نام بھی ان امپورٹرز میں شامل تھا۔ تب انہوں نے پہلی بار پریس کانفرنس کی تھی اور اپنے معاملے کو بہتر انداز میں سب کے سامنے لائے تھے۔ حکومتی سطح پر بندی کی گئی تھی، ان کے کیس سے قطع نظر باقی دواؤں کی ترسیل ممکن بنائی گئی تھی۔ بہر حال کسی حد تک ان کی شنوائی ہوئی تھی مگر ان کی ساکھ اب بھی منظر سے مٹی تھی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا جب ایک بہت اچانک مس روپ ان کے سامنے آن رکا۔

"میں تمہاری اس سلسلے میں مدد کر سکتی ہوں، لیکن اس کے بدلے میں تمہیں بھی ہمارا خاص خیال رکھنا ہوگا۔"

"میں کس سلسلے میں آپ کا خیال رکھ سکتا ہوں؟" انہوں نے حیرت سے دیکھتے ہوئے بہت ادب سے کہا تھا۔

"سیدھی سی بات ہے تمہارا سارا سامان کلیئر ہو گیا تو جو سامان قانونی نقطہ نظر سے ٹھیک ہے وہ سامان میں خریدنا چاہتی ہوں۔"

"آپ...... مگر آپ کیا کریں گی؟ یہ تو صد ہیلائی میں رکھنا ہے خود کو سپلیمنٹ ہیں، ایسی ادویات ہیں جو ذہانت پروگرام ہم کرنے والوں کے لئے زہر ہے اور جنہیں یہاں کی کچھ غیر قانونی کمپنیاں نئی پیکنگ اور نئے نام سے مارکیٹ میں سیل کرتی ہیں۔ یہ کاروبار منشیات کی طرح ہے۔ مگر اس سلسلے میں ابھی تک حکومتی کوشش بار آور نہیں ہو سکی۔ آپ بھی دیکھئے، میں پیسے کا دلدادہ نہیں ہوں لیکن پھر بھی بری طرح جکڑا گیا ہوں۔"

ایک خفگی سی مسکان ان کی اس طویل تفصیل پر ان کے گرد گھیرا ڈالے وہ بغور سامنے دیکھنے لگے۔ "آپ کس بات پر ہنس رہی ہیں مس......؟"

"مجھے تانیہ کہتے ہیں۔" ادھورے جملے میں جواب ان کی طرف بڑھا دیا گیا۔

انہوں نے نئے سرے سے سوال کیا۔ "آپ کو میری کون سی بات احمقانہ لگی مس ثانیہ! کہ آپ نے قہقہہ لگانا ضروری سمجھا؟"

ثانیہ نے اس کی ناگواری کو حیرت سے دیکھا پھر دھیرے سے بولی۔ "لگتا ہے آپ سے آج تک کسی نے بزنس کے علاوہ گفتگو نہیں کی ہے۔ لطیف جمالیاتی حس اور ذوق مزاح آپ کے قریب بھی نہیں پھٹکا۔"

سلیم افسر نے شانے اچکا کر کہا۔ "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں ایک دو اور دو چار کرنے والے بزنس مین کا بیٹا ہوں۔ اردگرد مجھے کبھی دوستوں کا جھرمٹ نہیں ملا۔ نہ ہی مجھے شوق ہے۔ اس لئے آپ کہہ سکتی ہیں میں انتہائی خشک انسان ہوں۔ ویسے آپ نے بتایا نہیں، آپ کا قہقہہ کس شمار میں تھا؟"

ثانیہ نے اپنی ساڑھی کا پلو درست کیا پھر کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "یہ ڈیل ہی میرے بزنس کا حصہ تھی، مگر وقت کی کارکردگی کامیاب نہیں تھی اس لئے آپ کی سپلائی میں یا روایات رکھ کر ڈیل کروائی گئیں۔ میرا خیال تھا ہمیشہ کی طرح ہم یہ مال کلیئرنس کروالیں گے، مگر تمہیں سوچ تھا کہ ایک ایماندار افسر کی تقرری سے یہ معاملہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ مگر جب آپ کا کیس اخبار میں گیا تو افسران کے دلوں میں لامحالہ آپ کے لئے نرم گوشہ بنتا چلا گیا۔ آپ کا کام بھی نکل گیا، اس لئے میرا راستہ ہموار ہوا، میں بھی اپنے کام سے فارغ ہو جاؤں۔"

سلیم افسر نے حیرت سے دیکھتے رہے پھر آہستگی سے بولے۔ "کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کس چیز کا اعتراف کر رہی ہیں؟ اگر یہ بیان آپ کے خلاف استعمال کیا جائے تو آپ کہاں ہوں گی، آپ کو پتہ ہے؟"

ثانیہ شرارت سے مسکرائی پھر سنجیدگی سے بولی۔

"آپ کو نہیں معلوم میں کیا چیز ہوں۔ اگر میں نے یہ اعتراف کیا ہے آپ کے سامنے تو اس اعتراف سے مکر بھی سکتی ہوں۔ یہ کوئی نہیں، میرے ہاتھوں میں وہ جادو ہے کہ آپ میری کہی ہوئی بات کو ثابت نہیں کر سکیں گے۔ آپ کی جگ ہنسائی آپ کے سر رہے گی۔ رہا مال تو اس کی ڈیلیوری اٹھوا لینا میرے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔ آپ کو تو پتہ ہے ہمارے ملک میں ہر چیز، ہر پرابلم کا ایک سلوشن ہے اور وہ ہے پیسہ...... پیسے سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ اب یہی دیکھ لیجئے، آپ کے مال کو پورٹ پر پڑا رہنے دینے کے بعد جب سب کچھ ہو گیا تھا تب ہماری مال کی ترسیل اس کھیپ میں کی گئی۔ آپ اس طرح مجھ سے نہیں بچ سکتے مسٹر سلیم افسر! کہ کوشش کے باوجود خود کو اس چنگل سے نہیں نکلوا سکتے۔ ہاں، اگر میرا ساتھ دیں تو یہ کام آسانی سے ہو سکتا ہے۔"

سلیم افسر نے پھر سے خاموشی اختیار کر لی تھی کیونکہ ابھی ان کے بہت سے روابط کے نتیجے میں ڈیل کی تھی اور بہرحال اس سلسلے میں انہیں کافی بڑی رقم چکانی پڑ رہی تھی۔ اگر یہ ڈیل جلدی مکمل نہ کی جاتی تو ان کا مال پورٹ پر پڑے پڑے ہی ضائع ہو جانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ مسٹر افسر سلطان نے اس سلسلے میں بیٹے کی رائے لی تھی مگر سلیم افسر نے یہاں بھی وہی خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ پھر یوں ہوا۔

اخبارات میں کچھ افسروں کے نام آئے تھے جنہوں نے بے تحاشہ رشوت دے کر ان کی سپلائی میں گڑبڑ کی تھی ساتھ ہی جو اس میں موجود کچھ خصوصی ٹیم کے افراد نے مال کی جانچ کاری کی تھی اور واقعی وہاں بے ضرر دواؤں کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوا تھا۔ مسٹر سلیم افسر نے دھڑکتے دل اور پسینے سے شرابور جسم کے ساتھ اس معائنہ ٹیم کا استقبال کیا تھا اور جب انہیں کچھ نہیں ملا تو انہوں نے ایک بار پھر بزنس کا آغاز کا انعقاد کیا تھا۔ وہ تین افسروں کی لسٹ جاری کی گئی تھی جو اس مذموم کارروائی میں شامل تھے۔ انہیں فوری طور پر معطل کر دیا گیا تھا۔

وہ اس طرح صاف عزت بچ جانے پر دنیا کے شکر گزار تھے۔ مگر یہ سب کیسے ممکن تھا اس سلسلے میں وہ مخلص انداز سے سوچ رہے تھے۔ پھر وہ اس ڈیل کی کامیابی کا جشن منا رہے تھے، جب ماہ نور بہت اچانک ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"قسمت کا تحفہ سب سے قیمتی ہوتا ہے۔" گلدستہ ان کی طرف بڑھا کر وہ مسکرائی اور دونوں ہی مسکرا دیئے۔

اس بزنس میں انہیں اضافی طور پر فائدہ ہوا تھا۔ جتنا پیسہ لگایا تھا اس سے دگنا ہو کر واپس ملا تھا۔ جنہوں نے یہ خاموش ڈیل اپنے ابا سے چھپائی تھی۔ سب ہی اکاؤنٹس کی ان کی تحویل میں کچھ عرصہ پہلے ہی کھلی تھی۔ ابا نے ان کے طور طریقے بدلے دیکھے تھے مگر جانے کیوں ان سے سوال نہیں اٹھایا تھا۔ بقول ان کے دولت جب تک چھپ کر کی جائے خوف رکھتی ہے۔ دولت کا عنصر رکھتی ہے۔ لیکن یہ آشکار ہو جائے تو انسان پھر اسے دھڑلے سے "حق" کی طرح استعمال کرنے لگتا ہے اور وہ اس درجے تک نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔ مگر افسر سلطان جب ماہ نور سے تقریب کے بعد ملے تو ان کا پہلا سوال تھا۔

"کیا تمہیں یہ لڑکی پسند ہے؟

کیا تم اس سے شادی کرو گے؟

یا پھر کیا یہ صرف تمہاری بزنس پارٹنر ہے؟"

تین سوال ایک ساتھ ہی...... وہ ابا کو دیکھتے رہ گئے پھر آہستہ سے بولے۔

"شاید آپ کے دل میں مجھے لے کر بہت سے سوال اٹھ رہے ہیں۔ مگر ابا یہ سچ ہے، میں اس سمندر میں رہ کر تجربوں سے ہی کچھ سیکھ سکتا۔ ہر دور کی کچھ ضرورتیں ہوتی ہیں۔ آپ کے دور میں ایمانداری،

وفاداری، خواہش کی نوعیت کی ہو یا شخصی نوعیت کی، ایک ہی حیثیت رکھتی تھیں۔ مگر آج کا دور ڈالر کا ہے۔ آج کل صرف سورج کو دیکھ کر رشتے بنانے والے لوگ ہی کاروبار میں ان ہیں...... آپ جانتے ہیں، میں اپنی پہلی ہی ڈیل میں کس طرح پھنسایا گیا تھا...... دراصل یہ ڈیل پہلے سے تانیہ کی طے کردہ تھی۔ کچھ رقم کے معاملے پر تنازعہ تھا، جس کی وجہ سے ان افراد نے اسے توہین آمیز بنا کر اس تیم میں مجھے ڈیپ کرنے کی کوشش کی۔ بظاہر تو یہ تانیہ ہی تھی مگر اس کی وجہ سے میں بھی راندے میں آ گیا۔ تانیہ نے معاملات مدعا کو لے لئے تو آپ نے دیکھا وہی افسر آسانی سے معطل ہونے کو بھی تیار ہو گئے۔ کیونکہ وہ آن ڈیوٹی کی طرح تنخواہ کے ساتھ معطل ہوئے اور پاکستان میں نرم گرم نوکری ہو کر کون ما شبہ لیا ہے۔ جہاں اس طرح کے افراد واپس نہیں لے لئے جاتے؟ انہیں معلوم تھا وہ کچھ عرصے بعد پھر سے آن ڈیوٹی ہوں گے۔ اگر نہ بھی ہوئے تو نمبر دو کام سے پہلے تا ان کے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔ پھر تانیہ نے بھی انہیں اس خاموشی کی اچھی قیمت ادا کر دی تھی۔ اس لئے صاف ہاتھ بچا کر نکلنا ممکن ہو گیا۔ آپ کو حیرت نہ ہوئی ہوگی۔ لیکن مجھے حیرت تھی کہ راتوں رات کس طرح ضبط شدہ مال کسٹم اور ختم ہو گیا۔ اب میں یونیورسٹی میں سیدھا سادہ پڑھنے والا لڑکا تھا۔ مجھے بزنس کی سیاست سیکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی ذریعہ تو چاہئے ہوگا نا۔"

"یعنی تم تانیہ کے نمبر دو کام میں سہولت سے اس کا ہاتھ بٹاؤ گے؟" ابا نے غور سے پہلی بار دیکھا۔

انہوں نے خاموشی کی زبان میں جواب دیا تو ابا نے قطعی طور پر ان کے بزنس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ڈاکومنٹ پہلے ہی وہ منتقل کر چکے تھے۔ اس لئے اب ان کا زیادہ وقت اپنے فارم ہاؤس میں گزرتا۔ یہاں تک کہ دو سال میں سلیم افسر نے اتنا کما لیا جتنا ابا نے پندرہ سال میں کمانے کی کوشش کی تھی۔ زندگی بہت سہل تھی، خوب صورت تھی۔ جب ابا کا حوصلہ ان میں ایک بار پھر سے لوٹا۔ بزنس پارٹنر کو لائف پارٹنر بنا لینے سے بہت سے مسائل حل ہو جایا کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی انہوں نے ورکنگ ڈنر میں تانیہ کو شادی کی آفر کر دی۔ یا ہوش مند ہوتے تو شاید وہ اتنے واضح الفاظ میں شادی کی آفر نہیں کر سکتے تھے۔

تانیہ ان کی طرح مدہوش نہیں تھی۔ اس نے پہلی فرصت میں ان کے ہاتھ میں پہنی رنگ نکال کر اپنی انگلی میں ڈال لی اور بہت اترا کر بولی۔ "تم جیسا شریک سفر ملنا میری خوش نصیبی ہے۔ مگر مجھے کسی ایک کا ہو کر رہنے کی عادت نہیں ہے۔ سو تم مجھ سے وعدہ کرو، اگر کبھی میں تمہاری پسند کی ہوئی زندگی سے اکتا جاؤں تو تم مجھے کسی بندھن میں جکڑنے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

وہ لال ڈورا آنکھوں سے تانیہ کے سراپے کو دیکھنے لگے، پھر بغیر سوچے ہوئے بازو وا کر کے بولے۔ "مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔ تم جیسی لائف پارٹنر کے لئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اگر آج تم یہ کہتیں کہ تمہیں بچے اچھے نہیں لگتے تو میں اپنی ممتا تمہاری تمنا پر سے وار دیتا۔ تم جان ہی نہیں سکتی ہو تانیہ! میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔"

تانیہ ان کے اظہار کے آگے ایک سیکنڈ نہ ٹھہری رہ سکی۔ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والی روح تھی، کتنے افیئرز چلائے تھے، کتنی ٹھوکریں دلوں کو ماری تھیں، تب کہیں جا کر اب احساس ہوا تھا کہ اسے اب اپنے مستقبل کے لئے کوئی محفوظ قدم اٹھا لینا چاہئے۔ زندگی میں اس نے ہمیشہ ایک ہی زندگی کو چلتے دیکھا تھا۔ دولت پاس ہو تو کچھ بھی خریدنے کا سوچا جا سکتا ہے، کچھ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے دولت کمانے کی الگ راہ چنائی تھی۔ اچھے خاندانی معیار سے ہٹ کر الگ معیار بنایا تھا۔ لیکن جب بات شادی کی چھڑی تو اس نے انہیں اپنی کزن کے سامنے لا کھڑا کیا۔

"یہ ماحول...... یہ لوگ......"

اُن کی آنکھوں میں سوال اُمڈ آئے۔ تانیہ کا لائف اسٹائل تو کہیں سے اس دنیا کا ہو رہ نہیں لگتا تھا۔ وہ تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ تانیہ گھر والوں کی چھتا چھتی اور طبقے کی چھاپ سے کوئی علاقہ رکھتی ہوگی۔ وہ تو اسے ایک شارپ بزنس وومن سمجھتے تھے، جسے ہائی فائی سوسائٹی میں موو کرنے کا ڈھنگ آتا تھا اور جسے ہر رنگ کو شوق شکل سے اسٹیپ لینے پر اکساتا تھا مگر یہاں......

وہ ایک لمحے کے لئے کھو سے گئے تھے۔ ان کے اندر کا خون جوش مارنے لگا تھا۔ مگر دولت سے وہ جو زندگی گزارنے لگے تھے اس نے بھی ان خاصیت کو زیادہ وہ ابھرنے نہیں دیا تھا۔ انہوں نے فوراً رشتے کی بات کروا دی تھی۔ حالانکہ یہاں شادی بیاہ کا رواج رواج نہیں پا سکا تھا مگر پھر بھی انہوں نے عہد لیا تھا اور ایک ہفتے بعد تانیہ ان کی زندگی میں چلی آئی تھی۔

وہ بہت خوش تھے۔ ابا ان کو دیکھ کر چپ ہو گئے تھے۔ مگر ان دنوں وہ جس ہنڈولے میں جھول رہے تھے، اس نے ابا کی ان ساری باتوں کی کہاں گنجائش رکھی تھی۔ سو زندگی کا انہوں نے ایک طویل ارجن دیا تھا۔ اپنی من مرضی کرنے کا ایک طویل ارجن...... زندگی لگے اپنے اصولوں کے برخلاف بہہ رہی تھی اور وہ خوش تھے۔ تانیہ ... تانیہ استاد کی جھلملاتی اور رنگ برنگ کیا کیا خوابی نہیں تھی جوان۔ سالوں میں دوائی تھی اور کیا کیا نہیں تھا جو بدل گیا تھا۔ ابا بھی اس عرصے میں فریق رحمت ہو گئے تھے۔ جو ہو رہا تھا وہ دیکھنا نہیں چاہتے تھے اور جو ہونا چاہئے تھا اس کے امکان کا شگن مٹ گیا تھا، سو انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں، موت اوڑھ لی تھی۔

سلیم افسر کی اس عرصے میں دو بیٹیاں ہو گئی تھیں۔ ان کی ساری دولت تانیہ سلیم افسر کے نام ٹرانسفر ہو چکی تھی۔ یہ ان کا قانونی حق تھا۔ کیونکہ وہ ان کی اولاد کی ماں تھی۔ مگر وہ صرف ماں بن کر رہنا نہیں چاہتی تھی۔ نہ صرف وہ کام میں وہ اتنی مہارت رکھتی تھی کہ اس نے وہ پراپرٹی بھی، جو انہوں نے اپنے برے وقت کے لئے اختیار کی تھی، ان سے پوچھے بغیر اپنے نام منتقل کروالی تھی۔ جب انہیں پہلی بار پتہ چلا تو پہلا جھگڑا ان کا اس دن ہوا۔

"تم...... مجھے پتہ نہیں کیوں یہ لگنے لگا ہے کہ تم صرف میری بیوی نہیں ہو۔"

ثانیہ نے تلخی سے انہیں دیکھا تھا پھر ہنس کر بولی تھی۔ "تمہاری حسیات حیرت انگیز طور پر ہمیشہ اوور ورکنگ کرنے کے باوجود تمہیں غلط مشورہ نہیں دیتیں۔ مگر افسوس تم نے ہر معاملے میں دیر کر دی ہے۔"

"تم نے مجھے لوٹ لیا ہے...... کنگال کر دیا ہے...... میرے سوئس اکاؤنٹ کی ساری رقم تمہاری عیاشی کی نذر ہو گئی ہے اور بزنس پراپرٹی کا سارا لین دین تم نے جعلی کاغذات کے ذریعے اپنے نام کروا لیا ہے۔ مجھے تہی دست کر دیا ہے ثانیہ! مجھے سمجھ نہیں آتا کوئی عورت اتنا چھل بھی کر سکتی ہے۔ ایسی عورت جس کی دو بیٹیاں بھی ہوں؟"

"بیٹیاں...... یہ دونوں تمہارا پیدا کردہ ہے۔ تمہیں معلوم ہے مجھے اولاد کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میں نے ہمیشہ اس ذمے داری سے جان چھڑانی چاہی تھی۔ مگر یہ بھی ایک بد روح تھیں کہ میری ہزار کوشش کے باوجود دنیا میں آ کر رہیں۔ تم نے پہلی بچی کو گود میں لے کر جس محبت کا اظہار کیا تھا وہ میرے لیے حیرت انگیز تھا۔ تمہارے لیے یہ محبت کے چھوٹے چھوٹے پیرائے تھے اور میرے لیے یہ دوہرا...... مگر تم یہ نہیں سمجھ سکتے۔ اس لیے علینا کے بعد میں نے اس ذمے داری سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ اٹھا لیا۔ میرا خیال تھا، گورنس اور آسائشات کے ساتھ یہ دونوں بچیاں پل جائیں گی۔ لیکن یہ بچیاں تمہاری طرح تھکی ہیں۔ انہیں پیار چاہیے، ممتا چاہیے، گود کی گرمی چاہیے۔ ڈیم فٹ۔"

وہ جھٹکے سے کسی صوفے پر بیٹھ گئی۔ ایسے بے ڈھنگے انداز میں کہ آدھی صوفے پر تھی، آدھی صوفے کی ہتھی سے باہر۔ ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی تھی۔ سیم اصغر نے بیوی کو دیکھا۔ تنگ پائنچے کی جینز، سلیولیس بلاؤز، ٹاپ شرٹ...... وہ حیرت سے اس دن پہلی بار جاگے تھے۔ پہلی بار انہوں نے پوری حسیات سے اس عورت کو دیکھا تھا...... عورت کہ جس سے انہیں کبھی محبت ہونے کا دھوکا ہوا تھا۔

یہ عورت تو صرف بازار میں بکنے والی عورت تھی اور انہوں نے اس سے اتنا پاکیزہ رشتہ جوڑا تھا...... انہیں خود پہ حیرت ہونے لگی تھی۔ علینا اور نوشے کو دیکھ کر انہیں لگتا تھا بابا کی نسل بہت دور سے جو جسم میں آ کر پھنس گئی ہے۔ مگر وہ بال بال قرض میں اپنے جکڑ گئے تھے کہ ان کی یہ سوچ انہیں کوئی راستہ نہ دکھا سکی۔ علینا اور نوشے کو ثانیہ نے بورڈنگ ہاؤس میں ڈال رکھا تھا۔ وہ اب میدان صاف دیکھ کر ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے پیار سے، محبت سے، غصے سے، ہر طرح سے آزمایا مگر ثانیہ کی چال نہ بدل سکی۔ پھر وہ کچھ سوچنے سمجھنے کی حد سے ایک انچ ادھر کھڑے تھے۔ جب انہوں نے ثانیہ کو کیا انتظر ستانہ طرح دیتے رہے مگر بات جب ان کی حد سے آگے نکل گئی تو وہ دو بدو پر اتر آئے۔ ثانیہ نے یہ مزاج دیکھا تو خلع کے کاغذات سامنے لا رکھے۔

"بہتر ہے ہم مزید کسی الجھن کے بجائے علیحدہ ہو جائیں۔ شادی کا حسن ماں کبھی تمہاری سو کالڈ شرافت نے بچھایا تھا سو مجھے اس حماقت کے جیل خانے سے تم ہی نکالو۔ مجھے نہیں رہنا تمہاری دنیا

میں..... تمہاری دنیا..... سانس لینے کی آزادی سے بھی چھین لے گی۔"

وہ منہ دیکھتے رہ گئے۔ نشے کے باعث انہیں کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔ مگر صبح جب وہ جاگے تو انہوں نے بنا کسی تردد کے خلع کے کاغذات پر سائن کر دیئے تھے۔ تانیہ زیورات اور سارے ڈاکومنٹس لے چکی تھی۔

قریبی دوست فاروق اعظم نے ملامت کیا۔

"تمہیں اتنی جلدی ہار نہیں ماننی چاہیے تھی۔ اسے عدالت میں تو گھسیٹتے، چکر پہ چکر لگواتے۔ دنیا کسی دھوکا دہی کا بھی چارج کر دیتے تو پھر پتہ چلتا، دیکھتے اور کیسے محبت کی نئی کہانیاں شروع کر پاتی۔"

سلیم افسر کچھ نہیں بولے۔ مگر قرض کی واپسی کا تقاضا کیا تھا کہ وہ لامحالہ تانیہ شاہ کے پاس گئے۔

"مجھے کچھ رقم دے دو، قرض چکانا ہے۔"

یہ ساری رقم تانیہ ہی نے اپنی عیش پسندی میں اڑائی تھی۔ نئی سے نئی گاڑی، مہنگے کپڑے سے ملنے کے..... پیسہ کتنا ساتھ دیتا؟ پھر یوں ہوا تھا کہ کریڈٹ پر بات چلتی رہی۔ وقت اچھا تھا، کریڈٹ کا معاملہ نبھتا رہا مگر تانیہ کے ہاتھ جیسے جادو کی چھڑی لگ گئی تھی، سو بینک کا قرض بڑھتا گیا۔ وہ تانیہ سے ملتے تھے، وہ شکایت بھی کی تھی مگر ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ بینک نے ان کا کاروبار، جائیداد اور گھر قرق کر لیا۔ وہ سڑک پر آ گئے۔ بچیاں بورڈنگ ہاؤس سے نکال دی گئیں۔ ایسے میں ایک دوست بخشو شیخ نے ان کو سر چھپانے کی جگہ دی۔ بچیوں کی ذمہ داری بھی انہی نے اپنے سر لے لی۔ گھر بار میں آگ لگی تھی کہ وہ انہی گلیوں کی خاک چھاننے لگے، جہاں کبھی شراب میں بھی جانے کا نہیں سوچتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں، اس سب کے باوجود انہیں تانیہ سے نفرت نہیں ہو سکی تھی۔

ہاں وہ نفرت کرنے کی کوشش ضرور رہے تھے۔

پھر یوں ہوا وہ انہی گلیوں میں قید ہو گئے۔ ان کے ذہن سے یہ بھی نکل گیا کہ وہ کبھی باعزت زندگی بھی گزارتے رہے تھے۔ یا ان کا نام کبھی سلیم افسر بھی تھا۔ بیٹیاں کہاں ہیں، یہ خیال بھی نشے نے ان سے چھین لیا تھا۔ وہ تانیہ کے چوبارے کے باہر بیٹھے رہنے لگے تھے۔ لوگ ایک پیگ شراب یا ایک وقت کے کھانے کے لالچ پر اپنے بہت سے کام ان سے نکلوانے لگے تھے۔ وہ چوبارے میں خط و کتابت سے لے کر لڑکیوں کو لے کر جانے اور واپس لانے کی ذمہ داری تک میں اب کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

ان کی زندگی نے بہت دھوکہ دیا تھا۔ لیکن انہیں خود پر حیرت نہیں ہوتی تھی کیونکہ حیرت کے لیے بھی ہوش درکار ہوتا ضروری تھا اور یہاں وہ ہر لمحے، ہر آن ہوش و خرد کو جام میں ڈال کر اندر

کبھی اٹھتے بیٹھتے سامنے آ کھڑا ہوتا تھا وہ ایک ناکام زندگی ہیں، جس کا انجام بھی ناکامی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ماضی جب بھی یاد آتا انہیں ہر آن چین نہیں دیتا۔ یہی وجہ تھی وہ تھیمن سے مجھ سے حافظ مرا کی تھیں۔ وہ اس میں بہت پیچھے آ گئے۔ پھر یہی زندگی ان کا تعارف بن گئی تھی کہ وہ چہرہ چھپاتے۔ لڑکی ان کی سمت چلی آئی۔ اس لڑکی کو وہ بہت دفعہ ڈیسٹ پر خود ڈراپ کر چکے تھے۔ یہ جہنیاں جسم کے کاٹے کا سب سے قیمتی ممبر تھی۔ ان کی اور اس لڑکی کی اکثر بیچ ری چوری گفتگو رہتی تھی۔ مگر جب اس نے اس گفتگو کی نوعیت بدلی تو وہ حیران رہ گئے۔ وہ یہاں سے فرار ہونا چاہتی تھی۔

انہوں نے سنا تو خلاف توقع قہقہہ لگا کر پوچھا۔ "کیا کرو گی یہاں سے جا کر؟...... سب کچھ تو ہے یہاں۔ پیار، محبت، آسائش، زندگی......"

لڑکی نے ان کی طرف دیکھا، پھر بے بسی سے بولی۔ "سب کچھ ہے مگر یہاں عزت نہیں ہے۔ تم جانتے ہو اس عزت کے بارے میں...... میں نے سنا ہے تم بھی بہت بڑے بزنس مین ہوا کرتے تھے؟"

سلیم اختر نے نشیلی آنکھیں اس پر گاڑ کر اپنے خالی جام کی طرف دیکھا، پھر لاپروائی سے بولے۔ "کبھی تھا...... مگر اب میں یہ بھول جانا چاہتا ہوں کہ معاشرے میں عزت بھی کسی کمال کا نام ہے۔"

"تم کیوں بھولنا چاہتے ہو کہ عزت اور نام نسب کی کوئی وقعت ہے؟"

سلیم اختر نے لڑکی کو دیکھا، پھر بھرائے لہجے میں بولے۔ "میں ناکام ہوں اور ناکام کی کوئی عزت یا نسب سے کوئی علاقہ نہیں۔ میں بہت برا انسان ہو گیا ہوں...... اور مجھے لگتا ہے میں اب پہلی سی حالت میں کبھی واپس نہیں لوٹ سکتا۔"

"کیا واقعی انسان کوشش کرے تب بھی حالات نہیں بدل سکتا؟"

انہوں نے خمار سے اسے دیکھا، پہلی بار کسی بات پہ سوچا تھا انہوں نے۔ لیکن خمار آلود دماغ کیا واقعی کچھ سوچ سکتا ہے؟

سلیم اختر نے جواب نہیں دیا اور وہ لڑکی جو خود کو عافیہ بانو کہتی تھی، پھر سے لگن سے بولی تھی۔ "زندگی...... آپ کو پتہ ہے زندگی اسی لئے زندگی کہلاتی ہے کیونکہ یہ تغیر پسند ہے۔ تحریک اس کا خاصہ ہے۔ انسان زندہ رہے تو بدل سکتا ہے، صرف موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ زندگی میں زندہ رہنا چھوڑ دینا کہاں کا انصاف ہے؟ آپ جینے کا ایک بار چانس کیوں نہیں لیتے؟ دیکھئے! آسمان کی طرف ایک بار دیکھئے۔ آپ کہنے لگے گا، جب تک وہ خدا ہے، بہت کچھ بدلا جا سکتا ہے، بلکہ سب کچھ بدلا جا سکتا ہے۔ آپ ایک بار آسمان کو دیکھئے...... آسمان کتنا وسیع، کتنا نیلا ہے۔ کالے بادل آسمان پر ہمیشہ کے لئے نہیں چھاتے، یہ موسموں کا تسلسل ہے اور وہ موسموں کا خالق۔ وہ رنگ بانٹتا رہتا ہے۔ یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم کس رنگ سے زندگی سجاتے ہیں۔ سلیم صاحب! انسان کے اندر امید زندہ رہے تو انسان بھی زندہ

AANCHAL.COM.PK

رہتا ہے۔ امید خدا کا دامن ہے۔ آپ کو پتہ ہے یہ بات؟"

سلیم اختر خان اضطرابی کی حالت میں بے حد کشاں لڑکی کو دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں کچھ تھا جس نے ان کا دل تھام لیا تھا۔

پھر یوں ہوا وہ چپ چاپ کر ان سے ملنے آتی رہی۔ ہر بار ایک نیا امید کا در کھول جاتی۔ وہ بھی اس سے اپنے دل کی باتیں کرنے لگے تھے۔ انہوں نے تانیہ اور اپنی بیٹیوں کی بابت بھی کچھ نہیں چھپایا تھا۔ وہ یہاں شوفر کے طور پر نوکر رکھ لیے گئے تھے۔ مگر اب...... اب انہیں ایسا لگنے لگا تھا جیسے یہاں کی فضا کی کثافت سے ان کا دماغ پھٹنے لگا ہے۔ وہ اب یہاں نہیں رہ سکتے۔ تانیہ کی دلکش صورت بھی یہاں کی گندگی سے اٹ گئی تھی۔ دل سے انہوں نے یہ نام کھرچ کھرچ کر اتار دیا تھا۔ عافیہ بانو کا تھما دھیرے دھیرے ان کے دل کا زخم اتارنے لگی تھیں مگر جب وہ دور تک کریدتے تو عافیہ بانو کی ہر کوشش زیر و زبر ہو کر رک جاتی۔ وہ انہیں آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتی اور وہ فرار کے دوسرے ہوئے لہجے میں بولتے۔

"بے کار ہے یہ سب۔ میں اتنا بگڑ گیا ہوں کہ سدھر نہیں سکتا۔ تم بے کار محنت کر رہی ہو۔ کسی اور کو آزماؤ شاید تمہیں کامیابی مل جائے۔"

عافیہ بانو روتی ہوئی چلی جاتیں اور وہ شرمندہ ہونے کے بعد خود سے شرمندہ ہو جاتے۔ یہاں تک کہ ایک دن عافیہ بانو کو کسی کے ڈیرے پر چھوڑے جانے کا کام انہیں سونپا گیا۔ وہ پہلی بار عافیہ بانو کا تماشا ہوتا دیکھ رہے تھے۔ جگر خراش کی کیفیت...... ان کی روح شل کر دی گئی تھی۔ وہ گاڑی چلا رہے تھے اور عافیہ بانو ان کے برابر بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ اب تک جو امید کا دامن تھامے کھڑی تھی اس امید نے دل جلا دیا تھا۔ وہ بار بار عافیہ بانو کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ تب ایک جگہ رکتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ سب آپ کی زندگی کا حصہ ہے، پھر آپ یوں بلک بلک کر رو رہی ہیں جیسے کسی باعزت خاندان سے تعلق رکھتی ہوں؟"

عافیہ بانو نے سخت نظروں سے انہیں دیکھا، پھر آہستگی سے بولیں۔ "گناہ بے اختیاری میں کیا جائے تو معافی مل سکتی ہے، جان کر سمجھ کر کیا جائے تو جرم ہو جاتا ہے اس غلطی کی سزا ہے۔ میں بھی ویسی نہیں ہوں جیسا آپ سمجھتے ہیں...... مگر میرا رب کہتا ہے، اس نے میرے دل کو چھو کر پاک کر دیا ہے۔ پھر کسی بد ذات کا گزر بھی بندگی سے دور ہے۔ کسی بڑی بات کی کیچڑ سے خود کو لت پت کر دوں......

میرا باپ ایک معمولی انسان تھا مگر میری ماں بے پناہ حسین تھی۔ وہ واپس نہیں چلی آتی۔ میرے باپ نے مجھے اور عطیہ کو حاصل کرنے کی جتنی کوششیں کیں وہ ناکام ٹھہرائی گئیں۔ میری ماں جانتی تھی، میرا باپ عزت اور خاندانی وقار کی وجہ سے عدالت میں اسے نہیں گھسیٹ سکتا۔ اس لیے انہوں نے اپنی من مرضی کی۔ میں اور عطیہ جب تک اپنی زندگی کے اس رخ سے آشنا تھے ہمیں یہی زندگی بھلی اور

خوش گوار تھی یا شاید ہم ایسا سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اپنے اندر کی ناگواری کو ہم اپنی بے بسی کے نام پر مجبوراً پیچھے رہتے تھے، مگر جب سے بابا سے ملے ان کی موت کی خبر سنی، تب سے اندر سے کوئی ہے جو بار بار اکسا رہا ہے۔ چلو، زندگی کا رخ بدلو، یہ زندگی ہمارے لئے نہیں ہے۔ میں تب سے اس زندگی کو بدلنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ عطیہ بغاوت کر کے اپنا گھر بسا چکی ہے۔ مگر میں اس آزادی کے لمس کو محسوس کرنے کے لئے کب سے تڑپ رہی ہوں۔ بڑی بہن ہونے کے ناطے میں نے اسے اس کی مرضی کے مطابق سپورٹ کیا۔ بہت چال بازیوں کے بعد میں اسے اس غلاظت سے نکال سکی ہوں۔ بڑی ماں اسی بات پر مجھ سے اور زیادہ خار کھاتی ہیں مگر مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ لیکن یہ سچ ہے عطیہ کے ساتھ ہونے سے جو اپنا پن محسوس ہوتا تھا وہ تنہائی کی نذر ہو گیا ہے۔ میں یہاں اکیلی پڑ گئی ہوں۔ عطیہ نے یہاں سے نکل کر صرف ایک سال تک رابطہ رکھا، پھر شاید اس کے شوہر نے سختی سے روک دیا ہوگا۔ میں اب اس کی آواز تک بھولتی جا رہی ہوں۔"

وہ رو میں بہتے کہاں سے کہاں نکل گئیں۔ کتنی ساعتیں یونہی خاموشی کا پلو تھامے گزر گئیں، پھر انہوں نے حال میں لوٹ کر سلیم اختر کو مخاطب کیا۔

"سلیم صاحب! آپ کی تو خود کی بھی بیٹیاں ہیں۔ کیا پھر بھی میری التجا آپ کا دل موم نہیں کر دیتی؟ کبھی آپ نے سوچا ہے، جو زندگی آپ گزار رہے ہیں اس زندگی کے ہوتے ہوئے کون آپ کی بیٹیوں کو بیاہے گا؟ کبھی آپ نے سوچا اگر تانیہ میری ماں کی طرح آپ کی بیٹیوں کو اپنی راہ پہ لے آئی تو کہاں جائے گی آپ کی نسل؟...... مسٹر سلیم! کبھی آپ نے سوچا ہے یا نہیں، لیکن امارت بہت سے عیب چھپا لیا کرتی ہے مگر غربت اور مفلسی سے بڑا کوئی عیب نہیں۔ آپ کے پاس دولت نہیں ہوگی تو آپ کو معلوم ہے جانے کے نام کی شہرت آپ کی بیٹیوں کو کہیں بیٹھنے نہیں دے گی۔ لوگ انہیں ٹھوکروں میں رکھ لیں گے اور پھر اس بات کی گارنٹی کیا ہے کہ جہاں ورثے کے پاس آپ کی بچیاں ہیں وہاں کوئی آپ کی طرح کی نجات دے گا؟...... بیٹی بہت نازک آئینہ ہے نسیم صاحب! سات پردوں میں چھپا کر رکھنے کی چیز ہوتی ہے اور آپ نے انہیں بے یارومددگار چھوڑ دیا ہے۔"

آج نشتر کم تھا، کچھ بھی اس بات کو سمجھنے کے لئے سوچ کو سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ عافیہ بانو خاموش تھیں اور وہ سوچ کے سمندر میں غرق مسلسل کار ڈرائیو کر رہے تھے۔

عافیہ بانو کو لگنے لگا تھا، جیسے انہوں نے اب تک ایک پتھر سے سر پھوڑا تھا۔ جذبات کی شاید اس انسان کی کیمسٹری میں کوئی جگہ نہیں تھی لیکن سنا ہے، پیسے کی بات ہر انسان کو بہت جلد متاثر کرتی ہے۔ سو انہوں نے نیا تیر پھینکا تھا۔

"سلیم صاحب اگر آپ نے مجھے اس زندگی سے نکال لیا تو میں آپ کو اتنا دے دوں گی کہ آپ ایک بار پھر ترقی کی بلندیوں کو چھو سکتے ہیں۔ بس آپ کسی طرح مجھے یہاں سے نکلنے میں مدد کر دیں۔"

سلیم افسر نے پہلی بار انہیں توجہ سے دیکھا، پھر آہستگی سے بولے۔ "زندگی میں میں نے بہت برا کیا، بہت کچھ ایسا کہ شاید ساری زندگی اپنے سامنے نظر نہ اٹھا سکوں۔ مگر عافیہ بانو! آپ مجھے اتنی پستی میں بھی مت دھکیل دیجئے کہ میں کبھی اپنے پیروں پر دوبارہ کھڑا بھی نہ ہو سکوں۔ شراب...... شراب واقعی انسان سے ہر جذبہ چھین کر کسی کی طرح دھو لیتی ہے۔ وہ اندر کچھ بھی نہیں رہنے دیتی صرف ہوس...... کہ صرف اپنی ہی ذات کی ہوس کے علاوہ کچھ بھی نہیں رہنے دیتی۔ مگر وہ رنگ کہ میری بات نہیں، وہ ماضی ہے، جسے میں اس کے نشے میں ڈبو کر نیست و نابود کر دینا چاہتا ہوں۔ مگر ہر روز صبح جب یہ ڈوبا ہوا ماضی پھر سے ساحل پر آ کھڑا ہوتا، مجھ سے آنکھیں چار کرنے لگتا تو پھر مجھے لگتا میں ہوش کا ایک بار پھر اپنے وجود سے ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دوں۔ مگر عافیہ! میں جب مجبور ہو جاتا، میں غرقاب ہونے کی منزل کو چھونے ہی والا ہوں تو تم پہنچ آ گئیں۔ تمہاری باتوں نے عمر بھر کے اس فریب سے آزاد کرنے کے لئے مجھے میرے ہی سامنے دھکیل دیا۔ میری مسخ کہانی پھر پہلے قدم سے شروع ہو گئی...... عافیہ! میں اس بچے کی طرح ہوں جس نے گود سے اتر کر پہلی بار دھرتی پر قدم رکھا ہے۔ مگر پھر لڑکھڑاتے ہیں۔ بار بار لگتا ہے، میں اب گرا تو دھرتی کی ساری مٹی مجھے پھانک لے گی، میں چلنا بھول گیا ہوں۔"

وہ کمسن بچے کی طرح ہو گئے تھے اور عافیہ بانو کی ممتا نے انہیں سمیٹ لینے کی ہوک سی تھی لی، وہ نہیں جانتی تھیں، یہ کیا رشتہ ہے۔ مگر ہر روز جب بھی وہ ان کے سامنے جاتیں تو انہیں لگتا، سلیم افسر ہی وہ انسان ہیں جن پر تقدیر نے انہیں اختیار دیا ہے۔ چونکہ وہ ان کا نصیب تھے یا نہیں، مگر اس لمحے وہ ان کے لئے تمام تر شدتوں سے ایک ہی جذبہ رکھتی تھیں اور وہ تھا محبت۔ ان کی زندگی میں محبت کی کوئی ڈیفی نیشن نہیں تھی، مگر انہیں لگتا تھا ان کی زندگی میں محبت ہی ان کی ذات کی ڈیفی نیشن بنے جا رہی تھی۔

عافیہ بانو کا دایاں ہاتھ سلیم افسر کے کندھے پر دباؤ ڈالنے لگا تھا۔ سلیم افسر محبت کے ٹھکرائے ہوئے انسان تھے۔ مگر یہ کمبخت محبت، یہ دل تو دوسری یا تیسری بار کیا، بار بار دھوکے افسوس کے باوجود محبت کرنے سے باز کب رہنے دیتا ہے۔ جو چنگاری اندر کہیں سلگ رہی تھی یا انہیں اس کا گمان ہوا تھا، وہ چنگاری یکدم تپش دینے لگی تھی۔

برسوں کے رکے ہوئے آنسو جو جام میں انڈیل کر ڈبو دیئے گئے تھے، وہ آنسو آج سلیم افسر کی آنکھوں میں جلن پیدا کرتے رخسار پر بہہ نکلے تھے۔ انہوں نے سائیڈ پر گاڑی روک دی تھی۔ وہ بے تحاشا تڑپ کر روئے تھے۔ عافیہ بانو پہلے تو جھجک کے بارے دیکھتی رہی تھیں، پھر دل سے ایک طوفانی جذبہ اٹھا تھا اور ان کی محبت نے سلیم افسر کو اپنی ذات میں سمیٹ لیا تھا۔ سلیم افسر، عافیہ بانو کے شانے پر سر ٹکائے روتے رہے۔ پھر بہ دقت خود کو سنبھال کر بولے۔

"جہاں جانے والے تھے وہاں کے ٹرپ کا کیا کریں؟"

عافیہ بانو انہیں دیکھنے لگیں۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کیا بہانہ بنائیں۔ کچھ ساعتیں اسی بے کلی و ہراس میں گزریں، تب انہوں نے عافیہ بانو کو مخاطب کیا۔ "آپ چھوٹی موٹی چوٹیں برداشت کر سکتی ہیں عافیہ؟"

عافیہ بانو سوالیہ دیکھنے لگیں پھر مدھم لہجے میں بولیں۔ "آپ کے ذہن میں کیا چل رہا ہے سلیم صاحب؟"

سلیم افسر مسکرائے، پھر مدھم ہو کر بولے۔ "آپ نے ابھی پیسوں کی بات کی تھی۔"

عافیہ بانو کا چمکتا چہرہ تاریک ہو گیا۔ سلیم افسر نے ان کی آنکھوں میں کرب دیکھا تو آہستگی سے بولے۔ "آپ مجھے غلط مت سمجھئے۔ میں آپ کی جو رقم لوں گا وہ رقم مجھ پر قرض کی طرح واجب ہوگی۔ لیکن یہاں سے نکلنے کے لیے مجھے زادِ راہ چاہیے ہی ہوگا۔ میرا ایک دوست انگلینڈ میں ہوٹل انڈسٹری سے وابستہ ہے۔ میں اس سے جاب کی بات کروں گا، پھر جب تک وہاں سیٹل نہ ہو جاؤں، آپ وقتی طور میرے گھر میں رہ سکتی ہیں۔ سال بھر کی بابت تو آپ کو خبر نہیں تھی۔ میں نے یہ گھر بیچ کر پانچ لاکھ دوست کو دے رکھا تھا۔ آپ کے اور بچوں کے ویزے کے لیے وہی کام آئے گا۔"

عافیہ بانو خاموشی سے انہیں دیکھنے لگیں تو وہ پھر بولے۔

"دراصل تانیہ کے بعد گھر گرہستی سے میرا دل ایسا اچاٹ ہو گیا تھا کہ مجھے اپنی اولاد بھی بری لگنے لگی تھی۔ بس دنیا چھوڑ دینے کو دل کرتا تھا۔ مگر چند دنوں میں آپ کی ذات نے میرے اندر جو امنگ اور زندگی کی رمق کا دیا جلایا ہے، اس نے زندگی کرنے کے سارے حربے پھر سے یاد دلا دیے ہیں۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

عافیہ بانو ثبات سے سر ہلا کر ان کے ساتھ کی خواہش کے کہ ان کو دیکھنے لگیں۔ وہ جس جذباتی کیفیت سے گزر رہی تھیں، اگر اس موڑ پر کوئی ان کو زندگی سے نکلنے کا واحد حل موت بھی بتاتا تو وہ بھی انہیں قبول ہوتا۔ یہ تو پھر زندگی کی بات ٹھہری تھی۔

سلیم افسر گاڑی کو پھر سے سڑک پر واپس لے آئے تھے۔ پھر گاڑی چلاتے ہوئے انہوں نے جانے کیا سوچا تھا۔ گاڑی کنارے روک کر ڈیش بورڈ پر رکھے ٹشو پیپر پر ایک تعارفی خط دوست اور انگلینڈ کے پتے اور بچوں کے ٹھہرنے کی جگہ...... پاپا کے دوست کے نام الگ خط، نہایت مختصر ترین مدعا، پھر ٹشو پیپر کے تینوں ٹکڑے ان کے حوالے کر کے بولے۔

"پلیز عافیہ! آپ فرنٹ سیٹ سے اٹھ کر پیچھے چلی جائیے۔ حادثہ ایک رسک ہے۔ اور میں چاہتا ہوں اس رسک میں آپ بچ جائیں۔ ایک دم خیال آیا تھا مجھے کچھ بھی ہو سکتا ہے، اس لیے بچے آپ کو

بیٹے ہیں، اگر معاملہ بگڑ جائے تو آپ مجھے چھوڑ کر بے دھڑک جا سکتی ہیں۔ ہاں، بس میری بیٹیوں کی ذمہ داری آپ کے سر ہوگی۔"

عافیہ بانو ششدر رہ گئیں، پھر ایک دم جذبات کا ابال اٹھا۔ انہوں نے ان کا ہاتھ تھام لیا، پھر پُریقین لہجے میں بولیں۔ "آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ ہم دونوں مل کر بچیوں کی دیکھ بھال کریں گے۔ مجھے آپ کی سوت کی نہیں، زندگی کی اشد ضرورت ہے۔"

سلیم افسر نے ان کی آنکھوں میں دیکھا، وہاں صرف سچائی اور وفا کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بے اختیار انہوں نے جسارت کی تھی، عافیہ بانو نے ان کی پُرمحبت جسارت پر انہیں ٹوکا نہیں تھا۔ وہ سمجھے تو انہیں لگا تھا جیسے آج وہ جو بازی لگائیں گے اس میں جیتنے سے انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ وقت، محبت سب ان کے ہاتھ میں تھے۔ انہوں نے باور کیا تھا۔

حادثہ قطعی حقیقی تھا مگر نقصان قطعی آرڈر میں تھا۔ عافیہ بانو معمولی زخمی ہوئی تھیں۔ سلیم افسر کو چوٹیں زیادہ لگی تھیں مگر بروقت طبی امداد ملنے سے معاملہ کنٹرول ہی رہا تھا۔

خون زیادہ نہیں بہا تھا۔ عافیہ کے ہاتھ اور بازو پر ٹکرا کر گاڑی کے ٹوٹنے سے اندرونی چوٹیں آئی تھیں۔ پیشانی پر سائیڈ ڈور کے گلاس کی کرچیوں سے زخم آئے تھے۔ نیل پڑ گئے تھے۔ بڑی چوٹ کوئی نہیں تھی۔

بڑی ماں اس حادثے کے بعد فوراً ہی ہسپتال پہنچ گئی تھیں۔ ان کی دعا سلام سے بہت جلدی کور کر لیا گیا تھا۔ وہ سلیم افسر کے روم میں بیٹھی تھیں، جب بڑی ماں نے اس روم میں انٹری دی تھی۔ سلیم افسر ان کے بہت کام کے بندے تھے، اس طرح بستر پر دیکھ کر وہ تاسف سے ہاتھ ملنے لگی تھیں۔ اس سے تسلی دے سکتیں تو انہوں بھرے لہجے میں بولیں۔

"کیا ہے سلیم! تم تو ڈرائیونگ میں اتنے ماہر تھے۔ یہ اچانک کیا کر بیٹھے؟"

سلیم افسر نے چہرے کو تکلیف سے بے زار کیا، پھر مدھم لہجے میں بولے۔ "کیا کروں بڑی ماں! ماہر آدمی بھی کبھی کبھی غلطی کر ہی جاتا ہے۔ مجھے تو بس افسوس ہے کہ عافیہ بانو، خان اختر کے ڈیرے نہیں جا سکیں۔ آپ کی عزت پر میں اپنی جان قربان کر سکتا ہوں مگر کیا کروں، بے حد مجبور ہوں۔"

وہ جتنا جھوٹ اس لمحے بول سکتے تھے، انہوں نے بولا تھا۔ بڑی ماں مطمئن انداز میں انہیں دیکھنے لگیں، پھر توقف سے، آگے کام نکلتے رہیں گے، کے خیال سے بولیں۔ "ارے اس کی فکر مت کرو۔ خان اختر نے پرائیویٹ پارٹی کے لیے کوئی مخصوص نام نہیں دیا، اس لیے وہاں میں نے نشیلا کو بھیج دیا۔ وہ بھی کوئی کم قاتل حسن تو نہیں رکھتی۔ تم بس ساری سوچیں اپنے ذہن سے نکال دو اور جلدی سے صحت یاب ہو جاؤ تو میں ایک جشن کروں گی کہ اس اوپر والے نے میری بچی اور تمہیں بچا کر بہت بڑا احسان کیا ہے۔"

حافیہ بانو خالی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں مگر توجہ مرکز ان تک لوٹی تو ان کی آنکھوں میں بڑی ماں کے لئے لگاوٹ سی لگاوٹ تھی۔ وہ ان کا ہاتھ تھام کر اپنے پرائیویٹ روم کی طرف بڑھ گئی تھیں اور وہ شکر گزار تھے کہ ڈاکٹر رحمان نے اس لمحے ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔ زخموں کی کہانی اتنی شدید نوعیت کی بھی نہیں تھی مگر انہوں نے میڈیکلی توجیہات پیش کر کے انہیں اچھی طرح تھما دیا تھا۔ ڈاکٹر رحمان ان کے دوست کے دوست تھے، ان کے قریبی دوست فاروق اعظم سے ان کی میل ملاقات اکثر رہتی تھی۔ وہ اکثر واک ایک ساتھ کیا کرتے تھے، کبھی کبھی وہ ایک دوسرے کو چھوڑ دیتے کہ کھانے کی دعوت بھی دیا کرتے تھے اور انہی دنوں میں ان کے ڈرائنگ روم میں لگی مسز سلیم افسر کی تصویر سے شناسائی کے باعث سلیم افسر جب ایمرجنسی میں ہسپتال آئے، انہوں نے پہلی فرصت میں مسٹر فاروق اعظم کو کال کر دیا تھا کہ بقول ان کے ان کا سنگ فرینڈ دریافت ہو گیا ہے۔ پھر پہلی بار ہوش آجانے پر انہوں نے فاروق اعظم کو دیکھ کر جلدی جلدی اپنی مجبوری بتائی تھی۔ تب فاروق اعظم کے کہنے پر ہی مسٹر رحمان نے ان کو دلاسے دیے، سمجھے ہر طرح کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا اور بہت مشکل سے چھپایا بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بڑی ماں کے چلے جانے کے بعد فاروق اعظم کو دیکھ کر ان کے دل میں اپنے دوست کے لئے بے پناہ پیار ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

وہ مکمل طور پر پرسکون تھے مگر حافیہ بانو کے لفظوں جیسے محبت نے ایک بار پھر ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ مسٹر فاروق سامنے بیٹھے تھے اور سلیم افسر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کے نظر جھکائے لیٹے تھے۔ وہ اپنے آپ سے شرمندہ تھے۔ فاروق اعظم انہیں دیکھے جا رہے تھے، پھر خفگی سے انہوں نے پہلی بار خاموشی کو زبان دی۔

''اعظم...... آخر تم خود سے اتنے ایسے کیسے ہو گئے تھے کہ ہر طرف سے منہ موڑ گئے؟ ایک بار بھی نے تمہارا تمہارا دوست ہوں...... تم نے ہم سب کو اس کے جیسا سمجھ لیا۔ بچپن کی دوستی کا خیال تک نہیں کیا۔ کسی کا خیال کرتے نہ کرتے، کم از کم اپنی بچیوں کا تو خیال کرتے۔ تمہیں پتہ ہے، انکل کے دوست نور صاحب کتنے اونچے تھے؟ ان کی بیوی ایک نمبر کی کینہ پرور عورت تھیں۔ وہ چاہتی تھیں تمہاری شادی ان کی بیٹی سے ہو مگر تم نادیہ کو یہاں لائے، یہ بات وہ ہضم نہیں کر سکیں۔ ان کی بیٹی اور مسز نور نے بچیوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا، الاماں الاماں۔ وہ تو اچانک میں ایک دن مسٹر نور کے گھر چلا گیا۔ علینہ مجھے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ چھ سال کی بچی، جیسے اپنے حالات بتا سکتی تھی بتانے لگی۔ ان حالات میں مجھے جو بہتر لگا، وہ کیا۔ فوراً میں اپنے ایک جاننے والے ڈپٹی کمشنر دوست کے پاس گیا، بچیوں کو اپنی کسٹڈی میں کرنے کا کیس داخل کیا اور پھر ایک مہینے میں صرف دوستی اور سورس کی وجہ سے اس کا فیصلہ لے کر میں دونوں بچیوں کو حاصل کر سکا۔ اس کام کے لئے ناکوں چنے چبانے پڑ گئے تھے۔ مگر اچھی خبر یہ ہے کہ حالات تمہارے، وہ چند خطوط، جو یوکے کے تعلیمی دور میں تم نے مجھے لکھے تھے، تمہاری نسبت جو تھا اور تمہارے اعتبار کو شفاف کرنے میں کافی کام آئے۔ اب اللہ کا شکر ہے۔

تین سال سے یہاں بورڈنگ ہاؤس میں مسلسل طور پر پڑھائی میں مصروف ہیں۔ مگر سلیم ایڈیٹ! انہیں اور کچھ نہیں سوجھا تھا؟ عافیہ سے شادی کرنا غلطی نہیں مگر یہ شو...... یہ کیا تمہیں زیب دیتا تھا؟ تم جیسے کولڈ مینڈ لسٹ حساب والے کو یہ حماقت پر حماقت قطعاً زیب نہیں دیتی۔"

سلیم افسر کچھ نہیں بولے۔ مسٹر فاروق جو کہہ رہے تھے تسلیم تھا سو وہ کہہ کر جتنے تھے انہوں نے آگے کا پلان بتایا۔ مسٹر فاروق نے عافیہ بانو کا نام سنا تو بھڑک گئے۔

"بابا سنو پلیز۔ پھر ایک نئی حماقت۔ تجھے کیا عزت دار گھرانے کی کوئی لڑکی نہیں نظر آتی جو..." وہ کہتے کہتے رک گئے تھے۔ کیونکہ دروازے سے عافیہ بانو داخل ہوئی تھیں۔

"گھر سے سوپ لایا تھا۔ میں نے سوچا میں آپ کو اپنے ہاتھوں سے پلا دوں۔ لیکن شاید آپ بے حد مصروف ہیں۔" انہوں نے سوپ کا پیالہ ان کے سائیڈ ریک پر رکھ دیا۔ ان کی آواز رنجیدہ ہو رہی تھی۔

فاروق اعظم نے پہلی بار انہیں نظر بھر کر دیکھا تھا۔ ملامت آنکھوں کا حصہ چہرے پہ بھی آگئی...... انہوں نے یکدم فیصلہ کر کے کرسی خالی کر دی۔ پھر ادب سے بولے۔

"پلیز عافیہ جی! آپ سلیم کو اپنے ہاتھ سے سوپ پلائیں گی تبھی یہ کچھ کھا سکے گا۔ ورنہ لیکن میرا کام آرڈر سے پلیز اپنی سیٹ سے یہاں بیٹھ جاتا ہوں۔ آپ مطمئن ہو کر اپنی من مرضی کر سکتی ہیں۔"

عافیہ بانو نے لہجے سے بہت کچھ چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں واقعی پہلے تاثرات تیزی سے زائل ہو چکے تھے۔ سلیم افسر سوپ پی چکے تو دوا کھلانے کا کٹھن مرحلہ درپیش آیا۔ وہ گولیاں نگلنے کے چور تھے مگر عافیہ بانو نے انہیں جس طرح ہینڈل کیا اسے دیکھ کر عافیہ بانو کے جاتے ہی فاروق اعظم نے جوش سے کہا تھا۔

"پہلی بار تو نے صحیح فیصلہ لیا ہے۔ تجھ جیسے کھتے بندے کے لیے ایسی ہی لائف پارٹنر کی ضرورت ہے۔ عافیہ خدمت گزار ہیں پھر بھی متوازن ہیں اور یہ خوبی بہت کم عورتوں میں پائی جاتی ہے۔ حکمرانی کی خواہش میں گھلا چھپا لینا اور چپکے چپکے دل پر حکمرانی کرتے چلے جانا اپنی بات آپ کے دل میں یوں اتارنا کہ وہ خود بخود آپ کے اپنے دل کی بات لگنے لگے۔ اٹس امیزنگ یار، بلکہ فرسٹ کلاس۔ مجھے تمہاری اس چوائس پر اب کوئی تحفظات نہیں۔"

سلیم افسر ہنسنے لگے۔ پھر جتنے دن وہ ہسپتال میں رہے، فاروق اعظم نے ان کی من مرضی کے سارے کام کروا لیے۔ پاسپورٹ، ویزا سب کچھ بیس پچیس دن میں مہیا کر لانا انہی کا کمال تھا۔ مگر مسئلہ عافیہ کی ایک سالہ بیٹی کا تھا۔ ان کی بیٹی اپنی نرم ماں سے بہت زیادہ وابستگی رکھتی تھی۔ کم عمر اتنی تھی کہ اسے کچھ سمجھایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ سلیم افسر اور عافیہ دونوں اس معاملے میں پریشان کن دوراہے پر آ کر اٹک گئے تھے کہ فاروق اعظم پھر روشنی کی کرن بن کر سامنے آئے۔ سلیم افسر کو ان کی دیانتداری پر بلا کا بھروسہ تھا کیونکہ عافیہ سے نکاح کے بعد فاروق اعظم ہی تو تھے جنہوں نے انہیں مشکلوں میں

جائیداد بھی بہت پہلے ہی بچنے سے کمال مہارت سے بچا لیا تھا، بس انہیں اپنے ایک رنگین طبیعت دوست کا سہارا لینا پڑا تھا، انہیں وہ کچھ یوں جانتی تھیں۔ سو شک کو پہلو تک سے لئے بغیر پورے چھ ماہ کے لئے کنٹریکٹ میں ڈیپ معاہدے کے تحت خانیہ کی خدمات حاصل کر لی گئی تھیں۔ یاد رہے کہ وہ فاروق اعظم کے فارم ہاؤس میں سلیم افسر کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔ سلیم افسر ہسپتال سے غائب ہو گئے تھے۔ بڑی ماں کے مریدوں نے انہیں بہت تلاش کیا تھا مگر ہاتھ آ کر بھی نہیں رہے۔ بڑی ماں ہیرا جیسا ملازم کھونے پر کچھ دن آزردہ رہیں، پھر سب بھول بھال گئیں مگر اس وقت جو مسئلہ درپیش تھا، وہ خانیہ سے زیادہ نازک مسئلہ تھا۔

"تم کوئی حل نکالو یار! انہوں نے چار دن بعد کی ٹکٹیں کروائی ہیں۔" سلیم افسر نے فاروق اعظم کو دیکھ کر سوال کیا اور سوچنے کی ذمہ داری سونپتے ہوئے کہا۔

فاروق اعظم مسکرائے، پھر مدھم ہو کر بولے۔ "وہ تمہاری بڑی ماں......"

سلیم افسر نے فوراً خفگی سے انہیں دیکھا، پھر اسی خفگی سے بولے۔ "پلیز! اس عورت کو ماں جیسے مقدس رشتے سے منسوب نہ کرو تو بہتر ہے۔ تم اسے چڑیاں بیگم کہہ سکتے ہو۔"

فاروق اعظم نے مسکرا کر اعتراض مان لیا، پھر بات جہاں رکی تھی وہیں سے شروعات کر کے بولے۔ "میں نے سنا ہے چڑیاں بیگم کا جو ملازم ہے بیوہ فراسیاں چیتوں، وہ خانیہ بھابی کی بیٹی کو روز کھانے کے بعد تفریح کے پارک میں لے جایا کرتا ہے۔ معلومات سے پتہ چلا ہے وہ بے حد لالچی بھی ہے۔ اگر ہم بچی کے اغوا کا ڈرامہ کرنے کا اسے اچھا معاوضہ دے دیں تو......"

سلیم افسر کو آئیڈیا پسند تو آیا مگر اس جواب سے نیا سوال ابھرا۔ "بچی کو اغوا کون کرے گا؟"

فاروق اعظم نے انہیں دیکھا، پھر آہستگی سے بولے۔ "شیرو گروپ۔ وہ اغوا برائے تاوان کا چیمپئن ہے۔ اگر ہم نے کہہ دیا تو پھر بھی دیا تب بھی بچی اغوا ہونے سے بچ نہیں سکتی۔ وہ اپنے کام کا ایسا ہی ماہر ہے۔ مگر سنو! خانیہ بھابی کو اس پلان سے آگاہ مت کرنا، وہ مان نہیں، گھبرا نہ جائیں۔"

سلیم افسر نے سر ہلایا۔ فاروق اعظم نے ساری مہم اور سوچ سے شروع کر دی۔ پھر ڈیڑھ دن بعد کامیابی ہوئی۔ شیرو گروپ سے بات ہو گئی۔ حسب پروگرام بچی اغوا کر لی گئی۔ سلیم افسر نے بچیوں کو بورڈنگ ہاؤس سے بلوا لیا تھا۔

وہ سب ڈنر کی پرواز کے لئے نکلنے والے تھے۔ بچی فاروق اعظم ہی لے کر آنے والے تھے۔ مگر وہ انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے، جب اچانک فاروق اعظم گھبرائے ہوئے داخل ہوئے۔ سلیم افسر انہیں

عافیہ ادھر بیٹیوں سے ڈرے ہوئے گئے پھر سوال کر بھی نہیں پائے تھے کہ فاروق اعظم سرسراتے لہجے میں بولے تھے۔

"سلیم چونک ہو گئی۔ وہ دیتو بہ معاش نکلا۔ اپنے معاہدے سے پھر گیا ہے۔ اس نے بچی کے لئے مزید رقم کا مطالبہ کیا ہے۔ میں نے کوشش بہت کی مگر مطلوبہ رقم مہیا ہونا اتنی آسان بات نہیں۔ اگر ایک دو دن ملتے تو شاید کوشش کامیابی بھی ہو جاتی۔ مگر اس وقت یہ سب ممکن نہیں رہا۔ تمہارا ڈراپ کینسل کرنے کا مطلب ہے سارے معاملات بگڑ جائیں۔ عافیہ بانو بیٹیاں نہ آئیں آنے کا اندیشہ ہے۔ اب تم بتاؤ کیا کریں؟"

سلیم افسر دنگ فاروق اعظم کو دیکھتے چلے گئے۔ وہ واقعی بہت پریشان کن سچویشن میں آ کر پھنس گئے تھے۔ انہیں پتا آپ بہت کیا محسوس ہوا تھا کہ کسی کا حوصلہ بھرا ہاتھ ان کے کاندھے پر آ رکا۔ وہ بجلی کی تیزی سے پلٹے۔ ان کی پشت پہ عافیہ کھڑی تھیں مگر ان کی طرح ہراساں نہیں تھیں۔ کمپوزڈ تھیں۔ انہیں حیرت ہوئی تھی۔ پھر یہ حیرت کئی چند لمحوں میں ہی کم گئی تھی کہ بنگلے کے اس طرف سے جہانیاں بیگم کی صورت نظر آئی۔ بچی ان کی گود میں تھی۔ عافیہ بانو کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔ وہ جانتی تھیں انہوں نے کیا کھو دیا ہے یا کیا کھونے جا رہی ہیں۔ جہانیاں بیگم ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھیں۔ پھر سلیم افسر کو مخاطب کر کے بولیں۔

"تم کیا سمجھتے تھے، تم ایک ماہر چال باز ہو؟ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو نادانی سمجھتے تھے۔ لیکن میں نے بہت دھوکہ کھایا ہے۔ وہ صرف اعتبار پر کھیلا ہے۔ مگر دیکھ لو میں کتنی جلدی اس جھٹکے سے سنبھل گئی ہوں۔ جو نے جتنی رقم کا مطالبہ تم سے کیا تھا، میں نے اسے پانچ فیصد زیادہ رقم دے کر یہ لاڈلی خرید لی ہے۔ جتنی اتم پر میرا احسان بڑھ گیا تھا اگر تمہاری بیٹی یہ سارا خرچ سود سمیت مجھے لوٹانے والی ہے۔"

عافیہ بانو کی آنکھیں بہنے لگی تھیں۔ جہانیاں بیگم جانتی تھیں، وہ ان کی ممتا سے کھیل رہی ہیں اور اپنی من مرضی کا نتیجہ لینے کے لئے انہیں اسی ممتا کا استعمال کرنا تھا۔ ماں سب کچھ سہہ سکتی ہے، اپنی اولاد کو کھونے کا غم نہیں سہہ سکتی۔ سلیم افسر کی اولاد بچا کر بھی ان کی اولاد تو نہیں بن سکتی تھی۔ یہی وہ نکتہ تھا جو عافیہ کو جذبات کی اس انتہا پر پہنچا سکتا تھا کہ پھر انہیں منہ کے بل گرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ یہ معاملہ ایسا تھا کہ کہیں دونی بھی ہاتھ باندھے کھڑی رہ جاتی تھی۔

"میری محبت تمہیں قید نہیں کرے گی، اگر تم......" سلیم افسر نے ان کا ہاتھ تھام کر فیصلہ دیا۔

عافیہ بانو نے ایک نظر سلیم افسر کو دیکھا۔ دوسری نظر چھ ماہ عابد اور دو سالہ انوشے کی طرف گئی۔ پھر نظر سوتے ہوئے بے خبر اپنی بیٹی پر جا کر رک گئی۔ ایک راستہ زندگی کی جانب تھا اور ایک ذلت کی موت کی...... ایک سمت میں گھر گرہستی کا سکون تھا اور دوسری سمت ذات کی تذلیل...... ایک طرف محبت تھی، دوسری طرف محبت کی انتہا ممتا کے روپ میں کھڑی تھی۔ بچی نے ہمک کر ان کی طرف ہاتھ بڑھائے تھے۔ انہیں

لگتا تھا ان کا دل یکبارگی بند ہو جائے گا۔ جہاں آرا بیگم نے تڑپ کا پتا پھینکا تھا اور شکست ہر آن ان کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ عافیہ بانو نے ایک ٹک بچی کو دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

”سلیم! چلئے، آپ کی محبت قید تو نہیں ہے۔ آزادی کو کس بے میرے لئے جسے میں عمر بھر بھگتنا چاہوں گی۔“

سلیم اختر نے نرم نرم سی کرتی آنکھوں سے اس عورت کو دیکھا جو یکدم عظمت کے مینار پر جا پہنچی تھی۔ جہاں آرا بیگم تلملاتی رہ گئیں۔

”میں تمہاری اسی ضد سے ایک دن خاک چھانوں گی۔ تم اس آدمی پر بھروسہ کر رہی ہو، ماں دیکھنا یہ آدمی تمہیں سارے جہان میں رسوا کرے گا۔ یہ مرد کبھی کسی ایک کے ہو کر نہیں رہتے، دیکھنا..... دیکھنا تم۔“

وہ چلاتی رہیں۔ بچی کا اچھا رچا کر روتی رہی۔ مگر عافیہ بانو پھر نہیں مڑیں۔ انہوں نے سن رکھا تھا سفر میں پیچھے مڑ کر دیکھو تو پتھر کا ہونے سے کوئی منزل نہیں روک سکتا۔ وہ پتھر کی ہونے سے بچ گئی تھیں مگر ایک بھاری پتھر تھا جو سینے میں دل کی جگہ رکھ گیا۔ وہ اس نئے سفر پر نکل کھڑی ہوئی تھیں۔ جو سفر جو کسی کی طرح کا نیا اور انوکھا سہی تو ان کی جھولی میں ڈال سکتا تھا مگر ان کے ساتھ چلنے والے مرد نے قسم کھائی تھی اس کی نم آلود ستائی کو وہ اس عورت کو کبھی اپنے نام کا کوئی دکھ نہ دیں گے۔ مضبوطی سے تھامے ہوئے ہاتھ کو انہوں نے تھپتھپایا تھا اور.....

”کیا ہے سلیم! آپ نے ابھی تک چائے نہیں پی۔ میں کب سے رکھ گئی ہوں۔ ٹھنڈی ہو گئی ہوگی اب تو.....“

یکدم ہوا کا تیز جھونکا سا تھا قریب سے سنائی دی کہ وہ ہڑبڑا سے گئے ماضی سے نکلے۔ انہوں نے ان آنکھوں کی طرف دیکھا جنہیں ہمیشہ مسکراتے رہنے کی عادت تھی۔ وہ آنکھیں..... وہ آنکھیں ان پر ہی مرکوز تھیں۔

”کیا ہو گیا اتنی محبت سے کیا دیکھ رہے ہیں؟ کیا پہلی بار ملے ہیں ہم؟“

سلیم اختر کی آنکھوں میں شوخی بھر آئی۔ وہ اٹھ کر کام کرتی عافیہ بانو کے قریب جا کھڑے ہوئے اور جذبے سے بولے۔ ”تم سے جب ملتا ہوں، یونہی لگتا ہے، پہلی بار مل رہا ہوں۔ اور وہ فاروق ہے، وہ میری ایسی باتوں کا خوب ریکارڈ لگاتا ہے۔ کہتا ہے، جوان بچوں کا باپ ہو گیا ہوں، دو بیٹیوں کو بیاہ چکا ہوں، نانا بھی بن گیا ہوں مگر محبت کے معاملے میں مجھ میں ابھی تک میچورٹی نہیں آئی۔“

عافیہ بانو ہنسنے لگیں، پھر مسکرا کر بولیں۔ ”فاروق بھائی جو بھی کہتے ہیں، آپ کو ستانے کے لئے کہتے ہیں، ورنہ بہرحال آپ سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں کہ کبھی کبھی محبت میں مچورٹی محبت کا اظہار نہیں ہوتا۔ اگر وہ اظہار آپ کے جیون ساتھی کی طرف سے ہو تو دل سے مرے سے دنیا جیت لینے کی مہک کرنے لگتا ہے۔ مگر آپ..... آپ نہیں سمجھیں گے یہ۔“

سلیم اختر نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر خمار سے کہا۔ ”اچھا تو میں یہ نہیں سمجھوں گا، میں جو محبت میں مالک تک ڈوبا ہوا ہوں اور گنوارے کی حسرت تک کا محبت کی شان میں گستاخی سمجھتا ہوں۔“

عافیہ بانو خوش ہو گئی تھیں پھر قدموں کی آواز محسوس کر کے گویا ہو رہی تھیں۔ "چھوڑیں بھی، بچے اب بڑے ہو گئے ہیں۔"

سلیم افسر نے عافیہ بانو کے ہاتھ چھوڑ دیے، پھر مسکرا کر بولے تھے۔

"کیا ہے یار بیوی! اتنا اچھا موڈ بن رہا تھا مگر تم نے بچے درمیان میں لا کھڑے کیے۔ یہ بھی کوئی بات ہے؟ ان کے بڑے ہونے کا مطلب کیا ہم اپنی معصوم خواہشات کا گلا گھونٹ کر کیوں دیں؟"

"آہا! معصوم...... معصوم خواہشات...... مجھ پر سب روشن ہے آپ کی معصومیت۔"

سلیم افسر کا قہقہہ خوب جاندار تھا۔ عافیہ بانو بھی مسکرا رہی تھیں، جب کچن کے سامنے انوشے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"کیا آج کھانا لگے گا ماما؟"

"کیوں نہیں بیٹا! بس پانچ منٹ میں سرو کر رہی ہوں۔ آپ اور ماہ نور ٹیبل پر چیزیں رکھوا دیجیے گا۔"

سلیم افسر نے انوشے کے چہرے پر ناپسندیدگی کا عنصر دیکھا، سو فوراً مزاحاً ہنستے ہوئے بولے۔ "رہنے دو بیٹا آپ۔ میں ٹیبل پر کھانا سرو کرنے میں آپ کی ممی کا ہاتھ بٹا لوں گا۔ آپ بس ماہ نور اور دانش کو کھانا کھانے کے کمرے میں آنے کا کہہ دیں۔"

انوشے تیزی سے پھر پلٹتی ہوئی اپنے قدموں پر لوٹ گئی۔ سلیم افسر اسے جاتا دیکھتے رہے، پھر آہستگی سے بولے۔ "جب سے اس کی شادی ناکام ہوئی ہے تب سے یہ بہت چڑچڑی نہیں ہو گئی عافیہ؟"

عافیہ بانو خاموشی سے سر ہلا کر انہیں دیکھنے لگیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر کہہ نہیں پا رہی تھیں۔ تبھی سلیم افسر نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مدھم لہجے میں کہا۔

"میں جانتا ہوں انوشے کی شادی کی ناکامی خود اس کی تلون مزاجی اور بد مزاجی کے باعث ہوئی ہے۔ مگر یار بیوی! اب کچھ بھی ہو لڑکی اس حادثے پر بکھر کر رہ جاتی ہے۔ اب تمہیں ہی مل کر اسے سنبھالنا ہے۔" تھوڑا توقف کر کے پھر مزید بولے۔ "مجھے یہ احساس ہے انسان کی ساری اولاد ایک جیسی نہیں ہوتی، سب فرماں بردار ہوں تو خدا کیوں کر آزمائے گا۔ بس مجھ لاچار سا اور خدا کی ذات کی پاکیزگی ہے۔"

عافیہ بانو نے کندھے پر ہاتھ مارا، پھر مصنوعی خفگی سے بولیں۔ "آپ اتنی بری بھی نہیں ہے میری بیٹی۔ ہاں بس تھوڑی سی ضدی ہے اور بس۔ رہا شادی کی ناکامی کا حادثہ، یہ تقدیر ہے، جو لکھا ہوتا ہے وہ خود بخود ہوتا چلا جاتا ہے۔ سب اسباب خود بخود تیار ہو جاتے ہیں، اس لیے امید رکھنی چاہیے، ہماری بچی کی زندگی میں خوشیوں کا نیا موڑ بہت جلد آئے گا۔ تمہیں نہیں پتہ، کچن طیبہ بھی اسی کی وجہ سے بہت

پریشان رہتی ہے۔"

سلیم افسر بولا کر چیزیں اٹھا کر کچن سے متصل کھانے کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ دانیہ اور مراد نے باپ کو کام کرتے دیکھا تو تیزی سے اٹھ گئے۔

"آپ بیٹھیے بابا! کھانا ہم دونوں مل کر لگا لیتے ہیں۔"

انوشے نے ناک سکوڑ کر دونوں کو دیکھا پھر بڑبڑائی۔ "بوجھ، گڈ بک میں آنے کی حسرت......" پھر چڑ کر بولی۔ "بابا! کیا ہم اتنے غریب ہیں کہ نوکر رکھنا افورڈ نہیں کر سکتے؟ جتنا بزنس آپ کا ہے، اس سے کم تنخواہ والے ملازمت پیشہ ماں باپ کی اولاد کے گھر دو دو میڈز ہیں۔ لگتا ہم ایک میڈ بھی نہیں رکھ سکتے۔ سارے فرینڈز اسکول میں کتنا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ وہ تو مجھے آپ خود اسکول چھوڑنے آیا کرتے تو میری فرینڈز کو میری امارت پہ شک ہی رہتا مگر...... بابا! ہم نوکر کیوں نہیں رکھ سکتے؟ مجھے یہ ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا ہے۔"

سلیم افسر نے بیٹی کی گفتگو اور جذباتی سوال سنا، پھر چاہا کچھ کہیں بھی اس کے جواب میں لیکن عاصمہ نے ان کی طرف سے پوزیشن سنبھال لی، پھر مسکرا کر بولی۔ "سیدھی سی بات ہے بیٹا! ہمیں ملازم رکھنا اچھا نہیں لگتا ہے۔ ملازم رکھ کر ہم وہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں کھو دیتے ہیں جو ہمیں سارا دن اور محبت میں مزید باندھ کر ایک نئے طریقے سے جینے کا کمال بخشتی ہیں۔ ہم کو ہمارے لیے کام کرنا اچھا لگتا ہے سمجھو!"

سلیم افسر مسکرا کر دیکھنے لگے۔ مراد بھی اس سے متفق تھا مگر انوشے وہ یکدم کھڑے ہو کر چیخ پڑی تھی۔

"ممّا کو یہ کام کرنا اچھا لگتا ہے تو پھر ماسی کو پورا کر باری نبھانا چاہیے۔ وہ آخر ہم سے یہ توقع کیوں رکھتی ہیں کہ ہم ان کی طرح بچا زندگی جینے کی تمنا کرنے لگیں۔ نانا ابا سے بھی میری ان ہی باتوں پہ لڑائی ہوتی تھی۔ وہ...... وہ مانتے یہ سے باپ کو دیا تھا مگر پھر بھی سے مشرق کے تعلقات محبت کی کہانیاں اٹریکٹ کرتی تھیں۔ مشرق...... مائی فٹ۔" وہ کہہ کر وہاں رکی نہیں تھی، جھنجھلا کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

مراد، دانیہ اور عاصمہ سلیم افسر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ماحول یکدم ہی ناخوشگوار ہو گیا تھا۔ سلیم افسر کو گھر کا موسم سنبھالنا تھا سو ہنس کر بولے۔ "روز ہونے والی باتوں پہ اس طرح نہیں چونکا کرتے۔ چلیں کھانا شروع کرتے ہیں۔ مراد! دانیہ بیٹھیں آپ۔"

ان کے کہنے پر سب اپنی کرسی سنبھال کر بیٹھ گئے تھے مگر عاصمہ بیگم...... اب بھی ماں بن کر بڑی مشکل سے انوشے کو پالا تھا پھر بیٹی کے بھوکے رہنے پر حلق سے نوالہ کیسے اترتا۔

"آپ کھانا شروع کیجیے، میں نوشی کا کھانا اس کے کمرے میں دے کر آتی ہوں۔ بچی دو گھنٹے سے بھوک بھوک کر رہی ہے۔"

سلیم افسر نے آنکھوں سے منع کرنے کی جو کوشش کی اسے انہوں نے ملامت سے رد کر دیا تھا۔ "پلیز سلیم! میری بات سمجھیے۔ میں کہنا چاہتی ہوں، بچے اگر شور شرابا نہ کریں تو گھر اور قبرستان میں کیا فرق رہ جائے گا۔"

سلیم افسر نے پھر کچھ نہیں کہا تھا۔ دائمہ اور مرواہ ماں کی محبت پر مسکرائے بنا نہیں رہ سکے تھے۔ بیگم عائزہ ٹرے میں کھانا لے کر نوشی کے کمرے میں گئی تھیں۔ مگر دروازہ کھول کر جو کچھ پہلی نظر میں انہوں نے دیکھا، وہ انہیں ہراساں کرنے کے لیے کافی تھا۔ نوشی یوں دروازہ کھلنے پر چونک کر رہ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا اس کی بھوک کی پروا ہو گی مگر عائزہ بیگم کو دیکھ کر ایک سایہ اس کے چہرے پہ لہرا کر رہ گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ عائزہ بیگم کچھ کہتیں، اس نے نیچے ہوتے ہوئے بھی انتہائی بدتمیزی سے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔

"اگر تم اچھی سوسائٹی میں اٹھتی بیٹھتیں، عام لوگ تمہیں اندازہ ہوتا کہ کسی کے کمرے میں جانے سے پہلے دروازے پہ دستک ضرور دے لیتے ہیں۔ مگر نہیں، ہر وقت گھر میں گھسے رہنے کی عادت تمہیں کہیں کا نہیں رہنے دے گی۔ لیکن پھر بھی تو ہے کہ کنوئیں کا مینڈک اگر تالاب میں چلا جائے تو بھی وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔"

اس نے جان کر ڈرگ نکوٹین کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا۔ سلیم افسر اس کی بدتمیزی کے پہلے ہی منتظر تھے، جواب کی چیخ پکار پر کھانا چھوڑ کر عائزہ بیگم کی پشت پر آن کھڑے ہوئے تھے۔

"نوشی! تمہیں ماں سے بات کرنے کی تمیز کیوں نہیں آتی؟"

"سلیم! پلیز رہنے دیں۔" عائزہ بیگم نے بات ختم کرنے کے لیے قدم اٹھایا مگر مسٹر سلیم جو پہلے سے ہی اس کے رویے پر تپے بیٹھے بالکل آؤٹ ہو گئے۔

"تم خود کو سمجھتی کیا ہو، کیا ہے تمہارے اندر؟ کوئی خوبی ہے تو صرف نسائیت کی ہے ورنہ...... اس پر اترانے والا سب سے بڑا احمق کہلاتا ہے، نوشی! تمہیں اچھا گھر، تعلیم سب کچھ دے کر بھی تمہاری شخصیت کو جب بھی دیکھتا ہوں تو مجھے تمہاری ماں یاد آ جاتی ہے۔ تم بالکل اس پر ہی گئی ہو، اسی کی طرح خود غرض، خود سر اور احسان فراموش۔"

"سلیم!" عائزہ بیگم ماحول کا خطرناک موڑ پر جاتا دیکھ کر زرد پڑ گئی تھیں اور نوشی نے سامنے رکھا دوا اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا تھا۔ پھر چیخ کر بولی تھی۔

"ہاں، میں ہوں اپنی ماں کی جیسی...... کبھی کبھی اس کے جیسا ہونا چاہیے تھا۔ تمہارے جیسا مرد کو اس عورت نے اپنے جادو سے اپنی طرف کر لیا۔ گھر میں اس کے قدم پڑے تو اس نے میری ذات ہی ایشو بنائی

......نہیں ہے میرے دل میں تمہاری بیوی کی عزت۔ پاپا مجھے تم سے بھی نفرت ہے۔ تم...... تم ہی تو ہو جس نے میری ماں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ پاکستان...... مجھے پاکستان سے اس لیے نفرت ہے کہ وہاں تمہاری بیوی نے جنم لیا۔ تم نے جنم لیا۔ آئی ہیٹ پاکستان۔ میں کبھی پاکستان نہیں جاؤں گی۔"

سلیم اختر بیٹی کی باتوں سے گنگ ہو گئے تھے۔ یکدم کمرے میں در آئے تھے۔ عمران کامران ہاتھ تیزی سے اٹھا کر نائلہ بیگم بھی کچھ نہ کہہ سکیں۔ انوشے کا گال سرخ ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے بیٹی کی طرف بڑھی تھیں لیکن انوشے نے ان کے ہاتھ جھٹک دیئے۔

"بس جانے دیں۔ مجھے معلوم ہے تمہاری بھی ماما نہیں ہیں۔ پاپا کو مجھ سے دور کر دیا ہے۔ کیونکہ تم میری...... کچھ نہیں۔"

نائلہ بیگم کے ہونٹ بھینچ گئے تھے۔

سلیم اختر نے انہیں پشت سے تھام لیا تھا۔ پھر آہستگی سے بولے تھے۔ "اپنے دل پر مت لو۔ یہ جو کہہ رہی ہے وہ سچ نہیں ہے۔ ابھی یہ تمہاری محبت کو سمجھی نہیں ہے۔ جب سمجھے گی کہ تم نے اس کے لیے کیا کیا چھوڑا ہے تو یہ خود تمہارے قدموں میں گر جائے گی۔ معافی مانگے گی۔ تم فکر مت کرو۔ بس پاکستان جانے کی تیاری کرو۔"

"میں پاکستان نہیں جاؤں گی۔" انوشے پھر سے درمیان میں چیخی، جیسے باپ بیٹی کو احساس دلانا چاہتی ہو۔

مگر سلیم اختر نے اسے خاص اہمیت نہیں دی۔ پھر بیٹے کو دیکھ کر بولے۔ "جو جہاں رہنا چاہتا ہے رہ سکتا ہے۔ لیکن اب ہم پاکستان جا کر ہی رہنا چاہتے ہیں۔"

انوشے تیزی سے باپ کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ پھر بدتمیزی سے بولی۔ "تمہیں پتہ بھی ہے اس عورت نے پڑھائی ہے۔ پاپا تمہیں نہیں پتہ یہ عورت جادوگرنی ہے۔ یہ عورت......"

سلیم اختر کا ضبط جواب دے گیا۔ "بکواس بند کرو اپنی۔" انہوں نے ہاتھ بھی اٹھایا تھا مگر نائلہ بیگم نے التجا کی تھی۔

"پلیز...... نہیں سلیم! جوان بچوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔"

انوشے نے حقارت سے ہنکارا بھرا تھا۔ "بس کرو یہ ڈرامہ۔ مجھے معلوم ہے تم کیا ہو۔ تم میرے پاپا کی ساری جائیداد ہتھیانا چاہتی ہو۔ تم بہت بری طرح منہ کے بل گرو گی۔ سمجھیں۔ میری ماں کی جگہ لے کر تم نے اچھا نہیں کیا ہے۔"

سلیم افسر، عافیہ بیگم کو کندھوں سے پکڑ کر باہر لے آئے تھے۔ کیونکہ انہیں پتا تھا اگر وہ ادھر رکے تو پھر ان کے ہاتھ کی تیزی کوئی نہیں روک پائے گا۔

دونوں کھانے کے کمرے میں آ گئے تھے۔ مراد اور دائمہ سر جھکائے بظاہر کھانا کھا رہے تھے مگر ان کے چہرے کا خوف بتا رہا تھا وہ اس ماحول سے بہت زیادہ ڈر گئے ہیں۔ ان کے گھر میں اتنی چیخ پکار سے کسی کو بات کرنے کی عادت نہیں تھی۔ اس لئے انوشے جب جب ہنگامہ کھڑا کرتی، ان دونوں کے چہرے ایسے ہی اتر جاتے تھے۔ سلیم افسر کھانا کھانے کے لئے بیٹھ چکے تھے۔ عافیہ بیگم کی تو بھوک اڑ گئی تھی، مگر شوہر کا ساتھ دینے کے لئے وہ ان کی پلیٹ شیئر کر رہی تھیں۔ شروع سے دونوں ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھانے کے عادی تھے۔

سلیم افسر نے ماحول کا تناؤ دیکھا تو یکدم عافیہ بیگم کو ایک ہفتہ پہلے کی پاکستان سے آئی ایک کال سے بات شروع کر بیٹھے۔ عافیہ بیگم خالی الذہنی کی حالت میں رہیں تو پھر سے ملائمت سے بولے۔

”بیگم بتاؤ بھی وہ تمہاری ڈیل کا کیا ہوا؟ فیشن اینڈ اسٹائل کمپنی نے تمہیں اپروچ کیا تھا۔ تم نے ان کی ڈیل کا کیا جواب دیا؟“ لہجہ کریدنے کے بجائے نرم رہا۔ ”فیشن اینڈ اسٹائل ویسے پاکستان کی سب سے مشہور ملبوسات بنانے والی کمپنی ہے۔ تمہیں انہوں نے تمہارے انگلینڈ میں کئے جانے والے کام کی وجہ سے اپروچ کیا ہے، یہ تمہارے لئے کامیابی کی بہت بڑی علامت ہے۔ ویسے کمپنی کا اونر کون ہے؟“

عافیہ بیگم نے ایک لمحے کے لئے سوچا، پھر آہستگی سے بولیں۔ ”اونر شپ تو مسٹر عبدالرحمن کے پاس ہے لیکن مجھے ان کے بیٹے شہریار عبدالرحمن نے اپروچ کیا ہے۔ آپ کو پتہ ہے، میں کام میں کتنی چوزی ہوں۔ پھر بہت زیادہ شور شرابا بھی نہیں چاہتی۔ مگر دائمہ ہے نا، اس نے مجھ سے پوچھے بغیر میرے ڈیزائن سیمپل میری پورٹ فولیو ویب سائٹ پر ڈال دیے۔ مجھے تو علم ہوا اس وقت جب شہریار عبدالرحمن کا اسی ویب سائٹ کے حوالے سے فون آیا۔ پہلے میرا خیال تھا، میں منع کر دوں گی۔ لیکن اب جب کہ آپ پاکستان جانے کی بات کر رہے ہیں تو پھر میں ان سے میٹنگ رکھ لیتی ہوں۔“

سلیم افسر محبت سے مسکرائے، پھر آہستگی سے بولے۔ ”بالکل...... بالکل، آپ کے ہر کام میں تمہارا ساتھ فری ہینڈ ہے اور صرف تم بات دو گی تو بنا کسی اضافی چارج کے تمہارے لئے ہمہ وقت حاضر جناب ہیں۔“

بیگم عافیہ کے ہونٹوں کو ہلکی سی مسکراہٹ نے چھوا۔ مراد اور دائمہ کھانے کی ٹیبل صاف کرنے لگے تھے، جب اچانک ایک خیال کے آنے پر بیگم عافیہ نے سلیم افسر کو دیکھا۔

”سلیم! کیا واقعی انوشے ہمارے ساتھ نہیں جائے گی؟ دیکھئے، میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ اگر وہ ہمارے ساتھ نہیں جائے گی تو یقیناً علیمہ کے گھر ٹھہرنے کی کوشش کرے گی۔ آپ تو جانتے ہیں اسے کوئی بھی کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی عادت نہیں۔ سو علیمہ کے ہاں ٹھہری، تو آپ کو معلوم ہے ماں مظفر کس طرح کے ماحول کا عادی ہے۔ اگر اس نے وہاں کوئی ہنگامہ کیا تو خواہ مخواہ علیمہ کو پرابلم ہو جائے گی۔ وہ شوہر اور بہن کے درمیان بیلنس رکھنے میں سینڈوچ بن جائے گی۔“

سلیم افسر بیوی کے تجزیے پہ مسکرائے تھے، پھر آہستگی سے بولے تھے۔ "آپ کو یہ کس نے کہا کہ وہ ہمارے ساتھ پاکستان نہیں جا رہی؟ دیکھئے وہ میری بیٹی ہے اور میں اس کا باپ ہوں۔ سو اچھی طرح سمجھتا ہوں اسے کس طرح ہینڈل کیا جا سکتا ہے۔"

"آپ اس پہ بحث نہیں کریں گے" وہ ان کے جملے سے جو سمجھیں اس پہ ٹھٹھر گئیں۔ سلیم افسر نے ان کی ممتا کا دکھ لیا، پھر شرارت سے بولے۔

"آپ نے یہ بھی کہا تھا کچھ دیر پہلے وہ عارف سے بہت کلوز ہے۔ پھر اگر ہم عارف کو ساتھ لے جاتے ہیں پاکستان کے بزنس کے حوالے سے تو آپ کا کیا خیال ہے ماہ نور شاہ اپنے فیصلے پہ قائم رہ سکے گی؟"

حانیہ بیگم شوہر کی لاچارگی پہ مسکرائے بنا نہ رہ سکیں مگر ایک سوال انہیں بہت عجیب لگ رہا تھا۔ سلیم افسر نے چہرے پہ اس سوال کا جال دیکھا تو فوراً انہیں کندھوں سے تھام کر بولے۔ "جس بات پہ آپ پریشان ہیں وہ بات مجھے بہت سے لوگوں نے پہلے بتا رکھی تھی مگر میں طرح دے رہا تھا۔ یا شاید ایک وجود دینے کی کوشش کی تھی خود کو۔ مگر اس لمحے وہ جس لہجے میں بول رہی ہے، میں نے اس کی آنکھوں کی مرضی سے جان لیا ہے کہ وہ واقعی ایڈکٹ ہو چکی ہے۔ لیکن یہاں نہیں قانون اتنی آزادی کو کیوں رہنا کہ ہم اپنے بچوں کا پتی من مرضی سے تربیت کریں۔ پاکستان جانے کا خیال صرف اس وجہ سے پختہ کیا ہے کہ وہاں بڑا ذخیرہ ہے لیکن وہاں باپ کی محبت کو قانون کسی حد تک سپورٹ کرتا ہے۔ اسے اچھا ماحول وہاں بھی کم نہیں۔ تم بے فکر رہو، انوشے اس عادت سے چھٹکارا پالے گی۔ اور وہی اس کی نفرت تو تم دیکھنا بھی نفرت تھا ایک دن اس کی محبت بن کر تمہیں چھونے لگی۔ چلو، خاطر جمع رکھو اور پاکستان فون ملاؤ۔"

سلیم افسر نے موبائل ان کی طرف بڑھایا۔ حانیہ بیگم ڈائری میں لکھے نمبر کنال کرنے لگیں۔ چار پانچ دفعہ فون کرنے کے بعد ایک طویل وقفے کے بعد جیسی دفعہ نمبر ملانے پر ان کا رابطہ ہو سکا تھا۔

"ہیلو! شہریار سپیکنگ۔"

بیگم حانیہ منتظر نظر جانے لگیں۔ دوسری طرف سے شہریار کی گرمجوشی امڈ آئی تھی۔

"ٹھیک ہے بیگم! آپ پاکستان جیسے ہی آتی ہیں، میں آپ سے فوراً ملنا چاہوں گا۔ ویسے اگر آپ تکلف نہ کریں تو ایئرپورٹ سے ہم آپ کو پک کر لیتے ہیں۔ بلکہ رہائش کا مسئلہ تو وہ بھی حل کیا جا سکتا ہے۔"

بیگم حانیہ نے مسکرا کر ان کی ساری تجاویز شکریے کے ساتھ لوٹا دی تھیں، پھر نرمی سے بولی تھیں۔ "پاکستان میں میرے شوہر بزنس سے وابستہ ہیں۔ رہی رہائش تو آپ کے شہر میں ایک بہت خوبصورت گھر بھی ہے ہمارا۔ امید کرتی ہوں آپ سے مل کر پاکستان سے وابستہ اچھی یادوں میں اضافہ ہو سکے گا۔"

"کیوں نہیں میم! آپ کو ہم کسی بھی طرح مایوس نہیں کریں گے۔" دوسری طرف سے سلام دعا کے بعد فون رکھ دیا گیا۔

نجم صافیہ دوبارہ بالکل آف کر کے مزید تشویش سے بولیں۔

"پتہ نہیں عجیب سی باتیں، مجھے پہلے کی گفتگو اور آج کی گفتگو میں بہت فرق محسوس ہوا ہے سلیم!"

"یعنی کس قسم کا فرق؟ احترام میں کمی تھی یا......"

نجم صافیہ نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا اور عجیب سے لہجے میں پکاری تھیں۔ "آج پہلے کے مقابلے میں شہریار عبدالرحمن کے لہجے میں بہت تھکن تھی۔ بظاہر وہ اپنے اس غم... لہجے کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر پتہ نہیں مجھے وہ مضطرب لگ رہا تھا۔ شاید وہ کچھ بیمار بھی ہے۔"

سلیم افسران کی خیال آرائی پر ہنسنے لگے تھے۔ "خدا کا خوف کیا کرو صافیہ!" پھر صافیہ نجم کا نام لے کر بولے تھے۔ "اپنے دماغ کو ہر وقت دوسروں کے مسئلوں میں الجھائے رکھتی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ مضطرب ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے شہریار عبدالرحمن بیمار ہو۔ لیکن میں تمہیں یہ حق قطعی نہیں دوں گا کہ تم غیر کے لیے اپنی جان ہلکان کرو۔"

صافیہ نجم نے مصنوعی خفگی سے انہیں دیکھا اور پھر سوچتے انداز میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ ابھی انہیں ڈھیر سارا کام کرنا تھا اور وقت نہایت مختصر رہا تھا۔

وقت بہت سارا ہے صاحب بھی معلوم نہیں کیوں لگتا ہے وقت نے بھی نہیں پتہ ہے گزر رہا ہے......

❀❀❀

شہریار کی اچانک آمد کی وجہ سے عاطف بیگ کا موڈ سخت خراب ہو گیا تھا۔ عدیل عبدالرحمن جانتے تھے، وہاں پر آنا خود بتانے کی خواہش کے باوجود غصہ نہیں نکال پا رہا تھا جو بات اسے ادھوری ہے۔

"عدیل بھائی! ابھی ذرا گاڑی نکلوا دیں۔ میں کمرے کی گھٹن سے نکلنا چاہتا ہوں۔" شہریار عبدالرحمن نے اس کی طرف دیکھا پھر کچھ دیر سے لہجے میں کہا۔

"تم کمرے کی گھٹن سے کیا، اس ہسپتال کی گھٹن سے بھی نکل سکتے ہو۔ تم مصروف آدمی ہو، تمہیں یہاں رکنا ہی نہیں چاہیے تھا اب تک۔"

عاطف بیگ بل کلیئر کروا گیا تو عدیل عبدالرحمن نے اس کا ہاتھ تھام کر "پرسکون رہے ہو؟ تندرست ہو؟" اگر وہ ایسا لگتا تھا کہ پھر رکا نہیں، کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

عدیل عبدالرحمٰن صوفے سے اٹھ کر اس کے قریب آ گئے، پھر آہستگی سے بولے۔ ''تمہیں اس طرح کا رویہ نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ آخر کو وہ تمہارا پاپا دوست ہے اور تم سے کتنا مخلص ہے، جسے تمہارے سے آگے کچھ دکھائی دیتا ہے، نہ تمہارے بعد۔''

شہریار عبدالرحمٰن نے گہری سانس لی، پھر آہستگی سے بولا۔ ''میں ماضی کی ہر چیز بھول جانا چاہتا ہوں۔ حالانکہ یہ ممکن نہیں، مگر میں بھول جانا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں، دوسرے بھی مجھے بھول جائیں۔ مجھے یاد کرنے میں سوائے تکلیف، دکھ اور وحشت کے کسی کو کیا ملے گا؟''

''شہری! یہ مایوسی کی انتہا ہے۔ مجھے لگتا ہے، تمہیں کونسلنگ کی سخت ضرورت ہے۔ تم ڈپریشن کے ایک طرح کے فیز میں آ کر بند ہو گئے ہو۔ حالانکہ زندگی اتنی بھی بری نہیں ہے۔''

اس نے عدیل عبدالرحمٰن کو دیکھا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں ایک طرح کے فیز میں آ کر بند ہو گیا ہوں، لیکن یہ فیز ڈپریشن نہیں، زندگی ہے۔ میرے لیے اس زندگی میں کوئی چارم نہیں ہے۔ زندگی میرے لیے ایک گنبد بے در ہے جس میں، میں قید ہوں اور سانس لینے کے لیے ہلکا سا روزن بھی نہیں ہے، جہاں سے میرے اندر کا حبس نکل سکے۔''

عدیل عبدالرحمٰن نے اس کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لے لیا، پھر محبت سے بولے۔

''زندگی گنبد بے در نہیں ہے، یہ صرف تمہارا احساس ہے۔ تم نے دروازے کی طرف پشت کر رکھی ہے اور سمجھتے ہو اس جگہ سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ شہری! زندگی میں سانس لینے کے روزن محبتوں کے رشتے ہیں۔ کیا واقعی تم دنیا میں بالکل اکیلے ہو؟ کبھی تم نے مجھے اپنے دوستوں میں شمار نہیں کیا۔ رابعہ، عائشہ، دانیہ یا رانیہ، بیگ اور میری بیٹی کیا وہ بھی تمہارے اندر کوئی امنگ نہیں جگاتی؟''

شہریار عبدالرحمٰن نے کچھ نہیں کہا۔ دل ایک رائے قائم کر لے تو اس رائے سے ہٹنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ فوری طور پر تو بالکل ناممکن...... کیونکہ بظاہر یہ تمام بہت سارے تھے، جو اس سے محبت کرنے والے تھے۔ مگر ان کی محبتیں تھکنے میں سے جزادوں کی تنہائی کاٹتی پڑتی تھی، پھر کہیں کوئی اُلفت آمیز الفاظ دل کو چھوتا تھا۔ زندگی بہت روشن تھی، بہت تیز رفتار...... اور یہ زندگی کا اصول ہے، زندگی سے تیز چلنے والے بھی پیچھے رہ جاتے ہیں اور زندگی کی رفتار سے کم چلنے والے بھی تنہا...... تنہائی جیسے محبت کی ذات ٹھہری ہے، شاید کسی زبان میں محبت کا دوسرا مطلب تنہائی بھی ہوتا ہو......

''کیا سوچنے لگے تم؟...... یقیناً پھر کوئی دل کو پریشان کرنے والا خیال ہی سوچ رہے ہو گے۔'' عدیل عبدالرحمٰن نے اُسے پھر سے اپنی طرف متوجہ کیا۔ پھر پہلے اس سے کہ وہ کوئی چبھتا ہوا سوال دے پاتا، کمرے کے باہر دستک ہوئی۔

"آجایئے، یہ خانہ بے تکلف ہے۔"

عدیل عبدالرحمٰن کا خیال تھا شاید وہ ڈیوٹی پر آنے والا ڈاکٹر غار، کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر جو شخص اندر داخل ہوا، عدیل عبدالرحمٰن کے چہرے پر اس کے لئے ستائش بہت جلد سے لینی گئی تھی۔

"ہیلو مسٹر ماموں......!" عدیل عبدالرحمٰن نے سلام کے بعد مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ماموں عبدالکریم نے عہدے کے لحاظ سے انہیں سیلوٹ مارا اور عدیل عبدالرحمٰن مسکرانے لگے۔

"نیا ہی ہی۔ میں یہاں صرف عدیل عبدالرحمٰن ہوں، آپ کے محکمے کا افسر نہیں۔"

ماموں عبدالکریم دوسری کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے احترام سے بولا۔ "ٹھیک ہے سر! آپ چھٹیوں پر ہیں۔ لیکن میں تو آن ڈیوٹی ہوں، اس لئے یہ میرے فرائض منصبی میں شامل ہے۔"

عدیل عبدالرحمٰن نے اس کی بات کو تسلیم کیا اور اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر بولا۔ "کیوں شیری کے بچے بازو کا زخم کم لگنے لگا تھا، جو اتنی خراب کنڈیشن میں ہسپتال میں آکر پڑ گئے ہو۔ تمہیں پتہ ہے یہاں، تمہارے بغیر ہم کو کہیں بھی مزہ نہیں آتا۔"

اس کا اس کی جی مائنر بن ہو گیا تھا اس لئے ماموں عبدالکریم مطمئن سا ہو کر پہلی فرصت میں اس کے بازو کا زخم دیکھنے لگا تھا۔ پہلے کے مقابلے میں زخم کی بہت اچھی حالت میں تھا۔ اس نے توجہ زخم سے ہٹائی تو اس کی رپورٹس پڑھنے لگا۔ شہریار عبدالرحمٰن اسے کافی دیر تک دیکھتا رہا پھر چیختے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یہاں کا ایک اچھا ڈاکٹر ذکی کی تھیں۔ ہاں تم جیسے افسر ذرا محکمے میں ضرور فٹ ہے۔ اس لئے اپنے شعبے کی ٹھیک سے چھٹیاں تمہارے ہی حق میں بہتر ہے۔ رہی میری کنڈیشن تو اگر کوئی بڑی خبر ڈھونڈ رہے ہو تو اتنا آفیس ہوں کہ ایک کالمی خبر اخبار میں ضرور لگے گی۔ سو پلیز کوئی نئی بات کرو۔ کیونکہ اپنی بیماری کی وجہ سے پہچانے چہرے دیکھتے دیکھتے میں اب بور ہو گیا ہوں۔"

عدیل عبدالرحمٰن اسے دلچسپی سے دیکھنے لگے۔ کیونکہ اس لمحے اس کے لہجے میں دل کی بیماری کی بجائے اس کے ساتھ تنگی ہی بہت سے لمس کی خوشبو بھی تھی اور یہ سچ تھا وہ اگر اپنے اندر کی بجائے اس کا اظہار کرتا تو اندر کی گھٹن خود بخود ختم ہو جاتی۔

"تم دونوں باتیں کرو میں ذرا دیکھوں، عاطف کہاں رہ گیا ہے؟"

"عاطف...... عاطف بیگ؟...... کیا وہ بھی یہاں آیا ہوا ہے؟ شیری کی باتوں میں بہت زیادہ اس کا تذکرہ رہتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے، میں اس کے تذکرے سے اتنا اسے پہچان چکا ہوں کہ پہلی نظر ہی میں

وہ میرے لیے اجنبی نہیں رہے بلکہ مجھے حیرت ہے وہ کمرے کے اندر ہونے کے بجائے کمرے سے باہر کیوں ہے؟"

عدیل عبدالرحمن مسکرائے، پھر آہستگی سے بولے۔ "تم یہ اپنے اس دوست سے ہی پوچھو۔ وہ ہند وہ دوسرے شہر سے کس کے سلسلے میں آیا تھا پھر ان دونوں میں ہی رہ گیا اس کے گرد ہی ڈیرہ لگا کر بیٹھ گیا۔

شکر ہے محترم محبت سے الرجک ہیں کیا ارشاد کرنے بے چارے کو قادری کا مطلب سمجھانے لگے۔ وہ بھی مناسبت میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔"

شہریار عبدالرحمن نے خفگی سے عدیل بھائی کو دیکھا۔ وہ جانتے تھے یہ خفگی ان کے کسی جملے کی وجہ سے نہیں تھی، پھر عدیل بھائی نے دوبارہ دیکھا تو وہ خفگی سے کہہ رہا تھا۔

"ہم میرا دماغ خراب ہے جو میں شیخ کا ساتھ چھوڑ دوں؟ کیا وہ بزرگ نہیں ہو سکتا تھا؟ یہ ضرور رہتا تو کیا جاتا تمہیں ہے کہ ہر شخص وہ پوری اور محبت کی کس قدر ضرورت ہوتی ہے۔"

عدیل بھائی اس بار ہنس پڑے، پھر اس کے قریب آ کر اس کا رخسار چھو کر پیار سے بولے۔ "تم...... تم مجھے کسی کم سن بچے کی طرح لگتے ہو۔ جس چیز کی ضد کرتے ہو، ناپسندی میں اپنی کوشش مارتے رہتے ہو۔ اب جاؤ فکر مت کرو، بس یا کافی جائے؟"

شہریار عبدالرحمن جواب میں کچھ نہیں بولا۔ جو کچھ بھی اس سے کہنے میں سرزد ہوا تھا، وہ کمرہ دیکھ رہا تھا جو انسان کی زندگی میں کبھی کبھی آتا ہے۔ وگرنہ ان جیسا محبت میں وضع دار انسان ایسے اظہار کے ہر جگہ سے جان بچانے ہی میں عافیت سمجھتا تھا۔ مگر یہاں باپ آ کر جیسے بہت سارے ہر کی طرح اس کی زبان اس کے دل کی طرح ان کے کہنے میں نہیں رہی تھی۔

عدیل عبدالرحمن کمرے سے باہر جا چکے تھے اور وہ مامون عبدالکریم کو دیکھ رہا تھا۔

"ہم کوئی خاص خبر ہے تمہارے پاس میرے لیے؟" شہریار نے گہرا سانس لے کر خاموشی کو توڑا۔ مامون عبدالکریم جس پر کچھ سنجیدہ ہو کر بولا۔

"تم یا الہام بھی اترا کرنے ہیں یا یہ بشارت کا کوئی جادو ہے؟"

"تو پھر نہیں، یہ بتاؤ کیا تم خبر ہے تمہارے پاس میرے لیے؟" اس نے سگریٹ کی طرف پھر سے ہاتھ بڑھایا اور مامون عبدالکریم اسے منع کرنے یا روکنے کے بجائے اس سے بھی پہلے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا چکا تھا۔

"تم اسموکنگ نہیں کرو گے۔" شہریار نے سختی سے کہا۔

"کیوں، میں اسموکنگ کیوں نہیں کر سکتا؟ کیا میں نے کبھی تمہیں ڈرنک کرنے اور اسموکنگ کرنے سے منع کیا ہے؟" ماسون نے اب بھی اٹھالیا تھا۔ تب اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔
"اوکے، میں اسموکنگ چھوڑنے کی کوشش کروں گا۔"
"لیکن میں نے تم سے اسموکنگ چھوڑنے کی فرمائش نہیں کی۔" وہ جھلا رہا تھا۔ شہریار جس طرح اسے گہری نظر سے دیکھ رہا تھا وہ اس خیال کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔
"مت بھیجو، بہت اچھا فاصلہ ہے باہر رہ جاتا ہے۔" اس نے التجا کی اور اس نے وہ دونوں چیزیں اپنی جیب میں ڈال لیں، پھر تلخی سے بولا۔
"ٹھیک ہے، میں نہیں کرتا اسموکنگ۔ مگر یاد رہے اب تم بھی اسے ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔"
شہریار عبدالرحمٰن نے بے بسی سے اسے دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔
"تم میری کمزوری سے واقف ہو، اس لیے فائدہ اٹھا رہے ہو۔ تم جانتے ہو میں نے کبھی زندگی کا فیصلہ اپنے اوپر لاگو نہیں کیا لیکن تم...... ٹھیک ہے۔" پھر آہستگی سے بولا۔ "میں کوشش کروں گا کہ اسموکنگ چھوڑ دوں، لیکن ایک دم سے کوئی بھی عادت بدلی نہیں جا سکتی تم جانتے ہو یہ بات؟"
ماسون عبدالکریم نے نفی میں سر ہلایا پھر بولا۔ "میں تمہاری اس بات سے متفق نہیں ہوں۔ عادت کیسی بھی ہو بدلی جا سکتی ہے۔" وہ رکا پھر شرارت سے بولا۔ "اس بار لوگ تو یہاں محبت بدل لیتے ہیں، اور تم کہہ رہے ہو عادت نہیں بدلی جاتی۔"
شہریار اب کچھ نہیں بولا تھا لہٰذا سارے کے سارے کے بعد وہ اپنی آنکھوں کی طرح خالی ہو گیا تھا۔
"ناراض ہو گئے ہو؟" ماسون نے ہاتھ تھام کر چاہت سے پوچھا مگر وہ خاموش رہا۔ ماسون عبدالکریم نے بھی اسے طرح دی، پھر شرارت سے اسے دیکھا تو کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، میں پہلے سے کہیں چھوڑ کر نہ جاؤں یا تم کسی نئے طریقے سے مجھے خارجی دروازے کا پتا اور اس کے استعمال کا طریقہ سمجھاؤ گے؟"
شہریار کے چہرے پہ مسکان اتری، پھر کب غائب ہوئی شاید اسے بھی پتہ نہیں چلا۔ ماسون نے اس کے قہقہے کا ساتھ دیا، پھر دونوں کی ہنسی رکی تو شہریار نے کہا۔ "اب بتاؤ بھی چچا جان، تم ان باتوں کا کیا خیال رکھتے ہو کہ فوراً آئسل بھاگ کے چلے آئے؟"

AANCHAL.COM.PK

مامون عبدالکریم نے مسکرا کر اسے دیکھا، پھر ہولے سے بولا۔ ”بکواس مت کرو۔ میرے پاس جو خبر تھی وہ واقعی بھی اہم نہیں تھی کہ میں یوں دوڑا چلا آتا۔“ تو توقف کیا، پھر بولا۔ ”میرا خیال تھا تمہارے دفتر جا کر تم سے تمہاری شوٹنگ کے بارے میں تجزیہ ڈسکس کروں گا، مگر یہ چچا صاحب بہادر وہاں سے تو اپل کر اس کی برداشت کرنے باہر نکل زوردی پہ نکل کھڑے ہوئے۔ ویسے یہ بات بہت بری ہے شیری! تم نے انٹرویو کال کر کے بیماری سے نخل گیری اختیار کر لی۔ ان بے چاروں کا کیا جو ایک امید سے تمہارے دفتر کے چکر مار رہے ہیں؟“

”اُف وہ...... میرے ذہن سے بالکل نکل گیا تھا، اچھا ہوا تم نے یاد دلایا۔“ اس نے سینٹرل ریک پر رکھا موبائل اٹھایا، نمبر پریس کیا، پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ ”مسٹر راحم! پلیز ایک نیا نوٹیفکیشن اخبار میں لگوا دیجیے کہ ہماری ایڈورٹائزنگ کمپنی کے ہونے والے انٹرویو ملتوی ہو گئے ہیں اور تین چار دن بعد کی تاریخ اناؤنس کر دیں۔ ہاں ہاں، میں یہاں تین چار دن سے زیادہ نہیں رک سکتا۔ بے فکر رہو، مسٹر مرگ نہیں، سنبھال کر پہنچ گیا ہوں۔ کیا وہ کون محترمہ ہیں؟ نہیں پلیز! کسی سے اس طرح کا سلوک نہیں کرو کہ بدتمیزی یا بدتہذیبی کا احساس ہو، نہ اتنا نشینا ہو کہ قرابت داری کا احساس ہو۔ کہہ دیا ناں انٹرویو قابلیت کی بنیاد پر ہی ہوں گے۔ ہمیں بہترین دماغ چاہئیں۔ تمہیں معلوم ہے، مجھے کم ذہانت سے سخت چڑ ہے۔“ اس کی آواز میں غصہ آ گیا تھا۔

”کول ڈاؤن، تمہارے لیے غصہ زہر قاتل ہے۔“ مامون نے خفگی سے دیکھ کر کہا تھا۔

اس نے چونک کر مامون عبدالکریم کو دیکھا، پھر اس کے کاروں کی بات کو وہ یکدم نظر انداز کر کے دوسری طرف کی بات غور سے سننے لگا۔

”ٹھیک ہے، کرا دو میری بات۔ آخر پرابلم کیا ہے ان کی؟ انہیں میری بات کیوں سمجھ نہیں آ رہی؟“ اچھا بس، کیا اس کے لہجے میں، پھر اس نے نہایت سرد لہجے میں کہا۔ ”جی کہیے، کس موضوع پر آپ کو میرے نمبر کی بات کیوں سمجھ نہیں آ رہی؟ جی ہاں، آپ نے درست سنا ہے، ہمیں کاپی رائٹر، گرافک ڈیزائنر اور ویب ایڈیٹر کی سخت ضرورت ہے۔ جی، آپ کا خیال ہے آپ ان تینوں کاموں میں ماہر ہیں؟ سوری، مجھے کہنے دیجیے کہ آپ میرے پہلے ہی آپشن میں ناکام ہو جائیں گی، کیوں؟ سیدھی سی بات ہے، جو انسان مختلف کاموں میں انرجی ویسٹ کرتا ہے، وہ کسی ایک کام میں بہترین کارکردگی نہیں دے سکتا۔ میں کہاں ہوں؟ کیا آپ کی اور میری اتنی بے تکلفی ہے کہ میں آپ کو یہ بتاؤں؟ جی نہیں، میں اپنے دوسرے دفتر میں مصروف ہوں، مسٹر راحم کو غلط اطلاع ملی ہے میری بیماری کی۔ آپ فون مسٹر راحم کو دیجیے۔“

اس کا غصہ پھر نقطۂ عروج پر تھا۔ دوسری طرف ریسیور راحم کے ہاتھ میں آیا تو وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ ”کیا تمہیں میری طرف سے اجازت تھی کہ تم میری بیماری کا ڈھنڈورا پیٹو؟ کیا میں نے تم سے کہا تھا کہ

مجھے دعاؤں کی بجائے دوائی کی زیادہ ضرورت ہے؟ مسز راحم حیدر! مجھے شادی سے زیادہ شادی کو ناکام کرنے والے ورکرز سے چڑ ہو جاتی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں آپ اپنی نوکری پہ بحال رہیں تو سوچ سمجھ کر قدم اٹھایا کیجئے ہو کے گا پانے۔"

اس نے موبائل آف کر دیا۔ ذرا سی بات کرنے سے ہی اس کے چہرے پہ پسینے کی بوندیں قطار در قطار دکھائی دینے لگی تھیں۔ وہ یک دم صدمے سے نڈھال ہو گئی تھی مگر اس نے پھر بھی مطمئن انداز میں ماسون کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بے تاثر کیفیت میں دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے لہجے کو نارمل کرنے کی کوشش کی مگر آواز میں کمزوری نمایاں تھی۔

ماسون نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "تمہاری ڈاکٹر نواز سے آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟"

"شاید پچھلے مہینے کی دس تاریخ کو...... لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"ڈاکٹر نواز نے تمہاری فرٹیلٹی رپورٹس دیکھ کر تم سے کچھ کہا تھا؟"

اس نے صوفے سے سر جھکا کر بے ترتیبی سے بولا۔ "کم آن یار! کیا ہو گیا، کچھ نہیں ہوا مجھے۔ ڈاکٹر نواز تو ان کا خوف لگانے کی کوشش کرتے ہی ہیں۔ جیسے ڈاکٹر صمدانی ہیں۔ دانیال تک کو اچھا خاصا الجھا دیا۔ عدیل بھائی اور پاپا تو پھر بھی قابل قبول تھے مگر بیچاری وہ دونوں کمزور دل کے ہیں۔ انہیں ہائی بلڈ پریشر ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صمدانی نے اچھا نہیں کیا۔"

"لیکن ڈاکٹر نواز نے کیا کہا تھا؟" وہ اپنی پچھلی ہی بات پہ اصرار کر رہا تھا۔

"میں نے کہا ہے نا، میں اسموکنگ چھوڑنے کی کوشش کر رہی ہوں گی۔"

"یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں۔ تم مجھ سے کیا چھپانا چاہتی ہو؟" اس کا لہجہ اب پہلے سے بھی زیادہ کمزور ہو گیا تھا اور شیراز عبدالرحمن ایسے ہر موقع پہ نرم ہو جاتا تھا۔ اس بار بھی اس کا لہجہ نم تھا۔ ماسون کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر اس نے لجاجت سے کہا۔

"تم اور ڈاکٹر نواز چاہتے تھے نا، میں نے ترک کر دوں اسموکنگ چھوڑ دوں تو میں نے اس کا فیصلہ کر لیا ہے نا۔ پھر کیوں سوالوں میں الجھ رہے ہو؟"

ماموں عبدالکریم نے تند نظروں سے اسے دیکھا پھر تلخ لہجے میں بولا۔ "تم اور کسی کی بات اتنی آسانی سے مان لو ناممکن...... ایک نمبر کے ضدی اور ہٹ دھرم ہو۔" لمحہ بھر رک کر وہ اسی لہجے کو برقرار رکھ کر مزید بولا۔ "شاید اب تمہاری ذرک اور اصول کو چھوڑنے اور اپنائے رکھنے سے تمہاری زندگی کے فائدے نقصان میں کوئی فرق نہیں پڑنے والا اس لئے تم جھٹ کرنا چاہتے ہو کہ سب کی مان بھی لو خوش بھی کردو سب کو اور خسارے کی خبر..... وہ کسی کے کانوں کان تک بھی نہ پہنچے۔ ہے ناں یہی بات ہے ناں؟"

شہریار عبدالرحمن کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں ماموں عبدالکریم سے چرالی تھیں اور ماموں عبدالکریم وہ تو اسے اتنے آرام سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔

"تم مجھے خود بتا رہے ہو یا مجھے ڈاکٹر فواز سے ملاقات کرنی پڑے گی؟"

شہریار نے گہرا سانس لیا پھر آہستگی سے بولا۔ "انہیں کہنا کہ کسی بھی کنڈیشن کی وجہ سے جو بات مجھے بتا دینی ہے بتا دیں، اس کی گارنٹی نہیں ہے سو......"

"سو کیا؟ تم نے اس بات سے یہ ارادہ کرلیا ہے کہ تم آسانی سے خود کو موت کے حوالے کردو گے؟"

"نہیں، بلکہ میں یہ چاہتا ہوں، زیادہ سے زیادہ کام کر گزروں تاکہ وقت اچھا گزر سکے۔ میں اچھی زندگی ہوں یہ حقیقت ہے۔ لیکن آپریشن ٹیبل سے واپس زندہ آسکوں گا اس کی صرف ایک پرسنٹ امید ہے۔ پھر میں ننانوے فیصد امید کو ایک پرسنٹ پر کیوں داؤ لگاؤں؟"

"تم بہت عجیب ہو بہت زیادہ عجیب...... تمہیں معلوم ہے اس بار کے انجام تک سے تمہارا کیس پہلے سے زیادہ بگڑ گیا ہوگا۔"

"ہاں، میں جانتا ہوں۔ شاید انکل عمران بھی آگاہ ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ بابا کی طبیعت کے پیش نظر اس بات کو ایکسپوز نہیں کرنا چاہتے اور یہی میرے لئے باعث اطمینان بات ہے۔"

"یعنی تم اپنے بچاؤ کے لئے کچھ نہیں کرو گے؟ ڈوب جاؤ گے سمندر میں حالانکہ تیرا جا سکتا ہے۔"

"شاید۔ لیکن کنارہ قسمت میں نہ ہو تو تیرنے کی خواہش زندہ نہیں رہ پاتی۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ اس بوڑھے پیک کو... یہ بتاؤ تم میرے پاس کسی خاص کام سے آئے تھے کیا؟"

"ہاں تمہاری صورت دیکھنی تھی اور یہ بتانا تھا کہ تم پر گولی چلانے والے کا تعین کیا ہے۔ بظاہر کوئی غیر رجسٹرڈ بندوق سے چلائی گئی تھی۔ لیکن معاملہ تمہارا تھا اور تحقیقات میرے ذمے سو تحقیق کرتے کرتے میں بادل خان تک پہنچ گیا۔ پہلے تو وہ مانا ہی نہیں تھا پھر کچھ مخصوص حربے آزمانا کر کے اس تک پہلے آیا کہ اس نے ہاں۔ اتنی ہتھیار لیے والے کا حلیہ بیان کرنا شروع کر دیا۔ میری ہدایت کے کچھ

AANCHAL.COM.PK

میں ان کے بتائے گئے حلیے کا خاکہ تیار کیا گیا۔ پھر نادانی مجرموں سے لے کر بڑی چیچز کے ... تک سب کا بائیو ڈیٹا چیک کیا گیا اور پھر بہت جلد پتہ چلا وہ زوار حسن شاہ کا بہت پرانا نمک خوار ہے، جسے گارڈ کے طور پر معزز ڈیوٹی پر لگایا گیا تھا۔ میں اپنی ٹیم کے ساتھ زوار حسن کے فارم ہاؤس پہنچ گیا، وہاں میرا خیال تھا مجھے کافی مشکل پیش آسکتی تھی مگر حیرت انگیز طور پر مجرم میرے حوالے کر دیا گیا۔ میں نے زوار حسن شاہ کا شکریہ ادا کیا اور اس سے فائرنگ والوں کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ شہریار نے ان کے مالک کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے، چیچز کی حماقت تھی، جوان جیسے نمک خوار ملازموں کے لیے تو قتل ہے۔ وہ پہاڑی لوگ ہیں اس لیے عزت اور آن پر جان لینے اور دینے پر یقین رکھتے ہیں۔ زوار نے بتایا کہ اس معاملے کو دبا دیا تھا لیکن وہ برداشت نہ کرسکا کہ ان کا آقا کسی کے سامنے سرنگوں ہو۔ سو پارٹی والے دن کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اس نے یہ مشکل ... سرانجام دیا۔ اب بھلے اسے کوئی مار دے یا پھانسی پر لٹکا دے، اسے اس سے کوئی غرض نہیں۔" ممون عبدالکریم نے اس کے بیان کی کاپی سے اپنے لفظوں میں تفصیل بیان کی۔

شہریار نے اس کے چپ ہونے پر بات خاموشی سے سنی۔ پھر آہستگی سے بولا۔ "... یہ کیس ختم نہیں ہو سکتا؟ کیونکہ بار اور ایک ... تو چیچز پکڑا گیا ہے، اس کے جیل جانے سے اس کے گھر والے کس مصیبت میں آسکتے ہیں۔"

"کس مصیبت میں آسکتے ہیں؟" اس نے اسے گھور کر دیکھا پھر غصے میں بولا۔ "تم جانتے ہو اگر اس کا نشانہ چوک جاتا تو تم کہاں ہوتے؟ کیا چیچز نے تمہارے ساتھ کوئی مہربانی کی ہوتی؟"

شہریار بے طرح جھنجھلا گیا پھر تحمل سے بولا۔ "میری بات کو ایسے نہیں لیتے۔ تمہیں تو معلوم ہے مجھے چیچز کا حال ... ہے، لیکن پھر بھی کسی کی تکلیف برداشت نہیں ہوتی اب۔ مجھے اگر اس کا علم کامیاب بھی ہو جاتا تو تم ہی کہو مرے ہوئے آدمی کو مارنے کی سزا تمہارے کس قانون میں درج ہے؟"

"بکواس مت کرو، یہ میرا ایمان ہے کہ تم جہاں ہو وہیں تمہیں کوئی مشکل پڑے ... میں اکٹھا ہوں۔"

"تمہیں، مجھے معلوم ہے تم ایسے کیوں ہو، تم نے اس وقت میری بات کا مان رکھا تھا جب تم مجھے صرف نام کی حد تک جانتے تھے۔ اب تو خیر سے ہم بہت اچھے دوست ہیں۔"

"بس بس... زیادہ مسکا نہ لگاؤ۔ لیکن یاد رکھو کہ تم بہت جلد ... کردار سے مجرے ... کرو گے۔"

"اوکے... پہلی فرصت میں یہ کام کر گزروں گا۔" اس نے اسے منانے کی کوشش کی۔

AANCHAL.COM.PK

مامون عبدالکریم ہاتھ ملا کر کسی سے کھڑا ہو گیا۔ اسے گئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ عدیل بھائی، عاطف بیگ کو لئے روم میں داخل ہوئے۔ عاطف بیگ کے ہاتھ میں گلدستہ تھا۔ یہ تو ملتے ہے، عاطف بیگ فارمیلٹی سے زیادہ جذبات پہ یقین رکھتا تھا۔ وہ گلدستے کے بجائے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر محبت کا یقین دلانے کی کوشش کرتا، مگر پھولوں کی خوشبو سے اس احساس کو باندھتا۔ خوشبو تو خوشبو ہے، آزاد ہے کی چاہتیں رہنے والا احساس...... اپنی مرضی کا مالک، جب چاہے تو آپ کے دل کی بات کہہ گزرے، نہ چاہے تو خاموش رو کر اس لمحے کو بے جا گزرتے دیکھتا رہے۔

"کیوں آیا تھا؟" اس نے پہلے سے لہجے میں کہا جیسے کسی بے مروتی ہوئی ہی نہیں تھی۔

عاطف بیگ نے گلدستہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سرخ اور پیلے گلابوں سے بنا گلدستہ جس کی پسند تھا شاید وہ اسے اچھی طرح سے وہ رکھتا تھا۔

"سلمان آیا تھا؟" عاطف بیگ کی طرف دیکھ کر اس نے سوال کیا۔

عاطف بیگ "ہوں......ہاں" کہہ کر چپ ہو گیا۔ عدیل بھائی صوفے پہ جا بیٹھے اور وہاں کافی حد تک پرسکون ہو کر ملاحت سے بولا۔ "کہہ دیا ہاں، سوری ساب ضروری ہے، شرمندگی دل میں محسوس کرتا ہوں تو زبان سے بھی ضرور کہوں۔"

عاطف بیگ تو دم بخود اسے دیکھنے لگا۔ لیکن اب انداز میں پہلے سے کم خفگی تھی۔ سو شہریار عبدالرحمن نے پھر سے سوال دہرایا۔ "کیا سلمان ارسلان مجھ سے ملنے آیا تھا؟"

عاطف بیگ نے گہرا سانس لیا پھر آہستگی سے بولا۔ "پہلی محبت کی نوعیت کیسی بھی ہو، پہلی محبت انسان بھولتا نہیں ہے۔ جب سلمان صاحب بھی اس جذبے کے آگے ہار گئے۔ مگر مجھ سے ٹکرا گئے تو لے وہ یہاں اپنے کسی آرٹیکل کے ہوم ورک کے لئے آئے تھے۔ پتہ چلا شہریار بیمار ہے تو اس کے لئے گلدستہ وارڈ والے سے بھجوا دیا۔ میں نے کہا شہریار کو پھولوں سے الرجی ہے تو کہنے لگے اسے کہنا پھولوں کو گلدان میں سجانے کے علاوہ ڈسٹ بن میں بھی پھینکا جا سکتا ہے، شرطیہ، پھولوں کو اس پہ احتجاج کی حاجت بھی نہیں ہوگی۔"

شہریار کے ہونٹوں کو مسکراہٹ نے چھوا۔ "پاگل ہے، مجھ سے بھی زیادہ پاگل۔" ہاتھ کے اشارے سے پھولوں کو گلدان میں لگانے کی فرمائش کی۔

عدیل بھائی دونوں کی گفتگو نہایت محویت سے سن رہے تھے، سو عاطف کے چپ ہونے پہ انہوں نے مامون کی آمد کی بابت سوال کیا۔ شہریار نے بلا کم و کاست سب واقعہ دہرا دیا۔ عدیل عبدالرحمن نے سنا تو مسکرا کر کہا۔ "یعنی شہر جوان ذہین ہی نہیں، ذہین آفیسر بھی ہے، خطروں سے کھیلنے کا شوقین بھی ضرور ہوگا؟"

"جی ہاں، وہ ایسا ہی ہے۔ بظاہر اس کے پاپا ایک کامیاب سیاست دان ہیں اور جاگیردار بھی گھرانے سے ہے لیکن پھر بھی وہ آپ ہی کی طرح کا شوقین مزاج ہے۔"

"شوقین مزاج...... مجھے! بالکل کافی تو شوقین نہیں ہو گیا ہے؟"

"ہو سکتا ہے ہو گیا ہو۔ لیکن جواب کو جاتے ہیں وہ روانی سے مجھ کہتے ہیں کہ آپ دوسری قسم کی شوقین مزاج ہیں، اس کے لئے بدلے کو ذرا جگر دار رکھنا پڑتا ہے۔"

"تم جانتی نہیں چچی...... تمہیں معلوم ہے، جب میں بھٹکا تھا ہوں تو سنک سی جاتا ہوں اگر ذرا سی تنگ میں شوقین مزاجی پا لیتا......؟"

"تو رابعہ بھابی کو صرف ایک فون کرنا کافی ہو گا تو آپ کی ذہنی رو وہیں لوٹ آئے گی۔"

"پتہ چل جاتا ہے کمزوری۔ ہوں، مزے کی بات ہے۔ کسی کی کمزوری سے نہیں کھیلتے۔"

وہ بھی مسکرا کر کے بظاہر بے ضرورت بول رہے تھے مگر شہریار جانتا تھا یہ سب محض اس کی توجہ بٹانے کے لئے کوشش کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"بیٹا ابھی تک نہیں آئی۔ شاید رنج کیا ہے ماں۔" اس نے عدیل بھائی اور عاطف بیگ کی تھکن کا خیال کر کے سوال کیا اور عاطف بیگ مسکرانے لگے۔

"میری ماما سے بات ہوئی ہے۔ وہ گھر سے نکلنے کی والی تھی۔"

شہریار دل کھول کر ہنسا، پھر شرارت سے بولا۔ "یہ بتائیں عدیل بھائی کی تھکن کی بے صبری ہو گی ہے نا؟"

عدیل بھائی شرمندگی سے مسکرائے پھر بولے سے بولے۔ "تم ٹھیک سمجھے۔ یہ میری نہیں میری بھوک کی بے صبری کا تقاضا ہے۔ اس لئے میں ہر وقت اللہ میاں ہر طرح کی تحمید ہے۔"

"واہ...... آپ تو کسی ماہر پولیٹیشن کی طرح بیان واضح ہو آئے۔" عاطف نے مسکرا کر شہریار کی بات کا دفاع کیا تو ایک انجانی سی فکر تھی، جوان کے دل کو گھیرے ہوئے تھی۔ پتہ نہیں اسے کیوں لگنے لگا تھا جیسے وقت کہیں بہت تیزی سے نکل گیا تھا اور اب صرف وقت کا اپنے ہونے کے دعوے کے سوا کچھ نہیں بچا تھا اس کی آنکھیں بظاہر شہریار پر جمی تھیں مگر دل...... وہ جس میں کہیں کھو گیا تھا۔

❁❁❁

دادا نے گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ سب سے پہلا نوٹس ہی کو دکھا۔

AANCHAL.COM.PK

"کرلی اس خوشیت کی تیاری؟...... مل گیا تمہیں اور مدیل کا انعام؟ یا ابھی کوئی خاص تقریب ہو گی، جس میں تمہیں میڈل لگائے جائیں گے؟"

"پلیز نانو! اتنی منافی کا مظاہرہ مت کیا کریں۔ وہ میرا بھائی ہے، اس کی پروا کرنا میرا فرض ہے۔" اس نے قدم روکے نہیں اور حیرت انگیز طور پہ نانو بھی صرف گھور کر نہیں رہ گئیں بلکہ اس کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ اس نے جانے کیا سوچا کہ ٹھنک سے بولی۔

"نانو! آپ پرہیزی کھانے پکانے میں بہت ماہر ہیں۔ پلیز شیری بھائی کے دوپہر کے لئے کچھ بنا دیجئے۔"

نانو نے ناک سکوڑی۔ پھر تنفر سے بولیں۔ "اسے یا اللہ ہو گیا کیا؟ میں اور اس کے لئے پرہیزی کھانا پکاؤں؟ زہر نہ دے دوں اسے؟"

"نانو پلیز! آپ جانتی ہیں، میں شیری بھائی کے متعلق کوئی کمنٹ نہیں سن سکتی۔"

"چاہے اس کی وجہ سے خود تمہارا کتنا ہی نقصان ہو جائے؟" نانو نے ترشی سے پوچھا۔

اس نے گہری سانس کھینچی، پھر آہستگی سے بولی۔ "جو نقصان ہو چکا، اسے کیا بار بار دہرانا۔ آپ بھول کیوں نہیں جاتیں کہ میری کبھی منگنی بھی ہوئی تھی؟"

"اے ہے، کیسے بھول جاؤں؟ کیا لڑکیاں گھر میں بٹھا کر رکھنے والی چیز ہیں؟ تم سے کیا کہا تو سنی ان سنی کر دیا، ہر بار بہانے سے کوئی وہ موقع لے کر گھر بسا لو، کب تک میری وہ اپنی ماں کی نیندیں حرام کرتی رہو گی؟"

بانیا کچھ نہیں بولی، کچن کی سمت بڑھتی چلی گئی۔ اس نے ملازمہ کو بلا کر پرہیزی کھانے کے ساتھ چکن کارن سوپ بنانے کا کہہ دیا تھا۔ اس کا ارادہ شاور لینے کا تھا سو وہ کپڑے لے کر واش روم میں گھس گئی۔ پھر چند منٹ بعد وہ اپنے بال تولیے سے سکھا رہی تھی کہ اس کے کمرے میں ہلکی سی دستک کے ساتھ جازی عبدالرحمن داخل ہوا۔

"جازی! تم...... تم کالج نہیں گئے؟ میں تو تمہاری غیر موجودگی سے یہی سمجھی تھی کہ تم کالج میں ہو گے؟"

جازی عبدالرحمن خاموشی سے صوفے پر آ کر بیٹھ گیا، پھر آہستگی سے بولا۔ "میں کالج گیا تھا، مگر پھر دل بے چین ہوا تو کلاسیں بنک کر کے گھر آ گیا۔ ویسے مسز افضل آپ کی چھٹی سے خاصے اپ سیٹ تھے۔ بقول ان کے، آپ سے زیادہ اچھی آرکائیو کوئی لے ہی نہیں سکتا۔ سو وہ ان سے مختلف لیکچرز اور آرکائیو اب وہ اپ سیٹ ہیں۔"

بانیا نے پرخیال انداز سے اسے دیکھا، پھر دھیمے سے بولی۔ "یہ صرف مسز افضل کا حسن ظن ہے مجھ پر، ورنہ میں جو ابھی اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کر پائی تھی، مجھے لیکچرر شپ کی آفر کرنا ان کے ہی دل

گزرنے کا کام ہے۔ میں نے کتنا کیا۔ ایم اے کے بعد پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ان کی آفر ایکسپٹ کروں گی مگر وہ بھی منصب کے پکے تھے فوراً پرنسپل کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا، پھر اعتماد سے بولے اس لڑکی کا آپ جس طرح چاہیں امتحان لے سکتے ہیں۔ یہ لڑکی کم عمری کے باوجود ہم سب سے زیادہ وسیع نظری رکھتی ہے۔ اس کے ذوق، اس کی لگن ایسی ہے کہ سراہی جائے۔ سو یونیورسٹی میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ یہ نئی ذمے داری میرے سر آ گری۔ اب یہ ان کی محبت ہی ہے کہ میں ان کے کالج کے ساتھ ہی ساتھ ان کی یونیورسٹی میں آنرز کی آر کلاس بھی لے پا رہی ہوں۔ مگر یہ تو طے ہے، میں کچھ بھی کر رہی ہوں، وہ اتنا اہم نہیں، جتنا میرے لیے میرے شہریار بھائی اہم ہیں۔"

"شہری بھائی...... ہونہہ! آپ کو تو دیوانگی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ وگرنہ کیا رکھا ہے ان کی شخصیت میں؟ انسان کی پوری سانگی میں کردار اہم ہوتا ہے۔ ان کے پاس کردار کی دولت مفقود ہے، پھر بھی آپ کہتی ہیں، آپ کو شہری جیسا سے زیادہ اہم کچھ نہیں لگتا۔"

"ہاں، مجھے ایسا لگتا ہے۔ کیونکہ میں تمہاری طرح لمحوں میں اپنی رائے نہیں بدلتی، نہ ہی میری محبت سطحی ہوتی ہے کہ خامیاں اور برائی دیکھ کر راستہ بدل لوں۔ جازی! اچھی محبت ہمیشہ محبت رہتی ہے، کبھی نفرت نہیں بنتی۔ صرف سطحی محبت کا چلن ہے یہ کہ رخ و گم دیکھ کر راہ بدلے۔"

جازی استہزائیہ سے ہنسا، پھر کڑواہٹ سے بولا۔ "مجھے تو تعین کر رہی ہیں۔ حالانکہ آپ خود بھی اس کیٹگری سے کیا دور تو نہیں۔ ماموں عبدالکریم کا ایشو ابھی اتنا پرانا تو نہیں ہے۔"

بابا عبدالرحمٰن نے تیزی سے پلٹ کر جازی عبدالرحمٰن کو دیکھا، پھر آہستگی سے بولی۔ "ماموں کا موضوع پاپا، میں بھائی اور شہریار بھائی کی مرضی کا تھا ہے۔ میں صرف اس کے ساتھ دو تین بار سے زیادہ کہیں نہیں گئی اور اس سے ملتے ہوئے بھی میں نے ہمیشہ یہ جتایا ہے اسے کہ میں محبت صرف حمزہ سے کرتی ہوں، اس کی اور حمزہ کی پسند و ناپسند میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہ کہ میں اسے حمزہ کا مقام کبھی نہیں دے سکتی۔"

جازی عبدالرحمٰن صوفے سے اٹھ کر یکدم اس کے قریب آ گیا۔ پھر دونوں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر لجاجت سے بولا۔ "آپ حمزہ بھائی کا نا پسند کرتی ہو تو اپنی مرضی سے جینے کا ایک مارجن کیوں نہیں دیتیں؟ چھوڑیے، شہری بھائی کی ناپسندیدگی کا ڈر۔ وہ تو ایسے ہی ہیں۔ اپنی زندگی اپنی مرضی سے جیتے آ رہے ہیں۔ قدغن لگاتے ہیں تو صرف آپ پر۔ آپ ان کی بے حسی سے کم واقف تو نہیں۔"

"جازی! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم شہری بھائی کے لیے اتنی نفرت سے کیوں سوچنے لگے ہو؟...... کس کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگے ہو؟ نویا سالار بھائی یا ماما؟"

جازی عبدالرحمٰن نے کندھے اچکائے پھر بے پروائی سے بولا۔ "اگر میں آپ کے گنوائے گئے ناموں کے ساتھ اپنا زیادہ وقت گزارتا بھی ہوں تو یہ فطری عمل ہے۔ ہاں، آپ کو اعتراض ہے تو صرف یوں کہ یہ لوگ آپ کے بارے ثروت بھائی کے خلاف سچ بولتے ہیں اور سچ کبھی کسی کو پسند نہیں آتا۔ پھر آپ کو کیسے پسند آسکتا ہے؟"

"سچ...... کیا ہے سچ؟ میں بھی تو سنوں۔" وہ بالوں میں برش کرتے کرتے بیڈ پر بیٹھ کر اسے محویت سے تکنے لگی۔

"سوری! آپ کو سچ پسند نہیں آئے گا۔" اس نے کنی کترائی اور دیبا عبدالرحمٰن نے رعب دکھایا۔

"بتاؤ جازی! تم کس سچ کو سچ سمجھ رہے ہو؟...... میں بھی تو جانوں تمہاری سوچ کہاں تک ہے؟"

"میں اور میری سوچ کی حیثیت ہی کیا۔ لیکن اتنا عقل ہے کہ میں آنکھوں پر خواہ مخواہ پردے نہیں ڈال کر رکھتا۔ میں اپنی آنکھ سے دیکھ سکتا ہوں، اپنے دماغ سے سوچ سکتا ہوں۔ میرے دماغ کو کسی نے زنگ نہیں لگایا۔"

"اوکے، میں نے مان لی تمہاری یہ بات۔ اب بتاؤ تمہارا سچ کیا ہے؟"

"یہی کہ ماہ نور کوئی شریف لڑکی نہیں، سوسائٹی گرل ہے۔ اسے محبت بدلتے رہنے کا شوق ہے۔ کل تک میں سمجھتا تھا شیری بھائی نے کسی بہت اچھی لڑکی کا دل دکھایا ہے مگر اب میں جان چکا ہوں، شیری بھیا جس قسم کی محبت ڈیزرو کرتے تھے، وہی ان کا نصیب بنی ہے۔ جتنی بڑی ماں، اس ماں سے ان کے حصے میں آئی۔ مجھے اس کا افسوس نہیں لیکن اس کی وجہ سے جو ہماری فیملی نے تکلیف دہ دور کاٹا وہ مجھے بھولنے کی چیز نہیں۔ میں ان سے دور تھا تو کسی حد تک ان باتوں کے کیچڑ میں گرا ہوا تھا۔ مجھے ان کی باتیں سب سے زیادہ اپنی طرف کھینچتی تھیں، ان کی محبت خوش نصیبی لگتی تھی۔ وہ جب میری تعطیلات ختم ہونے پر مجھے ہاسٹل ہر سال چھوڑنے پہنچتے تو مجھے ان پر ڈھیروں پیار آجاتا۔ مجھے لگتا دنیا میں شیری بھائی سے زیادہ کوئی اچھا پیار کرنے اور پرواہ کرنے والا ہو ہی نہیں سکتا۔ کبھی کبھی وہ مجھے پاپا سے بھی بڑھ کر لگتے۔ جب میرے دوست مجھے کہتے تمہارے بھیا بہت ڈیشنگ، بہت لونگ ہیں تو میں ایسے اتراتا پھرتا جیسے یہ سب میری تعریف ہو۔ مجھے ان کے محبت کے چھوٹے چھوٹے انداز اور ڈھیر ساری خاموشی اٹریکٹ کرتی۔ مجھے لگتا ماما نہیں آج تک کسی نے ٹھیک سے سمجھا ہی نہیں ہے...... میں جب گھر چھٹیاں گزارنے آتا اور ان کی گھر سے غیر موجودگی کا نوٹس لیتا، بھائی معنی پہنانے کی کوشش کرتے تو میرا دل کرتا میں ان سب سے لڑ جاؤں۔ میرے شیری بھائی ڈرنک کے عادی نہیں ہو سکتے۔ سوسائٹی گرل ان کا ٹیسٹ نہیں ہو سکتی، فلرٹ ان کی شخصیت کا خاصہ نہیں ہو سکتا۔ میرا دل چاہتا میں چیخ چیخ کر ان کی وائٹ کالر پرسنالٹی کے

لئے ہر ایک سے بڑھ جاتی، مگر میں کسی کے سامنے اپنی رائے ظاہر کرنے کے قابل عمر نہیں رکھتا تھا، اس لئے ساری تنہائیاں میں اُن کو سمایہ بنا رہتا تا کہ اُن کے پاس میرے حوالے سے بہت اچھی یادیں ہوں۔ وہ تنہائی پسند دکھائی دیتے تھے، مجھ اور میرا دل کرتا تھا، میں اُن کی اس تنہائی کو باتوں سے بھر دوں، اُن کا اتنا خیال رکھوں کہ اُن کے دل میں کبھی مایوسی کا شائبہ تک نہ پیدا ہو۔ بچپن میں غلط تھا، اپنی توجہ وہ ایک غلط انسان پر لٹا رہا تھا۔ پھر میں اب جان گیا ہوں کہ وہ جو مایوسی تنہائی کا شکار رہتے تھے تو اس میں اُن کی ہمدردی سمیٹنے کی خواہش کے سوا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔ وہ جذبات سے کھیلنے کے ساتھ عادی تھے کہ پھر وہ کسی پر بھی اپنی یہ مہارت آزما سکتے تھے چاہے وہ میں ہی کیوں نہ ہوں۔ میں، جو اُن کو اپنا خاص سمجھتا تھا اور خود کو اُن کا خاص مانتا تھا۔" وہ چپ ہو کر ایک دکھ میں ڈوب گیا۔

دانیہ نے اُس کے کاندھے پر ہولے سے ہاتھ رکھا تو جیسے رکی ہوئی بات پھر سے اس کی زبان میں بجنے لگی۔

"پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ شیری بھائی زندگی کو کس حد تک مذاق کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔ ڈیڈ کے بعد ایک بڑی کی وام اور محبت بدل جاتی ہے، بس رہ جاتے تو وہی تنہائی اور خود ساختہ بے چارگی کا ڈھنڈورا پیٹنے کے لئے شہریار عبدالرحمٰن...... مجھ سا جیسی بھائی سے کل ہی میں نے دل کا غبار نکالنے کے لئے اپنے دل کو کتھارسس کیا تو انہوں نے میرے دل کے بوجھ کو کئی گنا بڑھا دیا۔ آپ کے سامنے بھائی اور جانان کی جس قسم کی دوستی کی تقریب کا حال بھی بھلانے کے لائق تو نہیں۔"

دانیہ نے اس خیال سے مرجھائی ہوئی آنکھوں میں نمی سی محسوس کی مگر کمال مہارت سے اپنے چہرے کے تاثرات بدلنے نہیں دیے۔

جازی اس بات کو کہہ کر شاید اسی لئے رکا تھا کہ اس کے دل کی بھڑاس سے اپنے دل کی بھڑاس کو جھنجھوڑ کرے گا۔ مگر دانیہ کی یہ خاموشی تھی۔ بس اسی بات نے اُس کا پارہ چڑھا دیا، سو اس بار اُس کا لہجہ پہلے سے زیادہ بگڑا ہوا تھا۔

"بھیجو اللہ مجات یقیناً کسی عقل مندوں کی مدد کے لئے اپنی سمت درست کرنے کا بہترین موقع تھے۔ مگر آپ اتنی بڑی حقیقت بھول گئیں۔ آپ کیا نہیں جانتیں آئیں، جو جانان کے قریب کا شکار ہو کر آج تک لاپتہ ہیں؟ آپ کو اور بھیجو کا فوٹو گھر بھی یاد نہیں رہا؟ آپ کو ہمارے صوائع بھی بھول گئے، جو جانان نے خود ساختہ عشق کی سزا کے طور پر ہماری فیملی پر آزمائے۔ شہروں میں نکلنے والی وہ ساری چھوٹی بڑی دیدہ یاں، جو آپ نے بلکہ ہمارے گھر والوں نے مجھ سے چھپائیں، وہ سب آپ کیسے بھول جاتی ہیں؟ پہلے مجھے سب کا رشتہ شیری بھائی کی ذات کے لئے بڑا اُلجھا تھا، مگر اب میں جان گیا ہوں کہ سب انہیں میری طرح بہت اچھے سے جان گئے تھے، اس لئے اُن کی کارکردگی کے مطابق انہیں رد کر رہے تھے۔"

"جازی! اسٹاپ اِٹ۔ تم چھوٹے بڑے کی تمیز بالکل ہی بھول گئے ہو کیا؟"

"مجھے اپنی حدود کا اندازہ ہے بھابھی!...... بس آپ پتہ نہیں کب اپنی آنکھوں کی پٹی اتاریں گی؟"

دانیا کچھ نہیں بولی۔ اس نے کندھے پر دوپٹہ پھیلا کر کچن کا رخ کر لیا تھا۔ جہاں تینوں ملک ہیڈ کک کی نگرانی میں جلدی جلدی اس کی مرضی کے مطابق کھانا تیار کرنے میں مصروف تھے۔

"کتنی دیر لگے گی رحیمہ؟"

"بس دس منٹ اور لگیں گے چھوٹی بی بی جی۔"

دانیا رحیمہ کے جواب پر سر ہلا کر کچن سے باہر آ گئی۔ جازی کوریڈور میں کھڑا اس کا منتظر تھا۔ بظاہر اس کی بہت سی باتوں نے اس کے دل کو چھو لیا تھا، وہ اسے حق بجانب بھی سمجھتی تھی مگر شہریار سے انسیت اور محبت ان باتوں کے باوجود اپنا راستہ بدلنے پر دل کو آمادہ نہیں کر سکی تھی۔

وہ جازی عبدالرحمٰن کو نظر انداز کرتی اپنے کمرے کی طرف بڑھی جا رہی تھی کہ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر وہی کچھ ذہن میں بولا۔ "آپ نے کل کہا تھا جانا نے شیری بھائی کی طرف سے ہم سب کے دل بدگمان کرنے کے لئے کچھ ڈرامے کئے تھے، کیا میں ان کی تفصیل جان سکتا ہوں؟ اور مزید یہ کہ انہوں نے پانچ سال پہلے کس طرح شیری بھائی جیسے بندے کو برباد بھی کیا تھا۔ کیا آپ کے پاس اس سلسلے میں بھی کوئی ٹھوس گواہی موجود ہے؟ کیا واقعی آپ کو لگتا ہے، بھائی کو کوئی برباد کر سکتا ہے؟ بھائی جیسے انسان کو، جنہوں نے کتنی ہی زندگیاں برباد کر دی ہیں۔"

دانیا بات جھٹلا کر تفصیل سے جان بچانا چاہتی تھی کیونکہ اس کے پاس واقعی کوئی قابلِ ذکر واقعہ موجود نہیں تھا۔ مگر جازی عبدالرحمٰن ٹلنے والا نہیں تھا، اسی طرح تاکہ اس سے پہلے ہی سوال پر اصرار کر رہا تھا۔

دانیا نے پہلے تو کچھ سوچا، پھر آہستگی سے بولی۔ "جانا نے بھی بھائی کی منگنی کا غلط فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ پبلک فگر ہیں، اہم تقریبات میں ان کو جوائن کرنے لگی تھی۔ اعلیٰ سطحی پارٹیز میں، جہاں پاپا بھی بھائی اور ماما کا جانا بھی ہوتا تھا، وہ جان جان کر وہاں خود کو شیری بھائی کی منگیتر کی طرح شو کرتی تھی۔ پھر جب اسی طرح کی کسی تقریب میں وہ کسی نازیبا حالت میں پائی گئی تو اخبار پاپا کے نام پر کیچڑ اچھالنے لگے کہ عبدالرحمٰن کی ہونے والی بہو میڈیا کی خبروں میں اِن رہنا چاہتی ہے۔ رہی بھائی کو پانچ سال پہلے برباد کرنے کی بات تو یہ میں نے بزنس پوائنٹ آف ویو کے حوالے سے کہا تھا۔ دراصل وہ بھائی کے کریڈٹ کارڈز کے ذریعے کی جانے والی شاپنگ کے ذریعے بھی ان کے لئے مسائل پیدا کرتی رہی تھی۔ یہی وجہ تھی بھائی کو جانا سے علیحدگی کا فیصلہ کرنا پڑا۔ مگر جانا عادت سے مجبور ہے۔ اب بھی بھائی

کے لئے مشکلات کھڑی کرتی رہتی ہے۔ کہیں نہ کہیں اُنہیں لیٹ ڈاؤن کرنے کی خواہش اُسے چین سے بیٹھنے بھی نہیں دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ مسز کاظم منیجر خود ساختہ ملاقاتیں یہ سب آج تک جاری ہے۔ ایلیا رحیم کا معاملہ بھی اسی تکلیف دہ صورت حال کا شاخسانہ ہے۔"

وہ کہہ کر چپ ہوئی نظر اُٹھا کر جازی عبدالرحمٰن کا چہرہ دیکھا، وہاں اُسے صرف طنز کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیا۔ وہ پوچھنا نہیں چاہتی تھی کہ یہ طنز کیوں ہے، کیونکہ جانتی تھی، وہ پھر سے شہریار کے بخیے ادھیڑنے میں منٹ نہیں لگائے گا۔ وہ چپ تھی مگر وہ بولے بنا کیسے رُکتا؟ اُس نے ہنکارا بھرا تھا پھر زہریلے لہجے میں بولا۔

"آپ کی کہی ہوئی کسی بھی بات سے شیری بھائی کے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں اُبھرا۔ جو کچھ آپ نے کہا اُسے سن کر کوئی بھی ذی ہوش جان سکتا ہے کہ بھیا کا چلن کتنا خراب تھا۔ جو کچھ جانا نے اُن کے ساتھ کیا وہ اسے ویڈیو کرتے تھے اور خود انہوں نے ہی ایسے مواقع دیئے کہ ایک پرائی عورت نے ہمارے گھر کے سکون کو سبوتاژ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں بھائی کو پہلے ایک اچھا انسان سمجھتا تھا لیکن شہریار بھائی تو اچھے انسان نہیں ہیں، اچھے ہر شخص میں کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہمیشہ احسان کا سودا کرنے پہ یقین رکھتے ہیں۔ جو کچھ انہوں نے کمایا، پاپا اور ہماری فیملی کو اس کے لئے بہت زیادہ سروائیو کرنا پڑا ہوگا۔ رہا ایلیا رحیم کا تعلق تو یہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ایلیا رحیم بھی ان بہت سی لڑکیوں میں سے ایک ہے جو شیری بھائی کی میٹھی میٹھی باتوں میں آ جانا اپنے ایمان کا حصہ سمجھتی ہیں۔ آپ کو پتہ ہے ایلیا رحیم نے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا؟"

وہ مزے لے لے کر یوں تفصیل بتانے لگا جیسے یہ کوئی نیا واقعہ تھا جس سے دانیا واقف نہیں تھی۔ مگر دانیا جانتی تھی کہ وہ کس طرح مزے لیتے میں صرف اپنی انرٹ بڑھانا چاہتا ہے کہ وہ کتنے بڑے تھے بے وقوف بنا رہا تھا۔ یہ حالت اچھی نہیں تھی۔ تبھی دانیا نے اُس کا شانہ ہلا کر یہ تکلیف دہ کر کے پوچھا۔

"جب شیری بھائی پہ حملہ ہوا، سالار بھائی دفتر میں تھے۔ پھر اچانک وہ موقع واردات پہ کیسے پہنچ گئے؟"

جازی عبدالرحمٰن اُسے تولنے والی نظروں سے دیکھنے لگا کہ وہ واقعی جاننا چاہتی ہے یا صرف اُسے موضوع سے بھٹکانا مقصود ہے؟ اس کی آنکھیں بالکل صاف تھیں، سو آہستگی سے بولا۔

"بڑے بھیا اس وقت دفتر ہی میں تھے، لیکن کسی نے انہیں فون کر کے کہا تھا، وہ پھر سے جانا جیسا ایک نیا راستہ استوار کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو اس معاملے کو یہیں رفع دفع کر سکتے ہیں۔ سنی بھائی آندھی طوفان کی طرح اس معاملے کو بگڑنے سے پہلے سنبھالنے کی نیت سے شارٹ کٹ روٹ ڈرائیونگ کرتے ان کے فلیٹ میں پہنچے مگر وہاں جا کر شیری بھائی کا دوسرا روپ سامنے آیا۔ اس روپ میں

AANCHAL.COM.PK

شہری بھائی پہلے سے زیادہ ناقابل برداشت تھے۔ وہ ہٹ دھرمی جولین سے بھی آگے کا راستہ طے کر چکے تھے۔ پہلے اپنی پسند سے لڑکیاں بور کرتے تھے مگر اب ان میں یہ بات آ گئی تھی کہ اگر انہیں کسی اور کی پسند پہ پیار آ جائے تو وہ اسے کسی بھی قیمت پہ حاصل کرنے کے لئے حد سے گزر جانے کو بھی معیوب نہیں سمجھتے تھے۔ بھائی نے معاملہ کیسے سنبھالا کیا یہ آپ جانتی ہیں...... اور کوئی سوال یا سوال نما الجھاوا کہ سامنے والا اس الجھن میں پڑ کر آپ کے ان اینڈ اولڈ گریٹ بھائی کے متعلق رائے کا اظہار نہ کر سکے؟"

دانیا نے گہرا سانس لیا۔ اس کا خیال تھا وہ اس کی باتوں میں آ گیا تھا مگر اس کی غلطی سے وہ اسی بات میں جا کر اٹک گیا تھا جس سے نکلنے کے لئے یا تجھ پر اپنا چاہتا تھا۔ شہریار کی شخصیت پر اس کی اب تک ایک مضبوط رائے بن گئی تھی جس سے اسے دانیا نہیں جا سکتا تھا۔ اس لئے اندازہ لگا دوا ب کچھ بھی کہہ کر جازی کو شہریار کی طرف واپس نہیں لوٹا سکتی۔ سو منت سے نظریں جھکا کر اس نے کمرے کا رخ کیا۔ پھر آرام سے بیٹھ کر اب تک کی باتوں سے ہونے والے اثر کا اندازہ لگا ہی رہی تھی کہ عدیل بھائی کا فون چلا آیا۔

اس نے فوراً نکلنے کا ارادہ کیا اور کار کی چابیاں لے کر کچن کا رخ کیا۔ ملازمین نے سوپ فریج باکس میں پیک کر دیا تھا۔ اس نے ایک ملازم کو ساتھ لیا تھا اور جازی ابا اتو سے ساتھ چلنے کا کہے بغیر سیڑھیاں اترنے لگی تھی۔ پھر کار کا لاک ابھی کھولا تھا کہ عائشہ بھابی کی آواز سنائی دی۔

"دانیا! میں تمہارے ساتھ چلوں کیا؟"

دانیا نے مڑ کر دیکھا اور مدھم لہجے میں بولی۔ "آپ کو ساتھ لے کر چلنے پہ مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن حنین بھائی سے پوچھا آپ نے؟ کل شام کی ہی بات پہ ہنگامہ نہ کھڑا کر دیں۔"

عائشہ بھابی کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ "کچھ بھی ہو میں اس معاملے میں ان کی ڈکٹیٹر شپ نہیں مان سکتی۔ شہریار مجھے اپنے بھائیوں کی طرح عزیز ہے۔"

"ان کی تمام تر بدکرداری کے باوجود؟" پتہ نہیں اس کے لہجے میں کڑواہٹ کیوں آ گئی تھی۔

عائشہ بھابی کی آنکھوں میں حیرت تھی اور وہ خود بھی حیرت سے گم ہو گئی تھی۔ تو کیا وہ دل ہی دل میں جازی عبدالرحمٰن سے متفق ہو کر جا رہی تھی؟ اسے بھی شہریار سے اس قسم کے شکوے تھے جیسے گھر میں باقی ان افراد کو جو اسے اپنی لسٹ میں سب سے ناپسندیدہ انسان لگتے تھے۔

"مجھے آپ سے ایسی توقع نہیں تھی دانیا!" عائشہ بھابی نے فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھتے ہوئے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور وہ کان دبائے اپنی اس نئی کیفیت کو جھٹلاتی ان کے برابر آن بیٹھی۔

"آئی ایم سوری۔ وہ...... میں نروس ہو رہی تھی، مضطرب تھی اس لئے غیر متوقع بات کہہ گئی۔"

عائشہ بھابی نے نرمی سے اسے دیکھا۔ "بچہ! پریشان مت ہو، کوئی بات نہیں۔ میں جب آپ کو شہری بھائی کے لئے منتخب کر رہی تھی تو مجھے خوشی ہوئی ہے کہ اس گھر میں کوئی ان کا خیال رکھنے والا آ رہا ہے۔ آپ ان کی بیوی بھی، ان کے لئے مناسب ہیں۔ سب مجھے اچھی لگتی ہیں، اس لئے آپ کی طرف سے شہریار کے لئے کوئی چھوٹا سا جملہ بھی ان کا دل دکھا نہیں سکتا ہے۔"

"جی بھابی، سوری بھابی! آئندہ احتیاط کروں گی۔"

اس نے اگنیشن میں چابی گھما کر کار اسٹارٹ کی۔ روح من نے گیٹ کھول دیا تھا، وہ گاڑی کو ہلکی رفتار سے ڈرائیو کرتی گاڑیوں کے قافلے میں شامل ہو گئی۔ عائشہ شہریار کی طرف سے پریشان تھیں اور وہ جازی عبدالرحمن کے بدل جانے والے رویے سے پریشان تھی کہ کل کیا ہوگا، اس وقت شہریار تو جازی عبدالرحمن کے ساتھ نہیں ہوں گے، وہ اس سے کیا بہانہ بنائے گی۔

❀❀❀

وہ بہت تھکے ہوئے قدموں سے گئی۔ ہاسٹل کے احاطے میں داخل ہوتی تھی اور یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ شاید اب وہ واپس گئی تو ہاسٹل میں نہیں رہ پائے گی۔ دوسرے شہر سے آنے والی ورکنگ لیڈیز کے لئے بنایا جانے والا یہ ہاسٹل کچھ دن پہلے تک اس کے لئے ایک سائبان کی طرح تھا، مگر آج اسے لگنے لگا تھا کہ وہ بہت تیزی سے چپ میں لڑکی کی روشنی ہے۔ اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ ہاسٹل کی وارڈن اس کے لئے آج کل کسی عفریت سے کم نہیں ہو رہی تھی۔ گھربار سے بے دخل عورت یوں بھی بے یار و مددگار ہو جاتی ہے، یہی حال اس ہاسٹل کی وارڈن کا تھا۔ جسے بچوں نے گھر سے نکال دیا تھا اور وہ یہاں ایک چھت کی تلاش میں زندگی گزار رہی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا وہ بے گھری کا دکھ محسوس کر کے یہاں سب کے دکھوں کا خیال رکھتی مگر ہوا اس کے برعکس...... دکھ یا تو انسان کو نرم کر دیتا ہے یا سخت۔ اور یہی اس کے کیس میں ہوا تھا۔ وہ زندگی کی ٹھوکر کھانے کے بجائے سختی کی حد تک مجبور ہو گئی تھی۔ وہ صدر رفیق کی آواز سے خوف آرہا تھا کہ آج کا رویہ دیکھے جب پائے گی۔

وہ پہلے طنز کر چکی تھی۔ پرچیاں چپ تھی تا کہ اب بدلنے ہاں۔ غیر متوقع استقبالی طریقہ دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا تھا۔ اس کا سارا سامان اس کے کمرے کے باہر رکھ دیا گیا تھا۔ وارڈن نخوت سے اسے گھور رہی تھی۔

"یہ کیا ہے میڈم؟"

وہ کانپنے لگی تھی۔ ماں کے لہجے پر ہمیشہ سے اُس کا یہی حال ہوتا تھا۔ یہ لہجہ بہت مدتوں تک اُس پر حکمرانی کرتا رہا تھا اور آج بھی اس لہجے کی زد میں آ کر اس کی آواز اور وجود اسی طرح ری ایکٹ کرتے تھے۔

اُس نے بہ مشکل تھوک نگلا اور مرے مرے لہجے میں بولی۔ "پلیز میم! تین چار دن کا وقت دے دیجیے...... میری ڈگری جیسے ہی ملی میں آپ کے سارے واجبات کلیئر کر دوں گی۔"

"ہونہہ، واجبات دینے والے چہرے تم جیسے نہیں ہوتے۔ سنو لڑکی! اگر تمہاری ضمانت شائقہ کمال نے نہ دی ہوتی تو میں تمہیں ہرگز ہرگز کمرہ الاٹ نہیں کرتی۔ تم تو مجھے شکل سے ہی ایسی ویسی لگتی ہو۔"

"پلیز آنٹی! آپ میری مجبوری سمجھیے ناں۔ دیکھیے، میں ایک مہینے سے بے روزگار ہوں تو یہ میری مجبوری ہے، میری کوتاہی نہیں۔ پلیز آپ مجھے ایک چانس تو دیجیے ناں۔"

"چانس اور تمہیں دوں...... آخر تمہیں پہلی لگی لگائی نوکری چھوڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

مومنہ رفیق نے تھوک نگل کر شرمندگی سے کہا۔ "آنٹی میرے دفتر کا باس مجھ سے چیپ ایڈوانسز کرنے لگا تھا۔ میں نے اس کی یہ حرکت کئی بار تو اگنور کی۔ لیکن اس دن اس نے زبردستی میرا نقاب اُتار دیا، پھر اس کے ریمارکس...... میں ایسی لڑکی نہیں ہوں آنٹی! کہ اس کے خیالات پر اپنی زندگی کا چلن ہی بدل دوں۔"

"ہاں...... زندگی کا چلن۔ بس یہ سب پارسائی کے قصے کہیں اور جا کر سنانا۔ میں تمہیں اچھی طرح نہ جان گئی ہوتی تو شاید تمہاری اس بات پر تمہیں ریکارڈ ضرور دیتی۔ ویسے ایک بات ہے، اس میں برائی کیا تھی، اگر وہ تمہارا چہرہ دیکھ کر دل بہلانا چاہتا تھا؟"

"آنٹی! میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔" اس نے کمزور سا احتجاج کیا اور وارڈن ہنسنے لگی۔ تنفر اور حقارت بھری ہنسی۔ پھر اس کی شکل دیکھ کر بولی۔

"میں اچھی طرح جانتی ہوں، اس ہاسٹل میں آنے والی ننانوے فیصد لڑکیاں کیا نوکریاں کرتی پھرتی ہیں، تم بھی ان میں سے ایک ہی ہو۔ تمہارا گھر اسی شہر میں ہے، لیکن پھر بھی تم اپنے گھر کی جگہ گرلز ہاسٹل میں رہنا چاہتی ہو۔ کیا میں نہیں جانتی، تمہیں تمہارے گھر والوں نے کیوں دھکے مار کر گھر سے نکالا؟ تم نے پسند سے شادی کی تھی ناں گھر سے بھاگ کر۔ پھر کہاں گیا تمہارا ساتھی؟ بھاگ گیا ناں، چند روز عیش کر کے...... پھر کیا ملا ہے، اگر دوسرے لوگ بھی تم سے تمہارے سابقہ شوہر کی طرح میل ملاپ رکھنا چاہتے ہیں؟"

"آنٹی!...... وہ اب بھی میرا شوہر ہے۔" اس نے بھرے گلے سے احتجاج کیا اور وارڈن کا قہقہہ زہر بن کر اس کے اندر اترتا گیا اور زہریلا لہجہ پھر گونجا۔

"تمہارا یہ یقین بھی ایسا ہی ہے، جیسی تمہاری نام نہاد شادی...... کیوں پاگل بن کر اپنی زندگی کو خوار کر رہی ہو؟ بہت زیادہ دو سال نہیں رہ گئے تمہارے پاس، جو کمانا ہے کما لو۔ عیش، دنیا، روپیہ سب کچھ

تمہارے جذبوں میں کیا ہے؟ ہو سکتا ہے کچھ باری کا ... وہ ... ایک بار ... زندگی مت ضائع کرو۔"

وہ دن جا چکی تھی اور وہ کار ... میں ... رہ گئی تھی۔ اسے شدید بھوک لگ رہی تھی لیکن اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ رشا فعد ... ایک ہفتہ پہلے جو پیسے اس کی اچھی نوکری مل جانے کے یقین کے ساتھ ... گئی تھی وہ سب روپے ختم ہو گئے تھے۔ اس کی نوکری کا چانس بھی ضائع کر دیا تھا۔ کبھی کا ... سے ... لینے تک کی فرصت نہیں تھی۔ اسے کیا معلوم کہ نوکری کے لئے آنے والی دھکے کھا کر نشستیں جگہ بنانے والی ... بھی کہیں ... ہے کیونکہ ... بھوک لگتی ہے اور جسے زندہ رہنے کے لئے ایک چھت کی بھی حاجت ہو سکتی ہے۔

"پیسہ کتنا امیر لوگ......" اس نے نفرت سے کار ... کو ... اس کی نفرت کے کمال سے بھوک کی ... میں پہلے سے زیادہ ... گئی۔

"میں نے کمانے کے لئے ان ... کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔" اس نے ... سے تحقیق کیا ... کی کوشش ... سے مضبوط کرنے کی کوشش کی مگر بھوک......

"تم نہیں جانتی زمیر ... کیا ہو ... ایک بار ... میں تمہارے لئے اپنی بیوی کو چھوڑ سکتا ہوں......"

"چھوڑو یہ فضول سی باتیں۔ یہ دو جواب ... سب محبت کرنے والوں کے لئے انکار کے سوا کچھ نہیں۔"

"صورت! ایک بار آجاؤ۔ بس چند شامیں گزار لو تمہارے سنگ تو مجھے لگے گا میرا جیون رائیگاں نہیں گیا۔"

اس نے اندر ... ہی ... باتوں سے ... ابھری ... ہوئی ... کو ... بہلا دیا۔ معلوم نہیں یہ باتیں اس کے اندر کیوں ... جلا رہی تھیں۔

"کیا عزت کی قیمت ایک وقت کی بھوک کے سوا کچھ اور ہے؟" اپنے اندر ... خیالات سے وہ ... سے ... لگی ... بڑے ... فرش پر گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر جیسے اس نے اپنی بھوک سے آخری جنگ کرلی تھی۔

"ابھی تمہارے پاس وقت ہے۔ جو ... سکتی ہو اپنے چہرے کے ... پر حاصل کر لو۔ پھر تم میں کیا رہ جائے گا ... پر کوئی ... بھی نگاہ نہیں لگانا چاہے گا، چہ جائیکہ کوئی زندگی گزارنے کا خواب دیکھے......"

اس نے سر دائیں سے بائیں مارا۔ مگر پیٹ کی بھوک...... اس نے آنکھیں بند کرلیں اور اچانک اسے لگا اس بھوک سے بڑا کوئی عذاب ہے......

کوئی پیاری سزا کا ذائقہ......

اس کی سماعت میں اچانک نومولود بچے کے رونے کی آوازیں آنے لگی تھیں...... اس نے تو یہ تک نہیں دیکھا تھا کہ وہ بچہ لڑکی ہے یا لڑکا۔ بس کپڑے میں لپیٹ کر "چلڈرن ہوم" کے پالنے میں ڈال آئی تھی۔ آواز نے بہت دیر تک اس کے کلیجے کا دامن پکڑا تھا۔ مگر مجسم خواہشوں میں خطا۔ شاید اس کا تعلق مضبوط نہیں تھا کہ وہ اس کے پیچھے قدموں میں زنجیر ہو جاتے۔ وہ پلٹ آئی تھی اور آج آٹھ سال بعد اسے اس بھوک میں وہ رونے کی آواز کسی سزا کی طرح سنائی دینے لگی تھی۔

"میں نے اسے جس حالت میں چھوڑا، کیا وہ زندہ ہوگا...... یا ہوگی؟ بھوک تو اسے بھی لگی تھی۔ شاید نہیں۔ اس کے پیٹ میں کچھ گیا بھی ہوگا یا نہیں؟...... ان آٹھ سالوں میں ایک دفعہ بھی تو اس طرح نہیں سوچا تھی کہ کسی کی بھوک آج بھی مجھ سے شکوہ کرتی ہوگی۔ میرے خدا مجھے معاف کر...... میں خطا کار ہوں، مگر مجبور...... تو نے جس طرح راستے بچھائے، میں نے ویسا ہی سفر کیا۔ کس کس منزل پر میں لڑکھڑائی، یہ مجھ سے زیادہ تو جانتا ہے۔ مجھے معاف کر میرے رب!"

اس نے آسمان کی طرف ہاتھ جوڑ کر زار و قطار روتے ہوئے التجا کی اور بھول گئی کہ زندگی میں بہت کچھ اس نے خود اپنی مرضی سے کیا تھا۔ اس رب نے اسے جگہ جگہ تھام کر روکنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اپنے گھر کے جہنم سے نکل جانے میں اتنی اتاؤلی ہو رہی تھی کہ پھر کچھ اور نہ کوئی امتیاز مت کیا تھا۔ وہ عافیت گھر سے نکلنے ہی میں بھٹکنے لگی تھی۔ مگر گھر سے نکل کر بھی عافیت تو کہیں گھر کے اندر ہی رہ گئی تھی۔ ساتھ کچھ یاد آیا تھا تو دنیا کا ڈر، عزت کا خوف۔ اس نے اپنے ہاتھ سے جھوٹی موٹی نیکیوں کا پہاڑ بنا لیا تھا اور یہ پہاڑ اسے روز ڈراتے تھے...... کسی زمانے کی کسی نسل کی طرح اسے وقت اور اپنی کی گئی غلطی نے اس پہاڑ کے پیچھے دھکیل دیا تھا اور وہ بھی کہ وہ اس پہاڑ کو دیکھتی تھی مگر جب ڈر ہاتھ میں کچھ کر سانس لینے لگی تو کہیں سے بھولی بسری نیند اس کی آنکھوں میں چلی آئی۔ صبح کی کرن سے آنکھ روشن ہوئی تو لگا پہاڑ تو ابھی تک پہلے جتنا ہی اور کھردرا پن لئے اس کے اور زندگی کے بیچ کھڑا ہے......

"میرے اللہ!"

اس نے پھر سے سر جھکا لیا تھا۔ کاریڈور کے سارے کمرے بند تھے۔ اشتہا آمیز خوشبوئیں اس کی بھوک میں اضافہ کر رہی تھیں مگر وہ بھیک کے لئے بار بار پھیلنے والے ہاتھ کو موڑ کر گود میں رکھے بے بسی

کے ساتھ مل کر اپنی بھوک کا تماشا دیکھ رہی تھی۔

"مجھ سے نہیں برداشت ہوتی اب بھوک۔" یکدم اس نے اپنا جیولری بیگ نکالا۔ اس میں ایک وزیٹنگ کارڈ پڑا تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھ سے وزیٹنگ کارڈ نکالا۔ اس کے کسی یار کا کارڈ تھا جس نے اسے پڑھنے اور برے وقت میں اپنے گھر کا دروازہ کھلا رکھنے کا اشارہ دیا تھا۔

"بس ایک وقت کی بھوک نے تمہیں توڑ دیا......" اس کے اندر اس کے ضمیر کی آواز نے یکایک انگڑائی لی۔ اس نے کان نہیں دھرے۔ اسے اچانک احساس ہونے لگا تھا۔ 38 گھنٹے سے بھوکی ہے۔ اس نے بکھرا بکھرا گیٹ سے باہر نکلی تو اسے احساس ہوا اس کے پاس تو مدیحہ کے ہاں جانے تک کے پیسے نہیں تھے۔ اور نہ موبائل کہ فون کر کے وہ خود یہاں بلا لیتی۔ اس کے لئے بھی اس کی خالی جیب آڑے آ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے سڑک پر پیدل ہی چل رہی تھی کہ کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ ایک رکشہ اس کے پاس آ کر رک گیا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھایا اور حیرت بھری آنکھوں سے سامنے دکھائی دینے والے چہرے کو دیکھنے لگی۔

❀❀❀

سائرہ نبیل ابھی ابھی گھر آئی تھی۔ گھر کی حالت دیکھ کر وہ اپنا بیگ وہیں پھینک کر فوراً گھر کی چیزیں سمیٹنے لگی تھی۔ اس کا گھر بدل گیا۔ نبیل کا سابقہ گھر تھا۔ گھر میں کل تین کمرے تھے۔ جن میں سے کونے والا کمرہ بند رہتا تھا۔ ایک کمرے میں وہ دونوں رہتے تھے اور تیسرا کمرہ ان کے ڈرائنگ روم کی بدولت وہ بچے ہوئے تھے۔ کمانے کے باوجود جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ ان کی ماں بہت بیمار بیٹی اور بچی تھی۔ جن کی پرورش نے انہیں تنہا اس کی ماں بہت بری طرح سے بیمار رہنے والی روح تھی۔ بار بار باتوں کی ماہر۔ اور اس کے ابا نبیل راشدی ایک ماڈل کے جیسے تھے۔ ان کے ازدواجی تعلقات ان کا کام عام لوگوں کی طرح بس جیسے تیسے چل رہا تھا۔ ان کی مروت کی عادت کی وجہ سے ان کا گھر جیسے قرضے لینے کی مدد میں ہار بیٹھ کر بنا رہتا تھا۔ سو گھر میں صرف اتنی رقم آ پاتی تھی جس سے بمشکل صرف تین وقت کھانا کھایا جا سکتا تھا۔ اس گھر میں ابا کے ساتھ ان کے ایک بھائی ارسلان راشدی بھی رہائش پذیر تھے۔ وہ پہلے اچھی نوکری کرتے تھے۔ لیکن انہیں کوئی ایسا ان پر سے کروا دیا، غربت کی وجہ سے انکار سے تھے۔ لہٰذا وہاں پہلے ان کے ساتھ ہی رہتے تھے کیونکہ چچی ارسلان راشدی کی ضد تھی۔ ارسلان راشدی اور ان کی شادی کے بعد شادی شدہ ہو گئے تھے اور یہاں بھی انہوں نے جھگڑا کیا تھا۔ ان کے جاننے والے آج تک چاند صورت کی جوڑی کی تعریفیں نہیں بھولے تھے۔ مگر ان کی بیوی کے ساتھ کیا ہوا اس سلسلے میں گھر سے

خاموش تھی۔ ہاں، کریمہ سے یہ پتہ چلا تھا کہ ارسلان راشدی کے دل میں گھر کرنے والی ان کی بیوی اچانک ان کے دل سے اتر گئی تھی۔ جبران نے ٹھیک کہا تھا ایک دل میں یا تو محبت رہ سکتی ہے یا شک۔ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ سانس بھرنے کی جسارت کر ہی نہیں سکتیں۔ سو جس دن شک نے داخلے کی اجازت چاہی، محبت پچھلے دروازے سے نکل گئی۔ پھر اس محبت نے کتنے دکھ اٹھائے، کتنے امتحان دیئے، اس کے پاس اس کا کوئی گوشوارہ نہیں تھا کیونکہ ارسلان راشدی اور اس کی اماں آمنہ اس سلسلے میں ایسے چپ تھے، جیسے انجان...... ہزار موسم آئے مگر ان کی خاموشی میں کوئی دراڑ نہیں پڑی۔ جو کچھ ہوا تھا اس کے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہوا تھا۔ اس کے ابا کو دنیا سے گئے چوتھا ماہ تھا، جب وہ دنیا میں آئی۔ اماں کی عدت کے بعد محلے اور خاندان کے لوگوں نے زور ڈالا کہ بدلتے حالات کے پیش نظر ایک شرعی فیصلہ لے لیں تاکہ بچی کی پرورش اور خود ان کی جوانی دونوں کی سہولت سے نگہبانی ہو سکے۔ اماں اس بات کے لئے راضی نہ تھیں۔ نہ ارسلان راشدی۔ مگر دنیا کے لئے انہیں یہ فیصلہ لینا پڑا۔ پھر وہ دو سال کی تھی، جب اچانک امی کی خاموشی اور ابا کی زندگی کو ایک نئی آواز نے توڑا۔ یہ سونیا تھی۔ سونیا ارسلان راشدی۔ جانے کیسے اور کب انکار اقرار میں بدل گیا اور نئے وعدے نے زندگی سے ساتھ نبھانے کی قسم کھائی۔

شاید یہی کوئی کمزور اور جذباتی لمحہ ہی ہوگا۔ کیونکہ گزشتہ کئی سالوں سے، دیکھ رہی تھی کہ اس کے بابا ارسلان راشدی اور اس کی اماں آمنہ ارسلان راشدی کے درمیان ایک دوسرے سے خیریت پوچھنے کے علاوہ کوئی رابطہ نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے کا خیال تو رکھتے تھے مگر جس طرح وہ گھروں میں اس نے پکے رشتے دیکھے تھے ان بندھنوں میں ایسا کوئی بھی جذبہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا تھا۔

وہ گھر صاف کر کے اماں کے کمرے کو ترتیب دینے لگی کیونکہ وہ ان کے زیر استعمال رہنے والی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ انہوں نے نیند سے بوجھل آنکھوں سے اسے دیکھا اور آہستگی سے بولیں۔ ''آ گئیں تم؟''

اس نے ہمیشہ کی طرح صاف سر ہلا کر جواب دیا۔ کیونکہ اس کی پوری توجہ صبح کے وقت کی بکھری چیزوں کو ترتیب دینے میں لگی ہوئی تھی۔ اب اماں اٹھ بیٹھی تھیں۔

''تم بھی کیا سوچتی ہو گی، عجیب ماں ہوں، جسے نہ گھر کی پروا ہے، نہ اپنے بچوں کی پروا۔'' وہ بیڈ شیٹ ٹھیک کر چکی تھی، سو اس نے سہارا دے کر اماں کو اپنے بیڈ پہ بیٹھنے میں مدد دیتے ہوئے ان کی بات کا جواب زبان پہ روکا تھا، پھر نارمل سی ہو کر بولی۔

''میں ایسا کچھ نہیں سوچتی۔ کیونکہ میں نے سن رکھا ہے، ایک زمانے میں آپ بہت بہتر تھیں اور بہت خوب صورت ہوا کرتی تھیں۔ اماں! اگر میں جوان ہو گئی ہوں تو یہ آپ کا حق ہے کہ میں آپ کی مشکلوں کے حصے میں آپ کو مکمل آرام دوں۔ اس میں گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں الٹی سیدھی باتوں میں اپنا وقت نہیں گنواتی۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔''

"ہاں۔ مگر میں کبھی کبھی سوچتی ہوں، میں نے کبھی حسن سونیا کو تو بہو سا بھی تیرا بنانا چاہیے۔ مگر یہ بھی تیری ضد ہے کہ تمہیں وہیں سے وابستہ رہنا ہے۔"
وہ مسکرانے لگی پھر آہستگی سے بولی۔ "تم ایک دوست، بہن کی حیثیت سے میں چاہتی ہوں کہ وہ وہیں رہے، آگے وہ تحفظ کیا دے سکتی ہوں؟ اگر میری جگہ سونیا کا بھائی ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا ماں۔ سوال ہی نہیں
تمہیں چاہتی، بھائی نہ ہونے کے شوق میں سونیا کی خواہش کو ہی مار دوں۔" محمد نے کو وہ بڑی پھر آہستگی سے بولی۔ "بابا گھر پہ ہیں اماں ابا......"
اس نے سوال پر بھری مختلف سی سانس کھینچی مگر جواب ان کے پاس نہیں تھا۔ سو وہ خاموشی سے اٹھ گئی تھی۔
"آپ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا؟" اس نے گھڑی دیکھی۔ ابھی ساڑھے نو بج رہے تھے۔ وہ سیدھی کچن میں آئی تھی۔ ہمارا کچن بھی ٹھیک ٹھاک بڑا صاف ستھرا ہے بے بسی نے گھیر لیا تھا۔ یہ وہ لمحہ تھا
جب اس کے دل نے اس کی طرح بھوک بھری تھی۔ کاش سونیا بھی اس کا ساتھ دیتی اس کو کھانا بنانے کے لئے کھڑی ہوتی...... مگر یہ سوچ زیادہ دیر اس میں ٹھہری نہیں تھی۔ کیونکہ وہ کچن کی دہلیز سے
گزرے وہ فریج میں رکھا کھانا گرم کرنے کے ساتھ ساتھ تازہ روٹیاں بھی ڈال رہی تھی۔ فریج کے اندر بھی سے دونوں کی شکل اور ہیئت میں کافی فرق تھا مگر بھوک مٹانے کے لئے کافی ہو سکتا
تھا۔ وہ دسترخوان میں کھانا اس کے کمرے میں رکھ کر کرنے کے کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ دستک دینا اسے پسند نہیں تھا اور پھر ارسلان راشد کی کام میں اسے منہمک ہونے کی وجہ سے ان کے پاس جو ماں
کے کان پہنچوں تک بند کرنی ہوا۔ اس نے بے تکلف جھوٹی سی بات کہی۔ وہ دروازہ کھول کر وہ ایک دم رک گئی تھی۔
ارسلان راشد وہ توقع کے مطابق کہیں پہنچنے کی چہرے کو بکھارنے کی مرضی کوشش میں مصروف تھے۔
"بابا! آپ نے کھانا کھایا؟"
ارسلان راشد نے چونک کر اسے دیکھا۔ چلتے بلب کی روشنی میں اس کا نکھرا ہوا چہرہ عجیب ٹھہرے ہوئے تاثر لیے ہوا تھا۔
"نہیں بھوک نہیں ہے تم کھالو۔"
"پلیز بابا! آپ جانتے ہیں مجھے آپ کے بنا کھانا کھانا اچھا نہیں لگتا۔ چلیں اس کمرے میں سالوں، مجھے اور آپ کو ایک ساتھ بیٹھے ہوئے کئی سال ہو گئے ہیں۔ کئی روز بھی آپ کے ساتھ آج بھی
اس کے ساتھ بات کر، مجھے لگتا ہے، میں اور بڑی ہو رہی ہوں۔"

ارسلان راشدی نے بمشکل ضبط سے رکو دیا تھا اور بہت خاموشی سے اُس کے پیچھے چلتے چلے گئے تھے۔ پھر کھانا کھاتے ہوئے بھی رنی جملے پر کھانا یہاں آپ نے وہ سالن تو چکھا نہیں۔ اور ارسلان
راشدی اماں کی بات پر سر جھکائے یوں خاموش تماشے بیٹھے رہے جیسے انمد ارسلان کسی اور سے مخاطب ہوں۔ وہ اماں اور بابا کے رعب میں ارسلان راشدی کو ایک ساتھ بیٹھے دیکھ کر ہی آدھی بھوک ختم
ہونے کا گمان سی لگتی تھی سو بہت ہلکے پھلکے ہاتھ چلا رہی تھی۔ ان کی مرضی بھی کر دو بابا وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے رہیں۔ مگر ایسا ہونا کہاں تھا اپنے ہر موقع پر اماں کھانسیوں کا دورہ پڑ
جاتا اور بابا کو کوئی ضروری کام یاد آ جاتا۔ یوں یہ محفل برخاست ہو جاتی۔
آج بار بھی کچھ خلاف نہیں ہوا تھا۔ وہ تو ہمت ہی نہیں تھی۔ اماں نے کھانے کے بعد پھر سے سر سنبھال لیا تھا اور وہ کچن کا رخ کر کے اپنی سوچوں سے نکلنے کی سعی لا حاصل میں لگ گئی تھی۔ پھر کچن سے
فارغ ہوئی تو بابا کو کسی گم صم خاموش بیٹھے دیکھ کر عجیب سا چونکی۔
"کیا سوچ رہے ہیں بابا؟" وہ محبت سے قریب بیٹھتے ہوئے چائے کا کپ ان کی طرف بڑھا کر پوچھنے لگی۔
ارسلان راشدی نے چونک کر اسے دیکھا پھر آہستگی سے بولے۔ "ثانی بیٹا میرا دل گھبرا رہا ہے۔ کوشش کے باوجود بھی پاتا دل ٹوٹ سے۔"
"کیا ثانی آپ زوار سے ملنا چاہتے ہیں؟"
ارسلان راشدی نے بے بسی سے اسے دیکھا پھر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔ بے چارگی ہے کہ میں چاہنے کے باوجود بھی خود سے نہیں ملنا چاہتا۔ مجھے لگتا ہے ثانی اگر میں کسی دن یہ جسارت کر بیٹھا تو
بہت سے جواب طلب سوال مجھے میری تنہائی سے نوچ لیں گے۔"
"آپ کو تنہائی اچھی لگتی ہے؟" اس نے حیرت سے دیکھا۔
"تنہائی اچھی نہیں مگر زندہ رہنے کے لئے دھڑکن کی طرح ہے۔ اگر کسی دن یہ تنہائی بھی چھن گئی تو روح سفر اختیار کر لے گی۔ میں، میں خود ہی سوال بن جاؤں گا اور سوال جواب پانے کی حسرت
کرنے لگیں اماں تو ہاتھ ملتے رہ جاؤں گا۔ مسلسل ایک سفر بھاگتے ہوئے بیچ راہ ہے۔ کون کہاں بچھڑا، کہیں بچھڑا، یہ خیال تنگ کرنے لگتے ہیں۔ بس اس لئے میں تنہائی سے جان چھڑانے کے باوجود اسی کی قید
میں رہنا چاہتا ہوں۔"

AANCHAL.COM.PK

دوپہر بارہ بجے کا کھانا تھا۔ پھر شام کو کھانا بنا کر وہ چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر چھوٹے سے آنگن میں کرسی پہ آ کر بیٹھی ہی تھی کہ بے ساختہ کسی کے خیال نے اُسے ہراساں کر دیا۔ اس نے رسٹ واچ کی طرف دیکھا، شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ پتہ نہیں مومنہ کو نوکری ملی ہو گی بھی یا نہیں؟ اس نے سوچا اور اس سے ملنے کا ارادہ کر لیا۔

ایک ہفتہ پہلے وہ اُسے چار سو روپے دے کر آئی تھی تو اس کا خیال تھا اُسے تب تک نوکری مل ہی جائے گی۔ یہ ایک طرح سے عزتِ نفس کا دوسرے کی عزتِ نفس سے خاموش کیا جانے والا معاہدہ تھا۔ مگر جس طرح مومنہ رفیق نے اس سے رابطہ نہیں کیا تھا، یہ اس بات کی علامت تھا کہ وہ ابھی اپنی بے روزگاری کے گرداب سے نکل نہیں سکی تھی۔

آج اُسے سیلری ملی تھی، جیب بھاری تھی سو اپنے اور گھر کے خرچ سے نکال کر کچھ رقم بیگ میں ڈال کر وہ کچن میں آئی تھی، پھر اسکارف باندھ کر اس نے بابا سے اجازت چاہی تھی۔

"مومنہ رفیق۔ ہمیشہ صرف ذکر سنا ہے تم سے۔ کبھی لے کر آؤ ناں اُسے گھر۔"

"جی بابا ضرور... بس ذرا وہ بے روزگاری کے جنگل سے نکل آئے، پھر ملتے ہیں۔"

ارسلان راشدی نے سر ہلا کر اجازت دی اور اس نے باہر کا رخ کیا۔ بہت سے راستوں میں سے ایک راستہ جہاں کسی موڑ پہ مومنہ رفیق شاید اس کی منتظر تھی۔

مومنہ رفیق اور اس کی ملاقات بالکل حادثاتی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات تھی، جب وہ ملازمت کی اسٹرگل میں پہلی بار دوڑی تھی۔ وہ اور مومنہ بس اسٹاپ کی لائن میں ملے تھے۔ اس وقت بھی وہ حجاب میں تھی۔ دوسروں سے تو کیا وہ خیر شاید خود تک سے چہرہ چھپا کر رکھتی تھی۔ خود اس نے مومنہ رفیق کو وہ ایک بار کے علاوہ جانے کتنی ہی بار دیکھا تھا اور یہ دیکھنے کا مرحلہ جب آیا تھا تو اس نے لڑکی ہونے کے باوجود اُسے بے طرح سراہا تھا۔

"میری دعا ہے، جتنا خوب صورت تمہارا چہرہ ہے، تمہارا نصیب بھی اتنا ہی خوب صورت ہو۔"

"خوب صورت نصیب، وہ بھی میرا...... ہونہہ!" اس نے عجیب تلخ انداز میں کہا تھا، پھر وہ انٹرویو کے لیے اندر گئی اور باہر آئی تو بہت خفا تھی۔

"احمق ہے، انہیں نرس چاہیے یا کوئی ماڈل گرل۔ کہتے ہیں بی بی! آپ اپنا چہرہ دکھائیے۔ اس کے بغیر آپ کو نوکری نہیں مل سکتی۔ شاید انہوں نے میری قابلیت، میرے سرٹیفکیٹ کچھ بھی نہیں دیکھا اور صرف چہرہ دیکھنے کی ضد کی۔ آخر ایسا رکھا ہی کیا ہے اس چہرے میں...... میری خوب صورتی میرا نصیب تو نہیں بدل سکتی۔ میں کسی گم شدہ جزیرے کی شہزادی تو نہیں جو یہ سب مجھے لے اُڑنے کو بے کل ہیں۔"

AANCHAL.COM.PK

اس نے کچھ نہیں کہا تھا کیونکہ اس وقت کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن جب اس کی نوکری پکی ہوئی تو اس نے سب سے پہلے اس گرلز ہاسٹل کی راہ لی جہاں وہ رہتی تھی۔ وہ اس سے ملنے مطمئن ہو گئی کیونکہ اس لمحے وہ بے روزگار ہو چکی تھی۔

"تمہارا کوئی گھر نہیں ہے کیا؟"

اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی سوال کیا اور اس نے ناپسندیدگی آنکھوں میں بھر کر کہا۔

"نہیں، میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میں یتیم خانے میں پلی تھی۔ دس سال کی تھی جب ایک عورت نے مجھے گود لے لیا تھا۔ میں کبھی میرے [illegible] گھر اس عورت کو ایک ملازمہ کی ضرورت تھی۔ وہ "جلد رن: روم" کے جانے کے وقت مجھے اچھا کھلاتی، اچھا پہناتی مگر ان کے جانے ہی اس کا رویہ بدل جاتا۔ پھر یوں ہوا "جلد رن: روم" اور میری ماں کے درمیان میرے لئے رسہ کشی ہونے لگی۔ کچھ لوگوں نے صحیح اطلاعات "جلد رن: روم" پہنچا دی تھیں، جب کسی عدالت [illegible] میری کسٹڈی کا مرحلہ درپیش ہوا۔ میری [illegible] ماں مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی مگر یہ حقیقت تھی، اس کے گھر کے کاموں کی انتہا تھی۔ مگر "جلد رن: روم" کے کاموں کی حد کہیں تھی۔ سو میں نے فیصلہ [illegible] میں نے ساری باتوں کو [illegible] لیکن جب میں بڑی ہوئی تو مجھے لگا، میں اب تک بہت [illegible] زندگی گزار رہی تھی، جیسے [illegible] سو میں نے گرلز ہاسٹل کی راہ لی۔ ہاں [illegible] میں تنہا ہوں۔ میرا اس شہر میں کوئی گھر نہیں ہے۔" اس نے اتنی تفصیل سے جواب دیا تھا کہ پھر اس نے کبھی اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا اور آج وہ پھر سے اس [illegible] جاری [illegible] تک کہنے کی حاجت تھی۔

❀ ❀ ❀

بابا عبدالرحمٰن کھانے کی [illegible] منٹ کے اندر بات کی تھی اور حسب توقع عدیل بھائی اور عاطف بیگ دونوں کو بے طرح بھوک سے کھانے کا منتظر پایا تھا۔

"[illegible] یہ کیا زیادتی ہے، ہم یہاں قتل ہونے ہوتے رہ گئے۔"

عاطف بیگ نے [illegible] اس کے پیچھے عاطف بھائی کو آتے دیکھ کر وہ ہنسنے کی کوشش کرنے لگا۔

"کھانا لگا ہوا ہے میرا خیال ہے۔" اس نے [illegible] آرام سے بابا کے ہاتھ میں دے دی۔

عائشہ بھابی نے بے اندازہ دیکھا تو مسکرا کر بولیں۔ "میرے لیے تم شہریار جیسے ہو عاطف! اس لیے تکلف میں مت پڑو۔ جیسے وہ ہے ویسے ہی تم بھی ہو۔" اس نے مسکرا کر ان کی بات مان لی۔

بابا جنکی پہ کھانا لگانے لگی۔ چکن سوپ لے کر وہ شہریار کی طرف آئی تھی۔

"میں نے کہا تھا ناں میرے لیے نہ زحمت کرنا۔"

بابا عبدالرحمن ان سنی کرتے ہوئے اس کا بیڈ ٹیبل اس کے قریب رکھا نے لگی۔ چکن سوپ کا پیالہ رکھ کر اسپون اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"میں نے سنا ہے کہ آپ چار دن میں ڈسچارج ہونا چاہتے ہیں۔ جلدی سے اگر ایسا ہو رہا ہے تو اپنا کام خود کرنے کی کوشش کیجیے۔"

شہریار عبدالرحمن نے چونک کر ان کے چہرے کو دیکھا پھر آہستگی سے بولا۔ "آپ کو یہ کس نے کہا کہ میں چار دن میں فارغ ہونے والا ہوں؟" اسپون سے پیالہ اپ لیا اور وہ بیٹھ گئی۔

مسٹر حاتم کا میرے نمبر پر فون آیا تھا۔ وہ کسی دوست زادی کی ایجادات سے بہت تنگ تھے۔

"دوست زادی!... اوہ میرا خدا! کون ہے وہ دوست زادی، جو میجر کی جان کو آگئی ہے؟"

بابا ان کے ہونٹوں سے لگا دیے شپ سے صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میجر کی بہت ضرورت محسوس کی۔ آپ خود سوچیے صرف ضرورت کے لیے وہ کس طرح کی گھر سے نکلی ہے؟ ذرا کہاں کہاں چلی میں واپسی بھی معافی مانگ۔ یہ بہت زیادہ ہو گیا ہے۔"

"آہا! ویسے آج کل آپ بدل کہاں ہیں؟ کوئی تجسس کر رہی ہیں کیا؟" بات کرنے کی کوشش کی اور پھر اوکے جیتا۔ عاطف بیگ تو اپنا جمود کر بیٹھا گا۔ عدیل بھائی بھی تیزی سے اٹھے اور دروازہ کھول کر کے پھندا کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ آنکھوں میں ویرانی دوبارہ سرخی ٹھہر آئی تھی۔ چہرے کے نقاب سے بابا کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ عائشہ بھابی الگ پریشان تھیں۔ جب اس نے مدھم ہو کر کہا۔

"ٹھیک ہوں... ٹھیک ہوں... آپ لوگ تو ذرا ذرا سی بات پہ گھبرا جاتے ہیں۔"

عاطف بیگ جو اس کی پشت تھپتھپا رہا تھا اب کے ٹیپ پر بے ساختہ ہنس پڑا۔ کچھ ہی پل لگا تھا۔ شہریار نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور شرارت سے بولا۔ "آپ جناب کی حالت ملاحظہ کیجیے۔ پھندا لگنے میں سانسیں اٹکی تھیں جل رہی ہیں اگر اوپر کو آیا ہوتا... تو مجھے لگتا ہے وہ سرفینڈ آپ کی تیار ہو گی۔"

"بکواس مت کرو، ابھی اتنا بھی محبت کا روگ نہیں ہے مجھے۔" وہ اب ریلیکس ہو چکا تھا۔ منزل بھائی بھی بھرے سے کھانے سے انصاف کرنے لگے تھے۔ شہریار نے وانیا کو زبردستی کھانے کے لیے بھیج دیا تھا۔ وہ تینوں مصروف تھے، جب اس نے فون بجنے پر ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھایا۔

"ہیلو شہریار بول رہا ہوں۔ کون؟ مومنہ رفیق؟ اوہ، آپ... کیوں نہیں؟ کیوں کہ میں نے پہلے ہی پروگرام کرنے پر ریلیکس نہیں کیا۔ جی نہیں، اگر آپ قابل ہیں تو نوکری تو آپ کو تب ہی مل سکتی ہے۔ خدا واسطے پر نوکری بانٹنا شروع کر دوں تو پھر میری کمپنی چل چکی۔ کس سے بات کرنا چاہتی ہیں؟" توقف کیا پھر حیرت سے بولا۔ "آپ کو لگتا ہے، آپ کی دوست کوئی بہت بڑی چیز ہے، جس سے بات کرتے ہی میں آپ کے لیے نرمی سے سوچنے لگوں گا؟ کیا... کیا میں آپ کی دوست کو جانتا ہوں؟ اچھا...... حیرت ہے، وہ مجھے جانتی ہیں اور میں انہیں نہیں جانتا۔ ٹھیک ہے، بات کروا دیجئے۔" ایک لمحے کو لمبا وقفہ آیا، پھر دوسری طرف کی آواز تھی کہ شہریار گم سا ہو گیا۔ مومنہ سچ کہتی تھی کہ اس آواز کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ آواز اسے جانتی تھی۔ نام سن کر وہ چونک گیا۔ "مس شافعہ جمیل؟ اوہ، آپ ہیں جنہیں تیرے پیچھے کروانے کی بہت لت ہے۔ سوری، میں ایسا رسک نہیں لے سکتا۔ صرف آپ کے کہنے پر میں کیسے مان لوں کہ مومنہ رفیق میری کمپنی کے لیے بیسٹ چوائس ہوگی؟"

وہ پھر کچھ دیر کے لیے چپ ہوا تھا۔ شاید شافعہ جمیل اپنا موبائل لے کر مومنہ رفیق سے بہت دور ہو گئی تھی۔ کیونکہ پہلے اس جاری گفتگو میں وہ مسلسل اسے زبانی شہ دے رہی تھی، مگر اب وہ بالکل خاموشی کے گھیرے میں تھی۔ پھر شہریار نے جو کچھ شافعہ سے سنا، اس نے اس کی پیشانی کی رگوں کو ابھار دیا تھا۔ وہ چاروں اسی کی طرف مرکوز تھے۔ اس نے کچھ سوچا، پھر آہستگی سے بولا۔ "او کے، آپ مومنہ سے کہہ دیجئے، وہ کل میرے دفتر پہنچ جائیں۔ انہیں گرافک ڈیزائننگ کے لیے مسٹر راحم جس طرح اپروچ کریں، وہ ان کی رائے کی قدر کریں۔ جی ہاں، انہیں کہہ دیجئے گا، وہ تا اطلاع ثانی پروبیشن پر ہیں۔ جب تک میں خود ان کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہو جاتا، انہیں مستقل نہیں کیا جا سکتا۔"

وہ موبائل بند کر چکا تھا، پھر اس نے ایک اور نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ ہونے پر وہ جان پائے تھے کہ یہ دوسرا آدمی راحم جوئی کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ اس نے اس سے مومنہ رفیق کی جاب کے بارے میں بات کی تھی، پھر کچھ رقم ایڈوانس میں دینے کا حکم دیا تھا۔ راحم نے فیصلہ سن کر اپنی رائے کا اظہار کیا تھا، تبھی اس نے ہولے سے کہا تھا۔

"ہاں ہاں...... میں نے ہی کہا ہے، وہ بالکل نئی ہوگی لیکن یہی تو ہو سکتا ہے، وہ ہمارے لیے ایک گراں قدر اضافہ ثابت ہوں۔ تم تو جانتے ہو، مڈل کلاس میں کتنا مشکل ہے۔ بس اسے گین کرنا ہے، اچھی کارکردگی کے لیے اگر تھوڑا سا رسک بھی لیا جائے تو کیا برا ہے۔ ہاں، ہاں، اس ایڈوانس کو ہم اس کی سیلری سے کاٹتے رہیں گے، او کے گڈ بائے۔ لیکن میری غیر موجودگی میں معاملات ویسے

نئی چلتے رہنا چاہئیں جیسے ہر پل موجودگی میں تھے۔“
دونوں مسکراہٹ کر کے پلٹا تو اپنے پیچھے ہانیہ کو کھڑے پایا۔
”آپ یہاں آرام کر رہے ہیں؟ اباجی کل بھی لیٹ کر بھی کام آپ کی جان نہیں چھوڑ رہے۔“ شہریار کو نوٹ کیا جھڑپ چھپتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”یہ وہ..... اف یہ کون ہو وہ جس نے آپ کو اتنا متعارف کروایا ہے؟ کیا متعارف کروا کے یہ طویل ملاقات سے پیچھے رہے ہیں؟“
شہریار نے ہانیہ کے بولے لہجے کو وہاں رہا کا لہجہ کالونٹ کرنے لگا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا جیسے ہانیہ کے لہجے کی تہہ میں اس کی آنکھوں میں بھی طنز کا شائبہ تھا۔
عائشہ بھابی دونا کا رویہ بہلتے دیکھ کر فوراً بچاؤ کرانے کے خیال سے درمیان میں آگئی تھیں مگر غیر ستوقع شہریار نے اس کو بھی نہیں لیا تھا اور آہستگی سے بولا تھا۔
”موصوفہ حافظہ بچپن کی فرینڈ ہیں ہانی کے بابا ف… میں نے تو ے جواب آخر کی ہے اب ایسی بات نہیں ہے۔“
ہانیہ نے جواب سنا تو حسن حجازی عبدالرحمٰن کی باتیں اس میں کو ئی وجہ پیدا کر رہی تھیں۔ اس لئے اس کی آنکھوں کی بے یقینی میں کمی کی تہیں آئی تھی۔ وہ خاموشی سے ہونٹ بھینچے کھڑی رہی تھی، جب عاطف واش بیسن میں ہاتھ دھو کر ان کے قریب آ کر کھنکارا۔
”کیوں جگہ یہاں وقت اسموکنگ کا سوچ نہیں رہا؟“ شہریار عاطف کی شرارت سمجھ گیا تھا۔ وہ صرف ایک جملے کے لئے جی کرنا چاہتا تھا۔ مگر ہانیہ نے خاص توجہ نہیں دی تھی۔ وہ خاموشی سے عدیل بھائی، عائشہ بھابی اور عاطف بیگ کے لئے چائے انڈیلنے لگی تھی۔ عاطف نے ہاتھ کے اشارے سے اس کی طرف سوالیہ نگاہ اچھالا اور شہریار مسکرانے لگا۔
”لگتا ہے ہانیہ بی بی اپنے اسموکنگ سے بھاگی۔ بہت سی باتوں کے لئے، بہت سارے تحفظات نے آن گھیرا ہے۔“
”میں نے ایسا کچھ کیا کہا؟“ وہ صوفے پر بیٹھ کر چائے دینے لگی۔ عاطف بیگ چائے کے لوازمات اٹھا کر... بسکٹ کا پیکٹ اور احمد نے اٹھایا تھا۔
”اسموکنگ کا تھا۔ دونوں چیزیں اس نے ضبط کر لیں۔ کہہ دیا تھا، وہ سوچ کر نہیں چھوڑ دی تو وہ دن دور نہیں کہ تخت دار پہ لٹک رہے گا۔“
”وہ کون ہوتے ہیں میرے بھائی کو اس دھمکی دینے والے؟“ اس نے تیزی سے خفگی سے کہا اور شہریار ہنسنے لگا۔ پھر آہستگی سے بولا۔

"پیاری گڑیا! تم مجھ سے ناراضگی فوراً ہی ختم کر سکتی ہو، پھر کیوں ستاتی ہو؟"

وہ مسکرانے لگی تھی۔ پہلے سے کہ وہ بچہ ختم میں آ سنبھالا لے گئے تھے نرجس کے کو سالار بھائی اور حرا صاحبہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا اس نے موحد رفیق کو بھی اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کا موقع دے کر مجھ لینے کی کوشش کی تھی۔

"آپ گھر جائیے عدیل بھائی! تھوڑا آرام کر آئیے، ورنہ رابعہ بھائی خفا ہو جائیں گی۔ پہلے ہاسپٹل سے رخصت نہیں ہوئے تھے۔ عائشہ بھابی خفا ہو جائیں گی کہ ان کے میرے کام چھوڑ کر چھوڑا ہے کزنز والوں نے۔"

عدیل بھائی ہنسنے لگے۔ پھر وہ سات بجے سے پہلے ہاسپٹل سے رخصت نہیں ہوئے تھے۔ عائشہ بھابی ان کے ساتھ تھیں اور وہ اپنا عارضی طور پر ان کے ہمراہ اس شرط پر واپس گھر گئی تھی کہ وہ گھنٹے بعد وہ پھر سے ہاسپٹل آ جائے گی تو عدیل بھائی اسے نہیں روکیں گے۔ عدیل بھائی نے وجہ پوچھا تھا، سو عائشہ بھابی چلے پر اس نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ عاطف بھی نیم دراز ہو چکا تھا۔ نرس نے اسے خواب آور انجکشن دے کر سلا دیا تھا۔ زخم کی پٹی بھی بدلی جا چکی تھی۔ سو کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ اس نے موبائل آف کرنے کا عندیہ بھی لینا چاہا تھا مگر شہریار نے بولنے سے انکار کر دیا تھا۔

"پلیز موبائل وائبریٹ پہ ہے، شور نہیں ہوگا۔"

نرس نے سر ہلا کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ پھر صبح کی دیر گزر گئی تھی۔ اچانک ڈاکٹر صمدانی کی آمد پہ اسے جاگنا پڑا تھا۔ وہ معمول کا چیک اپ کر رہے تھے۔ پہلے دن کے مقابلے میں دوسرے دن اور دوسرے دن کے اختتام تک اس کی کنڈیشن تسلی بخش تھی۔ دل کی دھڑکن معمول پر تھی۔ آکسیجن کی ضرورت پہلے دن کے بعد کبھی محسوس نہیں کی گئی تھی۔ بی پی بھی ٹھیک تھا۔ ڈاکٹر صمدانی بہت زیادہ پُر امید اس کا کاندھا تھپتھپاتے اس کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کر کے لوٹ گئے تھے۔ عاطف بیگ کی بھی بات چیت سے آنکھ کھل گئی تھی، سو وہ صوفے پر سے اٹھ کر اس کے بیڈ کے سامنے کرسی پر آ بیٹھا تھا۔

"مبارک ہو، تم اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ یعنی ابھی کچھ دن اور زندگی کا ساتھ نہیں چھوٹ سکتا۔"

شہریار نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر مسکرا کر بولا۔ "کون کم بخت اس وقت زندگی کا ساتھ چھوٹنے کی فکر میں گھل رہا ہے؟" لمحہ بھر کو توقف کیا، پھر اپنے ذمے کے کاموں کی لسٹ گنوانے لگا، جس میں دنیا کی سیاحت، جارج کا بزنس میں چیئرمین بننا اور بہت سارے چھوٹے موٹے کام درج تھے۔ کام گنوا چکا تو بولا۔ "عاطف صاحب! ان سب چیزوں کو مکمل کرنے سے پہلے میں چاہوں گا میں زندگی کو دوست بنائے رکھوں تو ہی اچھا ہے۔"

عاطف بیگ نے ان کو چونکتا ہوا کرتے دیکھا پھر خفگی سے بولا۔ "میں تو سمجھا تھا تم بہت سنجیدہ ہو گئے ہو اندر کی بھڑاس نکال لو گے تو طبیعت بحال ہو جائے گی مگر تمہیں سارا غم اپنے اندر رکھنے کی اتنی عادت ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔"

"مت پوچھو یار بہتر ہے۔ بس تم اپنی دیکھو تم اپنی روداد رکھو۔"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور دو تکیہ پشت کے پیچھے رکھ کر آرام دہ حالت میں بیٹھ گیا۔ پھر قدرے بیزاریت سے بولا۔ "جس سے آپ کی خوشی ہے یار، بس اب مجھے ہسپتال میں بند ہو کر ٹائم ضائع کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ بند، گھٹن سے اور خود بیزاریت سے آپ ہی مر جائے گا۔" عاطف ان کی اکتاہٹ کے بارے میں جانتا تھا وہ بہت ہی کیسے سوچتا تھا کہ وہ ایک ہی کمرے میں بند ہو جانے کے باعث قید کی بیماری ہو چکا ہے۔ جیسے پہلے ان سے کہ وہ اس کیفیت سے نجات پانے کے لئے کوئی حکمت سے اپنا دل بہلائیں۔ شہریار نے ان کے فون ریسیو کیا اور چہرے پر یکدم مسکراہٹ دوڑائی۔ "ہاں چھوٹی!" یہ بے ساختہ ان کے منہ سے نکل ہی گیا تھا۔ ورنہ انہیں کیا پتا تھا کہ وہ بچوں کو فون کرنے کے لائق بھی تھا۔ بلکہ وہ اس لئے تھا کہ وہ دونوں سے محبت کرنے والوں کو پریشان کرنے سے اجتناب کرتے تھے۔

"چھوٹی!.......تم.......تم نے کیسے فون کر لیا بیٹا؟"

"بابا! میں نے سنا ہے آپ کی طبیعت خراب ہے۔ میری ماموں اکثر سے کال ہوئی تو بات ہوتی تھی۔ سچ سے میرے پاس بیلنس نہیں تھا نہیں بابا! ان کی بیٹی نہیں جا سکی تھی اس لئے کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کی دعائیں مجھے ساتھ رہی ہیں۔ بتائیے ناں بابا! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

شہریار نے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے عاطف کی طرف سے رخ موڑا پھر آہستگی سے بولا۔ "میری طبیعت فی الحال ٹھیک ہے جان بابا!..... مگر ابھی کچھ دیر بعد ایک جلاد ہے جو مجھے خیریت سے نہیں رہنے دے گا۔ تمہاری ابو ... نہیں ہے ان سے کیا ... ہے۔"

دوسری طرف حسب عادت قہقہہ گونجا۔ عنبر اس شخصیت کے لئے ... تھی۔ پھر عنبر سے سلام پا ان نے کہا تھا۔

"ہاں بابا، تم ٹھیک تھی ہو۔ تمہارے عاطف انکل ہی ہیں۔ وہ اکثر ... گفتار ہے جیسے انہوں نے مجھے بابا کے بغیر ... کر لیا ہے۔ ... کا مطلب ... ہے۔"

"بابا.....پھر وہی عجیب سر درد شروع ہو چکا تھا اور اس نے واضح جارحانہ لہجے میں سوال کیا تھا۔

"یہ عجیب کون ہے؟"

شہریار کوئی جواب دے ہی پاتا کہ اچانک دروازہ کھلا اور دادا عبدالرحمٰن کو دیکھ کر شہریار کی سٹی گم ہو گئی۔

"آپ یہ کون کون ہیں؟" کمینگی ان کے چہرے سے ظاہر تھی۔ عاطف نے سر پہ ہاتھ پھیر کر شہریار کے جسم میں گھس جانے کا یقین کر لیا تھا اور دادا ابا ابھی تک اسی پر رکی تھی۔

"میری ایک کلاس فیلو ہے۔ ابھی ابھی یورپ کے دورے سے لوٹی ہے۔ اس لئے میری طبیعت کا جان کر ایک اچھے سے دوست کی طرح خیریت پوچھنا چاہ رہی تھی۔" اس نے جان کر دادا کو باتوں میں لگا کر نمبر ڈیلیٹ کر دیا تھا۔ دادا نے واقعی اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر اپنی عینک سے پہلے کے نمبر پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔

"یا انگلینڈ سے آپ کو کون فون کر رہا ہے بار بار؟ کیا یہ بھی کوئی دوست ہے جسے آپ کی طبیعت کا احساس ہو رہا ہے؟"

اس نے موبائل لے کر نمبر دیکھا۔ نمبر شفا انجنی تھا۔ پھر پہلے اس نے کچھ سوچا۔ موبائل ایک دفعہ پھر بجنے لگا۔

"ہیلو شہریار اسپیکنگ۔"

پھر دوسری طرف کی آواز سن کر اس کی گرم جوشی دیکھنے والی تھی۔

"ٹھیک ہے ہم آپ پاکستان جیسے ہی آئیں گے میں آپ سے ضرور ملنا چاہوں گا ویسے آپ تکلف نہ کریں دو مہینے بعد سے خود آپ کو پک کر لیتے ہیں۔ ہاں... ہاں کیوں نہیں۔ اس کا مسئلہ بھی حل کیا جا سکتا ہے۔" دعا نہیں کرتا رہا پھر فون آف کر کے ریلیکس ہو گیا۔ عاطف بیگ کا فرزند پایا۔ تشکر دادا کے چہرے پر بھی تھا مگر اس کی وجہ دوسری تھی۔ وہ دوسرے کے بعد تجتی کا نام بار بار اس میں سن کر لگا تھا۔

کیا واقعی وہ شہریار کے لئے ایک اجنبی جگہ کا ایڈمیشن بن رہی تھی.......؟

کیا واقعی حقیقت میں شہریار اداکاری کر چکا تھا کہ اس کے مدمقابل کوئی اُمید کرنا شہد سے مذاق کے مترادف تھا.......؟

وہ دادا سے چلتے چلتے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی اور عاطف بیگ اس کے چہرے کی فکر مندی سے کتنا وہ سمجھ کے اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

"پریشان مت ہو دادا! ڈاکٹر ہمدانی کہہ رہے تھے شہریار بہت اچھی ریکوری کر رہا ہے۔ اب وہ ٹھیک ہے بالکل ٹھیک۔"

دادا نے سر اونچا کر کے ایک لمحے کو شہریار کو دیکھا، پھر دوبارہ میری طرف نظر موڑی۔ عاطف کو کچھ کہ بات لہجے میں بولی۔ "میں دیکھ رہی ہوں، واقعی شہری بھائی اب بالکل ٹھیک ہو چکے ہیں۔"

یہ عام سا فقرہ تھا مگر عاطف بیگ کو عجیب احساس ہوا تھا اور شہریار اس احساس کی تہہ کا پتے اندر تک [illegible] سے دیکھ رہا تھا۔

دادا اس جملے کے بعد رکی نہیں تھی۔ عاطف نے گھر چھوڑنے کی ضد بھی آخر کی تھی، شاید وہ اکیلی ہی کمرے کے لیے نکل جاتی۔ [illegible] اس نے چند روز کے لیے [illegible] پہ رکی تھی، اس وقت بھی سہولت کام آئی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد وہ شہریار کے پاس لوٹا تو [illegible] باتیں [illegible] کروٹ [illegible] کے سوتے ہوئے پایا۔ یاد بات کر وہ جانتا تھا وہ صرف اس وقت کی کیفیت اور عاطف کے سوال سے بچنے کی کوشش کے علاوہ کچھ [illegible] نہیں جانتا تھا۔ کمرے کی لائٹ آف ہو چکی تھی اور وہ اس کے قریب ہی [illegible] بیٹھ گیا تھا۔

"تم اب جا کر سو جاؤ۔ میں بالکل ٹھیک ہوں، اپنی نیند مت خراب کرو۔" اس نے کروٹ بدلتے [illegible] خیال اچھا لگا [illegible] کوئی مجبوری نہیں تھا۔

"تم دادا کی ناراضگی سے پریشان ہو؟" اس نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

مدھم لہجے میں بولا۔ "نہیں، مجھے دادا سے کوئی شکایت نہیں۔ مگر ہاں دل میں کچھ دکھ ضرور ہے۔ یہ [illegible] کی محبت سے اتنی زیادہ توقعات کیوں رکھتا ہوں؟ مجھے لگتا ہے، میں دنیا کی کسی بھی [illegible] میں چلا جاؤں تب بھی دادا کے لیے میں اس کا شہری بھائی ہی رہوں گا۔ وہ جتنا [illegible] کی طرح مجھے [illegible] کے [illegible] نہیں دیکھیں گی۔ مگر...... اب مجھے اس بات کے لیے [illegible] کیا چاہیے کہ میں نے اپنے دو مضبوط [illegible] کھو دیے ہیں۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے، میں خالی ہاتھ ہو گیا ہوں اور [illegible] عاطف! کسی کے دل سے نکلنے کا دکھ کیا ہوتا ہے۔"

وہ سنجیدہ ہو کر اس سے سوال پوچھنے لگا مگر جواب اس کی آنکھوں کی [illegible] میں [illegible] گیا تھا۔

"تم رو رہے ہو؟"

"نہیں تو......" اس نے صاف مکر جانے والا لہجہ اپنایا اور آنکھیں موند لیں۔

وہ جو کہتا تھا، وہاں دو مضبوط [illegible] کے کھو دینے پہ شاید ہی زندہ رہ سکے۔ وہ حارث عبدالرحمن اور دادا عبدالرحمن کے بچھڑ جانے کے باوجود زندہ تھا۔ [illegible] اس کی بات بہت [illegible]

نہیں رہی تھی۔ عاطف بیگ نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا تھا۔ مذہب کے لئے کوئی لفظ استعمال نہیں کیا تھا اور اس نے اسی تسلی سے اپنے دل کو بھی سمجھا لیا۔ زندگی کی تلخی کو چکھنے کے لئے جھکنا پڑتا تھا۔

❀ ❀ ❀

رات آہستہ آہستہ بھیگ چکی تھی اور زندگی......

وہ پتہ نہیں کہاں تھی اس کمرے میں یا اس کمرے سے باہر......

باہر اس کا کوئی وجود نہیں تھا اور سب کچھ زندگی کے ہونے کا واہمہ ہوتا تھا۔

اس نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا تھا اور سامنے رکھے آئینے میں اپنی لڑکی کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں بھری ہوئی، سانس پوری طرح بھیگ گئی تھی۔

"مسز مصطفیٰ! کہاں جا رہی تھیں؟"

اس نے چونک کر دیکھا۔ سنبھل کر بیٹھی تو اسے لگا یہ سوال شاید ضمیر نے کیا تھا۔ کسی خود رنگ میں رہنے والے نے کسی اور کے لہجے میں سرزنش کی تھی۔

واقعی وہ کہاں جا رہی تھی؟ اس نے خود سے سوال کیا اور شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ وہ چونک کے کمرے میں آ کر بیٹھی تھی۔ مگر وہ بڑی کہاں تھی، اسے خود روکا گیا تھا۔ آج اس کے قدم اٹھنے کے بعد رک سی گئیں پار ہے تھے۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا جس سے وہ خفا تھی۔ مگر اس کی نظر سے ایک بار پھر وہ لمحے گزر گئے جو اسے کبھی نہیں بھولتے تھے۔ ہر دن میں سے اس کے لئے اچھائی کا ایک لمحہ سوغات کر دیتا تھا اور کبھی پلٹ کر سوال کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتا تھا کہ اس احسان کا قرض کس طرح چکاؤ گی اور کب تک جھٹلاؤ گی اور کب تک ناشکری رہو گی۔ وہ کبھی یہ سوال نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے سکے گی۔ لیکن آج دل میں کسی نے چپکے سے کہا تھا۔

"اگر جو واقعی اس نے یہ سوال کر دیا تو جواب میں کیا کہہ پاؤ گی......؟"

آسمان کی طرف اٹھی ہوئی آنکھیں شرمندگی سے جھک گئی تھیں۔ وہ دنیا کی خوشیوں کے پیچھے بھاگنے کی اتنی عادی تھی کہ بھولی بھٹکی سرزنش سے دامن بھر نہیں پائی تھی۔

"کیا ہو گیا اتنی رات گئے تم کہاں جا رہی تھیں؟" وہ کمرے سے نکل کر ان کے سرہانے آ کھڑی ہوئی تھی۔ پھر وہ نہیں پا سکی تھی۔ مگر اب کا کندھا ملتے ہی رونے لگی تو اس کی مٹھی میں اس کی عزت کا

آخری کنارہ بنا ہوا تھا جسے وہ شکم کی بھوک کے لئے نیلام کرنے نکلی تھی۔

"میں بہت بری ہوں شانی! بہت بری۔ صرف بھوک کے لئے آج میں نے اپنی سوچ کو کہاں تک گرا دیا..... میں اپنی نظروں میں کبھی نہیں اٹھ سکتی۔"

شافعہ پھر سے رونے لگی۔ مجبوراً اس کی بات کا مطلب سمجھی تو اس نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

"پاگل لڑکی! پریشان تھی تو مجھے ایک فون نہیں کر سکتی تھی؟"

اس نے پلو سے آنسو پونچھتے پھر بے بسی سے بولی۔ "کیسے فون کرتی؟ میرے پاس پیسے ہی نہیں ہیں۔ میرے پرس میں کھوٹی کوڑی بھی نہیں بچی ہے۔"

شافعہ تحمل محسوس کرنے لگی۔ مجبوراً اس کا ہاتھ تھام کر ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ "مجھے تو تمہارا خیال کرنا چاہیے تھا۔ یہ میری کوتاہی ہے کہ میں نے تم سے صرف نظر کیا۔"

مومنہ رفیق نے اس کے ہاتھ کو محبت کے لمس سے چھوا اور بولی۔ "میں تمہاری ذمہ داری تو نہیں ہوں شانی! بس خوامخواہ بے وقوفوں کی دوستی کو جیسے میں نے تم پر حق کی طرح مسلط کر لیا ہے۔" وہ لمحہ بھر کو رکی، پھر نرمی سے بولی۔ "تم اتنی اچھی ہو کہ ایک نازیبا رشتے پر اتنی توجہ خرچ رہی ہو۔ حالانکہ آج کے دور میں کوئی دوسرا رشتہ داری ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔ میں تمہیں دیکھتی ہوں تو مجھے اس کے اچھے ہونے کا تھوڑا تھوڑا سا یقین آتا ہے۔ شانی! لوگ کہتے ہیں، جانے دنیا کب تک کیوں قائم ہے؟ اگر کوئی یہ سوال پوچھے تو کہنا کہ یہ دنیا تم جیسے لوگوں کے دم پر قائم ہے۔ جنہیں اچھائی کرنے کے لئے کسی صلے کی تمنا نہیں ہوتی۔ مدد کرنے کے لئے کسی رشتے کا تعلق بھی ضروری نہیں لگتا۔ جو بس دونوں ہاتھوں سے دیتے جاتے ہیں۔"

شافعہ مسکراتی رہی۔ اس کے کسی جملے پر اس نے دخل نہیں دیا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی تعریف سننے کی شائق تھی، بلکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے اندر بہت سارا دھواں بھر گیا ہے۔ تنہائی نے اس میں جالے تن دیئے ہیں، اس لئے وہ لفظوں اور باتوں سے اس کثافت کو مٹا دینا چاہتی تھی۔

وہ باتوں کے دوران گرلز ہاسٹل میں آ پہنچے تھے۔ شافعہ نے کمرے کی روم میٹ کی حیثیت سے مومنہ رفیق کا پچھلے مہینے کا دو ہزار کرایہ اور کھانے کا خرچ جمع کرا دیا تھا۔ رجسٹر پر دستخط کر کے رسید لی، پھر رسید مومنہ کو دے کر وہ تحمل سے وارڈن سے مخاطب ہوئی تھی۔

"مومنہ کا سامان جس طرح باہر نکالا گیا تھا اسے اسی ترتیب سے رکھ دیا جائے ورنہ اس کی شکایت کمیٹی دفتر میں بھی درج کرائی جا سکتی ہے۔"

وارڈن نے کان دبا کر بوجھل زنے اس کو سامان اس کے کمرے میں باترتیب سے رکھوا دیا تھا۔ وہ دونوں اب کمرے میں تھیں۔ اس کی روم میٹ گہری نیند سو رہی تھی۔ سو شافعہ نے اُسے زحمت دیے بغیر بہت خاموشی سے موحد رفیق کے آگے کھانا رکھ دیا تھا۔ کھانا دیکھ کر موحد کی آنکھیں چہرے سے بہنے لگی تھیں۔ مگر پھر وہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رک گئی تھی۔ شافعہ سہیل کچھ سمجھ نہیں پائی تھی اُس کے اس رویے کو۔ وہ یکدم کھڑی ہو گئی تھی۔ پھر دو منٹ بعد وہ واش روم سے نکلی تو اس نے اس کے گیلے چہرے سے اندازہ لگایا، وہ وضو کر کے باہر آئی تھی۔ اس نے جائے نماز بچھا کر دو نفل شکرانے کے پڑھے تھے، پھر دوبارہ کھانے کے لیے دسترخوان پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ شافعہ اس سارے عرصے میں خاموش رہ کر اس کی ذات کا جائزہ لے رہی تھی اور وہ اپنے میں گم کھانے لگی تھی۔

"جب میں گھر میں ہوتی تھی مجھے لگتا تھا، مجھ سے زیادہ مظلوم کوئی نہیں۔ جب میری ماں اپنے برے حالات میں دال یا سبزی پکاتیں اور مجھے سب سے آخر میں کھانا ملتا تو میں کہتی، مجھ سے زیادہ دکھی یا نہیں، نہ حلوا، جسے کھانے کے لیے ڈھنگ کا کھانا بھی میسر نہیں۔ مگر شافی! جب سے عافیت سے نکل کر دنیا کی بھیڑ میں آئی ہوں تب کھلا، میں تو بہت عیش میں جی رہی تھی۔ تین وقت کا کھانا، وہ کھاتی تھی نا، وہ جیسے بھی کھا خاموش ہوتی، پھر رو دی تھی۔ ان دو سالوں میں میں نے سوکھے ٹکڑے نمک پانی میں بھگو کر کھائے ہیں، جو ہم گھر میں بھی ٹکڑے والے کو دے دیتی، خیرات کر دیا کرتے تھے۔ میری ماں بہت سخت تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے کبھی روٹی نہیں پھینکی تھی۔ وہ کہتی تھی، اس سے بڑا گناہ کیا ہے کہ ہم اللہ کا دیا رزق پھینکیں اور بھوکے ٹکڑے سے کھاؤں کتنا۔ بیس دس روپے، تین روپے۔ کیا ہم نہیں یہ کم ایسے ہی خیرات کروں۔ ضائع کرنے سے اس کا تقدس مجروح ہوتا ہے۔ اللہ نے جس محبت سے کھانے کو دیا، ہمیں بھی اس محبت کا سلوک یاد رکھنا چاہیے...... میری ماں بہت سخت تھی۔ مجھے لگتا تھا، وہ دنیا کی بہت ظالم عورت تھی۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے، وہ تو بہت نیک عورت تھی۔ وہ مجھے دنیا کے نشیب و فراز سمجھانے کے لیے سختی کا چولا پہنے جیتی تھی اور میں اُسے سمجھے بغیر اسے چھوڑ آئی۔ دنیا بھی ماں نہیں بن سکتی۔ مگر ماں ایک دنیا ہوتی ہے۔ جس نے اسے ٹھکرایا، دنیا بھی اسے ادھورے حوالے کے ساتھ کبھی قبول نہیں کرتی اور ٹھکرا دیتی ہے۔"

شافعہ سہیل نے اس کے لیے گلاس میں پانی انڈیلا تھا۔ پھر نرمی سے بولی تھی۔

"تم اپنی ماں کو اتنا مس کرتی ہو، پھر لوٹ کیوں نہیں جاتیں اس کے پاس؟ میں نے سنا ہے، اولاد کتنی ہی بری ہو، ماں کو کتنا ہی ستائے لیکن پھر بھی ماں کے دل کے دروازے ہمیشہ اولاد کے لیے کھلے رہتے ہیں۔"

موحد رفیق نے خالی پن سے اُسے دیکھا، پھر نہایت آزردگی سے بولی۔ "میں ایک بار گئی تھی۔ مگر ماں اپنا گھر وہاں سے بیچ کر کہیں اور منتقل ہو گئی۔ میری ماں کا ایک ہی بیٹا تھا، جو میرے یتیم خانے سے گھر لائے جانے کے دو سال بعد پیدا ہوا تھا۔ لوگ کہتے ہیں، وہ گھر اسی نے اپنی بیوی کے کہنے پر بیچ دیا۔ میں نے معلومات کی تو پتہ چلا، گھر میں روزانہ جھگڑا ہوتا تھا۔ میری بھابی روز اپنے شوہر کو میری

ماں کے خلاف بھی کافی تھی اور وہ روز اُسے سخت سست سنایا کرتا۔ محلے والے کہتے ہیں، پتہ نہیں اب وہ لوگ کہاں گئے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں میری ماں زندہ بھی ہے یا......" اس نے آنکھیں میچ لی تھیں۔ پھر بہت دل گیری سے بولی تھی۔ "شافی! میرا دل کرتا ہے میری ماں بہت جیسے بھی ہو زیادہ کہیں مل جائے ہوں تو اس سے جا کر اپنی غلطیوں کی معافی مانگ لوں...... لیکن کیا واقعی ہم سب اپنی غلطی کی معافی مانگ سکتے ہیں؟

شافی! ہمارے پاس ماں اور باپ اور ان کا سایہ تحفے کی طرح ہوتا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں یہ سب ہمارا حق ہے اور حق کے لئے انسان ہمیشہ سخت لہجہ اپنا لیتا ہے۔ حق کے لئے کمینہ تک بن جاتا ہے...... اسے لگتا ہے یہ اس کا حق ہے تو بس پھر وہ اس حق کو جب تک چاہے استعمال کرے، جس طرح چاہے استعمال کرے۔ جتنا استعمال کرے۔ مگر حق لینے کے لئے ذمہ داریاں بھی تو کندھوں پر آپڑتی ہیں۔ مگر ہم ذمہ داری نہیں اٹھاتے۔ غلطی کرتے ہیں دوبارہ، سہ بارہ اور سمجھ لیتے ہیں کون ہے جو ہم سے اس کی بابت سوال کرے۔ کبھی جو ضمیر کچھ کہہ دیتا ہے تو کہتے ہیں، بہت وقت پڑا ہے فرصت ملی تو غلطیوں کی معافی بھی مانگ ہی لیں گے۔ روٹھے دل منا ہی لیں گے۔ مگر شافی! ہر چیز کی حد ہوتی ہے، عمر کی حد ہوتی ہے۔ ہم یہ بھول کر اپنی جارح طبیعت کے حساب سے کرتے رہتے ہیں۔ نہیں جانتے عمر کی حد کہاں، کس لمحے پاؤں سے سمیٹ دی جائے...... معافی مانگنے کی مہلت ملے یا نہیں، معاف کرنے والے لب، معافی اچھال سکیں یا نہیں، دیکھنے والی آنکھیں، دل اور خاموش لب لے کر مٹی تلے جا سوئیں، کوئی نہیں جانتا۔ لیکن ہم پھر بھی معکوس راہوں پر دوڑتے چلے جاتے ہیں۔"

وہ مسلسل بولے جا رہی تھی۔ شافعہ نے اُسے بولنے سے روکا نہیں تھا۔ پھر جب مومنہ اندر کے سفر سے واپس لوٹی تب شافعہ نے اس سے نئی نوکری کی بابت سوال کیا۔

"کہاں اپلائی کیا تھا تم نے؟"

"روفیشن پنڈ اسٹائل کے بی بلاک پہ مسٹر شہریار کی ایڈورٹائزنگ کمپنی کے لئے اپلائی کیا تھا۔"

"کون شہریار عبدالرحمن......؟" اس نے ذہن پہ زور ڈالا اور مسکرا کر بولی۔ "تم نے اگر وہاں اپلائی کیا ہے تو سمجھو تمہیں نوکری مل گئی۔"

مومنہ رفیق نے بے بسی سے گہرا سانس لے کر کہا۔ "کہاں ملے گی نوکری؟ مجھے تو لگتا ہے، جا کر یہ سکینڈز میں بھی اب سفارش کے بغیر کوئی کام ہونا مشکل ہے۔ میں مقررہ دن پر انٹرویو کے لئے گئی تھی، لیکن پتہ چلا انٹرویو کینسل کر دیئے گئے ہیں۔ مسٹر شہریار کے منیجر نے کہا ان کے پاس بہت مصروف ہیں۔ میں نے بہت لجاجت سے ان سے بات کرنے کی درخواست کی تو بمشکل بات کروائی گئی مگر مسٹر

"شہریار صاحب......"
شافعہ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ عود کر آئی۔ اسے اپنی پہلی ملاقات یاد آ کر رہ گئی تھی اس لئے اس نے دھارس کو کہا۔
"وہ واقعی بہت روڈ ہیں۔ مگر مومنہ! جو لوگ روڈ ہوتے ہیں نا، مجھے لگتا ہے ان کے اندر کوئی کمی ضرور ہوتی ہے، جسے چھپانے کے لئے وہ اپنے گرد خول چڑھا لینے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ ویسے شہریار عبدالرحمٰن تو پہلی نظر میں آپ ان کی شخصیت کے متعلق بہت غلط رائے ضرور رکھ سکتے ہیں مگر مجھے لگتا ہے وہ بہت کیئرنگ ہیں۔ تمہارے پاس ان کا نمبر ہے؟"
مومنہ نے نفی میں سر ہلایا۔ شافعہ کنول نے کچھ سوچا پھر جیسے یاد آنے پر اپنا پرس کھول کر بیٹھ گئی۔ پھر بس منٹ بعد اس کے بیگ کی اہم چیزوں اور وزیٹنگ کارڈز میں سے شہریار عبدالرحمٰن کی کمپنی کا کارڈ برآمد ہوا تھا، جس میں لائن سے سب کے موبائل نمبر درج تھے۔ خصوصی کارڈ صرف خاص نوعیت کے اہم سمجھے جانے والے افراد ہی کو فراہم کئے جاتے تھے۔ مسز ہمدانی کے توسط یہ کارڈ اسے فنڈ ریزنگ کے سلسلے میں دیا گیا تھا، جو اس نے اب تک سنبھال کر رکھا تھا اور اب کام آ گیا تھا۔ اس نے موبائل نکال کر مومنہ کو نمبر ڈائل کر کے دیا تھا۔
"مجھ سے بات نہیں ہوگی ان سے۔ وہ بہت کرخت انسان ہیں۔"
"نہیں ہیں کرخت۔ بہت ڈیسنٹ بندہ ہے۔"
"آہا، آپ اتنی زیادہ جس کی طرف داری کیوں کر رہی ہیں؟ کچھ دال میں کالا ہے کیا؟" شافعہ کنول نے اس کے طنز پہ چپت لگائی تھی پھر اپنا ارادہ ملتوی کر کے کہا تھا۔
"بی بی صاحبہ! ہم دیکھتی ہیں رنگ، جو اسے آنکھ مت رنگ کہتے ہیں۔ یعنی ہم احمق ٹکٹ تلاش کلاس کے مخصوص ہیں۔ سو یہاں اپنا کوئی خیال نہیں ہے میں آ تھکا اور بالفرض ایسا نہ بھی ہو تو میں سب سے پہلے شیشہ دیکھتی ہوں اس لئے بہت سرعت سے جان سکتی ہوں کہ کتنے پانی میں ہوں۔ سو اگر کوئی میری تعریف کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو میں اس کے جھوٹ کا کاؤنٹ شروع کر دیتی ہوں اور واقعی غلط فہمیوں سے محفوظ رہتی ہوں...... اور پھر یہ مومنہ ایسی بھی تو ہے، ہم جیسے مڈل کلاس لوگ اپر کلاس میں جا بھی نہیں سکتے۔ پہلے تو یہ بات وہ ادری بھی نہیں ملتا۔ اگر عزت کے دھوکے میں یہ پروانہ ملنے کی امید ہو تو تب بھی ساری کلاس مل کر اس ایک اکیلے بندے کے پیچھے پڑ کر اسے مار مار کر اپنے خول سے باہر نکال دیتی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ رشتے اور تعلق داریاں بھی صرف اسی وقت نبھاتے ہیں یا استوار کرتے ہیں، جب انہیں اس سے کوئی منفعت کا امکان ہو۔ میرا خانہ خالی ہے، اس لئے مجھے ایسے دھوکے نہیں ہوتے۔"

ANCHAL.COM

مومنہ رفیق نے کچھ نہیں کہا تھا۔ شافعہ نے نمبر پریس کرتے کرتے جو ہاتھ روک دیا تھا، پھر سے موبائل کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ پھر طویل گفتگو کے بعد اس نے جب اسے کریڈل سے واپس آ کر اس کے سامنے آ کر اس کی نوکری پکی ہونے کی خبر شیئر کی تو مومنہ رفیق کا پہلا سوال تھا۔

"تم نے میرے لئے نوکری خیرات کی طرح تو نہیں مانگی تھی ماں؟ یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ شہریار صاحب کا لہجہ آج بھی میرے ساتھ اچھا نہیں تھا اور تم نے بھی میرے سامنے بات کرنے کے بجائے تنہائی کا سہارا لیا تھا۔ کیا واقعی تمہیں لگتا ہے مجھے خیرات کے علاوہ کوئی نوکری نہیں دے سکتا؟" شافعہ کے مسکراتے ہونٹ یکدم سنجیدہ ہو گئے۔ اس نے اس کے قریب آ کر کہا۔

"تم...... مومنہ! تم بہت عجیب ہو۔ بہت ہی عجیب۔ کبھی رشتوں، تعلق داریوں کے لئے تڑپتی ہو تو کبھی سب کچھ بیک قلم موقوف کر کے تنہا ہو جانے میں عافیت سمجھتی ہو۔ کبھی خدا کی مہربانی کے لئے سجدے کرتی ہو تو کبھی چڑ جاتی ہو اور کبھی اس خدا کی ذات سے فرار ہو جانے کی کوشش میں ہو۔ کبھی چاہتی ہو کوئی اپنائیت سے تمہارے راستے کے سارے کانٹے چن لے اور کبھی تم سارے کانٹے خود اپنے پیروں کی قسمت سمجھ کر اس زنجیر سے خود کو آزاد کرنے کو سب سے بڑا آزار سمجھتی ہو۔" شافعہ نے توقف کیا، پھر آہستگی سے کہہ رہی۔ "میرا خیال ہے مومنہ! اگر انسان قابل ہو تو پہلی بار اس کی سفارش کرنے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ قابل شخص کو پہلی بار کے بعد دوبارہ کسی مصنوعی سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ آگے کا راستہ طے کرنے کے لئے خود اس کے قدم منزل کھوج لیتے ہیں۔"

مومنہ نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی میں جیسے وہ اس کی بات سے متفق ہو کر چپ کی چپ رہ گئی تھی۔ شافعہ [illegible] انداز دیکھا تو خاموشی سے [illegible] بند کرنے لگی۔ پھر اپنے کام سے فارغ ہو گئی تو اپنے پرس سے ہزار کا نوٹ نکال کر اس کے بیگ میں ڈالنے لگی۔ مومنہ نے فوراً اس کا ہاتھ روک لیا تھا۔

"پلیز نہیں ماں! تم خود بھی تو بہت ساری ذمہ داریوں میں بٹی ہوئی ہو۔ ایک [illegible] کی تنخواہ بھی نہیں [illegible] تنہا پوری کرتی پھرے۔"

شافعہ نے خفگی سے اسے دیکھا، پھر زور دے کر کہا۔ "تم بھی ماں ہو مومنہ! کیا اولادوں سے وقت پڑنے پہ شیئر کرنے سے وہ ضائع ہوتا ہے؟" شافعہ نے مسکرا کر پھر اسے کندھوں سے تھام کر روکی۔ "کاش میں کبھی تمہارا محبت پہ ختم ہوا ایمان پختہ ہوتے دیکھوں۔ لیکن مومنہ! دنیا میں جو چیزیں اب نایاب ہو گئی ہیں، پہلے یہ اسی دنیا میں وجود رکھتی تھیں۔ مومنہ! ہم تو قبیلے کی کھوئی ہوئی نسل کی نمائندہ ہوں اس لئے مانتی ہوں محبت میں شرط کی کچھ قسم جذبات [illegible] سب غرض ہو کر واپس کہیں لوٹ جاتی ہیں۔ ایک عمر دنیا کی عمر ہے اور ایک عمر دل میں جینے کی عمر ہے۔ ہم اگر مرنے کے بعد بھی کسی کے دل میں زندہ رہتے ہیں تو ہم اس کی عمر اس کی سانسوں میں نئی طرح سے جی رہے ہوتے ہیں۔ جتنے زیادہ دل اتنی لمبی عمر، کیا سمجھیں؟" اس نے نوٹ اس کے پرس میں ڈال دیا، پھر [illegible] کا عندیہ دیتی گزرگاہ سے باہر

نشی چلی گئی۔ سومنات سے باہر گیٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔ پھر وہ کمرے میں پہنچی تو اس نے پرس کو دیکھا۔ واقعی اس کے حساب سے زیادہ رقم آ چکی تھی۔ نشی نے بہت زیادہ وقت تک کام دینے والا تھا۔
اس نے فکرمندی سے سوچا، پھر دل کو تسلی دی کہ وہ دوسرا رشتہ سے کہہ کر ایک پرائیویٹ مریضوں کی دیکھ بھال کی اضافی خدمات سرانجام دے کر اس رقم کو بخوبی ختم کرنے کی سعی کر سکتی ہے۔

بچے کے رونے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ وہ جلے پیر کی بلی کب سے کچن کے کاموں میں مصروف تھی۔ مگر دل تھا کہ بچے کی پہلی آواز سے لے کر اب تک کے مسلسل رونے کے ساتھ ساتھ وہ بھی سسک رہا تھا۔
"باجی! پھوپھو جی کیسے روئے جا رہا ہے۔ سدرہ بی بی صاحبہ پتہ نہیں کہاں ہیں لیکن آپ کہو تو میں بچے کو دیکھ آؤں جی؟"
کام کرتے کرتے ہاتھ اس التجا پر لمحہ بھر کو رکے پھر تیزی سے کہا گیا۔
"کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں آقا زادے کو چھونے کی۔ تمہیں یاد نہیں ہے، پچھلی دفعہ تم نے یہ جرأت کی تھی تو وہ دن تک بھوکی رہی تھیں۔"
بڑی سی چادر کا بکل ڈالے اس عورت نے بھیگی پلکوں سے رحم طلب نظریں سبزی کاٹتی عورت پر ٹکا دیں۔
"کام کرو کنیز! تمہیں اپنی پروا نہیں ہوگی لیکن مجھے اپنی جان بہت عزیز ہے۔ بڑے آقا صاحب اس بات پر جان سے بھی مار سکتے ہیں۔ وہ آقا زادے کے لیے ملازمہ بھی نسل تلاش کر کے لائے ہیں تو پھر وہ تمہیں کیسے چھونے دیں گے اسے۔ اپنے دل کو سمجھاؤ اور کام کرو۔ تمہیں تقدیر کا لکھا سمجھ کر خود سے اپنی حالت سے اور اپنی قسمت سے سمجھوتہ کر لینا چاہیے۔"
بکل میں کھڑی عورت کی آنکھیں ساون کی طرح برسنے لگی تھیں لیکن ایک خاموشی کا معاہدہ تھا زندگی سے سو وہ چپ کر کے اس لوری کے پاس سے ہٹ گئی تھی، جو بچے کو چپ کرانے کے لیے اس کی مالکن گا رہی تھی۔
"پہلے میں کتنا اچھا گایا کرتی تھی۔ اس آواز پر سب سے آگے ہوتی۔ لیکن اب تو لگتا ہے، گا بھی لوں تو رحم کے سوا کچھ نہیں رہا ہے۔"
اس نے پلو سے آنسو پونچھے اور سالن بنانے میں مصروف ہو گئی۔ پھر کھانے کی میز پر کھانا چن دیا گیا تو وہ بے مقصد چولہے کے آگے کھڑی ہو گئی۔ کوئی بھی ڈش دوبارہ منگوائی جا سکتی تھی اور بڑے آقا صاحب کو کھانا تازہ اور گرم کھانے کی اتنی عادت تھی کہ وہ اس سلسلے میں کسی ملازم کی معمولی کوتاہی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ گھر کے سارے ملازم ان کی عادت سے خوب واقف تھے اور ان سات سال رہ کر وہ بھی ان عادات سے واقف ہو چکی تھی۔ کھانا بخیر و خوبی جس طرح چنا گیا تھا اسی طرح اٹھا لیا گیا تھا اور اب وہ حویلی سے ملحق غلام گردش کے کھانے کے کمرے کے باہر کھڑی ملازموں کے بھی کھانا

کھانے جانے کا انتظار کر رہی تھی مگر وہ سیڑھی پر رک گئی۔ پیر کر وہ جانے کس سے سرگوشی سے باتیں کر رہی تھی کہ ایک دم بخت آواز گونجی۔

”کیا مری جا رہی ہے، سالن نکال کے دے۔ کتنی آواز دی، بہرے تھے کان تیرے، مگر تو عشق کی اندھی تو تھی ہی، بہری بھی ہے۔“

ڈش پہلے پلاؤ کی بچی گئی تھی۔ وہ خاموشی سے ڈھکن ہٹا کر سالن ڈش میں ڈالنے لگی تھی۔ پتیلی کا آدھا سالن بھی ختم ہو چکا تھا۔ خالی پانی جیلیاں اس کی بھوک کا منہ چڑا رہی تھیں۔ ملازم جس طرح جب جب کچھ لایا تھا اسی طرح واپس جا چکا تھا۔ وہ دن بھر کی تھکن سے چور وجود لیے رسوئی گھر سے اٹھی تھی۔ ابھی اپنے کمرے میں آ رہی تھی کہ کمرے کے باہر زنجیر بجی تھی۔

”ادھر کون آیا ہے؟“ اس کے کمرے کی تیسری ملازمہ نے بجلی ملازمہ سے پہلے حکم دیا اور وہ جو ابھی بیٹھنے کے بارے میں بھی نہیں سوچ پائی تھی کہ دروازہ کھولنے چل دی کہ بخت صورت کردار اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”آج بھی بھوکی رہ گئی ہے اماں؟“

”ہاں مگر مجھے اب بھوکے رہنے کی عادت ہو چکی ہے۔“ اس نے نرمی سے جواب دیا۔ مگر کردار نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

”دیکھو تو جتنا مجھے انکار کرتی ہے میرے اندر اتنی ہی بجا تیز جل اٹھتے ہیں۔ گو عزت داری سوتی تو کہاں [illegible] تھی۔ تو پہلے ہی جلتی ہے پھر کیوں انکار دکھاتی ہے؟“ کس میں کھڑی عورت کی آنکھوں میں دنبل سے انسو بھر آئے جیسے بخشید پڑ گیا۔ سامنے کھڑے مرد کا دن ہر روز کا وہی مطالبہ برقرار تھا۔

”مجھے معاف کر دے شیخ! میں بہت [illegible] ہوں۔ بہت رذیل ہوں۔ مگر دیکھ اب میں اور [illegible] نہیں کرنا چاہتی۔ دیکھ تجھے تیرے سوہنے رب کا واسطہ۔ وہ غلطی معاف کرنے والا ہے تو بھی میری غلطی معاف کر دے۔“

کردار کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اس کے چہرے پر [illegible] کا جھکاؤ بھرتے خباثت سے کہا۔

”نا انصافی [illegible] کے مالک ہو، تو یوں بھی نہ کر۔ ہم تجھے محبت سے پکاریں تو تجھے سوہنا رب یاد آنے لگتا ہے...... مت بھول تو [illegible] میری۔ مجھے معلوم ہے تیرا انکار میں اپنی جڑوں کو بھی [illegible] ستوں [illegible] ہے۔ ملازموں کی ملازم [illegible] تجھے کھلا دوں گا۔ آج پیٹ بھر کر کھانا کھا۔ [illegible] کسی [illegible] سے پالا پڑا تھا۔

اس نے چادر کو اپنے گرد اور کس کر لپیٹ لیا تھا مگر لگ رہا تھا کہ چادر سر بازار کھینچ لی گئی ہے۔

"مجھے نہیں کھانا تمہارا کھانا۔ مجھے نہیں کھانی روٹی۔" اس نے تیزی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی مگر کمدار اچانک ہی آگیا تھا۔ اس نے بوٹ دروازے میں رکھ کر دروازے کو بند ہونے سے روک دیا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی کمرے میں آکر اپنے بستر پر بیٹھ گئی تھی۔

"اماں! سنو یہ کمدار میری بات نہیں سن رہا۔ تم اماں اسے روکو۔ تم تو اس حویلی کی پرانی ملازمہ ہو اماں۔" اس نے اپنے قریب بیٹھی بوڑھی عورت کو جھنجوڑنے کی کوشش کی۔ تھوڑی سی ساری عمر گزرے کرنے کی وجہ سے وہ ان پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ جس عورت نے دروازہ کھولنے کا حکم دیا تھا وہ بوڑھی عورت نکالے لائے۔ وہ بوڑھی تھی۔ جس نے اس کے گلے سے دبایا تھا۔

"تم بھی جا اب کیوں رہی ہو؟ ہم جانتے نہیں ہیں کیا تیری پاکبازی کو؟ گھر سے بھاگی ہوئی عورت ہے تو۔ آوارہ ہے کیوں شرماتی ہو اور چھپتا جانا چاہتی ہو اتنا کیوں کر رہی ہے؟ لے جا شیخے! آج تو اتنا کا ... بول دے۔ میں بھی تھک گئی ہوں اس سے۔"

بخش میں کھڑی عورت کی آنکھیں پھیلنے لگی تھیں۔

"اماں! یہ دیکھو کیا ہونے جا رہا ہے؟ تم بھی تو کسی کی ماں ہو۔ کیا تمہیں بیٹی کی طرح نہیں لگتی ماں؟"

اس نے ایک بار کوشش کی۔ بوڑھے وجود میں حرکت ہوئی۔ بیکل بوڑھے کھڑی عورت کے جسم میں طاقت بھر آئی۔ بیٹی وہ بھاگ گئی ہے۔ مگر بوڑھے لب ہلے تھے اور اس نے سنا تھا۔

"لے جا شیخے! اسے لے جا۔ مجھے اس کا کیا وہ گھر ہی اچھا ہے۔ کیا سمجھتی ہے یہ خود کو یہ بار آئی ہے یہ کون تھی...... حویلی کی ملازم ہے یہاں لئے اس پر سب کا حق ہے۔ لے جا شیخے! میں بھی تو دیکھوں اسے کس بات کا گھمنڈ ہے۔"

"اماں!" اس نے پھٹی پھٹی آواز میں چیخنا چاہا۔ آج ماں کا یہ روپ دیکھ کر ہی کا کندھا اسے بہت بھاتا تھا۔

"مت رو یہ خانم...... میں تو صاحب سے شکایت کروں گی۔ میں تمہیں کیسے دے رہی ہوں۔"

گہرا اندھیری رات سے بھی اندھیرے دل میں اس کی آواز کہیں دب گئی تھی۔

پھر دوسری صبح، رات سے بھی کڑی تھی۔ وہ بستر پر بیٹھی ہوئی سسک رہی تھی مگر کسی کو اس کے رونے سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔

"چل اٹھ شاہ! بہت کام پڑا ہے۔" اسی بوڑھی عورت نے اس کے وجود کو ٹھوکر ماری تھی اور اس ٹھوکر سے اسے وہ لمحے یاد آ گئے تھے، جب بہت بے پروائی سے اس نے بھی اسی طرح محبت کو ٹھوکر ماری تھی۔

"محبت کو ٹھوکر مارنے والے کبھی نہیں پنپتے۔" اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا مگر وہاں اماں نہیں تھیں صرف ان کی نصیحت بھری آواز چکراتی پھر رہی تھی۔

صبح ہو چکی تھی مگر اسے لگ رہا تھا سیاہ منحوس رات ابھی تک کہیں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے بدقت اپنے وجود کو گھسیٹ کر غسل خانے کی طرف لے جانے پر آمادہ کیا تھا۔ پھر نہا کر کپڑے بدل کر جب وہ اپنے کمرے سے نکلی تھی تو اس کے قریب سے جمال کندھے اچکا کر گزرا تھا۔

"آج تیرا کھانا میرے ذمے ہے۔ وہ بھی شیخ جیسا مجھے بھی موقع دے تو تیری تمام عمر کھانا دوں گا۔"

اس نے اس پر تھوک دیا۔ مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا اس نے یہ تھوک زمین پر نہیں اپنے وجود پر تھوکا تھا۔ آسمان کی بلندی چھونے کے لئے اپنی نسائیت کی اس تذلیل پر وہ خود پر جتنا احتجاج کرتی، کم ہی تھا کم تھا۔ مگر قسمت میں یہی تھا...... اور بدقسمتی سے اب یہی اس کی زندگی کا مقدر تھا۔ وہ حویلی میں داخل ہو کر سیدھی کچن میں داخل ہوئی تھی۔ پھر چائے پکنے کے لئے رکھ کر وہ ٹیبل سیٹ کر رہی تھی، جب کچن کا دروازہ کھلا تھا۔ اس حویلی میں لانے والا وجود اس کے سامنے کھڑا تھا۔

نک سک سے درست، وجاہت کا بہترین نمونہ۔ اس کے ہونٹوں پہ ہر وقت ایک مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی، جیسے اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی ڈور تھی اور ان ڈوریوں کو حرکت دینے میں کمال مہارت رکھتا تھا۔

"تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے سجال؟" شرارت بھری مسکراہٹ سے سوال کیا گیا اور اس نے بکل میں منہ چھپا کر اپنی ہر تکلیف کو چھپانا چاہا مگر آنسو بہت تیزی سے پلکوں کی باڑ پھلانگ کر چلے آئے تھے۔

"چچ چچ چچ...... تم جیسی لڑکی روتے ہوئے بالکل اچھی نہیں لگتی۔ دیکھو سجال، اگر تم اس طرح روؤ گی تو مجھے لگے گا، میں اپنی رعیت کے لئے بہت ظالم حکمران ہوں۔ حالانکہ تم جانتی ہو، مجھ جیسا پاور فل، براڈ مائنڈڈ انسان اس پورے کرۂ ارض میں کہیں نہیں ہوگا۔"

اس نے انتہائی بے بسی سے اسے دیکھا، پھر بہت مشکل سے بول کر التجا سے بولی۔ "مہربانی کر کے شاہ صاحب! مجھے میرے بچے سے ملنے سے تو مت روکیں۔"

"تمہارا بچہ؟" سامنے کھڑے وجود نے اچنبھے سے اسے دیکھا، پھر جتانے والی کوشش سے بولا۔ "تمہیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے، تم یہاں کنیزوں کی کنیز ہو اور تم جیسی عورت ہمارا لاڈلا پر کوئی ذی حق کرے، یہ ہم

برداشت نہیں کر سکتے۔"

"مگر یہ بولی جھوٹا تو نہیں ہے شاہ صاحب! وہ میرا ہی بچہ ہے ناں، جسے آپ نے مالکن کی گود میں لے جا کر ڈال دیا۔"

سامنے کھڑے شخص کے چہرے پر بے ہودہ مسکراہٹ ابھری۔ یوں جیسے اُس کے کہے کی ساخت پر ترس سے ہنسے ہوں۔ پھر وہ اس کے قریب آ کر بولا۔ "تم سے جو تعلق تھا اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی۔ کچھ سالوں کے لیے تم اچھی لگیں اور بس...... مگر اولاد کی تربیت، اس میں، میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔ وہ ہمارا خون ہے۔ اسے تم جیسے کم ذات اپنا کہنے کی جسارت بھی کریں تو ہمارا خون کھول اٹھتا ہے...... ہمیشہ یاد رکھو تم ہمارے ملازموں کی ملازم ہو۔ یہی تمہاری حیثیت تھی اور یہی تمہاری اوقات۔"

آنسو بہاتی آنکھوں نے غصے سے خود وجود کو دیکھا اور پھر چلا کر بولی۔ "میری یہی حیثیت ہے، یہی اوقات ہے تو پھر کیوں ہر بار آپ میرے زخموں پر نمک چھڑکنے آجاتے ہیں؟"

ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ لمحہ بھر سے پیچھے مڑ گیا اور مردانہ ہاتھ کا بھرپور طمانچہ اُس کے چہرے پر ثبت ہو چکا تھا۔ پھر سامنے کھڑے آقازادے نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔

"آواز نیچی رکھ کر بات کیا کرو۔ مجھے ملازموں سے اس آواز میں بات سننا قطعی پسند نہیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ اس گستاخی کے باوجود تمہاری زبان ابھی تک سلامت ہے۔ ورنہ ایسے ملازموں کو میں اپنے خونخوار کتوں کے آگے ڈال دیا کرتا ہوں۔" وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر مزید بولا۔ "تمہیں دیکھنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ تم نے عجیب حال بنا رکھا ہے، پہلے تو پھر بھی قابل قبول لگتی تھیں، اب تو کسی چڑیل سے بھی زیادہ بری ہو گئی ہو۔ تم سے مجھے اب گھن آنے لگی ہے۔ ہمارے ملازموں کی ملازم بھی تکنے کے لائق نہیں رہی ہو تم...... اور تم مجھ سے زبان درازی کرنے کی کوشش کر رہی ہو؟ سنو لڑکی! تمہیں میں صرف اس لیے دیکھنے آتا ہوں، کہ جان سکوں کہ گھر سے بھاگنے والی لڑکیاں آخر کب تک اپنے الوژن سے باہر نہیں نکل پاتیں۔"

"الوژن......؟" اس نے سسکاری بھری اور سر جھکا لیا۔

کہانیاں، خوب صورت انجام والی کہانیاں پہلے اُسے کتنی پسند تھیں۔ سامنے ہیرو کہانی اسٹارٹ کرتی تھی، جس میں ساری دنیا داری سے پیچھے کی ہو جاتی، تب بھی دیر سے دیر تک کی ملن ہو کر رہتا، ان کہانیوں میں نہ سماج بیچ میں آتا ہے، نہ امیری غریبی...... اُسے خواب دیکھنا بہت پسند تھا۔ خوش انجام خواب، جس میں ساری تمنائیں اس کی رعیت کی طرح ہوتیں۔ سر جھکائے پورا ہونے کی حسرت کرتی ہوئی تمنائیں...... اور وہ مزے سے زندگی کو مسکرا کر دیکھا کرتی۔ اب زمانے میں شاید زندگی مسکرانے ہی کا دوسرا مطلب تھا، مگر بس چاہت کی نسبت سے شناخت کا بحران در آیا اور......

"تم...... تم پاگل تو نہیں ہو؟ یہ سینک رہی ہو یا اسے جلا رہی ہو؟" کان کے قریب مالکن کی آواز سن کر وہ ہڑبڑا کر چونکی اور دوسری ملازمہ نمک مرچ لگا کر صاحب کے کچن میں آنے کا قصہ لے بیٹھی۔

"تمہاری یہ ہمت......" مالکن کی سانسیں تیز چلنے لگی تھیں۔ ملازمہ کی دی گئی چائے کی پیالی مالکن نے اس کے چہرے پر اچھال دی تھی۔ وہ اف کی آواز نکال کر دوہری ہو گئی تھی۔ تب مالکن کے مخروطی ہاتھوں نے اس کے ان بالوں کو مٹھی میں بھینچ کر کھینچا، جن بالوں میں اس کی ماں کی جان بند تھی۔ اسے لگتا، کبھی کبھی ماں اس سے بھی زیادہ اس کے بالوں سے پیار کرتی ہے۔ اور کبھی جو ماں کنگھی میں بے دھیانی میں بھی کھینچ جاتی تو وہ واویلا کر کے آسمان سر پر اٹھا لیتی تھی۔ "ہائے میرے بال کیوں کھینچے؟ کتنا درد ہوتا ہے بال کھنچنے سے۔" اور آج وہی بال بے دردی سے کسی کی مٹھی میں بھینچے ہوئے تھے مگر چہرے کی جلن کے آگے یہ تکلیف اسے محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"کم ذات، اگر پھر تو نے ان سے بات کی یا ان کے سامنے آئی تو تیرے چہرے پر تیزاب ڈلوا دوں گی۔ جان سے مروا دوں گی۔ چل جا، سامنے سے اب حویلی میں کہیں دکھائی مت دینا۔" زور سے دھکا دیا گیا اور وہ گھٹنوں کے بل پوری قوت سے زمین سے ٹکرائی۔

"امی!" دل کی گہرائی سے اس نے ماں کو پکارا۔ مگر یہ حسین محبت کا احساس تو وہ خود پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ پھر کس منہ سے شکوہ کرتی، کس سے شکوہ کرتی۔

دوسرے مرے قدموں سے چلتی اپنے ملازموں کے کوارٹر کی سمت بڑھتی چلی گئی تھی۔ چہرے کی جلن اتنی تھی کہ چہرہ اٹھانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ اس نے یکدم سوچا، گھر میں ہوتے ہوئے ایسے حادثے پر اس کا کیا رد عمل ہوتا؟ اسے ماضی کے کتنے ہی واقعات یاد آ کر رہ گئے تھے، جس میں معمولی سی خراش چھری سے پڑنے پر یا کھانا پکاتے ہوئے بھاپ سے جلنے والی کلائی پر وہ سوں سوں کرتی پورے گھر میں ایمرجنسی نافذ کر دیا کرتی تھی۔ اماں بھی تو جیسے پریشان ہو رہی ہوتیں اور بھابیاں اس کی دل جوئی کرنے لگتیں اور بھائی کہتا، "اسے کسی اچھے کلینک میں لے جاتے ہیں اماں! گڑیا کو بہت تکلیف ہو رہی ہے شاید۔" پھر اماں لاکھ منع کرتیں مگر بھائی اسے بائیک پر بٹھا کر کسی نہ کسی کلینک لے ہی جاتا۔ پھر ڈاکٹر کے لاکھ تسلی دینے پر بھی وہ اسی پریشانی سے کہتا، "ڈاکٹر صاحب! کوئی فکرمندی کی بات تو نہیں ہے نا؟ دیکھئے، مجھے میری بہن بہت عزیز ہیں۔" ڈاکٹر مسکرانے لگتا، اس کے بھائی کی محبت پر اسے رشک سے دیکھنے لگتا مگر آج...... وہ آدھے وجود سے منہ پر گر گئی تھی۔

"میں نے جو کیا اس کی سزا پائی۔ میرے بھائی ہوتے کہیں تھے مگر مجھے صبر کرنے کی عادت نہیں تھی اور بے صبری کا کام شیطان کا کام ہوتا ہے۔ میں نے اماں کی نصیحتیں جوں جوں ٹھکرا کر ماریں توں توں زندگی نے مجھے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ جو ہوا میرے کیے گئے اعمال کا صلہ ہے۔ مگر میرے اللہ! تجھے تو بخشش کرنے کی اتنی عادت ہے کہ میرے گناہ تیری معافی کے آگے ایسے ہیں جیسے سمندر کے جھاگ کے کچھ

نہیں...... کیا یہ عذاب ختم ہوگا بھی؟ کیا کبھی میں اس جہنم سے نکل سکوں گی......؟" اس نے تکیے پر زور سے ہاتھ مارا۔ کے رونا آگیا پھر تکلیف کی شدت کے باوجود رات بھر کے جاگے ہونے کی وجہ سے نیند میں کب پناہ ڈھونڈ لی اسے خبر نہیں ہوئی۔

❁❁❁

"اماں! آپی بہت روتی ہے؟ آپ بہت دل برداشتہ لگ رہی تھیں؟" زہرہ جنید نے گرل سے پار صحن میں کپڑے سوکھنے ڈالنے والی امی کو سمجھنے کی کوشش کی۔ مگر زہرہ جنید جانتی تھی کہ ماں کا غصہ جاتا رہا تھا وہ ان کے چہرے کی پریشانی کسی طور نظر انداز نہ کرسکی۔

شاکرہ بانو نے بیٹی کو دیکھا پھر بے چارگی سے بولیں۔ "پتہ نہیں۔ لیکن اس کے بنا یہ جہان سے تنگی سی نہیں ہے۔ لاابالی وہ کم عمری کی تھی وہ۔ جانے اب کہاں کہاں کی خاک چھان رہی ہو گی جانے کس حال میں ہوگی۔ کتابوں سے نیا ہوا اس نے زندگی پڑھی کب تھی، جانے زندگی کے ہاتھوں خوار ہو رہی ہوگی۔"

زہرہ جنید کو لگا اب مزید چائے کا گھونٹ حلق سے اتارنا دوبھر ہوگا۔ وہ کپ کو ایک جانب رکھتی ہوئی ماں تک آ کر رکیں پھر لجاجت سے بولی۔

"وہ جہاں ہوگی خوشی سے ہوگی۔ تبھی تو اس نے باپ کی عزت کا پاس نہیں کیا گھر سے نکلنا سمجھا۔"

گلے میں آنکھوں کے آنسو روکے ہوئے تھے۔ تبھی شاکرہ بانو نے بیٹی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دل گرفتگی سے پوچھا تھا۔

"تم تو دنیا کو اچھی طرح جانتی ہو۔ تم بتاؤ کیا گھر سے نکلی ہوئی لڑکی بہت خوشی سے زندگی گزار سکتی ہے؟"

زہرہ جنید نے آنکھیں بھینچ کر لبوں پر ہنسی بکھیر کر ماں کو دونوں کندھوں سے تھام کر دلاسے کی جملہ تک نہ کہا۔

"کاش کہ مجھے اماں آپ کو سمجھانا آتا۔ بہت اچھا ہو جاتا کہ میں نے آپ کو بتایا کیوں رکھا۔"

اماں جان کے آنسو پلکوں کے کنارے نکل گئے۔ "بیٹی بس کرو، بیٹھو بہت ہوگیا۔" پھر آہستگی سے بولیں۔ "تمہاری جنید سے دوبارہ بات ہوئی زہرہ؟"

زہرہ جنید جان کے لئے زندگی ہارے ہوئے لگنے میں مصروف تھیں، یکدم خشک آنکھوں سے ماں کو دیکھنے لگیں۔ پچھلے چھ ماہ سال سے وہ جس جہنم میں پھنسی تھیں، ابھی تک نکل نہیں پائی تھیں۔

جنید ہر ہفتے بچوں سے ملنے آتے تھے، انہیں باہر کھانا کھلانے لے جاتے تھے مگر ماں سے کئے وعدے پر اپنے کاربند تھے کہ ابھی تک وہ بچھڑے دوستوں کی طرح مل پانے کی حسرت کرنے میں بھی ناکام رہے تھے، چہ جائیکہ شریک سفر کی طرح ایک دوسرے کو خوش آمدید نظروں سے دیکھتے۔

”تم نے بتایا نہیں، جنید نے ابھی تک تمہارے معاملے کا کوئی حل نہیں نکالا؟“ شاکرہ بانو آج اس موضوع سے ہٹنا نہیں چاہ رہی تھیں اور زہرہ جنید چاہتی تھیں وہ یہ موضوع بھول جائیں۔ پھر پہلے اس سے کہ وہ کوئی نئی بات کہہ کر اپنے اس منصوبے میں کامیاب ہو جاتیں، اچانک ڈور بیل بجی۔ زہرہ جنید تیزی سے اٹھیں۔ پھر پانچ منٹ بعد وہ سلمان ارسلان کے ساتھ لوٹی تھیں۔ سلمان، عارفہ کو کالج چھوڑنے گیا تھا۔ کچھ جواب نے ذہنیہ کے بعد عارفہ کے مستقبل پر قدغن لگانے کی کوشش کی تھی مگر اس نے نہایت سرد مزاجی سے یہ آپشن ٹھکرا دیا تھا اور تلخ لہجے میں بولا تھا۔

”میری غلطی کہاں تھی، میں جان گیا ہوں۔ اس لئے تاریخ آپ کبھی خود کو دوبارہ دہرانے نہیں دیں گی۔ عارفہ کو تمام سہولت، عیش، آرام دوں گا میں کہ پھر اس میں ذرہ جیسی بیزاری پیدا نہیں ہو سکے گی۔ وہ دولت کے پیچھے گھر چھوڑ گئی تھیں ماں، میں نے اس کے جانے پر گھر میں اس کی جگہ دولت سے پُر کی، اب ہمیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں ہے۔“

شاکرہ بانو ان باتوں پر بہت کلستی تھیں، لیکن آج......

”کوئی خاص بات، تم کچھ پریشان لگ رہے ہو، کیا رات کو سو نہیں سکے تھے؟“ شاکرہ بانو نے بیٹے کی آنکھوں کی سرخی سے جانچی کی، جبکہ وہ چائے کے لئے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے نرمی میں بولا۔

”کوئی خاص بات نہیں تھی اماں! بس ایک اسٹوری پر کام کر رہا تھا اس لئے رات دیر گئے سو سکا تھا۔“

شاکرہ بانو نے سلمان ارسلان کو اتنی توجہ سے دیکھا جیسے انہیں اس کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔ ”تم ماں سے جھوٹ نہیں بول سکتے، تم جانتے ہو یہ بات۔ پھر کوشش ہی کیوں کرتے ہو؟“

سلمان ارسلان نے سپ لیتے ہوئے شاکرہ بانو کو دیکھا، پھر گھمبیر لہجے میں بولا۔ ”آپ کا بیٹا ہسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ اگر میں یہ خبر دوں گا تو آپ ہر صورت اُسے ملنے جانے کی ضد کریں گی اور یہ میں نہیں چاہتا کہ آپ وہاں جائیں۔“

شاکرہ بانو نے بمشکل پلیٹ میں چمچ رکھا تھا پھر خفگی سے بولی تھیں۔ ”تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے اب تک چھپا کر رکھی، میں یہ مان ہی نہیں سکتی کہ تمہیں شہریار کے ہسپتال ایڈمٹ ہونے کی اطلاع آج ہی ملی ہوگی۔“

وہ کچھ نہیں بولا تھا اور شاکرہ بانو تیزی سے اٹھی تھیں۔ "مجھے شہریار کو دیکھنے ہسپتال جانا ہے۔" اپنے کمرے کی طرف جاتے سلامہ ارسلان کو انہوں نے خاص جتا کر کہا اور اس نے مڑ کر خفگی سے کہا۔

"پھپھو نہیں، کیا جادو کر دیا ہے اس نے آپ پر کہ اس کی وجہ سے ملنے والے دکھوں کی ایک لمبی رات کاٹنے کے باوجود آپ کا دل اس کے لیے نرم ہے۔"

شاکرہ بانو نے بیٹے کی طرف دیکھا پھر تحمل سے بولیں۔

"مجھے حیرت ہوتی ہے، وہ بات جو ڈاکٹرز نے وقتی طور پر تمہاری ریکوری میں مشکل ڈالنے کے سبب تم سے دور کی تھی تم نے ٹھیک ہونے کے باوجود خود کو اس سے اسی طرح دور کر لیا جیسے کبھی کوئی میل ہی نہیں تھا۔"

سلامہ ارسلان کے چہرے پر غصہ آیا تھا مگر مجھ پر کیا پھر وہاں کے قریب آگے بڑھا تھا۔ "آپ غلط سمجھتی ہیں کہ میں شہریار کو اس کے دکھ کا سبب سمجھ کر اس سے دور ہوا ہوں۔ وہ اصل زندگی کے اس سچ سے میں نے صرف ایک ہی بات سیکھی ہے غریب ہونا دنیا کا سب سے بڑا الزام ہے اور پیسہ دولت کے بل پر امراء ورکرز کی اولادوں سے دوستیاں گانٹھتے ہیں ہاں تو یہ در اصل آپ کی غربت سے حظ لینے کے لیے ایسا کرتے ہیں ساتھیں آپ سے، آپ کی پرواہ اور ضرورتوں سے کوئی غرض نہیں ہوتی صرف اپنی حاشیہ برداری کے لیے انہیں لوگ چاہیے ہوتے ہیں، جو ان کی جے جے کار کریں، ان کے بوٹ چاٹنے کو زندگی کا ایمان سمجھیں۔ مگر میں اس چیز سے نکل آیا ہوں۔ اب میں جانتا ہوں زمانے کو کس طرح اپنے لیے موڑا جا سکتا ہے۔ زمانے کے دل پر کیسے حکمرانی کی جا سکتی ہے اور ہو کر لو امراء کی محفلوں میں ان کی بخشوں پر ہاتھ رکھ کر کیسے حالات و واقعات کا رخ موڑ کر عزت کروائی جاتی ہے، میں یہ جان چکا ہوں۔ اس لیے سرمایہ دار طبقے سے دوستیاں گانٹھنا اپنی شان نہیں سمجھتا۔"

شاکرہ بانو نے پر ہاتھ رکھے بیٹے کی لمحہ بہ لمحہ ہونے والی تبدیلی کو ایک مکمل شکل میں دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ لیکن اس وقت وہ جس مقام پر تھا اسے کسی اور سمت موڑا نہیں جا سکتا تھا اس لیے انہوں نے بحث ضروری نہیں خیال کی تھی اور چادر پہننے کے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ چلی گئی تھیں اور زہرہ جبیں، جو اتنی دیر سے ماں بیٹے کی گفتگو میں صم بکم بیٹھی ہوئی تھیں، یکدم سلامہ ارسلان کے قریب آ کر فکرمندی سے بولی تھیں۔

"شہریار کو ہوا کیا ہے؟ دو تین دن پہلے وہ مجھے ایکسپو سینٹر میں ملا تھا اس کے کسی دوست کا موبائل اسٹال تھا وہاں۔ اس سے مجھ سے تو وہ بالکل ٹھیک لگ رہا تھا، پھر یکایک....."

سلامہ ارسلان نے زہرہ جبیں کو دیکھا پھر سنجیدگی سے بولا۔ "انجائنا پیکٹورس ہے جو سات سال پرانا مرض ہے اس کا۔" کچھ رک کر پھر طنز سے بولا "بھائی لوگ عیش و آرام میں ہوں تب بھی دل تھامے ہسپتال کی سیر کرنے نکل پڑتے ہیں...... ان سے ملنے جاتے ہیں اب سخت جانی سے ہر واردات دل پر سہہ کر بھی استقامت سے کھڑے رہتے ہیں۔"

زہرہ جبیں بیگم جو بیٹی تھیں ان کا دل کدم شہریار کے لیے مسانے سے بکھر گیا تھا اور شاکرہ بانو جو چادر بچھی کی باہر آئی تھیں دونوں بہن بھائی کی بات کرتے دیکھ کر ان کی باتوں میں الجھی ہوئی تھیں خاصی حیراساں ہو گئی تھیں۔

"آخر بچپن میں بچہ پال لیا ہے اس بچے نے؟" اس نے بہلا جملہ کہا پھر زہرہ کی طرف دیکھ کر آہستگی سے بولیں۔ "کیا تم مجھے ہسپتال لے جاؤ گی؟ تاکہ میں بھی اپنے بھائی کی طرح بے حسی دکھانا چاہوں گی؟"

زہرہ جبیں نے کار کی چابیاں اٹھائی تھیں۔ پھر شاکرہ بانو کے ساتھ سیڑھیاں اترنے سے پہلے انہوں نے شاکرہ بانو کو چپ کرنے کی جتنی کوشش کی تھی اس کوشش کا کوئی کام نہ دکھا پایا تھا۔

"جب تک اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں گی اپنے بچے کو سکون نہیں ملے گا مجھے۔"

شاکرہ بانو نے اس جملے کے بعد خاموشی اختیار کر لی تھی اور کار فراٹے بھرتی ہسپتال کی سمت دوڑی جا رہی تھی۔

AANCHAL.COM.PK

❀❀❀

ملازم نے کوئی تیسری بار اس کے کمرے کا لاک کیا تھا مگر جواب میں وہی خاموشی طاری تھی۔ ملازم نے فکر سے ہر طرح سے پکارا۔ تب ہلکی سی کمرے میں آواز ابھری۔

"کون ہے؟"

"چھوٹی بی بی نجم صاحبہ آپ کا کھانے پر انتظار کر رہی ہیں۔" ملازم نے ڈرتے ڈرتے جملے دہرائے اور اندر سے آواز ابھری۔

"انہیں کہہ دو مجھے بالکل بھوک نہیں ہے وہ اکیلے کھا لیں۔"

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ ملازم پلٹا ہوا ڈائننگ […] کی طرف بڑھتا چلا گیا مگر پہلے اس سے کہ کچھ کہہ پاتا ان کی نظر […] صاحب پر گئی جو […] لگے تھے۔

"کیا بات ہے تم […] کی طرح کیا کھانے سامنے آن کھڑے ہوئے ہو؟" […] صاحب نے حسب توقع سے سوال کیا […] ہو گیا۔ نجم صاحبہ نے ان کی مشکل آسان کی اور بولیں۔

"کیا بہادری ہے زرش؟ تم اسے اٹھانے گئے تھے نا؟"

"کیا اسے اٹھانے گیا تھا؟" […] صاحب کے چہرے پر چنگیزی غصہ ابھر آیا۔ "تمہیں کتنی بار کہا ہے میری بیٹی کو مت بلایا کرو، مگر تمہارے ڈھیل […]"

صاحب کا پارہ ہمیشہ کی طرح ہائی ہو گیا تھا۔ ملازم نے منظر عام سے ہٹ جانے میں عافیت سمجھی تھی اور صاحب کی نظریں کھا جانے والے انداز میں بیوی پر جمی ہوئی تھیں۔ "میں نے تم سے کچھ کہا ہے ہاں، تم کیوں بے بی کی حماقتوں میں مخل ہوتی ہو؟"

"بے بی...... وہ اب بے بی نہیں رہی ہے آغا صاحب! وہ اب پچیس سال کی لڑکی ہے۔ مگر آپ سمجھتے ہیں ابھی تک وہ باربی ڈول اور فیری ٹیل سننے کی عمر سے باہر نہیں نکلی۔ آپ ہمیشہ باہر رہتے ہیں، گھر آتے ہیں وہ ایک ہفتے کے لیے۔ آپ کو کیا پتہ؟ آپ کے پیچھے آپ کی اولاد کیا کیا کرتی پھرتی ہے۔"

"کیا کیا کرتی پھرتی ہے، میں بھی تو سنوں۔" انہوں نے کپ ہاتھ سے رکھ دیا تھا اور بیگم عمرانی نے فوراً شکایتی دفتر کھول لیا تھا۔ غصے سے جھنجھلانے کے باوجود لہجہ سنبھال کر بولی تھیں۔

"کامنی کی طرح زرش کی بھی زندگی پارٹی، فنکشن کلب تک ہی محدود ہو گئی ہے۔ پانچ سال سے وہ یہی زندگی گزارنے کی عادت ہو گئی ہے۔ صبح منہ اندھیرے گھر آتی ہے اور کبھی کبھی گھر آتی ہی نہیں ہے۔ کچھ پوچھوں تو کہتی ہے، ایسی ممبر ہے مس لائف انجوائے کرنے کی۔ آپ کے دیے گئے فلیٹ میں رہتی ہے، غیر مردوں سے سلام دعا کرتی ہے۔ مجھے تو اس کے طور طریقے بھی اچھے نہیں لگتے۔"

آغا صاحب نے توجہ سے سنا مگر رد عمل، وہ بہت حیرت ناک تھا۔ سخت مزاج عمرانی صاحب قہقہہ لگا کر ہنسے جا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا یہ باتیں جن پر وہ خود کڑھتی رہتی ہیں، ان کے شوہر کے علم میں آئیں تو شاید ان کا مزاج بھی مکدر کر دیں گی۔ مگر یہاں رد عمل بہت وکھرا تھا۔

"آپ کو میری باتیں ہنسنے کے قابل لگ رہی ہیں۔ حالانکہ بیٹی کی دفعہ میں آپ دھوکا کھا چکے ہیں۔"

"بھاڑ......" مسٹر عمرانی نے لاپروائی سے پھر سے چائے کا کپ لبریز کیا تھا پھر جتانے کو بولے تھے۔ "زرش اور نایاب دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نایاب کو آسمان کی جگہ زمین پسند تھی۔ مگر زرش، اسے آسمان سے کم کوئی چیز رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ میں جانتا ہوں اپنی بیٹی کو...... تمہیں کیا پتہ شہرت کا نشہ کیا ہوتا ہے۔ وہ ماڈلنگ میں آنا چاہتی ہے کہ مجھے اس پر بھی کبھی کبھی بہت فخر ہوتا ہے۔ رسالوں میں اس کی تصویریں، انٹرویو، یہ سب بہت انٹرسٹنگ ہے میرے لیے۔"

بیگم عمرانی نے شوہر کو جواب طلب نظروں سے دیکھا اور بڑبڑائے لہجے میں بولیں۔ "اتنے سال ہو گئے مجھے آپ کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے مگر میں ابھی تک آپ کو نہیں سمجھ سکی۔ آپ کی بیٹی کے انٹرویو چھپے گئے ہیں، اس کی فیشن رسائل کی تصویریں آپ کو آرٹ دکھائی دیتی ہیں۔ راتوں کو گھر سے غائب ہونا، لائف انجوائے منٹ کے زمرے میں اپنی تمام بد صورتیوں کو چھپا لیتا ہے۔ لیکن عمرانی صاحب! یہ

ٹھیک نہیں ہے۔ ہم یورپ میں نہیں جی رہے ہیں، ہم پاکستان میں رہتے ہیں۔ یہاں باپوں کی ذمہ داری بچوں سے جواب سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔"

"ہاں...... بس کردیا ہے نہ مشکل معاشرے کی باتیں۔ مجھے اچھی نہیں لگتی ہیں یہ فضول باتیں۔ زندگی کو میں اپنے طریقے سے جینا چاہتا ہوں۔ سو مجھے اور میرے بچوں کو زندگی نبھانے کرنے دو اپنا گفت تم اپنے پاس رکھو۔ مولوی شکیل کی بیٹی ہو تو یہ تو اسے صرف اپنے تک محدود رکھو مجھ پر یا میری بیٹی پر اسے مسلط مت کرو۔"

نجمہ عراقی نے پھر کچھ نہیں کہا تھا مگر ان کے جانے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں گئیں تو جیسے کسی نے ان کے پیر جکڑ لیے تھے۔ یہ آواز...... کتنی پیاری تھی یہ آواز جب لحن سے قرأت کرتی تو اس کا دل اندر ہی اندر جھومنے جاتا۔ مگر ایک دن یہی آواز اس کے پیچھے کتنی دور تک آئی تھی۔

"مت محبت کے دھوکے میں آ۔ بیٹا کا اچھا نہیں۔ تیرے باپ کی بے عزتی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے، وہ تجھے ایک اشارہ دے تو اس کے لیے گھر بار چھوڑ دے گی۔ وہ تیرے باپ پہ ہنستا ہے کہ اس نے اپنی بیٹی کی کیا تربیت کی ہے کہ وہ جب چاہے اس تربیت کو سوالیہ نشان بنا سکتا ہے۔ وہ اچھا لڑکا نہیں ہے۔"

"اماں! مجھے بس شادی کرنی ہے تو عراقی سے۔ بس۔" کہہ چکی تھیں وہ ان سے۔ انہوں نے دو ٹوک لہجے میں کہا تھا۔ ابا نے اس کی شادی عراقی سے کردی تھی۔ مگر دہلیز سے پار جانے سے پہلے کہا تھا۔

"آج کے بعد تیرا میرا کوئی رشتہ نہیں۔ تو ہمارے لیے مرگئی ہے۔"

انہوں نے عراقی کے ساتھ گھر سے جاتے ہوئے غرور و انبساط سے دیکھا تھا۔ انہیں ابا کی بات پر کوئی دکھ نہیں ہوا تھا، بڑی اماں کی بات پر بھی دل نہ دکھا۔ دین والی آنکھوں نے ان پر اثر کیا تھا۔ انہیں لگتا تھا آج وہ خوش ہیں تو زمین آسمان خوش ہیں۔ انہوں نے محبت کی تھی، محبت پائی تھی۔ یہ سب سے مسرت آمیز بات تھی۔

مگر شادی کے تیسرے دن عراقی کہہ رہے تھے۔ "اوب گیا ہوں میں تم سے۔ مجھے بہت دیر تک کوئی وجود اٹریکٹ نہیں کرتا۔ تم بڑی پردہ دار بڑی دلیر والی تھیں، تبھی یہ شادی کا ڈھونگ بھی کرنا پڑا۔ اگر باتوں سے، دولت کی چمک سے ہی قابو آجاتی تو یہ ہمیشہ کے لیے زندگانی چھوٹی۔ اب بتاؤ، میں کیا کروں تمہارا؟"

انہوں نے چونکتی ہوئی دلہن کی ساری شوخی کا پانی آنکھوں میں مرتے پایا تھا۔ پھر بڑی لجاجت سے بولی تھیں۔ "جو جام دیا ہے وہ کبھی مت چھینئے گا۔ میں آپ کے کسی شوق میں حارج نہیں ہوں گی۔"

اور آج اتنے سالوں بعد بھی وہ وہیں کھڑی تھیں۔ بس کسی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے جیسے گھر کا کھانا میسٹ کرلیا جاتا ہے۔ عراقی کی زندگی میں بھی ان کی یہی اوقات تھی اور آج وہ اپنی دوسری بیٹی کے لیے

بھی بے راہ رو ہونے کے باوجود عظمیٰ مشتعل سے زیادہ کچھ نہیں تھیں۔

"ہاں! مجھے آپ کے خاندانی جینز نے جکڑ رکھا ہے۔ کوئی ہے جو مجھ میں دن رات رہتا رہتا ہے...... کوئی ہے، جو کہتا ہے مولوی عظمیٰ کی بیٹی مولوی بجارت کی پوتی ہو کر تم نے جوا سیٹ پار کرنے والوں کے ساتھ کیا، وہی وقت تمہیں لوٹا رہا ہے۔ ایک بیٹی ہے سوسائٹی پارٹی کی طرح، جسے اس کا شوہر زرنٹ دانتا تھا اور ایک بیٹی تھی، وہ کہیں اپنی پسند کی شادی کر کے زمانے کی بھیڑ میں کھو گئی تھی۔ اس نے تو ان کی طرح اجازت لینا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا اور اس کے مرنے کے دو سال بعد انہیں پتہ چلا تھا کہ وہ مر گئی ہے۔ بیٹی کے مرنے کی خبر دو ہائی سے آپ کی طرح نہ پہنچی تھیں اور ان کے شوہر نے نخوت سے کہا تھا۔

"مر گئی ہے تو مرنے دو۔ مجھے ایسی اولاد نہیں چاہئے جس نے میرا امو زور بار ایک شخص سے شادی کی، جس نسل کے نام تک بھی نہیں پالے۔"

وہ آرام کرسی پر بیٹھ کر بے مصرف جھولے لگی تھیں اور وقت مٹی میں فرشتہ اجل کی طرح ان کی طرف، کچھ کے خاموش گزر رہا تھا۔ ان کی زندگی کا بدن سرد تھا اور سانسیں کسی نے کھینچ کر رکھی تھیں۔ یہ درد مسلسل کی طرح تھی۔ مگر وہ اس سے رہائی نہیں چاہتی تھیں۔ انہیں لگتا تھا کہ خدا کی سزا دنیا میں ہی کچھ کٹ جائے تو اچھا ہے۔ گناہوں کا بوجھ کچھ تو کم ہو جاتا ہے۔

لیکن کیا ایسا ممکن تھا؟...... کچھ دل تھے، جو ٹھنڈک میں اپنے خاک میں مل کر خاک ہو چکے تھے۔ وہ اب بے ربط سے پوچھتے تھے۔ "کیا ایسا ممکن ہے دل دکھانے اور معافی مانگے بغیر کسی بھی سزا اور اس ذہنی اذیت سے نجات مل جا سکتی ہے؟" وقت ایسے ہر لمحے میں خاموش رہا تھا اور یہی خاموشی مسلسل ان کی سزا بنتی جا رہی تھی۔
انہوں نے آنکھیں موند لی تھیں اور خود کو وقت کے حوالے کر دیا تھا۔

❀❀❀

شہریار اب پہلے سے بہت بہتر تھا۔ عدیل بھائی اور عاصف بیگ پاپا کے ساتھ ان کی دلجوئی کے لیے ہر وقت موجود تھے۔ سوچ چیف آپ ڈاکٹر صمدانی آئے۔ آج ہسپتال جانے سے پہلے اس کے کمرے میں آئے تو وہ پہلے سے زیادہ فریش نظر آ رہا تھا۔ ڈاکٹر صمدانی کل دن بھر کی اس کی رپورٹس پڑھ رہے تھے۔ وہ انتہائی منہمک تھے، جب اس نے انجیکشن کی بات کی تھی۔
ڈاکٹر صمدانی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر آہستگی سے بولے تھے۔ "ہم چاہتا ہوں تمہیں لگتا ہے تم چار دن میں فٹ ہو چکے ہو۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ تب اچانک انہوں نے آہستگی سے کہا تھا۔

"زمین پہ پیر رکھ کے واپس دم تک دو قدم چلنا دور کی بات ہے۔ لیکن دم ودمی اور ندسوں کا ساتھ دے پانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔"

شہریار نے ان کی طرف دیکھا، پھر اپنے اصل لہجے میں بولا۔ "آسان کام میری زندگی میں کبھی دستیاب ہی نہیں ہوسکے۔ مشکل کام کرنا میری عادت بن چکے ہیں اس لئے پلیز! آپ میری درخواست پہ غور کریں۔"

ڈاکٹر ہمدانی نے اس سے متفق ہونے کی کوشش کی، مگر پھر بھی ایک ڈاکٹر کی طرح ہی سخت لہجہ اپنا کر بولے۔ "تمہارے نئے سرے سے ٹیسٹ ہوں گے۔ زمین پہ پیر رکھ کے بھی چلتے ہوئے تمہاری فٹنس بہتر دیکھیں، دوبارہ سے ساری تھراپی مانیٹرنگ ہوگی۔ جو بھی رزلٹ تمہارے حسب خواہ نکلا تب ہی میں کوئی فیصلہ لے سکوں گا۔"

شہریار نے خوش دلی سے ان کی پیشکش قبول کر لی۔ عاطف بیگ، جو ان دونوں کی باتوں کا خاموش سامع بنا الجھی جانے کی کیفیت میں خاموشی سے سن رہا تھا، اس کے بیڈ کے پاس آنے پر فوراً اس کے قریب پہنچا تھا۔

"انکل! آپ کو لگتا ہے اس وقت اس کا چلنا بہتر رہے گا؟"

ڈاکٹر ہمدانی نے کندھے اچکائے تھے، سنجیدگی سے بولے تھے۔ "میں نے تو ایک آپشن رکھا ہے۔ فیصلہ تو اس کا ہے۔ سو بس دیکھنا یہ ہے کہ اس کی باڈی کی برداشت کتنی درست رہے گی۔"

عاطف نے فوراً ہی خیال سے باز رہنے کا عندیہ دیا، گو وہ مطمئن نہیں۔

ڈاکٹر ہمدانی کے آنے کی اطلاع پہ ڈاکٹر سہیل بھی کمرے میں چلے آئے تھے۔ انہوں نے ماحول دیکھا تو ڈاکٹر ہمدانی کو سرعت سے مخاطب کیا۔ "سر! کیا اس وقت یہ ٹیسٹ بہتر رہے گا؟ مسٹر شہریار کی کنڈیشن کیا اس کی اجازت دیتی ہے؟"

عاطف بیگ نے گھبرا کر شہریار کو دیکھا اور اس نے بنا ٹائم دیے ڈاکٹر سہیل کو مخاطب کیا۔ "میری کنڈیشن جو بھی ہو، بہتر ہے اب میں مزید ہسپتال میں نہیں رہ سکتا۔ میرے بہت سے ضروری کام پینڈنگ میں پڑے ہوئے ہیں اس لئے مجھے یہاں سے جانا ہی ہے۔"

ڈاکٹر سہیل کچھ نہیں بولے تھے اور ڈاکٹر ہمدانی نے اپنی نگرانی میں ان کے ساتھ اس کے باقی ٹیسٹ لینے شروع کر دیے۔ بلڈ پریشر رپورٹ، کولیسٹرول رپورٹ اور دیگر ٹیسٹ بھی کرائے گئے تھے۔ سارے نے

ڈاکٹر صمدانی کے کالج فیسٹ کے لیے تیار ہونے کے لیے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی تھی۔ عاطف بیگ نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی تھی مگر اس نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے اس محبت سے اسے باز رکھا تھا۔ وہ اس وقت پوری طرح اپنے آپ پر انحصار کرنا چاہتا تھا سو بہت دھیمے قدموں سے کمرے میں چلنے لگا تھا۔ ڈاکٹر صمدانی نے ہاتھ کو پیچھے کرتے رکنے کا اشارہ کیا تھا۔ عاطف بیگ اس کے چہرے کی شادابیت سے پریشان ہو رہا تھا اور ڈاکٹر سہیل ڈاکٹر صمدانی سے اس کے سلسلے میں اپنی میڈیکل ہسٹری کی بابت گفتگو میں محو تھے۔ وہ ابھی آ کر اپنے بیڈ پر بیٹھ چکا تھا۔ وزن نے اپنی تیزی ماہرانہ رکھا تھا۔ اس کی بہتری نہیں ہے۔ تب تک نہیں تھیں۔ جو کچھ بھی تھا اس میں زمانے سے قصہ کمزوری کا عمل دخل تھا۔ ڈاکٹر صمدانی نے ماہرانہ کر دیا تھا اب وہ بیٹھ رہے تھے۔ انہیں سمجھ کر سے بھی جانچ کرائی گئی تھی۔ سو زلزلہ ماؤف کرتے ہوئے انہوں نے اسے یہاں تقریباً منتقل ہونے کو کہا تھا۔

"تمہاری یکسوئی حیرت انگیز ہے۔ ٹھیک ہے میرا خیال ہے تم چار دن میں پوری طرح بیدار ہو جاؤ گے کیونکہ سپرد ہو چکے جاؤ گے۔ لیکن یاد رہے اس کے باوجود ہفتے چیک اپ کے لیے تمہیں یہاں آتے رہنا پڑے گا اور وہاں میں کوئی بے پرواہی نہیں ہوگا۔"

اس نے سر ہلا کر ہامی ہر حالت میں لیٹ کر ان کی بات سے متفق نظر آنے کی کوشش کی تھی۔ عاطف بیگ اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ عدیل بھائی دستک دینے کی بابت لیے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔

"کیسے ہو چیمپئن؟ میں نے سنا ڈاکٹر صمدانی اپنے پیر جان سے بہت امپریس ہو کر گئے ہیں۔"

"کچھ نہیں" وہ مسکراتا رہا۔ عاطف اس کا تشنابی کے سامنے تکیہ لگانے لگا تب اس نے مدھم سے لہجے میں پوچھا۔ "آج تو آپ مصروف تھیں نہ سو عبا؟"

عدیل عبدالرحمن نے پلٹ کر اسے دیکھا پھر آہستگی سے بولے۔ "مصروف نہیں تھی، بتایا تو آج بھی آنے کی ضد کر رہی تھی مگر میں نے کہا تھا پہلے سے تمہیں چھٹیاں ہو گئی ہیں۔ کام کا حرج مت کرو۔ سو بچتی رہ گئی دو دن تھی۔"

تیمیہ ان سے مزید کچھ نہ پوچھ سکا۔ لیکن وہ سمجھ گیا تھا اسے اس بات پر یقین بھی نہیں آیا تھا۔ عدیل بھائی نے اپنا کارڈ ہولڈر پلٹ کر دیکھنے کی کوشش میں ان کے سامنے رکھے بال میں سب کے تکیے کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ اس نے بہانے سے منع کر دیا۔

"میں چیک کرلوں گا بھائی! آپ عاطف کے ساتھ ناشتہ کرلیں جا کر۔"

"آر یو شیور؟" عدیل بھائی نے جانچنے کی کوشش کی۔ مگر اس نے اندر کی کیفیت اندر ہی رہنے دی اور پورے اعتماد سے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"میں کہہ رہا ہوں نا! اس چھوٹی سی پرابلم کو ہینڈل کرلوں گا، آپ فکر مند نہ ہوں۔"

عدیل بھائی نے انداز میں قطعیت دیکھی تو خاموشی سے اٹھ کر عاطف کے قریب جا بیٹھے۔ پھر باتوں ہی باتوں میں رات کا قصہ کریدتے رہے۔ رابعہ کی اچانک واپسی ان سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ مگر رات کوشش کے باوجود عاطف بیگ نے معاملے کی ہوا تک لگنے نہ دی تھی۔ انداز سے پردہ ہٹایا تھا۔ سو وہ پھر رات کے ادھورے تمنا نے کی کوشش میں جتے ہوئے تھے۔ مگر عاطف بیگ بھی گھاگ تھا، ہاتھ آکر نہ دیا۔ سو عدیل بھائی نے اپنی ساری صلاحیتیں آزمانے کی کوششیں ترک کر دیں۔ شہریار سے رابعہ کی بات شیئر کررہے تھے کہ وہ کتنی پریشان ہیں اس کی بیماری کو لے کر... شہریار نے موبائل اٹھا لیا تھا۔

"بات کیا چل رہی تھی، رابعہ سے؟" عدیل بھائی نے حلیہ پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ شرمندہ دکھائی دیے۔ "رابعہ سے تم دو ڈھائی گھنٹے بعد ہی بات کرسکو گے، اس وقت وہ اٹھی نہیں ہے۔"

شہریار ان کی بات سے پہلے ہی نمبر پریس کرچکا تھا۔ پہلے اس سے کہ لائن وہاں کنکٹ کرتا، دوسری طرف سے فون ریسیو کرلیا گیا تھا۔ اس نے بے چوکی کے عدیل بھائی کو دیکھا، پھر اترا کر بولا۔ "رابعہ بھابی! آپ کے شوہر نامدار کہہ رہے تھے، آپ لیٹ کر آرام کر رہی ہیں۔"

عدیل بھائی تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس پہنچ آئے، پھر کان مروڑ کر بولے۔ "خبیث! کیوں میری زندگی اجیرن کرنا چاہتا ہے؟"

اس نے ویسے تو ریسیور پر ہاتھ رکھا تھا مگر ان کا تو ملاک ہاتھ آیا تو فوراً ہاتھ ہٹا کر مزید بولا۔ "دیکھیے بھائی بڑے دھیان سے کیا کہہ رہے ہیں۔ بقول ان کے آپ کے ہاتھوں ان کی زندگی اجیرن ہو رہی ہے۔"

رابعہ کی ہنسی کا فوارہ چھوٹ گیا۔ وہ جواب میں کچھ بولنے کے بجائے بہت دیر سے ہنس رہی تھیں۔ "خدا کا شکر ہے، شیری! تم بالکل ٹھیک ہو۔ ورنہ جب سے عدیل گئے ہیں، میں تب سے تمہارے لیے پریشان ہوں سارا دن... عدیل... کبھی کراچی آکر کوئی خیر خبر دیتے کہ ایسے چور ہیں کہ اللہ بچائے۔"

شہریار کے ہونٹوں کو مسکراہٹ نے چھوا پھر جواباً بولا۔ "میں بھائی اگر یہی ان کے لیے جنت ہے، جنت ایک دو روز تو کچھ کھاؤں بھی، یہاں آکر تو پرہیز اندر رہ جاتے ہیں۔"

"بکواس مت کرو لڑکے! کیوں میری زندگی تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو؟" انہوں نے رابعہ کی شگفتہ طبیعت کے تحت اس بار اتنی خفگی سے کہا تھا اور شہریار کا قہقہہ بہت جاندار تھا۔ وہ اُن کی کیفیت سے حظ

لے رہا تھا۔ عکس دوسری طرف کی خاموشی محسوس کی تو بات سنبھالنے لگا۔ "آپ نے بتایا نہیں وہ محترمہ ہیں کس عمر کی؟"

"مجھے کیا پتا کس عمر کی ہوں۔" سیدھا سا جواب آیا اور اُس نے مدھم لہجے میں کہا۔

"بابا کے بارے میں بتا دیا ہے بابا سے زیادہ تیری بیٹی کے دشمن ہیں اس لئے آپ بے فکر رہئے۔ آپ کی لڑکیاں ان جیسے اُن سے بات کے بعد پیش نہیں ہو سکتیں۔ رہیں وہ محترمہ تو بھائی جی! وہ تو کسی عمر کی تو ہوں گی۔ اس لئے میرے خیال میں آپ کی بات درست نہیں۔"

"توبہ ہے شہریار! آپ نے تو میرا دل ہلا کر رکھ دیا تھا۔"

شہریار ہنسنے لگا تھا۔ پھر جواباً بولا تھا۔ "اور تم؟ آپ کا اپنی محبت پر بس اتنا ہی اعتبار ہے یا پھر کسی شیطان نے کان بھرے ہیں؟ محترمہ آپ کی بات بہت بدلنے لگی۔"

"شہری! اب مجھے لگتا ہے تم دل کو تنگ کرنے کا کام کر رہے ہو۔"

اس نے کندھے اچکائے پھر سنجیدگی سے بولا۔ "نہیں اب بات میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ محبت میں اپنی محبت پر اعتبار ساتھ نہیں رکھنا چاہئے۔ اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو آنکھ بند کر کے اپنے محبوب پر مرتا۔ مجھے وہ جتنا ملتا بس صرف اسی قدر اپنی محبت کا نصیب سمجھ کر قناعت کر لیتا اور اگر کوئی آ کر اس محبت میں انتشار کا سوال اٹھاتا تو کہتا اعتبار میں ہی دے بیٹھا ہوں۔ بازی نہیں ہوتی کہ سامنے والے نے اعتبار کیا تو ہم نے کیا۔ اس نے محبت میں چلن بدلا تو ہم نے بھی چلن بدل لیا۔ بھائی جی! محبت کیا کیجئے، محبت پر مرنا سیکھئے، ہماری طرح۔"

"تمہاری طرح؟ .... تم نے کب کی محبت؟" نعمان بھائی کی طرف سے سوال اٹھا تھا اور اس نے آنکھیں بند کر کے کہا تھا۔

"میرے لئے محبت وجود کا نام نہیں ہے نعمان بھائی! محبت دل کا نام ہے اور یہ دل محبت پر ایسا اعتبار رکھتا ہے کہ پھر مجھے اس سے غرض ہی نہیں ہوتی کہ وہ محبت جو میرے دل کے نہاں خانے میں کسی کے لئے جنم لے تو وہ انتظار جھیل رہی ہے۔ وہ کسی منزل کو بھی ضرور چھونے کی لذت محسوس کرے۔ محبت میں منزل .... وہ تو موت ہے اس۔ مسلسل سفر کا نام محبت ہے۔"

رابعہ بھابی دوبارہ کچن کی دوسری طرف اُس کا یہ فلسفہ سن رہی تھیں سو اس کی بات سے سوال نکال کر بولیں۔

"مسلسل سفر کا نام محبت۔ یعنی فلرٹ کرنا جائز ہوا، شہری۔"

اس نے ہنس کر عدیل کو دیکھا، پھر بولا۔ ''عاطف بیگ کے لیے یقیناً محبت مسلسل سفر کا دوسرا نام ہے۔ مگر شہریار عبدالرحمٰن کے لیے محبت میں تو جیسے کا قائل ہو کر کسی ایک نام پہ جی اٹھنے اور جی مرنے کا نام ہے محبت۔''

''جی مرنے کا نام؟...... مطلب؟'' رابعہ بھابی نے اگلا سوال کیا اور اس نے آسودگی سے کہا۔

''مطلب یہی کہ محبت میں مر جانے والے لوگ مرتے کہاں ہیں، کسی ایک دل میں زندہ رہ جائیں تو ان کی زندگی پھر سے کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر لیتی ہے۔ ماتم اور آنسو نکل جاتا ہے۔ آپ تو جانتی ہیں، محبت روح کی بات ہے اور روح کبھی نہیں مرتی۔''

''واہ واہ...... کیا اعلیٰ خیالات ہیں آپ کے۔'' عدیل بھائی نے جان کر اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر جملہ مکمل کیا، پھر بیوی کو مخاطب کر کے بولے۔ ''آپ کو کیا لگتا ہے، شہریار آج کل کی جگہ کسی سیمینار میں شریک ہیں، جس کا عنوان ہے ''محبت ایک آفاقی سچ''...... رابعہ ذرا ان کی باتیں سنو، مجھے تو دماغ کی چولیں ہلتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں۔ مگر عاطف بیگ کا فلسفہ پہ سچائی پہ بہت اعتراض ہوا ہے۔ اگر چند دوست یہ سوچ لیں تو ازلی حیثیت عرش کا دعویٰ کر بیٹھتا۔ رہے شہریار تو بھاری بھرکم گفتگو کر کے اب گہرے سانس لے رہے ہیں۔'' آواز کو مزید سوفٹ کیا، پھر بولے۔ ''رابعہ ذرا خیال کرو کچھ۔ بچے کی طبیعت ابھی بالکل ٹھیک نہیں ہے، یہ تو اپنی جان کا روگ ہے، آپ ہی کچھ پروا کر لیں۔''

رابعہ عدیل کی بات سمجھ گئی تھی، سو انہوں نے نیک تمناؤں کے بعد فون رکھ دیا تھا اور شہریار عبدالرحمٰن تھا، وہ ان کے آخری جملوں پہ عدیل عبدالرحمٰن کو گھور کر دیکھنے لگا تھا۔

''کیا ہے؟ اب کیا اپنی محبت کا جادو مجھ پہ بھی چلانے کا ارادہ ہے؟'' وہ گھور کر دیکھے گئے پھر بولے۔ ''شہر میرے پیارے اس کے لیے آنکھوں میں تھوڑا سا پیار اور تشنگی بھرنے کی کوشش کرو۔ اتنے آرام سے تھوڑی تمہاری محبت میں گم ہو سکوں گا میں۔''

''ہاہاہا......'' شہریار کا قہقہہ خود بہ خود عدیل عبدالرحمٰن کے شوخ لہجے پر نثار ہو گیا۔ عاطف بیگ مگر اس سارے معاملے میں اسے خاموشی سے دیکھے جا رہا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا، وہ جب کسی معاملے میں بہت ٹینس فیل کر رہا ہوتا تھا، تبھی ایسی بے سروپا باتوں میں زندگی و بیت کر رہا تھا۔ اور وہ آیا کا معاملہ ایسا تھا بھی کم اہم نہیں تھا کہ وہ اس پر ٹینس ہوئے بنا رہ پاتا۔ مگر وہ اس بات کو ظاہر کرنے کے موڈ میں نہیں تھا اور یہی زیادہ پریشان کن صورت حال تھی۔ پھر پہلے اس سے کہ عاطف تنہائی ملنے کی تجویز کر کے اس کے اندر کا غبار باہر لانے کی سعی کرتا، اچانک وہ نظر آور شروع ہونے پر کر کے دروازے سے ہٹا کر۔

بانو اور زہرہ جبیں اندر داخل ہوتی نظر آئیں۔ شہریار نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر عدیل بھائی نے اُسے روک دیا۔

"ابھی مکمل آرام کیجئے! اگر زندگی میں تمہاری چھٹی کے وقت تھپڑا کرواؤں گا۔"

زہرہ جبیں نے سن کر مسرت کا اظہار کیا۔ "شہریار ڈسچارج ہو رہا ہے...... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔"

عدیل بھائی نے اُسے دیکھ کر کہا۔ "ہاں زہرہ صاحبہ! چھٹی بھی دھوم سے ہی جا رہی ہے۔ وگرنہ صمدانی انکل کا تو تین دن تک قیام کروانے کا ارادہ تھا۔"

"تین دن؟...... او مائی گاڈ! میں تو بور ہو کر ہی مر جاتا۔"

"بکواس مت کرو، سنو پٹ ہو گئے اب جو بار بار مرنے جینے کی باتیں کیں تو۔" عدیل بھائی نے بہت تیزی سے اُسے ٹوکا تھا۔ شہریار کے دل میں دف کے پیچھے کوئی پھول کھلنے کے لیے سر مارنے لگا تھا۔ اہم ہوا، کسی کا عجیب ہوا، کم خوشی آمیز احساس تو نہیں تھا، جو اس کے اندر زندگی ابھرنے کے پیچھے کی آخری کوشش، آخری داؤ کھیلنے کی تمنا بھرتی...... دور پلکیں بھیگ گیا تھا۔ پھر اس نے شاکر بانو کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

"خدا کا شکر ہے اماں! مجھ سے زیادہ تو میری بیماری کام آئی۔ وگرنہ آپ کی صورت دیکھنے کو تو شاید مجھے قیامت تک انتظار کرنا پڑتا۔"

زہرہ جبیں اس کے جملے پر مسکرانے لگی تھیں اور شاکر بانو نے کرسی پر بیٹھنے سے پہلے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا تھا۔ "سچ پوچھو تو میں تم سے خفا نہیں رہی تھی۔ لیکن شہریار! تمہاری جگہ جو میرے دل میں تھی وہ میں نے کسی کو الاٹ نہیں کی۔ سلامہ کو بھی تمہاری محبت کا حصہ نہیں بانٹا، بلکہ منت منت کر کہا کہ جب تم سے ملوں گی تو تمہیں تمہارا یہ حصہ دے جاؤں گی۔ تمہاری جگہ جو میری دعاؤں میں تھی وہ آج بھی تمہاری ہی دعا کا حصہ ہے۔ آج بھی میں اپنے رب سے تمہارے لیے اتنی ہی خوشیوں اتنی ہی کامیابیوں کی تمنا کرتی ہوں جیسے سات آٹھ سال پہلے کیا کرتی تھی۔ مجھے تم سے ملنے سے کسی روکنے نے، کسی شکوے نے نہیں روکا تھا، بلکہ میں سمجھتی تھی، میں جب جب تمہارے سامنے گئی تمہیں ماضی کا دکھ یاد آئے گا، تمہیں زہرہ کی تکلیف دکھ دے گی۔ بس اس لیے میں نے ماں کے دل پر پتھر رکھ لیا اور سمجھا لیا خود کو کہ میری سچی محبت اور سچی دعائیں تمہیں کسی بھی دکھ سے جو تمہیں پہنچنے نہیں دیں گی۔"

شہریار کچھ نہیں بولا تھا۔ مگر آج پہلی بار اس نے آنسوؤں سے انکار نہیں کیا تھا۔ اس نے شاکر بانو کا ہاتھ تھام کر اپنے بیڈ پر ان کے لیے جگہ بنائی تھی، پھر ماضی کی طرح ان کی گود میں سر رکھ کر آہستہ سے

کر دیا تھا۔

"وہ آپ کی دعائیں تھیں جنہیں میں نہیں سوچ رہا تھا کون ہے جس کی دعائیں مجھے یاد آ رہی ہیں؟ میں مایوسی کے سمندر میں ڈوبنے لگا تو دعاؤں کی محبت ہے جو مجھے ڈوبنے نہیں دیتی اور مجھے سمندر اچھال دیتا ہے۔"

آنسو ان کے پلو میں جذب ہو رہے تھے۔ عاطف بیگ سکتے کی کیفیت میں تھا اور عدیل عبدالرحمٰن کو لگ رہا تھا ان کا بھائی کتنا تنہا کتنا اکیلا ہے۔ ان کا سہارا کتنا بڑا سہارا ہے مگر ان کی گی...... اس بار میں ان کے حق میں جنگ لڑ کر ہی جاؤں گا۔ اب کے ناداں نے ان کے وجود میں جو کتنا بڑا خلا پیدا کر دیا ہے...... وہ سوچ رہے تھے اور وہ ان کی گود میں سر رکھے بولے جا رہا تھا۔ وہ سارے سوچ رہے تھے جب اسے ان کی ضرورت تھی اور وہ اکیلا پڑ گیا تھا۔

شاکرہ بانو اس کے سر میں انگلیاں پھیر کر اپنی ممتا کی تشنگی اس میں محسوس کرتے جا رہی تھیں۔ وہ بھی رو رہی تھیں مگر ان کے آنسوؤں میں شہریار کی طرح کی بے بسی نہیں صرف ممتا تھی احساس تھا کہ اب وہ اسے اکیلا نہیں چھوڑیں گی۔

کتنی دیر یونہی باتوں کا سلسلہ جاری رہا تھا جب کمرے میں داخل ہونے والی نرس نے اسے وارن کیا تھا۔

"اتنا تھک کر لینا آپ کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے مسٹر شہریار! اباز کی وجہ سے آپ کی کنڈیشن پرابلم ہو گئی......"

"محبت ہر پرابلم کا سلوشن ہے۔ کچھ نہیں ہوتا۔"

حالانکہ وہ محسوس کر رہا تھا ایک نئی طرح کو وہ سر رکھے اس کے سینے میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ مگر شاکرہ بانو کی محبت کا نشہ ایسا تھا کہ وہ اس احساس کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔

"بس کرو بیٹا اب آرام سے لیٹ جاؤ، اگر مسز چھوڑ دیں جب۔" شاکرہ بانو کی ممتا نے اس کے چہرے کے بدلتے رنگ سے اندازہ لگایا اور اسے کندھوں سے تھام کر تکیے پر لٹانے میں مدد کی اس نے سر تکیے پر رکھ دیا تھا مگر شاکرہ بانو کا ہاتھ اس نے ابھی تک نہیں چھوڑا تھا۔

"آپ آج کہیں مت جائیے گا۔ ابھی میں نے آپ سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں کہیں نہیں جاؤں گی اپنے بچے کے پاس ہی رہوں گی۔"

AANCHAL.COM.PK

زہرہ جنید نے ابرو بلند کرتے ہوئے دیکھا پھر مسکرا کر بولیں۔ "ٹھیک ہے اس ایجر میں بھی چل چلتی ہوں۔ شام کو آتے وقت آپ کو پک کر لوں گی۔"

شہریار نے مسکرا کر ان کے فیصلے کا خیر مقدم کیا۔ پھر وہ لمحہ وہی تھیں کہ اس نے دوسرا سوال کیا۔ پوچھا۔ "آپ کے ذاتی بینک کی بات کہاں تک پہنچی ہے ممی؟"

زہرہ جنید کھڑے ہوتے ہوئے یکدم ٹھٹک گئیں، پھر بہت حیرت سے بولیں۔ "تمہیں کیسے پتہ چلا میں ذاتی بینک کی بابت سوچ رہی ہوں؟"

وہ مسکرایا پھر آہستگی سے بولا۔ "وہ جو کہا ہوں آپ سب سے حتیٰ ماما نے یہ تو نہیں کہہ دیا کہ میں آپ سب کے بارے میں باخبر بھی نہ رہوں۔ پھر اتنی اہم تبدیلی کہاں ہے۔ اگر کوئی ہم جیسا مدبر انسان جانچنے کی ذاتی عادت نہ ہو تو۔"

زہرہ جنید ہنس کر اس کی بات ٹال دی مگر اس کا اصرار جاری رہا تو انہوں نے بتاتے ہوئے کہا۔ "سیدھی سی بات ہے شہری! بینک کے لیے لون اتنی آسانی سے کہاں ملے گا؟ اور میرے پاس ایسا کوئی چیز بھی نہیں جسے گروی رکھ کر میں لون لوں۔ مگر بہرحال میں نے بہت سی باتیں [illegible] فرینڈز کے ذریعے بینک سے معاملہ طے ہو رہا ہے۔ دیکھو کیا بات بنتی ہے؟"

"آپ نے کس بینک کو اپروچ کیا ہے ممی؟" اگلا سوال کیا۔

زہرہ جنید بینک کا نام بتانے لگیں۔ پھر درمیان میں رک کر بولیں۔ "دیکھو شہری! کوئی مہربانی کرنے کی ضرورت نہیں ہے تم جانتے ہو مجھے اپنے معاملات اپنی ہی ہینڈل کرنے کی عادت ہے۔ انحصار پسندی انسان کی شخصیت کو ختم کر دیتی ہے۔"

اس نے سر ہلا کر ان کی بات سمجھ لینے کا عندیہ دیا مگر دل ہی دل میں [illegible] سے مسائل حل کرنے کی بات ذہن میں رکھ رہا تھا۔ زہرہ جنید جا چکی تھیں اور وہ [illegible] گزرے سالوں کی یاد میں بسر کر رہا تھا۔ [illegible] تمہارے اب بھی آنے [illegible] ہیں، عارف کیا ابھی تک ان سے ناراض ہے یا اسے [illegible] کے کیس میں مدد کر چکا ہے...... کچھ باتوں کے جواب ہوتے ہیں، مسکان بکھیر رہے تھے اور کچھ باتوں نے پلکوں میں آنسو ٹھہرا دیے تھے۔ [illegible] آج پہنچ [illegible] مگر ہر صرف زندگی جی رہا تھا۔ [illegible] عبدالرحمٰن نے ان کو [illegible] لطف کو ساتھ لیے باہر آ گئے۔ کمرے میں اب صرف وہ تھا جو ان کے درمیان محبت کا سب سے اونچا جذبہ تھا۔ [illegible] بے طرح بکھرا ہوا تھا اور [illegible] ہر لمحے ہر پل کے لیے اپنی زندگی میں چاہیے تھا۔

❁❁❁

وہ مسلسل کھانسے جا رہی تھی مگر بار بار کوئی نہیں تھا جسے وہ آواز دے کر کہے پانی کا، ان کا حلق خشک۔ وہ چلائے اسے پانی کی سخت ضرورت ہے۔ اس نے تکیے پر بہت بے قراری سے سر مارا تھا۔ بدقت اپنے وجود کو گھسیٹ کر بمشکل [illegible] رکھے جگ سے پانی پینے کی اونچی سی کوشش کی تھی مگر گلاس ہاتھ سے [illegible] کے فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ وہ خوف زدہ سے انداز میں گلاس کی کرچیوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ لگ رہا تھا وہ بھی گلاس کے بجائے زمین پر کرچیوں کی طرح بکھری پڑی تھی۔ کوئی بھی اسے جھاڑو سے سمیٹ کر ڈسٹ بن کی نذر کر سکتا تھا۔ اس کی زندگی ڈسٹ بن کے ارد گرد ہی تو گزر رہی تھی۔ وہ خالی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

کاش کوئی مجھے ایک گھونٹ پانی پلا دے...... اس نے کانٹے جیسی زبان سے خشک ہونٹ تر کرنے کی کوشش کی اور اسی دوران باہر دروازے میں چابی گھمائے جانے کی آواز سنائی دی۔

"مجھے پانی پلا دو۔ خدا کے واسطے مجھے کوئی پانی پلا دو۔" دروازہ کھلتے ہی وہ [illegible] کی طرف [illegible] محسوس ہوا۔ [illegible] کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور ایک خوب صورت چہرہ [illegible] اور ہلکا تاب [illegible] اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ [illegible] کے [illegible] سے بھرے ہوئے تھے۔

"زرش! مجھے پانی پلا دو بیٹا۔ میری جان نکلی جا رہی ہے۔"

لڑکی تیزی سے سامان صوفے پر پھینک کر کچن سے گلاس میں پانی ڈال کر کمرے میں داخل ہوئی۔

"کیا ہو گیا بابا جانی آپ کی طبیعت اتنی خراب کیوں ہو گئی؟" اس نے سہارا دے کر پانی پلاتے ہوئے سوال کیا۔ جواب دینے کے بجائے غٹاغٹ پانی پی چکی تو ذرا سنبھل کر بولی۔ "کل رات کو اچانک بہت سخت [illegible] ہو گیا تھا۔ [illegible] سارے جسم کی [illegible] جان [illegible] کر رہ گئی ہے۔" وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھا۔

زرش اس کے [illegible] کے قریب [illegible] گلاس کی کرچیاں چن رہی تھی۔

"زرش! ان کو ڈسٹ بن میں ڈالتے وقت [illegible] یہ گلاس نہیں میں ہوں۔"

"بیجو! آپ بھی ناں...... ذرا سی بات کا [illegible] کیوں [illegible] ہیں؟ یہ گلاس ہے اور آپ کیسے [illegible] سکتی ہیں؟"

"پتہ نہیں مجھے لگتا ہے گھر سے نکلی ہوئی ہر چیز کی قسمت ہوتی ہے۔ ایک ہی [illegible] اسے [illegible] ہو جاتی ہے [illegible] کر کے ڈسٹ بن کی راہ دکھا سکتا ہے جیسے مجھے...... جیسے مجھے ڈسٹ بن کی نذر کیا زندگی

AANCHAL.COM.PK

نے...... زرش کیا من مرضی کی زندگی جینے کی تمنا کرنا اتنا ہی قابل تعزیر جرم ہے؟"

زرش کچھ نہیں بولی تھی، کچن میں جا کر اس کے لیے سوپ بنانے لگی تھی۔ پھر واپس لوٹی تو بستر پر آنکھیں بند کیے وجود نے اس سے سوال کیا۔

"میں نے سنا ہے، بابا واپس آگئے ہیں پاکستان۔"

وہ جو سوپ کو چمچ چلا کر جلدی جلدی ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں تھی، چونک کر بولی۔ "آپ کو کیسے پتہ کہ بابا گھر آگئے ہیں؟"

بند آنکھیں یکبارگی کھلیں، پھر آہستگی سے کہا گیا۔ "ماما کی آواز سننے کے لیے گھر فون کیا تھا۔ فون بابا نے اٹھایا تھا۔ میں کتنی دیر تک ان کی آواز کا اتار چڑھاؤ سنتی رہی۔ زرش! بابا کی آواز کا تناؤ، غرور ابھی تک ویسا ہے، مانتی ہیں میرا کوئی غم ہی نہیں ہے۔ بیٹا! ابھی افسوس نہیں ہے ان کے پیچھے جانے کا۔"

زرش کچھ نہیں بولی، اسے سوپ پلانے میں مصروف ہوگئی۔ آدھا پیالہ سوپ پیا تھا کہ ہاتھ ہٹا کر بولی۔ "بس اب اور نہیں۔ میں تم سے حمزہ عابد کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

زرش نے سوپ کا پیالہ رکھ کر اس کی طرف سے پشت کرلی، پھر آہستگی سے بولی۔ "میں جانتی ہوں بابا نے اور مجھے کبھی گھر بسانے جیسی لڑکی نہیں سمجھا۔ شاید بغیر کسی اضافی محنت کے وہ مجھے حاصل کرچکا ہے، اس لیے اب خالی خولی [illegible] کی بات کر کے اپنا وقت کیوں برباد کرے۔ اس کے لیے میں سوسائٹی گرل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔"

"تم نے ہر بار کیوں جھکی؟ تم تو جانتی تھیں اس راہ میں کچھ نہیں رکھا۔"

بہت گہرا سانس کھینچ کر سوال کیا گیا اور زرش نے کھڑکی کا پردہ سرکاتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

"شروع شروع میں بابا کی دولت کا بہت زعم تھا، اپنی خوب صورتی کا بے اندازہ تھا۔ میں سمجھتی تھی، میں زندگی کو اپنے طریقے سے انجوائے کرسکتی ہوں۔ پھر ریمپ واک میں آگئی تو منزل کی جستجو میں نئی سے نئی غلطی دہرائی جانے لگی۔ یہ واحد شعبہ ہے شاید جس میں مجھ جیسا لڑکا ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ دولت کسی کے لیے تحفظ نہیں ہے۔ یہاں اگر واقعی ناقابل یقین کامیابی حاصل کرنی ہے تو انسان کو سمندر میں کود کر ڈوبنے سے کون بچا سکا ہے۔ تیرنے میں وقت لگتا ہے اور جب تک آپ تیرنا سیکھتے ہیں تو آپ تھک ہار کر ڈوب چکے ہوتے ہیں۔ پھر چاہ کر بھی خود کو بدلنا ممکن نہیں ہوتا۔ سو میں بھی اس لہر میں بہتی چلی گئی۔ جب غلطی کا احساس ہوا اس وقت غلطی سدھارنے کا موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا..... حمزہ عابد انہی دنوں کی یاد ہے۔ وہ میری اصلیت جانتا تھا اور میں سمجھتی تھی، میں اسے سحر

پیچھے کر اپنا کر لوں گی۔ وہ میرے حسن سے متاثر نہ ہوا تو میری شہرت پہ مرے گا۔ میری شہرت بھی اس کا دامن نہ تھام سکی تو پاپا کی کروڑوں کی جائیداد اسے روک لے گی۔ مگر ثانی! تعلق داری میں تو وہ کسی سوسائٹی گرل سے بھی زیادہ گیا گزرا ہے۔ وہ پاپا کی جائیداد کے لیے مجھے صرف نفرت کر سکتا ہے، اور بس...... میں کبھی کبھی سوچتی ہوں، اسے چھوڑ دوں مگر دل نہیں مانتا۔ وہ میری چیک بک پہ میرے ہی سائن کروا کر خوب عیش کرتا ہے اور میں چپ چاپ اسے دیکھتی رہتی ہوں۔ میں وجاہت جان کا ایک پیکا سا زندگی کا احساس رکھتی تھی ثانی! مجھے لگتا ہے، وہ بھی اب تک بھولتی جا رہی ہوں۔ میں خود کو بھولتی جا رہی ہوں ثانی!"

"بے وقوف لڑکی! ایسا نہیں کہتے۔ کبھی نہ کبھی حمزہ کو تمہاری محبت بانٹ کرے گا، ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ محبت اتنی بے اثر ثابت ہو؟"

"ثانی! تم بھی ماں محبت کو اتنا خطرناک انجام ہوتے کبھی محبت کی اثر پذیری کی بات کرتی ہو؟ ثانی! اور پاپا کو دیکھو وہ کتنا رجسٹنٹ ہے بالکل پاپا جیسا۔" زرش نے کہا۔

"پاپا جیسا......؟" ثانیہ کے چہرے پہ کرب سمٹ آیا۔ پھر کتنی ساعتوں بعد اس نے کہا۔ "تمہارے گھر کی خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی۔ ممی کو دیکھو آج تک ان کی واپسی کے قدم گن رہی ہیں مگر ان کے آگے جاتے قدموں کی گنتی بڑھتی جا رہی ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولی تھی، جیسے اس نے اس موضوع سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ وہ اب بکن کا کمر چیک کر رہی تھی کہ ثانیہ نے سوال کیا۔

"زرش! تم سے میں نے ایک کام کہا تھا جان!"

"میں نے کوشش کی تھی ثانی! مگر شہریار عبدالرحمن آج کل اپنے دفتر میں نہیں ہوتا۔ اور کوئی ایسا قابل اعتبار بندہ نظر ہی نہیں آتا جس کے متعلق میں یہ کہہ سکوں کہ وہ شہریار عبدالرحمن کے متعلق سب کچھ جانتا ہو گا۔"

بیڈ پہ لیٹی لڑکی نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے بیڈ کی سائیڈ پہ رکھے فریم کو اٹھا کر اپنے سامنے کیا تھا اور اس کی شفتی آنکھیں تصویر پہ جم گئیں۔ تصویر میں وہ اور شہریار عبدالرحمن ایک بنچ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"شہریار! بہت برا کیا ہے ہم نے۔ ہم سب نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا۔ کاش، وقت مجھے اپنی غلطیاں سدھارنے کا موقع دیتا۔ تم کتنے سادہ دل ہو اور ہم نے تمہاری سادہ دلی کا بہت فائدہ اٹھایا۔ محبت کرنا کوئی بات نہیں، لیکن ہم نے تمہیں اس محبت کے قدم پہ لوٹا اور تم سادگی سے لٹتے چلے گئے۔ کاش! کبھی میں تمہارے سامنے پورے قد سے کھڑی ہو کر کہہ سکوں کہ دنیا میں اگر کچھ اچھا ہے تو وہ تمہارا

بل سے شہیر! ارے وہ تم ہو شہیر! عبدالرحمن! صرف تم......" اس نے بلی میں کو بلاتے ہوئے قدرے نرمی سے دہرایا تھا۔

"کیا سوچنے لگی نانی؟" زرش نے نانی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے آہستگی سے پوچھا اور انہوں نے بے بسی سے کہا۔

"میں جلد سے جلد ٹھیک ہو جانا چاہتی ہوں، زرش!"

زرش نے بجلی کی تیزی سے پلٹ کر انہیں دیکھا اور وہ پھیکے سے انداز میں ہنس کر بولیں۔ "اتنے سرپرائزنگ تم سے مت دیکھو۔ میں جانتی ہوں اب میرا ٹھیک ہونا ممکن نہیں، لیکن میں اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر ایک بار شہیر عبدالرحمن سے مل کر معافی مانگنا چاہتی ہوں گی اپنے بیٹے سے۔ جو وہ جھوٹ ہمارا ہے، میں چاہتی ہوں وہ جتنی خاموشی سے اس جھوٹ کو کیا گیا تھا اسی خاموشی سے اس جھوٹ کو اپنی زندگی سے نکال باہر کرے۔ میں مرنے سے پہلے اپنی ہر غلطی سدھارنا چاہتی ہوں زرش!"

زرش نے نبض کو بالکل بے قراری سے تھام لیا تھا۔ وہ موت کے قدموں کی چاپ بھی کی طرف بڑھتے دیکھ رہی تھی، لیکن پھر بھی کسی معجزے کے ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر کیا سارے معجزے ہماری پسند کے مطابق، ہماری زندگی کی داستان بدل سکتے ہیں؟ یہ وہ سوال تھا، جس کا جواب صرف وقت کے پاس تھا۔ پر وقت، جو اس کمرے میں ٹھہری ہوئی نانی کے پاس بہت کم رہ گیا تھا۔

سالار عبدالرحمن نے فخر سے ابھری بڑی ہی تھی کہ ان کی نظر باہر وہ خاتون پر جا کر رک گئی۔ سب انجان "گڈ مارننگ!" کا نعرہ لگاتی مادام اچھال رہے تھے، مگر موہنا سے تو اب ناک سے صرف ہٹی گئی۔ وہ بہت بعد میں جا کر پہنچی تھی۔

"گڈ مارننگ سر!" وہ سے شہیر عبدالرحمن تمہیں کا احترام سب ہی کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ مگر سالار عبدالرحمن اسے اوپر سے نیچے تک دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ پھر نظر پر ہی سے جانے کے بعد اپنے کیبن کی طرف بڑھتے چلے گئے تھے اور پھر تھوڑی دیر بعد رام پرشی اپنے کیبن سے نکلا تھا۔

موہنا کی جان لبوں پر آ گئی تھی۔ "سر بہت زیادہ غصے میں ہیں کیا؟"

"بہت زیادہ۔ لیکن یہ تم حجاب کیوں کر رہی ہو؟" اس کی بات کا جواب دے کر دوسرے لمحے، پر بھی رام پرشی نے فوراً دل میں اٹھنے والے سوال سے اپنے دماغ کو آزاد کیا۔

"بس ویسے ہی۔ مجھے حجاب کرنا اچھا لگتا ہے۔" موہنا نے آہستگی سے کہا۔

"حجاب کے مسائل وژن میں جاب کرنا ہے ضروری!" آمنہ باجی نے جیل پہ چلتے ہوئے کہیں بکھرے ہوئے خیال کو ٹٹول نہیں رہے ہوتے خیال آئی کی اور مومنہ اپنے اندر سمٹنے لگی۔ وہ شروع سے ایسی ہی تھی۔ بہت بہادر ہونے کا سوچتی تو ڈر لیتی تھی، مگر جہاں تنقید اٹھنے لگی وہیں اس کے بازو بھول جاتے۔

"مس مومنہ! آپ کو اتنی اچھی پوسٹ پہ کیسے رکھ لیا گیا، حالانکہ ابھی تو آپ کی شروعات نہیں ہوئے؟" ایک نیا سوال ابھرا۔

"مسٹر شہریار عبدالرحمٰن کی مہربانی ہے کہ میں یہ پوسٹ حاصل کر سکی۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"کس کی مہربانی؟...... ذرا پھر سے کہنا۔" شرمیلا ذرا...... وہ منہ کا ذائقہ خراب کیے بولی۔

"مسٹر شہریار عبدالرحمٰن کی......"

"اوہ، یعنی وہ بھی تکنے لگا... تب ہی اتنے بڑے سیلون میں سے اپنی ٹیم؟" خیال آرائی پہ مسکرائی اور اس کی جان آنکھوں میں کھنچ آئی۔

"مس مومنہ! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" یوں نے آ کر اس کی جان کو ہلکان کر دیا۔ وہ گھبرا گئی تھی اندر ہی اندر سے لرزاتی گئی۔

"آئی نو، خوب صورت ہو، تمہیں پہ احساس ہوں تو دل کرتا ہے۔"

اس کے چہروں میں لرزش بھی آ گئی۔ شہریار کا دل اسے بہت عجیب لگ رہا تھا۔ شاید سب یہاں ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو کر اس گفتگو سے محظوظ ہوتے ہوں گے، مگر اسے بیزاری ہو رہی تھی۔ وہ شروع سے خیالی پسند وہ تگ تعلق رہنے والی ایک خوف زدہ لڑکی تھی وجہ ایک فیصلے نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ وہ ڈری ہوئی اس کے کمرے کے سامنے پہنچی۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے سالار عبدالرحمٰن کی غصیلی آواز سنائی دی۔

"مسٹر شہریار کب سے اسٹائل وژن کے اندرونی معاملات میں دخل دینے لگے؟ وہ اسٹائل وژن میں ڈیزائن مارکیٹنگ کے معاملات دیکھتے ہیں، کیسے میرے فیصلوں پہ حاوی کیوں ہونے لگے ہیں؟"

مومنہ کو یہ چلا کر وہ شہریار عبدالرحمٰن کے بھائی ہیں۔ اس نے دل میں سوچا کیا سالار عبدالرحمٰن بھی ایسی ہی سوچ کے ہیں؟ مگر اس کے خیال کی مزید وضاحت سے پہلے ہی ناصر بھٹی نے روک لیا تھا۔ وہ گھبرا گیا ہوا تھا کہ شاید وہ منع کر دیں گے۔ ہونے کے لیے چیف ورک کرنے کے لیے آنا ہے باہر کھڑا ہو کر کچھ کہنا مناسب نہیں ہو گا۔

"بس، ہمنہ آپ باہر کھڑی ہیں تو اب تک اندر کیوں نہیں آئیں؟"

"سر، وہ ان کے غصے سے خوف زدہ ہو رہی تھی۔"

رحم بخش نے تبسم سے اسے دیکھا پھر آہستگی سے بولا۔ "بابا بہت اچھے ہیں۔ صرف کبھی کبھی غصے کا اظہار کرتے ہیں، اس لیے کوشش کیجیے گا آپ ان کی مرضی کے خلاف کوئی جواب مت دیجیے گا۔ آپ کیا کام ختم ہو گیا، ان کی ہاں میں ہاں کیسے ملائی جا سکتی ہے۔ اور ہاں ایک خاص بات، ان کے سامنے کسی بھی لحاظ سے شہریار عبدالرحمٰن کا ذکر کسی بھی پہلو سے مت کیجیے گا۔ بابا اس بات سے چڑ جاتے ہیں۔"

رحم بخش بہت ساری باتیں بہت ہی دھیمے انداز میں کر رہا تھا۔ سرپنچ کی آواز سن کر اس نے فوراً دستک دی تھی اور ہمنہ کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا۔

سالار عبدالرحمٰن ریوالونگ چیئر پر آنکھیں بند کیے جھول رہے تھے۔ ہمنہ دستک کے بعد اندر داخل ہوا تو چونک کر وہ سیدھے ہو کے بیٹھ گئے۔ ہمنہ رفیق نے نظر بھر کر دیکھا اور سوچا، اگر صورت کے ساتھ ساتھ مزاج بھی اچھا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ سالار عبدالرحمٰن شاید اس کے خیالات سے بے خبر اس سے اس کے کام کے بارے میں سوالات کر رہے تھے۔ ایک طرح سے یہ اس کا انٹرویو تھا۔ وہ ان کے جوابات سے اچھا خاصا متوازن تھا، مگر سمجھے لیے جانے کے باوجود بہت بہتر پر انحصار کر رہی تھی۔ ہمنہ اور عبدالرحمٰن اس معاملے میں کوئی خاص بات نہ کہہ سکے۔ یکدم انہوں نے اس کے پردے پر سوال اٹھایا۔

"آپ جانتی ہیں اسلامی ورثہ ایک بڑا روایتی زمانہ ہے۔ یہاں پردے پر سوال بھی اٹھ سکتے ہیں۔ ہمارے لوگ اس کے قائل ہیں جو ہماری زندگی پر بوجھ پر سوال اٹھا سکتے ہیں۔ ہمیں زیادہ پڑھی کے ساتھ سختی کر سکتے ہیں۔ اگر آپ پردہ......"

ہمنہ نے اپنے وجود کی پوری سے اٹھنے پر آمادہ کیا۔ "سر میں مرا یہ جواب نہیں چھوڑ سکتی۔"

"کیا آپ کا حتمی فیصلہ ہے؟" سالار عبدالرحمٰن نے اسے دیکھ کر سوال کیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور جانے کی اجازت چاہی۔

"آپ جا سکتی ہیں۔ جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھیے۔ میں آپ کے بارے میں فیصلہ کچھ دنوں بعد کروں گا۔"

جانے کیا بات تھی کہ اپنی مرضی کے خلاف جواب کے باوجود ان کے اندر اچھے وجود کو ہمنہ نے کی تمنا نے سر نہیں اٹھایا تھا۔ شہریار عبدالرحمٰن سے ان کی جتنی زیادہ جنگ تھی اتنا ہی ان کے لہجہ ان کا موڈ

خراب ہو رہا تھا۔ ہر لمحے ابھر آنے والے سامنے رکھ کر اسے نظر انداز کرنے میں جو مزہ تھا وہ اس کے منظر عام سے ہٹ جانے میں نہیں تھا۔ آخر ایسی کیا پرابلم ہو گئی ہے کہ ہسپتال سے محترمہ کا آنے کا دل ہی نہیں کر رہا...... ہمیشہ تو اسٹرونگ مین بنا رہتا تھا پھر؟...... سوالیہ نشان اٹھا تو بے سبب سوچا آخر کون ہے جس سے اس کے بارے میں معلومات لی جا سکیں اور دلی اطمینان کو بھی وجہ تک پہنچے۔ وہ مسلسل ریوالونگ چیئر پر جھولے جا رہے تھے۔

ڈرائیور تو نہیں تھا!؟ انہوں نے سوچتے ہوئے گھر فون کرنے کے بارے میں فیصلہ کیا۔ ان کا خیال تھا عائشہ سے گھر لہجے میں کچھ بھی پوچھ سکتے ہیں اور شرطیہ یہ نشان پر ان کی شخصیت کے رعب کی وجہ سے کسی بھی لمحاتی کمزوری کو دوبارہ دہرانے کی کوشش بھی نہیں کریں گی۔ انہوں نے سیکرٹری کو گھر کا نمبر ملانے کی ہدایت کی۔

ایک منٹ بعد ان کے روم میں بیل بجنے کی آواز سنائی دی۔ مسز عبدالرحمٰن کے گھر میں ہر بچے کا فون نمبر الگ تھا۔ یہی وجہ تھی انہوں نے عائشہ کے لئے نمبر ملوایا تھا۔ مگر فون کافی دیر تک نہ اٹھایا گیا تو انہوں نے ڈرائنگ روم کے کامن نمبر پر کال کرنے کا حکم دیا۔ پانچویں چھٹی بیل پر فون اٹھا لیا گیا اور دوسری جانب عائشہ کی آواز تھی۔ مگر اس آواز میں گھبراہٹ اور خوف کا عنصر بہت واضح تھا۔

"ہیلو عائشہ! میں سالار بول رہا ہوں۔"

"سالار...... اچھا ہوا آپ نے فون کیا۔ پلیز سالار! جلدی سے گھر آ جائیں۔ بڑی ماما کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ گھر کی گاڑی بھی نہیں ہے اور اس وقت ایمبولینس کو فون کئے ہوئے بھی پندرہ منٹ ہو چکے ہیں۔"

سالار عبدالرحمٰن نے ریسیور تیزی سے پٹخا تھا اور بھاگم بھاگ دفتر کی سیڑھیاں اترتے چلے گئے تھے۔ پھر تیز رفتاری کے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے جب وہ گھر پہنچے تو معلوم ہوا ان کی بڑی ماما کو ایمبولینس میں قریبی پرائیویٹ ہاسپٹل لے جایا گیا ہے۔ انہوں نے کار کو گیٹ سے واپس کے بغیر موڑ دیا اور پندرہ منٹ بعد مطلوبہ ہاسپٹل کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کا دل بے حد تیز دھڑک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سینہ توڑ کر باہر آ جائے۔ چہرہ پسینے سے تر ہو گیا تھا۔ گھر بھر میں وہ سب سے زیادہ جذباتی اور سب سے زیادہ چھوٹے دل کے تھے۔ معمولی سی تکلیف بھی انہیں بہت زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ پھر یہ پریشانی تو ان کی سب سے پسندیدہ ہستی سے متعلق تھی۔ ان کا دل ہی ہولا جا رہا تھا۔ وہ کاؤنٹر سے معلومات لیتے ہوئے اوپر پہنچے۔ ماما اور عائشہ کو حسب توقع پریشان پایا۔ سوائے چہرے کے تاثرات انہیں چھپانے پڑے۔ کیونکہ یہاں ان دونوں کو دلاسہ دینے کے لئے یہ ضروری تھا۔

"کیا ہوا تھا ڈیڈی؟" انہوں نے متوازن لہجے میں پوچھا۔

مما بس رونے لگی تھیں اور عائشہ نے کہنا شروع کیا۔ بابا تھا اچانک ہی بابا کو دمہ کا اٹیک (Asthma Attack) آگیا تھا۔ ان کا انہیلر (Inhaler) ختم ہو گیا تھا۔ نیا منگوانا بھول گئی تھیں، بس اس لئے ان کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔

سالار عبدالرحمن صبر [illegible] دو بجنے لگے تھے۔ پھر تین گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد ڈاکٹر نے ان کی کنڈیشن بہتر بتائی تھی۔ مما شام تک ان سے ملی تھیں مگر حشمت خانم کچھ بولنے کی کنڈیشن میں نہیں تھیں۔ پاپا اور عدیل بھائی بھی ابھی [illegible] میں ہاسپٹل پہنچ گئے تھے۔ [illegible] ان کی طبیعت معمول پر آگئی تو رات گئے مما نے شکوہ کناں لہجے میں پوچھا تھا۔

"امی جی! آخر کیا آپ کی ذرا سی بے احتیاطی سے ہمارا کوئی نقصان ہو جاتا تو؟"

حشمت خانم بیٹی کے اس اظہار پر نہال ہو گئیں مگر کچھ ساعت بعد [illegible] کیا یہ میری غلطی ہے یا تمہاری؟...... تم نے تو مجھے اپاہج بنا دیا ہے کہ میں اپنے سے کوئی فیصلہ ہی نہیں لے پاتی۔ دوا میری دوائیاں اور انہیلر بھی تو تم ہی جہان منگواتی ہو۔"

"میں جہان منگواتی ہوں؟" مما نے اچنبھے سے پوچھا۔

حشمت خانم نے خفگی سے کہا۔ "ہاں تم...... میرے پاس میں ہو کر [illegible] ہر جگہ مجھے [illegible] جاتا ہے۔ تمہیں پتہ ہے مجھے [illegible] رکھ رکھ کے [illegible] عادت ہے، اس لئے تو تم میری [illegible] کے مطابق میری زندگی کا سامان مہیا کرتی ہو۔"

مما خاموشی سے حشمت خانم کو دیکھتی رہیں، پھر آہستگی سے بہت [illegible] بولیں۔ "آپ جو میرے بارے میں رائے رکھتی ہیں، میں وہی رائے آپ کے بارے میں سمجھ رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا آپ میری [illegible] عادت سے تنگ آگئی ہیں [illegible] دراصل [illegible] اندر ہی اندر [illegible] کوشش کی تھی کہ [illegible] آپ کو رکھ [illegible] جیسا ایک بچی کو رکھنا چاہئے، مگر آپ کے [illegible] کی۔ تب میں مجھے ایسا سوچنا ہی نہیں ملا۔"

حشمت خانم [illegible] دیکھتی رہیں۔ پھر پہلے [illegible] مما کے فون [illegible] بجنے لگا۔ انہوں نے بیگ سے موبائل نکالا، نمبر دیکھا اور کال ڈسکنیکٹ کر دی۔

"کس کا فون تھا؟" حشمت خانم نے سوال کیا۔

نما نے تلخ لہجے میں کہا۔ "کس کا ہو سکتا ہے؟..... ایک ہی تو ہے، جس سے میری جان نہیں چھوٹتی۔"

"کون شہریار تھا؟" حشمت خانم نے نا سمجھی سے پوچھا؟ نما نے جواب نہیں دیا اور حشمت خانم نے پھر پوچھا۔ "تم نے عبدالرحمٰن سے پوچھا ہے شہریار کس وجہ سے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے؟"

"وہی کوئی اعتقادی وجہ۔ آپ نے کس سے ہاسپٹل کے بل پے کرتے ہیں جو وہ اس بارے میں سوچے۔ میں نے ان سے پوچھا تھا مگر انہوں نے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ میرا خیال ہے کام کرنے کی وجہ نہیں کر رہا ہوگا، سوشل اداکاروں کی طرح ہاسپٹل میں داخلے کے لئے مجبور ہو گئے ہوں گے۔ آپ کو تو معلوم ہے ان کی کتنی خوب صورت اور گرم گرم جانے لگی ہیں۔"

حشمت خانم نے کچھ نہیں کہا۔ نما کچھ دیر چپ ہو گئیں۔ پھر وہ بھی باہر جانے کے لیے سوچ ہی رہی تھیں کہ ملازمہ اندر داخل ہوئی۔

"بی بی! شہریار کا فون ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

حشمت خانم نے آج پہلی بار خوشی سے اس کی آواز سننے سے انکار نہیں کیا تھا۔

فائزہ سیل فون پکڑا کر باہر چلی گئی تھیں اور نما جان کر بیٹھی رہی تھیں۔ تا کہ جان سکیں اس نے انہیں فون کر کے کیا خبر دینی چاہی، جس سے وہ بے خبر رکھا گیا ہے۔

"ہیلو، بیٹا! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" حشمت خانم کو اس کی آواز کی کمزوری سے عجیب سا احساس ہوا۔

"میں ٹھیک ہوں، تم بتاؤ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"ایک دو دن اور، تین دن بعد چھٹی مل جائے گی۔ آپ بتائیے، آپ کا ڈاکٹر نے کیا کہا؟" وہ یوں گفتگو کر رہا تھا جیسے ہمیشہ سے اسی بے تکلف لہجے میں مخاطب رہتا تھا اور ماں ان کے اندر سے بھی اس سے جھگڑا کرنے کی ہمک نہیں ابھر رہی تھی۔

"ایک دو دن رکیں گے ابھی۔ ویسے اصل وجہ تو سمجھنے سے کچھ معاملہ سمجھانے میں دقت ہو رہی ہے۔"

"اُف! ام سمیر! مانو! مجھے بیمار نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

AANCHAL.COM.PK

حشمت خانم کچھ نہیں بولیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ وہ جانتی تھیں شہریار کی اس دوری کی کیا وجہ تھی۔ ممّا نہیں جانتی تھیں، اس لیے بھلا کہا انہوں نے حشمت خانم سے سوال کر لیا تھا۔ پھر بہت اچھی طرح اس کی طبیعت صاف کر کے ہی انہوں نے لائن ڈس کنکٹ کی تھی۔

حشمت خانم بیٹی کو پُرسوچ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر بہت آہستگی سے بولی تھیں۔ "تم نے اسے بے بھاؤ کی سنائیں، دل بھر کر برا بھلا کہا، مگر اس نے جواب میں تم سے کچھ کہا؟"

"کیا کہے گا؟ ایسا منہ رکھتا ہے کہ میری کسی بات سے اختلاف کر سکے؟"

حشمت خانم نے آنکھیں بند کر کے بیٹی کے اس جملے کو سنا، پھر آہستگی سے بولی تھیں۔ "تمہیں یہ معلوم ہی نہیں ہو سکے گا کہ نہیں، لیکن عالیہ! اس نے تمہاری کسی بات سے صرف اس لیے اختلاف یا اعتراض نہیں کیا کیونکہ وہ صرف تمہاری آواز سننے کا منتظر تھا۔ بھلے وہ آواز ذلت کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔ ورنہ اگر وہ بدتہذیب ہے تو بھی اتنا اونچا لہجہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتے، تم جانتی ہو یہ بات۔"

ممّا حشمت خانم کو حیرت سے دیکھتی رہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ ان کے بیان سے شدید اختلاف کے باوجود فی الحال اپنا ردعمل نہیں دے سکی تھیں، بلکہ انہیں صرف اس لیے حیرت نے آلیا تھا کہ شہریار عبدالرحمٰن کے لیے انہوں نے ہمدردی کا مظاہرہ کیوں کیا تھا۔ مگر حشمت خانم نے خود سے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا تھا۔

پھر یہ ان کے ہاسپٹل میں تیسرا دن تھا جب ڈاکٹرز نے ان کی ریکوری دیکھ کر انہیں ڈسچارج کر دیا تھا۔ چونکہ ان کی رپورٹ کے پیش نظر یہ فیصلہ لیا گیا تھا، اس لیے وہ منتظر تھیں کہ کون انہیں لینے آئے گا۔ بابا نے کالج جانا تھا، مگر غیر متوقع وہ ناشتے کے ساتھ ہاسپٹل میں داخل ہوئی تھی اور غیر متوقع دوسری گاڑی سے عدیل بھائی کی ہمراہی میں شہریار کو آتے دیکھ کر ان کی جذباتی کیفیت اپ اینڈ ڈاؤن ہو گئی تھی۔ تین دن سے وہ شہریار سے نہیں ملی تھی۔ یقیناً وہ اس سے خفا ہوگا۔ مگر جب وہ نارمل طریقے سے اس سے ان کی کسی بھی ضروریات کے بارے میں جاننے لگا تو اسے لگا وہ ابھی کہ ابھی رو دے گی۔ اس کی صورت سے ہی پتہ چل رہا ہے، وہ کتنے دنوں سے کس کرب سے گزر رہا تھا۔ تھکا ہوا اور کمزوری بہت نمایاں تھی اس کی شخصیت میں۔ مگر وہ پھر بھی ان سے ملنے چلا آیا تھا۔ عدیل بھائی نے بہت انکار کیا تھا، مگر پھر انہیں ماننا ہی پڑا تھا۔ وہ وقت کے ذریعے ان کے روم تک گئے تھے۔ نوشو نے یہ سامان کا بیگ لے چکی تھیں جیسے زندگی کے اسٹیشن پر کوئی آخری پڑاؤ کے لیے ذرا کی ذرا ٹھہرا ہو۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے ماما؟" شہریار نے عدیل بھائی کے لاکھ ہاتھ تھامنے کی ضد کے باوجود ان سے ہاتھ چھڑا لیا تھا اور اب وہ نرمی سے ان کا ہاتھ تھامے ان کی خیریت کی رپورٹ لے رہا تھا۔

عدیل بھائی نے خوف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے، اس سوال کا جواب دینا تو جیسے مزاج کی خاتون کے لیے آسان نہیں ہوگا۔ کیونکہ ان کی بھی کئی گنا سے زیادہ محسوس کرنے کے

لئے زیادہ سے زیادہ کم نہیں ہوئی تھیں مگر پھر بھی...... ان کا ردعمل بہت مختلف تھا۔ انہوں نے شہریار کا بازو تھام کر ان کی خیریت پوچھی تھی۔

"بالکل فٹ ہوں، ہاتو! بس معمولی سا اسکول ریجن تھا۔" ڈاکٹر شبیر سے فارغ ہو کر رشید بھٹی جہاز نے کے لئے اسٹینڈ تک کا ریسٹ بتایا۔ کہنے لگے "مسٹر شہریار! آپ کے اعصاب بہت تھک گئے ہیں، اس لئے کچھ دن تو آرام کرنا لازمی ہے۔ ان دنوں میں بھی فارغ تھا اس لئے ڈاکٹروں کی نصیحت کی طرح سے عادی ہو رہا ہوں......"

حشمت بیگم نے ان کا چہرہ دیکھا پھر مدھم سا بولیں۔ "تم مجھے بہادر نظر نہیں آرہے ہو شہری! تم ٹھیک ہو ناں؟...... بالکل ٹھیک؟"

"جی! تو میں ٹھیک ہوں...... بالکل ٹھیک۔ اب میں آگیا ہوں ماں تو آپ کو دوبارہ بیمار ہونے کا موقع نہیں لینے دوں گا۔" ان کے ہاتھ کی پشت اپنے ہاتھ میں لے کر محبت سے کہا۔ عدیل بھائی اور ہادیہ دونوں اس نئے رشتہ محبت پر حیران و پریشان تھے۔ مگر وہ دونوں مگن تھے۔

"مجھے معلوم ہے ہمارے بچوں میں تم مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہو۔"

ہاتو کلیاں...... عدیل بھائی چکرانے لگے تھے۔

"خیریت تو ہے ہاتو! آج سورج مغرب سے ہی نکلا تھا ناں؟" ان سے برداشت نہ ہو سکا تو بول پڑے۔

ہاتو نے کر تیکھیں اور شہریار شوخی سے بولا۔ "بس جل گئے ناں؟ ہاتو مجھ سے پیار کریں تو آپ کو کیسے ہضم ہو سکتا ہے؟"

AANCHAL.COM.PK

عدیل بھائی نے بیگ کندھے پر ڈالا پھر ہولے سے بولے۔ "تم جیسے احمق نہیں پڑتے۔ میں محبت سب کے لئے ہوتا ہے تحمل کرتا ہوں۔ ورنہ آگے تم صرف سالار ہی اچھا لگا سکتے ہیں۔"

"بلکہ رہتی بھائی کے خلاف کوئی کہیں ہو رہے گا۔" دانیال نے تب کر کہا تو عدیل بھائی شہریار کے کان میں گنگنائے۔

"لیجئے رہی کا ایک اور کردار میدان سے ہٹا! شہریار ادیب جینگ تو مجھے لگتا ہے خالی ہاتھ ہی رہ جائے گا ویسے تم خود بھی اپنے آپ کو ووٹ دینا چاہو گے یا......؟"

شہریار نے بازو پھیر کر ان کو اور دانیال کو پیٹنے لگ گئے۔

"تمہیں اتنا غصہ کیوں آرہا ہے گڑیا؟" عدیل بھائی نے ہادیہ کو تنگ کیا۔ جیسے میں مصروف ہو کر ہادیہ کو غصے سے گھورا مگر اس نے جواب دینا ضروری خیال نہیں کیا۔ عدیل بھائی نے کندھے

اچکائے اور لفٹ کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگے۔

شہریار رومانیہ کے برابر میں کھڑا تھا مگر رومانیہ اُسے مخاطب کرنا تو کجا اُسے دیکھنے تک سے احتراز کر رہی تھی۔

"کیا تمہیں لگتا ہے، واقعی تم مجھ سے نفرت کرنے لگی ہو؟" شہریار نے جھک کر سوال کیا اور رومانیہ کی جلتی آنکھیں اس پر آ کر ٹک گئیں۔

"میں اب غیر ضروری معاملات پر انرجی ویسٹ کرنے کی حماقت نہیں کرتی ہوں شہری بھائی!"

"شکر ہے شہری بھائی کا صیغہ برقرار رکھا، اگر اس رشتے سے ترقی کر جاتیں تو میں کیا کر لیتا؟"

"ہونہہ، خوامخواہ کی بلیک میلنگ۔" اس نے بظاہر برا منانے کے سے انداز میں کہا، مگر کہنے میں پہلو یہی تھا کہ شہریار عبدالرحمن آسانی سے بن لے۔ تو اس نے یہ تلخ گھونٹ بہت آرام سے پی لیا تھا۔
عدیل بھائی دونوں کے درمیان بیچ بچاؤ کروانا چاہتے تھے مگر رومانیہ نے انہیں یہ موقع نہیں دیا اور لفٹ دو منٹ بعد آ گئی تھی، سو تینوں اس کے ساتھ نیچے جانے کے سفر پر گامزن ہو گئے تھے۔ عدیل بھائی نے وہیل چیئر کار کے پاس لے جا کر روک دی تھی اور شہریار نے حشمت بیگم کو سہارا دے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھنے میں مدد دی تھی۔ ناصف بیگ ہاسپٹل سے ہی اپنی بزنس میٹنگ میں چلا گیا تھا جسے وہ اتنے دنوں سے پوسٹ پون کرتا آ رہا تھا، سو وہیل چیئر وارڈ بوائے کے حوالے کر کے وہ گھر کے لیے روانہ ہوئے تھے۔

گھر...... جہاں ماما اپنی ماں کی صحت یابی کے لیے جشن منانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ آج غیر متوقع پاپا بھی گھر میں موجود تھے۔ ہاں، یہ ضرور تھا ان کے گھر میں رکنا حشمت خانم سے زیادہ شہریار عبدالرحمن کی محبت کا پیش خیمہ ضرور تھا۔ پاپا نے گیٹ ہی پر شہریار کو سینے سے لگا لیا تھا۔ ماما نے اُس کی طرف متوجہ ہو کر بھی توجہ دینا ضروری نہیں سمجھی تھی۔ وہ حشمت خانم کو عادل بھائی کے ساتھ سہارا دے کر اُن کے کمرے تک لے جانے میں ساری توجہ صرف کر رہی تھیں۔ شہریار نے آگے بڑھ کر ماما کی مدد کرنی چاہی مگر ماما نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے تھے۔ غیر متوقع اُس نے اسٹریس نہیں لیا تھا۔ وہ پاپا اور عدیل بھائی کے ساتھ ڈرائنگ روم کی سمت بڑھتا چلا گیا تھا۔ پھر باتیں کرتے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ عدیل بھائی نے اس کی رہائش کا مسئلہ اٹھا دیا تھا۔

"پاپا! شہری کو میرا اور رابعہ کا گھر دے دیجئے نا۔ بمشکل سال سال بعد آتے ہیں شہریار، کئی بار ہمیں بھی ٹھہر سکتے ہیں۔"

شہریار نے ابرو چڑھا کر انہیں دیکھا پھر سنجیدگی سے بولا۔ "کیوں جناب! یہ مہربانی کیوں؟ میں آؤٹ ہاؤس ہی میں بہت پرسکون رہ سکوں گا۔ آپ جانتے ہیں، بھیڑ بھاڑ سے مجھے کوفت ہوتی ہے۔"

طبیعت کی بحالی کے ساتھ ہی جیسے اس کا روڈ رویہ بھی عود کر آیا تھا۔

تبھی عدیل بھائی نے اس کا کان مروڑ کے تنبیہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ "بس، بس صاحب۔ یہ ڈرامہ، رویہ اپنے پاس ہی رکھنا۔ سارے گھر والوں کو ڈرا دھمکا کے خود سے دور کر رکھا ہے۔ کم آن یار انسانوں میں اٹھو بیٹھو۔ کچھ چینج آئے زندگی میں۔ حالانکہ اب کوئی تمہاری روڈ تبدیلی ہونا تو ناممکن ہے مگر امید پر دنیا قائم ہے جگر.......!"

شہریار مسکرانے لگا۔ وہ پھر بھی راضی نہیں ہوا تھا ان کے فیصلے پر۔ جبھی پاپا نے زیادہ زور دیا تو کسمسا کر بولا۔ "آؤٹ ہاؤس میں ایسا کیا کام ہے ماں پاپا! اگر کوئی ایمرجنسی ہوئی مجھے کوئی پرابلم ہوئی تو میں فوراً آپ کو انفارم کروں گا ناں۔ لیکن پلیز مجھے شفٹ کرنے کے لیے زور نہ دیں۔ مجھے اپنے کمرے سے بہت انس ہے۔"

"کمرے سے انس چھوڑو انسانوں سے انس کرو میاں! کیوں جان کے دشمن بنے ہوئے ہو؟"

شہریار نے کوئی جواب نہیں دیا تھا بلکہ اپنے ارد گرد بے قرار سا محسوس کرتے ہوئے دانیا کو دیکھ کے ہانک لگائی تھی۔ "ایک کپ چائے پلا دو دانی! بہت تھکن ہو رہی ہے۔"

دانیا عبدالرحمٰن نے ہاں کہا۔ عباس اور ملازم کو آواز دینے لگی۔ ملازم کی شکل دکھائی دی تو شہریار کا چہرہ ٹیڑھا ہو گیا۔ شہریار نے دیکھا تو منہ بگاڑ کر بولا۔ "رہنے دو عباس! مجھے چائے نہیں پینی۔ تم جا سکتے ہو۔"

عباس اپنا سا منہ لے کر چلا گیا۔ تحریم دانیا نے قطعاً اس کے مزاج کے برہم ہونے کا اثر نہیں لیا اور فون پر گپ بازی میں مصروف رہی۔ عدیل بھائی نے شہریار کے چہرے کے تاثرات خطرناک دیکھے تو بولے۔

"خان! تمہارے لیے کیا میں چائے بنانے کی جسارت کر سکتا ہوں؟ دیکھو دانیا جیسی تو نہیں ہوگی لیکن پھر بھی پینے کے لائق ہی سمجھو۔"

شہریار نے کچھ کہنے کے بجائے آنکھیں بند کر لیں۔ عدیل بھائی نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور اٹھ کر کچن کی سمت بڑھتے چلے گئے۔ عدیل بھائی کو کچن کے لیے سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر دانیا نے فون یکدم بند کر دیا اور ان کے پیچھے تیزی سے بھاگی تھی۔

"آپ رہنے دیں بھیا! چائے میں بنا دوں گی۔"

عدیل بھائی نے مڑ کر اسے دیکھا، پھر خفگی سے بولے۔ "اگر یہی بات تم شہریار کی مان لیتیں تو کیا جاتا؟" لمحہ بھر رک کے پھر مدھم ہو کر بولے۔ "وہ تمہارے ہاتھ کی چائے کا ذائقہ جانتا ہے اسی لیے تمہارے ہاتھ کی چائے مانگتا ہے اس لیے وہ تکلفات نہیں کرے گا۔ تمہیں پتہ ہے ناں وہ کتنا ٹچی ہے۔ اگر کوئی اسے ایک بار کام کا منع کر دے تو ہاں پھر مت کا جت کر کے کام کرنے کی بات پھر سے ذرا اس

کا انکار، اقرار میں نہیں بدل سکتا۔ ویسے آپ نے شہریار کے سامنے اپنے بہترین تعلقات کی نفی کیا بات کی ہے؟"

واضح اشارہ اس کی بدمزاجی کی طرف تھا، جو پچھلے چار دن سے وہ شہریار کے ساتھ روا رکھے ہوئے تھی۔ مگر وہ کیا بتاتی کہ بہت ساری چھوٹی موٹی باتوں نے اس کے اندر توڑ پھوڑ برپا کر دی تھیں اور یہ ان کا خیال تھا۔ وہ چونکہ ہر حالت میں شہریار کی سائیڈ لینے کے عادی تھے اس لئے وہ کوشش کے باوجود ان کے دل میں پنپتا ملال نکال کر انہیں اس کی کسی خامی پر ردعمل ظاہر کرنے پر نہیں اکسا سکتی تھی۔ سو اس نے خاموشی اختیار کئے رکھی تھی۔

عدیل بھائی اسے چھوڑ کر کچن میں داخل ہو گئے تھے۔ ملازمین میں انہیں دیکھ کر کھلبلی مچ گئی تھی۔ پھر ان کی آمد کی جب معلوم ہوئی تو ہر شخص اپنی خدمات دینے پر راضی دکھائی دیا۔ مگر عدیل عبدالرحمن سب کو منع کرنے سے پہلے خود ان کے لئے چائے بنانے لگے تھے۔

پھر چائے کپ لے کر وہ پہنچے تو وہ ڈرائنگ روم میں دیوان پر بیٹھا بیٹھا سوچ چکا تھا۔ پاپا ان کے سامنے کے صوفے پر بیٹھے اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ اگر سالار عبدالرحمن ہوتے تو ضرور تلملا کے تخت بیٹھ کر کھڑا کر دیتے۔ مگر وہ عدیل عبدالرحمن تھے، وہ مسکراتے ہوئے پاپا کے سامنے بیٹھتے ہوئے بہت مدھم بولے۔

"آپ بہت محبت کرتے ہیں نا اس سے؟"

پاپا نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بہت آہستگی سے بولے۔ "ہاں، مجھے اپنی ساری اولادوں میں یہ سب سے پیاری ہے۔ میری بس یہی تمنا ہے کہ اس کی راہ کے سارے کانٹے اپنی پلکوں سے چن لوں اور اسے صرف خوشی اور محبت کی بارش میں بھیگتا دیکھتا رہوں۔ وہ ہنستی رہے یہاں تک کہ زندگی کی شام ہو جائے۔"

"بالکل ٹھیک...... مگر پاپا یہ بتائیں شہریار سے مطمئن ہیں نا آپ؟"

پاپا نے ہنستے ہوئے ان کی کشتی کھینچی، "خبیث ہو عدیل، تم بھی، کہاں کی بات کہاں لے جاتے ہو؟" عدیل بھائی کے ہنسنے سے قہقہہ پڑا۔ پاپا ان کے ... پیش ہی ایسے ہو گئے تھے۔ شہریار کی آنکھ ان کے قہقہے سے کھل گئی تھی۔ پھر وہ دونوں کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر متعجب ہو گیا۔

"میرے بارے میں کیا ڈسکشن چل رہی تھی؟"

"انہیں تو ہم چائے پر بحث کر رہے تھے۔ کھانے کی طرح مردوں کے ہاتھ میں چائے بنانے کے لئے ایک خاص اور الگ ذائقہ ہوتا ہے جناب۔" ممّا نے عمر کو ٹوک کر اپنا کپ چینی کی تھیلی پر رکھ کر اس کا کپ اس کی طرف بڑھا کر بولے۔ "یہ تو ہم بھی کیا کریں گے، کس عظیم باورچی سے پالا پڑا تھا۔"

"خدا نہ کرے کہ آپ کی زندگی میں یہ "مختصر" والا وقت آئے۔"

"کیوں بیٹا! میں نے عمر مختصر کا پیالہ پیا ہے؟" انہوں نے خفگی سے اور چائے کا کپ لیتے ہوئے کہا۔

"عمر مختصر کا پیالہ نہ پیا ہو تب بھی میری دعا نہیں! ابھی بھی رونقیں نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے خصوصی بخشش مانگی ہے آپ کے لئے۔ یہ چائے پینی کھانے کے بغیر نہیں جانے دوں گا آپ کو۔"

"دونی گئی بی اسپرٹ چاہئے مجھے۔" "سپورٹ؟" "کوئی ایک جملہ ہے جسے زندگی میں شامل کر لو پھر کچھ بھی ناممکن نہیں لگے گا۔"

"ہاں مگر اس کے لئے بندے کا بے حس ہونا ضروری ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں....."

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ عدیل شہید الرحمن نے اس جملے ادھورے کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ واقعی اسے بے حس نہیں دیکھنا چاہتے تھے سو بہت خاموشی میں چائے پی جا رہی تھی۔ لیکن چائے پینے کے بعد شہریار کی حالت...... چہرہ پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ وہ جیسے یکدم لٹ گیا تھا۔

"تم ٹھیک ہو شہری؟" پاپا اور عدیل بھائی یک دم ان کی طرف بڑھے تھے۔ اس نے جواب دینے کے بجائے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"تمہیں طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو چائے کافی سے پرہیز کرنا چاہئے شہری!" پاپا نے اس کا ہاتھ تھام کر اس کے صوفے پر بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ عدیل بھائی گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کے چہرے سے پسینہ صاف کر رہے تھے۔ پریشانی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ تھوڑی دیر پہلے کی ساری شوخی ہوا ہو گئی تھی۔

"شہریار! آنکھیں کھولو۔ مجھے بہت ٹینشن ہو رہی ہے۔"

شہریار نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ بمشکل آنکھیں کھولیں، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "شاید تھکن کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔ گھبرانے جیسی کوئی بات نہیں ہے۔"

بابا جی اور ملازم نے شہریار کو سہارا دیا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی، کچھ دیر بعد وہ پاپا کی طرف بڑھ گئی تھی۔ شہروز بعد میں لوٹا تو اس کے ہاتھ

میں جانے کا کہہ رہا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے سیڑھیاں اترتی چلی گئی اور تب ہی اسی وقت شہریار نے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ ماما کے چہرے پر بے چارگی تھی مگر اس نے بغور ظرف سے اس کا جائزہ لے لیا تھا اسے تسلی ہو گئی تھی وہ ٹھیک ہے۔ سو اس نے ماما کے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔ شہریار نے مدد سے کچھ نہیں کہا تھا مگر اس کے چہرے کا پھیکا پن جبریل بھائی اور پاپا دونوں نے محسوس کیا تھا۔

"تم اپنے کمرے میں آرام کرو چاہو تو پاپا!" وہ بے وقت تھا، جبریل بھائی اور پاپا اسے روک کر رہ گئے تھے وہ کہیں بھی تھا۔ جبریل بھائی اسے سہارا دیتے ہوئے آؤٹ ہاؤس کی طرف لے کر چل پڑے تھے۔

"جب تک میں یہاں ہوں، میں شہری کے ساتھ ہوں پاپا!"

پاپا نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ شہری نے بھی کچھ کہنا ضروری نہیں خیال کیا تھا۔
یوں شاید زندگی ان کے ہمراہ اپنی تنہائی کی ذات میں سمٹتی چلی گئی۔

❁❁❁

حافظ سہیل نے اپنی ڈیوٹی کے آف ہوتے ہی مسٹر رفیقی کے دفتر کا قصد کیا تھا۔ مسٹر رفیقی اسے آدھے گھنٹے بعد فری ملے تھے۔ سو اس نے ان سے اپنی [illegible] کی تھیں۔ مسٹر رفیقی کافی دیر تک سوچتے رہے تھے پھر آہستگی سے انہوں نے اپنے سامنے رکھے رجسٹر کے اوراق دو تین صفحے پلٹ کر دیکھے تھے۔

"یہ کس [illegible] بہت آپ کی [illegible] مگر اس کام کا اچھا معاوضہ بھی دیں گے۔"

"مجھے منظور ہے، [illegible] آپ [illegible] سے میری بات کر لیجئے۔ میں شام چھ بجے ان کی رہائش کا [illegible] کرنے کے لیے تیار ہوں گی۔ رہی ڈیوٹی کی بات تو یہ بات آپ ان سے پہلے ہی طے کر لیجئے گا کہ یہ میری مجبوری ہے، میں اپنی گورنمنٹ ملازمت چھوڑنا نہیں چاہوں گی۔"

مسٹر رفیقی نے سر ہلایا تھا اور وہ دفتر سے باہر نکل چکی تھی۔ پیدل ہی اس کا رخ سڑک کی طرف تھا کہ ایک کار اس کے بالکل سامنے آکر رک گئی تھی۔ وہ گھبرا گئی تھی لیکن پھر کسی طرح سنبھل گئی تھی۔ اس نے جلدی قدموں سے چلنا شروع کیا تھا کہ یکدم کسی نے اسے نام لے کر پکارا تھا۔ کار کا شیشہ نیچے ہوا تھا اور اس کے ہراساں چہرے پر [illegible] مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

"اُف۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔۔ آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔"

اس نے واپسی کے قدم موڑے تو فرنٹ ڈور کھول دیا گیا تھا اور وہ آرام سے اب کار میں بیٹھی ہوئی تھی۔

"آپ تو اچانک ہی فون پر آپ کہہ رہے تھے، آئندہ ویک اینڈ آپ کا پاکستان آنے کا پروگرام نہیں بن سکتا۔"

اس نے چادر کے کونے سے پسینہ صاف کیا اور ساتھ بیٹھے ہوئے مرد نے اُسے پوری گہری نظروں سے دیکھا۔ اس نظر میں لمس محسوس کرنے کی تڑپ صاف تھی مگر وہ اپنے اوپر چیک رکھنے کی اتنی عادی تھی کہ آسانی سے اس نے اس پیغام کو رد کر دیا تھا۔ سامنے بیٹھے مرد نے اس کی اس جسارت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ آنکھوں میں واضح طور پر خفگی کا تاثر موجود تھا۔ تبھی اس نے ہولے سے اس کے ہاتھ کو چھو کر نرمی سے کہا تھا۔

"آپ جانتے ہیں، میں زندگی کا ایک واضح اصول رکھتی ہوں۔"

"مگر محبت میں کوئی اصول نہیں ہوتا صرف محبت ہوتی ہے۔" وہ ایک دم بہت جھنجھلائی گئی۔ شافیہ کے چہرے پہ مسکان ابھری تو دب گئی۔ اس نے مدھم کہا۔

"ہاں محبت صرف محبت ہوتی ہے۔ لیکن محبت کرنے والے ذی ہوش ہوتے ہیں، اس لیے ان پر اضافی ذمے داری آپڑتی ہے کہ وہ اپنی محبت کو باہوش رکھیں۔"

"مگر محبت مدہوشی کا دوسرا نام ہے۔ تم وقت کے فاصلے مٹا دیتے کہ محبت کہتے ہیں۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا تم مجھے محسوس کرو، مجھے چھو کر دیکھو کہ میں تمہارا کتنا ہوں، کتنا نہیں... کیا تمہارا دل نہیں چاہتا تم میرے ساتھ گھومو پھرو، خواہ کچھ پلوں کے لیے ہی سہی دنیا کو اپنے اور میرے بیچ نہیں آنے دو۔"

شافیہ جمیل نے سنجیدگی سے اس کے جذبات سے چھلکتے لہجے کو سنا۔ آنچ دل میں قدم قدم اترتے دیکھی مگر پھر بھی خود کو سنبھالا دے کر بولی۔ "میرا یہ سب دل چاہتا ہے کہ میں تمہیں محسوس کروں۔ میرا دل چاہتا ہے، میں تمہارے ساتھ خوب گھوموں پھروں۔ مگر عارف! یہ سب ابھی ممکن نہیں۔ میں منگنی کو ایک کچا بندھن سمجھتی ہوں۔ جس دن تم نے میری محبت کو اپنے گھر کی دہلیز کا راستہ دیا اس دن تمہاری ہر تمنا، ہر آرزو پوری کرنا ضروری ہوگی مجھ پہ۔ تم میری زندگی کی پہلی تمنا ہو عارف! اور تم سے ہٹ کر مجھے کچھ دکھائی کب دے گا؟"

عارف اس جواب پر شرارت سے مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ "ایک معصوم جسارت کی اجازت تو دو گی نا؟ کتنے ماہ ٹل رہے ہیں، ہم میری محبت تمہارا احساس چاہتی ہے۔"

شافیہ بلش ہو گئی۔ عارف اس کے چہرے کے رنگوں سے محظوظ ہو رہا۔ اس نے جس معصوم جسارت کی اجازت چاہی تھی، اس کا اس پہ ردعمل دیا تھا۔ گاڑی سبک رفتاری سے سڑک پہ رواں دواں تھی۔

"بھی اگر عارف بھائی اتنے دولت مند نہ ہوتے تو بھی آپ کا کیا یہی فیصلہ ہوتا؟" عارف جواد نے سونیا کو سرزنش سے دیکھا مگر شافعہ کے چہرے پر خفگی نہیں ابھری تھی اس نے مدھم سا کہا تھا۔

"عارف میرے لیے صرف عارف ہیں۔ دولت، شہرت، عزت یہ سب مجھے اس لیے اچھی لگتی ہے کیونکہ یہ ان کے وجود کا حصہ ہے ان ہی پہ جچتی ہے۔ لیکن اگر یہ سب کچھ وقت ان سے چھین لے تب بھی میں ان کی پشت پر رہوں گی۔ مصیبتوں میں دوست تو نہیں چھوڑ کے جاتے۔ دوست تو کنول کے پھول کی طرح ہوتے ہیں۔ تالاب سوکھ جائے تو وہ بھی سوکھ کر وہیں مرجھا جاتے ہیں۔ مرغابی کی طرح نیا تالاب نہیں ڈھونڈنے نکل پڑتے۔"

"واہ واہ...... بھئی باتیں تو مجھے تمہاری پسند آتی ہیں۔ تمہارے علاوہ کسی اور لڑکی سے ہی نہیں دیتیں۔" وہ بات ختم کر کے سونیا کی طرف مڑا پھر آہستگی سے بولا۔ "تم نے اپنی بہن سے سوال کیا ہے تو چلو اس سوال کا محور تم ہوتیں تو تمہارا کیا جواب ہوتا؟"

سونیا مسکرا کر بولی۔ "سیدھی سی بات ہے، میں ذرا جو کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی پریکٹیکل ہوں۔ سو اگر ایسا موقع میری زندگی میں آیا تو میں مرغابی کی طرح نیا تالاب ڈھونڈنا چاہوں گی۔ آپ تو جانتے ہیں غربت چاٹتے چاٹتے کوئی ولی ہی ہوگا جو اف نہیں کرے گا۔ میں تو انسان ہوں، مجسمہ شرافت کب یہ یقین کر سکتی ہوں۔"

شافعہ نے اُسے سرزنش سے دیکھا اور عارف جواد نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"میں ذاتی طور پر تم سے پہلی بار مل رہا ہوں مگر تمہاری صورت سے میں نے تمہارے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ غلط نکلا...... ویسے تم ہماری منگنی میں کیوں نہیں آئی تھیں؟"

شافعہ کا خیال کر کے وہ بحث کو سمیٹ دیتے ہوئے یکدم بات کا رخ موڑ بیٹھا اور ادھر سونیا تو اس نے اس کے لیے کافی دلچسپی لیا اور اپنی دو ماہ بعد آنے والی وجہ بتانے لگی جس کی وجہ سے اس کی منگنی مس ہو گئی تھی۔ عارف جواد نے مزید کچھ نہیں کہا تھا اور ہمیشہ کی طرح وہ البم مانگنے لگا تھا جو شافعہ کے ساتھ اس نے ہوٹل کے وزٹ میں بنوائی تھی۔ یہ ہر تصویر میں وحشت پانی کے مختلف پوز پر بکھرے گزر رہا تھا۔ کندھے پر ہاتھ رکھے چلنے والی تصویر پر ایک لمحے کو وہ ٹھہر گیا تھا پھر محبت سے بولا تھا۔

"یہ دیکھو شافی! جب مجھے لگا تھا میری زندگی گزاری ہے تو صرف تمہارے ساتھ۔ تمہارے علاوہ مجھے کوئی اور سنبھال ہی نہیں سکتا۔ تم جانتی تھیں میری کار کا ایکسیڈنٹ ورک کی وجہ سے ہوا تھا لیکن پھر بھی تم نے ذرا سی بھی نفرت کا اظہار کیا نہ خوف زدہ ہوئیں۔ ان تین مشکل دنوں میں بھی میری دیکھ بھال میں تم جس طرح جڑی رہی تھیں، اس پر میرے دل نے کہا تھا بس یہی لڑکی ہے جو مجھ جیسے بگڑے

ہوئے انسان کو سدھار سکتی ہے۔"

شافعہ کچھ نہ بولی تھی۔ وہ دونوں کی باتیں سن کر باہر آ گئی تھی۔ ان کا رخ بابا کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ بے قدموں بابا کے پیچھے جا کھڑی ہوگئی۔ بابا اپنے اندر کا غبار نکالنے کے لئے ابھی لکیریں کھینچ رہے تھے۔ ان کے کینوس پر دو بہت گہری آنکھیں نیلی بھری بھری تھیں۔ ان آنکھوں میں محبت کا بے نام سا دکھ بھی اُمڈ رہا تھا۔ سونیا کو محبت سے کوئی علاقہ نہیں تھا مگر آنکھوں کی خوب صورتی وہ بابا کو سراہے بنا نہیں رہ سکی تھی۔

"واؤ بابا! کیا آنکھیں ہیں۔ یہ کس کی آنکھیں ہیں بابا؟ اس کینوس پر...... اس کو زندگی دینا ہے بابا!"

ارسلان راشدی چونک کر مڑے۔ "کچھ نہیں...... ان آنکھوں میں کوئی آنسو بھر سے ٹھہر گیا ہے لیکن بے خبر ہیں یہ آنکھیں ابھی تک جانتی ہیں کہ جیسے ان پر میرا اختیار آج بھی ہے...... مگر بچھڑ چکا ہوں دل ہی جو ایک وابستہ ہے یہ کبھی ٹوٹ نہ جائے۔"

سونیا ارسلان راشدی کو بہت خاموشی سے دیکھے گئی۔

"بابا! آپ کی شادی اماں سے مجبوری کی شادی تھی ناں؟ آپ پہلے سے کسی کو پسند کرتے تھے ناں؟"

ارسلان راشدی کچھ نہیں بولے اور سونیا نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بابا! میں محبت کو شغل سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ لیکن جب میں آپ کو محبت میں آپ کو جلتے دیکھتی ہوں تو مجھے محبت سے چڑ سی ہونے لگی ہے اور اس محبت پر رشک بھی آتا ہے۔ جو آپ جیسے کسی شخص کو اپنے اندر باندھ کر ہمیشہ کے لئے بازی سے ہار کر اس کا نام لیتے ہوئے بھی اپنی محبت ہونے کے زعم سے باہر نہیں نکلتی۔ اور ہمیشہ ہی آپ اس محبت کے بارے سے دور ہی نکلنا چاہتے ہیں۔"

ارسلان راشدی نے تھکے تھکے انداز میں بات مسکرا کر بہت سی رکھ کر ختم کرنے کی کوشش کی اور سونیا ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"آپ وہی نظم سنائیے بابا! جو آپ اکثر گنگنایا کرتے ہیں۔ "محبت کر کے دیکھو" عارف بھائی بھی آئے ہوئے ہیں بابا! میں انہیں بھی بلا کر لاتی۔ آج مل کر آپ شاعری کھیلتے ہیں۔" وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ پانچ منٹ بعد واپس لوٹی تو عارف اور شافعہ ساتھ تھے۔

ارسلان رانفدی کرسی پر بیٹھے تھے اور وہ دونوں سونیا کے روم میں آن بیٹھے تھے۔ سونیا نے ایک دوبار ضد کی تھی تب ارسلان رانفدی نے اپنی پسندیدہ نظم سنائی تھی۔

"لاکھ ضبط کی خواہش کے
بے شمار دعوے ہوں
اس کو بھول جانے کے
بے پناہ ارادے ہوں
اور اس محبت کو ترک کر کے جینے کا
فیصلہ سنانے کو
کتنے لفظ سوچے ہوں
دل کو اس کی آہٹ پر
بار بار جھڑکنے سے کون روک سکتا ہے
ہجر کے صحرا میں
اس کے نرم لہجے اور سوگوار آنکھوں کی
خوشبوؤں کو چھونے کی
جستجو میں رہنے سے
روح تک چٹخنے سے

AANCHAL.COM.PK

تجھے پاؤں چلنے سے
کون روک سکتا ہے
آنسوؤں کی بارش میں
چاہے دل کے ہاتھوں میں
ہجر کے مسافر کے
پاؤں تک بھی چھو آؤ؟
جس کا لوٹ جانا ہو
اس کو دور جانے سے
راستہ بدلنے سے
دور جانے سے
کون روک سکتا ہے
کون روک سکتا ہے......"

یکدم ارسلان راشدی کو لگا وہ اس کمرے سے کہیں اور جا نکلے ہیں اور کوئی ہاتھ ہے جو ان کے ہاتھ سے ابھی کے ابھی چھڑا کر ان کے حصے میں محبت کی بے وفائی کو دوبارہ چھوڑ کے جا رہا ہو۔

"مت جاؤ چھوڑ کر، میں نے تمہارے بغیر چلنے کی عادت ہی نہیں ڈالی ہے قدموں کو۔ میں تمہارے بغیر چلا تو مجھے گرنے سے کوئی نہیں روک سکتا......"

وہ تیزی سے دوڑے مگر ہاتھ ہاتھ سے نکل جائے تو راستوں کی مرضی ہے دوبارہ کبھی ان ہاتھوں کو پھر سے ملا دیں یا نہیں؟

"بابا! آپ نے سنا، عارف بھائی نے کیا شعر پڑھا ہے؟" سونیا نے انہیں واپس اندر کے سفر سے کھینچ لیا تھا۔ وہ چونک کر عارف کو دیکھنے لگے اور ساقہ، تنزیل، عارف کے بعد محبت پڑھ رہی تھیں۔

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں ، کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں ، اب ہجر کی کوئی رات نہیں
میدانِ وفا دربار نہیں ، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں ، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں
گر بازی عشق کی بازی ہے ، جو چاہو لگا دو ، ڈر کیسا؟
گر جیت گئے تو کیا کہنا ، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

"واہ واہ۔" عارف اور سونیا نے خوشی سے ساقہ کو داد دی اور ارسلان راشدی ان تینوں کے کھلکھلاتے چہروں کو دیکھنے لگے۔ یہ چہرے انہیں محبت نے ابھی چھوا تھا۔ محبت نے ابھی ان کی طرف اپنے ہاتھ کوئی دیکھیں منظر نہیں کیا تھا۔ اس لئے یہ ہنس سکتے تھے، پورے دل سے کھلکھلا سکتے تھے۔

کاش محبت کی ساری عمر ان کی خوشی کو لگ جائے اور محبت نام کے روگ سے میری قسمت میں نہ ڈال دے۔ رب سے انہوں نے دل ہی دل میں مناجات کی۔

محفل برخاست ہو چکی تھی۔ عارف ارسلان راشدی کی پینٹنگ سے کھلا ہوا رہا تھا اور ساقہ، تنزیل ان کی تازہ پینٹنگ دیکھ رہی تھیں۔

"بابا لیا تھیں...... ایسا لگتا ہے، میں نے ان آنکھوں کو پہلے بھی کبھی دیکھا ہے...... بہت زیادہ مگر یاد نہیں آ رہا...... آپ اس کا چہرہ بھی بنا دیتے نا۔"

ارسلان راشدی نے چہرہ بنانے کے بجائے ان آنکھوں میں بھی کالا رنگ بھر دیا تھا۔

"بابا! آپ نے کہا کہ وہ؟...... آنکھیں تو آپ کو بھی جانتی ہیں۔"

"ہاں، مجھے بھی پہلے یہی دھوکا ہوا تھا۔"

ابھی وہ جملہ کہہ کر انہوں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال لیا تھا اور سعد ان کے پیرنٹس ڈرائیونگ کے ان کی تعریف میں جیسے کہہ گئی تھی۔

"بابا! یہ دیکھئے یہ ہیں مسٹر عبدالرحمٰن جنہوں نے اس سلسلے میں ہر پلان بنایا تھا۔"

ارسلان راشدی نے البم ہاتھ سے لی تھی پھر تصویر پر نظر جاتے ہی ان کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک کوند گئی۔

"اچھے انسان ہیں۔ انہیں لوگوں سے ہمدردی جتانے اور ہمدردی کرنے کا خاص ہنر حاصل ہے۔" البم واپس کرتے ہوئے کمنٹ دیئے۔

"بابا! یہ واقعی بہت اچھے انسان ہیں۔" شافعہ تھوڑی حیران ہوئی۔

"ہاں میں جانتا ہوں یہ واقعی بہت اچھے انسان ہیں۔" لہجہ عام سا تھا مگر سعدیہ چپ ہو گئی تھی۔ کیونکہ لہجے میں خاص فخر کا احساس واضح تھا۔

بابا! آپ نے اسٹریٹ تو دیکھی اور کمنٹ دینے والوں میں سے تو نہیں پھر...... پھر کیا آپ مسٹر عبدالرحمٰن کو پہلے سے جانتے ہیں؟

"عبدالرحمٰن صاحب کو بہت اچھا جانتا ہوں میں۔" سوچا کہ ذہن نے سوال اچھالے اور ان کے نزدیک پہنچ گئی۔

❀❀❀

نئے شہر کی صبح نئی امید کے لئے خاموشیوں سے بات کرتی تھی۔ آج وہ معمول سے پہلے اٹھ گیا تھا۔ بھائی ان کے ساتھ تھے پیچھے گھر سے الگ ہو کر باہر آیا تھا۔ بہت خاموشی میں کیا گیا تھا سامنے کے بعد وہ کچھ دیر کے لئے بستر پر جا کر لیٹ گیا تھا سامنے کے بعد آتے ہی کیفیت محسوس ہوئی تھی۔ ہاتھ پیروں میں سے بالکل جان نکل گئی تھی۔ بھائی ان پر نظر رکھے ہوئے تھے اس لئے آرام کا بہت لمبا نہیں کیا تھا اس نے اٹھتے ہی دوبارہ کھڑے ہوتے دیکھ کر بھائی نے اشارے سے پوچھا تھا۔

"کہاں کا قصد ہے؟"

"فجر جاؤں گا۔"

"بالکل ہو بھی کوئی مسافت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آرام کیجئے۔ جب ٹھیک ہو جاؤ تب فجر جانے کا قصد کرنا۔"

"یعنی پھر تو کبھی ڈنر جوائن نہیں کر سکوں گا۔"

"کیا مطلب؟" عدیل بھائی کے کان کھڑے ہوئے اور اس نے دانتوں تلے زبان دبائی۔ جلد بازی میں غلط جملہ تو بندے کے سامنے نکل گیا تھا مگر پھر بھی بات سنبھالتے ہوئے بولا۔

"سیدھی سی بات ہے بڑے بھیا! آج تک تو آپ کا ایک مستقل مددگار ہے۔ پھر ہمارا رشتہ ہی کسی کی کمی نہیں ہو سکتا۔ سو کام کب تک میرے انتظار میں پڑے رہیں گے؟"

"کبھی تو میں کہتا ہوں اصل کام تمہارے انتظار میں نہیں پڑے رہیں گے اس لیے سالار کو بھی پکڑو کرنے دو۔ شاہ میر اور بابا جو اپنے سر لے کر رکھتے ہو پھر بھی کہنے میں یہی آتا ہے تم بزنس اور کیٹرنگ سمیت کے علاوہ کچھ نہیں بنا سکتے۔"

"آخا تو آپ کو میری محبت سالار بھائی سے زیادہ ہی ہے۔" شاہ میر کو کچھ تو شک کے بعد بولا۔ "سالار بھائی غصے کے جتنے بھی تیز ہیں اب بڑے بھیا! کام میں مجھ سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ ہم دونوں مل کر ہی کام کریں۔ ابھی فی الحال انڈسٹریل سٹاف بپاسا کے بزنس اور کر سکتا ہے۔"

"مگر ابھی تمہیں آرام کرنا چاہیے۔" کسمسا کر انہوں نے پھر بھی چانس لیا مگر وہ جنگ شدہ کپڑے لے کر باہر نکلنے چلا گیا تھا۔ پھر تیار ہو کر باہر آیا تو عدیل بھائی کے دل کو پھر سے وہم نے گھیر لیا۔

"میں مانتا ہوں تم نے میری بات مانتے ہوئے پچھلے دو دن کی چھٹی کی تھی اور ہفتے بھی آرام کیا تھا مگر ابھی تمہیں ابھی بھی آرام کرنا چاہیے۔"

"کرلوں گا۔ پہلے کام نمٹا لوں، پھر اکٹھا آرام کرلوں گا۔"

"مطلب؟ یہ تم کیسی منحوس گفتگو کیوں کرنے لگے ہو؟"

"کہاں بڑے بھیا! اچھا جملہ ہے۔ ظاہر ہے انسان کام مکمل کر کے ہی آرام کرنے کا حق دار بنتا ہے ناں۔"

عدیل بھائی کچھ نہیں بولے تھے اور وہ پورے اعتماد سے گاڑی سے اتر کر کھانے کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ پہلا منظر ہی تکلیف دہ تھا۔ ابا حضور ناشتے میں مصروف تھے ایک لمحے کے لیے بھی ان کے چہرے پر ملال کا تاثر نہیں ابھرا تھا۔ اس نے گہرا سانس لے کر اپنی خفگی کو سنبھالا۔ پاپا نے مسکرا کر اسے دیکھا اور نور نے اس کا رخسار چھو کر اس کی طبیعت کی بابت پوچھا۔

"آپ جیسی دوست کا ساتھ ہو تو! آپ بتائیے اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"میری طبیعت تمہارے جانے سے بہتر ہو گئی ہے میرے بچے!"

دادا جان کے ہاتھ سے کپ کی چائے چھلک گئی تھی۔ جازی عبدالرحمٰن نے بڑی حیرت سے محبت کے ان مظاہر کو دیکھا تھا۔ ماما کی آنکھوں میں حیرت کی جگہ غصہ تھا اور مسز عبدالرحمٰن مطمئن ہو کر اسے دیکھ رہے تھے، جیسے انہیں اپنی اس اولاد کی قابلیت پر کوئی شک تھا ہی نہیں۔ وہ چہروں میں کوئی بھی تحریر پڑھ سکتا تھا۔ سالار عبدالرحمٰن آج بہت صبح ہی آفس چلے گئے تھے، اس لئے اس نے دادا نے جازی عبدالرحمٰن کی طرف توجہ اچھالی تھی۔

"جازی! آج کالج کے بعد تم میرے آفس آ جانا۔"

جازی عبدالرحمٰن نے کرنٹ سے ان کی طرف دیکھا۔ جواب دینا کسر شان محسوس ہوا تھا...... مگر شہریار بہت کمینہ تھا اس نے فیصلے پر پورا زور دے کر بولا۔ "جازی عبدالرحمٰن! میں نے آپ سے کچھ کہا ہے؟"

"لیکن مجھے آپ سے کچھ سننے کی حسرت اب نہیں ہوتی۔"

"او کے ٹھیک ہے، مگر پھر بھی کل سے آپ آفس جوائن کر رہے ہیں۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" انہوں نے آخر میں ٹکڑے پر اپنا فیصلہ سنا دیا اور وہ چپ ہو گیا۔

"پلیز مجھے ریموٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے شہری بھائی! میں اپنے فیصلے خود لیتا ہوں۔"

"مگر بیٹا! شہریار آپ کے بھلے کے لئے ہی کہہ رہا ہے، اس کے ماننے میں کیا حرج ہے؟" مسز عبدالرحمٰن نے درمیان میں آ کر اسے سپورٹ کیا۔

مدیل بھائی کی آنکھیں بھی جازی پر اٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اس کے رویے پر سخت ناپسندیدگی واضح تھی۔ لیکن جازی عبدالرحمٰن کا دل اب چاہا کبھی شہریار عبدالرحمٰن کے لئے زبان سے نہیں جھڑک سکتا تھا، یہی وجہ تھی وہ نے تحمل سے اٹھ کر کے دادا کو کہا تھا۔ "بھائی چلیے میں کالج کے لئے لیٹ ہو رہا ہوں۔"

شہریار نے دادا عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا۔ ہاسپٹل جانے سے پہلے تک یہ ذمے داری ان کے سر تھی۔ شہریار آئے یک اپنا ڈراپ کیا کرتا تھا۔ جس دن بہت مصروف ہوتا، ڈرائیور کی ڈیوٹی لگا دیتا۔ مگر اس ذمے داری سے صرف نظر نہیں کرتا تھا۔ مگر آج جیسے سب کچھ مختلف ہو رہا تھا۔ جیسے سارے اختیارات ہاتھ سے نکلتے جا رہے تھے۔

AANCHAL.COM.PK

ایک لمحے کو اس نے افسردگی سے سوچا، پھر اس نے خود کو تسلی دی کہ ان کے بعد بھی تو یہ سب کچھ کسی نہ کسی کے حصے میں آنا ہی تھا۔ بہتر یہی ہے اگر ان کے ہوتے ہوئے یہ ذمہ داری اصل ہاتھوں میں چلی گئی تھی۔ اس نے نگاہ دوڑائی تھی، ماما آنکھوں میں جدائی کی نمی لئے دیکھ رہی تھیں۔ پھر آہستگی سے بولا تھا۔

”بابا! انجم خالہ پاکستان آچکی ہیں۔ چار پانچ دن سے وہ اپنے گھر کو رنوویٹ کروا رہی تھیں، اس لئے مصروف تھیں، نانو آنٹی نے بتایا ہے۔ آپ بتائیے میرے بارے میں کس قسم کے اختیارات ہیں؟“

عبدالرحمٰن نے اچنبھے سے بیٹے کو دیکھا، پھر نرمی سے بولے۔ ”سالار اور تمہارے اختیار یکساں ہیں شہریار! ہاں، بس کچھ کاموں میں تم دونوں ذمہ داری رکھتے ہو، اس لئے ان کاموں کے بعد آفس کی ذمہ داری مشترکہ ہے۔ باقی جس وقت جو فیصلہ لینا چاہے اسے اختیار حاصل ہے۔ میں نے وِل میں یہ سب لکھ دیا ہے۔“

”وِل.....؟“ شہریار نے بے قراری سے پاپا کو دیکھا۔

انہوں نے بیٹے کی آنکھوں میں بے قراری دیکھی تو بولے۔ ”یہ تو پہلی بات ہے بیٹا! میں اپنی عمر گزار چکا ہوں۔ یہ جو چل رہا ہے وہ صرف بونس ہے، اس لئے بعد کے مسائل سے بہتر ہے زندگی ہی میں سب کچھ بچوں میں برابر تقسیم کر دوں، تاکہ ان کے دلوں کی محبت کسی لڑائی کا ایندھن نہ بن جائے۔“

اس نے کچھ نہیں کہا تھا، مگر تیزی سے اس کے دماغ نے بھی اسے ایک نیا خیال دیا تھا۔ مگر اس خیال پر وہ بستر پر لیٹے لیٹے ہی عمل پیرا ہونا چاہتا تھا۔ سو وہ سوچ ہی میں الجھا کھڑا رہ گیا تھا۔ عدیل بھائی نے اس کا ارادہ بھانپ کر آہستگی سے بولے۔

”جب تک بالکل ٹھیک نہیں ہو جاتے تمہاری کار ڈرائیونگ بند رہے گی۔“

”عدیل بھائی! آپ تو مجھے بچوں کا چچا بنائے دے رہے ہیں۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں پاپا!“

”عدیل ٹھیک ہی کہہ رہا ہے، کچھ دن تم آرام کر لو گے تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔“ اس نے بے چارگی سے سر ڈال دیا تھا۔

پھر نجانے ابھی سب سے پہلے وہ ساری رنجش سے باہر نکلا تھا۔ حجاب میں چھپی آنکھیں، اس کے اندر کہیں دور بجنے لگی تھیں۔ ...... ویسا لگتا تھا اس نے یہ آنکھیں پہلے بھی کہیں دیکھی تھیں۔ مگر کہاں؟ وہاں بابا کے ساتھ ساتھ چلنا نہیں ہو رہا تھا۔ مگر بہر حال اس کا کام تسلی بخش تھا، سو اس نے سالار اور عبدالرحمٰن کے دفتر میں بھی ذمہ داری دی تھی۔

AANCHAL.COM.PK

"آج آپ صبح ہی دفتر آ گئے ہیں بھائی!"

سالار عبدالرحمن نے جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے کمپیوٹر پر ورلڈ مکینکس کی ویب سائٹ کھولے بیٹھے تھے۔

"سنی بھائی! آپ نے اخبار دیکھا ہے بھائی؟"

سالار عبدالرحمن نے اسے دیکھا کر جیسے دیکھا پھر تلخی سے بولے۔ "کیا تمہارا میرے پاس کہاں ہے؟ اسے تو آج کل آپ ایچ کر رہے ہیں۔ میں تو ایکٹنگ ڈائریکٹر ہوں اسمال موبائل وژن کا۔"

وہ کمرے کی دہلیز سے یکدم اندر آیا پھر بولے سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "آئی ایم سوری بھائی! میں نے صرف کا آپ کی اجازت کے بغیر رکھا۔ لیکن اگر آپ کو اس پر اعتراض ہے تو میں اپنا فیصلہ واپس لے سکتا ہوں۔ ویسے بھی اسے میں نے ٹاپ ٹیم پر ہی اپائنٹ کیا تھا۔"

"رہنے دو اپنا جتنا ہی سا پندرہ منٹ گزرنے دو پھر تمہیں پتہ چل جائے گا۔ پھر تمہیں پتہ چلے گا بھی اس میں کیا خاص ہے۔ مولانا یہ وہ منافق لوگوں سے سخت ہوئے۔" انہوں نے جھٹک کر کندھے سے ہاتھ ہٹایا تھا۔

وہ کچھ ساعت وہیں کھڑا رہا پھر اپنے روم میں جا کر رضا جو نیا ریسرچ کے شعبے میں رازی فاروقی کو اس نے آفس میں بلا بھیجا۔ چند سیکنڈ بعد رازی فاروقی اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جوان العمر خوش رو

وجیہہ انسان تھا۔ ایڈکی زیادہ تر وہ فاروقی کے شعبے کے ترقی کرتی کوئی بھی اشتہار جیتنے میں اہم رول ادا کرتا تھا۔ اس کے کام کا بھی پہلے ڈیسک ایڈ یٹر تک پہنچتا تھا۔ پھر اگر اس میں کوئی خامی ہوتی تو اس

اشتہار کو پھر سے درد کیا جاتا تھا۔ وہ منتخب ہو کر جاتی۔ اتفاق یہ ہے منتخب کردہ بجٹ میں ایڈ کے لیے پیش کیا جاتا تھا۔ وہ جو ایڈ کے حوالے کیا جاتا۔ کاپی رائٹنگ دوسرے مراحل جانے کے مرحلے

سے گزرنے کے بعد پھر کمپنی کی دوسری شکل میں فرنچ کیا جاتا۔ شہریار نے بھی اس وقت رازی فاروقی کو نئے ایڈ کی بابت پچھلے ہی کے حوالے سے طلب کیا تھا۔ آج کل ان کے پاس موبائل وژن کے

کالنگ کارڈز کا کنٹریکٹ ابتدائی مرحلے میں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رازی فاروقی کی شکل دیکھتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

"مسٹر فاروقی! موبائل وژن کی کمپین کہاں تک پہنچی؟"

رازی فاروقی نے ابتدائی شکل میں موجود کمپین کے مندرجات اس کے سامنے رکھے تھے۔ اشتہار کا پلان، مجوزہ کمپین رپورٹ، فوٹو ٹیکنیکل مارکیٹنگ کے حوالے سے تمام پروفائل سب ایک ساتھ اس کے سامنے رکھی گئی۔

"اس کمپنی کا بزنس بہت اچھا ہے مسٹر رازی! کیوں آپ کا کیا خیال ہے؟"

رازی فاروقی نے مسکرا کر کہا۔ "جی سر! یہ کمپنی آل ریڈی پاکستان میں بہت بڑی کلاس بجٹ رکھتی ہے۔ کروڑوں کی تعداد میں اس کے کسٹمرز موجود ہیں پھر نئے بزنس کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ اگر اس کا بزنس ہمیں اس سال کے لئے مل جاتا ہے تو ہم بہت بہترین طریقے سے اپ پوزیشن میں آسکتے ہیں۔ اس کمپنی کا ایڈ حاصل کرنے کے لئے ہمارے مد مقابل وژن کے ساتھ ساتھ دوسری بڑی بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنیاں بھی کوشش میں ہیں کہ وہ یہ بزنس حاصل کرنا چاہتی ہیں۔"

"پھر ہم نے کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے؟" وہ اس کی تب سے پہلی فائل کو دیکھتے ہوئے سوال کرنے لگا۔

رازی فاروقی نے گھڑی دیکھی پھر آہستگی سے بولا۔ "کل رات کی میٹنگ فکس ہے سر! آپ ابتدائی معاملات طے کرنے کے لئے پیش رفت کر سکتے ہیں۔ اسٹائل وژن کی مالکن بھی ہے اور خود آپ کی کام میں دلچسپی آپ کو اس موقع کو حاصل کرنے میں زیادہ وقت نہیں لینے دے گی۔"

اس نے فائل سائیڈ پر رکھ دی پھر چونکا، رازی سے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ میں یہ میٹنگ اٹینڈ کروں گا۔ آپ کل کتنے بجے۔"

رازی فاروقی سر ہلا کر اجازت لے کر باہر دروازے کی طرف مڑ گیا اور وہ نئے طریقے سے فائل پر پھر سے غور کرنے لگا تھا۔ اسٹیبلشمنٹ سب بہترین تھے۔ وہ کسی بھی ڈیپارٹمنٹ کی صلاحیتوں کو سراہتا تھا کچھ دیر سوچنے کی جستجو میں تھا کہ اچانک اس کے موبائل پر بیل ہوئی۔ اس نے نمبر دیکھے بغیر ریسیو کیا مگر دوسری طرف اضطراب اور خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"ہیلو شہریار اسپیکنگ...... کون؟"

دوسری طرف سے آواز کی جگہ سسکی سنائی دی۔

"ہیلو...... کون؟" شہریار کو لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکن یکدم بند ہو گئی تھی۔

"ہیلو میں بول رہی ہوں۔"

"کون...... کون ہو تم؟" اس کی آواز میں دل کی دھڑکن سے بھی زیادہ تیزی آتی گئی۔ جواب کی جگہ رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس نے موبائل پر نمبر دیکھا مگر یہ اجنبی نمبر تھا۔

کون تھی وہ؟...... یہ تو زبردست کنفیوژن ہوئی ہے۔ کیا نہیں آرہا کون تھی وہ؟ اس نے بہت ذہن دوڑایا مگر جواب ندارد تھا۔ یہاں تک کہ وہ جنگ کے لئے اٹھا تھا کہ اس نے جازی کو سالار کے روم کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ تیز قدموں سے اس تک پہنچا پھر مسکرا کر بولا تھا۔

"اچھا کیا تم نے میری بات مان لی۔"

"مجھے سالار بھائی سے کام تھا۔ میں آپ کے کہنے پر نہیں آیا ہوں شہزادے۔"

شہریار دوبارہ سے کھلکھلا کر مسکرانے لگا پھر ہنس کر بولا۔

"تم ہاں بالکل سالار بھائی کی کاربن کاپی ہو۔ صورت شکل میں نہیں اور عادت و اطوار میں بھی۔ دل میں کچھ بھی ہو مگر ایسے یوں جتانے ہو جیسے تمہیں کسی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

جازی نے اس کی طرف گھمبیرتا سے دیکھا پھر غصے سے بولا۔ "پہلے میں اپنے جذبات کو [illegible] نہ کرنے میں ہی سہولت سمجھتا تھا مجھے لگتا تھا جو دل میں ہے وہی باہر رہنا چاہئے۔ مگر پھر کچھ لوگوں نے اس جذباتیت کا خاصا فائدہ اٹھایا اور خاصا لطف لے کر دل توڑا کہ پھر مجھے جذبات ظاہر کرنا سب سے بڑی حماقت لگنے لگا۔"

شہریار نے خاموشی سے دیکھا بار اس نے ان کے بیان کی وضاحت نہیں دی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا وہ [illegible] رخ دے چکا ہے جب تک وہ اس بات سے انکار کرے وہ پھر بھی اس کے بارے میں اپنی رائے نہیں بدل سکتا۔ سو وہ چند لمحے بعد اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے باہر نکل آیا۔ شہزر نے اس کے لئے [illegible] کا دروازہ کھولا۔

وہ وقت مقررہ پر ریسٹورنٹ پہنچ گیا تھا مگر یہاں وہ دور تک مجسم حجاب بانو کا [illegible] نہیں تھا۔ اس کا دل بے حد مکدر ہوا تھا۔ وہ جس طرح خود وقت کا پابند تھا اسی طرح سامنے والے سے بھی توقع رکھتا تھا کہ وہ بھی اسی طرح وقت کی پابندی کرے گا مگر......

اب کیا کیا جائے؟...... وہ وقت گزاری کے لئے کوئی دلچسپی سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے قریب ہوا ان کی مہک پھیلتی چلی گئی۔

جانانہ...... بے ساختہ اس کے دل نے اطلاع دی۔ اس نے چور نظروں سے دیکھا مگر وہ سامنے کے بجائے اس کی پشت سے ہوتی ہوئی سامنے آئی تھی۔ اس کی [illegible] صورت آنکھیں [illegible] تھی۔

"تم یہاں؟" اس نے [illegible] سے سوال کیا۔

"سالار تمہارے آج کی لنچ میٹنگ کے بارے میں بہت کانشس ہے۔ اس کا خیال ہے، پتہ نہیں تم اتنی بڑی ڈیل سنبھال بھی سکو گے یا نہیں اس لئے یقین واثق ہے وہ تمہارے ساتھ ساتھ ہی دفتر سے نکلا ہوگا۔ سو میں نے سوچا، کیوں نہ پرانی دال کو نیا تڑکا لگا دوں۔ ایک پنتھ دو کاج۔" وہ ہنسی۔

"مطلب......؟" وہ خالی الذہنی سے سوچنے لگا اس لئے وضاحت سے سوال بھی نہیں کر سکا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا، جانانہ کہہ رہی ہے جو سالار عبدالرحمن تیمور وہاں سے واپس گئے ہوں گے اور سالار کے ساتھ اگر جاری بھی ہوا تو اس کی پوزیشن بہت خراب ہو جائے گی۔ ایک پنتھ دو کاج کی سمجھ اس لئے کسی حد تک آئی تھی۔ اس کی غصیلی آنکھیں جانانہ کے وجود کے آر پار ہو رہی تھیں۔ مگر وہ بھی ڈھیٹ تھی، باز آ کر ہو گئی تھی۔

"تم جب اتنی خفگی سے مجھے دیکھتے ہو ناں تو میرے دل میں تمہارے لئے محبت اور بڑھ جاتی ہے شہریار۔ ویسے ایک پنتھ دو کاج کی وضاحت ایک خوب صورت شعر کے ساتھ بھی تھی۔ اگر تم کہو تو سناؤں؟" اس نے اور چھیڑا، اس نے دیکھا اور وہ لطف لے کر بولی۔ "تایا عبدالرحمن یا چچی جان نے حمزہ عابد سے بڑی محبت اور خلوص سے مل رہی ہے۔ تم جانتے ہو ناں حمزہ عابد میرا اچھا دوست ہے، جسے تم نے ایک بار شکست دے دی تھی۔ مگر اب وہی تایا عبدالرحمن کی تم سے نفرت سے جواب بچے ہوئے ہیں جو تمہارے بساط میں کارگر جا چکی ہے۔ یہ صرف تم جانتے ہو حمزہ عابد کتنا اچھا ہے، کتنا ہینڈسم ہے۔ مگر تایا سمجھتی ہے وہ اب تک حمزہ عابد کو ٹھیک طرح سے سمجھ ہی نہیں سکی تھی اس لئے وہ اب اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کے لئے حمزہ عابد کے دن کہنے پر دن کہہ رہی ہے اور رات کہنے پر رات کہنے کی جستجو رکھتی ہے۔ تم جانتے ہو ناں، میں اس سچویشن کو کہاں تک لے جانا چاہوں گی؟"

شہریار رک گیا۔ اس کے پورے بازو سے درد ہوتا ہوا اس کی کمر میں پھیلتا جا رہا ہے۔ مگر وہ پھر بھی استقامت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی کسی کمزوری سے جانانہ کو سوچ نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ اسے پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ یکدم ہوٹل کے روشن دروازے سے اس نے بیگم جانانہ کو اندر آتے دیکھا۔ اس وقت وہ کسی سے ملنے کی پوزیشن میں نہیں تھا لیکن پھر بھی اس نے کھڑے ہو کر مسز جانانہ اور مسٹر علیم افسر کا استقبال کیا تھا۔

"سوری مسٹر شہریار اور امل ہم ٹریفک جام میں پھنس گئے تھے اس لئے دیر ہو گئی۔"

جانانہ نے دیکھا تو کھڑے ہو کر ادا سے بولی۔ "اوکے مسٹر شہریار ہم اگلی میٹنگ کے بارے میں پھر ڈسکس کریں گے۔"

"ارے آپ بیٹھئے ناں، ایک وقت میں دو کام بھی ہو سکتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! مگر یہ وقت صرف آپ کا تھا جسے میں نے تھوڑا سا استعمال کیا ہے۔ میرے خیال میں اس وقت کے کسی بزنس پر آپ [illegible] نہیں ہوں گے۔ بس اچانک میں یہاں [illegible] کرنے کے لئے آگئی تھی تو مسٹر شہریار کو دیکھ کر رہ نہیں سکی۔"

"ارے کوئی بات نہیں۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

جانان نے بیگم جاذب سے ہاتھ ملایا اور مسکرائی۔ بڑی تحمل سے اٹھتی چلی گئی۔

پھر شہریار تھا اور بیگم جاذب۔ دونوں نے سر جاذب [illegible] کے بعد معاہدے [illegible] طے کر لی تھیں۔ [illegible] کے بعد ایک [illegible] مسٹر سلیم نے رکھ دی تھی [illegible] شہریار عبدالرحمٰن نے سنبھال لی تھی۔ [illegible] کوئی [illegible] ہوتی ہے وہاں [illegible] میں لیتا۔ سوٹ کیس کو آزمودہ [illegible] پر ہوں" کہہ کر

اس نے بات سنبھال لی تھی۔ مسٹر سلیم اختر نے سنا تو نہایت بے تکلفی سے بولے تھے۔

"خیریت ہے مسٹر شہریار! آپ جیسے [illegible] کے بندے کو بھی ڈائننگ کا مسئلہ ہو سکتا ہے؟"

"کیا کریں مسٹر سلیم! کسی کا خیال ہے۔ مجھے اپنی ہیلتھ کا بہت خیال رکھنا چاہئے۔"

"او ہو کسی کا خیال۔۔۔" وہ معنی خیز انداز میں ہنسے۔ بیگم جاذب نے آنکھیں نکال کر [illegible] بازو رکھا اور [illegible] کی جیب سے سگریٹ نکال لیا تھا۔ پھر مسکرا کر بولے تھے۔ "مسٹر شہریار! کہیں اسموکنگ سے بھی کسی نے منع تو نہیں کر رکھا؟"

شہریار ہنس پڑا تھا۔ [illegible] کہ وہ فوراً اٹھ جانا چاہتا تھا مگر فی الحال یہ ممکن نہ تھا۔ وہ یہاں ٹھہرا ہوا تھا کہ یہ بزنس کے خلاف تھا اگر وہ مہمانوں کے اٹھنے سے پہلے اٹھ جاتا۔ مسٹر سلیم اختر نے اس کے چلنے کو [illegible] معنی دیے تھے۔ پھر وہ کافی پی کر ہی اٹھے تھے۔ شہریار نے ان کے اٹھتے ہی اپنا موبائل اور [illegible] اٹھائی تھی اور جانے کے لئے قدم بڑھا دیے تھے۔ بل چونکہ کمپنی کے حساب میں تھا سو اسے اس طرف سے سہولت تھی۔ لیکن گیٹ سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ جانان کی آواز [illegible] وہ جیسے اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

سالار بھائی اور [illegible] اس نے ایک نظر میں دونوں کو جانچ لیا۔ دونوں کے [illegible] بے حد [illegible] لگ رہے تھے۔ [illegible] عبدالرحمٰن نے بھی [illegible]

AANCHAL.COM

تھا صرف جتانے کے لیے وہ اس کے سامنے آنے سے کترا رہی وہ جو "عیاشیاں" کرتا پھر رہا ہے وہ ان سے اچھی طرح نہیں اور یہ کہ جازی بھی اب اس کی حرکتوں سے آگاہ ہے۔

اس نے دل ہی دل میں اس کی کوشش پر افسوس کا اظہار کیا تھا اور سیڑھیاں اترتا اپنی گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔ تب وہ پہلے کی مانند سنسناتا ہوا ہو گئی تھی۔ اس نے منزل واضح کی، اس کی سیل کوئی تھی، پھر کوٹ کی جیب سے اپنی وائس نکال کر ایک ہی سیکنڈ میں تین کالیں تھیں۔ جس لمحے وہ نکلیف کے رابطے ہونے کا انتظار کر رہا تھا اسی وقت اس کا موبائل بجا تھا۔ دوسری طرف ناطف تھا۔

"ہیلو شہریار ڈسٹربنگ۔" بہت گہری سانس لی تھی اس نے۔ دوسری طرف اتنی تیزی سے آغا کا سیل نمبر ... مگر دوسری طرف واقف تھا، شہریار آگیا تھا۔

"کہاں ہے تو؟.....اور یہ تیری آواز کیسی ہو رہی ہے؟ خیریت تو ہے؟ شہریار۔"

اس نے اس کی پریشانی سے حظ لیا پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "مجھے کچھ نہیں ہوا یار۔ بے فکر رہو، ابھی نہیں مرنے والا۔ ابھی بہت کام ہیں مجھے۔"

"بکواس مت کر، ساتھ تیرے بغیر کیا، اس کی ... جیل میں ہی نہیں ... جو تجھ کو ... آرام کرنے؟"

اس نے موبائل بائیں سے دائیں ہاتھ میں منتقل کیا پھر اسی تھکن سے بولا۔ "ہر کام ہو جاتا ہے۔ کسی کے ہونے نہ ہونے سے کام نہیں رکتے۔ مگر یار مجھے فارغ رہنے کی عادت نہیں ہے۔ فارغ ہوا تو بہت جلدی وقت گزر جائے گا۔"

"بکواس۔ یہ بتا کہ گھر جا رہے ہو؟ میں گھر آتا ہوں۔"

"نہیں پہلے گھر جانے کا ارادہ تھا۔ مگر اب میں گھر نہیں جا رہا، پاپا کے دفتر جا رہا ہوں۔ ... پاپا کے وکیل کے پاس مت ... ہیں۔"

ناطف نے کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا تھا۔ شہریار جانتا تھا وہ سخت ناراض ہو چکا ہے۔ لیکن کام بہرحال بے حد ضروری تھا۔ وہ اسے منانے کی بجائے راستے کی طرف نظر کیے خلاؤں میں دیکھنے لگا تھا۔ ایک لمحہ پہلے اسے لگ رہا تھا زندگی شاید ختم ہونے والی ہے۔ مگر دوسرے ہی پل سانس کی بحالی سے زندگی کتنی بھرپور لگی تھی۔ زندگی اور موت کا فاصلہ بس سانس بھر کا تو تھا......

وہ اپنی حالت پر خود ہی ہنسا۔ یہاں تک کہ دفتر کی عمارت دکھائی دینے لگی۔ شہزر نے کار اسی سیڑھیوں کے قریب روکی تھی۔ مسٹر ... عبدالرحمن کے اس کے بارے میں ... سخت قسم کے احکامات تھے، اس لیے وہ پوری طرح ... ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ شہزر نے بھاگ کر پہلے ہی دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ ... اندر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

اندر باہر! اس کی اندر سب میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ سالار کے غصے کے مقابلے میں اس کی تحت مزاجی کے باعث سامنا ان کے لئے اچھے اور بہتر بن چکے منظور کیا جا رہا تھا اور یہ بھی تھا کہ وہ اس رقم بنی کر پھر بنی کے کام میں باعث آؤٹ ہونے کے بھی تحفظ خاندان سب پاپا کا منتظر فیصلہ تھا کہ وہاں کے لئے بہتر بن چکا تھا۔

اس نے پاپا کے کمرے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ سالار عبدالرحمن کی تیز آواز کمرے میں گونجی۔

"پاپا! آپ وسیم کے کام کے لئے ان جیسے لاپروا انسان کو کیوں منتخب کرتے ہیں؟ آپ کو معلوم ہے وہ آج بھی مینٹل کے کام پر جانے سے ٹینٹ مار رہا تھا۔ جانتا ہے اس کے نام کا اپنا حق ہے جو اس کے کام سے بھی بہت کم تھا اور بندہ ہی ذاتی تجلی اس ماہر کی بیان سے پیچ گئی ہے پاپا! آپ کو سوچنا ہوگا کہ آپ اپنی کمپنی کے کاموں میں کس حد تک سنجیدہ ہیں۔"

شہر یار نے بہت سے دروازہ کھولا۔ کیونکہ بہر حال وہ یہاں نہیں سکتا تھا کہ سالار عبدالرحمن اس سے پہلے پہنچ گئے ہوں گے۔ کیونکہ خبر آنے کے لئے ٹارگٹ بھی اتنے کم فاصلے کا نہیں تھا۔ وہ دروازہ کھول چکا تھا۔ پاپا کمپیوٹر میں مصروف تھے اور ٹیلیفون کے چند فرق میں ان کے بجائے سالار عبدالرحمن کی آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔

مسٹر عبدالرحمن نے شہریار کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا اور اپنے طریقے سے سالار عبدالرحمن کو مطمئن کر کے فون آف کر رہا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا پاپا کی مصروفیت کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

چند منٹ بعد پاپا نے ویب ماسک آف کیا پھر وہ اس کی طرف مڑے تھے۔

"بہت تھک گئے ہو شاید؟"

"جی بس تھوڑا سا....." اس نے مختصر کہا۔ فائل ان کے سامنے رکھ دی۔

مسٹر عبدالرحمن فائل کی طرف دیکھنے لگے، پھر مسکرا کر بولے۔ "گڈ تم نے بہت اچھے ٹیسٹ لئے ہیں۔ اور ہاں سالار کی باتوں کو دل پر مت لینا۔ وہ بس یونہی جذباتی ہو جاتا ہے مگر یہ مطلب ہے وہ تم لوگوں سے کم تم سے پیار نہیں کرتا۔"

اس نے کچھ کہنے کے بجائے اپنے وجود کو کرسی سے اٹھنے پر آمادہ کیا تھا اور سر جھکا کر ان میں بڑ لایا تھا۔

"مجھے اس سے کوئی شکوہ نہیں ہے نا پاپا! کہ وہ مجھ سے کتنا پیار کرتا ہے کتنا نہیں۔ مجھے بس ایک ورکر کی طرح کام کرنا ہے۔"

AANCHAL

مسٹر عبدالرحمٰن نے سر ہلا کر اس کے لہجے کا یہ استفسار منظوری سے جانے دیا تھا۔ وہ دفتر سے نکلا تھا تو اس لیے اس کا رخ سیدھا گھر کی طرف ہی تھا۔ دانیا کے متعلق جو کچھ اس نے سنا تھا وہ اس کی وضاحت چاہتا تھا۔ دفتر کا خارجی دروازہ دھکیل کر کے وہ باہر نکلا مگر پارکنگ کی طرف سے ٹیک لگائے حافظ بیگ کو دیکھ کر اس کے قدموں میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

"تم یہاں؟...... تم تو شاید خفا تھے؟" اس نے زود حسی سے سوال کیا اور دوستی سے بولا۔

"ہاں، ناراض تھا۔ مگر پرانے زمانے کا بندہ ہوں، اس لیے دوستی کو آخری موڑ تک نبھانے کا قائل ہوں۔" وہ مسکرا کر پھر اسی لہجے کو برقرار رکھ کر بولا۔ "تمہیں پتہ ہے یا نہیں لیکن مجھے ہے۔ اس لیے دیکھنے آیا تھا کہ تمام تر عاقبت اندیشیوں کے باوجود ابھی زندہ ہو یا تعزیت خوانی کے لیے دس پانچ بندے جمع کرنے کی مہم شروع کروں۔"

اس نے جواب دینے کے بجائے پچھلی سیٹ کی طرف قدم بڑھائے تھے کہ اس کے برعکس دروازہ کھول دیا اور شیفر کی طرف دیکھ کر بولا۔ "گاڑی کی چابی مجھے دو اور میری کار تم گھر لے جاؤ۔ کار میں ڈرائیو کروں گا۔"

شیفر نے شہریار عبدالرحمٰن کی طرف تصدیق کے لیے دیکھا۔ شہریار نے ہولے سے سر ہلا کر "جو یہ کہہ رہا ہے وہی کرو۔ کسی زمانے میں کراچی کا ڈاہا کرتا تھا۔"

شیفر نے تفہیم انداز میں دیکھا مگر چابی اس کی طرف بڑھا دی تھی۔ حافظ بیگ نے اپنی کار کی چابی اس کی طرف اچھال دی تھی اور پجیرو کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا تھا۔ "تم نے اپنے شیفر کو اچھا خاصا خوفزدہ کر دیا ہے۔ اگر اس نے ون ون ون کو فون کر دیا تو؟"

شہریار کچھ نہیں بولا تھا۔ دراصل اس وقت اس کا کچھ بولنے کو دل ہی نہیں کر رہا تھا۔ دانیا کی فون کال اور موت کی دھمکیاں...... یہ سب بے تحاشا سوالات تھے جنہوں نے اس کے لاشعور کو گھیر لیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا مگر کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ مدت بعد وہ گھر کے سامنے تھے۔ اس وقت چار بج رہے تھے۔ یقیناً دانیا گھر آ چکی ہوگی۔

وہ سوچ رہا تھا۔ حافظ اس کے چہرے پر بکھرے سوالات پڑھ پا رہا تھا مگر خود سے دخل اندازی کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اپنے دوست کے مزاج کو جانتا تھا، کس بات پر پتے سے اکھڑ جاتا، پہلے سے اندازہ لگانا مشکل تھا۔

"حافظ......!" طویل خاموشی کے بعد اپنے کمرے کا لاک کھولتے ہوئے اس نے اسے پکارا۔

"کس بات پر پریشان ہو تم؟" وہ نام لیے جانے کی ٹون سے فوراً سمجھ گیا کہ وہ کچھ شیئر کرنا چاہتا ہے۔

"ہوں، میں بہت پریشان ہوں اس وقت......" اس نے کھڑکی کے پردے ہٹائے اور جھٹ سے بستر پر لیٹ گیا۔ وہ واقعی اس وقت بہت تھک گیا تھا۔

"کس بات سے پریشان ہو؟ کوئی خاص بات ہے؟ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ چھوٹی باتوں پر تم اتنا سنجیدہ نہیں لیتے۔"

شہریار اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ "حمزہ علید نے کسی طرح سے بابا کا دل پھر سے اپنی طرف موڑ لیا ہے۔ آج بابا بتلا رہی تھی، وہ کہہ رہی تھی، وہ پھر سے گھر میں واپس آ گئی ہے، اگر ایسا ہوا تو ختم جائے گا سب، پاپا اور صدیق بھائی کے باوجود ہم اس حماقت سے اسے نہیں روک سکتے۔"

عاطف نے اسے دیکھا مگر کچھ نہیں کہا۔ شہریار نے اسے پھر سے متوجہ کیا تو عاطف نے کھردرے لہجے میں کہا۔ "پتہ نہیں تمہیں یہ اچھا لگے گا یا نہیں مگر میں یہ کہتا ہوں، جب تک تجربہ نہ ہو تو اگلے قدم نہیں اٹھتے ہیں۔ منزل کو پانے کی جستجو میں راستے کا درست تعین کر پاتے ہیں۔ اس لئے چلنے والے کو خود تجربہ کرنے دو۔"

"تجربہ...... یا آگ کا تجربہ ہے۔ ہاتھ جل گیا تو؟"

"جل جانے دو۔ آگ بتا دے گی کہ اسے تو کتنی دیر اور کب تک اس میں تڑپ کیونکر ہوگا؟"

"ہاں مگر وہ کوئی انجان، ناسمجھ نہیں، وہ دانا ہے...... میری جان ہے اس میں...... اگر اسے کچھ ہوا تو میں پچھتاتا رہ جاؤں گا۔" اس نے تیزی سے بے قراری سے کہنے کی کوشش کی مگر بستر پر اٹھتے اٹھتے پھر لیٹ گیا تھا۔

"مر جاؤ گے کسی دن۔ کیوں بچے ہوئے ہو، بچے ہو؟" عاطف بیگ مسکرا کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ آدھے راستے میں ہی اسے رک جانا پڑا تھا۔ کیونکہ غیر متوقع طور پر اماں سامنے آن کھڑی ہوئی تھیں۔

"اماں آپ یہاں؟...... آپ کو آرام کرنا چاہیے تھا نا!" وہ یکدم چونک گیا۔

عاطف بیگ نے جانچتی نظر ڈالی پھر سر جھکا کر ماں کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ پھر مدھم لہجے میں بولیں۔ "تمہیں ابھی کچھ کہنا ہے تو کہہ لو، کچھ کمی تو نہیں ہے۔"

"کچھ خاص نہیں ہے، ہاں تو بہت دنوں بعد کام کیا ہے نا، اس لئے شاید کمزوری سے صورت پر اثر دکھ رہا ہے۔"

اماں نے مسکرا کر اسے دیکھا، کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں پھر انہوں نے اندر کی بات باہر نکالنے کے لئے اماں کا استعمال کیا۔

"بانو! حمزہ عابد کیا آج کل گھر آ رہا ہے؟"

بانو کے چہرے کے تاثرات تیزی سے بدلنے لگے۔ کیونکہ حمزہ عابد سے جانا اور جانا تھا سے جیسے ساری بہانی ہو گیے بھول گئی تھیں۔ انہوں نے خاموشی سے جوتی میں پیر ڈالے تھے پھر کچھ کہے بغیر کمرے سے نکلتی چلی گئی تھیں۔

شہریار ان کی کیفیت سے آگاہ تھا اس لئے اس نے زور ہی نہیں دیا تھا۔ اس کی پوری توجہ اس وقت اپنی طبیعت کے سنبھل جانے کی طرف تھی۔ مگر شام سے پہلے یہ ممکن نہیں۔ ماما سو شام کی چائے پر وہ لان کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی جازی نے طنز سے تیر اچھالا۔

"کچھ لوگ اپنے پہلے تجربے سے کچھ نہیں سیکھتے۔ انہیں غلطی کے بعد غلطی کرنے کی عادی ہو جاتی ہے۔ وہی ہے کہ یہ باقی سب کچھ فیڈ آؤٹ (Fade out) ہو جاتا ہے۔ صرف اپنا مشغلہ یاد رہ جاتا ہے۔ جا ہے اس مشغلے سے ان کے گھر والوں کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو رہی ہو۔"

شہریار نے معذرت خواہانہ مسکراہٹ کے ساتھ کپ لیا اب چائے کے اندر چینی گھولنے لگا۔ اس کے چہرے سے تاثرات جاننے کے لئے بے چین تھی۔ کیونکہ ماما نے اس کا سوال اس تک پہنچا دیا تھا اس لئے وہ چاہتی تھی کہ یہ بات جتنی جلدی کلیئر ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے کیونکہ حمزہ عابد اور بیوی نے ایک سال پہلے رشتے کی غرض سے انتظار کرنے کے لئے آمادہ کر لیا تھا۔ وہ چائے کے سپ لے رہا تھا جب بسکٹ کھاتی ماما کی طرف سوال اچھالا۔

"تم حمزہ عابد سے پھر سے ملنے گئی ہو؟"

"آف کورس...... شاید آپ کو یاد ہو وہ میرا فیانسی ہے۔"

"فیانسی ہے نہیں تھا۔ شاید تمہیں پتا نہیں ہے۔ پاپا اور ہم تمہاری شادی کسی اور سے کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ایک وقت میں تم خود بھی اس پر راضی تھیں۔ پھر اچانک......"

اس نے سوالیہ نگاہ جھکا لی اور ماما سنجیدگی سے بولیں۔

"ہاں ایک وقت واقعی میں آپ سب کی خواہش کے آگے مجبور ہو گئی تھی۔ کیونکہ مجھے لگتا تھا آپ میرے لئے کچھ غلط نہیں سوچ سکتے۔ مگر جب میں نے دیکھا خود آپ کی زندگی ایک کے بعد ایک

AANCHAL.COM.PK

مرمستی سے بھری پڑی ہے۔ ایک عام پولیس والا بھی نہیں ہوتا کہ یا ماموں آپ کے ذمہ کے ساتھ یا پارک کرے لگتا ہے تو پھر میں کیوں آپ کی غلطیوں کا حساب رکھوں؟ ماموں اچھا ہو سکتا ہے، میں کیسے مان لوں؟ آخر وہ ہے تو آپ کا دوست ہی ناں، میں کیسے بھول سکتی ہوں وہ گرفتاری جو ماموں کے ہاتھوں آپ کی ہوئی تھی۔ ڈرگ برآمد ہوئی تھی ناں آپ کی کار سے؟...... سارے اخبار بھرے پڑے تھے اس بدنامی سے، جب اچانک ماموں عبدالکریم نے پولیس کو فون کر کے کہا تھا آپ کسی کی دشمنی کا شکار ہوئے تھے۔ ڈرائیور جو عارضی بنیادوں پر رکھا گیا تھا، سارا الزام اس بے چارے کے سر گیا تھا اور آپ صاف بچا لیے گئے تھے۔ میں ایسے شخص پر اپنی زندگی کا انحصار کیسے کروں، جس کے کردار کی کوئی ضمانت نہیں، سوائے آپ کی گواہی کے اور آپ کی گواہی......" وہ استہزائیہ ہنسی پھر خود بولی۔ "آپ کی گواہی کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جو شخص ڈرگ رکھ سکتا ہو بظاہر ہی سہی وہ ڈرگ بھی لے سکتا ہے اور ڈرگ لینے والے پھر کبھی بھی برائی پر مائل ہو جائیں، انہیں کون روک سکتا ہے؟"

شہریار کے ہاتھ تنگ ہونے لگے تھے۔ مگر وہ خاموشی سے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ حمزہ جا چکا تھا، چند دنوں میں وہ بابا عبدالرحمٰن کی بہت اچھے سے برین واشنگ کر چکی تھی۔ جازی اس کے ساتھ اس پر طنز سے مسکراتے ہوئے خاموش تماشائی کا کردار نبھا رہا تھا۔ سو وہ جو خیال دل میں لے کر آیا تھا، اسی تیزی سے کسی کی کرسی پر سے اٹھ گیا تھا۔ جواب میں کچھ کہے بغیر وہ واپس اپنے روم میں لوٹ آیا تھا۔ جس وقت اس کی کمرے میں انٹری ہوئی اسی وقت اس کا موبائل بجا تھا۔

یقیناً یہ عاطف ہوگا۔ اس نے ریسیو کرنے کے بجائے موبائل آف کر دیا تھا۔ وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا، مگر بہت سی باتیں ایسی گڈمڈ ہو گئی تھیں کہ اسے کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔

❀ ❀ ❀

"تو اچھی رہی، تیری تو حویلی سے جان چھوٹ گئی۔ پتہ نہیں، کس کی دعا ہے تیرے ساتھ، تیرا کیا چاہو تو ہوئی اچھا ہو جاتا ہے۔" رات آرام کرنے کے لیے لیٹتے ہوئے بوڑھی نوکرانی نے سسکی مارتے ہوئے ہم عمر بیٹھی عورت کو دیکھ کر حسرت سے کہا۔

"میرا بھلا...... میرے لیے اچھا بھی ہو سکتا ہے؟" وہ یونہی بے دھیانی میں، مقصد خیال آرائی نہیں تھا صرف ذاتی محاسبہ تھا۔ مگر وہ بوڑھی ملازمہ بھی شاید اس سے مخاطب ہے۔ سو فوراً چیخ کر پھر سے بولی۔ "تو اور کیسی ہوتی ہے اچھی قسمت۔ ادھر دیکھ پچاس سال ہو گئے، کسی نے نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ اور تو ہے ہر رات کوئی نہ کوئی تجھے اپنا تکیہ بنا لیتا ہے۔ تیرے پاس اب اتنے سارے روپے ہوتے ہیں۔ میں نے تو جانی سے سنا ہے، تجھے شیخ نے وہ بغیر بتی والا فون بھی لا کر دیا ہے۔ وہ جو آقا زادے استعمال کرتے ہیں، پھر خوشبو کپڑے کتنی چیزیں کا کوئی گنتی نہیں، پھر تو خوش قسمت کیسے نہیں ہے؟"

بنگلے میں پہنچی عورت نے کچھ نہیں کہا۔ کمرے میں بیرات کے دیئے گئے تحفے یونہی کمرے میں پڑے تھے۔ دوسری نوکرانیاں وہ سامان عاریتاً اٹھاتیں مگر وہ ان کی کیفیت ان بن جاتا۔ بنگلے میں پہنچی عورت ان کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھتی۔ کچھ مہینوں میں ہی اُسے لگنے لگا تھا وہ قریب المرگ ہو گئی تھی ماں کی ممتا جدائی سہہ نہیں پا رہی تھی۔ حویلی میں تھی تو ایک آدھ بار ہی سہی، بچے بچے کو دیکھ لیتی تھی۔ مگر یہاں تمام گردش میں تو جیسے وہ گردش ہی میں آ گئی تھی۔

جانے رات کے کتنے پہر تک وہ جاگتی رہی۔ پھر وہ دوسری صبح ناشتے سے فارغ ہوئی تھی کہ بیگم صاحبہ کا پیغام چلا آیا۔

"تجھے شہر جانا ہے، بابا جی کے ساتھ......"

دوہر بلا کر جس نیند میں تھی اسی حلیے میں چادر اوڑھتی اٹھ گئی تھی۔

پھر وہ پہر تک دو گاؤں سے کہاں اونچے نیچے راستوں پر سفر کرتی رہی۔ یہ راستے اُسے پانی کمالیا کی پہنچ لے جا رہے تھے۔ یکدم تیز دھوپ میں سے ایکا ایکی گھور اندھیری چھا گئی تھی سا یک رات اس کے قدموں سے آن لپٹی تھی اور ایک ہر ہانی اس کے لباس کا تار تار ہو گئی تھی۔ لباس اتارتی تو بھی رسوا ہوتی تھی لباس وجود پہ رہتا تو بھی رسوائی کسی چڑیا کی طرح اس کی روح میں رینگتی پھرتی۔ سوچوں کے دوران پھر راستہ کیسے طے ہوا اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ شہر کی گلی میں گاڑی کے رکنے کے بعد ہوش کر راستہ قدموں سے لپٹنے لپٹے اس مکان کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ مگر کیا واقعی اس کے رکنے کا کوئی آخری مرا تھا؟

"چل اتر...... آگئی بڑی خوب صورت۔" بڑی بیگم صاحبہ کا لہجہ...... وہ حیران رہ گئی۔ اسے دولا رانوں نے تحفی سے [illegible] تھا۔ اس کا بیگ بھی اس کے قدموں میں پھینک دیا گیا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ نے رعونت سے کہا تھا۔

"تو جیسی عورت کا کون سی نسل سے ہے؟ آتی بے عزتی کے ٹکڑوں پہ پلنے اور دوسروں کے گھر والوں کی جھوٹی محبت پہ جینے کی عادت ہے۔ حویلی کی ساری عورتیں تجھ سے تنگ تھیں۔ وہ کہتی تھیں ان کا گھر والا ان سے زیادہ تجھے وقت دیتا ہے، پیسہ لٹاتا ہے۔ بس میں نے سوچ لیا تجھے اب حویلی میں نہیں رکھنا۔ شہر والی کوٹھی میں اب تجھے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ رہ یہاں پہ جب تک تجھے تیری بے غیرتی جینے دیتی ہے۔" "مجھے مجبور کر کے بھیجا" اسی رعونت سے بولی۔ "تو اگر مجبوری ہے، تجھے یہاں ڈر والا کر لے گا تو اس بات کو بھول جا۔ یہ کوٹھی میرے باپ کی پراپرٹی کا حصہ ہے، جس کا زور کوئی ختم نہیں۔ اب تجھے یہاں سے تیری موت ہی نکال سکتی ہے۔"

وہ گھٹنوں میں سر ڈال کر بیٹھ گئی۔ کچھ نہیں بولی اور گاڑی میں بیٹھتی ہوئی ملازمہ نے ڈرائیور سے کہا تھا۔

"اگر یہ یہاں سے بھاگنا چاہے تو اسے روکنا مت۔ حویلی والوں کے لیے یہ مستقل درد سر ہے، اسے جانے دینا جہاں جانا چاہے۔ مگر سنو! اسے اس سارے پلان کا علم نہ ہو، اسے بھی مخفی رکھنا۔ کریں ہماری غفلت سے فائدہ اٹھا کر بھاگ گئی ہے۔ رہے دادا حضور تو انہیں کسی نہ کسی طرح سمجھا لوں گی۔ مگر تم یہاں آنے کا ذکر کسی سے مت کرنا۔ کوئی بھی پوچھے، کہنا بھاگ گئی کنیز......"

"جو حکم......" ملازم نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی گیٹ سے باہر نکل گئی۔ سامنہ کے خاص ملازم نے وہاں مینی کو جو باتیں کی تھیں۔ مگر وہ کیا باتیں تھیں، بکس میں لیٹی حورعین ان سے بے خبر تھی۔ ہاں، بس وہ یہ جانتی تھی کہ وہ یہاں آزادی سے سانس لے سکتی تھی۔ اس نے ایک [illegible] استعمال بنایا تھا۔ مگر تین دن نہیں گزرے تھے کہ اس کے سر پر بم پھوٹ گیا تھا۔ زوار حسن اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا تھا تم اتنی آسانی سے مجھ سے پیچھا چھڑا سکتی ہو؟ تمہیں یاد ہے تم نے پچھلی بار میری کتنی تذلیل کی تھی، میری طلب کو ٹھکرا دیا تھا۔ میرے منہ پر جو تھپڑ مارا تھا اسی نے مجھے تم سے بدظن کیا تھا، ورنہ شاید میں تمہیں اپنا نام دے ہی دیتا۔ [illegible] مگر تمہیں [illegible] عزت راس نہیں آئی۔ تب میں نے قسم کھائی تھی کہ تمہیں اتنا پامال کروں گا [illegible] کہ تم خود چیخ چیخ کر جان لو کہ عزت اسے ہی ملتی ہے جسے ہم عزت دینا چاہیں۔ ذلت اسے ملتی ہے، جس کی پشت سے ہم ہاتھ اٹھا لیں۔ سوچو سوچو...... تم سوچتی رہو کہ میں یہاں تک کیسے پہنچا؟ تو جان لو تمہاری مالکن کی طرح میرے بھی کچھ خاص ملازم ہیں جنہیں میری غیر موجودگی میں میرے معاملات کی دیکھ بھال کرنے کا کام سونپا گیا ہے۔ چلو اٹھو اپنا سامان پیک کرو۔ ہم حویلی جا رہے ہیں۔"

اس نے مرے مرے ہاتھوں سے سامان بیگ میں رکھا تھا۔ پھر واش روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔ زوار کمرے سے باہر تھا۔ [illegible] یاد کرنا چاہتی تھی۔ اس نے بیسن میں نل کھول دیا تھا۔ پھر یاد کرنے لگی تھی۔

کوئی نمبر تھا جسے ایک وقت میں اس نے بہت دفعہ ملایا تھا۔ مگر اس وقت اسے وہی نمبر ملانے کے لیے بہت ذہن پر زور ڈالنا پڑ رہا تھا۔ جیسے ماضی کی ساری میموری سکرین بلینک ہو گئی تھی۔

زیرو تھری [illegible]...... پھر جیسے نمبر خود بخود بلینک میموری سکرین پر اسپارک کرنے لگے۔ پانچ پل میں ڈائل کیا گیا تھا۔

"ہیلو، شہریار اسپیکنگ۔"

وہ رو پڑی تھی۔ اس نے [illegible] کچھ کہنا چاہا تھا مگر پھر بھی سسکی سن کر دوسری طرف لہجے میں تیزی آ گئی تھی۔

"ہیلو، کون؟"

"میں...... میں بول رہی ہوں۔"

"کون...... کون ہو تم؟"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی بابا برہم ہوئی۔

"جلدی لوٹ آؤ لڑکی! ابھی شام تک یہاں تمہارا اس طرح انتظار نہیں کر سکتا۔"

اس نے موبائل آف کر دیا تھا۔ پھر موبائل اس نے بیگ میں چھپا لیا تھا اور مجرموں کی طرح مڑ کر دیکھتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی تھی۔

نہ جانے آگے کیا ہونے والا تھا؟

کوئی بھی اجنبی راستوں سے گزر رہی تھی اور اس کا دل کہہ رہا تھا فون کال میں اس نے جو ایک سوال گمنام چھوڑا ہے اس کے جواب کے لئے وہ بے حد بے چین ہے۔ کیا کرے گا؟ کیا واقعی اس شخص کے لئے اس گمنام سوال کی کوئی اہمیت ہوگی؟

اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

❁ ❁ ❁

عارف مسٹر سلیم اختر کے سامنے بیٹھا ہوا نئے پروجیکٹ کی تفصیل دے رہا تھا اور جبر ٹرسٹ میں ملوث لوگوں کے نام جاننے کا انتظار کر رہی تھی تو اس نے کوئی بات نہ کی تھی مگر مسٹر سلیم اختر نے اچانک نئے پروجیکٹ کی تفصیلات سمجھنے کے لئے عارف کو روک لیا تھا۔ وہ ہو ہنگ کے شعبے سے منسلک تھا سو فوڈ چین میں سرمایہ کاری کرنے کے متمنی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عارف جانے کا سو فوڈ سے منسلک افراد کا کاروبار کا پیپر ورک اور کال ریکارڈنگ ان کے سامنے رکھا تھا۔ وہ ان پر بحث کر رہے تھے کہ کس پارٹی سے میٹنگ کی جائے؟ اس کا موبائل بار بار وائبریٹ ہو رہا تھا مگر وہ اس وقت جواب نہیں دے پا رہا تھا۔ مگر ان کے اس رویے کے اظہار کے لئے تیار نہیں تھی سو انہوں نے جھنجھلا کر میں جب دوسری دفعہ اس کی فرم میں چلی آئی تھی۔

"پاپا! ہمیں باہر جانا ہے، پلیز بس ذرے کے وقت کام مت کیا کیجئے۔"

سیٹھ اقبر نے آتے ہی دیکھا، بچّہ کاغذات سنبھال لیے۔ "اوکے عارف! اہم گفتگو جا کر میں پڑھ لوں گا تفصیلات دیکھ لوں، پھر کل دفتر میں بات ہوگی۔"

عارف اٹھ گیا تھا پھر کار میں بیٹھتے ہوئے وہ اس کے لہجے میں بولا تھا۔ "تمہارے پاپا بھی بزنس کی بہت سخت ہو جاتے ہیں، جان تک نہیں چھوڑتے تھے سر! اچھا ہوا تم چلی آئیں۔"

"بکواس مت کرو عارف! اور میرے پاپا ہیں، ان کے خلاف میں کوئی غلط بات نہیں سن سکتی۔" انوشے نے مصنوعی خفگی سے آنکھیں دکھائیں۔

"بس بس یہی تو مجھے تمہاری یہی ادا تو اچھی لگتی ہے۔" وہ اس کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگا پھر اس کا ہاتھ تھام کے خود سے قریب کر لیا۔

"تمہاری قربت میں مجھے لگتا ہے میں بہت محفوظ ہاتھوں میں ہوں۔"

"اچھا ابھی آج تک لیٹ نائٹ میرے ساتھ کہیں گئی نہیں ہو، آج رات ٹھیک ہے بلکہ چلو ابھی چلیں کسی دن۔"

"ضرور چلوں گی...... کسی دن چلوں گی، لیکن ابھی مجھے اس مارکیٹ کے پیچھے والے بد بودار علاقے کیوں لے جا رہے ہو، کہیں تمہارے مطلب کی چیز کہاں چھپا رکھی ہے؟"

"مطلب کی چیز؟" عارف جواباً آنکھوں میں چمک لہرائی، پھر شرارت سے بولا۔ "ہم تمہیں بتا دیں یہاں سے جنت کا راستہ ملتا ہے تو کیا کرو گی؟"

"جو تم کرو گے وہی کروں گی۔"

اس نے تھوڑا آنکھوں سے دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ "چلو پھر کرتے ہیں، میں تمہیں جنت کی سیر کرواتا ہوں۔" اس نے گاڑی آگے بڑھا دی اور پھر بہت ہی گندی گلیوں میں سے ہوتا ہوا ایک گلی میں جا کر رک گیا۔

"تم اندر چلو گی یا باہر ہو گی؟"

"تمہارے ساتھ اندر چلوں گی۔" وہ اس کے بازوؤں پر اپنے وجود کا وجود ڈالتی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ گندا سا ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر وہ اندر آئے۔ کاؤنٹر میں بات چیت کے بعد کہیں جا کر وہ اس کمرے سے مزید اندر داخل ہوئے تھے۔ ایک طرف فروٹ بیچنے کا ڈھیر لگا ہوا تھا، ایک طرف بستر تھا۔ گندا بستر اور ایک عورت اس پر لیٹی ہوئی تھی۔ انوشے کی ساری توجہ اس عورت پر جا کر جم گئی تھی۔ وہ قطعی مطمئن تھی مگر اس نے بہت تعجب سے انوشے کو دیکھا تھا۔

انوشے کو عجیب سا احساس ہوا۔ عارف ایک چالیس، پینتالیس سال کے مرد سے اپنے مطلب کی باتیں کر رہا تھا۔ انوشے نظریں تھیں پھر وہ عورت کے پاس جا کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی تھی۔

"تم کون ہو؟" اس نے اس کے بالوں کو چہرے سے ہٹا کر پوچھا۔

اس عورت نے اس کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ "سنا...... چوڑیاں...... سونے کی چوڑیاں، مجھے دے دو...... مجھے دے دو۔"

انوشے کی اس کیفیت سے گھبرا کر چیخ نکل گئی تھی۔ عارف تیزی سے اس کے پاس آیا تھا۔ اس نے بروقت اس کا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تھی مگر اس مفلوج عورت میں بلا کی طاقت تھی۔

"یہ ایسے نہیں مانے گی صاحب! ایک منٹ۔" وہ مرد اندر گیا۔ واپس آیا اس کے ہاتھ میں ایک انجکشن تھا، جو اس نے بے دردی سے اس عورت کے بازو میں لگا دیا تھا۔

"مت لگاؤ...... یہ زہر ہے...... مجھے چھوڑ دو...... میں کچھ نہیں مانگوں گی...... مجھے دولت نہیں چاہیے...... چھوڑ دو، چھوڑ دو۔" انوشے اپنا ہاتھ چھڑا کر بار بار اسے جھٹک رہی تھی۔

"کون ہے یہ پاگل عورت؟" عارف نے قدرے کھردرے لہجے میں پوچھا تو وہ مرد خباثت سے ایک آنکھ دبا کر بولا۔

"پتہ نہیں صاحب! کون ہے؟ ہم تو آٹھ سال پہلے یہاں کچرے کے ڈھیر پر پڑی تھی۔ اس وقت بھی یہی بات، پیسہ پیسہ کہہ رہی تھی...... نچلا دھڑ اس کا شروع سے مفلوج ہے۔ سو روزانہ پانچ سو روپے دیہاڑی پہ ایک منشی آکر اسے لے جاتا ہے۔ وہ نمبر اس کے کام پہ لگاتا ہے۔ ہمارا حصہ دے جاتا ہے۔ خوب عیش میں ہے...... یہ بھی...... ہم بھی۔"

انوشے گھبرا کر دروازے پر جا کر کھڑی ہوگئی تھی، اس لئے اس نے یہ ساری گفتگو نہیں سنی تھی۔ مگر بستر پہ لیٹی بے بس عورت اسے ابھی تک ہانٹ کر رہی تھی۔

"کتنی لاوارث لگ رہی ہے، جیسے اس کا کوئی نہیں ہے۔ اگر اس کی اولاد ہوتی تو شاید اتنی زیادہ بری حالت نہ ہوتی۔ میرے خیال میں اب بھی تھوڑی بہت وقعت پاتی ہیں۔ لوگ کتنے عزت سے جینے نہ دیں، مگر عزت و احترام سے دفن ضرور کرتے ہیں...... کیا میرا بھی یہی انجام ہوگا؟ میری بھی کوئی اولاد نہیں ہے۔ میرے باپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔ میری ماں سوتیلی ہے۔ ایک بہن ہے مگر وہ بھی سوتیلی ماں کی زبان بولتی ہے۔ میرا بھی ایسا ہی خوف: کہ انجام مختصر ہے کیا......؟" اس نے جھرجھری لی، پھر ہذیانی انداز میں بولی۔ "عارف! چلو یہاں سے۔ میرا یہاں دم گھٹتا ہے۔"

"اوکے، ٹھیک ہے چلو۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے خدا حافظ کہا اور انوشے کو سنبھالتے ہوئے باہر آگیا۔

وہ کار میں بیٹھی تو اس نے سوال کیا۔ "کون عورت تھی وہ عارف؟"

عارف ہنسنے لگا، پھر مسکرا کر بولا۔ "ہے ایک پاگل عورت...... کسی نے اسے اس حالت میں کچرے کے ڈھیر پر ڈال دیا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ مر جائے گی۔ زیادہ مقدار میں ہیروئن کے استعمال کی وجہ

ہے...... اور ایک فقیر ہے جو سے رہتی ہے پچھلا کی معروف سڑک پہ لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں، وہ کوئی پہنچی ہوئی اماں ہے۔ مختلف سوال کرتے ہیں لوگ، جس پہ وہ ہاتھ کے اشارے سے کچھ کہہ دیتی ہیں، وہ اس کے لوگ معنی ڈھونڈنے لگتے ہیں، فقرہ نکالتے ہیں، جو لوگ اپنے معنی میں ٹھیک نکلتے ہیں تو اُن کا اعتقاد اس پہ بڑھتا جاتا ہے۔"

انوشے کھلے منہ سے اُسے دیکھتی رہی، پھر بہت آہستہ سے بولی۔ "اوہ، پور وومن! اپنے نہیں کسی کی زندگی کا حاصل ہوگی۔"

"ایسی عورتیں کسی کی زندگی کا حاصل نہیں ہوتیں۔ کوئی ایری غیری سی عورت ہوگی، ورنہ......"

"پلیز عارف! یوں مت کہو، پتہ نہیں اس بے چاری کے ساتھ وقت نے کیا کہانی گھڑی ہے، جو وہ یوں تصویرِ عبرت بنی ہوئی ہے۔"

وہ اس کے لہجے میں ڈوب گئی تھی کہ عارف جواد نے اُس کا شانہ ہلایا تھا۔ "چھوڑو وہ دوسروں کا غم، یہ دیکھو تمہاری جنت کا پتہ لے کر آیا ہوں۔" اُس نے لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ کافی مقدار میں ڈرگ تھی۔ اُس کی آنکھوں میں خمار اُتر گیا تھا۔ "تم...... تم میرے کتنے اچھے دوست ہو عارف!" اُس نے اُس کے شانے پہ سر رکھ دیا تھا۔ مگر عارف جواد کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

"آج لیٹ نائٹ ہی واپس چلیں؟"

اُس نے ہاں کہہ دی۔ مگر عارف جانتا تھا، آج کے موقع کو اس نے کس طرح استعمال کرنا تھا۔ انوشے ڈرگ کی ایڈکٹ تھی، آزاد خیال بھی تھی مگر آج تک اُس نے اتنی آسانی سے کبھی تنہائی کا موقع نہیں دیا تھا اور آج وہ موقع اُسے مل رہا تھا اور جواد حسن کے کہنے پہ وہ دولت حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اُس نے زندگی میں کبھی بھی دولت کے علاوہ نہیں سوچا تھا لیکن ایک حادثے کی طرح محبت اس کی زندگی میں آئی تو اُس نے ایک کھڑکی بند کی۔ محبت کے لیے اور دولت کے لیے دل میں الگ الگ پورشن رکھنے کی کوشش کی۔ وہ محبت شافعہ سے کرتا تھا مگر دولت کے لیے انوشے کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شافعہ سے ملنے کے بعد واقعی اُس کی زندگی میں بدلاؤ آیا تھا مگر اس نے اتنے برے حالات دیکھے تھے کہ دولت اور پیسے کے لیے اس کے اندر خود بخود ایک لالچ بھر گیا تھا، ایسے جیسے پیٹ بھر جائے مگر نیت نہ بھرے۔ پھر جواد حسن تھے، اس کی زندگی کا نیا موڑ۔ وقت اُن کے ساتھ گزر رہا تھا، اس لیے بچپن سے جو چالاکیاں، غلط باتیں اور کرپشن اس کے اندر در آئی تھی وہ چھوٹ نہیں سکتی تھی۔ پھر جب جواد حسن سے اُس نے شافعہ سے شادی کی بات کی تھی تو انہوں نے اپنے لائن آف ٹریک سے اس کے بچنے پہ اُسے خوب جھاڑا تھا۔ اُن کا خیال تھا انوشے سے شادی کے بعد یہ محبت کا بھوت بھی اتر جائے گا۔ مگر وہ ضد پہ اڑا رہا تو انہوں نے تجویز دی تھی کہ وہ انوشے کو کسی بھی طرح حاصل کر کے اُن کی دولت حاصل کرنے کے پلان کو کامیاب بنا دے تو وہ شافعہ کو اس کے لیے پالا لیں گے۔ مگر شافعہ کا معاملہ

اُسے اس وقت تک یاد رکھنا پڑے گا، جب تک وہ قریب سے اُس کی زیارت نہ کر لیں گے۔ وہ ماننا نہیں چاہتا تھا لیکن سالوں کے لئے مان گیا تھا۔ پہلے وہ درحقیقت صرف انوشے کو ہینڈل کرنا چاہتا تھا لیکن اب صرف جواد حسن کی زندگی بچے سے وہ لیا گیا۔ نے پرکشش تھا اور ان کا پلان بھی جواد حسن کے دماغ کی کارستانی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے پہلے کہ انوشے ہمیں پر پکڑ لے، کسی اپنی پسند بدل جائے یا وہ اس کو ٹھوکر دے، وہ اسے اس مقام پر لے جائے کہ پھر انوشے اور سلیم اصغر کے پاس سوائے عارف جواد کے ساتھ شادی کے آپشن کے کچھ نہ بچے۔ نئے حالات اور موقع اس کے ساتھ تھا، اس لئے وہ شادی کو پانے کے خیال سے مست انوشے سلیم اصغر کے ساتھ جواد حسن کے نئے بنائے گئے بنگلے کی طرف نکل آیا تھا۔ اسے یقین تھا اس کی شدید خواہش پر اس نے اسے مانند کا گفٹ دے دیا تھا، اس لئے اس کا خیال تھا وہ اس کے لئے بہت آسان ثابت ہوگی۔

سی ویو کی ٹھنڈی ہوا نے انوشے کے نشے کو دوآتشہ کر دیا تھا۔ وہ انوشے کو سہارا دیتے ہوئے بنگلے کی طرف بڑھ رہا تھا، جب بہت اچانک کسی نے پوچھا تھا۔

”کیا ہوا مسٹر؟“

”کچھ نہیں میری دوست ذرا زیادہ تھک گئی ہیں۔“

چوکیدار کی آنکھوں میں اس کے جواب سے بے یقینی در آئی۔ شاید اس کے لہجے میں احساسِ جرم کی لرزش در آئی تھی یا کہ پہلی دفعہ وہ بہت ہی دلچسپ تجربے سے گزرنے کے باوجود بھی بہت نروس ہو رہا تھا۔ عارف لہجے کی لرزش کو قابو میں رکھ کر اپنے بنگلے کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ اسے لگتا تھا یہ موقع شاید وہ کبھی حاصل نہیں کر سکے گا۔ وہ محبت تو کرتا تھا مگر اسے حاصل کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا اور اپنی مرضی کرنے سے پہلے ایسی ہی زندگی کا مسئلہ کھڑا ہو، سو وہ جواد حسن کی مرضی کرنے پر مجبور تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا، آج کے جدید زمانے کا کم خوبیوں اور زیادہ خامیوں سے بھرا ہوا انسان تھا۔ ایسا انسان جسے شاید ابھی محبت اور ہوس کا فرق تک نہیں معلوم تھا، جسے تو محبت کا مطلب بھی نہیں معلوم تھا۔ یقیناً اس کے دل نے اف لالف میں کھو سکتا تھا مزہ لگ رہا تھا...... اور غیر متوقع اس محبت نے اُسے بے خود کر دیا تھا۔

پھر پانچ منٹ بعد کی بات تھی، جب انوشے کی چیخوں نے اسے ہراساں کر دیا تھا۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے؟...... کون ہو تم؟“

"کوئی نہیں ہے، میں ہوں نا نوشین" اس نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر چپ رہنے کی کوشش کی مگر بہت پہلے ہی وہ چلا چکی تھی۔
"پھر دروازہ کھول لے۔ مجھے لگتا ہے، آپ کو میری بہت ضرورت ہے۔"
"آپ جو کوئی بھی ہیں، پلیز اپنے کام سے کام رکھیے۔" عارف نے کہا، مگر دوسری طرف جو کوئی بھی تھا اب سوال کرنے کے بجائے بہت زور سے دروازے کو کندھے کی چوٹوں سے بجا رہا تھا۔ کنڈی ٹوٹنے لگی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دروازہ پورا کھل گیا تھا۔ نوشین ڈرنے میں بڑی ہوئی تھی۔ جس قسم کی چیخ نکلی تھی لڑکی اس سے بچ گئی تھی اور عارف خوف سے ان دونوں کو تک رہی تھی۔ وہ جوان اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور کھردرے لہجے میں بولا۔
"مجھے لگتا ہے مسٹر! آپ لڑکی کی کسی مجبوری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"
عارف جواب دینے کے بجائے بھڑک اٹھا تھا۔ "کون ہو تم؟ تمہیں کس نے حق دیا کہ ہمارے معاملے میں بولو؟ یا پھر لڑکی کون ہے تمہاری؟"
اجنبی اس سوال پر گڑبڑا گیا تھا پھر سنبھالا لے کر بولا۔ "آپ کا سوال بجا اور میرا جواب بھی واجبی، لیکن سیدھی سی بات ہے ضرورت سے زیادہ اچھی شکل سے لگ رہی ہے مشرقی بھی ہے، اس لیے مجھے لگا، مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے۔"
عارف نے ساتھ کھڑی ان سنا کر کے سامنے کھڑے لڑکے سے پوچھا۔ لڑکا اب اس کی شاید سے دور رہا تھا اور اپنی مرضی سے چلنا چاہ رہا تھا۔ لڑکے کو ہر طرح رکھا رہا تھا۔ اجنبی لڑکے نے اس کے بارے میں پیچھے ہوتے ہوئے کہا تھا۔ "آپ حد سے زیادہ بڑھ رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے، میں ابھی آپ کو سخت مشکل میں بھی ڈال سکتا ہوں۔ پولیس سے میرے بہت اچھے تعلقات ہیں۔"
"اچھا تو یہ بات ہے، کھانے والے قبیلے سے تعلق ہے تمہارا۔"
"کہاں سرکار! ہم کہاں اُن فیصلے کرنے والوں سے Belong کر سکتے ہیں؟ وہ عظیم لوگ تھے۔ ہم جیسے دنیا دار لوگ تو بس تھوڑی بہت تنخواہ پر ہی بہت ہے۔"
"تجی یا..... قسمت ہوتی کی؟"
اجنبی کو چھوڑ کر اب اس نے بات کو طول دیا تھا اور نوجوان نے موقع غنیمت پا کر موبائل نکال لیا تھا۔ پھر اس نے ایک نمبر ملا کر کے کہا تھا۔ "ڈی ایس پی صاحب! دیکھیے، آپ کی رعیت میں آپ کے

دوست کے ساتھ کتنا برا سلوک ہو رہا ہے۔"

عارف جواد کے بانچھیں کھل گئے تھے۔ وہ کتنا بھی تیز طرار سہی، لیکن یہ ملک اس کے لئے فی الحال اجنبی تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ جاننے بوجھنے کہ ساحل کے معاملات تمام پولیس کے دائرہ اختیار میں تھیں اس نے پھر بھی پریشان ہو کر اتوشہ کے مجبوری کا تھا نوجوان نے کوفت سے اس کی طرف دیکھا۔

"پولیس......؟" اس نے ذہن پر زور ڈالا اور یکدم بزنس پارٹی کی ایک تصویر اس کے ذہن میں ابھر آئی۔ یہ خاندان وہی سب سے بڑا بزنس مین تھا اس ملک میں۔ یہ قبیلہ ابھی حال ہی میں شفٹ ہوئی تھی۔ یکدم اسے ملک کی ماں کو بھی سنانے لگی تھی۔ بارے آئے ہوئے لوگوں کے لئے پاکستان ویسے ہی ننانوے فیصد اچھا نہیں ہوتا ہو، وہ بھی جاننا تھا کہ بیٹا شہریار مزید گھبرا ہو گا اس نے لڑکی کو سہارا دے کر اٹھایا تھا۔ اس کے دفتری بیگ میں اس کے پیچھے سے گاڑی جا چکی تھی، مگر اس کے گیٹ پر بزرگ کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔

شہریار...... وہ ضرور جانتا ہو گا، بزنس کمیونٹی کے لئے وہ اور بکنگ تھا اس نے لڑکی کا بیگ اور جیکٹ اور کھول کر بہت آہستگی سے سنبھالا تھا، پھر ہوا کا سکون چلت باندھ کر اس نے کار اسٹارٹ کی تھی اور سڑک پر چلتے ہوئے موبائل پر نمبر پش کئے۔ Bluetooth کے ذریعے دوسری طرف فون اٹھائے جانے کا انتظار کرنے لگا تھا۔ کافی دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو شہریار اسپیکنگ...... کون؟"

"کون ہو سکتا ہے میرے علاوہ...... بقول شاعر

ہم بھی رکھتے تھے زاد راہ ہمراہ
اپنا غم، تیرا غم، جہان کا غم

"کون عارف؟" دوسری طرف سے ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی، پھر آہستگی سے بولا گیا۔ "رات کے گیارہ بجے تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"کہاں سے بول رہا ہوں یہ چھوڑو، بتاؤ تم گیارہ بجے سونے والوں کی لسٹ میں کب سے شامل ہو گئے؟"

دوسری طرف سے ہنسی کی آواز آئی، پھر اس نے آہستگی سے کہا۔ "نہیں، ویسے آج ذرا طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی، اس لئے جلدی لیٹ گیا تھا۔"

"طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ مطلب بیمار ہو؟" وہ اپنا غصہ بھول کر سرعت سے پوچھنے لگا اور شہریار کا قہقہہ اس کی سماعت سے ٹکرایا۔

"بہت فکر ہے عاطف تو۔ چلو ہے، کبھی کبھی تو مجھے یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ میری شادی نہیں ہوئی۔ بالکل بیویوں والی ٹون میں بولتا ہے۔" لمحے بھر رک کر وہ پھر سنجیدگی سے بولا۔ "کوئی خاص پرابلم نہیں ہے، بس کام کرنے سے جلدی تھکاوٹ ہو جاتی ہے اس لیے آرام کر رہا تھا۔ ویسے تم کہاں تھے؟"

"میں وہیں پر تھا۔"

"تم وہیں باقی رات گئے؟ کیا کر رہا تھا؟"

"کیا کہوں گا، تیرا غم منانے آیا تھا۔ مگر یہاں تو مستی کرنی پڑ گئی۔ بلکہ پوچھو تو بھی بچے بیٹھی۔"

"کیا مطلب؟" شہریار کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی تو اس نے سلسلۂ کلام آگے بڑھایا۔

"ہاں یار، جو آرٹ گیلری میں سے لوگ آئے ہیں ان میں سے ترکی کی مسز۔۔۔ کیا نام ہے ان کا؟"

"مسز شبنم افسر اور شیخ کی، وہ یہاں تقریباً 25 سال سے ہیں۔ ہاں وہ پاکستان بھی آئے ہیں۔ مگر تمہیں بات کے تیار بیچ یہ سوال کرنے کا خیال کیوں آیا؟"

"یار ان کی بیٹی ہے ناں، دیکھو، کیوں کام میں نہیں بھولتا۔"

"کہو مت، میری باجی کی عمر کی ہے۔ عزت سے ذکر کر۔" دوسری طرف سے شہریار کی خفگی بھری آواز سنائی دی تو وہ مسکراتے ہوئے شرارت سے بولا۔

"ہاں باجی کی عمر کی ہوتی ہوگی اپنا کام تو دل بہلاتا ہے۔ ویسے ملامت مت کچھ، اصل بات یہ ہے......" وہ کیک پیس کی تفصیل دینے لگا۔ یہ بات کا ہنس کر بولا۔ "رانگ کال کرکے ان کا دل جلا دیا اب کسی میری اولاد کی جان چھوٹی ورنہ تجھے پتا ہے میں یہ فون تجھے کہاں سے کر رہا ہوں؟"

"آرٹ گیلری اسپتال سے۔ کیونکہ ہمارے گروپ میں ان کی مزاحمت کے سارے نظام سلامہ جو کر رہا تھا۔"

"سلامہ......؟" یکدم اس کی زبان نے دل کے ٹکڑے چھوٹنے کی کوشش کی اور عاطف فوراً اس کو سے بدلنے لگا۔

"بس بس...... زیادہ مکھن لگانے کی ضرورت نہیں، اصل بات کی طرف آتے ہیں۔ ہاں تو یہ بتا، تیری میم صاحب کا گھر کہاں ہے؟"
شہریار نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "مجھے نہیں پتہ، مسز عابدہ کا جو گھر ہے ناں وہی نجم دانیہ کا گھر ہے۔ مسز عابدہ اس گھر سے اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو گئے ہیں۔"
"اچھا چل تیرا شکریہ۔ بکڑو نے میری کمان بنی۔ باقاعدہ شکریہ۔ کیسے صبح اذان کا تیرے فخر۔"
"بک بک مت کر۔ میرے شکر آنے کی ضرورت نہیں۔ میں آج کل بہت مصروف ہوں۔ تجھے پوری ٹینشن دے نہیں سکوں گا، پھر تیرا دھیان بٹ جائے گا۔"
"بڑا ہی خبیث ہے تو۔ دوستی محبت کو یوں قتل کر رہا ہے کہ......"
"کب سے ساختہ باتیں چھیڑ کر بول رہا ہے۔ معلوم ہے مجھے اپنا تیرا زیادہ قریب بہت کچھ... نہیں دانی کو پھر شکایت ہو گی کہ میں یہ چیزیں اسے بار نہیں آ رہا۔"
"وہ جانا ہر وقت ستانے کو تیار رہتا ہے۔" عاطف بیگ نے خفگی سے کہا اور ہنسنے لگا جو شرارت سے بولا۔
"اپنا تو بھی خیال رکھنا چل اب اللہ کی حفاظت سے چھوڑ کے آ۔ پھر ملیں گے پانی کی کہاں پھر ملوں گا میں تیری۔"
"او کے خدا حافظ! اپنا خیال رکھنا۔"
"اچھا میری جان!" اس نے ہنستے ہوئے فون رکھ دیا۔
عاطف بیگ نے موبائل آف کر کے گاڑی کو ذیلی سڑک پر موڑا، پھر چند لمحوں بعد وہ نسیم اختر کے گھر کے سامنے، جو بنگلہ دلارام میں نے گیٹ کھولا تھا پھر وہ دانیہ کو سنبھالتے ہوئے اندر بڑھتا چلا گیا تھا۔ نسیم اختر نے تحیر سے اسے دیکھا تھا۔
"...نسیم اے...... آپ کی بیٹی بحفاظت آپ کی کسٹڈی میں...... مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی۔"
"او میری بچی۔" نجم حاتب نے اسے سنبھالا۔ وہ نجم شدہ کی میں بھی ان کے ساتھ جھک رہی تھی اور مسز سلیم ان کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔
"آپ بہت عظیم انسان ہیں بیٹے! آپ نے آج مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ عارف بتا رہے تھے، یہاں سے کسی بات پر جھگڑا کر کے ناراض ہو کر نکل گئی تھی۔ دراصل یہ بڑی غصے کی بہت تیز ہے۔"

"غصے کی تیزی اور قدرے عاقبت اندیشی......" اُس نے بارہا سپورٹیو ہونے کا ثبوت دیا۔

سلیم اصغر نے سر جھکا لیا اور عین اسی وقت عارف جواد اندر آیا۔

"ابھی آنٹی نے نوشے کے گھر آنے کی اطلاع دی۔ آپ نے پوچھا، یہ کہاں چلی گئی تھی؟"

عاطف بیگ تھوڑے سے اُسے دیکھتا رہا مگر وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ عارف کے بولنے کے انداز سے وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اس گھر میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے وہ کسی گھریلو سیاست کا شکار ہوئے بغیر کافی کی آفر کو خوش اسلوبی سے انکار کر کے باہر نکل آیا تھا۔ گو اسے لگ رہا تھا، عارف کسی ایمرجنسی کا بہانہ بنا کر اس گھر میں شامل ہے، جس سے اس گھر کے مکین تک آگاہ نہیں تھے۔

اس نے واپس گاڑی کا رخ کراچی کے فلیٹ کی طرف موڑ لیا تھا۔ یہ فلیٹ اس کے بزنس کی سہولت کے حساب سے خرید رکھا تھا۔

مومنہ بھی بہت سہولت سے اپنی ذمہ داریاں نبھا رہی تھی۔ اُسے آئے ہوئے ساڑھے تین مہینے ہو چکے تھے۔ ایڈوانس میں اسے تنخواہ کا صرف پانچ فیصد ملا تھا، جو خرچ ہو گیا تھا۔ شافعہ کی دی گئی رقم بھی خرچ ہو چکی تھی اور آج پھر وہ پریشان تھی کہ وہ بھوکی تھی۔ حالت ایسی تھی کہ دل چاہ رہا تھا کوئی جھوٹے منہ ہی کچھ کھانے کے لئے پوچھ لے تو وہ ایک سیکنڈ بیٹھنے میں دیر نہیں لگائے گی۔ مگر دفتر کے باقی لوگوں کے لئے وہ ابھی تک اجنبی ہی تھی۔ کچھ وہ خود بھی لئے دیئے رہنے والی لڑکی تھی اور کچھ دفتر کے لوگ بھی شاید اُسے میرٹ سے ہٹ کر سفارش پانے کی وجہ سے اُس سے دور دور تھے۔ شافعہ سے وہ قرض مانگنا نہیں چاہتی تھی اور نہ کام کے ایڈوانس دیئے جانے پر بھی دفتر میں چہ میگوئیاں اُبھر رہی تھیں اس لئے وہ اس بات سے بھی بچنا چاہتی تھی۔ بار بار اُس کے ذہن میں اندھیرا چھا جاتا۔ مگر وہ مصروف تھی جب بہت اچانک چپراسی نے اُسے شہریار کے کمرے میں پہنچنے کی اطلاع دی۔ وہ سنبھلتی ہوئی دفتر میں داخل ہوئی۔ شہریار ریوالونگ چیئر پہ جھول رہا تھا۔

"مس مومنہ! وی مارکیٹنگ کمپنی کے Logo کا کیا بنا؟"

"تیار ہے۔" اس نے پرنٹ آؤٹ کی فائل اس کے سامنے لا رکھی۔

وی مارکیٹنگ کمپنی ایمپلائز مہیا کرنے کے سلسلے میں رجسٹریشن کا ایک پرائیویٹ ادارہ تھا۔ جہاں ملازمین کی درخواستیں کمپیوٹرائزڈ طریقے سے محفوظ کر لی جاتی تھیں اور پھر سرچنگ کے ذریعے قابل افراد کو جاب کے لئے پیغام بھیج دیا جاتا تھا۔ کمپنی بھی چونکہ نئی تھی اس لئے Logo کی تیاری اور پبلسٹی کا کام شہریار کی ایڈورٹائزنگ کمپنی کے سپرد کیا گیا تھا۔ شہریار پرنٹ آؤٹ کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ مومنہ

رنگوں نے بہت مہارت سے Logo بنایا تھا۔ سورج کی کرنیں اور درمیان میں ایک ننھی سی پھوٹتی ہوئی کونپل دکھائی گئی تھی۔ سبز پتہ، زندگی کی علامت گل کو واضح کر رہا تھا، مگر شہریار کو اس Logo سے یہ اعتراض ہوا تھا۔

"مس مومنہ! یوں نہیں لگتا اس Logo سے ہم نے زندگی کی کھلنے والی امید کو محدود کر دیا ہے؟ زندگی میں امید محدود نہیں ہوتی۔ جیسا کہ آپ جانتی ہیں، زندگی ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے، صرف لوگ مر جاتے ہیں۔ پلیز! اسے آپ اس پوائنٹ آف ویو سے دیکھئے۔"

"اوکے سر! میں پھر سے کوشش کرتی ہوں۔" اس نے فائل اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر رک گئی۔

شہریار تیزی سے اٹھا تھا۔ "مس مومنہ! آپ ٹھیک ہیں؟"

"جی سر! میں بالکل ٹھیک...... مجھے...... ٹھیک......"

وہ مزید کچھ نہیں کہہ پائی۔ شہریار نے بیگانگی کی حالت میں اسے بازوؤں میں سنبھالا مگر وہ تب تک بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس نے اسے بازوؤں میں اٹھا کر اپنے روم میں رکھے صوفے پر لٹا دیا تھا۔ پہلی بار وہ بے حجاب اس کی نظروں میں آئی تھی۔ شہریار پہلی مرتبہ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ واقعی بہت حسین لڑکی تھی مگر اس کی سادگی اس کی خوب صورتی سے کہیں زیادہ اس کی آنکھوں پر جھک گئی تھی۔

یا شاید...... آخر اس نے کہیں دیکھا تھا مگر کہاں؟ یہ الجھن اسے الجھا رہا تھا...... وہ سوچتے ہوئے تیزی سے باہر نکلا تھا، پھر اپنی سیکرٹری کو تیز لہجے میں مخاطب کر کے بولا۔

"مس انیلا! پلیز میرے روم میں جا کر مس مومنہ کو دیکھئے۔ آئی تھنک وہ بے ہوش ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر کو فون کریں۔ ڈرائیور سے کہیں انہیں کسی کلینک لے جائے۔"

انیلا نے غور سے دیکھتے ہوئے تیزی سے اس کے روم کی طرف مڑی۔ شہریار نے پشت موڑی تو ایک لمبا اور گہرا سانس اس کے سینے سے نکلا۔ جازی عبدالرحمن اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خاص طرح کا طنز نمایاں تھا۔

"اب فکر نہ کرو، یہاں بھی آپ سے محفوظ نہیں ہیں۔"

"جازی! بکواس مت کرو۔ تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ تم اس طرح مجھ سے بات کرو، میرے کردار پر کیچڑ اچھالو۔"

"کردار......" وہ استہزائیہ ہنسا۔ "آپ کا کردار...... جیسے سب کچھ روشن ہے مجھ پر، آپ کتنے پاکباز ہیں۔"

"ٹھیک ہے، میں بہت برا انسان ہوں۔ پھر تمہیں کیا اعتراض ہے؟ میں اپنی زندگی میں بہت خوش ہوں۔"

وہ بحث کے بجائے اپنے روم کی طرف بڑھ گیا۔ پھر جیسے ہی کھولا، دروازہ دوبارہ کھلا تھا کہ اس نے سنا، صوفیہ شرمندگی سے کہہ رہی تھی۔

"میری کوئی غلطی نہیں ہے۔ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ وہ ابھی وہاں سے گیا نہیں تھا، انہوں نے... میرے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے اس لیے۔"

"پاگل لڑکی اتنا نہیں سمجھتی تھی؟ ہم کتنا ایک دوسرے کو نہیں جانتے، لیکن انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ انسانیت کا رشتہ سب سے بڑا رشتہ ہوتا ہے۔"

شہریار نے باہر گزارا رات صرف روز نہیں۔ سمیع اور خیر بی سے کمرے میں آ گیا۔ سیدھا بیڈ پر لگانے کے لیے مڑ کر وہاں ہوتی مگر شہریار ان کی طرف سے پشت کر کے کھڑا تھا۔

"مس اینجلا! میں لنچ کا آرڈر کر رہا ہوں، آپ دونوں بیٹھ کر ریلیکس ہو کر بیٹھیے۔ مجھے باہر کچھ کام ہے، اس لیے آپ کو کسی قسم کی دقت نہیں ہو گی۔"

نظریں نیچی کیے اس نے چابیاں اٹھائی تھیں اور کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ صوفیہ نے اس کی پشت کو دیکھا تھا۔

"بہت اچھے انسان ہیں مسٹر شہریار۔ پہلی گفتگو سے مجھے لگا تھا بالکل غلط ہوں گے مگر یہ تو بہت رحم دل انسان ہیں۔"

اینجلا ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ پھر تھوڑی دیر بعد ڈنر میں بہت مختلف لنچ پہنچا ہوا تھا۔

"تم اتنا سارا کھانا...... اینجلا یہ بہت زیادہ ہے۔" صوفیہ نے گھبرا کر کہا۔

اینجلا مسکرا کر بولی۔ "جو دل چاہ رہا ہے وہ کھالو۔ ترکی میں اسٹاف کی وجہ سے فرحت وغیرہ کہیں کبھی لے کر آتی ہوں۔"

صوفیہ نے سر ہلا کر اس کے خیال کی تائید کی۔

پھر وہ لنچ سے فارغ ہو کر کمرے کی بیلکنی پر گئی، اینجلا نے فون اٹھایا تھا۔ "ہیلو، سلطان کلر ڈیزائن۔ آپ کون؟"

"مس اینجلا! میں شہریار بول رہا ہوں، آپ بتائیے آپ فارغ ہو گئیں؟"

"اوکے سر...... جی سر! ہم لنچ کر چکے ہیں۔"

AANCHAL.COM.PK

"ابے کے لیں بھی پوچھنا تھا اچھا اچھا چلتا ہوں!"

انیلہ جا چکی تھی۔ "بٹن کیوں کیا گیا ہے؟" سوال نے موحد سمیت پانی کو کہوں سے فوراً کہا۔ "مرضیز میں واپس آنا چاہتے ہیں اس لئے اپنی اپنی سیٹ پر چلو۔"

موحد انیلہ کے ساتھ چلتے ہوئے بولی تھی۔ "اس کا مطلب ہے انیلہ! مرزا جی بھی [illegible] نہیں تھا، وہ صرف ہماری [illegible] کے لئے اتنی [illegible] کرتے رہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو، مرزا صاحب بہت اچھے انسان ہیں۔ بظاہر سخت دکھائی دیتے ہیں، سخت رویہ رکھتے ہیں مگر مجھے بھی [illegible] لگتا ہے، وہ ہمارے ابا جیسے ہیں۔" انیلہ نے تبصرہ کیا۔

موحد اس سے اتفاق کرتے ہوئے بیٹھنے لگی، انیلہ بھی سنجیدہ ہو رہی تھی۔

کام ایک بار پھر سے شروع ہو گیا تھا۔ جازی عبدالرحمٰن، موحد رفیق کے [illegible] سے بہت غصیلی نظروں سے دیکھا جا رہا تھا۔ موحد رفیق نے تعارف چاہا تھا۔ انیلہ نے اس کے کان میں کھسر پھسر کی تھی۔

"شہریار صاحب کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں۔ پہلے کافی [illegible] ہوا کرتے تھے، اسٹاف سے کافی بے تکلف بھی تھے۔ لیکن پچھلے کچھ عرصے سے ان میں بہت چینج آ گیا ہے، اب یہ خود کو بھی مالک سمجھنے لگے ہیں۔"

"بڑی بات ہے مس انیلہ! کسی کی برائی نہیں کرتے۔"

انیلہ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ موحد کی بھی [illegible] چلتی گئی، کیونکہ شہریار ان کے بالکل پیچھے آ کر جانے کب کھڑا ہو گیا تھا۔

"وہ سر! ہم تو بس ایسے ہی..." انیلہ نے ہکلانا شروع کر دیا۔ شہریار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نے چھوا پھر وہ [illegible] سے بولا۔ "اس لئے کہ آپ لوگ بہت گھبرا رہی ہیں، جیسے حضرت عزرائیل کو دیکھ لیا ہو۔ مس انیلہ! [illegible] بہت [illegible] ہوں مگر [illegible] نہیں۔ ویسے ہم خود فیصلے سے بھی [illegible] کوئی تعلق نہیں۔"

"ایسی بات نہیں سر! ہم آپ کے بارے میں ایسی [illegible] رائے نہیں رکھتے۔" موحد نے [illegible] کہا اور وہ ہنس پڑا۔

"[illegible] ہے، [illegible] رکھتے ضرور ہیں [illegible] نہیں ہے، یہ اچھی بات ہے۔"

ANCHAL.COM.PK

مومنہ اوپا بلا کی زبان کی ادائیگی پر دنگ رہ گیا اور وہ مخاطب ہوا وہ کام کرنے لگا جس کام کے لئے آیا تھا۔ اس نے کوٹ کی جیب سے سفید لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"اس میں مومنہ! اس میں کچھ رقم ہے۔ میرے خیال میں آپ کے کچھ نہ کچھ کام آ ہی جائے گی۔"

مومنہ نے کسمسا کر اسے گومگو کیفیت میں دیکھا اور پھر بولی۔

"بے فکر رہئے میرا آپ کی مدد کا ارادہ نہیں ہے۔ آپ کے سوالات صرف حل کرنے کے لئے میری ذات کا کنٹری بیوشن ہے۔"

"صرف میں خیرات نہیں لیا کرتی۔" اس نے استقامت سے منع کر دیا حالانکہ یا تو لفافے کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ شہریار نے اس کی طرف دیکھا اور اس کے کھردرے لہجے میں جواب دینے جانے پر اس کی پچھاڑ دی۔

"یہ خیرات نہیں ہے مومنہ صاحبہ! آپ اسے ایک انسان کا دوسرے انسان پر احسان بھی مت سمجھئے، آپ میری بہن جیسی ہیں اور آپ کی بہن زیبا کا روپ ہونے کے لئے مجھ پر لازم ہے کہ میں آپ کی معاشی تنگی سے بارے میں بے فکر رہوں۔ آپ معاشی طور پر مستحکم ہوں گی تبھی میری بہن کی کرنے کے لئے بہت وقت دیں گی نا۔ سو یہ احسان نہ سمجھیں اسے آپ Give and take سمجھ سکتی ہیں۔"

مومنہ نے لفافہ لے کر پرس میں ڈال لیا تھا۔ شہریار بات ختم کر کے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ادھر ایک بچے نے ... کے سر پر شیشے پر نگاہیں جمائی تھیں۔

"بی بی! مومنہ اول میں کچھ ملا ہے۔ شہریار صاحب جیسے ایسے فیصلے لیتے رہتے ہیں مگر کسی نے بھی آپ کی ضمانت نہیں دی ... کے لئے بولے ہیں۔"

مومنہ کچھ نہیں بولی اور نئے سرے سے اپنے کام میں لگ گئی۔

پھر شام کی بات تھی جب عاطف بیگ جنرل چلا آیا تھا۔ شہریار اس وقت فیشن اینڈ اسٹائل کے موسم گرما کے ملبوسات کی نمائش کے لئے پروگرام ترتیب دے رہا تھا۔ جو ماڈلز آئے روز ... تھیں ان سے ایک ڈیڑھ ماہ پہلے ڈیٹ لینا پڑتی تھی۔ وہ ہال کی بکنگ اور ماڈلز کے معاملات طے کرنے کے سلسلے میں پوائنٹ لکھ رہا تھا۔ کس لباس کے ساتھ کس ماڈل کو پیش کیا جائے تو کوسٹ کم لگے۔۔۔۔ کون سا ہال بہترین لوکیشن دے سکے گا۔۔۔۔ یہی سوالات تھے کہ ان کے غور و فکر کے درمیان عاطف بیگ کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو! رفعت شہباز جی! کیسے ہو؟"

شہریار نے سر اٹھا کر دیکھا اور مسکرانے لگا۔ "تم ابھی تک یہاں ہو؟ میرے خیال میں تو تم یہاں صرف چند روز کے پروگرام پر آئے تھے۔ میں تو سمجھ رہا تھا میری کہی ہوئی بات پر تم اتنے خفا ہو گئے تھے کہ ملے بغیر ہی چلے گئے ہو۔"

"ارے ہاں ایسا ہو سکتا ہے؟ تجھ سے اتنی ناراضگی میں خود نہیں کر سکتا۔ ویسے کام سے زیادہ تیری طبیعت کی وجہ سے میرا قیام بڑھتا جا رہا ہے۔"

"نہیں ایسی بات نہیں۔ تم بے فکر ہو کر چلے جاؤ۔ وہاں ذکریا بھائی پر سارا لوڈ آ رہا ہوگا۔ میری فکر مت کرو میں بالکل ٹھیک ہوں اب۔ تمہیں تو پتا ہے حال دیا کی وغیرہ سب وقت سے پہلے ہی ہیں۔"

ناصف بیگ چلتے چلتے اس کے قریب آ گیا۔ شہریار کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "مجھے معلوم ہے تو اپنا بہت خیال رکھ رہا ہے۔ لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل نہیں مان رہا کہ تجھے چھوڑ کر جاؤں۔ پانچ چھ سال پہلے گیا تھا تو ٹھیک تھی۔ [illegible] حالت میں تجھے پایا ہے اب سوچ رہا ہوں کہ اب چھوڑ کے گیا تو......"

شہریار اسے دیکھنے لگا۔ وہ اس کا ادھورا جملہ جانتا تھا وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ سو اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے جذب سے کہا تھا۔

"دل میں وہم مت ڈال کر جا۔ کچھ نہیں ہو گا مجھے...... اور اگر کچھ ہوا لکھا بھی ہے تو بے فکر رہ۔ بہت سی دعاؤں میں ایک دعا بھی مانگی تھی میں نے کہ آخری لمحے تیرا چہرہ ضرور دیکھ کے جاؤں۔ اور اللہ بہت مہربان ہے وہ میرے وقت بھی تجھ جیسے خبیث کو [illegible] تو بھاگا آئے گا......"

ناصف بیگ نے اس کے بال مٹھی میں بھر لیے تھے اور درد بھی دیا تھا۔

"احمق! ذرا بھی عزت کر۔ میرے دور کرو یہ کہنا [illegible] پڑے گا مجھے اس حالت میں دیکھ کر۔"

"کوئی خاص [illegible] نہیں پڑے گا۔ بلکہ وہ تو خوش ہوں گے کہ کوئی تو ہے جو ان کے کاکل کھرے باس کے بھی کان کھینچ سکتا ہے۔" [illegible] اپنے [illegible] چلنے لگا۔ بہت [illegible] ہوئے مزے کی کافی [illegible] میں تیری ساری فرمائش بھی سنوں گا۔"

"ارے واہ جانِ من [illegible] تیری ساری فرمائش [illegible] پاگل سمجھ رکھا ہے کیا؟"

"بکواس نہیں بس جلدی سے اٹھ [illegible] تیری ایک نہیں سنوں گا۔" اس نے بازو پکڑ کر اسے اٹھایا۔

شہریار نے کار کی چابیاں، فون اور موبائل جیب میں ڈال کر فائل کے ساتھ باہر نکلا اور بدقسمتی سے اسی وقت سالار عبدالرحمن بھی اپنے کمرے سے نکلے تھے۔ ہو سکے باہر جاتا دیکھ کر ملازم پر کچھ کرنے کے
بتانے کو رک گئے۔

"رشید! فارغ بیٹھنے سے بہتر ہے کچھ کام ہی کر لیا کرو۔ ہر وقت اپنے ہی مشاغل میں لگے رہتے ہو۔ کبھی تمہیں تو اور وقت ضائع کرنے کے لیے نہیں دیتا۔"

شہریار کے اٹھتے قدم رک گئے۔ عاطف بیگ نے آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہا مگر شہریار نے ان کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر انہیں کچھ بھی کہنے سے باز رکھا تھا۔ پھر سالار عبدالرحمن اور وہ ایک ساتھ ہی نکلے تھے۔
کار شہریار ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ عبدالرحمن تو کب کا ہی جا چکے تھے ان کے لیے الگ جواب سے بغیر سے دراصل کا دور چل رہا تھا۔

"میں سوچتا ہوں تمہارے جانے کے بعد زندگی کتنی خاموش ہو جائے گی۔"

"ایسے ہی خاموش ہو جائے گی؟ میری زندگی بے کیف...... جیا لیا جانے کا مطلب خود کو اپنے ہاتھ سے جاتا ہوں اب بیوی سارہ رابطہ بھی کے باوجود رابطہ بھی منقطع کرنے کا۔" عاطف نے سر ہلا کر
کہا۔ شہریار کو کچھ یاد آیا تھا۔

"اب کیا سوچا جا رہا ہے؟"

"تایا ابو میرے کہنے میں نہیں آ رہے۔" شہریار نے عاطف کے کہنے پر کہا۔

"بہت ذہنی بے ناچاقی کر رہی ہے۔ تو دراصل کے دوران نہیں تھا لیکن پھر بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوئی اسٹریس لے۔ تو ابھی تک سوچ رہا تھا۔ مگر اب کیا کیا جائے کیونکہ عاطف اس کے ذہن سے
نکل ہی نہیں رہا تھا۔ نوید علی بھائی بھی اس سلسلے میں ناکام ہو چکے تھے۔ بس ماما اور نو عبدالرحمن اور سالار بھائی اس سلسلے میں ٹوٹ گئے تھے۔ مگر یہ صرف وہ جانتا تھا کہ اس کا نہ کہنا وہ رسک سے
مکمل رہی تھی۔ اس سلسلے میں ان کی ماموں عبدالکریم سے بھی بات ہوئی تھی مگر ان کا بھی خیال تھا۔ "ابھی فوری جلدی نہ کرو، جتنا تم اسے روکو گے وہ اتنی ہی ضدی ہو جائے گی۔ سے اس راستے پر وہ مصنف
بازک کی ہر کل سیدھی نہیں ہوئی۔ جب کام سے روکا تو پتنگ میں بتا ہو جاتی ہیں کہ شاید اس بات سے انہیں تاکید دور ہوگا اور یہ مصنف کرنا انہیں کہانی سے روکنا چاہتی ہے۔ سو بہرحال لیے
فکر وہ تایا ابو کی طرح میری ذمے داری ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی نظر سے اوجھل نہیں ہے وہ جو ہو یہ بہت کڑی نظر ہے بہرحال۔"

بظاہر ماموں کی اس بات پر اسے بھرپور یقین تھا مگر اس کا ضمیر اپنی بدعہدی بھلانے میں کیا ہی سخت کچوکے دیتا رہتا تھا۔ بھی بھی وہ بظاہر پرسکون رہتا تھا مگر اندر ہر وقت ایک ہلچل مچی رہتی تھی۔

"کچھ دیر کے لیے سب بھول جا۔ ہم آج صرف یونیورسٹی کے دن جینا چاہتے ہیں۔" اس نے اس کے اسٹیئرنگ وہیل پر مشاقی سے چلتے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دلداری سے کہا۔

شہریار سر ہلا کر گاڑی دوڑانے لگا۔ "کیا یاد کرے گا تو بھی کی زبردست کافی میری طرف سے۔"

عاطف نے آسودگی سے مسکرا کر اسے دیکھا۔ پھر دس منٹ بعد وہ کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے۔ ان کی مخصوص میز ریزرو تھی، سو وہ ایک کونے کی خالی ٹیبل پر جا کر بیٹھ گئے۔ کافی ہاؤس کی خنک اور مہکتی فضا نے شہریار پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ وہ مسکرا کر بولا تھا۔

"تجھے یاد ہے، ایک زمانے میں ہم یہاں بے وقوف بننے کے لیے کتنی دلچسپی سے آیا کرتے تھے۔"

عاطف بیگ ہنسنے لگا، پھر ایک آنکھ دبا کر بولا۔ "ہاں، بہت شوق تھا ان حسین دیویوں کا ساتھ دینے کا، لڑکیاں بھی تھیں، وہ ہمیں بے وقوف بناتی ہیں اور ہم انہیں بنا کر نکل جاتے تھے۔ سلامہ کتنا زچ ہوتا تھا ہماری اس شرارت سے۔"

"سلامہ...... ہاں آں......" شہریار کے ہنستے لب یکدم خاموش ہو گئے۔

عاطف بیگ نے دانتوں تلے زبان دبائی۔ مسکراہٹ کی بات وہ غلطی سے دوسری طرف لے گیا تھا مگر بہت جلد وہاں سے نکل آیا۔ پھر اسی موڈ میں ہنستے ہوئے بولا۔

"مجھے یاد ہے، وہ پگلی کیا کا قصہ...... وہ جو اپنی فرضی ذہانت سے لڑکوں کو بے وقوف بنایا کرتی تھی۔ جب ہم نے اسے سلامہ کا نام بتایا ہے تو وہ کتنا ہنس کر گئی تھی۔ پھر پورے کیمپس میں پیچھے پیچھے وہ بھوتنی اور آگے آگے ہمارا شیر جوان...... کتنی قسمیں کھاتا تھا مجھے بچا لو، وہ شکر ہے اس وقت آغا نادالدین نے انٹری دی اسے پروپوز کیا اور اب سلامہ صاحب گھر کو لوٹے۔ تجھے یاد ہے ہم دانیال کو بھی کتنا لیٹ کیا کرتے تھے۔"

شہریار ماضی یاد کر کے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ وہ شروع سے ایسے ہی ہنستا تھا۔ عاطف نے اسے دیکھا تو کہا۔

"تجھے یاد ہے، وہ پری وش تیری ہر وقت آنسوؤں میں ڈوبی آنکھوں سے وہ کتنا امپریس ہوتی تھی۔ کہتی تھی ہائے اللہ! شہریار وار جائے، بے چارے کو کیا غم ہے؟ ہم کہتے، اس کی آنکھوں میں آنسو ہمیشہ تیرتے

لگا کر ہنستے ہوئے آتے ہیں تو کہتی تھی، تمہیں کیا پتہ اس بے چارے کو کیا غم ہے۔ کتنے عرصے تک وہ تیرے فرضی غم میں پاگل رہی تھی۔"

شہریار ہنستے جا رہا تھا۔ پھر وہ تھم کے بولا۔ "پری وش بھی خوب تھی۔ اُسے یتیم اور مسکین نظر آنے والے ہر چہرے پہ پیار آجاتا تھا۔ ہم سب اُسے مدر انڈیا کہتے تھے ناں۔"

"آں ہاں، مدر انڈیا...... اُس کی چال ڈھال ساڑھی کے پلو، سب ہمارے لئے عجیب نہیں تھے۔ واقعی وہ بھی اپنے مزاج کی ایک ہی لڑکی تھی۔"

شہریار مزید کافی اور سینڈوچ کا آرڈر دے چکا تھا۔ ان کی باتیں ابھی تک جاری تھیں کہ عاطف نے اُسے محبت کے فرضی قصوں سے یکدم شاعری کی طرف کھینچ لیا۔

"تو نے وقتی فقرے کے لیے کتنی غزلیں لکھ ماری تھی ناں، سلامہ کہتا تھا لڑکیاں شاعروں پہ بہت مرتی ہیں اور تو نے کہا تھا شکر ہے خوبیوں پہ مرنے کا دور گزر گیا۔ ورنہ پھولوں سے ڈھکی قبر سے کون محبت کر رہا ہے، کون نہیں، صاحب قبر کو کیا معلوم...... سلامہ نے ہم دونوں کو کتنی ملامت کی تھی، وہ بیچارا بھی اس کے ساتھ مل گئی تھی اور تب ہم نے کہا تھا۔ "ہم شریف، پاکباز لڑکیوں سے چھیڑ نہیں کرتے۔ جو لڑکیاں بے وقوف بنانے میں خود کو باکمال سمجھتی تھیں، ہم صرف ان سے اپنی ذہانت کا خراج لیتے ہیں۔ سلامہ ساتھ بھی نہیں تھا یا لاجک، جب تک واقعی اسے ہماری شرافت پہ یقین نہیں آگیا کہ ہم فلرٹیشن میں بھی عزتوں کا پاس رکھتے ہیں، تب تک وہ ہم سے ٹھیک طرح سے بولا بھی نہیں تھا۔"

"ہاں، وہ وقت بھی کیا وقت تھا۔ ساری شرارتیں شروع کے دو سال میں ہی کر لی تھیں۔ پھر ایسا لگا تھا زندگی بے مقصد ہے، سب جیسے غائب ہو گئے تھے۔"

"ہاں، شاید۔ شروع کے ساڑھے تین سال ہم نے کتنی فلرٹیشن کی، سیاست کی، گٹ بندی کی، مقابلے جیتے، ڈیبیٹس جیتے، سلامہ نے اتھلیٹ میں نام کمایا...... ہم سب نے جو کچھ کیا شروع کے تین ساڑھے تین سالوں میں کر لیا تھا۔ پھر تیرا ابا جان کا مسئلہ آگیا، زکریا بھائی بارِ ہشت بن گئے، سلامہ پہ گھر کی ذمہ داریاں آگئیں تو سب کچھ ختم ہو گیا۔"

شہریار اسی کیفیت میں دور میں چلا گیا۔ اس کی آنکھیں اس لمحے بھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ مگر قریب کہیں بھی پری وش تھی وہ جیسے لڑکی نہیں تھی۔ تب ہی اس کی شاعری سے زیادہ اس کی پرسنالٹی پہ مرنے والی ماہی تھی۔

"آج سنا نا کچھ سنجیدہ سا۔ جو واقعی قلبی واردات کے تحت لکھا ہو۔"

شہریار نے مسکرا کر اسے دیکھا، مگر عاطف کی آنکھوں میں ایسا تحکم تھا کہ اسے شاعری کے سمندر میں غوطہ لگانا ہی پڑا تھا۔

"ایک نظم ہے۔ پتہ نہیں، تمہیں پسند آئے گی بھی یا نہیں؟"

"بے فکر رہو۔ تمہاری ہر چیز مجھے پسند آجاتی ہے۔ بس جی کڑا کرکے سنا ڈالو۔"

اس نے سر جھکایا، پھر اپنے مخصوص لہجے میں سنانے لگا۔

"آج کے دن وہ تمہاری محفل تھا
آج کا دن نہ یوں منا کہ
پھر کے فرصت ہے کہ یوں
وقت سے مہلت لے کر
تمہیں پانے، تمہیں چھونے کو سفر اختیار کرے
بچھڑنے کے لمحات کو یوں بے ثمر گزرنے دو
کہ
بعد میرے تمہیں اک تشنگی کا احساس رہے
اور ان وہ میرے جیسا کہیں سے میرا کم ہی ہو
تمہاری آنکھوں کی طرح ناشاد رہے"

عاطف بیگ گم انداز میں اسے دیکھنے لگا تھا۔ شہریار نے چٹکی بجا کر اسے متوجہ کیا تھا۔

"کہاں کھو گئے حضرت! کافی اور سینڈوچ باسی ہورہے ہیں...... بقول مولانا کے کافی اور سینڈوچ دونوں گرما گرم ہی لطف دیتے ہیں۔"

AANCHAL.COM.PK

عاطف بیگ مسکرایا، کافی پینے لگا اور شہریار یک ٹک سامنے دیکھنے لگا تھا۔
"تمہیں پتہ ہے ہماری مخصوص ٹیبل پر کون بیٹھا ہے؟"
"کون......؟"
"ساحر......!"
شہریار نے جواب دیا اور عاطف بیگ نے مڑ کر دیکھا پھر آہستگی سے بولا "ظاہر ہے ساتھ میں رکھنا چاہتا ہے۔ ہماری یادیں سنبھال کر رکھتا ہے امیر جنگ۔"
"امیر جنگ نہیں ہے۔
بس کچھ لوگوں کو زندہ انسانوں سے زیادہ مردہ انسانوں کو یاد کرنے میں خاص مزہ ملتا ہے۔" شہریار کا موڈ خراب ہوگیا تھا۔ کیونکہ وہ یہاں بخشی صاحب کے ساتھ بیٹھا تھا۔ "مجھے دوستی نہیں رکھنا مگر یوں دغاباز لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر دوستی کی یادگار منانا پسند نہیں کرتا۔ آئی ہیٹ بخشی صاحب......!"
عاطف بیگ کچھ نہیں بولا۔ کیونکہ وہ اس کیفیت سے سو فیصد متفق تھا۔ اسے پتہ تھا کہ وہ دن کتنی مشکل سے گزرے تھے جب ہر طرف سے مایوسی نے گھیر لیا تھا کہ ساحر نے روشنی کی کرن بن کر انہیں اس پریشان کن صورت حال سے نکال لیا تھا۔
"تجھے یاد ہے ساحر وہ پہلی بار؟" عاطف بیگ نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لئے پوچھا اور شہریار ہنسنے لگا۔
"ہاں وہ بھی کیا دن تھے۔ مجھے یاد ہے ہم نے ساحر مرحوم پر جا کر ایک نظم پڑھی تھی۔ کیا تھی وہ نظم......"
"تو اب مرتے نہیں
تو اب دل توڑ دینا کبھی زندہ نہیں کرتے......"
عاطف بیگ نے پہلا مصرعہ پڑھا اور شہریار نے اسے اشارے سے روک دیا۔

AANCHAL.COM.PK

"یہ نظم میں پڑھوں گا۔"

عاطف بیگ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مائیک کی طرف اشارہ دیا اور شہریار پڑھنے لگا۔

"خواب مرتے نہیں
خواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانسیں کہ جو
ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے
جسم کی موت سے یہ بھی مر جائیں گے
خواب مرتے نہیں
خواب تو روشنی ہیں نوا ہیں ہوا ہیں
جو کالے پہاڑوں سے رکتے نہیں
ظلم کے دوزخوں سے بھی پھنکتے نہیں
روشنی اور نوا اور ہوا کے علم
مقتلوں میں پہنچ کر بھی جھکتے نہیں
خواب تو نور ہیں
خواب سقراط ہیں
خواب منصور ہیں"

AANCHAL.COM.PK

شہریار چپ ہو گیا تو عاطف نے ہنس کر کہا۔ "تجھے یاد ہے، جب ہم ہاسٹل میں تھے؟ مجھے تحفہ دادا کے ساتھ انعام ملا تھا...... تم لیل بھائی کی جب رخصتی اور تو نے میری طرف دیکھا تھا۔ میں تیرے ساتھ نہیں ہوں۔"

شہریار پھر سے ہنسنے لگا تھا، پھر گویا ہوا۔ "تو شروع سے طوطا چشم ہے۔" کہتے کہتے تھما، پھر عاطف کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔ "اب ہم پانی پانی کیوں ہو رہے ہیں؟...... عاطف! کہیں یہ کسی حساب کی کلیئرنگ کا اشارہ تو نہیں؟"

"بک مت۔ تجھے تو وہم مجھ سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ بل اپ اٹھ، وہ بہت عجیب نظروں سے دیکھ رہا ہے۔"

شہریار نے جانا، اور موبائل اٹھایا تھا، تب ہی اسی وقت اس کے موبائل پر میسج آیا تھا۔

"پلیز ہیلپ می!"

انجان نمبر...... شہریار یاد کرنے لگا اس نے یہ نمبر پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ یکدم یادداشت میں ایک منظر گھوم گیا۔

"کیا ہوا، کس کا میسج تھا؟" عاطف بیگ نے بل پے کرتے ہوئے سوال کیا اور وہ کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ پھر کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے میسج کی بابت اس سے ذکر کیا تھا۔ عاطف بیگ بھی اس کی طرح سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"کون ہو سکتی ہے؟ تجھے اس فون کے ذریعے کال لوکیٹ کروانے کی کوشش تو کرنی چاہیے تھی۔"

"ہاں، یہ تو میرے ذہن میں ہی نہیں آیا، ٹھیک ہے میں اب بھی کر لوں گا۔" شہریار نے ہنس کے کہا اور عاطف بیگ ہم نیلی کی کب چھوٹی بچی کے متعلق پوچھنے لگا۔

شہریار نے مسکرا کر اسے دیکھا، پھر بولا۔ "ٹینی بالکل ٹھیک ہے۔ ان دنوں فیورٹ پڑھتی ہے۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی، سب سے اس کی نہیں بنتی، ماں کو وہ اپنا دشمن سمجھتی ہے، جیسے بہن بھائیوں کو وہ زار سمجھتی ہے اور وہ اور وہ اس رات والے واقعے تک سے وہ بے خبر ہے۔ تجھے پتہ ہے، عارف نے تو اس سے اس رات کا واقعہ پوچھا اور وہ گم گم۔ عارف نے اس کے ذہن میں یہ ڈال دیا تھا کہ وہ اس سے ڈر کر بھاگ آئے، اکیلی چھوڑ کر اکیلی ہی ساتھ چلی گئی تھی، جہاں کسی اور نے اس کے ساتھ بدتمیزی کی کوشش کی اور اس لڑکی نے بیان دیا۔ کیونکہ وہ بہت زبردست ڈرگ ایڈکٹ ہے۔ نشے میں اسے اپنے

وجہ وہی ٹریفک شروع ہو جاتی ہے۔ سوائے اس کے یہ بات تک ہی گئی ہوگی۔ پھر تو نے بھی تو عارف کو اپائنٹ آؤٹ نہیں کیا تھا۔"

"وہ تو میں نے ضروری نہیں سمجھا۔ میں کسی کی ذاتی زندگی میں کیوں گھسوں؟ پھر جب وہ مسٹر عابد جیسے کی بہت آدمی کی چالبازیوں کا ابھی تک نہیں سمجھ سکے تو میرے کہنے پر وہ عارف پر شک کرنے۔ میں نے عارف کی اس گھر میں بیوی تو ذہنگٹ ہوتے دیکھی تھی اس لئے میاں اپنی عزت پر ہاتھ کے فیصلے پر عمل کیا تھا۔ مگر...... بیٹا، یہ تو بتاؤ، تم تک میری باجی کی عادات و اطوار کے قصے کون پہنچا رہا ہے، مجھے بہت دکھ ہے؟"

شہریار نے تو بھی نظر سے دیکھا پھر مسکرا کر بولا۔ "غلط مت سمجھئے، میرے لئے تو بیٹی جیسی ہی ہیں۔ دراصل کام کے سلسلے میں کافی آنا جانا ان کا ہے نہیں۔ وہیں ملاقات رہی تھی، پھر خاموش لوگ تو مجھے پتہ ہے ان سے کتنے بات کرتے ہیں۔ سو بات چیت وہی پھر وہ شام کو کھل کر جاتی ہیں۔ تمہیں تو پتہ ہے ان بگڑی اداؤں کے پر نکلے۔ سو میں وقتاً فوقتاً بے تکلفی وہیں تو بیگم عاقب نے خاص طور مجھے یہ کام سونپا ہے کہ میں کسی طرح ان کی بیٹی کا دل ان کی طرف سے صاف کروا دوں۔ پھر لگ لینے کی عادت بھی ہو سکے تو چیز ہانے کی کوشش کروں۔ اور ہاں ایک بات اور ان کے گھر میں بیگم عاقب عارف کی طرف سے کافی بدل ہیں۔ نفرت کی وجہ سے خاموش ہیں۔"

"ارے واہ تم تو مستقبل انسری تجلی کے کا سپیشلسٹ ہو گئے ہو۔ تجھے تو آ بار اچھے نہیں لگ رہے۔"

"عاطف کے بچے اپنے کام سے باز آ جا۔" اس نے دائیں ہاتھ سے ڈرائیو کرتے ہوئے بائیں ہاتھ مارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور عاطف نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"ارے گاڑی سنبھال۔ کیوں جلدی میری میت بھیجنے کا چانس لے رہا ہے؟"

شہریار نے تیزی سے گاڑی سنبھالی ورنہ شدید ٹکر کا ایکسیڈنٹ ہونا تھا۔

"کہاں اتاروں؟" اس نے اس کے پہلے پوچھا اور دروازے ... شہریار نے اسے اس کی منزل پر اتار دیا پھر وہ گاڑی موڑ کر واپس جا رہا تھا کہ اسے سڑک پر تنہا کھڑی شائقہ بتول دکھائی دے گئی۔ موسم سے بات چیت کے باعث شائقہ بتول ... اس نے گاڑی اس کے قریب جا کر روک دی تھی۔

"آ بھی مس شائقہ! کہاں جانا ہے آپ کو؟"

AANCHAL . COM.PK

شافعہ جمیل نے اُسے شرمگیں مسکراہٹ سے دیکھا اور آہستگی سے فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی۔ پھر آہستگی سے بولی۔ "گھر ہی جاؤں گی۔ لیکن آپ مجھے چھوڑ دیں یہاں......"

شہریار کو لگا فضا میں نہیں اُس کے دل میں جلترنگ بجانے چلے گئے ہوں۔ اس لڑکی سے ہمیشہ ہی اس کے اندر کوئی پرانی یاد سلگنے لگتی تھی۔ اس نے کبھی محبت نہیں کی تھی مگر شافعہ سے وہ جب بھی ملتا، اُسے لگنے لگا تھا جیسے محبت کا یہ احساس نیا نہیں ہے، وہ اُسے صدیوں سے جانتا ہے اور جو نہیں جانتا شاید وہ جاننے کی کوشش میں ہی وہ ڈھونڈ کر جان سکتا تھا۔ پہلی جتنی دور تھی اُسے لگتا وہ اس کے اتنے ہی قریب ہے۔ قربت چھونے میں بھی نہیں تھی اس کے لئے قربت محسوس کرنے میں تھی۔ وہ اسے دھیرے دھیرے اپنا مان رہا تھا اسے لگ رہا تھا محبت بھی اسے دھیرے دھیرے اپنا مان رہی تھی۔

"آپ شروع سے بہت کم گو لگتے ہیں مسٹر شہریار؟"

شہریار نے چونک کر اُسے دیکھا اُس کا دل چاہ رہا تھا وہ مسلسل بولتی رہے اور وہ اس کی شیریں آواز سے اپنا دل یونہی سے بھرتا چلا جائے۔

"نہیں بہت زیادہ گم صم نہیں رہتا۔ بس ہر بات کی وضاحت کرنے کی عادت نہیں ہے مجھے۔ پھر یہ ایک سوچ ہے، آپ جاننا چاہتی ہیں تو آنکھیں پڑھ کر جان لیں اگر نہیں تو لفظوں کا ہیر پھیر لگانا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔"

شافعہ جمیل نے اُسے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ یکبارگی اُسے لگا، اس کا دل اس لمحے اگر تھم بھی گیا تو زندگی کا سب سے مرجانے کا سودا مہنگا نہیں ہوگا......

"آپ بہت گہری ہیں۔" اس نے اس کی نظروں سے بچنے کے لئے لفظوں کا سہارا لیا اور اس نے بھی دھیرے سے نظروں کا زاویہ بدل دیا۔

"میں گہری نہیں مسٹر شہریار آپ کی اس سوچ کے معیار پر پورا اترتی ہے، مگر ضروری نہیں۔ ہر انسان اپنی گہرائی سے بات کرتا ہے۔ لوگ لفظوں کے سحر میں رہتے ہیں۔ آپ خود بھی لفظوں سے کھیلتے ہیں، لفظوں کے سحر میں جکڑ سکتے ہیں جب چاہتے ہیں، آپ کو ذرا بے نیاز بنا رہنا چاہئے۔"

شہریار ہنس کر چپ ہو گیا۔ وہ بات غلط نہیں کہہ رہی تھی مگر شروع سے جو اس کی فطرت تھی وہ اسے بدل نہیں سکتا تھا۔

"آپ کو میوزک سے کوئی دلچسپی ہے؟"

"جی ہاں، لائٹ میوزک اور غزلیں پسند ہیں۔"

"ارے یہ تو بالکل میرا فیورٹ ہے۔ ویسے آپ کو گلوکاروں میں کون پسند ہے؟" شہریار نے فوراً ہی اگلا سوال کیا۔ شاید وہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہ رہا تھا۔

اس نے بالوں کو کیچر میں قید کرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "جنید جمشید اور عاطف اسلم اچھا گا رہے ہیں۔"

"لیکن جنید تو آج کل میوزک سے آؤٹ ہیں۔"

"ہاں نعت خوانی کا پیارا کیا گیا کام ابھی تک زندہ ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے، اگر انسان کا کوئی کام اس کے بعد بھی رہے تو وہ فائدہ مند ہے، کبھی آؤٹ نہیں ہوتا اور ان کا فائدہ وہ بھی کچھ کم نہیں۔ میری نظر میں تو وہ اب پہلے سے زیادہ بیسٹ ہیں۔"

"آپ کو مذہب سے کتنا لگاؤ ہے؟" شہریار کا اگلا سوال تھا۔

شافعہ نے سر جھکا کر کہا۔ "سیدھی سی بات ہے، میرے لئے مذہب میری زندگی ہے۔ زندگی سے الگ کوئی شے نہیں ہے۔ نماز، روزہ سب میری پہلی ترجیحات ہیں۔" وہ جواب دے کر رکی، پھر آہستگی سے بولی۔ "آپ کو مذہب سے کتنا لگاؤ ہے؟"

شہریار نے سوچ میں ڈوب کر دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔ "مذہب میرے لئے بھی زندگی جیسا ہے۔ مگر میں آپ کی طرح اس پر عمل نہیں کر پایا۔ روزے بھی رکھتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں مگر روزہ کے علاوہ کوئی کام مستقل مزاجی سے نہیں کر پاتا اور اس سلسلے میں ہمیشہ شرمندہ رہتا ہوں۔ مگر سونے سے پہلے اللہ سے دعا کر کے سوتا ہوں، زندہ رکھ تو مسلمان، موت دے تو مسلمان کی موت دے۔ شافعہ صاحبہ! میں بہت بڑے بڑے کام نہیں کرتا اور نہ ہی بڑی نیکیاں کماتا ہوں، لیکن اللہ کے بندوں سے محبت کرتا ہوں۔ لوگ مجھے روتے دیکھتے رہیں، میں اپنی استطاعت کے مطابق چھوٹی چھوٹی نیکیاں کماتا رہتا ہوں۔ بس مجھے یوں لگتا ہے میں پہلے جن باتوں کو بہت اہمیت دیتا تھا اب ان باتوں پہ جان قربان نہیں کرتا۔ میرے لئے مذہب یہی عبادت ہے، یہی چھوٹی چھوٹی نیکیاں ہیں۔"

شافعہ اسے پھر سے غور سے دیکھنے لگی۔ پہلا تجربہ ان کا بھی کچھ اچھا نہیں تھا۔ اس کے دل نے اسے ایک قلم سے سراہا تھا۔ مگر جیسے جیسے بات بڑھی تھی اسے وہ آج کے زمانے میں ذرا ہٹ کے رہنے والا انسان محسوس ہوا تھا۔ شہریار کیسٹ پلیئر میں کیسٹ لگا رہا تھا۔ اب صورت آواز کار میں ابھرتی چلی گئی تھی۔

اُداس لوگوں سے پیار کرنا، کوئی تو سیکھے
سفید لمحوں میں زندگی بھرنا، کوئی تو سیکھے
کوئی تو آئے خزاں میں پتے اگانے والا
گلوں کی خوشبو کو قید کرنا، کوئی تو سیکھے
کوئی اٹھائے محبتوں کے سراب مجھ کو
مری نگاہوں سے بات کرنا، کوئی تو سیکھے
کوئی تو آئے نئی رتوں کا پیام لے کر
اندھیری راتوں میں چاند بننا، کوئی تو سیکھے

AANCHAL.COM.PK

غزل دوسری مرتبہ چل رہی تھی، جب شافعہ جمیل نے تعجب سے اُسے دیکھا تھا۔ "صرف یہی غزل......؟"
شہریار کے چہرے پر مسکان اُبھری۔ "یہ غزل مجھے بے حد پسند تھی۔ سمانہ نے میری دعوت پر پورے کیسٹ میں یہی غزل ٹیپ کروا دی تھی اس دن پہ سب سے خوب صورت تحفہ تھا میرے لئے۔"
"سمانہ آپ کی......؟" جانے اس نے کیوں جاننا چاہا تھا۔
شہریار نے کھوجتی نظروں سے اُسے دیکھا مگر اس کے چہرے سے دل کا حال جان لینا ممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ سو بہت مدھم لہجے میں بولا۔
"سمانہ میری کزن، میری منگیتر، دوست بھی اور میری پیاری ڈول بھی۔ مجھے لگتا ہے سمانہ میری شخصیت کی اساس ہے۔ وہ میرے قریب ہو تو مجھے لگتا ہے میں کچھ نہیں ہار سکتا۔"
شافعہ جمیل کے چہرے پر الوہی مسکراہٹ بکھر گئی۔ پھر اس نے ملائمت سے کہا۔ "میرا کوئی بھائی نہیں ہے اس لئے مجھے معلوم نہیں ہے بھائی کس طرح اظہار کرتے ہیں اور اس کی خوشی کس طرح محسوس ہوتی ہے۔ لیکن شہریار صاحب! ایک بات کہنے دیں آپ کی سمانہ بہت خوش قسمت ہے کہ اسے آپ جیسا بھائی ملا!"

شہریار کو کچھ نہیں ہوا۔ ان لفظوں نے جیسے اس کے اندر خاموشی اتار دی تھی۔ کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ اپنا کی زندگی میں اب وہ دور دور تک نہیں رہا تھا۔ جن بہت سی باتوں پر بھی وہ کہیں مانے یا نہ مانے بابا نے
تھا اُسے۔ وہ ابھی تک دل سے اس کے لیے اپنی ہی ذہنی حالت اور بے دلانہ خفگی سے سوچ رہا تھا۔ خسارہ تو اُس نے لیا تھا مگر بہت کی بات تھی خسارہ اس نے لیا تھا مگر نقصان میں اُن کی اپنی ذات کا
اہمیت بڑھتا جا رہا تھا۔

"آپ چپ کیوں ہو گئے؟ کوئی بات بری لگ گئی کیا؟"

"ارے نہیں مس شافعہ! ایسی کوئی بات نہیں۔ بس مجھے حاضر غائب رہنے کی عادت ہے۔"

"چلیے، جس حالت میں آپ خوش ہیں۔ آں ہاں، بس لیفٹ لے لیجیے۔ یہی سفید رنگ کا گھر ہمارا ہے۔"

سفید ماربل اور جامنی اینٹوں سے سفید رنگ سے پینٹ شدہ گھر۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے آدھا سفید ماربل میں کہیں رہ گیا تھا۔ ویسے ہی اس سفید جام سے گھر میں کہیں بٹ گیا تھا۔ پتہ نہیں وہ گھر اسے اتنا اپنا سا کیوں لگ رہا تھا۔ اسے لگنے لگا تھا جیسے اس گھر نے بانہیں کھول کر اس کا استقبال کیا تھا۔ مگر اس گھر سے اس کا کیا تعلق تھا......

وہ کار روک چکا تھا۔ شافعہ اُسے چائے کی دعوت دے رہی تھی۔ ایک دل آیا انکار کر دے مگر دوسرے ہی لمحے اس گھر نے پکارا۔ میرے اندر مت آؤ۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں، تمہیں اپنے اندر سمیٹ لینا چاہتا ہوں۔ پلیز مجھ سے ملے بغیر مت جاؤ......

اسے لگا تھا جیسے اس گھر نے مسکرا کر دیکھا تھا۔ وہ جانے کی خواہش کے باوجود نہیں جا سکا تھا اور کار سے اتر کے پاؤں اپنے قدموں کو بھیجا رہا تھا۔

"آپ کے پاپا کہیں وہ تو نہیں منائیں گے؟" اُس نے تدل کلاس پر انگلیاں پھیریں اور شافعہ ہلکی سی مسکرائی تھی۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میرے بابا جان بہت کھلے مزاج کے ہیں جیسے ہم دونوں بہنوں کو پڑھنے دیا ہے۔ میری بہن دوسرے شہر میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہی ہے اور میں اس شعبے سے منسلک ہوں۔ وجہ معاشرے میں قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ حالانکہ ہم ان کے ذہنوں پر چھاپے رکھتے ہیں، ان کے ذہنوں کو پڑھتے ہیں لیکن پھر بھی لوگ ہمیں عزت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔"

"ارے آپ دل چھوٹا مت کیجیے۔ یہ لوگوں کا مزاج بن گیا ہے۔ پھر یہ بھی تو طے ہے دوسروں کی سوچ کی غلطی کو کیا اچھے آپ کو ان سب سے کیا نقصان ہے۔"

"ارے آئیے اندر چلیے۔ آج ہی آپ کا پتہ پاپا سے ملا تھا... کسی زمانے میں ان کی تصویروں کا مجموعی کا دستہ تھا۔ وہاں شہر کے بہت جانے مانے آرٹسٹ تھے، ڈیکن آرٹ ان کا شوق تھا۔ آپ کو پتہ ہے، میرے پاپا بھی ایس ایس نیچر... کے قدرتی مناظر کی ویڈیو بنا چکے ہیں۔"

"ارے واہ۔ وہ تو بہت قابل انسان ہیں۔ میں ان سے ضرور ملنا چاہوں گا۔"

شافعہ نے بیل دی۔ دروازہ سردار راشدی نے کھولا تھا۔

شہریار کو لگا یہ چہرہ وہ پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔ کہاں دیکھا تھا یہ چہرہ؟ یادداشت کو ایک جھٹکا سا لگا اور جیسے سب سمجھ آ گئی۔ وہ ہیجانی کیفیت میں ان سے ملے بغیر ہی تیزی سے واپس مڑ گیا۔

"سوری شافعہ ابھی مجھے کہیں اور جانا ہے۔ پھر کبھی آپ کے پاپا سے ملوں گا، ان سے مل کر مجھے بہت اچھا لگے گا۔"

شافعہ حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی اور وہ گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا... پاپا کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ سردار راشدی اور پاپا کی تصویر اس نے ان کے گھر میں دیکھی تھی۔ بے شمار سوال تھے اور وہ تھا......

گاڑی تیز رفتاری سے اڑی جا رہی تھی... وہ جیسے جیسے پاپا کے گھر سے قریب ہو رہا تھا اس کے اندر اٹھتے سوالوں کے جوابوں سے قریب ہو رہا تھا۔

❀❀❀

ماما اور ماہان نے اپنے سے... شہریار اور عاطف کو بیٹھے دیکھا تو... کی آوازیں ان کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ ... ساری توجہ اپنے پاس بیٹھے... صاحب کی طرف لگا رکھی تھی۔ ... سیاست کو... سیاستدانوں کی... رکھے ہوئے اب بہت سے... اخبار چلا رہے تھے... ماما اور ماہان تھا... کرتے ہوئے... بات کر رہے تھے۔

"تمہیں پتہ ہے ماما ایڈورٹائزنگ کا کاروبار کرنے میں سب سے زیادہ کون ملوث ہے؟"

"نہیں جانتا ہوں سر! آپ حسن ابراہیم شاہ وہ ہم ہے کہ کبھی اس سلسلے میں پوائنٹ آؤٹ نہیں کیے جا سکتے۔ آپ جانتے ہیں ماں، اور حکومت میں حزب سے اپنی جگہ مستحکم کر لیتے ہیں اور پچھلے چھ سال سے تو وہ سیاست میں صرف پیسہ لگانے کی پالیسی ترک کر کے خود بھی سیاسی لیڈر بن چکے ہیں اور ان کی پارٹی آج کل پاور میں ہے۔ آپ ہی بتائیے ایسے میں آپ اپنے اخبار کے ذریعے کیا رزلٹ لینا چاہتے ہیں؟"

مسٹر یوسفی نے مسکرا کر اسے دیکھا، پھر آہستگی سے بولے۔ "تمہیں معلوم ہے میرے نزدیک رائے دہندوں سے رزلٹ کی ضمن میں کیا مانگ ہوتی ہے۔ تمہیں وہ شہریار کا واقعہ یاد ہے، جسے ہمارے اخبار نے بہت ہائی لائٹ کر کے چھاپا تھا؟"

علامہ ارسلان نے ایک سیکنڈ سوچا اور بولا۔ "جی ہاں۔ وہ کسی ڈرگ سے متعلق ایک خبر تھی۔ دوسرے شہر سے آتے ہوئے ہائی وے پر اسے ڈرگ کے سلسلے میں روک لیا گیا تھا۔ گو ڈرگ کی مقدار اتنی کم تھی کہ اس وقت کے ہائی وے پولیس کے انسپکٹر مامون نے سخت تادیبی کارروائی سے صرف نظر کیا تھا، بات ذرا نیوز پر دکھائی گئی تھی اور شہریار بند عدالت تارش ہو گیا تھا۔"

یوسفی صاحب نے نفی میں سر ہلایا تھا، پھر بولے تھے۔ "تم اس وقت میرے اخبار میں نہیں تھے، اس لیے درمیان کی بات سے آگاہ نہیں ہو۔"

"یعنی سر؟" علامہ نے سوالیہ دیکھا اور وہ مسکرا کر بولے۔

"یعنی یہ کہ علامہ ارسلان! کہ وہ ڈرگ جان بوجھ کے اس کی گاڑی میں رکھی گئی تھی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ شہریار کو ہر وقت ہائی لائٹ کرتے رہنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی ابراہیم کی کوئی صورت باقی نہ بچے اور یہ کام اس وقت کے حسن ابراہیم نے کروایا تھا۔ اس طرح سے مخبروں نے جا کر ڈول بھی جیت لیا تھا اور دوسری طرف اپنا مطلب بھی حل کر لیا تھا۔"

"مطلب حل کر لیا تھا، میں سمجھا نہیں؟" آج اس پر راز کھل رہے تھے۔ وہ مبہوت ہو گیا تھا اور یوسف صاحب تو گم سم بیٹھے تھے۔

"مطلب حل کر لینا سے مراد یہ تھی کہ جن دنوں یہ کام ہوا انہی دنوں مسٹر حسن ابراہیم کی ڈرگ کی ایک بڑی کھیپ آ رہی تھی، ساتھ ہی صرف ڈرگ کی تھی، مقدار کا تعین نہیں تھا۔ ماتحتوں نے آدھا کلو ڈرگ شہریار کی گاڑی میں منتقل کروا دی، پھر ہائی وے پولیس انسپکٹر مامون نے شہریار کی گاڑی سائیڈ کروا کر باقی گاڑیوں سے توجہ ہٹا لی تھی، یوں وہ بہت آسانی سے کروڑوں کمانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔"

"پھر سر! ان پرانی باتوں کا مقصد؟"

"مقصد یہی ہے کہ میں آج کل ٹی وی چینل کھولنے کے لیے این او سی لینا چاہتا ہوں۔ سو وہ پرانا کیس پھر سے ری اوپن کر کے اپنے مطلب کا فائدہ نکالوں گا۔"

”آپ کو لگتا ہے وہ یہ بات مان لیں گے؟“ سلامہ نے حیرت سے پوچھا۔

یوسف اختر بولے۔ ”ہاں، مجھے معلوم ہے، وہ یہ بات مان لیں گے۔ کیونکہ انہی دنوں میں نے بہت خاموشی سے مسٹر ابراہیم کو فالو کیا تھا۔ کرائم رپورٹنگ میں ایک نام جانا جاتا تھا کا قمام وہ میرا ہی اسسٹنٹ تھا۔ ان دنوں میں نے بہت سے معاملات میں ٹیلی پیتھی۔ جو کام تم آج کر رہے ہو وہ کام میں ان دنوں کیا کرتا تھا۔ سو انہی دنوں کی کچھ یادیں فوٹوگرافس کی صورت میں محفوظ ہیں۔ اس لیے حسن ابراہیم کو میری خاموشی کی کچھ تو قیمت دینی ہوگی۔ میں نے یہ ترپ کا پتا اسی لیے سنبھال کر رکھا تھا۔ پھر اگر یہ معاملہ بھی ڈھیلا رہا جو کہ ناممکن ہے تو بھی میرے ہاتھ خالی نہیں ہیں۔ تم نے جو بیک ڈور ڈپلومیسی کی اپنائی ہے وہ میری ہی شخصیت کا تو پرتو ہے تم بالکل میری طرح تو سوچنے لگے ہو یوسف بتانے میں حرج نہیں۔ لائف کیئر ہاسپٹل کی پرائیویٹ روم کی رنگینیاں ہوں یا حلوائی گیسٹ ہاؤس کی کہانیاں، سب کی تصویریں مع ثبوت میرے پاس محفوظ ہیں۔ کچھ ہاسپٹل کی چیئرمین کے قصے ہیں، جہاں سے ہمارے سیاسی لیڈروں، بزنس کمیونٹی کی راتیں مہکتی ہیں۔ اگر وہ سب اخبار کی زینت بن جائیں تو سیاسی میدان بالکل خالی رہ جائے گا۔“

”آپ کو کبھی سخت تادیبی کارروائی سے خوف نہیں محسوس ہوا؟“ سلامہ سلمان نے اختتامی سوال پوچھا اور یوسف اختر ہنسنے لگے۔ پھر مسکرا کر بولے۔

”تم بھی تو اداکارانہ نبریا کا حصہ ہو۔ تمہیں کبھی سخت تادیبی کارروائی کا خوف ہوا؟“

سلامہ سلمان نے شوخ نظری سے انہیں دیکھا اور کہا۔ ”میں ہر رپورٹ پر مکمل ہوم ورک کر کے ہی ہاتھ ڈالتی ہوں۔ یہ تھی کی تاریں ملانا ہی سب سے بڑی مہارت کا کام ہے سر اور یہ کام مجھے بہترین بنیادوں پر آتا ہے۔ کمزوریوں کو کس طرح ٹریٹ کیا جاتا ہے، یہ میں نے آپ سے ہی سیکھا ہے سر!“

”بس پھر اپنا سوال واپس لے لو۔ کیونکہ شیر کا باپ شیر ہی ہوتا ہے۔“

سلامہ سلمان ہنسنے لگی۔ پھر بہت اچھی باتوں پر ملاقات ختم ہو گئی۔ سلامہ سلمان کافی ان سے نکلا تو اس کا رخ زہرہ جنید کے سائٹ پر ہونے والے کلینک کی طرف تھا۔ یہ زمین بھی اس نے زہرہ جنید کے لیے اپنی سیاسی بازی گری سے تیس سال کی انتہائی لوٹ مار سے پڑی تھی۔ لون کے لیے دو تین بزنس پارٹنرز کو بلیک میل کرنے کا کام جاری تھا مگر ابھی فی الحال جنید کی جمع پونجی اور خود زہرہ کی کمائی گئی رقم استعمال میں تھی اور پھر زہرہ خود اس بات سے آگاہ تھیں کہ اچھے کلینک کے لیے لون لیے بغیر کام جاری رکھنا ناممکن ہے، سو وہ خود بھی انہی کوششوں میں تھیں۔ جنید نے اس سلسلے میں اس گھر کے کاغذات زہرہ کے حوالے کر

AANCHAL.COM.PK

بنے تھے، جہاں وہ فیملی کی بہترین رہائش کے لیے منتقل ہونے والے تھے۔ مگر ماں کی گمشدگی کا حادثہ آ گیا تھا، سالوں کے بعد سے یہ گھر یونہی بغیر استعمال کے پڑا تھا۔ زہرہ نے کئی بار جنید کو صلاح بھی دی تھی کہ جب تک استعمال میں نہیں آتا گھر کو رینٹ پر دے دو۔ مگر جنید کی ضد تھی اس گھر میں پہلا قدم زہرہ جنید ہی رکھیں گی، ورنہ یہ گھر ایسے ہی پڑے پڑے ختم ہو جائے گا۔ "بہت سے خواب دیکھے ہیں ہم نے۔ اور یہ خواب ہم مل کر ہی جئیں گے۔"

سوزہرہ اس گھر کے کاغذات پر اون کی بابت پیش رفت کر رہی تھیں۔ سلامہ نے حالانکہ منع بھی کیا تھا اگر وہ کلینک کے سلسلے میں کوئی ڈیل نہیں چاہتی تھیں۔ زمین کے لیے بھی سلامہ نے کافی ہوم ورک کر کے کاغذات ان کے حوالے کیے تھے۔ جس وزیر کے ذریعے یہ زمین دی گئی تھی سلامہ۔ وہ پردہ اسے بلیک میل کرنے کا مرتکب ہوا تھا اور اس وزیر نے باقاعدہ میڈیا پر پریس کانفرنس کر کے کلینک کے لیے زمین دیے جانے کو حکومت کے بہبود عوام پروگرام کا حصہ قرار دیا تھا۔ یہ ٹیک کا ذاتی اس لیے میڈیا پر حکومت کی اس سلسلے میں کافی تعریف و توصیف ہوئی تھی۔ سوزہرہ جنید کو اس کام کے Fake ہونے پر ہلکا سا شبہ بھی نہیں ہو سکا تھا اور سلامہ چاہتا تھا وہ ان بھی اسی طرح پاس کروا دے کہ زہرہ کو یاد ہو جائے کہ ہے۔ مگر جس بزنس مین پر وہ ہاتھ ڈال رہا تھا وہ حقیقی بزنس کے کینے انسانوں میں شمار ہوتے تھے اس لیے امکان غالب تھا کہ وہ اس کام میں چوک جاتا۔

"ہیلو بیو!" سلامہ نے گاڑی پارک کی اور عارضی طور پر بنائے دفتر میں بیٹھی زہرہ کے قریب آ کر مسکراتے ہوئے انٹری دی۔

"ہیلو سلامہ! اچھا ہوا تم آ گئے، سچ! مجھے اس وقت تم سے ہی کام تھا۔ ذرا یہ چیک تو کیش کرا لاؤ۔ رقم کی کمی کی وجہ سے کام میں رکاوٹ آ رہی ہے۔"

"مگر آپ تو کہہ رہی تھیں، کلینک کے سلسلے میں آپ کی ڈاکٹرز میٹنگ ہو رہی ہے۔"

"ہاں، وہ ڈاکٹرز میٹنگ ہوئی تھی اور ڈاکٹرز اسٹاف جس طرح میرا ہاتھ بٹا سکتے تھے، انہوں نے بتایا ہے۔ میرے کلینک میں ڈاکٹرز کی ایک بڑی تعداد رضا کارانہ طور پر کام کرنے پر راضی ہے۔ میڈیکل ریپریزنٹیٹو بھی وزٹ کر رہے ہیں، دوائیوں کے سلسلے میں بھی کافی مدد کا امکان ہے۔ کلینک کے لیے مشینری بھی بہت حد تک ملنے کا گرانٹ بن چکا ہے، مگر یہ سب اس وقت ممکن ہے جب کلینک بن کر تیار ہو جائے۔ سو میرے بھائی! جلدی سے جاؤ میرا یہ کام کر دو۔"

سلامہ اور سلمان نے چیک لے کر جیب میں ڈالے اور الٹے پیروں واپس بینک کی طرف ہو لیا۔ بینک بند ہونے میں صرف ایک گھنٹہ رہ گیا تھا اس لیے اس کی گاڑی بہت تیز رفتاری سے سفر طے کر رہی

تھی۔ وہ بیٹے مرے سے اولاد کے لئے اسٹرگل کر رہا تھا مگر اس بار جیتنے کا امکان کم تھا۔

آج بیگم عافیہ خود کو رکھ کر انوشے کے ساتھ سفر کر رہی تھیں حالانکہ انوشے ان کے وجود سے نفرت کرتی تھی۔ لیکن بیگم عافیہ کو لگتا تھا وہ اسی طرح ان کے وجود کا حصہ ہے۔ محبت کو سمجھنے میں وہ بچی ہو سکتی ہے اور وقت بھی۔ لیکن ان کی پرورش میں پیار کے بنا ممکن ہے کہ وہ محبت کو بالکل ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔

"آپ جانتی ہیں، میں کتنی ریش ڈرائیو کرتی ہوں۔"

"ہاں، میں جانتی ہوں۔ مگر تمہارے ساتھ بیٹھ کر مجھے کوئی ڈر نہیں لگے گا۔"

انوشے نے ایک جھٹکے سے کار اسٹارٹ کی۔ پھر سڑک پر وہ عام حالات سے زیادہ ریش ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ عافیہ بیگم خاموشی سے ان کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

"تم میرے وجود کا حصہ اپنے اندر سے کیوں نکالنا چاہتی ہو؟"

"میں کیا کروں گی، آپ جانتی ہیں ناں، مجھے آپ سے کتنی نفرت ہے۔"

عافیہ بیگم نے مسکرا کے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا، پھر نرمی سے بولیں۔ "مجھے مارنے کے لئے تم اپنی جان پر مت کھیلو۔ تم چاہتی ہو میں مر جاؤں تو میں خود اپنی گاڑی کرا سکتی ہوں۔ مگر شرط ہے تم میرے ساتھ گاڑی میں موجود نہیں ہوگی۔ کیونکہ تمہیں ذرا سی بھی خراش آئے، میرا دل یہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

انوشے نے گاڑی ایک جھٹکے سے روک دی تھی۔ "مجھے آپ کے ساتھ کہیں نہیں جانا۔"

بیگم عافیہ مسکرا دیں پھر ملائمت سے بولیں۔ "آپ کیوں نہیں کہتی ہو تمہیں میری موت برداشت نہیں ہوگی اسی لئے اس ڈیل سے بچنا چاہتی ہو۔"

انوشے نے کچھ نہیں کہا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ عافیہ بانو نے مزاج کے عین مطابق دیکھا اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کے بولیں۔ "تم اپنی مرضی سے جہاں جانا چاہتی ہو جا سکتی ہو۔ میں ٹیکسی لے کر خود چلی جاؤں گی۔"

انوشے نے انہیں نہیں روکا تھا۔ وہ باہر نکل کر کسی ٹیکسی کا انتظار کرنے لگیں۔ انوشے ان کے اترنے کے بعد بھی اپنی کار آگے نہیں بڑھا سکی تھی۔ یہاں تک کہ وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئیں۔ انوشے نے انہیں ٹیکسی

AANCHAL.COM.PK

میں جتنے بچے کر اپنی کارگزاریوں کے عوض وہاں میں بانٹی تھی۔ بیگم عاقبہ نے انداز دکھانے میں ہی دل میں ٹھان لی تھیں۔

شہریار ٹھیک کہتا ہے۔ انوشے جتنی بھی میری طرف سے زور دے، اس کی طبیعت ہے وہ عادت کی طرح ہی مجھ سے پیار کرتی ہے۔ بس اس کے پیار کا طریقہ ذرا مختلف ہے۔ اس کا انکار وہ قرار کی ہی ضمانت ہے...... شہریار انوشے سے یکدم ان کی دماغ وہ شہریار کی طرف مڑ گیا۔ پتہ نہیں شہریار سے وہ جتنی بھی بار ملی تھیں، انہیں اس سے اپنا پن کیوں محسوس ہوتا تھا۔ شاید اس بچے کو ہر ایک سے اسی طرح گھل مل جانے کی عادت تھی۔

وہ آج کل پارٹیشن اینڈ اسٹائل کے وہاں کمشنر کی میٹنگ میں تحریک ہو رہی تھی۔ مگر ابھی تک جتنی بات چیت یا ملاقات طے ہوئے تھے وہ شہریار، عبدالرحمن اور علامہ عبدالرحمن کے ساتھ میٹنگ میں طے ہوئے تھے۔ مگر کل ہی شہریار نے انہیں ہر فنکشن کی لانچنگ میں ان کے کلام کے جواب سے منسلک کرنے کی بابت فون کیا تھا اور وہ آج اسی سلسلے میں فیشن اینڈ اسٹائل آئی تھی۔ لیکن کاتبوں نے کوئی وہ روک دیا تھا، انہیں یہ سب کچھ کر کے لگ رہا تھا جیسے ہمت کا ہاتھ بدل چکا ہو، ان کے سامنے سماں بدل گیا تھا۔ شروع میں سخت حالات سے...... مگر اتنے سالوں سے وہ جو زندگی جی رہی تھی اس میں اب ایکسٹرا اوورڈ سنت کی گنجائش کم ہی تھی۔ وہ مطلب نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ اچانک ان کے قریب اداکار کی طرح کام کرنے لگی۔

"اوہ میم! آپ یہاں خیریت؟"

بیگم عاقبہ نے تنگ کر گہرا سانس لیا اور مسکرا کر شہریار کو دیکھنے لگیں اور صرف دیکھا ہی نہیں، جواب دینا بھی ضروری تھا ورنہ وہ بیچ ہی سمجھتے کہ بہانے سے اس وقت کی اس شرمندگی کو چھپانے لگیں جس کا سبب وہ خود بنی تھی۔ مگر اپنی بیٹا کا احساس کر اور وہ بھی کسی قسم کی غلطی کے ضمن میں انہیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ شہریار ان کے لیے عزت دور کھول چکا تھا۔

"آئیے میم! میں بھی میٹنگ کے لیے ہی آیا ہوں۔" اس نے انہیں تعظیم دی اور ان کی احسان مندی کے احساس کو زائل کرنے کی کوشش کی۔ وہ جانتا تھا اس نے جتنی محبت سے سوال کیا تھا، وہ بیگم عاقبہ کو سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ اسے اس میٹنگ کا خیال خود ہو چکا تھا۔ ورنہ حقیقت میں وہ اس میٹنگ میں سالار عبدالرحمن کی تنگی سے بچنے کے لیے شرکت سے جان چھڑا گیا تھا۔ یہ بات کہ اندر چلنے والے سوالات کی وجہ سے وہ بیگم عاقبہ کو مدعو کیے جانے کا بہانہ تک بھول گیا تھا۔

"آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں شہریار؟"

شہریار وہ جانتے ہیں اسی حیرانی میں تھا، ان کی موجودگی آتشیں فراموش کر چکا تھا۔ یکدم چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟"

"ہاں...... میں کہہ رہی تھی کہ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔ وجہ جان سکتی ہوں؟"

اس قدر پر خلوص احساس شہریار کی آنکھوں میں کیفیت... اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے ... بارک کر رہی تھی ... ہوئے بہت مدھم لہجے میں کہا۔

"کوئی ایسی بات نہیں ہے میم! بس جب تک یہ فنکشن وقت پر اور میرے سوچے ہوئے آئیڈیاز کے مطابق لانچ نہیں ہوجاتا، مجھے پریشانی تو رہے گی ہی۔"

نجم عاقب مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگیں۔ پھر اس کا گال تھپتھپا کر بولیں۔ "تم بہت زیادہ حساس ہو اپنے کام سے اور جو لوگ کام کو اپنی طرح لیتے ہیں انہیں کامیاب ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے میم! ورنہ مجھے ابھی اس فیلڈ میں بہت کچھ سیکھنا ہے۔"

نجم عاقب اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں، مسکرا کر بولیں۔ "جو انسان یہ سمجھنے لگے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے، وہ سیکھنے کے عمل کو کبھی مکمل نہیں سمجھتا وہی انسان...... صرف وہی انسان کامیابی کی نئی جہت دریافت کرتا ہے۔ اسے ایسے ہی بیٹھوں کے راستے پر چلنا ضروری ہے۔ جب منزل پا جاتا ہے تو کامیابی کی طرف آنے والے کئی نئے راستوں کی نشاندہی کرتا ہے اور تم...... میرے بچے! تم ایسے ہی انسان ہو۔"

شہریار مسکرانے لگا۔ وہ مزید کچھ کہہ نہ سکا۔ نجم عاقب کی بات کا حسن اور ان کی محبت کچھ کہنے نہیں دے رہا تھا۔ اس نے انہیں میٹنگ روم کے سامنے لے جا کر کھڑا کرنے کے بعد وہ رکا نہیں تھا۔ نجم عاقب نے پھر بھی پوچھ ہی ڈالا۔

"یہاں سے میری اختیاری حدود کا اختتام ہوتا ہے میم! آپ سے باقی معاملات ملک عبدالرحمٰن طے کریں گے۔ میرا کام صرف فنکشن کی لانچنگ کا سینٹر بنانے اور ... کرنے اور یہاں کی جگہ تک تھا۔ باقی سب کچھ مسٹر عبدالرحمٰن دیکھیں گے آپ۔"

نجم عاقب نے اسے دیکھ کر کہا۔ "باقی کام؟...... اب کوئی کام کرنے کو بچا بھی ہے؟ سارے کام تو تم نے سہولت سے نمٹا لئے ہیں۔ شکر کرو یہ کسی اور کو جتانا چاہتے ہو۔"

وہ ہنس کر چپ ہو گیا۔ نجم عاقب میٹنگ روم میں داخل ہو چکی تھیں۔ وہ مسٹر عبدالرحمٰن کے کمرے میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے کے خیال سے داخل ہوا تھا، مگر کہا...... بابا بہت خاموشی سے رہا لوگ

AANCHAL.COM.PK

جبڑے پر آنکھیں بند کر کے جھولے جا رہے تھے۔ ان کے چہرے پر سوچوں نے ایسے جال تن رکھے تھے کہ ایک لمحے کو اسے دھڑکا سا لگا کہیں ڈاکٹر صدیقی نے تو اس کی بابت کوئی سیریس بات تو نہیں کر دی۔ وہ بہت خاموشی سے ان کا جائزہ لے رہا تھا اور سوچ رہا تھا وہ سوچ کا کون سا سرا پکڑے کہ یہ جال بلکہ جالے ایک دم سے صاف ہو جائیں۔ ایک...... مگر تیسرے منٹ تک اس نے ہر خیال کو چھوڑ کر باقاعدہ انہیں پکارنا ضروری سمجھا تھا۔

"بابا!..... خیریت ہے؟"

مسٹر عبدالرحمٰن نے چونک کر حیرت سے اسے دیکھا۔ حیرت تو خود شہریار کو بھی کم نہیں تھی کیونکہ بابا ہمیشہ اس کے قدموں کی آہٹ سے اسے پہچان لیا کرتے تھے۔ مگر آج وہ جانے خیالوں میں کہاں غرق تھے کہ وہ اس کی آمد تک سے بے خبر رہے تھے۔

"سب ٹھیک ہے، تم جاؤ، آج خیر سے تو ہے..... کل تو میرے سارے اصرار پر بھی تم نے سر پھیر لیا تھا۔ انکار کے سوا اور بات ہی نہیں، فیصلہ لینے کی ذمہ داری ڈال دی تھی مجھ پر کہ تم یہاں؟"

"کیا آپ چاہتے ہیں، میں یہاں سے چلا جاؤں؟"

مسٹر عبدالرحمٰن نے اس بار ناپسندیدگی سے اسے دیکھا، پھر گھمبیر لہجے میں بولے۔ "تو تمہیں تو منتخب بات کی کب آئے گی بار؟"

"شاید کبھی نہیں۔ آپ جانتے ہیں اس بات پر بار بار مجھ سے غلط امیدیں کیوں لگاتے ہیں؟"

مسٹر عبدالرحمٰن اس بار کچھ نہیں بولے۔ انہوں نے اپنے سامنے رکھی ڈائری کھول لی تھی۔ اس ڈائری میں وہ دوائیں تھے جو شہر بھر میں بماری اکثر بہت سے منتخب کر لیے گئے تھے۔ شہریار جانتا تھا یہ فائل کھولنا اور اس کی طرف سے بے پروا ہو جانا مسٹر عبدالرحمٰن کا صرف نفرت سے زیادہ ناراضگی کا ثبوت دینے کی معصوم سی کوشش تھی۔ اسے بابا پر ہنسی آنے لگی تھی مگر وہ پھر بھی ہم سارے سے کھڑا تھا۔

مسٹر عبدالرحمٰن نے کچھ سیکنڈ بعد ہی سر اٹھا کر اسے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھا دیکھا، وہ جل بلا اٹھے۔ "کیوں اتنا وقت برباد کرنا چاہتے ہو؟ ایک بوڑھے آدمی کے پاس بیٹھنے سے تمہیں کیا ملے گا؟"

اس نے پوری آنکھیں کھول کر مسٹر عبدالرحمٰن کو دیکھا، پھر کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" وہ سمجھے وہ خفا ہو کر جا رہا ہے۔ مسکرا کر اس کی بلندی سے اس کے قدموں میں زنجیر ڈالی اور غیر شکراہٹ وہ کہنے لگی۔

"میں کہیں جا نہیں رہا تھا۔ شان! دولت پیسے کا سودا تو کبھی بھی، کہیں بھی بنایا جا سکتا ہے۔ چاہے وہ اراضی دوست ہی کیوں نہ ہوں۔"

مسز عبید الرحمٰن نے اس کی طرف دیکھا پھر مدھم ہو کر بولے۔ "ابھی تک ناراض ہو مجھ سے شان؟ وہ بات گزرے آٹھ سال ہو گئے ہیں۔"

"اس بات کا ذکر مت کیجئے تو شاید اب وہ بات بھی نہ ہو۔"

"کیا تھی تمہیں دنیا میں ایسی آ گئی، جو ہم سب ہی نے تمہارے لئے کسی مہرے کی طرح نچوڑ لی تھیں؟"

اس نے نظریں چرا لی تھیں، کچھ بولا نہیں تھا اور مسز عبید الرحمٰن اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئے تھے پھر اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر بولے تھے۔

"کیا کبھی ایسا ہوگا کہ میں تمہارے لئے پہلے جیسا دوست بن جاؤں؟"

شہریار نے نظر اٹھا کر دیکھا پھر سر ہلا کر لہجے میں بولا۔ "کچھ اچھے وقت کبھی کانٹا چبھ جاتے ہیں تو پھر بھی نکال لیا جاتا ہے۔ بظاہر وہ چبھنے والی نظر کا غلطی کا کانٹا ہی لگتا ہے مگر پاپا! آپ کو معلوم ہے ناں وہ کانٹا پھر بھی اندر رہتا ہے، چبھتی ہے اور ایک دن ڈھل ڈھل کر وہ کچھ اوپر سے بیٹھ جاتا ہے۔ تو پھر برداشت کی حد بھی ایسی ہی ہے اور اس دن وہ مقام ہو گئی تھی۔"

"کیا بڑی بچپن کی محبت کے بدلے میں ایک غلطی معاف نہیں کر سکتے تم؟ حالانکہ میں نے تمہاری ہزاروں غلطیاں درگزر کی تھیں۔" پاپا نے تھکے ہارے سے لہجے میں کہا اور وہ سر جھکا کر بہت بے بسی سے بولا۔

"میں آپ سے نفرت تو نہیں کرتا پاپا! مگر......"

"مگر یہ کہ تم مجھ سے محبت بھی تو نہیں کرتے، پہلے جیسی۔"

اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اس کی کہیں ٹوٹی ہوئی تھی۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا تم پہلے کی طرح کوئی غلطی کرو اور سب سے پہلے تم میری گود میں آ کر چھپ جاؤ اور میں پہلے کی طرح تمہیں ساری دنیا سے چھپا لوں، تمہیں دنیا کے لئے کہیں باہر کچھ ڈھونڈنا پڑے۔"

"میں نے دنیا کا حساب اپنی زندگی سے نکال دیا ہے پاپا! آپ جانتے ہیں۔" اس نے پھر جان بچانی اور پاپا نے ایک نئے طرح سے اس کو دیکھ کر کہا۔

"اگر میں مر جاؤں تو کیا تب تم مجھے معاف کر دو گے؟"

"پاپا......" اس نے بے قراری سے اُن کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ "میں اپنی زندگی میں یہ دکھ کبھی دیکھنا نہیں چاہتا۔" اس نے عجیب سی ضد کی اور مسٹر عبدالرحمٰن نے اس کو خود سے قریب کر کے کہا۔

"وقت بہت کم رہ گیا ہے شہری! تم جانتے ہو میں جو گزار رہا ہوں وہ صرف زندگی ہے۔ مگر کیوں تھک رہے ہو یار؟ دکھ اور خوشی کی کوئی حد نہیں، محبت کی بھی کوئی حد نہیں، لیکن زندگی کی حد ہے۔ زندگی کبھی نہ کبھی ختم ہو جاتی ہے۔ مگر وہ لمحے، جو ہم ایک دوسرے کے ساتھ بانٹ کر گزار سکتے ہیں، جو ایک دوسرے کی محبت میں جی سکتے ہیں، اسے ہم دائمی جدائی سے پہلے عارضی جدائی سے برباد کیوں کیے چلے جاتے ہیں؟ زندگی مختصر، محبت مختصر، لیکن موت ایک طویل زندگی کا نام ہے شہریار! اس زندگی کے بغیر کسی محبت، کسی پیار، کسی یاد کے جانے والے دل کی خلش کے بغیر جینا بہت اذیت ناک ہوتا ہے تم جانتے ہو۔"

شہریار نے کچھ نہیں کہا تھا، بلکہ مسٹر عبدالرحمٰن کے کھلے بازوؤں میں سما گیا تھا۔ آخر کب تک تہی در بدری کا ڈھونگ کرتا رہتا؟ محبت اتنی دیر تک اس کے دروازے پہ کھڑی رہی تھی، یہ کیا کم تھا؟ سو اس نے مسٹر عبدالرحمٰن کی بہت ماضی میں کی گئی غلطی کو اپنی طرح بشری کمزوری کو وجہ دے کر معاف کر دیا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ وہ اب ساری کی ساری لے کر جینے سے اکتا گیا تھا۔ سو دوستی اور محبت کے کھلے بازوؤں کو اس نے زندگی سے مانگ لیا تھا۔ مسٹر عبدالرحمٰن نے اُسے سینے سے لگائے بھینچ رکھا تھا جیسے وہ برسوں بعد انہیں کھوئے ہوئے ملا تھا اور وہ خود ان کے کندھوں سے آنکھیں رگڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ جون کے کافی لانے پر وہ دونوں ایک جھٹکے سے الگ ہوئے تھے۔ شہریار نے جون کی طرف سے پشت کر کے اپنی آنکھوں کے آنسو صاف کیے تھے اور مسٹر عبدالرحمٰن نے بمشکل سنجیدگی سے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ جون کافی رکھ کر چلا گیا تھا اور مسٹر عبدالرحمٰن نے کافی بناتے ہوئے خوش دلی سے کہا تھا۔

"آج پورے چھ سال بعد کافی پی رہا ہوں شہری! تمہاری دوستی کے بعد میں نے کافی کو بھی زندگی سے نکال دیا تھا۔ یقین کرو بیٹا! پاپا کے ساتھ تمہاری محبت مجھے بات کرتی تھی، جو تم مجھ سے اُدھار کی طرح چھین چکے تھے۔"

"پاپا!......آئی ایم ساری......" وہ ان کے ہاتھ کو چوم کر مدھم ہو کر بولا۔ پھر کافی کا کپ تھام کر اس نے آخری گھونٹ حلق سے اتارا اور حیرت سے وہ سوال کیا، جو وہ کمرے میں آتے ہی کرنے کا خواہاں تھا۔ مگر ان کی باتوں سے ڈسٹرب ہو کر کہنا بھول گیا تھا۔ اس نے گلا کھنکھارا، پھر آہستگی سے بولا۔

"پاپا! آج کی میٹنگ کو آپ پرواہ کرنے والے تھے ناں، پھر آپ میٹنگ میں گئے کیوں نہیں؟"

"بس ویسے ہی۔ میرا دل کہہ رہا تھا تم آنے والے ہو اس لیے۔"

"پلیز پاپا! اب بتائیے مت۔ سچ بتائیے آپ میٹنگ میں کیوں نہیں گئے؟"

مسٹر عبدالرحمٰن نے اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھا پھر آہستگی سے بولے۔ "کیا تم نے بتایا ہے مجھے کہ تم جو کل مسز نفیسہ کا رشتہ دیکھ کر اس میٹنگ میں شریک ہونے سے جان بچا رہے تھے تو اتنا چپ تم دفتر میں کیوں نظر آ رہے ہو؟"

شہریار عبدالرحمٰن نے ان کی طرف دیکھا پھر یکدم ایک خیال تیزی سے ذہن کے پردے میں در آیا۔ اس نے سوال کو بدلنے کی غرض سے کرنے کے لئے اپنے پیچھے مڑ کر دیکھا مگر اس کی آنکھیں سیڑھیوں سے ناکام لوٹ آئیں۔

"پاپا! یہاں دیوار کے ساتھ ایک تصویر ہوتی تھی۔ وہ کہاں گئی؟"

مسٹر عبدالرحمٰن کے جسم میں تناؤ ابھرا مگر انہوں نے چہرے کے تاثرات بدلے بغیر مسکراتے ہوئے کہا۔ "بہت پرانی ہو گئی تھی وہ تصویر اس لئے کرنی ایڈجسٹ پارٹمنٹ سے کہا اس تصویر کی جگہ کچھ اور لگنا چاہئے تاکہ آنے والے مہمانوں پر اچھا اثر پڑے۔"

"مگر پاپا! آپ تو کہتے تھے وہ دوستی کا ایک لمحہ ہے اور دوستی کبھی پرانی نہیں ہوتی۔"

مسٹر عبدالرحمٰن گڑبڑا گئے۔ انہیں کیا معلوم تھا وہ ان کی باتیں اتنے غور سے سنتا ہے۔ نہ صرف سنتا ہے بلکہ یاد بھی رکھتا ہے۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے دیکھتے رہے پھر آہستگی سے بولے۔ "شہریار تم بھی ہاں کیا پرانی باتیں لے بیٹھے ہو۔ بیٹا! انسان کو وقت کے ساتھ ساتھ چلنا چاہئے۔ زندگی میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہوتی رہیں تو زندگی کا احساس زندہ رہتا ہے۔ ورنہ موت اور زندگی میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔"

شہریار اس بار کچھ نہیں بولا تھا بس انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ پاپا اس کے خاموش سوال سے گھبرانے جا رہے تھے کہ جانے اب وہ اس خاموشی سے کیا مطلب لے کہ اچانک اس نے اپنی بات پھر سے عبدالرحمٰن صاحب کی طرف موڑ دی۔ "جہاں تک میرا خیال ہے آپ نے نجم ثاقب سے ابھی تک کوئی ملاقات نہیں کی ہے۔"

مسٹر عبدالرحمٰن نے فوراً بے صرف ظاہر کرنے کی کوشش کی اور وہ ان کی فائل پر نظر رکھ کر جھکا ہوا ان سے پوچھ رہا تھا۔ "آپ نجم ثاقب سے جان کر ملنا نہیں چاہتے۔ کیا وہ بھی آپ کو جانتے ہیں یا پہچان کا

ہوا آپ کے ماضی میں ہے؟" مسٹر عبدالرحمٰن کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور شہریار سے یہ چھپ نہ سکا تھا۔

"پاپا! بتائیے آپ انجم حائر کو جانتے ہیں؟"

مسٹر عبدالرحمٰن نے نفی میں سر ہلایا۔ مگر جھوٹ پوری طرح ان کی آنکھوں میں جھلکا تھا۔

"تو آپ مجھے نہیں بتائیں گے کہ انجم حائر سے آپ کا کیا تعلق ہے؟ پاپا! آپ یہ بھی جانتے ہیں اور سالار راشد بھی کہ ان کا آپ کی زندگی میں کیا رول ہے۔ لیکن آپ بتانا نہیں چاہتے۔"

"شہریار پلیز! بھول جاؤ سب۔" انتہائی بے بسی سے انہوں نے کہا۔ وہ دیکھا اور وہ یکدم کمزور ہو گیا۔

"اچھے دوست ہیں آپ، ابھی بھی دوستی ہے آپ کی ان سے؟ بھی نہیں کرنے دیا مجھے؟...... کیسے پاپا! میں صرف ایک سوال لے کر آیا تھا مگر آپ نے میرے پاس سوالوں کا ڈھیر کھول دیا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں ان سوالوں کے جواب پانے کے لیے میں کسی بھی حد سے گزر سکتا ہوں۔"

مسٹر عبدالرحمٰن اسے بے بسی سے دیکھتے رہے مگر کچھ نہیں بولے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتے انہیں باہر دروازے پر دستک ہوئی۔

شہریار نے دروازہ کھولا تو سالار عبدالرحمٰن نے اس کی شکل دیکھ کر بہت ناراضگی سے... پھر اندر آ کر دھیمے لہجے میں بولے۔ "پاپا! انجم حائر آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

مسٹر عبدالرحمٰن نے بے چینی سے سالار عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا پھر بہت تھکے ہوئے لہجے میں بولے۔ "سوری سالار! تم شاید انہیں Manage کر لو۔ میں آج بہت تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ کسی کو بھی اٹینڈ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

سالار عبدالرحمٰن سر ہلا کر باہر چلے گئے اور شہریار انہیں دور سے دیکھتا رہا پھر جو جملہ اس نے کہا مسٹر عبدالرحمٰن جو بیڈ سے کھڑے تھے چونک کر پلٹے تھے۔

"کیا کہا تھا تم نے ابھی؟" ان کا لہجہ اچھا نہیں تھا اور وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

"میں نے کہا تھا، انجم حائر کسی زمانے میں آپ کی دوست نہیں رہ چکی ہیں کیا؟ آپ کسی جھوٹ اور بہت عرصے کی شرمندگی تو نہیں ہے جو آپ کو ان سے ملنے سے روک رہی ہے؟ کیونکہ شاید انجم حائر بھی اتنی ہی شدت رکھتی ہیں آپ سے ملنے میں، جتنی شدت سے میں آپ سے سوال کا جواب چاہتا ہوں۔"

AANCHAL.COM.PK

"شہریار، پلیز! تم جاسکتے ہو... میں کسی بات کا جواب نہیں دوں گی۔" مسز عبدالرحمن نے غصے سے کہا اور وہ کچھ کہے بغیر باہر نکلتا چلا گیا۔

پھر سیڑھیاں اتر رہا تھا تب جازی عبدالرحمن اور سالار عبدالرحمن بلڈنگ میں لگائے جانے والے پودوں کا معائنہ کرتے ہوئے آگے چلتے نظر آئے۔ شہریار ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور بہت خوش تھا کہ جازی عبدالرحمن اس کے خیال کے مطابق بالکل ٹھیک عمر میں بزنس میں آگیا تھا۔ شاید اس نے بھی اسی عمر سے یہ جدوجہد شروع کی تھی۔ وہ مسلسل چل رہا تھا جب اچانک جازی نے مڑ کر اسے دیکھا اور حیران ہو کر بولا۔

"آپ ڈیڈ میں؟...... فرصت مل گئی تھی کیا آپ کو؟"

"ظاہر ہے...... بغیر فرصت کے میں یہاں کیسے نظر آسکتا ہوں؟" اس نے بھی شگفتہ انداز میں جواب دے کر بنا کسی اسٹریس کے کہا۔ جازی کا منہ کھل گیا۔ کیونکہ سالار عبدالرحمن کے ساتھ وہ کر وہ خود بھی ان کی ہی طرح ... بہت ہوگیا تھا۔ سامنے صرف ایک نام تھا شہریار عبدالرحمن...... وہ جیسا ان کو ول کرتا تھا وہ اپنے ہر آنسو کا حساب اس سے لے گا۔ وہ اس نے محض اس کی محبت میں بہایا تھا۔

شہریار اس کے دل سے قریب واقف تھا ہوا سے طرح دیتا ہوا کار کی طرف بڑھ گیا۔ ان کا رخ ... کوئی ان کی طرف تھا۔ کوئی بچہ نہیں تھی۔ بس دل چاہتا تھا پھر سے کسی یاد کو بہانے کسی خواب کو پکارے۔ اس نے کوئی ان میں قدم رکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں۔

یہ کیسا کنکشن تھا......؟ وہ سوچتے ہوئے سناٹے میں گھر اور گیا تھا۔

❁❁❁

"مجھے کچھ نہیں آتی اماں! آپ آخر شہریار کو کس بات کا الزام دے رہی ہیں؟ آپ کیسے بھول سکتی ہیں وہ ساری شرمندگی اور تکلیف جو ان کے گھر نے ان کی وجہ سے اٹھائی ہے۔"

حشمت خانم نے بیٹی کو دیکھا پھر بچوں کے لیے جگہ بناتے ہوئے بولیں۔ "پہلے میرا بھی یہی خیال تھا عالیہ! کہ شہریار عبدالرحمن سے ناراضی میں کبھی ختم نہیں ہوگی لیکن اب مجھے لگتا ہے ہمیں اسے دیکھنے کا موقع دینا چاہیے۔ شاید یہ بھی لگتا ہے عالیہ! کہ ہم اپنے بچوں کی زندگی سے بڑی غلطی معاف کردیا کرتے ہیں۔ ... مستقبل سے ہٹ کر کہا گیا کہ ... ہمیں کر دیتا ہے۔ ہمیں لگتا ہے اس نے ہر حد پار کر لی ہے اور اب اس کے لیے کوئی ... زندگی گزار کر ساری دنیا کا انتظام ... ہو کر رہ جائے گا۔"

بیگم عبدالرحمٰن تعجب سے ماں کو دیکھنے لگی تھیں۔ اتنی بڑی تبدیلی شخصیت میں...... حالانکہ ان کی پیشانی اتنی مضبوط نہیں تھی کہ کبھی وہ بیٹی ہونے کے باوجود ان کی سخت گیری سے نہیں بچ پائی تھیں۔ انہیں لگتا تھا ان کی شخصیت میں وقت اور حالات کی تلخی نے جو تغیر بدل دیا ہے، وہ شاید ہی کوئی دوسرا رخ اختیار کر سکے مگر یہاں وہ اپنے پچھلے رویے سے بالکل مختلف لگ رہی تھیں۔ بیگم عبدالرحمٰن کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ انہوں نے پھر سے سلسلۂ کلام جوڑا تھا۔

"عبدالرحمٰن نے جو غلطی کی اب یہ بھی نہیں معلوم یہ غلطی تھی یا جرم...... وہ صبیحہ عالیہ اس میں ثمر یار کا کیا قصور تھا؟ وہ تو ایک کٹھ پتلی کی طرح تمہاری گود میں لا ڈالا گیا تھا۔ اس نے تمہاری مجبوری میں کمی، تمہارا وجود بنا ہے اور تمہاری گود بھری۔ پھر بھی تمہیں اس سے محبت نہیں، کیا کبھی اس کی بھی ضرورت نہیں ہوا؟"

بیگم عبدالرحمٰن چپ میں ڈوبی ہوئی واقعی اندر سے ٹوٹ گئیں۔

محبت..... شاید انہوں نے تو اس سے کبھی اس کی بھی نہیں کیا۔ انہوں نے ثمر یار کو Pet کی حیثیت بھی نہیں دی تھی۔ وہ ہر طرح سے بری حالت میں بھی ان کے دل کا کانٹا بننے میں کامیاب رہا تھا۔

کیا واقعی وہ ماں تھیں......؟

کیا واقعی وہ عورت تھیں......؟

وہ عورت جس میں ممتا ہر شے سے زیادہ ڈالی مالک نے......

کیا واقعی اس نے ان کے دل کا دروازہ کبھی نہیں کھٹکھٹایا......؟

دل نے کہا بار ہا بار بار ان کے اندر ہلچل مچی، بار بار دل نے تمام تر آنے والی اولاد کی طرح سینے سے لگانے کی ہوک ابھری مگر نظر انداز کیا، نفرت اور اس کی ذات کے ساتھ منسلک سوال نے ان کے قدم روک دیئے۔ انہیں اس تک جانے والے ہر راستے میں خاردار جھاڑیاں دیتے تھے...... اس طرح کہ وہ بھی خار بن کر ان کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا تھا۔

انہوں نے گہرا سانس لیا اور پھر سے وحشت خام نظر سے دیکھنے لگی تھیں۔

"تم نے کیا سمجھا غلطی کہاں سے معلوم ہوا؟"

AANCHAL.COM.PK

انہوں نے آہستگی سے سر ہلایا پھر مدھم لہجے میں بولیں۔ "تلخی ہماری طرف سے تھی۔ ورنہ گواہ اور نافرمانی اس کی طرف سے تھی، ہاں!"

"تم اب بھی غلط انداز سے سوچ رہی ہو۔ کیا واقعی تمہیں لگتا ہے، وہ نافرمان اور بدتمیز بچہ ہے؟ کیا اس نے کبھی تمہاری کسی بھی سخت بات پر پلٹ کر سالار کی طرح جواب دیا ہے؟"

ماما نے سر جھکا لیا۔ "شاید نہیں...... لیکن مجھے اس کے وجود سے یہ احساس بھی نہیں ہوا ہے کہ میں اس کے لیے ضروری ہوں۔"

بیگم حشمت مسکرانے لگیں۔ پھر آہستگی سے بولیں۔ "پہلے مجھے بھی یہی لگتا تھا...... تمہاری طرح وہ مجھے جواب دینے سے گریز کرتا تھا، اس لیے میرے اندر اس کے لیے تم سے زیادہ غصہ اور نفرت بھری ہوئی تھی۔ مگر جب میں ہسپتال گئی تو مجھے لگا، وہ تمام چیزوں کے باوجود مجھے اہمیت دیتا ہے۔ عالیہ! اس لیے مجھے لگتا ہے، ہمیں اسے سمجھنے کا ایک اور موقع لینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے اس کے اور ہمارے درمیان کی یہ تلخی ختم ہو جائے۔"

عالیہ بیگم نے ان کی طرف دیکھا پھر نرمی سے بولیں۔ "آخر آپ کی بیماری میں ایسا کیا راز چھپا ہے، جو آپ میں اتنی بڑی تبدیلی آئی ہے اس کی طرف سے۔"

حشمت خانم نے آنکھیں بند کر لیں، پھر آہستگی سے بولیں۔ "جس وقت مجھے استھما کا اٹیک ہوا، میرے اندر سانس لینے کی خواہش نے تیزی لگائی۔ مگر سینے کے اندر گھٹن بڑھتی گئی۔ میں نے اپنی دراز میں، اپنا ہینڈ بیگ، ہر جگہ انہیلر ڈھونڈا، مگر سب جگہ انہیلر کی دوا ختم ہو چکی تھی۔ اس لمحے مجھے لگا تھا بس زندگی کی کتاب کا نصاب ختم ہونے والا ہے کہ بہت اچانک میں امداد روی جانے لگی۔ میں ہسپتال میں جب پہلی بار ٹھیک طرح سے ہوش میں آئی اور اس نے مجھے ماسک کے موبائل پر فون کر کے جب کہا۔ "سوری ماما! تو مجھے [illegible] پڑنا چاہیے تھا۔" تب وہ بات بہت واضح ہو کر میرے سامنے آ گئی، جو بہت دیر سے مجھے الجھن میں ڈال رہی تھی کہ میرے انہیلر کا خیال نہ میں رکھتی ہوں، نہ تم۔ تو آخر کون ہے جو اس بے کار کے مشغلے پر توجہ اور وقت دیتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے عالیہ! اس بے کار کام کو ذمہ داری کی طرح شہریار نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ ایک بار میں نے اسے اپنے ہینڈ بیگ میں کچھ رکھتے دیکھا بھی تھا مگر اس وقت کچھ کی لیے پچی بندھی تھی کہ میں گئی۔ وہ اور بہت سی باتوں کی طرح شاید ڈرامے کے لیے اچھے ہے کسی بھی راستے کو اپنانے میں یقین رکھتا ہے۔ یونیورسٹی میں وہ پیسہ پانی کی طرح بہاتا تھا تو ایسے ہی تھا۔ میرے اندر یہ خیال لازمی پیدا ہوا تھا مگر اس کے ہاتھ سے چھین کر میں نے ہینڈ بیگ دیکھا تو ہر چیز جگہ پر تھی۔ میں نے سوچا میرے وقت پر پہنچنے سے روایتی کارروائی میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ لیکن اتنے سالوں بعد میں نے اس دن جانا، وہ میرے لیے کتنی اپنائیت سے سوچتا تھا...... آپ سانس لینا چاہیں اور سانس سینے میں اٹکنے لگے تو آپ کو لگتا ہے ساری رنجشیں، ساری باتیں صرف اس سانس کے آنے اور جانے سے منسلک ہیں۔ مرنے کے بعد ہر تلخی ہر

نفرت، بیر، شکایت اپنے آپ مر جاتی ہے...... میں نے سوچا، میں بھی مر گئی تو اس لمحے تو میرے پاس کیا ہوگا، جسے لے کر جاؤں گی؟ کیا کوئی بھی بچہ مجھ سے بھی محبت کرتا ہے......؟ جناب ابا صرف تھی سے وہ مجھ سے منسلک تھیں، میرے جانے پر وہ اداسی اور خوشی محسوس کریں گے۔ تب میں نے سوچا اگر زندہ رہوں گی تو زندگی کو ایک نئے طریقے سے جینے کی کوشش کروں گی۔ سو میں بھی رہی ہوں، جو تمہیں مجھ میں علامت محسوس ہوتی ہے۔"

وہ کچھ لمحے رکی تھیں، پھر بولیں۔

"بہت شکایت تھا کہ تمہیں پالا تھا عالیہ! باپ کا سایہ نہ تھا تو اماں ابا کے لیے وہ بڑی ذمہ داری کی طرح کندھوں پر آن پڑی ہے۔ سو میں نے تمہیں ماں کی طرح دیکھا، باپ کی طرح تمہاری نگہداشت کی ہم پر نظر رکھی۔ شاید تمہیں بھی مجھ سے اتنی باتوں پر گلہ ہو اور غلط بھی ہو گا۔ ایک بیٹی کی طرح تم جو مجھ سے زیادہ توقع رکھتی تھیں، میں نے اس سے صرف نظر کیا۔ مگر عالیہ! یہ سب تمہاری بہتری ہی کے خیال سے کیا تھا۔ پھر جب تمہاری شادی کی تو مجھے لگا تمہاری زندگی ایک بار پھر سے اچھی ہو، مجھ میں ہمت آ گئی ہے۔ یوں میں تمہارے بچوں کو اپنی نظر سے دیکھنے کی جیسے پوری ذمہ داری سے تمہیں پالا تھا۔ مگر بچوں کو بھی مجھ سے تمہاری ہی طرح کی شکایتیں تھیں۔ جنہیں میں جانتی ہوں کہ تم بھی سے اب دور کروں۔"

نجم عالیہ نے حشمت خانم کے سینے سے سر ٹکا لیا۔ وہ بے آواز رو رہی تھیں۔ وہ اس لمحے کمزور دھان پان سی لگ رہی تھیں، جب کہ حشمت خانم نے کہا۔

"جو سبق زندگی سے میں نے سیکھا ہے عالیہ! میں چاہتی ہوں تم تجربے کیے بغیر میرے تجربے ہی سے سیکھ لو۔ لیکن تجربہ... اور شاید وہ اپنے خاص طریقے سے بالکل نئے ڈھنگ سے کرو، شکوے تو یہ بالکل بھول ہی جاؤ کہ وہ تمہاری اولاد ہیں، سے وقت نے تمہیں کن حالات میں سوچنا تھا، اسے صرف ماں اور جاری کی طرح اپنی اولاد سمجھو۔ عالیہ! مجھے معلوم ہے تم ایسی ہی ہو کہ بہت کم اپنی رائے بدلتی ہو، لیکن تمہیں یہ تمہارے اندر... مگر کوشش کر دو، چپ ہو تو یہی زندگی ہے۔"

نجم عالیہ نے سمجھنے کی کوشش کی اور حشمت خانم کے لیے نیند لینے کے لئے اٹھ گئیں۔ حشمت خانم نے آہستگی سے آنکھیں بند کر لیں۔ انہوں نے کوشش کی تھی، زندگی کی غلطی کو دور کرنے کی اور غلطی کا احساس اور اسے دور کرنے کا ہنر صرف اسے ہی بخشا جاتا ہے، جس کے ساتھ قدرت محبت اختیار کرتی ہے۔

❁ ❁ ❁

شہر دل کی گلیوں میں
شام سے بھٹکتے ہیں
چاند کے تمنائی
بے قرار سودائی
دل گداز تاریکی
جاں گداز تنہائی
روح و جاں کو ڈستی ہے
روح و جاں میں بستی ہے
شہر دل کی گلیوں میں
تاک شب کی بیلوں پر
شبنمیں سرشکوں کی
بے شمار لوگوں نے
یادگار چھوڑی ہے
اتنی بات تھوڑی ہے؟
صد ہزار باتیں تھیں

AANCHAL.COM.PK

حیلۂ جگ بانی
صورتوں کی زیبائی
قسمتوں کی رعنائی
ان سیاہ راتوں میں
ایک بھی نہ یاد آئی
جا بجا بھٹکتے ہیں
کس کی راہ تکتے ہیں
چاند کے تمنائی!
یہ نگر کبھی پہلے
اس قدر نہ ویراں تھا
کہنے والے کہتے ہیں
قریۂ نگاراں تھا
خیر اپنے جینے کا
یہ بھی ایک ساماں تھا
آج دل میں ویرانی

AANCHAL.COM.PK

اور بن کے گھر آئی
آج دل کو کیا کیجیے
بادِ نسیم بہر جانی
پھر بھی لوگ دیوانے
آگئے ہیں سمجھانے
اپنی وحشتِ دل کے
بن لئے ہیں افسانے
خوش خیال دیوانے

وہ پڑھتے پڑھتے رک گئی تھی۔ کیونکہ اسی وقت ڈرائنگ روم میں اس کی دیکھ بھال کرنے والی نرس داخل ہوئی تھی۔

"ہیلو میم! کیسی ہیں آپ؟"

ثانیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا آج وہ پہلی بار اسے دیکھ رہی تھی۔ تین دن سے مسلسل وہ آنے کا متعدد ہو رہی تھی مگر کسی پچھلی مصروفیت کی وجہ سے آنہیں پا رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ زرش نے اس کے لئے عارضی طور پر میڈ کا انتظام کیا تھا اور آج وہ غیر متوقع آگئی تھی تو اس کو پوچھنا لازمی تھا۔

"تم.....!" اس نے تعارف کے لئے خالی جگہ چھوڑی اور وہ نے وہی تعارف دے گئی۔

"میں شافعہ ہوں میم! آج سے میں آپ کی کیئر ٹیکر ہوں گی۔"

"کیا آپ نے یہاں آنے سے پہلے مس زرش سے بات کر لی تھی؟" اس نے زرش کی ان تین دن میں ان باتوں کو یاد کر کے اپنے اندر دہرانے شافعہ کو مخاطب کیا، جس کا افسر بھی بنا کر وہ نرس شافعہ سے

بہت بدلی ہے۔

"جی میم! میں نے آنے سے پہلے میم زرش سے فون پہ بات کی تھی۔" انہوں نے کافی سخت لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا تھا لیکن میرے پہ اعلم بجو کیا انہوں نے فوراً ختم کر کے مجھے آپ کے فلیٹ آنے کا آرڈر جاری کر دیا۔"

"اوکے۔ یہ رہا میری دواؤں کا چارٹ اور ٹائم ٹیبل۔ یہ ڈاکٹر کے کنسلٹنٹ کی ڈسکشن۔ یہ فائل میڈیکل۔ آپ کو اس روشنی میں مجھے لگتا ہے ٹریٹ کرنا پڑے گا۔"

شائقہ چارٹ لے کر بیٹھ گئی۔ پھر پانچ منٹ بعد اس نے سر اٹھا کر کہا تھا۔ "میم! میں نے سارا چارٹ اسٹڈی کر لیا ہے۔ لیکن ایک بات کہنا چاہوں گی۔ آپ کے چارٹ میں ایک چیز مسنگ ہے۔"

"کون سی چیز مس شائقہ؟" ثانیہ نے جانتے ہوئے ڈاکٹر کے چارٹ میں خالی رکھے گئے پوائنٹ پہ توجہ سے دیکھا اور اس نے آہستگی سے کہا۔

"میم! میں جس ہسپتال سے وابستہ ہوں، وہاں دواؤں کے ساتھ ماحول پہ بھی بہت زور دیا جاتا ہے۔ ہمارے سر ڈاکٹر عرفان کہتے ہیں انسان بیماری میں صرف دوا لینے سے اتنا ٹھیک نہیں ہو سکتا جتنا ماحول کی تبدیلی سے۔ کاؤنسلنگ سے بہتر اور بہت محسوس کرتا ہے۔ سو میم! آپ کے چارٹ میں مجھے کہیں بھی کاؤنسلنگ، ٹریٹمنٹ دکھائی نہیں دیتی ہے۔ نہ کہیں باہر ماحول کی تبدیلی کا عنصر دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ آپ کے فلیٹ کے بالکل سامنے ایک بہت خوب صورت پارک موجود ہے۔"

ثانیہ نے اسے دیکھا اور پہلی بار شدت سے نوٹ کیا۔ اس کے فلیٹ کے باہر ایک خوب صورت پارک موجود ہے۔

"کیا آپ چاہیں گی کہ میں آپ کو شام کو پارک میں گھمانے لے جاؤں؟" شائقہ نے پوچھا۔

"کیا آپ کے لیے یہ روٹین ہوگا؟" اس نے سوال کیا اور شائقہ نے سر ہلا کر کہا۔

"میرے لیے یہ خوشی کی بات ہوگی میم! اگر میں آپ کو اس گھٹن کے ماحول سے باہر لے جا کر کچھ خوشی دے سکوں۔"

ثانیہ نے اس کی طرف دیکھا اور کپکپاتے ہاتھ سے اس کے ہاتھ کو چھو کر پوچھا۔ "کیا سارا دن زبردستی کی ڈیوٹی ہے شائقہ! جیسی آپ ہیں، ہمدرد، تم سے نفرت ہوتی۔"

شائقہ نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر مدھم کہا۔ "کبھی نہیں میم! یہ میری ڈیوٹی میں شامل ہے۔"

AANCHAL.COM.PK

ثانیہ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "مگر مجھے نہیں لگتا بس کسی ڈیوٹی کا حصہ ہے۔ تمہارے چہرے میں ایک نرمی ہے حیا ہے۔ یوں لگتا ہے محبت تمہاری منتظر ہے۔"

شافعہ کے ہونٹوں کو مسکان نے چھوا اور آنکھوں میں حیا اتری تو وہ اپنا چہرہ جھکانے لگی۔

"شاید تم سے تمہاری دوستی لگتی ہے۔ شاید اس لئے تمہاری آنکھوں کو خواب چھپانے نہیں آتے۔"

"میم! آپ...... آپ کبھی شاعرانہ باتیں کیا کرتی ہیں۔ کیا آپ شروع سے ایسی ہی شاعرانہ گفتگو کرتی ہیں؟"

ثانیہ نے نفی میں سر ہلا دیا اور کہا۔ "بس میرے لئے بہت پرانی نہیں ہے۔ پچھلے ہی سال سے مجھے لگتا ہے محبت پالینا کیا ہوتا ہے۔"

"کیا ہوتا ہے میم؟ محبت پالینا کیا ہوتا ہے؟" شافعہ نے دوبارہ زمانے کی بچی سے اس کے کانچ جیسے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے۔ شوق سے بات دکھانے لگی۔ ثانیہ نے نرمی سے کہا۔

"تمہارے بال سلجھانے میں بڑی نرمی ہے۔ یوں لگتا ہے میری ماں کے ہاتھوں کی دعا تمہارے ہاتھوں کو لگ گئی ہے۔"

شافعہ نے آہستہ سے کہا۔ جو وہ کہنا چاہتی تھی وہ اس کی باتوں میں رہا نہیں تھا۔ مگر جیسے جیسے لفظوں میں اس کی ذات جھلک رہی تھی۔ اور یہی اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ جو کہنا چاہتی ہے، کہتی رہے تاکہ اندر کی گھٹن کم ہو۔ اپنی دل کی بات اس تک پہنچا دے اور اندر کا حبس کم ہو جاتا۔

"میم! میں نے سنا ہے آپ کسی زمانے میں بہت مشہور ماڈل ہوا کرتی تھیں۔"

ثانیہ کے چہرے پر ایک سیکنڈ میں بادل کی سی کیفیت تھی۔ یوں لگا یہ سوال نہیں موت کا ایک وارنٹ تھا۔

"پانی... ایک گلاس پانی دو۔" بہت گھٹے گھٹے سے انداز میں اس نے پکارا تھا۔ شافعہ نے گھبرا کر جگ میں سے پانی انڈیل کر اس کی طرف بڑھایا۔ دیکھا وہ بہت صدمے سے بولی۔

"آئی ایم سوری میم! شاید مجھے آپ سے یہ سوال نہیں کرنا چاہئے۔"

ثانیہ نے گہرا سانس لیا اور بہت آہستگی سے بولی۔ "شافعہ! سوال تمہارا غلط نہیں تھا۔ بس وہ ایک ایسا وقت تھا جس نے سانس لینے کی ہمت بھی چھین لی تھی۔"

شافعہ نے اس کے بال سنوار کر پیچھے سے باندھ دیے تھے۔ وہ صوفے پر آنکھیں چھپا کر بیٹھی تھی۔ یوں جیسے کوئی بہت تھکا ہارا مسافر کسی سفر سے لوٹا ہو یا لوٹنے کی حسرت میں ایک نئے سفر کے لئے چل پڑا ہو۔

AANCHAL.COM.PK

"تم نے ابھی کیا پوچھا تھا مجھ سے شافعہ؟" اس نے یوں کہا جیسے پہلے کی کہی بات اب کہیں جا کر اس کے اندر اتری تھی۔

"میں نے کہا تھا میم! آپ کسی زمانے میں بہت مشہور ماڈل تھیں ناں؟"

ثانیہ نے اسے دیکھا پھر ذرا ٹھہر کر بولی۔ "تمہیں شاعری سے دلچسپی ہے شافعہ؟"

"جی میم! مجھے شاعری سے بہت گہرا رابطہ ہے۔"

ثانیہ کچھ کھلکھلا کر ہنسی، پھر مدھم لہجے میں بولی۔ "دل کی بات کرنے والوں کا دل! اظہار کرنے کے لیے شاعری کا ساتھ چاہیے، محبت کا ہاتھ چاہیے۔ اور محبت کا ہاتھ چند لوگوں سے ملتا ہے جن کے لفظوں کی خوشبو، جو لفظ شاعر نے پوری سچائی سے لکھے ہوں، دل والوں پر وہ وار بہت گہری ہوتی ہے۔"

"میم! مجھے لگتا ہے، آپ کہیں الجھن بھی کی رہی ہیں۔"

"نہیں، مجھے لفظوں سے دلچسپی تھی۔ مجھے لگتا ہے، تمہیں لکھنے سے کچھ شغف ہے شاید۔"

شافعہ مسکرانے لگی، پھر شگفتگی سے بولی۔ "میں تو صرف پڑھتی تھی میم! مگر عارف کہتے تھے تم میں ناول لکھنے کا بہت ٹیلنٹ موجود ہے، اس لیے دو سال سے معاشرتی کہانیوں پر لکھ رہی ہوں۔ تھوڑی بہت شاعری بھی کر لیتی ہوں۔ لیکن یہ دوسروں کے لیے نہیں، صرف عارف کے لیے کرتی ہوں۔ ہاں مگر ابھی سنانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

"کیوں؟...... جس کے لیے لکھتی ہو اسے ہی کیوں نہیں سنائی ہو؟ کس بات کا انتظار کر رہی ہو؟"

ثانیہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگی، پھر مہذب سے بولی۔ "میم! محبت کی شاعری سے لگتا ہے تو آپ کو معلوم ہی ہوگا، محبت میں چپ رہ کر دل میں اترنے کی خوشبو اپنی ہوتی ہے۔ محبت خوشبو ہے، اگرچہ محسوس ہونے کی چیز ہے میم! اور میں اسی لیے جو لکھتی ہوں، وہ چاہتی ہوں میری آنکھوں میں خود بخود ہو جائے۔ بقول فراز

سامنے تو جو نہ ہزاروں خواہشیں جاگ اٹھتی ہیں
کاش اب کے میری آنکھوں میں میرا دل نہ رہے

AANCHAL.COM.PK

"مگر شافعہ! ہاں یہی تو، آنکھوں میں دل سما جانے کی فضا اندری ہے، او ہم کہتی تو جب تمہارا دل تمہاری آنکھوں میں آ جائے تو وہ مجھ کو دیکھتے کہہ دے تم منہ سے کچھ نہیں کہو گی۔"

شافعہ مسکراتی رہی، کچھ نہیں بولی پھر وہ فلسفی ہوئی، بعد آہستگی سے بولی۔ "ہمم! آپ نے محبت کی ہے تو آپ جانتی ہی ہوں گی یہ جو کہ ہوتی ہے، اس کا مطلب وہ کہاں ہوتا ہے۔ محبت کبھی کبھی تو دل میں سمائی ہو جاتی ہے، کبھی آنکھوں میں کوئی چمک ہے۔ اور دل کے اندر کچھ اور باتیں رہتی ہیں ... حاضر میں غائب اور غائب میں حاضر کو ڈھونڈنے کی ایک لت ہے کہ جب یہ کہتی ہے کاش میرا دل میری آنکھوں میں سما جائے تو ... حقیقت یہ کہنا چاہتی ہے کہ محبت میں پوری محبت، پورا دل ... آ جائے کہ آنکھوں کا سہارا ہی نہیں لینا پڑے۔"

ماہم نے خاموشی سے دیکھتی رہی اور شافعہ ختم کر کے ... ٹرے میں رکھ کر اس کو ... کرنے چل دی۔ واپس لوٹ آئی۔ "ہمم! آپ کو شاعری سے کتنا لگاؤ ہے؟"

"پہلے نہیں تھا مگر اب بہت زیادہ ہے۔ جب ماڈلنگ کرتی تھی تو لگتا تھا آسمان چھونے کے لیے میرے پاس ... کا پسندیدہ وقت ہے ... ملتے تھے ان سے بھی انہوں نے متوجہ نہیں کیا، مگر جب میری زندگی میں یہ آئی تو مجھے لگا ... شاعری ... جس سے دل کی واردات کہنا آسان ہو جاتا ہے۔ جب ... محبت کی شدت یہی جس کیفیت نے چھو لیا مجھے آپ کسی سے محبت کریں، ساری دنیا ... صرف اس سے، اور وہ سمجھائے آپ سے محبت کیسی ہوتی ہے ... کیا کیفیت ہوتی ہے شافعہ تم جانتی ہو گی۔"

شافعہ نے ان کو دیکھ کر دل میں محسوس کیا، ... اسے خوب ... "ہمم! آپ ... تو مجھے اچھا لگے گا۔"

"شاعری...... یہ نہیں کچھ یاد بھی ہے مجھے یا شاید یاد نہیں ہے۔" وہ بیگم کی کیفیت میں پہلے کی طرح ... گنگناتے ہوئے بولی۔

"چلی اسے موسم گر یہ ابر اب کی بار بھی ہم نے
تری آنکھیں ... جو تیرے کمرے کے پیچھے ہیں
وہاں ہر چیز ویسی ہے کوئی منظر نہیں بدلا
تیرا کمرہ بھی ویسے ہی پڑا ہے، جس طرح تو نے
اسے دیکھا تھا، چھوڑا تھا

تیرے سفر کے تھیلے میں رکھی اُس بجز باب کی
بھرا ایک دو کانی کا
کہ جس کے خشک ابرو سے کناروں پر
ابھی تک بے سبب اور شناختوں کی تھکاوٹ کے دھبے نمایاں ہیں
قسم ہے جس کی اب بے رنگ جگنوؤں کی روشنائی یوں لرزتی ہے
کہ جیسے سوکھے ہونٹوں پہ پپڑی جمنے لگی ہے
وہ کاغذ ہیں
جو بے وقت روئے ہوئے کچھ آنسوؤں سے بھیگتے رہتے ہیں
تیرے جوتے بھی رکھے ہیں
کہ جن کے بے ثمر تلووں سے وہ سب خواب چپکے ہیں
جو تیرا وقت سے جانے پہ بھی اب تک سانس لیتے ہیں
تیرے کپڑے
جو غم کی بارشوں میں بھیگ کے آئے تھے
مری الماریوں کے کونوں میں اب بھی لٹکے ہیں
وہ اسلوب کو دیکھا اور لیے

AANCHAL.COM.PK

اور تکیوں کا اُجلا ساماں
چمکتے واش بیسن میں پڑے تب
دریچے کی طرف دیوار پہ لٹکی گھڑی
اب بھی ہمیشہ کی طرح
آدھ ساعت پیچھے ہوئی رہتی ہے
کیلنڈر پہ رکی تاریخ نے پلکیں نہیں جھپکیں
مگر اے موسمِ گرما!
اتنی ساعت
نجانے کس طرح سے تو چلا آیا
ہمارے بیچ سے گزرا
ہمارے بیچ سے یوں اس طرح گزرا
کہ جیسے دو مخالف راستوں کی تنگ سرحد
کہ جس کے ہر طرف بس دوریوں کی گرد اڑتی ہے
اتنی اک گرد کی تہ سی
تجھے دروازے کی دہلیز پہ بھی شاید نظر آئے

AANCHAL.COM.PK

کوئی تصویر کے اندر کی شام نظر آئے
تمتماتے بکھری آنکھیں جو ہر وقت مسکراتی تھیں
اب ان آنکھوں کے کونوں میں نمی سی نظر آئے"

شافعہ نے دیکھا، گنگناہٹ میں نمی گھل گئی تھی۔ ان کی آنکھیں دور کہیں تھیں۔ جانے کب کے، کیسے موسموں کا عکس تھا ان پر۔ شافعہ نے سوپ کا پیالہ رکھ دیا تھا اور اسے دینے والا تھا۔ تانیہ نے تھوڑی دیر کو بھی آنسو نہ پونچھے تھے۔ شاید یہی ان کا معمول تھا۔ کافی دیر بعد انہوں نے سر اٹھا کر کہا تھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے شافعہ! پلیز ٹی وی آن کر دو بیٹا۔"

شافعہ نے تھوڑی سی بحث کی تھی، جب کہیں اس نے آدھا سوپ پی لیا تھا۔ شافعہ نے ریموٹ ان کی طرف بڑھایا۔ تو ان کے قدموں میں کشن پر بیٹھ گئی۔ ٹی وی پر نظریں جمائی تھیں۔ فیشن برانڈ اسٹائل کے سپر کلیکشن کی نمائش پر مشتمل ریکارڈنگ چل رہی تھی۔ کیٹ واک پر چلتے چلتے کیمرا ایک چہرے پر زوم ہوا۔ تانیہ نے مسکرا کر ایک بے نیاز سی چال چلتی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ زرش ہے، میری بہن۔ مسز عبدالرحمن کی اسٹائل ویژن نے اس سال کے لئے اپنی سپر کلیکشن کے لئے اسے ہی بطور لیڈر کے لئے چنا ہے۔ اس کے چلنے میں کتنا سحر ہے۔ یہ قدم اٹھاتی ہے تو لگتا ہے زمین کے بجائے آسمان پر قدم رکھ رہی ہو، ہواؤں پر چل رہی ہو...... تمہیں پتہ ہے، بچپن میں بھی ایسے ہی چلتی تھی۔ لوگ کہتے تھے تانیہ! تمہاری بیٹی ایسے چلتی ہے، جیسے ساری دنیا پر حکمران ہو۔ مگر اب......"

وہ یکدم ماضی میں لپٹ گئی تھی۔ ادھورے جملے میں وہ پوری فلیش کی طرح اٹک گئی تھی۔ اس نے ریموٹ کھینچ لیا تھا اور ٹی وی کی طرف سے پشت موڑ لی تھی۔ شافعہ نے ٹی وی آف کر دیا تھا اور تانیہ نے بہت تھکے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"پلیز مجھے میرے کمرے تک لے جاؤ۔ میں کچھ دیر آرام کروں گی۔ تم بھی جا سکتی ہو، میرا آرام کا وقت ہے۔"

شافعہ نے انہیں سہارا دے کر وہیل چیئر پر بیٹھنے میں مدد دی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ انہیں ان کے کمرے میں لے جانے لگی۔ ان کے سائیڈ ٹیبل پر ایک تصویر اوندھی پڑی تھی۔

کیا بیٹی کی تصویر تھی؟ شافعہ نے صرف سوچا مگر پوچھنے کی جسارت نہیں کی۔ پہلے دن کے حساب سے وہ پہلے ہی بہت زیادہ دخل دینے کی جسارت کر چکی تھی۔ اب اگر کسی بات پر وہ غصے سے ہی اکھڑ جاتی تو......

اس نے اسے بستر پر لٹا دیا تھا۔ وہ کھانے میں اس کی مدد کر چکی تھی اور پھر کرسی پر بیٹھ کر رسالے دیکھنے لگی تھی۔ یہ رسالے سات آٹھ سال پرانے تھے، جن میں ماڈلنگ ریمپ پر ڈریس کی جگہ وہ کھڑی تھی اور شافعہ نے تصویریں دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ بلاشبہ بہت حسین رہی ہوگی، مگر محبت سے ہار گئی تھی...... بیٹی کون تھا؟ اور کیا واقعی محبت ہارنے کی جیسی ہی بازی تھی، جس میں جیتنے والا بھی آخری لمحے تک نہیں جان پاتا کہ اس نے کیا جیت کر کیا ہار دیا ہے......؟

شافعہ رسالے پلٹتی رہی اور خاموشی پورے کمرے میں پھیلتی چلی گئی۔

❀❀❀

شہریار نے گہری نظر کے احاطے میں آنے والے منظر کو ایک بار دیکھا تھا اور بہت پہلے لمحے کی طرح محسوس کی تھی۔ کرسی پر عارف جواد اور شافعہ بیٹھے تھے اور بہت شوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے رہے تھے۔ کیا وہی یہ لڑکی شافعہ کیا اسے کافی تھا؟ اس کی نظروں میں اندیشے سے شبنم اتر گئی تھی، جو اس کے لئے اسی طرح حالات سے جوڑتی تھی۔

عارف کو اس نے کئی جگہ اسی طرح اس کے ساتھ گھومتے پایا تھا۔

وہ کئی بار چونک گیا تھا۔ اس نے کافی منگوائی تھی۔ نہ جانے کب اس نے دیکھا تھا عارف کے چہرے پر بے اختیاری در آئی تھی۔ اک لمحے سوال رکھ کر شافعہ سے کچھ کہا تھا، پھر وہ کافی دے کر کسی بات پر اس سے اصرار کر رہا تھا۔ پھر اس کا کندھا تھپتھپایا۔ وہ عارف اس طرف دیکھتا چلا گیا تھا۔ شہریار نے کچھ سوچا تھا اور بیرے کو اپنی میز کے بجائے شافعہ کی میز پر لانے کا اشارہ کر کے اٹھ گیا تھا۔

"ہیلو مس شافعہ! کیسی ہیں آپ؟"

"اوہ مسٹر شہریار! آپ...... اچھا ہوا آپ آ گئے۔ دراصل میں کسی کے ساتھ کافی پینے کے خیال سے بور ہو رہی تھی۔"

"اچھا آپ کسی کے ساتھ تھیں شاید......"

"ہاں، عارف بیٹے میرے ساتھ تھے۔ لیکن اچانک ان کے باس نے انہیں کسی ضروری کام سے بلوالیا۔ وہ مجھے گھر چھوڑنے کو کہہ رہے تھے۔ لیکن میں دوپہر کی ضروری ڈیوٹی کے بعد اتنی تھک گئی تھی کہ مجھے تھوڑا سا [illegible] تھا پھر گھر بھی جا کر اچھا گھنٹوں آرام کرنا تھا۔ کیونکہ آٹھ سے میری رات کی شفٹ شروع ہوگئی ہے۔"

"رات کی شفٹ...... لیکن ابھی تو آپ دوپہر کی ڈیوٹی کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں۔" اس نے عارف جاوید کا معاملہ ختم کرکے نیا سوال کیا اور وہ تھکے تھکے لہجے میں بولی۔

"میری سسٹر ہے دو بہنا۔ وہ ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے دوسرے شہر میں رہتی ہے۔ اس کی تعلیم کے اخراجات پورے کرنے کے لئے میں دو تین جگہ اضافی طور پر پارٹ ٹائم کام کرتی ہوں۔ تین جگہ صرف ایک ایک گھنٹے کا کام ہے جیسے مسز زرش کا مسئلہ کے۔ ان کے ہاں ایک بجے [illegible] چھ بجے تک مجھے ڈیوٹی دینی پڑتی ہے۔"

"آپ اتنی محنت کرتی ہیں، آرام کب کرتی ہیں؟"

ثاقبہ ہنسنے لگی پھر مسکرا کر بولی۔ "مسٹر شہریار! آرام ہمارے نصیبوں میں کہاں؟ بقول [illegible] ہم مڈل کلاس لوگوں کی زندگی میں سکون اس وقت نکلتا ہے، جب سانس شام کا کنارا بن کر گھونٹ کی طرح بجھی ہوتی ہے۔"

شہریار ساکت اسے دیکھنے لگا۔ وہ کسی مڈل کلاس سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ لیکن ساری دولت کے باوجود محبت کا ترجمہ [illegible] کھاتے کی نذر ہو رہا تھا۔ کیا واقعی اس کی سانس بھی کسی شام کے کنارے کی طرح گھونٹ کی طرح چبھنے کے بعد ہی کسی صورت کی تمنا کیا زبانت کیا پائے گی؟

"آپ کیا سوچنے لگے مسٹر شہریار؟" ثاقبہ نے اسے پھر سے خیال [illegible] میں دیکھا [illegible] لیا۔

اس نے مسکرا کر کچھ چونک کر اسے بولا۔ "آپ کافی کے ساتھ سینڈوچ لیجئے ناں۔ یہاں کے سینڈوچ بہت مزے کے ہیں۔"

ثاقبہ نے مسکرا کر کہا۔ "شاید آپ یہاں اکثر آیا کرتے ہیں۔"

"جی...... ایک زمانے میں روز ہی آیا کرتا تھا۔ وہ کیفے [illegible] ہمارے لئے [illegible] تھی۔ میں، عاطف، سلمان، ماہا، اکثر شام کو یہیں کافی پینے آتے تھے۔ مگر اب تو شاید سالوں گزر گئے ہم ایک ساتھ یہاں نہیں آئے۔"

شافعہ نے اس کے چہرے پر سوالیہ نظریں گاڑیں مگر کچھ پوچھنے سے جان کر گریز کر رہی تھی۔ شہریار کچھ بے تابی سے اپنے اندر کلبلانے والے سوالات سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا سو خود ہی بولا۔

"آپ مجھے کچھ پوچھنا چاہ رہی ہیں، مس شافعہ؟"

"وہ...... دراصل آپ نے ایک نام لیا تھا علامہ...... وہ اصل میں میرے بہت اچھے دوست کا نام بھی ہے۔ اس لئے میں یہی سوچ رہی تھی، یہ اتفاق ہے یا ایک ہی شخص کے دو تعارف۔"

شہریار نے دلچسپی سے اسے دیکھا پھر سنجیدگی سے بولا۔ "کیا آپ کا صحافت سے کوئی تعلق ہے مس شافعہ؟"

شافعہ نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر وضاحت سے بولی۔ "کچھ اتنا خاص نہیں پہلے میں نے جرنلزم میں ماسٹر کیا ہوا ہے۔ وہ بھی گیپ دے دے کر۔ تعلیم اور ڈیوٹی ایک ساتھ نبھانے میں کچھ نہ کچھ دقت تو ہوتی ہے۔ لیکن پھر اچانک ایک دن بابا نے کہا تم بہت اچھا لکھتی ہو، اخبار میں چھپنے والی خبروں کا پوسٹ مارٹم بہت اچھے طریقے سے کر لیتی ہو، تمہیں لکھنا چاہیے تھا۔ اور بس اس طرح میں لکھنے لگی۔ پہلی تحریر لے کر جب میں اخبار کے دفتر گئی تو بہت کنفیوژ تھی، مگر مجھے وہاں علامہ ارسلان ملے۔ انہوں نے میرا خوف کم کیا۔ پہلی تحریر تو نہیں لگ سکی اس میں واقعات کی جگہ جگہ مسنگ تھی۔ جہاں تحریر ہونا چاہیے تھا وہاں واقعہ تھا، جہاں تفصیل ہونی چاہیے تھی، وہاں صرف سرسری تھی۔ سو میں نے آہستہ آہستہ علامہ سے سیکھا، لکھتے کیسے ہیں۔ ڈیلی رپورٹ، ویدر رپورٹ کا فرق ہو یا اسٹیٹمنٹ کی میڈیا خبروں کی تھیم سمجھانے کا ہنر، یہ سب مجھے علامہ نے ہی سکھایا تھا۔ سو مجھے شک ہوا شاید......" وہ ادھوری بات کہہ کر چپ ہو گئی۔

شہریار مسکرا کر اسے دیکھنے لگا پھر نرمی سے بولا۔ "پہلے آپ صرف میری دوست کی دوست تھیں مگر اب میرے دوست کی دوست اور زیادہ عزیز ہو گئی ہیں۔ ویسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ علامہ نے زندگی کا ایک ہی اچھا کام کیا۔"

"ارے تو یہ علامہ آپ کے یونیورسٹی فیلو ہیں؟"

"جی ہاں...... ایک زمانے میں ہم بہت اچھے دوست ہوا کرتے تھے۔" اس نے سرسری تاثرات میں جواب دینے کے ساتھ ساتھ جملہ بھی جوڑا اور وہ اسے دیکھنے لگی۔

"آپ کے درمیان ناراضگی کی کوئی خاص وجہ، مسٹر شہریار؟"

"ارے نہیں مس شافعہ! کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس اس کی یار باش زندگی بھی آپ کی طرح مصروفیت نے نگل لیا۔ ورنہ کبھی کبھار بات چیت ہوتی رہتی ہے۔" وہ صاف جھوٹ بول گیا۔ مقصد کوئی خاص

نہیں بتایا ہوا تھا۔ وہ بچی کو اس کی نظروں میں باعزت رکھنے کی تمنا کے باوجود اسے پسند بھی تھا، وہ کسی وجہ سے ادا ہو رہے ہیں تو ان کے اپنے مسائل سے شاید علامہ کی رہنمائی میں۔ وہ ان سے کبھی کبھی کترا جاتی، اس کے بارے میں مشکوک ہوتی اور وہ بھی دونوں باتوں سے بچنا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں وہ چھپے چھپے اس کے لئے ضرورت ہوتی جا رہی تھی۔

وہ جو نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ کھلے دل سے اس کے سامنے بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ اس کے انداز میں وقار۔ کیوں جیسا پل انداز نہیں تھا۔ شاید مردانہ وار کام کرنے والی لڑکیوں کے دل ان کے گھروں کی الجھنوں اور مسائل کے پاس گروی رکھے جاتے ہیں اور موسم آئے بغیر گزر جاتے ہیں۔ کبھی انہیں خبر نہیں ہونے پاتی اور کبھی خبر ہونے کے باوجود موسموں کی طرف کھلنے والے دروازے انہیں اپنے ہاتھوں سے بند کرنے پڑتے ہیں۔ یہ الگ بات ہوتی کیفیت ہوتی ہے کہ صورت حال کی طرف پشت کر کے اندھیرے سے دوستی کر لی جائے تاکہ گناہوں کی زندگی میں جھلک آئے نہ ہو۔

"بس شاید مجھے آپ کے ساتھ بیٹھنا کبھی کبھی رشک آتا ہے۔" اس نے خاموشی کی تہہ میں رہنے والے لمحوں کو اس کی آواز سے خفیف کرنے کی حسرت کی اور ہنسنے لگی۔ پھر مسکرا کر بولی۔

"آپ کو شاید تعریف کرنے کا شوق ہے مسز شہریار اور اگر یہ جو زندگی میں تھی رہی ہوں، وہ بہتر ہے صندل کلاس کی خانہ کے فیصلہ! یہاں جیتی ہیں اس میں نیا کیا ہوا۔" وہ یک لخت لڑکی پھر زمین سے بولی۔ "سوری مسز شہریار اب میں چلنا چاہوں گی۔ میری ڈیوٹی کا وقت ہو رہا ہے۔"

شہریار نے کھڑے ہو کر اسے تعظیم دی۔ وہ گلاس ڈور دھکیل کر باہر نکل گئی تو وہ اس کے عکس کو جاتے دیکھتا رہا۔ وہ نظر سے اوجھل ہوئی تو اس نے آنکھیں بند کر لیں جیسے اس عکس کو دل میں نقش کر رہا ہو۔

جانے کتنی دیر تک وہ یونہی بیٹھا رہا پھر کیفے سے نکل کر پارکنگ میں آ کر کار میں بیٹھتے ہوئے اس کا موبائل بجا تھا۔ اس نے پاس کیا۔ دوسری طرف عاطف تھا۔

"تیجو بابا سن! کہاں ہو تم؟"

"بیٹھا ان کے سامنے کھڑا ہوں۔" اس نے سادگی سے بتایا اور دوسری طرف سے قہقہہ آیا۔

"اور کہیں مت جانا۔ وہیں رہو میں آ رہا ہوں۔"

پھر وہ چوکنا ہو کر پاما اس کی گنجائش چھوڑے بغیر اس نے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ وہ کار سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا۔ دس منٹ بعد عاطف آیا تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور شہریار مستعدی سے اس کے کاندھ

بجا لا رہا تھا۔ شہریار نے اسے دلچسپی سے دیکھا تھا اور وہ آدھے گھنٹے کا کام دے کر اس کے قریب چلا آیا تھا۔ شہریار نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا پھر شرارت سے بولا تھا۔

"کیوں میری جان! آج حکمرانی کا چسکا اختتام فرما دیا؟"

عاطف جھینپ کر ہنس دیا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ دراصل میرا آف ڈے ہے اس لئے شوروم سے میں نے ڈرائیور بلوا لیا تھا تاکہ ایئرپورٹ سے وہ گاڑی شوروم واپس لے جاسکے۔"

شہریار کے چہرے کی ساری شوخی ماند پڑگئی۔ بہت دقت سے اس نے کہا۔ "چلا تو تم جا رہے ہو۔"

"ہاں...... لیکن ابھی ڈیڑھ گھنٹہ ہوں ناں تیرے ساتھ۔ چل یہ ڈیڑھ گھنٹہ سلیبریٹ کرتے ہیں۔"

اس کا جسم بے جان سا ہوگیا تھا۔ وہ اسے زبردستی کھینچتے ہوئے کیفے کے دروازے سے اندر داخل ہوا تھا۔ پھر اپنی مخصوص میز کی طرف قدم بڑھانے ہی لگا تھا کہ شہریار نے اسے روک دیا تھا۔ "وہ میز بڑے سال رونق ہے... بے رونق ہے۔ آج نہیں ہم کسی اور خالی میز کی طرف چلتے ہیں۔"

عاطف بیگ نے سمجھنے والے انداز میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ پھر کافی کا آرڈر دے چکا تو شرارت سے بولا۔ "فون پر جلدی میں تھا اس لئے پوچھنا بھول گیا۔ لیکن اب بتاؤ... یہ آج کس کے ساتھ کافی اڑائی جا رہی تھی؟"

شہریار نے جواب سوچا اور پچھلی ملاقات کا عکس آنکھوں میں در آیا۔

"تم بہت مہربان... آنکھیں اتنی گہری اور چمکیلی کیوں لگ رہی ہیں؟ مجھے تو ذاتی محبت سے ہے، سمجھ نہیں سکتا۔ پھر...... کون تھی؟" وہ اکسا خندہ رہا تھا۔

شہریار نے فوراً خود کو سنبھال لیا تھا پھر نرمی سے بولا تھا۔ "تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسی کوئی واردات نہیں گزری دل پر۔"

"دل کو تم بخش کا؟ کون کہتا ہے... میں نے تیری آنکھوں کی چوری پکڑی تھی۔ سچ بتا مجھے... دل کو تجھے کوئی لے گئی؟ اگر ہاں تو میں اصرار نہیں کروں گا۔"

شہریار نے آنکھیں جھکائی تھیں پھر بہت سادگی سے بولا تھا۔ "شافعہ...... مجھے شافعہ سے محبت ہوگئی ہے۔ مجھے لگتا ہے میری زندگی میں زندگی کی طرف کھلنے والا یہ واحد دریچہ ہے۔ پتہ نہیں کیا سے

AANCHAL.COM.PK

پایا جاتا ہے، ہاں البتہ، بچپن میں اسے اپنی زندگی میں کسی اور کا ہوتے دیکھوں اور ... لیکن یہ ناممکن ہے۔"

عاطف بیگ نے سکتے کی کیفیت میں بانو سے سپنوں رنگ دیا تھا اس کے چہرے پہ بہت گمبھیرتا اُگ آئی تھی۔ اس نے اس کا چہرہ دیکھا وہاں صرف محبت تھی، سادگی تھی اور دل تھا۔ شہریار نے کافی کا مگ اٹھایا تھا۔ پھر اس کے چہرے کی سنجیدگی کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟ کیا مجھے محبت کرنے کا حق نہیں ہے؟" وہ ملبہ جھاڑ کر کافی پھر بے ساختہ ہنستے ہوئے بولا۔ "کیا کہیں واقعی تو یہ نہیں سمجھنے لگا، مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے؟"

عاطف بیگ نے کندھے اچکا کر وضاحت چاہی۔ وہ پھر سے بولا۔ "سیدھی سی بات ہے۔ میرا ارادہ تھا تو اس دل میں کچھ کو جتانا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ ہی کوئی بات نہیں ہے تو تجھے یقین تو آ نہیں رہا۔ پھر دل نے کہا کیوں نہ Bluff کر دوں۔ مجھے حیرت ہیں کہ زندگی کے بجائے اُلٹے سانچے میں ڈوب گئے ہیں۔ سو ڈرامہ ختم اب سنجیدگی سے صرف کافی پئیں گے ہم۔"

عاطف نے اُس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا تھا۔ "تم سچ کہہ رہے ہو کہ تمہیں عاطفہ سے محبت نہیں ہے؟"

"ہاں بھئی۔ مجھے تیری ہی قسم، مجھے عاطفہ سے محبت نہیں ہے۔"

"تجھے معلوم ہے، جھوٹی قسم کھانے سے کیا ہوتا ہے؟" اس نے خوف سے اسے دیکھا اور وہ ہولت سے مسکرانے لگا۔

"پتہ ہے۔ مجھے کیا ہوتا ہے۔ لیکن بے فکر رہے۔ میری موت مجھے نہیں آئے گی۔ بس اب یار بکواس بند۔ ہم کچھ اور باتیں کرتے ہیں۔"

"چلیا ہر بات نہیں۔" عاطف نے سوچا اور تھوڑی دیر بعد بولا۔ "وہ مسڈ کال کا کیا ہوا؟ کس کی تھی؟"

شہریار نے رازی سے کہا۔ "اُدھر کے نمبر سے لوکیشن کسی گاؤں کی ہے۔ دیکھو نا وہ مستقبل کچھ نہیں، وہی کوشش جاری ہے۔"

"نمبر کس کے نام ہے؟" عاطف نے اگلا سوال کیا۔

"کسی بابل خان کے نام ہے۔ یہ معلوم کر رہا تھا اس کی فوری کا ایک خان بند اس گاؤں جا کر معلومات کرے گا۔ پھر ہی کچھ واضح ہوگا کہ کال کون کر رہا ہے۔"

عاطف نے اس کی طرف پُرسوچ نظروں سے دیکھا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "خیال گھوڑے دوڑاؤ تب بھی کچھ واضح نہیں ہوتا کہ وہ کون لڑکی ہے، پھر سوچنے جیسی فطرت کی عادت بھی نہیں۔ کیونکہ ان

ان لڑکیوں میں سے کسی کو تو تجھ سے سچا عشق نہیں ہو گیا؟"

"بکواس مت کر...... کیوں بدنام کرنے پر تلا ہوا ہے؟ میں ایسا نہیں ہوں تو جانتا ہے۔ یا عشق تو بیٹا! اس نے چھوٹتے ہی بھائی کو کر مخاطب کیا تھا۔ سارے منہ کا مزہ کرکرا کر دیا تھا۔

حافظ بیگ ہنسنے لگا، پھر بولا۔ "آہا ہا آپ حضرت کبھی انہی لڑکیوں میں شمار ہوتے ہیں، جو بہنوں کے بھائی بننا پسند نہیں کرتے۔"

شہریار بے ساختہ ہنسنے لگا، پھر بے تکلفی سے دوبارہ مخاطب ہوا۔ "تو واقعی تو چوہدری جا رہا ہے۔" محمد عمر کورنگا پھر خفگی سے بولا۔ "اچھا بھلا کراچی میں تھا۔ لے کر اتنی دور جانے لگا کہ مرنے کی اطلاع پہنچتے پہنچتے بھی باسی ہو جائے گی۔"

"پھر وہی بکواس......" اس نے بے دھڑک اس کے بازو میں چٹکی بھری تھی۔ پھر اس کی سسکاری کے درمیان ہی بولا تھا۔ "اور شاید تجھے چلانا نہ کی وجہ سے یہ معلوم ہو مگر یہ ملے ہیں، ہم نے کراچی بہت برے حالات میں چھوڑا تھا۔ ان دنوں تو جانے کے جو شہر میں ایسا پھنسا ہوا تھا کہ میں نے تجھے بتانا اور اپنی پریشانیاں بھی تیرے کندھوں پر ڈالنا ضروری خیال نہیں کیا۔ مگر آج، جب ہم اس شہر سے نکل آئے ہیں تو تجھے بتانے میں کوئی حرج نہیں لگتا مجھے۔" ایک لمحے کو وہ چپ ہوا، پھر بولا۔ "تجھے پتا ہے نا، یہاں ابا کا پلاسٹک کا ایک چھوٹا سا ادارہ تھا، جس سے اچھی گزر اوقات ہو جاتی تھی۔ مگر ابا کے بعد زکریا بھائی وہ ادارہ نہیں چلانا چاہتے تھے، سو ادارہ بیچ کر انہوں نے وہ رقم کاروبار میں لگانے سے بہتر سمجھا کہ ٹریڈنگ کمپنی میں لگا دی جائے۔ زکریا بھائی کا خیال تھا، وہ رقم دوگنی ہو گی تو وہ رینٹ کار کا شوروم کھولنا چاہیں گے۔ مگر بدقسمتی سے وہ کمپنی جعلی نکلی۔ پیسے لے کر صرف اس نے ایک دو مہینے تک پرافٹ شو کیا، پھر راتوں رات بھاگ گئی۔ کمپنی میں پیسہ ڈوب جانے پر ابا کا صدمہ تازہ ہو گیا، ان پر اس وقت آیا تھا۔ تکلیف دہ مدت سے تھی مگر اتنی۔ اس دن ہوا تھا، پھر بھائی کے علاج پر ہم بہت مقروض ہو گئے۔ برے دنوں میں ہمارے ہمارا خوب ساتھ دیا۔ بھائی کو اپنے ادارے میں نوکری دی، مجھے پر جانی کے ساتھ ساتھ جاب کی سہولت دی۔ دھیرے دھیرے پھر سے ہم کامیابی کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ زکریا بھائی کی چچا کی بیٹی سے شادی ہو گئی۔ بھائی نے اپنا پلاسٹک ادارہ دوبارہ شروع کر لیا۔ دن بدل گئے مگر برے حالات میں جس طرح چوہدری نے ہمیں سہارا دیا ہے، اس وجہ سے چاہنے کے باوجود چوہدری چھوڑنے کو دل نہیں کرتا۔ رہنا تو وہیں ہے، مگر آتا جاتا رہوں گا، تو دل چھوٹا نہ کر۔"

"کراچی تیری آمد کی وجہ؟" اس نے بہت دنوں پہلے کیا جانے والا سوال اب کیا تھا اور اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

"ایک ناشر ہوتے ہیں، جن کی کتاب کی اشاعت کے حقوق ہم نے خریدے تھے۔ مگر انہوں نے ہمارا لاہور سے پروف شدہ مسٹر جعفر خانی کے لیے بھیجا گیا تھا، کسی پبلشر کو مہنگے داموں بیچ دیا۔ سو قانونی

کارروائی کے سلسلے میں آیا تھا۔ معاملات آسانی سے طے پا گئے ہیں تو واپسی کا قصد کیا ہے۔ مسعود ہر جانے کی وصولی کے ساتھ واپس لے کر جا رہا ہوں۔"

"بہت کمینہ ہے وہ سب بے چارے عاص بلکہ کا کیا قصور تھا؟"

"تو ہمارا کیا قصور تھا بیٹا۔ غلطی ان کی تھی، دوسرا تو طے کی گئی بات۔ میں نے تو اس واقعہ کو آئندہ کے لئے اپنی لسٹ سے آؤٹ ہی کر دیا ہے۔ اس مسودے کے پیسے دے چکے ہیں، وہ کتاب ضرور چھاپیں گے۔"

شہریار نے مسکرا کر کچھ نظروں سے دیکھا۔ "ٹھیک ہے بیٹا! اچھا ہوا کہ نکل آیا۔ یہاں سے اٹھ چلو، مگر مجھے ان کے دفتر مجھے بلا کر کچھ کہنا پڑے گا۔"

عاطف بیگ ریلا آ گیا تھا۔ دونوں پھر ایک ساتھ پیلی روش میں بیٹھنے لگے تھے۔ شہریار اسے ایئرپورٹ چھوڑنے جا رہا تھا حالانکہ عاطف اس کی بے صرف ذرا دیر کے مگر صاف ظاہر تھا کہ اس نے ایک کہیں لائی تھی۔

"کیا بات ہے، گاڑی کی بی ادبی سے تو کوئی لاجواب سوغات کی ہے میں نے۔"

عاطف کی یہی نیک دلی کہ وہ رابطہ رکھے گا اور شہریار اس کے بعد بھی ہنس رہا تھا پھر گنگنا کر بولا۔

"پھر دنیا نہ کر مجھے

بے وفا لوگ اچھے لگتے ہیں"

عاطف نے خوشی سے اسے دیکھا تو مزید بولا۔ "مدعا بیان کروں تو ایک فون کال کے علاوہ وہاں کی آواز بھی سن لی میں نے، مجھے بھول جائے گا؟"

عاطف پھر کچھ نہیں بولا تھا۔ یہاں تک کہ وقت جدائی قریب آیا تو شہریار کے چہرے کا رنگ اڑنے لگا۔

"اتنی گہری اور گمبھیر خاموشی...... معاف بھی نہیں آئے گی مجھے عاطف اب جا رہا ہوں۔" شہریار نے اسے سینے سے بھینچ لیا تھا۔ جیسے کوئی بس اٹھ کر جا رہا ہو۔ بلکہ وقت کے بعد کی ملاقات جیسا زرد چہرہ تھا اس کا...... عاطف نے اسے دیکھا تھا پھر گھبرا کر بولا تھا۔

AANCHAL.COM

"ایسے ہی آف کرے گا تو میرا دل جاتا رہے گا جانے کیا؟ کیا تجھے پتہ ہے ماں، میرا دل کتنا کمزور ہے۔"

شہریار نے اس کے کندھے سے آنکھیں رگڑیں اور مدھم بولا۔ "تو کیا تجھے لگتا ہے میرا دل بہت بہادر ہے؟ مجھے تو چچا جیسے بھی دل پڑتا ہے۔" وہ اب بھی بار بار رہتا تھا مگر کچھ کھلی تھی۔ عاطف نے اسے پھر سے سینے سے لگا لیا تھا۔ پھر مدھم لہجے میں بولا تھا۔

"اپنا خیال رکھنا کسی کے لئے نہ سہی میرے لئے ہی۔ تجھے پتہ ہے ماں تو مجھے کتنا عزیز ہے۔ وہ میں وقت پہ لیتا۔"

"اچھا میری جگم......" اس نے شوخی دکھائی۔ مگر آنکھیں روکتے بغیر سے نیچے بیٹھ گئی۔ عاطف نے الوداعی معانقہ کیا۔ شہریار نے اس کا ہاتھ کھینچ لیا جیسے وہ اسے جانے نہیں دینا چاہتا ہو...... عاطف کے پیچھے سے جیران آگیا۔ وہ مسافروں کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ پہلے اس کی ٹیلی ہوا گم ہوئی پھر دھیرے دھیرے۔ کچھ آنکھوں نے جدائی کے آنسو چھلکا اور پھر وہ خالی ہاتھ گھر لوٹ آیا۔

"شہری اپنا بہت خیال رکھنا۔" بہت سے شور میں سے صدا ابھری۔ اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ ہونٹ بھینچے رہا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اپنی کار میں آن بیٹھا۔ رات آٹھ بجے کا گزرا ہے اس کی ملاقات تھی۔ مگر وہ جان کر اس میٹنگ کو گول کر گیا تھا۔ اس کا رخ گھر کی جانب تھا۔ پھر تالا کھول کے۔ وہ تو بہت دہ بات کرنے کے خیال سے اپنے کمرے میں جانے کے بجائے ماتھو کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ پہلا قدم ہی رکھا تھا کہ جازی نے اسے پکارا تھا۔

"شہری بھائی! امام آپ کو کھانے پہ بلا رہی ہیں۔"

اس نے تعجب سے جازی کو دیکھا۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ گھر میں کھانا عموماً ساڑھے نو بجے کھایا جاتا تھا پھر کیوں...... وہ ان کے بلاوے کی وجہ جاننے کی تگ و دو کرتے ہوئے کھانے کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ پورا گھر وہاں تھا۔

"تم ہاتھ منہ دھولو۔ میں تمہارے لئے کھانا نکلوا دیتی ہوں۔"

وہ بجلی کی تیزی سے مڑا۔ کیا واقعی کسی نے وہی کہا تھا جو اس نے سنا تھا؟ اماں جی براہِ راست اس سے ہی مخاطب تھیں۔ تانیہ کے بعد سے وہ گھر ٹوٹ پھوٹ گیا..... مگر اماں بھی جانتی تھیں۔ اس نے سوچا اور انہوں نے اپنی نرمی سے کہا۔

AANCHAL.COM.PK

"آج میں نے اپنے ہاتھوں سے کھانا پکایا ہے۔ شاید تمہیں پسند آئے۔"

وہ فریش ہو کر روم سے نکلا، واش روم سے باقاعدہ کھانے کے کمرے میں آ گیا تھا۔ ملازم میز پر کھانا چن رہا تھا اور ان میں سے کوئی بھی ڈش اس کی پسند کی نہیں تھی مگر ماما کا دل۔

آج پہلی بار انہوں نے اسے اتنی نرمی سے پکارا تھا......

آج پہلی بار وہ انہیں یاد رہا تھا......

وہ خاموشی سے بیٹھ گیا تھا۔ ماما وہیں کہیں چھوڑ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔

"پاپا آگئے گھر؟" اس نے پلیٹ سیدھی کرتے ہوئے بہت مدھم آواز میں پوچھا۔

"ہاں، وہ تو آٹھ بجے ہی آگئے تھے۔ کھانا کھا کر وہ تو سو بھی چکے ہیں۔"

"آپ ابھی سوئی نہیں؟" آہستہ سوال۔

انہوں نے پہلی بار اس کی طرف غور سے دیکھا۔ واقعی کیا کمی ہے اس میں جو انہوں نے آج تک اسے اپنی توجہ کے قابل نہیں سمجھا؟...... رابطہ نکاح وہ اب قصہ پارینہ بن گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اس سے نفرت کرنے لگی تھیں، وہ ان کی خوشی میں دشمن بنا تھا۔ عادل اور مونا اپنی زندگی کا فیصلہ کر چکے تھے، پھر وہ اسے سزا کے کٹہرے میں کیوں کھڑا کرکے رکھیں؟...... آج ان کے دل نے اسے بری کر دیا تھا۔ بس دل اور مسکراہٹ تھی ان کے لبوں پر۔

مسکراہٹ کیا صرف میرے لئے ہے؟ کیا صرف میرے لئے؟...... اس نے ماما کے ہاتھ کے بنے ہوئے کا نوالہ چکھا، اس کے سالن کے ساتھ حلق سے اتارا۔

"مرجاؤ گے تم...... مت کھاؤ۔" اندر سے صدائے احتجاج بلند ہوئی مگر اس نے اس صدا کا گلا گھونٹ دیا۔ اتنی ساری محبت وہ بھی کسی کے میرے لئے......

موت زیادہ بھیانک نہیں ہو سکتی ہے......

وہ کھانے میں مگن تھا، جب عدیل بھائی کا فون لئے جازب اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں چھائی تھیں۔ موبائل لئے باہر جیسے ہی ماما نے بجلی کی طرح اس کے ہاتھ سے فون

چھین لیا تھا۔

"آپ جانتے ہیں، یہ آپ کے لئے کتنا خطرناک ہے؟"

جازی کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ نمرہ بہ اطمینان سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر نرمی سے بولا تھا۔ "ہاں میں جانتا ہوں یہ میرے لئے کتنا خطرناک ہے، میں مر سکتا ہوں۔ لیکن ماما نے اپنی محبت سے کہا کہ انکار نہیں ہو سکا مجھ سے۔"

"ماما آپ کی پرابلم نہیں جانتیں، آپ تو جانتے ہیں ناں۔"

شہریار نے ایک ہاتھ سے اس کا کندھا تھپتھپا کر کہا تھا۔ "میں اپنی ماما کا بہانہ جانتا ہوں، لیکن شاید تم بدل گئے ہو، تم تو مجھ سے نفرت کرتے ہو ناں۔ پھر میرے مرنے سے جو خوشی تمہیں ملے گی تم اس خوشی کو کھونا کیوں چاہتے ہو؟"

جازی ہونٹ بھینچتا ہوا مڑا، مگر تبھی اسی وقت ماما نے انٹری دی تھی۔

"کیا ہوا؟...... کھانا اچھا نہیں پکا کیا؟" ہمیشہ کی طرح کانشس ہوتے ہوئے انہوں نے دریافت کیا۔

"بہت مزے دار کھانا ہے ماما! لیکن یہ جازف......" اس کا جملہ اس کے منہ میں ہی تھا کہ جازی نے ماما کے کندھے سے چہرہ ٹکا لیا تھا۔

"ماما! بھائی دل کے مریض ہیں۔ یہ وہ کھانا...... یہ کھانا کیسے کھا سکتے ہیں، مگر پھر بھی باز نہیں آ رہے۔"

دل کے مریض...... ماما نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے شہریار کو دیکھا۔ کھانا کھلوانے جو وہ چلی تھیں، کمرے لے جانے والا تھا انہوں نے اس سے چھین لیا تھا۔ "پاگل ہو گئے ہو شہری؟ تم..."

ماما سے اور کچھ نہیں بولا جا رہا تھا۔ انہوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے شہریار کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا تھا۔

"اتنی محبت کرتا ہے مجھ سے، کہ میرے کہنے پر زہر بھی کھانے کو تیار ہو گیا۔"

"جتنا آپ سمجھتی ہیں آپ اس سے بھی کہیں زیادہ محبت کرتا ہوں ماما!" ان کے سینے سے الگ ہو کر اس نے نرمی سے کہا۔ پھر وہ کچھ نہیں کہا۔ ماما اس کی پشت دیکھ رہی تھیں۔

AANCHAL.COM.PK

'لڑکا...... وہ تو لڑکا بہت الگ ہے۔ سب سے الگ...... ماں ٹھیک کہتی ہیں۔ مجھے اسے سمجھنے کے لئے ایک عمر چاہئے لگے گی۔'

دوبارہ سے کچھ بولا کہ ماما اٹھ کر حشمت بیگم کے کمرے میں آئی تھیں۔ یہ ان دونوں کا تاثر تھا۔ گو دروازہ کھولتے شہریار پہلے سے دودھ... بیگم حشمت نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا تھا۔

''آپ نے کبھی سنا ہے ماں بیٹے میں دوستی کا کیا معاہدہ ہوتا ہے؟''

شہریار نے مسکرا کر یوں کہا جیسے وہ شہزادوں کی طرح ان سے تصدیق چاہتا ہو۔

ماما اس کی طرف جھکی آئیں پھر اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر بولیں۔

''ایک موقع دیا جاتا ہے۔ تم اس سے کہو... میں ماں ہوں۔ اگر کبھی کسی کا دکھ اس کے لئے تم کچھ ساتھ بیٹھ لیا ہو تو بڑی سے بڑی بات سمندروں کے پانی سے بھی نہیں دھلے گی۔''

شہریار کچھ نہیں بولا تھا مگر اپنے کمرے تک جاتے جاتے بے ساختہ قدم لڑکھڑا گیا تھا۔ اس نے کبھی سے پہلا سوال... وہ کب بستر کے نیچے کر کے آرام دہ حالت میں لیٹ گیا تھا مگر جیسے ہی...... اس نے ہونٹ بھینچ لئے تھے۔

'آج ہی چاہئے کیا ہے آج ہی مر جائے گا کیا؟'...... اس نے بے بسی سے سوچا تھا۔ آئمہ ابھی تک پل رہی تھی کہ دھما پرے جذبات میں سلایا جانے لگا تھا۔

اس وقت وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا اور وہ اس پوزیشن میں تھا ہی نہیں کہ...... مگر دروازہ کھل چکا تھا۔ اس کے سامنے ماما کھڑی تھیں۔

''دودھ ہے تمہارے لئے۔ میں خود گرم کر کے لائی ہوں۔'' اس نے بہت وقت سے ان کا جملہ سنا تھا۔ ماما اب اس کے بیڈ کے قریب آ گئی تھیں۔ ''تم کچھ بول نہیں رہے۔ کیا میری کوئی بات دل کو لگ گئی ہے؟''

اس نے کچھ کہنے کے بجائے کپکپاتے ہاتھ سے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ماما اس کے یخ ہاتھ کو دباتے ہی گھبرا گئی تھیں۔

''شہریار تم ٹھیک تو ہو؟...... تمہارے ہاتھ اتنے ٹھنڈے کیوں ہو رہے ہیں؟'' انہوں نے دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اس کے قریب بیٹھ گئی تھیں اور وہ خاموشی سے انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ وہ کم از کم بیمار تو نہیں تھا۔ بچپن ہی سے اس کی عادت تھی۔

"ماما!" اس نے ان کا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ تکلیف اب چہرے پر بھی ابھر آئی تھی۔

"شہریار کیا ہو رہا ہے تمہیں؟...... میں تمہارے بابا کو کہاں ڈھونڈوں؟" ماما گھبرا گئی تھیں۔ اس نے انہیں نفی میں جواب دیا تھا۔

"بس اب کے ماما! یہ تکلیف...... یہ تکلیف چھ سات سال سے جھیل رہا ہوں میں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں خود ٹھیک ہو جاؤں گا۔ ہاں شاید کچھ وقت لگے گا آج......"

"چھ سات سال...... چھ سات سال سے تم......" ماما بوکھلا گئی تھیں۔ پوری طرح اس پر متوجہ ہو گئی تھیں۔ اپنی ساڑھی کے آنچل سے وہ اس کے چہرے پر آیا پسینہ صاف کر رہی تھیں۔ تب اس نے سائیڈ ٹیبل کی دراز کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"وہاں دراز میں ایک بوتل رکھی ہے ماما! کیا آپ وہ مجھے دیں گی؟"

ماما تیزی سے اٹھی تھیں مگر دراز کھنگال ڈالنے پر بھی انہیں وہ نہیں ملی تھی۔ شہریار کا بایاں ہاتھ اٹھا تھا۔ اس نے جست سے لی تھی۔

"کہاں رکھی تھیں گولیاں؟ رکھ کر بھول گئے ہو کیا؟"

"نہیں ماما!...... میں ضرورت کی وجہ سے وہیں رکھتا تھا۔"

"پھر...... پھر اب کیا ہوگا؟" ماما پریشان ہو گئی تھیں۔

تب اس نے تکلیف سے بمشکل نظر ان کے چہرے پر ڈال کر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بمشکل مسکرا کر کہا تھا۔ "آپ تو پریشان ہو رہی ہیں۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ پلیز ریلیکس کیجیے۔ میں بھی کوشش کر رہا ہوں کہ ٹھیک ہو جاؤں۔" ماما آنکھوں سے اس کا سر سہلانے لگی تھیں اور وہ پہلے سے بھی مدھم لہجے میں بولا تھا۔ "اگر آج زندگی کا آخری دن ہے تو مجھے زندگی سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ مگر ایک حسرت ضرور رہے گی کہ کاش! آپ کی محبت کا لطف لینے کا زندگی کچھ وقت اور دے دیتی۔"

ماما رونے لگی تھیں۔ اس نے سر تکیے سے اٹھا کر ان کی گود میں رکھ لیا تھا۔ پھر گہرا سانس لیا تھا۔ ماما نے گھبرا کے پکارا تھا۔ "شہریار!" اور اس نے بند آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا تھا۔ "مجھے تم ٹھیک نہیں لگ رہے...... میں بھی جا رہا ہوں ماما! بابا بلا رہے ہیں۔"

ANCHAL.COM.PK

اس نے شیراز کی گود میں رکھے سر کے تکیے سے اس کے خیال کو روکا ہوا تھا۔ پھر وہ گھنٹے بعد اسے اپنا سانس بحال ہوتا محسوس ہوا تھا۔ آج اس نے ایمرجنسی بیلٹ لیے بغیر کام چل گیا تھا۔ کیا واقعی محبت میں اتنی طاقت پوشیدہ ہوتی ہے کہ زندگی کی لکیر سے دوسری طرف جاتے جاتے اسے محبت نے روک لیا تھا۔ اس کا چہرہ تکلیف سے بالکل پیلا ہو گیا تھا۔ ماما نے اسے بہت احتیاط سے تھام کر تکیے پر لٹانے میں مدد کی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں ماما! آپ جا کر سو جائیے۔"

"نہیں...... میں تمہیں ایسی حالت میں تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔" وہ اس کے بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔

شیراز بہت گہری نیند میں تھا، جب ساڑھے بارہ بجے موبائل نے اس کی نیند توڑی تھی۔ ماما ابھی تک یہیں بیٹھی تھیں اور بہت گہری نیند میں تھیں۔ اس نے موبائل اٹھایا تھا۔ اس کا خیال تھا شاید عاطف کا فون ہوگا مگر دوسری طرف وہی سسکتی آواز......

"کیا آپ واقعی مجھے بھول گئے ہیں شیراز بھائی؟"

"تم اپنا نام کیوں نہیں بتاتیں؟" وہ تیزی سے بولا تھا۔ دوسری طرف ڈر کی دبی آواز پھر سے سنائی دی۔

"میرا خیال تھا مجھے میری فیملی کے ساتھ کوئی ڈھونڈے نہ ڈھونڈے، شیراز بھائی! آپ مجھے ضرور ڈھونڈیں گے۔"

"کک...... کون......؟" وہ بیڈ سے یکدم تیزی سے اٹھا تھا۔ جگ اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ ماما کی آنکھ کھلی اور وہ پریشان سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ "ثانیہ...... تم ثانیہ بول رہی ہو؟"

"ہاں شیراز بھائی! میں ثانیہ بول رہی ہوں۔ پلیز مجھے اس جہنم سے نکال لیجئے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے...... میں یہاں اور رہی تو مر جاؤں گی۔"

"نہیں بچے! ایسا نہیں کہتے...... میں ہوں نا، تم گھبراؤ نہیں۔ بس بتاؤ تم کہاں ہو، میں تمہیں لینے آتا ہوں۔"

اٹھتے ہوئے وہ تیزی سے اٹھ گیا تھا جبکہ دوسری طرف کا رابطہ یکدم منقطع ہو گیا تھا۔ اس نے تیزی سے دوبارہ کوشش کی تھی مگر پھر وہ نمبر آف جا رہا تھا۔

"شیراز...... !" ماما پوری قوت سے چیخی تھیں۔ اس نے چونک کر پلٹ کر ماما کو دیکھا تھا اور پھر گرنے سے پہلے ماما نے اسے تھام لیا تھا۔

ماما دیوانوں کی طرح اسے آوازیں دے رہی تھیں۔ "شیراز بیٹا! آنکھیں کھولو...... کیا ہوا ہے تمہیں؟" انہوں نے گلاس لے کر واش روم سے پانی بھرا تھا۔ شیراز کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے

تھے۔ کافی دیر تک بلاتی رہی تھیں، پھر مایوس ہونے لگی تھیں کہ اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ ماما گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔

"ماما!..... وہ ماضی... آپ جانتی ہیں ناں وہ سارے لمحے ماضی....."

ماما نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ "مجھے نہیں معلوم کون سا ماضی کون سا لمحہ۔ مجھے صرف اس وقت یہ پتہ ہے کہ تمہاری طبیعت بہت خراب ہے۔ چلو اٹھو میرا سہارا لے کر اٹھو۔ آرام سے بستر پر لیٹو۔ اور یہ موبائل اور یہ تمہارے پاپا کا فون بھی اس چھوٹی سی الماری نے بچپن رکھا ہے اور تمہیں بھی دیکھو کس حال پہ پہنچا کر چھوڑا ہے۔"

وہ ان کے سہارے کر بیڈ پر بیٹھا بچی تھیں اور اب نا سمجھ ہوئے رہی تھیں۔ "سوری لیکن کوشش کرو... تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔"

اس نے سونے کے بعد بھی چہرے پر رکھا تھا۔ گزرا ہوا ماضی کی آواز جھنکار رہی تھی۔ ایسی حالت پر بے ہوش نہیں ہوا تو مسئلہ حل ہو چکا ہوتا۔ اسے اپنے اعصاب پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ ماما اس کے چہرے کے اترتے چڑھتے تاثرات سے سارے ذوق کر رہی تھیں۔

"بیٹے کس بات پر تو تم ہو رہا ہے بچے؟"

"آج مجھ سے پوچھیں گی تو صاف کر جاؤں گا۔" اس نے تھکے ہوئے انداز سے جھنے ہوئے کہا اور ماما نے محبت سے کہا۔

"کل تم اپنے پاپا کے ساتھ ڈاکٹر معالج کے چیک اپ ضرور جاؤ گے۔ یہ احتیاطی بھی ضروری ہے بیٹا!"

اس نے کچھ نہیں کہا اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔

❀❀❀

"بابا! آج میں آپ کو اپنا کام دکھاتی ہوں۔" زارا نے دوبی کمرے سے ہوتی گئی ایک ڈاکیومنٹری جب فلم دکھانے پر سلیم افسر کو مجبور کیا تھا۔ فلم اس نے مختلف بازار میں جا کر بھیک مانگنے والوں پر بنائی تھی۔ سلیم افسر ابھی ابھی دفتر سے لوٹے تھے۔ بیگم شاہد نے ان کے لئے چائے بھیجی تھی اور وہ صوفے پر چسکیاں لے کر بیٹھے ہوئے بولے۔

"ٹھیک ہے بیٹا! دکھاؤ جو دکھانا ہے۔ میں بھی تو دیکھوں تمہارا اصل انٹرسٹ کس شعبے کی طرف زیادہ ہے۔"

AANCHAL.COM.PK

"ایسے نہیں پاپا! اس نظریے سے دیکھیں گے تو آپ کو میرا کام بہت اچھا لگنے لگے گا۔ بلکہ میری مثبت کوشش سے ماما بھی اس نظریے سے دیکھنے لگی۔"

سلیم افسر مسکرانے لگے تھے۔ آج غیر متوقع انوشے بھی ان کے ساتھ چائے میں شریک تھی۔ رائمہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے ایک گاڑی میں بیٹھی ہوئی عورت پر آ کر رک گئی۔ "پاپا! یہ عورت Packtion کرتی ہے، آپ کو معلوم ہے؟"

مسز سلیم افسر نے بے یقینی سے دیکھ کر کہا۔ "نہیں! اسے دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا، یہ Packtion کرتی ہوگی۔ اس کی حالت دیکھو، نہ شاید ٹھیک طرح سے آنکھیں بھی نہیں کھول سکتی۔ اس کے منہ سے کبھی رال ٹپک رہی ہے۔ یہ مجھے صرف نشے باز لگتی ہے اور بس۔"

رائمہ نے مدھم لہجے میں کہا۔ "جی پاپا! یہ بھی ہے۔ لیکن لوگ سمجھتے ہیں یہ مر گئی، نشہ کرتی ہے اور جب [illegible] چیک [illegible] ہوتا ہے ان پر دوسری طرح سے۔ میں نے پتہ لگایا ہے۔ یہ کسی [illegible] نام کے آدمی کے پاس قید ہے۔ وہ اسے مانگنے والے کو دیہاڑی پر دیتا ہے۔ دن بھر وہ اس کے نام سے کماتا ہے، پھر رات نکال کر اس عورت کو واپس اس قید خانے میں جمع کروا آتا ہے۔"

"تم اتنے دنوں سے یہ کام کر رہی ہو؟" سلیم افسر نے اپنی ذہین بیٹی کو دیکھا۔

رائمہ نے مسکرا کر سلیم افسر کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں، چہرہ رونق بخش تھی۔ "یہ کام میرے لیے مشکل [illegible] مگر آسان ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ آپ کی اور ماما کی دعائیں میرے ساتھ ہوتی ہیں اور یہ مراد ہے میرے ساتھ۔"

"ارے جانی، میرا کہاں ہے؟ کیا آئی نہیں وہ اب تک۔"

انوشے نے تلخی سے انہیں دیکھا، پھر غصے سے بولی۔ "پاپا! تمہیں صرف وہی لوگ کیوں یاد آتے ہیں، جو تمہارے قریب نہیں ہوتے؟ جو قریب ہوتے ہیں تم انہیں کیوں نہیں [illegible] ہمیشہ کی یہی طریقہ ہے تمہارا۔ پھر تمہیں وہ عورت کیوں یاد نہیں آتی، جس نے تمہارے لیے زندگی [illegible]۔"

"سو...... سوا...... مجھے...... " سلیم افسر نے بات کاٹ کر بیٹی کی طرف دیکھا۔ انوشے یکدم خاموش ہو گئی تھی۔ "پاپا......" ان کے اندر سنسنی سی پھیلتی چلی گئی تھی۔

"شائقہ!" انہوں نے آواز دی تھی اور انوشے اپنی بات کاٹ کر، وہ جیسے [illegible] باہر چلی گئی تھی۔ رائمہ باپ کے چہرے پر [illegible] دیکھ رہی تھی۔ [illegible] کسی کے ملنے کی [illegible] تھی یا کسی تکلیف کی وجہ سے،

وہ جان نہیں پا رہی تھی۔

انوشے پیچھے دیکھے بغیر باہر نکلتی چلی گئی تھی۔ آج کل ایک اچھے ہسپتال میں اس کا منشیات سے بچاؤ کا علاج چل رہا تھا۔ بیشتر تو ایسے افراد کو ادارے ہی میں رکھا جاتا تھا مگر اس نے ضد کر رکھی تھی کہ علاج کروائے گی مگر ہسپتال میں داخل نہیں ہوگی۔ شہریار کی کمپنی کی وجہ سے وہ اس لت سے کسی حد تک بچ بھی رہی تھی۔ مگر جس دن عارف مل جاتا، ساری کسر پوری ہو جاتی۔ زندگی اپنی مدہوشی کی طرف لوٹ آتی۔ اس نے خود عارف کو بھی کوئی بار ڈرگز استعمال کرنے سے منع کیا تھا۔ مگر جب نشہ سامنے ہوتا تو اس کے اندر شدید طلب اٹھنے لگتی۔ اتنی ہمت نہیں رہتی کہ وہ خود کو روک پاتی۔ پھر اسے کیوں کر نشے کی حالت ہی اس وقت وہ نشے میں تھی۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر نکل آئی تھی۔ گاڑی بے ڈھنگے انداز میں چل رہی تھی کہ اچانک ایک بے ہنگم شور کے بعد بیچ سڑک پر رک گئی۔ اس نے مجبوراً عارف کو فون کیا۔

”آج میں مصروف ہوں۔“ اس کی آواز آئی۔ پیچھے سے کسی لڑکی کے بولنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

”تم کہاں ہو عارف؟“

”میں راستے میں ہوں...... گھر جا رہا تھا۔“ جھوٹ اتنا صاف تھا کہ پہلے ہی جھٹکے میں پکڑا جا رہا تھا۔

”تم ابھی اور اسی وقت مجھے پک کرنے آؤ۔“ اس نے بیزاری سے کہا۔ دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

پندرہ منٹ بعد وہ اس کے سامنے تھا۔ ”کیا ہے یار! تم اتنے بلاتی ہو۔ میں کہیں مصروف تھا اس وقت؟“

انوشے نے اس کی طرف گھورتی نظروں سے دیکھا پھر غصے سے چیخ کر بولی۔ ”کون ہے وہ لڑکی جو تمہاری زندگی میں میری جگہ لے رہی ہے؟“

”ارے، وہ لڑکی...... اس دنیا میں...... انوشے! کوئی لڑکی اس پوری کائنات میں تمہارے جیسی نہیں ہے۔ یقین کرو میری بات پر۔“ اس نے گڑبڑا کر بات سنبھالی۔

”تمہیں میری خامیوں سے الجھن ہوتی ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”نہیں یار! بھلا مجھے الجھن کیوں ہوگی؟ یہ تو حسن والوں کی عادتیں ہیں جن کا احترام کرنا دل والوں پر واجب ہے۔“

”تمہیں میرے ڈرگ ایڈکٹ ہونے پر کوئی سوال ہے؟“

"بالکل نہیں.....یہ تو امیر بچوں کی ادائیں ہیں۔ اور پھر میں خود بھی تو کبھی کبھی مارفین لیتا ہی ہوں۔"

انوشے نے اُسے تولنے والی نظروں سے دیکھا اور پھر اس کا ہاتھ تھام کے بولی۔ "تم ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ گھر چلو۔ میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔"

"مگر تمہاری گاڑی.....اسے کون لائے گا؟"

"بائی دی وے، یہ گاڑی کتنے لاکھ کی ہوگی۔ بہر حال اتنی قیمتی نہیں ہے جتنا میرا زندگی گزارنے کا نیا فیصلہ۔"

عارف کی زندگی میں بھی نے کچھ نیا انداز لے لیا تھا۔ سو ناچوں چرا کیے وہ اُسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر واپسی کے سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ مگر موبائل سے اس نے شوفر کو گاڑی کی لوکیشن بتا کر گاڑی کسی مکینک کے پاس لے جانے کا حکم ضرور دے دیا تھا۔

گاڑی رواں دواں تھی کہ اس کا موبائل بجا تھا۔ عارف نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے موبائل اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر انوشے نے اس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دی۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے نمبر دیکھا، شافعہ نام پڑھ کر اس کو پتنگے لگ گئے۔ عارف سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہی تھی کہ اس نے موبائل آن کر کے تیزی سے کہا تھا۔

"تم جو کوئی بھی ہو، یہ جان لو میں نے اور عارف نے ابھی اور اسی وقت شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر تم اس کی کوئی گرل فرینڈ تھیں تو تمہیں اپنی کوشش ترک کر کے کہیں اور ٹرائی مارنی چاہیے۔ اور اگر کسی والدِ محترم کی لڑکی ہو تو تمہیں معلوم ہوگا ایسے دولت مند مردوں کی اس شہر میں کمی نہیں۔ جو تمہیں ٹھیک طرح سے بیچ سکیں۔" رابطہ منقطع کر کے اس نے فون گھور کے رکھا تھا۔

کون تھی.....اُسے معلوم تھا۔ شاید شافعہ ہی ہوگی۔ کیونکہ اس نے اپنے کسی دوست کی اچانک بیماری کی اطلاع دیتے ہوئے اس کی مدد سے پارٹی سے معذرت چاہی تھی۔ لیکن اگر یہ شافعہ ہی تھی تو.....اس نے سوچا۔ وہ دوبارہ شافعہ سے ملنا چاہے گا۔ دل میں ہلکی سی رمق اٹھی۔ شاید وہ اس سے ملنا چاہے گا۔ مگر ساتھ بیٹھی کروڑوں کی لڑکی دیکھ کر اس نے کندھے پیچھے ڈال دیے تھے۔

"تم اس سے محبت کرتے تھے؟"

"نہیں.....میں نے تمہارے علاوہ کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔" اُسے اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ کیا وہ تا حیات اچھا تھا؟ دل نے کہا تم پہلے ہی نہیں تھے، محبت نے شاید تمہیں جذب ہی نہیں کیا تھا۔ ورنہ تمہاری خامیاں لے کر تمہیں اپنی ساری اچھائیاں سوغات نہ کر دیتی۔ تم ایک لڑکی کو دھوکا دیتے رہے۔ ایک ایسی لڑکی کو جو تم سے واقعی سچا عشق کرتی تھی۔ وہ جو تمہاری ایک ایک خوشی کو

اپنے دل سے محسوس کرتا تھی۔ جس کی بعد اس میں ہمیشہ تم رہتے تھے۔ وہ جو تکلیف اپنے حصے میں لے کر تمہارے حصے میں صرف شکوہ باقی رکھتی تھی۔ تمہاری تنہائی کا اس نے اپنے لفظوں اور اپنے جذبوں سے رنگ میں بدل دیا تھا۔ جس نے کبھی مذاق میں بھی تمہارا دل نہیں توڑا۔ لیکن تم نے اس کا دل توڑنے میں ایک سیکنڈ نہیں لگایا۔ تم کہتے تھے، بہت سے دکھوں نے تمہیں تم سے چھین لیا ہے۔ وہ ان بہت سے دکھوں سے بڑا تمہارے اندر اعتبار اعتماد کی کونپلیں اگا کر ان کی دن رات آبیاری کرتی تھی۔ تمہاری مسکراہٹ جس کے لئے دنیا کی سب سے قیمتی شے تھی۔ مگر تم نے کیا اس کی محبت کا دل توڑ دیا تھا؟ کیا وہ چاہتی اس رویے کی متقاضی تھی؟

"تم کہاں گم ہو عارف؟ میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں ناں۔"

"میں سن رہا ہوں۔ تم کہتی رہو۔"

دل نے کیا کہا؟ آج کے بعد تم کچھ محسوس نہ کر سکو گے......

آنکھ نے کیا کہا، آج کے بعد تمہیں محبت اپنا دیدار دے گی نہ......

زندگی نے کیا کہا، انسان جینے کے لئے دولت ہی سب کچھ ہے......

اس نے کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ کیونکہ غلطی ساری اس کے حساب میں لکھی رہی تھی۔ وہ شاہد سے محبت کرتی تھی یا شاید محبت کرنے کے دھوکے میں تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ نوشین کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اسے لگتا تھا وہ اپنے مطلب کا مجبور نکال کر شاہد کو جب کبھی بھی چاہے پا سکتا ہے۔ مگر وہ شاہد جیسی لڑکی کو پہچان ہی نہیں سکا تھا۔ اس نے [illegible] ٹھکرا کر اپنی عزت اور اپنی محبت کی حفاظت کی تھی۔ وہ دولت کی بھوکی ہوتی تو آج کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہوتی۔ وہ نہیں جانتا تھا اور وقت سب جانتا تھا، وہ اس کے خسارے کے کس سودے پر ہنس رہا تھا۔

گھر آ چکا تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے ان کے ساتھ چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا تھا۔ ڈرائنگ روم کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ سلیم افسر کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں اور بیگم شاہد ان کا آدھا خشک رہی تھیں۔

"اچھا کریں...... زندگی میں ان سے زیادہ برے دن دیکھنے پڑتے ہیں۔"

AANCHAL.COM.PK

رافعہ کا رنگ فق تھا۔ وہ گم صم بیٹھی تھی اور سلیم اختر چونک کر اسے دیکھ رہے تھے۔

"بچو رت...... وہ عورت کتنی ہمت تھی مگر اس نے خودکشی کے بدلے اپنا کفن بیچ دیا!!! مجھے اسے اس حالت میں دیکھنے کی کبھی توقع نہیں تھی شافعہ! میں نے کبھی...... میں نے کبھی بہت پیار کیا تھا۔"

شافعہ سمجھتا رہا بس کی طرح ان کا غم بھاری تھی اور وہ تو شاید انہیں بے رنگ آنکھوں سے دیکھ کر رو دی تھی۔

"پاپا! میں نے آج ایک فیصلہ کیا ہے۔"

سلیم اختر نے چونک کر پلٹ کر بیٹی کو دیکھا۔ ان کی دروازے کی طرف پشت تھی اس لئے وہ دونوں میں سے کوئی اسے نہیں دیکھ سکا تھا۔ آپ دیکھا تھا؟ ان کے جملے کی ساخت میں اٹک گئے تھے۔

"کیسا فیصلہ بیٹی؟" رافعہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک سچ کو چھپاتے ہوئے سوال کیا کیوں سچ کی تلخی کہنے سے زبان و چہرا لینے میں سکت باقی تھی۔

"میں...... میں اسی مہینے عارف سے شادی کر رہی ہوں پاپا!"

سلیم اختر کے ہاتھ سے پانی کا گلاس چھوٹ گیا تھا جو رابعہ نے ابھی ابھی ان کے ہاتھ میں دیا تھا۔

"پلیز پاپا! میں اپنے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں سنوں گی۔ میرا فیصلہ ہے اور آپ کو یہ ماننا پڑے گا۔"

سلیم اختر کچھ نہیں بولے تھے۔ ایک وہ کپ میں پڑی چائے تھی، ایک سامنے کھڑی بیٹی۔ ایک نے اپنی زندگی کے فیصلوں کا اختیار چھین لیا تھا اور دوسری اپنے فیصلوں پر اداس کا شکار تھی۔

"میرا کیا فیصلہ ہونا چاہیے؟" انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تیمم شافعہ کی طرف دیکھا۔ ان کے ہاتھوں کی [illegible] کو کیا جواب ہونا چاہیے سو انہوں نے مدھم لہجے میں کہا تھا۔

"ٹھیک ہے...... مجھے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں۔ مگر میری شرط ہے، عارف کو بتا دو کہ ان کے پاپا خود لے کر میرے گھر آئیں۔"

"عارف! تمہیں اس پر اعتراض تو نہیں؟" [illegible] فون پر پوچھ رہی تھی۔

اور اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا تھا "میرے پاپا کو کوئی اعتراض نہیں۔ میں آؤں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک ہفتے کے اندر اندر آپ سے آ کر ملیں گے۔"

عارف جا چکا تھا اور وہ تب بھی اپنا فیصلہ کر کے بیٹھی تھی۔ تب ہی سلیم اختر نے کہا تھا "کیا یہ فیصلہ درست ہے بیٹا؟"

AANCHAL.COM.PK

نافیہ نے پلو سے آنسو پونچھ کر کہا تھا۔ "ہر فیصلے میں خطرہ ہوتا ہے ہاں۔ کرنے دیں زندگی کا یہ نیا تجربہ بھی اسے۔ ہو سکتا ہے، یہی فیصلہ اس کی روٹھی ہوئی خوشیاں لوٹانے میں مدد دے۔"

سلیم اختر کچھ نہیں بولے۔ بہت متاسف ہو کر پھر سے اسکرین کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ اس عورت کو اپنے حسن پر کتنا گمان تھا اور اب...... انہوں نے پھر سے دیکھا۔ سندلی سندلی آنکھیں، مدفون چہرہ، جھلستانی کلیاں...... وجود پہ غرور اب کہیں نہیں تھا۔ ان کی آنکھوں میں کتنی بے بسی تھی۔

نجم نافیہ شرمندگی سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر ان کے دل نے ایک فیصلہ کیا تھا۔

آج شافعہ شعبہ میں داخل ہوئی تو بہت خوش و خرم سی چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی [illegible] آج وہ روز کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی طرح تیار ہوئی تھی۔

"کیا ہوا خیریت......؟" اس نے سوال کیا۔

تب شافعہ اس کے قریب بیٹھ گئی "کوئی خاص بات نہیں تھی بس ایسے ہی طبیعت [illegible] اور ان کی ہونے کی وجہ سے [illegible] اتار دی۔"

"واہ...... بالکل لڑکی ہی تم تو بہت پیاری لگتی ہو، سب آپ کرے۔"

"مگر ایسے سنگھار کا فائدہ جو کسی کا دل نہ باندھ سکے۔"

"کیا ہو گیا آج تو مجھے لگتا ہے تمہاری جگہ مجھے تمہاری غمگساری کرنی پڑے گی۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بہت جلد اپنے آپ کو سنبھال لوں گی۔"

وہ کچن میں آ گئی۔ چائے بنانے لگی تھی۔ کل آنٹی اس کا پسندیدہ کھانا پکانے نہیں آئی تھی اس لئے یہ احسان اس نے کیا تھا۔

"کل تمہارے گھر کوئی پارٹی تھی کیا؟"

اس نے وہ بیٹھنے کی بجائے بات چیت کے تحت بے تکلفی سے سوال کیا۔ [illegible] پیغام کر رہا ہو [illegible] پوچھنے لگی۔

"تم کتنا جانتی ہو نجم؟"

AANCHAL.COM.PK

"ہم ایک جیسی ہیں۔ لیکن اگر اس دن سے کچھ الٹا چاہتی ہو تو تمہیں پوچھنا چاہیے میں کیسی لگتی ہوں۔"

"جیسی......" اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ شک کی غلطی میں جیسی کا جارحانہ انداز تھی۔ دونوں جارا ایک جیسے تھے اس لئے یہ غلطی ہو گئی تھی۔ وہ اب نے اس کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی دیکھی تو ہاتھ بڑھا کر اسے قریب بلایا۔

"تم ادھر آ کر بیٹھو، ہم کھانا باہر سے منگوائیں گے۔ آج چائنیز ہی ہو جائے گا کوئی بات نہیں۔ لیکن اگر تم ایسی خاموش رہیں تو میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔ مجھ سے کسی کی پریشانی بالکل نہیں دیکھی جاتی۔" وہ اس کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی تو اس نے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔ "تمہارا دل کیوں خفا تھا......"

"میرا منگیتر تھا ہم!...... لیکن کل رات......"

"اس نے کوئی بدسلوکی کی تم سے؟" اس نے اپنے خیالوں میں گم ہو کر بے چینی کی گہرائی میں سر ہلا کر دی۔

"ہم کل میری سالگرہ تھی۔ دونوں پاپا سب ایک ساتھ تھے۔ کل ہم بچوں بالکل خوشی سے سالگرہ منا رہے تھے۔ بیشتر وہ میری بات سے ... میرا خیال تھا آج ہم اکٹھے مزے کریں گے۔ مگر ان کے موبائل پر ایک کال آ گئی۔ اس نے بتایا کہ ان کے دوست کی ... میں نے سمجھا ... ہو گا مگر ہم! اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا...... وہ کسی لڑکی کے ساتھ تھا۔"

ثانیہ نے اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا تھا پھر آہستگی سے بولی تھی۔

"یہ تو مردوں کی عادت ہوتی ہے۔ ... بدلنے کے لئے دوبارہ ... مارتے ہی رہتے ہیں۔ مگر ... اپنا رکھنا ... عورت تو وہ ہے جو ... کی ہوتی ہے۔"

"مگر ہم میرے پاس ... نہیں ہے اور ... کی ہوئی تھی وہ عارف ... کرنے والے ہیں۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے عارف ایسا ہے کہ تمہیں دھوکا دے؟"

"پتہ نہیں ہم ابھی تو ایک ... پر کھڑی ہو گئی ہوں۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں ہے مرد دھوکے بھی دیتے ہیں۔ میرے پاپا، میرے ... سب کی زندگی خوشگوار تھی۔ کسی نے بھی کبھی ایسا کیا ہی نہیں کہ مجھے لگتا، میرے ساتھ دھوکا ہو گا۔"

"پھر تمہیں خود کو اس دھوکے کو سہنے کے لئے تیار کر لینا چاہئے۔ تم عارف کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں، اس لئے تم تاریکی میں کوئی بھی قدم اٹھا کر اپنے گھر سے آ گئی۔"

"میم! آپ...... کیا آپ جانتی تھیں، علی صاحب آپ کو دھوکا دیں گے؟"

"دھوکا اور علی......" وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ پھر دھیمے لہجے میں بولی۔ "تمہیں یہ کیسے لگا کہ علی نے مجھے کوئی دھوکا دیا تھا؟"

"پھر میم! آپ کو انہوں نے کیوں چھوڑا؟ آپ...... آپ تو اتنی پیاری، اتنی خوب صورت سی ہیں۔"

ثانیہ نے ایک نظر اُس کی طرف دیکھا، پھر مدھم لہجے میں بولی۔ "میں اتنی خوب صورت نہیں ہوں جتنا خوب صورت علی تھا۔ اُسے دیکھ کر سورج کی بھی سانس رک جاتی تھی۔ وقت بھی تھم تھم کے چلتا تھا۔ پھر میں اس کے حصار میں کیسے نہ آتی۔ میں بھی اس کے قریب رہی تو وقت کی طرح ساکت ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ دیکھتی رہی۔ پھر مجھے لگا مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ میں نے اُسے لڑکی ہونے کے باوجود پرپوز کر دیا۔ وہ سوفٹ ڈرنک کا گلاس رکھ کر میری جسارت پہ گم رہ گیا تھا۔ میں بھی وہ میرے حسن کے تیر سے گھائل ہو گیا ہے۔ مگر اس نے بہت سرد لہجے میں کہا تھا۔ "میں کسی ماڈل گرل سے شادی نہیں کر سکتا۔ مجھے بیوی با کردار اور باعزت چاہئے۔" میں نے کہا۔ میں تمہارے سانچے میں ڈھل جاؤں گی۔ زمانہ دیکھ لو گی، ساتھ پردوں میں رکھو گے، رہ لوں گی۔ مگر وہ نہیں مانا...... وہ نہیں مانا اور پھر مجھے ضد ہو گئی۔ کسی بھی طرح اُسے پالینا ہے۔ اُسے پانے کے لئے میں نے کتنے جھوٹ بولے۔ کتنے لوگوں کا آلہ کار بنی۔ جو مجھے کہتا، وہ مجھے علی سے قریب کر سکتا ہے، میں اس کے قدموں کی خاک چومنے سے باز نہ رہی۔ مگر کسی نے ایسا نہ کیا۔ پھر...... پھر ایک دن میری زندگی میں انقلاب آ گیا۔

ایک ایسی ہستی دریافت ہوئی جس نے واقعی علی سے مجھے ملانے کی قسم کھائی۔ علی جس منسٹری میں تھا، وہاں منسٹری کو نظر تھی، کاہل نے اس پہ دباؤ ڈالا کہ اگر وہ مجھ سے شادی نہیں کرے گا تو اس سے اس کی نوکری چھین لی جائے گی، فیک انکوائری میں گھسیٹ لیا جائے گا۔ علی اس بات پہ بھی راضی نہیں ہوا۔ وہ ہی انا والا آدمی تھا۔ اس نے کہا، وہ اپنی زندگی کے ہر بحران کا مقابلہ کرے گا مگر مجھ سے شادی نہیں کرے گا......

میں مایوس ہو گئی تھی، جب اس کی کمزوری اس کا بھائی نظر آیا۔ وہ ان دنوں ریسرچ پیپر کی تیاریوں میں تھا۔ علی کا سارا گھرانہ بہت علمی و ادبی سا تھا۔ سو اس کا بھائی بھی ریسرچ کے میدان میں آگے جانا چاہتا تھا۔ تب اس منسٹری کی طرف سے اس پہ دباؤ ڈالا گیا کہ اگر وہ نہیں مانا تو اس کی ریسرچ کو درمیان ہی سے ختم کر کے اسے گھر واپس بھیج دیا جائے گا۔ علی اپنی ذات پہ کمزور نہیں پڑا تھا، مگر وہ اس ڈراوے پہ

مان گیا۔ کیونکہ اس کے بھائی کی زندگی کا ایک اکیلا خواب یہی تھا کہ وہ اپنی ریسرچ میں کامیاب ہو کر اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جائے۔ اس کے اس ریسرچ پیپر کی تیاری میں ہی اس کی اکلوتی شب گزری تھی۔۔۔
ختم ہو گیا وہ ہار گیا اور میں جیت گئی میں نے اسے پا لیا ہے......

وہ میرے ساتھ تھا حیران...... میں اسے جب چاہتی دیکھ سکتی تھی...... جب چاہتی اسے دیکھ سکتی تھی۔ میری آنکھیں اس کے حسن سے ہر وقت خیرہ رہتیں۔ میرا دل کہتا میری آنکھیں کھلیں تو میں اسے دیکھوں۔ جب آنکھیں بند کروں تو اسے دیکھوں۔ مگر وہ میرے بارے میں ایسا نہیں سوچتا تھا۔ وہ جب مجھے چھوتا اس کے ہاتھ برف کی طرح سرد ہوتے...... تارا سا تھا ایسے تھا جیسے دریا کے دو کنارے اور بیچ میں منجدھار سا فاصلہ......

تین سال، چار سال...... پھر پانچ سال میرا صبر جواب دے گیا۔ میں نے کہا تم چاہتے ہو میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں؟...... شافعہ! تمہیں پتہ ہے اس نے کیا کہا؟"

شافعہ کا دل آنکھوں میں آن بیٹھا۔ "کیا کہا تھا صیام؟"

ثانیہ نے گہرا سانس لیا اور بولی۔ "اس نے کہا ہاں میں چاہتا ہوں تم میری زندگی سے چلی جاؤ تم...... جتنی اپنی مرضی سے آئی تھیں اتنی ہی میرے من کی مرضی سے جاؤ گی۔ تم واقعی چلی جاؤ بالکل چلی جاؤ۔ بالکل ثانیہ!...... بالکل چلی جاؤ۔

اس نے ٹھیک کہا اور اس دن میں نے جانا، محبت حاصل نہیں کی جاتی۔ اسے صرف پا لیا جاتا ہے مانگا جاتا ہے۔ میں نے اسے چھیننے کی کوشش کی تھی اور محبت نے مجھے اس جسارت پہ اپنے دل سے باہر نکال دیا...... مجھے اپنے دل سے باہر نکال دیا شافعہ۔ اگرچہ کہا پھر بھی نہیں تھا وہ اس کا دل میری طرف سے مڑ ہی...... وہ رحم کا، پیار مجھ سے پیار کرتا۔ گر ایسا نہیں ہوا تھا شافعہ! سو میں اسے چھوڑ کر اپنے گھر چلی آئی......

میں نے گھر آ کر بہت ساری خواب آور گولیاں کھا لیں۔ مجھے معلوم تھا میری زندگی کی طرح اسے میری موت کا بھی کوئی غم نہیں ہوگا۔ جس دن میں نے پھر بھی مرنے کی کوشش کی۔ میں اپنے فلیٹ میں اکیلی تھی، جب میری دوست نے مجھے اچانک آ کر بے ہوش پڑے دیکھا، کوشش کی مگر وہ فوراً ہاسپٹل لے گئی۔ اس نے مجھے ہاسپٹل پہنچایا۔ وہ ہسپتال کے عملے سے لڑنے لگی۔ اس نے کہا اگر مجھے کچھ ہوا تو وہ پورے ہسپتال کو آگ لگا کر رکھ دے گی۔ میرا کیس سیریس نہیں تھا۔ پھر مجھے بچا لیا گیا۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اتنی افسردہ سانس کہ شافعہ کو اس پر ترس آنے لگا۔

"میم! زندگی ابھی اتنی بڑی نہیں ہے کہ آپ اپنے جینے پر افسوس کریں۔"

ثانیہ نے خالی آنکھوں سے اسے دیکھا اور جیسے اس کی بات سنے بغیر بولی۔ "مجھے بچا لیا گیا تھا مگر ڈاکٹر صرف میرا وجود بچا پائے تھے۔ میرا اندر مر گیا تھا اور انہیں خبر نہیں ہوئی تھی کہ وہ ایک مردہ انسان میں زندگی کی رمق دوڑانے میں لگے جا رہے ہیں۔ میری دوست ہر وقت میرے ساتھ رہتی تھی۔ وہ ایک ہمدرد ساتھی تھی۔ اس کا حوالہ دے دے کر مجھے کہتی کہ وہ انسان کو چھوڑ نہ دیں۔ جتنی اذیت مجھے پہنچی ہے وہ اس سے دگنی اذیت اسے دے گی۔ مگر میری زبان کو تالا لگ گیا تھا۔ میں کچھ بھی نہیں بول پاتی تھی۔ اس لمحے میرے اندر صرف ایک بات چل رہی تھی۔ "مجھے جینا نہیں ہے..... دنیا میں جیسے جینا مجھے نہیں ہے۔" اور بس وہ میں یہی سوچتی رہتی۔ پھر ایک دن میں ہسپتال سے نکل آئی۔ میں کسی بھی گاڑی کے نیچے آ کر مرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ زندگی نے مجھ سے میرا آپ چھین لیا تھا۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ اچانک میرے سامنے ایک ٹرک ایک مجھ جیسی لڑکی کو کچلتا چلا گیا۔ میں نے اپنے سامنے موت کو دیکھا۔ موت اتنی بھیانک اتنی تکلیف دہ ہوتی ہے، میں تو اسے ایک ہلکی سی خواہش جیسی تکلیف سمجھتی تھی۔

میرا لرزتا وجود اس صدمے سے بے حال ہو گیا تھا۔ میں چل رہی تھی کہ چلتے چلتے بے ہوش ہو گئی۔

پھر میری آنکھ کھلی تو میں کسی گھر میں تھی۔ وہ بہت تنگ و تاریک گھر تھا۔ مگر وہاں کے لوگ وہاں کے دل تاریک نہیں تھے...... انہوں نے مجھے وہیں کی کسی گلی سے اٹھایا تھا۔ وہ لوگ مزدور تھے۔ انہوں نے میری بہت خدمت کی تھی، بہت پیار دیا تھا۔ تب میں نے ایک اور سبق لیا تھا زندگی سے کہ محبت کے لیے دولت شہرت ضروری نہیں ہوتیں..... نہ انسانیت سیکھنے کے لیے انسانیت پر بڑے بڑے خدا کے سہارا لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تو بس الہام ہوتے ہیں اور الہام صرف دل والوں پر اترا کرتے ہیں۔"

وہ کچھ دیر کو چپ ہوئی اور اسی کچھ دیر میں شکل بگڑ گئی تھی۔

"دیکھو شاید چائے آ گئی ہے۔" اس نے بند بیگ سے دو ہزار نکال کر دیے تھے۔ شافعہ نے چائے اس کے آگے رکھ دی تھی۔ پھر وہ پلیٹوں میں کھانا نکال کر ثانیہ کے سامنے ٹیبل پر رکھ رہی تھی۔

ثانیہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ پھر بہت مدھم لہجے میں بولی تھی۔

"پتہ نہیں وہ اتنا خوش قسمت نہیں تھا یا اس کی قسمت بری تھی مگر یہ طے ہے وہ اس نے بہت بڑی محنت گنوا دی ہے۔ تم جو صرف ایک مریض کے لیے اتنی توجہ، اتنی محبت، اتنی لگن سے اپنی خدمات پیش

کہانی ہو تو اس لڑکی کے لئے ختم کہاں ہوتی ہے...... کہا کیا نہیں کر گزر رہی...... اس نے بہت خسارے کا سودا کیا ہے ثنائیہ! میں اسے دیکھے بغیر جان سکتی ہوں کہ وہ ہار گیا ہے۔ وہ محبت سے ہار گیا ہے، اپنے آپ سے ہار گیا ہے۔"

ثنائیہ نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس کے پاس جیسے کہنے کو کچھ رہ ہی نہیں گیا تھا۔ شاید اسے دکھی رہی، پھر اپنی کہانی کو وہیں سے شروع کیا جہاں سے کہانی نے سانس روکی تھی۔

"میں وہاں بہت سارے دن رہی۔ وہ لوگ مجھے کسی اچھے گھر کی بے سہارا لڑکی سمجھ کر رکھے ہوئے تھے۔ میں کچھ دن اور وہاں رہ سکتی تھی، مگر میری عزت نفس نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ میں ایک دن چپکے سے ان کے گھر سے نکل آئی۔ میری حالت کم کھانے اور بہت مار کھانے کی وجہ سے بگڑ رہی تھی۔ شاید میں خود بھی اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتی تھی...... میں چلتی چلی جا رہی تھی کہ ایک جگہ مجھے تھک کر نڈھال ہو کر بیٹھ گئی۔ میرے سر کی چادر کا پلو پھیلا رہ گیا۔ کسی راہ چلتے نے اس میں دو روپے ڈالے، کسی نے ایک روپے کا سکہ اچھالا اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا، میں کب اور کیسے مہر عمرانی کی بیٹی ہونے کے باوجود بھکارن بن گئی۔

میرا دل چاہا تھا، اس دن میں جاؤں اور اپنے باپ کو لا کر چپکے سے اپنا حال دکھاؤں اور کہوں۔ دیکھو میرے بابا! تمہاری بے جا آزادی، غلطیوں سے چشم پوشی، شہرت کی بھوک اور مادر پدر آزادی نے مجھے کہاں لا کر پٹخا ہے...... میری مثال اس انسان کی طرح ہو گئی ہے جس نے [illegible] آسمان کی بلندیوں پر اڑنا چاہا مگر وقت نے مجھے فلک سے کہاں پستی میں پھینک دیا۔ میرا سارا جسم پھوڑے [illegible]۔ بابا! اگر ابھی آپ کی بے جا آزادی کی تمنا ہے تو مجھے [illegible] میرے دل نے تمنا کی کہ جھنجھوڑ دوں۔" [illegible] اپنے باپ سے پوچھوں کیا لاتی، وہ اس حالت میں مجھے پہچانیں گے بھی، میں ایسا نہیں کر سکی......

پھر شام تک جمع ہونے والی ریزگاری سے میں نے اپنی زندگی کا کھانا کھایا، جیسے مر جانے والوں کے بعد کوئی روٹی ہوتی ہے، ہاں وہی......"

وہ سانس سانس لینے کو رکی، پھر بولی۔

"پتھر میرے قدم رکھانے سے اور گھسٹ گئی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اپنے گھر جانے والی بس کا نمبر کسی سے پوچھا تھا۔ گاڑیوں میں گھومنے والی ثانیہ عمرانی نے پہلی بار بس دیکھی۔ وہ رستہ جب میں نے بس میں قدم رکھا تو لوگوں کی آنکھوں میں میرے لئے حقارت تھی۔ میرے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور پسینے کی بدبو سے میرا اپنا برا حال تھا اور میرے لئے وہ عورتیں بھی تھیں جن کی

مہینے بھر کی کمائی کے بعد بھی میں صرف ایک پرفیوم خریدا کرتی تھی۔ میں پلو میں منہ دے کر پہلی بار جی بھر کر روئی۔ کسی نے میری آنکھ کے آنسوؤں پر ترس کھایا تو کہا۔ "گجر گ آ گیا ہے بی بی!" میں اندھوں کی طرح سڑک پہ اتری۔ آج میں اپنے گھر کو ڈھونڈ رہی تھی اس گھر کو جس میں، میں نے سالوں جاتے تھے۔ میں نے اپنے باپ کا نام بتایا تھا۔ تب بہت سارے لوگوں میں سے آتے جاتے قدموں میں صرف ایک نے مجھے راستہ سمجھایا۔

"عمرانی صاحب کی بیگم آج بھی کے دن صدقہ خیرات دیا کرتی ہیں۔ مگر بی بی! تم نے آج دیر کر دی ہے۔" واچ مین نے میرے حلیے کو دیکھ کر جواب دیا۔ حالانکہ میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

"وہ تو بیٹی...... میرا جملہ حلق میں تھا۔ پہچان کی سیڑھی پہ پہلا قدم تھا میرا۔ "پتہ چلا میں ایک سال پہلے مر چکی ہوں...... میں نے افسوس سے اپنی طرف دیکھا۔ پھر لجاجت سے پوچھا۔ "کیسے مری تھی بی بی صاحب؟"

واچ مین نے ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "کیسے مرتا ہے یہ لوگ، جنہیں نہیں معلوم تمام عمر بھاگتا پھرتا ہے، پھر مرنے کے لیے بھی گھر نصیب نہیں ہوتا۔ مر گیا ہے بے چارہ سڑک پہ جیسے عام لوگ مرتا ہے۔ کبھی کبھی بڑا لوگ بھی عام لوگ کی طرح مر جاتا ہے۔ اچھا چلو، اب تم جاؤ۔ صاحب نے ہمیں تم سے بات کرتا دیکھ لیا تو جان کو آ جائے گا۔ بہت خبیث آدمی ہے ہمارا صاحب۔ گھر میں بیٹیاں ہیں پھر بھی...... چلو شوچہ تم جاؤ ماں۔"

اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور میں اس ادھوری بات کا دکھ جان گئی۔ کیونکہ وہ ادھوری بات پورے وثوق کی طرح میری اجنبی کی ماں کی آنکھ سے جھلک رہی تھی۔

میں اپنے گھر سے چلی آئی۔ یہاں دارالسکون میں رہنے لگی۔ پھر اچانک دو سال بعد میری ماں کے دیے تحائف لیے میری بہن وہاں آئی تو اس نے مجھے اتنی بری حالت میں بھی پہچان لیا۔

"میرا دل کہتا تھا کہ تم زندہ ہو۔ میرا دل کہتا تھا۔" اس نے میرے گندے منہ سے چہرے، الجھے بالوں کے باوجود اپنے قیمتی کپڑوں کا خیال کیے بغیر اپنے سینے سے لگا لیا۔ تب مجھے لگا محبت ہے دنیا میں...... شافعہ! کیا واقعی محبت میں ایسا ہوتا ہے؟ بدترین حالت میں بھی کسی اپنے کو پہچان لے؟"

شافعہ اس کا ہاتھ تھام کر اثبات میں سر ہلانے لگی۔ شاید کی آنکھیں، اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ باتوں میں کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ شاید باتھ روم کے بہانے کمرے کی تھی اور شافعہ بھی دوپٹہ بھول کر اسے سننے لگی تھی۔ سو کہانی ختم ہوئی تو شافعہ ایکسیوزن میں کھانا گرم کرنے کے لیے کچن میں گئی تھی۔ پھر دس منٹ بعد وہ کھانا کھا چکی تھیں۔ یہ وقت اس کے آرام کا وقت ہوتا تھا۔ سو وہ اسے سہارا

بیج دینے اس کے گھر سے حنا لائی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ ذرا سی بولی۔ "ہم آج کچھ گنگنائیں گی نہیں؟ آج دل بہت اداس ہے۔"
ثانیہ نے اس کی طرف دیکھا اور تکیے کے نیچے رکھی ڈائری نکالی۔ تصویر سا تھ جگمگ کرتا منظر بند کی تھی ماں نے مر کر پہلی البم گنگنی شروع کر دی تھی۔

"چاند کبھی تو تاروں کی آب چھوڑ سے نکلے
اور میری کھڑکی میں آئے
پاگل تنہا دیوانہ سا
میں اس کو بانہوں میں بھر لوں
ایک ہی سانس میں سب کی سب دعائیں کرلوں
جو میرے حال سے چھپیں
دل میں جتنی روشنی ہیں
سب چمکتا ہے تب ہوجائے شب ہے ناں
چاند میری کھڑکی میں آئے شب ہے تو ناں"

ثانیہ نے دیکھا بستر پر لیٹی ہوئی گڑیا جو چہرے والی لڑکی کو کم ہیں وہ ٹکٹکی کی طرف رخ کرگئی تھی۔ اس کی پلکوں میں بھیگی تھی۔ وہ جسم تھا مگر وہ چاند...... وہ چاند کہاں تھا۔
میرے دل کا چاند بھی تو...... ثانیہ نے دھیرے سے خالی ہتھیلی پھیلائی۔
سامنے لڑکی کے ہاتھ بھی خالی تھے۔ کچھلے سے کچھ سال دل چاہا دونوں سب پیچھے سے کسی نے ہاتھ پکڑ کے سب ہی سر جھکا کر بیٹھ جائیں۔ لوگ انہیں فقیر سمجھیں۔ کبھی کسی کے دامن میں تو خالی دامن میں ڈالے۔ کوئی پانچ روپے کے دو محبت جھولی میں ڈال دے۔ خالی دامن بھرتا جائے ابھرتا ہی جائے گا۔ بیشتر دل ہر ضرب نفس کا ادا ہو نفس...... کیا جھولی محبت کا مسرت کب کر پائے گا؟

AANCHAL.COM.PK

انہوں نے آنکھیں بند کر لیں تو ابا چلے آئے، آنسوؤں سے بھیگے ہوئے...... اماں بھی آئیں، دکھ میں ڈوبی ہوئی۔

"مت جاؤ بابا! میرے ابا جی، ہم سب تنہا رہ جائیں گے۔" کوئی آواز ابھری اور دل سے اٹھی۔ سارے وجود میں بجلیاں بھر گئیں۔

"مجھے بددعا لگ گئی ماں کی۔"

ماں کبھی بددعا نہیں دیتی۔ بددعا تو ہمارے اعمال خود بن جاتے ہیں...... انہیں بھی خود خودسری نے بددعا کی طرح خود سے جدا کیا تھا۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا، مسز عرفانی ابھی تک نشے کی ترنگ میں تھے۔ بیگم عرفانی کی آنکھوں میں اماں کے آنسو بھی اتر گئے تھے۔

"یا اللہ معاف کر دے...... مجھے معاف کر دے۔ تو بہت معاف کرنے والا ہے۔"

مگر کیا معافی اتنی آسانی سے مل سکتی ہے......؟ جب دل دکھے ہوں تو دعا دینے والے دل کے اندر سے پہلے زندگی بھی معاف نہیں کرتی...... اب وہ کون سا دکھ دیا ہے جو تم نے دیا ہے دل کو...... انہوں نے بے بسی سے سوچا اور ایک ہچکی تھا کہ آنکھیں مل کر جاگ گیا تھا۔

زندگی گنوانے کا جو دکھ میں نے دیا، وہ دکھ جیسے بغیر کسی کنیر سے اتار نہیں سکتیں...... ساری بیگمے کے ہزاروں کی ایک کی غلطی سارے گھر کو بھی بھگتنی پڑتی ہے۔

❀❀❀

زہرہ جبیں ہمارے سامنے بیٹھی تھیں اور انہیں حیرت نے گھیرا تھا۔ شاہ زیب ایک نام سے شرط پر منظور ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی ان کا خیال تھا کہ ایک بھی ذرہ نہیں جھکتا، جب تک کہ اس کے تمام لوگوں کیا اداروں کا مضبوطی اور پائیداری بخشی جاتی، لیکن ان دونوں کی محنت بالکل بند داں تھی۔

"آپ نے چیک کیا؟ مسٹر رفیع عثمانی اس لون شاہ کو ہسپتال کے لئے پاس کیا گیا ہے؟"

مسٹر رفیع عثمانی نے مسکرا کر زہرہ جبیں کو دیکھا، پھر نرمی سے بولے۔ "ہم! آپ نے ابھی ہمارے ڈاکومنٹس خود چیک کئے ہیں، پھر اتنی بے اعتباری...... بالکل نہیں ہے ہم کا کامیابی کے لئے اچھا ہو، اپنی صلاحیتوں پر اعتبار کرنا چاہئے۔"

"آپ کو لگتا ہے، مسٹر رفیع عثمانی صاحب! ہم آپ کا لون اور ہر مہینے کی قسط چکا سکیں گے؟"
انہوں نے بے حد طریقے سے رفیع عثمانی کو جانچنے کی کوشش کی اور وہ مسکرانے لگے۔
"مسز جنید! اگر اس طرح کی باتیں آپ نے دوسرے بینک آفیسرز کے سامنے کیں تو شاید وہ اپنے فیصلے پر ایک بار پھر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"
"لیکن رفیع عثمانی صاحب! مجھے یہ بات حیرت میں مبتلا کر رہی ہے کہ جب آپ کے کاغذات کی تحریر ہم قسط کی ادائیگی کے لیے مختص نہیں ہو پاتی جائے گی۔ جو قسط کی مد میں ہم آسانی سے جمع کروا دیں گے۔ آپ کا بینک اسے قبول کرے گا، یہ بینک کی انتہائی دریا دلی ہے۔"
مسٹر رفیع عثمانی نے مسکرا کر دیکھا اور پھر سنجیدگی سے بولے۔ "اگر یہ بزنس لون کے حوالے سے ہوتا تو شاید ہمارے رولز اور ریگولیشن ذرا سخت ہوتے۔ مگر یہ ایک ٹرسٹ ہسپتال کے قیام کا منصوبہ ہے۔ اس لیے حکومت اور پھر صنعت کار طبقے کی سپورٹ حاصل ہے۔ آپ کو پھر آپ کا عزم اور ارادہ بھی واضح ہے کہ اس کی جتنی بھی جلدی تیاری ہے، آپ نے اسی میں قوم کی مسیحائی کا کام شروع کر دیا ہے۔ پھر ہمیں یہ گمان کیونکر ہو کہ آپ اپنا لون واپس نہیں کر سکیں گی؟ پر عزم لوگ الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہم لوگ ہیں ہم نے پہچاننے کا کام کیا ہے، اسے ثابت کرنے کا کام آپ کا ہے۔"
زہرہ جنید کچھ مطمئن ہو گئیں، کچھ خوش ہو گئیں اور اپنے کاغذات اٹھا کر رقم اپنے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرا کر گھر لوٹ آئیں۔ سلامہ ارسلان آج گھر میں ہی تھا۔ دونوں بچے اس کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھے۔ عارفہ سلامہ کے امتحانی ٹیبل پر بیٹھی تھیسس کے مشکل سوال سلامہ کی مدد سے حل کر رہی تھی۔ زہرہ کی طرح عارفہ نے بھی میڈیکل ہی جوائن کی تھی۔ وہ انسٹی ٹیوٹ کے بجائے تعلیم کے سلسلے میں سلامہ اور زہرہ سے مدد لیتی تھی۔ کالج کے بعد اس کے اس طرح گھر میں بند رہنے کو اماں سمیت دونوں بہت محسوس کرتے تھے، روکتی تھی۔ "میں مجھے گھر سے باہر جانا اچھا نہیں لگتا تو میں کیا کروں؟"
زہرہ جنید نے ایک بار اپنا دوپٹہ اچھا تو بولی تھی۔
"عائشہ بیگم کو جس طرح راستوں نے کھا لیا ہے، میں ڈرنے لگی ہوں کہ مجھے بھی یہ راستے، یہ منزل کا گمان کہیں نگل نہ لے۔ میں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگی ہوں۔ ہر قدم پہ گمان ہوتا ہے شاید غلط سمت اٹھنے والا قدم ہے۔ مگر پھر آپ کا اعتبار، اماں کا پیار مجھے مضبوط کر دیتا ہے کہ اتنے تلخ تجربے کے باوجود آپ لوگوں نے زندگی کا اور مجھے ایک بار چن لیا۔"
زہرہ کمرے کی دہلیز میں کھڑی ہوئی ابھی تک عارفہ کو دیکھ رہی تھی۔ عائشہ کے جانے سے وہ بہت پژمردہ ہو گئی تھی۔ ہلکی سی آواز سے بھی اس کا سانس اتنا تیز چلنے لگتا تھا، لگتا تھا ابھی دل بند ہو جائے۔

"کیا پڑھا جا رہا ہے؟" انہوں نے حارث کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر سوال کیا اور وہ مسکرانے لگی۔

"کل سے ٹیسٹ کی تیاری کر رہی ہوں ممی اور کیا کروں گی؟ آپ کو پتہ ہے میرے چار سال پہلے ہی ضائع ہو چکے ہیں، اس لئے محنت ڈبل کروں گی تبھی تو لسٹ میں نام آئے گا۔"

زہرہ نے کچھ کہے بغیر اس کے کندھے پر یقین سے یوں ہاتھ رکھا، جیسے کہہ رہی ہوں، مجھے تمہاری صلاحیت پر بہت یقین ہے، جیت تمہاری ہوگی......

حارث پھر سے کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی تھی، جب زہرہ نے سلاسر کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ "سلاسر! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز ذرا میرے کمرے میں تو آؤ۔"

بچے اس کے ساتھ اٹھنے لگے تو انہوں نے فوراً منع کیا۔ "نو بیٹا! آپ لوگ پڑھائی کے پاس جائیں گے، مجھے آپ کے ماموں جان سے بہت پرسنل میٹرز ڈسکس کرنا ہیں۔"

بچوں نے برا سا منہ بنایا۔ سلاسر انہیں ہاتھ کے اشارے سے واپس آ کر دوبارہ جوائن ہونے کا عندیہ دیتے ہوئے باہر نکل گیا، پھر زہرہ کے کمرے میں پہنچا تو زہرہ اپنی چیئر پر بیٹھی ہوئی سوچوں میں غلطاں ہوتی جا رہی تھیں۔

"جی ممی! آپ کیا ڈسکس کرنا چاہتی تھیں؟"

زہرہ جمشید نے دروازہ لاک کر دیا، پھر اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔ "تمہارا اردو صحافت کے بارے میں کیا خیال ہے سلاسر؟"

سلاسر ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا، پھر آہستگی سے بولا۔ "ظاہر ہے ممی اردو صحافت کے متعلق میری بھی وہی رائے ہے جو سب کی ہے، بہت غلط راستہ ہے، اس پر چلنے والے اخبار کی کے سوا کچھ نہیں اٹھاتے۔"

زہرہ جمشید کی آنکھیں اس پر آ کر بالکل فوکس ہو گئیں، پھر وہ آہستگی سے بولیں۔ "تمہارا کیا خیال ہے، ہمارے ملک میں اردو صحافت کو دو سیٹ میں کتنے اخبار شامل ہیں؟"

سلاسر نے انہیں دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔ "سیدھی سی بات ہے ممی! اچھی صحافت کے تذکرے یا تو ماضی میں ملتے ہیں یا رائٹرز کی کہانیوں میں۔ ورنہ تو جو شخص عقل اور شعور رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ آج کل اخبار یا تو اسٹیبلشمنٹ کے بل پر چلتا ہے یا بیوروکریسی کے کندھوں پر اپنا بوجھ رکھ کر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اشتہارات، خبروں کا حصول، ہر ایک کی نظر عنایت، یہی پہلی چوائس ہوتی ہیں کسی بھی اخبار کی۔ سو جو ایسے نہیں، وہ اخبار کی اس جنگ سے بچ نہیں پاتے۔ ایک دو کی خبریں اور بہت ساری معمول کے مطابق نہ ہو بھی کرائے پر رہا ہے، اس لئے ٹوٹلی والا کالم صحافت تو آپ کو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔"

زہرہ جمشید کے چہرے سے لگا وہ اس کی قابلیت سے متاثر نہیں ہوئیں کیونکہ ان کا اگلا سوال تھا۔ "سب ہی؟ پھر بھی کچھ اخباروں کے نام صرف اردو صحافت کی شہرت سے جگمگاتے ہیں۔"

ملاسہ نے دو تین نام لیے مگر اب زہرہ جنید اس کے قریب اٹھ کر آ گئی تھیں۔ انہوں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں پھر مسکراتے لہجے میں بولی تھیں۔

"وی آئی" شاید یوسفی صاحب کا انگلش اخبار ہے ناں؟ یہ اس صحافت کا بے تاج بادشاہ ہے۔ ملاسہ! مجھے حیرت ہے، تم نے اس اخبار کا نام نہیں لیا۔ حالانکہ تم تو اس اخبار کے سب کچھ ہو۔"

ملاسہ اور ملالہ نظروں میں جچ گیا تھا۔ وہ اتنی تفصیل سے جاننے کی خواہش سے ہی سمجھ گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ مگر یہ ملاسہ اکلوتی سے بھاگتا تو بھری لگ جاتی۔ زہرہ رحمانی ہونے کی ابھی کچھ گنجائش تو باقی تھی...... مگر یہ اس کی سوچ تھی۔ کیونکہ بیس منٹ تک زہرہ نے جس طرح اس کے قلم کو گیلا تھا اور تنقید کا نشانہ بنایا تھا اس نے اس امکان کو قطعی موت دے دی تھی۔ وہ غصے میں بھری ہوئی تھیں اور نئے سرے سے اس کو ہدف تنقید بناتے ہوئے بولی تھیں۔

"ملاسہ اور ملالہ! پہلے میرے کولیگ تمہارے دوست کہتے تھے تم جھوٹے اور لالچی ہو۔ پیسے کے لیے کچھ بھی کر گزرتے ہو۔ تمہارے لیے اصول کا مطلب بے چارگی کی موت ہے...... مگر میں یہ سب سن کر انکار کر دیتی تھی۔ مجھے لگتا تھا تمہیں ماضی کے غم نے پاگل کر دیا ہے۔ اس لیے تمہارے رویے کا ذائقہ بدل اور کڑوا ہو گیا ہے۔ میں سمجھتی تھی تم اونچے ایوانوں میں کامیابی کے جھنڈے لگا رہے ہو تو یہ تمہارے تجربات ہے کیونکہ کلاس میں سے کوئی ہے جو اپنے حصے کو قرض کی کامیابی کی صورت اتار رہا ہے...... مگر کچھ دنوں پہلے مجھے پتہ چلا کہ اونچے ایوانوں میں تمہاری کامیابی صرف تمہاری بلیک میلنگ کی وجہ سے ممکن ہو سکی ہے۔ انہوں نے اب اس کا کندھا تھام کر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "ملاسہ! تم نے اس کے کام سے بچنے والے لیڈرز سپتال کی زمین بھی دھونس اور بلیک میلنگ سے حاصل کی ہے ناں؟"

ملاسہ نے شفاف آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا، پھر بولا تھا۔ "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کے پاس زمین کے قطعی ثبوت اور اصل کاغذات ہیں۔ پھر! آپ خواہ مخواہ مجھ پر شک کر رہی ہیں۔"

زہرہ جنید نے اب میز پر رکھی فائل اٹھائی تھی، پھر غصے سے بولی تھیں۔ "یہ فائل دیکھو، پورے پانچ کروڑ کا نوٹس مجھے دیا گیا ہے، کیونکہ میں ذاتی اسپتال بنا رہی ہوں۔ تم اندازہ کر سکتے ہو ناں ایک ایسا ہسپتال، جو بھی بنیادیں بنا رہا ہے، اس پر پانچ کروڑ...... رفیع عثمانی کہتے ہیں، حکومت اور صنعت کار برادری کا ان پر پریشر ہے کہ اس کام میں مجھے مدد نہیں دی جائے۔ مگر مجھے لگتا ہے یہ پریشر صرف تمہارے سے سوچ کا ہے ناں؟"

"مگر یہ بھی تو آپ کا کیا جاتا ہے، ہو! آپ آرام کریں ناں، گتھیاں کیوں گن رہی ہیں؟"

زہرہ جنید کہتے میں نچنی رہ گئیں۔ پھر بہت مجبورانے والے لہجے میں بولیں۔ "میرا مقصد کتنا نیک تھا ملاسہ! لیکن تم نے اسے رسوائی سے آلودہ کر دیا۔ میری زندگی کتنی شفاف اور صاف ستھری تھی، میں شارٹ

کتنا ہی وقت لگے میری زندگی میں...... میں نے محنت سے جان تک نہیں بچائی، کبھی پیچھے نہیں ہٹی۔ جنید کے معاملات میں بھی میں نے سچائی کا ساتھ دیا۔ سٹارٹ کٹ یہاں نہیں تھی جہاں لگایا تاکہ سارا سرمایہ ختم جانے کا کہ لیتے، کبھی مجھے میری بے زبانی کا طعنہ دے کر اپنے سوا اپنے عزیزوں کے لئے میں نے اپنے رشتوں کو ان کی راہ کہا ہے مگر۔ ماما ابھی نے...... تم نے میری ساری محنت یا کر دی، یا کاروبار حرام نہیں تھا، پھر تمہارے واحد نے نام رزق کیسے قبول کر لیا؟...... کیسے؟" وہ منہ چھپا کر رونے لگی تھیں۔

ماما سکتے کی کیفیت میں انہیں دیکھ رہا تھا جیسے اس لمحے اگر وہ انہیں تسلی دیتا تو ان کا دل پھٹ کر رہ جاتا۔ سر جھکائے ان کے کمرے سے نکلتا چلا گیا تھا۔

زہرہ جنید جو کہہ رہی تھیں وہ جھوٹ نہیں تھا۔ لیکن یہ ان کی کسی رہائش کی وجہ سے جاری کیا گیا تھا، یہ بھی غلط تھا۔

وہ قرار پا بے شک اپنا اتنا غیر حاضر جیسوں سے دور رہا تھا، جب ماں اپنے بیٹوں سے بیگانہ ہو کے واپس اپنی دکھائی دیں۔

"کہاں جا رہے ہو بیٹے؟"

وہی شفیق لہجہ پکڑنے سے روکا۔ کیونکہ کبھی اسی لہجے میں انہوں نے شہریار کو بھی مخاطب کیا تھا۔ بلکہ ابھی حال ہی میں وہ ان کی زندگی میں پھر کسی دفادار کی طرح وہ ماں کی دعا کیں جب سے ملنی شروع ہوگئی تھیں، اسے لگنے لگا تھا جیسے وہ ماں کی دعاؤں اور محبتوں سے اپنا حصہ پا کر اس گھر میں آگیا ہے۔ اس گھر میں جس کے راستوں پر دروازے بند کر چکا تھا۔

❀❀❀

طلعت جہاں اس وقت بے حد غصے میں ٹہل رہی تھیں۔ ان کی خاص خادمہ بھی انہیں دیکھ رہی تھی۔ "لیکن کب تک یا اختیار جلتے رہیں گی بیگم صاحبہ" "کیا ہو گیا ہے؟ انہیں اتنا غصہ کس بات پر آ رہا ہے؟" طلعت جہاں نے چونک کر یوں دیکھا جیسے وہ ابھی تک خود کو تنہا محسوس کر رہی تھیں اور کسی کی آواز سن کر اب ہوش میں آئی ہوں۔ انہیں کچھ اندازہ تھا مگر جو بات ان کے دل میں چل رہی تھی وہ بات سامنے والی عورت کے حوالے نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ بات جیسے ان کی سب سے لاڈلی اولاد کی طرح تھی، جسے وہ کسی اور کو دینا نہیں چاہتی تھیں۔ سو وہ اسے دل سے لگائے اپنے مخصوص تخت پر آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ کچن کے ہاتھ سے بنی گلوری لے کر منہ میں دبانے سوچنے لگی تھیں۔

"اے بے، وہ ماں جی زلیخا کا کیا حال ہے؟ مجھے تو دوبارہ پوچھنا یاد ہی نہیں رہا۔"

گل ن نے تاسف سے سطوت جہاں کی طرف دیکھا، پھر آہستگی سے بولی۔ "بہت برے حالوں میں ہے نشل۔ وہ ڈاکٹر ایک طرح سے جواب ہی دے چکے ہیں۔ وہ شفور سے کہتی ہے وہ گھر آنا چاہتی ہے۔ مگر سوچتی ہوں وہی ونی بدی واہیات بیماری ہے نشل اپنا ہے تو پرائے اپنے بھی قریب نہیں پھٹکتے۔ اس لئے شفور نے کو کہہ دیا ہے اس کی مشکل آسان ہو جائے تو وہیں کہیں دفنا دینا۔ لاش تک کو بھی لانے کی ضرورت نہیں ہے اس کی۔"

سطوت جہاں نے خاص لاڈ کی نظر سے اسے دیکھا، جیسے وہ اس کے فیصلے سے خوش ہوئی ہوں۔ دونوں کے درمیان باتوں کی چھکا چیک چلنے لگی تھی۔ جاناں بھی باہر سے آ کر ان کی باتوں میں شامل ہو گئی تھی مگر اس کا دھیان بار بار زلفی مائی کی باتوں میں اٹک رہا تھا۔

"آنکھیں کھول کر رکھنا کہ وہ تو بہت ماری ہے۔ مجھے نہیں پتہ، اپنا کتنی چالتر ہے۔ سنبھل کے چل۔ کسی کی بات کا بچے منہ سے کہہ کا پٹی بات کو دھوکا مت دے۔ کسی کی سوچی ہوئی بات کو اپنے دماغ میں پکا پکا کر اس کا زہر دوسرے کے حلق میں مت ڈال۔ بہاندی بے جگہ ہے ہو تو نیا ہو نہیں بکھرے۔"

یہ باتیں اس وقت ہوئی تھیں، جب وہ زلفی اماں کو دیکھنے گئی تھی۔ شفور اس کے پاس بیٹھا کھڑا تھا، آ کھ ہی نہیں رہا تھا۔ پھر وہ کہیں لینے کی بات آ گئی تب وہ اٹھا تھا۔ شفور کے اٹھتے ہی زلفی اماں جو بالا ہو کر کے مری جا رہی تھی، اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ پھر جو کچھ مختصر کیا تھا وہ اسے حیران کرنے کے لئے کافی تھا۔ یقیناً وہ دکھ کو وہ کاروبار کرتے تھے۔ پھر کون ہے جوان جیسے زہر کی بارود کو چھٹ دے جائے۔ ایک دل آ رہا تھا، سطوت جہاں سے ان لفظوں کا ماخذ پوچھے لگر زلفی اماں جس طرح زر زر کے بولی تھی، اس کی وجہ سے اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ وہ مجھ رہی تو ٹھٹھی رہی، پھر ایک تازہ چیک ان کی طرف بڑھا کر بولی۔

"یہ مسٹر مرزا کی محبت کی پہلی قسط ہے ماں! ایسے بہت سے چیک آپ کے ہاتھوں میں آنے کے لئے اس کی جیب میں تڑپ رہے ہیں۔"

سطوت جہاں مسکرانے لگیں۔ وہ اندر کی طرف بڑھتی چلی گئی تو گل ن نے انہیں آنکھ مار کر کہا "تو بڑی سیانی نکلی نشل۔ اللہ جنگ کی یہ چھتری اپر سنی ہے تجھے یہ بچھا لگا ہے تجھے۔"

سطوت جہاں نے مسکرا کر اسے دیکھا، مگر ان کا دماغ ابھی پہلی بات ہی میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے سوچ رہی تھیں کہ اس بات کو برف تلا کی طرح کیسے چھپایا جا سکتا ہے۔ مگر بات پوری سچائی کے ساتھ ان کے سامنے دھری ہوئی تھی۔

❀❀❀

ماما اس وقت کچن میں کھڑی ہوئی کل سے کئی پہلے ناشتہ بنانے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں کہ یکدم کچن کا دروازہ کھلا۔ مسز عبدالرحمٰن کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پہلے آ گئی تھی اور وہ انہیں کمرے میں نہ پا کر انہیں ڈھونڈتے ہوئے کچن تک چلے آئے تھے۔

آپ خیریت ہے آج کچن میں؟ اور وہ بھی اس وقت؟"

"وہ میں شہری کے لیے ناشتہ بنا رہی تھی۔"

"کیا کہا آپ نے کس کے لیے ناشتہ بنا رہی تھیں؟" مسز عبدالرحمٰن کا چونکنا جائز تھا وہ بوکھلا گئیں مگر سنبھالا لے گئی تھیں۔

"کیوں، میں کیا شہری کے لیے ناشتہ نہیں بنا سکتی؟" وہ مسکرا کر بولیں۔ "آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے وہ میری اولاد ہی نہ ہو۔"

"بیگم آج سورج کس سمت سے نکلا تھا بیگم! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں دن میں خواب دیکھ رہا ہوں جو آپ کہہ رہی ہیں۔ چٹکی کاٹو یہ خواب ہے تب بھی میں چاہوں گا کہ میری آنکھ کبھی نہ کھلے۔"

"رحمٰن صاحب! آپ بھی نا....." ماما نے ناشتہ سے منہ رکھا تھا پھر رات کی اس کی بے احتیاطی اور ساری رات کی طبیعت کی خرابی کی تفصیل بتانے لگی تھیں۔ پاپا الٹے قدموں ہی لوٹ گئے تھے۔ ماما اس کے لیے گرم چینی والی چائے اور براؤن بریڈ کا ناشتہ لے کر جا رہی تھیں۔ مسز عبدالرحمٰن کا زندگی بھی تقریباً اس سے ملتا جلتا تھا۔ وہ ڈے کے لیے باہر نکلیں۔ گول کوریڈور میں سے گزرتے ہوئے لاک سے واپس آتے ہوئے جازی پر نظر پڑی تو انہوں نے اسے روک کر کہا۔

"جازی! یہ ٹرے شہریار کے روم میں لے کر چلو۔"

جازی کسمسا کر بچنا چاہتا تھا مگر جانتا تھا ماما کو منع کرنا مشکل ہے۔ اس لیے سر جھکائے وہ شہریار کے کمرے کی طرف بڑھ گیا، جہاں کبھی نہ آنے کی قسم کھائی تھی۔ حالانکہ کل کافی رات تک وہ اس کی بد احتیاطی کی وجہ سے پریشان بھی رہا تھا۔ لیکن غصہ اپنی جگہ گرم کی جو محبت دل میں گھر کر گئی تھی وہ ایک دم سے دل سے نکالا نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے دروازہ ناک کیا۔ پاپا صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ دی تھی۔ ماما نے ٹرے سے مسز عبدالرحمٰن کو دیکھا تھا۔

"آپ نے ابھی تک اسے اٹھایا نہیں۔"
مسز عبدالرحمن نے الوہی مسکراہٹ سے انہیں دیکھ کر کہا۔ "نہیں عالیہ! میرا دل نہیں چاہا کہ میں اس کی اتنی پیاری نیند خراب کروں سارا دن اور پھر آنکھ کھلتے ہی یہ پوچھتا ہے کہ ممی کہاں رہ گئی؟ اٹھے گا اور بس لگ جائے گا۔ یعنی میں اسے اپنی پرواہ کب دیکھتی ہے؟"
جازی عبدالرحمن کی باتیں تعریفوں کے پل کے دنوں میں شہریار کی بات کو ہنس کر ٹالنا عجیب سا لگا۔ معلوم نہ ہوا تھی۔ وہ ان کے دروازے کی طرف قدم بڑھا رہے تھے جیسا کہ ممی کوئی اہل ممکن ہماری نکل جائے۔
ممی، مما نے جسٹ سوچا پاس کا بیان! کام بتاتے ہوئے جازی کہا تھا۔
"جازی بھائی کو اٹھاؤ۔" جازی عبدالرحمن نے مسکراتے ہوئے بابا اور دروازے سے لوٹ کر شہریار کے بیڈ کے قریب آ گیا۔ ویسے اسے حیرت ہو رہی تھی کہ شہریار نیند کا جیسا ہوشیار تھا اتنی بات چیت کے باوجود ابھی تک کیوں نہیں کسمسایا تھا۔
"شہری بھائی! اٹھیں۔ مما ناشتے پر بلا رہی ہیں۔" اس نے نہایت بلند سے اس کا شانہ ہلایا۔ سر سے لے کر پیر تک ایک سنسنی سی تھی جو پھیلتی چلی گئی تھی۔
"شہری بھائی!..... شہریار بھائی!" اس بار اس نے گھبرا کر بہت سختی سے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ شہریار نے کسمسا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ اسے اپنی خود ... پہلے کی حرکت پر ہنسی آنے لگی تھی۔
"کیا ہے؟" شہریار نے غنودگی بھرے لہجے میں پوچھا۔
"مما..... ناشتہ....." اس نے مختصر سمجھایا۔
شہریار اب بھی نیند کے خمار سے نہیں نکلا تھا اتنی گہری نیند شاید ہی وہ کبھی سویا ہوگا۔ مما اس کی طرف سے جواب نہ پا کر اب خود اس کے قریب آ گئی تھیں۔
"اٹھو شہریار! ناشتہ نہیں کرنا ہے کیا؟ دیکھو، ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں۔"
شہریار نے بند آنکھیں پھر سے کھول کر مما کو دیکھا۔ کل رات کی بات جیسے اس کے دماغ میں خواب کی طرح محفوظ ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت حیرت سے مما کو گھور رہا تھا۔

AANCHAL.COM.PK

"ماما! آپ......؟"

"ناشتہ ٹھہریار! چلو جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آؤ ورنہ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔" قریب ہی سے پاپا نے اپنے کپ میں چائے انڈیلی تھی۔

ایک نظر ماما کو دیکھ کر دوسری نظر پاپا پر جا کر ٹک گئی تھی۔ جازی عبدالرحمن! بالکل کھڑا تھا۔ حالانکہ وہ فوری طور پر جانا چاہتا تھا۔ جانے کس بات نے اس کے قدم روک لیے۔ کیا وہ ان کی خیر، بہت فرسٹ رپورٹ لینا چاہتا تھا؟ اس نے دل سے سوال کیا، جواب ندارد پایا۔ اس نے اب بھی اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"ماما! آفس میں آج نہیں جا سکوں گا شاید۔"

"کون کہہ رہا ہے دفتر جاؤ۔ بیٹھو ناشتہ کر لو بیٹا!"

جازی کے دل میں پھر سے ہلچل ہونے لگی تھی۔ کیا محبت زیادہ شاداب ہے؟ وہ پوچھنا چاہتا تھا جبکہ ٹھہریار پاپا کے سامنے رکھے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ پاپا نے بہت سے اس کی حرکت دیکھی تھی مگر ٹھہریار نے محبت کا اظہار کرنے کی کبھی ضرورت نہیں محسوس کیا تھا۔ وہ بچپن ہی سے ماما کا سہارا لے کر اٹھا تھا۔ اسے اپنے استعجاب پر بہت ہنسی آ رہی تھی۔ وہ جب آیا تھا تو اس سے بھی زیادہ بری حالت کے باوجود دوسرے دن دفتر کا قصد کرتا تھا اور آج صبح ہی سے نیم طبیعت کی خرابی پر اس کا جسم اس کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔

"محبت طاقت ہوتی ہے یا کمزوری؟" دل نے سوچا اور کہیں اندر سے جواب دیا۔

"تپتے ہوئے پیاسوں کو بوند بھی مل جائے تو اس سیرابی کے جھونکے سے بھی ان کی سانس اکھڑ جاتی ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے بیٹا! آپ اتنے کمزور تو پہلے کبھی نہیں تھے۔" ماما کی بھی اس کے ان دو بے سے رنجیدہ ہونے لگی تھی۔

اس نے ٹوک کر کہا۔ بہت کو ٹھہریار نام بھی آتی۔ ہر حالت میں نہیں ہو گا مگر صاحب نے ساتھ ہی نہیں دیا تھا۔ پاپا ایک دم گھبرا کر اس کے قریب آ گئے تھے۔

"جازی! بھائی کا ناشتہ یہیں لے آؤ۔"

ماما نے اور حکم دیا۔ وہ جھنجلا کر چلا ہے لے۔ ماما ایک دم چلا اٹھیں۔ پاپا اور ماما نے ایک ساتھ ناشتہ کیا تھا۔ بلکہ آج انہوں نے کم کھایا تھا، اسے زیادہ کھلایا تھا۔ اس نے لاکھ انکار کیا مگر ایک نہیں مانی گئی۔ جازی

نے پہلے کے مقابلے میں چہرے پر رونق دیکھی تو فوراً اٹھ کر چلا گیا۔ ماں نے اس کی پشت کو دیکھا اور سوچا۔

جاذب! کیوں تم اتنے ظالم ہو۔ دل کبھی کبھی یہ نہیں پاتے کہ تمہیں میری پروا ہے۔ میری تکلیف سے تمہاری سانس رکنے لگتی ہے۔ مگر چند لمحوں پر محبت نے کھونے میں فخر کا مزہ کیوں کھاتے۔ جب تک محبت کھو نہ دو تب تم ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ تم کس سے محبت کرتے تھے۔ وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔ ماما نے ملازم کو اشارہ کام سے کیک کاٹنے کے لیے ڈرائنگ روم لے جانے کا حکم دیا پھر زری سے بولی تھیں۔

"تم نہا دھو کر فریش ہو جاؤ تو میں تمہیں ڈاکٹر عمرانی کے کلینک پر لے جاؤں گی۔"

"آپ مجھے کلینک لے جائیں گی؟" وہ ہنس دیا۔

ماما نے منہ بنایا۔ "کیوں، میں ایسا کیوں نہیں کر سکتی؟ کیا میں بری ڈرائیور ہوں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا پھر مسکرا کر بولا۔

"مجھے آپ کی ٹینشن پر ہنسی آ رہی ہے ماما!" کچھ دیر کو رکا، پھر آہستگی سے بولا۔ "میں نے کل رات آپ کو بہت پریشان کیا آپ کو محسوس ہوا ہوگا جیسے بچپن سے لے کر اب تک کی ساری کسر نے کی حسرت نکال لی میں نے۔"

ماما کچھ نہیں بولی تھیں۔ اس کا گال تھپتھپا کر باہر چلی گئی تھیں۔ ان کے جاتے ہی اس نے موبائل کی طرف نظر کی تھی۔ موبائل آف کر رکھا تھا اس نے موبائل آن کیا تب پھر بھی موبائل میں زندگی نہیں دوڑی۔ کل ہاتھ سے چھوٹ کر موبائل ماربل کے فرش پر اس کی طرح بہت زور سے گرا تھا۔ شاید بیٹری نکل گئی ہوگی۔ اس نے کھولنے کے لیے سوچا تھا پھر بیڈ سے پیر اتارے ہی تھے کہ یکدم اس کے کمرے کا ٹیلیفون بجنے لگا۔

"صبح ہی صبح کون ہے؟" آج وہ بالکل آرام کرنے کے موڈ میں تھا۔ فون اٹھانا مجبوری تھی۔ دوسری طرف حافظ کی آواز سن کر اس کے اندر ٹھنڈے میٹھے احساس نے جنم لیا۔

"تم...... خیریت! رات کو سو بھی نہیں سکا تھا ٹیلی فون پر جھانکتا رہا تھا؟" وہ اٹھتے اٹھتے پھر لیٹ گیا تھا۔ دوسری طرف حافظ بیگ گرا رہا تھا۔

"کیا ہے یار تیرے موبائل کو کیا ہوا ہے؟ کل کئی دفعہ تجھے کال کر رہا ہوں، پہلے بیل جا رہی تھی پھر پاور آف کر دیا۔ تجھے پتہ نہیں ہے، میں نے رات کتنی پریشانی میں گزاری۔ تو نے ایسا کیا کیا تھا؟"

اس نے ریسیور کان سے لگا کر اس کی ساری بیزاری اپنے دل میں اتاری پھر نرمی سے بولا۔ "تھوڑی سی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔"

"تھوڑی سی طبیعت...... کیوں، کیا ہوا تھا؟" وہ تفصیل لینے لگا اس نے کل کی تفصیل بتائی تو اس نے سر پیٹ لیا۔ "احمق اعظم! کیوں اپنے دشمن بنے ہوئے ہو؟" لمحہ بھر کو رکا، پھر تحکم سے بولا۔ "آج ہی فرصت میں انکل صمدانی کے کلینک جاؤ۔ مجھے آنا ہو تو تھوڑا وقت لگ رہا ہے۔ اگر نہیں گئے تو شام کی فلائٹ سے کراچی آرہا ہوں میں۔"

شہریار نے فوراً سے ٹوک دیا۔ "تم ادھر کراچی مت آنا۔ میں ڈاکٹر صمدانی کی ڈیوٹی بجالوں گا۔"

حافظ بیگ نے قہقہہ لگایا پھر خفگی سے بولا۔ "بہت بری بات ہے شہری! ولایت کی آمد پر ایسا رسپونس۔ یہ تو وہی بات ہوگئی کہ شرارتی بچہ کراچی بھیجا گیا اور خط آنے پر جواب لکھا گیا۔ "آپ کا بیٹا اب کراچی بھیج دیں، ہم آپ کا بچہ واپس ڈی پورٹ کر رہے ہیں۔" یعنی بالکل ہی لاحول ولاقوۃ۔"

شہریار نے زور سے قہقہہ لگایا مگر اس قہقہے ہی میں وہ برہم ہوگیا۔ کتنی ساعتوں تک اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ دوسری طرف حافظ کی پریشانی شہریار محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے نرمی سے کہا۔

"میں تمہیں خود فون کرتا ہوں، اس وقت ماما میرا انتظار کر رہی ہیں حافظ!"

حافظ بیگ رابطہ منقطع نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اس کے جھجکنے کی وجہ سے اسے رابطہ منقطع کرنا پڑا۔

وہ فون رکھ کر بستر پر لیٹنے کو تیار تھا۔ یہ وہ بات تھی، بہت ہمت مجتمع کر کے اس نے یہ کام کیا تھا۔ سوچ کر سے بدل کر باہر آیا تو چولہے پسینے میں شرابور تھا۔

"چلو شہریار! لگتا ہے والدہ کی تمنی شروع ہوگئی ہے خطرے کی گھنٹیاں بہت تیز تیز بجنے لگی ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود کو دیکھا تھا پھر موبائل جیب میں ڈال کر والٹ اٹھائے وہ ڈرائنگ روم میں آیا تھا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی سب سے پہلی نظر دانیہ پر پڑی تھی۔ شاید ماما نے اس کی طبیعت کی بابت اسے بریف کیا تھا، کیونکہ اس کا چہرہ بجھا بجھا اترا ہوا تھا۔

"چلیے ماما! میں تیار ہوں۔" اس نے دروازے کو تھام رکھا تھا۔ وہ اب بھی سینے میں بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے کوئی شوریدہ سمندر کہ سب بہالے جائے مگر اس نے استقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ ماما اور وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ دانیہ اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ جازی کے برخلاف شہریار کی طبیعت کا سکون کراچی کا پورا گھر سے نکل ہی نہیں سکا تھا۔ اس وقت بھی وہ سامنے کے مرر میں اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ شہریار اس کی نظروں کے حصار سے واقف نہیں تھا لیکن اس وقت وہ کوئی رد عمل دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

وہ کلینک میں آ چکے تھے مگر ڈاکٹر سمدانی ابھی تک نہیں آئے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ان کی کار باہر آ کر رکی تو ولیہ تیزی سے باہر نکلی تھی۔

"خیریت ہے ولیہ؟" ڈاکٹر سمدانی نے اس کی شکل دیکھتے ہی سوال کیا اور وہ مدھم لہجے میں بولی۔

"بھائی...... مجھے بھائی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی ہے انکل!"

ڈاکٹر سمدانی نے اپنے کمرے میں جاتے ہی سب سے پہلے اسے بلایا تھا۔ پھر اس کا مکمل چیک اپ کرنے کے لیے انہوں نے ولیہ اور ماما کو باہر رکنے کا اشارہ کیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بولے۔

"آپ کیا مزے سے بے احتیاطی بیٹھا ایسے ہی ڈکٹیٹ کر رہے ہیں۔" وہ کچھ نہیں بولا اور وہ اس کے سر پر کھڑے ہو کر بولے۔ "کل ایک وزٹ میں میری ڈاکٹر نواز سے بات ہوئی تھی۔ وہ کسی مریض کا کیس تجربے کی بنیاد پر میری رائے لینے کے لیے بیان کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا مریض کی عمر اتنی نہیں ہے لیکن اندرونی طور پر وہ بہت تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ اس کا واحد حل آپریشن تجویز کیا گیا ہے۔ مگر مریض اتنا مصروف ہے کہ وہ آپریشن کے لیے بھی ٹائم نہیں نکال سکتا۔ سو وہ مجھ سے کہا تھی دواؤں کے متعلق میرا کل بحث کر رہے تھے کہ اس کیس کو کس کی فرصت تک سنبھالا جا سکے۔"

شہریار محمود نے انہیں دیکھا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر ناپسندیدگی اتر آئی۔ "ڈاکٹر نواز نے ڈاکٹری اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے۔ یہ بہت بری مثال ہے کہ ایک مریض کا کیس کسی وزٹ میں ڈسکس کیا جائے۔"

ڈاکٹر سمدانی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ پھر دلسوزی سے بولے۔ "اس کا مطلب ہے میرا شک درست نکلا۔ تمہیں آپریشن ہی تجویز کیا گیا ہے۔"

وہ اس اچانک حملے سے گڑبڑا گیا تھا۔ "کیا ڈاکٹر نے بیپ کیا گیا ہے؟" اس نے سوچا اور وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے۔ پھر نرمی سے بولے۔

"پچھلی دفعہ جب تم ہاسپٹل آئے تھے تمہارے والٹ سے کچھ کاغذات نکلے، جن میں صرف دواؤں کے نام تھے تمہارا نام نہیں لکھا تھا۔ شاید یہ تمہاری احتیاط پسندی کی وجہ سے تھا۔ ورنہ دواؤں کے ساتھ ہمیشہ مریض کا نام اور عمر ضرور درج کی جاتی ہے۔ ان پرچیوں میں لکھی ہوئی کچھ دوائیں ڈاکٹر نواز کے کلینک کی تھیں اور کچھ باہر کی لکھی گئی تھیں۔ وہ نسخہ جات تمہاری فیملی سے جان پہچان کی وجہ سے ڈاکٹر سہیل نے بھیجے تھے۔ ڈاکٹر نواز کے دستخط کے ساتھ دواؤں کی بائی پوسٹ بتاتی تھی کہ معاملات بہت گڑبڑ ہیں۔ مجھے شک ہوا تھا اس لیے تم سے دواؤں کے نام اگلوانے کے لیے میں نے سخت جان ماری کی تھی۔ مگر تم نے اس دن بھی ٹھیک دواؤں کے نام نہیں بتائے تھے۔ دو تین گولیوں کے نام چھپا گئے تھے۔ جانتے تھے مجھے معلوم ہونے کی صورت میں کیس ہسٹری کی جڑ تک چلا جاؤں گا اور تمہارے لیے بہت پرابلم کریئیٹ ہو جائے گی۔ وہ تو تمہاری قسمت تم سے زیادہ اچھی ہے کہ ساری عاقبت نااندیشی کے باوجود تم مرے نہیں۔"

کچھ لمحوں کے لئے انہوں نے سانس لیا، پھر اسی غصے سے بولے۔ "پہلے بھی تمہاری جو حالت تھی وہ صرف انجائنا تک محدود نہیں رہ رہی تھی مجھے لگ رہا تھا کچھ نہیں ہو رہا ہے اور اب دیکھا وہ کچھ نہیں ہوا کیسے پھر سے ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔"

وہ خاموش ہو کر اس سے طبیعت کی تفصیل لینے لگے۔ پورا قصہ سنتے سنتے ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ پھر جب وہ اپنی بے ہوشی کے معاملے پر پہنچا تو انہوں نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔

"کیا ہوا؟ آپ گھبرا کیوں رہے ہیں؟"

ڈاکٹر ہمدانی نے اسٹیتھو اسکوپ اٹھایا اور اس کا بلڈ پریشر چیک کرنے لگے۔ اس سے فارغ ہو کر اس کی نبض کا اتار چڑھاؤ دیکھنے لگے۔ اس کام سے فارغ ہوئے تو ان کی پوری توجہ اس کی طرف ہی تھی۔ آنکھوں میں بے طرح غصہ تھا۔

"پلیز انکل! آپ کس بات پر غصہ کر رہے ہیں مجھے بتائیں گے؟"

انہوں نے ایک لمحے کے لئے اس کی طرف دیکھا تھا اور بولے تھے۔ "تمہارا بلڈ پریشر جس خطرے کی طرف اشارہ کر رہا ہے تم جانتے بھی ہو وہ کیا بات ہے؟"

"آپ بتائیے، میں سننے کے لئے تیار ہوں۔" اس نے نرمی سے پوچھا۔

وہ مرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "تم جیسے بلڈ پریشر کا شکار کیا جاتا مجھ سے بے خبری، وہ ایک بہت ہی مائلڈ اٹیک تھا۔"

"مائلڈ اٹیک..... لیکن انکل! میں نے تو سنا ہے پہلا اٹیک بھی مائلڈ اٹیک نہیں ہوتا۔"

"ہاں عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن تمہارے کیس میں یہ نئی دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر چہ اٹیک بہت معمولی سا ہوا اور اس کی وجہ سے دل اپنی کارکردگی میں تھوڑا سا تعطل لے لیتا ہے تو بے ہوشی فطری بات ہے۔ لیکن آٹو کریکشن کے طور پر اگر دل بیشتر کے ذریعے اس تعطل کی رکاوٹ کو دور کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اٹیک کی بے ہوشی کسی طبی امداد کے بغیر خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن تم سمجھ سکتے ہو کسی بڑے اٹیک سے پہلے جس طرح چھوٹے چھوٹے اٹیک آتے ہیں یہ بھی انہی میں سے ایک تھا۔ تمہیں معلوم ہے ہارٹ اٹیک کب اور کیسے ہو جائے، کیا پتہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ شہریار! اگر اب بھی تم نہیں سنبھلے تو آئندہ آنے والا اٹیک صرف چند سیکنڈ میں تمہاری زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ تم مجھ سے وعدہ کرو اس بات کا......"

AANCHAL.COM.PK

شہریار نے آہستگی سے جھکا ہوا سر اٹھایا پھر قدرے اعتماد سے بولا۔ "کیا آپ ریٹائرمنٹ کے بعد میری زندگی کی گارنٹی دے سکتے ہیں انکل؟"

"زندگی کی گارنٹی تو شاید کوئی نہیں دے سکتا شہریار!" انہوں نے بے بسی سے اسے دیکھا تو وہ مدھم ہو کر بولا۔

"پھر انکل! زندگی کی گارنٹی جس کے پاس ہے ہمیں اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے نا۔ دیکھئے بہت سے ادھورے کام ہیں میرے، انہیں نمٹائے بغیر میں اس رسک میں نہیں پڑنا چاہتا۔ بس ہو سکے تو مجھے ابھی دعا دیجئے گا مجھے جو میرے کاموں کے پورے ہونے تک میرا ساتھ دے سکیں۔"

"تم آگ سے کھیل رہے ہو شہریار! میں عبدالرحمن سے اس سلسلے میں بات کر لوں گا۔ تمہیں نہیں پتہ تمہاری کنڈیشن عبدالرحمن کے مقابلے میں بھی زیادہ خطرناک ہے اگر بروقت علاج نہ ہوا تو پھر کرتے رہنا کچھ بھی نہیں رہ جائے گا۔" ڈاکٹر صمدانی واپس اپنی کرسی کی طرف بڑھ رہے تھے، تب اس نے ان کا بازو پکڑ لیا تھا۔

"میں نے کبھی کوئی ضد نہیں کی انکل! آپ سے کبھی کوئی فرمائش بھی نہیں کی اس لئے پلیز! زندگی میں پہلی بار آپ سے زبان بندی کا عہد فرمائش کے طور پر مانگ رہا ہوں۔ پرامس، تمام عمر پھر کبھی کوئی فرمائش نہیں کروں گا۔"

"کسی فرمائش کے قابل بچو گے تو کرو گے ناں۔" ڈاکٹر صمدانی نے غصے سے بھنا کر کہا۔

لیکن شہریار ان کی زبان سے سمجھ گیا تھا کہ وہ اب اس بات کا عہد کر چکے ہیں اور عہد میں وہ بھی اسی کی طرح پکے تھے۔ ڈاکٹر صمدانی اس کے لئے نئی بائی پاس کی گولیاں تجویز کر رہے تھے۔ وہ انجکشن بھی بازو میں اتار رہے تھے۔ سو جب دروازہ کھلا تو بابا اور اماں کے چہرے آدھے گھنٹے کی اس جانگسل چیک اپ کی وجہ سے بالکل اتر گئے تھے۔ اب وہ دونوں بھی کمرے میں آ چکی تھیں۔ شوگر میں پہلا نمبر انہی کا تھا اس لئے انہیں تسلی بھی تفصیل سے بات ہو سکی تھی۔ اماں نے تفصیل پوچھی تھی اور ان کی جگہ شہریار نے لیا تھا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے اماں! بس معمولی سی تکلیف تھی۔ شاید مسکولر پین تھا۔ اب برداشت دل کی تکلیف ہی ہو یہ ضروری تو نہیں ہے۔"

انجکشن سے طبیعت میں واقعی بہتری آئی تھی اس لئے وہ بہت فراوانی سے جھوٹ بول رہا تھا۔ ڈاکٹر صمدانی صرف اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ ایک فرضی نسخہ بھی لکھا گیا تھا جو اماں نے لے کر بیگ میں رکھ لیا تھا۔ پہلا نسخہ وہ کوٹ کی جیب میں دروازہ کھلنے سے پہلے ہی رکھ چکا تھا اس لئے گھر آ کر طبیعت بہت حد تک معمول کے مطابق تھی۔

"ماما! میں آفس جا رہا ہوں۔"

"پاگل ہو گئے ہو، صمدانی بھائی نے ریسٹ کا کہا ہے بیٹا!"

"نہیں ماما! اب طبیعت بہتر ہے، اس لیے میرا نہیں خیال، مجھے گھر میں رک کر آرام کرنا چاہیے۔" وہ کہتا ہوا باہر نکلا۔ ڈرائیور نے ساتھ چلنے کی فرمائش کی مگر اس نے ہمیشہ کی طرح ساتھ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر وہ آفس میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک بہت غیر متوقع شخص اس کے آفس میں جبران کے منع کرنے کے باوجود اندر گھس آیا تھا۔ اس نے آتے ہی بے طرح مخاطب کیا تھا۔

"تم......" اس نے بہت مدھم سا پوچھا اور اس کی جگہ جبران منمنایا۔

"میرے منع کرنے کے باوجود آ گئے ہیں، اس میں میری کوئی غلطی......"

اس نے ہاتھ کے اشارے سے جبران کو روکا، پھر نرمی سے بولا۔ "اٹس او کے، یہ میرے بہت اچھے دوست ہیں، آپ باہر جاؤ، ان کے لیے اچھی سی کافی بھجواؤ۔"

"میں کوئی نہیں پیتا۔" اس نے اسی روڈ سے لہجے میں کہا۔

جبران نے اس کی طرف دیکھا۔ "آ جاؤں یا نہیں آؤں؟" کا سوال اچھالا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے جبران کو جانے کا اشارہ کیا۔ جبران کے جاتے ہی وہ مدھم سی نرمی سے بولا۔

"تم اپنے غصیلے پن میں کبھی نہیں بدلے۔ ہمارے گروپ کے سب سے معاملہ فہم انسان تھے۔ مگر آج اتنے بہت کے......"

وہ اسی طرح کینہ توز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کبھی تم آنے کا جوابی طعنہ کیوں نہیں کر سکا تھا۔

شہریار نے اس کا چہرہ دیکھا، پھر اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا، اسے کندھوں سے تھام کر بولا۔ "پہلے بیٹھو تو۔ کھالو، تحمل آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اتنے سالوں بعد میں تمہیں اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے جی بھر کر دیکھنے تو دو۔"

وہ اسے اجنبی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے بیٹھ چکا تھا۔ کافی دیر لگی تھی اسے اپنے غصے کو گراف نیچے لانے میں۔ پھر وہ جتاتے لہجے میں بولا تھا۔

"تم زبیر مجھ سے ایک ہفتہ پہلے ملے تھے؟"

شہریار نے سر ہلایا۔ یعنی پول کھل گیا۔ تو ارادتاً نہیں تھا۔ سامیہ نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا کر کہا تھا۔

"ہاں، یہ ٹھیک ہے، میں زہرہ جبیں سے اس مہینے کافی مرتبہ ملا ہوں۔ لیکن یہ قطعی ان کے پاگل کے کام میں ان کا ہاتھ بٹانے کی نیت سے تھا۔ تم بتاؤ تمہیں کس بات پر غصہ آیا ہے، زہرہ جبیں سے میرے ملنے پر یا......؟"

سامیہ ارسلان نے پیپر ویٹ کو پوری قوت سے گھمایا تھا، پھر اسی ٹون میں بولا تھا۔ "یہ تمہاری غریب پروری کا بخار اتر کیوں نہیں جاتا؟ کیا تمہیں ہم سے بہتر حاشیہ بردار نہیں مل پا رہے ہیں! اب تک جو ہماری جان سے چمٹے ہوئے ہو؟ آخر کب تک تم میری سادگی پسند ماں کی محبت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے رہو گے؟ ہماری زندگی جینے کا اتنا شوق ہے نا، تو چھوڑ دو یہ عالیشان دفتر، گھر، گاڑی، اچھے کریڈٹ کارڈز۔ پھر میں دیکھتا ہوں، تمہیں ہماری زندگی جینا کتنا دلکش کام لگتا ہے۔ دو دن میں بھاگ جاؤ گے۔ لیکن دولت کے بل پر درویشی کا تمسخر اڑانا بہت آسان ہوتا ہے، جینا زیادہ مشکل۔"

شہریار اسے تحمل سے دیکھتا رہا، کچھ بولا نہیں تو سامیہ نے جھکا ہوا سر دوبارہ اٹھا کر اسی نفرت و حقارت سے کہا۔ "تم دولت مند لوگ جو کچھ کرتے پھرتے ہو کیا وہ ایمانداری ہے؟ وہ بزنس ہوں یا دولت کے کام ہوں یا پھر خیرات، تمہارے کون سے کام میں سچ ہوتا ہے؟ ہر چیز میڈیا پر چھانے کی، ہوس کی طرف قدم اٹھانے کا نام ہے۔ لیکن جب یہی کام ہم مڈل کلاس لوگ کریں تو تم لوگوں کو اصول، صداقت اور ایمانداری کے بخار چڑھ جاتے ہیں۔ ہاں، میں کرتا ہوں زرد صحافت، تمہیں اس سے کیا تکلیف ہے؟ تم جو ہر گلی سے تو تمہاری غلطیوں پر پایا جاتا ہے۔ سوچنا تو تمہیں چاہیے نا کہ غلطی یا تو کرو مت یا کرو تو ثبوت مت چھوڑو۔ ثبوت چھوڑو گے تو ہم تو چسکا لیں گے ناں۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔" شہریار اس کی اتنی طویل گفتگو کے بعد اب بات کی تہہ تک پہنچا تھا۔ کیونکہ وہ جتنی مرتبہ زہرہ جبیں سے ملا تھا اتنی ہی دفعہ اس نے انہیں سامیہ کے کچے کرتوت بدل لینے پر اس کے بارے میں صحافتی برادری میں پھیلی ہوئی شہرت کے قصے سنائے تھے۔ وہ دل سے یہی چاہتا تھا کہ وہ ان کی بات مانتے، اس لیے اس سے وہ کہتی کہ جہاں کے قلم کی قسم تھی وہ اسے نبھائے اور سوچنے کی کہا اور اب معاملہ اتنا دھماکے دار انداز میں اس کے سامنے تھا۔ یقیناً زہرہ جبیں نے اس کے ساتھ اس مسئلے پر میٹنگ کی تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہو ایسے جیسے کسی بھی معاملے میں تمہارا ذکر غیر ضروری ہو گیا ہے۔ وگرنہ تم تو بالکل بات کا لڈو۔"

اس نے بہت جوش سے یہ تنقید کی تھی۔ کیونکہ اس جملے سے وہ اس کے کیس کی طرف رخ گیا تھا۔ پتہ نہیں خود سامیہ کا بھی یہی ارادہ تھا یا نہیں، لیکن دل میں اچانک جبر سے چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں۔

"تم بس یہی طعنہ دینے کے لیے آئے تھے؟"

"نہیں..... ایک اور بات بھی ہے، جس پر تمہارے کمنٹس چاہئیں۔" لہجہ استہزاء سے بھرپور تھا جیسے وہ یہ جتا رہا ہو "تم کسی گنتی میں نہیں ہو میری۔ تم سے بات کر رہا ہوں تو یہ میرا ظرف ہے اور تمہاری خوش قسمتی اور بس۔"

"کیا بات ہے؟" اس نے حوصلے سے اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے نرمی سے سوال کیا اور وہ طنز سے بولا۔

"تمہاری بیوروکریسی میں یہی خامی ہے، جو تمہارے سامنے سر اٹھائے یا تم سے سوال کرے تو اس کو خرید لیتے ہو یا اس کا سر کاٹ دیتے ہو یا پھر بزور طاقت اس کا سر جھکا دینے پر کمربستہ ہو جاتے ہو۔ تم سے برداشت ہی نہیں ہوتا کہ عام عوام میں سے کوئی اٹھ کر تم سے سوال پوچھنے کی جسارت کرے۔"

شہریار نے طویل سانس لی، پھر گمبھیر لہجے میں بولا۔ "یہ تم عام عوام اور مڈل کلاس کا طعنہ کس کو دے رہے ہو؟ کیا واقعی اب تم مڈل کلاس میں رہ گئے ہو؟ سلامہ! تم جھوٹ بولنے کے اتنے عادی ہو گئے ہو کہ اب تم اس سچ کا سامنا بھی کرنے کی ہمت نہیں پاتے ہو خود میں کہ جس طبقے کو تم ذلیل کرتے تھے اسی طبقے نے تمہیں خود میں سے نکال کر باہر پھینک دیا ہے۔ تم بہتر ہے … مگر یہ جان لیتے کہ دولت کسی کی برائی یا اچھائی کا پیمانہ نہیں ہوتی ہے۔ خود غرضی کسی کی اجارہ داری کی پکی مہر سا جتے ہے، لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں، تم میں بھی ہیں، ہم میں بھی ہیں۔ مگر حوصلہ تو کرو یہ اعتراف کرنے کا کہ ہاں تم نے یہاں غلطی کی ہے۔" شہریار لمحے بھر کو رکا پھر اسی نرمی سے بولا۔ "میرے دفتر میں کام کرنے والوں کی اکثریت مڈل کلاس سے تعلق رکھتی ہے لیکن ان میں تمہاری طرح کا خود ساختہ خوف اور احساس کمتری نہیں ہے اپنی کلاس کے بارے میں۔ وہ جو ہیں اس میں خوش ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں خوشی دولت سے نہیں خریدی جا سکتی اور رہی عزت تو وہ دولت سے خرید کر بہت زیادہ دن نہیں چلتی۔ لوگ پیچھے پیچھے آپ پر فقرے ضرور چست کرتے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے تمہارے کولیگ تمہیں کیا کہتے ہیں؟"

سلامہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اسی نرمی سے بولا۔

"تمہارے کولیگ تمہیں ذہنی پاگل قرار دیتے ہیں جو اپنی ویلیوز پر شرمندہ رہتا ہے، جسے اپنی کلاس پر فخر نہیں شرمندگی ہوتی ہے، اسی کلاس پر جس پر وہ کبھی بھی فخر کرتا آیا کرتا تھا کہ دولت مند نہیں، مگر انسان ہونے کا فخر اس کے پاس بھی ہے، اسے بھی خدا نے اتنا ہی ذہن دیا ہے جتنا کسی امیر زادے کو، بلکہ اس کے پاس ذہانت کسی آسائشات کے بغیر تھی جو ٹینٹ میں رہنے والے امیر زادے سے کہیں زیادہ

ہے۔ وہ زندہ ہے۔ اس لیے نہیں کہ سانس لیتا ہے بلکہ وہ زندہ ہے، کیونکہ سوچنے کو زہر اسے بخشا گیا۔ وہ جو غرور کرتا تھا کہ اسے قارون اور فرعون کے خزانوں سے بھلے کچھ لے نہ ملے لیکن وہ تم کے حس ٹوٹا نے کو ہیرو کا ہے، وہ ساتوں دنیاؤں کے درجے کا تک ہے۔ پہلے والا۔" سلامہ جانتا تھا لیکن تم نہیں جانتے تم سب تو دل لگے ہو۔ سب کچھ۔"

سلامہ سارا ان کچھ نہیں بولا تھا کافی آ چکی تھی۔ وہ کافی پی رہا تھا کہ اس نے نئے سرے سے شہریار کی کوتاہی کی کوشش کی۔ "تم نے لون کے سلسلے میں جو ملنڈ کیا ہے کیا وہ اچھی بات ہے؟"

شہریار کنگ جب نے آکہا۔ کیا واقعی سلامہ اتنی بڑی چیز بن گیا ہے کہ کسی سے کوئی بھی چیز چھین لا سکتا ہے۔

"کس سے لون کی بات کر رہے ہو تم؟ میں نے تو اس وقت کسی طرح کا لون پلان نہیں کر رکھا۔"

"میں نے یہ کب کہا کہ لون تم نے اپنے لئے پاس کروایا ہے۔" سلامہ اس کی آنکھوں میں کچھ کھوجتی سے ہنسا اور وہ چل دیا۔ تیکی خاموشی سے ہونٹ بھی رہتی ہے۔ ظاہر ہو جائے تو فی شرمندگی وقت کا نیاں ہو جاتی ہے۔

"اچھا وہ اب تم اس سلسلے میں کیا کرو گے؟" اس نے اسے پھر چھیڑا۔

اور وہ گاڑی کھنکھار کے بولا۔ "مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سمجھ آ رہی۔ آخر میں کسی کے لئے لون کیوں پاس کرواؤں گا؟"

"ظاہر ہے اخلاص داری کے لئے خود کو اچھا ثابت کرنے کے لئے۔" شہریار کا تبسم پیالا اور وہ مسکرا کر بولا۔

"تو تمہیں لگتا ہے میں اچھا نہیں ہوں؟" ایک بے بسی سا پھر بے چارگی سے بولا۔ "تو اب تمہیں بھی لگتا ہے میں اچھا نہیں ہوں؟"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ تم مجھے غیر ضروری باتوں میں الجھانے کی کوشش کر رہے ہو۔" سلامہ کی کڑواہٹ اس کے لہجے سے اور اس نے کہا۔

"میں قطعی تمہارے خیال سے متفق نہیں ہوں، میں نے کسی بھی سلسلے میں کوئی ملنڈ نہیں کیا ہے۔"

سلامہ نے اسے دیکھا، چہرا چپے سامنے رکھی فائل اس کی طرف پھینک دی۔ پھر کھردرے لہجے میں بولا۔ "تم نے کوئی ملنڈ نہیں کیا تو یہ کیا ہے؟ تم نے ہمارے علاوہ کے کاغذات خود کو کا پیٹے وہ قلمیں کے کاغذات کیوں جمع کروائے ہیں؟ تم نے زہر بیچ کر ایک کاغذات کے ذریعے لون لوا اور حقیقت یہ لون تمہارے قلمیں کے پیپرز کے ذریعے گیا تھا تمہاری حجابی خان ابوبکر کے بحث...... تم

......آخر تم ثابت کیا کرنا چاہتے ہو؟ تم کوئی بہت بڑے دیالو ہو یا پھر یہ بھی تمہاری نرگسیت پسندی کی حس کی تسکین کا ذریعہ ہے؟"

"جو بھی سمجھو لیکن یہ طے ہے کہ تم زریجہ کے سامنے یہ نہیں ثابت کر سکو گے۔ کیونکہ جس کسی نے بھی تمہارے سامنے چاہے کسی لالچ، کسی خوشی یا خوف کی وجہ سے ہار مان لی ہے وہ اب دوبارہ ایسی غلطی نہیں کرے گا تم جانتے ہو تمہارے ساتھ رہ کر اتنی سیاست تو مجھے بھی آ گئی ہے کہ میں کوئی بھی کام کا پتہ لگا لوں۔ رہ گئے خدمات تو انہیں ٹھیک ثابت کرنے کے لئے مجھے بہت زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ کیونکہ حقیقت میں نے ان کا علم کے بجائے کے لئے ہیں بھی ٹھیک تم اور انجنیئرنگ کے ذریعے ہی حاصل کئے تھے۔ اور پھر تیسری بات تم زریجہ کی نظر میں اسے جیسے نے ثابت ہو چکے ہو۔ میرے مقابلے میں تمہیں اعتماد سے پرکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے اس معاملے میں پہلا لفظ میرا ہے۔"

سالار تن فن کرتا ہوا اٹھا اور پوری طاقت سے گلاس زور سے دیوار پر دے مارا۔ وہ باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی اس نے اپنی مصنوعی قسم کی استقامت کا اپنے وجود سے دور ہونے محسوس کیا۔ وہ اب گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ جن سے نسلی رنجش کی اس نے بنیاد رکھی دوست مت میں کس حل کر لیا تھا۔ وہ ان کی قسم عذاب ڈھلے ہوئے بیٹھا تھا کہ اچانک خیال کے پردے پر منافہ کا چہرہ گھوم گیا۔

سالار سے وہ شادی کے متعلق کوئی سوال کرنے کرنے سے ڈرتا تھا کیونکہ نہیں جاننا تھا کہ اس کے سادہ سوال میں سے بھی وہ کون سا مطلب نکال لے۔

"منافہ کمال...... کاش میں تم سے کبھی کہہ سکتا کہ مجھے تم زندگی کی طرح عزیز ہو۔ کبھی جو محبت کا خواب دیکھا وہ تمہی خواب میں ہی اٹھنے والی محبت تم ہی ہو سکتی تھیں۔ صرف تمہارے لئے یہ دل جینے کی ضد کرتا ہے۔ لیکن کیا واقعی میں یہ کبھی تم سے کہہ سکوں گا کہ تم مجھے کتنی عزیز ہو؟"

اس نے آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنا چاہا تب اس کی سیکریٹری نے اس کے گھر سے کال آنے کا تذکرہ کیا۔ گھر سے کال...... کون ہو سکتا ہے؟...... اس نے بٹن پش کرنے کال اپنے فون پر منتقل کی اور دوسری طرف کی آواز سن کر اس کی روح تک کھل اٹھی۔

"مام! آپ...... خیریت ہے؟"

"خیریت تو تمہاری پوچھنے کی ضرورت ہے۔ بتاؤ طبیعت کیسی ہے جناب؟"

"بالکل ٹھیک ہے مام! ایک دم پرفیکٹ ہوں۔ دیکھئے آپ کو میری آواز سے نہیں لگ رہا؟"

"نہیں...... کیونکہ تمہاری آواز ساری کوشش صرف کرنے کے باوجود بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہے۔ ٹھیک ہے بیٹا! گھر آ جاؤ، آرام کرو۔ کام تو ہوتے رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے پاپا! میں آ جاؤں گا مگر آج شام پانچ بجے تک آؤں گا، ابھی مجھے کچھ کام ہیں وہ نمٹا لوں۔"

"تم نہیں سدھرو گے۔ ٹھیک ہے، میں تمہارا چائے پہ انتظار کروں گی۔"

"ٹھیک ہے ماما! میں چائے تک آ جاؤں گا۔" اس نے ریسیور رکھا، پھر مڑا تو ٹھٹک گیا، بہت مشکل سے نظر آنے لگی۔

"سالار بھائی! آپ؟...... خیریت؟ کوئی کام تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا۔"

"بس ویسے ہی...... تم اپنی پارٹی کا بتاؤ، ذرا یہ بتاؤ، سالار سکندر تمہارے آفس میں کیا کر رہا تھا؟"

"ایک دوست کا مسئلہ لے کر آفس میں کچھ کام سے آیا ہے، بڑے بھائی؟"

"کیونکہ بات کرو، وہ اس کی شہرت کچھ اچھی نہیں ہے۔ بلکہ میٹنگ میں بھی مشکوک رہتا ہے۔ تم بتاؤ تم نے اس کو بلند رکھا ہے، وجہ اس سے تمہارا فخر کا واسطہ ہوا؟"

اس نے بے یقینی سے دیکھا، پھر تنگ سے کچھ نہیں بولا۔ "حسن بھائی! آپ بھی ہاں...... محمد عمر رکا، پھر آہستگی سے بولا۔ "مجھے معلوم ہے آپ میرے بارے میں بہت برے خیالات رکھتے ہیں۔ میں آپ کا اکثر میں کبھی کوئی مقام نہیں رہا، لیکن ہو سکتا ہے۔ مجھے سے حسن بھائی اگر میں شامل ہوں کے کچھ لوگ بلند رکھتے بھی ہیں تو اس کی پاپا بھی شادی کرنے میں دیر ہوں اس لئے آپ دل پہ دو دست لیا گیا ہیں۔"

"بابا لیا ہوں...... تمہاری غلطیاں اور ان تک عبدالرحمن بھی گزار کے چکر میں پڑ رہی ہیں، تجھے تم ان کے تحفظ کی ہی غلطی؟"

"ظاہر ہے، میں بھی اسی وجہ کہا ہی زمانہ اس لئے جانتا ہوں، غلطی ماننے کا مطلب ہے اپنے گلے میں پھندا ڈال لینا۔ سازادی اور زندگی کے دو تنگی ہے؟"

سالار عبدالرحمن نے نہایت خفگی سے اسے دیکھا تھا، پھر جو سے ایک فائل لیتے ہوئے کمرے میں آئے تھے وہ فائل لے کر وہیں چلے گئے۔ ان کے جانے ہی اس نے موبائل فون کو ہوا تھا، موبائل وہ میٹنگ کے لئے بھجوا چکا تھا۔ سو ماسون کا رابطہ ہونے ہی اس نے اسے آفس آنے کا حکم دیا تھا، جبکہ دوسری طرف وہ کی بے بسی سے کہا گیا تھا۔

"نہیں اکٹھا مرنا جان لو...... میری خصوصی ہدایت ہوتی ہیں، ان کو کسی قسم کی فکر ہو رہی ہے اور انہیں خطرہ ہے کہ کسی فقرے میں کسی قسم کا شک گری ہی ہوجائے۔"

"اوکے تمہاری معذرت قبول ہے مگر میری جان! شام کو کافی ہاؤس میں ضرور آنا... بہت ضروری معلومات ڈسکس کرنی ہیں۔"

اس نے ریسیور رکھا پھر اٹھنے سے بیشتر پہلے اس کا موبائل واپس آیا تھا اس نے نمبر ملایا، موبائل آن کیا ہی تھا کہ پہلا فون ہی دھماکے دار ثابت ہوا تھا۔

"ہیلو شہریار اسپیکنگ، عدیل بھائی!"

"بہت اچھے جا رہے ہو بیٹا! مجھے تو لگتا ہے وزارتِ عظمیٰ کی تمہارے ہی کندھوں پر منتظر ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے بھیا! موڈ کچھ خراب لگتا ہے آپ کا؟"

"کچھ خراب؟ شہریار اس وقت میں تمہارا اچھا بھائی ہوں، دل کر رہا ہے تم میرے سامنے ہو اور تمہاری شخصیت اور تم بہت برے طریقے سے پٹو میرے ہاتھ سے۔"

"لیکن آخر غصہ ہے کس بات کا؟" وہ کچھ بھی پار رہا تھا، تبھی انہوں نے خفا لہجے میں کل کی اخبار میں چھپنے والی تفصیل بتانی شروع کی، وہ بھی اپنی بات کہہ چکنے تک چپ کر رہے۔

"اگر زندگی سے اتنی ہی تنگ آگئے ہو تو تھوڑا سا زہر کھا لو۔ کیوں بار بار ہمیں اذیت دینا چاہتے ہو؟" شہریار کو تھپڑ جڑ دے... "آخر وہ کون سا جملہ ہوگا جو تم تک یقین پہنچا سکے کہ ہم تم سے انتہا کی محبت کرتے ہیں؟"

شہریار کا ان کے لہجے کی شدت سے دم رکنے لگا تھا۔ کتنی دیر اس سے بات ہی نہ ہوسکی۔ پھر خاموشی کے چند لمحات کے بعد اس نے بھرائے لہجے میں کہا تھا۔ "اتنی محبت مت کریں عدیل بھائی! بہت مشکل ہو جائے گی ورنہ آپ کو۔"

"کیا مشکل ہو جائے گی، وضاحت دو۔" وہ چڑ کر کہنے لگے تھے اور اس نے نرمی سے کہا۔

"سیدھی سی بات ہے بڑے بھیا! کسی بھی چیز کی عادت ہو جانا اچھی بات نہیں، انسان کو کچھ لوگوں کے ساتھ رہنا اور بچھڑ جانے کے خدشے پر بھی جینا آنا چاہیے۔"

"بکواس مت کرو، میں اس فلسفے سے متفق نہیں ہوں۔ کیونکہ تم لوگ وہ کمائی ہو جنہیں میں ہمیشہ اپنے محسوسات اور زندگی کی لسٹ میں سب سے قریب لانا چاہتا ہوں۔" ایک ساعت کو وہ رکے پھر بولے۔ "تابندہ بتا رہی تھی تم انکل صمدانی کے فنکشن گئے تھے۔ کیسا رہا جشن آپ؟"

"ایک جنرلسٹ کہاں سے، بابا نے یہ نہیں بتایا آپ کو؟" وہ ہنسا اور وجہ کہہ دی۔

"بابا کا خیال ہے تم نے اُن سے اور ماما سے Bluff مارا ہے، اُن کا خیال ہے تمہاری طبیعت خاصی خراب تھی، جسے تم نے چھپانے کی پوری کوشش کی ہے۔"

"اچھا! ماما اور بابا دونوں میں کافی ذہین ہو گئی ہے۔ ویسے یہ راز کھلا ہے تو آپ کو، آپ کا دوست جان سکتا ہے یا دشمن۔"

"نئی بات۔ لیکن کوئی شکن نہیں، سب سے شرم کرو ہو گی۔"

وہ چہرے سے جیسے جتا بہتر اور کر دو۔" آپ نے اتنی ماری بات منہ کے لیے جتنی جواب کہنا چاہتی تھی سب سے پہلے، وہ ابھی تک نہیں کی ہے۔

عدیل بھائی کا قہقہہ بہت جاندار تھا۔ پھر شوخی سے بولے۔ "مجھے معلوم تھا تمہارا یہ جاننا ضرور کسی نہ کسی صورت ہوگی۔ لیکن کس طرح۔ یہ تو پتا۔ اب تم تو کہاں تک ہو گا۔ نام کا دل جیت لینے پر مبارکباد میری جان!"

"ایک اور بات فون کرنے کی اصل وجہ بھی بتا دیجئے۔ کیونکہ بابا کی طرح میں بھی کافی ذہین ہو گیا ہوں۔"

عدیل بھائی کا قہقہہ پہلے سے بھی شوخ اور شاندار تھا اور شوخی ولا انداز! وہ کافی دیر تک ہنستے رہے۔ پھر ہنستے ہنستے بولے۔ "کہا ہوا تھا گھر والوں کو ابھی والے نے ابھی فون کر کے لگا کہ تم یہاں رکو گی تو ہم یہاں سے ہوا دو مہینے سے اصغر کی کوشش میں تھا۔ گندی دہ گئے بیچ آ رہا ہوں میں راجہ اور آپ کے ساتھ۔"

"کیا واقعی عدیل بھائی؟...... تھینک! یہ تو بہت اچھی ہے۔" وہ پورے دل سے خوش ہوا اور دل نے اسے ہمیشہ سے خوش ہوتے ہی ان کو پیغام بھیجنا شروع کر دیا۔ پھر وقت سلام دعا کے بعد اس نے موبائل رکھا اور دوبارہ میں پھر بجنا شروع ہو گیا۔ اس نے پانی سے دوائی نگلی پھر موبائل اٹھا کے پکارا۔

"ہیلو، شہریار اسپیکنگ...... آپ کون؟"

"میں ماجد بھائی...... کل سے آپ کا نمبر ٹرائی کر رہی ہوں لیکن نمبر لگ ہی نہیں رہا تھا۔"

اس کی سانس پھر تیز ہونے لگی تھی۔ "تم بتاؤ تم کہاں ہو؟ میں آ رہا ہوں تمہیں لینے۔" وہ اس کا سوال ختم کر کے اصل بات کی طرف آ گیا تھا۔ پھر وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اچانک لائن ڈس کنکٹ ہو گئی۔

وہ بے جان موبائل کو دیکھے جا رہا تھا، جب بیگم نافعہ Knock کیے بغیر اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

"بیٹا شہریار! کیسے ہو تم؟"

"میم! آپ.....؟ میں بالکل ٹھیک ہوں آنٹی جان، پلیز بیٹھیے۔" اس نے کوئی چیز چھوڑ دی تھی اب وہ بے جان مادی کے خیال سے روم میں لگے صوفے پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ "آپ کا کام کیسا چل رہا ہے میم؟" اس نے سوال میں پہل کی اور وہ گم گشتہ سی بیٹھی رہیں۔

"ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک چل رہا ہے۔ اس ہفتے تک سارے ڈیزائن فائنل کیے جا سکیں گے شہریار!"

شہریار نے ان کا چہرہ دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔ "میم! کوئی خاص بات، جو آپ کو پریشان کر رہی ہے؟"

بیگم نافعہ نے اسے دیکھا، پھر اپنے شوہر کی شادی کا ذکر کرتے جھجکیں۔ وہ اس معاملے میں اس کی رائے جاننا چاہتی تھیں وہ اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"تم اپنے بابا کے کتنے قریب ہو شہریار؟"

اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ ان کے سوال کی ساخت سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ انہوں نے یہی سوال دوبارہ دہرایا۔

اس نے گہری سانس لی پھر نرمی سے بولا۔ "میں اور پاپا شروع سے بہت اچھے دوست ہیں ہم ایک دوسرے سے کچھ چھپاتے نہیں، پاپا کی ہر بات مجھے بھی پتا ہوتی ہے۔"

بیگم نافعہ نے تولنے والی نظروں سے اسے دیکھا، پھر دھیمے لہجے میں بولیں۔ "کیا واقعی آپ کے پاپا آپ سے کچھ نہیں چھپاتے؟"

"جی میم! میرے خیال میں، میں پورے گھر میں ان کو سب سے زیادہ جانتا ہوں۔"

"پھر تم عطیہ بانو کے نام سے واقف ہی ہو گے؟"

"عطیہ بانو.....؟" وہ پہلے ہی قدم پر منہ کے بل گرا تھا۔

بیگم نافعہ نے اسے دیکھا تھا پھر بے حد سرد لہجے میں کہا تھا۔ "ہاں عطیہ بانو۔ تم یقیناً اپنے پاپا سے، وہ اس نام سے واقف ہیں یا نہیں؟" وہ کہیں پھر سرد سے بولیں۔ "ایک اور بات ان کے

بعد...... آج کے بعد کسی سے یہ مت کہنا تم اپنے پاپا کو سب سے زیادہ جانتے ہو۔" وہ یہ کہہ کر رکی نہیں تھیں۔ وہ ان کی پشت دیکھتا رہ گیا تھا۔

عطیہ بانو...... یہ نام اس نے کبھی پاپا کی زبان سے نہیں سنا تھا۔ وہ فوری طور پر پاپا سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے کمرے سے نکل کر پاپا کو ڈھونڈا۔ مگر پاپا جیسے نانیہ کے گھر آنے سے آدھا گھنٹہ پہلے نکل گئے تھے۔ اس نے کوریڈور میں کھڑے ہو کر سوچا، پاپا اسے کہاں مل سکتے ہیں؟ پھر تعین کر کے وہ نیچے سیڑھیاں اترنے لگا۔ گو رفتار بے حد تیز تھی۔ جازی اس سے بہت زیادہ تیز رفتاری سے اس کو کٹ کرتا ہوا اس سے پہلے سیڑھیاں اتر گیا تھا۔

آج ایک چاکلیٹ ایڈ کی کمپنی پریذنٹیشن تھی۔ ایڈ بائیو کے ہونے پر ایڈ پروڈکشن پر کام شروع ہوا تھا۔ سالار عبدالرحمٰن کی تھوڑی دیر پہلے کی ملاقات اور فائل طلب کیے جانے سے اس نے یہ اندازہ لگایا تھا۔

اشتہار سازی ایک طویل اور تھکا دینے والا کام تھا جس کے ابتدائی سارے معاملات جن پر کام ہیں تھا خود بخود اس نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔

"میٹنگ میں معاملات طے کرنا، ایڈ کمپین کا بجٹ بنانا، کمیشن حاصل کرنے کے لیے گٹھ جوڑ، تمام کاغذی کاروائی کمپلیٹ کر کے کمیشن حاصل کر کے دینا، پھر کمپنیز کے تھرو چیک کمپنی کی یہ فائل دیا یا اسے کمپنی کی ساکھ چیزی کوالٹی، ماڈلز کی ڈیمانڈ لینے کے لیے کی جانے والی کاوشیں، ان اوقات سکتر سے کی گئی بحث نبھانے کی ذمے داری یہ سب ہوتا تھا تب کہیں ایڈ پیپر رول کی سیڑھیاں چڑھتا تھا۔

لیکن وہ اس لیے خوش تھا کہ اس بار اس ایڈ کے لیے اکثر ذمے داری اس کے اسسٹنٹ کے ذریعے جازی عبدالرحمٰن نے اٹھائی تھی۔ یہ پوری کمپین جازی عبدالرحمٰن کی صلاحیتوں پر مشتمل تھی اور اس نے اس سلسلے میں بہت کم غلطیاں کی تھیں۔ وہ جب گاڑی تک آ گیا تھا تب اس کے موبائل پر میسج ٹون سنائی دی۔

اس نے کار میں بیٹھنے کے بعد میسج پڑھا، لکھا تھا۔ "اپنا میل باکس چیک کرو، پھر مجھ سے بات کرو تمہارے فون کو شرارت سے بھرا، عاطف!" اس نے اس میسج کا جواب دیے بغیر گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

اس کا خیال تھا، یہ صرف عاطف کی شرارت تھی اور بس۔ یقیناً اس کا کوئی کرنے کا موڈ ہو رہا ہوگا۔ سو اس نے اس کے میسج کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھا تھا۔

اس کی گاڑی بڑی سبک رفتاری سے رواں دواں تھی۔ اس کا رخ پاپا کے فارم ہاؤس کی طرف تھا۔ کیونکہ وہ جب بھی ڈسٹرب ہوتے، یہیں چلے آتے تھے۔ دو گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ پاپا کے فارم ہاؤس پہنچ سکا تھا۔ واچ مین نے گیٹ کھول دیا تھا۔ اس نے اندرونی برآمدوں کی طرف بڑھتے ہوئے پاپا کے بارے میں معلومات کی۔ ملازمین نے ان کے مخصوص کمرے کی طرف اشارہ کیا، جہاں آج تک وہ کبھی بھی داخل نہیں ہو سکا تھا۔ آج وہ اس کمرے کو دیکھنے والا تھا۔ اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ دروازہ صرف بھڑا ہوا تھا۔ اس نے اکیلے ہونے کے احساس کے تحت اجازت لینے کی ضرورت نہیں محسوس

تھی۔ بابا ایک مجسمے کے سامنے خود بھی بت کی طرح ایستادہ تھے۔

"عطیہ بانو کون ہیں بابا؟"

بابا بالکل نڈھال سے ہو رہے تھے۔ آنسو مارے ضبط کے ان کی آنکھوں میں تیرتے پھر رہے تھے۔ آج انہوں نے خود کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ دھیرے دھیرے قدموں سے چلتا ہوا ان کے قریب آگیا۔

"بتائیے ناں بابا! یہ عطیہ بانو کون ہیں؟" اس نے پھر سوال کیا۔

بابا نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا تھا۔ شہریار کی آنکھیں یکدم پھٹ گئی تھیں۔

"یہ........ یہ عطیہ بانو ہیں؟....... یہ......؟"

وہ کھڑے سے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ تصویر میں رومان راشدی اور عطیہ بانو ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ بابا جس راز کو چھپا رہے تھے وہ بہت واضح ہو کر اس کے سامنے آگیا تھا۔

نانا عبدالرحمٰن آج حمزہ عابد کے گھر چلے گئے ہوئے تھے۔ ماما ساتھ ہی تھیں سو بہت خوشگوار ماحول میں باتیں جاری تھیں۔ پھر نانا حمزہ عابد کے ساتھ اوپر ٹیرس پر آگئے تھے۔ اور یہ شہریار کے معاملے کے بعد سے دل و دماغ پر بوجھ کے بھی ختم ہو گئی تھی۔ وہاں حمزہ عابد کے اسٹڈی روم میں رہائش پذیر تھے۔ عابد صاحب نے بیٹی کی شادی کا خیال ہے بھی بھیجا تھا کہ ان کے داماد ان سے ملاقات نمائش کا اظہار ان سے بار بار کرتے تھے وہ معاملے کو پار لگے۔ مقصد بھی تھا کہ یہ واضح ہو کہ وہ بچے کو سمجھے۔ اور واضح ہو کہ وہ کسی طرح جانے کی بات طے کر لی جائے۔ یا اور بات کر دی جائے تو مجھے اس مسئلے سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ وہ اصل شہریار کو جو مقام ان کے دل نے دے رکھا تھا وہ مقام وہ کسی کو نہیں دے سکتے تھے۔ پھر حمزہ عابد سمیت دونوں کا خیال تھا کہ بڑی اولاد سے جدا ہو کر تمام زندگی کسی نئے رشتے کی بنیاد بن جائے گا۔ سو حمزہ عابد یک گونہ اطمینان محسوس کرتے ہوئے اپنی بیاری کہانی آگے بڑھا رہا تھا۔ جس غم سے وہ نکل گیا تھا اب قسمت سے واپس اس غم میں آگیا تھا۔ جانے کو ایک بار پانے کی مسرت میں ڈوبنے لگا تھا۔ وہ کچھ بھی کر گزر سکتا ہے۔ دانا کو پانے کے بعد دولت تو اس کے گھر کی باندی بن ہی جاتی مگر ان غم میں قائم ہو جاتا تو چاند جیسی خوب صورت زندگی کے نقش وجود سے پگھل جائے گا وہ یہ سوچ رہا تھا۔

ہر کسی کی قسمت میں چاند نہیں ہوتا، اس کی قسمت میں تھا، اس لئے وہ سوچ چاند کو پا لیتا اور یہی دانیا عبدالرحمن کر رہا تھا۔ دانیا اس کی آنکھوں کی تپش سے جل کر رہی تھی اور وہ اس سے بے خبر تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں حمزہ؟" دانیا کی شرمائی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی اور وہ چونک کر حال میں آ گیا۔ اب اس کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ تھی۔ اس نے دانیا کا ہاتھ تھام کر خود سے قریب کیا تھا۔

دانیا کسمسا رہی تھی مگر اس کی جسارت پر اس کا احتجاج بہت مدھم تھا۔ وہ اس کے کان میں گنگنایا۔

"جب تم سامنے ہو تو زندگی سامنے ہوتی ہے۔ اور یہ زندگی سے دور ہو کر قریب ہونے والا ہی جانتا ہے کہ زندگی کا لمس اس کے لئے کتنا ساحر ہے۔"

دانیا کے ہونٹوں پر بہت خوبصورت سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ پھر اس نے ناز بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔ "آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں حمزہ؟"

حمزہ حامد نے اسے کندھوں سے تھام کر دیکھا، پھر خمار آلود لہجے میں بولا۔ "تمہاری محبت..... تمہاری محبت میرے لئے ایسے ہے، جیسے زخم پر کوئی مرہم لگا یا ہو، کوئی بہت صبر آزما دن، وہ جو ہر وقت آنکھوں سے انکار کرتی رہے۔ کوئی بہت پیارا سفر، جس پر ساتھ ساتھ چلنے والے ہی جانتے ہیں کہ قسمت میں وصل کا عہد کیا ہوتا ہے۔ دعاؤں میں خدا کے خیال جیسی بات ہے۔ تمہاری محبت بالکل ان چھوئی، بہت ہی پیاری تمہاری طرح ہے تمہاری محبت میرے لئے....."

دانیا عبدالرحمن کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی اور حمزہ حامد جانتا تھا یہ چمک، یہ سانسوں کا ردھم، کوئی کیا سوال دل کی دھڑکن تھا؟ وہ جانتا تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ بے حد مسرور تھا کہ شہریار کی تمام تر چالاکی کے باوجود وہ کامیابی سے ہمکنار ہونے والا تھا۔

"ہم کب ملیں گے حمزہ؟"

حمزہ حامد کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھر آئی، جسے دانیا عبدالرحمن نے محبت کی ہنسی سمجھا۔ محبت کی ہنسی جس کے اندر محبت کے آنسو ہوتے ہیں مگر ہر نئے محبت کرنے والے کے لئے روشنی ہوتی ہے، محبت کی ہنسی۔ دانیا بھی اسے محبت کی ہنسی سمجھی تھی اور حمزہ حامد تھا شرارت سے بولا تھا۔

"تم جانو، ہم کب ملیں گے؟ دیر تو صرف تمہاری وجہ سے تھی۔ یہاں تو کب سے دل کا دروازہ کھولے بیٹھے ہیں۔"

دانیا عبدالرحمن نے اس کی طرف دیکھا اور دھیمی سے بولی۔ "واقعی حمزہ! آپ نے ہی زندگی سے محبت بنائی۔ مجھے تو محبت کرنی بھی نہیں آتی۔ میری مرضی سے آپ نے محبت کا راستہ ہموار کیا۔ مجھے

AANCHAL.COM

میرے حساب سے جایا اور میں دوسروں کے فیصلوں پر آپ کی اس محبت سے اجتناب کرتی رہی۔" شمع بیگم کرکری بھر بولی۔ "اگر ماریہ شنے کی بات نہ ہوتی تو شاید میں اب بھی اس شادی کے لئے راضی نہیں ہوتی۔"

حمزہ حامد کچھ نہیں بولا تھا اور یوں وہ ایک اچھی سی شام گزار کر گھر آ گئے تھے۔

ماما اپنے کمرے میں پہنچی تھیں۔ پھر انہوں نے ٹی وی لاؤنج میں عبدالرحمٰن کا نمبر دیکھا تھا۔ فوری طور پر انہوں نے ان کا موبائل نمبر ملایا تھا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی مگر رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ مایوس ہو گئی تھیں کہ انہوں نے ریسیور رکھ دیا تھا پھر کمرے سے باہر آئیں تو بیگم حشمت کو انہوں نے صوفے پر بیٹھے دیکھا تھا۔ ماما ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے اماں؟"

بیگم حشمت نے مسکرا کر عجیب انداز میں انہیں دیکھا تھا پھر سر ہلاتے ہوئے لہجے میں بولی تھیں۔

"تمہیں کیا لگتا ہے عالیہ! حمزہ حامد واقعی ماہا کے لئے ٹھیک ثابت ہوگا؟"

"آپ یہ کیوں کہہ رہی ہیں اماں؟" ماما نے حیرت سے کہا اور حشمت بیگم دھیرے سے بولیں۔ "صرف میں نہیں بلکہ عالیہ! آنکھ بند کر کے کوئی بھی راستہ چلنا خطرناک ہے اس لئے کسی بھی سمت کا سفر دیکھ بھال کر کیا جائے تو بہتر ہے، ہمارے معاملے دل سے جڑے ہوتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہیں غلطی کی گنجائش نہ رہ جائے۔"

"آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں؟" ماما کے لہجے میں تشویش کی آمیزش تھی۔ پھر انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "آپ کی اس بات سے میں یہ سمجھوں اماں! کیا آپ بھی شہریار کے حق میں ہیں ویسے آپ کا یہ سوال بنتا ہی ہے؟ کیا ضروری ہے جسے شہریار سے محبت ہو جائے، وہ اس کی بات، اس کے فیصلے بھی دوسروں پر مسلط کرے؟"

حشمت خانم نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا تھا پھر آہستگی سے بولی تھیں۔

"شہریار سے جب سے میں نے [illegible] اختیار کی ہے، میرا دل کہتا ہے، میں اسے زیادہ سے زیادہ جانوں، وہ اس میں کہاں کی ہے جس نے ہمیں اس سے دور رکھا؟...... عالیہ! جب میں نے سوچا میں زیادہ سے زیادہ اس کی ان چھوٹی سی دنیا میں [illegible] ان کے ذہن میں جانی جب وہ سوتا اور اس وقت بھی جانی جب بھی

AANCHAL.COM.PK

ہوتا۔ اس کے کمرے کی دیکھ بھال، جو پہلے ماما ملازمین لگا کر کرواتی تھیں اب اس کے اس سے قطع تعلق کے بعد میں نے اٹھائی۔

ماما انہیں دیکھ رہی تھیں۔ شاید کوئی بہت دھوکے وار داخلی تھی ان کے پاس۔ حشمت خانم نے بیٹیا کی دلچسپی دیکھی تو نرمی سے بولیں۔ "کیا تم یہ تو نہیں سمجھ رہیں، میں تمہیں کوئی راز بتانے والی ہوں؟"

"ہاں! آپ کی باتوں کا تو یہی مطلب نکلتا ہے۔" ماما نے قدرے حیرت سے کہا۔ حشمت خانم نے ان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔

"ہاں...... پہلے میرا بھی خیال تھا، لیکن بعد میں، میں نے سوچا یہ یک طرفہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے تمہارا دل اسے اس طرح نہ لے جس طرح اسے بیان کیا گیا ہے کیونکہ جو بات دل میں جگہ کر لے، وہ بہت کم دل میں سے اپنی جگہ بدلتی ہے۔ تو کیا آپ خیال ہی تک نہ جاتیں؟ سمجھ لیں، میں یہی چاہتی ہوں تم آنکھیں کھول کر حمزہ عابد کا جائزہ لو اور پھر خود سے کوئی فیصلہ لو۔ یہ دو طرفہ ہو تو دل یقین کرنے میں آسانی محسوس کرتا ہے۔"

ماما انہیں دیکھے گئیں، لیکن یہ ہوا تھا کہ جا چکی ان کے اندر اپنے فیصلے کو لے کر تشکیک سی آ گئی تھی۔ وہ پہلے جتنے اپنے فیصلے پہ یقین کرتی تھیں، حشمت خانم کے ان سے بنوا کر یقین نے انہیں ڈانواں ڈول کر دیا تھا۔ ماما ازسرِنو سوچ انداز میں خاموش ہو گئی تھیں۔ پھر ٹی وی پر وہ صرف اسکرین پر نظر جمائے بیٹھی رہی تھیں۔ حشمت خانم نے کیو چینل لگا رکھا تھا۔ اسلام کے درخشاں اصولوں پہ کوئی پروگرام چل رہا تھا۔ لیکن ماما کا دھیان اس طرف نہیں تھا۔ پھر یکدم انہوں نے چونک کر پوچھا تھا۔

"شہیر ادھر آیا؟"

حشمت خانم نے نفی میں سر ہلایا پھر آہستگی سے بولیں۔ "تمہارے جانے کے بعد اس کا فون آیا تھا اس نے تمہارے موبائل پہ مسڈ کال دینے کی بات پوچھا تھا، خیریت ہے؟ تو میں نے کہہ دیا تھا تمہارا نمبر نہیں مل رہا تھا اس لیے تم نے اسے مسڈ کال دی تھی۔ پھر تمہارے عادل بھائی کے پروگرام کا بتا کر کہہ دیا تھا کہ شاید شام کی چائے پہ وہ تم سے آ کر مل سکیں گے۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن حمزہ کے ذکر پہ وہ کافی مضطرب ہو گیا تھا۔"

ماما کچھ نہیں بولی تھیں۔ انہوں نے پھر سے عدیل بھائی کا نمبر ملایا تھا۔ پھر رابطہ ہوتے ہی انہوں نے خیریت ہی دریافت کی تھی اور دوسری طرف سے عدیل بھائی تھے خوشی سے بولے تھے۔

"شکر کریں بیگم! ماہ رابعہ کے ساتھ کراچی آ رہا ہوں۔ بڑی زور دار ٹریننگ منتظر کر رہا ہے۔ اب لگتے دو وجودوں کا یکساتھ ... کرنے کے لیے ابھی سے انتظام کر لیجیے۔"

"بہت شوخ ہو رہے ہو کوئی خاص بات؟" ماما مسکرا اٹھیں۔

وہ ہنس کر فون میں بولے۔ "شوخ...... میں تو دنیا میں آنے کے کچھ گھنٹے بعد سے ہی نوٹس کر رہا ہوں ماما! اب یہ تازہ شوخی صرف اس خیال سے لہجے میں در آئی ہے کہ میں اب کسی قاعدے ضابطوں اور لگے بندھے قیدوں کے لیے آپ سب سے نہیں ملنے والا، کھل کر جینے کا ارادہ ہے ماما! آج پہلی بار آپ سب سے دور ہو کر بھی آپ سب کو نزدیک پا رہا ہوں۔"

"بس بس مجھے بناؤ مت۔ کہہ تو دیا میں جانتی ہوں تمہارے لہجے کی یہ شوخی کیوں ہے اور کیا کہہ رہی ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہے ماما؟" انہوں نے طرح دینا چاہا اور ماما مسکرا کر یکدم لہجے میں بولیں۔

"لاڈلے بھائی سے تمہارے تعلقات بہتر ہو گئے۔ بچپن سے تمہاری خوشی ہو یا بے چینی سب مجھے پتا ہے؟" "حماد کیا ہو بس اب بہتر ہو گئے ہیں۔" "شہرزاد تمہاری محبت کی لسٹ سے بالکل ہی نکل گئی تھی۔"

"ایسے تو نہ کہیں ماما! اچھے تعلقات بھی تھے ہی۔ آپ سے زیادہ محبت میں ہی ہو رہے ہیں، بس پتا نہیں آپ کو میری محبت پہ نہیں کہتی تھی؟"

"اب بس زیادہ دوہرانا مت کرو۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

ماما نے سلام دعا کر کے فون رکھ دیا۔ انتظار ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جبکہ آنکھوں میں ایک سنسنی لہر اپنی جگہ لے رکی تھی۔ یہ سوچ اتنی گہری تھی کہ ان کی خوشی کو بھی کھا گئی تھی۔

❀❀❀

زندگی کی راہوں میں

چار سو اندھیرا ہے

ہنسی بنی اداسی ہے

خامشی کا ڈیرا ہے

جتنے خواب روشن تھے بکھر گئے نگاہوں میں

جتنے پنچھی اڑتے تھے کھلی فضاؤں میں
کھو گئے ہواؤں میں
آندھیوں کی راہوں میں
کیا خوف کا عالم ہے
جو فضا پہ طاری ہے
ہر کسی کے چہرے سے ہویدا سوگواری ہے
غم کو اپنا کہنے کی یہ سزا اتاری ہے
ہاں مگر یہ خواہش ہے پنجرے سے آسماں ہو لے
پنجرے سے جہاں ہو لے
میرا مہرباں ہو لے
میں کڑے سفر میں ہوں
خوف کے اثر میں ہوں
رات کے اندھیرے میں تنہا شجر میں ہوں
پھر کسی مسافر کا آشیانہ بنو گے
ہاں اگر چاہے لے چلے گا اجر مجھ کو

AANCHAL.COM.PK

دو قدم کے راستے
اک تنہا سو رہا ہے
اک بار پھر ڈھونڈے
وہ آج بھی میرا ہے

وہ آج بھی میرا ہے...... ایک حسرت اُس کے دل سے چھلکی ہوئی تھی اور وہ پل یہاں بالکل سامنے بیٹھا تھا۔

شافعہ اس لمحے زینب کے قلب میں تھی۔ عارف جمال اس کے ہاسپٹل سے اس کی ڈیوٹی لوکیشن جانے کے لیے آیا تھا۔ ہاسپٹل میں یوں بھی سب اُسے شافعہ کے فیانسی کی حیثیت سے جانتے تھے اس لیے خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ دونوں بالکل خاموش بیٹھے تھے، جب شافعہ نے کہا تھا۔

"جس کے پاس گئے تھے وہ کیا وہ بہت خوب صورت ہے؟...... اتنی خوب صورت کہ اس نے تم سے میرے عام کی محبت مانگی اور تم انکار نہیں کر سکے؟"

عارف جمال نے سٹ سے اُسے دیکھا تھا، پھر مسکرا کے نیچے نظر کو دیکھا تھا۔ "وہ بہت خوب صورت ہے، لیکن وہ تم کو نہیں جانتی۔ میں محبت صرف تم سے کرتا ہوں۔"

شافعہ بے بسی سے ہنس دی تھی۔ "تم...... تم اب بھی یہی کہہ سکتے ہو، مجھے یقین ہے کہ تمہیں آج بھی مجھ سے محبت ہے۔ عارف! تم نے اُسے یہی یقین دلا کر اُسے بھی کہا ہوگا کہ تم اس سے سچی جان سے محبت کرتے ہو، مجھے تو اس کا دل بارا ہوگا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم کسی پانی کی ماند آنکھیں الاؤ اس کی دیوار جان بننے لئے، آتش و دل اس کے کہنے میں نہ رہے، وہ اپنی ہستی نہ بدل جائے۔ عارف! تم اور تمہارے عشق ہر چیز سے ماورائی چاہت سے گئے۔ مجھے لگتے ہیں کہ میں تو تمہارے بعد وہ کچھ نہیں پائی اب مجھے بھی نظر نہیں آتا۔ کوئی منظر کوئی چہرہ وہ کس نہیں جچتا مجھے اور تم...... تم نئے چہرے سے کہہ سکتے ہو کہ وہ ہے ہو کہ تم اس سے نفرت کیا کرنے لگے...... تم ساری عمر اس سے محبت کرتے رہو گے...... کیسے کہہ سکتے ہو یہ سب کچھ تم؟"

عارف جمال کسی کٹہرے میں کھڑا تھا۔ اس سے لفظ نہیں ادا ہو رہے تھے۔ وہ صرف اُسے دیکھ رہا تھا۔ پھر کتنی ساعتوں بعد اس نے کہا تھا۔

"مجھے معاف کر دو شافعہ! میں تمام عمر تمہارا مقروض رہوں گا۔ لیکن تم مجھے میری یہ غلطی معاف کر دو۔ میں جانتا ہوں تمہارا دل بہت بڑا ہے۔"

شافعہ کمپل نے اُسے دیکھا اور آہستگی سے بولی۔ "تم کبھی آتے اور سر جھکا کے کہتے شافعہ! مجھے تمہاری محبت کے باوجود کسی اور کے دل کی محبت کھینچنے لگی ہے میرا دل آدھا تمہاری طرف مڑا ہوا ہے آدھا اس محبت نے چرا لیا...... تو میں دل کو دو آدھا کر لیتی۔ تمہاری اُلفت دیکھ کر محبت کی یہ عبادت بانٹ لیتی۔ حالانکہ تمہیں تو شاید میرا دل خدا کو بھی نہ سونپنے دے لیکن میں پھر بھی اس کڑے فیصلے سے گزر جاتی، لیکن ایسا ہوتا تو......

ایسا نہیں ہوا عارف! تم میرے ساتھ یہ دھوکا چھپکے چھپکے کرتے رہے۔ تم میری آنکھوں میں مرکوز رہتے تو مجھے لگتا تمہاری آنکھوں میں آن بیٹھنے والا دل صرف میرا انتظار ہو گیا ہے۔ مگر وہ دل...... وہ دل کتنا فریب تھا وہ دل کسی کا بھی نہیں تھا۔ تم میرا دماغ نوچتے رہے...... تم نے محبت کا بہت کمترین چیز سے مقابلہ کیا۔ دولت...... عارف! صرف دولت نے دل کی حکمرانی چھین لی۔ یہاں دیکھو یہاں ہر روز دولت کی آفریں قدموں میں ڈھیر ہوتی ہیں مگر محبت انہیں ٹھوکر لگا دیتی ہے۔

مشکل زندگی جینا بہت مشکل ہے عارف! صرف دولت کے لیے جینا...... زندگی کا وجود نہیں کرتی۔ محبت کتنا معتبر لفظ ہے آج کے زمانے میں...... کتنے پیار آج کے زمانے میں سب سے زیادہ کانٹوں بھرا راستہ ہو۔ کتنے محبت کے قصے میں پتھرا گئیں، مگر عارف! ایک تو یہ ہے آج بھی کہیں محبت کا ذکر ہو کر دل ضرور دھڑکتا ہے۔ محبت کا کوئی سچا تھا۔ آج بھی سانس تیز کر دیتا ہے۔ لگتا ہے، دل کو یا ابھی اتنی بھی بے مایہ نہیں۔ مگر تم نے اس کی لاج نہیں رکھی۔"

وہ کوئی پتھر اس کی طرف دیکھ کر پورے دکھ سے بولی۔

"تم آج جیسا چاہتے ہو جیو۔ زندگی تمہارا ہاتھ نہیں پکڑے گی۔ لیکن عارف! زندگی میں تنہائی کا ایک ایسا فخر ضرور آئے گا۔ جب دولت کے باوجود لوگوں کے باوجود تم تنہا ہو گے تو تمہیں یہ لمحہ یہ وقت اور یہ محبت ضرور یاد آئے گی۔ کوئی تمہارے دل میں ضرور کہے گا تم نے کس چیز کے لیے کیا گنوا دیا تھا...... عارف! آج تم مجھے کھو رہے ہو۔ خسارہ صرف تمہارا ہے، حالانکہ چھننے والوں کو لگے گا خسارہ صرف میرے حصے کا نصیب ہے۔ مگر صرف لوگوں کو ایسا لگے گا...... کیونکہ میرے پاس محبت کی سچائی اس کا احساس تمہارے جانے کے بعد بھی زندہ رہے گا۔ لیکن تم...... تم آج بالکل خالی ہو کر جا رہے ہو۔ خالی ہونے کا مطلب سمجھتے ہو ناں؟ کوئی یاد کوئی لمحہ کوئی محبت، کچھ نہیں...... تم اس بادشاہ کی طرح ہو گئے ہو عارف! جس نے کہا تھا خدا مجھے وہ ہنر دے کہ میں جس چیز کو چھو لوں وہ سونا بن جائے...... آج تم نے خود اپنے آپ کو چھو لیا ہے۔ تم اور تمہارا دل پیلا پڑ گیا ہے۔ تجارت سے بے نیاز پیلا پن ہے...... اس کے بعد سے یہ کسی مت کہنا تم زندہ ہو...... کیونکہ جس دن تم نے یہ کیا اس دن تمہاری

آنکھیں چرا رہے تھے لیکن کی زندگی بنس رہی ہے تھی تمہارے پاس جھوٹ ہے۔"

وہ مڑ چکی تھی۔ عارف جو خاموشی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ شاید کوئی لمحہ آئے کہ اس کا دل پگھل جائے، مگر آج وہ صرف ہار رہا تھا۔

وہ پلٹی نہیں تھی، سو وہ اُٹھ گیا تھا۔ اس کے قدموں میں واضح لرزاہٹ تھی۔ اس نے تو سوچا تھا، وہ دولت اور شافعہ کو ایک ساتھ، ایک سانس میں جی لے گا، مگر وہ نہیں جانتا تھا محبت اور دولت میں اگر پلڑا دولت کا بھاری ہو تو محبت ہمیشہ ہار جاتی ہے۔

وہ دولت جیت گیا تھا مگر محبت نے اس سے محبت کی خلعت اُتار کر اسے دروازے سے باہر نکال دیا تھا تو اسے لگ رہا تھا وہ کچھ بھی نہیں جیتا تھا۔ صرف جیتنے کا اسے شبہ ہوا تھا۔

وہ ڈرائنگ روم سے جا چکا تھا۔ شافعہ بالکل چپ سے پرسکے رونے جاری تھی۔ تب ٹیپو چچی کالی تائی اس کے قریب آ گئی۔ اس نے بہت مدھم لہجے میں کہا تھا۔

"کیا ہو جاتا اگر تم محبت کو اس کنڈیشن کے ساتھ قبول کر لیتیں؟...... شافعہ! تم نہیں جانتیں، لیکن میں جانتی ہوں تم کتنی خوش قسمت ہو۔ وہ خود چل کر تمہارے پاس آیا تھا تم سے یہ کہنے کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔" وہ لمحہ بھر کو رکی، پھر مسکرا کر بولی۔ "ادھر دیکھو، مجھے دیکھو، میں بچی کے منہ سے پلٹنے سننے کے لیے کتنے سال رسوائی کی آگ میں جلتی رہی ہوں۔ میں نے تو اپنی حالت کسی فقیر کی طرح کر لی تھی کہ شاید میری محبت پر نہ سہی میری بے چارگی پر ہی اُسے ترس آ جائے اور وہ مڑ کر کہہ دے، ہاں تم نے ایک لمحے میں، ایک کمزور لمحے میں واقعی تم سے محبت کا رشتہ نبھایا تھا۔ پھر لمحے وہاں لمحے سے گر جائے مگر میری محبت، میرے دل کے لیے وہ ایک معمولی سا جھوٹ عمر گزارنے کے لیے کافی ہوتا..... مگر ایسا نہیں ہوا شافعہ! اسے بھی تمہاری طرح سچ کہنے کی اتنی عادت تھی کہ وہ لمحہ اور وہاں لمحے کی بے چارگی جتنے بے قدموں میرے دل میں آئی اتنے ہی بے قدموں واپس لوٹ گئی۔ یوں، جیسے ایک غریب کسی دوسرے غریب کے گھر مہمان بن کر آئے، مگر اس کے گھر کی کسمپرسی دیکھ کر رات کے اندھیرے میں دروازہ کھول کر باہر نکل جائے کہ اگر میزبان کی آنکھوں سے آنکھیں ملانی پڑیں تو اس کی غربت کا تماشا کس دل سے دیکھے گا۔ میرے لیے ایسی ہی تھی محبت کی حسرت...... لیکن تم نے محبت کی پوری آنکھیں اپنے اوپر مرکوز دیکھنے کے باوجود محبت کو ٹھکرا دیا۔ تم نے بہت برا کیا شافعہ!"

شافعہ نے تائی کی طرف دیکھا، پھر بھیگے لہجے میں بولی۔ "محبت یوں نہیں اچھی ہوتی، تائی مام! محبت میں وضعداری ہو مگر نفس نہ ہو۔ محبت دل میں پھول کھلاتی ہے، ورنہ دل میں ایڑی اور بے کسی کے کانٹے اُگ آتے ہیں اور کانٹوں سے پھر کس کا دامن، کون سا خواب محفوظ رہ سکتا ہے۔"

ثانیہ نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کا کندھا تھپتھپانے لگی۔

شافعہ نے سر جھکا لیا تھا۔ کیونکہ غلطی تو پہلے کی باتیں جھوٹ کے سوا کچھ نہیں تھیں۔ کچھ دن پہلے وہ اکیلے میں سوچ رہی تھی کہ محبت بھیک کی طرح بھی مل جائے تو شاید وہ قبول کر لے گی مگر آج محبت اس کے در تک آئی تھی مگر محبت میں دل کی عزت بار بار کر۔ بھیک کی طرح نہیں تھی۔ وہ بالکل مرادوں بھری تھی اور دل تو مناجات تھا۔

کاش پھولوں کی ردا ہو جائے
اتنی حساس ہو جائے
مانگنے ہاتھ پہ کلیاں رکھ دے
اتنا مجبور خدا ہو جائے

وہ مانگ رہی تھی دل بے پناہ سے اور نہیں جانتی تھی وہ ان سے اتنی محبت رکھتا تھا کہ ذکیہ بانو کی طرف اس کے دامن میں ڈال لینے سے کترا کر اس نے چپکے سے اس کے آنسو چن لیے تھے۔ کسی بہت ہی محبت اور عزت کے لیے اسے سینت کر اس کے ہاتھ پہ کلیاں رکھ دی تھیں وہ ان خوشبو کے احساس سے جیسے کھو گئی تھی اس لیے گنگنا رہی تھی...... اور وقت جانتا تھا وقت بنانے والا خدا جانتا تھا اس لیے محبت اسے مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔

ایک پھولوں بھرا راستہ اس کا منتظر تھا۔ مگر وہ بھی تھی اور بس......

اور بس انتظار کے درمیان کا فاصلہ تو وہی کرتا ہے۔ مگر صرف انہیں جنہیں اپنے رب پر بھروسہ ہو۔

❀❀❀

مسز ندیم افسر جہاں کھڑے تھے اور ذکیہ بانو ان کا کندھا تھام کر لجاجت سے بولی تھیں۔

"آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ وہ اس سارے قصے میں صرف آپ کو جانتی ہے اور اس حالت میں آپ اسے تنہا نہیں کر سکتے کیونکہ شاید اس کا علم اتنا نہیں بھی کوئی چیز ہے۔"

AANCHAL.COM.PK

سلیم اصغر نے پوری آنکھیں کھول کر اس عورت کو دیکھا جو نفسیاتی ہاسپٹل کے پرائیویٹ روم میں زنجیروں سے جکڑی ہوئی تھی اور جسے حاصل کرنے کے لئے عافیہ بانو نے ایک خطیر رقم خرچ کی تھی اور اب یہاں علاج کے لئے بھی رقم خرچ ہو رہی تھی۔ اور سلیم اصغر تھے کہ اپنی بیوی کے اس قدم پر حیران ہو رہے تھے۔ وہ تانیہ کو دل سے نکال چکے تھے۔ اور یہ عورت..... اس نے تانیہ کو ان کے سامنے پھر لا کھڑا کر دیا تھا۔

”تمہیں آخر یہ سب کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ تم جانتی ہو، میں اس عورت سے کتنی نفرت کرتا ہوں۔“

عافیہ بانو نے ان کو کندھوں سے تھاما اور بھرائے لہجے میں بولی تھیں۔ ”جو دل صرف محبت کرنا جانتے ہوں، انہیں چاہ کر بھی نفرت کرنا نہیں آ سکتی۔ اگر آپ نفرت کرنے میں اتنے ہی ایکسپرٹ ہوتے تو برسوں پہلے سب کچھ بھلا دیتے۔ پر بھی صرف تانیہ کی صورت دیکھنے کے لئے بدنام گلیوں کا رزق نہ بنتے۔ آپ جو کہتے تھے آپ دنیا سے چھپ کر رہنا ہی سے خوف کھا کر وہاں شراب میں ڈوبے رہتے تھے تو یہ صرف آپ کا اپنی ذات کو دیا جانے والا معصوم دھوکا تھا۔ آپ اپنی تشنگیوں کو فراموش کر دینے کے لئے یہ سب کرتے رہے تھے۔ کیونکہ اگر آپ اپنے دل کا سچ خود سے کہہ گزرتے تو ان تشنگیوں کو حشر کون سہتا؟ کیسے سہتا؟“

سلیم اصغر کھڑے سے بیٹھ گئے تھے۔

”میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں شافعہ! تمہارے علاوہ اب مجھے کچھ یاد نہیں۔ نہ کوئی ہے ایسا جو مجھے تمہاری طرح خوش رکھ سکے۔ مجھے خود سے الگ مت کرنا۔ میں تمہارے بغیر کچھ نہیں ہوں۔“

انہیں عجیب سے ڈر کے نے جکڑ لیا تھا۔ بیگم عافیہ نے شوہر کی اس محبت کو بھیگی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ پھر مدھم لہجے میں بولی تھیں۔

”میں خود آپ کو خود سے بانٹنا نہیں چاہوں گی۔ لیکن میں چاہتی ہوں، ادتی... جو اپنی ایک ماں کی حسرت میں مجھ سے محبت کرتی ہے، وہ مکمل ماں کی محبت پا کر محبت کرنا سیکھ جائے۔ سلیم! میں جانتی ہوں، زندگی کا جو بڑا فیصلہ اس نے لیا ہے، وہ ناکام رہے گا کیونکہ جو کچھ اس کے اندر اپنی ماں کی گمشدگی کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے، وہ ماں کے مل جانے سے ترتیب پا جائے گا۔ آپ یوں سمجھیں کوئی کہانی شروع ہو، بچے سنتے سنتے سو جائے، پھر آدھی کہانی میں جاگے تو درمیان کی کڑیاں رہ جاتی ہیں، وہ ہمیشہ اس کہانی میں تشنگی کا احساس رہنے دیتا ہے۔ پھر بچہ اپنی طرف سے اپنے احساس سے گھڑ گھڑ کر اس درمیانی حصے کو مکمل کرنے کی کوشش کرے، اور کہانی کچھ کی کچھ ہو جائے۔ سلیم! اسے کہانی مکمل کرنے دیں تاکہ وہ زندگی کی کہانی ٹھیک ٹھیک جی سکے۔“

سلیم اصغر نے بیوی کو محبت سے دیکھا پھر نرمی سے بولے۔ ”زندگی میں کوئی ایسا لمحہ نہیں ہوگا، جب مجھے لگا ہو کہ میں نے زندگی میں درست فیصلہ نہیں لیا۔ عافیہ! تم میری کسی بجھی تشنگی کا ثمر ہو اور بس۔“

عافیہ بانو مسکراتی رہیں۔

پھر دونوں کمرے سے باہر آ کر ڈاکٹر سے بیٹے کی تفصیل لے رہے تھے۔ ڈاکٹرز کا خیال تھا معاذ ان کے دماغ کا نہیں صرف اس نشے کا ہے، جس کی وجہ سے ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر اثر پڑا ہے۔ کیونکہ جس وقت عاقبہ بانو انہیں ہاسپٹل لائی تھیں اور ڈاکٹرز نے ان کی دماغی استعداد کا اندازہ لگانے کی کوشش کی تو نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ان پر بہت کم محنت کے ساتھ اچھا رزلٹ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ عاقبہ بانو نے نفسیاتی علاج کے ساتھ ساتھ فزیوتھراپسٹ بھی ہائر کر رکھا تھا۔ سوال کرتے دونوں ایک ساتھ گاڑی کی طرف بڑھے تھے۔ ڈرائیور نے دونوں طرف سے دروازے کھولے تھے۔ سلیم افسر نے آرام سے بیٹھتے ہوئے عاقبہ بانو سے سوال کیا تھا۔

"تو مسٹر عبدالرحمن سے آپ کی ملاقات کا کیا رہا عاقبہ؟"

عاقبہ بانو نے ٹھنڈا سانس لے کر مدھم کہا۔ "مسٹر عبدالرحمن مجھ سے ابھی تک نہیں ملے ہیں۔ حالانکہ سارے کام ان کے سپردوں سے پہلے انجام نہیں دیے جا سکتے۔ لیکن انہوں نے مجھ سے نہ ملنے کے لیے سارے اختیار اپنے تینوں بیٹوں سالار عبدالرحمن، حجازی عبدالرحمن اور شہریار عبدالرحمن کو ہاتھ دیے ہیں۔ شہریار کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا وہ اپنے پاپا کے بہت قریب ہے مگر جب میں نے عطیہ کے بارے میں اس سے سوال کیا تو وہ کچھ حیرت زدہ ہو گیا۔"

"حیرت زدہ ہو گئے یا اپنے پاپا کے راز کی نگہبانی کرنے کے لیے جیسا تاثر دینے کی کوشش کر رہے تھے شہریار؟"

عاقبہ نے نفی میں سر ہلایا تھا پھر نرمی سے بولی تھیں۔ "نہیں سلیم! وہ بچہ ایسا نہیں ہے۔ جو اس کے اندر ہوتا ہے وہی اس کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں دل سے الگ کوئی رابطہ نہیں رکھتیں۔"

سلیم افسر مسکرانے لگے، پھر شرارت سے بولے۔ "خیریت تو ہے، آپ شہریار کا تذکرہ اتنے پیار سے کیوں کر رہی ہیں؟ سچ پوچھیں تو مجھے اب جیلسی ہونے لگی ہے۔ کیونکہ دائمہ شہریار بھائی کی دیوانی ہیں۔ مراد کو شہریار کے بغیر گزارہ نہیں ہے۔ اور وہ دنیا جہان کی نک چڑھی انوشے وہ بھی اس کا تذکرہ بڑی محبت سے کرتی ہے۔ اور آپ بھی اس کا ذکر اتنی محبت سے کر رہی ہیں۔" وہ قصداً بات ادھوری چھوڑ گئے۔

عاقبہ مسکرا کر ہنسی سے بولیں۔ "خدا کا خوف کریں سلیم! وہ بچہ ہے ہی اتنا اچھا کہ دل اس کی طرف خود بخود کھنچتا ہے۔ آپ کو پتا ہے، انوشے نے اس کی بہت مدھم مدھم یادداشت کی وجہ سے ہی زندگی کو تقریباً خیرباد کہہ دیا ہے۔ بہت چینج آیا ہے اس میں شہریار کی وجہ سے۔ اس دن میں نے سنا وہ اپنی فرینڈ سے بھی شہریار کا تذکرہ بڑی محبت سے کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو وہ بالکل

شہریار کی طرح ہوتا، اگر نہیں ہوتا تو میں دن رات یہی مناجات کرتی کہ میری زندگی میں شہریار جیسا ایک بھائی کا سہارا ضرور ہو۔ تمہیں نہیں پتہ، بھائی نہ ہو تو سوسائٹی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا بہت مشکل کام ہے۔ اب تو خیر لوگ شہری مرد کو بھی اہمیت دینے لگے ہیں اور اس جیسی لڑکی میں تبدیلی کا تناسب اتنا بھی ایسا تو نہیں کہ نظر انداز کیا جا سکے، اور جس کی وجہ سے یہ تبدیلی آئی ہے اُسے سراہا جائے۔"

"اوکے، اوکے، آپ کا شہریار بہت عظیم انسان ہے۔ بس۔ ویسے سچ بتاؤں تو اُسے دیکھ کر کبھی کبھی میرے دل میں خواہش جنم لیتی ہے کہ کاش اس جیسا میرا بھی کوئی بیٹا ہوتا۔" مسز عبدالرحمٰن بہت تھک گئی ہیں نا۔"

عائزہ مسکرانے لگی تھیں مگر ان کی سوچیں اب بھی عطیہ بانو کی کہانی میں الجھی ہوئی تھیں جس کے گرد وہ گھوم رہی تھیں۔ آخر وہ کس سے پوچھتیں کہ ان کی بہن کے ساتھ وقت نے کیا ظلم ڈھایا؟ انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور وہ ساری کاوشیں دہرانے لگی تھیں جو سلیم افسر کے ساتھ طویل سفر پہ جانے سے پہلے انہوں نے دہرائی تھیں۔ مسٹر عبدالرحمٰن ان دنوں ملک میں نہیں تھے اور جس کے ساتھ کا خواب دیکھ کر عطیہ بانو نے قدم باہر نکالے تھے، وہ نظروں سے اوجھل تھا۔ لوگ کہتے تھے وہ گوشہ نشین ہو گیا ہے۔ کہاں رہتا ہے، یہاں نہیں، کوئی نہیں جان سکا تھا۔ اور نتیجہ یہ تھا کہ وہ ایک بند گلی میں آ کھڑی ہوئی تھیں۔ راستہ کوئی نہیں تھا۔

کیا واقعی راستہ نہیں تھا؟ یا وہ راستہ ڈھونڈ نہیں پا رہی تھیں......؟

❀ ❀ ❀

"تمہیں کیا لگتا ہے، شاہ صاحب کو خبر نہیں ہوگی کہ ہم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟" سائیں نے رازداری سے کہا تو ملازم نے مدھم لہجے میں کہا۔

"سائیں! کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ ویسے بھی جو اس کی جان کے دشمن ہیں وہ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ صرف شاہ صاحب کی لاڈلی ہے وہ حویلی میں۔ لیکن اگر ہم اُسے اس طرح ادھ موا کر کے کسی شہر میں پھینک دیتے ہیں تو وہ وہاں کون سا زندہ رہ پائے گی؟ مر جائے گی پڑے پڑے۔ شاہ صاحب یہی سمجھیں گے کہ بڑی آپ کی بدی عورت تھی، بھاگ گئی، جیسے پہلے گھر سے بھاگ گئی تھی۔" ملازم تھوڑی دیر کو رکا، پھر جلدی سے بولا۔

"کھانے وانے کا تو وہ ویسے ہی کم کرتی ہے، پھر بھی اس پہ شک نہیں پڑتا۔ ساری حویلی کے مردوں کے دلوں پہ راج کر رہی ہے۔ نہ جانے مردوں کو اس میں کیا نظر آتا ہے کہ......"

اس نے ایک گندی سی گالی دے کر بات ادھوری کی اور سائیں نے پرسوچ انداز میں اُسے دیکھا۔ جو عمر کا ایک کام کرنے والا ملازم تھا، وہی دھڑکا اُسے بھی تو تھا۔ پتہ نہیں، مرد کی نظر میں پھر کب تبدیلی آ جائے۔ اس نے کہا تھا، ایک بار وہ ٹوٹ کر پلٹنے میں دیر لگتی ہے مگر مرد کا دل اس سے بھی تیزی سے بدل جاتا ہے۔ پھر کامران شاہ کا عجب بھی تو اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس کی نگاہ میں بھی آج تک کہیں کل کسی موقع پر بیٹے کو اس کا خیال آ گیا تو...... وہ اس حویلی میں کون بن جائے گی۔ دوسرے درجے کی عورت...... پانچ سال کا بچہ بہت لاڈ میں پل رہا تھا کہ اُسے ہی اس گھر کا وارث تھا ابھی تک۔ اس کی اولاد

کے بغیر نہیں سوچا تھا مگر سگی ماں تو سگی ماں ہوتی ہے ناں......

بس اتنی بات نے اسے ملازمہ کی باتوں میں آنے پر مجبور کیا تھا۔ زوار حسن شاہ ایک ہفتے بعد کسی کام کے سلسلے میں انگلینڈ جانے والا تھا اس لیے وہ چاہتی تھی، یہ کام اس کے جانے کے فوراً بعد کر لیا جائے تاکہ لیلیٰ پولی کی گنجائش نکل سکے۔ حویلی کی اکثر عورتیں اس کام میں خود بخود اس کی مددگار بن جاتیں۔ وہ ان کی مالکن تھی، وہ جو کہتی حویلی کے سب لوگ وہی کچھ کہتے۔ اس کا اسے یقین تھا۔ سو وہ مطمئن ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ مگر غلام گردش میں بیٹھی ہوئی کنیزوں کی کنیز گھٹنوں میں چہرہ چھپائے بے تحاشا رو رہی تھی۔ اسے پتہ نہیں، اپنی قسمت پر رونا آ رہا تھا یا اپنی زندگی پر، کچھ ظاہر نہیں تھا۔ زندگی کس ڈگر پر چل رہی تھی۔ زوار حسن شاہ کسی نہ کسی حوالے سے اس کے لیے ایسی ہی مشکلات پیدا کرتا رہتا تھا۔ اس کی مجبوری اس کی ذات میں دوبارہ گزر آئی تھی۔ اب تک اس کے دل کو موم کرنے کے بجائے اور پتھر کر دیتی تھی۔ اسے لگتا تھا اس کا خدا اس سے ناراض ہے۔ ورنہ دل کو موم کرنا کیا مشکل ہے۔

اس نے سر جھکا لیا تھا، پھر آہستگی سے خود سے بولی تھی۔ ”نرم دل کی کھیتیاں اجاڑنے والے کیا اتنی آسانی سے محبت کی فصل کاٹ سکتے ہیں؟“

دل نے کمرے میں لے جا کر کھڑا کر دیا، پھر تقریر لگائی۔ ”یہ کیا کر رکھی ہے؟ موم دل تو خود آنسوؤں میں پگھلا کر بہا دیے تم نے، پھر پتھر سے دوستی میں اتنی الجھن کیوں؟...... مگر عنایا کبھی کبھی وہ گم ہو جاتا تو وہ گھٹنوں میں سر دیے کر رونے لگتی، یا پھر چپکے چپکے تسبیح کرتی رہتی۔ کبھی تسبیح بیٹھ جاتا، کبھی اس کی دعاؤں کا ہر ایک ورد واپس لوٹ آتا۔ اب تو جیسے اسے انتظار کرتے کرتے بھی تھکن ہونے لگی تھی۔ انتظار اس کے لیے ایک طویل خاموشی اور طویل خلاء کے سوا کچھ نہیں تھا۔ تئیس سال بعد اس پر کھلا تھا اس نے جیسے اپنے گھر کے دروازے سے قدم دنیا میں نہیں، ایک خلاء میں رکھ دیا تھا۔ ایک ایسا خلاء، جہاں زندگی نہیں تھی، آسیجن نہیں تھی اور وہ نیچے سے نیچے گرتی چلی جا رہی ہے۔

”اوئے، چل اُٹھ! بہت کام پڑے ہیں۔“ بوڑھی ملازمہ نے اسے ٹھڈا مارا اور وہ کراہ کر رہ گئی۔ ”کن کمینوں سے بھی گئی گزری ہے تو...... مالکن کہنے لگی ہے۔ کم بخت میری بیٹی کا گھر برباد کرنے پر تلی ہے۔ ادھر دیکھ، ہماری ساری نسلیں اس حویلی کی غلاموں کی غلام ہیں، ہمارا شجرہ نسب ہے، ہماری نسلوں کی پہچان ہے، ہمارے باپ دادا کا پیشہ ہے۔ تیری طرح تھوڑی کھوئی!“ اس نے اسے اٹھنے بھی نہیں دیا تھا اور سر کی چادر کھینچ کر زمین پر گرا دیا۔ وہ منہ کے بل گری تھی۔ پیشانی زمین کی خاک سے خاک ہو گئی تھی۔ بالوں میں مٹی بھر گئی تھی۔ اور تبھی اسے لگا تھا، اس کی ماں نے اس کا ہولے ہولے شانہ ہلایا تھا۔

”اٹھ نیک بخت! نماز پڑھ لے۔ جو سر سجدے میں جھکتا ہے، وہ ہزار سجدوں سے بچ جاتا ہے۔ پتہ نہیں، تجھے خدا سے، نماز سے کیا الجھن ہے۔ میرا تو دن نہیں چڑھتا جب تک میں بارگاہِ الٰہی میں سر نہ

جھکا ہوں۔"

"صرف جھکا ہوں......" اُسے لگا جیسے اُس کی ماں کا آخری جملہ اس کی زندگی کی نیچ لائن بن گیا تھا۔ "جو سر خدا کے آگے نہ جھکیں ماں! انہیں پھر وہ جھکا جاتا ہے۔ کبھی دکھ دے کر، کبھی بیماری دے کر، کبھی آزار دے کر، وہ جھکا دیا جاتا ہے۔ مگر صرف انہیں جن سے وہ پیار کرتا ہے۔ صرف انہیں راستہ دکھاتا ہے کہ سنبھل جا، زندگی کی سمت ٹھیک کر لے۔ جن سے محبت نہیں کرتا، ان سے بے نیازی اختیار کر لیتا ہے۔ جیسے سمجھدار دوست اپنے دوست کا بہتر کردار استقبال کرے مگر دوستوں کو بالکل بھٹکنے دینے والے کبھی اپنے مہمان خانے سے ہاتھ پکڑ کر نکالتے نہیں، پھر گلے سے بھی لگاتے۔

اُس کے اندر ماں کی کہی باتیں گونج رہی تھیں۔ وہ بھرے بھرے قدموں سے پیچھے ہٹی تھی۔ تب عارفہ کی بات نے اُس میں ہمت بھری تھی۔

"یا ماں! کبھی کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے، جو لوگ بہت پرہیزگار ہوتے ہیں، اُن کے لیے بھی دنیا داروں سے بھی زیادہ تنگ ہو جاتی ہے۔ وہ خدا سے پیار کرتے ہیں پھر بھی قدم قدم پر ٹھوکر لگتی ہے۔ قدم قدم پر مشکلیں انہیں مسل دیتی ہیں۔ پھر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ دوست تو ایسا نہیں کرتا۔ دوست تو اچھا نہیں کرنا چاہیے۔"

"نہیں کرنا چاہیے۔ پر دوستی کو جانچنے کا بھی تو کوئی ذریعہ ہے نا۔ تم محبت کرو کسی انسان سے، دل میں کہیں نہ کہیں شک تو ہوتی ہے نا، جان لو تمہارا محبوب یا محبت تم سے کتنی محبت کرتا ہے۔ کیا وہ تمہیں محبت کرتے ہمارے لئے دنیا ٹھکرا دے؟ تم سوچتے ہو ماں، کسی خوف سے یہ جانچ نہیں کرتے، کیا یہ وہ ہماری خاطر ہو جانے سے، کیا یہ تمہیں چھوڑ کر رسوائی دے، ٹال دے اور حقیقت میں محبت کو آزمائش میں ڈالنا بھی نہیں چاہیے۔ مگر خدا ہے، بادشاہ ہے اور بادشاہ دل کے شاہوں کی ہی تحمل بار بار پرکھتا ہے۔ انہیں جنہیں دار ہو وضع داری جو برداشت ہو...... تم نے کبھی کسی بادشاہ کو کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے دیکھا ہے؟"

"یا ماں پھر کوئی بادشاہ نہیں ہوتا۔ ہم عام لوگ کہاں جائیں؟"

"محبت میں عام لوگ ہی تو خاص ہوتے ہیں۔ میں نے کتنی بڑی حاجت کا ترک یہ نہیں کہ آپ عیش و عشرت، آسائش اور دنیا سے منہ موڑ لیں، تیاگ یہ ہے کہ آپ ان سب چیزوں میں شامل ہوں مگر آپ کا دل اندر سے درویش ہو۔ درویش بادشاہ ہے اور دل کا بادشاہ خدا کے آگے درویش ہے۔ عام ہو، بے سہارے تحمل بار بار کی صدا سمجھا اور سنے نہیں دیتی۔ وہ اس کی آنکھ سے دنیا کو دیکھتا ہے، اس کے کان سے سنتا ہے اور یہ محبت کی انتہا ہے۔ اس انتہا تک جانے کے لئے آزمائش گزارنی پڑتی ہے، جیسے نذر گزاری جاتی ہے۔ مالک کی مرضی نذر قبول کرے یا رد کر دے۔ دکھ، آزار، پریشانیاں، یہ سب اس محبت کے

جانتے ہیں کہ ہم کتنی جلد ہار جاتے ہیں اس کی کسی تکلیف پر جا کر چیختے ہیں یا ضبط سے نکل جاتے ہیں۔ عارف! ضبط سے گزرنا محبت ہے، محبت ... کیسی ہوتی ہے؟"

"ہاں! ابلیس نے بھی تو محبت کی تھی، پھر بھی وہ راندۂ درگاہ ہوا۔"

اس نے اس کے اس انوکھے سوال پر اسے دیکھا پھر مسکرا کر بولی۔

"تمہیں سدا بچوں میں بیٹھ کر بھی ایسی باتیں ہی کیوں آتی ہیں؟" اماں نے مسکرا کر اسے سر اٹھا کر دیکھا، پھر کہنے لگیں۔ "ابلیس نے محبت کب کی تھی؟ محبت تو رب نے کی تھی۔ ہزاروں برس ہزاروں سجدے دیں، ہزاروں برس کیں، کتنا سر جھکا، مستقل سجدے کیے، اس نے سر نہیں جھکایا اپنی عبادت کے زعم میں، وہ کلی کی اپنی ابلیس نے عبادت کی... عبادت وفا جان! اگر وہ محبت کرتی تو اگر وہ محبت کرتا تو محبوب کا حکم ماننے سے ہی پیچھے نہیں ہٹتا، محبوب کی تو بارگاہ میں ہاں کا سر ... پھر اسے حضوری ملتی، اس نکتے کو ہی سمجھ محبت میں انکار نہیں، محبت میں اطاعت و تسلیم خود سپردگی ہے۔ یہ سمجھو! یہ مجھ۔"

اور اس وقت وہ سارے فرشتے اس کے دل میں ... سجدے کو سے سمجھے، وہ اپنے اندر اکڑ ... اس نے بھی تو ... جو بس جھکا یا تھا۔ محبت کی بارگاہ میں، فرشتے اس رب نے اور اس نے اپنی خودی کے زعم میں سب گنوا دیا۔

کیا یہ مرا ... ختم ہوگئی میری ...؟ اس نے آسمان کی طرف سر اٹھایا۔ بغیر سوچ سمجھے ہی اس نے ... بیل بجا دی تھی، پھر سسک کر بولی تھی۔ "میں ... بھائی! کل سے آپ کا نمبر ملا رہی ہوں، لیکن نمبر بند ہی مل رہا ہے۔"

"اچھا... بتاؤ تم کہاں ہو؟ میں آ رہا ہوں تمہیں لینے۔"

وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اس کو کسی نے پیچھے سے پکڑ لیا تھا۔

"اچھا... تو یہ چکر بازیاں ہیں تیری... حویلی کے لوگ کم پڑ گئے جو باہر سے اپنے سگوں کو بلا رہی ہے؟ کس کو فون کر رہی تھی؟ بول!" اس نے اس کے بال پکڑ کر جھنجھوڑا تھا اور وہ روئے جا رہی تھی۔

"ارے ... فون دے دے۔ قسم سے میں کسی کو نہیں بلا رہی تھی۔ اسے ... مجھے فون دے دے۔ تیرے بچے جئیں۔" وہ گھٹنوں کے بل جھک کر گڑگڑانے لگی تھی اسے اچانک ایک عمل یاد آنے لگا تھا۔ اس کے سامنے کسی نے اس طرح گڑگڑا کر کہا تھا۔ "وے ... ایک روٹی کا سوال کرتی ہے۔ تیرے بچے جئیں۔"

"نہیں ہے میرے پاس۔ کچھ نہیں ہے۔ تجھ جیسی سنگدل باپ کی بیٹی کو ان کے گھر میں اپنا اختیار بھی نہیں دیں، چل بہت راستہ دے۔"
"کاش! تانیہ تمہیں جھٹکتے ہوئے کسی کو کیا پتہ، کس درجے میں کون ہو، کون اللہ کا مقرب بندہ ہو، کون کیا ہو، تمہیں دینا ہے تو دے، مجھ سے تنگ مت کر، دل مت توڑ، دل اللہ کے رہنے کی جگہ ہے، بادشاہ کے دل میں بھی وہی نقیر کے دل میں بھی وہی۔ کیا پتہ تیرے کس جملے سے اس کا کون سا نکتہ ابھر جائے، وہ کہاں اور کون سا دل ہے تجھے لگ جائے۔ مت رلا اسے۔"
"مجھے نہیں پتہ، تیرے باپ کی جیسی ادھم وہی۔ کچھ نہیں ملتا اس سے۔ یہ سب ڈھکوسلے ہوتے ہیں ان مانگنے والوں کے۔"
"بابا لے جا تجھے رب کا واسطہ مت ظلم کر مجھ پر...... مت توڑ، دیکھ میری عزت ٹوٹ رہی ہے، قدموں میں ہے۔ مت کر بابا لے، ایسا مت کر۔" اس نے اچانک ہی ان کے پیروں میں ہاتھ ڈال دیا، بابا لے نے ٹھوکر لگائی۔
"بہت ہو گیا اور تیری عزت...... بس......" اس نے سم سب مو بائل ذرا کے بیچ رکھ کر زنی طاقت سے بکل دیا، اور وہ اپنے مجبوری، بے بسی اور دکھ سے ابھی کوئی موت ہوئی ہے۔ اس کے ذہن پر وہی تمام گردش میں کہ مجھے پھر سے...
"مانی اور ذرا کال ہو گئی ہے بابا لے نے موبائل کھینچنے کی کوشش کی تو اس نے ہاتھ اس پر رکھ دیا، بابا لے نے اس کا ہاتھ بھی جکڑ لیا ہے۔ مانی، شاہ صاحب کو پتہ چلا تو برا ہوگا۔"
مانی نے ملازمہ کی طرف دیکھا، اس نے کندھے اچکا کر کہا۔ "شاہ صاحب پو چھیں تو کہہ دینا، بابا تو جو کچھ ہے تم کہا ہے، اس سے کہنا کچھ وہ لوٹ کر جا چکے گی اسے۔"
ملازمہ سر ہلاتی ان کے پیچھے کی اور وقت زرا گزر کے اتر تا چلا گیا۔
حویلی کی تمام گردش میں اس کا سانس گھٹنے لگا اسے بہرا زندگی سے نکلنے کی حسرت بھی ختم ہوئی محسوس ہوئی۔ کیا بات اس کے لئے سوچوں پر کہا لے جانے والے کچھ شہریوں نے اسے اغوا کر لیا تھا، اس کے ساتھ وہی مجبوری اور کہانی نے حویلی میں خبر دے دی تھی۔
"وہ کچھ کا کہا کر لے گئے تو...... وہ کچھ کر......"
زماں حسن شاہ کو بابا جام مر رہا تھا کہ تیزی سے اٹھا تھا۔ "کس کی مجال ہے، جو میری ملازمہ کو اغوا کر کے لے جا، میرے قدموں سے۔" اس نے بندوق لے کر باہر نکلنا چاہا کہ مانی نے اسے روک لیا۔
"مت جاؤ شاہ جی! آج کی شعلہ بانی پر وہ مارے لئے خطرہ ہے، کہیں یہ وہ بھی نہ ہو۔ فسادی ہو حویلی میں۔"

زوار حسن شاہ نے اسے دیکھا اور پھر روٹی کے بال مٹھی میں پکڑ کر غرایا۔ "بتا اتری بچی! تیرا کوئی بادروست تو نہیں؟...... تو اس سے جلتی تھی ناں...... بتا وہ تیرے آقا تو نہیں تھے جنہوں نے تجھے مخبری کو بھیجا کیا؟"

"نہیں شاہ صاحب! میری کیا مجال ہے؟ میں تو صرف گھر کی حفاظت کرتی ہوں شاہ صاحب! مجھے میرے بچے کی قسم شاہ صاحب!"

زوار حسن شاہ کی سوئی رگیں کچھ ڈھیلی ہوئیں مگر انہوں نے اس کی تلاشی نہیں چھوڑی۔ پھر ایک دن بابے لڑکی نے عبد مجید کو کپ کر دیا۔ وہاں کے پاس غلام گردش کے مہمان خانے میں آ گیا تھا۔ شہر سے اسپیشلسٹ ڈاکٹر کو بلایا گیا تھا۔ ...... اس کا ہم جنا بابا تو تھا۔

"کون تھے بابے! وہ جنہوں نے تیرا یہ حال کیا؟"

"پتہ نہیں صاحب! چار بندے تھے۔ پتہ نہیں کہاں سے آئے تھے اور کہاں سے نکلے تھے مجھے تو تیری بچی ہوئی شاہ صاحب! انہوں نے مجھے ایک مارنا شروع کر دیا۔ میں تو ان کی شکلیں بھی نہیں دیکھ سکا شاہ صاحب!"

"تجھے کیا لگتا ہے بابے! وہ لوگ خان کے آدمی تو نہیں تھے؟" زوار حسن شاہ نے پر خیال انداز میں اسے دیکھا تو وہ کراہ کر بولا۔

"نہیں شاہ صاحب! خان کی بات چھوڑیں وہ میری غلام گردش ...... ان کے خاصوں کا مخبر بھی تجھے ...... زوار حسن ایسا ہم کے خادموں کو ...... وہ کوئی اور تھے شاہ صاحب!...... بالکل کوئی اور......"

"کہیں یہ لوگ شہر کی خفیہ پولیس کے لوگ تو نہیں تھے؟"

"خفیہ پولیس کے لوگ؟" اس نے سوال کیا اور زوار حسن شاہ واپس سے بولا۔

"ہاں! آج کل وہ میرے پیچھے چھان بین کر رہی ہے بابے! اپنے شہر کے سارے لوگوں پر سخت کڑی ...... بھی نظر ہے بابا! سائیں کی لپیٹ میں آئے ہوئے ہیں۔ پتہ نہیں نجانے کہاں سے بس کھل رہے ہیں۔ میں تو یہی سوچ کر خاموش جا رہا ہوں کہ معاملہ ٹھنڈا ہو جائے تو آ جاؤں۔ ...... بابے! مجھے نہیں آ رہا وہ شہری لوگ کون تھے جو تجھے زخمی کر گئے۔ ...... کہاں گئے؟......

بابے! اطلاع ملنے کی خبر کو جانے والی ...... نے اپنے بندوں کو پھیر لگا دیا تھا۔ پولیس کی اپنے علاقے سے باہر نہیں گئی۔ تجھے نہیں آتا کوئی کہاں ہے۔ سارے طرف سے الجھن بڑھتی جا

رہی ہیں اور بابے اُف.... نہ بھی ٹانگیں تڑوا کر بیٹھ گیا ہے۔ پتہ نہیں وہ پھر سے کھڑا بھی ہو سکے گا یا نہیں؟"
بالاچ اپنی تکلیف اور ان کے خشک ہونے اور رونے کا انداز دیکھ کر پھر سے رونے لگا تھا۔
زوار حسن شاہ کو وہ بوڑھا اسے دیکھتا رہا۔ پتہ نہیں وہ کیوں ناکارہ ہو گیا۔ اس کی نظر میں وہ ان کے لیے بے کار ہو گیا تھا۔ ریس کے گھوڑے کی طرح، مالک جس پر اس وقت تک پیسہ لگاتا ہے جب تک گھوڑا ایک پر دوڑتا رہتا ہے۔ گھوڑا زخمی ہو جائے تو مالک اس کی تیمارداری نہیں کرتا۔ جیتنے کے عوض ایک کاروپ انعام میں دیتا ہے تاکہ اس کی موت زیادہ تکلیف دہ نہ ہو سکے۔
بالاچ اپنی اوقات سے زیادہ بوجھ اٹھا کر اس لیے رو رہا تھا۔ مکافاتِ عمل، وہ کبھی کسی کو کبھی نہیں بخشتا۔ آپ کے اعمال خود آپ کے سامنے سزا کی طرح آ جاتے ہیں۔ کبھی آپ کے سامنے کبھی آپ کی آگے کی نسل کے سامنے۔ مگر مکافات ہوتا ضرور ہے۔ وہ روئے جا رہا تھا اور اسے ایک ایک پل کا دکھ لگ رہا تھا۔
کبھی اپنی کسی غلطی کا احساس اتنی جلدی نہیں ہوتا مگر جب ہوتا ہے تو دل کا درد آنسوؤں سے بہہ جاتا ہے اور دل تڑپنے کی حالت میں آ جاتا ہے۔ سمندر بن جاتا ہے اور سمندر چٹانوں تک کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ وہ بھی ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

❀❀❀

"کون ہو تم؟.... چھوڑو مجھے۔" اس نے پوری طاقت سے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی اور ایک بہت تیز آواز کے ساتھ جھٹکے میں چلا کر دیا۔
"تمہیں یہ زندگی بہت پسند ہے کیا؟ کیا تم وہیں رہنا چاہتی ہو؟ تمہیں آزادی نہیں چاہیے؟ ہم تمہیں خود اس حویلی کے درندوں سے بچا سکتے ہیں۔ بتاؤ کیا تم اب چلنا چاہتی ہو؟"
اس کے جسم کا سارا احتجاج ختم ہو گیا۔ اس نے گھبراتے لہجے میں پوچھا۔ "کون...... کون ہیں آپ لوگ؟"
"تمہارے خیر خواہ ہیں۔ اور خیر خواہوں کے نام نہیں ہوتے، بس کام چل جاتا ہے۔"
"مگر آپ کو کس نے بھیجا ہے میرے لیے؟"
مگر چاروں میں سے کسی نے بھی کچھ نہیں کہا تھا۔ نیہران کی جیپ زوار حسن شاہ کی زمینوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی تیز رفتاری سے شاہ نواز کی زمینوں کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔

"آپ شاہ فیاض کے آدمی ہو؟" اس نے خوف سے کپکپاتے ہوئے بھرے گلے سے سوال کیا۔ کیونکہ یہ تو وہی تھا کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹک جائے۔ "آپ بتاتے کیوں نہیں ہیں؟ آپ کس کے آدمی ہیں؟"

"ہم اللہ کے آدمی ہیں۔ اللہ کے بندے ہیں۔ ہمارا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں، لیکن شاہ فیاض کے اوپر ہمارا ایک قرض ہے۔ ہمارے بابا نے ایک بار شاہ فیاض کے بیٹے کی جان بچائی تھی۔ بس اس لئے آج ہم اپنے کام نکلوانے کے لئے اُن کا استعمال کر رہے ہیں۔ جب تک حالات نارمل نہیں ہو جاتے ہم تمہیں شہر لے جانے کی غلطی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ شہر کی طرف جانے والی ایک ہی مین سڑک ہے۔ وہاں پر تمہارے سردار شاہ کے آدمی پہرہ دے رہے ہوں گے۔ سو تمہیں کچھ دن اور قید میں گزارنے پڑیں گے۔ لیکن یہ قید زوار حسن کی قید سے مختلف ہوگی۔ تم یہاں آرام اور عزت سے رہو گی۔"

مائرہ نے بازوؤں میں اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔

پھر تھوڑی دیر بعد وہ شاہ فیاض کی حویلی میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایک لیٹر نکال کر شاہ فیاض کی طرف بڑھایا تھا اور جواب طلب نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔ شاہ فیاض نے لیٹر پڑھ کر کافی دیر تک مراقبے میں غوطہ لگایا۔ پھر گہری سانس لے کر بولے تھے۔

"شاہ حسن اور ہم سے ہماری نسلوں کا جھگڑا چلا آ رہا ہے۔ ہمارے سارے خاندان کے بہت سے آدمی اور خاندان کے لوگ بھی اس تنازعے کا شکار ہوئے ہیں۔ لیکن آپ کے بابا کا ہم پر ایسا احسان ہے کہ ہم اس تنازعے کے باوجود آپ کی مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔" انہوں نے ذمہ داری لی تھی۔ پھر بہت ٹھہرے ہوئے انداز میں آواز دی تھی "امین احمد ادھر آؤ۔"

امین احمد "جی سائیں" کہتا ہوا آگے آیا تو انہوں نے دور کھڑی مائرہ کی طرف اشارہ کیا۔ "امین احمد! یہ لڑکی آج سے ہماری پناہ میں ہے۔ اسے ہم تمہاری ذمہ داری میں دیتے ہیں۔ یہ آج سے تمہاری رانی کی طرح ہے۔"

"جی سائیں!" امین احمد نے ہامی بھری۔ وہ شاہ فیاض نے پھر سے ٹھہرے ہوئے کہا۔ "امین! اور کچھ یہ میری بیٹی ہے تو تمہاری بھی ہے۔ ہماری پناہ کا مطلب پتا ہے۔ مجھے میرے دوست کے آگے شرمندہ ہونے نہ دینا۔"

"نہیں سائیں! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ یہ میری بیٹی رانی ہے سائیں! مجھے اپنی بیٹی کی قسم، یہ آج سے میری بیٹی ہے۔"

شاہ فیاض نے امین کے ہاتھ کو مائرہ کے سر پر رکھتے دیکھا اور اطمینان سے بولے۔ "آپ اب بے فکر ہو جائیں، یہ میرا خاص ملازم ہے۔ اب یہ اپنی جان تو دے سکتا ہے مگر آپ کی دی گئی امانت میں کوئی

خیانت نہیں کی، جتنا تو خیانت کرنے پہ سے ملتا ہے۔"

چاروں نوجوان اٹھ گئے تھے ساتھ ہی پچھلے دروازے سے باہر نکل دیا گیا تھا جہاں سے وہ یہاں آئے تھے۔

وہ ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی ایک اور غلام گردش میں گم ہو گئی۔ ایک غلام گردش خاموش کا راستہ تھا اور دوسری غلام گردش جانے کون سا راستہ دکھانے والی تھی۔ پتہ نہیں اس کا اگلا قدم خلاء میں پڑنے والا تھا یا زمین چھو لینے والا تھا۔ وہ ابھی بھی اپنی زندگی کی الجھنوں کو سلجھانے کی دعا کر رہی تھی۔

یہاں آ کر اس نے پہلی بار بہت بے فکر ہو کر کھانا کھایا تھا، جو کئی بار سجدہ کیا تھا اور اتنی اسے تنگ رہا تھا شاید ماں کے دکھ نے اس کے لیے کوئی دعا کسی قید پرندے کی طرح آزاد کی تھی، نئی زندگی میں ایک قدم رکھنے کی سبیل پیدا ہوئی تھی۔

"شہریار بھائی! کاش آپ مجھے ڈھونڈ سکتے، مجھے یہاں سے لے جا سکتے۔ مجھے ایک موقع زندگی سے ملوانے کی لا یعنی جنگ ختم کرنے کا، میں معافی مانگ سکتی۔ میں اپنی ماں کے قدموں میں بیٹھ کر تمام عمر معافی مانگتی رہتی۔ کاش مجھے... شاید میں پوری طرح بخش دی جاتی...... کاش......" اس نے دعا کرتے ہوئے گھٹنوں پہ اپنا چہرہ چھپا لیا۔

❁❁❁

سوہنی رشی اب ڈنر میں بہت گھل مل گئی تھی۔ ان کے اچھے رویے نے سب کے دل جیت لیے تھے۔ اتنے ماہ کے سیکھنے ہیں اور اس کی قابلیت دیکھتے ہوئے ان سب کے ذہن سے وہ خیال بھی نکل گیا تھا کہ وہ نا اہل یہ کے سفارش پہ اپائنٹ کی گئی ہے۔ ان کا خیال تھا ڈنر کے لیے اس سے اچھی ورکر ہزاروں انٹرویو کے بعد بھی ڈھونڈنا مشکل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کی بہترین دوست بن گئی تھی۔ آج وہ سب کھانے کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ساری ساتھی ورکرز تھیں، اس لیے سب کا اصرار تھا کہ وہ پردے کے پیچھے کا حسن دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ مسلسل انکار کر رہی تھی کہ ناجیہ نے سوال کیا تھا۔

"کیا تم شروع سے حجاب کرتی ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ چہرہ آہستگی سے بولی تھی۔ "پہلے میں بہت ماڈرن قسم کی ہوتی تھی۔ میری ماں مجھے اس بات پہ بہت ٹوکتی تھی۔ اس کا خیال تھا عورت کا چھپا رہنے والی شے کا نام ہے اور میں کہتی تھی کہاں ہم، وقت بدل گیا ہے... ماں میری نہیں اور چھپ جاتی۔ آج مجھے میری غلطی میں میری ماں کی بھی غلطی شامل تھی۔"

"غلطی؟........ تم نے بھی کوئی غلطی کی ہے؟" بہت ساری آوازیں ابھریں اور اس نے سر اثبات میں ہلا کر کہا۔

"ہاں میری غلطی...... میری ماں نے مجھ پر ہر وقت چیک رکھنا شروع کر دیا۔ میں بڑی ہوئی تو مجھے لگتا تھا، میں کوئی عادی مجرم ہوں، جو نظر بچاتے ہی کوئی گناہ کر گزروں گی۔ ماں کو ہر وقت مجھ پر شک رہتا۔ میری سہیلیاں انہوں نے کبھی بننے نہیں دیں۔ اُن کا خیال تھا لڑکی کی سہیلیاں بگاڑ دیتی ہیں۔ میرا کہیں آنا جانا نہیں تھا۔ جو سکول فرینڈز تھیں ماں نے ان سے بھی مجھے چھڑوا دیا۔ اُن کے فون آتے تو ماں اُن سے اُن کے فون کرنے کی اتنی تفصیل لینے بیٹھ جاتیں کہ پھر مجھ تک فون آتے آتے خدا حافظ کے نعرے میں بدل جاتا۔ کبھی ماں کے سونے میں، میں کوئی فون ریسیو کر لیتی تو ماں کو پتہ نہیں، کیسے پتہ چل جاتا، وہ فوراً اپنے کمرے کا ایکسٹینشن اٹھا لیتیں۔ رات کو کوئی بلا اپنے آنکھ کر آ کے دیکھتیں...... میرا بھائی کہتا، ماں تو سائیکو کیس ہے۔ میں اُسے جھڑک دیتی، کیونکہ مجھے لگتا یہ ماں کی محبت ہے جو وہ میرا اتنا دھیان رکھتی ہیں۔ بھی ماں کی اس محبت کی عادت تھی کہ میری زندگی میں پیش آ گئے۔

"رفیق...... اور وہ محبت کا وقت۔" تانیہ نے ہنس کر کہا اور اس کی آواز بھیگ گئی۔

"ہاں، ایسا ہی سمجھ لو۔ میں ارد گرد کے ماحول سے بھاگنے کے لئے اس راستے کال پر چھپ چھپ کر باتیں کرنے لگی۔ محبت ہو تو چار لڑکیاں بھی آ ہی جاتی ہیں۔ گھر کی گھٹن نے مجھے باہر جھانکنے پر مجبور کیا۔ پھر جب وہ کہتے، انہیں مجھ سے کتنی طوفانی محبت ہے تو میرا دل مچل جاتا۔ مجھے ماں کی ما نگیں محبت سے چڑ ہونے لگتی۔ بھائی کی سرد مہری سے غار آنے لگتی۔ اور بس پھر یہ محبت اتنی طوفانی ہوئی کہ میں نے گھر چھوڑ دیا۔ رفیق اور ماں سے میری شادی ہو گئی۔ گھر گھر سے نکل کر کھلا کہ گھر در حقیقت کتنی بڑی پناہ ہوتا ہے۔ بہت دھکے کھائے۔ رفیق مجھے کچھ ہی عرصے بعد سے چھوڑ گئے تھے۔ وہ جیسے چپکے سے لے گئے، میں نے انہیں اتنے ہی چپکے سے کھو دیا تھا۔ میں سڑکوں پر آ گئی تھی۔ پھر جب ہر ایک کی نظریں مجھ پر آ کر ٹکنے لگیں تو میں نے پہلی بار حجاب کیا۔ مجھے لگا، یہ حجاب نہیں، یہی میری ماں کا کھینچا گیا حصار ہے، جسے میں نے خود توڑ کر اس میں در بدر ہو گئی۔"

"تمہاری کوئی اولاد؟...... کبھی رفیق اور ماں سے پھر ملیں؟" بہت سے سوال۔ ساری لڑکیوں کی آنکھیں اس کے دکھ میں بھیگ گئی تھیں۔ کچھ نا کسی کو بھی یاد نہیں تھا۔

"وہ کتنی دیر تک بہت روتی رہی، پھر مدھم ہوئی۔ "ایک اولاد ہوئی تو تھی، لیکن غربت سے گھبرا کر میں نے اُسے ایدھی والوں کے جھولے میں ڈال دیا تھا۔ مجھے تو اتنا بھی پتہ نہیں، وہ بچہ میری بیٹی تھی یا بیٹا......"

انیلہ نے اس کے ہچکیاں لیتے وجود کو بانہوں میں بھر لیا تھا۔

اور بہت اچانک دروازہ دکھایا تھا۔ سارہ کہاں تم بھاگ گئی تھیں سانس بھی نہیں لیا تھا۔ وہ بھی ان کی سستی اور کاہلی اور ان کے وقت ضائع کرنے پر جھنجھلا کی طرح انہیں اچھی خاصی باتیں سنانے لگا۔ لیکن وہ کچھ نہیں بولا

تھا۔ اس کی آنکھوں میں سکوت تھا۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتا ہوا مسز رفیق کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ پھر بہت غیر متوقع اُن کا ہاتھ اُس کے سر پر آ ٹھہرا تھا اور بھرائے لہجے میں اس نے کہا تھا۔

”شادی کے بعد سے اکیلا مت سمجھنا۔ میں ہوں ماں، تمہارا بھائی نہیں لیکن مجھے اُن کے بعد تم بابا کی طرح عزیز رہو گی۔“

یہ کہہ کر وہ رکا نہیں تھا۔

سارہ کی آنکھوں کے چہرے پر بہت جیسے بت بن گئی تھی۔ شدہ وہ مسز رفیق کا وہ جواب لمحے کے آنے اور گزر جانے کے بعد لبوں کی زد میں تھا۔

تب تک کام ختم ہو چکا تھا۔ وہ سب اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور وہ خالی ذہن لئے اپنے ذہن کی بیزاری دوسری طرف گم صم تھا۔

اس وقت ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ آج لیٹ ہاتھ کام تھا اس لئے وہ پاپا کے انکشافات کے بعد اندر آ رہے پیچھے سے واپس فوراً آگیا تھا۔ اس نے یہ نہیں پوچھا تھا پاپا اس کی ماں کو کیسے جانتے تھے

کیونکہ اس نے پاپا کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ وہاں آج بھی ان کا کھویا ہوا دل چھپا تھا۔ وہ دل جو شاید ہار گیا تھا۔

وہ ریوالونگ چیئر پر بیٹھا جھولے جا رہا تھا۔ وہ مسئلہ کا بے چارگی بھرا خلا اس میں کوئی چھید کر رہا تھا۔ ”میری ایک ماں تھی۔ زخمی لیکن غربت سے گھبرا کر میں نے اُسے کل چھوڑ دیا تھا۔ میں بھولے میں ڈال دیا

تھا۔ مجھے تو اس کا پتہ بھی نہیں، وہ کیسے جیتا تھا بھی۔“

وہ اب ریوالونگ چیئر سے جھولے جھولے اٹھا تھا۔ باہر نکلا تو پتہ چلا سارا اسٹاف گھر جا چکا ہے۔

اتنی جلدی؟.....وہ ابھی تو کمرے میں آیا تھا.....اس نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ سارے خیالوں میں گھومتے ریوالونگ چیئر پر جھولتے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔

پھر وہ گھر جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے ڈائننگ روم سے جاری کھٹکا نظر آیا۔ ڈائننگ روم اور کچن ساتھ ساتھ تھے۔ کچن جانے کے لئے جس کا دروازہ کھلا تھا، وہ

ورکرز کے کھانے پکے جاتے تھے۔ وہ گاؤں کچن میں تھے جہاں وہ کھڑا تھا۔

”کشف، یہ ٹینشن کیسی رہی مجازی؟“

"ایک جنم پرست کلاس شیری بھائی!" وہ تمسخر سے بولا۔ "بکھراتے ہیں، وہ کام کی نیابت کی وجہ سے سنا جا اعصاب پر کنٹرول کھو چکا ہے ہو گا" شہریار عبدالرحمن سے وہ ایسے بات کر رہا تھا جس سے وہ نفرت کرنے لگا تھا۔

شہریار اس کی کیفیت سمجھ گیا تھا، پھر بھی اس کے ستانے پر اعتراض کر کے مدھم بولا۔

"بہت ناراض ہو گئے ہو مجھ سے۔ کیا تمہیں لگتا ہے میں واقعی چاہے جانے کے قابل نہیں ہوں؟" پتا نہیں اس لمحے ان کا سوال خالی خالی کیوں تھا۔ آنکھوں میں جیسے نمی اتر آئی تھی۔

جازی عبدالرحمن کوئی ٹھیک سی بات کہہ کر اس کا مزاج تحلیل کرنا چاہتا تھا، جن جانے کیا تھا اس کے بارے میں کہ وہ خاموش ہو گیا تھا۔

"جازی! بتاؤ ناں، کیا واقعی میں نے تمہاری محبت میں کوئی کمی رہنے دی ہے؟ جو تم مجھ سے اس طرح دور ہو گئے ہو؟ تم بھی مجھے چھوڑ گئے تم بھی..... تمہیں معلوم ہے میں تم دونوں کے بعد کتنا تنہا رہ گیا ہوں۔"

جازی عبدالرحمن ششدر رہ گیا تھا۔ پھر کم جیسے ہراساں ہوتا ہے، اس نے پلکیں جھپکا کر آنکھیں بند کر کے سے بولا تھا۔

"آپ کو آپ کی تنہائیوں نے تنہا کیا ہے شہریار بھائی! محبت کا راستہ آپ نے خود چھوڑا ہے۔ پھر الزام ہمیں کیوں دے رہے ہیں؟"

وہ جن کھڑے سے بیٹھ گیا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی، جو اس کے اندر روئے جا رہی تھی۔ اسے کسی کے کندھے کی ضرورت تھی۔ وہ بہت چیخ رہا تھا چاہتا تھا، مگر کس کے سینے میں منہ چھپا کر روتا؟ اس نے اب سر جھکا لیا تھا۔

"جاؤ! تم گھر جاؤ۔ میں واقعی لاحاصل جنگ جیتنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ واقعی محبت میرے لیے نہیں تھی جو میرے لیے ہوتی نہیں تھی۔ مجھے اس کی حسرت نہ کرنی چاہیے شاید۔"

جازی عبدالرحمن کے دل کو کچھ ہوا تھا، اس کے لہجے سے...... مگر تبھی اسی وقت اس کے کسی دوست کا فون آ گیا تھا۔ سو وہ باہر نکل کر سیڑھیاں طے کرنے لگا تھا۔

شہریار نے کمرے میں آ کر اپنے کمرے کی لائٹس بند کر دی تھیں۔ ملازم اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا وہ خاموش کیوں لگ رہا ہے۔ کیا اس کی طبیعت خراب ہے؟ مگر وہ کچھ پوچھ ہی نہیں سکا۔ مالک اور ملازم کے رشتے میں بندھا خاموش ہو گیا تھا۔

"تم گھر نہیں جاؤ گے عبدالرحیم؟" اس نے پلٹ کر نرمی سے پوچھا۔

رحیم نے اس کی طرف دیکھا پھر قدرے بلند آواز میں بولا۔ "سر! آج فائنل ہو جائے گا۔ سالار صاحب بہت دن سے مسلسل اسی جنگ میں مصروف ہیں۔"

"لیکن ابھی یہ میٹنگ تو آج ہونی تھی۔" اس نے رک کر سوال کیا اور اس نے پھر سے پوچھا۔

"جی، یہ جو میں کہہ رہا ہوں یہ کل سے میڈیا کے حوالے کیا جا رہا ہے اس لئے وہ ان کا کام فائنل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دو دن سے یہیں آ جاتے ہیں اور رات گئے تک مصروف رہتے ہیں۔"

"انہیں اسسٹ کون کر رہا ہے؟" اس نے اگلا سوال کیا۔

"مسٹر صاحب جمال ہیں ان کے ساتھ۔"

اس نے بتایا۔ صاحب جمال ان کی کمپنی کا بہترین دماغ تھا۔ اس نے قدم آگے بڑھا دیئے مگر پتہ نہیں کیا بات تھی جو اسے روک رہی تھی۔ وہ جاتے جاتے پلٹ آیا تھا۔ اب اس کے قدم اپنے میٹنگ روم کی طرف بڑھ رہے تھے سامنے ہی میٹنگ روم کے دروازے پا کر اسے حیرانی تھی مگر روم میں سالار عبد الرحمن اکیلے تھے۔

"میں نے تو سنا تھا آپ کو صاحب اسسٹ کر رہا ہے لیکن یہاں تو آپ اکیلے ہیں۔"

وہ اندر آیا اور سالار عبد الرحمن نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ شہریار کو یک دم کسی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ دوڑ کر ان کے قریب پہنچا تھا۔

"سالار بھائی! آپ ٹھیک ہیں؟"

سالار عبد الرحمن نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اپنا سر مسل رہے تھے اور شہریار عبد الرحمن کے ہاتھ پاؤں جیسے بہت سے لرزنے لگے تھے۔

"عبد الرحیم!...... عبد الرحیم!" اس نے چیخ کر بلایا۔ پھر انہیں تھام کر بٹھا دیا۔ سالار عبد الرحمن کچھ نہیں بول رہے تھے ایسا لگ رہا تھا وہ کسی غنودگی کی حالت میں آ گئے ہوں۔

شہریار نے ڈرائیور اور سارے ورکرز کو کھلے چھوڑ رکھے تھے جن پر وہ میڈیا میں بورڈ میٹنگ اور دوسری اگلی میٹنگ کا اہم انجام دے رہے تھے۔ ولنٹ کے ذریعے نیچے بھیجا تھا عبد الرحیم کو وہ فوراً بند کرنے کا کہہ کر تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھا تھا۔ پھر انہیں فرسٹ ایڈ کلینک بہت پہنچا کر اس نے سختی سے بات بند کر دیا تھا۔ سالار عبد الرحمن نے ایسی کی بات کر دی تھی کہ وہ کام کے دوران اندر بیٹھے تھے لیکن پھر بھی انہیں لگ رہا تھا ان کے جسم کا درد بڑھتا جا رہا ہے۔

"آپ گہرے گہرے سانس لیں جیسے کہ بھائی! بس دس منٹ، یہاں سے انکل صدانی کا کلینک بہت قریب ہے۔ آپ حوصلہ کریں۔ دیکھیے اپنے دماغ کو اندھیرے سے کم منٹ دو بجے وہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

اس کی سانس ان سے زیادہ تیز چلنے لگی تھی۔ ملک کی جنریشن بے ہوشی کا شکار ہو رہی تھی مگر پھر بھی وہ پوری توجہ سے ڈرائیونگ انجام دے رہا تھا۔

دس منٹ کا سفر پانچ منٹ میں طے کر کے وہ کلینک میں داخل ہوا تھا۔ ڈاکٹر صدانی کا کلینک ایک چھوٹا سا ہسپتال ہی تھا۔ حواس ٹھکانے تھے، وہ سالار عبدالرحمن کو بالکل ٹھیک جگہ لایا ہے۔ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ ڈاکٹر صدانی نے ایمرجنسی میں سالار عبدالرحمن کا ٹریٹمنٹ شروع کروا دیا تھا۔ وہ ان کے باہر جانے کے اصرار کے باوجود ان کے سر پر کھڑا تھا۔

سالار عبدالرحمن کے آدھے گھنٹے میں سارے ضروری ٹیسٹ ہو چکے تھے۔ پھر ڈاکٹر صدانی اس کے قریب آئے تھے۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے تھے۔

"بہت پیار کرتے ہو اپنے بھائی سے؟"

اس نے ان کے چہرے سے آنکھیں نکالی تھیں۔ وہ جلد از جلد پلٹ جانا چاہتا تھا اور وہ اسے دیکھ کر کہہ رہے تھے۔

"اگر کبھی بارش پر الم سوفی اور سالار کو کچھ ہو جاتا تو تم کیا کرتے؟"

"میں...... میں اسی وقت مر جاتا۔ مجھ میں کسی کو بھی ڈوبتے دیکھنے کی ہمت نہیں ہے انکل!" اب اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

ڈاکٹر صدانی نے اسے پاپا کی طرح اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ پھر انہیں...... وہ کیسے رکتے، وہ خود بھی جوش کا کندھا چاہتے تھے، اس لیے کندھا ملتے ہی آنکھوں کی حد وہ بچانے گیا پڑ گئے تھے۔ ڈاکٹر صدانی نے اسے رونے دیا تھا پھر ہولے سے بولے تھے۔

"جتنی محبت تمہیں سالار سے ہے تمہارے پاپا اور میں بھی تم سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں۔ پھر تم کیوں ہماری محبت سے کھیل رہے ہو؟ کیا ہم تمہیں کھو کر جی سکیں گے؟"

وہ ان کے کندھے سے آنکھیں رگڑ رہا تھا۔ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر نرمی سے بولا تھا۔

"میں بھی جینا چاہتا ہوں مگر ابھی حالات میرے بس میں نہیں۔ کچھ مسائل ہیں، ان سے نمٹ لوں تو جیسے کہا ایک چانس ضرور لینا چاہوں گا۔" وہ رک کر بولا۔

PAKCHAL.COM

"سنی بھائی کے ٹیسٹ کا کیا رزلٹ رہا؟" اُن کے کندھے سے الگ ہو کر سوال کیا۔
ڈاکٹر صمدانی نے مسکرا کر اسے دیکھا، پھر محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "سب کچھ ٹھیک آیا ہے۔ بہت زیادہ محنت سے اچانک مسکولز پین ہو گیا تھا۔ پھر نازک مزاج ہوا کرتے ہیں کہ بالکل ہمت چھوڑ بیٹھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے، سینے کے ساتھ شدید درد کو وہ ہارٹ اٹیک کی کنڈیشن سمجھے تھے اس لیے گھبرا گئے اور تمہیں بھی پریشان کر دیا۔ تم تو جانتے ہو وہ سینے میں اٹھنے والا ہر درد دل کی تکلیف نہیں ہوتی ہاں، پھر بھی ڈاکٹر سے چیک کروا لینا بہتر ہے۔"
"میں بھائی کو لے جا سکتا ہوں؟" اس نے اگلا سوال کیا۔
ڈاکٹر صمدانی نے نفی میں سر ہلایا، پھر نرمی سے بولے۔ "وہ ایک خواب آور انجکشن لے چکے ہیں، ان کی نیند تین چار گھنٹے میں کھلے گی۔ وہ خود سے جاگے گا تو بہت فریش ہو کر اٹھے گا۔ اس لیے تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔"
اس نے سر ہلایا تھا اور سماوار عبدالرحمن کے بیڈ کے پاس جا کر سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر فون کر کے اس نے رحیم داد کو بتایا تھا کہ گھر سے کوئی بھی فون آئے تو وہ یہی کہے کہ صاحب اور شہریار ڈرائنگ روم میں مصروف ہیں اور فون پر بات کرنے سے سختی سے منع کر رکھا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گھر والے سب پریشان ہوں۔ سو اس نے اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ آنکھ بند کی تو پاپا کی آواز آئی۔
"یہ بے خطا ہے۔۔۔۔۔ تمہاری ماں۔۔۔۔۔"
وہ جملہ ابھی پورا نہیں تھا کہ ایک خواب آلود بچی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔
بچی کون تھی؟۔۔۔۔۔ اس سے اس کا کیا رشتہ تھا؟۔۔۔۔۔ کیا کوئی رشتہ تھا جو وہ سمجھا تھا؟
ایک نیا سوال اس کے سامنے تھا، وہ اس کا جواب ڈھونڈ رہا تھا۔
"ڈیڈی! میں نے آپ کی شادی کے لیے ایک مرتبہ پھر بات کی ہے۔"
AANCHAL.COM.PK

اذ شے کے کپڑوں پہ چلتے ہاتھ یکدم رک گئے تھے۔ اس کی نظریں عافیہ بیگم پر تھیں مگر خفگی کی وجہ سے وہ ان سے بات نہیں کر رہی تھی۔ کیونکہ کل اتنے دنوں کے بعد اس نے عارف کے ساتھ کسی پارٹی پہ جانے کا

جیولری کا انتخاب لیا تھا کیونکہ اس کے باوجود کہ عارف اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا اس نے اسے ڈنر پہ بھی بلایا تھا مگر وہاں کا انتظار کر کے واپس لوٹ آئی تھی۔ پھر رات کو عارف کے سامنے اس نے یک

جھک کر کے ناراضگی کی جبکہ وہ اپنی تھی اور گاڑی لے کر نکل گئی تھی۔ پھر وہ واپس لوٹی تھی تو عافیہ بیگم نے بہت سختی سے اسے ڈانٹا تھا۔ پہلی بار اس نے پلٹ کر عافیہ بیگم کو کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن اس کی ذو معنی ناراضگی، وہ اپنی جگہ۔ اس لیے اس نے اس وقت بھی زبان کے بجائے آنکھ سے سوال کیا تھا۔

بیگم عافیہ نے اسے کندھوں سے یوں تھام لیا جیسے کل کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ پھر کان میں دھیمے لہجے سے بولی تھیں۔

”میں نے تمہاری ممانی کا رشتہ نکالا ہے اذ شے! شام تک علیزہ بھی آنے والی ہے، پھر ہم مل کر تمہاری ممانی سے ملنے جائیں گے۔ میں نے پتہ علیزہ کو بھی دے دی ہے۔“

”آپ کو ان دونوں کا نمبر کیوں چاہیے تھا؟ مجھے تو لگتا ہے اس میں بھی کوئی چال ہوگی آپ کی۔“

اذ شے کا طرز تخاطب شہریار کی کتنی سے بدل گیا تھا اس لیے عافیہ بیگم کو بھی وہ بہت پیارا ہو گیا تھا۔ یکدم انہیں یاد آیا تو بولیں۔

”اذ شے اتم نے شہریار کو لگے سے کال کر دیا ہے یا نہیں؟“

اذ شے نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر شرمیلی سی مسکرا کر بولی ”مجھے خود بھی حیرت ہے کسی کو پکار کر بڑا اچھا نہیں لگتا۔ ماسٹے واٹس ایپ پر مجبور ہوتا ہے۔“

عافیہ بیگم نے اس کے کندھے پہ محبت سے ہاتھ رکھا اور مسکرائیں۔ یہ کل کا تجربہ ہے جس نے اسے اتنا تو ہارٹ کر دیا ہے۔ پھر وہ کچھ سوچتی رہی تھیں کہ عارف صاحب کا فون آیا وہ اس سے کل کی مصروفیت کا ذکر کر کے کال کاٹ کر اس بیوی پہ معذرت کر دی تھی تاکہ اذ شے کچھ دیر تو ماننے کا بول دیتی رہی۔ پھر آفس کا ٹائم اس کی آواز پر لیک کرتی کھڑی ہو گئی۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے بدلے تھے پھر چلا دیا تھا۔

شام کے پانچ بجے اس کی واپسی ہوئی تھی۔ گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ علیزہ کی آمد پہ وہ بھاگ کر ڈرائنگ روم میں پہنچی تھی۔ عافیہ بیگم اس سے اتنی دیر میں شہریار اور اس کی وجہ سے اذ شے کے حوالے سے گفتگو کر چکی تھیں۔ علیزہ نے اسے گلے سے لگایا تھا پھر شرارت سے بولی تھی۔

”اتنا بدلاؤ شہریار کی وجہ سے؟ کیا پھر پسند کے وقت اسے کیوں منع کیا؟“

انوشے نے بہن کو مسکرا کر دیکھا پھر بولی۔ "وہ بہت سمجھدار ہے عجیبہ، مجھے تو وہ دوسرا مرد لگتا ہے علیزہ! تمہیں نہیں پتہ وہ اس کے ساتھ آپ جیسے ہوں تو بور نہیں ہوتے ہاں۔ آپ اس کے ساتھ چل رہے ہوں تو آپ کو لگتا ہے، ایک گہرا احساس تحفظ حصار ہے، جیسے تو ذکر کوئی پا لیا ہم آپ کو سمجھ نہیں سکتی۔ لیکن میرے دل میں ہوتا ہاں تو میں زندگی میں کسی بہت اچھی دعا کے طور پر اسے اسٹیج کر لیتی۔ تم کوشش کرو تو تمہیں بھی وہ بہت اچھا لگے گا۔"

علیزہ نے سر ہلا دیا تھا۔ پھر انوشے کچھ دیر ان کے ساتھ بیٹھی تھی اور کھانے کے بعد اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ آج انہوں نے پیچ علیزہ کی وجہ سے لیٹ کیا تھا۔ اس ٹرپ میں صرف تنہا علیزہ ہی آئی تھی، اس لیے بیگم عابدہ بھی پھر اس سے باتیں کر رہی تھیں۔ بات انوشے کی شادی پر پہنچی تو علیزہ نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

"ممی! مجھے عارف انوشے کے لیے بالکل پرفیکٹ لگتا ہے۔ پچھلے دنوں وہ پاپا کو ملا تھا تو وہ بہت اپ سیٹ تھا انوشے کے اس فیصلے پر۔ حالانکہ اب اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن وہ اتنا اچھا انسان ہے کہ انوشے کے اس فیصلے پر وہ صرف اس کی زندگی کی وجہ سے اپ سیٹ ہے۔ کہہ رہا تھا علیزہ! انوشے نے مجھے چھوڑ دیا، مجھے اس کا غم نہیں ہے۔ لیکن میں یہ نہیں چاہوں گا کہ وہ ایک ادھورا فیصلہ کر لے۔ جواد حسن کی شہرت پاکستانی کمیونٹی میں اچھی نہیں ہے..... میں نے خود پاپا کو اس سلسلے میں کئی مرتبہ وارن کیا ہے مگر پاپا بھی انوشے کی طرح حقیقت سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ممی! وہ لوگ بہرا سائٹ پر رہتے ہیں۔ ساری زندگی دوسروں کی زندگی پر اپنی زندگی جیتے آئے ہیں۔ انوشے خوش نہیں رہے گی ممی! کیا اسے کسی طرح روکا نہیں جا سکتا؟"

بیگم عابدہ نے بیٹی کو دیکھا پھر نفی میں سر ہلا کر بولیں۔ "میں اور تمہارے پاپا اس سلسلے میں کچھ بھی ایک بار نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں پہلے ہی بہت جھگڑا کر چکی ہے۔ اس کا خیال ہے میں ایک بہت بری ماں ہوں، جس لیے اسے خوش نہیں دیکھنا چاہتی۔ اب تم ہی بتاؤ اس سلسلے میں کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟"

علیزہ نے بیگم عابدہ کو بہت پیار سے دیکھا تھا۔ پھر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی تھی۔ "وہ تو پاگل ہے ممی! اسے کسی چیز کی تمیز ہی نہیں ہے۔ نہ ہی انسانوں کی پرکھ ہے۔ اگر نہ وہ آپ کی محبت پر میری طرح ہمیشہ فخر کرتی۔ ممی! دنیا کی کوئی بھی عورت آپ سے اچھی ماں نہیں ہو سکتی۔ آپ کو پتہ ہے، کبھی کبھی میں جب ان دونوں شیطانوں کو ڈیل کرتی ہوں اور پھر اپنا محاسبہ کرتی ہوں تو مجھے لگتا ہے، میں تو آپ جیسی تربیت، محبت اور ممتا کا عشر عشیر بھی اپنی اولاد کو نہیں دے پاتی۔ جتنا آپ نے ہمارے ساتھ کیا، ہماری زندگی کو دیا۔ ممی! میں چھوٹی ضرور تھی، لیکن مجھے وہ منظر آج تک نہیں بھولا ہے، جب آپ نے پاپا کی محبت اور وعدے پر اپنی بیٹی کے ہنستے ہاتھوں کو گھر کر دیا تھا۔ میں نے جب خود اولاد کی خوشی پائی، تب سمجھی ہوں، آپ نے کتنا بڑا ایثار کیا تھا اس وقت۔ ممی! آپ کی جتنی قدر کی جائے، اتنی کم ہے۔"

نافیہ بیگم کی آنکھوں میں ماں کی محبت کے آنسو بھر آئے تھے۔ پھر انہوں نے ان آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا تھا اور محبت سے بولی تھیں۔

"علیزہ! یہ حقیقت ہے، بچہ کبھی اپنی ماں کو نہیں بھول سکتا۔ کیا تمہیں اپنی ماں یاد نہیں آتی؟"

علیزہ نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا، پھر مدھم لہجے میں بولی۔ "شاید مجھے بھی کبھی کبھی ایک بار دل میں چبھن سی ضرور ہوتی ہے کہ کبھی میں ماں کو دیکھوں کہ ان کا غرور اب بھی ویسے ہی قائم ہے یا نہیں۔ محسوس کیوں کر کیا کبھی ان کے دل میں ہماری محبت نے کوئی کشش جگائی یا نہیں۔ بس اس لئے یاد آتی ہیں وہ... مگر محبت کے ذکر پہ تو صرف پاپا کا چہرہ آنکھ میں آتا ہے۔"

نافیہ بیگم اس کے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں پھیر رہی تھیں، پھر بے حد سنجیدہ لہجے میں وہ دوبارہ بولی تھیں۔

"میں نے تمہاری ماما کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ کیا تم ان سے ملنا چاہو گی؟"

علیزہ کے چہرے پہ جذبات کا ایک طوفان امڈ آیا اور نافیہ بیگم جانتی تھیں یہ فطری بات تھی، بچہ چاہے جتنا بڑا ہو جائے وہ ماں سے کبھی جدا ہو جائے مگر ماں یاد نہیں آتی۔ لیکن ایک دل کی ان کہی ہوتی ہے، جو ہمیشہ دل میں رہتی ہے اور بچہ زندگی سے ناخوش رہتا ہے، خوش بھی رہنا ہے تو بچی ہی کے ذریعہ اس کی آنکھ میں جگنو اور دل میں محبت کے جھونکے دبے پاؤں چلتے رہتے ہیں۔

نافیہ بیگم نے علیزہ کو اس کیفیت میں ڈوبے رہنے دیا تھا پھر نرمی سے بولی تھیں۔

"وہ نفسیاتی ہسپتال میں زیر علاج ہے۔ بہت تیزی سے ریکوری کر رہی ہے۔ آج شام ہم ان سے ملنے جائیں گے۔"

"شام ہونے میں ابھی بہت دیر ہے ماما!" علیزہ نے بہت کوشش کی تھی مگر جذبات کو کسی طور نہیں چھپا سکتی تھی۔ نافیہ بیگم نے علیزہ کے رخسار کو پیار سے چھوا تھا پھر مسکرا کر بولی تھیں۔

"تمہارے پاپا آجائیں تو پھر چلتے ہیں علیزہ! جب تک تم آرام کر لو۔"

علیزہ اٹھ کر گئی تھی مگر اس کے چہرے سے لگتا تھا وقت بہت آہستہ گزر رہا ہے۔ پھر سات بجے تھے جب سلیم اختر اپنے چہرے پہ ایک گہری سوچ سجائے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ بیگم نافیہ نے ان کا کوٹ اور بیگ تھام لیا تھا۔ پھر وہ صوفے پہ بیٹھ گئے تھے۔ جب انہوں نے ٹھنڈا ٹھنڈا صندل کا شربت انہیں پیش کیا تھا انہوں نے بیوی کی اس محبت کو مسکرا کر دیکھا تھا مگر چہرے کی سنجیدگی...... وہ کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔

AANCHAL.COM.PK

''خیریت تو ہے سلیم! آپ آج کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔''

انہوں نے چونک کر بیوی کو دیکھا، پھر سنجیدگی سے بولے۔ ''آپ ٹھیک کہتی ہیں عافیہ! زندگی میں اندھا بھروسہ کسی پر نہیں کرنا چاہیے۔''

''یعنی؟'' انہوں نے سلیم افسر کے ہاتھ سے خالی گلاس لیا۔ وہ پھر آہستگی سے بولے۔

''عابد صاحب نے واقعی ہمیں دھیرے دھیرے بہت خاموشی سے لوٹا ہے۔ آج ایک ہفتہ کی سوچ بچار کے بعد میں نے نیا سپروائزر وقاص رکھا ہے اور عافیہ! اس بندے نے صبح سے لے کر شام پانچ بجے تک جتنا بھی حساب کتاب آڈٹ کیا ہے، اس کے مطابق یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ عابد صاحب دیمک کی طرح ہمارے بزنس کو کھا گئے ہیں، بلکہ ہمارے ہی پیسے سے ہوٹلنگ میں قدم جما چکے ہیں۔ اگر ہم آج انہیں کرپٹ ڈکلیئر کردیں، تب بھی ان کی ساکھ اور شہرت سوسائٹی میں اتنی ہے کہ وہ ایک دن کے لیے بھی جیل نہیں جا سکتے۔ اٹس ٹرو، عافیہ! آپ بہت ٹھیک تجزیہ کرتی ہیں۔ آپ کی کہی ہوئی بات سے میں نے جب جب صرف نظر کیا ہے، واقعی مجھے بہت نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، آپ کی ایک حس ہم سے اضافی ہے۔''

بیگم عافیہ نے شوہر کے کندھوں پہ اعتماد سے ہاتھ دھرے تھے، پھر محبت سے بولی تھیں۔ ''میری اضافی حس محبت اور محبت کے خدا پر یقین ہے سلیم! میں پانچ وقت اس کے سامنے سر جھکاتی ہوں تو مجھے لگتا ہے میرے گرد ایک حفاظتی حصار سا بن گیا ہے۔ اب مجھ سے کچھ غلط نہیں ہو سکتا کیونکہ غلط کرنے پر وہ الہام کی طرح دل میں بولنے لگتا ہے۔ میں اس پہ حسن ظن رکھتی ہوں، اس کے آسرے پہ خوش گمان رہتی ہوں اور وہ کہتا ہے خود میں اپنے بندوں کے لیے ویسا ہی ہوں، جیسا وہ اپنے دل میں میرے لیے گمان رکھتے ہیں۔ عابد صاحب، بزنس ورلڈ چھوڑیے، اس کی طرف پلٹ آئیے۔''

سلیم افسر نے بے چارگی سے انہیں دیکھا تو نرمی سے بولیں۔ ''وقت ملنے کا، فرصت کے وقت اسے یاد کرنے کا ارادہ رہ جاتا ہے، جبکہ زندگی کبھی موقع نہیں دیتی۔ زندگی سے موقع لینا پڑتا ہے۔ ہم اپنے شریک سفر اور بچوں کے لیے بھی تو زندگی سے وقت خود چراتے ہیں، پھر اس کے لیے ہم کس وقت کا انتظار کرتے ہیں؟''

سلیم افسر نے بیوی کا ہاتھ تھام لیا تھا، پھر بہت مدھم لہجے میں بولے تھے۔ ''دل کی بے راہ گی...... لگتا ہے تمہاری باتوں سے جاتی رہی ہے۔ پھر جس کے ذکر سے زندگی میں اتنا سکون آ گیا ہے، خود اس سے ملنے کی آرزو، وہ یقیناً بہت بڑی خوشی دے گی۔ بس مجھے ہو گیا آج سے میں کچھ وقت نکالوں گا اپنے لیے۔''

بیگم عافیہ مسکرانے لگیں، پھر نرمی سے بولیں۔ ''آپ نے عابد صاحب کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

"کیا سوچوں گا؟ میں نے پہلی فرصت میں انہیں یہاں سے لے جانے کا حکم نامہ جاری کردیا۔"

"کوئی پرابلم تو نہیں ہوگی؟"

"ہو بھی سکتی ہے نہیں بھی۔ لیکن میں نے جو فیصلہ کرلیا ہے، میں اس پر قائم ہوں۔"

تجسم عاقب نے انہیں دیکھا پھر طلیحہ کی طرف، خیال ذرا دیر میں ان تک پہنچا۔ سلیم افسر گہری سوچ میں ڈوب گئے پھر آہستگی سے بولے۔

"تہمینہ کا خیال غلط نہیں ہے۔ جواد حسن، عابد صاحب کے دوست ہیں۔ یہ لوگ بہت طاقت ور ہیں اس لیے ان سے بڑے تعلقات ہیں، وہ بھی جب تہمینہ جیسی خیال فرازشاہ میں ہوتی ہے، وہ بھی اتنی گہری دوستی ہو۔ جواد خود بھی میری نظر میں ایک دم سے نیچے گرگئے ہیں۔" "وہ طلیحہ کو گھر کے باہر تو نہیں ہے۔" "جو محمود انوشے کی ضد تھی وہ بھی اس رشتے کے حق میں فیصلہ نہ دیتا۔"

تجسم عاقب ان سے متفق نظر آئیں۔ پھر شام کی چائے کے بعد وہ دونوں گھر سے نکلے تھے اور بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد نفسیاتی ہسپتال پہنچ گئے تھے۔

سلیم صاحب نے ڈاکٹرز کے پینل سے ہر گز نہیں جانے دیا تھا۔ طلیحہ اور انوشے ماں کے کمرے کا نمبر معلوم ہوتے ہی بے قراری سے کمرے کی طرف بڑھی تھیں۔ ڈاکٹر نے ان کی بے قراری کا سبب سے دیکھا تھا پھر سلیم افسر کی طرف دیکھ کر بولے تھے۔

"نجم کی دماغی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ نجم محمود اعصاب کی مالک تھیں اس لیے ڈرگ کا استعمال [illegible] انہوں نے تیزی سے اثر دکھایا ہے مگر......"

"مگر کیا ڈاکٹر؟" سلیم افسر نے بے تابی سے پوچھا۔

"ان کا دماغ آج سے پچیس سال پیچھے کے فریم میں جاکر اٹک گیا ہے۔ وہ یہ جان گئی ہیں کہ وہ کون ہیں، ان کا نام کیا ہے، لیکن اس کے ماضی کے حالات میں پرابلم ہوگی ہے وہ آپ کو جان احمد خان سمجھنے لگی ہیں اور ان کے ذہن سے یہ بات مٹ گئی ہے کہ وقت کتنا گزر چکا ہے۔" انہوں نے ڈاکٹر نے تفصیل بتائی تھی۔

وہ دونوں خاموشی سے اٹھ گئے تھے۔ پھر کمرے میں داخل ہوئے تو ان دونوں کے چہرے پر [illegible] تھا۔ کیونکہ طلیحہ دوبارہ سے رو رہی تھی اور انوشے سکتے کی کیفیت میں ماں کے بیڈ کے پاس بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا؟" تجسم عاقب نے طلیحہ کو چھوتے ہوئے پوچھا اور طلیحہ ان کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

AANCHAL.COM.PK

"ماما! میں بہت شرمندہ ہوں...... بہت بری کہ اپنی محبت میں اتنی سیلفش ہو گئی کہ آپ کی ساری ریاضت کو بھلا بیٹھی۔ ماما! یہ عورت...... یہ عورت ہماری ماں نہیں ہو سکتی، اس نے صرف ہمیں پیدا کیا ہے، مگر ہماری ماں نہیں ہو سکتی۔"

انوشے علیزہ کے کاندھوں پر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں احتجاج کا کوئی جذبہ پہچاننا کیسا مشکل تھا۔

سلیم قمر صاحب کے پاس وہ تیزی سے چلتے ہوئے پہنچے تھے اور صاحب نے بھی ان کی کوتاہی کی تھی۔

"آ گئے تم...... پھر میری زندگی اجیرن کرنے کیوں چلے آئے ہو؟...... چلے کیوں نہیں جاتے اپنی بچیوں کو لے کر؟ مجھے نہیں پالنی تمہاری اولاد...... جیسے اس کام کے لیے تھوڑی میں نے تم سے شادی کی تھی؟ مجھے نہیں پسند بچے۔ نفرت ہے مجھے بچوں سے۔ خواہ مخواہ زندگی کا حرج کروانے چلے آتے ہیں۔ یاد کرو بچے تو ہیں۔" وہ چیختے چیختے رکی پھر بولی۔ "ارے بڑی...... ارے دیکھو پتہ نہیں کس نے میرا ہیجا خراب کرنے بھیجا ہے۔ کیسی ہے کیا! اب میری کیا ہو۔ جب اتنی زندگی ناکام ہونے سے بچ گئی تو میں زہر کھا لوں۔"

انوشے سنانے لگی تھی جو کہ آواز لرزی ہوئی تھی۔ علیزہ نے اسے تھاما تھا اور اس نے رنجیدہ ہو کے بین کیا تھا۔

"ہائے علیزہ! کچھ چیزیں ختم ہو جاتی ہیں، کچھ لوگ کس قدر جلد کیوں ان کی یادیں خوب صورت ہو کر ملتی ہیں۔ یہ جسے کہتے ہیں کہ ہم کچھ چیزوں اور لوگوں کو یاد کرنے کے بجائے اپنی زندگی میں زندہ رہ کے جینا کیا اور پھر تمام عمر گریہ و زاری کرتے رہیں۔"

علیزہ نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور وہ چاروں باہر آ گئے تھے۔

"جب تک یہ بالکل ٹھیک نہ ہو جائیں، آپ ان کا علاج جاری رکھئے گا۔" سلیم صاحب نے گزشتہ مہینے کا حساب کلوز کرتے ہوئے نئے مہینے کے لیے کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد، آئندہ ہونے والے اخراجات کا چیک دیتے ہوئے کہا تھا۔

انوشے اس وقت حانیہ بیگم کے قریب بیٹھی تھی۔ وہ بہت زیادہ دل گرفتہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، جب حانیہ بیگم نے اسے خود سے قریب کرتے ہوئے پچکارتے کہا تھا۔

"دل پر بات مت لو انوشے! وہ بے چاری ابھی اپنی سدھ بدھ میں نہیں ہیں، یادداشت پوری طرح بحال ہو گئی تو دیکھنا کتنی محبت سے ملتی ہیں تمہیں۔"

علینہ نے عافیہ بیگم کو غصے سے دیکھا تھا اور پھر ان کے پاس سے اٹھ گیا تھا۔

"یہ عورت بھی تو ہے۔ اس سے خون کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ لیکن کیسے ہتھیلی کے چھالے کی طرح انہوں نے پالا ہے تمہیں۔ اور ایک وہ عورت تھی، اس نے جنم دیا تھا مگر اس کے اندر اب تک ممتا نے جنم نہیں لیا۔ ماں واقعی اس عورت جیسی ہوتی ہے۔"

علینہ نے عافیہ بیگم کے کندھے پر سر ٹکا کر ان کے لمس کی ٹھنڈک اور محبت کو ذرا محسوس کیا تھا اور تشنہ وہ ابھی تک سکتے کی کیفیت سے نہیں نکلی تھی، ورنہ جس طرح چھنائے جانے پر ناممکن تھا کہ وہ کوئی ہنگامہ نہ اٹھاتی۔

گاڑی ایک رفتار سے چکنی سڑک پر پھسلتی چلی جا رہی تھی، اور اسی طرح تشنہ ایک ایک پل گن رہی تھی، اس کے ہاتھ سے بھی زندگی اسی طرح پھسلتی جا رہی تھی۔

❀❀❀

شافعہ بہت بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہوئی تھی، حالانکہ ایسے حالات سے اس کا روز واسطہ تھا، پھر بھی وہ ناممکن ہی تھا، جب شبیر اس کے سامنے پیش آئی تو اس کی بیماری اور تعلیم یافتگی سے ذرا محسوس ہوتی تھی۔ ارسلان راشدی نے سنبھالا لیے، حالات کو اپنے قابو میں کیا تھا۔ ڈاکٹر کیس ہسٹری لے رہے تھے۔ فوری رزلٹ پا... شروع کر دی گئی تھی اور شافعہ کو بہت ہوش تھی کہ اس کی ماں کی ہر وقت رہنے والی کھانسی شدت اختیار کر گئی تھی۔

"مجھے یاد نہیں ہے کبھی ماں کی حالت ایسی ہوئی ہو۔ بابا! امیں تو کبھی ماں کا ہنستا... ٹی بی تشخیص دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑی، پھر اچانک......" ڈاکٹر کہہ رہے تھے انہیں دست الرجی ہے۔ گھر کا گرد میں خود روز صاف کرتی ہوں، اماں نے کبھی دست صاف کرتے، گھر کی چیزیں جھاڑتے ہوئے مٹی اڑتے پایا، یہ بھی الرجی شو نہیں کی۔ وہ تو سکون سے آنکھیں بند کیے لیٹی رہتی تھیں، پھر اچانک......"

ارسلان راشدی نے بیٹی کو کندھوں سے تھاما تھا۔ پھر نرمی سے بولے تھے۔ "بیٹا! بعض دفعہ ایسا ہی ہوتا ہے، کہ کسی بیماری کے جراثیم اندر ہی خاموشی سے سوئے رہتے ہیں، پھر اچانک کسی واقعے، حادثے یا بیماری کی کمزوری کی وجہ سے ایک دم جاگ کر ایکٹو ہو جاتے ہیں۔"

شافعہ نے ارسلان راشدی کو دیکھا، پھر نرمی سے بولی۔ "بابا! یہ دمہ تو ہر قسم کی بیماریوں میں کچھ پر درست ہو سکتا ہے، لیکن الرجی والا میں نے سنا ہے شروع سے بہتر ہو سکتی ہے۔"

ارسلان راشدی نے بیٹی کی بات کو رد نہیں کیا تھا۔ پھر ساری رات وہ دونوں نشستوں میں آمنہ کا دھیان رکھتے رہے تھے۔ اور پھر صبح سے پہلے آمنہ کو ہوش آیا اور سونیا کی آمد ایک سانحہ ہوئی تھی۔ شافعہ نے بیٹی کی بجائے بھری آمد کو قدرے نگاہ سے دیکھا تھا۔ "تم لاہور سے اتنی جلدی کراچی کیسے آ گئیں؟" سوال میں خوشی اور حیرت کا امتزاج موجود تھا۔

سونیا اس وقت ارسلان راشدی کی کسی بات کا جواب دے رہی تھی کہ چونک کر گلا کھنکھار کے بولی۔ "وہ ایک دوست کے ابو کی وجہ سے واپس آ گئی ہوں ممّا!"

شافعہ نے یہ جواب سن کر اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ ارسلان راشدی نے بھی بیٹی کے اس ایکشن کو حیرت سے دیکھا تھا۔ تب سونیا نے چہرے سے مسکرا کر کہا تھا۔

"بابا! مجھ کو فون ہی ایسا آیا تھا کہ میں بہت گھبرا گئی تھی۔"

آمنہ کو سارا منظر جیسے پھر سے یاد آ گیا تھا اور اس نے جو سوال کرنے سے رہ گیا تھا وہ پوچھا تھا۔

"یہ تم ہاسٹل سے رات کو کہاں غائب تھیں؟ ہاسٹل سے باہر رہنے کے کچھ اوقات کار ہوتے ہیں یا نہیں؟ اور تمہاری وارڈن، تمہارے ہاسٹل کے ایڈمن سب کو تمہارا [illegible] کیوں ہو جاتا ہے؟"

سونیا کو لگ رہا تھا وہ آج چوری کرتے ہوئے پکڑی جا چکی ہے لیکن پھر بھی جھٹلانے کو بولی۔ "مجھے ایک دوست کی مدد کو جانا تھا۔ ہم مخصوص دوست باہر تھے۔ جس نمبر پر آپ نے فون ملایا وہ میری دوست کا موبائل تھا جسے وقتی طور پر میں نے لے لیا تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ آپ سے رابطہ کرنے میں کوئی پرابلم نہ ہو۔ ہاسٹل کی وارڈن وغیرہ کا رویہ تو بے وجہ احمقانہ بات کہنے والے لوگ ہیں پسند نہیں کیا جاتا۔

ارسلان راشدی نے بیٹی کا عذر تسلیم کر لیا تھا لیکن شافعہ کی آنکھوں کی ناپسندیدگی چیخ چیخ جا رہی تھی مگر اس نے کمال [illegible] سے اپنے جذبات چھپا لئے تھے۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ "مجھے اپنی ایکسٹرا ڈیوٹی کرنی ہے سونیا! اس لئے اماں کا خیال تم رکھو۔ مجھے یقین ہے تم اس کام میں مجھ سے زیادہ بہتر کارکردگی دکھاؤ گی۔"

پھر یہ تیسرے دن کی بات تھی کہ شافعہ ہسپتال آئی تو ہر طرف سے نظریں آ کر اس پر ٹک کر رہ گئی تھیں۔ کچھ آنکھوں میں حیرت تھی اور کچھ آنکھوں میں تمسخر۔ یہاں تک کہ وہ اپنی ڈیوٹی کے لئے وی آئی پی روم میں داخل ہوئی تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ یہ ایک وزیر کے بیٹے کا روم تھا مگر اٹینڈنٹ اس کے دوست کے پاس تھی۔ جو محض دل بہلانے کے لئے یہاں ایڈمٹ تھا۔

شافعہ نے بہت تحمل سے اس کا جائزہ لیا تو [illegible] "مسز شافعی اشتیاق! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ان چند ایک نرسز میں سے نہیں ہوں جو اپنے لئے اچھا دام کرتی پھرتی ہیں۔"

تمہیں رزاق نے تمسخر بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا پھر والٹ اس کی طرف اچھال دیا تھا۔ "تم اپنی مرضی سے لے سکتی ہو مگر وقت میں اپنے حساب سے پیش کروں گا۔ کتنے پیسے چاہئیں، والٹ سے نکال لو۔"

شافعہ چلا پڑی تھی۔ اس نے بات اس کے منہ پر دے ماری تھی۔ "مجھے پتا ہے تم جیسے امیر لوگ، ساری سرمایہ داری کو دوام کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ پتہ نہیں تمہیں تمہارے ماں باپ پیدا کیوں کرتے ہیں۔"

"میں بتاؤں، کیوں پیدا کرتے ہیں؟" اس نے شافعہ کے بازو کو موڑ کر پشت پر جکڑا تھا، پھر غرا کر بولا تھا۔ "ہمارے باپ ہمیں تم جیسیوں کے لئے پیدا کرتے ہیں جن کی ساری عمر محنت کرنے، مسائل کے گرداب میں گھومتے گھومتے گزر جاتی ہے۔ جن لطف کا ایک لمحہ بھی قریب نہیں پھٹکتا۔ ہمارے ماں باپ کمانے ہی اس لئے ہیں کہ ہم تم جیسی چند پیسوں پر بکنے والی لڑکیوں کے ناز نخرے اٹھا سکیں۔ اب بولو، کتنا لوگی؟..... بتاؤ؟"

شافعہ نے بہت بے بسی محسوس کی تھی۔ کسی مرد کی جارحانہ گرفت سے نکل جانا اتنا آسان نہیں تھا لیکن اسے اپنے بچاؤ کے لئے جلد ہی کچھ سوچنا تھا۔ یکدم اس کے ذہن میں بجلی کی تیزی سے خیال کوندا تھا۔ اس نے ہاتھ کے قریب لٹکا ہیئر جسٹنگ پن کو استعمال کر ڈالا تھا۔

سیکنڈ نہیں گزرے تھے کمرے کے دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔ تبھی رزاق نے گھبرا کر اسے چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنا بکھرا ہوا بال ٹھیک کرتے ہوئے دروازے کا لاک کھولنے لگی تھی۔

"مسز! اور یوسف؟"

"یس مسز! اندر!" وہ تیزی سے باہر نکلی تھی جیسے کسی قید سے چھوٹ کر بھاگا ہو۔

ہاں کو..... وہ جیسے ہی جانے کے لئے اسٹاف روم میں آئی تھی تو سب کی نظریں اس پر سوالیہ طور پر اٹھی تھیں۔

"تمہاری ڈیوٹی کس کے روم میں کس نے لگائی تھی؟" مسز زیب نے سوال کیا۔ وہ مدھم لہجے میں بولی۔

"پتہ نہیں لیکن ڈیوٹی اور کے ساتھ ڈاکٹر نور کے دستخط تھے۔"

"ڈاکٹر نور....." مسز زیب نے قریب آ کر سوالیہ انداز سے دیکھا اور تیزی سے بولی۔

"ہمارا کارڈ ..... تمہارا تھا تم نے ہیئر جسٹنگ پن دیا تھا..... تم کس مشکل میں پڑ گئی تھیں بتاؤ؟"

اس نے سر جھکا لیا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھی بھر آئے تھے۔ تب سینئر انچارج نرس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا تھا۔

"امین کا خیال ٹھیک تھا، ڈاکٹر زون نے بھی رزاق کی ڈیوائڈ پوری کرنے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ یہ رول ہے، جو لڑکیاں اس کام میں دلچسپی نہیں رکھتیں، انہیں بلاوجہ تنگ نہیں کیا جائے گا۔"

"کیسا کام میم؟....... آپ کی باتیں الجھی ہیں۔"

سینئر انچارج نرس نے نرمی برقرار رکھی تھی، پھر بولی تھی۔ "دو گھنٹے کے پانچ ہزار کمانے کے اشتہار کبھی نظروں سے نہیں گزرے؟" وہ پھر بولی۔ "تم بہت سیدھی اور بھولی ہو۔ شاید آج ہی تمہاری ڈیوٹی بدلی گئی ہے۔"

"جی میم! میں دراصل چلڈرن وارڈ میں ہوتی تھی مگر......"

سینئر انچارج نرس نے اس کا کندھا تھپتھپایا تھا، پھر آہستگی سے بولی تھی۔ "اگر تم یہ سب نہیں کرو گی تو کل سے تمہاری ڈیوٹی تمہیں واپس مل جائے گی، تم آج کی بقیہ ڈیوٹی ریسیپشن پر دو۔"

شافعہ بہت سارے سوالات اٹھائے نیچے کی سیڑھیاں اترنے لگی تھی۔ پھر کوریڈور سے گزرتی ہی تھی کہ سسٹر زرین کی نشیلی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

"ڈاکٹر زون! آپ کیوں چاہتے ہیں، ہم جو کام اتنے سالوں سے بنا کسی جھنجھٹ کے کرتے آ رہے ہیں، اسے ایک نئی بلا جیسی الجھنوں کا شکار ہو جائیں؟ آپ کو معلوم ہے ناں، آج کل ایک صحافی ویسے ہی ہمارے ہسپتال کی واقعات ٹٹولتا پھر رہا ہے۔ اسے بڑی مشکل سے مطمئن کیا گیا ہے۔ لیکن اگر آج کچھ ہو جاتا تو پولیس کے ساتھ ہسپتال کو ہلا کر رکھ دیتی۔ آپ سمجھ رہے ہیں ناں میری بات؟"

شافعہ کے سامنے اپنے ہسپتال کے حوالے سے بہت سے سوالات واضح ہو گئے تھے۔ سلامہ نے بھی اسے اس کے ہسپتال کے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی، مگر وہ اپنے کام سے کام رکھنے والی ایسی لڑکی تھی کہ کچھ سمجھی ہی نہیں تھی۔ اب وہ ریسیپشن پر ڈیوٹی کے لیے آن کھڑی ہوئی تھی۔ چارج اسے دے دیا گیا تھا۔ آج کی ساری اضافی ڈیوٹیاں شام چھ کے بعد مجھے پانی تھیں۔ وہ مصروف تھی، جب وہ ڈاکٹر وہاں کھڑے ہو کر یہ گفتگو کرنے لگے تھے۔

"حرب قیامت کی نشانی ہے، آج کل مرد اور عورت بس پیسہ کمانا چاہتے ہیں۔ چاہے وہ حلال ذریعے سے ہو یا حرام...... تمہیں پتہ ہے، وہ بیڈ نمبر 37 کی مریضہ کے ساتھ آئی لڑکی، وہ پورے ہسپتال میں ان تین دنوں میں اتنی مشہور ہو گئی ہے کہ توبہ کرنے کو دل کرتا ہے۔ بار بس جاب کرتے فریش ڈاکٹرز، پرانے گھاگ شکاری قسم کے سینئرز میں وہ بات ٹاپک ہے۔ تین دن میں اس لڑکی نے پندرہ ہزار روپیہ

لئے تم یقین کرو گی ماں! تمہاری مہینے کی تنخواہ نہیں ہے۔"

شافعہ کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے تھے۔ وہ جو ہتھ زمین کو اپنی جگہ عارضی کھڑا کر کے اماں کے کمرے کی طرف گئی تھی پھر جانے کیا اس نے سونیا کو پاس اچک لیا تھا اماں نے غور سے دیکھا تھا۔

سونیا ارسلان راشدی کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اماں کی آنکھیں نوٹ دیکھ کر پھٹ گئی تھیں۔

"اتنے سارے نوٹ تیرے پاس کہاں سے آئے سونیا؟"

سونیا نے اماں کی طرف دیکھا۔ بگڑتی حالت پر قابو پا کر بولی۔ "میرے ساتھ چلیں نا ممی...... اماں ابھی کا بیمار ہے۔ ڈپریشن ہو رہا ہے۔"

"اماں! آپ کو پتہ ہے یہ...... کتنا برا کام کر کے یہ پیسہ کما رہی ہے؟" شافعہ نے اماں کو مخاطب کیا تھا۔

اماں کو اس دھندے کام کی نوعیت جاننے کے لئے پھر کسی اضافی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ نڈھال ہو کر رونے لگی تھیں۔ انہوں نے اس سے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔

"تم نے یہ راستہ کیوں چنا؟" شافعہ کی آواز تیز ہوئی۔

اماں نے دوپٹے سے چہرہ نکال کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "چیخ چیخ کر کیوں اپنی رسوائی کر رہی ہو؟...... مجھے یہاں سے لے چلو ہم گھر میں بات کرتے ہیں۔"

"نہیں اماں! آپ کی طبیعت...... وہ بھی زیادہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"تو وہ گھر میں اب اس جگہ ایک منٹ نہیں رکوں گی۔"

شافعہ نے پھر بہت کوشش کی مگر آمنہ ارسلان راشدی کا فیصلہ نہیں بدلا۔ شافعہ نے ڈاکٹر سے اپنی ذمہ داری پر انہیں ڈسچارج کروا لیا تھا اور اب وہ واپس اپنے گھر جا رہی تھی۔ سونیا کے چہرے سے صرف ناپسندیدگی کے عنصر کے علاوہ کوئی تاثر نوٹ نہیں کیا جا سکتا تھا اور اماں برسوں کی بیمار دکھائی دینے لگی تھیں۔

شام کو ارسلان راشدی واپس لوٹے تو بہت خوش تھے۔

"مجھے نئی نوکری مل گئی ہے۔ جس دوست کے ذریعے میں عارضی نوٹ کا کام دو دن سے سنبھال رہا تھا اس نے ایک بہت مشہور ... کے افسر کے ہاں بھیج دیا۔ انہیں ... چاہئے تھا۔ مجھے

AANCHAL.COM

آٹھ ہزار روپے ہے، مگر ترقی کی گنجائش ہے۔ انہیں میری سی۔ وی نے بہت متاثر کیا ہے۔ لیکن تم لوگ اتنی جلدی ہسپتال سے کیوں آ گئے ہو؟" وہ کامیابی کی خبر دے کر سب کی خاموشی سے چونک کر سوال کرنے لگے۔ تب شافعہ نے ساری داستان کہہ سنائی۔ سونیا زیادہ متاثر نہیں ہوئی۔ سلمان راشدی کمرے سے بیٹھ گئے تھے۔ پھر ان کے لب ہلے تھے۔

"کرپشن...... مجھے کرپشن اور کرپٹ لوگوں سے شدید نفرت ہے۔ آصفہ! تم کو معلوم، میں نے اپنے اس اصول کے لئے کیا کیا کھو دیا تھا؟ اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیا تھا، کیونکہ وہ کرپٹ تھی، وہ بے وفا تھی۔ اپنے بچپن کے دوست کو چھوڑ دیا تھا، کیونکہ وہ دھوکے باز تھا۔ میں نے دنیا سے اسی لئے منہ موڑ لیا تھا کہ مجھے ساری دنیا ایسی لگتی تھی۔ آصفہ! میں نے اتنے شدید صدمے کے باوجود تمہاری بیٹیوں پر اعتبار کیا، لیکن یہ بھی ویسی ہی نکلیں۔ آصفہ! یہ ویسی کیوں نکلیں؟ انہیں تو تم نے پالا تھا۔ یہ تمہاری بیٹیاں تھیں، پھر یہ عطیہ جیسی کیوں نکلیں؟"

آصفہ، سلمان راشدی پر پھر سے کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ ڈسٹ کوئی نہیں تھی، لیکن ان کا دمہ پھر سے اکھڑ گیا تھا۔ شافعہ نے انہیں فوری بٹھایا اور دوا دی تھی۔ انہیلر کا استعمال کرایا تھا۔ پھر بہت تھکے ہوئے اعصاب لے کر وہ اپنے کمرے میں اٹھ آئی تھی۔ مگر ساری رات اسے نیند نہیں آئی تھی۔ وہ ایک دو بار سونیا کے کمرے میں آئی تھی اور پھر اس نے غسل خانے سے پلنگ موڑ دیکھ کر تھکی ہوئی سونیا کو کچھ کر کچھ کہنے کی کوشش کی تھی، مگر اس نے شافعہ کے بولنے سے پہلے ہاتھ اٹھا کر فوراً اسے چپ کرا دیا تھا۔ پھر تھکی سے بولی تھی۔

"مہربانی کریں، مجھے کسی قسم کی نصیحت مت کیجئے گا، کیونکہ آپ جانتی ہیں، میں کتنی ضدی ہوں۔ اور پھر کیا بتایا جائے، اگر آپ کے پاس تجربہ، اصول ہے، اور آپ اس سے کامیابی کے دروازے کھل جا سم سم کہہ کر کھلوانے کی طاقت رکھتی ہیں، تو حرج ہی کیا ہے، یا جاہ ہی آزمانے میں؟"

شافعہ نے دکھ سے اس کو دیکھا، پھر نرمی سے بولی۔ "تمہیں نہیں پتہ لیکن اماں نے جس طرح ابا کا اعتبار اور عورت ذات پر سے یقین چھینا تھا، تم نے اسے پھر تاراج کر دیا ہے۔"

سونیا نے بیڈ پر بیٹھ کر اسے تمسخر سے دیکھا، پھر بولی۔ "پلیز! ابا کے اعتبار کی تو بات ہی مت کرو۔ اگر وہ اندر سے عافیہ چاچی کو اتنا اچھے ہوتے اس تو ہم بہت اچھی زندگی گزار رہے ہوتے۔ ابا کا مسئلہ کیا ہے، ہاں؟ وہ عافیہ چاچی کا الزام بھی دیتے ہیں، وہ سوگ بھی کرتے ہیں، وہ ان سے نفرت کرتے ہیں اور کہیں سے اندر سے خواہش بھی کرتے ہیں کہ وہ کاش کسی دن عافیہ چاچی آ کر انہیں کہہ دیں کہ وہ غلطی پر تھیں، مگر نہ اب تک عافیہ چاچی کے دل پر صرف وہ حکمرانی کرتے ہیں۔ ابا خود کہتے ہیں، مجرم نہیں، ایک ترتیب والی زندگی کیسے رہے؟ ابا کہتے ہیں، انہوں نے ہم پر اعتبار کیا، میں کہتی ہوں اگر وہ ہم پر اعتبار نہیں کرتے تو دوسرا آپشن کیا ہوتا ان کا...... گھر چلانے کے لئے تمہیں انہوں نے انسانوں کے جنگل میں پھینکا ہی تھا، اگر تم ان کی سگی بیٹی ہوتیں تو کیا وہ تمہیں اتنا لاوارث کا م

کرنے رہتے؟ کیا وہ اسی طرح کی بے عمل زندگی گزارتے؟ انہیں تو ہم پر اعتبار کرنا ہی تھا، کیونکہ تم سہیل راشدی کی بیٹی تھیں اور میں آفندی راشدی کی اولاد ہوں، میرے وجود میں آنے کا سبب محبت نہیں تھی، کوئی خود ساختہ دکھ تھا، تم کا جذبہ تھا۔ تم کا مجھے بابا پر بھی کبھی اور لڑکیوں کی طرح فخر نہیں ہوا۔ کیونکہ میں جانتی تھی، میں عملی زندگی میں قدم رکھوں گی تو تمہاری طرح کوئی نئی زندگی میری منتظر ہوگی اور میں زندگی کو گزارنے پر یقین نہیں رکھتی، زندگی کو جینے پر یقین رکھتی ہوں۔"

شافعہ کی زبان کو جیسے تالا لگ گیا تھا۔ کچھ باتیں ایسی تھیں، جن پر اسے سونیا کا نقطہ نظر ٹھیک لگا تھا۔ لیکن وہ اپنے بابا کے دل کی حالت اس لئے بہتر جان سکتی تھی کیونکہ کچھ دن پہلے ہی اس نے بھی اعتبار کھویا تھا۔ اگر کچھ عرصہ پہلے یہ سب باتیں سونیا نے کی ہوتیں تو وہ اس سے حرف حرف متفق ہو جاتی۔ ارسلان راشدی کو الزام دیتی۔ مگر اب اپنے دل کو دکھتا سا لگا تھا، کیا اسے یہ محسوس کرنے میں وقت نہیں ہوئی تھی کہ اس کے بابا نے کتنے تکلیف دہ سال گزارے ہیں۔ یہ محبت...... یہ محبت اچھے بھلے عملی آدمی کو بے کار، ناکارہ کر کے چھوڑتی ہے۔ اس کا نہ جینے میں شمار ہوتا ہے نہ مرنے میں۔ موت زندگی میں ایک بار آتی ہے مگر محبت کرنے والے ایک ایک لمحے میں ہزار بار مرتے ہیں۔

اس نے خاموشی سے سونیا کے بیڈ سے اپنے بیڈ کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے۔

❁ ❁ ❁

آج ماما کو اچانک کچھ خریداری کے لئے مال جانا پڑ گیا تھا۔ وہ اس وقت بالکل تنہا تھیں۔ پھر کپڑوں کی شاپنگ کے بعد انہوں نے جیولری سیکشن کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ ان کا خیال تھا وہ ونیا کی شادی کے حساب سے کوئی اچھا سا سیٹ خرید لیں گی اور پھر بزنس کمیونٹی کی طرف سے دو ایک فنکشن تھے۔ عبدالرحمن صاحب نے سلیم اختر کی بیٹی کی شادی کا نیوتہ بھی ان کے ہاتھ میں تھمایا تھا، اس لئے آج کی شاپنگ کچھ انہی خیالات کے تحت کی جانی تھی۔ وہ گھومتے گھومتے ایک شاپ کی طرف بڑھ رہی تھیں کہ ان کی آنکھوں میں حیرت در آئی تھی۔ انہیں اس شخص کو اس طرح دیکھنے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ انہوں نے ایک ٹک سر بابر کو دیکھا، کسی کی حسین گردن میں ہار پہناتے ہوئے بابر احمد ہی تھے، ماں کے بات، جس کے ہاتھوں میں وہ اپنی بیٹی کا سارا جیون دے چکی تھیں۔

انہوں نے بیگ سے موبائل نکالا تھا، پھر بیسٹ کر کے نمبر پریس کر کے منتظر دکھائی دینے لگی تھیں۔ کافی بیلز کے بعد فون ریسیو کیا گیا تھا اور انہوں نے اسے پوچھا تھا۔

"سحر بیٹا! آج آپ مصروف تو نہیں ہیں، ہاں؟"

دوسری طرف سے شرمندہ سا لہجے میں کہا گیا۔ "مصروف تو رہی ممی جی! لیکن آپ بتایئے آپ کو کیا کام تھا مجھ سے؟"

"یس بیٹا! بابا کو تمہاری ساری ذہانت کی ... ضرورت تھی تم تو جانتے ہو ان کو تمہاری جاب پر کتنا بھروسہ ہے۔"

دوسری طرف سے ہنس کے کہا گیا۔ "یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے ممی! ورنہ میرے بس کہاں تک کی بات نہیں۔ رہی سائٹنگ تو آج تو میرا بہت اہم ٹاسک بابا جینز ہوا ہے۔ ابھی پانچ منٹ بعد ہی بگ میٹنگ ہے۔ شام تک فارغ ہو سکوں گا۔ اگر آپ شام تک کا انتظار کر لیں تو۔"

"کیوں نہیں بیٹا! میں آپ کا شام کا انتظار کروں گی۔ آپ رات بجے گھر آ جانا بیٹا۔"

"جی جی! آپ بے فکر رہیں۔"

فون آف کر کے وہ پھر مصروفیت میں لگ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماما کو اس کے وجود سے تر سے بھرنے لگی تھی۔

"تم میری بات کے کام نہیں ہو شہریار ٹھیک کہتا ہے۔"

ماما نے جیسی تھیں کیا اور ... سے بنا ... بیدار ہو کے گھر آ گئیں۔ پھر اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں کہ پاپا کو انہوں نے سامنے سے گزرتے ملازم کو روک کر شہریار کا پوچھا۔

"آج صاحب گھر پر ہی ہیں۔ باہر نہیں گئے ہیں۔"

ماما نے سر ہلا کر ملازم کو جانے کا اشارہ کیا اور پھر وہ اس کے کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئیں۔ آہستگی سے انہوں نے دروازہ ناک کیا۔ وہ لیپ ٹاپ پر کسی کام میں بہت انہماک سے مصروف تھا۔

ان کو پتہ تھا کہ اس نے ابھی ... Send کی ہوئی فائل کو کھولا ہو ... دور ہو گیا تھا کیونکہ اب اس کے سامنے ایک لڑکی کی تصویر آ چکی تھی۔

...... ماسٹر وہ بہت اچھی طرح سے جانتا تھا۔

اس نے پشت پر کسی کی آمد کا احساس کیے بغیر سر بالکل انجان تھا۔ پھر جیسے کی لمبی قطاریں تھیں اور دوسری طرف ناطف کی بے نیازی۔

"ناراض ہوتا ہے خبیث۔" وہ بیٹا اور ماما کے ... سے پیارا ... اپنی سب اولادوں سے پیارا ... بہت خاص لگ رہا تھا۔ کیونکہ وہ بھی جان

AANCHAL.COM.PK

ایسا تھا جو ان کی نظروں سے اوجھل رہ جاتا تھا۔

اس نے اب پھر نمبر ڈائل کیا تھا اس بار کال ریسیو کر لی گئی تھی، تبھی اس نے خفگی سے کہا تھا۔

"کیوں بھئی، مہاراج آں کس بات پہ مصروف تھے؟"

"کیا مطلب؟ کیا صرف تم ہی عزت دار ہو؟ ہم اب اتنے بھی گئے گزرے نہیں کہ آدھی رات کو بلا کر فون ڈس کنکٹ کروانے کے باوجود پھر بھی اس طرح بنا جھجک کال کرتے رہیں گے۔"

شہریار نے اب کی بار سر ہلایا تھا، بھرپور ہنسی سے بولا تھا۔ "دو بار بلکہ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔"

"تو مجھے آج میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔" اس نے اوکے ڈس کنکٹ کر دی۔

شہریار نے سامنے دیکھا کہ پھر اس کا نمبر آ رہا تھا، فون نمبر دیکھ کر کال ریسیو کر لیا تھا اس نے، تب وہ غصے سے بولا تھا۔ "ابھی دو دن تو تیری آواز بہت خوش تھی، دو دن یاد کیا چلا گیا ان تیری زندگی سے پھر رہا بھی نہیں۔ قیامت تک نواز کرے گا میرے۔"

"بکواس مت کر، آج کل تیری کسی بلیک میلنگ میں نہیں آؤں گا۔ ہاں اگر تو بھائی لوگوں کو دی یاد رکھ کر بات کرے تو شرافت کرے تو کچھ سمجھے۔"

"شرافت کے بچے! اسی لیے تجھ سے کہ ابھی Send کی ہوئی ای میل سے فائل کے متعلق بات کرنا چاہتا ہوں اور تو ہے کہ کسی کو پتہ چل جاتا ہے۔"

"کیسے نہ پتہ چلے، میری طرح ہر وقت بندے کی عزت خاک میں نہیں ملاتا۔"

"کافی پیارے، اب تجھے عزت دار بننے کا شوق آخر کیوں چڑھ گیا ہے؟"

"بس میری مرضی۔" اس نے کہے بغیر پھر لائن کاٹ دی اور وہ ٹھٹک سا گیا۔

"ہاں سمجھتا کیا ہے خود کو، اس شوخ نے۔" اس نے موبائل بیڈ پر پھینک دیا۔

ماما اس کی ساری باتیں بہت دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔

یہ بچہ کتنا سادہ سا ہے۔ کیا پتہ جاناں کے معاملے میں بھی انہیں کوئی دھوکہ ہوا ہو۔ ماما کے دل میں ڈھیروں نئے سوال نے سر اٹھایا تھا۔

"بہت ناراض کر دیا ہے تم نے ناظف کو۔"

وہ چونک کر مڑا۔ "اوہ ماما! آپ...... آپ کب آئیں؟" وہ کرسی سے اٹھ کر تیزی سے ان کی طرف آیا پھر ان کے قدموں میں بیٹھ کر حیرت سے بولا تھا۔ "پہلی بار...... پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ کسی کے کمرے میں آنے کا مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ مجھے لگتا ہے، دواؤں سے میرے اعصاب اور حسیات خواب آور گولیوں کے مزے لینے لگے ہیں ورنہ آپ آئیں اور مجھے خبر نہ ہو۔"

ماما ہنس پڑیں۔ "بہت مزے لینے لگے ہو، ورنہ تمہاری صورت دیکھ کر مجھے کبھی ہلکی پھلکی شیر کی یاد آتی تھی۔" انہوں نے پھر ہنس دیا۔

"اچھا آپ کبھی اس طرح بھی مجھے دیکھتی تھیں؟" وہ مسکرا کر بولا۔ "آپ بہت مہربان ہیں ماما! مجھے خبر بھی نہیں ہوتی تھی اور میرا جانا مکمل ہو جاتا تھا اور یہاں دل تھا کہ حسرت میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا تھا کہ کبھی آپ مجھے عدیل بھائی یا سالار بھائی کی طرح تو دیکھیں۔ آپ کو نہیں پتہ لیکن آپ کی بے نیازی کی وجہ سے میرے اندر میری زندگی سے وحشت بھر رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا آپ کی آنکھ جو مجھے محبت سے نہیں دیکھتی تو پھر دنیا کی کسی دوسری آنکھ کی توجہ اور محبت کے لئے تڑپنا ہی چاہئے۔ اسی وجہ سے تو اپنی زندگی سے ناتا ٹوٹ گیا تھا۔ یوں زندگی کے قدموں کی آہٹ میں موت کی چاپ سننے کے لئے بے قرار رہتا تھا مگر اب......"

"مگر اب؟" ماما نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں کی رحل میں تھام لیا تھا اور وہ جذب سے بولا تھا۔

"مگر اب ماما! اب مجھے لگتا ہے، زندگی کو باقی رہنا چاہئے۔ اب میرا دل کرتا ہے موت کا بلاوا آئے بھی تو آپ سے ملنے کو جی چاہے تو دم نہ نکلے۔ سچ پوچھیں ماما تو سچ یہ ہے کہ آپ کی محبت کو پا کر میرا دل مرنے کو نہیں چاہتا۔ مجھے لگتا ہے، مجھے مکمل جینا چاہئے۔"

"تو جیو، تمہیں کون روکتا ہے؟" اب ماما نے پیشانی چوم کر اسے زندگی کی کوئی انوکھی دعا دی تھی۔ اس نے لفظ نہیں سنے تھے مگر دل میں احساس ہوا تھا کہ محبت نے اسے سب سے خوب صورت بندھن میں باندھ لیا تھا۔ اس نے ماما کے گھٹنے پہ سر رکھ دیا تھا پھر بہت چاہت سے بولا تھا۔

"زندگی طویل ہو یا مختصر، لیکن میں چاہوں گا، وہ آپ کی محبت میں گزر جائے۔" سر اٹھا کر انہیں دیکھا پھر لجاجت سے بولا۔ "مگر پلیز ماما! ابا اور جازی کی طرح آپ کبھی میرا محبت بھرا لہجہ مت سمجھئے گا، کبھی اپنا لہجہ مجھ سے سخت مت لیجئے گا۔ اب مجھ میں سکت نہیں ہے۔"

AANCHAL

ماما نے اپنے دل کو کسی خشک پتے کی طرح چٹخنے ہوئے پایا تھا۔ پھر جو کچھ ہوا تھا وہ سب ان کی ممتا کی ہتک تھا۔ انہوں نے شہریار کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔ کبھی اس کے کندھے سے سر نکالے رونے جاری تھیں۔ یوں جیسے اب تک کی ساری بے زاری، غصہ، خفگی ان آنسوؤں میں بہا دینا چاہتی ہوں۔

شہریار نے انہیں رونے دیا تھا۔ پھر کوئی دو منٹ بعد اس نے نرمی سے ان کی آنکھیں صاف کر دی تھیں۔ "یہ آنکھیں بہت قیمتی ہیں ماما! ان میں اگر پھر آنسو دکھائی دیے تو مجھے بہت تکلیف ہو گی۔"

ماما نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا تھا۔ پھر سنبھل کر بولی تھیں۔ "حافظ سے کیا کہہ رہے تھے، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"اوہو ماما! وہ تو صرف اسے خفا کرنے کا حربہ تھا۔"

ماما نے اس کا کان مروڑ دیا تھا۔ پھر مسکرا کر بولی تھیں۔ "بات مان لی تو بھی اس سوال سے نہیں بچ سکتے کہ کل چار بجے تک کہاں تھے تم؟"

"کل چار بجے تک...... وہ ماما! کل ایک لیڈ کا فائل تھا وہیں مصروف تھے ہم اور سارا دن گزر گیا۔"

"ماما نے کوئی نہیں کہا کہ آگے اور اپنی ایک ساتھ ہو سکتے ہیں۔ لیکن کام کی نوعیت دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاید تم سچ بول رہے ہو۔"

شہریار کا قہقہہ بہت جاندار تھا۔ ماما نے اسے اسنے خوشگوار موڈ میں دیکھا تو دل سے دعا کی وہ ہمیشہ یونہی ہنستا مسکراتا رہے۔

"آج آفس کیوں نہیں گئے؟" سوچتے سوچتے سوال کیا تو وہ مسکرا کر بولا۔

"آج مجھے ورلڈ کلاس فنکشن کے لیے منتخب کیے گئے ہال میں انتظامات دیکھنے تھے ماما! اور ان کے بعد فنکشن کی بکنگ بھی۔ ہر چیز میں وقت کی پابندی ضروری ہے۔ اور پھر تین دن سے جو ماڈلنگ کی ریہرسل ہو رہی ہے اس کو فائنل ٹچ دینا ہے۔ میک اپ کے لیے جس پارلر کو بک کیا گیا ہے، ان کا رزلٹ بھی آن دی دیکھا جائے گا۔ ریمپ شوز کا فنکشن ارینج کیا ہے، پارٹی میں موجود شرکا کے لیے کھانے کا انتظام، کیٹرنگ اور کمپنی ارینجمنٹ سب کام ایک ساتھ ہی لگ رہے ہیں، میں نے آفس سے چھٹی کر لی۔"

ماما نے اس کے رکتے ہی اس کے سر پر ہاتھ مارا تھا۔ پھر خفگی سے بولی تھیں۔ "اتنے سارے کام اکیلے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جازب اور سالار کو بھی اس سلسلے میں ساتھ لے کر چلو۔ آخر کو یہ تقریب ہماری ہے تو ان کی بھی تو ہے۔"

"ہم سب کام مل کر ہی تو کرتے ہیں مام!" پھر وہ خود گیا تھا الماری سے اس نے چیک شدہ سوٹ نکالا تھا اور حیرت سے گم لہجے میں بولا تھا۔ "مام! میرے روم میں دانیا آئی تھی کیا؟"

"نہیں تو..... دانیا کو آج کل یونیورسٹی سے فرصت ہی کب ملتی ہے جو وہ یہاں آئے۔ لیکن تم نے یہ کیوں پوچھا؟"

اس نے اپنی خوش گمانی کو خود ہی پرے دیا تھا پھر مدھم لہجے میں بولا تھا۔ "بہت دنوں سے میں اپنا کمرہ بہت ترتیب سے پاتا ہوں۔ ہر چیز بالکل اسی طرح ملتی ہے جس طرح دانیا کے ہاتھوں کی ترتیب کی وجہ سے ملتی تھی۔ سوچتا تو کافی دنوں سے رہا تھا کہ یہ سوال کروں گا لیکن ہر روز بھول جاتا تھا۔ اب آپ کہہ رہی ہیں دانیا میرے کمرے کی طرف آئی ہی نہیں پھر؟...... مام! یہ ترتیب کسی ملازم کے ہاتھ کی تو نہیں ہو سکتی۔ اور یہ صرف ترتیب ہی نہیں میرے کپڑوں کی استری، سیونگ بٹن...... ان سارے کاموں کی میں کسی ملازم سے امید نہیں رکھ سکتا۔"

ماما نے سوچا اور بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں حشمت خانم کی بات گھوم گئی..... "آج کل میرا زیادہ وقت اس کے کمرے کی دیکھ بھال میں گزر جاتا ہے۔"

ماما مسکرانے لگی تھیں، پھر الماری کے پٹ کھول کر اس ترتیب کو بڑی محبت سے چھو رہی تھیں۔ "ماں...... یہ صرف اماں کا اسٹائل ہے اور کل پرسوں وہ کہہ رہی تھیں کہ اب تمہارے کمرے کی دیکھ بھال میں ان کا زیادہ وقت گزر جاتا ہے۔"

"نانو...... ممانا نو یہاں سر کھپاتی ہیں اماں؟"

ماما نے اثبات میں سر ہلایا تھا پھر سنجیدگی سے بولی تھیں۔ "کل کی تقریب کے لیے کوئی اچھا سا سوٹ خرید لینا ہے اور ہاں نیلم شمع کی شادی ہے پرسوں، اس کے لیے بھی بازار جا کر کچھ خریداری کرنا ہے۔ تمہارے پاپا تو اس شادی کا بائیکاٹ کر رہے ہیں لیکن بیٹیوں کی شادی میں شرکت کرنے کو میرا دل ہی کرتا ہے۔ پہلے مجھے لگتا تھا شاید دانیا کی شادی نہیں ہو پا رہی اس لیے میرے اندر کا فرسٹریشن اس طرح بھاپ اڑاتا ہے مگر اب...... اب مجھے گمان ہوتا ہے، شاید یہ میری کوئی نامعلوم سی دعا کی گرہ ہے جسے میں ٹھیک طرح کھول نہیں پا رہی۔"

شہریار نے مسکرا کر واپس ماما کو دونوں کندھوں سے تھاما تھا، پھر آہستگی سے بولا تھا۔ "آپ غلط سوچ رہی ہیں خود کو۔ دراصل آپ ایک عورت ہیں مام! اور عورتوں کی شادی بیاہ پسندیدگی ہوتی ہے، پھر کسی کی خوشی میں خوش ہونا تو یہ کیفیت دل میں نرمی اور حلاوت سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ سو پلیز، آپ خواہ مخواہ الجھن میں نہ پڑیں، بس تیاری کریں۔ پاپا نہ سہی، میں ضرور آپ کے ساتھ اس شادی میں شریک ہوں گا۔"

"تم میرے لئے ناممکن کرلو گے شہریار؟"

"آف کورس ماما! میرا سارا وقت جو بیت گیا وہ بھی آپ کا تھا، جو بیتے گا وہ بھی صرف آپ کے نام ہے۔"

ماما اس کے جملے سے پہلے تو خوش ہوئیں پھر افسردگی سے بولیں۔ "لیکن بیٹا انسان ہونے کے ناطے شاید میں کم ہو جاؤں گی تمہارے بیٹے میں۔ تمہیں خوش کرنے کے چکر میں، میں یہ بھول جاؤں گی بیٹے شادی شدہ ہے۔"

شہریار ہنس پڑا تھا پھر ان کے کندھوں پر بازو رکھ کر جذب سے بولا۔ "آپ تمہیں کی بات کر رہی ہیں ماما، یہاں اپنی خوشی کے لئے دنیا چھوڑنے کی ہمت رکھتا ہوں میں۔ اور پھر...... " وہ شرارت سے ہنس کر بولا۔ "اور پھر ماما آپ بھی سوچیں کسی لڑکی کی شامت آئی ہے، جو مجھ سے شادی کر کے بیوہ ہونے کے ناطے یا شمپ لگائے گی؟"

"کچھ مت۔ خدا نہ کرے۔ ابھی میں وہ دن دیکھنے کے لئے زندہ ہوں۔"

وہ ماما کی خفگی محسوس کر کے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر لاڈ سے جھول گیا تھا پھر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اوکے اوکے..... اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ حضرت خضر کے ہاتھ سے کسی نے کئی صدیوں جینے کا نسخہ حاصل کیا تھا اس لئے موت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اب ٹھیک بولا ہے نا؟"

ماما نے اس کے سر پر چپت لگائی پھر نرمی سے بولیں۔ "لاڈلا ہو ماں کا، ورنہ تمہیں پتہ چلتا ان جوان بیٹے والے خیال سے سانس کیسے رک جاتی ہے۔"

"پلیز!..... ماں! سانس کو آرام سے آنے دیں ناں، نہیں تو بے موت مارا جائے گا۔"

"بھئی کہاں؟" ماما نے کان پکڑ کر مروڑا تو وہ چیخنے لگا۔ جیسے بمشکل چھڑوا کے لئے، بھاگ کر روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ماما اسے جاتا دیکھتی رہیں پھر آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئیں۔ ابھی انہیں ڈنر کے انتظام کے لئے سب سیٹ کرنے کی ذمہ داری بھی نبھانی تھی۔

شہریار تھکا ہارا تھا، کمرے میں جا کر اس کو موبائل بجتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے بالوں کو تولیے سے خشک کرتے ہوئے نمبر دیکھا، حافظ کا نمبر تھا، پھر نظر انداز کر دیا تھا۔ موبائل پھر بجنے لگا۔

"پیر تو نہیں ہو گیا تھا کہیں بھی نہیں سنائی دے رہا۔" اس وقت وہ غصے سے جھنجھلا گیا تھا۔ جتنی جلدی نکلنا چاہ رہا تھا، اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ اس نے نمبر دیکھے بغیر موبائل آف کر دیا تھا۔ پھر سارے کاموں سے فارغ ہو کر شام سات بجے وہ ڈنر پر پہنچا تھا، کیفے میں ہر شخص کو اس نے کافی سراہا محسوس کیا۔ وہ سیدھا ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔

"خیریت دفتر میں بم کی دھمکی آئی ہے کیا؟"

انیلہ خوف زدہ ہو گئی تھی پھر مدھم ہو کر بولی۔ "سالار صاحب نے صبح سے دفتر سر پہ اٹھایا ہوا ہے۔"

"مگر کیوں بے بی؟" وہ کرسی پہ بیٹھ گیا۔ پھر پہلے کہ وہ اسے بتاتی اس کا موبائل پھر بجنے لگا۔ نمبر بابا کا تھا۔ اس نے فوراً ریسیو کیا۔

"جی بابا جی۔"

"میں تو وہیں ہوں جہاں ہونا چاہئے...... آپ بتایئے آپ اتنے کیوں گھبرائے ہوئے ہیں؟ خیریت؟"

بابا نے ٹھنڈی سانس لی اور دھیرے سے بولے۔ "آج دفتر جانے کا ارادہ ملتوی کر دو، تمہارے لئے حالات بہت خراب ہیں۔"

وہ ہنس پڑا۔ "بابا آپ پیشین گوئیاں کب سے کرنے لگے؟ کیا ہوا ہے؟ میں صبح اچھا بھلا آیا ہوں، اچانک کیا ہو گیا کہ ایسے حالات شروع ہو گئے؟"

"شہریار تم سمجھ نہیں رہے ہو۔"

"تو آپ سمجھا بھی کہاں رہے ہیں بابا؟" وہ بابا کی بات کی وجہ سے خوب جھنجھلا گیا تھا۔ پھر بابا کچھ بتانے کی کوشش کرنے ہی والے تھے کہ اس کے سر پہ اچانک بم پھٹ پڑا۔ وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے آئے۔ وہ جھٹکے سے مڑا۔ سالار بھائی غصے میں سرخ ہوتے ہوئے اس کے سر پہ کھڑے تھے۔

"میرے کمرے میں آؤ۔"

"واپس زندہ جانے کی گارنٹی دیتے ہیں تو آتا ہوں۔"

انیلہ نے ہنسی بمشکل روکی۔ سالار بھائی کو اس بات سے اور بھی پتنگے لگ گئے۔ وہ اس کا بازو پکڑ کر تقریباً اسے کمرے میں لے کر چلے گئے پھر پوری طاقت سے دروازہ بند کیا۔

"ٹوٹ جائے گا سالار بھائی!" اس نے کہا۔ پتہ نہیں یہ تشبیہ دروازے کے لئے تھی یا بازو کے لئے مگر ایک نئی گتھی تھی۔ انہوں نے اسے صوفے پہ لے جا کر دھکا دیا تھا پھر غرا کر بولے تھے۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری سبجیکٹ کی ہوئی ماڈل کو یوں نکالنے کی؟"

اس نے سر ہلایا، پھر ہلکا گہرا سانس لیا۔ "وہ بے حد مہنگی ماڈل تھی اور ورلڈ ریکٹ کر رہی تھی حالانکہ اس کے ساتھ اس کی بہت ماڈل ورش ہی تھی مگر وہ اسے بھی جگہ جگہ لیٹ ڈاؤن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پچھلی دفعہ میں ہماری ایڈورٹائزمنٹ کا چکر دو دفعہ لگا کر آ جاتی ہیں اتنی دیر تک تو اس کو میک اپ اور پوز نہیں ہوتا تھا۔ بس اس لیے میرا دل اتنا برا ہوا کہ میں نے اس کو فوری فائر کر دیا۔"

"فوری فائر کر دیا...... تمہیں معلوم ہے اس سے جو کنٹریکٹ اس سیزن کے لیے طے پایا ہے اس میں ہماری طرف سے شرط تھی کہ اگر وہ اس سارے عرصے میں کسی اور جگہ ریمپ کرے گی یا فوٹو شوٹ کروائے گی یا ماڈلنگ ریمپ پر دکھائی دے گی تو جو رقم ہم نے اسے اس کنٹریکٹ پر ادا کی ہے وہ واپس ہمیں ڈبل کر کے لوٹانی پڑے گی۔ لیکن اگر ہمارا معاہدہ ہماری طرف سے ختم ہوتا ہے تو وہ یہ شق ہم پر لاگو ہو گی۔ تم جانتے ہو تمہاری اس غلطی کی وجہ سے ہمارا جو سرمایہ آل ریڈی بزنس میں لگا ہوا ہے اس کے ہوتے ہوئے اتنی بڑی رقم کو یکمشت دینا اور وہ بھی بغیر کسی پرافٹ کے کتنا بڑا بوجھ بن جائے گا؟ سال بھر کا کنٹریکٹ تھا ہمارا اس کے ساتھ۔"

شہریار نے رقم جوڑی اور ٹھنڈا سانس بھرا۔ یہ رقم واقعی ان کی اس کنڈیشن میں ادا کرنے جا فیشن اینڈ اسٹائل کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئے، پھر اس بار دھیمے لہجے میں بولے۔ "میں نے معاملہ حل کرنے کے لیے اسے آج شام کی دعوت دی ہے۔ اگر تم اس سے معذرت کر لو اپنے رویے کی تو......"

"یہ ناممکن ہے۔ میں ایسی میڈیا کرتم کی لڑکی سے معافی نہیں مانگ سکتا۔" وہ کھڑا ہو گیا اور سالار عبدالرحمن کا پارہ پھر سے چڑھ گیا۔

"تم اس سے معافی نہیں مانگ سکتے تو رقم کا بندوبست کرو۔" وہ پھر غصے سے بولے۔ "آخر تمہیں ہمارا نقصان کر کے کوئی سکون ملتا ہے کیا؟...... آئے دن کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کیے رہتا ہے تمہارا۔ ایک معاملے پر تعلق کرو، دوسرا منہ کھولے کھڑا ہوتا ہے۔" وہ رکے، پھر بولے۔ "کل آئی پیر جیسی تھی؟ کیا کمپیوٹر آف نہیں کر سکتے تھے؟"

ایک نیا چارج۔ اس نے اعصاب ڈھیلے ڈال دیے پھر مرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آخر ہوا کیا؟ پتہ تو چلے۔"

"پتہ چلا تو کیا کر لو گے؟" وہ پھر غصے سے بولے۔ "کراچی میں لوڈ شیڈنگ کا معلوم ہے نا۔ پھر بھی جو احتیاط کر رہی تھی تم نے ایڈیٹنگ روم کے تینوں کمپیوٹر کھلے چھوڑ گئے۔ دفتر میں کوئی تھا نہیں جو جنریٹر آن ہوتا۔ جھٹکا لگا اور ایک کمپیوٹر اڑ گیا۔ جس ایڈ پر کام کر رہا تھا بار بار بجلی کے آنے جانے سے پورا ایڈ اڑ گیا۔ وہ تو شکر ہے اور بیک اپ سے میں نے کاپی کر رکھا تھا ورنہ سارا کام خراب ہوتا اور ہرجانہ بھی

طرف سے تحریا نہ تھا۔ شہریار! میں تمہارا آخر کروں کیا؟"

اس نے کچھ نہیں کہا۔ کیونکہ اگر اس وقت وہ کل کی کنڈیشن دہراتا تو جواب بھی ملتا۔

"وہ روز بڑا تھا اب۔ میں مرد نہیں سمجھا تھا جو بنا تھا بھی ہوتا۔"

سالار بھائی ایسے ہی تھے۔ غصے میں اپنی غلطیاں تک دوسروں پر تھوپ دیتے تھے کہ "میں غلطی کر رہا تھا تو روکا کیوں نہیں مجھ کو۔ ابا! عجیب تھا وہ بھی ان تک شعبہ یا شہزادی سے بولا۔

"میں جاؤں بھائی؟"

"کہاں جاؤ، پہلے یہ بتاؤ یہ ہرجانہ کون بھرے گا؟"

"کیپیٹل کا ہرجانہ میں بھرنے کو تیار ہوں۔ کاٹوں چیک؟"

سالار جیسے انہیں جھٹکا دے رہے تھے۔ "کیپٹل میں نے بخشا۔ مسئلہ ہے میں تو داماد کی بات کر رہا ہوں۔"

"میں نے پہلے کہہ دیا ہے، میں معذرت نہیں کروں گا۔"

"نکل جاؤ پھر۔ میں یہ بات پاپا سے ڈسکس کروں گا۔"

"شکریہ برادر آج سے بھائی!!" اس کی شوخی کسی طور کم نہ ہوئی۔

اور انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ "دفع ہو جاؤ، کیونکہ میں جان گیا ہوں، تمہیں صرف ناراض ہونے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔"

"شکریہ، میرے پیدا ہونے کے کسی سبب سے تو آپ متفق ہوئے۔" وہ باہر نکل گیا۔ اس کی پشت پر دروازہ بہت زور سے بند ہوا تھا۔

دو دن کی عزت افزائی پر وہ سیدھا پاپا کے دفتر کی طرف چلا گیا۔ پھر ان کے دفتر میں داخل ہوا ہی تھا کہ بہت تیز تیز آوازوں سے اس کا دماغ جھنجھنا گیا۔

"یہاں بھی جھگڑا......" وہ بڑبڑایا۔ تب ہی اچانک اس کے کانوں میں آواز پڑی۔ یہ آواز یقیناً نجم صاحب کی تھی۔

AANCHAL.COM.PK

"سعید الرحمن! ابھی تم سے پوچھ رہی ہوں، میری بہن عطیہ کہاں ہے؟ میں نے اُسے تمہارے گھر پہ چھوڑا تھا۔ میں ارسلان راٹھور کی بیوی بن چکی تھی، میں نے صرف تمہاری آنکھوں کی سچائی پہ اعتبار کیا تھا۔ تم نے کہا تھا وہ بہت اچھا انسان ہے۔ وہ نیک دل ہے، وہ عطیہ سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے، وہ جو حاکم کا انسان ہے، وہ خاندانی شرافت میں ہے۔ یہ سب تم نے مجھے کہا تھا اور میں نے ان باتوں میں سے کسی بھی بات کی چھان بین نہیں کی تھی اور عطیہ تمہیں سونپ دی تھی۔ میں تو اُن کی شادی میں بھی شریک نہیں ہو سکی تھی۔ لیکن سعید الرحمن! آج میں سلیم کے گھر میں گئی تو وہاں میں نے ارسلان راٹھور کو دیکھا۔ میں نے عطیہ کے بارے میں جاننا چاہا تو تم جانتے ہو اُس نے کیا کہا؟"

لمحہ بھر کو لہجہ تھما، پھر روتی ہوئی آواز آئی۔

"اُس نے کہا کون سی عطیہ؟ میں کسی عطیہ کو نہیں جانتا۔ میں ایسی عورت کو جاننا بھی نہیں چاہتا جو شوہر کے ہوتے ہوئے اُس کے دوست سے تعلقات بڑھاتی، وہ گھر چھوڑ کر جس دن اس کے دوست کے گھر رہ کر آئے، جو ہسپتال میں ہو تو اس کے ایڈمٹ ہونے کے لیے اخراجات کے طور پر اس کے شوہر کے بجائے اس کا دوست دستخط کرے۔ اُس نے مجھ سے کہا، آپ جانتی ہیں نا، میں ایسی عورت کی اولاد کیوں یقین کرلوں کہ وہ میری ہی اولاد ہے؟...... اُس نے مجھ سے کہا اور میں سلیم اور بچے کے سامنے آ گئی۔ انہوں نے مجھے سچ بتا دیا ہے اور میرا دل...... میرا دل بیٹھا جا رہا ہے اس دکھ سے...... بتاؤ سعید الرحمن! میری بہن کہاں ہے؟"

"عطیہ...... عطیہ مر چکی ہیں خالہ!...... عطیہ تیس سال پہلے مر چکی ہیں۔ وہ ڈلیوری کے آدھے گھنٹے بعد ہی مر چکی تھیں۔"

"ڈلیوری.. عطیہ کی اولاد ہوئی تھی؟..... کون ہے اُس کی اولاد؟ کہاں ہے اُس کا بچہ؟"

شہریار کے ہاتھ میں سوال باندھا گیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اُن کا دل بہت تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ "پاپا! آپ کی خالہ تھیں ماں آج؟"

پاپا نے چونک کر اسے دیکھا اُس کے چہرے سے بے جانی کی سی کیفیت تھی۔

"سعید الرحمن! بتاؤ نا، وہ اولاد کیا تھی؟ لڑکا یا لڑکی؟"

"لڑکی تھی نیم!" شہریار کے منہ سے نکلا تھا۔ پاپا کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ اور وہ مزید بولا تھا۔ "ہم ایک دفعہ آپ نے کہا تھا ماں میں آکر دیکھوں کہ میں اچھے پاپا کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔

بلکہ سب سے زیادہ جانتا ہوں ممی! آپ جان سکتی ہیں، میں پاپا کے کتنے قریب ہوں۔"

"عبدالرحمٰن! کیا یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟"

"ہاں ممی......" پاپا کی آواز مدھم ہوگئی تھی۔ انہوں نے کچھ اور بھی کہنا چاہا تھا مگر نجم عاقب نے ان کی مہلت نہیں دی تھی اور تڑپ کر بولی تھیں۔

"عبدالرحمٰن! میں تمہیں کتنا غلط سمجھتی تھی تم کتنے مختلف نکلے ہو عبدالرحمٰن! کیا فاطمہ کی بیٹی ہونے کے سچ کی طرح یہ بھی سچ ہے کہ تم نے اس بچی کو جلد [illegible] میں داخل کروا دیا تھا؟"

"پلیز! آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں، میں نے تو......" مسٹر عبدالرحمٰن نے وضاحت کرنے کی کوشش کی مگر نجم عاقب نے بغیر کچھ کہے [illegible] اور عبدالرحمٰن ان کو پالنے پر [illegible] تھے۔

"شہریار! تم نے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا؟ کیوں کہا تم نے کہ فاطمہ آنٹی کے پاس بیٹی [illegible] تھا؟"

شہریار نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا تھا بلکہ تیز تیز چلتی سانسوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ "پاپا! ہمارے [illegible] کا کیا ہوگا؟ کیا ممی عافیہ ہمارا کنٹریکٹ جاری رکھیں گی یا یہ معاہدہ ٹوٹ جائے گا؟" جانے تمہیں اس نے اتنا مختلف سوال کیوں کیا تھا۔ پاپا کا سوال کیوں [illegible] گیا تھا۔

پاپا نے اس کے چہرے پر احساس تکلیف دیکھی مگر پھر بھی بے قراری سے بولے تھے۔ "شہریار! تم اتنا [illegible] کب سے رکھنے لگے ہو؟"

اس نے اب خود پر قابو پا لیا تھا سو متوازن لہجے میں بولا تھا۔ "اس میں [illegible] کیا ہے پاپا اگر میں ہر پہلو سے حالات کا [illegible] رہا ہوں۔"

"شہریار!" پاپا نے اس کا کندھا تھاما پھر نرمی سے بولے۔ "شہریار! کیا واقعی تمہیں [illegible] کسی بات نے ہرٹ کیا؟ جو وہاں انہوں نے کہا کیا اس پر تمہیں اعتراض نہیں ہوا؟... تمہیں یہ جاننے کی جستجو بھی نہیں ہوئی کہ یہ ارسلان راشدی کون ہے؟"

اس نے پاپا کے کندھے پر رکھے اپنے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا، پھر آہستگی سے بولا۔ "نہیں، مجھے یہ جاننے کی جستجو نہیں ہے کہ ارسلان راشدی کون ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں وہ ہستی کہاں رہتی ہے اور کیسی دکھتی ہے۔"

"تم جانتے ہو ارسلان راشدی کون ہے، کہاں ہے؟" پاپا کا سانس تیز تیز چلنے لگا تھا۔ پھر انہوں نے بے قراری سے کہا تھا۔ "تم مجھے اس کا پتہ دے سکتے ہو شہریار؟...... میں ایک بار اس سے ملنا چاہتا

ہوں۔ میں اُسے بتانا چاہتا ہوں کہ عشیہ بے قصور ہے۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہے پاپا! کیونکہ میں جانتا ہوں، وہ آپ کی بات کا یقین نہیں کریں گے۔ اگر وہ آپ کی یا میری طرح ہوتے تو شاید وہ اتنا بڑا الزام نہیں لگاتے ماما پر۔ انہیں محبت کرنی نہیں آتی تھی پاپا! اور آپ نے اُن کی سفارش کی تھی۔ ایسے انسان کی سفارش، جس کی نظر میں محبت یا اعتبار نہیں تھی، جس کا اعتبار صابن کے جھاگ کی طرح تھا۔ ذرا سی تیز دھوپ ہوئی اور بیٹھ گیا۔ پاپا! مجھے ارسلان راشدی کی کہی ہوئی کسی بات کا دکھ نہیں ہوا۔ کیونکہ کمزور اور کم ظرف مرد بے ظرف اور زندگی کو ایسے ہی جیا کرتے ہیں۔ پاپا! مجھے ماما کی حسرت پر دکھ ہوتا ہے۔ اور مجھے...... مجھے آپ کے دل پر ترس آتا ہے۔ اگر آپ نے ماما سے شادی نہ کی ہوتی تو آپ کی فرسٹ چوائس عشیہ ماما ہوتی ناں؟"

عبدالرحمٰن کھڑے سے بیٹھ گئے تھے بالکل گم صم سے۔ تب اس نے اُن کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا تھا۔

"محبت کا جرم تو نہیں پاپا! جو آپ گھلے گھلے کیا کرتے رہے ہیں اتنے برسوں سے۔ کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ انسان زندگی کسی کے ساتھ شروع کرتا ہے اور دل کسی اور کے ساتھ چل پڑتا ہے۔ مگر پاپا! آپ اس لحاظ سے اچھے انسان رہے کہ آپ نے دونوں میں سے کسی کو بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹایا۔ دونوں کے ساتھ دل اور زندگی شیئر کی۔ ماتی زیادہ دو کہ آپ کبھی خود کو خوشی میسر نہیں آنے دی۔ کیا کرتا ہے انہیں اتنا تو دو؟" وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر بولا۔ "مجھے آپ کے کردار کی بلندی پر فخر ہے پاپا! کہ آپ اپنے دل کا مدعا سامنے ہوتے ہوئے اس کے چہرے کا پہرہ رکھے رہے۔ آپ نے عائشہ ماما سے عشیہ ماما کا بیٹا لے لیا۔ نہیں، ارسلان راشدی کے لئے انہیں مانگا۔ آپ نے یہ کیا کیا پاپا؟"

عبدالرحمٰن صاحب نے سر جھکا لیا تھا، پھر نرمی سے بولے تھے۔ "کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے شیری! محبت آپ کو چاروں طرف سے باندھ لیتی ہے۔ مجھے بھی اس نے باندھ لیا تھا۔ میں اور ارسلان بچپن کے ساتھی تھے۔ ہم نے بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ وہ بہت خوددار انسان تھا۔ میں اس کی مدد کرنا چاہتا تو وہ انکار کر دیتا۔ اس لئے مجھے اس کی مدد کرنے کے لئے بھی بہانے ڈھونڈنے پڑتے۔ میں اُسے گفٹ میں کبھی کتابیں دیتا، کبھی قلم، کبھی اچھے کپڑے...... وہ مجھے محبوب رہتا مگر میں باز نہیں آتا۔ وہ پڑھائی میں تمہاری طرح بہت تیز تھا۔ مجھے لگتا تھا، وہ اپنے گھر کے نامساعد حالات کے باوجود بہت آگے جائے گا۔ تو میں نے صرف اس کے راستے کے پتھر دور کئے تھے۔ اس راستے پر دیا اور وہ خود چلا تھا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ وہ پینٹنگ بھی کیا کرتا تھا۔ مجسمہ سازی میں بھی کمال رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ سی ایس ایس کلیئر کر کے میرے ہمراہ اونچے حلقے کی پارٹیز میں گیا تو فوراً لوگوں کی نظروں میں آ گیا۔ میں صرف اُسے لے کر گیا تھا۔ اس نے اپنی شخصیت کے لئے جگہ خود بنائی۔ ان ہی پارٹیز میں اُسے

عطیہ نہیں... وہ میرے بیٹے تھے پر عطیہ سے ملتا رہتا تھا اور میں، جس دن اس نے کہا کہ مجھے عطیہ سے محبت ہے اس لمحے مجھے لگا، میں کس راستے پر چل پڑا تھا؟ عطیہ کے چھن جانے کے ڈر نے میری سانس روک دی تھی مگر عطیہ...... جب انہوں نے ارسلان راشدی کا نام اس دیوانگی سے لیا تو مجھے لگا کہ مجھے اس ملن کے لیے اپنی کوشش تیز کر دینی چاہیے۔ میں نے اس سلسلے میں اپنی تمام کاوشیں صرف کر دیں۔ مگر... محبت... پتہ نہیں چاروں طرف سے باندھ لیتی ہے......" پاپا کہتے کہتے رک گئے اور وہ پاپا کو دیکھے گیا۔ پاپا کے دل پر اس کے دل کو پہلے سے زیادہ پیار آنے لگا تھا۔ جس سے اس کا دل بھر گیا تھا۔ اس نے پاپا کو خود سے بھینچ لیا تھا۔ کچھ نہیں ہوا تھا مگر نم آنکھیں ان پر مرکوز تھیں۔

"مجھے پہلے آپ پیارے تھے اب تو میری جان بن گئے ہیں پاپا!"

پاپا نے ہولے سے اس کے گال کو پیار سے تھپکا تھا پھر کچھ جان میں آ کر بولے۔ "پھر نازی کا کیا شوشہ چھوڑا ہے؟ کاغذات میں صرف ایک لڑکے کا اندراج ہے اور وہ تم ہو۔ سوچو اگر جائیداد کی تحقیقات کرنے نکل گئیں تو بہت مشکل ہو جائے گی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا تھا پھر مسکرا کر بولا تھا۔ "میں پکا کام کر کے آیا ہوں پاپا!"

"مطلب تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" پاپا نے حیرت سے دیکھا اور اس نے کہا۔

"اس دن کی بات پر مجھے لگا تھا کہ تم جائیداد کی تحقیقات ضرور کرو گی جو میں چاہتا تھا کہ نہ ہو۔ میرا چاہا ہوا حسنت نے میری مدد کی اور میں نے کاغذات میں تبدیلی کروا لی۔ میں ساری زندگی صرف آپ کے کام سے جانا جانا چاہتا ہوں دنیا میں۔"

پاپا نے اسے خود سے قریب کیا تھا پھر مدھم لہجے میں بولے تھے۔ "کون کہتا ہے جو تمہارے ماتحت نہیں جاتا؟ تمہیں بتا! اظہار نیا بات ابھی بھی ادھوری ہے ٹھیک طرح سے واضح تو کرو۔"

وہ پاپا کے پہلو میں اپنی جگہ بنا کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں نے کاغذات میں ایک لڑکی کا اندراج پانی تاریخوں میں کروا دیا تھا کہ اگر ہم حمائیہ جیسے نے آنکھیں نہ بھی ہوا تو ہو جائے۔ کیونکہ لڑکی کا اندراج مرے ہوئے بچے کی حیثیت سے کیا تھا۔ مگر جن دنوں میں ریکارڈ رسانی کروائی گئی میں منسلک تھا ایک پانی مدد الف نے اتنی مجھ سے تحقیقات شروع کر دیں۔ وہاں سے مجھے پتہ چلا... کیونکہ وہ مجھے معلومات دینے کی ایک بھاری پیشکش پر آمادہ تھی حسب کرنا ہم کے پاس اس دن ایک نہیں دو بچے ہوئے تھے۔ میں نے معلومات کو سچ کیا ہم ابھی کے حوالے سے مگر مجھے ان پانی مدد الف کی

ریاض ذوالفقار سے اصلیت جاننے پر پتہ چلا کہ وہ بچی انہوں نے دولت کے لالچ میں ایک امیر عورت کو بیچ دی تھی۔ میں پتہ کر کے وہاں گیا مگر معلوم ہوا وہ بچی کو صرف چار سال پہلے ساتھ لے کر چلے گئے تھے، پھر انہیں اسٹاک مارکیٹ میں اتنا نقصان ہو گیا کہ ان کے کھانے کے لالے پڑ گئے۔ یوں وہ بچی "چلڈرن ہوم" میں پلنے لگی۔ اب میں کاغذات میں تبدیلی کروانے کے لیے پریشان ہوں۔ کیونکہ میری کاوش کی خبریں ہاسپٹل کی انتظامیہ تک جا پہنچی ہیں۔ سدرہ آصف نے نوکری کے بچاؤ کے لیے میرا نام نہیں لیا ہے لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہا ماہا کی بیٹی کو کاغذات میں زندہ کیسے کروں تا کہ عافیہ ہم اسے اپنی کسٹڈی میں لے سکیں؟"

"کیا مطلب؟ کیا تم جانتے ہو عافیہ کی بچی کہاں ہے؟"

"پہلے نہیں جانتا تھا ورنہ یہ حماقت نہیں کرتا۔ مگر اس دن جب آپ نے کہا تھا کہ میں تمہاری ماں عطیہ ہوں تو میری آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ مجھے اچانک یاد آ گیا تھا، میں جس بچی کے ساتھ اس دن تک چل پایا تھا، وہ بچی تصویر تھی پاپا! جس دن آپ کو پہلی بار اٹیک ہوا تھا اس دن میں کالج سے آپ کے دفتر کے ورکر کے ساتھ آپ کو ہاسپٹل لے کر پہنچا تھا۔ نرس نے جب آپ کی چیزیں میرے ہاتھ میں دی تھیں، تب آپ کے والٹ میں پہلی بار میں نے ان کی تصویر دیکھی تھی اور بہت سالوں بعد کسی اور کی آنکھیں دیکھ کر مجھے وہ منظر یاد نہیں آ رہا تھا مگر ماں کی تصویر دیکھ کر مجھے یاد آ گیا تھا وہ چہرہ، وہ تاب کتنا حسین تھا... میں نے جلد بازی میں ایک غلط کارروائی کر دی ہے جس کا سدھار اب دشوار ہو گیا ہے۔ عطیہ ماما کی بیٹی ہمارے دفتر ہی میں جاب کرتی ہے پاپا! مگر اب میں اس غلطی کو کس طرح سنبھالوں، مجھے سمجھ نہیں آ رہا؟"

"تم بہت جذباتی، بہت ہی جذباتی ہو شہریار! اگر تم اب بھی اس لڑکی کے بجائے یہ سوچتے کہ ایک امید کی کرن جھوٹی نکلی تو تم کاغذات بدلنے کے بجائے عافیہ کے سامنے آسانی سے اپنی ذات کلیئر کروا سکتے تھے۔ نہ صرف ان کے سامنے بلکہ ساری دنیا کے سامنے ارسلان راشدی کے نام کا اعتبار پا سکتے تھے۔ تمہاری ذات معتبر ہو سکتی تھی۔ بچپن سے لے کر آج تک تم پر اور مجھ پر جو سوال اٹھتے آ رہے تھے، وہ اپنی موت آپ مر جاتے۔"

"ایسا ہو سکتا تھا پاپا! لیکن میں دنیا کی قیمت پر بھی آپ کو نہیں چھوڑنا چاہتا۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں، اس طرح آپ کی ریاضت، آپ کی محبت کی توہین ہوتی۔ اور میں ایسا نہیں دیکھ سکتا۔"

"تم بہت الگ ہو شہریار! بہت زیادہ الگ۔ مجھے لگتا ہے، میں تمہیں بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں، لیکن ہر بار تمہاری کوئی نئی بات چونکا دیتی ہے۔"

وہ مسکرا رہا تھا مگر اس مسکراہٹ میں کچھ چھپا ہوا تھا۔ پاپا نے اس کا شانہ تھپتھپایا تھا۔

"تمہارا وہ شیریں والی ... میں بہت امتزاج سمجھتا ہوں۔"

اس نے آہستگی سے پاپا کے شانے پر سر ٹکا دیا تھا، پھر آہستگی سے بولا تھا۔ "میں صرف امتزاج نظر آتا ہوں، اندر سے ہوں نہیں۔"

"اچھا تو تم اس معاملے کو کیسے ہینڈل کرو گے؟" پاپا نے اس کے رخسار کو چھوا تھا۔

اور وہ عجیب سی ہنسی سے بولا۔ "پتہ نہیں پاپا! ابھی خود بھی واضح نہیں، لیکن معاملہ بہت نازک ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔"

پھر وہ رخصت چاہنے ہی والا تھا کہ پاپا کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ سالار عبدالرحمٰن نے ان کا جملہ ادھورا بتاتے بتاتے گئے۔

"پاپا! آپ بتائیں، اس نے پتہ نہیں کیا جادو کر رکھا ہے، آپ کو اس کی کوئی بات بری ہی نہیں لگتی۔"

پاپا نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا اور ہولے سے بولے۔

"آخر ہوا کیا ہے؟ سچ بھی تم ایسے ہی لگتے ہو جیسے کسی نے تمہارا پتہ کر رکھا ہے، جیسے کوئی بہت بڑی غلطی کر دی ہے انہوں نے؟"

سالار عبدالرحمٰن نے بلاکم و کاست ڈریسنگ روم اور ماڈل گرل کی بابت سب کچھ کہہ سنایا۔ پاپا نے تصدیق طلب نظروں سے دیکھا تو اس نے آنکھوں سے اثبات میں اشارہ کر دیا۔ سالار عبدالرحمٰن نے دونوں کی مجرمانہ سازش جیسی خاموشی دیکھی تو ذرا دیر بعد آف کنٹرول ہو کر بولے۔

"پاپا! میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ کو دونوں ... غلطی آپ اسے ایسے ہی ... لیکن اس کی دونوں سے بڑی غلطی آپ نظر انداز کر دیتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہو۔ آپ بہت زیادہ فرق کرتے ہیں اپنے بچوں میں۔"

"مجھے ان تمام چیزوں کا پتہ ہوتی ہے سالار، تم میری عادت جانتے ہو، مجھے چیخ چیخ کر کوئی بات منوانا یا غلطی کا احساس دلانا کبھی بھی اچھا نہیں لگتا ہے۔ میں تمہاری شکایت پر کوئی ایکشن نہیں لوں گا، یہ تمہاری بھول ہے۔ تم کیا وہ تمہاری غلطیوں پر بھی تمہیں تنہائی میں بلا کر ہی کوئی روشنی دکھاتا رہا۔"

سالار عبدالرحمٰن پتہ نہیں اس بات سے متفق ہوئے تھے یا نہیں لیکن ان کے کمرے سے وہ واپس لوٹ گئے تھے۔ پھر ان کے جاتے ہی پاپا نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا تھا۔

AANCHAL.COM.PK

''کوئی نیا بلنڈر ہے بیٹے جان؟'' وہ کچھ مسکرا کر بولے۔ ''کبھی کبھی بھائی کو تم بہت ستاتے ہو شہریار! اب بولو نئی بات ہے۔''

''نئی بات ہے یا نہیں، آپ پوری بات جانے بغیر کیسے کہہ سکتے ہیں؟ ہمیشہ دو طرفہ بات سن کر فیصلہ کرنا سود مند ہوتا ہے پاپا!''

''اچھا بھیا جی! اب آپ مجھے یہ بھی سکھائیں گے؟''

وہ شرارت سے ہنس دیا پھر اپنا مقدمہ پیش کر کے چپ کر گیا۔ ''آپ بتائیے میری کہاں غلطی ہے پاپا؟''

پاپا نے غور سے سنا، وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔ ''پہلے والے معاملے میں بیٹا تمہاری غلطی نہیں ہے، لیکن شہریار کی ماڈل گرل والے معاملے میں سو فیصد آپ کی غلطی ہے۔''

''میری غلطی کہاں ہے پاپا؟'' اس نے سوال کیا اور عبدالرحمن صاحب نے مسکرا دیا۔

''بھیا جی! اس سے نیا پھر بلی والی گرل کے سامنے ہم نے کام کیا ہے، ان سے کام لیا ہے، تو ان کی فیس کی ادائیگی کرنی پڑے گی۔'' وہ کہتے ہوئے پھر ہنس کر بولے۔ ''ہوتا ہے بیٹا جن لوگوں پر بہت اتھارٹی ہوتی ہے، جن کو ہزاروں کیا، لاکھوں لوگوں کی ستائش ملتی ہے، ان میں تو ہر بڑا غرور اور تکبر آ ہی جاتا ہے۔ سوچو ذرا ایک جوان جیسے نے چھوٹے معاملات کو ہینڈل کر لیا، سمجھ گیا وہی کامیاب ہوگیا۔''

''یعنی آپ کہنا چاہتے ہیں، میں ان دونوں سے معافی مانگوں؟'' شہریار کا موڈ خراب ہوگیا۔ تب پاپا نے اس کا ہاتھ اپنے کندھوں پر رکھ کر کہا۔

''نہیں میرا بیٹا! کسی سے معافی نہیں مانگنا چاہتا تو میں اس کی عزت نفس کی قربانی نہیں دوں گا۔ ہاں اگر بات احترام کی ہوتی تو شاید مجھے کوئی عار نہیں ہوتا بلکہ پھر تمہیں ہمارا ضمیر خود ہی معافی مانگنے سے روک نہیں سکتا تھا لیکن بات چونکہ صرف ہار جیت، غرور اور نیچا دکھانے کی ہے تو اس میں تمہارا ساتھ دوں گا۔''

''لیکن پاپا! ان کو منانے میں آخر اس کا انتظام کہاں سے ہو سکے گا؟''

''سوچتے ہیں، اس پر بھی سوچتے ہیں۔ بلکہ زیادہ اچھی منانے کی کوشش کرو۔ کچھ ہوں یا اس وقت تمہاری ماما کو بھی تو گھر پر فون جانا ہے۔'' پاپا نے موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن شہریار نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''آپ پیچھے ماما سے ملیں گے پاپا؟'' شہریار مسکرا کر بولا۔ ''نئی بات لگتی ہے پاپا! آشنا میں کہاں اور… ماما پوری کریں؟…… او کے ٹھیک ہے، میں ماما سے سوری کر لیتا ہوں۔''

پاپا نے اتنی جلدی فیصلہ لینے پر اس کی محبت کو حیرت سے دیکھا مگر وہ چکی تھی۔ بے بس پاپا ہنسے تھے کہ ان کا موبائل بجنے لگا۔ نمبر دیکھ کر وہ مسکرائے پھر شرارت سے بولے۔ "یہ اسٹرانگ ہے تمہاری ماما کی
محبت۔ دیکھ لو ضرورت پڑنے پر وہ کسی کے کہنے سے پہلے چلی آتی ہیں مگر... ہیلو! عبدالرحمن بول رہا ہوں۔" انہوں نے آدھا جملہ ان کی طرف اچھالا اور آدھا جملہ فون پر بس کہہ کر فون شہریار کی طرف بڑھا دیا۔
ماما نے آواز سنی تو فوراً بولیں۔ "عبدالرحمن صاحب! یہ سالار اور شہریار کو کیا ہوا، کیا اختلاف ہوا ہے؟ عائشہ بتا رہی تھی، بہت غصے میں تھی۔ چیک پاس کرنے سے انکار کیا ہے اس نے اور بہت رویا وہ، بتا رہے تھے
اسے شہریار کی شہہ سادہ دینی ہو گی پر۔"
پاپا انہیں تفصیل دینے لگے۔ ماما نے سنا تو برہمی سے بولیں۔
"سالار بھی ماں، پتہ نہیں کب مدبر بنیں گے؟ ٹھیک ہے آپ چیک سائن کر کے بھیجیں، میں خود دستخط کر کے چیک آپ کے بنائے گئے اکاؤنٹ میں جمع کروا دوں گی۔"
پاپا نے ہنس کر فون بند کر دیا، مگر شرارت سے بولے۔ "اچھی بیوی ہونے کا بڑا پلس پوائنٹ ہوتا ہے۔ سیکھو کچھ میری زندگی سے شہریار صاحب!"
شہریار ہنسنے لگا اور وہ جوائنٹ اکاؤنٹ کا چیک سائن کرنے لگے۔ سائن کر کے زیر لب۔ "اب یہ چیک کون لے کر جائے گا بھئی؟"
شہریار نے اپنی خدمات پیش کر دیں تو بولے۔ "نہیں، تمہیں بیا کی بات کرنی پڑے گی۔ تمہیں تو شاید شاپنگ کے لیے بلایا تھا ناں؟"
"جانتا ہے کچن میں سوچ رہا ہوں، میں نے جو غلطی کی ہے اسے کس طرح سدھاروں؟ اور پھر آپ کے اتنے اچھے رویے اور میرے انکشاف کے بعد وہ جو آپ کے بارے میں غلط رائے لے کر گئی
ہیں اسے بھی تو دور کرنے کی کوئی سبیل پیدا کرنے کی کوشش کرنی پڑے گی ناں۔"
پاپا نے اس کے ہاتھ میں چیک تھما دیا۔ وہ کچھ نہیں بولے مگر ان کی پیاری سی مسکراہٹ سارے راز کھولے دے رہی تھی۔
محبت پر واقعی کسی کا اختیار نہیں۔ یہ جب ہوتی ہے یا نہیں ہوتی، شہریار بہت آنی تک اس میں الجھ نہیں جاتی۔
"آہ... یہ "Stranger" ہے کون جس نے اخبارات میں تہلکہ مچا دیا ہے؟ کوئی اندر کی باتیں......" بخشی صاحب نے سالار کے سامنے اخبار پٹخ دیا۔ کچھ دنوں سے صبا بانی اس کالم نگار کی رپورٹس
پر پورا ملک حیران تھا۔ یہ ایک ایسا کالم نگار تھا کہ جسے دنیا کی پروا تھی، نہ اپنی جان کی۔ صبا بانی آج کل یہی بات پوچھ رہا تھا۔ سب جاننا چاہتے تھے، یہ اسٹرینجر کون ہے جس نے بڑے بڑے ایوانوں میں

ہلچل مچا رکھی ہے؟

"تم کچھ بولتے کیوں نہیں ہو، آخر یہ ہے کون؟" محمد عمر کوڑ کے پھر بولے۔ "اس اسٹرینجر کا طریقۂ واردات بالکل میرے جیسا ہے۔ جیسے میں نے کسی زمانے میں گمنام کے نام سے کیا تھا۔ لیکن یہ مختلف ہے کہ یہ اس چھپے سچ سے میری طرح کمانے کے بجائے اسے عوام کے سامنے لا کر رکھتا جا رہا ہے۔ بالکل مخبروں جیسی عادات کا حامل لگتا ہے۔"

"مخبر اسٹرینجر بھی کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی تنخواہ کے آپشن تو رکھتے ہی ہیں۔ مجھے تو نہیں لگتا یہ بندہ ایسا کرتا ہوگا؟"

یوسفی صاحب تھک کر بیٹھ گئے پھر جھنجھلا کر بولے۔ "اگر ایسے راز میرے پاس ہوتے تو میں کروڑوں کما چکا ہوتا۔ مگر یہ بے وقوف صرف عوام کی واہ واہ پر خوش ہے۔"

"سر! کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جن میں خدمتِ خلق کا جذبہ ہر چیز سے بڑھ کر ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر سے اپنے کام میں لگ گیا تھا۔ اخبار کا پروف شیٹ پڑھتا رہا۔ ایک دو جگہ کالم چھوٹ رہے تھے، جو اس نے فوری بے ضرر قسم کی نیوز کو کسی ٹائم کالر کو پر کر کے بیلا روناکل کے لئے سب ایڈیٹر کے پاس بھیج دیا تھا۔ اب وہ قطعی فارغ تھا۔

فارغ ہوا تو یکدم اسے شافعہ کی یاد آنے لگی۔ کچھ دنوں میں وہ جتنی اس کے قریب ہو گئی تھی، اس کی اداؤں تسلی کے لئے جو عارضی جملے وہ کہتا رہا تھا، ان جملوں نے اُسے باندھ لیا تھا۔ آخر کو اس نے شادی تو کرنی ہی تھی، سو پھر وہ شافعہ کیوں نہیں ہو سکتی؟ اس نے اماں اور زہرہ پھوپھو سے بھی رائے لی تھی، دونوں نے شروع ہی جیسے اس پروپوزل کو بالکل ٹھیک فیصلہ قرار دیا تھا۔ مگر یہ سب کچھ ابھی اندر ہی اندر تھا۔ شافعہ کی نظروں میں پسندیدگی کا عنصر تو تھا، لیکن یہ پسندیدگی واقعی محبت تھی، یہ جاننا باقی تھا۔ ابھی وہ فائنل پروف پڑھ کر اخبار کی کاپی آنے کے بعد دفتر سے اٹھا تھا۔ اس کا رخ اب گھر کی طرف تھا۔ اس نے بیل دی۔ دروازہ زہرہ پھوپھو نے کھولا۔ زہرہ اور جنید ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے آدھی رات گئے ہاسپٹل کے معاملے پر ڈسکس کر رہے تھے۔ نقشے پر بھی کچھ اعتراض اٹھائے جا رہے تھے۔ مگر وہ ان کی گفتگو میں شامل ہوا تھا، نہ ہی رسمی سلام کے خیال سے رکا تھا۔ زہرہ پھوپھو نے اس کی سرد مہری پر اسے خفگی سے دیکھا مگر اس نے خفگی بھانپ جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کیونکہ وجہ پہلے سے ہی جانتا تھا۔

اب وہ اپنے کمرے میں آ چکا تھا۔ پھر بستر پر لیٹتے ہی اس کی نظر اپنے کمرے میں لگے فون پر پڑی تھی۔ اس نے اپنے فون پر دن بھر آنے والی کالز دیکھی تھیں، پھر ایک آواز تھی جسے وہ ہمیشہ اپنے گرد محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اس آواز کو سن کر وہ سارا دن کا دماغ ختم ہونے کے باوجود فریش محسوس کرنے لگا تھا۔ آج ہاسپٹل میں اس کی رات کی ڈیوٹی تھی، اس کی کال سے یہ اطلاع اسے پہنچی تھی۔ سو وہ بے دھڑک اس کا نمبر ملا رہا تھا۔

کافی دیر بعد اس کا رابطہ ہو سکا تھا۔ آواز سن کر اس کا دل کھل اٹھا تھا۔

"کیسی ہیں شافعہ! آپ؟"

"بالکل ٹھیک ہوں..... یہ بتائیے آپ کیسے ہیں؟" وہ لمحہ بھر کو رکی، پھر مدھم لہجے میں بولی۔ "آپ نے آج رات کا میڈیا ٹرائل دیکھا۔ سچ۔ سلامہ! مجھے تو دیکھ کر ہی اس شخص کی جوان ہمتی پر رشک آیا۔ دیکھئے سلامہ! جو بات میں آپ سے کہہ دی گئی، وہ بات کس طرح کسی اور کے دل نے پک کر لی۔"

سلامہ طنز سے ہنسا، پھر بولا۔ "آپ جیسے میڈیا ٹرائل کی کر کوشش ہو رہی ہیں، اس کی جوان ہمتی پر آپ نے کبھی غور کیا؟ یہ واقعی میڈیا ٹرائل بھی ہو سکتا ہے، اسٹیبلشمنٹ کی بچگانہ کوشش۔ آپ نے اندازہ لگایا، اس میڈیا ٹرائل کے کنٹرولر کس اپوزیشن سے متعلق ہیں حکومت میں۔ ایک پلان ہے گندا کرنے کی جوان قیمت وار جاری ہے، یہ اسی کا حصہ ہے۔ آپ اندازہ لگائیے، اگر اس مسٹر شجر کی وجہ اک بھیگی اور دوبیدہ کی ذلیل ہوگئی تو حکومت کے ایوانوں کے پائے اور مضبوط ہو جائیں گے کیونکہ مسٹر شجر کے کہنے میں عوام ایک بار پھر نئے سرے سے بے وقوف بن جائے گی۔"

"پلیز سلامہ! کسی کو برا نہیں کہتے، تو اس پہ اعتراض تو مت کیجئے۔ کسی کی اچھی بات کو برا بنانا بڑی عادت تو نہیں۔"

سلامہ نے خفگی سے ہنکارا بھرا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "مجھے دراصل اس وحشت کی سیاحی میں ایک طویل عرصہ ہو گیا ہے۔ میں ایسے کھیلوں سے اچھی طرح واقف ہوں، اس لئے مسٹر شجر کی ذات کو کسی شک سے بالا نہیں سمجھتا اور شافعہ! آپ کو یہ تو پتہ ہے، یہ میڈیا کی خبریں جس نیٹ ورک سے کی جاتی ہیں، ان کو آج تک ٹریس نہیں کیا جا سکا۔ کیا آپ کو نہیں معلوم یہ بات؟ ممکنات میں سے ایک ہے کہ حکومت اس نیٹ ورک، اس ویب سائٹ کو ٹریس نہ کر سکے؟ کسی بھی ملک کا نیٹ ورک سسٹم پوری طرح حکومت کے دائرہ اختیار میں ہوتا ہے۔ معلومات کی ہر سطح کی ہر یا غیر ملکی، اس سے باخبر ہوتی ہے۔ حکومت کو کہاں سے خبر لا دی گئی، میڈیا کے لئے یہ جاننا تھوڑا مشکل ہے۔ مگر حکومت کے لئے یہ آسان ترین ہدف ہے۔ مگر حکومت ابھی تک اندھیرے میں ہے۔ جی ایچ کیو بھی اس سے لاعلمی کا اظہار کر رہا ہے۔ سو شافعہ! مجھے کہنے دیجئے، یہ بہت بڑا المیہ ہے، جس کے ڈانڈے ہماری عمومی سیاست سے جا کر ملتے ہیں۔ اس لئے پلیز! اسے مشہور اور مقبول کی کیٹیگری میں مت ڈالئے۔ کیونکہ آج کل دنیا کی تیز رفتار ہوتی ہوئی اور اقتصادی کیو یہ تیکنیک کا شاخسانہ بن چکی ہے کہ آپ اگر اپنے بچاؤ کے لئے بھی کچھ کرتے ہیں تو اس میں بھی پوائنٹ کا کوئی نہ کوئی مارجن ضرور رکھتے ہیں۔ یہ تیسرا اعلیٰ درجے کی سیاست ہے۔"

"سیاست ہے یا نہیں، لیکن یہ تو دیکھئے، وہ کیسے اپنی جان پر کھیل جاتا ہے؟" شافعہ اپنی بات پر اڑی رہی تو وہ تحیرانہ ہنسا، پھر نرمی سے بولا۔

"اگر حکومت میری پیٹھ پر ہو تو ایسے دھماکے دار کام میں بھی کر سکتا ہوں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے، جیسے ایک پل ورز کا بیٹا قتی کی علمبرداری میں اپنی ڈگری کو لات مار آئے اور ایک مڈل کلاس پڑھی تھی کی تحسین کر

طرح سے اس پر غصہ آور کیے، وہ بھی کیا آدمی ہے، اس کے اندر تو عزتِ نفس نام کو نہیں۔ مجھے دیکھو عزتِ نفس پر نوکری کو لات ماردی مگر گردن نہیں جھکائی۔ سب آپ کی طرح اس کی بات، اس کی ہاں میں ہاں ملتی پر واہ واہ کریں۔ مگر دل کہاں پر جن رہ دو آپ کی تعریف پر شکوہ سے آپ کو بچے گی نہ سکے۔ شافعہ یہ نیا دل ہے یا اسے آپ نیا دل نہیں سمجھتیں؟"

"آپ کی بات بہت بہادری کی نکلی ہے۔ لیکن زندگی کا صرف یہی نظریہ ہر جگہ تو لاگو نہیں ہوتا۔ سچ کے لیے نوکری کو ٹھوکر مارنے کے لیے ہمت کی تو ضرورت ہوتی ہے نا سلامہ!"

سلامہ نے گہرا سانس لیا۔ بیزاری سے بولا۔ "شاید میں آپ کو اپنی بات سمجھا نہیں پایا، ورنہ آپ جان لیتیں، مجھ کے بیت اور بحر سے مجھے بیت کی توجیہات کیوں مختلف ہوتی ہیں؟" وہ چند لمحے رکا، پھر مزید بولا۔ "آپ مرا متفق رہنا چاہے اسے مجبوری کہیں لیکن حقیقت کھلنے پر دل ٹوٹے گا تو مجھے الزام نہیں دیجیے گا۔"

شافعہ کی ہنسی سنائی دی، پھر اس نے مدھم لہجے میں کہا۔ "بے فکر رہیے سلامہ! میں اپنے دل میں خاص کی گنجائش رکھتی نہیں، اپنی ذات کے حوالے سے میں پریکٹیکل ہوں اس لیے دکھ ہوگا بھی تو اتنا شدید نہیں ہوگا کہ میری شخصیت ہی بکھر جائے۔" وہ ذرا ٹھہری، پھر بولی۔ "لیکن سلامہ! سورج کی تمنا کرنے والے آنکھوں کے ظلم ہونے کے خوف سے اندھیرے کی دنیا توڑنے کی حسرت نہیں چھوڑ دیتے۔ امید...... کسی اچھے دن کی امید، کسی صبح پر قرض رکھ کر ہر روز سوتے ہیں، ہر روز جاگتے ہیں۔ نیند گہری ہو جائے تو اپنی آنکھوں کی امید دوسروں کو دے کر جاتے ہیں، بار بار بھی نہیں تھکتے۔ دلی میں زبیدہ پھپھو، اماں، جنید بھائی اور شہریار سب یہی چاہتے ہیں کہ آپ اس امید کو پھر سے جگائیں جو اندر تک اٹھے ہیں۔ زندگی اس کے سبب پا جائے گی کہ آپ نے جو پچھلی کا سانس روک رکھا ہے اسے بے دھڑک آنے دیں۔

سلامہ! آپ کو نہیں معلوم آپ میرے لیے کتنے اچھے دوست ہیں اور میں آپ کو کس منزل کی سمت جاتا دیکھنا چاہتی ہوں۔"

سلامہ باقی ہر خطاب حذف کر گیا، صرف اُسے سنائی دیا تو یہ کہ وہ اُسے اچھا دوست سمجھتی ہے۔ وہ اس نے تڑپ کے کہا۔ "صرف دوست شافعہ......؟" وہ آج کہہ دینا چاہتا تھا اور دوسری طرف شافعہ تھی، اس کی ادھوری بات پا چھوٹا سا سانس بھر کر چپ ہو گئی۔ سلامہ نے دوبارہ پوچھا تب وہ آہستگی سے بولی تھی۔

"دل جیسے شہر کے پامال ہو جانے کا منظر بھولتے ہیں
جہاں رنگ کے سارے خس و خاشاک
سب مرے محفوظ ہو گئے ہیں

ابھی کچھ دن لگیں گے

مجھے بار مستے ہوئے شہزادوں کے ساحل پر

تمہیں امید کا بچھڑا ساحل کہ گھر بنتے بنتے رہ گیا ہے

وہ اک گھر بچھڑنے میں

ابھی کچھ دن لگیں گے

لمبا ٹھنڈا سانس لے کر وہ خاموشی میں ڈوب گئی، پھر نرمی سے بولی۔ "آپ کچھ بھی کہنا چاہیے گا، وہ بہت خوش قسمت ہوگی۔ عالم! حقیقت میں شاید وہ لڑکی نہیں ہوں۔"

"تم مجھے اس لیے تو نہیں ٹھکرا رہی ہو کہ میں سچ نہیں لکھتا؟"

وہ ٹھٹھک کے رچاؤ سے ہنستی نہیں بولی۔ "آپ کے اندر چھپے قلم کے علاوہ مقبولیت کا گھمنڈ موجود ہے، ہمیں اس کی طرف اشارہ ہے کہ آپ بہت جلد مشہور ہو گئے، زرد صحافت کا حصہ نہیں بنے رہیں گے۔ کبھی نہ کبھی سچائی بس ایک لمحے میں آپ کے دل میں سرایت کر جائے گی۔ کچھ بھی نہیں آپ کے دل کو کسی طرح سے جھنجھوڑ دے گا۔ سوچتی ہوں عالم! ہو سکتا ہے کبھی کسی وجہ سے ساری باتیں، نصیحتیں، تجربے بے جوڑ لگیں... وہ بھی ایک ہاتھ جب اپنی زندگی کے سامنے ہونے والا حادثہ بہت جرأت سے سکھاتا ہے۔ ابھی آپ نہیں سمجھے کہ دنیا کا بہترین سبق ہے آپ دنیا کو نہیں جھیل رہے، بلکہ ایک اچھائی کو بنا رہے ہیں۔ جب اور اچھائی کبھی اپنے مزاج پر آئی تو کھلے گا آپ اب تک کتنا غلط قدم اٹھا رہے تھے۔"

"مگر میں نے تم سے کچھ اور پوچھا تھا۔ کیا تم مجھے اس لیے رجیکٹ کر رہی ہو؟" وہ اپنی بات پر اڑا رہا تو اس نے نفی میں جواب دے کر بہت مدھم ہو کر کہا۔

"عالم! میں وہ لڑکی نہیں، جو آپ کو پا کر خود کو خوش قسمتی کا حق دار سمجھے۔ کیونکہ مجھے لگتا ہے آپ کے ساتھ آپ ہی کی طرح نفرت کرنے والی لڑکی سوٹ کرے گی اور میں...... میں اچھے حصے کی محبت کر چکی ہوں۔ میرا انتخاب ملنا شاید آپ کی امید پر پورا نہ اتر سکے۔"

"یہ تمہاری سوچ ہے میری نہیں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں سوکھ جانے والا پیڑ اگر زمین میں جڑیں رکھتا ہے تو موسم کے بدلنے پر بہار کا موسم آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ زخم لگتا ہے تو وہ مرہم بھی پا؛

ہے۔ بچوں کی بات جو ہو جائے تو اس نقصان کی تلافی آنٹ کی بھی دشوار ہو جاتی ہے۔ سو، جب تم اس احساس سے گزرو تو میرے دل کی حالت ضرور دیکھنا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"
شافعہ نے کچھ نہیں کہا۔ پھر دونوں ہی مختلف گفتگو کرنے لگے، یہاں تک کہ شہریار کے کام پر بات کا سلسلہ ختم ہو گیا۔
"تم ابھی تک شہریار سے ملتی ہو؟"
"کیوں؟ آپ اس طرح کیوں پوچھ رہے ہیں ان کا؟ وہ بہت اچھے انسان ہیں ماں۔"
سلامہ چلتے لگے پھر بولا۔ "یہی تو پرابلم ہے، وہ مجھے بہت زیادہ پیارا ہے، اس کی قربت میں اکثر کمی کا شکار ہو جاتا ہوں میں۔"
"سلامہ! آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ وہ آپ کا ذکر بہت محبت سے کرتے ہیں۔"
"اپنے اپنے ظرف کی بات ہے، آپ سمجھئے میرا ظرف ذرا کم درجے کا ہے۔" وہ جواباً مسکرانے لگی پھر محبت سے بولی۔
"آپ اس وقت غصے میں انہیں سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس لئے شاید انہیں ٹھیک طرح سے جج نہیں کر پا رہے۔"
"او کے تم کہتی ہو تو اسے ٹھیک طرح سے جج۔ میں اب سونے جا رہا ہوں۔"
اس نے جتنی بے قراری سے فون کیا تھا، اتنی ہی شدت سے رابطہ منقطع کر دیا۔ پتہ نہیں اسے شہریار کا نام سن کر ہی کیوں الجھن ہونے لگی تھی۔ پہلے جو نام رگ جاں محسوس ہوتا تھا، وہی اب قابل نفرت لگتا تھا۔ آج وہ سمجھ پا رہا تھا، اسے لگا جو بات وہ خود سے چھپا رہا تھا، وہ حقیقت بھی تھی کہ وہ اس کی زندگی کے سارے گناہ کی بنیاد کا واحد سبب سمجھتا تھا۔ حریم جیسی محبت، ان کی زندگی خشک اور بے رنگ ہونے کا بھی وہی کو وجہ دار گردانتا تھا۔ شافعہ کی شخصیت میں اس کی محبت کے باوجود جو ایک کمی اور ایک خوف بیٹھ گیا تھا اس کے لئے بھی وہ شہریار کو معاف نہیں کر پا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جن معاملوں میں اس کا دماغ اسے منع کر دیتا، ان معاملوں میں بھی وہ اسے بخشتا نہیں تھا۔
وہ سوچتا رہا تھا، پھر جانے اسے کب نیند آ گئی تھی۔
صبح آنکھ کھلی تو ایک نیا تہلکہ اس کا منتظر تھا۔ حکومتی طور پر فائل ہونے والے زمین کے کئے جانے والے سودے کی رپورٹ تھی، جس کی خبر پر بہت سے لوگ عام طور پر لگے تھے۔ دونوں کی زمین

ہزاروں میں الاٹ کر دی گئی تھی۔ اوپر سے نیچے تک فون کھڑکنے لگے تھے۔
کل ہی اُس نے بات کی تھی اور اب اُن کی پارٹی حکومت میں وہ جو کچھ فرما رہے تھے۔ اسے نے پہلی بار اس سرجبر کے بارے میں اس طرح سے سوچا تھا۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس وقت کس طرح اوپر سے نیچے تک فون کھڑک رہے ہوں گے۔
''کون ہے یہ؟'' ایک ہی سوال ہر طرف گردش کر رہا ہوگا۔ اس نے بڑے بڑے چینلز اخباروں میں یہ خبر دیکھی۔ بہت سکون سے پڑھی تھی۔ خبر بہت خاموشی سے اخبار رکھا تھا اور اٹھتے ہی میز پر رکھی ہوئی جوشاندہ کی طرح اس تذکرے کے تصور سے پہلے درد ہی تھی۔ وہ جو پہلی بار نے جان بخشی پہلے نمبر آیا تھا۔ وہ ان غریب کو جیسے ہی واقعی رہا تھا کہ گھر میں بیٹھ کر جنید داخل ہوئے۔
''تم بہت جنید بھائی......؟'' اس نے سوال کیا اور وہ صوفے پر بیٹھ کر بہت مسکرا کر بیٹھتے ہوئے بولے۔
''تمہارا دوست شہریار وہ...... وہ وزیرِ اعظم میں ہے ٹھیک!''
''مطلب؟ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' اس نے بڑے مزے سے سوال کیا اور وہ دھیمے لہجے میں بولے۔
''تمہیں پتہ ہے یہاں وہ دونوں جس سے باقاعدہ ملاقات میں ہیں وزیر اعظم کے پروجیکٹ کے بارے میں بات چیت ہونے والی ہے۔ وہ دونوں ہی تمہیں ان کی اپنی زندگی میں مست ہیں۔ ہم پھر بار بار وہاں چلا آیا۔ پتہ نہیں اُسے اس کی طبیعت کی خرابی کا کس نے بتایا؟ شاید پرویز نے بتایا ہو۔''
وہ سوال کرتے رہے۔ خود کو جواب دیتے رہے اور وہ اسے انجانی سی الجھن سے دیکھتا رہا۔ وہ مختصر لفظوں میں پوری کہانی سننے کا شائق تھا۔ جنید بھائی رنگ اور مرضی کے قائل تھے، سو کچھ دیر چپ ہو کر بولے۔
''مطلب یہ کہ اُس نے اس کا بہت خیال رکھنے کی کوشش کی اور اس کو اچھا محسوس ہوا۔ وہ اس کے لئے محبت اور عزت دیتا رہا اپنے سالوں سے اپنے فیصلے پر قائم رہنے پر اس کے مضبوط کردار پر یقین سے متاثر رہا۔ یہاں تک کہ اس کی نظر زہرہ کو دیکھنے کے سلسلے میں بدل گئی۔ اُس کے انداز میں زہرہ کے لئے پیار اور فکر آ گیا تو کل اس نے زہرہ کے ہاسپٹل سے جانے کے بعد یہ سب کیا اٹھایا؟''
''کیا قدم اٹھایا؟'' زہرہ کا سانس تیز تیز چلنے لگا اور جنید مسکرا کر بولے۔

وہ تھی اس نے راحیل کے متعلق ان کے سامنے سارے ظاہر کی۔ کہنے لگا: ڈیڈی جی! راحیل بھی تو آپ کے گھر کا فرد ہے نا، یہ وہی ہے نا جس سے اتنی بات ملنے کی جانی تھی لیکن آپ نے دیکھا، اس نے کیسے شارٹ کٹ مارنے کے چکر میں سارے خاندان کو بدنام کر کے رکھ دیا۔ تھیفٹ کے الزام میں گرفتار ہو گیا تھا اخبارات میں خبریں لگ گئی تھیں، مگر دے دلا کر معاملہ دبا لیا گیا تھا اس کا۔ کیونکہ اگر وہ پکڑا جاتا تو کچھ بڑے افراد کا بھی اس کے بیان میں ذکر تھا اس لئے انکوائری کسی نتیجے کے بنا ختم ہو گئی۔ پھر آنٹی! آپ بتائیے، آپ کے خاندان والوں نے کیا اُسے اپنے اندر سے باہر نکال کر پھینک دیا؟ کیا آپ کی گھریلو تقاریب میں اُسے بلانا چھوڑ دیا گیا؟" امی نے شرمندگی سے سر جھکا لیا تو بولا۔ "پھر آنٹی! آپ بتائیے یہ کہاں کا انصاف ہے کہ غلطی دوسرے کی اور سزا آپ نے زہرہ کو دی؟ دیکھئے ماں نے زہرہ کو کے ساتھ ساتھ ان کے دونوں بچے کیسے ایک گھر کے ہوتے ہوئے جان سے نکالے گئے تو مر جائیں گے آنٹی جی! آپ کو دل سے فیصلہ لینا ہوگا۔ کیونکہ یہ طے ہے اگر زہرہ کو ایک بہترین انسان نہ ہوتیں تو وہ اتنا طویل رسوائی کا عذاب نہ جھیلتیں۔ جنید بھائی اُن کے حق میں تھے لیکن انہوں نے پھر بھی آپ کے رشتے کو ٹھکرا کر نہیں کیا اور سالہ۔" یہ بات امی کے دل کو ایسی لگی کہ انہوں نے فوراً زہرہ کو اور بچوں کو گھر لانے کی ضد کر دی سانس بیماری کی وجہ سے تھوڑے سے ہی نرم دل ہو چکی ہیں لیکن یار! اچانک کام نکل گیا، یہی بہت ہے۔"

وہ جھینپ کر زہرہ نے آنکھیں گھور کے دیکھا پھر ان کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔ "شرم کریں اپنی ماں کی محبت کے بارے میں ایسے کمنٹ دیتے ہیں؟"

جنید ہنسنے لگے، پھر شرارت سے بولے۔ "بس بیگم! تمہیں کیا معلوم کتنی مشکل سے اپنی زندگی میں تمہیں دوبارہ لانے کا آرڈر جاری کروایا ہے۔ سو بہتر ہے اس سے پہلے کوئی فیصلہ بدلے، اپنی پیکنگ شروع کر دو۔"

زہرہ مسکرا کر اٹھ گئیں اور کمرے کی دہلیز پر کھڑی ماں اطمینان سے مسکرانے لگیں۔ کیونکہ ہر روز کی رپورٹ شہریار ماں کو باقاعدگی سے دیتا آرہا تھا۔ جنید سمجھتے تھے وہ صرف ان کی بیماری میں ان کی ماں کے قریب گیا ہے۔ حالانکہ یہ مہم وہ ڈیڑھ مہینے سے انجام دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ پاکستان سے آنے کے بعد اس نے اپنے روٹین پروگراموں میں یہ کام بھی شامل کر لیا تھا۔ بہت سخت باتیں سنی تھیں اس نے کافی دھکے کھائے تھے تب کہیں جا کر تیر نشانے پر لگا تھا اس کے لئے وہ نرم پڑی تھیں اور آج وہ کامیاب ہوا تھا۔

انہوں نے کمرے میں جا کر اس کا موبائل نمبر ملایا تھا مگر جواب میں گھنٹی جا رہی تھی۔ ان کا دل خوف زدہ ہو گیا تھا۔

"اے اللہ میرا بچہ ٹھیک ہو۔" انہوں نے دل ہی دل میں مناجات کی، پھر آدھے گھنٹے بعد دوبارہ موبائل سے نمبر ملایا تو اس کی اندر تک خوشی بھر دینے والی آواز سنائی دی۔ وہ صرف ہیلو کہنے سے ہی پہچان

گیا تھا۔ سو بہت دل سے انہیں زہرہ کے گھر بالکل نئی مبارک باد دے رہا تھا۔ ثنا کبریا ہنستی رہیں، بکھری رہیں۔

"کہاں ہے آن؟ ماں کا دل بہت چاہ رہا ہے اپنے بیٹے کو دیکھنے کو۔"

وہ بس پہاڑ پر ہی ہے ہوا۔ "بیٹے کی طرف سے ان کے لئے پیغام ہے کہ آج شام فیشن اینڈ اسٹائل کا شو ارگنائز ہو رہا ہے اس لئے وہ آج مل نہیں پائے گا، بہت مصروف ہے ماں۔ مگر وعدہ کرتا ہے کہ بہت جلد آئے گا، پارٹی پار ہوں تو ماں کی گود میں سر رکھ کر بہت ساری باتیں کرنے حاضر ہو جائے گا۔"

ثنا کبریا مسکرانے لگیں۔ بیٹے سے بات کرنے کی تمنائی تھیں کیا تو ان کے گھر دل میں امید جاگنے کا احساس کم کر کے وہ گھبرا گئیں۔

"بہت احتیاط سے چلایا کرو بیٹا! سڑکیں بہت خطرناک ہوتی ہیں۔"

"ہوتی ہیں ماں! لیکن زندگی سے کم خطرناک ہوتی ہیں۔ زندگی سے بچھڑا ہوں تو ان کی خطرناکی کا تجربہ بھی کر کے دیکھنے میں کیا حرج ہے؟ جان ایسے جائے یا ویسے، بات تو ایک ہے ماں۔"

"کیا وحشت ہو گئے میرے بیٹے۔ ایسی فضول باتیں نہ کرو۔"

شہریار ہنسنے لگا۔ پھر بہت ساری دعاؤں کے بعد نکلنا ہی تھا۔ ثنا کبریا فون رکھ کر زہرہ تو اچھے سامنے معاملہ کو دیکھ کر بات ہوئی تھیں۔

"ہاں! مجھے نہیں سمجھ آئی، آپ اسے کس بات سے ایسا پیار کرتی ہیں۔ کیا وہ بہت اچھا ہے؟ مجھ سے بھی بہت زیادہ اچھا؟ اس کے بارے میں مجھ سے زیادہ جیسے ہیں جو آپ...."

ثنا کبریا کی آنکھیں نم ہونے سے پہلے کے بیٹے کے چہرے پر آ کر رک گئی تھیں۔

"تم...... مجھے کبھی لگتا تھا تم جتنا تم بڑھانے جا رہے ہو، ساری جبلیں تم میں بھرتا جا رہا ہے۔ تم ایک ماں کی محبت کو دولت کے ترازو سے جانچنا چاہتے ہو۔ تم بھی تو تم جیسے ہو اسے بھی انسانوں کی قدر نہیں تھی، وہ بھی دولت کو سب کچھ سمجھتی تھی اور تم بھی دولت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہو۔ اب تو مجھے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے تم نے کبھی شہریار کی دولت کی وجہ سے تو اس سے دوستی نہیں کی تھی؟ ہوتا ہے ماں، وہ کئی لوگ ہیروں کے پیسوں پر عیش کرنے کے بدلے نہ بدلنے ہوتے ہیں۔"

"ہاں! یہ بہت زیادہ ہے آپ میری تذلیل کر رہی ہیں۔"

"تمہاری اصلیت ہوتے ہوئے بھی تم بھڑک جاتے ہو اور ماں کو ختم کرتے ہو اور تمہارا دل نہیں کانپتا۔ تم جاننا چاہتے ہو نا اس شہریار میں ایسا کیا ہے، جو سب کو اس کی طرف کھینچتا ہے تو وہ ہے اس کی عزت دینے کی عادت۔ وہ کبھی کسی کو خود سے بھی زیادہ سامنے والے کو احترام دے ڈالتا ہے۔ کبھی مطلب تھا کے بغیر وہ لوگوں کو ان کی معاشی حیثیت کے بنا پر کیٹگریز میں نہیں ڈالتا، وہ میرا اس شخص سے کتنے دل سے ملتا ہے وہ جسے اپنی حیثیت پر شرم نہیں آتی فخر ہوتا ہے۔ یہ فرق ہے اس میں اور تم میں۔ اس کی شخصیت میں کوئی جھول نہیں ہے۔ اور تم...... تم اپنے احساسِ کمتری کو احساسِ برتری میں چھپانے کے لئے زیادہ سے زیادہ بڑا اور ہیلتھی دکھائی دینے کی کوشش کرتے ہو۔ کیونکہ تمہیں ڈر ہے کوئی تمہیں اس طرح نہ جان لے، جس طرح تم واقعی اندر سے ہو۔"

شاکرہ بانو کب کی جا چکی تھیں اور وہ بت کی طرح ان کے کمرے کی دہلیز پر کھڑا رہ گیا تھا۔ بہت کڑا تجزیہ کیا تھا ایک ماں نے اپنے بیٹے کا۔ لیکن کیا یہ سچ تھا؟

اس نے اپنے دل میں جھانکا، جواب شاید کبھی نہیں پایا تھا کہ اس نے سر جھٹک کے گھر کے گھٹن زدہ ماحول سے نکلنے ہی میں عافیت جانی تھی۔

***

آج بہت صبح آنکھ کھل گئی تو مانو ٹہلنے باہر چلی آئی تھی۔ اس کا دل مان ہی نہیں رہا تھا کہ اس کی ماں ہوتے ہوئے بھی غیر محل میں موجود ظالم ماں ایسی بھی ہو سکتی ہے۔ اس عورت کو اس نے تحتِ شعوری کیفیت میں دیکھا تھا اور اب کتنے الگ بہت کڑوا سے ملی تھیں۔

بابا کہتے ہیں وہ میری ماں ہیں۔ لیکن مجھے کیوں نہیں لگتا وہ میری ماں ہیں؟ ماں تو ماما کی سی ہوتی ہیں۔ جب بھی تصور کرتی ہوں مجھے ماما کیوں یاد آنے لگتی ہیں؟ میں نے جب سے آنکھیں کھولی ہیں میرے دل میں کتنی بار خیال آیا، میں آنکھیں بند کروں اور دیکھوں، میرا دل کسے چاہتا ہے۔ اور جب بھی آنکھیں بند کرتی ہوں میری آنکھوں کی پتلی پر صرف ماما کا عکس ہوتا ہے۔

وہ ڈریسنگ روم میں ٹہلتی ہوئی آئی تھی، جب اچانک تپائی پر دونوں ہاتھوں کے سہارے سے چلتے ہوئے اس کے سامنے وہ تیار آ کھڑی تھی۔

"ماما......" اس نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھاما۔ مگر ہاتھ حرارت سے خالی تھے اور آنکھوں میں اندیشے کے لئے بیزاری کی رٹ کیفری ہوئی تھی۔

"تم آخر ہو کون، جو میری بیٹی بننے پر تلی ہوئی ہو؟ میں نے کہا ہے نا، میری صرف دو بیٹیاں تھیں، جنہیں میں نے خود چھوڑ دیا تھا۔ مجھے بچے پالنے سے سخت چڑ تھی مگر سلیم افروز کو بچوں سے عشق تھا۔ پتہ نہیں وہ اتنا پڑھ لکھ کر بھی ایسا احمق کیوں تھا؟" وہ لمحے بھر رکی، پھر رازداری سے بولی۔ "سنو! میرا مشورہ ہے تمہیں تم شادی نہ کرنا۔ شادی کسی روگ ہوتی ہے......" وہ نیلے ایک جھٹکے کے ساتھ

بات پر ایک بار پھر مسکرا کر بولی۔ ”ابھی دیکھو میری زندگی کتنی مست ہے۔ نہ شوہر کی ذمے داری، نہ بچے۔ جہاں چاہتی ہوں، چلی جاتی ہوں۔ جیسے چاہتی ہوں، زندگی نبھائے کرتی ہوں۔ تمہیں پتہ ہے، زندگی گزارنے کے لیے سب سے زیادہ ضروری کیا چیز ہوتی ہے؟“

”محبت......؟“ انوشے نے رُک کر لہجے میں کہا، وہ زوردار قہقہہ لگا کر بولی۔

”محبت...... یہ محبت کیا ہوتی ہے؟ جب پیٹ خالی ہو تو محبت ساتھ نہیں دیتی۔ پیٹ کو روٹی چاہیے اور روٹی کے لیے پیسے چاہیے ہوتے ہیں۔ اور میں نے زندگی کا یہی اصول بنالیا ہے، پیسہ جہاں سے جتنا ملے، حاصل کرلو۔ یہ مت دیکھو وہ پیسہ جائز ہے یا ناجائز۔ میں نے اپنی ساری زندگی اسی نظریے پر گزاری ہے۔ دیکھو پیسوں میں کھیل رہی ہوں، پیسوں میں......“

انوشے حیرانی کی کیفیت میں ڈوبی تھی۔ پھر باہر نکلی تھی تو زینب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر افسوس سے کہا تھا۔

”میم تانیہ جس قبر میں آکر رک گئی ہیں، اس قبر کی ایک ایک بات میں صرف یہی تو کہنا ہے کہ ان کے پاس بہت پیسہ ہے، انہوں نے بہت عیش سے زندگی گزاری ہے۔ مگر میم اس سلیم افسر نے ان کے بتائے گئے اکاؤنٹ نمبر اور فیک نام سے جو ان کی رقم جمع تھی، بینک سے اس کے بارے میں معلومات کیں تو پتہ چلا ان کے سارے اکاؤنٹ کسی نے خالی کر ڈالے۔ میم تانیہ کے ساتھ بہت برا ہوا ہے۔ ان کی زندگی کا محور دولت ہے اور اکثر مرزا کے خیال میں اگر یہ بات انہیں کبھی پتہ چلی تو شاید وہ باقی کے دن بھی قرار نہیں رکھ سکیں گی۔“

انوشے بنا کوئی بات کیے سر ہلا کر رہ گئی تھی۔ اس کا رخ گھر کی طرف تھا اور دل بہت اداس تھا۔ وہ جس آس پر یہاں آئی تھی وہ اس کی آنکھوں کے آگے ہی دم توڑ گیا تھا۔ دل نے اپنی کوئی سیڑھیاں اور نیچے اتار دیا تھا۔

❀❀❀

وہ ابھی ابھی دفتر سے نکلا تھا۔ ہر طرف اس کی بے چارگی کے ہی قصے تھے۔ اسے پہلی بار لگا تھا، وہ واقعی جینے والوں کی لسٹ میں شامل ہے، ورنہ بہت سالوں پہلے تک اسے ہر لمحہ اپنے وجود سے گھٹن کے سوا کچھ نہیں آتا تھا۔ کوئی ایک بھی ایسی خوشی وجہ نہیں تھی، جسے وہ جینے کی وجہ بنا سکتا۔ پھر اچانک اسے لگا اگر وہ اپنے دل کی بھڑاس نہیں نکالے گا تو دماغ پھٹنے سے یا تو مر جائے گا یا پھر اور بہت سے لوگوں کی طرح بے حسی کی چادر لپیٹ کر سو جائے گا۔ یہ غنڈہ سامراج کے جادو جیسی نیند تھی، جہاں ہر شخص نیند میں چلنے کی بیماری میں مبتلا تھا۔ ہر کام ہو رہا تھا، سب کی زندگیاں کٹ رہی تھیں، لیکن پھر بھی سوچنے کا دستور یہاں کے لوگوں کے نصاب سے نکل گیا تھا۔ آج کل لوگ کسی کے گھر کی آگ میں صرف ہاتھ سینکتے تھے یا تماشائی بن کر اپنی زندگیاں گزارتے تھے یا پھر سگریٹ اور سگار کے

جو ٹی وی میں بیٹھ کر باتیں کرنے والوں کی طرح جو اللہ کے بارے گئے نکال دیکھ کر پریس نوٹ جاری کرتے تھے کہ یہاں اس ملک میں کچھ نہیں بدلا جا سکتا یہ ملک رہنے کے قابل نہیں رہا اور بس.......

اور وہ اس اور بہت سوں میں سے زندگی تشکیل کرنے کے عمل سے ہو کر گزر رہا تھا۔ جب اس نے پہلی بار اجنبی کے نام سے پہلا کالم لکھا اس دن اس نے پہلی بار اپنے ہونے کا احساس پایا۔ وہ نیٹ کے ذریعے اپنے لکھے ہوئے کالم کو کسی بھی بڑے اخبار کے لئے میل کر رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ ایک دن اس کے باس نے اس کی یہ چوری پکڑ لی تھی۔

"آہا تو آپ ہیں اجنبی۔ حیرت ہے اتنا اچھا لکھتے ہو تو میرے دفتر میں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں تو صحافت کا حصہ ہونا چاہئے تم نے ایم اے صحافت کر رکھا ہے ناں۔"

"تو سر! لیکن صحافت سے مجھے نفرت ہے۔"

"لیکن جو تم لکھ رہے ہو یہ بھی تو صحافت ہے؟" اس کے باس نے نکتہ اٹھایا۔

اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ "نو سر! یہ صحافت نہیں ہے، یہ مجھ پر قرض ہے جب سامنے خاص کام کی قسطیں سمجھ سکتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے سر! میں نے آج تک اپنے کسی کالم کا معاوضہ نہیں لیا حالانکہ اجنبی کا لکھا ہوا کالم تینوں بڑے اخباروں میں اردو اور انگلش میں ہر روز چھپتا ہے۔"

"ماننا پڑے گا اجنبی! آپ ہماری طرح جی کے سر پھرے ہیں آپ کی عظمت کو تو سلام کرنا چاہئے۔ میرے خیال میں ایک بزنس پارٹی میں بھی ہماری ملاقات ہوئی تھی اس دن۔ میں آپ کو دیکھ کر چونک گیا تھا لیکن آپ نے اس دن بات ٹال دی تھی۔ آپ نے کہا تھا آپ وہاں اپنے نادر کے بی اے پر شریک ہیں کہ آپ کے نادر اسٹر......."

اور اس نے فوراً اشارے سے اپنے باس کو روک دیا تھا۔ "پلیز سر! وہ میرے نادر ہیں، یہ سچ کہتا ہوں میں اس اذیت سے بے حال پھرتا ہوں اچھا گھر، گاڑی، عیش و آرام، میں نے یہ سب اس نام کی وجہ سے ملنے پر ہی چھوڑا ہے۔ آپ جب مجھے میری کسی غلطی پر ڈانٹتے ہیں ناں سر! تو مجھے لگتا ہے آپ نے میری غلطی کو نہیں میرے نادر کی دی ہوئی بچی ہوئی زندگی سے ہونے والی غلطی کو جھڑکا ہے۔ انہیں جھڑکا ہے۔ سو مجھے اس دن بہت خوشی ہوتی ہے۔"

"افوہ! آپ بھی ناں، اپنے مزاج کے ایک ہی ہیں۔" یہ اس کے باس کا اس کے بارے میں آخری کمنٹ تھا۔ پھر وہ اجنبی نام بہت مشہور ہوا۔ جب اس کے کالم کا ایک بہت ہی روشنک ای میل آئی۔

"محبت کرنے والوں کی قدر کرنا صرف دل والے جانتے ہیں اور دل والے پیار کے لئے کچھ بھی ٹھکرا سکتے ہیں، چاہے وہ عیش و آرام ہو، جان ہو، کچھ بھی۔ اگر کہیں اسٹف تم میں موجود ہے تو محبت کا ڈوبی

ہم بھی کر سکتے ہیں۔"
وہ بوکھلا گیا۔ اس کی اپنی کہی بات یاد دلا دی۔ لکھنے گئے آئیڈیاز بھی یاد آئے۔ اس نے سکول میں لکھنا شروع کیا تھا، پھر یہ سلسلہ چل نکلا تھا۔ پہلی بار اس سے بالکل اجنبی شخص ملا تھا اور اب بات کرنے کے لئے اس نے سرکل میں آنے کا موقع دیا تھا۔ محبت ثابت کرنا اس سرکل کا ایک خفیہ اصول تھا۔ بڑا پکچرسک فارورڈنگ سیکھی تھی مگر اندرونی طور پر سب اس کام کے ماہر تھے۔ غزل، نظم، رباعی، ہر کسی کے لئے جان ہتھیلی پر لئے پھرنا، یہی ان کا کام تھا۔
وہ بیٹھا سوچتا رہا۔ اچانک اس کے دماغ نے واضح ہو کر کہا، اس نے سچ ہی کہا تھا۔ "زندگی بہت خوب صورت ہے۔" کوئی یاد کرا دیا گیا تھا۔ کیونکہ میں بھی ایک طرح سے اس کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"
اس نے جواب دیا۔ "زندگی صرف تمہاری وجہ سے ہی خوب صورت ہے۔" جس کا مطلب تھا "ملیں گے، مگر اسے اعتبار کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے۔"
وہ خاموشی سے اٹھ گیا تھا۔ ایک نیا احساس اسے لئے ہوئے تھا، وہ جانے کی بات پر کر کے اٹھ گیا تھا۔

❀❀❀

آج اس کا جشن وہ منا رہا تھا۔ آج پہلی بار اس نے اپنی زندگی کا سب سے لمبا دائرہ کھینچنے کی ہامی بھری تھی۔ غربت، افلاس، تنگی، بے بسی کی جان مارنے کے باوجود زندگی کے پیچھے پیچھے بھاگتے دیکھ کر اس نے سوچا تھا وہ اس کی طرح کی زندگی کبھی نہیں گزارے گا، وہ کبھی زندگی سے فریب نہیں ہوگا۔ اس کی خودی، زندگی اس کے پیچھے دوڑے۔ انہیں کیا پتا تھا وہ بے بسی ایسی کہ زندگی اتنی سب اس کے غلام رہیں اور وہ اس کی حسرت سے کبھی انکار نہیں کر سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ لاہور میں تعلیم کے لئے آنے کے باوجود ہفتے کے تین دن اس کے کراچی میں گزرتے۔ وہ کئی گرل فرینڈز رکھتا تھا، لیکن پھر بھی باقی وقت پارٹیز میں نکل جاتی تھی۔
اس نے آج تک اپنے وجود کو کبھی کسی کی جھولی میں نہیں ڈالا تھا۔ وہ ایسا کرنے کے لئے کسی اصول، کسی معاشرتی بندھن کی قائل نہیں تھی بلکہ وہ منتظر تھی کسی ایسے ہی دلدار انسان کی، جو اسے روپے پیسے کے جھولے میں لمبی لمبی پینگ دے سکے اور پرواز کی وہ منزل ہو، لمبی پینگ اپنے لیے لیتے اوپر جانے کا سفر کرتی۔ پرندہ بن جاتا اور اوپر سے نیچے آنے میں کسی طرح نہیں آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی ایسے مرد کی

تمنائی تھی، جس کی زندگی میں شامل ہو کر وہ کبھی پیچھے کا سفر نہ کرے۔ بلند سے بلند، اونچی سے اونچی ہوتی جائے۔ اور یہ سفر اسے دینے والا آ گیا تھا۔ بات صرف کچھ دیر سے شروع ہوئی تھی، مگر اب لگتا تھا بہت آگے جانے والی تھی۔ اس کے سنگ رہنے والا شخص اس کی محبت کا دم بھرنے لگا تھا اور وہ بھی چاہتی تھی۔ ایک جشن پسند زندگی اور ایک خواب بھر کا سفر۔“

اس نے لپ اسٹک سے ہونٹوں کو نکھار دیا۔ پرفیوم اپنے چہرے سے اپنے وجود کو خوشبوؤں میں بسایا اور بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی کو دیکھا۔ انمول سی ہوئی انگوٹھی اس کے خوابوں میں رنگ بھرے جا رہی تھی۔

”میں تمہیں دل سے اپناتا ہوں۔ زندگی کا سفر تمہارے ساتھ گزرے تو زندگی سنوار دے گی۔ سونیا پلیز انکار مت کرنا۔ دیکھو میں ایک ہفتے بعد جا رہا ہوں۔ آج اپنا کر رخصت کر دو۔ دل ساری عمر تمہاری محبت کی قید سے نکلنا بھی چاہے تو نکل نہیں سکے گا۔“ مخمور وارفتہ ترنم اور اس کا قرقری تبسم......

”آپ جانتے ہیں دل میری دنیا ہے؟...... مجھ سے شادی کرنی پڑے گی آپ کو۔“

”دل سے تمہارا ہوں، پھر بھی تم نارمیلٹی سمجھانا چاہتی ہو؟ چلو یہ بھی چلو۔ ہم بھی شادی کر لیتے ہیں۔“

ایک اور قرقری تبسم...... وہ ساتھ ساتھ اٹھنے والے قدموں کی آواز۔ ایک دھوکا دینے پر مصر، ایک دھوکا کھانے پر تیار۔

زندگی نے نیا موڑ لیا۔ وہ نکاح تک جاتے جاتے صرف منگنی کی انگوٹھی پہ آن رکی مگر پھر بھی ضد کر کے بولی۔ ”کل پتا چلا ہے، آپ پہلے سے شادی شدہ ہیں؟“

”ہاں، میں شادی شدہ ہوں، تم سے کیوں چھپاؤں گا؟ مگر سونیا! وہ عورت میری ماں باپ کی پسند ہے، گاؤں میں رہنے والی بالکل نالج ہوتی ہے اور مجھے...... مجھے تم جیسی پرجوش محبت ہی لطف دے سکتی ہے۔ تم اسے بھول جاؤ، وہ گاؤں میں رہے گی، میں تمہیں یہاں الگ گھر دوں گا۔ جو تم چاہو وہ تمہارے نام لکھنے کو تیار ہوں، دولت، گاڑی، گھر وہ اپنا آپ سب کچھ۔“

قرقری تبسم پھیلتا چلا گیا۔ اس کی طوالت پورے بدن میں پھیلتی ہوئی اور آنکھوں کی چمک اندھیرے میں جگنو کی بند ہوتی کرن کی طرح چمکتی چلی گئی اور آج کا دن تھا وہ اپنے اسی فیصلے پر مسرور تھی۔ اس نے کسی کا دل پکڑ سے باندھ لیا تھا۔ زندگی میں کہیں شارٹ کٹ نہیں ہوتا لیکن اس نے یہ رسک لے لیا تھا۔ ہاسٹل میں اس کا امیج ایک بری لڑکی کا تھا۔ شریف گھروں کی لڑکیاں اس سے دور دور رہتی تھیں۔ لیکن اسے اس کی کبھی پرواہ نہیں رہی تھی۔ اس کا خیال تھا، جو جو وہ کر رہی ہے وہ جائز ہے۔ جس طرح بے انتہا بھوک میں غربت میں حرام جانور بھی حلال ہو جاتا ہے اسی طرح نامساعد حالات، تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے اس کام میں کوئی برائی نہیں ہے۔ اگر وہ ایک دو گھنٹے کے لیے کسی کے پاس اپنا وقت اور اپنی کمپنی فراہم کرتی ہے۔ اس نے کبھی کسی مرد کو حد سے تجاوز کرنے نہیں دیا تھا۔ وہ

بہت بڑی وجہ اس کی غربت تھی، پھر بھی ہمیشہ اس نے اپنا آپ سنبھال کر رکھا تھا۔ لیکن یہ جانتی تھی کہ اس کی مدھم شہرت بھی اس کو کوئی اچھا گھر نہیں دے گی اور اس کی مڈل کلاس میں کوئی اچھا گھر ملنے کی شکل
بھی کہاں سے پیدا ہو سکتی تھی۔ سو اس نے اپنی شہرت کو پہلی بار اس فیلڈ میں موجود جاہ و حشمت کے پیچھے کیا تھا۔ جب سے وہ زوار حسن شاہ سے ملی تھی اور آج پورے ایک سال کی کاوش کے بعد وہ ایک عہد سے
بندھی اپنی زندگی کا سب سے بڑا جوا کھیلنے جا رہی تھی۔

زوار حسن شاہ اس کی محبت میں لاہور چلا آیا تھا۔ یہی بہت تھا۔ اس نے ہاسٹل کی دیوار پھلانگی تھی اور دو چار دن کی مشق گرم کر دی تھی۔ گو کہ الزام اس کے سر بھی نہ آئے اور وہ اپنی خاموشی بھی برقرار رکھے۔ رہی
ماں تو وہ اسے اس کا کوئی ذکر نہیں تھا کیونکہ شادی کے بعد وہ مسز زوار حسن شاہ ہوگی۔ پھر اس کے رسوائی کے آگے کبھی اکا دکا کسی کی اکمانی تھی جو کہ کسی نے اس نے آنے والے آپ کا جائزہ لیا۔ پھر
وہ اس کے آنے والے لمحوں کا انکار کر رہی تھی کہ اس کے موبائل پر کال آئی۔

”ہیلو سونیا سپیکنگ۔“

”ہیلو سونیا! میں شگفتہ بول رہی ہوں۔ پلیز تم جلدی سے گھر آنے کی کوشش کرو۔ اچانک اماں کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ میں انہیں ہاسپٹل لے آئی ہوں۔ لیکن پتہ نہیں میرا دل بہت ڈر گیا ہے۔ تم آ رہی ہو
ناں سونیا؟“

”ہاں.....ہاں، میں آ رہی ہوں۔“ اسے لگا کسی نے اسے سب سے اونچی عمارت کی چھت سے دھکا دے دیا ہو۔ اس کی زندگی سے آگے بغیر جا رہا تھا۔ یہاں اس کے ضبط کا موقع نہیں تھا۔

”ہیلو ڈارلنگ! تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو آج۔“ کسی نے عقب سے کہا تھا مگر اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی حیرت سے پوچھا۔ ”کیا ہو گیا ڈیئر! کیا میرے دیر سے آنے پر خفا ہو؟ دیکھو میں تمہیں
پہلے بتا دوں، مجھے مت جلانا۔ زندگی کا سا منصب بے وفائی پارٹنر پر بہت غصہ آتا ہے۔ سویٹ ہارٹ! آج ہماری زندگی کا اتنا پیارا دن ہے اور تم اداس ہو؟“

”میری نانی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ مجھے کراچی جانا ہوگا شاہ صاحب!“

زوار حسن شاہ نے اسے کتنا چونکا کر دیکھا تھا، پھر نرمی سے لہجے میں بولا۔ ”او کے ڈیئر! ہمت رکھو۔ ہم ملن کی یہ سلیبریشن پھر کر لیں گے۔ تم گھر جاؤ۔ میں خود تمہارے ٹکٹ کا انتظام کرتا ہوں۔ لیکن سونیا! اب
میرے جانے کے بعد تم کراچی میں ہی رہنا۔ میں جانے سے پہلے اب تم سے وہیں ملوں گا۔“

AANCHAL.COM.PK

"شکریہ شاہ صاحب! آپ کتنے اچھے ہیں۔ مجھے فخر ہے میرا انتخاب غلط نہیں۔"

"انتخاب تو میرا بھی بہت اچھا ہے میڈم!" زوار حسن شاہ نے بھرپور محبت کا احساس دیتے ہوئے اس کے کان میں گنگنا کر کہا۔ سونیا نے محبت کے ان الفاظ پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا پھر اس نے ہوٹل کے کمرے سے ہی اس کی سیٹ کنفرم کروائی تھی۔ زوار حسن شاہ نے اسے ایئرپورٹ تک جانے کے لیے اپنی گاڑی باوردی ڈرائیور کے ساتھ عنایت کی تھی۔ وہ اپنے چھوٹے سے بیگ کو کندھے پر ڈال کر باہر نکلی تھی۔ پھر اسے نکلے پندرہ منٹ بھی نہیں گزرے تھے زوار حسن نے ایک موبائل نمبر پریس کر کے کہا تھا۔

"ہیلو پلیز! کیا آج کے دن تم مصروف تو نہیں ہو؟...... مجھے بہت تنہائی لگ رہی ہے ڈارلنگ! آج پورا دن صرف تم ہی وہ لڑکی ہو جس نے مجھے سمجھا ہے۔ پلیز ڈارلنگ! میری تنہائی کو بھگا دو۔"

اس نے موبائل اٹھا کر آف کیا تھا اور زندگی اس کی زندگی پہ ہنس رہی تھی۔

❁❁❁

آج پتہ نہیں ان کے دل کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ تنہائی میں بیٹھے بیٹھے اٹھے تھے اور پیر گھسیٹتے ہوئے آصفہ کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"آج آپ کو بہت کھانسی آ رہی ہے، خیریت تو ہے؟" وہ ان کی پشت تھپکنے لگے۔ ان کا یہ عمل انتہائی مشکل کام تھا۔ لیکن کھانسی کا بہانہ تھا کہ کسی جرم کا احساس۔

انہوں نے اپنے شوہر احسان راشدی کو دیکھا۔ شوہر احسان راشدی بھی انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ ان کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے بہت غیر متوقع ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اگر ان کا وجود پتھر کا ہوتا تو دکھائی دے جاتا کہ اس محبت کے لمس نے ان کی جلد کے نیچے کتنے ننھے ننھے سے رنگ ابھار دیے تھے۔ انہیں تو اب یہ بھی یاد نہیں تھی کہ وہ کس مدت سے کہاں اور کیوں جل کر راکھ ہو گئی تھیں۔

"آصفہ! کل جو کچھ آپ نے کہا وہ سچ تھا؟" بہت دیر سے رکی ہوئی بات ان کے ہونٹوں پر پھسل آئی تھی۔

آصفہ نے کچھ نہیں کہا تھا۔ کیونکہ حقیقت کی زبانی پر وہ پہلے ہی کہہ چکی تھیں کہ شادی بیچ چکی ہیں، سو انہوں نے ایک سچ کا اقرار کر لیا تھا۔ لیکن اب یہ شخص جو سامنے بیٹھا تھا اس نے جتنی محبت سے ان کا ہاتھ تھام رکھا تھا، اگر وہ کہتیں ہاں وہ سب سچ تھا تو وہ اس کی نفرت سہہ سکیں گی؟ خود ان کی بیٹی ان کی موت پر رونے کے بجائے ان کی نفرت میں جل بھن جائے گی۔ شاید بچے آپ سے بھی نفرت کرنے لگیں گی۔

"آصفہ! تم نے کل جو مجھ کو بتایا تھا کہ وہ، وہ جھوٹ تھا، تم صرف مجھے میرے دکھ سے آزاد کرنے کے لیے جھوٹ بول رہی تھیں ناں؟ تمہیں لگا تھا تم کل مر جاؤ گی تو میں کیسے دو دو موتوں کا بوجھ اٹھا کر جی سکوں گا؟ میں خود سے نفرت میں کہیں کوئی غلط قدم نہ اٹھا لوں۔ تم یہی چاہتی تھیں ناں، میں عطیہ کے غم کو کسی سمندر میں بہا دوں؟ اس کی بے وفائی کا غم بھول جاؤں اور پھر سے جینے لگوں؟ تم یہی چاہتی تھیں ناں کہ میں نے جو اپنے گرد ایک تنہائی کا صحرا کھینچ لیا ہے، وہاں سے کسی تمنا کی شدید پیاس سے رگڑ کھاتی ایڑیاں کوئی چشمہ پھوٹ بہائیں؟ تم یہی چاہتی تھیں ناں، میں پھر سے جینے لگوں؟"

آصفہ ارسلان راشدی نے انہیں دیکھا اور ایک کمینی سی تمنا نے ان کے بیچ کا گلا گھونٹ دیا۔ انہوں نے ان کے ہاتھ پہ اپنے لمس کا جھنجوڑ کر دیا تھا، پھر بھرائے لہجے میں بولی تھیں۔

"میں صرف آپ کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں...... میں چاہتی ہوں، آپ پھر اپنے پہلے کی طرح جئیں۔ آپ، جن کا آئی کیو لیول ہنڈرڈ پرسنٹ تھا، لوگ آپ کی گفتگو سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے تھے، میں چاہتی ہوں، آپ شافعہ کا ساتھ دیں۔ وہ بچی دن رات محنت کر کر کے تھک گئی ہے یار ارسلان! آپ کی چینگوں نے انہیں کمایا نہیں کہ شافعہ سکون کا گہرا سانس لے سکے۔ آپ کو پتہ ہے، تیس دن سے وہ مسلسل جاگ رہی ہے۔ اس کی آنکھیں جاگ جاگ کر سرخ انگارہ بن گئی ہیں، مگر وہ پھر بھی ڈیوٹی دے کے آتی ہے۔ ارسلان! یہ وہ زندگی نہیں، جو میں نے اس کے لیے سوچی تھی۔"

ارسلان راشدی نے ان کی طرف دیکھا تھا، وہ کچھ نہیں بولے تھے مگر امید کا قیدی آزاد ہو گیا تھا۔ آج انہوں نے اپنے کمرے کی نئے سرے سے صفائی ستھرائی کی تھی، بیراں نے کاغذات نکال کر انہوں نے انہیں ترتیب دیا تھا اور دوپہر کو جب شافعہ گھر آئی تھی تو انہوں نے اسے سیدھا اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔

شافعہ نے حیرت سے ارسلان راشدی کی اور کمرے کو دیکھا تھا۔ آج وہ دونوں سنگ کے حلیے میں تھے، کسی خود رو نیم بیری کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ آج بھی ان کے چہرے کا جمال ایسا تھا کہ ہزاروں دل رک جاتے ہوں۔ لیکن، عطیہ چاچی نے کہا تو دل ہار دی تھیں۔ عطیہ چاچی، آج تک اس نے اس گھر میں ان کی کوئی تصویر نہیں دیکھی تھی، صرف بچپن میں ذکر سنا تھا، جب اماں ان کے نام لیتے جاتے پہ جلیلہ کمان کے لیے نفرت آمیز گفتگو کرتیں۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" وہ مسکرائے۔

وہ ان کے بستر پہ بیٹھ گئی۔ "بابا!...... بابا!...... آپ تو آج پہچانے ہی نہیں جا رہے۔"

ارسلان راشدی نے اس کا چہرہ دیکھا، پھر سنجیدگی سے بولے۔ "میں تو پھر بھی پہچانا جا رہا ہوں، لیکن شافعہ! تمہیں کیا ہو گیا ہے، چند دنوں میں تم میں بہت چینج آیا ہے۔ تمہارا رنگ کتنا جل گیا ہے اور

تمہاری پیاری آنکھیں، یہ کیوں سوج رہی ہیں؟ کیا روتی رہی ہو؟"

"نہیں تو بابا! آپ کو وہم ہوا ہے۔" اس نے نظریں چرا لیں۔ مگر ارسلان راشدی مصر رہے تو اس نے انہیں عارف جواد کے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

ارسلان راشدی کے چہرے پہ کرب آ گیا تھا۔ پھر انہوں نے سر جھکا کر کہا تھا۔ "اگر آج میں منسٹری میں کسی اچھے عہدے پہ ہوتا تو شاید یہ فیصلہ کبھی نہیں لیتا۔ محبت...... محبت ہمیشہ دولت کے پیچھے بھاگ کر کیوں رسوا ہوتی ہے؟ رسوا کرتی ہے۔ وہ عطیہ...... اسے بھی صبر نہیں تھا۔ اس نے بھی محبت اور دولت میں سے دولت کو چن لیا تھا۔ اور یہ عارف...... مجھے تو نفرت ہے محبت سے۔ میں...... میں دکھاؤں گا اس محبت کو، میں آج بھی دولت کما سکتا ہوں۔ محبت نے میرا اعتبار ختم کیا، لیکن میں اسے اپنا انتظار کرنا سکھاؤں گا۔"

"عطیہ چاچی...... بابا! آپ کو پتہ ہے عطیہ چاچی کہاں ہوں گی؟" اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا اور وہ نفرت انگیز لہجے میں بولے۔

"ہوگی کسی اپنے محبوب کے پاس۔ دولت والوں سے پیار کرنے والوں اور حسن سے پیار کرنے والیوں کا کوئی ایک ٹھکانہ ہوتا ہے کہیں؟ یہ محبت تھوڑی ہے جو ایک ہی در پہ پڑے رہ کر پتھر ہو جائے؟"

ان کی نفرت سے گھر دہلنے لگا تھا اور باہر دیوار سے ہاتھ ٹکائے کھڑی آصفہ ارسلان راشدی تھیں۔ ان کے اندر ایک یاد چکراتی پھر رہی تھی۔

"پلیز آصفہ بھابی! ایک بار ارسلان کو بتا تو دیجیے کہ عطیہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ عطیہ کی بیٹی میں اسے سونپنا چاہتی ہوں۔ پلیز! ایک بار مجھے اس سے ملنے تو دیجیے۔ وہ جتنا بھی خفا سہی لیکن عطیہ کی موت کی اطلاع اسے موم کر دے گی۔ اس کی اولاد پہ صرف اس کا حق ہے آصفہ بھابی! پلیز......"

اور رعونت سے انہوں نے دروازہ بند کر دیا تھا پھر سرد لہجے میں بولی تھیں۔ "رکھو تم عطیہ کی اولاد کو اپنے پاس۔ ہمیں نہیں چاہیے اس کی اولاد۔ شاد کیجیے آپ ہی اسے۔ ہمارے لیے وہ جیسے پہلے مر چکی تھی۔"

"بھابی! ایسا ظلم مت کریں۔ عطیہ بے قصور ہیں۔ وہ آج بھی ارسلان کا نام لیتے لیتے دنیا سے گئی ہیں۔ پلیز بھابی! آپ تو عورت ہیں، اتنی پتھر دل تو مت بنیں۔"

مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ انہیں اس وقت اپنے آپ آنے والی اولاد کا بھلا سوچنا تھا۔ وہ تینتیس راشدی کی بیوی تھیں مگر ان کی اچانک حادثے میں ہو جانے والی موت نے ان کے لائف کو بکھیر دی تھی۔ تین برس سے وہ اولاد کو ترس رہی تھیں اور اب یہ خوشی ان کی جھولی میں آنے ہی والی تھی تو ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ عطیہ بانو ایک سال پہلے ارسلان راشدی کی زندگی میں آئی تھیں۔ پہلے ارسلان راشدی اپنی تنخواہ کا زیادہ حصہ ان پہ اور اپنے بھائی پہ لٹا دیتا تھا۔ لیکن بیوی کے آنے سے ان کی توجہ پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ پھر ان کی ماں نے انہیں ورغلانا شروع کر دیا تھا کہ اگر بیوی کے آنے سے وہ ایسا بدل

گیا ہے جو اولاد ہونے پر تو وہ ان کے ہاتھ سے بالکل ہی نکل جائے گا۔ پھر ان کی اولاد کا مستقبل کتنا تاریک ہو جائے گا۔ یہ کچھ تو ابھی سے وہ تمہیں چھوڑ کر شہر سے ملنے والے بنگلے میں شفٹ ہو گیا ہے اور تم ابھی تک وہ کمرے کے گھر میں پڑی سڑ رہی ہو۔

اور بس پھر اٹھتے بیٹھتے ان کو یہی پراگ ہو گیا تھا۔ ان کے شوہر انہیں قناعت صبر کی تلقین کرتے، جتنا مل جائے اسی پر شکر کرنے اور اپنے سے بہتر حالات میں جینے والوں سے حسد کرنے سے روکتے تھے مگر انہیں یہی فکر کھائے جاتی تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے رو دھو کر اپنے دل کی بات ارسلان راشدی تک پہنچا ہی دی تھی۔

”خدا اچھا وقت دکھائے تو برے حالات میں ساتھ دینے والوں کو بھلا نہیں چاہیے۔“

ارسلان راشدی اس جملے میں چھپے پیغام کو سمجھ گئے تھے۔ سو گھر کو کرائے پر اٹھا کر وہ بیوی اور بچوں کو لے کر اپنے بنگلے میں آ گئے۔ زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی کہ انہیں اس میں بھی خامی نظر آنے لگی۔ وہ بڑا ہوا جا رہا تھا مگر یہ سب ان کا خیال تھا۔ عطیہ کو بھی رکاوٹ کرنے کا اختیار ان کے پاس رہنا چاہیے۔ خود عطیہ بھی نرم طبیعت کی مالک تھیں اس لیے ان کی اس بچگانہ ضد کو بھی نبھا لیتی تھیں۔ گھر کے چھوٹے چھوٹے فیصلوں کے لیے وہ ان سے رائے لیتیں مگر آہستہ آہستہ یہ سب ان کو ڈھونگ سے یوں پھر سے دھیرے دھیرے کچھ بدلنے لگا۔ سہیل راشدی نے آخر کو اس عمل سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ جس راستے پر چل رہی تھیں اس میں توازن برقرار رکھنا دشوار ہو گیا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ ان کی چھوٹی چھوٹی شکایتوں سے گھر میں روز روز کی لڑائیاں ہونے لگیں۔ یہی بات سہیل راشدی کو اندر ہی اندر کھا گئی تھی۔ سو ایک دن کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ حادثاتی طور پر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد زندگی نے ایک نیا موڑ لیا اور پھر عطیہ بانو بھی ان کی زندگی سے نکل گئیں۔

”ماں! آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟ دیکھیے تو آپ کی طبیعت کتنی خراب ہے۔ آپ کو سخت آرام کی ضرورت ہے۔“

کہیں قریب سے شائلہ کی آواز پر وہ چونکیں۔ سارا ماضی دھڑ دھڑ کرتا ان پر آ گرا۔ اذیت بھی ازاد کر ان کی سانس کی نالی میں اکٹھی ہونے لگی۔ ان پر ایک بار پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ یہ دورہ اتنا شدید تھا کہ فوری طور پر انہیں ہسپتال لے کر جانا پڑا تھا۔ ارسلان راشدی آج پہلی بار اس کے ساتھ تھے۔ شائلہ کو لگا تھا وہ ان کمزوری میں جیسے نئے سرے سے اپنے قدموں پر کھڑی ہو گئی ہوں۔ انصار پسندی چاہے جتنی بھی ہو، نہ تو اس سے کوئی تکلیف اور دکھ میں اگر کوئی ہو جو آپ کی پشت پر آپ کی ڈھارس کی طرح آ کر اس زندگی سے جنگ لڑنا اور جیتنا جیسے بہت آسان کام لگتا ہے۔

عطیہ کے حلیہ دیکھنے کے باوجود ایک ماں کی حیثیت سے ماہ بیگم بیٹے کی شادی کی تیاری کے لئے نکلی تھیں اور بہت غیر متوقع انہیں وہ چہرہ نظر آ گیا جس سے پہلی بار ملنے کے بعد بھی دل نے کہا تھا کہ وہ اس چہرے کو شاید بہت پہلے سے جانتی ہیں۔ اور اکثر پبلک پلیس پہ اسے دیکھ کر دل نے اکثر اس سے مل بیٹھنے کی ہمک بھری تھی اور کافی دفعہ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس چہرے سے مل بیٹھی بھی تھیں۔ لیکن آج دل کے کہنے میں لگ گئی تھی۔

"ہیلو جاناں......!" ماہ بیگم نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور جانانہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"ہیلو میم! کیسی ہیں آپ؟" پھر مسکرا کر دکھانے کی کوشش کی۔ مگر جب معاملہ برائیڈل شاپنگ کا آیا تو وہ اچنبھے میں آ گئی۔

"کسی برائیڈل کی شاپنگ میں کروں میم! یہ بہتر نہیں ہے۔"

"کیوں بہتر نہیں ہے؟" انہوں نے سوال کیا۔ وہ ہانپنے لگی۔ پھر اصرار یہ تھا تو اس نے اپنی ہی اکلوتی شادی کی بات بتا کر یقیناً چونکانے اور باز رکھنے کی کوشش۔ اس کا خیال تھا وہ وہاں ہیں اس لئے نحوست وہم کی وجہ سے وہ اس سے کیا جانے والا یہ اصرار چھوڑ دیں گی۔ وہ یہاں بے صرف نہیں گھوم رہی تھی۔ بلکہ وہ یہاں کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ آج اس کی کسی کے ساتھ پکچر دیکھنے کی ڈیل طے پائی تھی۔ تین گھنٹے کے پچاس ہزار ریٹ ہوا اس جیسی لڑکی کے لئے بہت کم تھے۔ لیکن وہ آج کل اپنے ہر مسئلے کو کیش کرنا چاہ رہی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا وہ بہت جلد اور تیزی سے واپسی کی سیڑھیوں کا سفر طے کرنے والی ہے اور واپسی کا سفر بہت تھکا دینے والا، ہانپ جانے والا سفر تھا۔ وہ کل کے لئے کچھ جوڑ لینا چاہتی تھی مگر یہ خاتون......

"تم......مجھے نہیں معلوم تھا تم جاہل عورتوں کی باتوں کو اتنی اہمیت دیتی ہو۔ مجھے اس پہ یقین نہیں۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ نے بھی سختی سے منع فرمایا ہے کہ اچھے اور برے شگون لینا مسلمان کے لئے جائز نہیں۔ اور میرا ماننا ہے جو اچھا یا برا بھی ہوتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔"

جانانہ نے کندھے ڈال دیے۔ پھر وقت بدلنے کا اس نے مقاومت پہ غور کرنا چھوڑ دیا تھا اب وہ مارے بندھے ان کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ شیرازی کے بعد سے اسے شادی اور اس کے تذکرے سے بھی بیر سا ہو جاتا تھا مگر ماہ بیگم یہاں پہ ہر فیصلہ اس کی پسند و ناپسند سے لے رہی تھیں۔ یہاں تک کہ جب وہ شاپنگ کے بعد آئس کریم پارلر میں داخل ہوئیں تو بہت مسکرا کر بولی تھیں۔

"بہت حیرت انگیز جانانہ بیٹا! تمہاری اور میری پسند میں کافی حد تک مماثلت ہے۔ تم نے اسی چیز پہ ہاتھ رکھا جو مجھے بھی پسند تھی۔" وہ جبراً کہیں پھر مسکرا کر بولیں۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا بیٹا! میں

اور دوست ملنے کے بجائے آپ سے اکثر اور بہت قریب ہو کر مل سکوں؟ میں تمہیں اپنے گھر بلانا چاہتی ہوں۔"

جاناں نے بے زاری سے انہیں دیکھا۔ وہ اسے بیوقوف ہی کیا سمجھ رہی تھیں۔ ان جیسے شریف گھرانے کے لوگ اس جیسی کسی لڑکی کا سایہ بھی اپنے گھر پڑنے دینا گناہ سمجھتے تھے اور وہ اسے اپنی بیٹیوں سے ملوانا چاہتی تھیں۔ وہ شکوک بھی میں تھیں اور اسے بھلا بھی دور کرو یا ضرور دیتی کیونکہ شیرازی سے محبت میں فریب کھانے کے بعد اس نے دکھ فریب پہچانی، یہ سب مردوں کی آنکھوں میں تاڑنے کا ہنر سیکھ لیا تھا۔ روشی جیسی آنکھوں والا تحمل کر بیٹھنے لگتی پھر وہ ہنسی کسی پاگل پن کر جاتی کہ جھولے کسی کی خبر نہیں ہوتی۔

"آپ اتنا چپ کیوں ہو رہا؟ میں نے آپ سے ایک اجازت مانگی ہے۔"

جاناں نے ان کی طرف دیکھا۔ پھر کھلکھلا کے بولی۔ "مسز نسیم اختر! شاید آپ میرے بارے میں اتنا نہیں جانتیں، جتنا رشتے قائم کرنے کے لئے جاننا ضروری ہے۔ سو مجھے کہنے دیجئے، کسی بھی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے آپ کو پتہ ہونا چاہئے، میں کسی عام شریف گھرانے سے تعلق نہیں رکھتی۔ شرفاء بھی مجھ سے صرف رات کی تنہائی میں ملنا پسند کرتے ہیں۔ آپ اب سمجھ گئی ہوں گی۔ میں آپ کے گھر آنے کے قابل نہیں ہوں۔"

نجم ہاجرہ سکتے کی کیفیت میں منہ تکنے لگیں۔ ان کا خیال تھا، وہ کسی بہت ویل آف گھر کی لڑکی ہو گی مگر جاناں کے ان کے چہرے کے تاثرات دیکھے۔ انہیں کرب کپ ہاتھ سے رکھ کر اٹھ گئی۔ پھر وہ قدم اٹھانے والی تھی، جب نجم ہاجرہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"تم مجھے غلط مت سمجھو جاناں! میں تنگ سوچ رکھنے والی عورت نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے، وہ زندگی کوئی بھی خوشی سے نہیں اپناتا۔"

"لیکن میں نے اپنایا ہے۔ میں یہ زندگی خوشی سے اپنائے ہوئے ہوں۔ اگر میں برسوں کی روشنی میں ویل آف سوسائٹی کے لوگوں کی آنکھوں میں مجھے اپنے قریب رکھے گی جو نفرت دکھائی دیتی ہے لگتا ہے، مجھے اسی نفرت سے عشق ہے۔ آپ کیا کہتی ہیں؟"

نجم ہاجرہ نے مسکرا کر کہا تھا۔ "میں تب بھی یہی کہوں گی۔ دل کے معاملے ہیں۔ اور دل بہت کم دماغ کی مانتا ہے، جاناں! مجھے تمہارے ساتھ بیٹھنا اور باتیں کرنے میں جو خوشی ملی ہے، تسکین ملی ہے، وہ شاید زندگی کے کسی لمحے نے نہیں دی ہو۔"

جاناں تعجب لگا کر ہنسنے لگی پھر تھم کر بولی۔ "میم! آپ تو شاعری کرنے لگی ہیں۔"

نیلم بانیہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ اُسے اپنے گھر کا پتہ دے کر اور آنے کا اصرار کر کے وہ اُٹھ گئی تھیں۔

اُن کے جانے کے بعد جاناں نے اُن کی پشت کو دیکھا تھا۔ یکدم اُسے لگا تھا اندر سے کوئی شیرازی سے ملنے والی جاناں نے اس محبت سے ادھار لے کر سانس بھری تھی۔

"مجھے کیا ہو رہا ہے؟...... مجھے عام عورتوں کی طرح کبھی نہیں سوچنا۔ مجھے محبت سے نفرت ہے۔ تعجب میری نظر میں پیسے سے خریدی جانے والی چیز ہے اور کچھ نہیں۔"

اُس نے دل میں یہ جملہ بار بار دہرایا مگر اندر سے ایک عجیب طرح کی بغاوت اُٹھی اور لڑنے پہ تُلی آ رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں آج کل طلعت جہاں بھی اس پر توجہ نہیں دے رہی تھیں ورنہ جب وہ دنیا سے فیڈ اپ ہو کر ان کی گود میں سر رکھتی تو ساری تھکن، سارا احساس بے چارگی اپنی سلوٹیں لیے مر جاتا مگر طلعت جہاں کی سرد مزاجی کچھ زیادہ ہی بڑھتی جا رہی تھی۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔ اُس نے دل میں سوچا اور اُٹھ گئی۔ مگر اس وقت اس کی گاڑی کا رخ گھر کی طرف تھا، نہ ہی اس نے اپارٹمنٹ کی طرف۔ جاناں نے اسے مسیج کر کے گاڑی ریورس کروایا تھا۔ وہ اس وقت پروگرام کینسل کر کے چیک کر کے ہاسپٹل جا رہی تھی۔

آج کل اس کا وقت زلیخا بی بی کے پاس گزر رہا تھا۔

زلیخا بی بی کسی زمانے میں بہت اچھا گایا کرتی تھیں۔ پھر نئے لوگوں کے آنے سے زلیخا بی بی کا راج یا سہارا چھن گیا تو پھر وہ صرف رسوئی گھر تک محدود ہو گئی تھیں اور اتنے عرصے بعد شکوؤں اور تنہائی کا دھواں بھرتے بھرتے اس مقام پر آ کھڑی ہوئی تھیں کہ ڈاکٹروں نے اُسے ٹی بی ڈکلیئر کر دی تھی۔

جاناں کو زیادہ وقت زلیخا بی بی کے ساتھ گزر رہا تھا۔ اس لیے اس کو اس اتنی خطرناک بیماری کے باوجود قدم ہونے پہ تیار نہیں تھا۔ اُس نے گاڑی پارک کی تھی پھر زلیخا بی بی کے پرائیویٹ روم میں داخل ہوئی تھی۔ غفورا کمرے میں نہیں تھا۔ وہ خود اس موذی بیماری سے بچنا چاہتا تھا اس لیے زیادہ تر کمرے سے باہر رہتا تھا۔ زلیخا بی بی ڈاکٹر اور نرس کے رحم و کرم پر رہتی تھیں۔ غفورا کمرے میں صرف اس وقت ہوتا تھا جب جاناں اُن سے ملنے آتی تھی۔ لیکن اس وقت حیرت انگیز طور پر وہ اُسے دیکھ کر بھی نہیں آیا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے زلیخا؟" وہ کرسی پہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

زلیخا بی بی نے اُسے دیکھا، پھر ہنس کے بولی۔ "آج تو کھل کے باتیں کریں گے۔ غفورے کو کسی نے فون کر کے گھر بلایا ہے۔ کوئی خاص بات ہوگی شاید۔"

جانانے تحیر سے اسے دیکھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا رانی بی! میرے دل میں کیا چل رہا ہے؟"

رانی بی نے لمبا ٹھنڈا سانس کھینچا، پھر مسکرا کر بولی۔ "عمر گزری ہے اس دشت کی سیاحی میں۔ آنکھوں کے کہے ان بولے دل کے خبر، باتوں کی زبان، سب جانتی ہوں، سب جانتی تھی، پر اب تو لگتا ہے بالکل کوری ہوگئی ہوں، کور چشمی ہے ہاں، بلکہ بالکل ختم۔"

جانانے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا، پھر ہمدردی و ترحم سے بولی۔ "تم دل چھوٹا مت کیا کرو رانی اماں، تم اب بھی کسی کمتر سے نہیں ہو۔ بہت عزت ہے تمہاری میرے دل میں۔ بس کچھ مصروفیت ہوتی ہے، کہ میں روز تم سے ملنے آؤں۔"

رانی بی نے اسے دیکھا اور مشفقانہ لہجے میں بولی۔ "مجھ سے ملنے میں کیا رکھا ہے؟ وقت ملے تو آپ جیسے کسی دن مل لے، زندگی سنور جائے گی تیری۔" لمبا سانس لیا پھر دوبارہ بولی۔ "اس جگہ میں نہیں، وہ سے جانے، تیری دنیا، ہے تو اپنی دنیا خوشنما۔ کیوں ہم رزلیوں میں پڑی ہوئی ہے۔"

جانانے دیکھی، پھر اداسی سے بولی۔ "میں نہیں جانتی، وہ کیسی عورت تھی اور کیسی نہیں۔ بچپنے میں جیسے میری ماں کی زندگی، اور اس کے بعد میری ماں وہی ہے جس نے مجھے پالا، اس نے کبھی مجھے میری ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ کیا کوئی اور کرتا ہے کسی اور کے بچے کی چاکری جیسی اماں نے کی؟"

رانی بی نے اسے دیکھا پھر کہا۔ "تو اگر کوئی ہوتی تو میں دیکھتی کون کتنا تیری چاکری کرتی؟ ہماری دنیا میں صرف چاکری کی جاتی ہے۔ کیونکہ یہی ہمارا معاش ہوتی ہے۔ جس پر ہم چند ٹکے تنخواہ کماتے بھی ہیں۔ محبت نہیں ہے، لالچ ہے۔ جانے، کبھی تو نے نہیں سوچا محبت اور لالچ کا رنگ الگ کر کے دیکھے۔"

جانانے رانی بی کو دیکھا، پھر خفگی سے بولی۔

"مت کہا کرو رانی اماں ایسی کوئی باتیں، جن پر میں سوچنے لگ جاؤں۔ مجھے جینے دو وہ زندگی جو میں جینا چاہتی ہوں۔"

ماں رانی نے اسے دیکھا پھر کہا۔ "کبھی تیرا دل نہیں چاہا تو شہزادی سے ایک بار ملے؟ کبھی تیرا دل نہیں چاہا تو جانے کہ تیرا والا بچہ جیا کہ نہیں؟"

جانانہ کسی گہری پاتال میں اتر گئی۔ محبت تلخی کی طرح کا جال مسلسل عمل ہے اور کسی نہ محبت کے پاتال میں اتر ڈوبتی ہوں یہ محبت اس کی تخمی سے نکلی، کبھی اندر کی گہرائی وہ خالی ہاتھ لوٹ سے

تمہاری مرتی زندگی میں موت کی سختی ابھر آئی۔ یا شاید یہ سچ نہیں تھا۔ شیرازی اُسے چھوڑ کے جا چکا تھا اور اُس کی محبت کا احساس دنیا میں آنے کے کچھ گھنٹوں بعد ہی واپس محبت کے گرد لوٹ گیا تھا۔ وہ تو اپنی اولاد کو منہ تک نہیں دے سکی تھی کہ کہیں دل چاہتا تھا اسے کسی احتجاج سے پکار کر یاد کر لیتی۔ اس کی مدد مانگتی۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکی تھی۔ اور آج اتنے سال بعد وہ اسی دکھ میں سمٹ آئی تھی۔ رمشی مانی نے اچھا نہیں کیا تھا۔

اس نے شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھا تھا اور رمشی مانی نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔ "تجھے پتہ نہیں۔ یہ خبر خوشی دے گی یا دکھ لیکن میں آج تجھے بتا رہی ہوں۔ نشا نے مجھے جو بچہ گود میں دیا تھا وہ بچہ مرا ہوا نہیں تھا۔ وہ بچہ زندہ تھا۔ وہ تیرے شیرازی کا بیٹا تھا۔ پر نشا نہیں چاہتی تھی کہ تیرے اندر کی ماں جاگ جائے۔ تجھے نہیں پتہ، لیکن ہمارے طرز کی دنیاؤں میں ہم جیسیں یا تو اللہ سائیں سے لو لگا کر ہاتھ کام سے جاتی ہیں یا ماں بننے کے بعد ماں بن کر سوچنے سے۔ اور نشا نہیں چاہتی تھی تو اس دنیا اس راج پاٹ کو ایک بچے کے لیے چھوڑ دے۔ وہ بچہ جس کے باپ کی محبت نے اس کے سامنے سر اٹھایا تھا۔ ہماری گلیوں کے لوگ کے شادی بیاہ کے بندھن کے لیے نہیں ہوتے۔ وہ صرف تماش بینوں کے لیے ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں کیسے شیرازی میں عزت کی زندگی جینے کی دھن پڑ گئی؟ پتہ نہیں کیسے وہ تیرا دیوانہ ہو گیا، تجھ پر مرمٹا؟"

"بس کر رمشی! تم نہیں جانتیں تم میرے کتنے زخموں کو پھر سے ادھیڑ رہی ہو۔ اب مجھے کیا ملنا شیرازی کے بیٹے کا؟ مجھے تو یاد ہے، وہ مجھ سے بچھڑ گیا ہے وہ انسان....."

لفظ سسکی کی طرح اس کے ہونٹوں سے نکلے تھے۔ اس نے فوراً ہی اپنے تاثرات پر کنٹرول کر لیا تھا اور اسی بے پروائی سے بولی تھی جیسے جذباتی کمزوری لمحوں سے نکل کر کبھی کچھ سے وجود کرے۔ اس نے رمشی کو دیکھا تھا، پھر نفرت سے بولی تھی۔ "رمشی! اب مجھے اس سے واقعی کوئی فرق نہیں پڑنے والا کہ شیرازی کے ساتھ میں نے جینے کے کیا خواب دیکھے تھے۔ میری زندگی کی ایک سمت متعین ہے اور مجھے اسی ڈگر پر چلنا ہے۔ مجھے یہ راستہ زندگی کا جائے یا کسی تاریک گلی کی گمنامی میں۔ موت بن کر میرا استقبال کرے، مجھے ایسے ہی جینا ہے۔ مجھے اب اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑنے والا کہ شیرازی کی اولاد زندہ بھی مری نہیں۔ سچ پوچھو تو اس کی بے وفائی کے غم سے میں جھلستی تو اس زندہ بچے کو میں خود اپنے ہاتھوں سے مار دیتی۔ مجھے کسی چیز سے اب فرق نہیں پڑنے والا۔" لمحہ بھر کو وہ رکی، ابھرا بیگ سے نوٹ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ کر بولی۔ "اپنا خیال رکھنا۔ مجھے واقعی تمہاری محبت کی قدر رہے گی۔ ورنہ کون کرتا ہے آج کے زمانے میں بے مطلب کی محبت۔ تم واقعی عظیم عورت ہو۔ بہت زیادہ۔"

اس کا ہاتھ تھپتھپا کر وہ اٹھ گئی تھی۔ مگر ہر قدم پر ایک سوال خود بخود ابھر رہا تھا۔ کیا واقعی وہ شیرازی کی بے وفائی کے غم میں شیرازی کے بچے کا گلا گھونٹ دیتی؟ اگر ایسا ہوتا تو اس نے اس بچے کو دنیا میں لانے

کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟ کیا اُس کے اندر ماں زندہ تھی جسے وحشی سطوت جہاں نے مار دیا تھا؟ کیا واقعی اُس کے اندر ماں اور ممتا بھری عورت مرگئی تھی؟...... نجیبہ؟ اگر ایسا ہوتا تو روز رات کو اس کا قلب کیوں بے قرار رہتا تھا؟ وہ بچہ کے لیے ظالم تھی یا صرف دکھاوے کی کوشش کر رہی تھی؟

بہت سارے سالوں نے اُس کے گرد گھیرا ڈال دیا تھا۔ پھر یہ گھیرا تنگ سے تنگ ہوتا چلا گیا اور اُس نے گھبرا کر اپنے کمرے میں لمبے گہرے سانس لیے جیسے آکسیجن یکدم ہوا سے کسی نے غائب کی ہو۔

میرا بچہ...... وہ زندہ ہے؟...... وہ سانس لیتا ہوا بولتا ہوا بچہ تھا اور ماں نے کہا وہ مر رہا ہے...... میرا دل اُن کی کشتی ڈبو رہا تھا۔ عمر ساری؟ اب...... اب وہ کتنا بڑا ہو گیا ہوگا۔ ماں سے چھپ کر کس کے پاس ہوگا۔ نجیبہ یا شیرازی؟ شیرازی کہتا تھا میرا امن کرنا ہے، میری جیسی ادا ہو، وہ جانے تمہارے دل کی طرح خوبصورت ہو، کتنے روپ میں کھو گیا، کیوں زندہ ہو!

"شیرازی......؟" اُس کی پلکیں بند ہو گئی تھیں۔ وہ رو رہی تھی۔

پھر اُس نے دروازہ کھولا تھا اور سطوت جہاں کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"ماں! تم نے مجھ سے آج تک جھوٹ کیوں بولا؟"

سطوت جہاں نے حیرت سے اُس کے لہجے کی کاٹ کو ناپا پھر اسے ہنکار کر دیکھا۔

"ہاں صدف یہ کیا حال بنا لیا ہے؟ تیری آنکھیں رونے کے لیے تھوڑی ہیں جانے! ادھر آ ماں کی بانہوں میں آ۔" انہوں نے بازو پھیلا لیے مگر جانے وہ کھڑی رہی تھی۔ پھر سرد لہجے میں بولی تھی۔

"ماں! میرا بچہ زندہ تھا ماں؟"

سطوت جہاں کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا مانو ایک عالم نے خوف کھایا ہو۔ وہ چپ کھڑی رہی تھیں پھر انہوں نے کہا تھا۔

"یہ سب تمہیں کس نے کہا ہو گا جھوٹ ہے...... وہ مر چکا جانے! اوپر بیماری سے ہو گئی ہے تو اُس کی باتوں میں کیوں آ رہی ہے؟ وہ بچہ تو مرنے سے پہلے مردہ لوگ زندہ نظر آنے لگتے ہیں۔"

جانا! تمہیں خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی پھر اُس کی آنکھوں کا شک دور نہیں ہوا تھا جب سطوت جہاں نے ہنکارا بھر کے کہا تھا۔

"ہاں تیرا بچہ زندہ ہوا تھا پھر...... میں نے کیا کرنا تھا اُسے کا؟ بیٹی کی سوتن تو چیلوں کی طرح رکھتی میں۔ مجھے کچھ میرا شیرازی تھوڑی پیدا کرنا تھا اپنی جان کے لیے؟ اس نالائق کا دل جیا۔ پھر بھی مار گیا

AANCHAL.COM.PK

تجھ سے وہ بھی کیسی تیری محبت ہوئی ہے؟ اس نے پیروں میں سے پھر اپنے بارنگ سیدھا اس میں تو کیا ہوتا؟ جس کے باپ سے دنیا چھین لی اس کی اولاد سے کیا اُمید رکھی؟ میں نے تو تیرا بھلا ہی چاہا تھا۔“

بابا خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اس نے الماری کھولی تھی پھر ایک بکس اٹھا کر وہ بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ چوڑیاں، چیزیں تحفے کسی کا دل۔ وہ ایک کے بعد ایک شے نکالتی چلی گئی۔

پازیب، کتنی خوب صورت ازلی فینسی نگوں والا سیٹ......

اس نے بکس کے اندر دیکھا، ایک گلاب کا پھول بھی تھا۔

”تمہارے سامنے جانے جب میرا دل تجھ سے محبت کا طلب ہوگا اس دن گلاب کی پتیوں آپ ہی آپ مرجائے گی۔“

اس نے مرجھائے ہوئے پھول کو دیکھ کر سوچا، ایک ابھی تک بھی ہوئی تھی شاید لگتا تھا شیرازی شیرازی کی کوئی بات جب وہ بانٹا غور کیا تو پتہ اس کا اپنا دل تھا۔

تو کیا شیراز نا بھی تھا اس کے دل سے نہیں نکلا تھا؟

ستارے جو چمکتے ہیں
کسی کی چشم حیراں میں
ملاقاتیں جو ہوتی ہیں
جمال ابر و باراں میں
یہ آباد وقتوں میں
ملیں نا شاد ہوں گی
محبت اب نہیں ہو گی
یہ کچھ دن بعد ہو گی

AANCHAL.COM.PK

گزر جائیں گے جب دن

بات ان کی یاد میں ہوگی

جاناں نے کتاب کو بند کیا، کارڈ رکھا اور پھر رونے لگی۔

"مجھے نہیں رونا ہے اب محبت کے لئے تو بالکل نہیں جس کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ محبت کرنے والوں کو کبھی شکوہ ان سے نہیں ہے ان کے ہاتھوں میں سجے انگارے ہوتے ہیں۔ دل جلتا ہے۔ پتھر بھی یہ سارے انگارے دامن میں بھر لیتا ہے پتھر۔ جہاں دل جاتا ہے وہاں پتھر کون ہوتا ہے کون باقی رہے۔ یہ محبت بہت ظالم ہے۔ شہروز کی محبت بہت ظالم ہے۔

اس نے ساری چیزیں اٹھا کر رکھ دیں۔ مگر مرجھایا ہوا گلاب کا پھول اس کے نازک ہاتھوں میں تھا۔

"اس میں سے جب تک خوشبو آئے......" کوئی کہیں قریب کھڑا کہہ رہا تھا اور وہ خوشبو میں گم ہوئی جا رہی تھی۔

پتہ نہیں خوشبو اس مرجھائے ہوئے پھول میں تھی یا اس کے مرجھائے ہوئے دل میں؟ کیا رنگ جانے لے اٹھی تھی۔ مگر بچھتاوا وہ بھی سے بچھڑنا ہے آپ سے مل۔ پتہ نہیں کیا ہے آپ سے ملنا اس کے لئے تیک اختیار ہوتا یا نہیں؟ لیکن یہ طے تھا محبت اس کی کہانی کو نئے سمت موڑ کی بہت قوی تھی۔

سالار عبدالرحمن کی ابھی ابھی آنکھ کھلی تھی۔

کیا وہ زندہ ہیں......؟ پہلا احساس چونکا دینے والا تھا۔

جیسے کوئی گہرے سے جگا گیا تھا۔ انہوں نے پہلے دائیں دیکھا، پھر بائیں طرف جا کر ان کی نظر ٹھہر سی گئی تھی۔ شہریار عبدالرحمن کرسی پر بہت آرام سے سو رہا تھا۔ نیند اتنی گہری تھی اس کی کہ ان کے سامنے سائیڈ ٹیبل پر پڑا ہوا گلاس گر کر ٹوٹ گیا تھا مگر وہ پھر بھی نہیں جاگا تھا۔

انہیں اچانک بہت پیار سا آ گیا تھا۔ پھر کار کردگی کرتے ہوئے اس کے شعور سے اس تکلیف میں وہ انہیں دنیا کا سب سے اچھا انسان لگا تھا جس نے ذاتی طور پر ان کی زندگی بچانے کی مقدور بھر کوشش کی تھی۔ اب ان کی نظر سائیڈ ٹیبل پر رکھی واچ اور جنرل وارڈ کی ... پر جا کر اٹک گئی تھی۔

"تو ان کا معاملہ اس حد تک خراب ہو گیا ہے؟"

انہیں حیرت ہونے لگی تھی۔ وہ اتنی سخت خراب حالت میں بھی شہریار کے علاوہ کوئی اور قابل ذکر نہیں تھا۔ انہیں غیر ارادی طور پر دی جانے والی طبی امداد کا کچھ مثبت تھا۔ انکل صدانی کا ٹیکسلا کی اچھا نہیں تھا، انہیں کارڈیو ویسکولر جا کر کے مرے سے بیک اپ کیا جا رہا ہے۔ اسی خیال کے تحت انہوں نے اپنی زندگی کے سب سے ناپسندیدہ انسان کو ڈھونڈنے سے جگانے کی کوشش کی تھی۔ پھر شہریار کی کوشش پر انہیں جا کر کامیاب ہوئے تھے۔ شہریار نے متذبذب نیم رنگ آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اسے آشنا ہونے میں لگا تھا پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ریک پر رکھی دوائیں اٹھائی تھیں۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے انکل بھائی؟"

"ٹھیک لگ رہی ہے۔ لیکن میری طبیعت کیسی ہے یہ صرف ٹھیک ٹھیک تم ہی بتا سکتے ہو۔"

شہریار مسکرایا تھا پھر نرمی سے انہیں سہارا دیتے ہوئے بولا تھا۔ "آپ ایک دم پرفیکٹ ہیں انکل بھائی۔ ہمدانی انکل کہہ رہے تھے، وہ تکلیف صرف مسکراہٹ کی وجہ سے ہوئی تھی۔"

"پھر یہ دوا نہیں؟" مدھم سوال کیا اور انہوں نے اپنی نرمی سے کہا۔

"ایک دوست کا فون آیا تھا اس کے فادر کے لیے یہ دوا چاہیے تھی۔ اس نے ارجنٹ کہا تھا کہ آج شام تک پہنچا دے مگر کل کے لیے میں آنے جانے ذرا سا دور سے یہ دوا بھی لیتا آؤں۔"

سالار عبدالرحمٰن کی پیدائش، وہیں لگا کر وہ دیکھ رہا۔ لیکن انہوں نے کوئی عذر نہیں کیا تھا۔ آہستگی سے بیٹھتے ہوئے انہیں پائے تھے۔ چیک اپ کا ٹائم ہو گیا تھا۔ بے حس کی تھی اور شہریار کے ساتھ بیٹھ کر انہوں نے گھر کا سفر کیا تھا۔ ایک خوف سے بیمار ہوئے تھے اور کسی انجانے خوف میں لپٹ گئے تھے۔

اگر واقعی آج وہ مر جاتے؟...... دل بار بار یہی سوال کر رہا تھا۔ پھر انہوں نے ہر خوف کو جھٹک کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تھا اور یہ اندھیرا انہیں اس وقت بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ پھر جب وہ گاڑیاں چلیں تو گاڑی ایک جھٹکے سے رک چکی تھی۔

گھر آ چکا تھا۔ واچ مین نے گیٹ کھولا تھا اور فوراً اس نے بہت تیزی سے ان کی طرف کا دروازہ کھولا تھا۔ پھر سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا کہ انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"اگر مر بھی رہا ہوں گا نا تو شاید تمہارا سہارا لینا نہیں چاہوں گا۔" وہ کچھ لمحوں پہلے کی بات یکدم فراموش کر کے غصے سے بولے۔

AANCHAL.COM.PK

اس نے سر ہلا کر انہیں اپنی مرضی کرنے دی تھی۔ پھر گاڑی پارک کر کے وہ اندر آیا تو عاطفہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا تھا۔

"میں جانتی ہوں شہریار بھائی! آپ کے لئے زندگی کتنی مشکل ہو گئی ہے۔ مگر اسے ہمیشہ یاد رکھئے گا، ایک ماں آپ کے لئے ہر روز بہت ساری اور بہت لمبی دعائیں مانگا کرتی ہے۔"

شہریار نے کچھ نہیں کہا تھا اور خاموشی سے سامنے اپارٹمنٹ روم کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ پھر بستر پر تھک کے لیٹا ہی تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا تھا۔

"ہیلو شہریار اسپیکنگ۔ کون؟"

"شہری کے بچے! میں عاطف......"

"پلیز، میں اس وقت بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں، پھر کبھی فون کرنا۔" اس نے تیزی سے کہہ کر لائن ڈس کنکٹ کر دی اور تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔ پتہ نہیں پھر کب نیند آئی تھی اسے معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

❀❀❀

نجم عاقبہ سلیم افسر کے ساتھ جج صاحب کی شرکت کے بعد گھر واپس لوٹی تھیں۔ سلیم افسر وہیں سے ایک میٹنگ میں چلے گئے تھے اور وہ گھر آ گئی تھیں۔ بظاہر عطیہ بانو کا معاملہ ان کی زندگی میں ختم ہو گیا تھا لیکن ان کا دل تھا کہ ہر وقت عطیہ بانو کے لئے چیخ رہا تھا۔ جس بہن کو وہ اب تک ڈھونڈ رہی تھیں وہ اب اس دنیا میں کہیں بھی نہیں تھی اور اس کی بیٹی...... وہ...... وہ جانے کہاں ہو گی۔

نجم عاقبہ گھر میں داخل ہوئی تھیں۔ علینہ نے انہیں بہت محبت سے تھاما تھا۔ سلیم افسر کی محبت کا عکس جو تھا اس کی چاہت میں۔

"مام! آپ سے کوئی ملنے آیا ہوا ہے۔ لیکن آپ تو مجھے بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔" علینہ نے انہیں غور سے دیکھا اور عطیہ بانو کے خیال سے جو آنسو ان کی آنکھوں میں آ گئے تھے وہ اس نے صاف کئے۔

"کون آیا ہے علینہ؟"

"مام! اس کا نام جاناں ہے۔ وہ آپ کی کوئی فرینڈ ہیں۔ سنا ہے جاناں نام بتایا تھا انہوں نے۔"

"جاناں..." انہوں نے نرمی سے دہرایا۔ نسوانی آواز کا سن کر جانے کیسے گم ہو گئے تھے۔ "جاناں کو میرے روم میں بھیج دو... میں فریش ہو کر آتی ہوں۔"

علینہ سر ہلا کر رہ گئی۔ عاقبہ نجم نے اپنے قدم اپنے کمرے کی طرف بڑھائے۔ بظاہر وہ گھر کے ماحول میں لوٹ آئی تھیں لیکن دروازے پر ٹھٹک گئی۔

"آ جاؤ جانانہ!"

جانانہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ سائرہ بیگم نے اسے سینے سے لگا لیا۔ گو کہ اسے سینے میں بھینچنے میں ان کی وہ تمنا بھی شامل تھی جو عطیہ کی بیٹی کو سینے سے لگانے کی حسرت سے دو آ کھڑی ہوئی تھی۔

"خیریت بیگم! آج آپ بہت دل گرفتہ لگ رہی ہیں؟"

"نہیں تو...... بس ویسے ہی طبیعت کچھ بوجھل بوجھل سی تھی۔ بتاؤ تم کیسی ہو؟ میرا لالہ تمہیں زیادہ تنگ تو نہیں کیا؟"

جانانہ ہنسنے لگی پھر محبت سے بولی۔ "بیگم بیگم! امراؤ میں تمام بچوں جیسی بات نہیں ہے وہ یوں لگتا ہے، جیسے وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ اندر رہ جانے والی عمر میں رہ رہا ہو۔ اس کی باتیں سن کر مجھے لگتا ہے، میں کسی بھی بڑے سے بات کر رہی ہوں۔ بیگم بیگم امراؤ میں اتنی سی عمر میں جو بلند ہمت کا عنصر ہے وہ بہت متاثر کرتا ہے۔ باقی بیگم اولاد ہی آگے چلتے ہوئے اولاد ہمیشہ آپ کو تنہا چھوڑ دیتی ہے۔" اس کی آواز ڈوب گئی تھی۔

چند برس اولاد کے تذکرے سے اسے وہ کل کا بچپن یاد آتا تھا اپنی خالی زندگی سامنے آن کھڑی ہوتی تھی۔ وقت گزر گیا تھا مگر آج کل وہ ماضی کے سفر میں تھی کہ اس نے اس وقت سے کیا کیا۔

شہریار کی تکلیف بیٹے کی حسرت بھی اس صحرا کے سمندر میں وہ بھٹکتی تھی اسے کبھی کبھی خود پر حیرت ہوتی تھی۔ بیاہ...... ہی جانا ہے۔ جس کے ہزار نخرے سے وہ نا کام نہیں پیار کرتا تھا۔

طلعت جہاں آج کل اس سے بہت آزردہ خاطر رہتی تھیں۔ کچھ پریشان بھی رہنے لگی تھیں۔ مگر آج کل اسے کوئی بھی بات محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

"کیا سوچنے لگی بچے؟" بیگم جانی نے اس کا رخسار چھوا پوچھا اور اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

"پتہ نہیں بیگم! آج کل میری آنکھوں میں اتنا غم کیوں آنے لگا ہے۔ یوں لگتا ہے، جیسے کوئی میرے اندر بیٹھ کر دن رات رونے جاتا ہے وہ رونے جاتا ہے مگر اندر ہی ہے کہ کم نہیں ہوتی۔"

"شاید تم بہت تنہا ہو اور یہ جو میرے بچے اگر تمہاری عمر کی! کیوں کا وقت تو صرف خواب، کچھ دیر خواب میں نے بھی ہی صرف دیکھی ہے۔ جب میں تمہاری عمر کی تھی تو یہ فخر مجھ پر بھی اتا تھا۔ میرا دل کی جان نہیں پاتا تھا کہ میرا اپنا آپ خود سے کیا چاہتا ہے، کیا نہیں۔ جو زندگی تم گزار رہی ہو وہی زندگی کبھی میری بھی تھی۔ جس خدا کا مجھ پر کرم آیا اور میری زندگی میں سلیم اختر کو بھیج دیا۔ اور ایسا بھیجا کہ ماضی کی

ہر گناہ مجھے ایک خواب لگنے لگی۔"

جاناں نے پوری کھلی آنکھوں سے انہیں دیکھا اور حیرت سے پوچھا۔ "میم! کیا واقعی مرد اتنے اچھے بھی ہوتے ہیں کہ ہم جیسی عورتوں کو بھی عزت سے رکھ سکیں؟"

"بہت سے مرد ایسے ہوتے ہیں جاناں! جو ہم جیسی عورتوں کو بہت عزت، مان دیتے ہیں، جو وعدہ کر لیں تمام عمر نبھا جاتے ہیں۔" لمحہ بھر کو وہ رکیں پھر مدھم لہجے میں بولیں۔ "اگر تمہارے اندر ایک اچھی سوچ میں بھی تھوڑی ہمدردی ہے تو اسے کھونا مت۔ کسی ایک کا دامن تھام لو زندگی سہل ہو جائے گی۔"

"میم! یہ بات کہنے میں بہت آسان لگتی ہے، لیکن عمل کرنے میں بہت مشکل لگتی ہے۔ ہم جیسی بدنام عورتوں کی بدنامی سے کون نام جوڑنا چاہے گا؟ اور اگر ایسا کوئی میرے لیے ہو بھی تو میم! محبت میں ایک بار دھوکا کھانے کے بعد مجھ میں دوسرا جھٹکا کھانے کی ہمت نہیں ہے۔"

"کون تھا وہ بدنصیب، جس نے تمہیں دھوکا دیا؟" بیگم نافع بیڈ پہ تکیہ پشت کے پیچھے رکھ کر ٹیک لگاتے ہوئے بولیں۔ یوں لگ رہا تھا، وہ جیسے اپنے اندر کا غبار ان باتوں سے ریلیز کرنا چاہتی ہوں۔

جاناں نے ایک لمحے کو سوچا پھر شیرازی کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ وہ کیسے ملے، کتنی ٹوٹ کر محبت کرتے تھے، اور پھر کتنا اچانک وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔ پھر جب وہ بچے بیچنے کے ذکر تک پہنچی، بیگم نافع کو لگا جیسے وہ ان کے دل کے زخم کے بہت قریب آ گئی ہو۔ ان کی آنکھیں اس کے دکھ سے کم اپنے دکھ سے زیادہ چھلک گئی تھیں۔

"پتہ نہیں میم! میرا بچہ کیسا ہوگا؟...... دیکھنے میں کیسا لگتا ہوگا؟...... پتہ نہیں زندہ بھی ہوگا یا نہیں؟"

"ہاں، پتہ نہیں زندہ بھی ہوگی یا نہیں؟" وہ بڑبڑائیں۔ جاناں نے آنسو پونچھ کر دیکھا تب انہوں نے جیسے بتانے کو فریم کردہ مختلف تقریبات میں کھینچی جانے والی تصاویر دکھانے کی آفر کی۔ پتہ نہیں وہ اس کا غم بانٹنا چاہتی تھیں یا اپنے دکھ سے نظریں چرانے کی سعی کی تھی۔ جاناں تصویروں میں کھو گئی تھی۔ اس کی زیادہ توجہ مردانہ تصویروں پہ تھی۔ پھر اچانک ایک تصویر پہ اس کی نظر جا کر ٹھہر گئی۔

"میم! یہ شخص آپ کی فیملی گیدرنگ میں......"

بیگم نافع نے تصویر دیکھی پھر ہولے سے بولیں۔

"میرا کوئی خاص تعلق نہیں ہے ان سے۔ بس پروفیشنل نوعیت کے تعلقات سمجھو۔ میں ان کی کمپنی میں ڈائریکٹر ایڈمن چیف ہوں۔"

جانان نے حوصلے سے ان کی طرف دیکھا پھر قدرے توقف سے بولی۔
”میم! وہ آدمی بہت برے انسان کا بیٹا ہے اور خود اس سے بھی کہیں زیادہ برا۔ ہو سکے تو آپ اس سے دور ہی رہیے گا۔“
بیگم جانیہ کو کچھ گھنٹے قبل ہونے والی ملاقات یاد آ گئی۔ ان کا حلق بھی کڑوا ہونے لگا تھا کیا پاگل جانان کی پھر پراسرار آواز سنائی دی۔ وہ اب بہت پرانے وقت کی تصویروں میں الجھی ہوئی تھی۔
”میم! ...... کیسے ...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ کے پاس ان کی تصویر......“
جانیہ بیگم نے اس کی طرف دیکھا پھر حوصلے سے بولیں۔ ”تم مجھے بتاتی ہو اپنے بارے میں؟“
”میم! یہ میری ماں ہیں۔ اور میری منہ بولی ماں کی بہن ہیں۔ میری ماں نے محبت میں ہار کے بعد خودکشی کر لی تھی، اس لئے مجھے میری ماں کی بہن نے ہی پالا پوسا تھا اور میں انہیں ماں ہی کہتی ہوں اور اپنی ماں کو شروع سے ہی برے بچوں کی طرح خالہ کہا کرتی تھی۔ وہ مسٹر عبدالرحمن سے بہت پیار کرتی تھیں۔ بہت ٹوٹ کر محبت کرنے والی روح تھیں۔ مگر عبدالرحمن نے انہیں ٹھکرا دیا۔ وہ کہتے تھے، ہم ڈی کیمپوں میں رہنے والی لڑکیاں گھر میں نہیں بسائی جا سکتیں۔ انہوں نے کہا کہ تم بھول جاؤ کہ کبھی تم مجھے یاد کرو گی۔ دو منہ [illegible] کیوں سے محبت کرنے کا تو کیا؟ [illegible] رکھنے کا بھی روادار نہیں ہوں اور بس میم! یہ بات ان کی ساری [illegible]۔ وہ اندر ہی اندر گھل گئیں۔ پھر ایک دن اس اذیت سے نجات کے لئے انہوں نے خودکشی کر لی۔ تب سے مجھے مسٹر عبدالرحمن سے بھی نفرت ہو گئی ہے میم! میرا دل کرتا ہے میں ان کی زندگی میں اندھیرے ہی اندھیرے بکھیر دوں، جتنا وہ چاہیں زندگی میں سکھ [illegible]، مر جائیں تو موت بھی انہیں چھو کر گزر جائے [illegible] ترسے انہیں۔“
بیگم جانیہ کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ ”تمہاری منہ بولی ماں کا نام کیا ہے جانان؟“
”طلعت جہاں، میم!“
جانیہ بیگم کو لگا ان کا دل ابھی کے ابھی بند ہو جائے گا۔
طلعت جہاں...... بڑی ان کی بہن نہیں تھیں [illegible] وہ اس کے سارے وجود میں بسنے والا صرف [illegible] تھیں۔ وہ ان کی بہت اچھی دوست کی بیٹی تھی [illegible] ان کے لئے۔ بات یہ تھی کہ مسٹر عبدالرحمن نے اسے کوئی دھوکا دیا تھا۔ وہ جانیہ کے حوالے سے مسٹر عبدالرحمن کو بہت اچھے سے جانتی تھیں مگر کچھ دن پہلے کی ملاقات کے بعد سے انہوں نے مسٹر عبدالرحمن کی جگہ اور مقام

اپنی نظر میں بدل دیا تھا اور اس کی اسٹوری سے وہ ادارہ بھی نیچے بیان رکھے تھے۔

"عبدالرحمن انکل آپ کو کیا بتاتی تھی اور آپ کیا نکلے؟" شہوار نے دل میں سارے دکھوں کا بار ایک ساتھ محسوس کیا۔ جانانہ نے ان کی گم صم کیفیت دیکھی تو اٹھنے کے لیے اپنے وجود کو لاگو کرتے اٹھتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

"میری ماں آپ کی کیا لگتی تھیں بیگم؟"

"وہ میری بہت اچھی دوست تھی جانانہ! میں آج جو زندگی جی رہی ہوں وہ ان کی محبت، کاوش اور مدد کی وجہ سے ممکن ہے۔ میں اس کی بہت قرض دار ہوں۔ اور تم اس کی بیٹی ہو تو میرے لیے میری نرمے، عنیزہ اور رائمہ جیسی ہو۔ آئندہ رہا جانا تو مجھے غم سے مل کر بہت اچھا لگے گا۔" وہ اسے گلے لگا کر رخصت کرنے باہر تک آئیں۔

پھر یہ تیسرے دن کی بات تھی، جب ان کے گھر کا گم ہوا جانا کہ شہریار نے آ کر انہیں ایک بار پھر بیگم شیخ کے سامنے لاکھڑا کیا جس تکلیف کو وہ بھلانا چاہتی تھیں۔

"آپ اور یہاں مسٹر شہریار؟" بیگم جانیہ نے کہا، چھوڑ دیا تھا اور بے مروتی لہجے میں مخاطب ہوئی تھیں۔

شہریار نے ان کے لہجے کا برا منائے بغیر اپنے قدموں کو ان کی سمت بڑھنے سے رکنے نہیں دیا تھا۔ وہ دیکھتے دیکھتے پل ہی پل میں ان کے قریب آگیا تھا۔

"آپ ناراض ہیں مجھ سے؟"

"ناراض...... نہیں تو...... کیونکہ ناراض تو اپنوں سے ہوا جاتا ہے اور آپ میری اپنوں کی کسی کیٹیگری میں نہیں آتے۔ ہمارے درمیان اختلافات کی کڑی سے جاری رہا لیکن وہی بہتر ہے۔ کیونکہ میں عبدالرحمن شیخ سے اس سے زیادہ گہرے تعلقات استوار رکھنا نہیں چاہتی۔"

"کوئی نئی بات؟" وہ کچھ پوچھ گیا۔ رائمہ نے دونوں کی گفتگو کے بعد سے ساتھ آہستگی سے اٹھ گئی اور شہریار نے پھر سے انہیں غور سے دیکھا۔

"بتائیں نا بیگم! آپ کے مرحومہ تحفظات کیا ہیں پاپا سے تعلقات میں؟"

"کچھ نہیں۔ میں مسٹر عبدالرحمن کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ کیونکہ میں انہیں جو سمجھتی تھی وہ اس مقام کے اہل نہیں تھے۔" "مجھے مجبور کر رہی ہیں بیگم!" "جو کچھ عبدالرحمن نے میری بیٹی عطیہ کے

ساتھ کیا اور رجو کے ساتھ کیا، میں اسے نہیں بھول سکتی۔"

"رجو..... کون رجو؟" اس نے اکتا کر سوال داغ دیا۔

پھر نجم حافیہ اسے کہانی سنانے لگیں۔ جائیداد کے تذکرے پر اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی اور جو اسٹوری وہ سنا رہی تھیں وہ پاپا سے اچھے طریقے سے سن سکتا تھا۔ اس لیے جائیداد اور نجم حافیہ دونوں کے غائب کیے جانے پر افسوس ضرور ہوا تھا مگر اس نے اس وقت انہیں غلط ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا اور کسی ثبوت کے بغیر شوکت کو غلط ثابت کرنا قدرے دشوار ہی نہیں ناممکن تھا۔ سو وہ ان کی جو بات کہنے لگا تھا اس نے بات کا رخ ہی بدل دیا تھا۔ بہت اپنائیت سے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے بڑے ٹھہرے لہجے سے بولا تھا۔

"آپ دل سے کہیے، کیا واقعی آپ مجھے صرف اپنے پاس کا بھتیجا سمجھتی ہیں؟"

نجم حافیہ کچھ نہیں کہا۔ وہ اس کے چہرے سے کون سا رنگ ابھرا تھا کہ وہ منہ چھپا کر رونے لگی تھیں۔

"پلیز ممی، ایسا نہ کیجیے، مجھے خواتین کو روتا دیکھنا برداشت نہیں ہوتا۔ آخر آپ اتنی چھوٹی سی بات پر دل کیوں چھوٹا کر رہی ہیں؟ میں تو آپ کو بہت بہادر سمجھتا تھا۔"

نجم حافیہ کچھ نہیں بولی تھیں۔ شہریار نے پلکا یا ہاتھ ان کے کندھے پر رکھا تھا اور تبھی نجم حافیہ نے نظر اٹھا کر پلٹ سے اس پر ڈالی تھیں۔

"عبدالرحمن نے رجو کے ساتھ جو کیا وہ برا ہے، مگر صرف دکھ ہی کا نہیں بلکہ انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ صرف دکھ کا ایسا ہونا تھا ہی نہیں۔ اس کا کیا قصور تھا؟ شہریار! انسانیت بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں؟"

شہریار ان کے قریب بیٹھ گیا اور بڑی آہستگی سے بولا۔

"آپ نے اس وقت بھی پاپا کی بات پوری نہیں سنی تھی اور اس وقت بھی آپ ادھوری بات پر پاپا کو موردِ الزام ٹھہرا رہی ہیں۔"

"ادھوری بات؟..... تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"صرف اتنا کہ ممی اگر پاپا کا ہاتھ ہوتا [illegible]۔ ممی عطیہ کے بھائی نے جنم دیا تھا [illegible] بعد مر گئی تھی۔ پاپا نے بچی اور ممی عطیہ دونوں کو [illegible] تھا۔ پھر آپ ہی بتائیے، پاپا کیسے موردِ الزام ٹھہرائے جانے کے قابل ہیں؟"

بیگم عافیہ نے غور سے دیکھا، پھر گویا ہوئیں۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ عطیہ کی بچی مر نہیں سکتی۔ میرا دل کہتا ہے وہ زندہ ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے، میں خود آپ کی تسلی کے لئے آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ پاپا سے میں نے معلومات لے لی ہیں، چلئے۔" اس نے آنسو صاف کئے۔ بیگم عافیہ نے ایک نظر اسے دیکھا، اس کے خلوص کو جانچا اور فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر رات کے تقریباً ساڑھے آٹھ بجے تک وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ رجسٹر میں بچی کا اندراج تھا، مگر اسے مردہ شو کیا گیا تھا۔ کاغذات چیک کروانے میں جو وقت صرف ہوا تھا، وہ دیر جانا تھا۔ پاپا نے کاغذات میں اپنے پاپا کی محبتوں کو ریکارڈ رہنے کے لئے جس طرح اس نے تبدیلی کروائی تھی، نئی صورت حال میں اسے دانتوں تلے پسینہ آگیا تھا۔ یہ حقیقت پہلے سامنے آئی تو کاغذات میں وہ بیگم عافیہ کے ہاں بیٹے کی جگہ بیٹی کو شو کروایا ہوا، جس کا اندراج زندوں میں ہی رہنے دیتا تا کہ نئی صورت حال میں بات اچھی طرح سمجھ جاتی، مگر اب اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کس طرح اس معاملے کو ہینڈل کرے۔ پرانی مڈوائف کا معاملہ بھی سامنے آگیا تھا، مگر اس کی ڈیتھ کی وجہ سے بھی معاملہ التوا میں ہو گیا تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھی، ناکام ہونے پر روئے جا رہی تھیں۔ ان کی جستجو ناکام ہوگئی تھی اور شہریار سوچ رہا تھا کہ وہ بیگم عافیہ پر عطیہ یا زرکی بیٹی کا معاملہ کیسے کھولے۔

بیگم عافیہ روئے جا رہی تھیں، جب شہریار نے سارے تکلفات بالائے طاق رکھتے ہوئے انہیں اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ "پلیز میم! اپنے آپ کو سنبھالئے۔ جو فیصلے خدا کے ہوں، ان پر صبر کرنا ہی پڑتا ہے ناں۔"

"مگر میرے دل کو یقین نہیں آتا کہ میری عطیہ کی بچی مر چکی ہے..... میرا دل کہتا ہے وہ زندہ ہے۔"

"مگر میم! قرائن تو یہی کہتے ہیں۔"

"ہاں، ہاں شاید مجھے اس بات پر، قسمت کے اس فیصلے پر صبر ہی کرنا پڑے گا۔ کیا ہوتا اگر میری عطیہ کی بچی زندہ ہوتی۔"

وہ روئے جا رہی تھیں، جب اچانک عافیہ بیگم کے موبائل پر گھر سے فون آیا۔ موبائل بجنے کے ساتھ ہی اسکرین سیور کے طور پر جو تصویر سیٹ کی گئی تھی، شہریار کو بیگم عافیہ کی محبتوں پر بے ساختہ پیار آگیا تھا۔ جس معاملے کو حل کرنے کے لئے وہ کتنے دنوں سے اتفاقی، اچانک خاکے بنا رہا تھا، وہ معاملہ بہت آسانی سے حل ہو گیا تھا۔

"میم! یہ تصویر کس کی ہے؟" اس نے آنسو پونچھنے کے لئے ٹشو دیتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ..... یہی تو عطیہ ہے، میری بیٹی۔"

AANCHAL.COM.PK

"لیکن میم! یہ شکل...... یہ شکل تو میں نے ابھی حال ہی میں کہیں دیکھی ہے۔" اس نے پریشان سا سوچنے کا پیرایہ جانے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ "ارے ہاں یاد آیا میم! یہ لڑکی تو میرے بھتیجے میں حال ہی میں ملازم ہوئی ہے یا ایک دفعہ صحت کی خرابی کی وجہ سے اس کا چیک اپ کرنے پر میں نے اسے دیکھا تھا۔ مگر کاغذات...... کاغذات میں تو میم عطیہ کی بیٹی گم شدہ ہوگئی ہے یا پاپا بھی آج تک یہی سمجھتے رہے ہیں۔"

"ہاں...... مگر کیا پتہ اس بد ذات نے کوئی گڑبڑ کی ہو۔ یہ سپتالوں میں تو بیسیوں کے چکر میں اس سے بھی پہلے بچوں کو والدین سے جدا کیا گیا ہے۔ کیا پتہ میری عطیہ کی بیٹی کے ساتھ بھی یہی مانند رہا ہو۔ کاش وہ لڑکی واقعی میری عطیہ کی بیٹی ہو تا کہ میں اسے سینے سے لگا کر اپنی عطیہ کی محبت سے جذب کر سکوں، پیار دے سکوں، وہ سارا پیار جو عطیہ کا مجھ پر قرض ہے۔"

"اللہ کرے میم! یہی سچ ہو۔ واقعی مجھے خوشی ہوگی، میم عطیہ کی بیٹی اگر مل جائے تو پاپا بھی خوشی سے جھوم اٹھیں گے۔ چلیں میم! چلتے ہیں اس کے ہاسٹل۔"

شہریار نے کاروبار اور اسٹیٹس کی اور گاڑیوں کے سیل رواں میں بیٹھا لگا۔ وہ ٹیکسی کے ذریعے گرلز ہاسٹل گیا۔ مگر پتہ چلا چھٹی کے دن اکثر وہ صبح سے شام تک کہیں چلی جاتی ہے، کہاں جاتی ہے، پتہ نہیں۔

"کیا اس کا اکثر یہ معمول ہے۔"

شہریار کو باقی باتوں کے برخلاف اس دفعہ واقعی حیرانی ہوئی تھی اور اس نے اس کی روم میٹ سے سوال کیا۔

"ایک مہینے سے تو لازمی طور پر یہی روٹین رکھے ہوئے ہے۔ اس سے کوئی پوچھتی بھی ہوں تو گھبرا جاتی ہے، کچھ بتاتی نہیں ہے۔"

شہریار ویٹنگ روم میں انتظار کرنے لگا تھا۔ پھر اس کی روم میٹ نے آدھے گھنٹے بعد آ کر اس کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ جیسے مانیہ کے ساتھ اس کے کمرے کی طرف بڑھا اور وہ اس وقت پہنچے، جب ہاسٹل کی وارڈن اس سے سخت لہجے میں بول رہی تھی۔

"اب تم یہاں نہیں رہ سکتیں۔ تم اس فیس کو لے کر یہاں سے جا سکتی ہو۔"

"وہ میری ماں ہے میم! آپ اتنی سنگدلی کا مظاہرہ مت کریں۔"

"میں سنگدلی کا مظاہرہ نہیں کر رہی، یہ رول ہے یہاں کا۔ یہ ہاسٹل ہے کوئی یتیم خانہ نہیں۔ تم جانے کی سوچو ورنہ میں خود تمہیں سڑک پہ لے جا کر کھڑا کر دوں گی۔ جب بڑی آئی ماں سے سوک۔"

"پلیز میم!" وہ وارڈن کے پیچھے کمرے سے باہر تک نکلی مگر کوریڈور میں شہریار اور جیسے مانیہ کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

"شہریار صاحب! آپ؟"

شہریار نے جواب دینے کے بجائے آہستگی سے اُسے تھام لیا۔ "اپنا سامان سمیٹو اب تم یہاں نہیں رہو گی۔ یہ جگہ تمہارے رہنے کے قابل نہیں ہے۔"

"مگر شہریار صاحب! میں کہاں جاؤں گی؟ اتنی رات گئے رینٹ پر گھر کہاں ملے گا؟" اس نے بے چارگی سے کہا اور بیگم عافیہ جو اب تک سکتے کی کیفیت میں گھری تھیں، بے ساختہ انہوں نے اسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا تھا۔

"یہ تو بالکل میری بیٹی ہے۔ شہریار! میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ تم نے میری رائیگاں تلاش کو معنی دے دیئے۔"

"شہریار صاحب......" مومنہ نے سوال کیا تھا۔ ادھورا اور شہریار مختصر لفظوں میں اپنے اجاڑ کا بیان کرنے لگے۔ مومنہ حیرت سے بت بن گئی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا مگر جب ان کی ماں نے بھی بانہیں اس سے کھول دیں تو گھر سے بچھڑنے کی۔ یتیم خانے کا نام، پہلے والدین کا تذکرہ سب بھولی تھی۔ دونوں بیانوں میں ذرا بھی فرق نہیں تھا۔ مومنہ حیرت و رفتار سے اپنے بچھڑے ماں جی کو دیکھ رہی تھی سسک رہی تھی۔
عافیہ بیگم ان کی مدد کر رہی تھیں اور اس مدت میں شہریار نے مومنہ کی ماں کو سہارا دیتا وہ گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔ واپس لوٹا تو عافیہ بیگم کے کندھے سے سر لگا کر رو رہی تھی۔

"میری ماں میری خوش نصیبی تھی بیگم! میں نے ماں کو چھوڑا تو جیسے خوشی نے زندگی نے سکون نے اور...... بابا نے بھی میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔"

"نئی بات مومنہ! اگر ایسا ہوتا تو سے ڈرنے والا ہے میں دو کسی ایک دل کو تمہارے لئے موم کر کے کیوں بھیجتا؟ اس نے تمہیں کسی کھائی میں گرنے نہیں دیا۔ یہ اس کی محبت کی انتہا ہے۔ آپ اللہ کی محبت کا اعتراف کر رہی ہیں۔" شہریار نے اس کے وجود سے جھلکتے بات مکمل کی اور اس کا بوجھ اٹھاتے ہوئے اس کا سوٹ کیس اٹھانے کے لئے آگے بڑھا۔ اس محبت اس ملن کے منظر سے ان کی خوشی بھی آنکھوں میں جھلک رہی تھی۔ دل بے ساختہ چاہ رہا تھا وہ بیر احتیاط چھوڑ دے اور برسوں بعد ملنے والی اپنی بہن کو سینے سے یوں لگائے کہ پھر کبھی کوئی تشنگی اس کے دل پر قرض نہ رہے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس نے خود پر جبر کیا تھا اور وہ ان کے لئے تیار تھا۔ عافیہ بیگم مومنہ کو ساتھ لگائے گاڑی کے قریب پہنچی تھیں۔

پھر رات کافی دیر تک وہ عافیہ بیگم کے گھر بیٹھا محبت کی بارش بکھرتا رہا تھا۔ وہ حبیبہ کی طرف سونے سے قبل اپنا وعدہ دہرانے سے اٹھا۔

"او کے بیگم! اب کل ملاقات ہو گی۔ میرے خیال میں کل آپ کے لئے ایک بہترین دن ہو گا۔"

انجم جانی مسکرائے تھے جبکہ اس نے سومت کی طرف دیکھا۔ "سومت! انکل صبح وقت پر دفتر پہنچ جانا۔ بہت سارے کام فائنل کرنے ہیں۔"

سومت نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ سلام دعا کرتا باہر نکل گیا۔ موبائل اس نے اس سارے عرصے میں سائلینٹ کر رکھا تھا۔ گاڑی میں بیٹھا تو مسیجز اور مسڈ کالز دیکھنے لگا۔ ایک نمبر پر نظر پڑی تو اس نے گاڑی سائیڈ پر کر کے روک لی۔

"ہیلو! بابا! بات کر رہا ہوں۔ ابھی انجم نے فون کیا تھا۔ خیریت ہے؟"

"بابا! میں بہت پریشان ہوں۔" بھتیجی کی گھبراہٹ زدہ آواز سنائی دی تو اس نے اسے چمکار کر ریلکس کیا اور نرمی سے بولا۔

"جان بابا! آخر ہوا کیا؟ تم جیسی بہادر لڑکی کسی عام بات سے تو پریشان نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی جو در وہاں تم کرائی رہ گئی۔ تم نے کسی نئی قسم کی پرابلم کا ذکر نہیں کیا تھا اور ابھی تک...... آخر معاملہ کیا ہے؟"

وہ چپ ہوا اور دوسری طرف مدھم لہجے میں کہا گیا۔ "بابا! آپ جانتے ہیں وہ ٹھیک ہے نا؟ انہیں فکر نہیں ہے یہ کچھ دنوں سے ہاسپٹل آ کر کچھ لوگ میرے بارے میں بہت زیادہ انویسٹی گیشن کرنے لگے ہیں۔ اور میں نہیں چاہتی کہ آپ کسی پرابلم میں پڑیں۔"

"کچھ لوگ؟...... کون لوگ ہیں تم نے انہیں دیکھا ہے؟"

"نہیں بابا! میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ مگر مدر سپیریئر بتا رہی تھیں۔ وہ الگ الگ زبان تھیں۔ جو میرے بارے میں معلومات لینا چاہ رہی تھیں۔ مگر مدر سپیریئر نے انہیں میرے بارے میں کسی بھی قسم کی انفارمیشن دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اب بتائیے بابا! میں کیا کروں؟"

شہریار نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور تسلی سے بولا۔ "تم پریشان مت ہو جانا۔ میں بزنس سے فارغ ہو کر پہلی فرصت میں تمہارے پاس آتا ہوں پھر مل کر سوچتے ہیں کچھ۔"

"اوکے بابا!" دوسری طرف سے فون رکھ دیا گیا۔

شہریار نے اپنی تمبر زر پہ لب... بھی۔ کیونکہ سارے نمبر حافظ کے موبائل گھر اور دفتر کے نمبر تھے۔ اور وہ اسے فرصت سے فون کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ گاڑی بے حد تیز رفتاری سے سڑک پر رواں دواں تھی۔ وہ کچھ نہیں سوچ رہا تھا پھر بھی دل بہت سارے معاملوں میں ایک انجانا سا تھا۔ اس وقت اس کا دل بے طرح چاہ رہا تھا کہ ... ماموں عبدالکریم نے

AANCHAL.COM.PK

جب سے اُس نے اور سگریٹ اُٹھایا تھا اُس نے تب سے پلٹ کر اسموکنگ کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ حالانکہ یہ ایک بے حد مشکل ذہنی امر تھا کہ کوئی پرانی اور پختہ عادت کو چھوڑ دینا۔ لیکن وہ ایسا ہی تھا جو ٹھان لیتا کر گزرتا چاہے پھر اس کے لئے اسے کتنی ہی اذیت اور ضبط کرنا پڑتی۔ پھر اس کے سامنے اس کے پاپا کی مثال بھی تھی۔ وہ اس سے بھی بدتر کر چکے اور کہ۔ تب تحسین ماموں انکل کے کہنے پر بس ایک دن فوراً نے فیصلہ لے لیا تو پھر دوبارہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔ مگر آج پتہ نہیں اسے کیوں اسموکنگ کی طلب ہو رہی تھی۔

اُس نے موبائل نمبر ملایا تھا۔ ماموں عبدالکریم کی چہکتی آواز سنائی دی تھی۔

"کہاں ہے تو؟ اور اتنی رات تک کیوں جاگ رہا ہے؟"

شہریار ہنسنے لگا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "یہ سوال تو مجھ سے بھی پوچھا جا سکتا ہے، تو اب تک جاگ کیا کر رہا ہے؟"

ماموں عبدالکریم ہنسا پھر بولا۔ "اپنی تو بھیا صبح و شام ہے۔ ہمارے وطن کے لئے اس ملک وطن کے لئے نیند قربان کرتے ہیں اور پھر کسی دن اچھوں کی ہی چاول کی لیں سے وقت اور دیکھ کر سو جاتے ہیں۔ تمکو دیکھو پھر بھی سکون میسر نہیں جاتا۔"

"بکواس مت کر۔ بڑی خطرناک کہانی سننے کے لئے فون نہیں کیا۔ بتا میری نئی پلیٹ فورس کی کارکردگی کیسی جا رہی ہے؟"

"ایک دم چکاچک۔ تو نے بالکل ٹھیک بندے سے ملوایا تھا اسے بہت کام نکل رہے ہیں اس سے۔ اور نئے ایلائنز بھی مل گیا ہے۔ تجھے پتہ ہے؟"

"ہاں ہاں، وہ تو پتہ ہے مجھے میری گڈ نیوز۔ بتا وزیر داخلہ کے فرسٹ سیکرٹری کے معاملات ابھی تک کافی مشکل ہی ہیں ناں؟ بس اس لئے پوچھ رہا ہوں کل اگر ان کی کسی بیٹے نے یا خدا ان میرے گلے میں ہی نہ پڑ جائے۔"

"ارے تمہیں معاملات وزیر داخلہ سے بھی او کے ہیں سب ہم پہلے والی گیم۔ پی سے تمہیں رہے۔ تیرے بھائی کی تو رن گئی ہے جانی!"

"کیے ماموں ایسی تیری تو لے لی کی زبان بھی بدل گئی ہے کیا؟ آج کل کن لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے لگا ہے؟"

"ہر طرح کے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا پڑتا ہے میری جان! معاملات ایسے ہی تھوڑی طے کرتی ہیں؟" محمد کریم کا بیٹر انداز سے بولا۔ "اب بتا تو تم نے فون کیوں کیا تھا؟"

شہریار نے گلا کھنکھارا، پھر لجاجت سے بولا۔ "ماسون یار! اسموکنگ کو آج بہت دل چاہ رہا ہے اگر تو اجازت دے تو......"

"تمہیں معلوم ہے ایک بات چھوڑ دی ہے تو بس چھوڑ دی ہے جان!"

"پلیز ماسون!" اس کے لہجے میں شیر خوار بچوں کی ضد در آئی۔

ماسون نے گھور کر کہا۔ "اب کیا بچہ بن جانے کا نخرہ کر رہا ہے۔ دل پانی پانی ہونے لگا ہے تیری شیریں زبانی سے۔" لڑکا بھرپوری سے بولا۔ "اوکے ٹھیک ہے۔ مگر صرف ایک سگریٹ سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ وعدہ کرو تو اجازت ملتی ہے۔"

"اچھا صرف تین...... تین زیادہ نہیں ہیں پیارے۔"

"تین پیکٹ یا تین سگریٹ؟"

وہ ہنسا پھر شرارت سے بولا۔ "جیسی تیری مرضی۔ مجھے پتہ ہے کہ اس معاملے میں تین سگریٹ یا تین پیکٹ، جو دل چاہے حکم جاری کر دے۔ بقول شاعر، جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔"

"بس بس...... زیادہ چاپلوسی نہیں۔ تین سگریٹ کے علاوہ ہاتھ لگایا تو مجھ بیچاری سے نہیں میرے ہاتھ سے مرے گا۔"

"منظور ہے جناب! منظور ہے وہ کہے؟" وہ کچھ دیر کو چپ ہوا۔

شاید وہ کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر بات اندر ہی کہیں دب گئی تھی۔ ماسون جیسا کہ اس نے اس کی خاموشی کو سنا، دھیرے سے کہا۔

"جس وجہ سے پریشان ہے اس پریشانی کو میرے سامنے کہہ رہا ہے جان، پھر اس کے لئے زیادتی مت کیا کر۔ مجھے سارے معاملات ابھی اپنے اختیار میں ہیں۔"

"بابا کی تازہ ترین صورت حال......؟"

"جانتا ہے...... وہ آج کل کچھ فارم میں نظر نہیں آرہے۔ کتنے ہی معاملات میں وہ بے ہاتھ کا جادو چلا رہے ہیں۔ ایم این اے کی سیٹ میں آ گئی تھی۔ وہ تین وزیروں کی اس کی وجہ سے کھینچا تانی ہونے لگی۔ وہ تمام صوبے سے الگ آؤٹ کر گئی تھی۔ بلکہ اس نے انہیں پہچاننے سے ہی انکار کر دیا۔ اس لئے معاملہ پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی سے آگے نکل گیا۔ کچھ مسئلہ وف بے فاصلہ کا۔ وہاں وہ ہماری ہم نوا ہیں

ہاں، آج کل ان کے حالات بہت اچھے چل رہے ہیں ان کا۔"

شہریار نے بائیں جانب پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "پاپا سے جب پتا چلا تھا ہم عائزہ کی پہلے ایک بیٹی تھی، جو دو مہینے میں ہی [illegible] کے باہر چلی گئی تھیں، اس لیے میرے خیال میں جانا ان سے ان کی مکمل ملاقات ابھی کمزوری کا باعث نہیں ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو [illegible] اب بہت بات ہو گئی، مجھے بات کرنی ہے۔"

"کیسے؟ پھر کام کرتے کرتے خود بھی کہیں ڈھونڈ رہا ہے کیا؟" اس نے تجسس کے لہجے میں پوچھا اور وہ جواباً بولا۔

"بس ایسا ہی سمجھ لیجیے۔"

"اوکے بائی! ابھی پھر بات۔"

اس نے موبائل آف کر دیا تھا۔ اب وہ گھر کے بہت قریب تھا۔ چند منٹ بعد وہ گھر کے سامنے تھا۔ واچ مین نے گیٹ کھولا تھا، وہ گاڑی اندر لے گیا تھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ اسے گھر میں کسی کے جاگنے کی توقع نہیں تھی مگر بہت اچانک پاپا کی آواز سن کر اس کے قدم خود بخود رک گئے۔

وہ ان کے سامنے جا کر مدھم لہجے میں بولا۔ "آپ ابھی تک سوئے نہیں پاپا؟"

"نہیں۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا آج تم جس اذیت سے گزر کر آؤ گے اس کے لیے کسی کا کندھا ضرور چاہیے ہوگا اور وہ کندھا کسی دوست کا ہو [illegible] میں [illegible] ہے۔"

"پاپا!" وہ واقعی کسی کی بانہوں کا منتظر تھا۔ پاپا نے اپنی محبت سے اسے آغوش میں لیا کہ پھر آنسو بہنے لگے تھے۔ یہ سارے وہ آنسو تھے جو عائزہ بیگم کے گھر میں پلکوں کی سطح تک [illegible] چھپ گئے تھے مگر اب بے اختیار بہہ رہے تھے جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا ہو۔

"بہت دل چاہا ہوگا ان [illegible] گلے سے لگانے کو، یہ کہنے کو کہ تم [illegible] جاؤ [illegible] کہنا ہے ماں!"

وہ ان کے کندھے سے سر ٹکائے اثبات میں سر ہلانے لگا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "میرا دل چاہ رہا تھا پاپا! میں [illegible] ان کے چہرے پر [illegible] تھی۔ میں

اس خوشی کو تشنگی کی طرح چھپاتے دیکھیں، میں اچانک اس کے کندھے پر ہاتھ رکھوں اور کہوں، میں شہریار ہوں۔ وہ تمہارا اپنا بھائی شہریار۔ مگر میں نے ایسا نہیں ہونے دیا پاپا! میں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ کیونکہ مجھے لگتا تھا آپ وہاں نہیں ہوں گے تب بھی میرے ان جملوں سے آپ کا دل رک جاتا، آپ کو لگتا آپ کی محبت ضائع ہو گئی، ماما کی محبت نے مجھے بندشوں میں نہیں باندھا اور پاپا! پھر بھی تو تھا، میں نے سے بیٹا کر کے بھی کہا؟ ابو نہیں تو دو ایک سال بعد مجھے تو پتہ ہی ہے اس ملک میں کیوں اس لئے تو ہر کام ادا کر دے کر جاتا۔ کہاں نہ ہوں بھی تو ختم کو وہ ڈھونڈ میں ملک میں کیوں چاہتا کہ وہ اس دکھ میں گھل جائیں کہ ہم دشمن سے ملے بھی نہیں کہ بچھڑ گئے۔"

پاپا نے اس کے ان آخری جملوں پر اسے خود سے الگ کیا، بغور خفگی سے دیکھنے لگے۔

"روئی کا کہنا ہے کہ مطلب یہ نہیں ہے تم اپنے دوست کی جان ہی نکال لو۔" چہرہ گویا کہ ابھی ان کی چیخ نکل پڑی اپنے بال سنوار کر دے۔ "تمہیں کیا پتہ تم میرے لئے کیا ہو؟ تمہیں کیا لگتا ہے جیسے میں تو مر جاؤں۔ کیا تم چاہتے ہو، میں مر جاؤں؟"

"نہیں پاپا! آپ کے لئے تو میں نے ایک طویل زندگی مانگی ہے۔"

"تو پھر یہ کیوں نہیں سوچتے تمہارے لئے بھی کوئی ایسی ہی طویل زندگی کی دعا مجھے ماؤں کے پاؤں میں پڑا رہتا ہے۔" وہ ان کے چہرے کا خسارہ چھو کر دے۔ "تمہاری ماما...... تمہیں پتہ ہے آج کل ہر وقت کی نمازیں پڑھتی جا رہی ہیں۔ اور وہ...... وہ تم ہو تمہارے لئے لمبی عمر کی دعائیں، سے ہر وقت ان کے منہ کا نچڑ رہتے ہیں۔"

"سچ پاپا! سرپرائز میں تو اس خوشی سے مری جاؤں گا کہ کسی کے لئے میں اتنا ضروری ہو گیا ہوں۔"

"کم بخت۔" پاپا نے اس کا کان مروڑا۔ وہ ہنسا بھی مگر پاپا کی اندر رحمت نہیں آئی تھی۔ پتہ نہیں اسے ان سب باتوں کے باوجود کیوں محسوس ساتھا کہ وقت بہت تیزی سے گزرتا جا رہا ہے۔ سمیٹ کر رکھنے کے لئے وقت بچا ہی نہیں ہے مگر۔ یہ سوچ اس نے پاپا سے شیئر نہیں کی تھی اور کر بھی دیتا تو وہ کے سائڈ سے تنگ لگائے ماما، جب ان کو دل بے ساختہ اس کی باتوں سے کچلا نے لگا تھا۔ آنکھ بھیگی بار تاتی جلد ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آئے تھے۔

"نہیں انشاءاللہ ابھی نہیں۔ بہت سارے سالوں تک نہیں۔ ابھی میرے بچے نے دنیا دیکھی ہی نہیں ہے۔ اس کی تو ساری عمر کام میں گزر گئی۔ ابھی اسے شباب دیکھنے کی تمنا ہے، اسے شباب جینے کی عمر ہے۔

AANCHAL.COM.PK

ابھی نہیں، ابھی تو بالکل نہیں۔"

تمام دعا کے باوجود ایک بے کلی سی ان کے اندر رچی رہی اور وہ اس کمی سے منہ موڑ گئی تھیں۔

پھر صبح آنکھ کھلی تو وہ سب سے پہلے کھانے کے کمرے میں موجود تھا۔ ماما نے اسے تشویش سے دیکھا تھا پھر نرمی سے بولی تھیں۔

"تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں ٹھیک نہیں ہے۔ بیٹا! آرام بھی کسی چیز کا نام ہے۔"

"بے آرام تو ہم ہیں... بے چینی ہماری زندگی میں نہیں چھپائی۔" اس نے ناشتہ کی میز پر چائے سے لگتے ہوئے کہا اور ماما ان کے کپ میں گرم چائے ڈالنے لگیں۔ پھر اپنا کام مکمل کر کے تشویش سے بولیں۔

"کیا تم نے اسموکنگ کی تھی؟"

"آپ کو کیسے پتہ چلا؟" وہ گھبرا کر بولا۔ ماما نے اس کی طرف خفا نظروں سے دیکھا پھر تیزی سے بولیں۔ "کل تم نے ہی صبح جلدی دفتر جانے کا کہا تھا اپنے پاپا کو۔ سو میں ساڑھے سات بجے تمہارے کمرے میں تمہیں اٹھانے گئی تھی۔ ایش ٹرے میں سگریٹ کے ٹکڑے دیکھ کر بہت دل خفا ہوا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا فوراً اٹھا کر کلاس لگاؤں تمہاری لیکن سوتے میں تم اتنے معصوم لگتے ہو کہ ہمت ہی نہیں پڑی ڈانٹنے کی۔"

"آہا! تو میں جاگتے میں اچھا نہیں لگتا کیا؟" اس نے لاڈ سے ماما کو دیکھا۔

ماما نے اس کا چہرہ دیکھ کے دیکھا پھر مسکرا کر بولیں۔ "میرا بچہ ہے ہی اتنا پیارا کہ ہر رنگ میں اچھا لگتا ہے مجھے۔ بس جب بہت زیادہ سرخ ہو جاتا ہے غصے سے تو لگتا ہے مجھے اس پر۔"

"اظہار کر دیا کیجئے ناں، ماما! آپ کے اظہار میں اور آپ کے غصے میں جو محبت ہے وہ میرے لئے تو جیسے ٹانک ہوگی۔ وہ ہے ماما! آپ شام کو فنکشن پارٹی میں تو آ رہی ہیں ناں؟"

"ہوں، تمہارے پاپا نے انوائٹ کیا ہے تو آنا پڑے گا۔"

شہریار نے شرارت سے انہیں دیکھا پھر مسکرا کر بولا۔ "تو ماما پاپا تو ہم سے بھی تیز نکلے۔ پہلے ہی انوائٹ نہیں کر لیا میں لاؤ کھانے کی دعوت دی ہی نہیں دیا۔"

ماما نے اس کے ہاتھ پیار سے تھپکا پھر بولیں۔ "انوائٹ تو تمہارے پاپا نے کیا ہے مگر میں اس فنکشن پارٹی میں صرف اس لئے آ رہی ہوں کہ مجھے ارمی آنٹی سے ملنا ہے کیونکہ بہت زیادہ دنوں سے اس پارٹی

AANCHAL.COM.PK

کیا دوست کرنے والا ہے؟"

"ماما! آپ بھی ناں......" وہ شرما گیا تھا۔ ماما مسکرانے لگی تھیں۔

پھر وہ سلام دعا کے بعد گھر سے نکلتا چلا گیا تھا اور ماما نے ڈھیلے اعصاب کے ساتھ اپنے وجود کو کرسی کے حوالے کر دیا تھا۔ آہستہ آہستہ غلط فہمیاں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ اب لگتے وہ ہر روز پہلے سے زیادہ انہیں عزیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ کل رات کی باتوں سے یہ بھی کنفرم ہو گیا تھا۔ وہ جس بات کے لئے اتنے عرصے سے خار کھائے رہتی تھیں، وہ بھی ان کی خام خیالی تھی، ورنہ وہ بات جو مسز عبدالرحمٰن اتنے طویل عرصے سے انہیں کہتے آ رہے تھے، وہ ان بند ہو گئی ہوتیں۔ وہ بات جسے ... کے بعد انہوں نے بہت دل گیری سے شہریار کے مستقبل کے خوف سے ان سے ایک بار شیئر کی تھی۔

اور انہوں نے بہت خفگی اور غصے سے انہیں دیکھ کر ان کی طبیعت کے خیال سے کہا تھا۔ "آپ نے شیری کے لئے جو بھی ایسٹ رکھے ہیں، جیسے آپ چاہتے ہیں وہ زندگی گزارے، اس سے ہم میں سے کوئی غرض نہیں رکھے گا۔ نہ ہی اس سے آپ کا نام واپس لیں گے، نہ ہی مقام۔ وہ آپ کا بیٹا ہے اور ہمیشہ آپ کی ذمہ داری ہی رہے گا۔"

بابا نے ان کے اس جملے کے بعد سے دکھ کرنا شروع کر دی تھی اور آج انہیں تیس سال بعد اپنے شوہر کے بچے یقین آیا تھا۔ بے اختیار ان کی آنکھیں پھر سے گیلی ہونے لگی تھیں۔

"میں کہاں کہاں غلط تھی اور کتنا زعم کرتی تھی کہ مجھ سے زیادہ ٹھیک فہم رکھنے والا کوئی نہیں۔" انہوں نے خود کو سرزنش کی اور ناشتے کے برتن اٹھانے لگی تھیں۔

شہریار دفتر پہنچا تو مومنہ پہلے سے موجود تھی۔ سارے دفتر میں اس کی ماں کے ملنے اور مسٹر عابد کی بھانجی ہونے کی خبر آگ کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور سب منافقت کے باوجود اس کے سرخرو سے تھے کیونکہ انہیں اچھی ہی عزت دے۔ شہریار نے انٹری دی تو اعلیٰ نے فوراً اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دیکھئے ناں شہریار صاحب! لیڈی کی اتنی بڑی خوشی کو بھی نفع اور نقصان کے حساب سے تول رہی ہے۔ کہتی ہے، میں فضول خرچی نہیں کر سکتی، حالانکہ اب اس کے ساتھ ایسا کوئی پرابلم بھی نہیں۔ آپ کو تو پتہ ہے ناں، اگر یہ پہلے والی صرف مومنہ ہوتی تو شاید ہم اپنی ٹریٹ صرف مٹھائی کے بغیر بھی بانٹ لیتے، مگر اب تو یہ مسٹر عابد کی بھانجی ہے، اس سے اتنا بخل ہمارا زیب نہیں دیتا۔"

شہریار نے مومنہ کی طرف دیکھا اور وہ سر جھکا کر بولی۔ "سیدھی سی بات ہے شہریار صاحب! وہ میری خالہ ہیں، ان کا جو کچھ ہے، جو باقی بچ میں یقیناً میرا ہے، میرا ہو سکتا ہے، مگر میری عزت نفس اور خود داری سے قطعاً برداشت نہیں کر سکتی کہ میں بیڑا ساٹ زندگی جیوں۔ مسٹر شہریار صاحب! اپنی تنخواہ کے حساب سے میں نے اپنی خوشی بہت اچھے سے سلیبریٹ کر لی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

اس نے گلاب جامن کی طرف ہاتھ بڑھایا اور مومنہ نے فوراً بے ساختگی ٹوک دیا۔ "سوری سر! میرے خیال میں آپ کا ہر وقت بلڈ پریشر ہائی رہتا ہے۔ شوگر لیول بھی انہیں میں ہی چل رہا ہے۔ اس لئے اسے رہنے دیں۔" "ڈونٹ وری، پھر روٹی۔" "میں آپ کے لئے شوگر فری سویٹ منگوا لیتی ہوں، بس پانچ منٹ انتظار کر لیجئے۔"

شہریار دلچسپی سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ اب اُن کی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ مومنہ نے بیرے کو مٹھائی لانے کا حکم دیا اور ایلیا تیزی سے اپنے مقدمے میں واپس آ کر پھر سے بولی۔

"بولئے ڈیئر! مومنہ ٹھیک کہہ رہی ہے یا میں؟"

شہریار نے دونوں کی طرف دیکھا، پھر دل ہی دل سے بولا۔ "میرے خیال میں آپ دونوں ہی کا نقطہ نظر بالکل ٹھیک ہے۔ کسی ایک کا ساتھ دینا زیادتی ہوگی۔" اُس کا جملہ ادھورا ہی تھا کہ اس کے فرینڈز اور اندر کی ٹیم کے سارے ممبرز نے ہلکا پھلکا احتجاج کرنا شروع کر دیا۔

شہریار کے ہونٹوں پر بھی ہنسی آ گئی۔ اسے ایک لمحے کے لئے یہ عام سا جینے کا انداز بہت اچھا لگا تھا۔ سوال کا احتجاج اس سے پہلے کہ زور پکڑ جاتا، اس نے ہاتھ اونچا کر کے بولنا۔ سب کے ہونٹ کھلے بند ہوئے اور وہ کھڑے ہو کر بولا۔

"آج کا کمیشن اگر لانچنگ مرحلے میں پلس پوائنٹ حاصل کر لیتا ہے، میڈیا میں کامیاب رہتا ہے تو مومنہ کی طرف ایک شاندار سیلیبریشن میں آپ کے لئے ارینج کروں گا۔"

"یہ کیا بات ہوئی شہریار بھائی!" ایلیا کی زبان بے ساختہ پھسلی۔ اس نے دانتوں تلے زبان دبائی۔ حالانکہ اس سے رشتہ جوڑنے کی رسم عام کہاں تھی جو اس کے پاس یہ غلطی سرزد ہونے کا امکان رہتا۔

ایلیا نے آہستہ آہستہ سر اٹھا کے شہریار کے چہرے کی طرف دیکھا، وہاں ویسے ہی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

"تھینک یو ایلیا! آپ کتنی ینگ ہیں، لیکن آپ سب میرے لئے ویسی ہی ہیں، اس لئے مجھے خوف زدہ ہونا چھوڑ دیجئے، وہ ایک بار ودوتا جواب گزر چکا ہے۔" وہ دوبارہ پھر پروگرام میں ترمیم کر کے بولا۔ "اوکے، اگر ہم بلاشبہ میڈیا کی اچھی کوریج نہیں حاصل کر پاتے جو ہمارا ٹارگٹ ہے، تب بھی بے فکر رہئے۔ پارٹی کے بعد آپ سب کا ڈنر میرے اوپر رہے گا۔ سو جو اپنے گھر میں اطلاع کرنا چاہتا ہے، پہلے سے کر دے۔ پک اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری بھی میری اور......"

"واؤ!" سارے ورکرز کی باچھوں سے یورش پھر گیا۔ وہ انہیں خوش ہوتا دیکھتا وہاں سے اٹھ گیا۔ کانفرنس روم میں سالار عبدالرحمٰن میڈیا کے افراد کے ساتھ میڈیا کوریج کے لئے ویو پوائنٹ آؤٹ کر رہے

AANCHAL.COM.PK

تھے۔ حازق عبدالرحمٰن پارٹی کا مکمل شیڈول ترتیب دے رہا تھا، جو شہریار نے اسے پوائنٹ آؤٹ کر رکھا تھا۔ مدعوئین کی سیٹیں کہاں ہونی چاہئیں، پریس گیلری کہاں ہوگی، مہمانانِ خصوصی کے لیے کتنے اور کون کون سے افراد مدعو کیے جائیں گے، بزنس حاصل کرنے کے لیے اشتہارات کا حصول کس کس کمپنی کو اپروچ کرنے سے حاصل ہوگا، کون کون سے چینل پر یہ تقریب آن ایئر دی جاتی ہے، حازق بہت انہماک سے مصروف تھا۔ وہ مسکراتا ہوا اپنے روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ سارے کام مکمل تھے، صرف اب پریزنٹیشن باقی تھا، جس کا کریڈٹ آسانی سے حازق لے سکتا تھا۔ چھوٹا تھا وہ، شروع میں اتنی سہولت تو اسے اس کی طرف سے ملنی ہی چاہیے تھی۔ ہاں یہ تھا کہ اس سارے کام میں اس نے کسی زندگی کی حد تک اسے انوالو ضرور رکھا تھا؟ کہ اسے معاملات کی تہہ تک پہنچنے میں وقت نہ ہوتی۔ ذہین اور زیرک وہ اس سے کہیں زیادہ تھا، اس لیے وہ اس کے مزاج کے مطابق سے اچھا مشن لے کر اٹھا تھا، اب اس کا وقت اپنی زندگی کے سب سے خوبصورت خیال کے ساتھ وقت گزار رہا تھا۔

"آج کی کامیابی میری بھی کے لمحہ کیسے ہوں گا، شاید مجھے تم سے ویسی ہی محبت ہے جو تم نے ان سے کی تھی۔ مجھے تمہاری محبت میں جینے سے زیادہ مر جانے کی آرزو ہے۔ میرا دل کرتا ہے تم مجھے زندگی میں کسی خوشی میں تنہا کر کے تو مجھے نہ کرو، مگر زندگی میں جب بھی تم روؤ تو تمہاری آنکھ سے میرا دل تو ٹوٹ ہی چکے۔ تم مجھے بھول جاؤ، مگر میں چاہ کر بھی تمہیں بھلا نہ سکوں۔ تمہاری محبت میں میری زندگی آزار ہو جائے ویران ہو جائے، مگر تمہارا خیال میرے ہمراہ یوں چلے جیسے وہ صرف میرے لیے بنا تھا۔ میں تمہیں ہمیشہ اس قیدی کی طرح چاہوں، جو بادشاہ کے حکم معافی سے پہلے ہی پھانسی پا چکا ہو۔ میں تمہیں خلش میں یاد رہوں، درد میں یاد رہوں، تمہیں زیادہ ہوں تو محبت ضرور ایک بار مجھے میری طرح دل گیر کرے، بے چین کرے۔"

"کیا سوچ رہے ہو؟" بہت غیر متوقع آواز سنائی دی۔

خوشی سے اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ "نبیل بھائی! آپ...... آپ تو تین دن بعد آنے والے تھے نا۔" وہ ان کے سینے سے جا لپٹا تھا۔

انہوں نے کافی دیر تک اسے خود سے بھینچ رکھا تھا، پھر آہستگی سے بولے تھے۔ "اگر دو پہلے گئے وقت پر آتا تو اتنی خوشی جو تمہارے چہرے پر ابھی ہے وہ کیسے دیکھنے کو ملتی بھلا؟"

"نبیل بھائی! آپ بھی نا۔" اس نے ہلکے سے ان کے کندھے پر مکا مارا، پھر خوشی سے بولا۔ "اچھا کیا آپ آج آ گئے۔ آج فنکشن میری بھی جان۔"

"ہے تو، مگر مجھے تو وہ پوچھنا ہے، جو تم مجھ سے چھپانے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہو۔ خیریت ہے میرے شیر؟ آج تیری آنکھیں بڑی چمکیلی ہو رہی ہیں۔"

"ہوں گی...... ہوں گی...... کیوں نہیں ہوں گی، مرا پہلا محبت کے کئی زینے ایک ساتھ جو چڑھ گیا ہے۔"

"ہامون تم...... اتنے لوڈڈ کیوں ہو؟" وہ واقعی حیران ہوا تھا اور عدیل بھائی نے ہنس کر بات کی۔

"یہ ہمیشہ غلط فہمی کا شکار رہتا ہے۔ لیکن اس وقت میری اور اس کی چپقلش صرف اس لیے ہے کہ رات کو ہم تمہاری پارٹی میں نہیں آسکتے۔ کچھ آفیشل معاملات ہیں۔ ہامون مجھے آج سے اسسٹ کر رہا ہے۔"

"اچھا تو یوں کہیے نا آپ دونوں میرے لیے ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ محبت کا رعب مجھ پر جھاڑ رہے ہیں۔" وہ یکدم خفا ہو کر ان کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر عدیل بھائی اس کی کرسی کے پیچھے کھڑے ہو کر بولے۔ "بچے تمہارا صرف آج کا دن نہیں، سیکنڈ سے پاس زیادہ وقت تمہارا۔"

"سارا وقت میرا کیوں نہیں؟" اس نے بگڑے لہجے میں پوچھا اور ہامون شرارت سے بولا۔

"سارا وقت تجھے دے دیا تو رابعہ بھابی کہاں جائیں گی، وہ مجھے مار......"

بے ساختہ قہقہہ پھر جیتے میں کیسے رکتا۔ وہ بے ساختہ ہنسے جا رہا تھا عدیل بھائی نے گھورا۔ مگر وہ یکدم سنجیدہ ہو گئے تھے۔

"کون ہے وہ جس نا انہیں تم نے؟"

"میری بھی ہے بڑے بھیا ہامون تو بس......"

"بابا ہامون تو بس یہ پانی بھی نیا ہیں جیسی محبت کرتا ہے۔ کہتا ہے وقت آنے دے سب بتا دوں گا۔ اسے میں نے کہا تھا اگر وقت نکل گیا تو کہنے لگا میری قسمت میں ہوگی تو مجھے ضرور ملے گی۔ حیران آج کل بھائی کو قدرت راز سر بتا رہا ہے۔" ہامون اسے پوری طرح ایکسپوز کرنے کی کوشش کر رہا تھا انہوں نے بہت گھور کے اسے دیکھا تھا اور ہامون نے مخملی پردے کے والٹ کو عدیل بھائی کی طرف بڑھایا تھا۔

"دیکھیے کون ہے جس نے بھائی جیسی چٹان کو پانی کر دیا ہے۔"

"عدیل بھائی پلیز نہیں۔" اس نے فوراً والٹ چھیننے کی کوشش کی۔ ہامون نے اسے بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا، جب عدیل بھائی نے اس کے والٹ میں لگی تصویر کی رونمائی کر دی تھی۔

ANCHAL.COM

"اوہو! تو یہ معجزہ ہے، تب ہی تو ہمارے بیچارے بھائی کا دل اڑا کر لے گئیں۔"

وہ شور کرتی وانی جیسا تھا، جب اچانک سوہنی دروازہ ناک کرکے اندر آئی تھی۔ سب "خیر ہو" کہہ کر بیٹھ گئے تھے۔ محفل کی بے تکی کا ماحول اور عدیل بھائی درست کر رہے تھے۔ سوہنی کی آنکھیں مسکرائی تھیں، کیونکہ بچیوں کا شور کمرے سے باہر صاف سنا جا سکتا تھا۔

"سر! ہم سب تیار ہیں۔ آپ کب تک نکلیں گے؟"

شہریار نے وال کلاک کی طرف دیکھا پھر نرمی سے بولا۔ "ابھی ایک گھنٹے میں نکلتے ہیں مس سوہنی!"

سوہنی سر ہلا کر باہر نکل گئی تو عدیل بھائی شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگے، پھر نرمی سے بولے۔ "بہت محبت کرنے لگے ہو اس سے؟"

شہریار کی آنکھیں پہلے سے بھی زیادہ چمکیں۔ "ہاں" بس اس نے آنکھیں موند کر اثبات میں سر ہلایا تھا اور پھر جذب سے بولا تھا۔

"مجھے اس سے محبت ہے
محبت بھی ستاروں سی
گھٹاؤں کی اداؤں سی
صبح دم کھلتے پھولوں کی مہک جیسی
کناروں سے گلے ملتے ہوئے لہروں کے پانی سی
شراروں کے رقص پہ چھیڑے ہوئے سنگیت کے جیسی
کسی آزاد پنچھی کی اڑانوں سی
مجھے اس سے محبت ہے

AANCHAL.COM.PK

رم جھم پیار دیوانی ساون کی بارش سی

مجھے اس سے محبت ہے

ہاں، مجھے اس سے محبت ہے"

اس نے آنکھیں کھولیں تو دونوں بہت عجیب سی کیفیت میں اسے دیکھ رہے تھے۔

"تم محبت کرنے سے اعتراف کرنے سے کیوں ڈرتے ہو؟" ہارون نے زیر لب مسکراتے ہوئے [illegible] کہا۔

"اس کی محبت کا مزہ ہی الگ ہے۔ چپ چاپ سے چل جاؤ، اپنی وجہ اس میں بھی تھرل ہے۔"

"مگر مجھے لگتا ہے یہ سب بے حد صدق دل سے ہے، جو ایسی محبت کا راگ الاپ رہا ہے، سمجھو مجھے کوئی کے زمانے سے محبت کرتی تھی، لیکن اس کا اظہار اس نے میرے اظہار کے بعد ہی کیا تھا۔ یہ سرخ ہے نیلی، پیاس، بلکل مرے [illegible] بڑی اچھا لگتا ہے۔"

"اوکے اوکے آپ کی پیار کلاس لوں گا، جلد اس مقام پہنچ جاؤں گا" کہا۔ "وہ سناؤ، مجھے تم سے محبت ہے۔"

"کوئی بات نہیں رات ہماری ہے ہمارا، تو بس آج کہہ دو کہ تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔"

"شادی... [illegible] بھیا! میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟"

"اب پھر مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو۔ میں سالار بھی تم جانتے ہو، میں بہت [illegible] ہوں۔"

"مجھے پہلے سے یقین تھا یہ بات... مگر اسے تمہاری [illegible] راجد بھائی کے سامنے کہیں تو جانوں کہ تم جوان ہو آپ۔"

عدیل بھائی جواب کے بجائے ہنسنے لگے۔ پھر وہ دونوں ساڑھے بارہ سے پہلے کھانا پینا ختم کر اٹھے تھے۔

عدیل بھائی کے کلینک ہی وہ بھی اپنے گروپ کے ساتھ فری کلینک میں جا بیٹھا تھا۔ پھر ۱۰ بجے سے پہلے وہ کلینک پہنچ گئے تھے۔ حازق اور سالار باہر کے کاموں میں مصروف تھے اور قریب کی رنج

AANCHAL.COM

منت اور انتظامات کے لئے وہ جان مار رہا تھا۔ یہاں تک کہ تین بجے زہرہ بی مومنہ نے کھانے کو پیک کر دیا۔ پھر وہ بستہ کھانا کھا رہے تھے اور مومنہ اپنا موبائل لے کر ایک قدرے خاموش کونے میں کسی پر جا بیٹھی تھی۔ وہ صبح سے کافی مرتبہ شافعہ کو فون ملا چکی تھی مگر کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر ٹرائی کیا تھا اور اس بار خیر سے رابطہ ہو گیا تھا۔

مومنہ کی آواز سن کر وہ بہت خوش ہوئی تھی اور شہریار، عافیہ بانو، عطیہ بانو اور سلمان راشدی کے نئے رشتے کے حساب سے باتوں میں دو دو ہاتھ کرنے خود بھی مارے سینڈوچ اور چائے چھوڑ کر آ گیا تھا۔ مومنہ کی اس کی طرف پشت تھی، سو وہ اسی خوشی سے مصروف گفتگو تھی۔

شافعہ نے اس کے لہجے کی خوشی نوٹ کی تو بولی۔ "تم اتنی خوش کیوں ہو؟ کیا کوئی خاص بات ہے؟" اس نے سوال کیا اور مومنہ ہنس پڑی، پھر بہت شوخی سے بولی۔

"شافعہ! اللہ کو میری محبت پہ یقین آ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ تمہیں پتہ ہے، آج میں کتنی خوش ہوں۔ آج...... آج پورے بائیس سال بعد مجھے جس کی تلاش جگہ جگہ بھٹکائے دے رہی تھی، میں نے اسے پا لیا۔ مجھے وہ مل گئی۔ شافعہ! مجھے میری ماں مل گئی۔ بھائی نے انہیں اولڈ ہوم میں لا کر چھوڑ دیا تھا اور آج میں نے...... میں نے اپنی ماں کو پا لیا اور ایک اور گڈ نیوز، میری کل مسز عافیہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ میری ماں سے بہت پوچھا جا رہی تھیں، لیکن جب وہ میرے ہاسٹل آئیں تو حیرت ان کی میری خبر تھی۔ شافعہ! تم سوچ نہیں سکتی ہو، مجھے کتنے بڑے بڑے سرپرائز ملے ہیں۔ شافی! وہ مسز عافیہ میری خالہ نکلیں، ان کے پاس میری سگی ماں کی تصویریں تھیں۔ میری ماں بالکل میرے جیسی لگتی تھیں۔ تو یقین نہیں کیا کہہ رہی ہوں، تمہیں شافی! میں بالکل اپنی ماں کے جیسی ہوں۔ تم شام کو آنا۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ عافیہ آنٹی بھی بہت خوش ہیں۔ آج کے دن ان کا پہلا کنسرٹ لائیو ہو رہا ہے اور آج کے دن وہ میرے ساتھ سیلیبریٹ کر رہی ہیں۔ شافی! تم آؤ گی نا، ہوں؟ دیکھو! آج میرا تم سے بہت باتیں کرنے کا من ہے۔" وہ پھر کہہ کر پھر بولی۔ "خیریت شافی! تم کچھ بول نہیں رہیں، اپنی منگنی والے تنگ؟"

"ارے نہیں! تم کسی کو بولنے کا موقع دو تو کوئی بولے نا۔"

"اوہ سوری شافی! آج میں اتنی خوش تھی کہ کیا بتاؤں۔ تمہیں پتہ ہے، مسٹر شہریار نے ہمارے سارے مظفر کی لڑکیوں کو خصوصی ڈنر کے لئے انوی ٹیشن بھی دیا ہے آج۔ ہم تو خوب مزہ کرنے والے ہیں۔"

"واقعی، یہ تمہارا حق ہے مومنہ! تم نے جتنی سخت زندگی جی ہے، اس کے لئے یہ موج مستی جائز ہے۔" اس نے ہنس کر اسے مبارک باد دی۔ مگر وہ ایک بات پر اڑ گئی۔

"پلیز شافی! تم اگر آج ہمارے ساتھ ڈنر پہ چلو تو اچھا لگے گا، ہاں؟"

"تمہیں اچھا لگے گا، مگر ضروری تھوڑی ہے تمہارے شہریار صاحب کو بھی یہ بے تکلفی اچھی لگے؟ اگر مجھ کو کتنا میرا کہنا یاد تھا تو وہ میرے ہاتھ سے خرچ ہو جائیں گے۔"

"آپ کے ہاتھ سے خرچ ہو جانے میں جو مزہ ہے کسی شادی اور بچت میں کہاں ہے۔ ویسے آپ مجھ سے تقریباً ہر روز ملتی ہیں، ہم باتیں بھی کرتے ہیں، لیکن پھر بھی آپ آج تک نہیں جان پائیں، میں اندر سے کیا ہوں۔ اس شافعہ! کیا واقعی آپ میرے بارے میں اتنی بری رائے رکھتی ہیں؟"

مومنہ نے اچانک فون چھینے پر احتجاج کرنا چاہا، مگر شہریار پر نظر پڑی تو وہ اعصاب ڈھیلے ڈال کر اُسے بات کرتے دیکھنے لگی اور دوسری طرف شافعہ بھی اچانک اس حملے پر پہلے تو گھبرا گئی، پھر سنبھالا لے کر بولی۔

"روز ملتی ہوں تو بھی کیا مسٹر شہریار، ہم روز کچھ گنی چنی باتوں پر ہی ڈسکشن کر لینے کے سوا کرتے ہی کیا ہیں۔ حالات حاضرہ، عالمی طاقتوں کی جنگ، ورلڈ فنانس مارکیٹ پر میرا کامل تبصرے کے علاوہ ہماری گفتگو کا لب لباب نکلتا ہی کیا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں، ان باتوں سے کسی انسان کو نہیں جانچا جا سکتا۔"

"کیوں نہیں جانچ سکتا مس شافعہ! جبران تو کہتا تھا، ہم جو چھوٹے چھوٹے مکالمے بولتے ہیں وہ ہمارے اندر ہماری ذات کو ظاہر کرنے کے چھوٹے چھوٹے روشندان ہوتے ہیں، جہاں سے پورے کے پورے ہم جھانکتے ہیں، اور آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ میرے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتیں مس شافعہ! یہ انصاف نہیں ہے۔" اس سے کوئی بات نہیں بن سکی تو وہ بات بدلتے ہوئے بولی۔ "آپ مومنہ کے ساتھ ہیں شہریار صاحب۔"

شہریار اس کی چالاکی پر ہنس پڑا، پھر مسکرا کر بولا۔ "کل میم جانے کے بالکل قیمتی انداز میں مومنہ کے گھر کی خوشی میں ایک ڈنر پارٹی ہے، جو مومنہ صاحبہ، انوشے اور رائمہ علینہ کے لئے ہیں۔ ون اینڈ اونلی بھائی کا رول پلے کروں گا۔ انوشے اور علینہ بھو تو بڑی ہمت نے پر مصر ہیں، اس لئے رعب گانٹھنے کے لئے تینوں ہی ملی ہیں، سو جشن ہجرے میں ہوں۔ رہا اس وقت مومنہ کے پاس ہونے کا سوال تو جناب مومنہ میرے پاس ہیں، ماشاءاللہ شو آرگنائز کرنے کے لئے اس وقت فرزا کا ایک گروپ میرے پاس ہی موجود ہے جسے مومنہ لیڈ کر رہی ہیں۔"

"یقیناً یہ گروپ لڑکیوں پر مشتمل ہوگا۔" اس نے پھر زبان کا چٹخارہ دیا۔ پتہ نہیں اُسے چڑانے میں کیا مزہ مل رہا تھا، مگر وجہ انکشاف تھا تجسس کو کرنے لگا تھا، پھر ہنسی تھمی تو شرارت سے بولا۔

"آپ بالکل ٹھیک اندازے پر پہنچی ہیں مس شافعہ! اگر میں شادی شدہ ہوتا تو ایک کروڑ آپ کو ضرور دیتا، مگر ریکارڈ درست فرمائیے لڑکیوں کا گروپ اس لئے میرے ساتھ ہے کیونکہ میں جانتا ہوں مردوں کے مقابلے میں عورت میں کریٹیویٹی کی ایک حس زیادہ ہوتی ہے، سوالیہ تی کی بات ہے اور آپ مجھے کہاں سے کہاں لا کے دے رہی ہیں۔" وہ پھر گڑبڑا کر پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "مس شافعہ! کیا واقعی آپ

مجھے فنا بالانسان لگتی ہیں؟"

"اُف شہریار صاحب ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔"

"ارے واہ آپ کا مذاق اور اتنا خطرناک، یہاں کسی کی جان سے جاتے جاتے بچا ہے۔"

"شہریار صاحب آج یہ بات تو ہے آج آپ مجھ سے بہت مختلف لگ رہے ہیں۔"

وہ پھر سے ہنسا اور پھر خوشی سے بولا۔ "آج میں بہت خوش ہوں مس شافعہ! مجھے لگا آج آپ اپنی شام میرے نام کر دیں گی؟"

"جی شہریار صاحب!" وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ یہ اس شہریار کی زبان نہیں تھی جس سے وہ پہلی بار آفس میں ملا کرتی تھی۔ ان کی طرف خاموشی نے دیکھا تھا جو بہت مدھم لہجے میں کہا گیا تھا۔

"میرے جملے کا غلط مطلب مت لیجئے گا مس شافعہ! میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں آج آپ بھی میری خوشی میں ضرور آئیے گا آپ سے انتظام، یہ واضح ہے میں نے سارا ایک بات اور آج کے شو کو میں ہوسٹ کر رہا ہوں، سو اچھے سننے والوں کی مجھے سخت ضرورت ہے۔"

شافعہ بے ساختہ ہنس پڑی پھر فکر کرنے لگی۔ "آپ تو اپنی اتنی تعریف کر گئے شہریار صاحب اپنی ہی تعریف کے بجائے رب العالمین، یہ تو بڑی بات ہے جناب بیچنی سوچنے والی؟ کسی نے سوال اٹھایا اچھے سننے والوں کی لگن رکھنے والے شہریار صاحب کیا اچھا بولنا بھی جانتے ہیں تو کیا جواب دیں گے آپ؟"

"کیا جواب دوں گا اسے میں، بہت محبت سے کہوں گا وہ پہچان، مجھے پلیز!! آگے سنئے پھر فیصلہ کیجئے۔" وہ کھل کر بولا۔ "بتائیے ناں شافعہ! آپ نہیں آ رہیں؟"

شافعہ نے کافی دیر تک سوچا ہو گا اس معاملے کی وجہ سے بالکل انکار کر دیا تھا۔ وہ کبھی آنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتی تھی مگر پھر بھی اس نے شہریار کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہامی بھر لی تھی۔

فون آف ہو چکا تھا مگر وہ پھر بھی کسی سحر میں جکڑی ہوئی تھی۔ وہ مدہوشی سے اسے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھی۔ وہ اس کی شہد آگیں آواز، پتہ چکا تھا مگر نظر نہ آ گیا تھا اور وہ سوچتی بہت رازداری سے بولی تھی۔

"ہم... بات یہاں تک آ پہنچی ہے تو مجھے بتا دیجئے شہریار صاحب! میں آپ کے دل کی بات بہت آسانی سے اس تک پہنچا سکتی ہوں۔"

جیسے جیسے اس کو جو... یکدم چونک پڑی تھی۔ یکدم اسے وہ بات بہت شدت سے یاد آ گئی تھی۔ کسی بہانا کی بے تکلفی سے معصوم کی طرح اس سے مخاطب رہا کرتی تھی مگر آپ کتنے دن کتنے ماہ سے اس نے اس کی

آواز بھی نہیں سنی تھی۔

"بس مومنہ! میرے خیال میں اب ہمیں کچھ کام کرلینا چاہیے۔" وہ چند لمحوں تو خاموش رہی پھر کیوں رو پڑی گیا۔ مومنہ نے انہیں حیرت سے ان کے بدلتے تیور دیکھے تھے مگر وہ بہت سنجیدہ ہوگیا تھا جیسے کبھی مسکرایا بھی نہ ہو۔ سب ٹھیک کہاں اس کے ساتھ مصروف تھیں۔ پھر بھی کوئی ساڑھے سات بجے مسز حمید الرحمٰن اور سالار عبدالرحمٰن نے مہمانوں کو ریسیو کرنا شروع کردیا تھا۔ شہریار بظاہر مصروف تھا لیکن اس کی نظر داخلی دروازے پر ہی لگی ہوئی تھی۔ مومنہ اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ تبھی اندر نے میں جاکر اس نے حجرے سے شافعہ کا نمبر ملایا تھا۔ دوسری بیل پر اس نے ریسیو کیا تھا۔ مومنہ نے اس کی آواز سنتے ہی کہا تھا۔

"کہاں ہو تم؟ یہاں مہمان آنا شروع ہوگئے ہیں اور تمہارا ابھی تک دور دور تک پتہ نہیں ہے۔"

شافعہ نے قدرے شرمندگی سے بولی۔ "اچھا، بس آج ایک گھنٹے کی ڈیوٹی لگ گئی ہے ورنہ مجھے آنے میں کچھ دیر ہوجائے گی۔"

شافعہ نے ... ملایا تھا اور اس وقت کسی کے نرم ہاتھوں نے اس کا شانہ چھوا تھا۔ "کیسی جارہی ہے تیاری؟ کوئی پرابلم تو نہیں؟"

وہ مڑا اور بے ساختہ مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کرلیا۔ "ام! آپ...... مجھے واقعی آپ کا بہت شدت سے انتظار تھا۔"

"شکریہ! آپ کو کسی اور کا بھی شدت سے انتظار ہے شاید۔"

"مومنہ پلیز......" اس کی شرمگیں مسکراہٹ ان کا جواب دل کہنے سے نہیں روک سکی تھیں۔

"کون ہے وہ؟ مجھ سے ملواؤ گے؟" ام نے اداس والے جاؤ سے پوچھا اور وہ دھیرے سے مسکرا کر بولا۔

"آئے گی تو ضرور ملواؤں گا۔ ویسے پتہ نہیں آپ کو پسند آئی بھی ہے یا نہیں۔"

"وہ کیسے پسند نہیں آئے گی؟ تمہاری پسند اچھی ہی ہوگی نہیں ہوسکتی۔" ام نے اسی یقین سے کہا کہ اس کے چہرے پر اطمینان پھیلتا چلا گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا وہ مومنہ نے اس کا بازو پکڑا تھا۔

"سر! جانیے ماسٹنگ کی طرف سے کہا جارہا ہے کہ آپ فوری طور پر اسٹیج پر پہنچیں۔"

شہریار نے بالوں کو ہاتھ سے سنوارا اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا چلا گیا۔ پھر ڈیک سنبھالے اسٹیج کی اسپاٹ لائٹ میں آکر کھڑا ہوا تو زور و شور سے تالیاں بجا کر اس کا استقبال کیا گیا تھا۔

AANCHAL.COM.PK

اس نے فرشتہ پاپا کو صحیح پراواسٹ کیا تھا۔ وہ جو جیساں چند جذبے تھے، جب اس نے ان کے لیے نظم پڑھی تھی۔

"کچھ لوگ سبز موسموں کی طرح
زندگی میں پھول کھلایا کرتے ہیں
خوشبو کی سوغات کر کے
چپکے چپکے جیون مہکایا کرتے ہیں
ویل ڈن ڈیئرنگ بینی مسز عبدالرحمٰن!"

پاپا کے چہرے پر ان کے تعارف سے مسکراہٹ بکھر گئی۔ انہوں نے بہت جذبے سے اس کی پذیرائی کی تھی۔ پاپا روسٹرم کی طرف بڑھ گئے تھے۔ پھر ایک مختصر خطاب کے بعد بہت ساری تالیوں میں اس نے انہیں رخصت کیا تھا اور ایک انعام کروایا تھا۔

"ہر مرد کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہے۔ لوگ کہتے ہیں مگر میں نے اسے ادھورا دیکھا ہے۔ کیونکہ میری ہر کامیابی کے پیچھے صرف ایک عورت کا ہاتھ ہے اور وہ ہے میری مام مسز عاطیہ عبدالرحمٰن۔ پلیز ہیو......!" اس نے دیکھتے پیچھے کی سمت فخر سے مام کو ان وی ٹیٹ کیا تھا۔

مام کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ آج تک کی تقریبات میں انہیں کبھی بھی ایسے ان سے ان وی ٹیٹ نہیں کیا گیا تھا جو ان کے لیے ممتنے سے بزنس پارٹی رہ گئی تھی۔ آج ایک بہت خوشگوار یاد وہاں سے لے کر جا رہی تھیں، جیسے عمر بھر کی محنت کو کسی نے ایک لفظ میں سمیٹ دیا تھا۔ "محبت" بلکہ محبت تھا جو شہریار کی آنکھوں میں تھا۔ مسز عبدالرحمٰن کے چہرے پر تھا۔ وہ صرف تشکر کے اظہار کے سوا کچھ نہ کہہ سکی تھیں اور بھیگی آواز کے ساتھ لوٹ آئی تھیں اور ان کے بعد باقاعدہ تقریب کا آغاز ہو گیا تھا۔ وہ ہر ماڈل کے چہرے پر کہیں نہ کہیں شمر ڈھونڈ رہا تھا اور وہ ذہن سے اسی کی ان ہی ذہن سے متاثر ہونے چلے جانے بزنس اور شاعری بہت الگ۔ کیا ہی کہا کہ شاعری اس کا مزاج تھی اس کے ذہن میں تھی۔

تقریب اپنے عروج پر تھی، جب ہائی وے دروازے سے ثانیہ داخل ہوئی تھی اور اس نے نظریں اس پر گاڑ دی تھیں۔

AANCHAL.COM.PK

"وہ جبیں ضرور کئی چاہتوں سے سجے گا
مگر وہ آنکھیں ہماری کہاں سے لائے گا"

شعر بے محل نہیں تھا۔ ریب منیب پر نظریں تھیں۔ سب نے اس کے شعر کو داد دی تھی۔ مگر ہما نے پلٹ کر دیکھا تھا اس کے لہجے کی حدت صرف ہما نے محسوس کی تھی اور وہ گم تھا۔

تبھی ہابیل نے اپنا منیب بھی نہیں لیا تھا کہ وہ گنگنانے لگا تھا۔

"تم جس خواب میں آنکھیں کھولو

اس کا روپ امر

تم جس رنگ کا کپڑا پہنو

وہ موسم کا رنگ

تم جس پھول کو ہنس کے دیکھو

کبھی نہ وہ مرجھائے

تم جس حرف پہ انگلی رکھ دو

وہ روشن ہو جائے"

موحد نے گھبرا کے دیکھا تھا اور اس نے فوراً بات سنبھال لی تھی۔ "ہم جس سے محبت کرتے ہیں ہمیں اس پر اس کی محبت پر تجربے کا سا گمان ہوتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں وہ جو چاہے بدل سکتا ہے، جو روپ چاہے دے سکتا ہے۔ سو پیار میں محبت کرنے والوں کے تمام رنگ اور ہنر سے کنڈراس کے ساتھ...... یہ محبت کا رنگ آپ اپنی محبوب ہستی کے لیے گفٹ کر سکتے ہیں۔"

زوردار تالیوں میں اس کے کمنٹ پر داد ملی تھی۔ وہ پنچ تھی۔ وہ بے دلی سے باری بجاتا چلا گیا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد تقریب کے اختتام پر شجاع اور ان کے ساتھ شامل افراد نے اس تقریب کے خر

AANCHAL.COM.PK

کام میں لی جانے والی جانفشانی کی مختصر کہانی سنائی تھی اور تقریب کے اختتام پر کھانے کا آغاز کر دیا تھا۔

شہریار آزادی ملتے ہی تیزی سے سافیہ کی طرف بڑھا جو کیبن میں رکھے ہوئے پودوں کی طرف جا رہی تھی مگر جب تک وہ وہاں تک پہنچتا، وہ داخلی دروازے کی طرف پہنچ چکی تھی۔ وہ سومنہ کے پاس جا کر رک گیا تھا۔

"کیا؟ واصفہ کھانا کھائے بغیر کیوں چلی گئیں؟"

سومنہ نے مڑ کر اسے دیکھا پھر نرمی سے بولی۔ "وہ صرف دو گھنٹے کی چھٹی لے کر یہاں آئی تھیں، آج غالباً ان کی ڈیوٹی ہے اس لیے۔"

شہریار مایوس ہو گیا تھا۔ سالار عبدالرحمٰن اور جازل فیملی سیکشن میں چلے گئے تھے۔ پس نوشین اور عمران کے ساتھ کئی گروہ لوگوں کے شوٹ لے رہے تھے۔ چینل کے کیمرہ مین ان کے فیملی کا فوٹو شہریار کے ساتھ لے کر ویڈیو سے شوٹ کر رہے تھے۔ تقریب ہر سال کی طرح بہترین رہی تھی۔ سب نے تقریب کا خاص طور پر مزا لیا تھا۔ لوگوں نے اس بار کی تقریب کی خوبی میں شہریار کو بھی شامل کیا تھا۔ کئی لوگوں نے ان سے بات کی اور کافی تعریف کی۔ تقریب اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ مہمان جا چکے تھے۔ صرف شہریار بچا تھا اور اس نے پارٹی ختم ہونے کے لیے رک لیا تھا۔ وہ ان کے پاس بیٹھا تھا۔

"ہاں بھئی کیسے کہاں غائب ہو گئے آپ لوگ؟"

"سر میرے خیال میں آپ ان رہنے دیجئے۔ آج آپ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔"

اس نے دوستی کی بات پہنچی میں سر ہلایا تھا۔ "ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ بتائیے کہاں غائب ہو گئے؟"

سب ہی ہوٹل کے کام کرنے کی تعریف شروع ہو گیا، یہاں تک کہ اس نے ٹیلی ویژن کا نام لیا تھا۔

"سر وہ بہت مہنگا ہوٹل ہے اور ہم پورے پانچ افراد ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟" اس نے سومنہ کے احتجاج کو رد کر دیا اور سب کو بس میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر ہوٹل پہنچ کر ان کی اپنی مرضی سے آرڈر دیا۔ سب کھانے میں مگن تھے، جب چائے کا آرڈر دے دیا تھا۔

"سر مجھے لگتا ہے آپ کا شاعری کا شوق بہت اچھا ہے۔ پلیز کچھ سنائیے ناں۔"

"ارے بگلا تھک گیا ہے اسٹیج پہ شعر پڑھ پڑھ کر، اب ہمت نہیں ہے۔ پلیز ویجر کیجیے۔"

شاروں نے فوراً اسے ٹوکا تھا۔ "پھر کہاں مسٹر! پھر کہاں موقع ملے گا؟ ہماری مصروفیات اور آپ کی مصروفیات اجازت کہاں دیں گی کہ اس طرح کی بے تکلف محفل سجا سکیں؟ کل تو ویسے ہی رعید الرحمٰن نے بھیجی ہوئی ڈش کی ہے یہاں ماں سے لیے ابھی۔ ہمارے پاس ویڈیو گھنٹہ ہے۔ ابھی تو صرف ساڑھے دس ہوئے ہیں سر!"

وہ مسکرانے لگا تھا۔ پھر ابھی وہ جم رہا ابھی نہیں تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا تھا۔

"پلیز مسٹر! محفل سے یوں ہی اٹھ کر مت جائیے گا، محفل کا مزہ خراب ہوگا۔"

اس نے انعم کو دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ "لوگ ہماری وجہ سے یونہی اچانک اٹھ جاتے ہیں، پہلا اور آخری محفل کے مزے کی بات کرتی ہیں۔"

موموند کی جواب سے جہانگیر کی آنکھیں تب خوشی سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ موموند میں جا بیٹھا کیا کہ کال ریسیو کر رہا تھا۔

"کہاں ہے؟" سوال کیا گیا۔

"وزن......" اس نے عاطف کے سوال کا وہی مختصر جواب دیا تھا کہ سب نے اسے حیرت سے دیکھا تھا وہ رو رہا تھا۔ پھر اس کی آنکھیں اطراف میں پھیلنے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گم بیٹھا رہا تھا۔

"ہم ہیں آوارہ سو بہ سو لوگو!
جیسے جنگل میں رنگ و بو لوگو!
ساعت چند کے مسافر سے
کوئی دم اور گفتگو لوگو!
تجھے تمہاری طرح کبھی ہم بھی

AANCHAL.COM.PK

رنگ بہجت کی آرزو کو!

قربِ عاشقی سراجِ دل

مگر تمہارے ہی غم کے کھولو کو!

دلِ مسرت و آرزو کرتے

جانے کس شے کی آرزو ہو گا

تاب ندی نہ جستجو کرتے

جانے کس کس کی جستجو ہو گا

کوئی منزل نہیں روانہ ہیں

ہم مسافر ہیں بے ٹھکانہ ہیں

ہم مسافر ہیں......" اس نے آخری مصرعہ دوبارہ پڑھا پھر آنکھیں کھولیں تو حیران رہ گیا۔ سامنے کی کرسی پر جہاں عمارہ بیٹھی تھی وہاں عاطف بیٹھا تھا اور اس نے اس کی یہ نظم بہت آہستگی سے موبائل میں ریکارڈ کر لی تھی۔

"تم یہاں؟...... میں تو سمجھا......" اسے جیسے تحمل کیا اور وہ مسکرا کر بولا۔

"سالار بھائی سے پتہ کیا تھا انہوں نے اس نے بتایا مگر تم کو بتانا بھی نہیں بتائی تھی۔ سو میں یہاں آگیا تو تمہیں کال کر کے تم پوچھا حیرت انگیز طور پہ میں دشمن کے سامنے ہی تھا اس لئے تمہاری نظم سننے کا شرف حاصل کر سکا۔"

سب مسکرانے لگے۔ شمع یار خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ اس کی آمد غیر متوقع نہیں تھی اب بے چینی سی تھی۔

AANCHAL.COM.PK

"ہم اپنے کیا مجبور ہیں؟ مجھے پتہ ہے وہ ایک نظم سے بغیر سے منہ کے چھپائے ابھی نہیں چھوڑنے والے ہوں گے کیونکہ وہ ابھی نظم سنا۔" اسے کہہ دے کر وہ گرلز کی طرف مڑا اور بولا۔

"آپ کا پاس بہت اچھا شاعر بھی ہے۔ آپ کو پتہ ہے نہیں ناں؟ لیکن شہریار عبداللہ جن پوری یونیورسٹی کے رعب والا ہوا کہ۔ نے تھے اور شاعری نصابی کتابوں سے بھی زیادہ ضروری سبجیکٹ۔ وہ لڑکی تھی ان کا۔"

"کیوں سر! کیا سر حافظ ٹھیک کہہ رہے ہیں؟"

وہ جھینپے ہوئے انداز میں ہنسنے لگا اور اب کی بار رابیلہ نے فرمائش کی تھی۔

"ارے نہیں بھئی مجھے اس وقت کچھ یاد نہیں آ رہا۔" اس نے جان بچائی اور وہ مسکرا دیا۔

"سر! اس دن آپ ایک نظم گنگنا رہے تھے وہی سنا دیجئے ناں، وہی نظم 'اے عمر رواں آ پاس میرے'"

"آپ نے مجھے یہ نظم کب گنگناتے ہوئے سنا مس روز؟" اسے حیرت ہوئی اور روز مزے سے دیکھ کر رہ گئی۔

"سر! اس دن آپ کچھ دیر سے دفتر آئے تھے۔ شاید کوئی فائل بھول گئے تھے آپ اور کچھ ڈھونڈتے ہوئے آپ یہی نظم گنگنا رہے تھے۔ میں اس وقت دفتر سے اٹھ کر جا رہی تھی۔ پھر بھی آپ کی آواز سے چونک کر کمرے کا دروازہ کھول کر میں نے دیکھا تھا۔ آپ شاید ہی پتا چلا ہو۔ لیکن وہ آپ ہی تھے۔ سر پلیز! آپ کی آواز اس نظم میں بہت خوبصورت لگ رہی ہے۔ سنا دیجئے ناں سر!"

شہریار نے طرح سے جس تمنا تھا اور سب نے بھی روز کی حمایت کی۔ وہ ٹیوٹی سب سے نظم سنانے بیٹھ گئی۔ حافظ نے ایک بار پھر سے ریکارڈنگ کا آپشن آن کر دیا تھا۔

اے عمر رواں

آ پاس میرے

اک راز کی بات بتانی ہے

اک خواب سنانا ہے تجھ کو

اک درد کی الجھن جو دل میں ہے

اک رنگ دکھانا ہے مجھ کو
اے عمرِ رواں آہستہ چل میرے
یہ عمر خوشی کی خاموشی
یہ نیند کی جھپکی سہمی سی
اک خوف سا ذہن و دل پہ ہے
تنہائی مری پیچھے سے ہے
اے عمرِ رواں آہستہ چل میرے
تجھ سے تو یہ کہنا ہے مجھے
رفتار کو اپنی دھیما کر
اک شخص سے ملنا ہے مجھ کو
ملنے کی گھڑی جو ٹھہری ہے
وہ چار قدم پہ اب کے ہیں
اے عمرِ رواں آہستہ چل میرے"

وہ کہتے کہتے تھمی اور عاشر بیگ نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"واہ واہ بھئی! آپ نے تو جی کھول کر گایا ہے... [illegible]... آپ بھی شامل ہو گئیں اسے داد دینے کے لیے۔"

"میں نے تو صرف ایک فرمائش کی تھی۔" وہ منہ پھلانے لگی تو شہریار نے جواباً اسے گھورا۔

"عاطف کے بچے اپنوں کو ستا مت، اچھا بھلا موڈ برباد مت کر۔"

سب کے چہرے ساحل کے کنارے سے نہر سے چمکنے لگے۔ شہریار نے کھانے کے بعد سب کو آئس کریم کھلائی تھی۔ پھر وہ ان سب کو لے کر نکل گئے تو وہ گئی تھی اور وہ عاطف کے سامنے اکیلا کھڑا رہ گیا تھا۔

عاطف نے سگریٹ سلگائی تھی اور اس نے اس کے پاکٹ سے پیکٹ نکال کر اپنے لیے بھی سگریٹ سلگائی تھی۔

"تیرے تو کیا کہنا، آفرین، نیا موبائل بھی چھوڑ دیا ہے، کسی سے بات کیا ہے۔"

"ہاں ذہنی طور پر تھکا ہوا ایک دو گھر۔ بہت پیچھے کو رہ گیا۔ سب لیپ ٹاپ پاس رکھا ہے۔ تو اس کی قوت بہت کی۔"

عاطف نے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے اسے دیکھا پھر آہستگی سے بولا۔ "تو شہ کیا؟ ... ماموں ... کو بیٹ کر چکا ہے۔"

"ہاں، وہ اب محفوظ ہاتھوں میں ہے۔" محمد خیر کو شہریار مسکرا کر بولا۔ "مجھے اس کے محفوظ ہونے والی اطمینان سے چھوٹ جانے کا یقین نہ ہوتا تو زندگی کا مزہ سے انجوائے کر سکتا تھا؟ ہر ہفتے میں دو دن اس کے لیے اس سے ملنے جاتا ہوں۔ دراصل وہ زوار حسن شاہ کے مخالف والے کے پاس اٹھا لی گئی ہے۔ ماموں کے ذریعے میں نے اسے ... کے باہر سے اس وقت اٹھوا لیا تھا، جب وہ زوار حسن شاہ کے خاص کارندے کے حکم پر اس کے لیے کلب میں رولی لے کر گئی تھی۔ ... زوار حسن شاہ کا منہ بند ... اور بتا دیا ... ان کی ... تو سب بکی۔ سو زوار حسن نے اسے کچھ ... سے بچی تھی ... وہ بی بی کی اس کنیز پر جس طرح جا پہنچا زور و کیا اسکا تھا مگر ...... مگر وہ بھی جانتا تھا اس نے ... ماموں نے بہت اچھی طرح اس کی کٹائی کی ہوئی تھی۔ شاید اب دوبارہ پھر بول نہ سکے گا۔ مگر مجھے اس کی اس تکلیف کے سبب بڑا افسوس نہیں ہے۔ وہ بھی یہ بڑی ... کیا تھا۔"

اس کا لہجہ اتنا سفاک تھا کہ عاطف کانپ گیا تھا۔

"شہریار تم اتنے سفاک تو نہیں تھے۔"

"نہیں تھا مگر ... کے ساتھ انہوں نے جو کچھ کیا ہے اس کے ساتھ جتنا بھی برا ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ تم نے نہیں دیکھا عاطف! اسے میں نے دیکھا تھا ...... وہ ... کی رات کبھی نہیں رہی

ہے اور جب پہلی بار میرے سینے سے لگ کر روئی تھی تو مجھے لگا تھا وہ میں کے... کب سے آسمان بھی رو پڑا ہوگا عاطف! میں جانتا ہوں وہ کسی کو نہیں چھوڑوں گا سب کا حساب برابر ہوگا۔"

وہ کہتے کہتے تھما تبھی اس کے موبائل پر عدیل بھائی کی آواز سنائی دی۔ وہ گھبرائے ہوئے تھے۔ "شہریار! ذکی سے نکلتے ہوئے شافعہ بیگم نے قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ وہ بچ تو گئی ہے مگر کاری ضرب سے تکلیف بہت زیادہ نہیں لیکن ضرور ہے کہ اسے ہسپتال میں کافی دن رہنا پڑے گا۔"

"آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟ وہ کس ہسپتال میں ہے؟"

"سٹی ہسپتال میں... میں وہیں سے بول رہا ہوں تم آ رہے ہو نا؟"

اس نے عاطف کو سٹی ہسپتال چلنے کا کہا لیکن وہ ابھی ٹرن بھی نہیں لے سکا تھا کہ اس کا موبائل پھر سے بجنے لگا تھا۔

"ہیلو...... کون......؟"

"میں امین بول رہا ہوں سرکار! شاہ نواز کی حویلی سے۔"

"ہاں امین بولو کیا بات ہے؟"

"صاحب! غضب ہوگیا ہے جی۔ آپ نے جس لڑکی کو یہاں پناہ دی تھی وہ لڑکی خطرے میں ہے جی۔ زوار حسن شاہ اور شاہ نواز کے بیٹے امیر فیاض کے درمیان اس لڑکی والا معاملہ طے ہو رہا ہے جی۔ زوار حسن شاہ امیر فیاض کو ایک جوڑا [illegible] کی دو زمین دے رہے ہیں یہ وہی زمین ہے جس کی وجہ سے دونوں خاندانوں میں سالوں سے تنازعہ چلا آ رہا تھا۔ میں نے یہ خبر اس لڑکی کو بچانے کی وجہ سے دی ہے صاحب! اگر آ سکو تو آجاؤ۔"

شہریار نے عاطف کو گاڑی روکنے کا کہا۔ پھر اسے اس نے دوسری سیٹ پر جانے کا کہا اور ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھال لی تھی۔

"شہریار! اس طرح خاموش کیوں ہو؟ حماقت ہے۔ تمہیں عدیل بھائی کی مدد بھی پڑے گی۔" عاطف نے سمجھانے کی کوشش کی اور اس نے موبائل پر ماموں سے رابطہ کرنے کی کوشش شروع کردی۔

"میں اس وقت کشمکش میں ہوں۔ یہاں سے نکلنا بہت مشکل ہے...... آخر تمہیں امیر حسن کیا [illegible] ہے؟" شہریار نے تفصیل بتانے لگا اور اس نے تحمل سے پوچھا۔

ANCHAL.COM.PK

"کہاں جا رہے ہو تم؟"

"ستار خان کی حویلی۔" اس نے بتایا۔ وہ میرا اور مامون کی شوخ آواز تھی۔

"مت بکو تو بیہاں۔ میں جلد ہی لے لیتا ہوں۔ کیونکہ آج کل ہم اس گاؤں میں رہ رہے ہیں۔"

مگر شہریار نے ارادہ نہیں بدلا تھا۔ اس کی گاڑی اپنی سمت کی طرف اُڑی جا رہی تھی کہ اچانک بے ہنگم شور کے ساتھ بند ہو گئی۔

"یہ کیا تماشا ہو گیا..... لگتا ہے انجن جام ہو گیا ہے۔" انجن میں کی ڈال کر پھر سے سٹارٹ کرنے کی کوشش کی اور عاطف نے پیچھے سے سر نکالا۔

"مت کر بخت گاڑی سٹارٹ نہیں ہو گی۔"

"کیوں اس نے انجن سے تمہیں کہہ دیا ہے؟" شہریار نے کوفت سے دیکھا اور دوبارہ سٹارٹ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"گاڑی بلٹ پروف ہے۔ صرف شہر کی حد تک بات سنتی تھی۔ اس لیے شہری حدود ختم ہوتے ہی ٹریکر سسٹم کے تحت خود بخود بند ہو گئی ہے۔" عاطف کہہ کر دوسری طرف کی بات سن کر اپنی ایمرجنسی کیبنٹ کرنے لگا۔ پانچ منٹ بعد گاڑی دوبارہ سٹارٹ ہو چکی تھی۔

"گاڑی ہمیشہ اپنی ہونی چاہیے۔" عاطف اس کے غصے کو خوشی سے دیکھتا چلا گیا۔ شہریار اس وقت گاڑی [illegible] اپنے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی کی سب سے رنگین ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ 35 منٹ بعد حویلی پہنچے۔ مامون نے آتے ہی موبائل پر فون ملا کر [illegible] اندھیرے میں وہ سائے کی طرح لگ رہے تھے۔ عاطف نے متعلق خود کو شہریار کے ہم قدم پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ مامون کے کان میں [illegible] حویلی کی روشنی کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ دس منٹ بعد وہ اس کے قریب پہنچے تھے۔

"تم نے کیا پایا؟" اس نے پہلا سوال کیا۔

مامون نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔ "ہمارے دو آدمی [illegible] کی مہربانی سے حویلی میں گئے ہوئے ہیں لیکن ابھی تک کوئی انفارمیشن نہیں آیا ہے۔"

اس نے تفصیل دے کر [illegible] سے رابطہ کیا تھا [illegible] پر ان کی آواز سنائی دی۔ "مرزا زاور حسن شاہ نے لڑکی کو لے جانے کے بجائے کسی طرح سے بے ہوش کر دیا ہے۔ مرزا حسن بھی [illegible] طرح

سے دوچار ہے۔ جو بھی ہوا ہے، یہ امیر بخش کی نہیں، شاہ بخش کی ایما پر بھی ہوا ہے۔ بڑی کی اور مین ہماری کسٹڈی میں ہیں۔ لیکن سر! جوابی طاقت کے استعمال کے بغیر ہم باہر واپس نہیں آ سکتے۔ کیونکہ اندرون خانہ کسی کی حرکت کی سزا دیے جانے پر غالب امکان ہے کہ وہ ہمیں آسانی سے باہر نہیں نکلنے دیں گے۔ آپ کے حکم کا منتظر ہے۔"

ماموں تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گیا تھا اور اسی وقت اس کی فون کے بند ہونے کی بجائے آواز آئی۔ "سر! یہ مسٹر بخش آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ہم بڑے طریقے سے ٹریپ ہو گئے ہیں سر! یہ سب سوچی سمجھی اسکیم تھی جو زوار حسن شاہ نے ٹریپ کا بچھایا ہے۔"

ماموں نے سر ہلایا تھا۔ پھر وائرلیس پر مخاطب ہوا تھا۔

"مسٹر بخش! اگر آپ سمجھتے ہیں، آپ نے ہمیں ٹریپ کر لیا ہے تو یہ غلط ہے۔ بقول آپ کے، آپ آج کی اس کارروائی کو پولیس کے سامنے لائیں گے، مجھ پہ الزام لگائیں گے تو اسے جھٹلا دیا جائے گا، میں بھی ایک جاگیردار کا بیٹا ہوں۔ اپنے چھوٹے موٹے لوگوں کے میرے پاس بھی رہتے ہیں۔ ... میں آپ کے ہی گھر میں آپ ہی کو ٹریپ کر دوں تو کیسا لگے گا؟ آپ کے خلاف لڑکی کے اغوا کا پرچہ درج کروانا اور اس کی بازیابی بہت سے سوال اٹھا سکتی ہے۔ اور یہ بھی بازیابی لڑکی اس بری حالت میں ملے، پولیس آپ پر سوال اٹھا سکتا ہے۔ اگر آپ یہ معاملہ بھی دبا جائیں تو بھی زوار حسن شاہ کے گودام میں گندم کی بوریوں میں ڈرگس کی برآمدگی کا قضیہ بھی آپ پر تھوڑا میرے لیے مشکل نہیں۔ آپ تو جانتے ہیں... والے سیاہ و سفید میں بہت ماہر ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ بھی کم لگے تو گرین فائل کا حوالہ دے دینا بھی کافی ہونا چاہیے۔ آپ جانتے ہیں، میں دوستی دشمنی میں اسی وقت انوالو ہوتا ہوں، جب ہوم ورک مکمل کر لوں۔"

"ٹھیک ہے، یہ بڑی کی اور مین کی حفاظت تم تک پہنچا رہے ہیں۔ مگر یہ کوئی آخری ملاقات نہیں ہے۔ ابھی بے عزتی کا بدلہ لینا ہم پر قرض ہے۔"

ماموں مسکرایا تھا۔ پھر بولے بغیر اس نے وائرلیس آف کر دیا تھا۔ پھر وہ شہریار کی طرف مڑا تھا۔

"سر! عدیل بہت سخت جان ہیں۔ ان کی بازیابی سے پہلا آسان نہیں تھا۔ اس وقت بھی میں نے جو کیا اس کی وجہ صرف اندھیرے میں تیر چلانا تھا۔ ورنہ سر! مجھ کچھ گرین فائل میں کیا ہے، کیا نہیں، میں قطعی لاعلم ہوں۔" "ہاں، میں یہ دانی بات تک ٹھیک پہنچا تھا میں..." محمد عمر کو رکا، پھر مزید بولا۔ "شہریار کے بچے! اشتعال میں آ گیا ہوں میں۔ دوستی اور نوکری دونوں میں سے کسی کو چننا سکتا تھا اور میں نے دوستی کے حق میں ووٹ کاسٹ کیا ہے۔"

ماموں کی فوری ہے رکن شاہ نواز کے وعدے کے مطابق آ پہنچے تھے۔ حویلی سے آنے والے رکن نے ماموں کو جلیوٹ کیا تھا مگر بہت مدھم لہجے میں بولا تھا۔

"سر! اگر وہ چاہتے تو ماموں وڈا کی کوشش کر سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اس لئے مجھے لگتا ہے اس معاملے میں زمین کو بانٹنے میں بھی شاہ نواز کی کوئی چال ضرور تھی، جو فی الحال سمجھ نہیں آ رہی۔"

ماموں ابھی اس بات پر غور کر ہی رہا تھا کہ اس کے وائرلیس پر سگنل آنے لگا۔

"سر! ماسٹر زوار دم سے کس ہو گئے ہیں۔"

ماموں نے ایک نظر شہریار کی طرف دیکھا اور تیزی سے بولا۔ "عائشہ کو جتنی جلدی ہو شہر لے جا سکتے ہو لے جاؤ۔ ماموں ابا عائشہ کی حالت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

شہریار نے اثبات میں سر ہلایا اور تیزی سے بولا۔ "تمہارا کیا ہوگا؟"

ماموں نے شوخی سے کہا۔ "مبارک شہادت پر۔ مشکل ہونے سے مجھے اب کوئی نہیں روک سکتا۔ شہریار بھائی مجھے سیدھا جنت میں لے جائیں گے۔ پورے دس دن کی محنت خاک میں مل گئی ہے۔ زوار کے کس ہونے سے ہمیں الگ معاملے میں الجھا لو۔ نے کی یہ بھی کارروائی تھی۔ لیکن شہریار سوچ لے گا۔"

شہریار اس سے ہمدردی کا اظہار کرتا اپنی کار کی طرف بڑھا تھا۔ عاطف نے اس بار ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تھی اور کئی بار رفتار سے اڑتی جا رہی تھی۔

آدھی رات تھا، جو منہ پہلے جتنے سفر میں تھے گھنٹہ اس وقت اس سے بھی زیادہ، لیکن ڈرائیونگ سے آدھے گھنٹے میں طے ہوا تھا۔ قریب ترین ہاسپٹل دیگر ہاسپٹل تھا۔

شہریار عائشہ کو بازوؤں میں اٹھائے ہوئے ایمرجنسی روم تک پہنچا تھا۔ اسے فوراً اسٹریچر مل گیا تھا۔ عاطف نے ایمرجنسی کے لئے بھاگ دوڑ کی تھی مگر وہاں معاملات میں پولیس کی انوالومنٹ کی وجہ سے ڈاکٹرز نے کیس لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے فوری طور پر عدیل بھائی کو فون ملایا تھا۔ مختصر لفظوں میں ایمرجنسی کے بارے میں بتایا تھا۔ عدیل بھائی نے فون ڈاکٹر کو دیا، پھر ساری انہوں نے لینے کا عندیہ جا کر، وہ عائشہ کو ایمرجنسی روم میں لے گئے تھے۔

"عائشہ کی کنڈیشن بہت خراب لگ رہی تھی، عاطف! اور رک رک کر سانس لے رہی تھی کہ میرا دل رکنے لگا ہے۔ ٹھیک تو ہو جائے گی نا؟"

عاطف نے شہریار کی طرف دیکھا۔ وہ تھکن سے بالکل زرد ہو رہا تھا، پھر بھی اس کی سانس اٹکی ہوئی تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد ڈاکٹر شہریار کے قریب آئے تھے۔

"دماغ کے ساتھ بہت زیادہ ٹارچر کیا گیا ہے۔ شاید ڈرگز بھی زیادہ مقدار میں دی گئی تھیں۔ کیا یہ ڈرگ لیتی تھی؟"

"شاید مارنے کی کوشش کی گئی ہے۔" شہریار سکتے میں دوبارہ بولا۔ "کیا یہ بچ جائے گی ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر نے اس کی طرف دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔

"ہم جو کوشش کر سکتے تھے کر چکے ہیں۔ مگر ہوش آنے میں بہت عرصہ لگ سکتا ہے۔ یہ بھی اس صورت میں اگر اسے ہوش آ جائے تو۔"

شہریار نے بے چینی سے ڈاکٹر کو دیکھا، پھر اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

"سوری مسٹر شہریار! اس وقت وہ آئی سی یو میں ہیں۔ آپ چوبیس گھنٹے تک ان سے نہیں مل سکتے۔ پلیز آپ ویٹنگ روم میں جب تک آرام کر سکتے ہیں۔"

عاطف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، پھر اس کا ہاتھ تھاما تو فکر مند ہو گیا۔ "تمہیں تو بخار ہو رہا ہے۔"

"ہاں شاید بہت زیادہ بھاگ دوڑ کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہے۔"

عاطف نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور فکر مندی سے بولا۔ "تیرے چہرے پر تکلیف کیوں محسوس ہو رہی ہے؟ کہیں پھر سے درد تو نہیں ہو رہا؟"

شہریار نے کپکپاتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور مدھم لہجے میں بولا۔ "بے فکر رہ معمولی سی بات ہے۔ تھوڑا آرام کروں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تو ٹینشن مت لے۔"

وہ دھیمے قدموں سے چلتا ہوا ویٹنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ عاطف اس کے پیچھے لپکا تھا۔ "ہم ہسپتال میں کھڑے ہیں۔ اگر زیادہ محسوس کر رہے ہو تو میں ڈاکٹر سے کنسلٹ کر لیتا ہوں۔"

"کہہ رہا ہوں سب ٹھیک ہے۔" وہ صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ مگر اندرونی تکلیف اپنی جگہ بنانے دے رہی تھی۔ آج اس نے خود کو ضرورت سے زیادہ ہی تھکا لیا تھا۔ کل رات ڈرائیو کی تھی، جس کے اثرات ظاہر ہونے ہی تھے۔ صبح آٹھ بجے کا جاگا ہوا تھا اور اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

"یار عاطف!" کچھ دیر بعد اس نے دیکھتے ہوئے عاطف کو مخاطب کیا اور وہ چونک کر دوسرے صوفے سے اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔

"کیا ہوا؟ کوئی مسئلہ ہے؟"

اس نے ہونٹ بھینچ کر اثبات میں سر ہلایا تھا۔ "درد بڑھتا جا رہا ہے بابا...... کہیں سے پانی مل جاتا تو میں پی لیتا۔"

"پانی...... ابھی لایا۔" عاطف بجلی کی تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ پانچ منٹ بعد جب وہ کینٹین سے منرل واٹر کی بوتل خرید کر لایا اس وقت شہریار صوفے سے پشت ٹکائے ضبط کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ اس کا چہرہ تکلیف کی شدت سے پھیکا پڑ چکا تھا اور ہاسپٹل کی کولنگ کے باوجود پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔

"شہری...... شہریار!" عاطف نے اس کا شانہ ہلایا۔ شہریار نے خمار آلود آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس سے منرل واٹر کی بوتل لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر کراہ کے صوفے پر ڈھلک گیا۔

"شہریار...... ڈاکٹر!" عاطف پاگلوں کی طرح چیخا تھا۔

نرس کی مدد سے فوراً اسے ایمرجنسی روم کی طرف لے جایا جانے لگا تھا۔ عاطف اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا مگر ایمرجنسی روم کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔

دروازہ بند ہو گیا تھا اور عاطف باہر کھڑا بالکل بے بس ہونے لگا تھا۔ اسے اپنے پاس کسی کو بلانے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ وہ گم صم ہو کر سامنے کھڑا تھا جب شہریار کے موبائل کی بیپ اٹھی۔

"ہیلو!"

"ہیلو شہریار! تم کیسے ہو بچے؟" عدیل بھائی کی محبت میں ڈوبی آواز سنائی دی تو عاطف بلک بلک کر بول اٹھا۔

"عدیل بھائی...... میں عاطف۔ عدیل بھائی پلیز یہاں جلدی آ جائیں۔ شہریار کو یہاں اچانک پین اٹیک ہوا ہے۔ وہ ایمرجنسی روم میں ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو......" عدیل بھائی کی آواز کانپ گئی تھی۔ فون بند کرنے کے کچھ منٹ بعد وہ ان کے سامنے تھے۔

"ہوا کیا تھا؟ تم لوگ ہوٹل سے اتنی دور کیا کرنے آئے تھے؟"

عاطف انہیں تفصیل بتانے لگا۔ عدیل بھائی کے چہرے پر تفصیل سن کر تشویش پھیل گئی۔

"شاہ فیاض کی حویلی سے کسی کو اس طرح لے آنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ماموں اور میرے لئے اس کا ریکارڈ بنا بہت مشکل ثابت ہوگا۔" وہ کچھ سوچ کر سر جھٹک کر بولے۔ "دیکھا جائے گا سب۔ یہ بتاؤ اس کی طبیعت کیوں خراب ہوئی؟"

AANCHAL.COM.PK

عاطف نے بے تحاشا شدت کو اس کا سبب بتایا اور عدیل بھائی اس کے ساتھ ایمرجنسی روم کے باہر قطار سے لگی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ اس وقت وہ گھبرائے نہیں ہو رہے تھے، جب اچانک ایمرجنسی روم کا دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر راشد نے نکل کر یونیفارم میں عدیل نبیل اجنبی کو دیکھا مگر ساری توجہ عاطف بیگ کی طرف کر کے پوچھا۔

"آپ مسٹر عاطف! مسز شہریار کے ساتھ ہیں؟"

"جی میرا نام ہے، وہ اب کیسا ہے؟"

"شاید بی پی کی شدت کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوئے تھے، اب تو ان کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ ویسے مسٹر عاطف! آپ خوش قسمت ہیں جو وقت سے بہت پہلے یہاں موجود تھے۔ ورنہ بی پی ہائی ہونے کے سبب ہارٹ اٹیک بھی ہو سکتا تھا۔ ویسے مسز شہریار کو یہ تکلیف کب سے ہے؟"

"گزشتہ سات سال سے وہ انجائنا پیشنٹ ہے سر!"

"صرف انجائنا پیشنٹ...... مگر مسٹر عاطف! ان کے ٹیسٹ سے جو رپورٹس نکلی ہیں وہ خوفناک لگ رہی ہیں۔"

عدیل بھائی کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ "کیا...... کیا پرابلم ہے؟"

ڈاکٹر راشد نے عاطف بیگ سے توجہ ہٹا کر ان کی طرف دیکھا، بیچارگی سے بولا۔ "وہ انجائنا کے علاوہ کنڈیشن کا شکار ہیں۔ ان کے ایمرجنسی میں لئے گئے ٹیسٹ بتاتے ہیں انہیں ہائی بی پی بھی ہے جبکہ ہیں اور ان کی وہ لوگ کی بائی پاس سرجری... ان کے ڈاکٹر نے بائی پاس کا مشورہ بھی دیا ہوگا۔"

عاطف کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ عدیل بھائی بھی اندر سے ہل کر رہ گئے تھے۔

"ٹینشن مت لیجئے عدیل بھائی! آپ کے لئے بہت مشکل ہو جائے گی۔" عدیل بھائی کے انداز کا کیا گیا تھر ہوا اور وہ کمرے سے چلے گئے تھے۔

"پاگل...... یہ لڑکا بھی پتہ نہیں اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ کتنی بہت بری ہو گئی ہے کیا؟...... وہاں سے تب ہی آپ چلے گئے تھے۔ عاطف بیگ گئے کی کیفیت میں ان کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

AANCHAL.COM.PK

"ابھی ہوں زیادہ بہت ختم تو نہیں ہو رہی، پھر ملاتا رہنا ایسے ہی قیامت تک آواز گونجے گا۔" اس کے ہاتھ میں اس وقت بھی اس کا موبائل اور اس کا والٹ تھا۔

"اسے کچھ نہیں ہوگا ناں عدیل بھائی؟" عاطف کی آواز لرزنے لگی تھی۔

عدیل بھائی خود ضبط کے باوجود اپنی نمی نہیں چھپا سکے تھے۔ انہوں نے عاطف کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر دو گھنٹے بعد وہ روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا جب انہوں نے اس سے جڑ کر کہا تھا۔

"بہت برے ہو شہریار اسم۔ ڈرا کیسا سکتے تھے۔ تکلیف میں کیا مزہ آتا ہے تمہیں؟"

اس نے جھکتے ہوئے انداز میں انہیں دیکھا۔ پھر بہت مدھم لہجے میں بولا۔ "آپ اتنے کیسے ہیں؟ سب آسان رہتا ہے اب۔ دیکھئے نا آپ اور عاطف نے ذرا دیر میں خود کو ہر دو ماں کے کس حال کو پہنچا لیا ہے۔ فوت ورثہ ہے بھیا! تم روتی ماہیں ایک تماشا ہو رہی۔"

"تم نہیں سدھرو گے شہریار اسم، کبھی نہیں سدھرو گے۔" عدیل بھائی کی آواز بھرا گئی تھی۔

اس نے دایاں ہاتھ سے ان کے رخسار کو چھوا تھا پھر مدھم بولا تھا۔ "اب سدھرنے کے لئے کچھ باقی نہیں ہے۔ برے بھیا! اس لئے محنت اس نے کا خیال ہی چھوڑ دیا۔ ویسے میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔"

"ہاں بیگ رہا ہے، واقعی تو بالکل ٹھیک ہے۔" عاطف نے اسے لگی ڈرپس کی طرف طنز سے اشارہ کرتے ہوئے جل کر کہا اور وہ مسکرا سے ہنسنے لگا۔

"اچھا! ابھی ٹھیک نہیں ہوں، دو چار گھنٹے میں ٹھیک ہو جاؤں گا ناں۔ بتائیں امی کی طبیعت کیسی ہے؟"

عاطف بیگ نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اس کی پریشانی میں ماں کو تو بالکل ہی بھول گیا تھا۔

"میں ابھی پتا کر کے آتا ہوں۔" عاطف بیگ تیزی سے باہر کی طرف بڑھ گیا اور شہریار عدیل عبدالرحمٰن کے چہرے پر پھیلے ہوئے غصے اور خفگی کے ملے جلے تاثرات سے ہراساں ہوتا رہا۔

"مجھے لگتا ہے اس وقت تمہیں صرف ماما ٹھیک کر سکتی ہیں۔" عدیل بھائی نے موبائل نکالا۔

"پلیز عدیل بھائی!" اس نے تیزی سے ڈرپس والے ہاتھ سے انہیں روکنے کی کوشش کی اور تکلیف سے سوئی کے ملنے سے تڑپ اٹھا۔

"شہریار! میں تمہارا کیا کروں بچے!" عدیل بھائی نے موبائل ریک پر رکھ کر ایمرجنسی کا بٹن دبایا۔ نرس تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ ڈرپ کی سوئی نکال کر اس نے خون صاف کیا۔ پھر سے

AANCHAL.COM.PK

ڈھونڈ کر اس نے ڈرپ لگا دی تھی۔

"پلیز! احتیاط کیجیے مسٹر شہریار! آپ ذہین، سلجھے انسان ہیں۔"

عدیل بھائی کرسی پر بیٹھے تھے مگر مکمل اس سے خفا تھے۔

"شافعہ کیسی ہے بھائی؟"

عدیل بھائی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس نے بھولے سے انہیں پکارا۔ "ناراض ہیں آپ؟"

"کیا اب بھی بتانا پڑے گا کہ شہریار صاحب! میں آپ سے سخت ناراض ہوں؟" وہ جلبلا اٹھے۔

اس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔ "پلیز! ناراض مت ہوا کریں بڑے بھیا! جتنا وقت محبت میں کٹ جائے وہی اچھا ہے۔" اس نے بمشکل آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ ڈرپ میں ملی دوائیں اسے ایک گہری نیند کی طرف لے جا رہی تھیں۔

"عدیل بھائی! آپ بہت اچھے ہیں۔"

عدیل بھائی جو اس کی طرف سے منہ موڑ کر بیٹھے تھے، اس کے لہجے پر تڑپ کر مڑے تھے مگر اس کی آنکھیں اس وقت تک بند ہو چکی تھیں۔

"شہریار..... شہریار....." انہوں نے گھبرا کر اس کا شانہ ہلایا۔ پھر گھبرا کر وہ باہر نکلے۔ نرس نے ان کی کیفیت بھانپ کر اس کا وزٹ کیا، پھر مسکرا کر بولی۔

"سب کچھ ٹھیک ہے مسٹر عدیل! صرف دواؤں کی وجہ سے غنودگی میں چلے گئے ہیں اور بس۔"

عدیل عبدالرحمن وہیں پتھر بنے بیٹھے تھے۔ اس کے دو سارے دن تھے جن کو جن کر ان کے اندر ایک خطرے کا الارم بجا تھا۔ ایک کے بعد ایک بادل ہٹے جا رہے تھے۔ ان کا دل اس کے لیے محبت سے بھر گیا تھا مگر ساتھ ساتھ خفگی کا تاثر بھی اتنا گہرا تھا کہ وہ اسے آسانی سے معاف کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔

ANCHAL.COM.PK

عاطف، عاشر کی پوری رپورٹ لے کر آ چکا تھا اور ڈرائنگ روم میں تھے عدیل بھائی کچھ دیر کے لیے اسے بھی تسلی دے گئے تھے۔ مگر اب مکمل ان کی توجہ ان کی مریم جان کی طرف تھی۔

صبح کی سپیدی نمودار ہو رہی تھی، سانسیں بحال ہو رہی تھیں جب صبح آٹھ بجے اس نے دوبارہ اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔

عدیل عبدالرحمٰن نے کوئی ردعمل نہیں دیا تھا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھے تھے، جب عاطف نے دوبارہ پوچھا تھا۔

”ناؤ فیلنگ بیٹر؟“

شہوار نے مسکرا کر سر ہلایا تھا، وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں بابا۔“ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ عدیل عبدالرحمٰن نے پھر بھی ردعمل نہیں دیا تھا مگر خفا آنکھیں اس پر اس طرح مرکوز نہیں کر وہ پھر سمٹ کر تکیے پر لیٹ گیا تھا۔

”کیا پاپا بہت ناراض ہو گئے ہیں عدیل بھائی؟“ اس کی آواز میں اب بھی نقاہت تھی۔ عدیل عبدالرحمٰن کو یقین نہیں آ رہا تھا وہ کس طرح کا ردعمل دیں۔

”ہاں جان بوجھ کر اسٹنٹ کے بارے میں میں نے آج تک کسی کو نہیں منایا ہے۔“

”پھر کیا میں اس خوشی میں جشن منا لوں کہ بالآخر آپ نے مجھے بخشا ہے؟“

”بیٹے بھیا!“ اس نے شرارت سے انہیں دیکھا۔ وہ اب تک کی خفگی کو زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھ سکے تھے۔ عدیل عبدالرحمٰن واقعی بہت برہم تھے۔ جب تک اس کی طبیعت خراب تھی ان کی جان آنکھوں میں اٹکی ہوئی تھی اور اب وہ ٹھیک تھا تو پھر سے خفگی کی شدت بڑھ گئی تھی۔

”عاطف! تم یہاں ہو؟ مجھے تم سے کچھ کام ہے۔“ وہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اس بار عاطف نے بھی انہیں تعجب سے دیکھا تھا۔

”عدیل بھائی!“ وہ اب کے بستر سے بہت تیزی سے اٹھا تھا۔

عدیل عبدالرحمٰن دروازے سے لوٹ آئے تھے۔ ”کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو؟“ انہوں نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کر روک لیا تھا۔ اس کی کمزوری سے درد کی وجہ سے پھر خون رک گیا تھا۔ اس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا۔ عدیل بھائی کو بے قرار کرتا وہ پھر سے گرا تھا۔ انہوں نے اسے کندھوں سے تھام کر گلے لگا لیا تھا۔

AANCHAL.COM.PK

"تم سے زیادہ ضدی اور خود سر انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

وہ ان کے کندھے سے آنکھیں رگڑنے لگا۔ "پھر بڑی خان صاحب چھوٹی بی بی آپ کو مجھے سراہنا چاہیے نہ کہ غلطی کیا کر دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک ہوئی تو میں تمہیں بتاتا، غلطی کس قدر برا کام ہے۔"

"شکر ہے میری طبیعت خراب ہے ورنہ آپ ...... آپ بہت ظالم ہو بھائی!"

"میں ظالم ہوں یا تم ظالم ہو؟" اب کی بار انہوں نے لحاظ کیے بغیر اس کے بال مٹھی میں بھینچ لیے تھے۔ اس نے سسکاری بھری تھی اور عاطف بے قراری سے آگے ہو گیا تھا۔

"درد سے بچا لیں اسے درد ہو رہا ہے بھائی۔ پلیز اس کے بال چھوڑ دیجیے۔"

شہریار نے چونک کر اس کے چہرے کے بھیگے پن اور اداسی کو حد درجہ گہری نظر سے نوٹ کیا تھا جب عدیل بھائی نے اس کا کندھا تھپکا تھا۔

"شام کو واپس آؤں گا تم آرام کرو۔"

"آپ گھر میں کیا کہیں گے؟"

"تم بتاؤ کیا کہنا چاہیے؟" عدیل عبدالرحمن نے الٹا اس سے ہی پوچھ لیا تو وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "کہہ دیجیے گا آپ ... بس یہ کہہ دیجیے گا اچانک عاطف کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اس لیے جلدی سے نکلنے میں ... جلدی میں پتہ نہیں چلا تھا ہوں۔"

"دیکھ رہے ہو عاطف ابا کو کتنا سوچنا پڑ رہا ہے اپنی غلطی کو چھپانے کے لیے تمہارے استعمال سے بھی دریغ نہیں کر رہا۔"

"... نے دیکھا ناں عدیل بھائی ابا سے اپنا سارے ہر طرح کا اختیار ہے میری زندگی پر۔"

اب کی بار شہریار نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ "یہ جنون ہے ہاں ... مجھے تو لگ رہا ہے جیسے میرے پاس وقت ختم ہو گیا ہے اور تو بھی ہو کے دوست کی طرح میری ہر خواہش پوری صدقہ کر کے مرتے مرتے بھی خوش و خرم رکھنا چاہتا ہے مجھے۔ ... محبت میں صرف محبت ہوتی ہے ... محبت میں رحم دلی اور ترس کھانے والی حالت، مجھے نفرت ہے اس

حالت ہے۔"

عدیل عبدالرحمٰن نے عاطف کو دیکھا تھا۔ عاطف نے شہریار کو گھورا وہ کوئی کمنٹ دیے بغیر باہر نکل گئے تھے۔ شہریار کو لگ رہا تھا وہ ان سے ابھی تک ناراض ہی لگتے ہیں۔

عدیل عبدالرحمٰن کے باہر نکلتے ہی شہریار نے عاطف کی طرف دیکھا پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "ثمرہ کے بارے میں ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟"

عاطف ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا پھر نرمی سے بولا۔ "ڈاکٹرز کے خیال میں اس کی ریکوری بہت بہتر ہے۔ لیکن زیادہ دیر تک وہ ان کی ذہنی تکلیف کی وجہ سے بےقرار ہے اور بار بار مسلسل تمہارا بھی پوچھ رہی ہے۔"

شہریار نے پُرخیال انداز میں ان کو دیکھا پھر نرمی سے بولا۔ "چلو، میں پہلے سے بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ میرے خیال میں ثمرہ سے مل لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

عاطف نے چہرے پہ چھائی فکر کو ایک لمحے کے لیے بھرپور رہنے دیا پھر ہٹتے لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے لیکن ابھی تمہیں سخت آرام کی ضرورت ہے۔ میں ثمرہ سے تمہاری مصروفیت کی بابت کوئی بہانہ کر دوں گا۔"

"پاگل ہو گئے ہو، مصروفیت کا بہانہ سن کر وہ میرے بارے میں کتنی غلط رائے رکھے گی اور پھر تم بھی تو دیکھو اس وقت اسے ہماری کی مورل سپورٹ کی کتنی ضرورت ہے۔ اگر وہ دل ٹوٹ گیا تو ساری زندگی کے لیے اس کے اندر ایک گرہ رہ جائے گی۔" انہوں نے بستر سے پیر لٹکائے اور عین اسی وقت ڈاکٹر اور نرس اندر داخل ہوئے۔

"مسٹر شہریار! یہ کیا؟.......آپ کو ابھی آرام کی ضرورت ہے۔"

"مجھے ڈاکٹر، وہ میری مسز ہیں، میرے آرام سے زیادہ میری ضرورت ہے اس وقت۔"

"اوہ! اچھا.......تو وہ آپ کی مسز ہیں؟"

"جی ایسا ہی سمجھ لیجیے۔" کہہ کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا جیسے ان کے کمنٹ کا انتظار کر رہا ہو۔ ڈاکٹر نے نرس کے ہاتھ سے انجکشن لے کے ان کی شرٹ کی آستین کو فولڈ کیا۔ ڈاکٹر نے انجکشن کے بعد دست بعد بخیر سے ملو کا ڈاکٹر کی بلڈ پریشر لیا پھر نرمی سے بولا۔

"اوکے مسٹر شہریار! آپ کے پاس ہماری کی سہولت ہے کہ آپ کو جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔ پلیز! کسی بھی قسم کا سٹرین مت لیجیے گا ورنہ آپ کی طبیعت بگڑ سکتی ہے۔"

AANCHAL.COM.PK

شہریار نے سر ہلاتے ہوئے شرٹ کے کف بند کیے اور بیڈ پر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے شوز کی طرف ہاتھ بڑھایا تو جانے کیسے عاطف آگے بڑھ آیا تھا۔

"رہنے دو، میں پہنا دیتا ہوں۔" ڈاکٹر اس کا جھکنا اس وقت سود مند نہیں ہے یہاں؟"

ڈاکٹر اس کے لہجے پر مسکرا اٹھے پھر بولے۔ "ڈاکٹری نقطہ نظر سے اس وقت ان کا ہلنا بھی سود مند نہیں ہے مسٹر عاطف! لیکن اگر باپ اپنے بیٹے کا احسان اتارنا چاہتے ہیں تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔"

ڈاکٹر کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مگر عاطف نے اس سلسلے میں ایک تبدیلی کی۔ وہ کرسی پر بیٹھا تھا اور عاطف بیگ اسے Socks پہنا رہا تھا۔ شہریار کی آنکھوں کے کناروں پر بے طرح نمی اتر رہی تھی۔ "عاطف کے بچے! اس وقت تو بالکل فرمانبردار بیٹوں کی طرح لگ رہا ہے۔ میں کیا کروں گا تیرا؟"

"کیا مطلب، کیا کریں گے کیا ارادہ ہے تیرا؟" اس نے شوز پہنانے کے بعد سر اٹھا کر دیکھا مگر شہریار کی ہنسی یکدم اندر ہی گھٹ گئی تھی۔ ایک ان کہی نمی جو ہونٹوں پر آ رکی تھی۔ آنکھوں سے بدل رہی تھی۔ وہ دوسرا شوز بھی پہنا چکا تھا بے جان کہ ان کی آنکھوں کی ان کہی سے متاثر ہو گیا تھا۔

شہریار نے کچھ نہیں کہا تھا صرف ہولے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا پھر بہت مدھم لہجے میں بولا تھا۔

"پتہ نہیں، میں تجھے پھر کبھی ملوں یا نہ ملوں، لیکن مجھے تیری محبت بہت یاد آئے گی۔ بہت مس کیا کروں گا میں تجھے۔"

"کیوں نہیں، میں کہیں نہیں جا رہا تجھے چھوڑ کر۔ مس کرنے کا ارادہ شروع ہی سے ختم۔"

"اچھا، اگر بابا بھائی نے سن لیا ناں پھر احتجاج کرتے تو کیا ہی چلے جائیں گے کہ ان کا ہی منڈا کیوں لگا ہے کیا پنڈی والوں سے۔"

"رہنے دو میرے بھائی تو کچھ نہیں سمجھتا۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ اور بڑی بات کہ وہاں اکیلے کب ہیں، آصف اور راحیل بھی تو ہیں ان کے ساتھ۔"

"ابھی اس طرح تجھے فری ہینڈل کیا ہے کام چوری کا یہ تیری آمد....." اس نے سوال کیا اور وہ ہنس دیا۔

"تجھے بتایا تو تھا ناں، بھی یقینی تھی تو نے پتہ نہیں کیا یا نہیں؟"

شہریار اور وہ کوریڈور میں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بات کر رہے تھے۔ شہریار کی آواز بہت ہی مدھم تھی۔ اسے بات کرنے میں خاصی محنت کرنی پڑ رہی تھی۔ بہرحال خود ان کی اپنی غلطی سے ان کی طرف آ رہا

AANCHAL.COM.PK

تھا، جس سے وہ بچنا چاہتا تھا۔ پھر کن خوشبو تیز ہو گئی تھی۔ وہ چلتے چلتے رک گیا تھا مگر بہت مدھم لہجے میں بولا تھا۔

"تجھے معلوم ہے وہ لڑکی کون ہے؟"

"نہ معلوم ہو تو تجھے کہتا کہ کرائے والے بابو بننا پڑے۔"

شہریار نے اس کی طرف دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔ "تجھے یہ لڑکی کہاں ملی تھی؟"

"ملی کہاں ہے، میری کزن زویا کی سہیلی ہے اس کے کالج میں۔ یہ بھی میڈیکل کے تھرڈ ایئر میں ہے۔ وہی کزن والا نے لے جانے میں وہاں ایک بار اسے دیکھا تھا۔"

"مگر تصویر تو وہاں سے کھینچی ہوئی لگ رہی تھی۔ کیا کالج کے باہر بھی اسے فالو کر رہا ہے؟"

عاطف نے شرمندگی سے سر جھکا لیا تھا، پھر آہستگی سے بولا تھا۔

"یار بس کیا کروں، اسے دیکھ کر پاگل ہو رہا ہوں، نہیں رک سکا تو بس۔ ہاں کوئی دفعہ اسے فالو کیا ہے میں نے۔"

"پھر کیا ارادہ ہے تمہارا تو نے؟" وہ شدت سے کچھ کہنے سے بچنا چاہتا تھا اور عاطف نے سر اٹھا کر کہا۔

"لڑکی ذرا نا خفا سی ہے۔"

"ذرا...... عاطف؟" اس نے تعجب سے دیکھا اور عاطف بے بسی سے بولا۔

"کیا کروں یار، حقیقت میں شروع سے کہتا ہوں، مجھے اس کے بارے میں مت سوچنا اگر دل جان سے اسے پانا چاہتا ہے۔"

شہریار نے اس کی طرف دیکھا، پھر نرمی سے بولا۔ "کچھ معلومات ہوں گی تیرے پاس اس کی بابت۔"

"ہاں کزن سے معلوم ہوا تھا۔ یہاں کراچی میں اس کی بہن ہے، اس کے پاس رہتی ہے۔ ماں باپ ہیں اور وہ دونوں کی زندگی سے خوش نہیں ہے، اس لئے زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی شائق ہے۔"

"ضیا...... کیا نام ہے اس کا؟" شہریار کی مدھم آواز اور مدھم ہو گئی تھی۔

AANCHAL.COM.PK

"سونیا...... بیٹا ارسلان راشدی۔"

شہریار چلتے چلتے یکدم پھر سے رک گیا تھا۔ بیٹی...... وہ تو اسے اظہار جہم کے نام سے جانتا تھا۔ کتنا خوف ناک نام دیا تھا اس نے اسے۔ وہ ارسلان راشدی کی بیٹی ہے۔

اس نے حافظ کا کندھا تھام لیا تھا۔ "بابا پھر سے نام بتائیں؟"

"کیا بات ہے صاحب؟" حافظ حیران ہو گیا تھا مگر زیادہ وہ پریشانی پر قرار نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ اس کے چہرے کے بدلتے رنگ سے وہ با آسانی سمجھ گیا تھا۔

"میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔ آپ کو ابھی آرام کی ضرورت ہے مگر شہریار اپنے جسم کو کیوں بلاوجہ تکلیف دے رہا ہے تو؟" وہ یکدم گھبرا گیا تھا۔ مگر شہریار بہت آہستہ روی سے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اپنے روم کی طرف واپس آگیا تھا۔ پھر اپنے بیڈ پر آ کر وہ بیٹھا نہیں تھا بلکہ لیٹ گیا تھا۔

"ڈاکٹر کو بلاؤں؟" اس نے اس کی بند آنکھوں سے گھبرا کر سوال کیا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "کچھ نہیں ہوا مجھے۔ بس ایسے ہی گھبراہٹ ہو گئی تھی۔ ذرا دیر میں نارمل ہو جاؤں گا۔"

حافظ خاموشی سے اس کے جوتے اتار رہا تھا۔ شہریار نے پھر کچھ نہیں کہا تھا۔ حافظ نے ان کے منع کرنے کے باوجود ڈاکٹر کو بلا لیا تھا۔

ڈاکٹر نے نئے سرے سے اس کا چیک اپ کیا تھا۔ پھر نرمی سے بولا تھا۔ "مسٹر شہریار! آپ نے پھر سے کسی بات کا سٹریس لیا ہے شاید۔ مگر ریکوری جلد ہی ممکن ہے۔"

شہریار نے خالی پن سے اسے دیکھا تھا۔ کچھ نہیں بولا تھا۔

❀❀❀

ارسلان راشدی کھانا باہر سے کھا کر آئے تھے۔ جب سے سونیا کا معاملہ کھلا تھا انہوں نے آس پاس اور دنیا سے بالکل قطع تعلق کر لیا تھا۔ اس لئے جب سائرہ کی رات کی ڈیوٹی ہوتی، وہ کھانا باہر سے ہی کھا کر آتے تھے۔ سوائے وقت وہ اپنے بستر پر لیٹے ہوئے کافی نصاب سے بار بار کی تفسیر سن رہے تھے۔

تین چار روز پہلے جو کچھ ان کے ساتھ ہوا تھا، وہ سب کچھ انہوں نے گھر میں کبھی ڈسکس نہیں کیا تھا۔ ثاقب جہم نے جس طرح ان سے سوال پوچھا تھا، کچھ دیر کے لئے وہ واقعی گنگ ہو گئے تھے۔ پھر

آہستہ آہستہ انہیں وہ سارے لمحات یاد آتے گئے تھے جن کی اذیت سے آج بھی ان کی روح پر چھالے پڑے ہوئے تھے۔ پھر تئی انتیس برس پہلے انہوں نے لفظوں کے انتخاب میں بھی سہولت سے کام نہیں لیا تھا۔ جو کچھ ان کے اندر اتنے برسوں سے غبار جمع تھا انہوں نے بیگم عاقب کے اوپر نکال دیا تھا۔ بیگم عاقب اپنی بہن کے متعلق بیان سے بھی مایوس ہو کر بہت دل گرفتہ ہو گئی تھیں۔ پھر وقت ان کے چہرے پر دراڑیں چھوڑ گئے تھے۔

وہ سب یونہی کیوں نکل آئے تھے بیگم! ان کا خیال تھا، نئی سچائی کے اظہار پر شاید ہی ان کی ڈگری برقرار رہ سکے مگر شام کو جب وہ کونا گزر پر مسز حلیم افسر سے دستخط لینے گئے تھے تب بیگم عاقب نے کہا تھا۔

"یہ کیسے بھی تو ہو گا بیگم! عبدالرحمٰن کہتے تھے ان کا حساب بہت اچھا ہے۔"

"عبدالرحمٰن۔" ان کا سر کرنا ہو گیا تھا بیگم! بی بی جی بھی تھی کہ اس کی طرح کی عزت نفس نے ان کے اندر بکھرا نہیں پھر اور وہ خاموشی سے کاغذ پر دستخط لے کر اپنے کیبن کی طرف واپس چلے آئے۔ مگر دل کے اندر جانے آج اتنے برسوں بعد کہیں ایک دھک جاگی تھی کہ وہ کہیں سے عطیہ کو نہ لے آتیں۔ پہلے وہ اب ان کی نہیں تھیں، پہلے انہوں نے گھر سے نکالنے وقت ان کے ہاتھ میں فیصلہ رکھ دیا تھا مگر ایک تعلق جو سانس بھر چکا تھا، وہ کہیں نہ کہیں اندر ہی اندر سر اٹھانے لگا تھا۔

انہوں نے آنکھیں بند کیں تو ایک نیا پارٹ کے سوا کچھ نہیں دکھ پایا۔ جیسا انہوں نے کیا، جس جیسا پاک کپڑا ایک سفید شیبان کی تھا، میں خوش ہوں۔ "پلیز ارسلان! مجھے گھر سے مت نکالو۔ میں اس تجربے کے بعد کہاں جاؤں گی ارسلان؟" آواز میں دکھ ہی دکھ تھا اور انہوں نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا تھا، پھر غرا کر بولے تھے۔

"تمہیں دولت کی ہوس ہے، ہاں تو جاؤ، کہیں بھی چلی جاؤ۔ تم جیسی عورتوں کے لئے گھروں کی کمی تھوڑی ہوتی ہے؟" وہ پھر غصے سے بولے۔ "کسی اور گھر کی بات کیا ہے، وہیں چلی جاؤ، اماں، عبدالرحمٰن کے پاس۔ وہ تمہارے لئے بہترین پناہ گاہ ثابت ہو گا اس لئے بھی تو ایک ہفتہ ان کے پاس رہ کر آئی ہو نا۔"

"یہ جھوٹ ہے ارسلان! آصف بھائی! آپ ہی دیکھئے نا، میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"ہمیں کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ، میں کیا جانوں؟ میں کیا تمہارے ساتھ گھوم رہی ہوں؟"

"آصف بھائی! آپ...... آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" حیرت ان کے چہرے پر ثبت تھی اور انہوں نے ان کی حالت کا خیال کئے بغیر انہیں دھکا دیا تھا۔

"دفع ہو جاؤ۔ میری زندگی میں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں......"

اور وہ عورت، جو دھکے سے گر گئی تھی، یکدم زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

وہ جیسے چلی گئی تھی اور وہ؟ بارش کے شور کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ انہوں نے دروازہ بند کر لیا تھا مگر وہ اندر کھڑے روئے اسی اذیت میں بھیگ رہے تھے جس اذیت میں غلطیاں تھیں۔ اور بارش کی بوندوں میں تیرتا، ٹپ ٹپ کرتا ایک شکستہ حال لمحہ تھا جو ان کے اندر باہر یادوں کی گونج پیدا کر رہا تھا۔

میرے ہاتھ پہ لکھو
فیصلہ جدائی کا
اتنا مختصر لکھنا
جتنی تم نے مجھ سے
مختصر محبت کی
اتنا مختصر لکھنا
فیصلہ جدائی کا
جتنی مری سانسیں اب
جتنی مری زندگی ہے
جس میں تمہیں آنے سے پہلے
منظور تھا

AANCHAL.COM.PK

فیصلہ جدائی کا اب طویل مت لکھنا
جس طرح میری چاہت
جس طرح میری خواہش
فیصلہ جدائی کا گر طویل لکھو گی

تب میں نہ پڑھ پاؤں گا
میں تو اب جدائی کے فیصلے کو پڑھنے تک
زندگی کا ساتھی ہوں
زندگی تمہاری ہے

"نظم تو بہت اچھی سنائی آپ نے۔"
"یہ نظم نہیں میرا دل تھا، جسے جس میں لطف آ رہا ہے خطیبہ! تم بہت ذہین ہو۔ تمہیں میری محبت پر، آپ کی محبت کی خوشبو آ رہی ہے۔" انہوں نے ان کی لٹ سے چھیڑ چھاڑ کی اور گاڑی تمام سا نیجان کے اندر گویا جلترنگ بجانے لگا۔
"آپ کو کیا پتہ، اب تک آپ کی محبت پرانی ہے یا کسی اور بات پر؟"
"اور کون سی بات ہے جس پر تم ہنسی؟"
"مجھے اپنی خوش قسمتی اپنی زندگی کے خوب صورت ہونے کے یقین نے ڈگمگاہٹ بخشی ہے ارسلان! آپ جیسی جان نثار آپ کی چاہتوں میں مجھے کس قدر عزیز ہو گئے ہیں۔ اگر میں آپ کے بعد زندگی کا تصور کروں تو زندگی کا کوئی پیرا... مجھے زندگی کا مشن سمجھنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔" "محترمہ! مرکز ہو کر بھی پھر ایسا کیوں؟ اگر میرا جواب آپ کی نظم کے خلاف انکار میں ہوا تو؟"

ارسلان راشدی نے انہیں دونوں کندھوں سے تھام لیا تھا۔ پھر جذب سے بولے تھے۔ "پہلے تو مجھے یقین تھا ایسا نہیں ہوگا۔ تبھی اگر ایسا ہوتا تو واقعی فیصلہ بھائی کا پتہ چلنے تک ہی زندہ تھا میں۔ پھر تم مت کرنے کے باوجود مجھے جینے پہ مجبور نہیں کر سکی تھیں۔"

"اتنی محبت کرتے ہیں آپ مجھ سے؟"

"بہت زیادہ۔ جتنا تم سمجھ سکتی ہو اس سے زیادہ۔ موت کے علاوہ مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔"

"اتنے بڑے بڑے دعوے مت کریں۔ نبھا نہ سکے تو......؟" عطیہ شوخی سے بولی اور وہ ان آنکھوں میں ڈوب گئے۔

"نہیں نبھا سکا تو تمہارے سامنے ہی مر جاؤں گا۔"

"مرجانا آسان نہیں ہوتا۔" شوخ ادا سے بول کر چھیڑا۔

اور ارسلان راشدی ہنس کر بولے۔ "محبت کرنا بھی تو آسان نہیں ہے۔ سمجھو مجھے مشکل کام کرنے کی عادت ہے۔"

"ہاں جانتی ہوں میں آپ کو۔"

"محبت کی نسبت سے ان کا وجود کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ انہوں نے پشت کے پیچھے دروازے سے یکدم لاک کھول کر کسی کو نکلتا دیکھا۔ جہاں عطیہ بازو پکڑ کر پہلے پہر سے زمین پر بیٹھی تھیں وہاں بارش کے سوا کچھ نہیں تھا جیسے بارش کو وہ اپنے آنسو دے کر چلی گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے دل کو ٹٹولا اور محسوس کیا ان کا دل اندر سے مر چکا تھا۔ پھر اسفند کن حالات میں ان کی زندگی میں آئیں؟ کیسے عمر کٹ گئی؟ انہیں پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ وہ جو دل اندر سے مر گیا تھا وہ پھر زندہ نہیں ہو سکا تھا اور آج اتنے سالوں بعد اسی دل میں ایک بار پھر سے جیسے کسی نے چنگاری پھونک کر آگ سلگا دی تھی۔

"چلی گئیں نہ تم بھی چھوڑ کر میری عطیہ؟"

"مگر وہ میری عطیہ کہاں ہے اب؟" دل نے دہائی دی اور سچائی کو دیکھ کر ان کے قدموں تلے زمین پاؤں گرا۔ انہوں نے کروٹ بدلی مگر خیالات کو انہی پکارے میں بند کر جانا چاہا تھا کہ بجلی کی فون کی بیل نے انہیں چونکا دیا تھا۔

"چلو ارسلان راشدی!...... کیا؟ جی وہ میری بیٹی ہے سالے، میں ابھی آتا ہوں۔"

ان کا سانس تیز تیز چلنے لگا تھا۔ وہ آندھی طوفان کی طرح گھر سے نکلے تھے۔ پھر کیسے نہ گئے۔ کے ہسپتال پہنچے تو وہاں قل بو بندوبست میں پولیس افسر کو دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی تھی۔ "کیسی ہے میری بیٹی؟" انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

بہت شفیق لہجے میں کہا گیا۔ "فی الحال رات سر ابھی ٹانگ میں فریکچر ہے تھوڑی سی سر پر چوٹ ہے۔ باقی اتنا نقصان نہیں ہوا، بہت بڑی بات ہے کہ بچت ہو گئی۔ کسی شاندی کی ٹکر سے بچ کر اور بچ جانا معجزہ ہے۔"

"مگر ایسا کون کر سکتا ہے سرمد علی؟" انہوں نے ان کے بیچ سے نام پوچھا۔ بریگیڈیئر عبدالرحمٰن مسکرا کر بولے۔

"دراصل ان کا ہسپتال میں کسی مسئلے میں کلاش چل رہا تھا۔ کسی سانحے نے ان معاملات میں اپنا ایک واضح نقطہ نظر برقرار رکھا تو انہیں یہ نتائج بھگتنا پڑے۔ جیسا آپ بے فکر رہیے اب کسی سانحے کی تحقیقات کی ذمہ داری میرے ذمہ ہے۔ آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔"

ارسلان راشدی انہیں دیکھتے رہے، پھر کندھا تھپتھپا کر بولے۔

"کوئی بہت اچھا انسان ہے جس نے آپ کی ڈیوٹی لگائی۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں آپ جیسی وردی والے عام لوگوں کا احساس رکھتے ہیں بچہ جانچ ان کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے کندھے پر لیں۔"

"ارے سر! ہمارے پولیس افسر ایسے ہی نہیں ہوتے۔ یہ بہت غلط انداز فکر پھیلی ہوئی ہے عوام میں۔ ویسے رہی میری بات، بیٹا نام اور صبر سے پاپا کی ڈیوٹی ہے کہ بڑے لوگوں کا حق ادا ہو۔"

"آپ کے پاپا.....؟" ارسلان راشدی نے ادھورے تعارف کے لیے جگہ خالی چھوڑی تو بریگیڈیئر عبدالرحمٰن مسکرا کر بولے۔

"میرے پاپا مشہور بزنس مین مسٹر عبدالرحمٰن آفریدی ہیں سر!"

"آپ کا نام کیا پوچھ سکتا ہوں میں؟" ان کی روح آنکھوں میں کھنچ آئی، بریگیڈیئر عبدالرحمٰن نے توجہ سے مسکرا کر کہا۔

"کیوں نہیں سر! اس میں کوئی حرج نہیں، میرا نام سرمد علی عبدالرحمٰن آفریدی ہے سر!"

AANCHAL.COM.PK

ارسلان راشدی نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ ایک پل میں انہیں لگا۔ باڈی گارڈ جیسی عجیب ... دفعہ میں انہوں نے یہ خیال ذہن سے جھٹکا اور خاموشی سے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گئے۔
عبدالرحمن سے ملنے میں کوئی حرج تو نہیں۔ میں بھی تو دیکھوں اس شخص کے اندر واقعی انسانیت نام کی چیز ہے؟ یا کوئی شرمندگی ہے یا نہیں۔

❁❁❁

بیگم عاقبہ شادی کی فائنل تیاریوں میں مصروف تھیں۔ ان دنوں انہیں شہریار کی بہت شدت سے یاد آ رہی تھی مگر مسز عبدالرحمن سے پتہ چلا تھا کہ وہ تین دن پہلے اپنے ایک دوست کے ساتھ ... چلا گیا تھا اور وہ کل نوشے کی شادی تھی۔
"کیا شہریار نوشے کی شادی میں شریک نہیں ہوگا ماما؟" علیزہ نے جوڑا پیک کرتے ہوئے سوال کیا اور بیگم عاقبہ کندھے جھٹک کر آہستگی سے بولیں۔
"نہیں شاید وہ شادی میں نہ آ سکے۔ کیونکہ اس کا دوست کافی سیریس انجری کے تحت ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔" انہوں نے بچیوں کا سامان سمیٹتے ہوئے بے زاری سے بولیں۔ "نوشے شادی سے خوش تو ہے علیزہ؟"
علیزہ نے کام کرتے ہاتھ روک کر بیگم عاقبہ کو دیکھا، پھر سوالیہ بولی۔ "آپ نے یہ سوال کیوں کیا ماما؟ کیا آپ کو لگتا ہے نوشے خوش نہیں ہیں؟"
بیگم عاقبہ اس کے قریب بیٹھ گئیں، پھر نرمی سے بولیں۔ "پتہ نہیں مجھے کیوں لگتا ہے نوشے خوش نہیں ہے۔ بار بار پوچھنے پر بھی ... ہو کر جواب دیتی ہے۔ خوشی اس کو نہیں کہتے علیزہ! خوشی تو اسے کہتے ہیں جو تمہارے چہرے پر دکھتی ہے۔ اپنے جیون ساتھی کا نام سن کر جس طرح تمہارے چہرے پر رنگ بکھر جاتے ہیں، خوشی اس کو کہتے ہیں علیزہ!"
علیزہ نے غور سے بیگم عاقبہ کو دیکھا، پھر آہستگی سے بولی۔ "ماما! ہو بھی تو سکتا ہے وہ نیا نام کے ساتھ اور ان کے سسرال ... سے خفا ہو گئی ہو۔ اس نے ماما کو بچپن سے جو ایک خاکہ بنا رکھا تھا جس طرح انہیں ظلم ... وہ آپ سے بھی ... اختیار کر لی تھی وہ سب سوچ کر وہ خود سے شرمندہ ہوتی ہوگی۔ یہی شرمندگی اسے اندر سے کاٹتی ہوگی ماما! کیونکہ وہ ضدی ہے کہ آپ کے سامنے جھکنے میں بھی اس کی انا آڑے آتی ہوگی۔"
بیگم عاقبہ نے سر ہلا دیا تھا، پھر بہت دھیمے سے ... کے قریب ... پھر وہ جب شادی کا جوڑا پہن کر باتھ روم سے نکلی تھی تو بیگم نے اسے ... کر وہ ان کے گلے سے لگ گئی تھی۔

"ماما! مجھے نہیں پتہ معافی کیسے مانگتے ہیں۔ مجھے نہیں پتہ غلطی کرنے سے کیسے رکتے ہیں خود کو۔ مگر مجھے اتنا پتہ ہے کہ ماں کی جو محبت میں ماما ثانیہ سے چاہتی تھی، وہ محبت مجھے صرف آپ سے ملی ہے۔ میں نے پورے دس سال ماما ثانیہ کے سامنے جا جا کر ان کے اندر کی محبت کو جگانا چاہا تھا مگر نہیں...... وہ جانتی ہی نہیں ہیں محبت کرنا کیا ہوتا ہے۔ جس طرح آپ علینہ کو کھینچ کھینچ کر پیار کرتی ہیں، انہیں محبت کو اس طرح جتانے لگانے کی عادت ہی نہیں ہے۔ وہ صرف دولت، دولت کرتی ہیں۔ ماما! میں جب ان کے پاس گئی ان کی زبان سے صرف دولت کا ہی تذکرہ سنا۔ میں نے ان کے چہرے پر بالکل وہی ملامت، وہی محبت ہوتی تھی ماما! جیسی علینہ، رائمہ یا مراد کو پیار کرتے وقت آپ کے چہرے پر ہوتی تھی۔" وہ روئے جا رہی تھی اور مجھ جیسا پتھر کا دل ایک مرتبہ پھر میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ ان کی محنت اور محبت رائیگاں نہیں گئی تھی۔

اب وہ ان کی گود میں سر رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ پھر اس نے اپنی ایک اور یاد دہرائی تھی۔ "آپ کو یاد ہے ماما! جب ایک دفعہ میں سوئمنگ کی کلاس ضد میں لینے گئی تھی اور آپ کہتی تھیں تم علینہ کی طرح اچھی سوئمر نہیں بن سکتیں۔ آپ کو لگتا تھا میری توجہ کم ہوتی تھی اور شاید آپ یہ بھی جانتی تھیں، مجھے پانی سے ڈر بھی لگتا ہے۔ مگر میں نے آپ کو غلط ثابت کرنے کے لیے سوئمنگ کلاس جوائن کی اور آپ میری کلاس سے میرے ساتھ تھیں۔ آپ کو لگتا تھا آپ کو کسی بھی وقت میری کسی بھی حماقت سے لڑنا پڑ سکتا تھا۔ میں نے پول میں پہلی سیڑھی پر قدم اٹھایا تھا اور آپ میری ٹیچر کے ریلیکس کہنے کے باوجود کرسی سے اٹھ کر میرے پاس آ گئی تھیں۔ "تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا ناں؟" آپ نے میرا ہاتھ چھونے کی کوشش کی تھی اور میں نے آپ کا ہاتھ جھٹک دیا تھا کیونکہ اس وقت میں واقعی خوف سے ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ پھر آپ نے دوبارہ پوچھا تو میں ضد میں پانی میں گئی اور آگے بڑھ گئی تھی۔ اس وقت مس ملیحا کا ضروری فون آ گیا وہ اندر چلی گئیں۔ ارد گرد بچیاں، بچے ٹرینڈ تھے، اس لیے انہیں کوئی ڈر نہیں تھا۔ ان کے ذہن سے شاید میں نکل ہی گئی تھی۔ مگر ماما! آپ صرف مجھ پر نظریں گاڑے بیٹھی تھیں۔ آج علینہ کی کلاس نہیں تھی اس لیے آپ کو میری فکر زیادہ تھی۔ "اتنے گہرے پانی میں مت جاؤ، ورنہ تم ڈوب جاؤ گی۔" میری فرینڈ نے مجھے وارن کیا اور مجھے اس وقت آپ کے جذبات سے کھیلنے میں اتنا مزہ آ رہا تھا کہ میں آگے بڑھتی چلی گئی۔ میں ڈوب رہی تھی ماما! اور آپ...... آپ جو میری طرح پانی سے ڈرتی تھیں، سوئمنگ سے ڈرتی تھیں۔ آپ نے میرے لیے چھلانگ لگا دی تھی۔ اس وقت آپ کے اندر وہ طاقت تھی کہ تیرنا نہ آنے کے باوجود آپ مجھے کنارے پر گھسیٹ لائی تھیں۔ کسی نے مس ملیحا کو بلا لیا تھا۔ مس نے فوراً کی ڈرائیونگ میں تیزی سے ڈوبنے کے باعث میرے اندر جمع ہونے والے پانی کو نکالنے کی کوشش کی تھی۔ پھر جب میں نے آنکھ کھول کر دیکھا اس وقت آپ پانی میں شرابور بیٹھی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھیں۔

میم نے مجھ سے کہا: "تمہاری ماما تم سے بہت محبت کرتی ہیں۔" مگر مجھے لگتا تھا، یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی جس سے اندازہ ہو سکتا کہ آپ کو مجھ سے محبت ہے۔ مگر آج جب میں ذرا ماما سے بچھڑ کر کہا کر بڑی ہو گئی ہوں تو مجھے لگتا ہے، محبت تو صرف آپ کو کرنا آتی ہے۔ ماما! محبت کے بغیر کوئی اپنی جان پر یوں تو نہیں کھیل جاتا۔"

وہ بے آواز رو رہی تھی۔ بیگم عافیہ کی بھی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ اتنے سالوں بعد سہی، انہیں محبت نے ان کی ریاضت کا صلہ دے دیا تھا۔ انہوں نے انوشے کو گلے سے لگا لیا تھا۔ پھر دونوں کافی دیر بعد ایک دوسرے سے الگ ہو کر آنسو پونچھ رہی تھیں، جب علینہ پریشے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

بیگم عافیہ اس کا سر تھپتھپاتی ہوئی باہر نکل گئی تھیں۔ پھر وہ ڈرائنگ روم سے ہو کر گزر رہی تھیں، جب سلیم افسر کی سنجیدہ صورت نے ان کے قدم روک لیے تھے۔

"خیریت سلیم؟" وہ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگیں۔ اور سلیم افسر ان کی آنکھوں پہ [illegible] سے بشاشت لانے کی کوشش کرنے میں مصروف ہو گئے۔

"پھر سچ بولنا چاہتا ہے تو اسے جھوٹ بولنے پر کیوں اکسا رہے ہیں؟"

"نہیں تو عافیہ! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

عافیہ بیگم ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔ پھر ابھی کچھ دیر پہلے ہونے والی انوشے کی گفتگو دہرانے کی بجائے بات مکمل کر کے چپ ہو گئیں۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے تھے، وہ اندر ہی اندر مجھ سے محبت کرتی تھی اور اس بات کو چھپانے کے لیے وہ مجھ سے روڈلی بی ہیو کرتی تھی۔ مگر اتنا یہ سے ملنے کے بعد وہ بکھر ہی گیا۔ وہ آنسو جو اس نے اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر بہانے کے خیال سے سنبھال کر رکھے تھے، وہ سارے آنسو آج اس نے میرے گلے سے لگ کر بہا دیے۔ سلیم! مجھے خوشی ہے کہ زندگی کے اس نئے سفر پر اپنے ماضی کی کوئی گرد، کوئی الجھن اس کے ساتھ رخصت نہیں ہو رہی۔ تم دیکھ لینا اس بار ہماری انوشے جو گھر بسانے جا رہی ہے، وہ واقعی خوشیوں بھرے راستے سے ہو کر آتا ہے۔"

سلیم افسر نے ان کی طرف دیکھا، پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "کاش تمہاری یہ پیشین گوئی اب تک کی پیشین گوئیوں کی طرح ٹھیک ثابت ہو، مگر فی الحال آثار تو بہت برے ہیں۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" بیگم عافیہ کی آواز کپکپا گئی تھی۔

سلیم افسر نے ان کی طرف دیکھا، پھر مدھم لہجے میں بولے۔ "عابد صاحب کی ریشہ دوانیوں اور شور و غوغا کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال سے بچنے کے لیے میں نے انہیں نوکری سے نکال دیا۔ مگر

نانیہ! آج وہ میرے آفس میں آئے اور انہوں نے پتہ ہے کیا کہا؟"

"کیا کہا؟" ان کی سانس رکنے لگی۔

سلیم اختر تھکے سے بولے۔ "وہ کہنے لگے، مسٹر سلیم اختر! آپ نے میری بے ایمانی کے بدلے میں مجھے نوکری سے نکال دیا، اچھا کیا۔ کیونکہ میں خود بے ایمان ہونے کو ہم جماعت بنا رکھنا چاہتا تھا۔ مگر مسٹر سلیم اختر! آپ جواد حسن کے بیٹے کو اپنی بیٹی دے رہے ہیں تو آپ نے اس کی پہچان کیسے کی ہے؟ شاید آپ کو یہ جواد حسن کا آپ کے بزنس میں، میں نے ہی اندازہ لگایا تھا۔ پھر آپ کیسے بھول گئے کہ پورا کا پورا [illegible] ہوتا ہے...... نانیہ! آپ...... آپ جانتی ہیں اس نے کہا کہ میں نے پانچ چھ دن سے جواد حسن سے مکمل ملاقات کر رکھی تھی۔ وہ ڈرنک کے عادی تھے، میں نے بھی ڈرنک انہیں دی اور پھر نشے میں انہوں نے وہ سب بکا جو ان کے دل میں تھا۔ انہوں نے ہماری دولت کو ہم ہی پر بے کی طرح استعمال کیا ہے۔"

"آپ...... آپ نے عارف سے بات کی ہے؟"

سلیم اختر نے ان کی طرف دیکھا پھر سر جھکا کر بولے۔ "ہاں کی...... اس کی تو جون ہی بدل گئی ہے لگتا ہی نہیں ہے، یہ وہی عارف ہے جسے ہم اتنے عرصے سے جانتے ہیں۔ بالکل خاموش ہو گیا ہے۔ میں نے اس کے سامنے اس کے پاپا کی بابت بحث کی تو سر جھکا کر بولا کہ میں کیا کہہ سکتا ہوں انکل! پاپا تو ایسے ہی سوچتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کبھی سمجھا ہی نہیں ہے۔ وہ مجھے بھی اچھے لگنے آ جانے سے بہا کرنے کے لئے [illegible] کے ساتھ نہیں سمجھتے۔ آپ سمجھتے ہیں اور شبنم خوش نہیں رہے گی۔ آپ بیشک سمجھتے ہیں...... سمجھا آپ نے پھر میں کیا کروں؟ عارف اپنے باپ کے کسی کام سے متفق نہیں، وہ ان کی الزام سے بھی نہیں رہا، پھر...... پھر میں کیا کروں؟"

نجمہ آپا نے ان کی طرف دیکھا اور نرمی سے بولیں۔ "اگر وہ ایسا ہو گیا ہے تو مجھے لگتا ہے اس کے دل کو کسی نے بدل دیا ہے۔ کوئی دیا روشن ہو گیا ہے اس میں۔ اور اندھیرے میں کھڑے شخص کے لئے دیا بہت بڑا سہارا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ وہ شبنم کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گا۔"

"مگر اس کے پاپا......؟" سلیم اختر نے تذبذب بھرے لہجے میں پوچھا۔

نجمہ آپا نے کچھ نہیں کہا مگر ان کی آنکھوں کا یقین ایک امید روشن کر رہا تھا۔ سلیم اختر نے خود کو حالات کے سپرد کر دیا تھا۔

❀❀❀

''مسٹر ہامون! آپ کو کیا لگتا ہے شہریار آپ کا باس ہے جو آپ نے یہ ہو سکنے دیا؟ آپ کو پتہ ہے آپ نے پی ٹی آئی سے سیاسی میدان میں کتنی ہلچل مچا دی ہے؟ اور وزیر داخلہ حسن وہ آپ کی ذہانت کو کیسے قبول رہے گا۔ اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ کوئی سیر کا سوا سیر ہوگا اور وہ صرف بازی ہار دیتی۔ لیکن اس نے عین موقع پر یہ پتا کھیلا کہ آپ کی سیاسی حمایت کا نتیجہ شاہ نواز کی حکومت کی طرف سے رجوع اور شدید صاف صاف کہنا ہے آپ کو پتہ ہے شہریار حسن کا نام پر چھاپہ مار کر وزیر کی ایک بہت بڑی مقدار ضبط کی گئی ہے۔ وہ کشتی بھی ان کے ناکافی اقدامات کے ذریعے گئی؛ معلوم شخص شیخ زاہد کے نام پر پانی! جس میں ان کے نام منتقل کر کے شہریار کو صاف بچا لیا ہے۔ آپ نے دیا فون جو آزادی کی کر حسن ابراہیم کے بیانوں سے وزیر داخلہ بھی ہے۔ وہ بھی گلے میں اٹک گئی ہے۔ مسٹر حسن ابراہیم نے پارلیمان میں ہماری کارروائی پر قرارداد مذمت داخل کرنے کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ دوسری طرف آپ کی ڈرین ناکامی کے شعبے کی محنت پر شاہ نواز کا شک ہو گیا ہے اس لئے شاہ نواز بھی ہمارے محکمے پر حیثیت مرتبے کا بوجھ کرنے کے لئے بہت سے لوگ لے رہا ہے۔ مسٹر ہامون! آپ کے پاس ان آپ شاہ نواز کا کوئی جواز؟''

''سوری سر! لیکن اس وقت مجھے لگا شاید وہ کسی اور اس کی زندگی زیادہ ضروری ہے اگر اس وقت میرا دوست شہریار نہ بھی مجھے اہم وجہ کہتا اور باقاعدہ حکم بھی اور وزارت سے میرے پاس فون بھی میں انسانیت کے ناتے اپنی ڈیوٹی ادا کر دیتا۔''

''کیا اس لئے ہم مسٹر ہامون! کیونکہ ڈیوٹی آپ کی ضرورت نہیں منتقلے؟''

''سر! یہ قطعی الزام ہے مجھ پر۔ کیونکہ ضرورت ہوا منتظر میں نے زندگی ادا فرض میں سے ہمیشہ فرض کو چاہے۔''

عدیل عبدالرحمن خاموشی سے ہامون عبدالکریم کو بخت نصیحتیں نظر ہوئے دیکھتے رہے، پھر پہلے اس سے کہ وہ کوئی حتمی نکالتے ہونٹ بحث میں کھینچے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون؟'' عدیل عبدالرحمن نے سخت کھردرے لہجے میں سوال کیا۔

''میجر سر!''

''کم ان۔'' نام سن کر بہت ہی شدید پیشانی سے انہوں نے اندر آنے کا استقبال کیا۔

"آپ جیسا باوسر منیجر! آپ جیسے نوجوانوں پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔"

"سر! یہ آپ کی محبت ہے۔"

"اچھا تو محبت والی بات کا م کا مرتبہ حاصل کر رہا ہے۔" عدیل عبدالرحمٰن کا لہجہ بدل گیا تھا۔ مسٹر منیجر نے ان کی طرف دیکھا تھا پھر ان کے سامنے ایک فائل رکھ دی تھی۔

"مامون صاحب کا فون جاتے ہی میں نے میڈیا کی کوشش شروع کر دی تھی سر! اس فائل میں کچھ تفصیلات ہیں کچھ نقشے ہیں اور ... تختے پر ایک ٹی وی لگی ہے۔ جس میں مسٹر حسن ... کچھ ہوٹل گرینٹ ... کی فلیٹ ... شامل ہیں۔ کچھ ... زمانہ ... بیٹے سے بھی زیادہ حسن ... کے کچھ حصے بھی درج ہیں۔ کچھ ... بھی ہیں، جو بہت اندر تک ... کے زمرے میں آتی ہیں۔ آپ ان باتوں کا حوالہ ... کر سکتے ہیں۔ ... مامون صاحب نے اچھی طرح سنبھال لیا تھا اور جو کسر رہ گئی تھی وہ میں نے گرین فائل کے مندرجات پوسٹ کر کے پوری کر دی ہے۔"

مامون نے زبان ... عدیل عبدالرحمٰن نے چونک کر پوچھا تھا۔

"وضاحت کریں مامون عبدالکریم!...... یہ منجانب کا کیا مطلب ہے؟"

مامون پہلے تو ... پھر سر جھکا کر بولا۔ "سر! میں نے شاہ ... کی فائل ... کر کے کہا تھا اگر وہ ... چاہیں گے تو پھر ہم بھی ... کے سامنے لا کر ... سکتے ہیں کہ ... دشمنی نبھانے ... کرنے والے وہ سیاسی خانوادے اندر سے ایک ہیں۔ ... زخمی ہوا تھا۔ ... آپ تو جانتے ہیں ... کے باوجود شاہ ... ایک ... زمین کے لیے ان کے ساتھ ... رکھا ہے وہ بہت آسانی سے بیان ... ہو جائے گا۔"

"... بہت کم تعداد ... کرتے ہیں۔"

مامون نے سر ہلایا تھا ... "سر! ... کی سیدھی انگلی سے ... کرنی بھی آتی ہے مجھے۔"

عدیل عبدالرحمٰن نے ... دیکھا ... بولے۔ "مسٹر مامون! آپ اس وقت ... میں موجود ہیں ... زبان و بیان میں احتیاط کیجیے

خاطر رکھئے۔"

"جی سر! سوری سر!" اس نے کہا اور مدھم لہجے میں کہا۔

اسفر بجر اس انداز پر جھنکا رہا تھا۔ پھر وہاں کی مشاورت کرنے ہی والا تھا کہ عدیل عبدالرحمٰن نے اپنا ہونٹ کھسکا لیا تھا جو فطرتی طور پر بکری میں ہی تھا۔ بذات ٹی پاپوجیت قبر تھا۔ پھر ہامون نے انہیں اپنے لہجے میں جھنکا ہاں وہ بے مہو ہے سنا تھا۔

اسفر بجر ہنس پڑا تھا اور ہامون عبدالکریم نے شکوے سے انہیں دیکھا تھا اور وہ مسکرا دیے تھے۔

"کہا کہیں کبھی کبھی باتیں بھی نیند سی آنکھوں سے ہی نکلا کرتی ہے۔" تو وہ کے پیچھے بولے "جس طرح تم نے شاہجہاں کو منوا دیا، ہینڈل کیا، بہری گندا ابی ہیری ٹی اب ہے۔"

اسفر بجر کا قہقہہ بہت بلند تھا۔ ہامون بھی ہنسا تھا اور عدیل عبدالرحمٰن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"لنچ کا ٹائم ختم اب ہامون بچے! جلدی سے جانے والا اس کے لہجے میں گھنگھور سے کہ ہم سے مشکل بچا لے گئے ہیں۔ اور ہاں سنو، ساتھ نہ لے کے آنا۔ آج کو مہمان آئے ہیں۔"

"سر! آپ بھی نا..... پہلی نہیں چلا کب آپ سنجیدگی سے عزت کر رہے ہیں، کب مذاق فرما رہے ہیں۔"

عدیل عبدالرحمٰن ہنسے، پھر مسکرا کر بولے۔ "شخصیت میں اتنا شعور تو ہونا چاہیے کہ بندہ الگ کرنے وقت اچھا لگے۔"

"ہم بالکل جیسے سر!" اسفر بجر نے بھی باتوں میں حصہ لیا اور ہامون عبدالکریم چائے بنانے کے لئے کچن کی طرف بڑھ گیا تھا۔

❀ ❀ ❀

ہسپتال میں عدیل عبدالرحمٰن کے ساتھ ہامون ہی بھی آمد ہوئی تھی۔

"تمہارا بابا سارا دن؟ حافظ نے تمہیں تنگ تو نہیں کیا؟" عدیل عبدالرحمٰن نے پوچھا۔

"نہیں تو، وہ بے چیا! بیٹا مجھے کبھی بھی تنگ نہیں کیا کرتا۔ ہاں، میں ہی اسے کبھی کبھی ستانے لگتا ہوں۔"

شہریار خاموشی سے ابھی تک سونیا اور علیا رحیم کی چیزیں الگ کرنے میں جتنا تھا۔ اس نے مامون اور عدیل عبدالرحمٰن کی موجودگی کو نظر انداز کیا تھا۔

"اگر تم اس طرح خاموش ہو کر تم مجھے جتانا چاہتے ہو کہ تم مجھ سے خفا ہو تو پھر تمہیں میرے ہاتھ سے قتل ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔"

شہریار عبدالرحمٰن نے عدیل عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا پھر بے چارگی سے بولا۔ "دیکھئے نا انکل۔ جان چھوٹ جائے گی آپ کی بھی میری بھی۔ آئی ایم فیڈ اپ آف لائف۔" ان کی آواز میں شکستگی نمایاں تھی۔

مامون، عاطف، عدیل عبدالرحمٰن تینوں حیرت سے ساکت ہو گئے تھے۔ ایسے لہجے میں اس نے کبھی بھی بات نہیں کی تھی۔ شہریار کہاں کھو گیا تھا۔

"آخر ہوا کیا ہے؟ تم اتنے دل گرفتہ کیوں ہو رہے ہو؟" مامون نے بالآخر تھام کر سوال کیا اور وہ چیخ کر بولا۔

"تھک گیا ہوں میں اپنی ہوشیاری سے۔ وہ نہیں صرف وہ نہیں ہے زندگی؟ اگر ہے تو مجھے نفرت ہے اس زندگی سے۔ میں جینا چاہتا ہوں اب۔ بس اب اور نہیں برداشت۔ میں دیکھ سکتا آپ کو اور یہ برداشت نہیں سہہ سکتا ہوں۔ میری تلاش ختم ہو گئی ہے برسوں سے۔۔۔۔۔ زندگی کا مصرف کیا ہوتا ہے؟ جس کو میں سہتا پھرتا ہوں؟"

اس کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ نہ جانے غصہ کس پہ تھا اور وہ اپنا غصہ کس پہ نکال رہا تھا۔ عدیل عبدالرحمٰن نے آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے تھام لیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے میری جان! اتنا غصہ؟ تم نے کبھی کسی کو نہیں کہا پھر۔۔۔۔۔"

انہوں نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور وہ جواب دینے کے بجائے ان کے سینے سے لگ کر رونے لگا تھا۔ اسے روتا دیکھ کر عاطف اور مامون دونوں کی جان آنکھوں میں کھنچ آئی تھی۔ خود عدیل عبدالرحمٰن کا دل بھی تیز تیز دھڑکنے لگا تھا اور وہ ان کے کندھوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے بھرائی لہجے میں بولا تھا۔

"میں تھک گیا ہوں عدیل بھائی! اب اور نہیں سہا جاتا۔"

عدیل بھائی نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔ پھر بھی بھرائے لہجے میں بولے تھے۔ "کیا بچے! تم تو میرے سب سے بہادر بھائی ہو۔ اتنی جلدی ہمت ہار دو گے؟" عدیل عبدالرحمٰن پہ وہ نفسیات کے کیا یہ اس سمجھانے کی بات کیا کرتے تھے، جو شہریار عبدالرحمٰن میں دور دور تک نہیں ہے۔"

شہریار جھجکنے سے انداز میں ہنسا تھا۔ کچھ بولا نہیں تھا۔ بس نے اسے پھر سے نواب اور انگلش بگاڑتا رہا تھا اور وہ علیم پر بری رکھتے ہوئے عدیل عبدالرحمٰن کو دیکھتے ہوئے بتا رہا تھا۔

"ہر روز سونے کے وقت اس بات کے لئے خود کو مناتا ہوں کہ آخری نیند ہو دوبارہ۔ جاگ جاؤں وہ بہت اذیت انگیز ہوتا ہے عدیل بھائی! یہ زندگی بے یار ہو جاتا ہے۔ میں اس ہجر کے دن جیتے جیتے تھک گیا ہوں۔" اس کی آواز مدھم سے مدھم ہوتی چلی گئی تھی۔ عدیل بھائی اس کے خاموشی میں چلتے جانے پر غصہ کرتے چلے گئے تھے۔

"محبت کرنے والے دلوں کو یہ کم بخت دل کا روگ ہی کیوں لگتا ہے یاسمین؟"

"شاید محبت خراج میں محبت دل ہی لیتی ہے عدیل بھائی! اس لئے بہت کم دل ایسے ہیں جو نکھار رنگ لے پاتے ہیں۔" فاطمہ نے کہا تھا اس کی آواز میں بھی نمی گھلی ہوئی تھی۔ شہریار نے رات جاگ کر گزاری تھی۔

دوسری صبح اس کی آنکھ کھلی تو سر میں کسی وجہ سے درد کا احساس لئے ہوئے تھے۔ اسے رات کی کوئی بات بھی یاد نہیں تھی۔ جو کچھ کہا تھا شدید بے خبری میں کہا تھا اس نے۔ سوچوں نے جاگنے کے بعد کل کی کسی بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ بہت کمپوزڈ حالت میں جاگا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے تمہاری اب؟" عدیل بھائی نے رخسار چھو کر کہا۔

وہ مسکرا دیا۔ "ٹھیک ہوں بالکل۔ مجھے کیا ہوا ہے؟" "تمہیں کیا ہوگا؟" وہ بے فکری سے بولا۔ "آپ کی آنکھوں کو کیا ہوا؟ اتنی سوجی ہوئی کیوں لگ رہی ہیں؟ اتنی سرخ رنگت؟"

"نہیں تو ویسے کل رات ذرا سو نہیں سکا اس لئے۔ ویسے تو کوئی پرابلم نہیں تھی۔"

اس نے اگلا سوال کیا تھا۔ "شہزاد اور شاہد کیسے ہیں بھائی؟"

"دونوں بہت بہتر ہیں اب۔ انہوں نے تمہارا پوچھا تھا میں نے کہا تم چند دن گئے ہوئے ہو۔"

"آپ لوگ مجھے کب تک چند دن بھیجتے رہیں گے؟ خوشی کا تو یہ عالم ہے سب چند دن پر خرچ کر رہا ہوں گی۔"

"ارے بھائی یہ کیا ہوا؟ ہم تو ان کا ہی تجربہ تمہارے ہے جیسا ہے۔ ہم سب ہی کتنا سوچ رہا تمہیں محسوس رہا ہے۔" فاطمہ نے ہنسی دکھائی اور پوچھا۔

AANCHAL.COM.PK

"تم سے لوگوں کی بھی نشانیاں ہوتی ہیں۔ وہ جو مڑ کر ان کو دیکھ کر چند نیاز کرتے ہیں۔"

"سو ٹھیک لگ رہا ہے بھائی کا؟" اسعون نے محبت سے پوچھا اور وہ مسکرا کر چپ ہو گیا۔

پھر دوسرے دن صبح ہی اس نے طبیعت کی بہتری ریکوری کے ساتھ شہریار جنگ کی مانگ کی تھی۔ عدیل بھائی مطمئن نہیں تھے مگر اس کی ضد کے آگے ایک نہ چلی تھی۔ وہ شہریار سے ملنے کی طرف ہی گیا تھا۔

"شہری بھائی! آپ......" اسے دیکھ کر اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ اس کا وجود جیسے بیٹھے بیٹھے لرز رہا تھا۔

"مت رو میرے بچے! میں یہیں ہوں۔ کیا ہوا غم ہے؟"

اس نے بازو پھیلائے اور اس کا سر اس کے سینے سے آ لگا۔ سسکیاں ہچکیوں میں بدل گئی تھیں اب۔ وہ تیز آواز میں رو رہی تھی، جیسے کسی کی میت پر بین کر رہی ہو۔ مگر شہریار جانتا تھا وہ اپنی ذات کے مارے جانے پہ بین ڈال رہی تھی۔ اس نے قدم اٹھائے تھے اور کہانی میں جا گری تھی۔ ساتھ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ جانتے ہیں اب ہاتھ چھوڑ کر دوڑنے والے بھی سنبھل نہیں پاتے۔ اس نے بھی مضبوطی سے قدم نہیں جمائے تھے سو وہ بھی گر گئی تھی اور یہاں گرنے والوں کے ہاتھ تھامنے والے کتنے ہوتے ہیں؟ کسی گرے ہوئے پر ہنسنے والے ہزاروں مل جاتے ہیں مگر سہارا دے کر دوبارہ کھڑا کرنے والے انگلیوں پہ گنے جا سکتے ہیں۔ اور وہ خوش قسمت تھی کہ اس کے پاس ایک ہاتھ ایسا تھا جو اسے تھام لینے کو دوڑ کر آنے پر تیار ہوتا تھا۔ حالانکہ اس نے اس شخص کی ذات کو سب سے زیادہ ضرب کا نشانہ بنایا تھا اور اب بھی یہی شخص اس کی دل جوئی کو سب سے پہلے پہنچا تھا۔ وہ پھر کر رو چکی تھی مگر اب ان کی توجہ شہریار کی طرف ہوئی۔

"شہری بھائی! آپ پہلے سے بہت کمزور نہیں ہو گئے ہیں؟"

وہ مسکرایا اس کے آنسو پونچھ کے صاف کر کے مدھم لہجے میں بولا۔ "نہیں تو بیٹا! تمہیں ایسا لگ رہا ہے۔ ورنہ میں تو اب بھی پہلے جیسا ہٹا کٹا ہوں۔"

مانو کی آنکھوں میں بے یقینی اتر آئی۔ اس نے جواب پانے کی ضد نہیں کی۔ ضد کرنے کی بہت سالوں تک سزا کاٹ کر آئی تھی۔ اس لئے اسے سوال اور ضد کا ذائقہ بہت اچھے سے ازبر تھا۔

"سلمان بھائی سے آپ ملتے ہیں؟" اس نے متوازن لہجہ اختیار کیا۔

شہریار اسے خاموشی سے دیکھتا رہا پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "وہ انسیس برس کا ہے ہمارا بھائی۔ ہم جیسے گناہوں سے کہاں ملے گا؟"

"وہ آپ سے خفا ہیں کیا بابا؟ آپ ان سے خفا ہیں؟" وہ ورکنگ شی سے اصل جڑ تک پہنچ گئی اور وہ جھکا رہا۔

"پھر وہاں گزرا کیا تھا وہ پیا میں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم سات سال سے ایک دیوار کے فاصلے پر ہو کر بھی نہیں ملے۔"

ماثرہ نے اس کی طرف دیکھا، پھر اس کی آنکھوں میں دکھ ہی دکھ بکھرنے لگا۔

"کہاں گم ہو کیا سوچ رہی ہو؟" اس نے اس کا شانہ ہلا کر اسے گم ہونے سے بچایا اور وہ اس کی طرف دیکھ کر کمزور سے لہجے میں بولی۔

"میں بہت بری ہوں شہری بھائی! میری وجہ سے آپ دونوں اتنے اچھے دوست الگ ہو گئے، میری ماں کی محبت شرمندہ ہو گئی اور پھوپھو کا سر جھک گیا، عارفہ کی زندگی ختم ہو گئی۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے بھائی! میں قابل معافی نہیں ہوں، مجھے کبھی معافی نہیں ملنی چاہیے۔"

شہریار عبدالرحمٰن نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، پھر آہستگی سے بولا تھا۔ "غلطی کر دینا بہت آسان ہے ماثرہ! مگر غلطی کو مٹانا انتہائی مشکل۔ ہم کہنا آسان مگر معاف کرنا بے حد کٹھن سمجھتے ہیں، ماثرہ! معافی مانگنے کے لیے دل بہت بڑا کرنا پڑتا ہے، یہ توفیق بھی خدا کسی کسی کو دیتا ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں غلطی سدھارنے کا موقع مل گیا۔ پہلی غلطی خدا معاف کر سکتا ہے تو وہی خدا بندوں کے دل میں بھی اس کی محبت اور نرمی ڈال دیتا ہے۔ تم اس کے لیے پریشان مت ہو کہ تمہیں کوئی دھتکارے گا یا نکالے گا، سارا زمانہ تمہیں اپنے اندر سے باہر نکال کر پھینک دے، تب بھی تمہارا شہری بھائی ہو گا، جو تمہاری غلطی سمیت تمہیں کبھی تنہا نہیں ہونے دے گا۔"

ماثرہ ایک بار پھر سے رونے لگی تھی۔ شہریار نے اس بار اسے چپ نہیں کرایا تھا، اس کے سر کو تھپکتے ہوئے بانہوں میں لیا تھا، چپ کا تپ رہا تھا اور ماثرہ سے لگ رہا تھا اس کے سر پر شہریار نے صرف ہاتھ نہیں رکھا تھا بلکہ دل کے خزانے سے ایک دعا اس کے پلو سے باندھ دی تھی۔ یہ دعا جو تمام عمر کے لیے اسے شاد کام کرنے کے لیے کافی تھی۔

شہریار اس کے سونے تک وہیں رہا، پھر اس نے فون کر کے اپنے ایک بہترین دوست کی ممی کو ماثرہ کا خیال رکھنے کے لیے فون کیا تھا۔ رات تک وہ آ گئی تھیں، تب اس نے بہت تشکر سے انداز میں کہا تھا۔

"صرف آج کی رات آپ اس کی کیئر کر لیں، آنٹی! میں کل تک اس کی کسی اور کے رہنے کے لیے کسی جگہ کا بندوبست کر لوں گا۔"

آنٹی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی بات رکھ لینے کا عندیہ دیا تھا اور وہ وہاں سے رخصت ہو کر گھر آ گیا تھا، جیسے ہی وہ گیٹ سے داخل ہوا تھا کہ ام کے کمرے کی کھڑکی کا پردہ ہلا تھا۔

"مام کو وہاں دیکھنا بہت مشکل ہوگا۔" اس نے پریشان ہو کر سوچا اور مام واقعی بہت تیزی سے اس تک آپہنچی تھیں۔ وہ کاریڈور کے دروازے میں کھڑا تھا۔

"شہریار!" پشت پر آواز سن کر وہ اس طرح رکا جیسے اسے مام کے جاگتے رہنے کا اندازہ نہ ہوا تھا۔

"مام! آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟" وہ ٹھٹک کر پوچھ گیا تھا۔

مام نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا پھر نرمی سے بولیں۔ "فاطمہ کی طبیعت کیسی رہی بیٹے؟ چوٹ زیادہ شدید تو نہیں آئی تھی اسے؟"

"نہیں مام! بہت معمولی چوٹیں تھیں۔ وہ ریکور کر گئی ہے۔ ابھی تو میں لوٹ سکا ہوں گھر۔ آپ یہ بتائیے آپ اب تک کیوں جاگ رہی ہیں؟"

مام نے مسکرا کر اس کے رخسار کو چھوا اور نرمی سے بولیں۔ "جس ماں کے دو بچے گھر سے غائب ہوں، وہ آرام سے سو سکتی ہے؟" پھر مدھم لہجے میں بولیں۔ "میں پہلے بہت بری ماں تھی۔ مگر اب مجھے کہنے دو، ابھی میں اچھی ماں بننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ پلیز، وجدان نانی کی وجہ سے مجھ سے چھوٹ گیا تھا، وہ بھی اب ماں کی نانی کی وجہ سے ٹوٹ چکی ہے اس لئے اس کی غلطیوں کو نظر انداز کر دیجیو۔ ماں کو معاف کرنے کی عادت ڈالو شہری۔ یہاں کوئی بھی پرفیکٹ نہیں ہوتا۔ خامیاں تو ہر ایک میں ہوتی ہیں۔ غلطیاں تو مجھ میں بھی ہیں۔ کوشش کر رہی ہوں کہ......"

شہریار نے مام کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا پھر نرمی سے بولا۔ "اب تک آپ کی گفتگو میں نے نہیں سنا تھا۔ آپ کو چاہیئے تھا، اس لئے آپ نے میری مام کے خلاف بہت کچھ کہا، اب اور نہیں سنوں گا۔ مام! مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں تھی اور شکایت کبھی ہو بھی نہیں سکتی۔ آپ مجھے پیار کرنا بند کریں، میری محبت آپ کے لئے ہمیشہ ایک جیسی رہے گی۔"

مام کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔ انہوں نے اس کی جبین کو چوما پھر بولیں۔ "تم میری سب اولادوں میں سب سے اچھے بیٹے ہو۔ مگر میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی۔ ہر وقت دور رکھا۔ میں کبھی خود کو اس کے لئے معاف نہیں کر سکتی۔"

وہ ہنس پڑا۔ پھر مام کے گلے میں لاڈ سے بانہیں ڈال کر بولا۔ "ابھی آپ نے مجھ سے ایک بات کہی تھی، معاف کرنا سیکھو۔ معاف کرنے کی عادت ڈالو تو معاف کر دیتے ہیں۔ محبت میں اتنی سختی اچھی نہیں ہوتی مام!"

مام کچھ نہیں بولی تھیں۔ اس کے سینے سے سر ٹکا کر وہ بے آواز رو رہی تھیں۔

"ارے ماما! پھر آنسو...... میں نے آپ سے کہا تھا ناں، دوبارہ آنسو آپ کی آنکھ سے نکلے بہت تکلیف ہوگی مجھے۔"

ماما نے ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھے تھے اور بہت رحم لہجے میں پوچھا تھا۔

"تم نے کھانا کھالیا ہے یا نہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے کچن کی طرف لیتی چلی گئی تھیں۔ پھر پاپا کا پسندیدہ کھانا گرم کر کے انہوں نے اس کے سامنے لا رکھا۔ وہ آہستہ روی سے کھانے میں مگن ہو گیا تھا۔ ماما اس کے سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی اس کی تعلیمی سرگرمیوں کے حوالے سے نئی نئی چیزیں بتا رہی تھیں۔ وہ مسکرا کر ماما کی تمام باتیں سنتا رہا تھا۔ جہاں تک ٹھیک تھا۔ اچانک شافعہ کے تذکرے پر اسے پھندا لگ گیا تھا۔ ماما اس کی کمر تھپتھپانے لگی تھیں۔

"جہان ہے۔ آخر جلدی کس بات کی ہے؟"

اس نے بمشکل گہرے گہرے سانس لے کر اپنی حالت پر قابو پایا۔ پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "آپ دیتیں۔ ماما شافعہ کو بھی تین دن پہلے ایکسیڈنٹ ہوا تھا؟"

ماما پانی کا گلاس بھرتے بھرتے ٹھٹھک گئی تھیں۔ پھر ہچکچاتے لہجے میں بولی تھیں۔ "کیا آفت آ گئی ہے۔ پہلے ماہ بعد نور شافعہ۔ دور کہیں پھر گئی ہیں۔" "تم تو پھر اسے دیکھنے نہیں گئے ہو گے ناں؟ تم تو کراچی میں نئے نئے تھے۔" "تم پھر کہیں سر پر ٹکی چپت لگا رہی ہیں۔" "بس جب سے بچے ہوئے ہیں۔ سب سے کہہ رہے تھے اور تم کی شادی میں میں لے کر جاؤں گا ماما۔ اچھا۔ وغیرہ وغیرہ...... پھر سے عبدالرحمن صاحب کی فیملی کی شادی میں شرکت کی تھی میں نے۔ ویسے جوڑی بہت پیاری تھی دونوں کی۔"

ماما کسی خیال میں گم ہو گئی تھیں اور وہ معذرت کرنے لگا تھا۔ ماما نے اس کی معذرت پر اسے یوں چونک کر دیکھا جیسے کسی خیال نے انہیں اپنے اندر سمو لیا تھا۔ ان کے ہونٹوں کو مسکراہٹ نے چھو لیا تھا۔

"خیریت، یہ مسکراہٹ کس خوشی میں؟"

ماما نے اس کے پیشانی پر آجانے والے بال سنوارے۔ پھر مسکراتے ہوئے بولیں۔ "صبح ہم شافعہ سے ملنے ہسپتال جائیں گے۔ اور ان لوگوں سے پہلی فرصت میں اس سے تمہاری بات پکی کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ کیونکہ تمہاری شادی میں بہت دیر ہو گئی ہے میں نے۔"

اسے سمجھ نہیں آیا وہ ماما کو کیا کہے کہ وہ کسی نئی صورت حال میں وہ بھر سکے نہیں لینا چاہتا تھا۔

"ماما پلیز! ابھی وہ وہیں ہی کمپلینٹ سے تھوڑی دور ہے۔ وگی اور آپ شادی کی بات کرنے کا سوچ رہی ہیں، وہ کیا چاہتی ہیں۔ کچھ وقت دیجیے اسے ماما! اگر وہ اور میں ان سے نپٹنے کو دل سے قبول کر لیں۔"

ماما نے ہمدردی سے اسے دیکھا مگر اس کی بات مان لینے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ سو وہ کھانے کے برتن سمیٹنے لگیں اور وہ خود اپنے روم میں آگیا۔ بستر پر لیٹ کر اس نے سب سے پہلا نمبر ... ان کا ہی ملایا تھا۔

"ہیلو! کیسا ہے وہ؟ آپ سنائیں کیسی طبیعت ہے مری؟" سلام دعا کے بعد ان کا حال احوال شروع ہوگیا اور وہ ہنسنے لگا۔

"بہت بری ہوگئی! دنیا کے سامنے اتنا بولنا ہے تو کبھی کبھی کسی کمزوری کی بات کہہ دیتا ہے۔"

"ارے سالا! میرے بارے میں لوگ سننے کے لئے ترستے ہیں۔ تمہیں کیا پتہ کیا جادو ہے میری آواز میں۔"

ثمیرا ہنسنے لگی پھر نرمی سے بولا۔ "تو پھر میری آواز سن لی نا؟ قسم کی بے اگر میں ابھی ... تو تیری آواز کی وجہ سے مجھے بخار ٹھیک ہو جاتا۔"

"ہاہاہا......" اس کا قہقہہ بہت بلند تھا۔

ثمیرا نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔ "میری وجہ سے تجھے کوئی عذاب تو نہیں ملا؟"

"نہیں۔ میری بیماری کی وجہ سے بچت ہوگئی۔ بھائی صاحب اتنے پریشان ہوگئے تھے کہ زیادہ باز پرس کر ہی نہیں سکے۔ پھر الٹا تیری کوریج نے بھی ہم دونوں کو پھانسی لگنے سے محفوظ رکھا۔"

ثمیرا نے مطمئن ہو کر موبائل آف کر دیا۔ پھر سونے ہی لگا تھا کہ اچانک اس کے موبائل پر بیپ ہوئی۔ اس نے فون ریسیو کیا اور دوسری طرف مکمل سکوت تھا۔

"کون بول رہا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

مگر دوسری طرف صرف گہرے ہلکے سانس گونجتے رہے۔ یہاں تک کہ اس نے خود ہی بے زار ہو کر آف کر دیا۔

"کون ہو سکتا ہے؟" اسے حیرت ہونے لگی۔ مگر یہ حیرت زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکی۔ کیونکہ عاطف کا فون دس سیکنڈ بعد ان کی تنہائی کو تہہ و بالا کرنے کے لئے اس کا منتظر تھا۔ پھر دیر تک بہت ساری باتیں

تھیں اور خود شہریار بھی کچھ اس طرح تنہائی سے اکتایا ہوا تھا کہ وہ اس کی کمپنی کا ساتھ دیتا رہا، یہاں تک کہ قریباً دو بجے وہ سو سکا تھا۔

پھر دوسری صبح ناشتے کی میز پر اس کے لئے ایک نیا دھماکہ منتظر تھی۔

"آپ تین چار دن کہاں رہے بھائی؟" جازی عبدالرحمٰن کا لہجہ بہت عام سا تھا۔ مگر شہریار اس کے لہجے سے چونک گیا تھا۔

"کیوں میاں آج میری بابت تمہیں فرنیش رپورٹ لینے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟" اس نے بریڈ کا پیس ہاتھوں سے کترتے ہوئے پرسکون لہجے میں پوچھا اور جازی عبدالرحمٰن کا چہرہ وہ یکدم جھنجھلاہٹ کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ سالار عبدالرحمٰن نے بھی اس بار اسے چونک کر دیکھا تھا، جب جازی نے ان کے سامنے اخبار پھینک کر کہا تھا۔

"دیکھ لیجئے ماما! آپ کے بیٹے آج کل کتنا فیمس ہو رہے ہیں اور وہ بھی کن معاملات میں۔ مجھے تو سوچ کر ہی شرم آ رہی ہے۔"

شہریار نے کپ ہاتھ سے رکھ دیا تھا اور سالار بھائی سے پہلے اخبار اٹھا لیا تھا۔ اخبار کے فرنٹ پیج پر کسی لڑکی کے خواہ مخواہ رونا دھونا چھپی تھی۔ وہ یک کالمی خبر کے اندر اترا اپنا نام پڑھ کر اس کی ہارٹ بیٹ بے حد تیز چلنے لگی تھی۔ خبر مشکوک ہے "دی ٹی ج" چھپا ہوا دور سے ہی نظر آ رہا تھا۔

"کیا خبر ہے؟" ماما نے بھی چائے کا کپ رکھ دیا تھا۔ شہریار اتنی اچانک اس جوتشن سے اپنا بچاؤ کسی بھی طرح نہیں کر پایا تھا۔ دماغ کا اتنا اچانک کیا گیا تھا کہ اس کا اندر تک ہل گیا تھا۔ وہ خبر پڑھ کر اب اس کی صفائی سننا چاہتی تھیں۔ مگر وہ کیا صفائی پیش کرتا؟ اسے اس لمحے صدیقی بھائی کی شدت سے کمی محسوس ہو رہی تھی۔ پاپا، ماما اور رابعہ بھابی سب کی نظریں اس پر تھیں، جب جازی نے نیا ہنگامہ لا کھڑا کیا۔

"آپ کو پتہ ہے ماما! آپ کے یہ بیٹے جھوٹ بولنے کے کتنے عادی ہیں۔ پھر یہ نہیں دیکھتے کہ جھوٹ بولنے کے لئے کس کی بات کس طرح استعمال کر رہے ہیں، بس جھوٹ بول دیتے ہیں۔ مگر آپ کو تو معلوم ہے ماں، جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" پاپا نے ترشی سے پوچھا اور جازی اسی تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔ "مطلب یہ ہے پاپا! کہ عاطف بھائی کا کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہی نہیں تھا اور نہ ہی یہ وہاں گئے تھے۔ میں نے خود دو دن پہلے عاطف بھائی کو یہاں کے شاپنگ مال میں دیکھا۔ پھر میں نے شہری بھائی کا نمبر بھی ملایا تھا، مگر یہ اپنی کچھ لامعنی مصروفیات میں اتنے مصروف تھے کہ انہوں نے میری کوئی کال ریسیو نہیں کی تھی۔" ذرا رک کر پھر مزید بولا۔ "کیا آپ یہ سن کر پسند کریں گے کہ وہ بدنصیب لڑکی کون تھی، جسے آپ نے اپنی عادت کے مطابق ایک نئے سانپ سیڑھی کے کھیل میں گھسیٹ لیا ہے؟ شہری بھائی! آپ آخر اپنی یہ

نادانی کب چھوڑیں گے؟ کبھی الماری ہم، کبھی جاناں، کبھی کوئی تحفہ کوئی۔"

شہریار تحمل سے اٹھ گیا تھا مگر ماما نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں مگر ان کی آنکھوں میں واضح لکھا تھا کہ وہ اس کی طرف سے صفائی چاہتی تھیں۔ پاپا نے کچھ نہیں کہا تھا۔ سالار رحمانی بھی خاموش کے اٹھ گئے تھے۔ وہ ویسے طریقے سے کچھ کہہ گیا تھا۔ جازی اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا اور ماما کی آنکھوں میں وہ جانا، سے (نرمی شفقتی) والے دن کے آنسو کی طرح جھلملانے لگا تھا۔

"ان کے پاس اپنی کسی غلطی کا آج سے پہلے کوئی ایک بھی جشن جیسا تھا جو آج ہوگا؟ امام، آرام سے بیٹھے، آپ جناح کی بات نے کی کوشش کر رہی تھیں۔ آپ کا دل ان سے نفرت کرنے لگے گا اس لئے پلیز، بچے ہیں، کو تکلیف میں مت ڈالیں امام!" شہریار نے تیز نظروں سے جازی کو دیکھا تھا مگر وہ ان کو تھا ورنہ نے نیا شوشہ چھوڑا تھا۔

"آپ کو پتہ ہے پاپا! انہوں نے مسٹر ہمدانی اینڈ زوجہ کے ہونے نہ دینے ایک شخص کی ڈاکٹر کا ہے، جو صرف ان کے معاملات دیکھے گا۔"

سالار عبدالرحمن جو ہنسی کیس لے کر دروازے کے قریب سے ہو کر گزر رہے تھے، اس بات پر ٹھٹک کر کھانے کے کمرے میں آ گئے تھے۔

"ایسا کیوں کیا تم نے؟" سالار عبدالرحمن جو غلطی نہ ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے، اب پاپا اور وہ فوراً نہیں رک سکے تھے۔

"میرے کچھ ذاتی معاملات تھے جن پر مجھے رفیق صاحب کے کئی اور ان کی مدد کی ضرورت تھی۔ غلطی میری تھی اس لئے نقرے کے لئے بات کرتے وقت مسٹر مرتضیٰ سے میں نے رابطہ کی ضرورت نہیں سمجھا۔"

"تمہارے ذاتی معاملات ہمارے ذاتی معاملات سے ایسے کیسے ختم سمجھے جاتے ہیں کہ ہم ان کو نہیں رہتے۔ جب ان کے بیٹے ہیں اور ہم کسی بھی طرح کی رعایت نہیں دیں گے۔"

"اوکے، پاپا ہم بیگ!" وہ جھنجھلا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ پاپا نقرے کے بجائے اس کے روم کی طرف چلتے چلے گئے تھے۔ وہ اس سے کسی بات کی وضاحت نہیں چاہتے تھے۔ وہ بس اس کے دل کو بہتر کرنے کے خیال سے اس تک پہنچے تھے، مگر وہ پریشان ہونے کے بجائے بہت پُر سکون سا بیٹھا ہوا تھا۔

"شہریار! اتنی ٹینشن لے رہے ہو تم؟" اس نے پاپا کو دیکھا ضرور تھا مگر اٹھا نہیں حالانکہ وہ ان کے احترام میں بیٹھا کتنا بھی تھکا ہوا ہوتا، یکدم اٹھ کھڑا ہو جاتا تھا۔

"تمہارا رویہ بہت خراب لگ رہا ہے۔ میں نے آج تک تمہیں خاموش نہیں دیکھا تھا۔ ہت ڈوبے؟"

"ایسے ہی پاپا! جازی کی خشبو بہت زیادہ سخت لگی تھی اس لئے موڈ خراب ہو گیا تھا۔"

پاپا نے اس کے قریب بیٹھ کر دھیرے سے رخسار چھوا، پھر یہ حتم ہو گئے تھے۔ "ہماری لاڈو! یہاں تمہاری خاموشی کی وجہ سے ہی ہم منتشر ہی جا رہی ہیں۔ سات سال پہلے اگر تم نے خاموش رہنے کا عہد دیا ہوتا تو میں ساری دنیا کو بتا دیتا میرا بچہ کتنا پیارا ذہین اور کیرنگ ہے۔"

"ان سے کیا ہوگا پاپا؟ کیونکر بتا کر بات کیا کر کیا؟...... کیا میری زندگی کھلی کتاب کی طرح نہیں ہے؟ میں کسی اور زبان کا لفظ نہیں ہوں کہ مجھے ترجمہ کرنے کے لئے ایکسپرٹ ادب کی ڈکشنری کی ضرورت پڑے۔"

"مگر بیٹا دنیا دیکھتی ہے جو سامنے نظر آتا ہے۔ دنیا وہی ہے جو سامنے دکھایا جاتا ہے۔ تم خود بھی تو شہریار کی دنیا سے وابستہ ہو۔ تمہیں تو مجھ سے بہتر پتا ہونا چاہیے کہ جو دکھتا ہے وہی بکتا ہے۔"

"ہاں پاپا! مگر مجھے لگتا ہے دنیا مجھے بنا کہے جان پائے۔" وہ لمبا سا سانس کھینچ کر شرٹ کے کف سے الجھتے ہوئے اور پاپا کی نظر اچانک اس کی کلائی پر جا کر رک گئی تھی۔

"تم واقعی یہ چاہتی ہو کہ تمہیں جان لے شہریار؟"

دروازے کا ہینڈل گھماتے ہوئے کھولنے کی جستجو کرتی ہاتھ روک کر مڑ ہو گیا تھا۔ کیا دکھ اپنی بات سنتے ہوئی تھی جو جا رہی کے بغل میں تھا۔ وہ شہر گئی تھیں اور اندر وہ رہتے ہیں کہہ رہا تھا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے پاپا! میں واقعی پہلے جیسی نہیں رہی تھا۔" مگر اس کا لہجہ بہت کمزور سا تھا اور پاپا کی نظر میں اس کی چھپی ہوئی زبان دراز ہو گئی تھی۔

"تم مجھے بچہ سمجھتی ہو کہ میں حقیقت نہیں جان پاؤں گا؟ تم پارا ماہ چار دن کسی ہاسپٹل میں گزار کر آئے ہو نا؟"

"ہاسپٹل میں......؟" اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا اور مدھم لہجے میں کہا تھا۔

"کسی خاص وجہ سے ایڈمٹ نہیں تھا پاپا! بس اچانک تھوڑا سا بیمار ہو گیا تھا اس لئے ڈاکٹرز نے ٹیسٹ اور چیک اپ کے لئے بلایا۔"

"کیا دوست شہریار اتنی جلدی جلدی بیمار؟ یہ اچھی علامت نہیں ہے۔"

"آپ کیا کہہ رہے پاپا! اچھی علامت ہو یا نہیں، زندگی میں آنے والی تبدیلیوں سے کون جان چھڑا سکا ہے؟"

"مطلب؟" پاپا کی پیشانی یکدم کچھ زیادہ گہری اور پریشان کر دیا۔

"آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں پاپا! جیسے میں نے آپ کو بتایا نا۔" وہ ہنس کر بولی۔ "میں نے یونہی ایک ... سی بات کی تھی پاپا! آپ پتہ نہیں کیا سمجھے؟"

پاپا کی آواز میں ... تھی اور ماما ... وہ واپس لوٹ گئی تھیں۔ اپنے کمرے میں آ کر ان کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ پتہ نہیں کب تک وہ اپنا کمرہ بند کر کے روتی رہی تھیں۔ پھر ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ ... آنسو خشک کر کے وہ اس کے کمرے کی طرف دوبارہ نگرانی کو گئی تھیں۔

باہر سے آؤٹ ہاؤس کا دروازہ کھلا ہی رہتا تھا۔ ہاں البتہ اس کا کمرہ اندر سے لاک ہوتا تھا مگر غیر متوقع انہوں نے اس کے کمرے کے دروازے کو چھوا ہی تھا کہ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ کافی انجانوں پر رکھے وہ بہت گہری نیند میں سو رہا تھا۔ ماما نے اس کی کلائی میں ... ساتھ ... دیکھے تھے اور ایک بار پھر ان کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔

"آخر میں کیا کروں ایسا کہ تیری عمر کے سارے دکھ مجھے مل جائیں تجھ پیارے؟" ماما نے اس کے نقش کو چھوا بھی، بہت واضح لہجے میں بولا بھی مگر وہ ایسی گہری نیند میں تھا کہ ہلکا سا بھی کسمسایا نہیں۔ حالانکہ پہلے نیند کا اتنا کچا تھا کہ قدموں کی چاپ سے بھی اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔

ماما وہیں بیٹھی رہی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ شام کے چھ بجے جاگا تو ماما کو اپنے کمرے میں پایا۔

"ماما! آپ...... آپ کب آئیں؟" وہ حیرت سے اٹھا۔ ماما کو ... سے اٹھنے سے بہت پہلے ... ماما نے ... کے اس کے قریب آ کر اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر پوچھا۔

"میں بھی تھوڑی دیر پہلے ہی آئی تھی۔ تم تو کبھی بھی دن میں ... سوتے تھے ... آج ... شاید سفر کی تکان زیادہ ہو گئی ہے ناں؟"

"جی ماما!" اسے ماما سے جھوٹ بولنا عجیب لگا تھا مگر اس نے جھوٹ بول دیا تھا اور ماما نے اس کے جھوٹ کو خاموشی سے پی لیا تھا۔ پھر مدھم لہجے میں بولی تھیں۔

"تم نہا دھو کر فریش ہو جاؤ تو میں تمہارے لیے چائے نکلواتی ہوں۔"

"اوکے ماما!" وہ بیڈ سے اٹھ گیا تھا اور ماما کچن کی طرف چلی گئی تھیں۔

❁❁❁

شافعہ کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملتے ہی ملاسا ارسلان ہاسپٹل پہنچ گیا تھا۔ پہلی بار وہ ایک نئے طرح کے خوف سے لرزا تھا۔ شافعہ ہاسپٹل کی بابت اپنا خوف تحریر کر رہی تھی۔ تب اسے لگا تھا وہ جو بھی چھپاتا آرہا تھا وہ کسی نہ کسی کی زندگی میں ایسا ہی حادثہ بن کر رونما ہوتا ہوگا۔ تحریر وہ اپنے قلم سے ہو بہو ہی یا بلکہ ذہن سے اس واقعے کو اس طرح پیش کرتا تھا کہ اس کا ممدوح بنا کا سب سے بڑا ذریعہ لکھنے لگتا تھا۔ سچائی چھپانے کی سزا اگر کسی دوسرے کی زندگی کو بدنما کی طرح لگ جاتی۔ اگر واقعی شافعہ کو کچھ ہو جاتا تو...... یہ سوچ کر اس کا دل لرز جاتا تھا اور پہلی بار ایک سچ نے اسے اسی خوف سے چند لمحے بعد تھے ورثہ دیا تھا۔ ہم حادثے کا مطلب اس وقت تک سمجھ ہی نہیں پاتے جب تک وہ حادثہ خود ہماری زندگی سے قربت اختیار کر کے ہماری سانسیں اتھل پتھل نہیں کر دیتا۔ ہم خبر کو صرف ایک خبر سمجھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ جو گیا تھا یا تھا۔ جب وہی خبر خود ہماری زندگی سے کسی خون آشام کی طرح آ کر چمٹ جاتی ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ واقعی اس خبر میں کتنا درد کتنی آہیں، کتنے بین چھپے تھے، جو ہماری سماعتوں نے ان سنے کر دیئے تھے۔

وہ یہاں بیٹھا تھا اور اس کے اندر اس کی ذات ایک کشمکش میں پارکس میں کھڑی تھی۔

ارسلان راشدی صدیقی عبدالرحمٰن کی تعریف کرتے نہیں تھک رہے تھے اور ملاسا ارسلان کا دل چاہ رہا تھا وہ بھی بہت سی غیر ضروری باتوں میں رکھ کر ایک بہت ضروری بات پوچھے کہ شہریار عبدالرحمٰن کیسا ہے؟ اسے کچھ دنوں پہلے کی ملاقات بہت شدت سے یاد آئی تھی جب وہ اس کے برنش لہجے پر یونیورسٹی والے لڑکے جیسی سنجیدگی سے مخاطب تھا۔ وہ اس پر گرج برس رہا تھا اور وہ۔ مٹی کی طرح کھڑا سن رہا تھا۔ ماں کہتی ہیں وہ بہت اچھا انسان ہے۔ زہرہ بھی کہتی ہیں اس جیسے سچے اب دنیا میں خال خال دکھائی دیتے ہیں، جو اپنے حصے کی خوشی سے دوسروں کی جھولی میں ڈال دیں۔ ماما کہتی ہے شہریار بھائی کی وجہ سے ان کی زندگی ذرا سی بیٹس ہو گئی ہے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو پھر ندا نے تو شاید ہمیں گھر سے بے گھری کا عذاب بنا دیتیں۔

ناٹک...... ملاسا ارسلان کی روح پھر سے آنکھوں میں کھنچ آئی اور سامنے شوکیس میں لگی ہوئی شافعہ کی طرف اس کی نظر مرکوز ہو گئی اور ایک پرانی یاد در آئی، جہاں وہ شافعہ کے ساتھ کھڑا اختتامی سیشن کانفرنس کی کوریج کر رہا تھا اور بیک گراؤنڈ میں نغمہ گونج رہا تھا۔

یہ کرب یہ پیام گھر و گشتی کے

یہ لمحے کاروان زندگی کے

کہاں ہیں، کہاں ہیں محافظ خودی کے؟

ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

اس نے زینب کی اٹھان [illegible] پشت بھی [illegible] اور اس کا اسسٹنٹ کورٹ کے ساتھ ساتھ کانفرنس کی فوٹیج بھی لے رہا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، یہ سب بکواس ہے؟" اس کے اسسٹنٹ کم دوست نے چیمبر نے کی کوشش کی اور وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔

"مجھے ایسے لوگوں سے نفرت ہے [illegible] جو اپنی تکلیفوں کے [illegible] ان کے خواب دکھاتے ہیں۔ ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہا۔ یہ اگر یہاں خود اپنی عزت کی اہمیت نہ سمجھیں تو؟"

"بکواس مت کرو، اگر کسی کے کان میں پڑ گئے [illegible] ابھی کمرے سے باہر نکل رہے ہیں۔" دوست نے معنوی سی مسکراہٹ سجا کر کانفرنس کی [illegible] بالخصوص پوز لیا اور زینب آگے بڑھ گیا۔

یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے ماں بھی

مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی

یشودا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی

پیمبر کی امت زلیخا کی بیٹی

ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

اس نے طنز سے چیمبر پر اس کی طرف دیکھ کر مسکراہٹ کو [illegible] میں مجھ لا اور اس کے دوست [illegible] "یہ عورت بھی کمال کی چیز ہے۔ تمہیں پتہ ہے اس کے بیٹے کی شادی پر [illegible] آپ کو بھرا ہوا تھا [illegible] باقی [illegible] کہاں رولی ہوئی تھیں [illegible] اور اس کے بیٹے اور اس کے دوستوں نے کسی بھی قسم کے احتجاج کی خاطر میں نہ

اسے ہونے کا رونا نہ ڈال رہی تھی اور رقم بھی کوئی خاص نہیں پڑتی تھی۔

”چپ کرو، وہ مجھے ہی بے وقوف بنا رہی ہے۔“ علامہ نے اسے بمشکل چپ کرایا اور آخری بند اس کے کانوں میں سیسے کی طرح اترا۔

بادِ خزاں ادب کر باد

بکھرے ہیں پتیاں، دے منتشر بکھراؤ

تا خوابِ غفلت میں مشرق کا بلاؤ

تا خوابِ غفلت میں مشرق کہاں ہیں؟

رضوی نے اس کے کان میں گنگنا کر کہا۔ ”خوابِ غفلت میں مشرق بلاؤ، بلا لیا گیا اعتبار اٹھ گیا اذانِ مشرق کا ذرا سا اثر، مست ہو جائے گا.....“

”کیا بکتا ہے، مسلمان ہے بھی یا نہیں؟“ علامہ نے اسے چٹکی کاٹی اور حقارت سے ہنس کر بولا۔

”موقع اور وقت کے حساب سے میں سب کچھ ہوں۔ جہاں کامیابی کے امکانات ہوں، پاؤں رکھتا ہوں، تم جیسوں کی طرح نہیں جھکتا۔“ وہ ہنسا۔ پھر بولا۔ ”ادھر دیکھ، تیری گرل فرینڈ تیرے پاس آ رہی ہے۔ میں تو چلا۔“

علامہ ارسلان ہنس کر چپ ہو گیا اور اس کی اس قسم کی تعریف کرنے لگا جو اس نے لفظوں میں بیان کی تھی۔

”مسز رضا بہت اچھی انسان ہیں۔“

”ہاں، واقعی ان جیسے انسانوں کی وجہ سے ہی دنیا قائم ہے۔“ اس نے طنز کرنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر طنز پھر بھی جھلک آیا تھا۔

وہ سارے ہنگامے کو بے تحاشا جذباتی ہو کر دیکھ رہا تھا، جس کے سامنے لڑکیاں چیخ رہی تھیں۔ ایک گھر سے فرار ہو کر بھاگنے والی تھی اور ایک جبراً اغوا کی گئی تھی۔ دونوں کے انجام ایک جیسے تھے۔ علامہ جانتا تھا ان کو بنگلوں کے بعد ان لڑکیوں کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ معلوم نہیں سارے این جی اوز کس جگہ پہنچتے ہیں۔ مگر مسز رضا جس این جی او کی چیئرپرسن تھیں وہاں ایسی لڑکیوں کے نام پہ امداد اکٹھی کی جاتی تھی مگر بہت سے بند ہو جاتے۔ فرار کے لئے مجبور لڑکیاں رہائش کھانے اور عزت کے بدلے میں بڑا احسان مانتی، اگرچہ اچھی جاتی تھیں۔ جس جگہ پہ انسانیت کے نام پہ کسی ہاتھ

AANCHAL.COM.PK

بکھر کر رہ گیا تھا۔

"مجھے لگتا ہے مسز رضا! آپ کو ایسی لڑکیوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ ورنہ اتنی کوفت نہ ہوتی آپ کے چہرے پر۔" شافعہ کسی سلسلے میں آگے نکل چکی تھی جب مسز رضا نے اسے اکیلا پا کر اس نے مڑ کر انہیں دیکھا پھر تلخی سے بولا۔

"ایسی لڑکیوں سے ہمدردی کیوں کی جائے مسٹر! جنہیں دل کی پروا نہ ہو جنہیں دل سے جڑی کسی بات میں دلچسپی نہ ہو، کیسے سنبھالے گا؟ ایسی لڑکیاں...... انہیں تو بس فرصت میں کوئی مار دینی چاہیے۔"

"کیا انہیں یہ حق ہے کہ وہ کسی کو مار سکیں؟ میں نے سنا ہے وہ بچی تو گھر چھوڑ کر بھاگ گئی تھی ناں؟" مسز رضا نے جانے کس جنم کا بدلہ لیا تھا۔ حالانکہ اس کا خون کیا گیا تھا، وہ جا چکی تھی آگ میں جھونک دیا گیا ہے۔ لالی رخ نگاہوں سے اس نے مسز رضا کو دیکھا پھر تلخی سے بولا۔

"زندہ انسان کو کوئی مارنے کا سوچتا ہے اور جو دل میں مر چکے ہوں انہیں مارنے کے لیے کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑتی صرف ایک بے نیازی کافی ہوتی ہے مسٹر! یہ دل کی باتیں ہیں، یہ آپ جیسی سوکالڈ بیوپاری نہیں سمجھ سکتی۔"

مسز رضا جتنا کر آگے بڑھ گئیں۔ وہ واپس پلٹا تو اپنے پیچھے شافعہ کو کھڑے پایا۔

"آپ...... آپ کب آئیں؟" اسے پتہ نہ چلا کہ دوسرے ہی لمحے وہ اس کا گھٹنا ملانے لگا تھا۔

شافعہ نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا تھا، پھر نرمی سے بولی۔ "آپ کو کس بات کا اعتبار نہیں ہے، مجھ پر یا خود پر؟"

"پتہ نہیں۔" اس نے سگریٹ سلگایا اور وہیں کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ نے ماضی کے بعد شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزارا ہو جس میں آپ کی نظروں کی تپش سے وہ بچی ہو۔ وقت بدل رہا ہے۔ آپ کہتے ہیں آپ کو اپنی محبت پر اعتبار ہے۔ لیکن مجھے لگتا ہے آپ کو سب سے زیادہ خود پر شک ہے۔ آپ اندر سے سہمے ہوئے ہیں اور باہر سے پتھر بننے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی آپ کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ انسان اپنے آپ سے لڑتا رہے تو بہت جلدی تھک جاتا ہے۔ رہی بات ایسی لڑکیوں کی تو کبھی یہ خیال بھی آیا آپ کو، مجھے کہنے دیجیے، آپ اپنے اندر کا فرسٹریشن باہر نکالنے کے لیے ایسا کر رہے ہیں۔ اگر نہ ملتا اگر زندگی میں

تبھی آپ کے سامنے آتی تو آپ اس کے چہرے پہ بے نیازی والی فطری سی خوشی نہیں دیکھ سکتے۔ آپ اندر سے اتنے ڈسٹرب ہیں کہ اس کی جگہ اگر کوئی انجان لڑکی بھی آپ کی مدد کی طلب گار ہوتی تو آپ پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ پلیز ماما اپنے اوپر سے یہ بوجھ اتار دیجئے، آپ کیا ہیں، سمجھئے......"

"ماما! آپ ریسٹ کریں۔ کس سانحہ کی سیریس خبر نہیں ہیں۔" اس کی آواز اسے پھر سے حال میں لے آئی اور یکدم اسے عدیل عبدالرحمٰن کا محبت آمیز رویہ یاد آنے لگا۔

"دولت بری نہیں ہوتی، اسے استعمال کرنے کا ارادہ کرنے کا فیصلہ اچھا یا برا ہوتا ہے۔ استعمال کرنے کا طریقہ ٹھیک یا غلط ہوتا ہے۔"

عدیل بھائی کے ہاتھ کا لمس اس کے کندھے پہ ثبت تھا۔

"پتہ نہیں کون ہے جو میرے بابا کے پروجیکٹ میں ساری رقم کے کانٹے چھانٹا چاہ رہا ہے؟" اس کی ذہنی رو پھر سے شہریار کی طرف مڑ گئی۔ زہرہ بیگم کا لہجہ گونجنے لگا، وہ اس لہجے میں نجانے کیا جھلکتا چاہتا تھا کہ جنید بھائی کی آواز آنے لگی۔

"پتہ نہیں کیا وجہ ہے کہ شہریار مکس میں نے اس کا خاکہ اور فیصلہ بدل دیا۔"

اس وقت اس نے دل کے اندر شہریار کے لئے ایک لمحے کے لئے چاہا تھا کہ اس کی اچھائی کا کوئی مطلب پست ہونے کے پیچھے الزام سے بچا کر چلا جاتا مگر اس لمحے اس نے پوری آواز سے کیا تھا کہ جو بیگم کے گھر واپس ہونے زندگی کے سفر میں شوقی کے ساتھ شامل ہونے میں ان کا کوئی مطلب تھا؟

دماغ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر بھی ایک مندگی تھی، شاید وہ ایک غلطی کر بیٹھی ہے، سے معاملہ جاننا تھا کہ کیا واقعی اسے گھر جانے کے فیصلے میں وہ کہیں شامل تھا؟ کیا واقعی اسے معمولی سا الزام دیا جا سکتا ہے؟

کیا کبھی اس نے اس کی محبت کو اپنے کسی مفاد کے لئے استعمال کیا تھا؟ کیا شہریار نے اس کے ساتھ جتنا بھی اچھا کیا، جتنے بھی لمحات میں وہ اس کے کام آیا، کیا کبھی اس نے اس کا ریٹرن مانگا، کبھی جتایا؟

وہ تو بڑا اچھا کام کر کے بھول جایا کرتا تھا۔ شو بھی نہیں کرتا تھا۔ بس یہی اس کی اچھائی، نیکی کی علامت سے متاثر رہا کرتی تھی۔ لیکن کیا واقعی وہ متاثر ہوا کرتا تھا یا احسان ان کے اندر ایک ادا سنجیدگی بنا کرتا تھا جسے وہ خود ساختہ احسان مندی میں چھپائے رکھتا تھا؟

اماں کہتی ہیں وہ دائمہ کی طرح شاید انسانوں سے نہیں مال کی امارت سے متاثر ہوا تھا۔ اس کے اندر خلا تھا۔ کیا واقعی یہ ٹھیک تھا؟

پچھلے دنوں وہ کبھی فنیس پاکس کے لیے تیار تھا کبھی بانٹیں شگن روح کے اندر کوئی اس کے اس دوہرے خول کو کمر چے جا رہا تھا۔

آخر یہ تبدیلی کیوں ہو رہی تھی؟...... اس نے لمبا ٹھنڈا سانس کھینچ کر سوچا اور دل نے کہا۔ انسان اپنے اوپر آنے والی ہر مصیبت ہر دکھ ہر تکلیف سہہ جاتا ہے مگر وہ جس سے محبت کرتا ہے اس پر گرم ہوا کا ایک ہلکا سا تھپیڑا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک کانٹے کے برابر خراش بھی سہہ نہیں سکتا اور پھر شافعہ...... شافعہ صرف اس کی محبت کہاں تھی وہ تو اس کے اپنے وجود کا حصہ تھی اور وجود پر ہونے والی افتاد اسے دل اتنی آسانی سے کب بھلا پاتا ہے؟

کیا وہ اندر سے بدل رہا تھا؟...... اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور چپکے سے کروٹ بدل کر جیسے باہر آگیا تھا۔ اچانک اسے اس لمحے کی اماں کی خفگی بھی یاد آنے لگی۔

"تم...... مجھے تو نہیں لگتا تھا تم جتنا تم بدحواس ہوتے چلے جا رہے ہو۔ اتنا ہی تنگ ہے تم ہی بچھڑا جا رہے۔ تم ایک ماں کی محبت کو دولت کے نظریے سے دیکھنا چاہتے تھے۔ تم بھی دائمہ جیسے ہو۔ اسے بھی انسانوں کی قدر نہیں تھی۔ وہ بھی دولت کو سب کچھ سمجھتی تھی اور تم بھی دولت ہی کو سب کچھ سمجھتے ہو۔ اب تو مجھے یہی کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے تم نے کہیں شہریار کی وجہ سے تو اس سے دوستی نہیں گانٹھی تھی؟ ہوسکتا ہے ہاں، کچھ لوگ دوسروں کے پیسوں پر عیش کرنے کے بڑے حریص ہوتے ہیں۔"

کیا واقعی وہ حریص تھا؟" اس نے دل میں جھانکا۔ اماں خفا اس کے سامنے پھر آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

وزیر آرزو میں زہرہ پھپھو اور اماں سب سے پہلے داخل ہوئی تھیں۔ وہ خاموشی سے اماں کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان کے رویے میں اس کے لیے خفگی تھی مگر شافعہ سے وہ بہت محبت آمیز رویے سے مل رہی تھیں۔

"آپ کا شہزادہ ابھی کمپنی سے نہیں آیا؟" اس نے جان کر اماں سے بات کر کے چھیڑا۔ مگر اماں خاموش رہیں۔

زہرہ پھپھو بولیں۔ "اماں سے اس کی بات ہوئی تھی وہ ایک دو دن میں کراچی واپس آنے والا ہے۔"

"واپس آنے والا ہے اور آتے ہی ایک دھماکا اس کا منتظر ہے۔" اس نے شہریار کی واپسی کا سوچ کر "میں لگنے والی آخر رپورٹ کے بارے میں سوچ کر خود سے کہا۔ مگر اب معاملہ اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ مسز یوسفی کی بات ماننے کے لیے مسٹر حسن اور اہم نے شہریار کی ذات کے بخیے ادھیڑنے کا کام سونپا تھا اور اس نے اس کی طرف سے خارج وجہ سے یہ رپورٹ تیار کی تھی۔ مگر اب یہ

ریپورٹ...... وہ تھوڑا سا بجرا سا ہوا تھا مگر یہ بیراگی پاگل پن نہیں تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ شائد کی وجہ سے اس کی سوچ میں بہت تیزی سے بدلاؤ آیا تھا۔ لیکن یہ بدلاؤ ایسا ہی تھا جیسے تیز سمندر کو تھوڑا سنبھال سا اب سمندر پُرسکون ہو کر سب کچھ بھول جانے کا ایا ارادہ کیے، یہ وقت کو سمجھ سکتا تھا۔

* * *

زندگی ان کی نظر میں محبت سے کہیں زیادہ دولت میں پوشیدہ تھی۔ جب بھی انہوں نے زندگی کا ایک نقشہ کھینچا اس میں محبت کے فانوس، قمقمے نکلے نہ جانے کیوں عود و عنبر کی خوشبو میں نکلے نہ وجود بکھرا یہی مگر آسائشات کے کام پر ہمیشہ انہوں نے اپنا دل جھکتا ہی پایا تھا۔ زندگی میں دولت سمجھ و مقدس ہو اس کا کبھی انہوں نے کچھ اہتمام رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی، جب دولت نے گھر کی راہ دیکھی تو ان کے اندر کی حریص عورت نے سوچا یہ ساری دولت کس طرح اپنی ہو سکتی ہے۔ اور بس پھر آنکھ بند کر کے انہوں نے جو سمجھ میں آیا کیا۔ گھر کسی کا بسایا بھی، اجاڑا بھی، پھر زندگی سر پہ تیز دھوپ کی طرح چھا گئی تو انہوں نے اسی اجڑے ہوئے گھر کی دلداری میں توجہ اور اذیت گزاری۔ مگر یہ تب بھی محبت کے ضمن میں نہیں تھی۔ تب بھی انہوں نے گھاٹا اور کچھ بیٹے کے پیرائے میں بانٹ لیا تھا۔ پھر زندگی کا نیا سفر شروع ہوا تو خبر ہوئی، آسائشات اور دولت کا جو ایک الگ کر لانے کا پیرایہ اپنایا تھا، وہ کہیں درمیان ہی سے محبت کے نقصان میں کھو گیا ہے۔ جس دل پہ انہوں نے دستک دی تھی اس دل پہ تو محبت نے پہلی دستک پر ہی کھل جانے کے بعد سے ہی اندر سے دروازہ لاک کر دیا تھا۔ وہ باہر کھڑی رہ گئی تھیں۔ مگر حسرت کا شدید لمحہ دل میں آیا تھا۔ مگر نکل جانے کے لالے پڑ گئے تھے۔ جس انسان کی دولت کی چاہ نے انہیں عورت کے معیار سے گرا دیا تھا، وہ عورت ایک بار پھر سے بیچ ہو گئی تھی۔ تب پرانی شناسائی اچانک سر اٹھا گئی تھی۔ وہ نفس میں آ گئی تھیں... خود اس کی طرف اٹھنے لگے تھے۔ پھر تیز دھوپ میں تھکے پیر چلنے کے لائق کند گھر کی سربراہ کا جھونکا چھو جائے تو آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی جاتی ہیں۔ سو انہوں نے بھی دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اندر کی عورت کو ایک بار پھر سے ضمیر کی گولیاں کھلا کر خودکشی پہ مجبور کر دیا تھا۔ پھر دوبارہ اس شناسائی سے ملنے گئیں باقی ہی چل گئیں۔ یہاں تک کہ زندگی کا سب سے بڑا جھٹکا جیتیں۔ شناسائی پھر لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گئی اور وہ ایک دھوکے کے لیے گھر واپس آ گئیں۔

وقت دیکھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس دھوکے نے نیا جنم لیا۔ ان کے شریک سفر نے پہلی بار مردہ آنکھوں سے ایک امید کو زندہ ہوتے دیکھا۔

"میری بیٹی...... ایک میری اولاد ہے۔" انہوں نے بچی کو گود میں لیا اور وہیں جھک گئیں۔ کچھ کہہ بھی نہ پائیں۔ اور آج اتنے سالوں بعد یہ سوال پھر سے سر اٹھا رہا تھا۔

"مجھے کریشن سے نفرت ہو گئی۔ یہ تو میری بیٹی تھی نا آمنہ، یہ تمہاری بیٹی تھی نا پھر یہ سب کچھ کیوں ہوا؟" آوازیں، اردگرد آوازیں......

وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''تمہاری بیٹی ہوتی تو شاید یہ ایسی نہیں ہوتی تم تو درویش صفت انسان تھے اور وہ...... وہ خطیب وقت تم سے کہیں زیادہ چاہا اور محبت کی بھوکی تھی۔ مگر میں نے اپنی حرص اور لالچ میں سب بھلا دیا۔''

''کمیل......!'' وہ سر پہ ہاتھ رکھ کر رونے لگیں۔ اور آخری فون کال ان کے کہیں اندر دل کے خاموش کمرے میں گھٹی چیخ گئی۔

''مت کرو یہ سب آصفہ! آخر تم کیوں برباد کرنا چاہتی ہو میرے ارسل کے گھر کو؟ عطیہ اتنی پیاری، اتنے اچھے سلوک والی لڑکی ہے۔ اس نے ہمیں ایک بیٹی کا سکھ دیا ہے، مگر تم کیسی ماں ہو اپنی بیٹی کا گھر برباد کرنا چاہتی ہو۔ کتنی دولت چاہیے تمہیں؟ آخر کس دولت کا معیار چھونا چاہتی ہو؟ یاد رکھو تم تو وہ عورت تھیں جو کہتی تھیں دل بہت ضروری ہے، محبت کے بغیر تمہیں سانس نہیں آتا تھا، پھر...... پھر آج کل......''

اور پھر دولت کے لیے انہوں نے جتنی بھی ہوس کا اظہار کیا تھا، کمیل راشدی کے لیے وہ صدمے سے کم نہیں تھا۔ ان پر ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا تھا۔ انہوں نے کمیل راشدی کے ساتھ خوش ہونے کے جتنے خواب اور سپنے لکھے تھے، سب ایک ساتھ انڈیل دیے تھے۔ اور یہی بات اتنی جان لیوا ثابت ہوئی تھی کہ وہ گاڑی پر اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکے تھے۔ گاڑی ایک دھماکے کے ساتھ کہیں سے ٹکرا گئی تھی۔ وہ گھر میں بے ہوش ہو گئی تھیں۔

''کمیل... کمیل....!'' وہ چیخی بھی تھیں مگر ان کی چیخیں ان تک واپس لوٹ گئی تھیں۔

ارسلان راشدی شام تک کارروائی کے بعد لاش گھر لا سکے تھے اور آج اتنے سالوں بعد ان پر کھلا تھا، درحقیقت ارسلان راشدی، کمیل راشدی کے بے جان وجود کو نہیں شعوان کو دفنا کر آئے تھے۔ انہیں مرے ہوئے اتنے سال ہو گئے تھے اور لوگ آج بھی انہیں زندہ سمجھتے تھے۔

ایک بم پھٹنے سے جیسے کسی ایک گھر کی منہدم عمارت کا سارا ملبہ ان پر آن گرا ہے۔ ان کی سانس بھی تھمی کی تھمی رہ گئی، ان پر پھر سے کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ سونیا گھبرا کر ان تک آئی تھی۔ وہ کسی پرانے طریقے سے وہ انہیں دلاسہ دے رہی تھی کہ اچانک انہوں نے اسے جھٹک دیا۔

''دفع ہو جاؤ تم...... تم میری بیٹی نہیں ہو۔'' سونیا نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔ ''چلی جاؤ...... تم اگر ارسلان کی بیٹی ہوتی تو...... تو مجھے یوں نہ کھٹکتا، اپنے باپ کی طرح دھوکے باز، مفاد پرست نکلی ہو تم۔'' سونیا کھڑے کھڑے بیٹھ گئی تھی۔ ''میں تمہاری بیٹی ہوں ماں!'' اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے ماں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور سسک کر چیخ کر کہا۔

AANCHAL.COM.PK

"ہاں ہاں...... تُو میری بیٹی ہے میری بیٹی...... اسی لئے ایسی ہے۔ تجھے عزت پہ دولت زیادہ پیاری لگتی ہے......" وہ اسے گالیاں دے رہی تھیں۔ اس لمحے انہیں لگ رہا تھا وہ جتنا زیادہ اسے برا بھلا کہہ رہی تھیں، اتنا ہی وہ اپنی کسی غلطی کو کم کر رہی تھیں۔ مگر زرش نے یکدم انہیں ایک قبر میں لا کر کھڑا کر دیا۔

کیا یہ غلطی سونیا نے کی تھی؟

کیا وہ اس سلسلے میں بالکل بری الذمہ تھیں؟

کیا یہ غلط تھا کہ ان کی غلطی کو سونیا نے اپنے کندھے پہ اٹھانے کا دکھ جھیلا تھا؟

وہ گم صم سی سونیا کو دیکھے گئیں۔ ان پہ پھر سے کھانسی کا دورہ پڑا اور اسی وقت فون کی بیل بجی۔ سونیا بھاگتی ہوئی دروازہ کھولنے گئی۔ مگر جو شخص سامنے کھڑا تھا اس نے سونیا کے قدموں پہ پڑے ہوئے بوجھ کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں یکدم آنسو بھر آئے تھے۔ زوار حسن اس سے ملے بغیر چپ چاپ گھر سے باہر چلا گیا تھا یا کہاں غائب تھا؟ اور وہ تین دن سے اس کے بے خبر گزارا کر کے تھک گئی تھی۔

"یہ مرد بھی آپ کے نہیں ہوتے۔" زرش نے ایک دفعہ اس سے جانے کس مشکل میں عمر وحید کی باتوں سے تنگ کر خاموش بیٹھی ہوئی سونیا سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ اس وقت زرش بے حد غصے میں تھی اور سونیا نے زوار کو کسی اور کے لب و رخسار کی تعریف کرتے دیکھ کر اپنا خون جلاتے ہوئے زرش کا یہ جملہ سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس وقت اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔ اور آج آصفہ اور سلمان راشدی نے جو کیا تھا، اس نے اس کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اس کی ذات اتنی رائیگاں اور اس کی شناخت اتنی کمزور، زوار حسن سے منسوب تھی کہ وہ یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکی۔

"سونیا..... آپ رو رہی ہیں؟" وہ یکدم اندر آ گیا تھا اور اس کے آنسو وہ کب تھمنے تھے۔

"دل دکھانے کی سزا اتنی کڑی ہو سکتی ہے شہریار صاحب؟"

"کتنی کڑی؟" شہریار عبدالرحمن نے نرمی سے پوچھا اور وہ جو ذہنی طور پہ بالکل ختم ہو چکی تھی، کسی نفسیاتی مریض کی طرح بڑبڑائی۔

"اتنی کڑی شہریار صاحب! اگر آپ کا سچ برسوں بعد آپ کو پتہ چلے کہ آپ جس کے نام کی شناخت لئے گھومتے رہے ہیں، جس کے نام پہ اتراتے رہے، جس کے نام پہ آپ دل کی ہر بات نکالنے کے لئے کچھ بھی کہہ سکتے تھے، وہ آپ کا کچھ نہیں لگتا تھا۔ میں تیز چلچلاتی دھوپ میں تنہا رہ گئی ہوں۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ نہ میری ماں...... نہ میرا باپ۔ پتہ نہیں میرا باپ کون تھا؟" وہ فون

رنگ آنکھوں سے شہریار کو یوں دیکھنے لگی جیسے اس بے ساختہ ہنسی کی ہر ادا اس نے ہی اسے دی تھی۔

"سوہنا! آپ اپنے آپ کو سنبھالیں۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

سوہنا نے یکدم چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بالکل گم صم ہو کر دوبارہ سے لگ کر زمین پر بیٹھ گئی۔

افتخار سلطان راشدی اس عرصے میں اپنے کمرے سے نکل کر باہر آ چکی تھیں۔

شہریار نے افتخار سلطان راشدی کو دیکھا اور اسے لگا اس کی دل میں کہیں کچھ ٹوٹا ہے۔ پاپا نے اسے بتایا تھا کہ ان کے گھر کے... والے نے کس طرح انہیں فون کیا تھا اور جب وہ وہاں پہنچے تو بارش میں وہ گلی میں گھر کے دروازے سے ٹیک لگائے عطیہ بانو کس طرح برف کی مورت بنی ہوئی تھیں۔ انہوں نے انہیں کیسے سنبھالا، اٹھایا تھا۔ انہیں اس لمحے لگا تھا عطیہ بانو کو جو خبر وہاں کے ساتھ چلا گیا تھا اس کی روح وہیں دروازے سے ٹیک لگائے جیسی رہ گئی تھی۔ زندگی کا فیصلہ ان کی آنکھوں سے مرنے دیکھا تھا اور دل میں محسوس کیا تھا، زندگی کا ایک حصہ شوہر کے دل میں بھی مر گیا تھا۔ پھر تین دن تک ان کی اپنی رہتے اور بچوں کو ختم ہوتے دیکھا، دوبارہ انہیں ایک آگے کی کمی ہو گئیں کہ پاپا کے ہاتھوں میں جدائی کے لمس کا اثر تک نہ ہو سکا۔

"کون ہو تم؟" افتخار سلطان راشدی اس تک آ گئی تھیں۔ اور وہ گم کیفیت میں نظر ڈال کر دیکھ رہا تھا۔ اندر سے کوئی چیز ٹوٹا تھا۔ وہ سوہنا کی بدتمیزی کا ثبوت ان عورت کو کیا دے کر نہ بنا دے... جا کیا ہوتا۔ مگر یہ عورت...... یہ عورت اس کے باپ کی بیوی تھی اور زندگی نے اس کی ذات پر بھی چڑھا رکھے نقش ثبت کر دیے تھے۔ وہ بظاہر زندہ تھیں مگر شہریار کو اس لمحے لگا، وہ زندہ رہنے کے صرف دکھاوے میں لگی ہوئی ہیں۔

"کون ہے یہ؟...... کیا یہی زوار حسن ہے؟" افتخار سلطان راشدی چیخیں اور وہ دو قدم پیچھے کو ہٹ گیا۔

"تو ہم انکل شہریار ہیں...... شہریار زوار حسن۔ مجھے پاپا نے شافعہ کے لئے لاہور گڑیا کو لینے بھیجا تھا۔"

افتخار سلطان راشدی کی آنکھوں میں دکھ کی شدت کے مارے کہ سب رونے لگا تھا۔ انہوں نے سوہنا کو آواز دی۔

"اٹھو جلدی سے۔ بیٹا وہاں جلدی جاؤ گی۔ کھانا بند کر دو ابھی۔"

"بہن..... کون سی بہن؟ میری کوئی بہن نہیں ہے۔ میری کوئی ماں نہیں ہے۔"

شہریار نے پلٹ کر سونیا کو دیکھا اور اس کے چہرے پہ ترحم ابھر آیا۔

اسفندیار ملک راشدی اس کے انکار پہ ٹوٹ گیا تھا، بالآخر وہ ... میں چلی گئی تھیں اور شہریار اس کے قریب اس کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

"میرے ساتھ چلو گی؟"

سونیا نے خالی آنکھوں سے اسے دیکھا پھر سرسراتے لہجے میں بولی۔ "تم بھول گئے ہو؟" وہ کچھ دیر بعد بولی۔ "اگر تم سوچ رہے ہو میں تمہارے ساتھ ضرور چلوں گی۔ میں جینا چاہتی ہوں شہریار صاحب!"
اس کے لہجے میں اب نئی سوچ تھی اور کرب۔ وہ ایک لمحے کو الجھن کی طرح دکھی لگ رہی تھی۔

شہریار نے کچھ نہیں کہا۔ گہری سانس لے کر اسے بانہوں میں تھام کر اٹھانے لگا۔ پھر اسی کے لہجے میں بولا۔ "چلو آج ہم دونوں خاموشی سے زندگی کو آوازیں دیتے ہیں۔ زندگی کی تلاش کرنے نکلتے ہیں۔ کیا پتہ موت سے پہلے ہمیں زندگی خود ہماری تلاش میں حیران ہو کر ہمیں دیدار کرا دے۔"

سونیا مسکرا دی۔ پھر کھڑی ہو گئی تھی۔

شہریار عبدالرحمن اسے کار میں چھوڑ کر گھر کے اندر چلا گیا تھا۔ پھر واپس آیا تھا۔ کار ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے اس کے چہرے پر ... دیکھا تھا پھر مدھم لہجے میں بولا۔

"تم جانتی ہو..... کیا تم اب بھی سمجھتی ہو کہ دنیا میں کچھ بھی اچھا نہیں رہا ہے؟"

سونیا نے خالی آنکھوں سے اسے دیکھا پھر گھبرائے لہجے میں بولی تھی۔ "میری زندگی میں کچھ اچھا ہوا؟ کہاں سونیا ہوتی؟ کیا میری ماں اسفندیار ملک راشدی ہوتی؟"

"کیا تم اپنی ماں کی غلطی کا جرم نہیں دے سکتیں؟ وہ بشر ہیں اور غلطی بشریت کی پہلی پہچان ہے۔"

"مگر میں اُن کی سزا پر کھڑی رہ گئی ہوں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ان چیزوں سے گزرنے کا کیا مزہ ہوتا ہے۔ میری زندگی ... رہ گئی ہے اور کوئی نہیں ہے جو مرا تھا۔ مجھے زندگی سے نفرت ہو گئی ہے۔"

"تم جینا نہیں چاہتی ہو؟" شہریار نے کار کو موڑتے ہوئے سوال کیا اور وہ خالی دل سے لہجے میں بولی۔

AANCHAL.COM

"آپ کو کیا لگتا ہے، میں زندہ ہوں؟" شہریار نے اس کا چہرہ دیکھا جہاں واقعی زندگی نے موت اوڑھ لی تھی مگر اسی وقت کی فضا نے اسے زندگی کو کھینچ نکالا تھا۔
"تمہیں اگر میں کہوں زندگی اب بھی تمہارا استقبال کرنے کے لیے تیار کھڑی ہے تو تم کیا سوچو گی؟"
"کیا سوچوں گی؟ مجھے لگے گا آپ مجھ پہ طنز سے ہنسنا چاہتے ہیں۔ میں ایک لمحے کے لیے یہ سوچوں گی، پھر آپ کے ساتھ مل کر شاید خود بھی ہنسنے لگوں گی۔ آپ کو کیا لگتا ہے، میری ہنسی اڑائی جاتی ہے؟"
شہریار کو لگا وہاں سے کہیں زیادہ بہتر پہیتر بھی اپنے لیے اور اسے chill کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔
وہ اسے بڑی حسرت سے تکتا رہا تھا۔
"مجھے کیا دو گی؟" اس نے سوال کیا مگر وہ خاموشی سے ماحول کو دیکھنے لگی۔ اس ماحول میں وہ کتنی مرتبہ زوار حسن کے ساتھ آچکی تھی مگر یہاں موجود وہ بہت لیٹ نائٹ آیا کرتے تھے وہ ابا سے چھپ کر چوری چوری...... آج وہ یہاں سر جھکائے بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی کاش کوئی اس کی ... چھوڑی ہوئی جگہ لیتا تو اس کی روح غم ہونے سے نیچ جاتی۔ مگر یہاں کے حسن کے حال سے کوئی مطلب تھا۔
شرارت کرتے ہوئے شاید کسی منزل پہ جا کر کہیں رکنا بھی کبھی بے نام مسافت بھی اوڑھ لیتا ہے۔ وہ بھی ان مسافت میں کھو گئی تھی۔
"تم مجھے کیسا انسان سمجھتی ہو؟"
"شاید شروع سے بہت بہتر۔" مختصر جواب۔
شہریار نے گہرا سانس لیا جو ابھی اندر سے ساری شخصیت بھی منتشر تھی۔ وہ بہتر اور بہترین اور بہترین کا فرق جان رہی تھی اس کا دل بیتاب تھا اس کے اندر ابھی تو ارمان خانہ گھٹے ہوئے تھے، کرنے کی حس سو چکی تھی اور زندگی کے لیے بھی سب سے ضروری کمپنی تھا اس نے اس کی پلیٹ میں بہت شائستگی سے پیار رکھا تھا مگر بہت نرمی سے بولا تھا۔
"جب ہم بالکل اکیلے ہوں تو اپنے ساتھ چلنے والے سائے کو بھی ہاتھ دوست سمجھنے پہ مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔ ہمارے پاس دلاسے کے لیے اور کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ کیا میں سمجھوں تم مجھے ایسا سایہ سمجھتی ہو؟"
"سائے اندھیرا ہوتے ہی اپنی سمت آپ مر جاتے ہیں۔"
شہریار نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور نرمی سے بولا۔ "لیکن تم بھی جانتی ہو جب میں اپنا اکیلے ہاتھ کے لیے ایک سایہ ساتھ ہو تو کیا ہے؟ اس جب میں ہر کوئی آپ کے ساتھ نہیں ہوتا ساتھ چلنے والے

بھی ہوتے ہیں، جنہیں آپ سے محبت ہو۔"

"آپ کہنا چاہتے ہیں، آپ کو مجھ سے محبت ہے؟" اس نے طنز سے اسے دیکھا۔

وہ دولے سے مسکرا کر بولا۔ "ہاں، مجھے محبت ہے، ہر اس انسان سے جو اپنی غلطی کو غلطی مان کر زندگی میں دوبارہ سے سنورنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ تم ایک بہت معصوم لڑکی ہو۔"

"میں اور معصوم لڑکی؟ آپ کیوں مجھ پر طنز کر رہے ہیں مسٹر شہریار؟...... آپ اچھی طرح جانتے ہیں، میں کیسی لڑکی ہوں۔ تو آپ نے بھی تو میری نادانی سے بہت ٹھوکر کھائی تھی۔"

اس نے ایک سے خود کو نادم کرتے کہا تھا، شہریار شائستگی سے بولا تھا۔ "اچھا! آپ کے اندر کی اچھائی کسی نادانی سے ختم نہیں ہو سکتی۔ جب کہ اسے سنبھلنے کے لیے وہ خدا خود آتا ہے۔

بس میرے لیے یہی ذرا بہت ہوتی ہے۔ میں نے کسی کے لیے یا نہیں کیا۔ تمہاری غلطی تو اسے میں کب کا بھلا چکا ہوں۔ پاپا، صبا، ممی اور سارا خاندان، جنہوں نے کبھی غلط بنا کر مجھے

تمہارا دوست بننے میں یوں محسوس ہوا، جیسے میں نے ان کی ... کی سوغات کھو دی۔"

سونیا یک دم اسے دیکھنے لگی، دبکی ہی رہی۔ پھر ایک آنسو ٹپکا، دوسرا آنسو ٹپکا، پھر یوں لگا جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا ہو۔ وہ بلک بلک کر رونے کا احساس تک بھول گئی تھی۔ ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔

"مجھے زوار نے دھوکا دیا۔ ہم شادی کرنے والے تھے۔" اس نے سسکیوں میں کہا۔ شہریار کے چہرے پر ایک تاثر ابھرا۔ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تم زوار سے محبت کرتی تھیں؟"

"نہیں۔ شاید میں صرف ایک اچھا جیون ساتھی تلاش میں اسے محبت کا نام دیا۔ ضد تھی یا شاید غرور تھا۔ ضد تھی اور وہ جال میں پھنس گیا۔"

شہریار اسے بغور دیکھتا رہا۔ "اگر میں کہوں، تمہیں زندگی میں کوئی سچا پیار کرنے والا ملے تو؟"

"تو شاید مجھے کبھی یقین نہیں آئے گا۔"

"اگر میں یقین دلا دوں؟"

سونیا نے اس کے چہرے کو دیکھا، پھر سر جھکا کر بولی۔ "کون کرے گا مجھ سے محبت؟ میں نے تو اپنا کردار ... اطفال سے زیادہ ... نہیں دی۔ میں نے کبھی زندگی کا حق نہیں دیا، کہا، پھر میں کیسے مان لوں۔"

زندگی میری اتنی ناش غلطیاں معاف کر سکتی ہے؟"

شہریار نے اپنے سامنے رکھے موبائل کا بٹن پریس کیا تھا پھر نجیب سے بولا تھا۔ "کہاں ہے وہ؟ فوراً پتا کرو" کشش اتنی آ جا۔"

"کیا مطلب، کیا تمہارا کمرے سے جھگڑا ہوگیا ہے یا فون سے خودکشی کرنے کا کوئی عہد باندھ لیا ہے؟" عاطف بیگ کی پُرمزاح آواز سنائی دی اور وہ بگڑ رہا۔

"مجھے کبھی ایسا کرنے کی کوئی ضرورت ہے عاطف! کیونکہ ایسی حرکت اپنی جان ضائع کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ کہ میں یہاں تیرے لئے ایک بہت بڑا سرپرائز لئے بیٹھا ہوں۔"

"مگر میں نے تو ڈیوٹی کے تحت...؟ یہ کام میں حد سمجھ لیا؟"

"اچھا ہے یا نہیں؟" اب کی بار بہت سختی سے کہا اور جواب ملا۔

"اس مت میں بیٹھا ہوں۔"

وہ جیسا انتظار کرنے لگا۔

سونیا اسے دیکھے جا رہی تھی۔ "یہ عاطف کون ہیں؟"

"میرا دوست ہے۔ چند دن لاہور سے تم سے دل کی بات کہنے یہاں کراچی تک چلا آیا۔ جب اس نے مجھے تمہاری تصویر send کی تو میں ایک لمحے کے لئے مجبور ہو گیا۔ مجھے لگا وہ ایک بہت غلط راستے پر چل پڑا ہے۔ لیکن جب زمان راشدی کا اپنا شاہد کا ہوا تو مجھے لگا میں تمہیں کسی بھی طرح اس راہ سے قدم ہٹانے پر مجبور کروں گا کیونکہ تم عاطف کی منگیتر کی طرح بابا کے دوست کی بیٹی ہو۔ مجھے اس کا احساس تو ہوا تھا شاید یہ کام بہت مشکل ہے مگر تمہارے ڈر نے ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ مجھے تم پر بہت سختی کرنی پڑی۔"

"مگر میں سمجھتی ہوں میں آپ کے خیالات پر پوری نہیں اتر سکی اور مسٹر عاطف وہ ایک مرد ہیں۔ وہ کیا میرے ماضی کو جاننے کے بعد قبول کر لیں گے؟ آپ کو کیا لگتا ہے مرد کیا ہوتے ہیں؟"

"ہاں..... ہاں، وہ بہت مختلف ہیں سونیا اور تم جو بات کہہ رہی ہو وہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے آپ تیز دھوپ میں بارش کا تصور کریں۔ ہر انسان اپنا دل رکھنے والا کوئی بھی انسان کسی بھی حد تک بلند ہو سکتا ہے کہ وہ ان کے کردار کی رفعتوں پر شک کرے۔ دل، رحم، محبت، یہ سب انسانی تحفے ہیں۔ کسی کی جھولی میں بھی وقت کا قدرت ڈال سکتا ہے۔"

AANCHAL.COM.PK

عاطف گلاس دوبارہ پیش کر کے بیٹھا تھا اور سامنے سونیا کو دیکھ کر وہ چونک رہ گیا تھا۔

شہریار نے اسے دیکھا پھر مصنوعی خفگی سے بولا۔ "بہت اچھے جناب! ہم سرپرائز دے رہے تھے وہاں چہرے پر ایسے تاثرات ہیں جیسے شہزور کرکٹ میں جیت کے شہزادے ایک دم ہی گئے ہوں۔"

عاطف ہنسنے لگا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "یقین کرو وہ دور تک میرے ذہن میں بھی پانہیں تھا۔ بہرحال تاثرات اس لئے تھے کہ کسی نے دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔ تم یا چانک......"

شہریار نے اسے کندھے سے تھام کر کہا۔ "اچانک...... خوشیاں اچانک ملیں تو ان کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔"

عاطف کھڑا رہا۔ پھر شہریار کے کہنے پر وہ کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ تب اس نے چپکے سے کہا تھا۔ "ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا ان کا تم نے بہت خیال رکھنا ہے تمام عمر۔ دوبارہ کبھی ان کی آنکھوں میں آنسو نہ آئیں، اور وجہ تم بنو تو پھر قتل ہو جاؤ گے میرے ہاتھ سے۔" وہ ذرا سا پھر سونیا کی پشت سے جا لگا اور پیچھے کو جھک کر ہاتھ بڑھا کر بولا۔ "اسے غور سے دیکھ، یہ مجھے بابا کی طرح عزیز ہے اور تو جانتا ہے میں بابا کے سلسلے میں کتنا حساس ہوں؟"

"جانتا ہوں، جانتا ہوں میرے بھائی! مگر اب اتنی بھی دھمکیاں مت دے کہ مجھے دن میں تارے نظر آنے لگیں۔"

شہریار ہنسنے لگا۔ تسلی سے اس نے چابیاں اور والٹ اٹھایا تھا، پھر پشت موڑ لی تھی۔ سونیا نے مڑ کر لہجے میں بابا کا احسان کہا تھا۔

"بابا کہاں ہے بمر؟" جیدہ سے اس کا لہجہ مؤدب ہو گیا تھا۔ اس کا نیک شخص کے لئے احترام کی حد تک چلا گیا تھا۔ "رضیہ بوا کے کمرے میں کہاں؟" بے قرار کرتا نہیں چاہتا تھا سر جھکا کر بولا۔

"بابا میری کیونکہ مکمل بستر پر سو رہا اور پلیز مجھے آہستہ آہستہ کہا۔ عاطف کے دوست کی حیثیت سے ہم بہت اچھے دوست ہیں اور اگر تم قاتل بھی ہو تو بابا کی طرح تم مجھے اپنا بھائی بھی کہہ سکتی ہو۔"

وہ اب روتی نہیں تھی اور سونیا نے دوبارہ شکر کی سانس لے کر کہا تھا۔ "میں نے جو کچھ شہریار کے سامنے کہا میں اسے سچ جانتی ہوں۔ ساری زندگی ان کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتی۔ وہ چاہتا تو مجھے ان کی عزت کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیتا۔"

عاطف کچھ نہیں بولا تھا۔ اب صرف سونیا بول رہی تھی اور وہ سن رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

انوشے کی شادی کے بعد سے بیگم عاقبہ کی جانب سے صرف ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی۔ پھر وہاں کا نمبر بدلتی رہی تھیں اور ان سے رابطے میں نہیں رہی تھیں اور اب بہت اچانک وہ انہیں ایک سڑک پر چلتی نظر آ گئی تھیں۔ اس کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ گرا ہوا تھا۔ پیشانی پر وہ خوف ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر بیگم عاقبہ کو لگا تھا جیسے وہ خوف کو دبانے پیچھے سے ہار گئی تھی۔ بیگم عاقبہ نے گاڑی جان بوجھ کر ٹیکسی کے پیچھے ڈال دی تھی۔ پھر وہ ٹیکسی ایک پرانی ہوٹل کی طرف مڑ گئی تھی اور بیگم عاقبہ کو حیرت ہونے لگی تھی۔ یہ ایک ہوٹل کی عمارت تھی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی اندر کی سمت بڑھتی گئی تھیں۔ پھر وہ ایک مرینہ سے کچھ بات کر رہی تھی۔ مرینہ نے ایک پرچہ سے پکڑایا تھا اور وہاں سے چلی گئی تھی۔ بیگم عاقبہ تیز تیز سانسوں کے ساتھ اس مرینہ کی طرف بڑھتی جا رہی تھیں۔ یوں جیسے وہ کسی بہت بڑے راز کے قریب سے قریب ہوتی جا رہی تھیں۔

بیگم عاقبہ اس لمحے اس مرینہ کے بالکل سامنے تھیں۔

"زل...... روشی......؟" ان کی آواز میں لرزا تھا۔

مرینہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں حیرت تھی، پھر بہت تیزی سے ان کے ساتھ بیٹھی طرف سے ایک سسکی سی ابھری تھی۔

"عاقبہ...... عاقبہ بانو!"

"روشی! ہاں، میں عاقبہ۔ یہ تم کس حال کو پہنچ گئی ہو؟"

"جس حال میں ہونا تھا مجھے عاقبہ! ارحم اور عطیہ کیا گئیں، ہماری دنیا سے عزت، داری، رواداری، مروت سب چلا گیا۔ تمہارے بھائی نے اچھل کر دیا تھی۔ مجھے گھر سے لے جا کر نکال دیا تھا۔ مجھے پتہ ہے عاقبہ! ارحم گزر گیا ہے، فون بھی کرتی تھی ان سے عبدالرحمن کے لئے۔"

"میں عبدالرحمن صاحب کو یاد نہیں کرتی تھی۔" وہ غصے سے پرانی یادوں پھر سے ماضی میں ڈوب گئیں اور روشی بانی نے انہیں فون میں کہا۔

"ہاں عاقبہ! اپنا ارحم گزر گیا اور میں ان کے لئے کچھ نہ کر سکی۔ میرا دل چاہتا ہے میں ان کو ہزار بار پھانسی پر لٹکا دوں۔ مگر میں مجبور ہوں۔ اس کا قاتل ابھی تک زندہ ہے۔"

روشی بانی کے لہجے میں غصہ، چنگاریاں اور بانکا پن تھا مگر بے بسی ان کو اور بیگانہ کر رہی تھی۔

"صبر کر بولتی! صبر کرنے والوں کے ساتھ اللہ ہوتا ہے۔"

"ہاں، مجھے بھی اللہ کے انصاف کا انتظار ہے۔ وہ واقعی منصف ہے، وہی کافی ہے۔ مجھے اس کے فیصلے پر اندھا یقین ہے۔"

نجم ثاقبہ نے ان کی طرف دیکھا، پھر کچھ ہچکچاہٹ سے بولیں۔ "زلفی! ادھر ایک بچی تھی، وہ کہاں ہوئی؟"

"تمہاری بچی...... وہ تو تمہارے بیڑ کے میں مر گئی تھی ثاقبہ!"

نجم ثاقبہ کی نگاہ ان کی زندگی نے آج بھی ناامید ہی کی تھی۔ وہ کئی بار اس خبر پہ رو چکی تھیں۔

"یہ جانان...... یہ کس کی اولاد ہے زلفی؟"

زلفی بانی نے انہیں دیکھا اور سر جھکا کر بولی۔ "دشمنی نے اسے ویسے ہی حاصل کیا تھا جیسے دوسری دنیا میں عموماً لڑکیاں پہنچتی ہیں۔ پر اس نے رجوع نہ کیا کہ اسے بچپن سے یہی سمجھایا ہے کہ وہ اس کی مرحومہ بہن کی اولاد ہے۔"

ثاقبہ نجم کو دونوں بیک وقت دونوں کیا کہہ رہی تھیں، بجز سلام دعا کے بعد اٹھ گئی تھیں اور پشت موڑ کر چلتی جا رہی تھیں۔ ان کے منظر سے چلے جانے پر زلفی بانی نے پیچھے سر رکھ کر رونا شروع کر دیا تھا اور اسی وقت جانان ان کے پاس چلی آئی تھیں۔

"تم نے نجم ثاقبہ سے کیا کہا، میں ان کی سگی بہن کی اولاد نہیں ہوں؟"

زلفی بانی کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

"بتاؤ زلفی بانی! کیا واقعی مجھے خواہ مخواہ کے پاس لایا گیا تھا؟"

زلفی بانی نے پھر بھی کچھ نہیں بولنا تھی۔ ان نے چپکے سے تکیے کے نیچے سے ایک گڈی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی تھی، پھر آہستہ سے بولی تھی۔

"اپنی ماں سے کہنا جب تک ہو سکے آج بھی میرے لیے اتنا ہی مشکل ہے۔"

AANCHAL.COM.PK

"تم کہنا چاہتی تھی، وہ میری ماں نہیں رجو بیگم ہیں؟"
رشتی مائی نے جس کا سوال سنا اور اس نے بالکل الگ سوال کیا۔
"جانے تو نے کبھی شیرازی کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی؟ کبھی تیرا دل نہیں چاہا وہ اچانک کہیں سے تیرے سامنے آجائے اور تو سب سے پہلے نفرت سے ہی سہی اس کا گریبان پکڑ کر پوچھے ضرور کہ وہ تجھے چھوڑ کر کہاں چلا گیا۔ وہ تو تجھ سے بڑی جنون کی محبت کرتا تھا۔"
"میں نے تم سے اپنی ماں کے بارے میں پوچھا ہے رشتی ماں، شیرازی کو کیوں درمیان میں گھسیٹ لائی ہو؟"
رشتی مائی نے تیز تیز سانسوں میں اسے دیکھا اور بولی۔ "جو تیرے دل میں سوال ہیں ان کے جواب تو کس بارے کیوں پوچھتی ہے؟ خود ڈھونڈ۔ تیرے سوال میں اتنے سے تو بہت سے راز کھلیں گے۔ کبھی کبھی سوال سے ہی نیا سوال جنم لیتا ہے کے بارے میں جواب۔ تو شیرازی کو ڈھونڈ، جلد از جلد، اپنے بچے کو ڈھونڈ۔ جانے اشفاق تجھے پچھلی دفعہ میں کبھی سچ نہیں کہے گی، جانے ابا تال میں اور جانے کے لئے ڈھونڈنا پڑتا ہے شیرازی کو......" وہ پھر سے کھانسنے لگی تھی۔

❀❀❀

"زرش! تم نے مجھے بتایا نہیں ہے کہ ثانیہ اتنے دن سے کیوں نہیں آرہی ہے؟" تانیہ نے بے حد تھکے ہوئے انداز میں پوچھا۔
زرش پہلے تو خود کو مصروف ظاہر کرتی رہی پھر یکدم اس نے آہستگی سے کہا۔ "ثانی کا ایک ہفتہ پہلے ایک روڈ ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا تانی!"
"مگر تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں زرش؟" وہ بے یقینی سے چیخ پڑی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی صاف پڑھی جاسکتی تھی۔ اس کا سانس بہت تیز تیز چل رہا تھا، جب زرش نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اطمینان سے کہا تھا۔
"وہ بالکل ٹھیک ہے تانیہ! میں خود اس سے ہر ہفتے ملتی رہی ہوں۔ وہ اب گھر بھی شفٹ ہوگئی ہے۔" چند ساعتوں کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ "تم نے مجھ سے شیریار کا نمبر مانگا تھا، اس کا کیا ہوا؟"
تانیہ نے اس کی طرف دیکھا پھر بہت بے بسی سے بولی۔ "نہیں، میں اس سے بات ہی نہیں کرسکی۔ میرے اندر اتنی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ میں اس سے مخاطب ہوتی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے خاموشی سے ڈر

رہی۔ زرش! مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی ہے نانی! نفرت کیا اگر مجھ میں ہمت ہوتی تو میں اپنی زندگی اپنے آپ ختم کر لیتی۔"

"نانی پلیز ایسے مت کہو۔ سنو! تم کیوں تنہا تم سے بات کرو۔ وہ تمہاری بات بہت اچھی طرح سمجھے گی۔"

"جانا نہ...... ہاں مجھے جانا نہ سے بات کرنی چاہیے۔" اسے جیسے زرش کی بات سے نئی بات ملی۔ وہ کچھ دیر کے لئے سوچوں میں غرق ہوئی، پھر سر اٹھا کر بولی۔

"زرش! تم نے مجھ سے ابھی تک حمزہ عابد کو نہیں ملوایا۔ میں بھی تو دیکھوں، وہ بندہ ہمارے جاب کی کس حد تک کاپی ہے؟"

زرش نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا پھر بہت بے چارگی سے بولی۔ "نانی! جانی تم نے مجھے علی کے متعلق بتایا تھا۔ میں نے علی کو دیکھا تھا تو میرا دل کہتا تھا، وہ تمہاری محبت کے آگے ٹھہر ہی نہیں سکے گا۔ اور پھر اس کا دل محبت کی سمت مڑنے سے کوئی طاقت نہیں روک سکے گی۔ مگر دل تم بے دین کے ساتھ چار سال بتا دیئے لیکن وہ پھر بھی تمہاری محبت تمہارے حسن کے آگے نہیں جھکا۔ مجرم تم مجھے ملیں بہت بری حالت میں۔ تم اس وقت بکھری ہوئی تھیں۔ تمہاری زبان علی کی نفرت سے تار تار ہو چکی تھی، جیسے دل کا کوئی اجاڑ گھر جس پر بلوائیوں نے حملہ کیا ہو، سب کچھ لوٹ مار کر لے گئے ہوں اور گھر میں بچا ہو تو صرف آرزوؤں کا خون، تمہیں اور کبھی نہ ختم ہونے والا سناٹا۔ میں نے جب تمہیں پہلی بار گلے سے لگایا تب میں نے دیکھا سناٹے کی بھی ایک ابریشن ہوتی ہے۔ اس دن پہلی بار میں نے سناٹے کو روتے دیکھا۔ تمہارا دل تمہاری آنکھوں میں کسی پہلی رات کی دلہن کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ پہلی رات کی دلہن، جس کا دولہا اس کا گھونگھٹ اٹھائے بغیر اسے مسترد کر گیا ہو۔ تم نے اس دن جس طرح تڑپ کر کہا۔ "علی...... علی نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی، وہ صرف محبت سے نفرت کرتا تھا صرف نفرت۔...... تو نانی! آج میں تمہارا ہاتھ تھام کر تم سے بھی زیادہ چیخ چیخ کر رونا چاہتی ہوں۔ کیونکہ تم خوش قسمت تھیں کہ علی نے تم سے محبت نہ کی نفرت تو نبھائی۔ مگر میرے پاس تو اپنا ایک اکیلا کچھ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ حمزہ نے نہ مجھ سے محبت کی نہ نفرت۔ نانی! وہ تو مجھے کسی والی زید بھی نہیں سمجھتا۔ اس نے میری سادگی سے خوب کھیلا ہے۔ میں اس کی وجہ سے سوسائٹی پارٹی بن گئی لیکن اب وہ میری اسی شہرت سے چڑتا ہے۔ اس نے مجھے ٹھکرا دیا ہے نانی!...... تم نے سنا؟ اس نے مجھے ٹھکرا دیا ہے۔" زرش کہتے کہتے نانی کے سینے سے لگ کر سسک سسک کر رونے لگی تھی۔

نانیہ اس کی پشت تھپتھپانے لگی تھی۔ پھر شام کے وقت نانیہ نے اسے کسی اچھی جگہ گھومنے کے لئے تیار کیا تھا۔ وہ حمزہ اور اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ کی طرف نکل آئی تھی۔ مگر گاڑی ڈرائیو کرتے ہی اس کی نظر جس پر پڑی، وہ حیران کن تھی۔

جانانہ گم صم بیٹھی تھی اور حمزہ عابد اس کے سامنے ریڈ شیٹ پڑھ رہا تھا۔ وہ کاؤنٹر پر جا کر ناشتہ کے بیچ باکسر کا آرڈر چیک کیا اور میز کی طرف اشارہ کرکے وہیں بیٹھ گئی تھی اور اس کے کانوں نے حیرت سے سنا تھا۔

"میں کامیاب ہو گیا ہوں جانانہ! اس نے پھر سے گم سم واپس آکر بت کھڑا ہے کہ میں شطرنج کا کھلاڑی ہوں۔ جانانہ! تم سن رہی ہو نا؟"

"ہاں، میں سن رہی ہوں۔" بہت مدھم آواز سنائی دی۔ زرلش نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پہلے سے کچھ مختصر لہجے میں بولا۔

"تم اب جیسا چاہو گی شہریار اور عبدالرحمٰن کو ذلیل و خوار کرسکتی ہو۔ تم نے جس انتقام کے لیے اتنی محنت کی اس محنت کا پھل کھانے کا وقت آگیا ہے۔ جانانہ! تمہیں صرف یہ بات خوشی نہیں دے رہی کہ تم نے جس لمحے کے لیے انتظار کیا وہ لمحہ اب چند قدم کے فاصلے پر ہے؟"

جانانہ نے پہلی دفعہ اس کے چہرے کی طرف دیکھا پھر کھردرے لہجے میں بولی۔ "تم ان کو چھوڑ دو۔ مجھے اب معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ ہماری دوستی برقرار رہے تو تم مجھے کسی بھی طرح اس شخص کے متعلق معلومات لا کر دو کہ وہ زندہ ہے یا......" جانانہ کی آواز ڈوب گئی۔ زرلش آگے ہو کر تھی کہ وہ نہیں دیکھ سکی اور حمزہ عابد حیرت سے بولا۔

"تم...... تمہیں کیا ہو گیا ہے بے بی؟ تم اچانک اتنی اداس اتنی تھکی ہوئی کیوں لگنے لگی ہو؟"

جانانہ نے اس کی طرف دیکھا پھر بولی۔ "جب تک تم مجھے یہ پتہ کرکے نہیں بتاؤ گے کہ شہریار زندہ ہے یا مر گیا ہے تب تک میں ٹھیک نہیں ہوں گی اور تم سے [illegible] بہتر ہے تم اب [illegible] کا پیچھا چھوڑ دو۔ مجھے کسی بھی قسم کا انتقام نہیں لینا ہے۔"

"مگر جانانہ! تم جانتی ہو میں جہاں تک آ گیا ہوں وہاں سے مڑ نہیں سکتا۔"

"تم یہ سمجھتے ہو وہ اگر نہ [illegible] مر گیا تو تم نہیں جانتے میں کیا کر گزروں گی؟"

اس نے دوپٹہ جھٹک اٹھایا اور عین اسی وقت ویٹر نے اس کے قریب باکسر تیار ہونے کا اشارہ کیا تھا۔ زرلش دوسری طرف بیٹھ گئی تھی اور جانانہ اس [illegible] باہر نکل گئی تھی۔

زرلش نے حمزہ عابد کو دیکھا وہ بیچ میں [illegible] کسی کا نمبر [illegible] کر رہا تھا۔ پھر وہاں سے دو قدم آگے چل رہا تھا۔ جب اس نے سنا وہ بہت [illegible] مخاطب تھا۔

AANCHAL.COM.PK

"سطوت جہاں! تمہاری چھٹی حس ٹھیک کہہ رہی ہے۔ وہ اب تمہارے اختیار میں نہیں رہی ہے۔ اسے کسی نے مجھ سے شیرازی کی یادوں کی طرف کھینچ لیا ہے۔ وہ عبدالرحمٰن کے لیے پھر سے زمزم کو ترسنے لگی ہے۔ وہ کہتی ہے وہ میں دنیا کو بھول جاؤں۔ تم بتاؤ کیا میں ایسا کرسکتا ہوں؟ پانچ سال سے میں جس سونے کے پہاڑ میں سے سرنگ نکال رہا تھا اب وہ کہتی ہے اس پہاڑ کو میں ڈائنامائٹ سے اڑا دوں۔ تمہیں پتہ ہے جہاں سطوت جہاں! اس دولت کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ مجھ پر یہ کیسے ممکن ہے؟ اپنے گھر آنے والی دولت کو ٹھکرانے کا کفر کروں؟ تم اگر سنبھالنا چاہتی ہو تو سنبھال لو اپنی سونے کی چڑیا کو....."

لمحہ بھر کو رک کر اس کی بات سننے لگا پھر خباثت سے ہنس کر بولا۔ "تم نے ٹھیک کہا ہے، میں وہی بولوں گا جو تم کہہ رہی ہو۔ گواہیاں لا! دلوا دو تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

اس نے موبائل آف کردیا تھا اور زرش نے کار میں بیٹھتے ہوئے ثانیہ سے کہا تھا۔

"تم جو کہنا چاہتی ہو جانتا ہوں مجھے کچھ نہ کہو۔ وہ اس وقت بالکل تپے ہوئے لوہے کی طرح ہے۔ تم جیسی چوٹ ماروگی اسی طرح مولڈ ہوجائے گی۔"

ثانیہ نے پُرخیال انداز میں اسے دیکھا پھر زرش سے بولی۔ "تم پنڈی کے بورڈنگ ہاؤس کی نوکری کا بتاؤ وہاں کیا ہوا؟"

"کیا ہونا ہے بورڈنگ ہاؤس کے تو ادارہ کے تحت بھیجا اس سے پہلے ہی رد کردیا گیا کہ وہاں اس بورڈنگ ہاؤس کی میٹرن کہہ رہی تھی مجھ سے پہلے بھی کوئی اس جگہ کے مطابق پوچھ گچھ کرچکا ہے۔ وہ حیران ہورہی تھی کہ آخر یہ سب کیا ہے۔ وہ بھی اچانک بائی لائنٹ کیوں کر ہوگئی؟ تمہیں پتہ ہے وہ تو بروقت میری کچھ ہمتی وہاں کی وہ تین گجر زمیر کی جان پہچان کی نکل آئیں۔ ورنہ خصوصی سیکورٹی آفیسر کے سامنے اگوا دیتی بیٹھے میں ہاتھوں پسینہ آجاتا۔"

"خصوصی سیکورٹی آفیسر.....؟" ثانیہ نے تشویش کھاتے ہوئے تحیر سے دیکھا اور زرش مسکرا کر بولی۔

"ہاں خصوصی سیکورٹی آفیسر تھا یا وڈ شمنگ۔ شہریار کی مسز رانیا کے سلسلے میں اس کا نام سننے میں آیا ہے۔ خصوصی سیکورٹی اسی کی طرف سے تھی۔"

"سیکورٹی کے لیے تو عدیل عبدالرحمٰن بھی کم نہیں تھے۔ میں نے سنا ہے، وہ لاہور میں ڈی ایس پی رہ چکے ہیں اور آج کل وہ یہاں واپس ٹرانسفر ہوکر آچکے ہیں۔"

ثانیہ کے جملے پر اس نے ثانیہ کو ایک نئے سرے سے غور سے دیکھا۔ "ثانیہ! تمہارے پاس کچھ معلومات ہیں شیرازی کے بارے میں؟ اگر یہ معلومات تم عدیل عبدالرحمٰن کو ٹرانسفر کروا دو جانا کہ سطوت جہاں کے متعلق زیادہ واقفیت سے پہچانی جانے لگے گی۔ سطوت جہاں پر تمہارا بھی تو ادھار رہتا ہے نا۔ علی کی نظروں میں اس نے بارہا تمہیں نادیدہ کرنے کے لیے حربے استعمال کیے تھے۔ کتنی مرتبہ

تمہارے سامنے کے رنگ سے حق کی منسٹری کے تحت غیر ملکی معاملات میں اپنے ملک کی ایک بھیانک تصویر پیش کی۔ ڈرگس کا معاملہ ہو یا حکومتی رازوں کی ترسیل ہر معاملہ ایسا ہے کہ اسے سزائے موت سے خود کو بچانا مشکل ہوگا۔ اس نے نرمی سے کہا مگر پھر تمہیں جتنا بڑا سیل کرنے کا وقت دی تھی وہ واقعی تم آسانی سے اس کی طرف پارسل کر سکتی ہو۔" عالیہ نے زیرک نگاہی سے اسے دیکھا تھا۔

اور دوسری صبح ایک لفافہ تھا جو زین نے عدیل عبدالرحمٰن کے دفتر کے پتے پر پوسٹ کیا تھا...... سطوت جہاں کے گرد وقت گھیرا تنگ کرتا جا رہا تھا۔

❁❁❁

سطوت جہاں نے زینی بی بی کو بالکل سے اغوا کروا کے سینٹر بھیج دیا تھا۔ انہیں لگتا تھا اگر وہ یہاں رہی تو بہت سے راز کھلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ حریم عافیہ کے زینی بی بی سے ملنے کے بعد مسلسل ان کے اندر جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔ پھر کچھ دنوں سے انہیں لگ رہا تھا ان کی بہت خفیہ قسم کی سرگرمیاں چیک کی جا رہی تھیں۔ ایک دو لڑکیاں بھی اغوا ہوئی تھیں۔ مگر دو دن بعد وہ آزاد ہو کر واپس آگئی تھیں۔ معلومات کرنے پر پتہ چلا انہیں اغوا کے بعد کہاں رکھا گیا، کس طرح رکھا گیا، انہیں کچھ نہیں پتا تھا ایک بے ہوشی کی جو کھلی تو وہ شیدا مارٹی کی عمارت کے سامنے کھڑی تھیں۔ سطوت جہاں نے اوپر سے نیچے تک ایمان باور دینے تھے مگر ہر طرف سے جواب ندارد آیا تھا۔ کسی پر کسی بھی طرح کی اندرونی دشمن کے ہر سیل کے متعلق سرگرمیوں کی کوئی تفصیل نہیں تھی۔

وہ اس وقت اپنی چیئر پر جھول رہی تھیں اور خیالات کے تانے بانے سے اس اجنبی کہانی کی گتھی کو حل کر رہی تھیں مگر ابھی تک کچھ بھی نہیں تھا۔

جاناں کہاں ہے؟ ان کے ذہن پر نئے سوال نے ڈنک مارا۔ وہ تیزی سے سیدھی ہو گئیں۔ انہوں نے فون اپنی طرف کھینچا اور نمبر ملایا مگر وہ آف تھا۔

یہ آج کل جاناں کہاں رہنے لگی ہے؟ اس کی سوشل لیڈرشپ بالکل ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ اسے پیام آتے ہیں مگر اب یہ تک نہیں کسی کی دعوت پر نہیں جاتی۔ اندر کا زور بھی جیسے ختم ہو گیا ہے اس کا اپنے کمرے میں جس کروٹ لیٹی ہے اسی کروٹ لیٹی رہتی ہے۔ نہ ضد کرتی ہے نہ شور کرتی ہے نہ اپنے روم انجوائے کرتی ہے نہ اب مجھ سے زیادہ کھل کر بات کرتی ہے۔ کہیں زینی نے اسے سب کچھ بتا تو نہیں دیا؟

سطوت جہاں کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں اور ان کے قریب کہیں آواز گونجی تھی۔

"تم کیا سمجھتی ہو محبت اتنی کمزور ہوتی ہے کہ چند سال دور رہنے والا انسان اپنا نام تک بھلا دے؟ تم نہیں جانتیں سطوت جہاں! محبت اتنی طاقت ور ہوتی ہے کہ ایک بار دل کو اپنی لپیٹ میں لے لے تو اس امر بیل سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ بھلے جاناں مجھے بھولنے کی کوشش کرے بھول ہی جائے مگر اس کے دل میں یہ میری محبت کی امر بیل ہے جو اس کو اندر ہی اندر میرا نام کبھی بھولنے نہیں دے گی۔ بھلے میرا

ام اس کی دل کی گہرائیوں میں دفن کر دو تم، مگر پھر بھی کسی دن ایک بم سے دل کی زمین زیر و زبر ہو گی اور تو میرا نام سب سے پہلے نکل کر باہر آ جائے گا...... مجھے تمہاری ہزار کوشش کے باوجود اس کے دل کی دھڑکن بننے سے تم روک نہیں سکتی ہو۔ تم سن رہی ہو ناں؟ جانانہ صرف میری ہے۔ صرف میری۔"

وہ گھبرا کر آنکھیں اپنے کمرے سے باہر نکلیں اور اس وقت جانانہ جنید کی باتھ میں پکڑے اپنے کمرے کا دروازہ کھولتی ہوئی نظر آئی۔

"کہاں گئی تھی ماں کی جان......؟"

جانانہ نے چونک کر پلٹ کر دیکھا تھا۔ آج دیکھنے میں الگ سا لگتا تھا۔

"آپ کیا دیکھ رہی ہیں؟"

جانانہ نے سینڈلیں مارنے کے فرش پر پٹخ دیں، پھر سر اٹھا کر لہجے میں بولی: "میرا ایڈمیشن کے لئے چلڈرن ہوم میں بھجوایا تھا ناں؟"

سطوت جہاں، جانانہ کو دیکھتے رہیں، پھر نرمی سے بولیں۔ "ماں کی جان! آج تم تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ کتنے دنوں سے اس نے تمہیں سینے سے نہیں لگایا۔"

سطوت جہاں نے جانانہ کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ مگر اتنی جانانہ کے بازوؤں میں گرفت کا احساس نہیں تھا، جو غیر ارادی جھجک میں سطوت جہاں کی کمر کے گرد اس کے بازو حائل ہو کر بس رہ گئے۔

"کیا ہو گیا ہے جانے! تم چند دنوں میں کتنی کمزور ہو گئی ہے۔"

"چند دنوں میں تمہیں ماں اپ پورے بارہ سال ہو گئے ہیں مجھے میرے شہرازی سے بچھڑے ہوئے اور تو نے تمہیں محبت میں بچھڑے ہوئے ان کے چہرے پر روپ دیکھا ہے؟ جدائی کی آگ میں ان کا اس ان کا رنگ سب بالکل اڑ گیا ہے۔ ہاں! تم کیوں سمجھو گی؟ تم نے کبھی محبت کی ہی کب ہے؟ تمہیں کیا پتہ شہرازی کی محبت میں آنچ آنچ جل کر بھی تمہاری نیت کی ٹھنڈک سے کیسے ایسا روپ سنوارا کرتی تھی۔ مجھے خوب معلوم نہیں، صرف شہرازی کی بے وفائی کی بات کو اس کا اعتراف کر دیتی تھی۔ پر کچھ دنوں سے مجھے لگنے لگا ہے، جیسے میرا شہرازی آج بھی کہیں چپکے چپکے میرا نام لئے جا رہا ہے۔ وہ آج بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ مگر ماں! تمہاری محبت میں، میں اب سوچتی ہوں اگر کبھی وہ اچانک میرے سامنے آن کھڑا ہوا؟ اگر اس نے مجھ سے آ کر پوچھا، میں بے وفا نہیں تھا، بس وقت نے ہمیں یونہی جدا کر دیا تھا، اب میں لوٹ آیا ہوں، بتاؤ کیا تم میری پہلے جیسی جانے ہو؟ تو...... ماں! میں کیا جواب دوں گی؟ میں تو اس کی جانے رہی نہیں گئی۔ مجھے تو تمہاری دولت نے کسی کی ذات بنا دیا ہاں! تم

نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ۔ میں تمہاری بیٹی نہیں تھی مگر میں نے تو ہمیشہ تمہیں اپنی ماں سمجھا تھا۔ پھر...... پھر بھی تم نے...... ہاں! میرا بچہ کہاں ہے؟ کون سے جہنم خانے میں ڈالا تھا؟“

حلاوت جہاں کے اردگرد رسیوں کی اتنی مضبوط باڑ بندھ گئی تھی کہ وہ بھاگ نکلنے کا راستہ بھی کھو چکی تھی۔ وہ ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اس لئے ضروری تھا کہ مالک ہاتھ سے نکلنے سے پہلے پہنچا دو تھا
اسے صحبت لگتیں۔ انہوں نے جہنم خانے کا نام و رضیہ کھولا تھا۔ جانانہ بچے کمرے میں آگئی تھی اسی وقت اس کے فون پر بیپ ہوئی تھی۔

نمبر دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ یہ شخص اسے شیڈول کر رہا ہے آج۔ جس نے اس کی زندگی کو تہس نہس کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

”کیا تم مجھ سے کل کسی وقت مل سکتی ہو؟“

اس نے سوال سن کر گہرا سانس کھینچا پھر بہت تھکے ہوئے انداز میں بولی۔

”سوری شہریار! میں اب تمہیں نہیں ملنا چاہتی۔ وہ اس لئے نہیں کہ تم سے... بلکہ اس لئے کہ مجھے لگتا ہے، میں نے تمہارے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ میں تم سے ملوں گی تو مجھے میرا احساس جرم مار ڈالے گا۔“

”جانانہ......!“ جانانہ کے اندر ایک بجلی سی لہرائی تھی اسے لگا تھا کسی نے اسے شہر زاد نے پکارا ہے۔ تحریر یا آخر شہر زاد کی خوشی تھی۔

”شہریار......!“ اس نے دم لے کر سانس لی اور دوسری طرف سے تحکم آمیز آواز آئی۔

”تم نے مجھے جتنا برباد کرنا تھا کر لیا گیا۔ جانانہ! ایک اطلاع ہے میرے پاس تمہارے لئے جو شاید تمہارے کسی کام آسکے۔“

”کہاں آنا ہے؟“

”وہیں جہاں ہم آخری بار ملے تھے۔“ دوسری طرف سے کہہ کر رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔

❀❀❀

شہریار ساتھ شیخ کی جمعہ بہت ورباش کرنے کی نیت سے نکلا تھا مگر راستے میں فون ملتے ہی اس نے ارادہ تبدیل کر لیا تھا۔ وہ اس کا کاؤنٹر میں انتظار کر رہا تھا۔ عاطف چند لوگوں کے ساتھ بیٹھا تھا آگے بڑھے

AANCHAL.COM.PK

زکریا بھائی اور اماں کے سامنے جانے کا عندیہ دے گیا تھا۔ شیرا ب حالات سے کسی حد تک مطمئن تھا کہ ہارون کا کال پر جوش فون آگیا تھا۔ وہ کافی ہاؤس پہنچا تو وہ پہلے سے منتظر تھا۔

"خیریت تم نے آج ایمرجنسی میں فون کیا تھا؟"

"تمہارے لیے ایک گفٹ ہے۔"

"میرے لیے اور گفٹ؟" حیرت اس کے لہجے سے جھلک رہی تھی۔ تب اس نے ایک فائل اس کے سامنے رکھ دی تھی۔

"کیا ہے یہ؟" اگلا سوال۔

ہارون عبدالکریم نے اثبات میں سر ہلایا اور اس نے بہت تحمل سے کہا۔

"وہاں [illegible] کو میرے لیے گفٹ ہو گا [illegible] جاتا ہے، ہر شخص کسی کے لیے [illegible] کے لیے [illegible] گفٹ نہیں ہو سکتی۔"

ہارون عبدالکریم نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ [illegible] الفاظ چبا چبا کر بولا۔ "یقیناً یہ گفٹ وہ کسی دوست سے [illegible] دنیا میں [illegible] جس سے متعلق ہے وہ قبائلی دشمن ہے، اس نے تمہیں [illegible] کے اس حال کو پہنچایا ہے کہ تم اب [illegible] سے سانس بھی نہیں لے پاتے۔ اور تمہیں اس کی بیٹی کا [illegible] رہا ہے۔"

شیرا کافی دیر تک [illegible] نہیں بولا۔ [illegible] کے درمیان خاموشی [illegible] تب اس نے [illegible]

"شاہ وقاص کو کیا ہوا ہے؟"

"اسے [illegible] سب سمجھ [illegible] اور اب وہ حسن اور ابراہیم کے بھی پیچھے [illegible] ہیں۔ بظاہر [illegible] نے تیرے پیچھے [illegible] کوشش کی گرفتار [illegible] ہے۔ [illegible] لسٹ میں نام [illegible] جانے کے بعد وہ ملک سے فرار نہیں ہو سکتا۔ بہت جلد ہم اسے پا لیں گے اور [illegible] جان کا [illegible] بیان کر رہا ہے۔ [illegible] کیس کی پیروی کل [illegible] حاضر ہو گئی ہیں۔ [illegible] عمر کی بھی [illegible] لیں گے ہم۔"

"جہاں سے......" شیرا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا [illegible] محبت دکھائی اور ہارون عبدالکریم کے [illegible] مسکراہٹ نے چھپایا۔

"تیری یہ محبت مجھے حیران کر دیتی ہے۔ کیا آج کے دور میں بھی ایسی محبت ہوا کرتی ہے کبھی؟"

"مجھے نہیں پتہ ہوا کرتی ہے یا نہیں؟" شہریار نے آنکھیں اس پر جمائیں تھیں اور ماموں عبدالکریم نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کہا۔

"تجھ سے ملنے سے پہلے یقین نہیں تھا مگر اب لگتا ہے دنیا میں تجھ جیسے لوگ بہت کم، بہت ہی کم ہیں مگر دنیا انہی لوگوں ہی کے وجود سے قائم ہے۔"

"بس ماموں..... زیادہ شرمندہ نہیں۔ یہ بتائیں حمزہ ماموں کا کیا حال ہے؟" شہریار اس طرح بول رہا تھا جیسے اس کا ذہن کہیں اور تھا اور وہ صرف اس وقت کی باتوں سے فرار چاہتا تھا۔

"تم کچھ پریشان ہو سب ٹھیک تو ہے؟"

شہریار نے اس کی طرف دیکھا پھر آہستگی سے نفی میں سر ہلا کر بولا۔ "کچھ خاص نہیں۔ آج کل دریا نیلم کے سلسلے میں کیس الجھا ہوا رہتا ہے، اسی سلسلے میں کچھ مصروفیت زیادہ ہے۔"

"کیا ابھی تک سارا کام سنبھالا اور حماد بھی نہیں سنبھال سکتے؟" اس نے پوچھا اور شہریار مسکرایا پھر نفی میں سر ہلایا۔

"حماد زیادہ تر کام خود ہی کرتے ہیں۔ میں تو زیادہ تر بزنس مارکیٹنگ میں ہی مصروف رہتا ہوں کہ ان کو کھانا کھانے کی بھی فرصت نہیں ملتی اتنا کام بڑھ گیا ہے۔ سچ پوچھو تو میں کہاں ان کا ساتھ دے پاتا ہوں؟"

"کیا بات کرتے ہو۔ جو تمہارے شب و روز سے واقف ہیں ہم سے پوچھو بیٹا جان۔"

شہریار پھر کچھ نہیں بولا تھا۔ دونوں خاموشی سے کافی پیتے رہے۔ حمزہ اٹھنے ہی والا تھا کہ اس کے موبائل پر بیپ ہوئی۔ اس نے موبائل ریسیو کیا اور دوسری طرف کی بات سن کر وہ ایک دم جھٹکے سے اٹھا تھا۔

"ماموں! مجھے ابھی ہسپتال جانا پڑے گا۔"

"کیا یہ ہاسپٹل کا سفر قسمت میں لکھوا کر لایا تھا؟"

شہریار خاموش ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر دونوں کی گاڑیاں آگے پیچھے ہی نکلی تھیں۔ ہاسپٹل پہنچ کر ماموں کو سنجیدگی کا احساس ہوا تھا۔

شہریار کے پیچھے کئی ڈاکٹر اور بہت سا عملہ جمع ہو گیا تھا۔ ماموں عبدالکریم نے اپنا کارڈ دکھا کر اسے فوری طبی امداد کی۔ حالت بالکل ٹھیک تھی۔ شہریار اس کمرے کے باہر کھڑا تھا اور ان کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے

روتے بتانے لگی تھی۔

"اس میں بہت رش تھا مرا، اگر ہم یہاں مس کر دیتے تو ایک گھنٹے تک ہماری گاڑی ایس نہیں نکلتی۔ میں نے امامہ کو کہا تھا رہنے دو، بچے یہیں سب بس گھر رہو گے لگی۔ سالار صاحب کی مجاز کمانے سے بہتر ہے۔ یہ تھوڑی سی تکلیف برداشت کر لی جائے۔ اس نے مجھے جگہ دے دی تھی مگر ان کے لیے فٹ پاتھ پر بھی جگہ نہیں تھی۔ بس بہت تیز چل رہی تھی۔ جگہ جگہ اسپیڈ بریکر تھے، جھٹکے لگ رہے تھے اور بس ایسے ہی جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ...... مرا امامہ بچ تو جائے گی؟" وہ پھر سے رونے لگی۔

شہیر باراں سے بھی زیادہ خاموش بیٹھا تھا۔ شہر دو گھنٹے بعد امامہ کے بچ جانے کی خوش خبری کے ساتھ ان کے ماں باپ کے آنے کے بعد وہاں سے نکلا تھا۔ ڈاکٹرز سے اس نے بات کی۔ بہت منت کی، دے دی، کے لیے بائی پاس کر نے کی سفارش کی تھی۔ اس لیے ان کے ماں باپ نے اسے بہت اچھے لفظوں میں یاد کیا تھا۔ مگر شہیر جس ٹاپک کا ان کو پتا تھا وہ شاک سے اتر گیا۔ پاپا شہر میں موجود تھے اور جازی عبدالرحمن اور سالار عبدالرحمن ان کے سامنے بیٹھے تھے اور لگ رہا تھا وہ تینوں اسی کے منتظر تھے۔

"مجھے لگا آپ کے او لے صاحب زادے جو کوئی بھی فیصلہ لینے سے پہلے بورڈ آف ڈائریکٹرز سے رابطہ کر لینا ضروری نہیں سمجھتے۔"

اس نے کہا، مسکرایا اور پاپا نے اس کے سامنے بیٹھ کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "اگر آج تم یہ فیصلہ نہیں لیتے تو مجھے تمہاری تربیت پر افسوس رہ جاتا۔"

جازی عبدالرحمن نے جیسے کہا کہ کھل کر ہنسا اور سالار عبدالرحمن کی بھنا جیت...... وہ تیزی سے کانفرنس روم سے اٹھ کر نکل گئے تھے۔

"جاؤ تم بھی جاؤ۔ آج کل تم ان کے نقش قدم پر چل رہے ہو۔" پاپا نے طنز کیا اور جازی عبدالرحمن جو ابھی اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا اب بھی سے کرسی پر بیٹھا رہ گیا تھا۔

پاپا شہیر سے سلام دعا کرنے دفتر سے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ پاپا کے نکلتے ہی جازی نے بھی اٹھنے میں تیزی دکھائی تھی مگر شہیر نے بہت مضبوطی سے اس کی کلائی تھام لی تھی۔ جازی عبدالرحمن نے ذرا سے مڑ کر اسے دیکھا۔ شہیر کے چہرے پر پہلے جیسی بہت چمک رہی تھی لگتا نہیں تھا درمیان میں کچھ ابھرا ہے۔

"میرا ہاتھ چھوڑ دیجیے، مجھے بہت سے کام ہیں بھائی!"

شہیر ہنس پڑا، پھر شرارت سے بولا۔ "مشرقی مرد اس طرح ایک بار ہاتھ پکڑ لیں تو بار بار چھوڑا نہیں کرتے۔"

"پلیز شہریار صاحب! میرے پاس آپ کی اس قسم کی الجھی باتوں کو سننے کا وقت نہیں۔"

"شہریار صاحب؟...... اچھی بات ہے بندے نے مذاق کی عزت دے دی ہے۔ دو دن میں ہے لیکن میرے بچے! آج مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے اس لئے تمہاری ساری کوشش کے باوجود میں نے صرف اف نہیں کیا۔" مجھے فوراً پیلا کا نمبر جازی سے بولا۔ "میں آج تک دیکھتا ہوں مسٹر برقی کے اور نمبر تک جاتا ہے۔"

"مگر یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے اس میں آپ مجھے کیوں گھسیٹنا چاہتے ہیں؟"

"بس کچھ ضروری کام ہی ہے ورنہ تمہیں معلوم ہے میں بہت کم اپنی ذات کے لئے دوسروں کو تکلیف دیا کرتا ہوں۔"

"حالانکہ آپ کو کرکٹ میں پروفائل نے مجبور کرتا ہے۔" وہ بھی جازی کے لہجے کو بھرپور ہے تو بیٹے بھی اور وہ بیچاری پر اپنے بالوں کو سنوارتا ہوا بولا۔

"کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے ان ہمارے پروفائل یا یونہی سب چہرے رہ جاتے ہیں اور ان بہت پیچھے سے آپ کے حصے کی نیکیاں بھی کما کر چلا جاتا ہے کوئی پیچھے سے چل جاتا ہے۔ کبھی تو پیچھے آنے والوں کے لئے منزل کی تلاش کی آسان رہتا ہے۔ مگر تم یا بھی نہیں سمجھو گے۔ وہ کہا ہے منیر نیازی نے:

محبت اب نہیں ہوگی یہ کچھ دن بعد ہوگی
گزر جائیں گے جب یہ دن یہ ان کی یاد میں ہوگی

سنو بی جان! یہ محبت بعد میں ہوگی۔ اتنا مجھے یقین ہے محبت میری قسمت میں ہے مگر ملے گی جب شاید میں اس احساس کو بھی نہیں پاؤں گا۔ مجھے شروع سے ہر خواہش ختم ہونے کے بعد ہی ملی ہے۔ یہ میری قسمت کا المیہ ہے۔"

جازی عبدالرحمٰن اس کے لہجے میں ڈوب گیا تھا۔ مگر بہت تیزی سے وہ اس کی آواز کے سحر سے نکلا تھا۔ شہریار اس کی پشت کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ پھر ایک جھٹکے سے بھی پہلے وہ اس کے کیبن میں جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"میں نے سوچا تم بات کے مطابق مجھے ڈانٹ دے گا اس لئے دیکھو پورے آدھے گھنٹے پہلے یہاں چلا آیا ہوں۔ سچ کہا ہے تم نے؟"

"میں تو لنچ نہیں کروں گی۔"

شہریار کے ہونٹوں کو پیاری مسکراہٹ نے چھوا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب آگیا پھر اس کے گلے میں پہلے جیسے انداز میں بازو حمائل کرکے بولا۔

"لنچ واقعی نہیں کرسکتیں یا میرے ساتھ لنچ کرنے کے خیال نے تمہیں انکار کرنے پہ مجبور کیا؟"

"جواب آپ سمجھ لیں۔"

"ٹھیک ہے میں نے سمجھ لیا لیکن آج میرا دل چاہ رہا ہے، دل تمہارے... ہوں۔ کتنا عرصہ ہوگیا ہمیں ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائے ہوئے۔"

"کیوں، ہم روز ڈائننگ ٹیبل پہ ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے پہ بیٹھے ہیں؟"

اس نے جواب نہیں لیا اور آہستگی سے اس کے بازو اپنے گلے سے نکال پھینکے۔ شہریار کچھ دیر تو خاموش رہا پھر دوبارہ بولا۔ "آج میں نے تمہارے لیے چکن چیز پیزا منگوایا ہے۔ ساتھ میں پستہ شیو آئس کریم بھی ہے۔"

"جی۔ مگر میں نے پیکنگ والی چیزیں کھانا چھوڑ دی ہیں۔"

اس بار شہریار کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ "اچھا تم یہ سمجھو آرڈر تو عدیل بھائی نے بک کروایا ہے۔ اب تو کھالو گی نا؟"

جازی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اسی دوران ہوٹل پہ آرڈر کر کے کر چکا تھا۔ جازی نے بہت تیزی سے کیبن سے نکلنے کی کوشش کی تھی۔ شہریار نے پھر سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"کیا آج تم میری ایک بات نہیں مان سکتیں؟ حالانکہ میں نے زندگی کی کتنی ہی شامیں تمہارے نام کی ہیں۔"

"پلیز، مجھے بار بار بلیک میل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کے ساتھ کھانا تو کیا آپ کے ساتھ بیٹھنا بھی نہیں چاہتی۔ اگر میرے اختیار میں ہو تو میں اس فضا میں سانس بھی نہ لوں، جس میں آپ سانس لیتے ہیں۔"

شہریار کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا تھا۔ ایک تیز درد کی لہر نے اس کی جان کھینچ لی تھی مگر جازی کو پروا نہیں تھا۔ اس نے گہرے گہرے سانس لیے تھے اور اسی وقت عدیل بھائی کی کال آگئی تھی۔

"تم ٹھیک تو ہو؟"

"کیا بات ہوئی، آپ کو الہام ہونے تک ہیں کیا؟" اس نے اس بہت وقت سے بنی تیوری اور اسماعیل بھائی گھبرا گئے تھے۔

"درد ہو رہا ہے تمہیں؟ تمہاری طبیعت خراب ہے؟ میں فوراً آتا ہوں۔"

آن نے جلنے کی، وہ کام کوشش کی، پھر گھبرائے لہجے میں بولا۔ "ہم نے صاحب کو منانے کی کوشش کر رہا تھا مگر بہاؤ سے اتنا زبردست تشنج تھا۔ پچھلا بھی پکڑ لیا، وہاں نے احتجاج کیا۔ "الا ٹھیک ہو
ہے، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ڈاکٹر مت بلائیے گا، کیونکہ مجھے ابھی ایک بہت ضروری کام سے باہر جانا ہے، میری میٹنگ ہے کچھ دیر بعد۔"

پیچھا کافی دیر اس کو مجھے لیے باہر آ گیا، پھر وہ امان کی طرف متوجہ ہوا۔ "اگر آپ کا ٹھیک نہیں تو جو کچھ کیا ہے۔ میں نے جس فرزند کے لیے مانگا تھا اس نے اچانک آنے سے انکار کر دیا ہے۔ دیکھئے اگر
آپ کو پتا لگے تب ٹھیک ہے لگے تو خیر نہیں ہے۔"

امامہ نے ... اس سے ... لیا تھا۔ خبر کیں رہتے ہوئے جازی اور ان کا کلیش کسی سے چھپا ہوا نہیں تھا سو جازی کے کمرے سے غصے میں نکلتے ہی اسے سب کہانی سمجھ آ گئی تھی۔

شہریار اس کی آنکھوں میں ہر طرح کے دکھ سے آشنا ہو گیا تھا۔ پہلے جواب بہت نیچی ہوئی تھی، اب تو بات گھر سے باہر آ گئی تھی اور گھر سے باہر آنے والی باتیں ایسے ہی تماشا بنا دیتی ہیں۔

اس نے بہت آہستگی سے پوچھا تھا۔ "جازی عبدالرحمن کہاں ہیں؟ کچھ معلوم ہے؟"

"وہ شاید لنچ کے لیے باہر گئے ہیں۔ وہ اور لنچ فقری ریسٹورنٹ میں کرتے ہیں۔"

"اوکے، تھینکس۔"

وہ واپس اپنے روم تک گیا تھا پھر وہاں سے لفٹ کے ذریعے نیچے پارکنگ، بالکل پہنچا تھا پھر پانچ منٹ بعد وہ فقری ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ بظاہر یہاں کسی بھی طرح کی صورت حال کا سامنا ہو سکتا
تھا لیکن وہ ہمت مجتمع کر کے اندر داخل ہوا۔ جازی عبدالرحمن اسے کونے کی ٹیبل پر نظر آ گیا تھا۔

"آپ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟" اس نے چمچ پلیٹ میں رکھ کر غصے سے کہا اور وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

AANCHAL.COM.PK

"مجھے اس وقت تم سے کوئی بحث نہیں کرنی، تم مجھے بتاؤ فضہ کہاں ہے، کس چیز کا کام ہے؟"

جازی عبدالرحمٰن نے گاڑی روک کر دروازے کو اشارہ کیا تھا۔ شہریار نے پھر سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ "تم میرے ساتھ جا رہے ہو، اپنی بائیک یہیں چھوڑو، وہ دفتر سے کوئی آ کر لے جائے گا۔"

"مگر میں آپ کے ساتھ نہیں جا رہا......"

"آرام سے نہیں چلو گے تو شہریار، کیا مجھی آتا ہے مجھے۔" جازی عبدالرحمٰن نے کہا اور شہریار نے اسے کار میں زبردستی دھکیلا، پھر کار لاک کر کے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر بیٹھ گیا۔

"یہ آپ اچھا نہیں کر رہے، میں پاپا سے آپ کی شکایت کروں گا۔"

"مگر قتیل بھائی کے پاپا میرے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیں گے، اس لیے دھمکی بے کار ہے شہریار۔"

"آپ اس لئے ہی تو مجھے لے جا رہے ہیں کہ پاپا آپ کو سپورٹ کرتے رہتے ہیں۔"

وہ پھر سے مسکرانے لگا۔ ... ایک فائل دراز سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دی تھی۔

"آپ ... مسٹر جازی کے ... آپ کے ... فیصلہ اچھا ... کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

"جازی! ... کرو۔" شہریار نے پاکٹ سے پین نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور وہ بہت بے اختیاری سے اسے دیکھنے لگا۔

"میں قتیل بھائی سے پوچھے بغیر کہیں دستخط نہیں کر سکتا۔"

رفیق صاحب نے ان دونوں کو اکیلے بیٹھنے کا موقع دیا تھا اور جازی نے پہلا ہی جملہ ... لا تھا۔

"تم کاغذات پڑھ سکتے ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

AANCHAL.COM.PK

دفتر میں یہ کاغذات سالار بھائی کے ساتھ ہی اسٹڈی میں بھجوا دوں گا۔"

"جازی! وقت ضائع مت کرو، پڑھو۔" اس نے اس بار خفگی سے اسے دیکھا پھر نرمی سے بولا۔ "تم جاننا چاہتے ہو اس میں کیا لکھا ہے؟ تو سنو، اس میں میری اسٹاک مارکیٹ میں لگی ہوئی رقم کے بارے میں تفصیلات لکھی ہیں اور اسٹاک ممبر شپ کارڈ تمہارے نام منتقل کر دینے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں میرے بعد تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اب سائن کرو گے یا نہیں؟"

جازی عبدالرحمٰن نے مسکرا کر دستخط کر دیے تھے۔ شہریار نے فائل سمیٹ کر رکھ دی تھی۔ سارے راستے جازی عبدالرحمٰن نے کچھ نہیں کہا تھا مگر شہریار کو بات سے اس کا دل ٹوٹا ہوا لگا تھا۔ خفگی کے باوجود بھی اس جملے سے یکدم اس کی آنکھوں میں نمی کیوں اتر آئی تھی؟ شہریار بہت مشکل سے خود پر قابو پا رہا تھا اور جازی نے چور نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"آپ کی طبیعت خراب ہے کیا؟"

شہریار نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر مسکرانے لگا۔

"نہیں، کچھ خاص نہیں۔ تمہیں علم ہے دل کا معاملہ ہے بھائی! آپ اچانک سے کہنے سے انکار کر دے، اس کی مرضی ہے۔ معاشی زندگی میں معاملات سدھار لینے کا مارجن لے رہا ہوں اور بس۔"

جازی پھر کچھ نہیں بولا تھا مگر گھر آتے وقت اس کے انداز میں بہت بے چینی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، شہریار ان جاتے ہوئے کاروبار پر حاوی ہو گیا تھا۔

جازی عبدالرحمٰن بالکل گم صم گھر آیا تھا۔ پھر ایک گھنٹے بعد کی بات تھی، وہ دوبارہ سے اس کے کمرے میں موجود تھا۔

"آپ اس وقت......؟" اس بار شہریار کو چونکنا، اس کا لہجہ کچھ نم تھا۔

شہریار نے دلچسپی سے اسے دیکھا تھا پھر مسکرا کر بولا۔ "میری بیماری؟ ایسی بیماری ہے کہ آپ جیسا یار، اسٹوڈنٹ بھی چھینا ہو گا تو مجھے لگتا ہے میری زندگی سے زیادہ میری موت مشکل ہو گی۔ ابھی تک ختم ہو گئی تو بہت مجھے، کبھی کی محبت کا اظہار سمجھ کر ہی سہی۔ اور وہ کہا گیا ہے یوسف! مرنے والے انسان جس کے ساتھ قربت کا ایک لمحہ بھی گزار لے اسے قبر میں اترتے وقت یاد آتا ہے، ایک بات ضرور کھلاتے ہیں۔ تمہارے ہاتھ کھلا کھائیں گے یا......؟" وہ اس کے بالکل قریب آ گیا تھا۔

جازی عبدالرحمٰن کا دل چاہ رہا تھا وہ اسے جس شخص کی طرف کھینچ رہا ہے، وہ اس شخص سے کہیں دور بھاگ جائے۔ مگر وہ اب اس کے دل کو کتنا ہی ناپسند ہو، لیکن آج بھی اس کی موت کا سوچ کر

سانس میں بکھرتے ہوئے ٹوٹتے جملے وہ کرکے لگتا تھا اسے اندر سے لگ رہا تھا کہ جس سے اس کا دماغ نفرت کرتا تھا اس سے اس کا دل کیوں محبت جتانے پر تلا ہوا تھا۔

”کیا بات ہے مسٹر جازی! بلا رہا ہے۔ کیا آج تم بھی پاگلوں کی طرح خوب صورت نہیں لگ رہا؟“ اس نے جھینپ کر نظریں موڑ لیں اور وہ اپنی مزاج سے اس کے قریب آ گیا۔

”تھوڑی دیر کے لیے اپنی سیٹ اور اپنا لیپ ٹاپ دو گے؟ کچھ ضروری کام ہے۔“

وہ سختی سے انکار کرنا چاہتا تھا مگر بہت غیر محسوس طریقے سے وہ کرسی سے کھڑا ہو گیا تھا۔

شہریار اس کی سیٹ پر بیٹھ کر اس سے اس کے لیپ ٹاپ کو سمیٹنے لگا پاس موجود پڑا تھا اس نے بیان فرمایا۔ حارث تھیں دکھائی تھی اور دوسری کرسی پر بیٹھ کر لیپ ٹاپ اپنی طرف سرکا کر اسے آن کر رہا تھا۔
”جسٹ چیکس..... یہ انتہائی رازداری کی بات ہے، اس وقت تم جہاں ہو وہ پاس موجود ہے، تم بھی اچھی طرح تمہاری جاسوسی کی اطلاعات تمہارے کان تک پہنچ رہا۔“

اب اس کی انگلیاں keys پر حرکت کر رہی تھیں۔ وہ ویب سائٹ پر ڈرامنگ کر رہا تھا پھر جازی کو متوجہ کرنے کے لیے اسے آواز دی تھی۔

”جازی! ادھر آؤ۔ میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔“

جازی عبدالرحمن کرسی سے اٹھ کر اس کے کندھے سے لیپ ٹاپ پر نئی معلومات دیکھنے لگا تھا۔

”یہ ہمارے بابا کی ویب سائٹ ہے۔ میرے بابا اس آف شپنگ میں میرے علاوہ دو سرمایہ دار اور مسٹر جہانزیب شامل ہیں۔ جہانزیب کے شیئرز زیادہ ہیں جس کی وجہ سے وہ ایم ڈی بھی ہیں اور وہی معاملات دیکھتے ہیں، ان پر بھرپور کنٹرول ہوتا ہے صرف انہیں ہی دستخط کرنے ہوتے ہیں، ہم بس ہماری فائلز میں، میں نے یہ بات اور رزلٹ حب تو فتح تھا۔ ویسے تم نے تجزیہ کرتے وقت سالار جہانگی کا نام نہیں دیکھا؟ حیرت ہے۔“

جازی عبدالرحمن خاموشی سے سر جھکا گیا کہ وہ اس کے لہجے سے ایسا مسرور ہوا تھا کہ پھر کچھ بھی جتانا نہیں رکھنے جیسا نہیں لگا تھا اب وہ ویب سائٹ......“

شہریار اس کی کرسی سے اٹھ گیا تھا۔ پھر اس نے اسے کندھوں سے تھام کر کرسی پر بٹھایا تھا۔ ”اب یہ سنبھالو۔ ویب سائٹ کا پاس ورڈ ہے جازی رحمن ہے۔“

”جازی رحمن؟“ اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور وہ مسکرایا۔

"ہاں، بے شمار جاذبی ایلیس فارمالا ارے!" وہ تھوڑی تفصیل دے کر دو کا نہیں تھا اور اس کے گھر سے جانے پر بیگم جاذبی عبدالرحمٰن نے اسے روکنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کیا اسے بتا رہی ہیں؟ ہمیشہ تک سامنے شہریار کے گرم ہاتھوں کا لمس باتیں کر رہا تھا مگر وہ جا چکا تھا۔

ہمیشہ جانے کے بعد روکنے کا خیال کیوں آتا ہے؟ زندگی سے وقت نے سوال کیا اور وقت ہنسنے لگا، ہنستا چلا گیا۔ مگر ان کی آنکھوں کی نمی اس سے ساری زندگی کا نچوڑ گیا تھا۔

❀❀❀

شائنہ بستر پر لیٹی تھی۔ ابھی ابھی ملازمہ اس کے پاس سے اٹھ کر گیا تھا کہ اچانک [illegible] نے آ کر کسی دوست کی آمد کی اطلاع دی تھی۔

"کون دوست ہے؟" اس نے بہت سے [illegible] سامنے دیکھا سے [illegible] کی چیخ نکل گئی۔

"تم تو عید کا چاند ہو گئیں...... آج کہاں سے؟"

سومہ مسکرا کر اسے اپنی روداد کی تفصیل بتانے لگی۔ انوشے کی شادی کا حال بتانے لگی۔ پھر بیگم [illegible] شہریار پر آ کر رک گئی۔ وہ اس کے لئے رعب اللسان تھی مگر [illegible] اسے لگا ان کو شائنہ [illegible] کی کلاس لے لگی مگر اس نے دیکھا ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔

پھر اس نے بھرائے لہجے میں کہا تھا۔ "تم ٹھیک کہتی تھیں شہریار عبدالرحمٰن کو سمجھنا واقعی بہت مشکل کام ہے۔" [illegible] سونیا تفصیل دے کر دی۔ "جی؟ جو دوان معاملے میں شہریار واقعی فرشتہ بن کر آئے تھے۔ روز سونیا کہتی مرے سے [illegible] زندگی کی طرف لوٹا اور بہت مشکل کام تھا۔ مگر شہریار صاحب نے یہ کام کیا اور صرف سونیا کو نئے سرے سے زندگی دی بلکہ اپنے ایک دوست عاطف کے لئے سونیا کا ہاتھ بھی مانگ لیا۔ پاپا کا تو منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا مگر میرے سمجھانے پر انہوں نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ عاطف واقعی ایک ویل سیٹلڈ لڑکا ہے۔"

"مگر سونیا نے یہ سب کچھ کیا کیوں؟ اور پھر اچانک [illegible] کیا گزرا؟" سومہ نے اگلا سوال کیا اور اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

"سیدھی سی بات ہے حالات سومہ [illegible] سے حالات [illegible] بیگم جاذبی کی [illegible] ہے۔ [illegible] شکر ہے اس نے [illegible] نہیں کیا [illegible] ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ جاتے۔ جو لوگ [illegible] کے نام سے جانتے ہیں وہ صرف [illegible] کے لوگ ہیں۔ [illegible] کوئی اخبار [illegible] ہے کہ [illegible] پھر عاطف

بلکہ اس کی اس بدنی شہرت کے باوجود اس کا نتیجہ تھا کہ وہ کرتیا ہے تو زندگی کا ایک مار جس لینے میں کیا حرج ہے؟ مومنہ! مجھے لگتا ہے ہمارے بد رنگوں کی کوئی نیکی ہے، جو ہمارے کام آ گئی ہے آج۔"

مومنہ کی آنکھیں گیلی ہو گئی تھیں۔ اسے وہ دن یاد آ گئے تھے، جب وہ تین دن کی بھوک کے لئے اپنی عزت داؤ پر لگانے کے لئے سفر ہو کر چل پڑی تھی اور اسے اچانک شافعہ نے برائی سے اچک لیا تھا۔

"یہ تمہاری اپنی نیکی ہے شافی! اماں تم اتنی اچھی ہو کہ تمہارے ساتھ اس خدا نے برا ہونے ہی نہیں دیا۔"

"کیا اتنی میرے ساتھ برا نہیں ہوا؟" شافعہ کی آنکھوں میں رکی نمکین پانی میں غوطے لگانے لگا اور مومنہ نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"نہیں تمہارے ساتھ کچھ برا نہیں ہوا۔ دیکھو اگر عارف تمہیں زندگی کی کسی اہم موڑ پر اچانک اس طرح چھوڑ دیتا تو؟ تم تو صبح کی کرنوں بھرے دن میں اس سے بچھڑی ہو۔ زندگی نے بارسائی کا موسم ضرور چاہا ہے، لیکن دیکھو محبت نے کیسے سالار ارسلان کے دل میں تمہارے لئے محبت کو زندہ کر دیا ہے۔"

شافعہ نے اسے خاموشی سے دیکھا، کچھ نہیں بولی اور مومنہ نے ادھورے جواب سے نیا سوال کیا۔

"تم نے سونیا کو اچانک اس تبدیلی کی وجہ نہیں بتائی؟"

شافعہ نے اسے دیکھا پھر آہستگی سے بولی۔ "سونیا کہتی تھی مجھے میری منزل سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ آپ جنہیں ہیں سے کہتی تھی ایک طاقت ہے، جو سب کچھ بدل سکتی ہے اور بس وہ طاقت جیت گئی۔ شاید کبھی اور یہ سب سنتا تو اسے اس بات میں یقین کرنے میں وقت ہوتا لیکن جو اس میں پر اور کی طاقت پر ایمان رکھتے ہیں انہیں معلوم ہے، نیکی ایک سرسراہٹ بھری آواز کی طرح ہوتی ہے ایک ستی بھرا احساس ہے جو خود بخود دل کے اندر بیدار ہوتا ہے اور پورے وجود پر چھا جاتا ہے۔ ممکنات کا مکمل ہو جانا خدا کے وجود کا ادراک ہے۔"

سونیا چائے اور بسکٹ کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی اور زیر لب مسکرانے لگی۔ مگر اس مسکراہٹ میں زہر گھلا ہوا تھا کیونکہ جو نیکی کسی برائی کے بطن سے جنم لے اور وہ اپنے ہونے پر بہت دنوں تک خود پر ایسے ہی طنز سے ہنستی ہے۔ لوگ بھی اس نیکی کو ایک اتنی درجے کی برائی ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں مگر نیکی کا احساس دھیرے دھیرے ایسے پھیلتا ہے، جیسے سمندر کا ہلکا بھاری بہاؤ۔ مگر پانی کے مسلسل ٹکرانے سے بھی بہاؤ پتھروں کو کاٹ دیتا ہے، ان کی نئی طرح سے صورت گری کرتا ہے۔ کبھی کبھی اکثر بالکل بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اس کی ماں کی ایک برائی نے اسے بھی بدل دیا تھا۔ ایک ہی لمحے میں وہ بری تھی اور اس ایک لمحے ہی میں صدیوں سے بنا مذہب عبور کر مرتی تھی۔ لوگ تو قعر مذلت میں سر تک ڈوبے ہو کر ایک لمحہ توبہ پر سدھر جاتے ہیں، پھر وہ کیوں سمت نہیں ٹھیک کر سکتی

تھی۔ ایک لمحہ خوشی کا ہر ایک کی زندگی میں آتا ہے۔ کچھ لوگ اس لمحہ خوشی میں رنگینی کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور کچھ لوگ اس لمحہ کو خوشی کہنے میں لگا دیتے ہیں۔ لیکن سونیا جانتی تھی کہ وہ جو زندگی بسر کرنے کو ترجیح دینے والی تھی اگر میں سمجھا کہ شہریار کے لئے اس کی وجہ سے سنبھال نہ لیتے تو شاید وہ تمام زندگی کی طرح ایک طویل شام سوت جیتی رہتی۔ اس نے شافعہ کو اس کے بیچ کا نہیں بتایا تھا اور نہ ہی شافعہ نے اسے کبھی بتایا تھا۔ حقیقت میں بھی شافعہ ان لوگوں میں شامل تھی جو صرف اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں اتنے مگن رہتے ہیں کہ پھر انہیں کبھی کبھی اپنے دل کی آواز سننے کے لئے بھی کسی دوسرے انسان کی انگیخت کی ضرورت رہتی ہے۔ کوئی اور انہیں بتائے تمہاری احتیاجات کیا ہیں تمہارا دل کیا چاہتا ہے؟ تب وہ ٹھہر کر دل کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو کچھ ادھوری زندگی کے چند پل سے رخصت ہو جاتے ہیں۔“

سونیا نے رکھ دی تھی۔ وہ دونوں چائے سے لطف لے رہی تھیں اور سونیا اپنا پیالہ اٹھا کر کچن میں رکھ رہی تھی جب بہت اچانک کسی نے پوچھا تھا۔

”ہاں بھئی ہمارے حصے کی چائے کہاں ہے؟ ہماری فرینڈ کا کیا حال ہے؟ آج کل تو وہ ہمیں لفٹ ہی نہیں کراتے۔“

سونیا کے ہونٹوں سے مسکراہٹ اس کے پورے چہرے پر پھیلتی چلی گئی تھی۔ ”شہریار بھائی! آپ آپ بھی کمرے میں چلیں۔ بیٹھئے میں ابھی دو منٹ میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی۔“

”ارے تکلف کی ضرورت نہیں ہے بہنا!“ شہریار نے انکار کرنا چاہا۔ مگر وہ تب تک اسے شافعہ کے کمرے میں بٹھا کر چائے بنانے جا چکی تھی۔

شہریار نے مسکرا کر دیکھا پھر شرارتی لہجے میں بولا۔ ”محترمہ آپ کی بہن نے یہاں بھیجا ہے۔ مگر لگتا ہے آپ مجھے جانتی ہی نہیں۔“

”ارے بس آپ فارمیلٹی مت دکھائیے۔ آ جائیے، یہ خانہ بے تکلف ہے۔“

شہریار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے چہرے پر جذبات کا ایک رنگ آ کر لوٹ گیا اور وہ سوچنے لگا کیا وہ کبھی کہہ سکے گا کہ محترمہ میں تمہارا ہمسفر ہوں؟ کبھی پورے حق اور اعتبار کے ساتھ کیا وہ اسے اپنے سینے سے لگا کر اس کے لئے دعا مانگ سکے گا؟

”کیا سوچنے لگے؟ میں نے کہا ناں، یہ خانہ بے تکلف ہے۔“

شہریار نے شافعہ کے چہرے پر بکھری زلف کو شوخی سے کہا۔ ”یہ خانہ بے تکلف ہے؟ آپ نے اس خاتون خانہ سے پوچھا ہے۔ وہ شاید مجھے خوش آمدید کہیں گی۔“

"اب تو بلاؤ مت، وہ بھی شہریار بھائی! یہاں آپ کے خلاف ہے ہی کون؟ بابا آپ کے حریف ہیں، ہم آپ کی پارٹی میں ہیں، ساہر اور ثانیہ بھی......"

"ہاں ہاں، ثانیہ بھی کیا؟" وہ ہنستا سا جا کہہ دل نے ضد کی کہ سومیہ ثانیہ کا نام بھی اس کے ساتھ نتھی کر دے تو زندگی بے اختیار پیاری ہو جائے مگر وہ ایک شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ چپ ہو گئی تھی۔ شہریار نے کبھی ضد نہیں کی تھی، پھر بابا نہیں چل ہی رہی تھیں کہ سونیا نے مووت کی بات نہیں، دیکھنے کی ضد کی تھی۔

سومیہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا اور تبھی اسی وقت ارسلان راشدی، آصفہ کا پیغام سونیا کے لیے لے کر کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ سے شیشے کا ایک جھونکا گیا تھا شہریار ان کی کیفیت جان رہا تھا اس لیے مطمئن بیٹھا رہا اور سونیا تیزی سے اٹھی تھی۔

"بابا! کیا ہوا، خیریت تو ہے؟" آصفہ ارسلان راشدی کے بچ کے بعد سے سونیا کا دل اپنے بابا کے لیے جو سے بھر گیا تھا۔ حالانکہ پہلے وہ اپنے امی بابا میں بٹی ہوئی تھی مگر اب اسے ان سے خفی انسیت ہو گیا تھا۔ وہ اس کی نظر میں ایک عظیم انسان تھے جنہوں نے اس کی خاطر اپنے مخالف بابا اور اسے اپنایا تھا۔ بابا اس کی ماں کی بدبختی کی جان جا کیں تو شاید وہ انہیں بھی معاف کر دیں گے۔

ارسلان راشدی بت کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ "تم...... تم کون ہو؟"

"یہ ہنستے بابا! جس کے متعلق میں نے اکثر آپ سے کہا تھا کہ تسلی ملی تو اسے آپ سے ملواؤں گی۔"

ارسلان راشدی مرے قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئے تھے اور شہریار کا بھیجا ہوا تھا کہ وہ گم رہے تھے۔ انہوں نے آنے کا کچھ بات کہہ دی گئی تھی اور سونیا کی بہت بچہ کا تحمد ہو کر رو دی تھی۔ "ثانیہ بچو! آپ کو کیا لگتا ہے، بابا نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھی ہو؟"

ثانیہ، سومیہ کے کہنے سے بیٹھنے کے لیے ایک جانب کو بیٹھ گئی۔ ارسلان راشدی کو ان کا بھی اس سوال کو وضاحت دے رہا تھا۔

"تمہاری ماما کا کیا نام ہے؟"

"عطیہ بانو۔"

"کیا...... عطیہ بانو...... تمہارے بابا کا نام؟"

"سنا ہے وہ آپ سے محبت کرتی ہیں، وہ کہتی ہیں ان کا کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سارا وقت نکل جاتا ہے، جہاں جانے میں۔"

عطیہ بانو کے لفظ ایک ایک قدم کر کے سیڑھیاں چڑھتے ان کے دل کی سب سے اوپری سیڑھی پر آ گئے تھے۔ وہ تیز تیز مومنہ کے قریب آئے تھے۔ بہت ڈرتے ڈرتے انہوں نے مومنہ کو چھوا تھا، یوں جیسے وہ کوئی عکس تھی جسے چھونے کے ساتھ ہی بکھر جانا تھا۔

"تم مومنہ؟...... میری عطیہ کی بچی؟" کتنی مشکل سے یہ چار پانچ جملہ نکلا تھا، بازو وا کیے تھے اور وہ ان کے سینے سے لپٹ گئی تھی۔

شہریار نے مٹھیاں بھینچ کر اس جذباتی لمحے سے خود کو بچایا تھا۔ ارسلان راشد کے لب بھنچے تھے۔

"تمہاری ماں کیسی ہے مومنہ؟"

مومنہ نے بھیگی پلکوں سے انہیں دیکھا اور بہت بے بسی سے بولی۔ "مجھے تو معلوم ہی نہیں، ماں کیسی ہوتی ہے۔ میں تو بچپن سے یتیم خانے میں پلی تھی۔ بابا اور عافیہ خالہ سے پتہ چلا میری ماں تو تین سال پہلے مر چکی ہیں۔"

ارسلان راشد کے ہاتھ بے جان ہو کر گر گئے تھے۔ وہ کھڑے سے کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔

"عطیہ مر گئی ہے؟...... میری عطیہ مر چکی ہے مجھ سے ملے بغیر ہی...... میرا دل تو اب بھی یہی کہتا ہے وہ زندہ ہے، وہ ختم نہیں ہو سکتی...... بالکل جھوٹ۔"

مومنہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دینی چاہی تھی، پھر جیسے پیار زرد پڑ گیا تھا۔ سخت سنگلاخ پہاڑ کیسے روتے ہیں، شہریار نے پہلی بار دیکھا تھا۔

"میں...... میں عبدالرحمٰن کو اس کے لئے کبھی معاف نہیں کروں گا۔ کیا وہ اتنا مصروف تھا کہ مجھے بتانے کے لیے بھی اسے فرصت نہیں ملی؟ میں کبھی معاف نہیں کروں گا اسے۔"

مومنہ نے ان کا مشتعل لہجہ سن کر شہریار کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ اسے تب پتہ چلا وہ اس ملن کے دوران چپکے سے ان کے کمرے سے نکل گیا تھا۔

"یہ شہریار بھائی کہاں گئے؟ میں نے تو ان کے لئے چائے بنانی تھی؟" سونیا نے حیرت سے کہا تو ارسلان راشد اور مومنہ کے اچانک ملن پر سب کی نگاہ اس طرف اٹھی تھی کہ کسی کو بھی اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔

AANCHAL.COM.PK

"ہیلو کون بول رہا ہے؟" سالار عبدالرحمٰن نے مسلسل بجتے ہوئے فون کو بند ہوتا دیکھ کر اٹھایا تھا۔ یہ لائن ان کے کمرے میں بھی اور جازی کے کمرے میں بھی تھی۔ تیسری بیل آنے پر انہوں نے ریسیور اٹھا لیا تھا ان کی
ہیلو کو تھوڑی دیر سے سن رہے تھے۔ جب جازی نے فون نہیں اٹھایا تو انہیں ہی فون ریسیو کرنا پڑا۔
"ہیلو جی! جازی سے بات ہو سکتی ہے؟"
"جی آپ کون؟ میں ان کا بڑا بھائی سالار عبدالرحمٰن بات کر رہا ہوں۔"
"وعلیکم السلام! میں ندیم بات کر رہا ہوں، معاملہ ہی ایسا ہے۔"
"اوکے ندیم! کوئی ضروری بات کرنی ہے تو آپ مجھے بھی بتا سکتے ہیں۔ ہم دونوں بھائی کم دوست زیادہ ہیں۔"
ندیم جیسے تھک کر پھر ان کو بتانے کی کوشش کی جس بات میں دل نہیں لگ رہا تھا، جازی کی وجہ سے اس میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی، ان کا اصرار بڑھتا گیا، تب ندیم نے راز بتانے میں پہل کی۔
"آپ جازی سے کہنے گا ان کا شک ٹھیک نکلا، وہ لڑکی جو باہر پڑھنے والی تھی، اس بار بھائی کی بیٹی ہے۔ میں نے بہت سوچ کر بتایا ہے، سب پتہ کر لیا ہے۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے ماموں عبدالاکرم
بولتے ہیں ان کی ان معاملات میں گہری نظر تھی مگر جازی کے لئے میں نے کسی نہ کسی طرح پتہ کیا ہے۔ اب آگے کیا کرنا ہے، یہ پوچھنا تھا جازی سے۔"
"جازی کو چھوڑو، میں جو کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو۔" وہ اسے سمجھانے لگے، پھر ریسیور رکھ کر انہوں نے مڑ کر دیکھا تو ان کے چہرے پر ایک شرارت بھری مسکراہٹ پھیلی نظر آئی تھی۔
"اب دیکھوں گا یہ کیسے چھوڑتے ہیں۔ ماموں کیسے اس کی محبت کو ٹھکراتے ہیں۔ اتنا دیکھا جا سکتا ہے ان کی بات سے، بچپن سے ہی میری بات میں کیوں خامیاں نظر آتی ہیں؟"
ان کی شرارت بھری مسکراہٹ شیطانیت بھری مسکان میں بدل گئی تھی۔ وہ بولتے بولتے جملے پر جملے بنتے جا رہے تھے۔ پہلے کا شیریار کا دھیان ان کی باتوں میں پھنسے پیسے کی طرح اٹک کر رہ گیا تھا۔
"مجھے کیا پتہ، میں بتا کر دفع ہو گیا۔ روز روز وہی ان کا رونا دھونا سنتا ہوں میں اور......"
جملہ بار بار ان کے اندر دہرایا جا رہا تھا اور بار بار ان کا غصہ سوا ہو رہا تھا۔
"ماموں عبدالاکرم...... جس شخص کی تعریف بار بار سے گزری ہے، پتہ نہیں شیریار سے متعلق ہر انسان، ہر چیز سے مجھے نفرت کیوں ہو جاتی ہے؟" انہوں نے اپنی بات مکمل کر کے اپنے بلند بالا قد کو بستر سے

نارمل کیا تھا۔

دوسری صبح شہریار کے لئے بجائے پیغام تھیں اور لائی تھی۔ وہ ناشتے میں مصروف تھا کہ سالار عبدالرحمٰن نے ناشتے کی ٹیبل کو گھمسان کا رن بنا دیا۔

"سالار بھی زمکین سے ناشتہ کر لیا کرو۔ جہاں ساتھ بیٹھتے ہو وہیں ہنگامہ شروع کر دیتے ہو۔" ماما نے غصے سے کہا اور وہ جز بز ہو کر کھڑے ہو گئے۔

"میں ہنگامہ کرتا ہوں یا آپ کا بیٹا روز ہنگاموں کا باعث بنتا ہے؟"

"اب کیا کیا ہے اس نے؟" ماما نے پوچھا۔ ماما نے چائے کا کپ نیچے رکھ دیا تھا کیونکہ معاملہ عقدہ کشائی کے لئے سامنے آنے والا تھا اور یہ کیا معاملہ تھا وہ جاننا چاہتی تھی۔

"پاپا اس نے میرے دستخط بغیر میری اجازت سے بہت سے کروائے ہیں۔"

شہریار نے خفگی سے جازی عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا مگر اس کی آنکھیں خلاف تھیں۔

"شہریار! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ کن کاغذات پر سائن کروائے ہیں سالار نے؟"

"وہ...... پاپا وہ کاغذ بنک پیپرز تھے، جن پر ان کے سائن ضروری تھے مگر ان حالات میں ان کی طرف سے انکار ہی تھا تو میں نے تھوڑی سی چالاکی سے کام لے لیا۔"

"پاپا! آپ کو پتہ ہے کل اس نے اپنے کنالج کے ماتحت ساتھ کیا تو نوٹیفکیشن جاری کروایا ہے؟ جس سے لگا ہے مگر جازی نے بینک کا نوٹس دکھایا تھا۔"

"کیا آرڈر پاس ہوا ہے؟" جازی نے سوال کیا اور وہ غصے سے بولے۔

"حضرت نے کئی بار ہنا دیے ہوا کہ شروع کر دیا ہے کمپنی کے پیسوں سے نئی بانڈ انسپکشن بنک کر دی گئی ہے کئی مالی کالونی بنے کیا بنے گا۔ سارے اخبارات میں ایک اضافی خرچہ جاری کر دیا گیا۔"

"آخر شہریار خان نے یہ فیصلہ کیوں لیا ہے؟" ماما نے سالار عبدالرحمٰن کی آنکھوں میں جھانک کر شہریار سے سوال کیا اور سالار عبدالرحمٰن بھنا کر بولے۔

"تم ماما نے ہی جناب کو کھلی چھوٹ دی ہوئی ہے۔ کیوں کہ ایک اچھا ڈرامہ آپ کی سہولت بھی تو چاہئے۔ آخر کبھی کسی کو کھانے کو بھی ملا رہے؟ مجھی اب بھی باہر رہا کا اچھا خیال رکھتی ہے۔ ابھی چند ہم ملازمین دیتے ہیں یہ اضافی ٹرسٹ کے فنڈ کا بیٹ کون بھرے گا؟ ہم لوگ راجا مہاراجہ کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں یا شہریار پاپا ماحول کو سمجھتے ہیں؟ آپ بتائیے اس میں کیا سمجھداری ہے؟"

حدیل عبدالرحمٰن نے خفگی سے پلیٹ آگے سرکا دی تھی پھر سالار اور عبدالرحمٰن کو مخاطب کر کے بولے تھے۔ "مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی سالار! حالانکہ تم میرے مانتا نے ہو مگر تمہاری اور میری سوچ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" کے پھر کیوں بولے؟ "انبلہ کا جس طرح اسٹیبلشمنٹ والے ہو گئے وہ اسٹیبلشمنٹ میرا پاپا کا بیٹا تو نہیں تم اتنے بند ہے بند ہے اتنا لگ بول رہے ہو؟ وہ بچی مرنے مرنے بچی ہے۔ میں جب ان سے پہلی بار ملا ہوں تو ان کی آنکھوں میں کتنے آنسو تھے، تمہیں کیا پتا؟ تمہیں کیا پتا ہے اس نے کتنی حسرت سے شہریار سے کہا تھا کہ کاش وہ موت ہوتی۔ وہ کوکنگ کی کلاس پک اینڈ ڈراپ کر رہی تھی اور وہ کسی طرح بسوں کے دھکے کھا کر وہاں پہنچتی تھی۔ ایک فطری بات ہے اس کے دل میں بھی حسرت سر اٹھاتی تھی۔ کہا جا رہا ہے شہریار نے یہ فیصلہ کیا کہ کم از کم اس کی کلاس کے لیے تو پک اینڈ ڈراپ کی سہولت ملے گی؟"

سالار عبدالرحمٰن حدیل عبدالرحمٰن کو گھورتے رہے اور شہریار نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ "آپ یہ فیصلہ غلط سمجھتے ہیں تو پلیز اسے بدل لیجیے گا مگر میری زندگی کا ایسا ہی طریقہ جاری رہنے دیجیے۔" ماما کی سانس رکنے لگی تھی لیکن سالار عبدالرحمٰن نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کچھ مت کہا کرو۔ میں جانتا ہوں تمہارے اندر کتنا شعور ہے بیٹا۔"

شہریار کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی وضاحت دیتا بچی ڈرائیور کے ساتھ شیشے کی دیوار کے پیچھے موجود تھی۔

"یہ بچی کون ہے؟" شہریار کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

ماسوں عبدالکریم نے ڈوپٹہ کھینچ لیا تھا۔ اس معاملے پر اس کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔ وہ ہنستا ہنستا ماما کے سوال کو جواب کی طرف موڑتا تھا۔

"وہ ماما! ...... یہ میرے ایک دوست کی بیٹی ہے جسے میں نے......"

"جھوٹ کیوں بول رہے ہو ماما! ...... یہ کیا ان کی بیٹی ہے بابا جان کی اولاد ہے ماضی اور ایک ہی قسم کی لڑکی کی گھٹن دیکھ لینے اور محسوس کر لینے کے لیے یہ کافی ہے کہ اس انسان پر جو شخص اپنی محبت لٹاتا ہے، اس کے لیے اس محبت کی دنیا بھی قیمت نہیں ہے۔"

حدیل عبدالرحمٰن اور پاپا کی آنکھوں میں بھی اب کئی سوالات تھے۔ یہ وہ راز تھا جو اس نے کبھی کسی سے شیئر نہیں کیا تھا۔

"بابا! آپ بتاتے کیوں نہیں، آپ ہی میرے بابا ہیں؟" تجّی کا لہجہ بدلا تھا۔

جازی عبدالرحمٰن کے چہرے سے یاسیت آ گئی

تکلّف سے جواب کے رویے میں نوازش تھی، اس نے اس لمحے پھر سے تجّی کی جگہ اختیار کر لی تھی۔ عائشہ بھابی اور رابعہ بھابی تک اس معاملے میں گھر کی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ کسی نے کوئی لفظ نہیں کہا تھا اور وہ خاموشی سے تجّی کا ہاتھ تھامے ڈاٹ ہاؤس کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

"آپ کو یہاں کس نے بلایا تھا؟" اس نے نرمی سے سوال کیا اور تجّی بھی نرمی سے بولی۔

"مجھے تو بابا رانگل نے فون کر کے کہا تھا کہ آپ مجھے گھر بلوا رہے ہیں۔ میرے نانا ابو بے خبر ہیں، بات بھی ہوئی تھی، بہت محبت سے انہوں نے مجھ سے بات کی تھی اور بہت محبت سے کہا تھا کہ آپ نے اپنے گھر میں میرے لیے جگہ بنائی ہے، اس لیے اس بار گرمیوں کی چھٹیاں میں کراچی آ کر مناؤں۔"

شہریار کچھ نہیں بولا تھا، اس نے ڈاٹ ہاؤس کے دوسرے کمرے کے سامنے تجّی کو لے جا کر کھڑا کر دیا تھا۔

"آپ کا سامان یہاں سیٹ کر دیا گیا ہے۔ ذہنت ورڈ میں سب سنبھال لوں گا۔" وہ کیا کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں پایا تھا۔ کل کی بابا اور وہ ملاقات سے وہ پہلے سے ہی بتا چکا تھا اور بیٹا مگر......"

"مجھے لگتا ہے، میری ساری عمر وضاحتیں دیتے گزر جائے گی۔ پھر بھی میں کسی ایک کے لیے بھی اپنا گھر نہیں کر سکوں گا۔" وہ خود سے بولا تھا پھر وہ تجّی کو لے کر اپنے کمرے میں لے گئے تھے۔

"یہ فائل کیا چکر ہے؟ تم نے کس سلسلے میں سالار جیسے بندے کو ہینڈل کیا ہے؟"

وہ مجبور تھا وہ تجّی کے سلسلے میں وضاحت مانگیں گے مگر انہوں نے بالکل الگ سوال کیا تھا۔

"کمپنی خان نہیں، اسٹاک مارکیٹ کی ممبرشپ کا رزان کے نام ٹرانسفر کروانے کا قانونی معاملہ تھا۔"

"اس کی کیا ضرورت تھی؟" عدیل بھائی کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

اس نے عدیل بھائی کے چہرے سے نظریں ہٹا کر مدھم لہجے میں کہا تھا۔ "آپ جانتے تو ہیں یہ پھر بار بار دہرانے سے کیا فائدہ ہے بڑے بھیا؟"

"شہریار! اتنا اہم آپریشن کروانے میں دیر ہی کیا ہے؟" وہ اس کے قریب آئے اور ہاتھ کا ان کے کمرے کی کھڑکی کھول کر اسی لہجے میں بولا۔

"شاید چار سال پہلے یہ آپریشن کامیاب ہو سکتا تھا لیکن اب...... اب اس کی کامیابی کا صرف ایک فیصد چانس ہے بھیا! اور ننانوے فیصد کو صرف ایک فیصد پر قربان کر دوں؟ کیا نئی مشکل میں ڈال دوں؟ نہیں... کچھ تھا جو اسی لہجے میں بولا۔ "آپ میرے لئے پریشان مت ہوا کریں بھائی! جو چیزیں پہلے سے طے ہیں انہیں اس طرح اپنے مطابق ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

عدیل بھائی کوئی بات کہنے کے لئے منانے میں رہ گئے تھے، پھر ماحول کو چینج کرنے کو کہا۔ "یاسمین تمہاری محبت میں بگڑ رہا ہے۔ تمہیں اپنی علاقی ذمہ داریوں سے روگردانی کرنے لگا؟ مجھے لگتا ہے اب اس کے کان کھینچنے ہی پڑیں گے مجھے۔"

شہریار جو سنجیدگی میں ڈوبا ہوا تھا فوراً مسکرانے لگا پھر نہایت وضاحت سے بولا۔

"پلیز بڑے بھیا! اس طرح تو مت کریں اور پھر ابھی تو دیکھیں وہ آپ کے ڈیپارٹمنٹ کا سب سے ذہین ایماندار ہے، وہ ہمیشہ جان ہتھیلی پہ لئے گھومتا ہے ایسے میں ایک اہم جینٹ وہ اپنی ذات کے لئے نہ ڈیپارٹمنٹ کے مارجن سے لے لیتا ہے تو بڑی آسانی سے درگزر کیا جا سکتا ہے۔"

"اچھا...... آپ کی طرف میں سوچنے لگا اس تو نظرانداز کیا ہے ہوا ڈیپارٹمنٹ۔" وہ ہنسے پھر یکدم اچانک بولے۔ "تم شادی کب کر رہے ہو؟"

"میری شادی ہو چکی ہے بڑے بھیا!" اس نے ترنت جواب دیا۔

عدیل بھائی نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔ "میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہو یہ بات۔"

وہ نظریں چرا گیا۔ عدیل بھائی کا اصرار بڑھتا گیا تب اس نے بچی کے ملنے کی پوری داستان کہہ سنائی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، یہ سچ ہو سکتا ہے؟" عدیل بھائی نے پوچھا۔

WWW.AANCHAL.COM.PK

وہ اسی سے بولا۔ "آپ کو کیا لگتا ہے، کوئی لڑکی اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولے گی؟"

"تم نے کبھی اس سچ کے اندر جھانکنے کی کوشش کی؟"

اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ "میں نے یہ سوچے بغیر کہ یہ سچ ہے یا جھوٹ ہے، اسے صرف سمجھانے کی کوشش کی ہے۔"

عدیل بھائی نے ایک لمحے تک اسے دیکھا، پھر یکدم بازو پھیلا کر اسے اپنے اندر سمیٹ لیا۔ "پتہ ہے، میں تمہیں کبھی سمجھ بھی نہیں سکا، شہریار! لگتا ہے تم ہم سب بھائیوں میں سب سے الگ، سب سے پیارے انسان ہو۔" شہریار کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی پھیل گئی، وہ جیسے ان سے ٹکرانے لگا تھا۔

"منی کے لیے اس گھر میں گنجائش نکل سکتی ہے بھیا؟"

"بے فکر رہو، اس طرف سے اب تم سے کوئی اس سلسلے میں سوال نہیں اٹھائے گا۔ اور اگر کسی نے زیادہ ہنگامہ کیا تو پھر مجھے نمٹنا آتا ہے ایسے حالات سے۔"

اس نے ہلکے سے عدیل بھائی کے کندھے پر مکا مارا۔ "آپ بہت زیادہ گریٹ ہو بھائی!...... میں تو آپ کا عشر عشیر بھی نہیں ہوں۔"

"کیا بکتا ہے؟" عدیل بھائی کا قہقہہ فلک شگاف تھا اور دروازے کا ہینڈل تھامے کھڑی ماما کا دل کب سے جیسے پسلیوں سے لرز رہا تھا۔

کس کس کے آپریشن کی بات چل رہی تھی اور کس چیز کا آپریشن...... بہت سے سوالات ابھر رہے تھے مگر ہلکے سے کھلے دروازے سے آواز بہت صاف سنائی دے رہی تھی۔ ماما نے بیشتر باتیں سنی، پھر وہ واش روم سے ہو کر گزر رہی تھیں، جب ان کے کانوں میں ماہ رخ عبدالرحمن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی نالائق کو پانے کے لیے ڈائننگ کی طرف جا رہے تھے مگر ماما پوچھنے کے لیے رکی نہیں تھیں۔ ان کا دل تیز آندھیوں کی زد میں تھا۔ شہریار کا ماضی کن لہجوں ان کے اندر ہزار طرح کے سوال اٹھا رہا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ وہ ان سوالوں کے جواب کسی سے حاصل نہیں کر سکتی تھیں۔

پاپا ابھی لاؤنج میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ ماما کو ادھر پا کر انہیں کھانے کی اطلاع ملی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" انہوں نے ماما سے پوچھا اور جاوید بابا نام دہرانے لگی۔

"ارسلان راشدی۔"

ان کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ ارسلان راشدی ان پر نظر ٹکائے کھڑے تھے۔

"کیسے ہو تم؟" مسٹر عبدالرحمٰن نے انہیں تحیر سے چھو کر یوں دیکھا، جیسے وہ کوئی خواب تھے۔ شاید اتنے برسوں بعد تو حقیقت بھی خواب سا لگنے لگتی ہے اور یہ حقیقت تو تھی کا سم پا کر جا رہی تھی، پھر کسی کو کیا پتا، یہ حقیقت زندہ بھی تھی یا بابا، سامنے کے اور ارسلان راشدی کے بیچ کھڑا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، مجھے کیسا ہونا چاہیے؟ مجھے، جس نے اپنی محبت کھو دی، اپنا دوست کھو دیا۔"

"کھونے کی ضرورت تمہاری تھی۔ میں نے تو بہت کوشش کی تھی کہ......"

"اب اس میں کیا رکھا ہے کہ غلطی کس کی طرف سے تھی۔ دکھ تو یہ ہے کہ میں نے جو جھیلا ہے، تم نے عمر قید کاٹی ہے۔"

"جو عمر قید تم نے کاٹی ہے، اگر میرے چہرے کو دیکھو تو تمہیں لگے گا تم نے تو صرف عمر قید کاٹی ہے، عطیہ زمین، اپنی مٹی ملنے مٹنے کا آسرا تو تھا تمہیں، میں تو ایک لمحے میں زندگی میں جلاوطنی کی سزا میں ہزار بار جیا ہوں، ہزار بار مرا ہوں۔ کتنا دل کرتا تھا، کبھی پھر سے پلٹ کر تمہیں دیکھوں، تمہیں بتاؤں کہ تم نے عطیہ کو کھونے میں بہت جلد بازی کا ثبوت دیا۔"

"عطیہ...... کاش وہ تم سے زیادہ مجھ سے دل کا حال کہنے کی عادت ڈال لیتی تو ہماری پیار کہانی کا انجام بہت مختلف ہوتا۔"

مسٹر عبدالرحمٰن تھک کر بیٹھ گئے تھے، پھر بھرائے لہجے میں بولے۔ "وہ تو جتنے دن تمہارے ساتھ رہی، ہمیشہ تمہارے پیچھے ہارتی ہی رہی۔ کتنی باتیں تھیں، کتنے سچ جو وہ تم سے شیئر کرنا چاہتی تھی، مگر تمہارے پاس اسے دینے کے لیے سوائے آنسوؤں، سوائے نظرانداز کیے جانے کے کوئی چیز نہیں تھا۔ اپنے بچے کے بارے میں تمہارے حوالے سے کتنے خواب تھے اس کی آنکھوں میں، وہ سنتے خواب مار دیے، اگر تم دیکھ لیتے تو اس کی مر جانے والی آنکھوں سے پہلے مر جاتے۔ مگر تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی تو کب تھا، ورنہ آج تمہاری پیار کہانی بہت مختلف ہوتی۔"

"مجھے تم بتا نہیں سکتے تھے کہ میں نے عطیہ کو کھو دیا ہے۔ تمہیں پتہ ہے پورے بیس سال سے میں اسے ہر دکھ کی بات میں یاد کر کے دکھ کو سوا کرتا رہا ہوں۔ اتنا یاد وہ کہ میرا دل اس کے بوجھ سے بالکل خالی ہو گیا۔ کون سا ایسا لفظ تھا، جو میں اسے دینے سے نہیں ہو کا اور وہ...... وہ منوں مٹی تلے سلا دی گئی تھی۔ یہ سارے خزانے مٹی کے نیچے کیوں دفن کرنے کی روایت ہے، کس نے ڈالی ہے یہ روایت؟" وہ بات

کمرے سے نکل گئے تھے۔

مسز عبدالرحمٰن نے ان کو شانت کرنا چاہا مگر بے چارگی سے بولے تھے "میں تو صرف اسے گھر کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے تو کئی بار کہا تھا کہ ارسلان سے ایک بار ملنے دیں۔ ایک بار وہ عطیہ کی اولاد کو بانہوں میں لے لے تو شاید عطیہ کی روح کو سکون آ جائے۔"

ارسلان راشدی نے ان کے چہرے کی طرف بے یقینی سے دیکھا پھر آنکھوں کے ہم رنگ دبے سے بولے۔ "آخر ایسا کیوں کریں گی؟ ان میں میرے بچے سے کیا پرخاش ہو سکتی ہے؟"

مسز عبدالرحمٰن کو یک دم شہریار کا جھوٹ یاد آ گیا تھا۔ وہ کیا کہہ گئے تھے جذبات میں۔

ارسلان راشدی نے چونک کر پوچھا۔ "عطیہ تو صرف بیٹی تھی ان اور وہ بھی جنم دینے میں چل بسی پھر یہ کس بچے کا ذکر ہے؟"

پاپا کو شہریار اس لمحے میں بہت شدت سے یاد آیا تھا اور عین اسی وقت ان کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ شہریار کو ایسی صورت حال سے نمٹنے کا احساس بہت شدت سے ہوا تھا اور اسی وقت مسٹر ارسلان راشدی نے اسے نظروں سے بتایا۔ مجھے مرے سے سوال کیا تھا۔ "تم کس بچے کا ذکر کر رہے ہو عبدالرحمٰن؟ میری تو صرف بیٹی تھی نا؟"

شہریار نے ایک ساعت میں سوچا تھا پھر نرمی سے بولا تھا۔ "یہ میرا ذکر کر رہے تھے انکل! انہیں یہ بتا رہا تھا کہ آپ عطیہ کے زندگی سے نکل جانے سے بالکل ٹوٹ گئے ہیں اور زندگی سے ہار گئے ہیں تو پاپا نے اپنی گود کی محبت آپ کی گود میں ڈالنی چاہی تھی۔ ماما کہ آپ کا وجود پھر سے جڑ سکے۔ ہم عطیہ کی بیٹی کی بات کو بیٹھے تھے مگر وہ بچی مر چکی تھی اور یہی پاپا کے پاس بھی پہنچی تھی لیکن اگر وہ یہ کہتے تو شاید آپ اسی پل مر جاتے اس لئے انہوں نے قربانی دینی چاہی تھی مگر آخر ہم نے انہیں آپ تک پہنچنے ہی نہیں دیا تھا۔"

"عبدالرحمٰن! تم..... تم اتنے گہرے ہو! اپنی چھوٹی کی خوشی کو کوئی کسی کو کب دیتا ہے؟ تم اتنی محبت کرتے تھے مجھ سے اور میں تم سے کتنی نفرت کرتا تھا۔ مجھے معاف کر دو عبدالرحمٰن!" ارسلان راشدی نے مسٹر عبدالرحمٰن کے کندھوں کو تھاما اور پاپا نے شہریار کی طرح جذبات سے ان کو سینے سے بھینچ لیا تھا۔ وہ دونوں پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

شہریار کا دل ایک بار پھر سے ننھے بچے کی طرح مچلنے لگا تھا مگر اسے پاپا کے دل کا خیال رکھنا تھا ضبط کر گیا تھا۔

ارسلان راشدی بہت دیر بعد پاپا سے الگ ہوئے تھے اور اب ان کی پرنم نگاہ شہریار کی طرف تھی۔

"عبدالرحمن! تمہارے بچے بالکل تم پر گئے ہیں۔ ان کی تربیت میں ذرا سا بھی جھول نہیں ہے۔ مجھے اب لگتا ہے شاید تمہارا بیٹا پہلے سے مجھے جانتا تھا۔ تبھی اس کا رویہ میرے ساتھ بہت احترام والا تھا۔ اس نے ساتھ فوری بہت مدد کی ہے۔ سوہا کے معاملے میں میرے بچے کے قدموں کو تھام کر وہ ساتھ رہا ہے۔ تمہارا بیٹا حمد بن عبدالرحمن وہ بھی بہت اچھا انسان ہے۔"

بابا کی آنکھوں میں فخر سا آگیا تھا مگر پھر بابا کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر ان کا دل تھمنے لگا تھا۔

کیا ان سب کی قسمت میں صرف صبر لکھا ہے؟...... ان کا دل کراہا تھا۔ اسی وقت ارسلان راشدی نے محبت سے اسے گلے سے لگا لیا تھا۔

"تم جیسے بچے قسمت والوں کو ملتے ہیں عبدالرحمن! یہاں مجھ سے جیت گیا ... معاملے میں۔ مجھ سے ایک سٹینڈ پیچھے رہتا تھا۔ میں اس سے زیادہ اچھا حساب دان تھا۔"

"بابا وہ اصل میں دل اور محبت میں پیچھے رہ جاتے ہوں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ آج تک وہ نہیں پا سکے ہیں۔"

مسٹر ارسلان راشدی کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔ وہ بات سنبھال کر کچھ کہتا ہی رہا تھا کہ حماد کے فون پہ ... اخبار کے اندرونی صفحات پر اس کی نظر جا کر ٹھہر گئی تھی۔ اس نے تیزی سے خارجی دروازے کی طرف قدم بڑھائے تھے اور کار پارکنگ سے ... پھر ایک بک اسٹال سے وہی اخبار خریدا تھا۔ پاس کی ... تصویر تھی اور جو خبر تفصیل سے لکھی تھی، اس نے اسے تجسس نے مجبور کر دیا تھا۔ اس نے گاڑی سائیڈ پر روک کر ... کا نمبر ملایا تھا۔ پھر وہ سخت لہجے میں استفسار کر رہا تھا۔ ایک ساتھ ہی سامعہ کی آواز سنائی دی تھی۔

"تب ... کیوں لکھوانے کا کام ... کیوں لگتا ہے ... لوگ تو خبروں میں ان رہنے کے لیے ... ایکسیڈنٹ کرواتے ہیں۔ ہم تمہاری طرف سے بغیر کسی اضافی چارج کے تمہیں ... فرصت ... دیتے ہیں۔ تمہیں تو ہمارا احسان ماننا چاہیے کہ ہم نے تمہیں خبروں میں مرنے نہیں دیا۔"

"چاہے زندگی موت جیسی کر دو؟ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ تم لوگ مجھے جینے کیوں نہیں دیتے ہو؟...... سامعہ! تمہیں اب تک نہیں پتا چلا میرا کیا بگاڑا ہے؟"

سامعہ طنز سے قہقہہ لگا کر بولا۔ "تم صرف مجھ سے ... کرنے ... تمہیں کیا سمجھا؟ تمہیں تمہارے اپنے گھر والے ... سنو ... صرف ... کا ... ہے بلکہ تمہارا ... گھر سے نکلوانے کی ... ہے۔"

"میرے ساتھ چکر ہے؟...... کون ہے وہ؟"

"تم بہت اچھے سے جانتے ہو۔" وجاہت بول کر چپ ہوا اور شہریار نے سرد سے لہجے میں کہا۔

"سالار ریحانی...... کیا سالار ریحانی؟"

مگر سالار فون بند کر چکا تھا۔ وہ جیسے تیسے گھر پہنچا تھا۔ آج سالار ریحانی خبر سنا گئے تھے۔ اس کا خیال تھا وہ گھر میں ہوں گے۔ وہ تھی وہ گھر ہی میں تھے۔

عائشہ بھابی کی تیز آواز کمرے سے باہر آ رہی تھی۔

"آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آپ جانتے ہیں، ماما شہریار ایسا نہیں ہے، پھر آپ ہمیں کیوں ایسے کیوں دیتے رہتے ہیں؟ جانے کتنا صوفت ... جہاں شہریار کا نام آتا ہے، آپ کو آگ لگ جاتی ہے۔"

"بکواس مت کرو تم...... تم نہیں جانتیں، مجھے اس شخص سے کتنی نفرت ہے بالکل نفرت ہے مجھے اس سے کہ میں اسے زندہ دیکھتا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے، میں اسے گولی سے اڑا دوں، وہ مر جائے۔"

"سالار...... آپ کو پتہ ہے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ میرا بھائی ہے، میں دن رات اس کی زندگی کی دعا کرتی ہوں ... آپ ہیں کہ......"

عائشہ بھابی کے رونے کی آواز ... نئے سرے سے عائشہ بھابی ... [illegible]
مگر ڈرائنگ روم کے قریب سے گزرتے ہوئے بابا کی آواز پر وہ رک گیا تھا۔

"آپ صرف اس لئے چاہتی ہیں اس سے کہ اس شادی کے لئے شہریار بھائی نے منع کیا تھا۔ ماما! آپ آخر ان کی زبان کیوں بولنے لگی ہیں؟ آخر وہ فی کیا ہے جو ... میں؟"

"وہ تمہارے قابل نہیں ہے۔ وہ اچھا انسان نہیں ہے۔"

"وہ اچھا انسان نہیں ہے تو شہریار بھائی نے کہاں سے جان لیا؟ ماما! میرا دل چاہتا ہے میں شہریار بھائی سے ایک بار پوچھوں تو وہ آخر ... کسی کو اچھا برا ہونے کا ٹھپہ لگانے والے؟ کبھی خود بھی نے اپنے کردار کی چھان بین کی ہے؟ آخر انہیں غرور کس بات کا ہے؟ بڑی سمجھائی تھی میں انہوں نے ہماری عزت خاک میں ملا کر رکھ دی ہے۔"

شہریار نے پکار کر بے وقت کہا تھا۔

"شہریار.....!" نانو کی آواز پر وہ چونک کر مڑا تھا۔

"کیا میں واقعی بہت برا ہوں نانو؟" انتہائی بے چارگی سے اس نے پوچھا۔ کتنا عجیب وقت پڑا تھا اس پر کہ وہ اپنے کردار کی وضاحت کے لئے کسی اور سے گواہی چاہ رہا تھا۔ وہ اپنی ذات پر تکیہ کیے بیٹھا ہوا سمجھا تھا۔ نانو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا، نرمی سے بولی تھیں۔

"نا سمجھ ہیں یہ سب۔ میں خود بھی ان سے ناراض ہو گئی ہوں، اس لئے کہہ رہی ہوں، جب ان کی آنکھوں سے پٹی اترے گی تو خود تم سے اپنے کیے کی معافی مانگیں گے۔"

"نانو! مجھے حسرت کبھی نہیں رہی کہ کوئی مجھے صحیح کرنے میں غلطی کرے، یہ معافی مانگے، میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں، مجھے سانس لینے، جینے کی تھوڑی سی آزادی ملے۔ یہ ہم وہاں تھیں، یہ میں میرا وقت جو گزر رہا ہے، اس وقت کو میں محبت کشید کرنے میں گزار سکوں۔"

"آئے گا، وہ وقت ضرور آئے گا۔"

نانو کی تسلی کا سرا تھامے وہ جس طرح چپکے سے آیا تھا اسی طرح چپکے سے اپنے روم کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ باہر کے بیٹھی کی آمد پر کیا خاص ردعمل نہیں رہا تھا اور اس کے لئے یہ بات حیرت انگیز تھی۔ نانو کی وہاں آنے کے ساتھ ہی لاڈلی کی طرح بیمار بن گئی تھی۔ اس نے میس کے بجائے ہاؤس میں داخل کروا دیا تھا۔ عبدالرحمٰن کو بیٹی کو حیثیت کا تعین کیا تھا۔ عدیل بھائی اس بات پر بھی اس سے خوب خفا تھے۔ سب ہی نا سمجھ کر جھک گئے تھے اسے خوب سے گنج ہونے لگے تھے۔ وہ ہزار کوشش کے باوجود بھی فون کرنے کے لئے ہمت نہیں کر سکے تھے۔

وہ چپکے سے روم میں آ کر لیٹ گیا تھا اور اسی وقت اس کے سیل پر بیپ ہوئی تھی۔

"شہریار....." اس نے آنکھیں بند کیے جمائی لیتے ہوئے کہا اور دوسری طرف سے جاذبہ کی نکھری آواز آئی تھی۔

"کیا دو دن پہلے تم نے مجھ سے مذاق کیا تھا شہریار؟ کیا واقعی تم اتنے گھٹیا ہو سکتے ہو کہ بدلہ لینے کے لئے میری محبت کو بھی درمیان میں گھسیٹ لائے تھے؟"

شہریار کو بہت عجیب سی کیفیت سے واسطہ پڑا تھا۔ "صرف دو دن میں کچھ معاملات میں اتنا الجھا رہا تھا کہ میرے ذہن سے یہ بات نکل ہی گئی تھی، نکل چکا ہے۔ میں تم سے ثانیہ کے لئے ضرور ملوں گا۔"

جانا نے بجھ کے ٹیلیفون رکھ دیا تھا اور وہ تکیے پر سر ڈالے سونے کی کوشش کرنے لگا تھا ایک پُرسکون اور مطمئن نیند...... لیکن کیا واقعی ایسی نیند اُس کی قسمت میں تھی؟

❀❀❀

انوشے بہت غیر مطمئن سی بیٹھی تھی۔ بیگم جانیہ نے اس کا چہرہ دیکھا تھا اور پھر آہستگی سے بولی تھیں۔

"آخر تمہارے اور عارف کے درمیان کس بات کی دوری ہے؟"

انوشے کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے پھر اس نے بھرائے لہجے میں کہا۔ "دراصل یہ عارف کی نہیں ہے ماما! غلطی میری ہے۔ میں نے اسے زندگی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو صرف میری طرف میری دولت کی وجہ سے اٹریکٹ ہو گیا تھا اسے لگتا تھا کہ میں اسے ایک پُرآسائش زندگی دے سکتی ہوں۔ شاید اس سوچ میں بھی وہ حق بجانب تھا تو بھی ساری عمر مجھے محبت کا دھوکا دیتا رہتا اور میں خوش رہتی۔ لیکن بس اچانک ماما اس کی زندگی میں جانے کیسے شائستہ آگئی تو اسے لگا دولت اہم نہیں محبت سب کچھ ہے۔ شاید قسمت نے ایک خاص کشش رکھی ہے۔ وہ میری طرف سے مڑ گیا تھا۔ جب انکل نے اسے دباؤ میں لے کر کہا کہ اگر وہ مجھ سے شادی کرنے اور دولت حاصل کرنے کے حصول میں کامیاب ہو گیا تو شائستہ سے وہ خود اس کی خفیہ شادی کروا دیں گے۔ وہ دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلتا رہے گا۔ آخر کو مرد دو دو شادیاں کرتے ہی ہیں۔ مگر بدقسمتی سے میں نے اسے چیک کرنے میں غلطی کی اور اس نے شائستہ کو کھونے میں جلدی کی۔ ماما! وہ دو طرح کی لڑکی نکلی۔ اس نے اسے ٹھکرا دیا تب سے اب تک یہ حالت ہے اس کی کہ وہ ہر دم میرے ساتھ ہے مگر میرے چہرے میں شائستہ کو تلاش کرتا ہے میرے لمس سے بھاگتا ہے جیسے میں...... میں اسے قید کرنے والی کوئی چڑیل ہوں۔"

وہ بیگم جانیہ کے سینے سے سر ٹکا کر رونے لگی تھی۔ بیگم جانیہ نے اس کے آنسو پونچھے تھے پھر مدھم لہجے میں بولی تھیں۔

"اسے وقت دو۔ ابھی تمہاری شادی کو صرف دو ماہ ہی تو ہوئے ہیں۔ آنکھ بند کر کے اس کے حکم پر چلو، جو وہ کہتا ہے ویسی بن جاؤ۔ کسی کے دل میں جگہ بنانا بہت مشکل ہے انوشے! اور ایسا دل، جہاں پہلے سے کسی کا قیام ہو......" وہ کچھ پل کو رکیں، پھر اسی لہجے میں بولیں۔ "مجھے دیکھو میں نے بھی ایسی ہی سخت جانی سے یہ عمر گزاری تھی۔ تمہارے پاپا کے دل میں تانیہ تھی مگر میری محبت، خلوص اور وفا نے انہیں تانیہ کو بھلا دیا۔ وہ شروع شروع میں مجھ میں بھی تانیہ کو کھوجتے تھے۔ میری آنکھوں میں اس کے رنگ دیکھتے۔ کبھی کبھی مجھے جھڑک بھی دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے ساری عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ دیکھ لینا ایک دن تم بھی مجھے تانیہ کی طرح چھوڑ جاؤ گی۔ اس نے بھی شروع میں اپنی عادت ڈالنے کے لیے ایسی ہی محبت لٹائی تھی مگر اب دیکھو اسے تو شاید میرا نام بھی یاد نہیں ہوگا۔ میں یہ سب سنتی تھی، پیتی تھی

تھی کیونکہ جانتی تھی تو نے لیے ہوئے دل سے آ بنا کے علاوہ وہ کچھ نہیں لکھتا۔ ستارہ کا کیسا رنگ ڈھیلا ہو جائے یا ٹوٹ جائے تو تو نے میں فرق آ جاتا ہے۔ مگر یہ تو دل تھا اس میں کھٹکے اس بات کو ماننے میں کہ وہ محبت کھو چکے ہیں، بہت وقت تو لگتا ہی تھا مگر مجھے یقین تھا میری ذرہ حرارت محبت کبھی نہ کبھی آدھے آدھے بٹے ہوئے سلیم کو سمجھا ضرور کرے گی۔ محبت کبھی رائیگاں نہیں جاتی افوہ شاہ اور دیکھو میرے اس یقین نے مجھے بے اعتبار ہونے نہیں دیا۔ سو تمہیں بھی اسی ریاضت کے لئے خود کو تیار کرنا پڑے گا۔ محبت کرنا آسان ہے مگر محبت پالینا اور اسے نبھانا یہ مشکل کام ہے۔ اس لئے تمہیں پہلے اپنے دل میں جھانکنا پڑے گا کیا تمہیں واقعی عارف سے محبت ہے یا یہ صرف تمہارے دل کا دھوکا تھا؟ اگر دل اس محبت کو مان لے تو پھر انگاروں تک پر چلنے کا حوصلہ پیدا کرو۔ محبت یونہی ملتی ہے۔ آگ کا دریا ہے یہ اسے پار کرنا محبت خود سکھاتی ہے۔ اگر وہ تمہارے دل کا اس کے قابل سمجھتی ہے۔"

❀❀❀

جازی عبدالرحمٰن عموماً پرائیویٹ پارٹیز میں جانے سے کتراتا۔ کالج جانے تک سب کے سے زیادہ پاس فرصت کا وقت کم بچتا تھا اس کے فرینڈز کہتے، تجھے اتنی جلدی بزنس میں گھسنے کی کیا ضرورت تھی؟ بزنس ٹائیکون کا بیٹا تھا، مزے کرتا، پڑھتا یا نہ پڑھتا تب بھی چل جاتا مگر وہ ان باتوں کو اہمیت دیے بغیر اپنی ذمے داریوں میں جتا ہوا تھا۔ شہریار عبدالرحمٰن نے نامحسوس طور پر واقعی اسے اپنی زندگی خود جینے کی عادت چھڑوا دی تھی۔ اب وہ کام کے لئے بہتر ہو رہا تھا۔ بس غنیمت تھا کہ بزنس اور تعلیم ایک ساتھ چل رہے تھے لیکن اس سب کے باوجود پرائیویٹ پارٹیز...... وہ ایسے دعوت نامے دوستوں کی نذر کر دیتا تھا لیکن اس بار یہ ممکن نہیں ہو سکا تھا کیونکہ یہ دعوت نامہ اسے سب سے عزیز دوست ندیم کی طرف سے تھا۔ وہ امریکہ سے ایک ہفتے کے قیام کے سلسلے میں آیا تھا اور اس ایک ہفتے کے لئے اس نے ایک بنگلہ رینٹ پر لے لیا تھا۔ یہ بنگلہ عموماً اسی قسم کی سرگرمیوں کے لئے استعمال ہوتا تھا اس لئے کسی بھی معاملے پر اعتراض نہیں کیا گیا تھا۔

'جاؤں یا نہ جاؤں؟' وہ [illegible] گھماتے ہوئے مسلسل سوچ رہا تھا کہ یکدم اس نے فیصلہ کر لیا 'اسے جانا چاہئے۔ آخر کو وہ دوستی کرنے کو اس کا بھی کوئی حق ہے۔ شہریار بھائی مزے کر سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں؟'

وہ کمرے سے نکلا تھا اسی وقت شہریار ٹیلی فون کے پاس کھڑا اپنے نام آنے والی ڈاک میں سے ایک خط کے متن پر توجہ دے رہا تھا۔

'یہ کام کمرے میں نہیں ہو سکتا تھا' اس نے چڑ کر سوچا پھر طنز سے بولا۔ 'اگر یہ کام اپنے روم میں کر لیا جائے تو فرق کی باقی لڑکیوں کو دیکھ کر آنکھوں کو جو سیرابی ملتی ہے، وہ کہاں سے ملے گی؟'"

شہریار نے اس کا انداز دیکھا تھا اور نظر انداز کر کے پھر سے اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ دراصل وہ دفتر سے اٹھتے وقت ذہن و دل میں کچھ الجھ رہا تھا، جب چاچا کے اس خط پر نظر پڑی جس میں انہوں نے حسابات کے حوالے سے
کیا بہت اطلاع دی تھی جو شہریار کی معلومات کے مطابق قطعی بے بنیاد اور غلط تھی۔ ان کے اکاؤنٹ میں بڑی رقم جمع ہی نہیں کروائی گئی تھی، اس لئے وہ خط کا جواب فوراً سے پیشتر بھجوانے کے لئے
جواب ڈرافٹ کر رہا تھا۔

جازی نگاہ غلط انداز ڈال کر آگے بڑھ گیا تھا، پھر شام ڈھلے وہ باہر ٹہل رہا تھا، جب چاچا کے مجتبیٰ نے کہا تھا۔

''ہاں...... چاچو...... ! آپ آج کل ذرا ہمارے لگ رہے ہیں۔''

جازی نے جواب محسوس کر کے دیکھا مگر جواب نہیں دیا۔ وہ کئی دنوں سے وہ اس کی طرح کی ہر شرارت اور تحریک کا ایک منٹ کے لئے [illegible] رہا تھا۔ مجتبیٰ بھی مجتبیٰ کے لئے [illegible] پیدا ہوتے
بھی لگتا تو وہ دونوں سے کہتا کہ یہ شہریار رضائی کی بیٹی ہے، اس لئے ان کی شرح تنقید کے [illegible] سے بچ نہیں سکتا۔ اس سے وہ سمجھتا تھا کہ جس طرح شہریار عبدالرحمٰن نے اس گھر کے سکون کو
غارت کیا ہے، وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ بھی ان کی بیٹی سے ایسی ہی بے مروتی برتے۔ مجتبیٰ تھک کر بیٹھ گئی تھی مگر حالت بہت بے چین ہو رہی تھی، کیونکہ رابعہ بھابی نے اسے لانے کے ساتھ باہر
لے جانے کے لئے آواز دے دی تھی۔ جازی عبدالرحمٰن باتیں نکال کر باہر نکلتا چلا گیا۔

بارہ بجے سے پارٹی کبھی ہوتی ہے، آج کل اراکے اس کا تجربہ تھا۔

''تم اپنی پارٹنر نہیں لائے؟'' ندیم نے دوبارہ لہجے میں پوچھا اور دونوں میں بات شروع کرنے لگا۔

''میں نے آج تک تب سے ڈانس سے بڑا اور وہیں آگے بڑھا ہی نہیں۔''

''کیا جی میں رقص کا ساتھ ایک بار ہوا تم؟'' ندیم ہنسا، پھر ہاتھ کے اشارے سے اس نے کسی کو بلایا۔ جازی نے صرف پہلی نظر ڈالی تھی، وہ مری نظر ڈالنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ یہ اس کا پہلا تجربہ تھا، اس لئے
اس کا پورا وجود پسینہ پسینہ ہو گیا تھا۔

ندیم اس کی فیلنگ سے بے پروا سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ میرا اتفاق نہیں ہے۔ جب اسے تم نے کتنی ویٹ سے ... میں مجنوں کا ... تمہیں مجھ سے تعلق نہیں ہے۔"

"محبت...... یہ کیسی محبت ہے؟" اس نے اپنے گھر میں ایک صاف ستھری محبت دیکھی تھی۔ ایسی محبت جہاں ... لڑکی نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور اس نے کرنٹ لگنے کی کیفیت میں ہاتھ چھڑا لیا تھا آخر کب تک ... کے آگے ... ایک سیکنڈ میں ... گیا تھا اور ... نے اس کا دماغ اڑا دیا تھا۔ ... میں بے ہوش ہو چکا تھا۔

"یہ بہت ہی ... ہے شیم!" لڑکی نے مایوسی سے کہا اور ... "تمہارے ... کے آگے ہم جیسے ... پانی بھرتے ہیں۔ ... کا ... جلد ... جائے گا۔"

"تم اسے اپنی طرح کیوں بنانا چاہتے ہو؟" لڑکی کی ادا ... کی تھی۔

"وہ ... ہاہاہا...... بچے جو ... کے لئے اس کا ... کسی بھی طرح ... ہوتا ہے مگر بہت ... ہے۔"

لڑکی ہنسنے لگی تھی اور وقت اس سے زیادہ ... رہا تھا۔

❀❀❀

"خیریت انوشے؟" شہریار داخل ہوا اور گیٹ ... سوال پوچھنے لگا تھا۔

انوشے اسے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بیٹھ گئی تھی پھر سب کچھ کہہ ... دی۔

"میں ... شہریار ... کے کہنے پر میں ... کرتی ہوں ... مجھ سے ... چلی جاؤ تم میری زندگی سے نکل جاؤ، مجھے اکیلا ... وہ مجھے شانی نہیں ملی تو میں بھی زندہ ... نہیں رہ سکتا۔"

"تمہیں معلوم ہے شانی کیسی ہے؟" شہریار کی ... آنکھیں ... انوشے کے چہرے پر ... وہ جانتا تھا ... کیسی ہے لیکن انوشے سے سننا چاہتا تھا اور وہ بھی کہ شہریار کے جذبات سے پرے کیا دی تھی۔

"اسے ... نہیں لگتا ... کے لئے ... سکتا ہے۔ مگر عارف ... اس کے ... لگتا ہے ... آنکھیں ... غزل لکھے گا" عارف نے چپکے سے

AANCHAL.COM.PK

"یہ میرا لفظوں پر ایمان ہے۔ جب اسے تم نے کتنی ویٹ ہے ورنہ میں مجنوں کا حتمی ہیں مجھ سے تعلق نہیں ہے۔"

محبت...... یہ کیسی محبت ہے؟ اس نے اپنے گھر میں ایک حماقت سے تحریر کی تھی۔ ایسی محبت کہاں ملتی تھی اس نے بڈی نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور اس نے کرنٹ لگنے کی کیفیت میں ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ آخر کب تک سمندر کے آگے ڈگمگاتا ایک سیکنڈ میں بہہ گیا تھا ورنہ تک نے اس کا دماغ اڑا دیا تھا۔ وہ بیگ ہی میں بے ہوش ہو چکا تھا۔

"یہ بہت ہی زیادہ بے ہنگم ہے" لڑکی نے مایوسی سے کہا اور قدم بڑھایا۔ "تمہارے یہ کمرشل کے آگے ہم جیسے کتا کس پانی بھرتے ہیں۔ یہ تو چیز اس کا پیار ہو تو تم جلد ہی جلد ہو جائے گا۔"

"تم اسے اپنی طرح کیوں بنانا چاہتے ہو؟" لڑکی کی ادا میں ناز کی تھی۔

"وہ قیمتی لگا کر رہا۔" ہاہاہا..... اچھے جو بیمار ہوں گے تو اپنی عیاشی کے لئے اس کا پیسہ اڑائیں گے۔ وہاں سائیڈ بکٹ کسی بھی طرح کو بیوقوف رکھنا ہوتا ہے مگر بہت آسان شکار ثابت ہوتا ہے۔"

لڑکی ہنسنے لگی تھی اور وقت اس سے زیادہ دیر نہیں رہا تھا۔

❀❀❀

"خیریت انوشے؟" شہریار داخل ہوا اور گیٹ پر ہی سوال پوچھنے لگا تھا۔

انوشے اسے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بیٹھ گئی تھی پھر سب کچھ کہہ چکی تو رو دی۔

"میں اپنا گھر بار نہیں کرنا چاہتی شہری! مام کے کہنے پر میں جتنا تحمل کر رہی ہوں وہ اتنا ہی مجھ سے مس بی ہیو کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے تم چلی جاؤ تم میری زندگی سے نکل جاؤ، مجھے اکیلا کر دو۔ وہ مجھے شانی نہیں ملی تو میں بھی زندہ نظروں سے نہیں دیکھ سکتا۔"

"تمہیں معلوم ہے شانی کیسی ہے؟" شہریار کی سماعت آنکھیں بن کر انوشے کے چہرے پر اترنے لگیں۔ وہ جانتا تھا شانی کیسی ہے لیکن انوشے سے سننا چاہتا تھا اور وہ بھی کہ شہریار کے جذبات سے پرے کہہ دی تھی۔

"اسے دیکھ کر نہیں لگتا کوئی ماں اس کے لئے جھڑک سکتا ہے۔ مگر عارف پورا کا پورا اس کے نام پہ دل دے کر ہٹ کے لگتا ہے اس کی آنکھیں ایسی ہیں کہ کوئی ان پہ غزل لکھے گا۔ عارف نے چپکے سے

ان آنکھوں کے کام اپنی ماری مرکوزی ہے وہ ایسی نہیں ہے کہ کسی کی آنکھ میں خواب بن کر چمکنے لگے۔ عارف کے لئے وہ خواب کا سب سے قیمتی گھر ہے، وہ اس گھر میں رہتا ہے، جیتا ہے اور اس نے گھر سے مجھے باہر نکال دیا ہے۔ شہری! تمہیں معلوم ہے رسائی کیسی ہے؟

شہریار نے سر جھکا لیا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ کیونکہ وہ بھی کسی خواب کے گھر میں رہتا تھا سانس لیتا تھا۔ اسے دیکھ بھی سکتا تھا اور اس کی بے رخی سے چپکے چپکے مرجاتا تھا۔

"تم میرے لئے کچھ کر سکتے ہو شہریار؟"

شہریار عبدالرحمٰن نے نوشے کی طرف دیکھا اور بے بسی سے ہنسا۔ "محبت لعنت ہے، با مروت لعنتی جو خود مر جائے، بجی گھڑی ہوتی ہے۔ آپ اس سے دامن بچا نہیں سکتے۔ وہ چپکے سے کہتی ہے، تم آزاد ہو سب کچھ کر سکتے ہو مگر قدم اٹھانے کی ہوک بھر دو۔" نکرا کر الٹ [illegible] کیا واقعی تم مجھے چھوڑ کر جا سکتے ہو؟ جو دل صرف محبت کرنا جانتے ہوں وہ محبت سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ محبت مسافت ہے اور لوگ اس میں کبھی منزل کی تمنا میں قتل مرتے ہیں۔ محبت خاک ہے، مگر لوگ [illegible] اس میں مبتلا ہو کر اپنے وجود بنا لیتے ہیں۔" عارف کا رابطہ وقت کہاں گزرتا ہے؟"

"وہ اکثر ہوٹل مینجمنٹ میں مصروف رہتے ہیں اور اکثر شام کے کلب چلے جاتے ہیں۔ کبھی برج کا شوق تھا انہیں، لیکن اب اکثر وقت وہ کافی اور اسموکنگ میں وقت گزارتے ہیں۔ بہت رات کو گھر لوٹتے ہیں۔ بہت تھکے سے ہوتے ہیں، اکثر چپ رہتے ہیں۔ میں بات کرنے کی کوشش کروں تو وہ کہتے ہیں کہ میری آواز سنانے میں گم ہو جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کوئی مجھ سے بات کرے صرف شانی کی بات کرے ورنہ خاموشی بہترین رفیق ہے جان کی۔"

شہریار نے ہولے سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے نو بج رہے تھے۔

"آپ جانا نہیں میں کھانا لگوا رہی ہوں۔"

"پلیز نوشے تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تکلف کی کیا بات ہے شہری! اپنوں کے گھر کھانا کھانا کوئی عیب نہیں۔"

"تمہاری توجہ کھانا ہی کتنی ہے بس؟" وہ مسکرا دیا تھا۔ نوشے نے ایک نہیں پھر کھانے کے بعد کافی پی کر اٹھتے اٹھتے بھی ایک بج گیا تھا۔ آج نوشے سے اس نے ڈھیر باتیں کی تھیں۔ وہ من کے شہر دفنی

انہوں نے اس کے متعلق بھی تفصیل سے بات کی تھی۔ پھر سلام دعا کے بعد اٹھا تو گھر کے لیے ہی نکلا تھا مگر گھر کے راستے میں جازی کی گاڑی پر نظر پڑی تو وہ حیران رہ گیا۔ رسٹ واچ پر نظر ڈالی تو ڈیڑھ بج رہا تھا۔ جازی عبدالرحمن انکل کی طرف رات گئے تک بیٹھے نہیں رہتا تھا۔ پھر اس نے گاڑی جازی کی گاڑی کے تعاقب میں لگا دی۔ پھر وہ جان سکا گاڑی جازی نہیں چلا رہا تھا اس نے کار اوورٹیک کی اور جازی کی گاڑی سامنے ترچھی کھڑی کر دی۔ تیز رفتاری سے چلتی گاڑی نے بہت زور سے جمپ لی تھی۔

"یہ کیا حرکت ہے مسٹر......؟" ایک لڑکا دہاڑا۔

دوسرے نے نرم لہجے میں کہا۔ "یہ جازی کے بھائی ہیں اصغر!"

پہلے لڑکے کا لہجہ بدل گیا۔ "سر! وہ ہم ایک پارٹی سے آ رہے تھے۔"

شہریار قہر لیے ان کی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ جازی کی آنکھیں بند تھیں۔

شہریار نے آگے بڑھ کر اس کا شانہ ہلایا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا لڑکا بولنے لگا۔

"یار وہ ڈرنک کی وجہ سے غنودگی میں ہے سر!...... ویسے سب ٹھیک ہے۔"

"کیا بکواس ہے یہ؟" شہریار نے تیزی سے دروازہ کھولا تھا۔

"جازی!...... جازی!" بہت بے قراری سے جھنجھوڑا تھا انہیں۔ کبھی نہیں پھر کہ اس کے اعصاب اعتدال پر آتے چلے گئے تھے جازی کو کھینچ کر اس نے اپنی گاڑی میں بٹھایا۔ سیٹ بیلٹ باندھ دیا تھا۔ [illegible] تھا۔

"تم لوگ گھر کیسے جاؤ گے؟"

"ہمارے دوست ابھی تھوڑی دیر میں ہمیں پک کرنے والے ہیں سر!"

اس نے سر ہلایا۔ وہ دونوں لڑکے قدم موڑ گئے اور شہریار واچ مین کو فون کر کے جازی کی گاڑی کے متعلق حکم دے رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر واچ مین کے ہاتھ میں کار کی چابی دے کر......

AANCHAL.COM.PK

گھر کے لئے گاڑی آگے بڑھا دی گئی تھا۔ مین گیٹ کے بجائے اس نے آؤٹ ہاؤس کے دروازے سے جازی کو بیٹھنے والے کمرے میں پہنچانے کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔ سہیل بھائی کی چہیتی بہن اب لائبہ کے ساتھ زوم شیئر کر رہی تھی۔ اس لئے اس کی طرف سے اطمینان تھا کہ وہ کوئی سوال نہیں پوچھے گی۔ جازی کو لٹانے سے پہلے وہ اس کے جوتے، کوٹ اور ٹائی اتارنا نہیں بھولا تھا۔ حالانکہ تب تک وہ کافی تھک گیا تھا۔ مگر بستر پر لیٹا تو یہ سوال بھی بھول گیا تھا کہ وہ تھک گیا ہے۔ نیند جانے کب آئی تھی۔

❀❀❀

شافعہ پورے ایک ماہ بعد آج ڈیوٹی پر آئی تھی۔ زرش نے عارضی طور پر پچھلی ملازمہ کو پورے مہینے کی تنخواہ دے کر برخاست کر دیا تھا اور اب بھی اسے دیکھ کر نہال ہو گئی تھی۔

"تم آ گئیں...... تم نے تو میری جان نکال دی تھی۔" زرش حالانکہ روز اس کی راہ تکتی رہی تھی۔ "تمہاری بیماری کا سن کر مجھے تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ تمہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ صرف مجبوری سے تم واقف ہو ناں؟"

شافعہ نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ پھر وہ اس کے کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔ جب اچانک سائیڈ ٹیبل پر رکھی تصویر کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ تب ہی زرش کمرے میں آئی تھی کہ شافعہ تصویر دیکھ کر حیران کھڑی رہ گئی۔

"یہ...... یہ مسٹر شہریار آپ کے ساتھ؟"

شافعہ کی گردن نے پانی کی طرح سے... زرش نے بہت خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ "ہاں، یہ میں اور شہریار ہیں۔ ہم کسی زمانے میں بہت اچھے دوست تھے۔ شاید وہ مجھے کبھی اپنی زندگی میں کوئی مقام نہ دے پائے مگر میرے لئے وہ زندگی میں زندہ رہنے کا سبب ہے۔ خوب صورت احساس ہے۔"

شافعہ کی آنکھوں میں ایک نامحسوس احساس اُبھرا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر شہریار کی شخصیت کے متعلق جو نئے انکشافات ہوئے تھے اس سے پہلے کہ اب کچھ پوچھ پاتی، شافعہ نے بہت اچانک سوال کیا۔

"میم! آپ کا دل چاہتا ہے، آپ علی صاحب سے پھر کبھی ملیں؟"

زرش کی آنکھوں میں حسرت نے آنکھ کھولی۔ وہ شافعہ کو سمجھتے ہوئے بھی مسکرانے سے ایک سسکی اُبھری۔ "کاش ایسا ہو سکتا۔ کاش ایسا ہو سکتا۔ شافی! میرا بھی دل چاہتا ہے، میں زندگی کی شام میں کبھی تو ایک بار دیکھ پاؤں۔ وہ کیسے مجھ سے ایک لفظ نہ کہا ہے۔ چاہتی ہوں دنیا کے سارے خزانے ایک ہاتھ میں پہیلی کی طرح لا دے۔ مگر وہ ایک بار پھر سے مجھے کبھی دکھائی دے۔ قریب نہ ہو تو بھی دور

AANCHAL.COM

ہماری مشکلیں آسانی میں جیسے موت کی دل کو یوں لگتا ہے...... دل کو لگتا ہے؟ پریشانی ہیں۔ کیوں ایسی باتیں امکانات سی دل میں پہلے سے مرنے! ثانی اور یہ نہیں۔ ممکن نہیں۔ سے ہی دیکھی ہوں گی۔
ایک سبک بدن کے پانی کی طرح بہہ جائیں گی مگر زندگی کا لطف اور خود زندگی ڈوب مرتی ہے مگر دل کی حسرتیں...... وہ دل کے اندر ہی کہیں چھپائی ہوئی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں ہجر کے والا دل بند ہو
گیا۔ حسرتیں محبت کی چادر تجویز کر دیکھنے کی آپ سب مرگئی مگر کوئی بند دل میں جا کر جھانکے سے کان لگائے تو جان لے کہ مرنے کے بعد بھی دل مردہ دار سے شکر کی کمی کی طرح اٹکی تک ہجر تجزوار با
ہے ساتھ محبوب کے گرد گھیرے ہوئے دل گرگرا رہا ہے۔ مگر یہ کوئی نہیں جان سکتا۔ کیونکہ یہ دل کی اسرار تھری چپ کا کام ہے۔"
ثانیہ نے عنبر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دل میں عہد کیا اور خوشی کو اس کے لیے ایک بار ضرور اسے کمائے گی۔ وہ اب اس کے لیے کچھ سے نکال رہی تھی۔ ثانیہ اس کو پیار سے دیکھ رہی تھی پھر نرمی سے بولی۔
"وہ جو ایک دیکھتا ہے تم نے مان لیا کہ گھر کا بار بنا لیا؟"
ثانیہ نے مسکرا کر اسے دیکھا پھر مسکرا کر بولی۔
"ہمیں جب کوئی دکھ ہوتا ہے ہم اسے ہم کہتے ہیں وجود کو نہیں ملا ہے وہ دنیا کا سب سے بڑا آزار ہے۔ اس رب کو ہم سے محبت نہیں ہے جبھی دل میں رکھ کر دل کو تکلیف سے اٹھا کہا۔ فکر کچھ عرصے بعد
جب اس کے بدلے کوئی اور خوشی ہماری زندگی کا راستہ مڑتی ہے تو ہمیں اپنے رب کی مہربانی پر پیار آجاتا ہے۔"
"ہاں ہاں.....ٹھیک کہتی ہو؟" عنبر کی آنکھیں چمکنے لگیں اور ثانیہ نے ہنس کر کہا۔
"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ ہم! میری زندگی نے محبت کو بہتر سے چھپا ہے۔ بس اس کے اظہار کے لیے سوچ رہا ہوں وہ نہیں کہ کیا ان کی ہی جھول میں ہے، وہ سمجھ جاتے ہیں بہت اچھی طرح سے۔"
"کب ملوا رہی ہو اس سے؟" ثانیہ نے اس کے ہاتھوں کو محبت سے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا اور وہ مسکرانے لگی۔
"بہت جلد میں آپ کو بہت جلد ملواؤں گی ان سے۔"

❀❀❀

آج وہ یونہی عارف کو فون کرنا چاہ رہا تھا۔ اس وقت اس کی گھڑی دو بجا رہی تھی۔ فجر سے پہلے وقت تھی۔ اور بھائی نے کسی اور پر ڈال کر اسے بہت اچھے سے ڈانٹ دیا تھا مگر اب وہ کوشش کرتا تھا

شہریار خاموشی سے سنتا رہا۔

پھر وہ آگے بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ تینوں مانند وہ اس سے کچھ دور تھا۔

"زندگی رک جانے کا نام نہیں۔ بے وفائی تم نے نہیں کی، بے وفائی اس نے نہیں کی تو بس سمجھو تم اس کے لیے بنے ہی نہیں تھے۔ محبت اپنے لیے جگہ خود بناتی ہے، دل خود منتخب کرتی ہے۔ اور پھر جتنا اہل سمجھتی ہے، اتنی محبت، اتنا جذبے کا اثر دے دیتی ہے۔ اس اجر کو آگے پھیلاؤ، پتھر اور انسان میں کچھ تو فرق رکھو۔ رکنا پتھر ہو جانے سے تعبیر کر لو۔" "تم جس عمر میں ہو، تمہیں معلوم ہوگا، ماضی ہمیشہ ٹھس ہو جاتا ہے۔ وہ کمزور لوگ کبھی کبھی بہت مضبوط گھر بنا لیتے ہیں لیکن وہ اپنی کمزوریوں سے خود ہی گم ہوتے ہیں۔ ان کے اندر بدل دینے اور بدل جانے کی ہمت نہیں۔ ہمیشہ نئے راستوں پہ چلنے پڑا کسانی رکھتی ہے اور نئے راستے ہمیشہ نئی منزلیں کھوجتے ہیں۔ ایسی منزلیں جو دوسروں کے لیے بھی آگہی کا باعث ہوتی ہیں۔ جبران کہتا ہے "محبت صنوبر کی شاخ کی مانند ہوتی ہے۔ درخت سے ایک شاخ الگ کر دی جائے تو درخت کچھ عرصے کے لیے ملول اور دکھی ہوتا ہے۔ مگر نئی بہار کے ساتھ اسی جگہ ایک نئی کونپل پھوٹتی ہے اور ایک دن درخت کو چھتنار کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ مل کر سایہ بن جاتی ہے۔ جو شاخ ٹوٹی، وہ شاخ نہیں ہوتی مگر درخت اس کی یاد کے ساتھ ساتھ اس کے عہد وفا میں ایسا جکڑ جاتا ہے کہ پھر پرانی محبت کی کسک بہت دھیمی رہ جاتی ہے، بہت ہی دھیمی۔ عارف! محبت ایک ہری لہر کی طرح ہے، جس کا رابطہ دل اور روح سے مرتے دم تک ختم نہیں ہوتا۔ ہم بس گھٹتے گھٹتے جیتے ہمارے اندر زندگی کا، محبت کا کوئی خواب مر گیا ہے تو دل بھی مر گیا ہے لیکن دل ہر نئے خواب، ہر خوشی کی شتاب پہ یکبارگی ایک لمحے کے لیے سانس بھر کر ابھرتا ہے۔ کبھی ہم یہ آواز دور کر دیتے ہیں، کبھی نئی کہانی ہیں ایسی سمت نہیں چلنا چاہتے اور محبت..... محبت اپنی سمت خود طے کرتی ہے، منزل خود تجویز کرتی ہے۔ تمہیں بھی اپنا آپ محبت کے ہاتھ میں چکنی مٹی کی طرح دے دینا چاہیے۔ وہ جیسے چاہے تمہارے نقش اُجاگر کرے، بنائے، بگاڑے۔ جو کچھ بھی ہو، پھر بھی خود محبت کرتے رہنے کا ہنر کم تر نہیں۔ اپنے اندر جھانکو، انوشے کی آنکھوں میں جھانکو، کیا وہاں تمہیں تم سے محبت کم دکھائی دیتی ہے؟ کیا وہ لڑکی محبت دیے جانے کے قابل نہیں؟"

عارف نے دیکھا رہا، پھر اس کے لب ہلے۔

"مجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے، کیوں عمر گنوا دی ہم نے

ثریا بے چارگی سے ہنسا۔ "میں جانتا ہوں، وہ آنکھیں ایسی ہیں کہ کسی کا بھی دل فدا کر سکتی ہیں مگر ان آنکھوں کے آگے ان آنکھوں کو بھی روکو، چھوڑو وہ جن کے لئے تمہارے آگے کچھ ہے، تمہارے بعد کچھ ہے۔ محبت کیا دل کے لئے مزاحمت کرو عارف! یوں بھی بہت کم لوگ برداشت کر پاتے ہیں اور جو اس جذبے کو نبھانے کی تمنا رکھتے ہیں وہ انہیں سناؤ اچھی بات نہیں۔ جو دل خود دکھی ہو وہ دوسروں کے دکھ کو بہتر سمجھ سکتے ہیں بلکہ زیادہ بہتر دل رکھنا چاہتے ہیں۔"

عارف نے اس کے چہرے کی طرف نظر کی، پھر آہستگی سے سر ہلایا۔ "تم شاید ٹھیک کہتے ہو۔ محبت کتنی آب جو کی طرح ہے۔ بہکتے آپ کو بہا لے جاتی ہے مگر اس آب جو سے پیاسے دلوں کو سیراب کرنے کا ہنر بھی سیکھنا چاہئے۔"

عارف نے سگریٹ کیس اٹھایا، کار کی چابی لی اور شہریار کی طرف دیکھ کر بولا۔

"جس طرح تم نے اپنے دوست کی محبت سے میرا تعارف کروایا... ثریا! کیا یہ سچ ہے کہ تمہارے دل نے اس مدت کو بچا کر رکھا ہے؟"

شہریار مسکرانے لگا۔ یکدم اس کی جوانی میں مانوس چہرہ دمکا۔ اسے لگا وہ اس کے ہونٹوں نے عارف کا لہجہ بولا۔

"مجھ پہ اٹھی ہیں وہ بھولی سادہ آنکھیں

تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر بھی ہم نے"

عارف نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک انوکھی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ روم سے نکلتا چلا گیا۔

خالی میز پر بھاپ اڑاتا کافی کا کپ دھرا تھا۔ ثریا عبدالرحمن بیٹھا تھا۔ بالکل اکیلا تنہا اور سادہ آنکھیں جو محبت کا رنگ اوڑھ لیتی ہیں تو پھر نبھانے کا احساس بھی کہیں مدھم پڑ جاتا ہے۔ شہریار نے اس پہ کیا تھا اور دل سے باہر نکلتا چلا گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

ہاتھ سے اخبار اٹھایا تھا اور اندرونی صفحات پر ہی ایک خبر پر ہی اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ "بی بی" نام پڑھ کر اس کا دل گویا رک گیا تھا۔ اس نے سوچے سمجھے بغیر اپنا ادھورا چائے کا کپ وہیں رکھ دیا اور دروازہ بند

کسی ہوئی اور نکلی ناک تھی۔ پھر وہ بہت متوازن قدم رکھتی ہوئی "ڈیلی ٹائمز" کے آفس کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

"ایکسکیوزمی میم! آپ کو کس سے ملنا ہے؟" یکدم آواز نے اس کے قدم روک لئے۔

"مجھے چیف ایڈیٹر مسٹر احمد اسرار خان سے ملنا ہے سر!" شائستہ لہجہ۔

سامنے والا استفہامیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"میم! ویسے تو سر عام طور پر کسی سے ملتے نہیں ہیں لیکن آپ جیسی خوبصورت لیڈی کے لئے انہیں وقت نکالنے میں کیا وقت لگے گا۔ دراصل اس وقت وہ میٹنگ میں ہیں آپ پلیز ویٹنگ روم میں ان کا انتظار کیجئے۔"

وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ پھر آدھے گھنٹے بعد کہیں وہ احمد اسرار خان کے سامنے پیش ہوئی تھی۔ سالوں بعد اسے اپنے سامنے دیکھ کر دل ایک بار پھر بہت تیزی سے دھڑکا تھا۔ دل نے ہمک بھری تھی، بھاگ کر اس کی بانہوں میں سمانے کی۔ پر وہ کیسے بغیر اس کے سینے سے لگ جاتے اپنی شناخت۔ وہ وقت معافی مانگنے کا ہے کب؟ وہ خالق جیسا ظرف رکھتا ہے کہ اس کی غلطی کو بھلا دے، معاف کر سکتا ہے۔ اس سے پوچھے کہ زندگی میں کسی خوشی کے لئے ترسے میں بھول جائے۔ کبھی اپنی بیٹی سے اس کی بات ہوئی کبھی اس کی یاد سے اس کی آنکھیں بھیگیں کہ اس کی آنکھیں ان سب کے لئے ترستی رہی تھیں۔

"جی فرمائیے میم! میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟" وہی کھنک دار لہجہ..... اس کی فرحت زادی کے بھائی کی آواز پر چونک گئی تھی۔

"آپ نے آج کے "ڈیلی ٹائمز" کا فرنٹ پیج پڑھا ہے؟"

احمد اسرار خان کچھ یکدم سنجیدگی سے بولا۔ "کیا آپ میرے ساتھ کوئی جوک کرنے آئی ہیں میم؟"

"جس کے ساتھ زندگی نے جوک کیا ہو کیا وہ ایسی ہمت کر سکتی ہے؟"

"اوہ..... سوری میم! اگر آپ کو میری بات بری لگی ہو۔ لیکن آپ خود دیکھئے اس میں چیف ایڈیٹر ہوں میری مرضی کے بغیر کوئی خبر اخبار کی زینت نہیں بن سکتی، پھر آپ کا سوال..... سو مجھے تھوڑی حیرانی ہوئی۔ ویسے آپ کا اشارہ کس خبر کی طرف تھا؟"

سامرہ سلمان نے اخبار سامنے رکھا اور دو مختلف خبروں کی طرف اشارہ کیا۔ یہ خبریں شہریار کے متعلق تھیں، جن میں سے ایک خبر اس کے فلیٹ کی رنگینی سے متعلق تھی اور دوسری خبر بچی کے متعلق تھی کہ آخر شہریار کا اس بچی سے کیا تعلق ہے؟ کیا واقعی وہ مسٹر عبدالرحمن بخاری کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے جس کی وجہ سے ان کا پورا خاندان ہر وقت اپ سیٹ ڈاؤن کا شکار رہتا ہے؟

"آپ مسٹر شہریار کو کتنا جانتے ہیں سر؟"

سامرہ سلمان نے چونک کر دیکھا۔ "میرے خیال میں میرے لیے مسٹر شہریار ایک خبری شخصیت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے مس! لیکن آپ؟"

"کیا واقعی آپ مسٹر شہریار کو اتنا ہی جانتے ہیں؟ کیا یونیورسٹی، کالج کی ساری یادیں آپ کے دل سے محو ہو گئیں؟ کیا آپ یہ بھی بھول گئے کہ ایک وقت تھا آپ خود ان کے کردار کی سو سو قسمیں کھایا کرتے تھے، کوئی ان کے خلاف کچھ کہتا تھا تو آپ اس سے لڑ جاتے تھے۔ آپ کہتے تھے اگر شہریار جیسا شخص بھی برا ہو سکتا ہے تو دنیا میں کوئی انسان اچھا نہیں ہے۔"

سامرہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ "آپ...... آپ کون ہیں مس؟" اس نے جانے کیسے آرٹیکل کو ہاتھ لگایا تھا۔

اور اس نے گہرا سانس لے کر کہا تھا۔ "میں وہی ہوں، جس کی عزت کے لیے شہریار بھائی نے آپ سے کہیں زیادہ خاک چھانی تھی۔ میں وہ ہوں، جسے بازیاب کروانے کے شہر میں آپ نے اس عظیم شخص کی چھپی نہیں چھپنے دی بلکہ اس کے کردار کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں کہ اب وہ پسند ناپسند میں اتنا ترقی یافتہ ہو گیا ہے کہ دوسروں کی پسند چھپانے کے لیے لڑکیاں تک اغوا کر لیتا ہے۔ آپ نے اس معاملے میں زوار حسین کا ساتھ دیا اور اسے چھوڑ دیا جسے آپ بچپن سے جانتے تھے، جس پر آنکھ بند کر کے یقین کرتے تھے۔ میں وہ ہوں جسے شہریار بھائی نے ظلم سے نجات دے کر اپنے فلیٹ میں عزت سے رہنے کی ضمانت بخشی۔ مگر آپ نے ان کے اخلاق کی اس شائستگی کو بھی چند روپوں کے لیے کیچڑ میں لت پت کر دیا۔ کیونکہ سب سے بڑے گناہ کی طرح شہرت پانے کیا ضروری ہے وہ اچھے والا بھی اس میں ملوث ہو کا شکار ہو؟ آپ جاننا چاہتے ہیں نا، وہ بچی کون ہے؟ وہ فلیٹ کی رنگینیوں کی کیا کہانی ہے تو سنیے، دیکھیے آپ اپنے قلم سے اپنی بہن کی بچی کی عزت کو ملیا میٹ کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھیں، شاید آپ کی پہچان کا سفر ابھی رکا نہیں ہو۔"

اس نے حجاب اتار دیا اور سامرہ سلمان اسے بت کی طرح ایسے دیکھنے لگا، جیسے اس سچ نے اس کی جان بند کر لی تھی۔ اس سے ایک لفظ نہیں بولا جا رہا تھا اور وہ جو کہتا تھا ایسی لڑکیوں کو جو اپنی ادنیٰ سی خواہش کے لیے گھر چھوڑ دیتی ہیں انہیں گولی سے اڑا دینا چاہیے بلکہ شاید انہیں کوئی بھی مارنے کی ضرورت نہیں، ان کے لیے تو ایک مرد چہرہ بے نیاز نظری کافی ہے۔ محبت کرنے والوں کے لیے اس

سے دنیا نہ مزا اور کہانی ختم ہو چکی۔ وہ آج سامنے کھڑی تھی مگر وہ بے نیاز نہیں رہ پا رہا تھا۔

گندم اس کی کوروں میں ڈھیر سارا پانی جمع ہو گیا تھا اور وہ پھر سے سسک پڑی تھی۔ "آپ کو پتہ ہے، میں سات سال سے زوار حسن کی حویلی میں قید تھی..... ایک قیدی۔ آپ جانتے ہیں ناں اس کا مطلب؟"

ماما رماہ ان کی گردن جھک گئی تھی اور وہ پھر سے روتے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔ "حسن بھائی آپ نے اسی زوار حسن کو دعوت دی، اپنا حق ثابت کرنے کے لئے شہریار پاپا کا مان لگائے۔ یہ دیکھئے میرے آپ کے اور زرمینہ کے گھر اور طبیعت کے کاغذات۔ یہ لوگ جن کے لئے چیزیں اپنے نام لکھوا گئے تھے۔ کیونکہ بچہ ہو جانے کے لئے شہریار بھائی نے اپنے وہ طبیعت پاپا نے مل رکھا ہے تھے۔ آپ بھی بچی تھے ہیں، شہریار بہنوئی سے ہیں جان ہو گئے تو مرا میں شامل ہیں۔ جنہیں صرف اپنی دولت پیاری ہے کے علاوہ کچھ نہیں اور جن کے پاس اپنی شخصیت کا کلس یا فخر صرف دولت ہے اور کچھ نہیں۔"

ماما رماہ ان اسے خاموشی سے دیکھ رہا پھر جیسے کوئی سخت جان کے رشتے سے کوئی نیا احساس رنگ بنا۔ بیٹا ہے اس کے اندر سے بھی اسی طرح سے کوئی بند باندھا تھا۔

"تا نسیہ.....!" اکلی خوشبو نے اس کی زبان نے نام پکارا تھا اور بہت عرصے بعد اس کی باتیں واضح تھیں اور اس نے وہ کفران نعمت کیوں کی؟

"میرے بھیا.....!" وہ اس کے سینے سے لگ کر زمین و آسمان ایک کر کے رو رہی تھی۔ شماس کی آنکھیں بھی چھلک رہی تھیں۔

"آئی ایم سوری بھیا! میں آپ کی دوست شہریار نہیں مگر میں اچھی بہن نہیں بن سکی۔"

اس نے اس کے آنسو شفقت سے صاف کئے تھے، پھر بھرائے لہجے میں بولا تھا۔ "اگر تمہاری غلطی تھی تو بی اللہ معاف کرے، میں بھی تمہارا مجرم ہوں کہ میں نے کون سی اچھے بھائی ہونے کی ذمہ داری نبھائی؟ صرف شہریار تھا جو ہمیشہ کی طرح ہم سب سے آگے نکل گیا۔ مگر خیر اب غم سے جدا ہے۔ وہ ہماری ذات سے شیری کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔" اس نے اسے چوم کر اٹھایا تھا اپنی ماری جھنجھلا کر مسکرا رہی تھیں، بچہ نہ سے کے ساتھ باہر نکلا تھا۔

"ہم گھر جا رہے ہیں، تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

"مگر کیا مجھے پر کوئی اعتراض ہو تو میری خوش نصیبی ہوگی۔ دیکھئے بھیا ان سات سالوں میں میرے اندر کی ضد، غصہ، نفرت سب اپنی موت آپ مر گئی ہے۔ وہ ثانیہ مر چکی ہے بھیا!"

"مگر مجھے یہ اپنی بات بڑی عزیز ہے۔" اس نے اس کے سامنے چلتے چلتے ٹھہرے لہجے میں کہا اور اس نے حیرت سے اسے دیکھا تو کہا۔
"اتنی جلدی مان گئے بابا، جو ملازمت چھوڑ دی؟ مجھے لگتا تھا آپ مجھے کبھی دیکھنا بھی نہیں چاہیں گے اور نظر بھی نہیں ڈالیں گے۔"
ملک ارسلان نے ان کے لیے اپنی گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولا، پھر اگنیشن میں چابی گھما کر بیک کرتے ہوئے گہرا سانس لے کر بولا۔ "مجھے بھی یہی لگتا ہے، ایک وقت تک مجھے تمہارے نام سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ میں نے گھر سے تمہاری ہر چیز اسٹور روم میں بند کروا دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ زندگی میں کبھی مجھے ملیں تو میں تمہیں دھتکار دوں گا، تمہیں نظر انداز کر کے گزر جاؤں گا۔ لیکن آج اتنے سال بعد تم میرے سامنے آ کر کھڑی ہوئیں تو مجھے لگا میں ملک ارسلان نہیں رہا بلکہ ایک جذباتی باپ ہوں، شاید اپنی ہی شکست سے رنجیدہ تھا۔ مجھے اس لمحے لگا تھا اچانک میرے اندر کا باپ جاگ اٹھا تھا۔ مجھے لگا تھا اگر میری جگہ بابا ہوتے تو وہ کیا کرتے؟ میرے سامنے تم ہو، میری خود کی بیٹی کھڑی ہوتی تو کیا میں پھر بھی اتنی سفاکی اور سختی سے اسے جھٹک سکتا تھا؟ میرے دل نے کہا میں اگر باپ ہوں تو شاید اتنا ظالم نہیں ہوتا کہ مجھے میری بیٹی کی آنکھوں میں آئے آنسو برداشت نہیں ہوتے۔ بس اسی وقت میں نے تمہیں باپ کی نظر سے دیکھا اور تمہیں محبت سے گلے لگائے بنا نہیں رہ سکا۔"
"بابا! آپ...... آپ بہت عظیم انسان ہیں۔"
ملک ارسلان مسکرا دیا تھا۔ گاڑی تیز رفتاری سے پکی سڑک پر دوڑ رہی تھی اور راستہ بہت واضح دکھائی دے رہا تھا، سالوں کی گرد جو منزل پر جمی ہوئی تھی منزل کا احساس تک مٹا چکی تھی، ایک بار پھر سے نمایاں ہو گئی تھی۔

❀❀❀

"آخر یہ سب کیا کیا جا رہا ہے؟" ٹوئٹی صاحب نے اخبار زور سے پٹخا تھا۔ انہوں نے جو ایک ہفتہ مسز حسن اور اہم کے لیے نئے سرے سے ساکھ بنائی تھی اس نے چند دنوں میں وہ ساکھ ہلا کے رکھ دی تھی۔ مسز حسن اور اہم ان کے آفس میں بیٹھے تھے۔
"تمہارا اخبار اور تم تو کمال ہو۔ دیکھو یہ سب کس کی حرکت ہے؟ تمہیں بہت اچھے سے جانتا ہے وہ، تمہارے ایک ایک قدم، ایک ایک فیصلے کا پہلے سے علم ہے۔ کوئی اندر کا آدمی ہے یا کوئی تمہارے اندر کا آدمی ہے، جو تمہیں نقصان پہنچا رہا ہے۔ تمہیں پتا ہے کون ہے جس نے تم سے اتنے قریب آنے دیا؟"

AANCHAL.COM.PK

یوسفی صاحب نے مسٹر حسن اور ابراہیم کو بغور پر سوچ نظروں سے دیکھا پھر انہوں نے اسسٹنٹ سے علامہ کے متعلق پوچھا۔

"سر! وہ ابھی ابھی دفتر سے نکلے ہیں۔ کوئی خاتون آئی تھیں۔ پتہ نہیں ہم میں سے کسی نے بھی ان کی صورت نہیں دیکھی وہ تو آپ ہی تھیں..... نہیں سر! وہ وہاں نہیں گئے، بلکہ آج کی ساری میٹنگز بھی کینسل کروا دی ہیں۔"

انہوں نے ریسیور رکھ دیا پھر مسٹر حسن اور ابراہیم کی طرف دیکھ کر بولے۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں کوئی دشمنی میں ہمیں ڈاج کر رہا ہے، جس میں بہت جلد ان مڈل مین کے قریب جا پہنچوں گا، جو اس اسمگلنگ کا اصل ہاتھ بنا ہوا ہے۔"

"اصل ہاتھ تو..... تم اب بھی غلط سوچ رہے ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں کوئی تمہیں ٹھیک اسی طرح دشمنی سے بے وقوف بنا رہا ہے۔"

مسٹر یوسفی نے پُر خیال انداز میں دیکھا پھر آہستگی سے بولے۔ "میں بہت جلد بات کی تہہ تک پہنچ جاؤں گا، آپ بے فکر رہیں۔"

مسٹر حسن اور ابراہیم جانے پر رکھا گئے تھے اور مسٹر یوسفی نے علامہ اور سلمان پر کڑی نظر رکھنے کا حکم جاری کیا تھا۔ انہوں نے جانفشانی محنت سے مقام بنایا تھا وہ اتنی آسانی سے اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے اور اس کے لئے وہ کسی حد تک بھی جا سکتے تھے۔

❁❁❁

شہریار نے مامون کے سامنے بیٹھے بیٹھے دوسرا سگریٹ ختم کیا تھا کہ مامون عبدالکریم نے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اپنے قبضے میں لے لیا تھا پھر سنجیدگی سے کہا تھا۔

"اگر اس عادت کو نہیں چھوڑا تو اس سگریٹ کے پیکٹ کی طرح تمہیں بھی ضبط کر لوں گا۔"

وہ پھیکی سی ہنسی ہنسنے لگا پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "وہ ایک کام کیا تھا تجھے رپورٹ ہونے کی اجازت چیک کرنے کے لئے..... "تھوڑی دیر رک کر پھر بولا۔ "تجھے معلوم ہے ماں وہ میری کیا لگتی ہے؟"

"جانتا ہوں۔" مامون عبدالکریم نے سنجیدگی سے کہا۔

شہریار تڑپ کر بولا۔ "تو جانتا ہے، تو یہ بھی جانتا ہوگا کہ میں ان کے لئے زندگی بھر یاں۔ دیکھنا چاہتا ہوں..... میں دیکھنا چاہتا ہوں بدرفیق انسان آخر ہے کون؟ کیا صورت کے قابل ہے بھی اپنی صورت کی مالک

بحری کوئی غلطی ہے؟"

ہارون عبدالکریم نے اس کی طرف دیکھا پھر اس نے ایک ان صفحوں کی لسٹ سامنے رکھ دی۔ "یہ سب رفیق احمد ہیں جن کا بائیو ڈیٹا میں نے اپنی سورس سے حاصل کیا ہے۔ وہ افراد ہیں جن کی عمریں پچیس سے پینتیس سال تک کے درمیان ہیں۔ باقی رفیق احمد نامی افراد چالیس سے ساٹھ کے درمیان تھے، جنہیں میں نے لسٹ آؤٹ کر دیا۔"

شہریار نے پھر اپنے سامنے رکھے کمپیوٹر سے رفیق احمد نامی ہر شخص کی تصویر سمیت اس کے سامنے ڈیٹا موجود تھا۔

مگر یہ تیسرے دن کی بات تھی، وہ ہارون کے دفتر میں بیٹھا تھا۔

"ان میں سے کوئی رفیق احمد مومنہ کا شوہر نہیں ہے۔" ایک جملہ کہہ کر وہ پھر گہری خاموشی میں ڈوب گیا، تب ہارون نے ایک نیا راستہ دکھایا۔

"تم مومنہ کو میرے دفتر بلوا سکتے ہو، میرا کمپیوٹر ایکسپرٹ اب ناموں کی جگہ صرف تصویروں کے ذریعے اس سے پہچان کا مرحلہ طے کرے گا۔"

شہریار نے حیرت سے دیکھا، عجیب نظروں سے بولا۔ "بہت لمبا کام ہے ہارون! میں نے کیا تھا وہ کراچی کا بندہ ہی تھا، کتنی بار اسے آیا تھا، اور اگر کراچی کا بندہ ہے تب بھی ضروری نہیں پاکستان کے باہر سے یہاں کی آبادی۔ کئی دن لگ جائیں گے کئی دن...... اور یہاں وقت، ہارون تین کا کال پڑ گیا ہے۔" اس نے ایک جملہ کا بقیہ انتہائی آہستگی سے بولا۔ "تمہارے کمپیوٹر ایکسپرٹ کے علاوہ بھی نادرا کی اس سلسلے میں مدد کر سکتے ہیں۔ ہم کیوں نہ مومنہ کی پیش کی گئی تصویروں کو کمپیوٹر سے اسکین کر کے تصویر حاصل کرنے کی کوشش کریں، یہ زیادہ آسان حل ہے۔"

ہارون عبدالکریم نے اس کی طرف دیکھا، عجیب نظروں سے بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ تجربات کے لئے تمہیں مومنہ کو میرے دفتر لانا ہوگا۔ ہم اس کا کمپیوٹر پر خاکہ کھینچ کر لیتے ہیں۔"

"اوکے میں کل لاؤں گا اسے؟" وہ پھر سے چپ ہو گیا۔

ہارون عبدالکریم نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر پھر ہونٹ بھینچ کر بیٹھ گیا۔

شہریار نے سر اٹھا کر اسے دیکھا عجیب نظروں سے بولا۔ "جو تم کہنا چاہتے ہو وہ کام میں اماں کی شادی سے پہلے نہیں کرنا چاہتا۔ میری زندگی کی ایک ہی خوشی ہے یار!"

"ایک ہی بیٹی......وہ......وجہ ثانی ہے، کس کھاتے میں ڈالے گا؟؟"

"وہ......" اس نے ذرا کھسیا کیا، پھر ہنس کر بولا۔ "وہ میری محبت ہے یار۔ اور محبت کو وجہ کی ضرورت ہے نہ کسی دلیل کی حاجت۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں یہ میرا ویک پوائنٹ ہے۔ میں ساری عمر بھی اسی خاموشی سے اسے چاہ سکتا ہوں۔"

"کیا بکواس ہے، کیوں پچاس کی رہائی کا ہیرو بننے چلا ہے؟" مامون نے خفگی سے کہا اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے بات ختم کرنے کا اشارہ کیا پھر بولا۔

"رہائی زری کا کیا ہوا ہے؟"

"کیا ہونا تھا، ہم نے اسے اپنی کسٹڈی میں لے لیا ہے، بیان ریکارڈ کروایا گیا ہے مجسٹریٹ کے سامنے بند کرنے کی کارروائی ہوتی ہے۔ سطوت جہاں آنٹی بہت ڈسٹرب ہیں کہ مائی ڈیئر زری اچانک کہاں چلی گئی؟ کارروائی خفیہ طور پر کی گئی تھی۔ پھر امیر حمزہ نے بھی اس سلسلے میں کافی مددگار ثابت ہوا ہے۔ کئی راز ہیں جو وہ ہی بتا سکتے ہیں، وہ سب معلوم ہیں۔ تمہیں پتہ ہے، سطوت جہاں ان دنوں چاروں طرف سے مجبور ہو چکی ہے؟ اس کے کیس میں غداری کا مقدمہ درج کیا جانے والا ہے۔ اس کی دولت کہاں جائے گی۔ کیا اس کا بیان دینا مناسب ہو گا؟ جب حکومتی راز حاصل کرنے کے لئے ان لڑکیوں کا استعمال کیا کرتی تھی۔ اور پھر ساری رقم انہی کے بینک میں جمع کرنے میں مہارت کا ثبوت دیتی تھی۔ وہ ایک کیس سے نکلے تو دوسرے کیس میں داخل۔ جیل جانے سے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"لیکن جب بڑے بڑے معاملات آتے ہیں تو کارروائی راستے میں خود بخود رک جاتی ہے۔" اس نے نکتہ اٹھایا۔

مامون ہنس کر بولا۔ "تم اپنے بھولپن کو کیا سمجھتے ہو، ہم کون سے لوگ نہیں ہیں کیا؟ اماں بار بار عدیل اور دوسرے لوگوں میں یہ پہلے سے ہے کہ ہم بھی کسی کے خلاف کوئی بات ہو سکتا ہے اور کہاں جا کر کیس فائل بند کرنے کا حکم مل سکتا ہے لیکن میری جان تم ایک بات کا پتا ہے سطوت جہاں، امیر حمزہ وغیرہ تک محدود رکھا گیا ہے اس میں میری اور عدیل کی رائے بھی تھی کہ وہ ایک ہی طرح سے محفوظ ہے اور دوسرے جب ہم ان کا چہرہ پہچان سکیں گے کہ وہ اپنی خفیہ جگہ سے سامنے آ کر کوئی بھی رپورٹ لکھیں گے، اور تم جانتے ہو اس کی وجہ سامنے ہے۔ پھر مستقبل کے بعد عمر کے حصے سے پہلے رخ بدل سکتی ہے اس لئے اوپر سے نیچے تک تفصیل بھی ہوتی ہے۔ یہ امیر حمزہ جیسا انسان ہے جو ہر رخ سے ہی کام آتے ہیں، سب ہی اپنے خیال کے۔"

"تم بہت چھپے رستم ہو، شکل سے تو اتنے خبیث نہیں لگتے؟" وہ ہنسا اور ماموں عبدالکریم نے ہاتھ بڑھا کر ہاتھ لگا کر چہرے سے کہا۔

"تم اپنے بھائی کی قدر کرو، مجھے کب سے جو میری جان کا دشمن ہو رہے ہیں لے کر پیچھے بہت سے لوگوں کے حق میں نکلا ہوا ہوں۔ مجھے اپنی سیاست کی پلید ہونے پر روتے ہیں، جو میری ایمانداری سے چڑتے ہیں اور مجھ کو میری آبائی امارت سے کسی انقلابی شاعر کی طرح کا شکوہ ہے۔ رہے مرعدیل تو وہ ان ساری خصوصیات میں مجھ سے کئی گنا بازی لے گئے ہیں، ہماری جان ہتھیلی پر لیے گھومتے ہیں۔ میری جان ایمانداری کا خناس پالنا اتنا آسان نہیں۔"

"مگر ہر کام کو احتیاط سے کیا کرو۔ تم دونوں میرے لئے بہت ضروری ہو۔"

"یہی بات ہم دونوں تمہارے لئے کہتے ہیں مگر تم اسے کو تیار نہیں ہو۔"

"اوں ہوں، اب بتاؤ اس میں کیا رکھا ہے، میں کہاں ضروری تھا، کہاں پہنچا اور کہاں تک پہنچی تحقیقات میں جیا، یہ بتاؤ" "جا!" "کی کوئی خیر خبر؟ مجھ سے ملنے کو کہا تھا مگر ایسی منظر عام سے ہٹی ہے کہ میں تو ڈھونڈ ڈھونڈ ہارا......" وہ لمحہ بھر کو رکا پھر آہستگی سے بولا۔ "جو اطلاع میں اسے دینے والا تھا، تمہیں وہ خبر اس تک پہلے ہی تو نہیں پہنچ گئی؟"

"نہیں، یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ یہ خبر صرف مجسٹریٹ صاحب، میں، مرعدیل اور سائی زرقی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ مگر تجھے کیا پتا ہے تو عیش کر، اچھا ہے تیری زندگی ہمیشہ رنگ کا میدان بنانے والی کے ہاتھوں میں سکون ہے تو تجھے اس سکون کا شکر کرنا چاہیے۔" وہ کہا پھر شرارت سے آنکھیں چمکا کر بولا۔ "ایک منٹ...... ایک منٹ...... کہیں یہ چپاتی نظموں والی لو اسٹوری تو نہیں کہ منہ کرتے پیار ہو تو کر گیا، کر گیا...... کی......" شہریار نے اس کے لگتے پر سے چٹکی کاٹی اور وہ دہل ہو گیا۔ "کچھ تو میری عزت کا خیال کر، اس وقت میں فل یونیفارم میں ہوں، لوگ کیا سوچیں گے؟ ویسے سچ بتا، کیا کبھی جاناں نے تیرے دل کو شانی کی طرح سمجھا تھا؟ کبھی تو کوئی ایسا لمحہ آیا ہو گا، جب تو نے سوچا ہو گا، کوئی کیسے اس قدر پیارا ہو جاتا ہے تو اس مجسمے ہوئے حسن کے مجسمے کو سنوارا جا سکتا ہے۔ کبھی تو کوئی قرب کا ایسا لمحہ آیا ہو گا ناں......؟"

شہریار نے آنکھیں بند کر لیں، پھر اس نے آنکھیں کھولیں تو وہاں گہرا سکوت تھا۔

"دل اور دماغ میں جب اس بات کا پتہ کہ کیا واقعی مجھے کبھی اس سے محبت ہوئی تھی؟ لیکن ایسا سوچنے سے پہلے ایک بار میری شانی کو دیکھ لینا، پھر کہنا کیا واقعی اس کے ہوتے ہوئے میرا دل کسی کا ہو سکتا تھا؟"

"شانی جب نہیں تھی، تب کیا تھا؟" ماموں نے پھر چھیڑا اور شہریار نے ضد کر کے کہا۔ سگریٹ سلگایا اور مخمور لہجے میں بولا۔

"شانی کب نہیں تھی میری زندگی میں، پتا؟ شانی جیسی لڑکی سے میں کب سے محبت کر رہا ہوں، بس وہ مجھے مل ہی نہیں رہی تھی۔ اس کی محبت سے میرا دل خالی کبھی نہیں تھا۔ وہ جب نہیں تھی تو دل چاہتا تھا کہ وہ کہیں سے آجائے، آئے اور میرے بکھرے ہوئے نقش کو سنوار دے۔ اب وہ ہے تو میرا دل کرتا ہے، وہ مجھے ہمیشہ ایسے دیکھتی رہے جیسے کوئی مرنے والا زندگی کو حسرت سے تکتا ہے۔ میرا دل کرتا ہے وہ مجھے پیار کرے، کبھی کبھی اتنا..... اتنا زیادہ کہ خود کو بھول جائے، وہ مجھے چاہے تو ایسے کہ پھر میرے اندر کی ساری تشنگی، ساری حسرت محبت بن جائے۔ میرا وجود اس محبت سے بھٹکا روپ بھرے، مجھ سے کہیں دور کی دوری پہ کھڑی میری خوش قسمتی پہ ناز کرتی رہے۔ وہ مجھے اپنا ایسا پیار کرے کہ میں اسے کبھی بھولا ہی نہیں تھا۔ کبھی مجھے بھولے تو ایسے جیسے میں کبھی اسے یاد نہیں آیا تھا۔ میرا دل..... ماموں! پتہ نہیں میرا دل کیا چاہتا ہے، کیسے کیسے خواب ہیں ان آنکھوں میں، مگر یہ زندگی..... اسے ہمارے خوابوں سے سروکار ہی کتنا ہے؟"

ماموں عبدالکریم ہم سا دھے سے گیا اور وہ خود بھی خاموش ہو کر شیشے کے پار بھاگتی دوڑتی زندگی کو دیکھنے لگا۔ اسی زندگی کو جو آہستہ آہستہ اس کے اندر مرتی جا رہی تھی۔

❁❁❁

شافعہ جمیل راشدی آج بہت دنوں کے بعد علی کا پتہ حاصل کر سکی تھی۔ وہ پاکستان الیکٹرک پروڈکشن ہیڈ آفس چیف تھا۔ اس تک پہنچنا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا لیکن وہ سارے راستے سوچتی رہی تھی کہ ارسلان راشدی کے خصوصی خط اور فون کے باوجود کیا واقعی وہ اس کی بات اتنی ہی آسانی سے سنے گا، جس طرح اس نے کہنے کا سوچا تھا؟ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے دفتر کے باہر اپنی باری آنے کا انتظار کر رہی تھی، یہاں تک کہ تقریباً تین گھنٹے بعد جب وہ اپنے دفتر سے آف کرتا تھا تب اس کی باری آئی تھی۔

وہ کپکپاتے قدموں سے اس کے دفتر میں آئی تھی اور سامنے ہی بڑی سی ٹیبل کی دوسری طرف بیٹھے مرد کو دیکھ کر سہم گئی، وہ شاندار تھا، اس کی آنکھیں بند کیے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

"جی فرمائیے میم! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" انداز بہت مہذبانہ تھا مگر کیا اس کا مخاطب کر بھی اس کا کیسی انداز رہتا؟

"وہ..... مجھے مسٹر ارسلان راشدی کے تھرو آپ سے ملنا تھا۔"

"او، ہاں، میں جانتا ہوں، ایک زمانے میں وہ میرے آئیڈیل رہ چکے ہیں۔ ویسے دیکھئے تو آپ ان کے نام کے ساتھ آئی ہیں تبھی میں آپ سے مل پا رہا ہوں، ورنہ بہت عدیم الفرصت رہتا ہوں۔"

شافہ نے غور کیا تصور ہی کے برخلاف آج اس لمحے کی تلخی میں بھی ذہن میں آسمان کا فرق تھا۔ بہت حد تک وجیہہ تھا اور واقعی ایسا تھا کہ لڑکیاں اس کو پلٹ کر ضرور دیکھتی ہوں گی۔ مگر خالص اور روکھے پن کی اپنی اوٹ۔

"کیا میں جان سکتا ہوں آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟" اس بار لہجے میں قدرے نرمی تھی اور اس نے بے جھجک پوچھا تھا۔

"کیا آپ کو کبھی وشہ بیگم کی یاد آتی ہے مسٹر علی؟"

علی کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی، پھر اس نے تلخی سے کہا۔ "انسان اچھے دن بھول سکتا ہے مگر برے دن اور بری یادیں اور ان اچھے دنوں کو برباد کرنے والوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ پورے پچیس سال گزارے ہیں میں نے اس کے ساتھ۔ کیا میں وہ سال بھول سکتا ہوں؟ کبھی نہیں۔"

"آپ کو پتہ ہے بیگم صاحبہ بہت تھوڑے دن کی باقی ہیں۔"

علی کے چہرے سے کئی تاثرات ابھرے مگر اس کے ہاتھوں نے جتنی تیزی سے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھایا وہ اس کے اندر کی بے چینی کا کھلا ثبوت تھا۔

"کیا اب بھی آپ کو بیگم صاحبہ کی موت کا ذرا سا بھی دکھ نہیں ہوگا؟"

"شاید نہیں، ہرگز نہیں۔" اب وہ سگریٹ کے گہرے کش لے رہا تھا۔ اس نے اپنی آواز کی کپکپاہٹ تلخی میں بدل کر چھپانے کی کوشش کی تھی۔

تبھی اس نے کہا تھا۔ "ہم اپنے کمرے میں کوئی شو پیس رکھ دیں اور بہت عرصے تک اس کی جگہ نہ بدلیں اور کوئی اچانک اس شو پیس کو اٹھا کر کسی اور جگہ رکھ دے تو ایک لمحے کے لیے ہی سہی ہمیں اس ترتیب پر وحشت ہونے لگتی ہے کیونکہ ہمیں اس کی عادت پڑ گئی ہے۔ کیا کبھی آپ نے بیگم صاحبہ کے لیے اتنی سی بے چینی بھی محسوس نہیں کی؟"

"نہیں ان کی یادوں سے میری بہت سی تلخ یادیں وابستہ ہیں اس لیے میں ان سے پیار کر کے پھر سے اس اذیت ناک تجربے سے نہیں گزرنا چاہتا۔ میں محبت نہیں محبت میں اعتدال کا قائل ہوں۔"

"لیکن جو لوگ صرف محبت میں جیتے ہیں محبت ہی میں مرتے ہیں ان کا کیا؟"

"آپ آخر کہنا کیا چاہتی ہیں؟" وہ ایک بار پھر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے رسٹ واچ پر یوں نظر ڈالی تھی جیسے اپنی عدم دلچسپی کا اظہار کر رہا ہو۔

شافہ بھی اٹھ گئی تھی، پھر نرمی سے بولی تھی۔ "ہم جن سے محبت کرتے ہیں ان کے لیے مر جانے سے بھی نہیں ہچکتے۔ مگر ہم جن سے نفرت کرتے ہیں، چاہے جانے کی تمنا رکھنا تو ان کے دل کی بھی

مجبوری ہے ناں؟ کچھ لوگ ساری زندگی کچھ نہیں پاتے۔ لیکن کیا ان کی مجبوری کو ہمیشہ خالی ہاتھ کتنا ہی زندگی جینے کی روا ہے؟ مسٹر علی! آپ اگر ان سے ایک بار مل لیں تو شاید ان کی زندگی نہیں تو مرنے کی گھڑیاں مرتے وقت ان کی روح میں حسرت نہیں رہے گی۔ ماں سے وہ آسانی سے نکل سکتی ہیں اگر ایک بار آپ آجائیے۔ مجھے معلوم ہے آپ ایک زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن کچھ پلوں کو صرف مزاج الگ ملے، پھر بھی وہ دستور محبت سے اعلیٰ بات ہے ناں......"

علی کچھ نہیں بولا تھا اور وہ اس کے روم سے باہر آگئی تھی۔ پھر مزید حیران نہ رہی تھی کہ کوئی اس کے قریب سے گزر رہا تھا۔

وہ شی کی خوشبو۔ "شہریار!" اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اس سے تین سیڑھی نیچے تھا۔ وہ اس سے چھ زینے اوپر کھڑی تھی۔ بے ساختہ امام نے شہریار کو روک لیا تھا۔ شام جانی ہو کر شافعہ کے برابر آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ بے ساختہ ایک گہرا سانس سینے سے نکلا تھا۔ شافعہ اور اس کے بیچ تین زینوں اور چند سیڑھیوں کا فرق تھا۔

"کیا وہ کبھی اس دوری کو پھلانگ سکے گا؟"

وہ کچھ کہتی کہ قدم اٹھاتی اس کے قریب آن رکی۔ "مسٹر شہریار! آپ اور یہاں؟"

وہ بس پلو پکڑ کر ڈالتی رہی تھی۔ اب وہ دونوں ایک ساتھ چل رہے تھے۔

کاش یہ راستہ کبھی ختم نہ ہو۔ وہ ان کے ساتھ یونہی چلتی رہے اور زندگی کی ایک سانجھی شام اسے آگے ڈھانپ لے۔

"آپ آج بہت چپ چپ سے ہیں، خیریت؟"

شہریار نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔ "جو محبت کے متعلق کچھ نہیں جانتے، وہ ہمیشہ شور کرتے ہیں، چیختے بلاتے ہیں۔ مگر جو محبت کو گہرے راز کی طرح جان لیں، وہ اندر سے بکھرتے ٹوٹتے رہتے ہیں مگر ہونٹوں پہ مہر لب رہتے ہیں۔ محبت خاموشی کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔"

"حیران...... ہے ناں؟"

"ہاں، حیران ہوں۔ میرے مذاق اڑاتی مسکراہٹوں میں شور مچاتے کیسے آ رہا ہے؟ ویسے آپ نے نہیں پوچھا محبت کا کہاں سے جانا؟"

AANCHAL.COM

وہ مسکرانے لگی، ایک اسرار بھری مسکراہٹ...... محبت محبت کے تذکرے پر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اپنے ہی جھولا جھول رہی تھی۔ آنکھوں میں اپنے ہی نقش چھوڑ گئی تھی مگر محبت خاموشی کے رازوں میں سے ایک راز کی طرح اس کے ہونٹوں پر بھی چپ چاپ خاموشی سے آن بیٹھی تھی۔

"آپ یہاں کیا کرنے آئی تھیں؟" شہریار نے اس کی مسکراہٹ سے اپنا ہی نقصان کیا اور وہ مسکرانے لگی۔

"ایک لڑکی ہے، بہت محبت سے بھری ہوئی زندگی جس سے وہ بچانا چاہتی ہے، وہ منتظر آنسوؤں سے نکل گیا ہے اس کے اور وہ آخری ساعت اسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہے اسے ایک بار سننا چاہتی ہے، جس سے کبھی ٹوٹ کر محبت کیا کرتی تھی۔"

شہریار کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ کئی ساعتیں وہ کچھ نہیں بولا پھر آہستگی سے پوچھنے لگا۔ "اس محبت نے کیا جواب دیا؟ کیا وہ مرتی ہوئی محبت کی آخری بار زندگی جینے کی حسرت کو پورا کرے گی یا تشنہ ماندہ رہے گی؟"

"یہ تو میں کوشش کر رہی ہے، دیکھئے کیا فیصلہ کرتی ہے زندگی۔"

شہریار نے یکدم سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے کی جسارت کی پھر گویا اپنا گلا صاف کرتا ہوا بولا۔ "آپ یہاں کس طرح آئی ہیں؟"

"رکشہ لیا تھا اب اسی کے ذریعے واپس جاؤں گی۔"

"میرے خیال میں میرے ہوتے ہوئے یہ ٹھیک نہیں ہے۔ پلیز! آپ جہاں کہیں گی میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔"

شافعہ نے پہلے تو رد کیا پھر مان گئی۔ شہریار نے فرنٹ ڈور کھولا پھر کار اسٹارٹ کر رہا تھا جب شافعہ نے سوال کیا تھا کہ وہ آج یہاں کیا کر رہا تھا۔

اس نے گاڑی کو ریک کیا پھر نرمی سے بولا۔ "آپ تو جانتی ہیں، میں بزنس مین ہوں، کچھ دنوں پہلے ہی پتا چلا تھا کہ انکم ٹیکس والے کے ساتھ ماضی کے معاملات طے کرنے مجھے پڑیں گے، معاملات صاف ہوتے نظر آئے تو کھلا کہ یہ صرف اندرون خانہ رشوت ستانی کی ایک بہت ہی گھٹیا حرکت تھی۔ مسٹر علی سے مل کر معاملہ حل کر لیا ہے۔ ایک دو بندے معطل بھی کیے گئے ہیں اس لیے اب میں پرسکون ہوں۔"

"کسی کو معطل کیے جانے پر آپ پرسکون ہوتے ہیں؟"

AANCHAL.COM.PK

شہریار مسکرایا۔ "آپ خواہ مخواہ پریشان ہیں مس شافی! میں تو اس ذمہ داری کے کما حقہ ادا کیے جانے پر پُرسکون ہوا ہوں۔ دیکھئے ناں، کوئی ذمہ داری دی جائے اور آپ اسے نبھا جائیں، یہ کم خوشی تو نہیں۔"
شافعہ نے اسے کار چلاتے ہوئے چور نظر سے دیکھا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی، وہ بہت عام باتیں کرتا تب بھی شافعہ کو لگتا وہ کچھ بہت خاص کہتے جا رہا ہے۔ سالار اور اس کا انتہائی جائزہ لیتے ہوئے اکثر وہ شہریار کو کیا وہ نہیں رہتے دیتے سالار کی محبت سے مجبور ہو کر چپ ہو کر جاتی تھی مگر اس شخص کا اس سے کوئی غرض ہی نہیں تھی کہ کوئی اسے سراہے یا کوئی اس کی ذات پر اپنی زندگی نچھاور کرے۔ اسے تو خود مٹنے کا اتنا شوق تھا کہ بکھری ریت کی دیوار کے باوجود حصار بنے رہنے کی سرخوشی میں لپٹا پہروں خاموش کھڑے رہنے پر خوش تھا۔
"کیا دیکھ رہی ہیں مس شافی؟"
شافعہ اسے دیکھ کر نرمی سے بولی۔ "دیکھ رہی ہوں، پہلے سے بہت کمزور ہوتے جا رہے ہیں آپ۔ اس اے سی کار میں بھی آپ کا اتنا پسینہ آ رہا ہے۔ رنگ بھی مرجھا گیا ہے۔ آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟"
شہریار کے چہرے پر مسکراہٹ کھلنے لگی۔ آپ جسے چاہیں، اگر وہ آپ کا اتنی پروا کرتی تو یہ بے بسی جیت دل کی سرخوشی...... وہ چاہ کر نہیں سمجھی۔
"کچھ خاص نہیں ہے مس شافی! پچھلے دنوں کچھ بخار ہو گیا تھا اس کے اثرات ابھی تک باقی ہیں۔"
"اوہ! اچھا اچھا...... میں بھی سوچ رہی تھی جانے کیا بات ہے؟"
"جانے کیا بات ہو سکتی ہے مس شافی؟" اس نے حظ لیا اور وہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔ کسی اجنبی بات کو کہنے کہنے اس نے اسے یکدم روک لیا تھا۔
وہ بہت سبک رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے کہنے کے مطابق وہ اسے شافی کے فلیٹ کے سامنے ڈراپ کر کے آگے بڑھ گیا۔
یہاں سے اس نے مومنہ کو پک کرنے کے لیے دفتر کا قصد کیا تھا مگر سالار عبدالرحمن کے ایک خصوصی پروگرام کے تحت وہ آئندہ اپارٹمنٹ میں ابھی بھی ہوئی تھی کہ ایک گھنٹے تک اس کا نکلنا محال تھا اور اپنی من مرضی کا مطلب تھا سالار عبدالرحمن کا مزید غصہ برداشت کرنا، سو وہ اپنے کیبن میں مصروف ہو گیا۔ کچھ کام پینڈنگ میں پڑے ہوئے تھے انہیں کرتے کرتے دو گھنٹے گزر گئے۔ مگر مومنہ کے آف کرنے کا کوئی دور دور تک شبہ نہیں ہوا۔ پھر کام کرتے کرتے یکدم اسے طبیعت میں ایک عجیب گھٹن محسوس ہوا تو وہ اٹھ کر اپنے کیبن سے ملحقہ ریسٹ روم میں آ گیا۔ کاؤچ پر لیٹ کر اس نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے ریلیکس کرنے کی کوشش کی تھی۔ شرٹ کے اوپر کے دو بٹن بھی کھول دیے تھے مگر جیسے بڑھنے والی گھٹن اور اپنے اندر پھیلتی ہوئی بے چینی کو وہ گہرے گہرے سانس لے کر اندر کی گھٹن پر قابو

پڑا رہا تھا، جب بہت اچانک جازی کی آواز سنائی دی تھی۔

"شہریار بھائی! یہ کچھ ڈاکومنٹس پر آپ کے دستخط چاہئیں۔"

شہریار نے گہرا سانس لے کر پلک جھپکی۔ "میں ادھر ہوں جازی فائل لے کر تم یہیں آ جاؤ۔"

اس کا اٹھنے کا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا، مگر جازی کے لیے اس نے خود کو چہرے سے کمپوز کیا تھا۔ جازی اس دن کی عنایت پر کچھ [illegible] گیا تھا۔ وہ مین گیٹ سے اگر وہ گھر داخل ہوتا تو اوپر سے نیچے تک کھلبلی مچ جاتی۔ وہ رنگ کرنے، پاپا سے اور باقی لوگوں سے کافی [illegible] مجبور رہا، [illegible] احسان کی [illegible] وہ بھلانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں؟ ہم بھی تھوڑی دیر پہلے تو [illegible] صاحب کہہ رہے تھے کہ آپ کام کر رہے ہیں؟"

وہ دھیمے سے مسکرا دیا۔ "ہاں، کام کر رہا تھا مگر کچھ تھوڑی سی [illegible] محسوس ہو رہی تھی اس لیے [illegible] نے یہاں آ گیا۔ مگر تم بتاؤ کہاں سائن کرنے ہیں؟"

اس نے پاکٹ سے قلم نکالا۔ جازی صفحہ الٹتا رہا اور وہ دستخط کرتا چلا گیا۔

جازی نے فائل اوپر والی رکھی تو حیرت سے بولا۔ "مجھے حیرت ہے بھائی! آپ اس دن مجھے ڈانٹ رہے تھے اور [illegible] نے کہا کہ [illegible] تھے اور آج آپ نے خود فائل لا پروائی دکھائی ہے؟"

شہریار نے اس کی طرف دیکھا [illegible] عام سے لہجے میں بولا۔ "فائل تمہارے ہاتھ میں تھی جازی اور میں [illegible] کے لیے [illegible] ہوں۔ سب دستخط [illegible] تمہارے نام [illegible] ہے۔ دستخط کرنے نہ کرنے کا سوال کہاں رہ جاتا ہے؟"

"شہریار بھائی......!" مگر بعد وہ کچھ دن [illegible] تھا شہریار [illegible] "آپ نے [illegible] کیوں [illegible] ہے؟" وہ اس سے [illegible] والے لہجے میں مخاطب ہوا تھا اور شہریار نے ایک دم سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں بھائی!"

اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا، وہ [illegible] جھکے ہوئے جازی کے نقش [illegible] سے [illegible] لہجے میں بولا۔

''وہ ملا نہیں ہے ایک بار ہمیں
اور پھر زندگی دوبارہ ہمیں''

جازی کی آنکھوں میں پہلی بار انجانے اندیشے اترنے لگے تھے۔ ''آپ ایسی باتیں کیوں کرنے لگے ہیں؟''

''بس کبھی کبھی ڈائیلاگ مارنے کو دل کرتا ہے تو بس منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے۔ ویسے کچھ خاص بات نہیں ہے۔'' اس نے جازی کا گال تھپتھپایا۔

جازی تکتا رہا تھا جب تک سالار عبدالرحمن نے پھر کہا تھا۔

''آیا خواب شعوری نیند میں بھی کبھی پورے ہوتے ہیں۔''

جازی رک گیا تھا اور شاید ان کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں سنی بھائی؟''

''تم اچھی طرح جانتے ہو کیا سوچ کر بابا ان کے لیے کس بات سے ڈرتے تھے؟''

''سنی بھائی.....!'' وہ یکدم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ ''دھیرے بابا کی طرح مت بولیں آپ.....آپ ایسا کیسے سوچ سکتے ہیں؟''

''جس طرح تم اور کر کے بھی نہیں سمجھتے اسی طرح......''

وہ شاید کچھ اور بھی کہنے کو تھے مگر وہ ناراضی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اس نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

سالار عبدالرحمن اسے دیکھتے رہے جب وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ شہریار نے جازی کو اسی طرح آتے اور دروازے کے اندر سے باہر نکلتے دیکھا تو کھٹکا ہوا۔ وہی اٹھ آئی تھی۔

''کیا کہہ رہے تھے؟ کیا پھر کسی بات پر حرف سے پہلی بار کی طرح تکلیف کیوں ہوئی ہے؟''

جازی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور وہیں کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ فون کھسکا کر اس نے راسون عبداللہ کا نمبر ملایا ہی تھا۔

"سوری یار! میں مومنہ کے ساتھ تیرے فنکشن میں نہیں آسکوں گا، اسے ڈرائیور کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ ہاں، بس تھکا ہوا ہوں، طبیعت ٹھیک نہیں ہے...... نہیں یار صحت ٹھیک ہے، مگر مجھے لگتا ہے، جانے بغیر گزارہ نہیں ہو گا...... اور وہ مجھے؟ بس تجھے بولنے کی عادت ہے۔ نہیں، دوبارہ تجھ سے اچھا انکل ملیں گے۔"

وہ فون رکھ کر مڑا تو جازب اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"آج آپ التفات کی نظر مجھ پر بہت ہے؟ میرے بھائی! کہیں یادداشت تو نہیں بھول گئے؟ میں شہریار ہوں سر! اور اس نظر سے دیکھا جانا قطعی نظرانداز کرسکتا ہوں نہ برداشت کرتا ہوں۔" شہریار نے کہنے کے بعد منہ کھینچ لیا تھا۔

"مجھے لگتا ہے آپ کی طبیعت خراب ہے۔" وہ یکدم قریب آگیا تھا۔ جازب نے ہولے سے شہریار کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور دبا دیا۔

"مجھے آج اتنی محبت تھی تو ہوتا......!
کہ مرے دل کے ملنے کو بچے تھی نہیں
دل جو گمنام ہے، جو سنسان ہے
دل جو انجان ہے، دل انجان ہے"

"شہری بھائی!" اس کا ہاتھ کانپ گیا تھا اور شہریار نے بے ساختہ اس کے ہاتھ میں کہا تھا۔

"اپنی گاڑی کی چابی دو گے؟ میں ڈرائیور کے ساتھ مومنہ کو ماموں کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں، اس کا ایک ذاتی کام تھا۔"

جازب عبدالرحمٰن نے کچھ کہے بغیر کوٹ کی جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر اس کی ہتھیلی پر ڈال دی تھی۔

"تھینکس!" اس نے چابی اٹھائی تھی۔ مومنہ کو بات ختم کر کے وہ ہمدانی انکل کے گھر کی طرف اڑا جا رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

مومنہ ڈرائیور کے ذریعے ماسون عبدالکریم کے آفس میں داخل ہوئی تھی۔ یہ اور بات کہ اس کے ساتھ ہی داخل ہونے والے بابا عبدالرحمن نے بھی اجازت دی تھی۔

"کیسا کام ہو رہا ہے؟" وہ اندر داخل ہوتے اور جواب دینے کی بجائے سوالیہ دیکھنے لگے۔

"مومنہ ہیں مسز شہریار عبدالرحمن کے نئے باف پارٹی ہیں۔"

"اوہ اچھا...... اچھا...... تو گویا شہریار سے ان کا رشتہ؟"

"مسز ان کے آفس میں جاب کرتی ہیں۔ بیگم صاحبہ کی بھانجی اور مسٹر ارمان راشدی کی بیٹی ہیں۔ شہریار انہیں اپنی بہن مانتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے ہماری بھی خبر بتانی ہوگی ہاں۔ سو کہ آپ ان کی جس قدر مدد کر سکتے ہیں کریں۔ مسز شہریار ہمارے بہت اچھے دوستوں میں سے ہیں۔"

ماسون عبدالکریم مسکراتا ہوا مومنہ کو کیبن کی طرف لے گیا۔

مومنہ خاموش لہجے میں بولی۔ "آپ کے پاس تو بہت پرانے ہوتے ہیں اور یہ نہیں بجانی مانی کی جانے کہاں کہاں سے دستیاں آئی ہیں۔"

"دستیاں؟" ماسون عبدالکریم قہقہہ لگا کر ہنسا۔ پھر کچھ کہتے کہتے رکے اور بولا۔ "یہ شہریار کے بڑے بھائی کی خواہش ہے ان لئے دل رہے تھے کیونکہ وہ اور میں ذاتی طور پر [illegible] کرنے سے ہم صرف گھبراتے ہی نہیں بلکہ پیچھے لگ جاتے ہیں ابتدا آپ کی اچھی بھلی کار کردگی بھی ان کھاتے میں [illegible] دی جاتی ہے۔"

مومنہ کچھ لمحے انداز میں سر ہلا کر چپ ہو گئی اور پھر وہ کرسی پر بیٹھی تھی اور سٹ اس کے خیال میں وہ دوڑ رہی تھی۔ کئی بار سٹیپ روکی اور بالآخر سوچنے لگی کہ اس نے ٹھیک کہا ہے۔ پہلا ایک گھنٹے بعد وہ ٹھیک خیال ہونے لگی۔ ٹھیک ہے۔ اس نے ان کے پاس اپنی کوئی بات نہیں رہنے دی تھی۔ جو کچھ بھی تھا، باغ کے سو روم سے زیادہ تحسین کی، بار بار آگیا تھا اور اچھا ہے۔ جب آپ کوئی چیز بہت احتیاط سے سنبھال کر رکھیں اور دوبارہ سے ڈھونڈنے کی کوشش کریں تو اس سے پہلے نئی چیزیں کونے کھدروں سے برآمد ہوتی ہیں اور پھر بہت محنت کے بعد ڈھونڈی جانے والی چیز برآمد ہوتی۔ [illegible] کے باہر بیٹھے ہوئے اس کی دریافت ہوئی تھی۔

انکل یہ پرفیکٹ ہے کر زیادہ خوش ہوئی تھی اور جب وہ باہر نکلی تو ماسون عبدالکریم کی آنکھیں بجھ سے مومنہ پر [illegible] رک گئیں۔

"یہ...... یہ مجھ پر اتنا مان ہیں؟"

"جی سو فیصد بلکہ میرے سے بھی زیادہ مان ہیں۔"

عدیل عبدالرحمن نے مودبانہ پیش کیا تھا۔ ان کی آنکھیں بھی حیرت سے تصویر پر جم کر رہ گئی تھیں۔ مامون عبدالکریم کچھ کہنے والا تھا، جب بہت اچانک عدیل عبدالرحمن نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر دبا ڈالا۔ مامون نے اس دباؤ سے سنبھالا لیا اور بہت خوشگواری سے بولا۔

"آپ کے سسر بہم رشتہ اٹھا دیں گے؟ اعتماد نے میں آپ کی عزت کی ہے۔ کہتے ہیں خیر آگے کریں گے۔ لیکن آپ انہیں اعتماد نے میں احترام رکھتی ہیں؟"

مومنہ نے گھبراہٹ میں سر ہلایا تھا۔ مجرمانہ لہجے میں بولی تھی۔ "پتا نہیں، مجھے انہیں کھونے کا ڈر ہے یا ان کو پانے کی حسرت شدت پکڑ گئی ہے۔ لیکن ایک بات میں ضرور سوچتی ہوں اگر وہ مجھے ملے اور اسی حالت میں ملے کہ میرا دل ان سے نفرت کرنے کی جسارت بھی نہ کر سکے اور خود سے شرمندہ ہوتا رہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ وہ مجھے ملیں ہی نہیں؟"

مامون کچھ نہیں بولا تھا۔ مومنہ کو ڈرائیور کے ساتھ واپس گھر بھیج کر وہ شہریار کا فیصلہ زبانی کرنے لگا تھا۔ ایک سوال بار بار اسے ڈرا رہا تھا۔ وہ کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ عدیل عبدالرحمن نے اس کے سامنے ٹھنڈا اخبار معروف نرگس کا لا رکھا۔

"بے کار ہے ایک بچے سے میں خود بھی بات کر رہا ہوں مگر ان کا سیل پاور آف ہے شاید۔"

مامون عبدالکریم نے پُرخیال انداز میں عدیل عبدالرحمن کی طرف دیکھا، سنجیدگی سے بولا۔ "شہریار نے مومنہ کے متعلق کس حتمی بات کا نام دیا تھا؟"

عدیل عبدالرحمن کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھرنے لگی اور وہ کچھ کھنکھار کر بولے۔ "میرے خیال میں شہریار سے بہتر کوئی اچھا فیصلہ نہیں لے سکتا۔ ہاں سوال یہ ہے کہ مومنہ کے لیے ہمارے سامنے جس نے خود پر بوجھ سمجھا ہے، خود مومنہ کی اسے لائق نہ سمجھے ہوئے ہے سامنے شہریار کے ان فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر بات وہی کہ پہلا معاملہ سیٹ ہوئے بغیر دوسرا کیسے بدلا جا سکتا ہے؟"

"آپ کو کیا لگتا ہے، مومنہ واقعی خوش ہے؟"

عدیل عبدالرحمن نے پُرخیال انداز میں انہیں دیکھا، سنجیدگی سے بولے۔ "مومنہ کی حد تک حقیقت پسند لڑکی ہے، وہ ایک محفوظ گھر چاہتی ہے، جب سے شہریار نے اسے پیشکش کی تو اس نے سوچ کر

وقت نے کہاں پہ ویزل کو جنت نظاروں کی طرح مٹنے نہیں دیا۔ وہ ایک ضد زندہ رکھنا چاہتی تھی اور ٹوٹی کی بات تو اپنے کھونے والے بچے کا دکھ دینے کے چکر میں وہ ایسی بے حال ہو گئی ہے کہ پوری طرح ٹوٹ بھی نہیں ہو پا رہی۔ شہریار اس سلسلے میں پوری طرح اس کی مدد کر رہا ہے کافی چند دن۔ میری ناک مچان چکا ہے مگر کوئی بھی لسٹ نہیں۔ دیکھو کیا رزلٹ نکلتا ہے۔" وہ کہتے کہتے پھر بالکل ان کے ہاتھ سے لے کر وہ بار بار شہریار کا نمبر ملانے لگے۔

ماسون نے اس کی وجہ پوچھی تو وہ قسم کھا کر بولے۔ "وہ کسی پرابلم میں ہے۔ ماں تو میرا نمبر دیکھ کر کال ریسیو کرتا ہے۔ مگر آج فون ان کے دوست سے ہی لے کر تم سے اپنی پرابلم شیئر کرے گا۔"

"آپ کو کیوں لگتا ہے وہ کسی پرابلم میں ہے؟" ماسون عبدالکریم کے ذہن میں پیر کی کال کو بجتی گئی اور انہوں نے مجھے کچھ نہیں کہا۔

"پتہ نہیں، مگر ابھی تک ٹھیک ہے لیکن وہ کسی پرابلم کا شکار ہوتا ہے تو میرے اندر عجیب طرح کی بے چینی ہوتی ہے۔ کوئی بات محسوس طور پر کاٹنے لگتی ہے۔ تم اسے بچپن سے بھی کیسے جانتے ہو۔" انہوں نے تقریباً آٹھویں بار نمبر ملاتے ہوئے بات کی اور اس بار تو بجتے رابطہ ہو گیا۔

"کیا ہے؟ کیا ایک پل بھی میرے بغیر سانس نہیں لی جاتی؟"

عدیل عبدالرحمٰن نے خیالی کا نام دیا تھا کہ ان کو ان کی بات کہی تھی۔ اس کی بھی ہوئی آواز لگی تھی اور ماسون نے آنکھ کی آواز کی حرکت سے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"خیریت! یہ تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے؟ تم ٹھیک تو ہو جان؟"

"ہوں...... ٹھیک ہوں۔"

"مگر مجھے ٹھیک لگ تو نہیں رہے۔ کہاں جا رہا ہے؟"

"میں وہاں ہوں جہاں سے اپنی بھی خبر نہیں آتی۔ ویسے شہر سے باہر ہوں۔"

"مگر وہ پیر تک تو شہر میں تھا، پھر اچانک......"

"کام اچانک ہی نکل آتے ہیں میری جان! تم فکر مت کرنا۔" پھر اس نے سلام دعا کے بعد لائن ڈس کنکٹ کر دی۔

AANCHAL.COM.PK

"اب کیا کہتے ہیں آپ؟ وہ ٹھیک ہے۔"

عدیل عبدالرحمٰن نے فون کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا: "وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ یقیناً انکل صمدانی کے فلیٹ میں ہے۔"

"آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"اس کا لہجہ بات کرتے کرتے تم نے نہیں دیکھا مگر میں نے مارک کر لیا تھا۔ وہ میری موجودگی جان چکا ہے۔ آخر ہے تو میرا بھائی ہی۔"

وہ دونوں پھر ایک ساتھ نکلے تھے مگر جب تک وہ فلیٹ پہنچے تب تک وہ وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔ انکل صمدانی ان کے پوچھنے سے انکاری تھے اور عدیل عبدالرحمٰن کی بھی رٹ تھی کہ انکل صمدانی نے اسے انڈر گراؤنڈ کر دیا ہے۔

"خدا کا خوف کرو عدیل! میں کوئی گینگسٹر ہوں یا شہریار مجرم جو انڈر گراؤنڈ کر دوں گا۔ تم بھی مجرموں کے ساتھ رہ رہ کر بالکل ان جیسے ہو گئے ہو۔" انکل صمدانی کا لہجہ ملامت والا تھا۔

عدیل عبدالرحمٰن کچھ دیر لاجواب ہو گئے۔ انہیں اب بھی یہی خیال تھا کہ شہریار یہیں ہے۔ مگر کہاں، یہ وہ نہیں جان پائے تھے۔

❀❀❀

جازی عبدالرحمٰن آج بے انتہا انکار کے باوجود دوستوں کی ضد پر پرائیویٹ پارٹی کے لیے نکلا تھا۔ پہلے کا مزاج بنا تھا۔ اب بھی اس نے قسم کھائی تھی کہ آج وہ صرف بار اور رنگ نہیں لے گا۔ کسی کولا وغیرہ سے کام چلائے گا۔ مگر پرائیویٹ پارٹی کا ہیجان انگیز ماحول آدھے گھنٹے بعد ہی بار اور رنگ کی طرف لے گیا۔ بیٹھا پارٹی کی آخری گہری ڈرنک کے گلاسوں سے الجھ رہا تھا کہ جانے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ اس طرح اس کو دیکھنے کی گنجائش اس کی زندگی میں کہیں نہیں تھی۔

"یہ کیا چیز کون ہے؟" اس نے اشارہ کیا اور ایک نشے میں دھت شخص نے آنکھیں جھپکیں۔ جھپک کر اس کی اشارہ کی انگلی کی طرف دیکھا اور پھر خباثت سے ہنس کر بولا۔

"تہمینہ.......؟ یہ تو پانچ سات بار تینوں کا روح رواں ہے۔ لوگ اسے اپنی پارٹیوں میں اس لئے بھی بلاتے ہیں کیونکہ یہ پیسہ پانی کی طرح بہاتا ہے اور خوش مزاج اتنا ہے کہ ہر جگہ کا نسبت اس کے کھلنے میں موجود ہے۔"

جازق عبدالرحمن نے گلاس ٹیبل پر رکھا تھا پھر یکدم اس کے سامنے آ کر بولا۔ "آپ سے مجھے لگتا تھا کہ آپ ایسی نہیں تھی مگر!"
اس نے مڑ کر دیکھا پھر طنزیہ شرمندگی سے بولا۔ "کیا تم کسی دعوت میں شریک ہو جو صرف مجھ پہ طعنہ زن ہو؟ ہم سب سارے مرد اپنے آپ بنتے ہیں وہ وجہ سے رکھتے ہیں ہمیں سوسائٹی میں موو کرنے کے لیے ایسا کرنا پڑتا ہے برخوردار!"
جازق نے اس کا ہاتھ جھٹکا اور تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔
وہ گھر آیا تو سیدھا شہریار عبدالرحمن کے آؤٹ ہاؤس کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا آؤٹ ہاؤس بند پڑا تھا مگر ایک وقت میں شہریار کی جاسوسی کے لیے اس نے ماسٹر کی بنائی تھی وہ آج کام آئی تھی اس نے بہت آرام سے دروازہ کھولا تھا پھر اس کی الماری ٹٹول رہا تھا کہ اسے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی تو یہ شہریار بھائی تھے وہ بہت الجھا تھا اس نے ڈرتے ڈرتے رخ موڑا مگر سامنے بہت غیر متوقع ماما کھڑی تھیں۔
"کیا ڈھونڈ رہے تھے؟"
"شاید کوئی فوٹو گراف! مجھے لگتا ہے جس کا تم ذکر کرنا چاہتے ہو۔"
ماما نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔ "میں کبھی بھی شہریار کو نہیں سمجھ پائی ہوں۔" "تم پھر کر رہی ہو..." "جاننا چاہتے ہو شاید وہ تمہاری ماں کے پاس موجود ہے۔ لیکن اچانک شہریار کے لیے سوفٹ کارنر کیوں؟"
جازق سے کچھ ہی دیر تک کچھ نہیں بولا گیا پھر بولا۔ "شہریار بھائی کے لیے تو آپ لوگ بھی کبھی نرم گوشہ نہیں رکھتی تھیں اس لیے تو پھر بھی ان کے دوستوں میں شامل تھا اس لیے دوست کو واپس پلٹنے میں زیادہ وقت نہیں ہوتا۔" "کیا تم کے پاس جو سچائیاں ہیں وہ آپ نے خود بھی جی ہیں؟"
ماما شہریار کے بیڈ پر بیٹھ گئیں پھر اس کے بیڈ کے کنارے پر کسی ان کے کسی اچھے دوست کی یادگار تصویر ہاتھ میں لے کر بولیں۔ "پہلے کبھی مجھے لگتا تھا کسی انسان کو جانچنے کے لیے سچائیاں، کچھ بہت سچائیاں بہت ضروری ہوتی ہیں مگر جب سے شہریار کی آنکھوں میں دیکھا ہے مجھے لگا ہے اچھے بچے کو جانچنے کے لیے صرف اس کی آنکھیں اور اس کا چہرہ دیکھنا کافی ہوتا ہے۔ ماں بھی اپنے بچے کو

غلط بیچ نہیں کر سکتی۔"

جازی عبدالرحمٰن کچھ نہیں بولا۔ امام کے ساتھ خاموشی سے ان کے کمرے سے نکل آیا، پھر آہستگی سے بولا۔ "بھائی نے آپ کو شہر نہ آنے کی کوئی وجہ بتائی تھی امام؟"

"نہیں، کہہ رہا تھا حالات کو ذرا دیر سے آئے گا اور بس۔ تین دن پہلے سے اس کا انتظار کر رہی ہوں، لیکن ابھی تک وہ آیا نہیں ہے۔" امام نے کہتے کہتے رسٹ واچ دیکھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔

جازی نے خاموشی سے کھانا کھایا تھا اور چپ کر کے اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا تھا۔ لیکن اس کی نظر میں وہ سارے مناظر گھوم گئے تھے، جب جب اس نے شہریار کو بیٹر کا نشانہ بنایا تھا۔

"میں شاید آپ کو کبھی سمجھ نہیں سکوں گا بھائی!" اس کی خود کلامی بے ساختہ تھی۔ اس نے بیڈ کی سائیڈ دراز سے شہریار کی تصویر کا فریم باہر نکالا تھا اور پھر کچھ سوچ کر واپس لگا دیا۔

دوسرے دن وہ ناشتے کے بعد ماموں کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اپنی بات واضح کرنے کے لیے اس نے ایک لفافہ ان کی طرف بڑھایا تھا۔ وہ ایک کے بعد ایک تصویر دیکھتا چلا گیا۔ حمزہ عباد ہر تصویر میں کسی نئی لڑکی کے ساتھ موجود تھا۔ جازی نے تصویریں اکٹھی کر کے ایک خیال سوچا ہی تھا کہ ماموں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اگر تم سمجھتے ہو کہ تم یہ تصویریں دکھا کر اس وقت دنیا کا دل حمزہ عباد سے موڑ سکتے ہو تو تم غلطی پر ہو۔ اگر چاہو تو آگے سے دیکھی سچائی ہے۔ پہلے یہ تصویریں تمہارے سامنے بھی رکھی جا چکی ہیں تو تم بھی ان تصویروں کو شہریار کی کوئی سازش کہتے، جیسا ایک وقت میں حالات نے انہیں ریپ کر رکھا تھا۔ جازی! جسے ہم چاہنے لگتے ہیں نا، تو پھر فطری طور پر وہ بہت زیادہ سخت ناقدین نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ہم اس کی بڑی غلطیوں کو تو کیا، چھوٹی چھوٹی بشری کمزوریوں تک کو معاف کرنے کے موڈ میں نہیں ہوتے۔"

جازی کچھ کر تصویریں لفافے میں واپس کر کے شہریار کے روم کی طرف بڑھ رہا تھا کہ جا کر اس کے قدم رک گئے تھے۔

"تم نے اب تک یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی، سالار! ابھی تک جانا نہ ہے اچھی ہیں۔ پھر دنیا کیا ہوا شہری کو رسوائی اپنے سر لے لی گا؟ مجھے تو لگتا ہے، اگر تمہیں خود اپنے جیون ساتھی کو اپنی طرف موڑنا نہیں آتا۔ ورنہ جس طرح شہریار نے سالار بھائی کو ختم کیا تھا، جس طرح اپنی طرف اس نے جاذب کو راغب کر کے تمہارے لیے میدان چھوڑا تھا، کوئی اور لڑکی ہوتی، اپنا حق مانگتی اور اپنے حق سے خود کو الگ تو کب کی اس کی زندگی خوشیوں سے بھر جاتی۔ لیکن تم نے...... تم نے......"

وہ بے مقصد مڑ کر کچن کے سامنے سے گزرتا چلا گیا تھا۔ ایک کے بعد دوسری سچائی نے اس کے اندر توڑ پھوڑ مچا کر رکھ دی تھی۔

"شہریار بھاگتی!" وہ چپ کمرے کی زینت بن گئی۔ گھر کیسی کی کرتی رہی بیٹھ گیا تھا۔ اس نے موبائل نمبر ملایا تھا مگر دوسری طرف کال ریسیو نہیں کی گئی تھی۔ وہ بار بار ملاتا رہا مگر خاموشی تھی۔ اس نے موبائل آف کرکے اعصاب ڈھیلے ڈال دیے تھے اور اب وہ انداز سوچ رہا تھا جس سے وہ شہریار کو پھر سے منا سکتا۔

❀❀❀

فون بجا، ہونا تیزی سے فون کی طرف بڑھی تھی۔ وہ ابھی ابھی عاطف سے ہی باتیں کررہی تھی کہ اچانک رابطہ منقطع ہوگیا تھا۔ عاطف پندرہ دن کراچی میں رہ کر ہونا کو بھی طرح سے زندگی کی طرف لوٹا کر واپس چلا گیا تھا اور کم وبیش وہ جا کر بھی مسلسل اس سے رابطے میں تھا۔ ایرانی دانشوروں کا عاطف بہت عظیم گارڈ تھا۔ جس نے ان کی خیر جوئے انہیں بے کی بنیاد پر قبول کرلیا تھا۔ جس طرح سے اس نے سوسائٹی کے خلاف قدم اٹھایا تھا اب وہی جانتے تھے کہ ایک مرد کی حیثیت سے ہونا کا ویژن کس قدر قابل تعریف تھا۔ شاید یہی اس نئے رشتے پر خوش تھی۔ اعتماد ملازمت زندگی نے بھی ٹھنڈا گہرا سانس بھرا تھا۔ پھر بھی کوئی بات تھی جو ان کے اندر گہری گھٹن بن کر مٹی جارہی تھی اور وہ سوچ رہی۔ وہ عاطف کی شکر گزار تھی لیکن شہریار عبدالرحمن کی شخصیت کی بہت زیادہ قائل تھی۔ وہ اس کی نظر میں رول ماڈل کی حیثیت اختیار کرگیا تھا۔

اس نے سوچوں کو جھٹک کر فون اٹھا لیا تھا، پھر شوخی سے بولی تھی۔ "کیا ہے جی، ابھی تو ہم پہلے ہی بات کررہے تھے اور آپ ہیں کہ......"

"کون...... ہونا بول رہی ہو؟"

اس کا دل اس کے دماغ میں دھڑکنے لگا۔ اس شخص کی آواز وہ لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ جس پر بھی سچ تھا کہ اب وہ اس آواز کو اپنی زندگی میں سننا نہیں چاہتی تھی۔

"کون بول رہا ہے؟" وہ جان کر انجان بنی اور دوسری طرف سے کرخت لہجے میں پوچھا گیا۔

"کس کا انتظار تھا تمہیں؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس طرز تخاطب میں کسی اور سے بات کرنے کی جس انداز پر صرف میرا حق ہے۔"

"آپ بول کون رہے ہیں؟"

"کیا مجھے تمہیں یہ بھی بتانا پڑے گا کہ میں کون ہوں؟"

"میں آپ کو نہیں جانتی۔" اس نے گھبرا کر فون رکھ دیا تھا۔ جیسے وہ فون سے ہی کوئی کارستانی کرنے پر اختیار رکھتا ہو۔ اس کے ریسیور رکھتے ہی بیل پھر بجنے لگی۔ اس نے رات کی خاموشی میں بیل کی آواز کو بجتے سے گھبرا کر فون پھر اٹھا لیا۔

"تم آخر چاہتے کیا ہو؟"

دوسری طرف گہرے گہرے سانسوں کی آواز آتی رہی پھر کوئی بہت ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "کیا تمہیں یہ بھی بتانا پڑے گا کہ میں صرف تمہیں چاہتا ہوں۔"

"عجیب سنگدل ہیں۔ بھلا آپ نے ہزاروں لڑکیوں سے کہا تھا۔"

"ہاں کہا تھا۔ مجھے اس پر کوئی انکار نہیں۔ لیکن اب میرا دل تمہاری طرف کھنچا جا رہا ہے تو میں کیا کروں؟"

"آپ بحث کرنے کے قائل رہے ہیں؟ آپ کو معلوم ہے آپ کی فیملی کے متعلق اخبارات کیا چھاپ رہے ہیں؟"

"اخبارات اور ان کی خبریں..... وہ وقت دینے والوں پر ہوتی ہیں ظلم کا رد عمل ماضی لگتی ہی ہے۔ تم اگر نہیں دو ان کے اخبارات کا پیٹ کیسے بھرے گا؟" لمحہ بھر رک کر پھر بولا۔ "آجاؤں ہاں۔ بہت دل چاہ رہا ہے تم سے ملنے کے لیے۔"

"آپ غلط نمبر ڈائل کر رہے ہیں۔ میری پچھلے ہفتے ہی منگنی ہوئی ہے۔"

"منگنی اور تمہاری؟ ہاہاہا..... تم سوچتے کیا ہو؟ بھی مجھ پر جا رہی ہے۔ پوگرل! کچھ تو شرم کرو۔ کیوں کسی عزت دار گھرانے کی لڑکی بننے سے مچل رہی ہو؟ ہم جیسوں کو کہاں وہ شاباش کب ملتی ہیں؟"

سونیا کی آنکھوں میں اس تذلیل سے آنسو آ گئے تھے۔ وہ جانتے وڈوں سے سوال بلند واستا اس کا گریباں ایک ہی جھٹکے میں نیچے آ گیا تھا۔ اس نے منگنی کی انگوٹھی کو بے بسی سے دیکھا اور ابھی بہت اچانک کسی کے نرم ہاتھوں نے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا تھا۔ اس نے صوفے سے پشت لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں اور سانس کی تیز آواز گونجی تھی۔

"تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس سے سونیا کی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ کیونکہ جس سے اس کی منگنی ہوئی ہے وہ اس سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے اور محبت کرنے والے اپنے محبوب کی خامیوں، خطاؤں کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں ان کا محبوب انسان ہے اس سے غلطی ہوئی۔ ایک عام بشر ہے ایک عام انسان ہے۔ رہے تم..... تو بہت جلد تم وہاں ہو گے جہاں کے

AANCHAL.COM.PK

حق بات ہے۔ میری بہن کو جھکانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اب وہ اکیلی نہیں ہے۔“

سوہا نے بہت تشکر سے شافعہ کو دیکھا تھا۔ شافعہ نے فون رکھ کر اسے بانہوں میں سمیٹ لیا تھا اور وہ اس کے کندھے سے سر ٹکا کر رو دی تھی۔

”تانی بجو! عاطف ایسے کیوں ہیں؟ ان کے دو بچے بھی ہیں۔ پھر وہ طلعت کو زندگی میں آزمائیں گے۔ وہ واقعی سوفٹ ہارٹڈ ہیں ناں؟“

شافعہ نے اس کے بال سہلائے مگر جواب دیتے لہجے میں برہمی تھی۔ ”تو جیسے بھی ہیں تم بس... اور کیا کہوں۔ وہ ظہیر صاحب کے دوست ہیں اور ظہیر بار کا دوست بنانا آسان کام نہیں ہے۔“

سوہا نے شافعہ کے چہرے پر کئی عکس ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر اسے سوائے عقیدت کے رنگ کے کوئی رنگ نظر نہیں آیا۔

”پتہ نہیں یہ عقیدت کب محبت بنتی ہے۔“ سوہا نے دل میں سوچا اور طلعت سے بات کی اور سر جھکا کر اپنے اور عاطف کے مانند نصیب پانے والے خواب دہرانے لگی۔ شافعہ کے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ تھی جیسے یہ مسکراہٹ اس کے ہر خواب کے لیے دعا بنے جاری تھی مگر وہ جانتی تھی کہ سوہا کی زندگی کا رنگ نیا تھا۔

❀❀❀

جانان خوش آنکھیں لیے صوفے پر بیٹھی تھی اور طلعت جہاں پریشان نظر آ رہی تھیں۔

”آخر تمہیں پریشانی کیا ہے اماں؟“ جانان نے تھکے تھکے لہجے میں طلعت جہاں کو دیکھ کر پوچھا۔ لہجے میں زندگی مفقود تھی۔

طلعت جہاں نے جانان کو دیکھا پھر خفگی سے بولیں۔ ”جس کی ایک بیٹی ہو جو دو ہری بھاری ہو، وہ ایک دم خشک پتے کی طرح جھڑ جائے تو اس ماں کا کلیجہ کیوں منہ کو نہ آئے گا؟“

”ماں! بس بھی کرو۔ بس میرا کچھ دل تنگ ہو گیا ہے۔ میں اب بھی تمہاری وہی بیٹی ہوں جس پر تمہیں ناز ہوا کرتا تھا۔“ جانان نے ان کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر طلعت جہاں نے ناراضگی سے جھٹک دیا۔

”رہنے دے یہ چاپلوسی، یہ محبت کے ناٹک۔ مجھے تو لگتا ہے تجھے اب اپنی ماں سے پہلی والی محبت بھی نہیں رہی ہے۔“ وہ رونے پڑ گئی تھیں۔

”ماں! بس کرو۔ میرا سہارا ہے وہ اب ہی کون؟ آخر تمہیں یہ کیوں لگا کہ میں تمہاری پہلی والی بیٹی نہیں رہی؟“ اس نے تھکے ہوئے انداز میں سوال کیا اور طلعت جہاں کے لفظوں کی اٹھان بھری گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

”اگر شہر میری پہلی والی بیٹی ہوتی تو منگنی اٹینڈ کرنا کیسے چھوڑ سکتی تھی؟ تمہیں بانی نانی تعزیت کے لئے نہیں آتے ہیں مگر تجھے تو پھر سے شیرازی کا روگ لگ گیا ہے۔ وہ بے وفا تھا، تجھے بھی بھول گیا اور دو دن میں اس نے تجھے جانے کیا پٹی پڑھائی ہے کہ تو شیرازی کا بیج ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ میں کہتی ہوں کیا دے گا تجھے شیرازی کا بیٹا؟ کم اصل کی اولاد کم اصل ہی ہوگی ناں؟ کیا سن نہیں جاتی ہے اس نے، چاندی جیسا تعویذ ہزاروں بچوں کے گلے میں ہو سکتا ہے۔ مگر تیری تو لگتا ہے عقل ہی ماری گئی ہے۔ کیا کرے گی شیرازی کا پیار دیکھ کر؟“

جاناں کی آنکھوں میں آنسو آگئے، خواب آنکھ کے مگر وہ خواب بھی ٹوٹتے تھے اور اس کا لہجہ کرلا رہا تھا۔

”شیرازی کیسا بھی تھا مگر وہ میرا پیار اور شیرازی کی محبت تھا، میں دیکھنا چاہتی ہوں صرف ایک بار دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ دیکھنے میں کس پر گیا ہے مجھ پر یا بالکل میرے شیرازی پر؟“

”تیرا شیرازی کہاں سے ہو گیا وہ؟ تجھے معلوم ہے جاناں، وہ ایک نمبر کا......“

”ہاں پلیز مجھے کچھ مت بولو۔ وہ جیسا بھی تھا میرا شیرازی تھا، اس نے مجھ سے محبت نہیں کی لیکن میں نے تو اس سے محبت کی تھی اماں، اسے گالیاں مت دیا کرو، جہاں بھی ہے، جیسے بھی ہے بس وہ......“

سطوت جہاں نے اٹھ ہوتے نند کو دیکھا تو پھر سے ان کی باتوں میں گھسیٹ لیا۔

”حمزہ جاہ کہہ رہا ہے تم نے شہریار والے معاملے میں کچھ توجہ نہیں چھوڑ دی ہے؟“

”یہ حمزہ جاہ تم سے کیسے اتنا گھل مل گیا ہے ماں؟ تم تو کہہ رہی تھیں حمزہ جاہ سے بچ کر رہو بہت چالاک آدمی ہے اور ایسے لوگ جو خاندانی نہیں ہوتے پشتی رئیس نہیں ہوتے ہیں اور وقتی دولت کا گرا امیر ہونے والے الگ۔ ماں! یہی کہا تھا ناں تم نے؟“

”ہاں، ہاں...... یہی کہا تھا مگر ضروری نہیں جو ایک رائے قائم کی جائے اس پر دوسری نظر نہ ڈالی جائے۔ کبھی کبھی لوگ جیسے دکھتے ہیں ویسے ہوں گے، یہ ضروری تو نہیں۔“

”ہاں ماں! تم ٹھیک کہتی ہو، کبھی کبھی لوگ واقعی ایسے نہیں ہوتے جیسے دکھتے ہیں مگر تمام عمر کبھی کبھی تو پتہ ہی نہیں چلتا بس رہ جاتا ہے، یہ بات سمجھ نہیں آتا۔“

سطوت جہاں اسے تعجب سے دیکھتی رہیں کہ یہ جملہ یونہی سرسری کیفیت کا پیش خیمہ ہے یا واقعی اس جملے میں کوئی حقیقت ہے۔ یہی جاننے کے لئے انہوں نے التفات سے پیش قدمی کی تھی۔ ”ہاں واری! یہ تو بتا شہریار اور عبدالرحمن کے بارے میں کوئی نئی پیش رفت کی تو نے؟“

AANCHAL.COM.PK

حق بات ہو۔ میری بہن کو جھکانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اب وہ اکیلی نہیں ہے۔"

سوہا نے بہت تشکر سے شافعہ کو دیکھا تھا۔ شافعہ نے فون رکھ کر اسے بانہوں میں سمیٹ لیا تھا اور وہ اس کے کندھے سے سر ٹکا کر رو دی تھی۔

"تائی جی اور عاطف ایسے ہی ہیں، دل کے برے نہیں ہیں۔ پھر وہ طلعت کو زیادہ نہیں آزمائیں گے، وہ واقعی سوفٹ ہارٹڈ ہیں نا؟"

شافعہ نے اس کے بال سہلاتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا تھا۔ "تم جیسے بھی ہیں تم بس یاد رکھنا کہ وہ منیر صاحب کے دوست ہیں اور منیر صاحب کا دوست ہونا آسان کام نہیں ہے۔"

سوہا نے شافعہ کے چہرے پر کوئی عکس ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر اسے سوائے عقیدت کے رنگ کے کوئی رنگ نظر نہیں آیا۔

"پتہ نہیں یہ عقیدت کب محبت بنتی ہے۔" سوہا نے دل میں سوچا اور طلعت سے ہونے والی بات میں سر رکھ کر اپنے اور عاطف کے حوالے سے دیکھے جانے والے خواب دہرانے لگی۔ شافعہ کے ہونٹوں پر اداس مسکراہٹ تھی، جیسے یہ مسکراہٹ اس کے ہر خواب کے لیے دعا بنے جا رہی تھی مگر وہ واقعی ان دونوں کی زندگی کا روگ تھی۔

جانان خالی آنکھیں لیے صوفے پر بیٹھی تھی اور عظمت جہاں پریشان نظر آ رہی تھیں۔

"آخر تمہیں پریشانی کیا ہے اماں؟" جانان نے تھکے تھکے لہجے میں عظمت جہاں کو دیکھ کر پوچھا، لہجے میں زندگی مفقود تھی۔

عظمت جہاں نے جانان کو دیکھا پھر خفگی سے بولیں۔ "جس کی ایک بیٹی ہو جو بیوہ ہو، بے سہارا ہو، وہ ایک دم خشک پتے کی طرح جھڑ جائے تو اس ماں کا کلیجہ کیوں منہ کو نہ آئے گا؟"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ بس میرا بھی دل تنگ ہو گیا ہے۔ میں اب بھی تمہاری وہی بیٹی ہوں جس پر تمہیں ناز ہوا کرتا تھا۔" جانان نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر عظمت جہاں نے ناراضگی سے جھٹک دیا۔

"رہنے دو یہ چاپلوسی، یہ محبت کے ناٹک۔ مجھے تو لگتا ہے تجھے اب اپنی ماں سے پہلی والی محبت ہی نہیں رہی ہے۔" وہ رو دینے کو ہو گئی تھیں۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ میرا سہارا ہے وہ ہے ہی کون؟ آخر تمہیں یہ کیوں لگا کہ میں تمہاری پہلی والی بیٹی نہیں رہی؟" اس نے تھکے ہوئے انداز میں سوال کیا اور عظمت جہاں کے لفظوں کی اٹھان بھری گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

اگر آج میری بچی والی بیٹی ہوتی تو شگفتہ ایٹینڈ کیسے چھوڑ سکتی تھی؟ آتی بانی نانی تعزیت کے لیے آتے ہیں مگر تجھے تو بس شیرازی کا روگ لگ گیا ہے۔ وہ بے وفا تھا، تجھے یہ بھی بھول گیا اور وہ کتنی اس نے تجھے جانے کیا پٹی پڑھائی ہے کہ تو شیرازی کا بچہ ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ میں کہتی ہوں کیا دے گا تجھے شیرازی کا بیٹا؟ کم از کم اولاد کی فصل ہی ہو گی ماں؟ کیا شناخت بتاتی ہے اس نے، چاندی جیسا تعویذ ہزاروں بچوں کے گلے میں ہو سکتا ہے۔ مگر تیری تو لگتا ہے عقل ہی ماری گئی ہے۔ کیا کرے گی شیرازی کا بیٹا دیکھ کر؟“

جاناں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، خواب آ گئے مگر وہ خواب بھی شبنمی تھے اور اس کا لہجہ گرا ہوا تھا۔

”شیرازی کیسا بھی تھا مگر وہ میرا بچہ اور شیرازی کی محبت تھا۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں بس صرف ایک بار دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ دیکھنے میں کس پر گیا ہے مجھ پر یا بالکل میرے شیرازی پر؟“

”تیرا شیرازی کہاں سے ہو گیا وہ؟ تجھے معلوم ہے جاناں، وہ ایک نمبر کا......“

”ماں پلیز مجھے کچھ مت بولو۔ وہ کیسا بھی تھا میرا شیرازی تھا۔ اس نے مجھ سے محبت تھوڑی کی تھی، میں نے تو اس سے محبت کی تھی۔ اس سے گولیاں مت دیا کرو، جہاں بھی ہے، جیسے بھی ہے، بس......“

سطوت جہاں نے اٹھتے ہوئے ضد دیکھی تو پھر سے اس کو پچھلی باتوں میں گھسیٹ لیا۔

”حمزہ عابد کہتا ہے تم نے شہریار والے معاملے میں کچھ تفصیل چھوڑ دی ہے؟“

”یہ حمزہ عابد تم سے کیسے اتنا گھل مل گیا ہے ماں؟ تم تو کہہ رہی تھیں حمزہ عابد سے بچ کر رہو، یہ اچھا آدمی ہے اور تم نے کہا تھا کہ یہ نہیں ہوتے ہیں، پشتینی رئیس الگ ہوتے ہیں اور وقتی دولت کا گرا امیر ہونے والے الگ۔ ماں! یہی کہا تھا ناں تم نے؟“

”ہاں ہاں...... یہی کہا تھا مگر ضروری نہیں جو ایک رائے قائم کر لی جائے اس پر دوسری نظر نہ ڈالی جائے۔ کبھی کبھی لوگ جیسے دکھتے ہیں، ویسے ہوں بھی، یہ ضروری تو نہیں۔“

”ہاں ماں! تم ٹھیک کہتی ہو۔ کبھی کبھی لوگ واقعی ایسے نہیں ہوتے جیسے دکھتے ہیں۔ تمام عمر کبھی کبھی تو پرتیں ہی اتارتے رہ جاؤ، ہاتھ کچھ نہیں آتا۔“

سطوت جہاں اسے تولنے والی نظروں سے دیکھتی رہیں کہ یہ جملہ یونہی سرسری کیفیت کا پیش خیمہ ہے یا واقعی اس جملے میں کوئی حقیقت ہے۔ یہی جاننے کے لئے انہوں نے التفات سے پیش قدمی کی تھی۔ ”ہاں واری! یہ تو بتا شہریار اور عبدالرحمٰن کے بارے میں کوئی نئی پیش رفت کی ہے؟“

AANCHAL.COM.PK

جانانہ نے صوفے سے پشت ٹکا دی، پھر مدھم لہجے میں بولی۔ "سچ پوچھو تو ماں! مجھے اب اس معاملے میں تو کیا کسی بھی معاملے میں دلچسپی نہیں رہی۔ مجھے لگتا ہے، جیسے کوئی ہے اور پیچھے سے کہہ رہا ہے۔ "جانے! آؤ..... جانے! آؤ۔" ماں ایک آواز اندر باہر ہر طرف سنائی دیتی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے یہ آواز نہیں، میں خود ہوں۔ پھر میں اس آواز سے آگے دوڑوں تو وہ مجھ سے پہلے دوڑ رہی ہوتی ہے۔ کہیں آنے جانے کو دل نہیں کرتا، کسی کا ان باتوں پہ بچانے کو من نہیں کرتا۔ رہا شہریار تو مجھے کبھی کبھی وہ اتنا معصوم لگتا ہے ماں! مجھے اپنی شاطر چالوں سے اچھے آپ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ عجب انسان ہے، اسے جتنا دکھ دو، اتنا ہی سہہ لیتا ہے۔ پر اس کے گھر پہ کوئی بات کر دو تو جان پر کھیل جانے پہ تیار ہو جاتا ہے۔ ماں! کیا واقعی گھر اتنی ہی مقدس جگہ ہوتی ہے، جہاں کی عزت کے لیے لوگ خاموشی سے اپنی جان پہ کھیل جائیں؟ مجھے تو پتہ ہی نہیں ہے، گھر کیا ہوتا ہے؟ بابا کا گھر ضرور ایک گھر تھا، میرا اور شیرازی کا گھر۔ مگر وہ گھر تو بہت کمزور نکلا۔ ماں! تمہیں نہیں لگتا، سزا صرف اسے ملنی چاہیے، جس کا جرم ہو؟" اس نے بھرپور طریقے سے جہاں کو دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ "مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے ماں! انہیں عبدالرحمٰن کی سزا اور ہے مگر کسی کو نہیں ملنی چاہیے۔ تمہیں پتہ ہے، وہ شہریار میری وجہ سے زندگی سے کتنا دور ہو گیا ہے؟ ماں! کبھی کبھی مجھ میں یہ احساس جرم مار سے ڈال دیتا ہے۔"

"ادھر نہ جانے! تو بھی ماں...... آج کل کن سوچوں میں رہنے لگی ہے؟ ادھر دیکھ، یہ احساس جرم میرا تمہارا ہمارے لیے نہیں ہوتی۔ ہمارے لیے صرف زندگی ہوتی ہے۔ بے حد حساب جینے کے لئے زندگی۔ یہ سمجھ۔ چل اٹھ، آج میں تجھے خود پارلر لے کر جاتی ہوں۔ چل اٹھ۔ دیکھ کتنے دنوں سے میری طرف دھیان نہیں دیا تو نے۔"

جانانہ منع کرتی رہی، مگر حشمت جہاں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھا کر باہر کی طرف بڑھتی چلی گئی تھیں۔

❀ ❀ ❀

وہ اس وقت ایمرجنسی روم میں لیٹا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صمدانی، ڈاکٹر نواز کے ہاسپٹل میں ابھی ابھی آئے تھے اور بہت زیادہ پریشان تھے۔ اس کی صورت نظر آئی تو بولے۔ "تم اتنے اسٹرانگ ہو کر بھی چلتے بنتے ہو، اگر اتنی تکلیف میں تمہیں راستے میں کچھ ہو جاتا تو؟...... تمہیں معلوم ہے، نواز کے ہاسپٹل سے زیادہ میرا اسپتال قریب پڑتا ہے؟"

اس نے تھکے سے انداز میں ہنس کر انہیں دیکھا اور پھر آہستگی سے بولا۔ "جب میں نکل رہا تھا، جازی کی یہ بات مجھے کنفرم ہو گئی تھی کہ میں کہاں جا سکتا ہوں، اس لئے مدیل جیسی کی پریشانی سے بچنے کے لئے میں نے یہ چانس لیا۔ ویسے کنڈیشن بہتر ہے نا؟"

ڈاکٹر صمدانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”فی الحال تمہاری ہارٹ بیٹ اسٹیبل نہیں ہیں۔ ہم دونوں مل کر تمہاری کنڈیشن سنبھال رہے ہیں۔ اگر تمہیں خاطر خواہ رزلٹ نہیں ملا تو میں آج تمہارا آپریشن کرنے سے قطعاً نہیں چوکوں گا۔“

”آپ تو باندھ کر مارنے والی بات کر رہے ہیں انکل!“ وہ ذرا سا ہنس دیا تھا اور ڈاکٹر صمدانی اس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ کر مدھم بولے تھے۔

”تمہیں معلوم ہے، ہم جسے چیزیں ٹھیک کہہ رہے ہیں، وہ ہماری میڈیکل ٹرمنالوجی میں اگر ہارٹ ٹھیک کیا جاتا ہے اور بار بار رہنے لگے تو اس کا مطلب ہے رکاوٹ شدید سے شدید ترین ہوتی جا رہی ہے۔ تمہاری تازہ ترین انجیوگرافی کا ارادہ ہے۔ کیونکہ چار ماہ پہلے والی انجیوگرافی اس وقت صورت حال ٹھیک طرح سے نہیں بتا پا رہی۔“

”انجیوگرافی انکل نے...... وقت آپریشن سے کچھ زیادہ تکلیف دہ ہے۔ آپریشن میں تو بے ہوشی ہوتی ہے انکل! اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے فرار ہو جاؤں تو یہ ارادہ ضرور بدل دیجیے۔“

”ارادہ بدل دیجیے۔“ ڈاکٹر صمدانی نے اس کا لہجہ ادا کرنے کی کوشش کی، پھر مدھم سے بولے۔ ”شہریار! کیا واقعی ہماری محبت تمہارا دامن نہیں پکڑتی؟ اگر ہاں تو یار! دنیا میں کوئی تو ایسا ہوگا، جس کے لیے تم جینا چاہتے ہو گے؟“

اس پل اس کی آنکھوں میں ایک چمک کوندی تھی اور ڈاکٹر صمدانی نے مسکرا کر کہا تھا۔

”یہ چمک بتاتی ہے کوئی ہے واقعی میں! آپ نہیں پوچھیں گے آخر کس کی پروا رہی ہے؟“

ڈاکٹر صمدانی کی آنکھیں اس پر جمیں اور وہ مسکرایا۔ ”بہت جلد ملواؤں گا انکل! آپ سب سے پہلے ملیں گے، لیکن بغیر ہاتھ ادھاری دل تھوڑی دوں گا۔“

”ہاں تو...... اتنے تو فرماں بردار بیٹا ہو تم۔“ انہوں نے چہرہ اور شہریار نے مصنوعی خفگی سے دیکھ کر کہا۔ ”کیوں انکل! کوئی شک ہے میری فرماں برداری پر؟“

”نہیں، مجھے زیادہ ویٹنگ کی ضرورت نہیں۔ ہم اپنا فیصلہ پوری ایمانداری سے لیں گے۔“

”پلیز انکل! یوں نہ کریں، ابھی بہت سے کام پڑے ہیں، ابھی دیکھیے ایوارڈ فنکشن کی ایک ورکشاپ ہو رہی ہے لندن میں، ایوارڈ فنکشن کے ایوارڈ کے لیے کمپین چلانی ہے۔ کچھ اشتہارات ہیں، دانیال کی شادی ہے اور بہت سے کام ہیں۔“

ڈاکٹر صمدانی بچے کے بغیر اس فیلڈ میں رہنے کی شہادت دلانے ہے۔ یہاں تک کہ تمام کر ماموں کا اسے تج آگیا۔ وہ بیرک کے فون کی طرف دوڑے بھی تھے۔ انہوں نے ان کا سمجھا تھا مگر اس بار ماموں نے ضروری بات کی تھی۔ وہ بیرک کا سارا حال انکل صمدانی تو شاید پہلے سے جانتے تھے کہ وہ کیسے معاملے کی جڑ تک پہنچا اور کیسے ڈاکٹر نواز کے پاس پہنچا۔ انہوں نے سوال کی تفصیل سے وہ سب سر سے ذرا لگا رہا یہاں تک کہ رات گئے ماموں ان کے سامنے بیٹھا تھا۔

”اب بتاؤ کیا پرابلم ہے؟“

”کوئی پرابلم نہیں ہے۔ بتاؤ مومنہ کے کام کا کیا ہوا؟“

شہریار نے انگلیوں کا پوٹ اٹھایا۔ جیب سے نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔

شہریار نے غصے سے ہتھیلی کو رگڑ کر پوچھا ”یہ...... بینچ اٹھا رہا ہے؟“

”ہاں، یہ اس کے بہت سے بینک ناموں میں سے ایک نام ہے۔ حسن تم بے فکر رہو، مومنہ سنور کی لاکی ہے۔ بہت جلد آزادی ملنے والی ہے۔“

”مطلب؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

اس نے تشریح کرنا شروع کی۔ ”مسز بیرک نے ایک جھگڑا کر دیا ہے۔ حسن ابراہیم اور ان جیسے بڑے بڑے نام ... کی طرح اڑنے والے ہیں۔ سیاسی میدان میں ان کی حیثیت صفر ہونے والی ہے۔ پھر کوئی سیاسی جماعت ان کی پوزیشن کو بچا سکے گا نہیں ہونے پائے گی۔ سو حسن ابراہیم کی گرفتاری سے زیادہ حسن کو بھی اپنے شکنجے میں ہوگا۔ پھر مومنہ کے لئے ڈائیوورس لینا کچھ نا مشکل کام نہیں ہوگا۔“

شہریار تفصیل سن کر بیرک سے لپٹ گیا تھا۔ پھر دوسرے دن ڈاکٹر نواز نے ان کی صحت کے مطابق سوال کیا تو وہ ہنس کر بولا۔ ”یہ سچ ہے محبت زندگی بڑھا دیتی ہے۔ ڈاکٹر نواز ہمارے انکل صمدانی جیسا مان کے باقی ... مسیحائی ہے مسیحائی۔ مجھے لگتا ہے کسی دن میں مرنے لگا تو انہیں یاد کر بلا لیں گے کہ ڈاکٹر کر مجھے واپس زندہ کر دیں گے۔“

”کمال کیا ہے؟“ ڈاکٹر صمدانی جو چپ چاپ اندر آئے تھے ان کے اس جملے پر ہنسی سے بولے اور وہ خاموشی سے خدمت کے لئے ... کے لئے ... کرکے بیٹھ گیا۔

"اب مطمئن ہو جائیں۔" ڈاکٹر صمدانی نے آہستگی سے کہا اور ان کی مریضہ اس کے تاثر سے باہر نکل گئی۔ وہ مریض کے پاس سے ہٹ کر کھڑکی کی طرف چلے گئے اور ڈاکٹر نواز سے شوخی سے بولے۔

"بالکل صمدانی بہت چالاک ہیں، تھوڑا تھوڑا کر کے ذہن تیار کر رہے ہیں، کہ کوئی اعتراض نہ کر سکے۔"

ڈاکٹر نواز ہنسنے لگے اور ڈاکٹر صمدانی اسے گھورتے ہوئے باہر نکل گئے۔

اس نے ... دن کے جانے کے بعد اب اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیئے تھے اور تین دن بعد وہ گھر میں تھا۔ ڈاکٹر صمدانی ایک بار پھر اس کی ضد کے آگے ہار گئے تھے۔

❀❀❀

وہ وہیل چیئر پر بیٹھا ... عارفہ نے کچن میں سے نکل کر دروازہ کھولا تھا۔ اماں پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔ سارا سامان گھر منتقل ہو چکا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی اور آج کل وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جاتی تھی۔

"خیر ہے نا بھائی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔ بتاؤ اماں کہاں ہیں؟" اس نے متوازن لہجہ اپنایا، مگر عارفہ جانتی تھی اس کے بھائی کے لہجے میں تلخی ابھی تک نمایاں تھی کیونکہ اس دن کی ... کی بحث کے بعد سے اماں نے مکمل طور پر اس کا بائیکاٹ کر رکھا تھا اور اس بائیکاٹ کی وجہ سے وہ جان بوجھ کر شہریار ... [illegible] ... آج کے بعد کیا وہ کبھی شہریار کے سامنے اس طرح سر اٹھا کر دیکھ سکے گا۔ کیا شہریار اسے پورے دل سے کبھی معاف کر سکے گا؟"

"آپ کیا سوچ رہے ہیں بھائی؟" عارفہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ... سوال پوچھا اور وہ آگے آ کر اماں کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"اگر میں تم سے کہوں ... زندگی میں واپس لوٹ آئی تھی......؟"

عارفہ کی آنکھیں پوری طرح کھلیں اور وہ کپکپاتے ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر ... لہجے میں بولی۔ "اگر آپ اس کی غلطی معاف کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو میں کہوں گی اماں کو واپس لے آئیے۔ اگر آپ ... بھائیوں کی طرح اسے جان سے مارنے کا ... زندگی دینے کے خواہاں ہیں تو میں کہوں گی وہ جہاں ہے جس حال میں ہے اسے وہیں رہنے دیجئے۔ کم از کم اس طرح ... زندگی کے ... تو برقرار رہے گی۔ میں سمجھتی ہوں ... زندگی میں کبھی ... ان کی آنکھ ... رونے لگی تھی اور ... نے کچن کی طرف رخ کر لیا تھا۔

"کیا میں واقعی بہت برا بھائی ثابت ہوا ہوں عارفہ؟ کیا واقعی میں بہت ظالم انسان ہوں؟"

عارفہ کھڑے سے اس کے قدموں میں بیٹھ گئی تھی اور گھٹنوں سے لپٹی روتی ہوئی تھی۔ "آپ دنیا کے سب سے بہترین بھائی ہیں۔ مجھے آپ کی محبت پر بھی بھروسہ تھا۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے بھائی! لیکن غلطی معاف کرنا بہت مشکل کام ہے۔ ہر کوئی معاف کرنے میں اتنا اعلیٰ ظرف نہیں رکھتا کہ گھر سے نکلی ہوئی لڑکی کو اپنی گھر والوں کی عام معافی دے سکے۔"

کسی کے ہلکے ہلکے قدموں کی چاپ اس کی پشت پر رکی تھی۔ وہ پلٹی بھی نہیں تھی کہ کسی کے نحیف ہاتھوں نے اس کا شانہ پکڑ لیا۔ اس نے ایک خوش فہم سی بات سوچی اور وہ اجنبی اس کے سامنے موجود تھی۔

"عائشہ بیگم!...... تم...... عائشہ بیگم! یہ تم ہو؟"

وہ کچھ کہے بغیر صرف سر ہلا کر کانپتے ہوئے کالے ہاتھوں کو تھامے رہی۔ عارفہ نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور ماتھے پر بوسہ دیا۔

"ہمارے بھائی دنیا کے سب سے اچھے بھائی تھے مگر میں نے انہیں سمجھنے میں جتنی غلطی کی، زندگی نے اس کی بہت بڑی سزا دی ہے مجھے۔"

عارفہ کچھ نہیں بولی۔ وہ اسے کھینچ کر اس کے شانے سے سر ٹکائے ماں بیٹیوں دونوں روتی رہیں۔

حامد نے دونوں کے درمیان سے سر اٹھا کر اندر کا رخ کیا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ وہ چلا گیا اس کا ارادہ تھا وہ شہریار کے بیٹے کو لے آئے گا۔ پھر اگلے تین دن وہ شہریار کے دفتر کے چکر لگاتا رہا مگر شہریار سے اس کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی اور پھر یہ چوتھا دن تھا۔ جب اس نے اپنی گاڑی اس کے دفتر کے باہر کھڑی کر دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید شہریار اس سے اتنا خفا ہے کہ اب ملنا ہی نہیں چاہتا۔ نہ جانے کیسے ممکن ہے۔ دفتر کا کوئی ایک بندہ بھی اس کی آمد اور ملاقات کا ٹھیک ٹھیک نام نہیں بتا سکے اور بہت جلد گیارہ بجے اس نے شہریار کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھی تھی۔ اس کے اندر جاتے ہی اس نے بھی گاڑی کا اندر کی سمت کا راستہ لیا تھا اور بہت خیر متوقع وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ سے برآمد ہوا تھا۔ بے حد تھکا ہوا مرجھایا ہوا سا اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی حسرت تھی۔ کوئی ان کہا سا دکھ تھا۔

"شہریار!" اس نے تیزی سے اسے پکارا تھا۔ کہیں وہ اس سے کھو نہ جائے۔ آج پتہ نہیں شہریار کے کھونے کا ڈر کیوں لگ رہا تھا۔ کیا محبت ڈر کے سوا کچھ اور نہیں؟ کبھی نہ ملنے کا ڈر اور کبھی مل کر بچھڑ جانے کا ڈر۔

شہریار بہت حیرت سے پلٹا تھا۔ "تم نے مجھے ہی پکارا ہے ماں؟"

"یہ کیا بات ہوئی تمہارا ہی نام شہریار ہے اور کون ہے اس نام کا؟" ملاحہ نے لاپروائی سے کہا اور شہریار جھینپے سے انداز میں بولا۔

"ہاں واقعی یہاں اور اتنا خوش نام۔" "کون ہوگا جتنا میں، وہ شخص تمہارے لہجے میں کوئی طنز کوئی دل جلانے والا جملہ نہیں تھا ہاں، تو حیرت ہوئی کہ مجھے کوئی اتنی بے قراری سے کیسے پکار سکتا ہے۔ اتنی بے قراری سے کہ جیسے دیر سے بے خبر تنہا ہو جائے گا۔"

ملاحہ اب اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ "تم اتنے دل گرفتہ کیوں ہو؟"

شہریار نے ایک خالی نظر اس پر ڈالی اور بے خبری سے بولا۔ "میری زندگی بے جا اتنی ہے بے خبر کیسے، میں اتنا دل گرفتہ کیوں ہوں۔ نہ ختم ہونے والی زندگی ختم ہو جاتی ہے ملاحہ! زندگی ختم ہونے کا مطلب سمجھتی ہو؟ کام کرتے ہیں بہت سے، بہت کچھ کرنا ہے۔ مگر کوئی ہے جو ہر جا ہے سب چھوڑ کر چلو میرے ساتھ۔"

ملاحہ کا دل بہت خوفزدہ ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں پانی بھی آ گیا تھا۔ کیا یہ آنسو تھے جو اتنی تیزی سے اس کے بکھرنے کے خیال سے نکل آئے تھے؟

"شہریار آئی.....آئی ایم سوری!"

ملاحہ نے غلطی کہنے میں اتنی جلدی نہیں کی تھی جتنی جلدی اس نے اسے کھینچ کر خود سے لپٹانے میں کی تھی۔ شہریار ابھی گم کیفیت میں تھا۔

"کیا واقعی تم نے مجھے محبت سے پکارا ہے ملاحہ؟ اب میرا بھی دل کتنی دیر سے بے کیا اپنے پرائے تمہاری؟ تم جانتی ہو، اور تمہارے لیے میں کتنا حساس ہوں۔ اگر یاد رکھو تو جان بھی ساتھ کھنچی جائے گی۔"

"خدا نہ کرے۔ چلو تمہارے ڈنر میں بیٹھتے ہیں چل کر۔"

"ڈنر نہیں، کہیں اور چلتے ہیں۔"

پہلی بار شہریار کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری تھی۔ وہ ملاحہ کی گاڑی میں آن بیٹھا تھا اور گاڑی تیز رفتاری سے آگے دوڑتی چلی گئی تھی۔

❀❀❀

عدیل عبدالرحمٰن دوبارہ سے گھر نہیں گئے تھے۔ مگر ان خاص کے تحت ان کی ساری توجہ پہلے سے زیادہ معلومات کو فارم میں لانے میں خرچ ہو رہی تھی۔ حشمت جہاں کی وجہ سے ان پر بہت پریشر بھی

AANCHAL.COM.PK

تھا۔ اسٹرینجر بھی بہت زیادہ محتاط ہو گیا تھا کیونکہ اسے احساس تھا کہ بات نہ مانی جائے تو عبدل عبدالرحمن کے بہروپ پر چیک رکھا جانا لازمی امر تھا۔ مومن عبدالکریم بھی اسی حوالے سے مصروف تھا۔ لیکن شہریار کے کہنے پر وہ مومنہ کے معاملے سے بھی صرف نظر نہیں کر رہا تھا، پھر وہ آن موقع کے کہنے پر جس جا ملتا ہوم میں معلومات لے رہا تھا اس نے بہت سے راز اس پر آشکار کیے کہ وہ بیٹے تھے۔ وہ پوری معلومات ثبوت کے ساتھ لے کر وہ یہ پہنچا ہی تھا کہ عبدل عبدالرحمن کی گھبراہٹ دیدنی دکھائی دی۔

”ہمیں فوراً کہیں جانا ہے فرید بن کوئی جب چیزوں کے پیچھے سے معاملے کو ہمیں خود ہینڈل کرنا پڑے گا۔“ انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراہٹ کا عملی ثبوت دیا۔

مومن کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ معاملہ حجابی کی غیر متوقع ہے اگر رنما حجابی کی پیچیدگی پیچیدہ ثبوت میں بھی جب زندگی کا ایک حصہ بھی دار جتن تھا مرد۔ عبدل عبدالرحمن ان معاملات کو بھی ختم کر دیتے کہ تھے یہ سب اٹھایا گیا ہوا تھا۔

اس نے سوال کیے بغیر اپنے پچھلی ہولسٹر میں ریوالور کی موجودگی کو محسوس کیا تھا پھر آہستگی سے پوچھا تھا۔ ”انی تھنگ رانگ سر؟“

”اسٹرینجر کا آخری ٹائم آیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا، بن فاکل ٹی وی سے یوفی احمد کو کسی اچھے پیشکش دو کیلے ادا بات انچے کے لیے اس نے شاہ نواز اور حسن ابراہیم کے کہنے پر معاملات کو کینسل کیا ہے اور اس کا خیال ہے وہ کوئی اندر کا آدمی سامنے آ رہا ہے اور آن سامنے آ رہا ہے، بائیکنگ پروگرام ہے اس کا... کے اس کی کارکردگی کو لگایا جا رہا ہے، مگر اسے پروا ہی نہیں ہے۔ پتہ نہیں آج اس کا کرائم رپورٹ والا دماغ کہاں گیا ہے وگرنہ وہ تو الو کے جانے کو بار کی نہیں کرتا۔“

”آپ سلامہ کے لیے اتنا پریشان ہیں؟“ مومن عبدالکریم کو حیرت ہوئی۔

عبدل عبدالرحمن نے جھنجھلا کر کہا۔ ”میں سلامہ کے لیے پریشان نہیں ہو رہا بلکہ شہریار کے لیے پریشان ہو رہا ہوں کیونکہ اسٹرینجر کی آخری اطلاع تھی کہ سلامہ شہریار کو خبر دے کر کہیں جانے کے لیے نکلا تھا۔“

مومن عبدالکریم نے ان کا کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ وہ جانتا تھا اسٹرینجر تک آتی فرینڈز نہ کیسے فارورڈ ہوتی تھیں۔ مومن کے جسم میں سنسنی کے سوا کوئی احساس نہیں تھا۔

”آپ آج بہت سلو چلا رہے ہیں سر!“

AANCHAL.COM

"اس سے زیادہ اور کتنی تیز چلا سکتے ہو تم؟ جیپ الٹ بھی سکتی ہے۔"

ماہون نے کچھ کہنے کے بجائے راستوں کی سمت نظر کی۔ دو پولیس سے کیپٹن کا کام لیا جا رہا تھا۔

مدثر عبدالرحمٰن کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ کیپٹن ان ہی کے بالکل سامنے تھا۔ شوٹنگ پوائنٹ پانچ نمبر کے فاصلے سے دور تھا۔ قریب زیرو ونگ جیپ بھی بارہ منٹ پہلے ان کی جیپ کو کراس کرنے کے بعد پہنچی تھی۔ اس نمبر نے کافی ان کا نام پولیس پر پہنچایا۔ سب معاملہ بالکل صاف تھا۔

شہریار کافی ہاؤس میں داخل ہوا تھا اور خالی میز کی طرف بڑھ رہا تھا کہ صلاح نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آج کہیں اور نہیں، اپنی پوری رونق والی میز پر چلتے ہیں۔ میں نے آج تک اس میز پر کسی غیر کو بھی بیٹھنے نہیں دیا۔"

شہریار نے اسے شکوے سے دیکھا تو صلاح اور سلمان ہنس پڑے۔ "اس دن میں نے جان بوجھ کر عاطف کو اپنی میز پر کافی کی دعوت دی تھی۔ پتہ نہیں تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا تھا، اپنی جگہ عاطف کو دیکھ کر جلن... گولڈی نے کہا تھا مجھے بھی سمجھایا کیا جائے، جس سے تمہیں تکلیف پہنچے تمہارا دل ٹوٹ جائے۔"

شہریار نے پوری توجہ سے اسے دیکھا، پھر مدھم بولا۔ "تم نے یہ سوچا میرا دل ٹوٹ جائے۔ مجھے پرواہ نہیں... تم نہیں جانتے اپنی میز پر جگہ دیکھ کر مجھے کتنی اذیت ہوئی تھی۔"

"میں محسوس کر سکتا ہوں تمہاری اس اذیت کو، کیونکہ میں خود بہت عرصے سے خوار ہونے کی اذیت سہہ رہا ہوں۔" صلاح آہستگی سے بولا۔ "تم سناؤ تمہاری ناکام تگ و دو سے کیسی مشکل چل رہی ہے؟ کیا کہتے ہیں وہ؟"

شہریار نے اس کے سامنے سگریٹ کے پیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس نے فوراً پیکٹ اپنی طرف کھسکا لیا۔ "میں نے سنا ہے تم اسموکنگ چھوڑ چکے ہو۔"

شہریار ہنس دیا، پھر مسکرا کر بولا۔ "جو اسموکنگ سے ڈرتے تھے وہ سگریٹ پیتے نہیں، اور ان پر جب پہلے اسموکنگ میں اتنی مقدار..." اب کی بار اس نے زور دے کر سگریٹ نکال لیا تھا۔

"تمہیں ڈاکٹر نے اسموکنگ سے منع کیا ہے نا؟"

"پیشہ بھی رکھتے ہو، بہتر مجھ سے میرے متعلق کیا ڈاکٹر سے جاننا چاہ رہے ہو؟ تمہارے رویے کا پتا تو مجھے پہلے بھی کبھی شک نہیں رہا تھا۔"

ملازمہ بھی تو پوچھ رہا ہے، تمہارا باپ پھر بھرائے لہجے میں بولا۔ "پھر وہ کیوں کر رہے ہو؟ آپ یقین کیوں نہیں کر لیتے؟ تمہیں معلوم ہے جہاں اس آپریشن میں ہونے والی دیر تمہاری زندگی کے چانس کو اور کم کر رہی ہے۔ مائی گاڈ، آ رہے ہیں تمہیں پھر بھی تم ہو کہ اپنی ضد نہیں چھوڑ رہے۔"

شہریار نے سنگ بست کے وجود ہی سے رخ موڑتے ہوئے بتانے کر ہیں ہو، شاید جیسے اس نے کچھ سنا نہیں اور بہت غیر متوقع بولا۔ "بہت دنوں بعد سنگ بست بیٹے کو محسوس ہی ایک ہے ملازمہ؟" آج کی بار شہریار نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا بھی مگر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔

"تم یہاں؟" شہریار نے دبے لہجے میں سامنے کھڑے جازی عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا۔

"آپ سے گھر پر ملاقات نہیں ہو رہی تھی، اس لیے میں نے سوچا کہ میں یہاں کوئی ان میں آپ کا انتظار کر لوں۔" جازی کا لہجہ روکھا پھیکا تھا۔

شہریار نے اس کا یہ انداز کرسی کو بی پر بٹھا لیا تھا اور کچھ نہیں بولا تھا۔ ملازمہ خاموشی سے کچھ بتا رہا تھا اور جازی کی نظریں شہریار پر لگی ہوئی تھیں۔

"آپ نے اتنی بڑی بات ہم سب سے چھپا کر اچھا نہیں کیا خاص کر دادی جان سے۔ وہ آپ سے کتنا پیار کرتی ہیں اور آپ بھی اس کی ... سمجھانے کے بجائے سمجھائے جا رہے ہیں۔"

شہریار نے گہرا سانس لیا، پھر بہت مدھم لہجے میں بولا۔ "محبت سمجھانے کی اتنی بڑی عادت ہے مجھے کہ اگر محبت نفرت میں بدل جائے تب بھی نفرت کو بھی سمجھانے لگتا ہوں۔"

"شہری بھائی! آپ...... کیا ہیں آپ؟"

پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے پاتا، باہر گولیوں کی تیز آواز سے خوف ان کے ماحول میں ہر جگہ پھیل گئی۔

"باہر مت نکلنے گا۔" ملازمہ نے کھڑے ہو کر اس وقت کی وہ ساری ذمہ داری سنبھالی اور شہریار نے کسی سنجیدہ بچے کی طرح جازی کا ہاتھ تھاما تھا۔

"تم اس کاؤنٹر کے پیچھے سے باہر نہیں نکلو گے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ میں نے کہا ہے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

جازی نے فق چہرے سے اس کی طرف دیکھا اور شہریار کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے سنگ بست جھجک کر دوسرے مسلا اور کال ریسیو کی۔

"شہریار! کوئی ان کے پچھلے دروازے سے نکلے گی... ہم انہیں سامنے سے مصروف رکھے ہیں۔ ملازمہ کے لیے کچھ ہو سکتا تھا۔"

"عدیل بھائی! کاش ان کا پچھلا ہوا زیادہ ک ہے ٹھیک ہو لاک ہی رہتا ہے۔"

"جنازے لوگ ان کو چاہتے ہیں۔ جسے چاہو جنازے کرو۔" انہوں نے چیخ کر کہا۔

سلامہ ایک دوسرے کو دھکا دے کر سب کو باری باری ٹکرانے لگا۔ پھر وہ دونوں رو گئے تھے۔ جازی سب سے آگے تھا۔ جب بہت اچانک سلامہ نے شہریار کو کھینچ کر اپنے آگے سے دھکا دیا تھا۔ شہریار پوری قوت سے گرا تھا۔ دوسری گولی سلامہ کے پہلو میں پیوست ہوئی تھی۔ شہریار گر رہا تھا اور اسی وقت دوسری گولی نے اس کا شانہ مضروب کر دیا تھا۔

جازی چیخا تھا۔ "شہریار بھائی......!"

مگر گاڑی فائرنگ کے بعد رکی نہیں تھی۔

"سلامہ!" شہریار اپنی تکلیف بھول کر سلامہ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جازی فون پر چیختا تھا۔

"گولی لگ گئی ہے۔ آپ جلد عدیل بھائی! اللہ، مجھے آپ کی ضرورت ہے۔"

چند منٹ بعد گاڑی کی مامون عبدالکریم اور عدیل عبدالرحمن پچھلی طرف آئے تھے اور جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا اسے مضبوط اعصاب کے باوجود دہل کر رہ گئے تھے۔ عدیل عبدالرحمن نے کسی بھی زخمی کی [illegible] کے تحت ایمبولینس پہلے ہی کال کر لی تھی اور اب ان کا بھی عمل ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ گولی ان [illegible] اس شوٹنگ میں مضروب ہونے کے بعد سلامہ احسان کے ساتھ ایمبولینس کے ذریعے پولیس ہسپتال بھیج دیا گیا تھا۔ عدیل عبدالرحمن کے کہنے پر [illegible] کی ایمرجنسی تیار [illegible] کے پہنچنے سے پہلے ہی کر دی گئی تھی۔ عدیل عبدالرحمن نے شہریار کو سنبھالا ہوا تھا۔ [illegible] ان کے سینے میں تکلیف ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عدیل عبدالرحمن کی جیپ بہت تیزی سے ہسپتال کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ جازی بار بار شہریار کی طرف دیکھتا اور رو پڑتا۔

"آپ ٹھیک ہیں نا شہریار بھائی؟"

شہریار صرف سر ہلا کر چپ تھا۔

ہسپتال میں سلامہ کا فوراً آپریشن شروع کر دیا گیا تھا۔ شہریار کو بینڈیج کے بعد [illegible] ڈاکٹر باہر آ گئے تھے۔ عدیل عبدالرحمن نے سلامہ کے گھر اس حادثے کی اطلاع

بھیج دی تھی۔

پھر شہریار صبح نیند سے جاگا تو پہلا خیال ملامہ ہی کا آیا تھا۔ وہ بہت تیزی سے اٹھا تھا۔ ڈائننگ روم میں سب سے پہلے جس سے اس کا سامنا ہوا وہ شافعہ تھی۔

"شہریار! ملامہ...... ڈاکٹر اس کے متعلق مجھے کچھ نہیں بتاتے۔ کہتے ہیں معاملہ کافی مشکل ہے، جو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ وہ ملامہ کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تم جانتے ہو اس شہریار جو ہم نہیں سمجھتے میں کتنے گھنٹے ان گھنٹوں میں کتنے منت، دعائیں مانگی ہیں، کتنے سجدے کرتے ہیں۔ میں تو... وہ بہت شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ شہریار! اگر میری ملامہ کو کچھ ہوگیا تو میں...... میں کیا کروں گی؟"

شہریار کو ابھی کے ابھی شرمندگی سے ... ملامہ کی جگہ وہ ڈر گیا تھا۔ ... آرزوؤں کا خون کر دیا تھا اور اس کے لیے مزید کے لیے ... جانے کے لیے ... بھی ختم تھا۔

"شہریار! آر یو آل رائٹ؟" عدیل عبدالرحمن نے اس کا شانہ ہلایا۔ وہ بھی ابھی ڈریسنگ روم سے باہر آ کر کھڑے تھے۔ مگر شہریار کچھ کہے بغیر اسپتال سے نکلتا چلا گیا تھا۔ شام گئے تک اس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ پھر وہ واپس تب آیا جب بہت اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس کے فلیٹ پر ... ہوئی ماں نے دروازہ کھولا تو سامنے عدیل بھائی کھڑے تھے۔

"ملامہ کیسی ہے؟" اس نے سوال کیا اور عدیل بھائی گھورتے ہوئے خاموشی سے اس کے بیڈروم میں آ گئے۔ بیڈروم کی ہر چیز لپٹی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ... سب زمین بوس تھے۔

"یہ سب کیا ہے؟" عدیل عبدالرحمن نے تیز نظر اور سخت لہجے میں پوچھا اور وہ جواب دیے بغیر ... ا۔

"ملامہ ٹھیک ہو گئی ہے بھائی؟"

"تمہیں اس سے کیا مطلب ہے کہ وہ ٹھیک ہو گئی یا نہیں؟"

شہریار خاموش رہا، اسے ٹھیک لگنے سے ڈر لگا تھا۔ اس کے گھر میں ... حد تک بے تابی تھی۔

"تم وہاں سے اسپتال سے کیوں بھاگ آئے تھے شہریار؟"

"وہ...... بس دل ہی نہیں..." وہ مزید کچھ کہنے کے بجائے کھڑکی کا پردہ ہٹانے لگا اور عدیل عبدالرحمن نے اس کی پشت دیکھ کر اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

"تم رونا چاہتے ہو؟"

AANCHAL.COM.PK

شہریار نے پلٹ کر ان کو دیکھا۔ جیسے ان کے بازوؤں سے خود کو چھڑانے کی کوشش بھی نہ کی تھی۔

"تم شانی کے لئے افسردہ ہو؟"

شہریار کی پلکوں میں نمی اترنے لگی۔

"شانی دنیا کی آخری لڑکی تو نہیں ہے یار!"

شہریار کی پلکوں میں آئی نمی رخسار پر پھسلنے لگی۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"رو جانے دو بہت ہو گیا، دل پھٹ جائے گا تمہارا۔" عدیل عبدالرحمٰن نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر کہا۔ کوئی پیار تھا جو تم سے چھپ گیا تھا۔ وہ ان کے سینے سے لگا بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

عدیل عبدالرحمٰن اس کی پشت تھپک رہے تھے اور وہ بیچارگی سے چیخا تھا۔

"میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ مجھ سے بچا کر اسے میں نظر نہیں آیا...... وہ میرے کندھے سے لگ کر ملاحہ کے لئے زار زار رو رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کاش ملاحہ کی جگہ میں ہوتا۔ مجھے وہ نہیں ہی کہیں لگ جاتی۔ کبھی کبھی ہوتی جو میرے دل کے پار بھی ہو جاتی۔ مگر شانی اگر اس طرح میرے سینے سے لگ کر روتی تو مجھے اپنی موت پر افسوس ہوتا۔ مگر اسے میں نظر نہیں آیا عدیل بھائی اسے میں نظر نہیں آیا اور وہ میرے کندھے سے لگ کر ملاحہ کے لئے روتی رہی۔ ملاحہ کے لئے۔ کیا وہ تھی، میری محبت اور عشق کا کیا؟ کیوں؟...... اتنا ہی ہے؟" وہ ان کے بازوؤں میں مچلے جا رہا تھا۔

عدیل عبدالرحمٰن نے بمشکل اسے سنبھالا ہوا تھا اور بیڈ پر بٹھا دیا۔ وہ اس کے کمرے میں ہی رک گئے تھے۔

❀❀❀

ہارون عبدالکریم عدیل عبدالرحمٰن کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ ملائی بچی کے متعلق وہ معلومات دے رہا تھا مگر اس کی ماں کون تھی اس کا سوال ہنوز جواب طلب تھا کیونکہ کسی نے اسے بچی کو چھوڑتے نہیں دیکھا تھا اس لئے زیادہ معاملہ حل ہو گیا تھا۔ [illegible] تھا کہ وہ پیر تک جلد [illegible] سے مسٹر [illegible] کا فون آیا۔ ایک دن [illegible] نے اس عورت کو دیکھنے کی بات [illegible] تھی۔ بات بہت پرانی تھی لیکن اگر وہ عورت اس کے سامنے ہوتی تو وہ اسے پہچان سکتی تھی۔

AANCHAL.COM.PK

عدیل عبدالرحمٰن نے دراز سے تصویر نکالی تھی۔ "یہ دو تصویریں لے جاؤ۔ دیکھو دونوں میں سے کون ہے اس بچی کی ماں؟"

مامون نے تصویریں لفافے میں ڈالیں ضرور مگر وہ اٹھا نہیں تھا۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر خاموش تھا۔

"تم شہریار کے متعلق جاننا چاہتے ہو؟"

مامون نے تشکر آمیز انداز میں عدیل عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا۔ عدیل عبدالرحمٰن نے شفقت سے اس کی طرف دیکھا پھر گہرا سانس لے کر بولے۔

"وہ بہت برے طریقے سے ڈس ہارٹ ہوا ہے۔ شانی نے جس طرح معاملہ الجھا کے اپنی جذباتیت کو ذکی ہے اس بات نے اسے بہت دل گرفتہ کر دیا تھا۔" وہ تھکے ہارے سے بے بسی سے بولے۔ "مجھے سمجھ نہیں آتی ایک انسان جو ساری زندگی صرف دیتا رہتا ہے، جو کبھی اپنے لیے کسی چیز کی ضرورت پر ضد نہیں کرتا۔ قسمت جو دینا چاہتی ہے خاموشی سے رکھ لیتا ہے۔ سنا ہو کرتا ہے، وہ شعور صرف وہی شخص زندگی کی ہر خوشی سے کیوں خارج رکھا جاتا ہے؟ آخر کیا قصور ہے میرے بھائی کا۔ اگر وہ پڑھ لکھ کر حد تک اچھا ہے۔ کیوں زندگی اس کے ہاتھ سے سب کچھ چھین لینا چاہتی ہے؟ خوشیاں، محبت، کیا اس کا ان چیزوں پر کوئی حق نہیں ہے؟ مامون ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

مامون عبدالکریم نے ان کی طرف دیکھا پھر دل گرفتگی سے بولے۔

"جو لوگ ایثار کرتے ہیں، زندگی دیکھنا چاہتی ہے وہ کس حد تک ایثار کر سکتے ہیں۔ انسان سب کچھ قربان کر سکتا ہے لیکن اپنی محبت کسی کے لیے قربان کر دینا بہت آسان ہے۔ اور ہمارا شہری اسے مشکل کام کرنے کی اتنی عادت ہے کہ پھر قسمت بار رکھتی ہے وہ نہیں۔ مرا شہریار کے دل کی محبت کسی کی زندگی اسے ضرور لے گی۔ محبت تبھی بے اثر نہیں ہو سکتی کہ دوسرے دل پر اثر چھوڑے بغیر گزر جائے۔"

"لیکن اگر یہ اثر وقت سے کسی فیصلے میں بہت دیر تک روک لیا گیا، اگر یہ فیصلہ بھی قسمت پر بھی محفوظ کر لیا گیا اور فیصلے کا اعلان نہیں کیا گیا تو...... تو میرے شہریار کے دل پر یہ دکھ مرہم کون سا لگا سکے گا۔ تم نہیں جانتے مگر میں نے دیکھے ہیں اس کے آنسو جو تڑپ تڑپ کر اس کا دل، اگر شانی نے اس سے یہ نہیں کہا کہ وہ سارہ سے نہیں اس سے محبت کرتی ہے تو وہ بھی نہیں پائے گا اور اپنے بھائی کو بھی اپنے سامنے..... مامون ایسا برداشت نہیں کر سکتا۔ کاش کوئی حل ہوتا۔ کاش اس بچے کی بخشش کو میں اپنے حساب میں بدل کر سکتا۔"

"مرا ہم جب سے مجبور ہو جاتے ہیں، تبھی تو ہمیں خدا یاد آتا ہے۔"

"مامون! کیا میرے خدا کو بھی میرے بھائی پر رحم نہیں آتا؟ کیا وہ اسے زندگی کے مارے دکھوں کے ازالے کے لیے شافی نہیں بنا کر سکتا؟ ایک صرف شافی؟"

مامون عبدالکریم نے پہلی بار ہاں سے ہٹ کر، چھوٹے بھائی کی طرح انہیں اپنے بازوؤں میں کھینچ لیا تھا۔ پھر بھرائے لہجے میں بولا تھا۔ "میں آپ کے جذبات اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں عدیل بھائی! لیکن کہتے ہیں ناں اگر وہ کسی سے کوئی چیز چھینتا ہے تو اس کے بدلے کوئی اور نعم البدل بھی دے سکتا ہے۔ اور ہم جن کی جانے والی خوشی یا چیز کے بدلے ان کے نامہ اعمال میں بہت ڈھیر سارا اجر اور نیکی لکھ دیتا ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ ان کی نیکی ہمیں کہاں، کس مقام، کس گہری کھائی میں گرنے سے بچا لیتی ہے۔"

عدیل عبدالرحمٰن نے خالی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر بھرائے لہجے میں بولے۔ "نیکی...... میرے شہریار نے ساری عمر نیکی کمانے کے سوا کیا ہی کیا ہے۔ پھر بھی ان کا دامن...... ان کا خالی دامن دیکھ کر میرا دل دہلنے لگتا ہے۔"

مامون عبدالکریم کچھ نہیں بولا۔ ان کی پشت تھپکتا رہا۔ عدیل عبدالرحمٰن کا موڈ معمول پر آیا۔

جلد ہی وہ معمول کے مطابق کارروائی میں گم تھے۔ آدھے گھنٹے بعد وہاں پانی لازمہ سے مل چکا تھا۔ وہ جم خانہ کے گھر میں پارٹی میں کھینچی گئی تصویر تھی۔ مازنہ نفوس کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کے لب ہلے تھے۔

"وہ پہلی ہی تھی ماما جی۔ بہت سال پہلے کی بات ہے لیکن وہ بچی ہی تھی۔ بڑی نفیس اور بہت خوب صورت تھی۔ اب اس لڑکی میں کتنی تبدیلی آ گئی ہے کہ خود شاک ہوئی ہیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموشی سے سائڈ کا اپنا خانہ ایک طرف کر کے گھر چلا گیا۔ عدیل عبدالرحمٰن یہاں رشنی بانی کی بہت حوصلے سے دینی کی خوشی جانے کی اطلاع پا گئے تھے۔

"مرا وہ بچی تو مسٹر کی ہی ہے۔ رشنی بانی کو اس بات کی وار نے بچانے سے انکار کر دیا۔"

عدیل عبدالرحمٰن سر ہلا کر روم کے باہر کھڑے رہے تھے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹرز کی ٹیم باہر آ گئی۔ پھر معلومات شیئر کرنے لگی۔

"آپ وہ بہت بہتر ہیں۔ بہت مزید گفتگو کرنے کے قابل ہیں۔ جو کو جانا چاہتے ہیں وہ جا سکتے ہیں۔"

عدیل عبدالرحمٰن، مامون عبدالکریم کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ رشنی بانی نے انہیں دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔

"میں نے سنا ہے تم ابھی تک میری بہن کے قاتل کو گرفتار نہیں کر سکے......" لمحہ بھر رکی، پھر بولی۔ "میں پہلے جانتی تھی اسے گرفتار کرنے کے لیے دس قتل کے بھی گواہ ہوں تم تب بھی اسے گرفتار نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے بڑے بڑے لوگوں سے اتنے گہرے تعلقات ہیں کہ کوئی اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔ وہ سر عام بھی قتل کر دے تب بھی تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم کچھ نہیں کر سکتے۔ اب میں نے سچ بولا ہے تب بھی تم مجبور ہو۔"

عدیل عبدالرحمن نے رشی مائی کی طرف دیکھا، پھر آہستگی سے بولے۔ "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ صرف جھوٹ ہے، وگرنہ میں کسی بھی لمحے اسے ایک مجبور کیڑے مکوڑے کی طرح گرفتار کر سکتا ہوں۔ لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔" لمحہ بھر رک کے پھر آہستگی سے بولے۔ "جو بیان آپ کی زبان سے بیان ریکارڈ کیا تھا وہ حرف بہ حرف درست ہے تو پلیز اس پر دستخط کر دیجئے۔" انہوں نے وہ بیان کی کاپیاں لیے لفافہ نکال کر سعد سان کے سامنے رکھیں اور رشی مائی نے بناچوں چرا اس پر دستخط کر دیئے۔ پھر آہستگی سے بولی۔

"میں نے جلد رن ہوم کا پتہ غلط بتایا تھا، پتہ نہیں مجھے یہ کیوں لگتا تھا کہ اگر میں نے صحیح پتہ بتا دیا تو میں آپ کے لیے غیر ضروری ہو جاؤں گی اور آپ اس شخص کی طاقت کے آگے میری مظلوم بہن اور مظلوم انسان کے قتل کا کیس داخل دفتر کر دیں گے۔ اگر میں آپ کے لیے معلومات دینے کے لحاظ سے کارگر رہی تو ہی آپ مجھ سے رابطہ رکھیں گے اور تبھی میں آپ سے التجا کر سکوں گی کہ بے گناہوں کا قتل معاف کر دینے والے بھی قاتل سے کم نہیں ہوتے۔"

عدیل عبدالرحمن نے ایک لفظ نہیں کہا، نرم سے سعد سان کا کندھا تھپتھپاتے رہے۔ "آپ بے فکر رہیں، آپ میرے لیے قابل احترام ہیں۔ آپ ٹھیک ہو جائیں تو آپ کا بندوبست نیلم خانم نے اپنے گھر میں کر رکھا ہے، بلکہ آپ کے سارے علاج کی ذمہ داری بھی انہوں نے ہی اٹھا رکھی ہے۔"

"خانم...... وہ جنتی عورت ہے۔ میں ساری عمر اس لڑکی کا احسان نہیں اتار سکتی۔" رشی مائی نے گہرا سانس لیا، پھر آہستگی سے بولی۔ "جانے کا شیرازی سے ایک بیٹا تھا۔" جلد رن ہوم کا پتہ بتا چکی تو پھر سے دکھ سے بولی۔ "شیرازی...... وہ بھی ایک لڑکا ہی تھا۔ ہمارے ہی محلے کا تھا لیکن بہت نیک خصلت، میرا ایک کام نگار کوشش کے باوجود اس کے اندر ہمارے محلے کی ایک بھی خصلت نہیں آ سکی تھی۔ وہ عورت کی عزت کرتا تھا۔ یہی بات مجھے اس کو عزیز رکھنے کے لیے کافی تھی۔ وہ مجھے مائی کہتا تھا۔ پڑھا لکھا تھا۔ کچھ کچھ دنیا سے سیکھ گیا تھا۔ ایک بار میں بہت بیمار پڑ گئی تھی، تب اس نے ایک تعویذ میرے گلے میں ڈالا تھا، کہتا تھا تعویذ جانے نے اسے بڑے پیر صاحب کے دربار سے لا کر دیا تھا کہتی تھی، جب تک یہ تیرے گلے میں رہے گا تیری حفاظت ہوتی رہے گی۔ پر میں پگلی اس کی اس بات کو

کبھی نہیں اور یہی وہ تعویذ کا دیا تھا کہ......" مائی زلیخی رونے لگی اور عدیل عبدالرحمٰن نے جان لیا کہ مائی زلیخی اس وقت عقل سے زیادہ صرف اندر کے جذبات میں بہنے لگی ہیں وہ اگر ایک غیر ضروری معاملہ بیچ میں نہ لے آتیں ما ایک لمحے کو انہوں نے تو جسم سے دیکھا پھر نرمی سے بولے۔

"مائی زلیخی! کیا جانا نہ کے بچے کے گلے میں وہ تعویذ ڈالا جائے تم نے وہ جو پانی کا ان کے ذکر پہ تجسس ہیں یا وایا؟"

وہ نفی میں سر ہلانے لگی پھر آہستگی سے بولی۔ "پتہ نہیں کیوں، مجھے شیراز تو نہیں سمجھا۔ جب جانا شیراز کا نام لے کر وہ جو میرے اندر اس سے زیادہ وہ گمان بیٹھتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ اگر میں وہ تعویذ بچے کے گلے میں ڈال دیتی تو اس کی حفاظت ہو رہی تھی۔ تمہاری ماں بھی نہیں وہ بچہ یہاں ہوگا اور یہ تعویذ...... یہ میرے گھٹنے میں پڑا ہے۔ عجیب طرح کی خود غرضی آگئی تھی اس لمحے مجھ میں۔ میں نے بچے کو چھوڑ کر اپنی حفاظت کو سوچا اور بس وہیں مار کھا گئی ایک عام عورت سے بے وقوف"

عدیل عبدالرحمٰن نے پھر سے اسے جسم سے دیکھا اس کے سر پہ ہاتھ رکھا پھر نرمی سے بولے "مائی زلیخی یہ صرف تمہاری سوچ تھی۔ جو طے ہے زندگی اور موت یہ سب پہلے سے لکھی ہوئی ہیں۔ جس نے جب جیسے جانا ہے وہ سب طے ہے۔ کوئی حیلہ بہانہ ہم روہ اس وقت تک ہی کو سہارا سکتا ہے جب تک حکم کا فیصلہ نہ آ جائے اور جب اوپر سرکار سے فیصلہ آ جائے تو پھر کوئی کسی کو روک نہیں سکتا۔ یہ تمہاری محبت تھی کہ تم نے اس تعویذ کو اتنی اہمیت دی اس کے بارے میں ایسا سوچا۔"

ماسون عبدالکریم کو جانے ان جملوں سے اچانک کیا ہوا تھا وہ بہت تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

عدیل عبدالرحمٰن نے اس کے جانے کو غور سے دیکھا تھا پھر مزید قطعیں سے وہ باہر آگئے اور وہ بہت غیر متوقع طور پہ گراؤنڈ میں کھڑا ڈیوٹی اسموکنگ کر رہا تھا۔

"کیا ہے مسٹر ماسون! ڈیوٹی کے خلاف اور وہ بھی اسموکنگ۔ آپ اسموکنگ کب سے کرنے لگے؟"

"کبھی کبھی سر! جب بہت شدید ذہنی ٹینشن ہو جاتا ہوں تو......"

"میں پوچھ سکتا ہوں آپ اس وقت کس بات سے ٹینس ہو گئے تھے؟" عدیل عبدالرحمٰن کا لہجہ سخت اور ترش تھا۔

ماسون عبدالکریم نے ایک نظر ان کے چہرے کی طرف دیکھا پھر بہت ٹینس لہجے میں بولا۔ "سب کچھ پہلے سے لکھا ہوا ہے سر! تو پھر کوئی چاہے کہ وہ جس سے محبت کرتا ہے وہ تمام عمر اس کا رہے

بند تس میں جکڑ کر کے کہ کوئی کوشش کامیاب نہ ہونے دے۔ ہمیں کہ بچھڑنے کی تو سر! یہ لازمی ہے۔ یہی۔ لیکن اگر میرا دل چاہے، وہ منظر کبھی بھی آئے لیکن وہ منظر...... بچھڑنے کا وہ منظر میری زندگی کے کنارے سے سمٹ کر میری بے بسی کے دائرہ اختیار میں نہ آئے تو سر! کوئی دل گرفتہ کیا کرے؟ کسی کو صبر کی تاکید کرنا آسان ہے سر! لیکن وہ صبر کا مقام ہماری زندگی میں بھی رائٹ ٹائم پر آئے تو ہمیں وقت سے شکوہ ہو جاتا ہے سر! اور...... اور پل میں اس احساس سے دل گرفتہ ہو گیا تھا سر! کیا ہم آن ڈیوٹی کسی فیملی کا سوگ بھی نہیں کر سکتے؟"

"ہامون! کوئی خاص بات؟" عدیل عبدالرحمٰن نے اس بار نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا تو اس کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔

"میری ماں کی طبیعت آج کل خراب ہے سر! ان کے نئے ٹیسٹ کی رپورٹ آگئی ہے اور ڈاکٹر ان کے بائی پاس کی بات کر رہے ہیں۔ اور آپریشن دل کا ہو تو سر! سو فیصد گڈ چانس پر بھی دل کانپ سی جاتا ہے سر! اور میں بھی آج کل ایسے ہی ذہنی کرب سے گزر رہا ہوں۔ میں ذہنی طور پر چاہ کر بھی کسی بھی ناگہانی خبر کے لیے خود کو تیار نہیں پاتا سر! خود مر جانا کتنا آسان لگتا ہے نا، لیکن ہم جن سے محبت کریں، ان کے بارے میں خواب میں بھی کچھ ایسا دیکھ لیں تو پھر کئی منٹوں تک ہمیں نیند نہیں آتی جیسے جڑ سی ہو گئی ہے۔"

عدیل عبدالرحمٰن نے کچھ نہیں کہا تھا اور خاموشی سے چلڈرن ہوم کا پتہ لے کر باہر نکل گئے تھے۔ مگر سارے ریکارڈ کھنگال لینے پر بھی انہیں جانانہ کے بیٹے کے بارے میں کوئی کلیو نہیں ملا تھا۔ جو بچے ایڈاپٹ کیے گئے تھے، ان بچوں کے متعلق بھی یقین سے یہ کہنا کہ ان میں سے کوئی بچہ جانانہ کا بیٹا ہو سکتا ہے، ناممکن تھا۔ پرانا اسٹاف اکثر جا چکا تھا یا وقت گزرنے کی وجہ سے اپنی یادداشت پر بھروسہ نہیں کر پا رہے تھے۔ اور جو تھے وہ اپنے کام سے اتنے بیزار تھے کہ ان کی مدد کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ ایک ہی جواب تھا "ہم نہیں جانتے۔ ان برسوں میں لاکھوں نہیں تو ہزاروں اور ہزاروں نہیں تو سینکڑوں بچے چلڈرن ہوم میں آتے تھے، پھر کسی خاص یا مخصوص نشانی کے بنا یہ معلوم کرنا کہ وہ بچہ کون ہے، یہ احمقانہ سوال ہے۔" عدیل عبدالرحمٰن بھی اس جواب کی صحت پر یقین رکھتے تھے سو ناکام ہو کر واپس لوٹ آئے تھے۔

❀❀❀

تیمور کی آنکھ کھلی تو کمرے میں لیمپ کی ہلکی روشنی جگمگا رہی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ نو بجے کا سویا ہوا آٹھ بجے جاگا تھا۔ پھر اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اچانک ایک دم سے لائٹ آن ہو گئی۔ عدیل عبدالرحمٰن دو کپ لیے کھڑے تھے۔

”کافی میرے خیال میں، میں نے تمہیں ڈسٹرب نہیں کیا بھیا جان؟“

وہ مسکرا کر اٹھ بیٹھا، پھر پھیکے سے لہجے میں بولا۔

”بڑے بھیا! آپ بھی ناں، اتنی محبتیں دیتے ہیں اور پھر اس بات پر بھی مصر رہتے ہیں کہ کوئی آپ کی شان میں قصیدہ بھی نہ پڑھے۔“

عدیل عبدالرحمن ہنستے ہوئے اس کے بیڈ پر بیٹھ گئے، پھر شرارت سے بولے۔ ”بیٹا! یہ بھی حفظ ماتقدم ہے۔ ورنہ تم نے شاہی دربار میں قصیدے کی پذیرائی پر کوئی بڑی چیز مانگ لی تو؟ بعد میں وعدے سے تو مکرنے سے رہا ناں۔ ویسے تم موقع ملنے پر کیا مانگتے؟“

اس نے کافی کے بھاپ اڑاتے کپ کو ہونٹوں سے لگایا، پھر گہرے لہجے میں بولا۔ ”شانی اور زندگی۔ مگر آپ واقعی دونوں چیزیں دینے میں ناکام رہتے۔“

عدیل عبدالرحمن کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا۔ انہوں نے کپ تپائی پر رکھ دیا، پھر اسے کندھوں سے تھام کر بولے۔ ”تم اسے بھول نہیں سکتے شیری؟ محبت کو ایک اور چانس دو گے ناں خود کو؟“

وہ ہنسنے لگا۔ بے ساختہ ہنسی رکی تو اس کی آنکھیں پانی سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔

”محبت کو ایک چانس اور دوں، زندگی کو مگر کس زندگی کو؟ کیا واقعی اس ہتھیلی میں یہ لکیر لکھی ہے؟ بڑے بھیا! خوش گمانی سے باہر نکلئے۔ یہاں زندگی نہیں ہے اور آپ ایک محبت کا چانس اور لینے کی بات کر رہے ہیں۔“ وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر گہرا سانس لے کر بولا۔ ”اچھا ہی ہوا ناں بڑے بھیا! شانی کی زندگی میں، میں پلٹ کر نہیں گیا۔ اگر واقعی وہ میری محبت میں مبتلا ہو جاتی تو خواہ مخواہ جاتے جاتے بھی بھاری رہتا کہ میں کیا ہوں جو ساتھ لے جا سکتا ہوں اور کیا ہے جو میں نہیں لے جا پا رہا۔ بڑے بھیا! محبت بہت ظالم ہے۔ یہ جب بھی کسی دلربا لمحے سے رہا ہوتی ہے ناں تو پیچھے سے ہمارا دل لے لیتی ہے۔ ہمارے دل کو مسخ کر لیتی ہے، پھر اپنی ناخنوں سے ہمیں ستاتی رہتی ہے، ہر فرمائش پر کہتی ہے کہ اس سے محبت زیادہ پاور فل ہو جائے گی۔ مگر جانے کب کھلتا ہے محبت خود طاقت ور ہو جاتی ہے اور ہمیں کمزور کر دیتی ہے۔ اور میں خوش ہوں، میری محبت نے صرف میرا دل مسخ کیا، شانی کو محبت دی اور یہ بھی چاہت کرنے والے جانتے ہیں محبوب کو خوش دیکھ کر دل کتنی انوکھی خوشی محسوس کرتا ہے۔“

عدیل عبدالرحمن گم صم بیٹھے تھے۔ انہوں نے احتیاطاً کوئی ردعمل نہیں دیا تھا اور بہت دیر بعد بولے تھے۔ ”کافی پی لو تو ہم سوا سے ملنے ہاسپٹل چلیں گے۔ تمہارے زخم کی بینڈیج بھی کروانی ہے۔“

وہ خاموشی سے کپڑے لے کر واش روم میں گھس گیا تھا۔ دس منٹ بعد وہ ان کے ساتھ جیپ میں بیٹھا تھا اور عدیل عبدالرحمن بھرائے لہجے میں بولے تھے۔

"مسعود کی بیٹی کلائنٹ کی بنی ہے ہم نے۔ تمہیں پتہ ہے، وہ بچی کہاں ہے؟"

شہریار نے رابطہ کیا اور جب جواب ملا تو حیران رہ گیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو......" اس نے ادھورا جملہ کہا اور عدیل عبدالرحمٰن تھکے ہوئے سے بولے۔ "تمہیں پتہ ہے، جانتا کس کی بیٹی ہے؟" لمحہ بھر رک کے پھر گویا ہوئے۔ "میں نے پتا نے ریکارڈ کھنگالے ہیں وہ شبنم عاقب کی بیٹی کہاں ہے، یہ سوال اب اولین سوال نہیں ہے۔" عدیل عبدالرحمٰن تفصیل بتانے لگے اور وہ تحسین آمیز انداز میں انہیں دیکھتا گیا۔

"آپ نے تو کمال ہی کر دیا، لینڈ مافیا والوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ آپ وہاں تک کیسے پہنچ گئے؟"

عدیل عبدالرحمٰن مسکرائے پھر بولے سے بولے۔ "میں اتنی دور چلا گیا تو رابعہ کا کیا ہوگا جانِ من؟"

"بڑے بھیا! فریب کی نظر چیک کروا لیجئے، میں اور جانِ من؟ کیوں مذاق کرنے لگے ہیں؟"

"بکواس۔ تمہیں کیا پتہ تم کتنے عزیز ہو مجھے، اگر اختیار ہوتا تو تمہیں گود لے لیتا۔"

"آپ بھی تو ایسا ہی ہے بڑے بھیا!" اس نے ان کے کندھے سے سر ٹکا دیا پھر اندر دافعتی میں سے کہہ... "آپ کی محبت میرے لئے طاقت کی طرح ہے۔ آپ میرے ساتھ ہوتے ہیں تو مجھے لگتا ہے، میں کچھ نہیں ہار سکتا۔"

عدیل بھائی اس کو دیکھنے لگے اور وہ ایک دم یاد آنے پر سیدھا ہو کر بولا۔ "وہ تھوڑے پہلے میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا تو میں نے ممّا کو ایک بات کرتے سنا تھا۔ کیا یہ بات سچ ہے بڑے بھیا؟"

عدیل عبدالرحمٰن نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کون سی بات؟" وہ واقعی نہیں سمجھے تھے اور وہ ان کے کندھے سے سر اٹھا کر بولا۔

"پچھلے عرصے کی آبادی میں اضافے کی خبر۔ ... میں تو شوق سے پاگل ہی ہو گیا تھا... دونوں تو تمہیں میری طرف سے قطعی بے خبر تھیں۔ آپ تو جانتے ہیں ہم جہاں جاتے ہیں بڑی خاموشی سے جاتے ہیں۔ بڑے بھیا! پچھلی بات... عدیل جعفر کا حوالہ بہت لیٹ ملا آپ نے اکلوتی بیٹی قتل ہو گئی ہے۔"

عدیل عبدالرحمن ہنس دیے اور شہریار کو چھیڑنے لگے۔ "واہ.....آپ تو مشرقی لڑکی کی طرح شرمانے بھی لگے ہیں، بڑے ہو کے ہی سہی آپ کو سمجھ آئی۔"

"شہریار! بچو گے اب تم۔ میں یہ بھول جاؤں گا کہ تم زخمی ہو۔"

"آپ بھی کبھی کبھی نہ بچہ ہی سمجھتے ہیں کہ میں شہریار ہوں، آپ کا سب سے لاڈلا بھائی۔"

عدیل نے مسکرا کر گہری نظروں سے اسے دیکھا پھر مصنوعی خفگی سے بولے۔ "تم مجھے بھی تم جیسا سمجھتے ہو، بات بدل کر کیا سمجھتے ہو مجھ سے میری نظر ہٹا سکتے ہو؟ یہ تمہاری بھول ہے۔"

"بھول ہی سہی مگر سب بچے رہتے ہیں استاد جی کی طرح میری ایسی کوئی بھول مجھ تک نہیں آئے گی۔"

"شہریار.....! تم کچھ دکھ سے دوچار نہیں ہو؟"

"میں تو شروع سے ہی دکھی ہوں، بس کوئی اس بات کا اندازہ نہیں کرتا۔" اس نے کہا اور اٹھنے کی کوشش کی لیکن تکلیف کی وجہ سے بازو اس نے فوراً ہی ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔

"بہت زیادہ درد ہو رہا ہے؟" عدیل بھائی کے چہرے پہ غم آ گیا اور وہ بے حد سنجیدہ ہو کے بولے۔

"بہت کچھ ہو رہا ہے اندر، صبح سے بھوکا ہوں اور آپ نے صرف کافی پلا دی ہے۔ مجھے اس بات کا غم کھائے جا رہا ہے۔"

عدیل بھائی نے مسکرا کر جیب ٹٹولی، اس کے لیے چکن ونگز کا آرڈر بھیجا، وہ کمرے سے باہر جانے ہی والے تھے کہ دروازہ کھلا، شہریار نے اندر داخل ہونے والوں میں سب سے پہلے عاطف بیگ پر اس کی نظر ٹھہر گئی تھی۔

"تم.....ابھی تک گئے نہیں؟"

عاطف بیگ سونیا کے ساتھ کھڑا تھا، اس کے چہرے کے اندر کوئی لفظ تھا کوئی شرمندگی، وہ جو کہنا چاہتا تھا کہہ نہیں پا رہا تھا، وہ بالکل خاموش کھڑا تھا۔

"کیا ہوا، بتایا بھی نہیں، شادی سے پہلے ہی سونیا نے اپنی پسند بدل دی ہے کیا؟"

"پلیز شہری بھائی، ایسا تو نہ کہیں۔"

AANCHAL.COM.PK

"تو پھر کیا کہوں، Sis؟" وہ شوخ ہوا۔ عاطف بیگ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا اور پھر بند کر لیا۔ "کتنے دن کے لئے آیا ہے؟"

"ہمیشہ کے لئے۔"

"کیا مطلب؟" شہریار واقعی حیران ہو گیا تھا۔ تب اس نے کہا۔

"تم دونوں کیا لے کر بیٹھے ہو۔ عمر کے مارنے سے فرصت کب ملتی ہے؟ میں نے سوچا میں تو بھاگ دوڑ ہی میں تھک جاؤں گا سو کراچی ہی شفٹ ہو جاؤں گا۔ یہاں زکریا بھائی کے کراچی کے بزنس کی دیکھ بھال کروں گا۔ امی میرے ساتھ رہیں گی۔ بہنوں کی تو شادیاں ہو گئی ہیں [illegible] اب ہم دونوں بھائیوں میں تھوڑی تھوڑی بہت ساری محبت کے ساتھ تقسیم ہو گئی ہیں۔"

"سونیا کا بتایا تو نے انہیں؟" شہریار نے سوال کیا اور وہ ہنس کر رہ گیا۔

"مجھے کیا لگتا ہے ان کے بغیر میں کوئی فیصلہ لے سکتا ہوں؟ ہاں بس ان کا فیصلہ اپنے حق میں کرنے کے لئے تھوڑی بہت بلیک میلنگ کرنی پڑی تھی۔"

"خبیث...... خود غرض بات؟" شہریار نے اس کے بال مٹھی میں پکڑ کر جھٹکے دئیے اور وہ قہقہہ لگا کر ہنسی کرتا رہا۔

"بہت زیادہ بلیک میلنگ کرنی پڑی تھی۔ پہلے تو زکریا بھائی بھی نہیں مان رہے تھے۔ لیکن جب فیملی کی کہانیاں سنائیں [illegible] کی دھمکی دی تو امی اور زکریا بھائی مان گئے۔"

"حالانکہ اگر وہ [illegible] خود کشی کی کوشش کا سبب [illegible] کی حیثیت سے زیادہ بھی تھی۔"

"خبیث...... تو لگتا ہے میری ناخن کے چاول کھانے کے لئے تیاری بیٹھا ہے۔" اس نے غلطی سے اس کے کندھے پر مکا جڑ دیا جس پر زخم تھا۔ سو شہریار "اوف" کی آواز کے ساتھ دوہرا ہو گیا تھا۔

"شہریار...... سوری یار، مجھے تو نہیں معلوم تھا۔"

شہریار نے تکلیف سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا پھر ہونٹ بھینچ کر بولا۔ "ویسے یہ معلوم کرنے کا کون سا اچھا طریقہ تھا؟"

سونیا عاطف کو دونوں طرح سے واقف رہی تھی اور شہریار سے بے قراری سے پوچھ رہی تھی کیا سے تکلیف زیادہ تو نہیں ہے؟

وہ معاف کر چکا تھا۔ پھر آگے کر کے کھینچ عاطف کے قریب سے گزرتا شرارت سے بولا۔ "اچھا بھائی زندہ رہو [illegible] بہت بڑی ہے......"

"بہنیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

شہریار نے زور سے قہقہہ لگایا تھا مگر یکدم سنجیدہ ہو کر اٹھا کیونکہ بہت زبردست ٹیس اٹھی تھی۔ پھر عاطف اور سونیا اس کے قریب کھڑے تھے، جب اس کی شرٹ اتاری گئی۔ سونیا کے ساتھ خود عاطف کی بھی اس کی تکلیف سے آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ اس کی بینڈیج خون سے بھر گئی تھی اور عاطف کے مردانہ ہاتھوں کی طاقت کی وجہ سے ٹانکے پھر سے رسنے لگے تھے۔

"ٹانکے دوبارہ لگانے پڑیں گے۔" ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کا یہ خون کیسے نکلا؟" ڈاکٹر نے پھر سوال کیا اور شہریار، عاطف کو دیکھ کر مسکرا کر بولا۔

"بس بھائی نے محبت کا مظاہرہ کیا تھا اس لیے۔"

"مسٹر عاطف! آپ نے کیئرلیس کیا آپ؟"

شہریار نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ خنجر کا بھاگا نکالا گیا تھا۔ زخم کی صفائی کے بعد سرے سے ٹانکے لگے تھے۔ شہریار کا چہرہ تکلیف سے سرخ ہو گیا تھا گو اس نے ہلکی سی کراہ بھی نہیں نکالی تھی۔ عاطف اس کی طرف سے پشت کر کے کھڑا تھا۔ سونیا روم سے ہی باہر نکل گئی تھی۔ ڈاکٹر کام ختم کر کے گیا تو شہریار کو شرٹ پہنانے میں عاطف نے پوری تابعداری سے محبت نبھائی۔

ڈاکٹر کمرے سے چلا گیا تو شہریار نے اسے دیکھ کر کہا۔ "معاملہ کیسا ہے؟"

"پہلے سے بہت بہتر ہے۔ اب بخار سے ہوش بھی آ گیا ہے۔"

شہریار نے کچھ اور پوچھنے کے لیے ہونٹ کھولے اور بند کر لیے۔ عاطف ایک ڈائیاں تمام جذبات اس کے اندر ہی دب کر رہ گئے۔ دوسرے دن ابیل جانے میں بھی خاموش پڑی تھی، وہ اس کے جذبوں پر آ گئی۔

"معاملہ تمہارا ٹھیک ہے مگر یہ بتاؤ ان کی اُنی کیوں ڈر رہی ہے؟"

"کیا مطلب؟" شہریار نے انجان بن کر اسے دیکھا۔ پھر مخصوص لہجے میں بولا۔ "بھئی دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں میرے بھائی! بس اس لیے۔"

"بس اس لیے اور تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا؟" عاطف بیگ نے اسے عجیب نظروں سے گھورتے ہوئے کلائی تھام لی اس نے پوچھا۔ عاطف رو دیا۔

"خیریت؟ ڈرو مت کہ تمہیں اب کلائی مروڑ دینی چاہیے۔ سونیا کی کلائی کا چانس دو بار۔"

"تم نے بھی "کوئی ان" میں ایک دفعہ شافی کا ذکر بہت دل سے کیا تھا۔"

"میں تو ہر ایک کا ذکر بہت دل سے کرتا ہوں۔ ویسے اس دن یہ بات کنفرم ہو گئی تھی کہ میں نے اس کا ذکر جسٹ فار جوکنگ کیا تھا یار......"

"یہ صرف مذاق ہے جو تمہارے والٹ میں اس کی تصویر کیا کر رہی ہے؟ میں نے خود تمہارے والٹ میں یہ تصویر دیکھی ہے۔"

شہریار کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ بینا لنک والا منظر پھر سے ذہن میں آ گیا تھا۔ اس نے پہلی فرصت میں تصویر والٹ سے نکال کر رکھنے کا عندیہ دیا تھا شاید۔ یہ کیا کہ مرنے کے بعد آپ یکدم ہی ایکسپوز ہو جاتے ہیں۔

عاطف بیگ اس کی سوچتی آنکھوں کے حصار میں اس کے قریب آ گیا تھا پھر ذرا پیچھے ہٹ کر بولا۔ "کیا والٹ سے تصویر نکال دینے سے وہ تمہارے دل سے بھی نکل جائے گی؟"

شہریار کھڑے ہوئے سے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ "تم کیا سننا چاہتے ہو مجھ سے؟" اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

عاطف بیگ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا پھر سنجیدگی سے بولا۔ "تم وہی کیوں نہیں کہتے کہ جو سچ ہے۔ اور سچ یہی ہے کہ تم شافی سے بے پناہ محبت کرتے ہو۔"

شہریار نے گہرا سانس لیا پھر خالی لہجے میں بولا۔ "اگر مجھے کمزور ہو کر، رنجیدہ ہو کر کہانی میں کوئی شکست آ جانا ہے تو میں بہت دفعہ ہار چکا ہوں۔"

"پھر تم بھی اسی دور کی طرح ایثار پسندی کا مظاہرہ کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟"

"کیسی ایثار پسندی؟ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں پھر میں خواہ مخواہ ہی انٹری کیوں دوں؟"

عاطف نے پھر کچھ نہیں کہا تھا اور وہ دونوں باہر آ گئے تھے۔ پھر حامد کے کمرے میں وہ دونوں ایک ساتھ داخل ہوئے تھے۔

"کیسے ہو شہزادہ جوان؟" عاطف نے مسکرا کر شوخ لہجے میں پوچھا اور حامد نے شہریار کی طرف دیکھا۔

"تم کیسے ہو شیریں؟ بے ہوش ہوتے وقت میرے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا کہ پتہ نہیں میں تمہیں ریسکیو کر سکا ہوں یا نہیں؟ شکر ہے میں ناکام نہیں رہا۔"

شہریار اس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا پھر ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "اگر تم میری وجہ سے کچھ ہو جاتا تو میں شاید کبھی خود کو معاف نہیں کر پاتا۔"

AANCHAL.COM.PK

"بہت ہی جتنی محبت کے تم قابل ہوتا تو میں ابھی تمہارے کام بھی چھین لیتا۔"

عاطف دونوں کو دیکھتا ہوا کچھ بیزاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے شرارت سے بولا۔ "چھوڑ بے بس سنانی افسانے کا خیال ترک کر دو بچے۔ یہاں لیلیٰ مجنوں کا سوپ اوپیرا چل رہا ہے۔ ہم دونوں شاید کرے میں اضافی کرداروں کی طرح لگ رہے ہیں۔"

شہریار نے عاطف کو جھنپ کر ہاتھ جڑا ہوا تھا اور شانی معاملے کے لئے سوپ نکالنے لگی تھی۔ شہریار کچھ دیر تک بیٹھا پھر عاطف کو چھوڑ کر وہ باہر آ گیا۔ اپنی کار کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اس کے موبائل پر بیپ ہوئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور تیز تیز سانسوں کی آواز اس کے دل میں برچھی سی چل گئی۔ وہ خاموش تھی مگر اس میں جذبہ بولتا تھا۔ یہ کال اسے کافی دنوں سے ستا رہی تھی۔

"کون ہیں آپ؟ اور مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟"

"شہریار کیا تم مجھ سے مل سکتے ہو؟" پہلی بار نسوانی سانسیں لفظوں سے پُر ہوئی تھیں۔

"کون۔۔۔۔۔کون ہیں آپ؟" اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کیا یہ وہی آواز ہے جو وہ سمجھتا تھا؟ کیسی ہی آواز سنتی ہی وہ ٹھٹکی پھر اچانک۔۔۔۔۔

"کہاں ملنے آؤں؟" وہ بے تابی سے پوچھا۔ وہ آواز اسے ملنے کا راستہ سمجھانے لگی۔

وہ آدھے گھنٹے بعد اس سے ملنے پارک میں پہنچا تھا۔ بہت کمزور سی وہ لڑکی۔۔۔۔۔ بیک وقت بہت سارے جذبات سے گھیر گیا۔

"تم۔۔۔۔۔تم زندہ ہو؟" حیرت ایک ایک لفظ سے ٹپک رہی تھی۔

سامنے بیٹھی لڑکی کی آنکھوں میں سیلاب آ گیا تھا۔ "میں نے دنیا میں کوئی کام اچھا نہیں کیا لیکن سب سے برا کام جو میرے اعمال نامے میں لکھا جا چکا ہے وہ تمہاری بیوی سے کھیلنا تھا۔ شاید اسی کی سزا ملی ہے مجھے جو میں آج۔۔۔۔۔"

"پلیز وجیہہ ایسی باتیں مت کریں۔ میں آپ کی آج بھی اتنی عزت کرتا ہوں جتنی پہلے کرتا تھا۔"

"تم اب بھی میری عزت کرو گے اگر میں کہوں میں نے تم سے جو کیا وہ محض اداکاری تھی؟"

"ہاں، میں پھر بھی آپ کی اتنی ہی عزت کروں گا۔ کیونکہ کوئی نہ کوئی مجبوری تو آپ کی بھی رہی ہوگی، جو آپ نے اس کردار کو اس ڈرامے میں کرنے کی ہامی بھری۔"

"ہاں مجبوری...... میری بہت بڑی مجبوری تھی شہریار!" وہ جیسے گم ہوگئی پھر رک رک کے ٹوٹے لہجے میں بولی۔ "محبت...... محبت بھی کتنی بڑی مجبوری ہے ناں۔ تخت و تاج، عزت، دولت، ہر چیز ٹھکرانے پر مجبور کردیتی ہے۔" کچھ توقف کر کے وہ پھر بولی۔ "ہاں، میری محبت، اسے ہی پانے کے لئے تمہاری سادگی، تمہارے دل سے کھیلی تھی، کسی نے مجھ سے کہا تھا اگر تم اس ساحر کو ریشم میں الجھا دیتی ہو تو وہ مجھے میری محبت حاصل کرکے دے گی اور پھر میں نے سوچا...... اس لمحے میں نے سوچا اگر محبت مجھے چھین کر بھی لینی پڑی تو میں کرلوں گی مگر بعد کو کھلا محبت چھیننے سے نہیں ملتی ہے، صرف مانگنے سے ملتی ہے۔ صرف خدا کی طرف سے کی گئی بخشش کے کرم سے ملتی ہے۔ مگر جب میں سمجھی بہت دیر ہوچکی تھی۔"

شہریار صوفے پر بیٹھ گیا تھا ایک بوجھ تھا، جو سینے سے اتر گیا تھا اور وہ اپنی گود میں رکھی ہوئی فائل اس کی طرف بڑھا کر بولی۔

"یہ تمہاری سادگی سے کھیلنے کا کفارہ ہے۔ اس فائل میں میری ساری جائیداد کے کاغذات ہیں جو میں مرحوم کے لئے تحفہ ہے۔ میں نے انتقالی کے طور پر تمہیں اس کا گارڈین مقرر کیا ہے۔"

"میں، وہ کون؟" وہ حیرانی انداز میں ہنسا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "زندگی کی ریت بہت تیزی سے پھسلتی جارہی ہے۔ اور آپ مجھے ایک زندگی سے بھرپور جیون کا نگہبان مقرر کرنا چاہتی ہیں؟" لمحہ بھر کو رکا، پھر بولا۔ "آپ یہ کام کسی اور کے سپرد کردیجئے جس کا سایہ ابھی اس کا اہل ہو۔"

"میں زرش کو کہتی ہوں لیکن وہ اس کے لئے راضی نہیں۔ تم بتاؤ پھر میں کسے اس کام کا حق سونپوں؟"

"ایک منٹ، آپ نے کیا نام لیا؟" وہ یکدم چونک گیا تھا۔

"زرش۔ مشہور ماڈل گرل زرش۔ وہ میری بہن ہے۔"

"اوہ اچھا، تبھی وہ آف دی اسپاٹ مجھ سے فری ہونے کی کوشش کرتی تھیں اور میں اس کو غلط معنی دیتا تھا۔ سوری بالیا! آپ زرش سے پھر ملیں تو میری طرف سے معذرت کردیجئے گا کہ میں ان جیسی اچھی لڑکی کو بھی کیریکٹر لیس کہتا تھا۔ میں نے سنا ہے، ہم اگر کسی کے متعلق برا سوچیں یا کہیں تب بھی اس وقت تک معافی نہیں ملتی، جب تک وہ شخص معاف نہ کردے، جس کے لئے ہم نے بدگمانی رکھا اور لمبے سفر پر جانے سے پہلے آپ کو تو معلوم ہے ناں بوجھ جتنا کم ہو اتنا ہی آسانی سے راستہ کٹتا ہے۔"

ثانیہ کچھ نہیں بولی۔ وہ بس آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر شہریار چلنے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ اس نے اس کی کلائی تھام لی تھی۔ "شہریار! میرے گناہ بھی آج ہی معاف کر دو۔ مجھے بھی بہت لمبے سفر پہ جانا ہے۔"
اس نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا، پھر بھیگے لہجے میں بولا۔ "آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں، میں تب بھی معاف کر دیتا ثانیہ! میرا دل بہت نرم ہے۔ میں کسی سے نفرت کر ہی نہیں سکتا۔ کوشش کرتا ہوں، تب بھی اندر سے محبت کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ یہ پھول کتنے پاگل ہوتے ہیں نا، وہ ان ہاتھوں کو بھی مہکا دیتے ہیں جو انھیں اذیت پہنچا کر، دل دکھا کر توڑ جاتے ہیں، بکھراتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، چاہے الزام ہو، الزام ہو کہ ہو نفرت، یہ سب کچھ دامن میں بکھرتے چلے جاتے ہیں، بکھرتے چلے جاتے ہیں۔"
ثانیہ کچھ نہیں بولی۔ اس نے شہریار کا ہاتھ آہستگی سے چھوڑ دیا تھا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا کار کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ پھر راستے میں تھا، جب اس کے موبائل پہ ایک ناپسندیدہ نمبر جگمگا رہا تھا۔ وہ تمام ناپسندیدگی کے باوجود اس نمبر کو ریسیو کرنا چاہتا تھا۔ اور پھر یوں لگا کسی نے اسے خاموش جلانے کے لیے یہ نمبر پریس کرنے پہ اکسایا تھا۔ وہ غصے میں فون بند کر گیا تھا۔ سو گھر پہنچا تو ماما کو چھوٹی چچی وفا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہونے پہ جھنجھلا گیا تھا کیونکہ جس کا اسے انتظار تھا، وہ اس کمرے سے ہو کر گزرے بغیر اپنے روم کی طرف نہیں جا سکتا تھا۔
تقریباً پندرہ گھنٹے بعد باہر کار رکنے کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ شور سے اٹھ کر دروازے میں آن کھڑا تھا۔ دانیا شرمیلی مسکراہٹ لیے اس کے سامنے سے گزر رہی تھی۔
"دانیا! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"
دانیا نے چونک کر ناپسندیدگی سے اسے دیکھا، پھر نخوت سے بولی۔ "کیا میں نے آپ سے کچھ کہنے کے لیے التجا کی ہے؟ جانتے ہیں بھائی! میں بہت عرصے سے نفرت کرتی ہوں۔"
شہریار نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا، پھر بہت ملتجی لہجے میں بولا تھا۔ "تم بہت غلط راستوں پہ زندگی کو گزارنے کی کوشش کر رہی ہو۔" وہ جتنی شدت سے اسے غلط لوگوں کی سنگت سے بچانا چاہتا تھا اور دانیا نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تھی۔
"آج کل میرا موڈ بہت اچھا ہے بھائی! اس لیے میں نہیں چاہتی آپ میرا موڈ برباد کریں۔"
"دانیا! وہ اچھا لڑکا نہیں ہے۔" اس نے بے بسی سے کہا اور وہ استہزائیہ ہنسی، پھر بہت برے لہجے میں بولی۔
"اچھائی کا پیمانہ آپ مقرر کریں گے؟ آپ؟ جو شاید اچھائی کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ پلیز بھائی! ایسی باتیں مت کیا کرو۔"

شہریار کا موڈ بگڑ گیا تھا۔ اس نے دانیا کی طرف دیکھا، پھر تلخی سے بولا۔ "تم جانتی ہو اس گھر میں حمزہ وجاہت کے لئے کوئی راضی نہیں ہے؟"

"تو کوئی راضی نہ ہو، لیکن میرا دل تو راضی ہے۔ اور سالار بھائی میرے ساتھ ہیں، جازی میرے ساتھ ہے۔"

"جازی کا خیال بدل چکا ہے۔ رہے سالار بھائی تو آخر آج تک انہیں اچھے اور برے میں تمیز کرنی کب آئی ہے؟ انسان کے اندر ٹھیک فیصلہ کرنے کی قوت ہوتی تو ان کی زندگی بہت بہتر ہوتی۔"

"تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے؟"

وہ پشت موڑے بولے جا رہا تھا کہ سالار عبدالرحمٰن کی تلخ آواز سے اپنے جملوں کا پیچھا کرتی بہت قریب محسوس ہوئی۔ وہ مڑ کر کچھ کہہ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ اس کے سر پر پہنچ گئے۔

"تم آخر ہوتے کون ہو میری ذات پر اعتراض اٹھانے والے؟ تم اپنی زندگی، کچھ کیا ہے اس میں سوائے غلطیوں کے دھبوں کے۔ اور رہا دانیا کی شادی کا معاملہ، تو اس میں میں کسی اور کو دخل اندازی کرنے نہیں دوں گا۔ چاہے وہ جبرئیل ہو، باپ ہوں اس کا، سمجھے تم.... تمہاری اوقات ہی کیا ہے تم ہوتے کون ہو اس کے؟"

"میں بھائی ہوں اس کا۔"

"آپ کچھ بھی تھے میرے، پر کیا آپ نے؟"

شہریار سکتے میں رہ گیا تھا۔

"دانیا!.... میں شہریار ہوں تمہارا سب سے فیورٹ بھائی۔" وہ بے یقینی لہجے میں بولا کہ کسی کا دل بھی دہل جاتا۔ دانیا نے پشت موڑ لی تھی اور سالار عبدالرحمٰن نے اس کے زخمی بازو کو مٹھی میں بھینچ کر کہا تھا۔

"سن لیا تم نے؟ تم کچھ بھی نہیں ہو اس کے۔ تم نہ اس کے، نہ میرے، نہ اس گھر کے۔ تم صرف ایک بوجھ ہو۔ ایک غلط فیصلہ جو پاپا نے اپنی زندگی میں لیا اور جسے ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔"

وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا تھا۔ مگر سالار عبدالرحمٰن رکے نہیں تھے۔ چوٹ بار بار زخم پر ہی لگتی ہے جو کہ زخم گہرا ہے بھرے نہیں، اور جب زخم بھر جائے تب بھی نشان رہ جاتا ہے، بتایا جا سکے کہ یہ زخم کتنا گہرا تھا۔ بعد میں بھی نہیں اٹھنے دے رہے۔ وجود نے پر ساکت ہو گیا تھا۔ دل نے دھڑکنے سے انکار کر دیا تھا جیسے زندگی سے مفر ہو، ایک آواز سنائی دی تھی۔

"شہری بھائی! آپ یہاں ہیں؟ میں آپ کو آپ کے روم میں ڈھونڈ رہا تھا۔ شہری بھائی! یہ کیا ہوا؟" اس نے وائٹ کوٹ پر سرخ رنگ پھیلتے دیکھ کر بے قراری سے اسے پکارا۔ "آپ کا زخم پھر کھل گیا۔"

ANCHAL.COM

"میرے زخم بھرتے کب ہیں، بس دکھنا بند ہو گئے ہیں۔"

وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔ "شیری بھائی! آر یو آل رائٹ؟"

اس کی پلکوں میں اٹکی نمی رخسار پر پھسل گئی۔ "کیا واقعی مجھے زندہ رہنا چاہیے جازی؟"

"کسی نے کچھ کہا تھا؟ اور وہ کہیں ماما اور بھائی نے تو......؟"

وہ کچھ نہیں بولا تھا اور جازی تیزی سے اٹھ کر باہر کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا اور تھوڑی دیر بعد ماما اس کے ساتھ آئی تھیں۔

"کیا ہوا شیری؟" ماما بھی حواس باختہ ہو گئی تھیں۔ جازی نے اس کا کوٹ اتار کر زخمی بازو پہ شرٹ کے بٹن کھول دیا تھا مگر وہ بت کی طرح ایستادہ تھا۔

"اور آئی کا دلیہ سالار بھائی بھی ہیں۔" وہ فرسٹ ایڈ باکس کھول کر روئی سے اس کے زخم کے اردگرد کا خون صاف کر رہا تھا۔ ماما نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا مگر اس میں پھر بھی زندگی نہیں جھلک رہی تھی۔ وہ دیا کے جلتے بجھتے سائے کے اندر زندگی ہار گئے تھے۔

"ماما! میں واقعی اچھا بیٹا یا اچھا بھائی نہیں بن سکا ہوں۔ اف! میں کس طرح ثابت کروں کہ میں آپ سب سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ کس طرح کہوں کہ آپ سب کو یقین آ جائے؟"

ماما نے کچھ کہنے کے بجائے اسے کھینچ کر خود سے بھینچ لیا تھا۔ بھرائے لہجے میں بولی تھیں۔ "تمہیں کسی کو یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں کہ تم کتنی محبت کرتے ہو۔ جو دل والے ہوتے ہیں ماں، وہ آنکھوں میں جھانک کر جان جاتے ہیں محبت کتنی ہے اور کیسی ہے۔"

"پھر ماما! یہ بھائی اور سب بابا یہ لوگ مجھے اتنا غلط کیوں سمجھتے ہیں؟"

"ان کے غلط سمجھنے سے تم غلط نہیں ہو جاتے۔ تم فکر مت کیا کرو شیری!"

اس نے ٹھنڈا سانس لیا۔ جازی نے اسے شرٹ پہننے میں مدد دی تھی۔ وہ اٹھ کر اپنے روم کی طرف جانا چاہتا تھا مگر ماما نے اسے روک لیا تھا۔

"تم آج میرے روم میں سوؤ گے۔ مجھے لگتا ہے تجھے بخار چڑھ رہا ہے۔ وہاں کون دھیان رکھے گا؟"

"نام اسے۔ یہ دل یکدم زیادہ گھبرانے کی بات نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں۔"

نام نے اس کے چہرے پہ نظر گاڑی اور پھر دھیمے لہجے میں بولیں۔

"تمہارا چہرہ دیکھ کر بتا سکتی ہوں، تم کتنا ٹھیک ہو۔" پھر اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر جتانے والے لہجے میں بولیں۔ "میرے اختیار میں ہو تو دنیا کی ساری خوشیاں ایک تمہارے دامن میں لا ڈالوں، پھر چاہے اس کے لئے مجھے کوئی بھی قیمت چکانی پڑے۔ مگر افسوس! میں بے حد مجبور ہوں۔"

شہریار نے ماما کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پہ اس کے دل کا ڈوبنا صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ شاید عدیل بھائی نے نانی کے معاملے میں ماما کو بے بس کر دیا تھا سوائے ان کا دو بول لینے کے لئے کٹی ذہن بنانی پڑی۔

"کہاں مجبور ہیں آپ؟ آپ کے پاس تو کھلا آپشن ہے۔ آپ مجھ سے جتنا ساتھ چاہتی ہیں، کرنے میں قطعی آزاد ہیں۔ اور یہاں بھی کون کم بخت کافر ہے جو آپ کی محبت سے دامن بچانا چاہے گا۔ سچ ماما! آپ کی محبت ہی تو میرا زادِ راہ ہے۔"

"پھر کیسی فضول بات؟" ماما نے اس کا کان کھینچا اور وہ مسکراتے ہوئے ان کے ساتھ ہی ان کے روم کی طرف بڑھ گیا۔

جاری دونوں کبھی ملیں کے کانپ محبت سے ساتھ جاتا دیکھ کر مسکراتا رہا اور دل میں دعا کرنے لگا کہ ہماری زندگی میں واپس لوٹ آئے گا۔

❀❀❀

آج وہ بہت اداس ہو رہی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے سے اس کی طبیعت سے ساری شوخی اور شرارت جیسے ختم ہو گئی تھی۔ اس کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزرتا تھا۔ نرم کھلے بال، نیند کے انداز، سب ایک کسی کے سامنے جا کر وہ موم کی طرح پگھل کر رہ جاتے تھے۔ محبت سوچتی تھی اس کے دیوانے تھے۔ جیسے اب وہ ان میں جلنے لگی تھی، پتہ نہیں کیوں اس محبت نے اس کا پیچھا لے لیا تھا۔ اب وہاں سے دامن چھڑانے کو کوئی بھی جتن کرتی سے شہزاد اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا۔ پھر وہ اسے یہاں تک کہ شہزادی کا عکس دھندلا ہو جاتا اور ایک دل کھنچا سا پھر سے بھڑکنے لگتا۔ دروازہ کھولا اور سب منظر ایک جھٹکے سے ٹوٹ جاتا۔ وہ مانگنے بس نہیں تھی مگر اب بن گئی تھی۔ بس ایک

فی لگن لگ گئی تھی۔

"میرا بچہ کیسا ہوگا؟ ہمارا بچہ شیراز اور میرا بچہ؟"

وہ جاناں نہیں تھی وہ ایک ماں ہو گئی تھی اور ماں کو اپنے بچوں سے کیا کام وہ اس کی باتیں اولاد کے لمس کو جیسے ہی آن میں محسوس کرتی تھیں۔ حشمت جہاں اپنی ہی پریشانیوں میں مبتلا تھیں سیج سے جو شکنیں نہ رات گئے ٹوٹیں اور ساری رات ان کے گھر میں کوئی ان کے نہ سے جو کرتا وہ اس کی محفل جمتی۔ مگر جب بھی جاناں خود کو دیکھتی حشمت جہاں کچھ بتا رہی تھی رہتا۔

ہم بچے سو جس کرتے آجاتے ہیں وہ ایک جیسا ماں کا نہیں ہوتا ان سے ان کا ہے... تو وہ معاملات کچھ الجھن اور جاناں تھیں بہت کی طرح ایسا کرتے دیکھتی رہتی کہ پھر رہا تک کوئی ان کا آنچل کھینچ کر چلا جاتا۔

"واحد وہاں اماں! وہ شیراز بیٹا اپنے پاؤں پاؤں چلنے لگتا اور وہ اس کے پیچھے دوڑتی ہوئی ماں نے اپنا موبائل تک آف کر رکھا تھا۔ بی بی جی کیا ان بہت خوبصورت باہر نکلی تھی تو موبائل آن کر لیا تھا۔

اس کا نیا ہر وقت گھر میں رو کر نکلتا وہ بھاگ کر جلدی جلدی اپنے بچے کو جیسے ہاتھ میں لگی آتی۔ ان بھی وہ بہت سے گفٹ لے کر جلد ملنا وہ ہم کے گیٹ سے گاڑی اندر لے کر آئی تھی کہ اچانک کار سے وہ سنے ہی اسے انجم عافیہ کے سامنے مراد دکھائی دے گیا تھا۔

"تم! آپ یہاں؟"

"جاناں! تم نے اپنی کیا حالت کر لی ہے؟ کہاں تھیں تم اتنے دنوں سے؟ میں نے کتنے تمہارے گھر کے چکر لگائے تمہارا فون بند کیا لیکن حشمت جہاں نے مجھے تم سے ملنے نہیں دیا۔ وہ کہتی تھیں کہ تم نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا ہے۔"

جاناں خالی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ "سوری میم! میں اپنے آپ میں نہیں تھی مجھے کسی چیز سے رغبت نہیں رہ گئی تھی۔ کچھ دنوں سے پتہ نہیں مجھے شیراز اتنا کیوں یاد آنے لگا ہے کہ پھر کچھ بھی یاد رکھے جانے والا نہیں لگتا سب بھول جانے کے قابل نہیں لگتا۔ میم! یہ دل ان لوگوں کے لئے کیوں دھڑکے جاتا ہے جو آپ کے نہیں ہو سکتے، جو کبھی آپ کے نہیں ہو سکتے، جنہیں آپ سے محبت نہیں ہوتی مگر دل پھر بھی ان کی بے وفائی کو سچ ماننے کو وقت کی کسی مجبوری کی نذر کر دیتا ہے۔ اس محبت کو، اس محبت کے سبب کو کیا کہا جاتا ہے؟ اس محبت کو جو کبھی ہماری محبتوں کا نصیب نہیں بن سکی۔"

انجم عافیہ نے کچھ کہے بغیر اس کو خود سے لپٹا لیا تھا شیراز اپنے لہجے میں بولی تھیں۔ "تم نے کبھی سوچا کہ کیا پتہ تمہارا شیراز بے وفا نہ ہو، مجبور ہو صرف مجبور! وہ تم سے آج بھی اتنی ہی محبت کرتا ہو جتنی پہلے

AANCHAL.COM.PK

میں کیا کرتا تھا، مگر تمہیں بتانے سے قاصر ہوں۔"

"ممی! انسان واقعی مجبور کیسے ہو سکتا ہے؟ دنیا کے کسی کونے سے چاہے تو محبت کا پیغام بھیج سکتا تھا۔ پھر اگر میں اس کی آواز، ایک نظر کی محبت جتنی بار چاہے مجھے بجا فیس لطافتی، انا رنی پھرتی ہو، پھر سزائے موت دیتی، میں اف تک نہیں کرتی۔"

نیلم داتیہ نے دل سے اس کی محبت کے ملنے کی التجا کی تھی۔

وہ مراد کے پاس جا کر رک گئی تھی۔ "تم کیسے ہو بیٹا؟"

"ٹھیک ہوں ممی! لیکن آپ کو پتہ ہے، آپ پر اداسی بالکل سوٹ نہیں کرتی ممی! آپ ہنستی ہوئی بہت اچھی لگتی ہیں۔" مراد اندر سے گفت بات کو ابھی باہر آیا تھا اس لئے ساری باتوں سے لاعلم تھا۔ وہ اس کے سوگوار حسن پر کمنٹ دے رہا تھا اور جانتا نہ تھا کہ ان لفظوں نے اسے کسی دور سے لا کر ماضی کے کسی پاتال میں کھینچ لیا تھا۔

"او جانے دو بیٹا۔ تیرے چہرے پر مسکراہٹ نہ ہو تو لگتا ہے زندگی مر گئی ہے۔ بیٹا! بہت تو ہو چکی ہے۔"

اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی آ گیا۔ وہ مراد کے نقش کو ایسے چھونے لگی جیسے ان آنکھوں کے کسی نقش پر بچھڑنے کی عمر تلاش کر رہی ہو۔

"تم میرے بہت پیارے بچے ہو مراد!"

"آپ مجھے دنیا کی پیاری ہیں ممی!" مراد نے اس کی ہتھیلی پر اپنی بہت عقیدت سے چوم کر خوش دلی سے رخصت کی اور جانے سے پہلے شرارت کرنے لگا۔

مراد کے ہر ہر انداز میں اسے شیرازی کیوں یاد آتا تھا؟ کیوں؟

وہ اندر ہی اندر ٹوٹ گئی۔ شیراز گنت کے بیٹے کے ان کے بچے چھپنے چھپنے کا تھا اور ان کے ساتھ تھا اس کے دل کا دیا سا کیوں؟ جس کا جواب ابھی حاصل کرنا وقت کے انتظار کی بات تھی۔

❁❁❁

وہ اس نئی شخصیت کو دیکھ کر شاید ... نے ان کے سامنے شام کی چائے لا رکھی تھی۔

"تمہارے پاپا کیا کر رہے ہیں؟"

شافعہ نے ماں کو ایک نظر دیکھا اور آہستگی سے بولی۔ "جب سے سوہا ملی ہے، ان کا زیادہ وقت سوہا اور موحد کے ساتھ گزرنے لگا ہے۔ ایک دم سے کھلنے لگے ہیں، جیسے پاپا پھر سے زندہ ہو گئے ہیں۔ وہی چہکنا، وہی شاعری، وہی زندگی۔ ہاں بس کبھی کبھی عطیہ پھپھو کی یاد آجاتی ہے تو پھر سے اداس ہو جاتے ہیں۔"

"عطیہ، عطیہ، عطیہ...... آخر تم سب کو عطیہ فوبیا کیوں ہو گیا ہے؟ آخر کیا ہے اس عطیہ میں؟ جب وہ دنیا میں تھی، تب بھی جیسے میری دشمن تھی اور اب مر گئی ہے، تب بھی قرض خواہ کی طرح میرا سب کچھ چھین لے گئی ہے۔ تیرے پاپا بھی اس کی حمایت کرتے تھے، دوسرا ان کی بھی زندگی اس سے شروع ہو کر اس پہ ہی ختم ہو جاتی تھی۔ مجھے لگتا تھا میں نے کوئی زہر پی لیا ہے عطیہ نام کا۔ میری زندگی، اس کی وجہ سے سب مر گئی تھی۔ میں جس گھر پہ حکمرانی کرتی تھی، اسی گھر میں دوسرے درجے کی شہری بن گئی تھی۔ پھر میں نے اسے اتنا ستایا، اتنا ستایا کہ وہ گھر سے نکال دی گئی۔ مگر اب پھر سے یہ اس کی اولاد کے روپ میں میرے گھر میں گھس آئی ہے۔ میں اسے اندر نہیں گھسنے دوں گی۔ یہ کون عطیہ؟" آصفہ نے چائے کا کپ دیوار سے مار دیا۔ کف اڑاتا لہجہ، جنون بھرا انداز۔ وہ شافعہ سے سنبھالی نہیں جا رہی تھیں۔ مگر وہ پھر بھی اسے کھینچ کھانچ کر اندر لے گئی اور شرمندگی سے جھنجھلا گئی تھی۔ سوہا کی بات ابھی تک اس کے دل میں پھانس کی طرح اٹکی ہوئی تھی۔ اسے اپنی ماں سے غیر متوقع محسوس ہوئی تھی کہ اب یہ بنا بنایا سارا بھید کھل گیا تھا۔

آصفہ تھکی چلاتی یکدم خاموش ہو کر خلاؤں میں گھورنے لگی تھیں۔ شافعہ کپ کی کرچیاں اٹھا رہی تھی۔ آصفہ کے کمرے سے باہر آئی تو پاپا کا کمرہ اسی طرح میوزک کے ردھم میں ڈول رہا تھا اور موحد، سوہا، پاپا کے ساتھ کیرم کی بازی جمائے بیٹھی تھیں۔

اگر کبھی جو پاپا کو پتہ چل گیا، وہ کریکٹر سے جتنا جڑے تھے، وہاں کے ہاتھوں اتنے ہی برے کریکٹر کو حصہ بنا بیٹھے ہیں تو؟...... جو لوگ کسی خاص زندگی سے جڑتے ہیں، کسی خاص بات سے، حالت سے نفرت کرتے ہیں تو پھر وقت انہیں اسی مقام پہ لا کر کیوں جھونک دیتا ہے؟ شاید کسی ایسی بستی میں کہ جہاں سے شناخت لے کر واپس لوٹ آنا ناممکن سا ہوتا ہے۔ شاید غرور، شاید خدا کے آگے خدائی بھرے زعم کو وہ انہیں اس طرح منہ کے بل گراتا ہے تاکہ جب وہ زمین کی خاک کا مزا اپنے تالوؤں میں محسوس کریں تو وہ کچھ ان کے دل کے قریب آ کر کہے۔

"کون ہے، جو میرے آگے دم مار سکتا ہے؟ کون ہے، جو اگر میں برا کرنا چاہوں تو تمہارے لیے خیر حاصل کر سکے؟ اور اگر میں تمہیں خیر دینا چاہوں تو تمہارے لیے برا کر سکے؟ کون ہے...... کون ہے جو

AANCHAL.COM.PK

ازل سے ابد تک؟ کون ہے جو مجھ سے دور ہے؟"

"مگر عطیہ چچی! ان کا کیا قصور تھا؟"

اس نے کہا۔ جہاں ذہن و دل کی شدت کم تھی اور محسوس کیا اس نے جیسے عطیہ چچی کے دل کو کسی ذہن و دل کی طرف اچھالنے کی عادت سی بن گئی تھی۔ کیونکہ وہ چہرے اس کے اندر بول رہی تھیں۔

"میرا قصور کیا تھا؟ محبت کرنا اور بے حد و حساب محبت کرنا، صلے کی تمنا نہ کرنا کوئی جرم ہے؟ یہ محبت کے مارے دل کی زندگی میں کامیابی کے سوا ان کی آنکھ بند ہونے پر بھی کہاں خالی رہتے ہیں۔"

وہ نئے کمرے سے چائے کا پانی رکھ رہی تھی اور فریب دے کے موبائل پر میسج بھیج رہی تھی۔ "کب آؤ گی؟"

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ کوئی اتنی بے قراری سے آپ کا انتظار کر رہا ہو تو انتظار کرنے والے اور خود انتظار پر بے ساختہ پیار آ جاتا ہے۔ اس نے جلدی جلدی چائے کا دم لگایا اور پھر چائے اور سینڈوچ بابا کے کمرے میں دے کر وہ باہر نکل جانے کا کہہ کر تیار ہونے چل پڑی تھی۔

❀❀❀

وہ بہت مزے سے شام کا اخبار پڑھ رہی تھی، جب اچانک جازی نے اس کی کلائی تھامی تھی۔ "ابھی چلو! میں آپ کو کہیں لے کر جانا چاہتا ہوں۔"

"لیکن اس وقت مجھے کہیں اور جانا ہے۔" اس نے کلائی چھڑائی۔

تھوڑی دیر پہلے حرمین کا فون آیا تھا، اس لیے دل میں ایک دھمک سی تھی۔ مگر جازی نے اس کی کلائی نہیں چھوڑی تھی۔

"آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" وہ بڑے زور و شور سے کہہ رہا تھا۔

"میں اماں کو دل کی ہر بات بتا دوں گی، بدتمیزی مت کرو جازی!"

"یہ اس بدتمیزی سے بہت کم ہے بجو! جو آپ نے شہری بھائی سے اب تک روا رکھی ہے۔"

"شہری بھائی؟..... اوہ! یہ شہری بھائی کا جادو تمہیں کیونکر دکھ رہا ہے؟ تم تو انہیں پتا نہیں کتنی بار دیکھ چکے تھے؟"

"ہاں، شاید میں بھی سالار بھائی کی برین واشنگ کا شکار ہو گیا تھا۔ کچھ مہینوں کے لیے سہی، میں نے شیری بھائی کو برا سمجھا۔ لیکن اب میں جان چکا ہوں، جو غلطی میں کر چکا ہوں، آپ نہیں کریں۔" اس نے اُسے کار میں بٹھا کر دروازہ لاک کر دیا تھا۔

دانیا نے غصے سے اُسے دیکھا تھا اور وہ جو کچھ جانا تھا دانیا کے سامنے کہہ گزرا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ دانیا کا غصہ خاموشی کے گھپ سناٹے میں کھو گیا تھا۔ اس نے ڈیش بورڈ پر سے تصویریں اس کی گود میں اچھال دی تھیں۔

"یہ ہے حمزہ عابد۔ یہی ہے اس کی اوقات۔"

"جاری اپنی بیوی پر لعنت۔" اس نے چیخنا چاہا مگر اس کی آواز شہوار سے اونچی نکلی تھی۔ پاس بیٹھے اسے ایک ہوٹل کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا تھا۔

"بائیسویں میز پر وہ آپ کو ابھی بھی جاتے کے ساتھ مل سکتا ہے۔"

دانیا کل کے کھلونے کی طرح چلتی ہوئی بائیسویں میز کی پشت والی میز پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے اندر زلزلہ آ گیا تھا اور حمزہ عابد کی کھوکھلی آواز گونج رہی تھی۔

"یہ تم نے اپنی کیا حالت بنائی ہے؟ میں تمہیں اس حالت میں دیکھتا ہوں تو میرا دل رکنے لگتا ہے۔ پلیز ایسا مت کرو، ابھی خود کو تباہ کرنے کا وقت نہیں۔ ابھی تو تم وقت سے جو کچھ چاہو حاصل کر سکتی ہو، پا سکتی ہو۔ پھر یہ سب کچھ کیوں چھوڑ رہی ہو؟ عطوت، میرے تمہاری اس حالت سے بہت پریشان ہیں۔"

"عطوت مم...... پاپا......" بے ساختہ قرودہ تعجب اس کے سینے سے برآمد ہوا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی اور حمزہ عابد نے خود سے دانیا کا ہاتھ چھڑا دیا۔

"اب جب کہ میں اس موڑ پر ہوں کہ تمہاری ضد پوری کر سکتا ہوں تو تم کیسے الٹ رہی ہو۔ یہ تماشا ہے ظلم ہے...... تم نے ہی تو چاہا تھا کہ تم اس لڑکی کو تنکوں کے بل اپنے سامنے سر جھکائے دیکھو۔ تم چاہتی ہو کہ تم کسی سے پوچھ سکو کہ اعلیٰ تربیت، اعلیٰ خون کے باوجود ایک لڑکی اپنی پاکیزگی کے معیار سے نیچے آئی تو ثبوت صرف خون کے فرق کا کیوں ہو۔ تم ہی تو چاہتی تھیں کہ وہ میرے لیے گڑگڑائے، میں اس میں اتنا بس جاؤں کہ پھر میں اسے ساری دنیا چھوڑنے کا بھی کہوں تو وہ انکار نہ کرے۔ میں جو کہوں وہ آنکھ بند کر کے عمل کرے۔ اپنے گھر والوں تک کو میرے لیے ٹھکرا دے۔ تو پھر اب دیکھو وہ دو زندگی لینے والی ہے۔ تو تم کیسی ہو؟ تمہیں اب کسی قسم میں کوئی اعتراض نہیں ہے؟ تمہاری شدید بیزارگی آس کر کے سامنے کی جو حسرت تھی وہ بھی اب پوری ہونے والی ہے، پھر بھی تمہارے اندر کوئی تحریک ختم کیوں نہیں

یعنی؟ آخر تم یہاں نہیں تو کہاں ہو؟"

"شیرازی...... تم نے میرے شیرازی کے متعلق کیا پوچھا؟"

"وہ بیٹا تھا۔" حشمت بیگم نے کہا تھا۔

"میں تم سے پوچھ رہی ہوں کہ تم نے شیرازی کو کیا بتایا؟" وہ جنون سے چیخی اور حمزہ عابد نے پہل ہو کر دھیمے لہجے میں کہا۔

"ظلم! یہ پاگل جیسی ہے۔ تم مجھے کیوں تماشا بنانا چاہتی ہو؟" حمزہ سے لپٹ کر کہا جا رہا تھا۔ "شوکت بیگم ٹھیک کہہ رہی ہیں تم اپنا ماضی دفن کر چکی ہو۔ رہا شیرازی تو مجھے صرف زندگی سے پیار ہے، صرف زندگی سے۔ مرے ہوئے لوگوں کو تلاش کرنے کا کام کسی گورکن سے کرواؤ مجھ جیسے شخص کو نہ جھکاؤ۔"

"بکواس مت کرو۔ میرا شیرازی زندہ ہے۔ تم نے سنا میرا شیرازی زندہ ہے۔" وہ اس بار پہلے سے بھی زور سے چیخی تھی۔

حمزہ عابد یکدم کھڑا ہو گیا تھا۔

"تمہیں تماشا بننے کا شوق ہے تو بنو مگر مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔ رہی بات تو میرے ہوم میں ابھی اتنی گنجائش ہے کہ نکلنے کی کوئی راہ مل ہی جائے گی۔ اب بھی دیکھنا نہیں چاہے گی۔ وہ احمق مجھ سے محبت جو کرتی ہے۔ رہا میں تو تم جانتی ہو میں کھانے کا ساتھی کبھی نہیں بنتا۔" وہ کھڑا ہو کر ان ہی الفاظ کے ساتھ کمرے سے نکلا تو اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

"بابا......!" اس نے ہاتھ بڑھا کر پکارا اور روتے ہوئے باہر کی طرف بھاگتی چلی گئی تھی۔ باہر جازی نے اس کے لیے قریب آ کر دروازہ کھولا تھا۔ پھر چیخی تو میں حمزہ عابد باہر تک آیا، جازی عبدالرحمٰن کی گاڑی گیٹ سے نکلتا چلا گیا تھا۔ وہ بابا کچھ نہیں بولی تھی بس مسلسل روئے جا رہی تھی۔ اور جازی جانتا تھا یہ رونا اس کے لیے کتنا ضروری ہے۔ موسم اور آسمان بارش کے بعد بہت شفاف، بہت چمکیلے ہو جاتے ہیں۔ ایک الجھن مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کو چھو رہی تھی۔

❀ ❀ ❀

ارسلان راشد تو دونوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے باتوں میں گن تھے کہ اچانک احسان کے رونے پہ چونک گئے تھے۔

"کیوں آئی ہو تم یہاں؟"

ارسلان راشدی ان کا ابھی نہیں سمجھے تھے کہ اچانک سوال نے انہیں ہراساں کر دیا۔

"یہ میری بیٹی ہے آصفہ! اسے یہاں آنے کے لئے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔"

مگر آصفہ جیسے اپنے سوال کے اندر رہنا تھیں، مسلسل عطیہ کو دیکھے جا رہی تھیں۔ "عطیہ تم کیوں مجھے جینے نہیں دیتی ہو؟ تمہیں کیا لگتا ہے ارسلان اب بھی تمہارا ہو سکتا ہے؟ ارسلان تمہارا نہیں ہے، یہ صرف اب میرا ہے۔ وہ تمہیں طلاق دے چکا ہے۔ تم پھر بھی یہاں چلی آئی ہو؟ عطیہ!..... تم مر کیوں نہیں جاتیں اور مرے ہوئے لوگ دوبارہ زندہ نہیں ہوتے۔ اگر ہوتے ہیں تو انہیں پھر سے مارنا پڑتا ہے۔ ایک ہی قتل کی سزا دوبارہ نہیں مل سکتی۔"

ارسلان راشدی لفظوں کی ساخت سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ آصفہ نے روتے ہوئے پھر سے ہاتھ کو کمر پہ رکھ کر بولنا شروع کر دیا تھا۔

"آصفہ! تم پاگل ہو گئی ہو؟..... سونیا! سونیا!" ارسلان راشدی نے بے بسی سے آصفہ کو دیکھا تھا۔ سونیا دوڑ کر ان تک آئی تھی اور آصفہ پہلے جیسے انداز میں چیخ رہی تھیں۔

"تو بھی ان سے مل گئی..... اس عطیہ سے، جس نے ہمیشہ مجھے دکھی رکھا، کسی خوشی سے جینے نہیں دیا..... تو تو میری بیٹی ہے ناں پھر تو عطیہ اور ارسلان کا ساتھ کیوں دے رہی ہے؟"

"ماں! چپ کر جائیں..... تم چپ رہتی ہو تو عافیت میں رہتی ہو۔ چپ کر جائیں پلیز!"

"کیوں..... میں کیوں چپ کر جاؤں؟ میں بولوں گی۔ ہاں، میں بولوں گی، مجھے نفرت ہے عطیہ سے، عطیہ کے بچوں سے بھی۔ جس طرح میری اولاد کا حق مارا جاتا ہے، ارسلان صرف عطیہ اور بچوں پہ پیسے لٹانے لگا تو میری دونوں بیٹیوں کا کیا ہو گا؟"

"ماں!..... چپ بس چپ....."

ارسلان راشدی سکتے کی کیفیت میں آصفہ کو دیکھتے رہ گئے۔ یہ باتیں انہوں نے پہلے بھی کہی سی تھیں۔

"آصفہ بھابی خوف زدہ ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں، ہم ان کے اور جمیل بھائی کے حق کو نظر انداز کر دیں گے۔"

"بکواس مت کرو عطیہ! مجھے تم سے ایسی توقع نہیں تھی کہ تم میری آصفہ بھابی کے متعلق ایسی چھوٹی بات کرو گی۔ تمہیں کیا معلوم انہوں نے میرے لیے کیا کیا قربانیاں دی ہیں۔ میرے اخراجات، میری ضرورتیں...... بھیا میرے لیے اتنے حساس تھے کہ میری زندگی کو ایک ٹھیک رخ دینے کے لیے انہوں نے اپنی اولاد نہیں ہونے دی۔ تم نہیں جانتیں پورے دس سال بعد اب ان کے ہاں خوشی نے رخ کیا ہے اور تم ان کے خلوص، ان کی محبت پر الزام دھر رہی ہو۔"

ارسلان راشدی ابھی تک سکتے کی کیفیت میں کھڑے تھے اور آصفہ کو سنبھال کر کمرے تک لے گئی تھی۔

"آصفہ نے یہ کیوں کہا کہ سونیا صرف ان کی بیٹی ہے؟" ذہن نے ایک بات کا سرا تھام لیا تو وہ منہ سے کچھ کہے بغیر اٹھے اور کسی روبوٹ کی طرح آصفہ کے کمرے کی دہلیز پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ پھر کچھ پوچھنا ہی چاہتے تھے کہ آصفہ روتے ہوئے جو چیخ چیخ کر مسلسل بول رہی تھیں، یکدم چپ ہو گئیں۔

"مجھے زندگی بھر صحیح فیصلہ کرنا نہیں آیا۔ پہلے عطیہ سے شادی کا غلط فیصلہ کیا، اپنی محبت سے دوری اختیار کرنی پڑی، بہرحال تھے ہی سہی مگر جب مجھے ٹھیک فیصلہ لینا تھا تب بھی ارسلان راشدی کا غلط فیصلہ لے لیا۔ وہ پیچھے رہ گیا، وہ شخص جو اس دنیا میں تم سے سچا پیار کرتا تھا۔ سونیا تو بالکل اس کی طرح خوبصورت ہے۔ تیری آنکھیں بالکل تیرے باپ پر گئی ہیں۔"

"ماں! چپ کر جاؤ۔ ڈیڈ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" سونیا ارسلان راشدی کو دیکھ کر تیزی سے انہیں چپ کرانے کی کوشش کرتے ہوئے ٹھٹک گئی تھی اور عطیہ نے سن لیا تھا۔

ارسلان راشدی کے دل میں دکھ کی ایک لہر اٹھی تھی۔

"میں صرف آپ کی بیٹی ہوں پاپا! پلیز مجھ سے ہاتھ مت چھڑائیے گا۔ میری ماں کی سزا مجھے......" سونیا نے لپکتے ہوئے ارسلان راشدی کی طرف دیکھا۔

ارسلان راشدی نے اس کی طرف سے پشت کر لی۔

"مجھے وقت دو... میں کوئی بہت عظیم انسان نہیں ہوں، بیٹی! ہوں صرف ایک عام سا انسان۔" انہوں نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا پھر کراہتے ہوئے "آپ نے میرے ساتھ یہ دھوکہ کیوں کیا آصفہ؟ آپ تو جانتی تھیں مجھے کرپشن سے، بے وفائی سے کتنی نفرت تھی، کتنی زیادہ کہ صرف شک پر میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کھو دی۔ میں نے اپنی عطیہ کو چھوڑا۔ آپ نے سنا، میں نے اپنی محبت کو کھو دیا، لیکن آپ کیا جانیں، دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ آپ کیا جانیں؟"

وہ مومنہ اور سونیا کے پکارے جانے پر بھی نہیں رکے تھے اور فوراً آنکھیں کھولے خاموش بیٹھی تھیں۔ لگتا تھا کسی چابی کے کھلنے کی چابی ختم ہوگئی تھی۔ وہ بالکل بت کی طرح بیٹھی تھیں۔ شام کی نارنجی کرنیں کمرے میں موجود تھیں ان کا چہرہ ان نارنجی شعاعوں سے دھندلا گیا تھا۔

سونیا وہ سب سے الگ کر رہی تھی۔ مومنہ اسے چپ کرا رہی تھی۔ وہ سونیا کے دکھ سے واقف تھی اسے اپنے بابا کا دکھ پریشان کر رہا تھا اس صحا سے شیراز عبدالرحمٰن کی یاد بے ساختہ آتی تھی۔ شیراز اس کی زندگی میں بہت اچانک آیا تھا اور بہت عجب انداز سے اس کی زندگی کا محور بن گیا تھا۔ وہ چہرے سے اپنے موبائل پر اس کا نمبر ٹرائی کرنے لگی تھی۔

❁ ❁ ❁

یہ ممکن تو نہیں لیکن
چلو یونہی ذرا ہم سوچ کر دیکھیں
سمندر کا کنارہ ہو
ستارے رات کے ماتھے پہ چپکے سے
کسی کا نام لکھا ہو
تو آنکھیں موند کر وہ نام پڑھ کے
مسکراتی ہو
ہمارے ہاتھ میں دیا تھامے ہو
جس کی لکیروں میں
کوئی تارہ ہمارے نام کا روشن نہیں ہوتا

AANCHAL.COM.PK

دیا آنکھیں
جن میں جلتے آرزو کے
چراغوں کی لو میں اک چہرہ ابھرتا ہے
(کسی خوش بخت ہستی کا)
دیا آنکھیں صرف اک چہرے کو دیکھیں
اور وہ چہرہ دوبارہ
یہ ممکن نہیں لیکن
چلو یونہی ذرا ہم دعا کر دیکھیں
طلب کی آرزو
حرف دعا بن کر
ہمارے لب سے نکلے
اور پوری ہو
ہمارے بھی دل میں
بجھے ناکامیوں کے سارے شکوے
شگفتہ حبیب

AANCHAL.COM.PK

بے فکری تو نہیں چین

جیلو بھی......

تانیہ نے آج کئی ہفتوں بعد اس کے کمرے کی صفائی کی تھی اور اس کی الماری میں رکھی ڈائری کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ اس البم نے اس کی دنیا تہ و بالا کر ڈالی تھی۔ وہ اس کے بیڈ پر بیٹھی البم پر ہاتھ پھیر رہی تھی کہ ایک تصویر اس میں سے پھسل کر اس کے قدموں میں گر گئی تھی۔ تصویر میں شہریار سامنے کے رخ پر کھڑا تھا اور شائقہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں اور مسکرا بھی رہی تھیں مگر شہریار کی آنکھوں کی ویرانی کے گہرے دبیز بکھری پڑی تھی۔

"بھائی شانی سے پیار کرتے ہیں مگر شانی تو......" تانیہ کے دل کا ایک ایک ٹکڑا جلتا تھا۔

"یہ بھائی بھی کیا ہیں، جس سے محبت کرنے لگتے ہیں وہ ان کے ہاتھ سے ریت کی طرح پھسل کیوں جاتا ہے؟ میں نے بھی تو بھائی کو کتنا دل دکھایا ہے۔ کیا بھائی پھر مجھ سے پہلے کی طرح بات کریں گے؟ شاید عادات کے طور پر ضرور کریں سے اب وہ مجھے پہلی والی تانیہ کی طرح نہیں سمجھیں گے عمر بھر کے مجھ سے ناراض ہوں گے۔ میں نے ان کا دل بھی تو بہت دکھایا ہے۔" یکدم کچھ دن پہلے کا جملہ اس کے دل میں گونجا۔

"کچھ نہیں لگتے آپ میرے۔ سن لیا آپ نے؟"

ایک انتہا شرمندگی تانیہ نے یونہی ڈائری کے صفحے پلٹے۔ لکھا تھا۔

"آج تانیہ نے بھی مجھے موت دے دی ہے۔ میں ایک انسان ہوں موت ایک ہی بار آتی ہے لیکن محسوس کرتا ہوں کہ زندگی میں جتنا جینے کا حق تھا اس سے کہیں زیادہ موت کی تلخی کا مزہ چکھا ہے۔ آپ ایک بار مر جائیں کسی دل میں صبر آجاتا ہے مگر بار بار موت کی سزا کے لئے مجھ جیسے جائیں تو قرار کیسا؟ آج میرے دل کا رہا سہا قرار بھی کھو گیا ہے۔ میرے پاس جینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ جانو گی آپ میری محبت میں جتنا ہیں کیا واقعی وہ سمجھتے ہیں شہریار زندہ رہ گیا ہے؟....." پھر ایک بڑا سا سوالیہ نشان تھا۔

تانیہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اس نے آنچل سے آنکھیں صاف کیں۔ پھر پڑھنے لگی تھی۔

AANCHAL.COM.PK

"پتہ نہیں، محبت کی قسمت میں یہ سزا کیوں لکھی ہے کہ آپ جس کے پیچھے بھاگتے ہیں، وہ آپ کو نہیں ملتی۔ جب آپ اس کا ذائقہ تک بھلا چکے ہوتے ہیں تب یہ آپ کے رگ و پے میں ٹیس بن کر ناگ کی طرح کھلنے کھلنے لگتی ہے۔ میں نے بھی اس کی بہت طلب رکھی مگر اب جبکہ میرے پاس وقت نہیں بچا تو یہ ساری محبت روپ بدل کر سامنے آتی ہے اور کہتی ہے، مت جاؤ، زندگی جیو، مجھے جیو۔ مگر زندگی تو کم رہ گئی ہے۔ زندگی بہت کم رہ گئی ہے اور وانیا کی نفرت بڑھتی جا رہی ہے۔ کیا میں اس کی نفرت لے کر کون سے مروں گا؟ ایک طرف وانیا ہے اور ایک طرف شانی مگر دونوں میں سے کسی کے دل میں میرے لیے میری طلب نہیں ہے۔ میں زندہ رہوں یا مر جاؤں، کسی کے دل میں میرے لیے ہوک نہیں اٹھے گی۔ میں بھی کیا زندہ آدمی تھا جسے محبت نے نہ جینے دیا نہ چین سے مرنے دے گی۔ مگر کاش! ایسا ممکن ہو کہ جب میں اس زندگی سے منہ موڑوں تو وانیا اور شانی کا دل میرے لیے ہوک سے بھر جائے۔ وہ مجھے تڑپ تڑپ کر رو دیں۔ تب مجھے لگے گا میری محبت رائیگاں نہیں گئی۔ مگر یہ ممکن کہاں ہے؟ یہ تو خواب ہے۔ خواب بھی دیوانے کا...... میں خود سے کہتا ہوں تم تو زندگی میں ہی مر چکے ہو، بس لگتے ہو کہ زندہ ہو۔ حالانکہ اب تو صرف سانس کی ڈوری کے ٹوٹنے کی رسم رہ گئی ہے۔ ورنہ اندر ہی اندر تم کب کے خاک ہو چکے ہو۔ شانی کیا یہ خاک کبھی محبت کی مہک پہنچے گی؟"

وانیا سے آگے نہیں پڑھا گیا۔ اس نے ڈائری جگہ پر رکھی، پھر اٹھنے لگی تھی کہ سائیڈ ٹیبل پہ رکھی کیلنڈر کی تاریخ پہ اس کی نظر جا کر رک گئی۔ آج دس دسمبر تھی مگر تاریخ پچیس دسمبر پڑی ہوئی تھی۔

وہ تاریخ بدلنے والی تھی، جب اچانک وہ اندر سے ہل گئی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ پچیس دسمبر کو بھول گئی۔ بالکل سال سے اس تاریخ کو سلیبریٹ کرتے کرتے صرف چند مہینوں کی جدائی نے اس کے اندر یہ صورت حال کر دیا تھا۔

شہریار بھائی کا برتھ ڈے میں بھول گئی...... میں کیسے بھول گئی؟ ایک نئے دکھ نے دل کو دامن پکڑا اور کہیں قریب وہ پکارا۔

"اتنا دھیان مت رکھا کرو وانی ڈیئر! کبھی یہ برتھ ڈے وش بھول گئیں تو تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا، مگر یہاں اس دل میں کوئی امید مر جائے گی، بلکہ زندگی مر جائے گی۔ اور یہ بھلا دیا جانا میں اور میرا دل برداشت نہیں کر سکیں گے۔"

"وہ بھلا کیسے ممکن ہے۔ مجھے آپ کا برتھ ڈے بھول جائے، ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔" وانیا نے زعم سے کہا اور اس نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا، اگر ایسا کبھی ہو ہی گیا تو پھر بتاؤ کیا سزا دی جائے؟"

AANCHAL.COM.PK

"آپ بتایئے پھر کیا سزا دیں گے یا دینا چاہیں گے؟" شوخی سے پوچھا۔

اور اس نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کے بہت جذب سے کہا۔ "ایسا ہونا تو اگرچہ ممکن ہے، لیکن کبھی ایسا ہوا تو پھر تمہیں دوبارہ کا موقع نہیں دوں گا۔"

"کیا مطلب؟ یہ کیا بات ہوئی؟"

اس نے اسی انداز میں دیکھ کر پھر کہا۔ "مطلب یہ کہ پھر تمہیں دوبارہ سالگرہ منانے کا موقع نہیں ملے گا۔ تم تو جانتی ہو ہم اور ہماری سزائیں بھی وکھری ہوتی ہیں۔"

وہ کچھ نہیں سمجھی اور وہ کرسی پہ بیٹھ کر مدھم لہجے میں وضاحت کرنے لگا۔ "تمہیں کیا لگتا ہے تم میرا تحفہ دینا بھولو گی تو تمہارا بھائی یا کزنز برداشت کر سکے گا؟ سو جب ہم ہی نہ رہے تو کس کو تحفہ دے سکو گی؟"

"شیری بھائی! خدا کے لیے ایسی خوف ناک باتیں مت کریں۔ میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔"

"ناراض ہو کر دیکھو، تمہیں اپنے فیصلے پہ پچھتانے پہ مجبور کیا تو کہنا کس بھائی سے پالا پڑا تھا۔"

اور اب وہ یہ غلطی کر چکی تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکلی، خاموشی سے اس کی پسندیدہ کتاب، کیسٹ اور پرفیوم پیک کروا کر واپس لوٹی اور چپکے سے سرپرائز دینے کے لیے ماما کے کمرے کی سمت چل پڑی تھی۔ کمرے میں نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہ بہت گہری نیند سو رہا تھا۔ ایک پل کو اس کا دل آیا، وہ اسے جگا دے مگر دوسرے ہی پل اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ گفٹ اور پھول اس کے سرہانے رکھ کر اس نے ایک نظر اس کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر پلٹ کر چلنے لگی تھی کہ بہت تھکے ہوئے مدھم لہجے میں اسے پکار لیا گیا۔

"جا رہی ہو؟..... ابھی تک غصہ ختم نہیں ہوا مجھ پر؟"

اس نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ سرخ انگارہ آنکھیں اس پہ جمی ہوئی تھیں۔ کچھ نیند کا خمار تھا، کچھ بلڈ پریشر کا اثر۔ وہ آدھے وجود سے اس کے بیڈ کے سامنے پڑی کرسی پہ بیٹھ گئی تھی۔

"کچھ بولو گی نہیں؟" اس نے آگے ہو کے اس کا ہاتھ تھاما اور وہ دھیمے لہجے میں بول کر بولی۔ "میں جب جانتی ہوں میری غلطی اتنی بڑی ہے کہ معافی نہیں کی جا سکتی تو میں آپ کو کسی امتحان میں کیوں ڈالوں؟"

"اچھا! اتنا مانتی ہو اپنے بھائی کو اب تک؟" شہریار نے گہرا سانس لیا۔ جذباتیت ہمیشہ اس کے سینے کا درد ایسے ہی بڑھایا کرتی تھی۔ وہ اسے خاموشی سے دیکھ رہی تھی، کچھ بولی نہیں تھی اور اس نے پہلے کے سے انداز میں اس کے بالوں کی لٹ کھینچی تھی، پھر بھرائے لہجے میں بولا تھا۔

"میرا خیال تھا ہم جس سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہوں اس کی غلطی شاید کبھی معاف نہیں کر سکتے مگر آج مجھے پتہ چلا ہم جس سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں اس کی غلطی چاہے کتنی بڑی ہی کیوں نہ ہو اسے غلطی کا مارجن بھی سب سے زیادہ دیتے ہیں ماں کی غلطی پر شوہر کی ناراضگی دیکھ لیں اور معاف کرنے کا وقت آئے تو محبت انہیں ہار جاتی ہے غصہ نہیں رہتی۔ بس فرصت میں معاف کرنے کی سعی کرلی ہے۔"

"مگر میں چاہتی ہوں آپ مجھے کبھی معاف نہ کریں۔"

"ہاں...... یہ بھی اچھی خود غرضی ہے تمہاری۔" "تو پھر کیا کہتی ہیں اپنا غیر ارادے پورا؟ لطف آگیا ہو میرے لئے یہی بہت ہے۔ شکر ہے آپ جیسن سے مزید مکمل ہوگا۔"

"پھر کیسی مرنے کی باتیں؟ آپ میرے ہاتھ سے قتل ہو جائیں گے کسی دن۔"

ثریا لگا بے ساختہ قہقہہ اس کے معصوم غصے پر چھپنے لگا تھا۔ شہریار نے گہری آنکھوں سے اسے دیکھا پھر سے ہاتھ بڑھا کر مخاطب کیا۔

"یہی انداز تو مس کر رہا تھا بہنا اب نم آنکھیں تو زیادہ چمک رہی ہیں کون کہہ سکتا ہے ابھی تو بہت جینا ہے انشاء اللہ مکمل تمہارے لئے بہت سارے خواب دیکھے ہیں جب تک وہ پورے نہ ہوں جانے کا پروگرام کینسل۔"

"میرے لئے خواب؟ آپ کے اپنے خواب ان کا کیا ہوگا؟" وہ شانی کے متعلق جاننا چاہ رہی تھی۔

شہریار نے بیڈ شیٹ کے نیچے تکیہ رکھ کر خود کو اونچا کیا پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "تمہارا بابا ایک بات ہے کہ میری آنکھوں کے خواب کی جگہ ان آنکھوں نے دھار لئے۔ میں پہلے بہت ... بات ... مگر پھر ان چمکیلی آنکھوں میں ان خوابوں کو زیادہ خوش رنگ ہوتے دیکھا تو پھر تمہارے خواب تم سب کے خواب بھی اتنے سارے ہیں کہ کئی سال کہیں کھو گئے۔"

"یہ ہوئی نا بات ایسی اسپرٹ چاہئے ہماری سے ... کے لئے۔" شہریار اس کے چہرے سے کئی خوشی کو دیکھ کر اندر ہی اندر کتنا مسکرایا۔ بھلے بہت جلد آنے والا ہے ان آنکھوں سے گرا ہوا ان آنکھوں کے آنسو سے کتنا نزدیک ہیں گے۔

"آپ میرے ساتھ ہیں پھر میں کیوں رونے لگی؟ آپ مجھے روتے دیکھ کر برداشت کر سکیں گے؟"

ANCHAL.COM.PK

وہ پیچھے سے انداز میں مسکرا کر رہ گیا۔ مگر کچھ نہیں بولا اور ساتھ پڑے ہوئے موبائل کے لائٹ جلنے پر چونکا۔ "یہ یقیناً ماما کی محبت تھی۔ انہوں نے وہ بالکل آف نہیں کیا تھا، لیکن فون بند کردی تھی تاکہ وہ پرسکون سو سکے۔ اس نے کال ریسیو کی اور دوسری طرف سے گھبرائی آواز......

"مومنا! کہاں ہو بھئی؟ کیوں پریشان ہو؟...... کیا انکل کہیں چلے گئے ہیں؟...... اچھا تم بہت دیر سے کال کررہی تھیں۔ سوری میں سو رہا تھا نہیں کوئی مسئلہ نہیں تھا...... ارے میں تو یہ ہی کہہ رہا تھا تم نہیں ہوں تمہارا اکلوتا سا بھائی ہوں صرف...... تم کبھی بھی کسی بھی وقت مجھے رنگ کرسکتی ہو...... اوکے پانچ منٹ میں انکل کے ساتھ گھر آرہا ہوں۔ پھر پوچھوں گا۔ یہ نوبت کیوں آئی۔" اس نے موبائل آف کیا۔ شہربانو کی طرف دیکھا۔ وہ اداسی اس کے لہجے پر آکر رک گئی تھی۔

"یہ مومنا آپ کی بہن کب سے ہوگئی؟"

وہ ہنس دیا۔ "پگلی۔ یہ بھی پاپا کے دوست کی بیٹی ہے۔ وہ بہت عرصے بعد گم ہوئے ہوئے ہیں۔ مجھے بھائی کہتی ہے اس لیے کہ ان کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ تم تو راز ہی سے سوچ۔"

"ان کا بھائی نہیں ہے کی وضاحت؟" وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

موڈ آف تھا اور وہ شہربانو کی بس ہنسا سمجھتا تھا۔

"کیا بات ہیں، انوشے ہیں، ہماری مومنا اور مونا بھی ہیں۔"

"ٹھیک ہے آپ کے پاس تو ایک لمبی لسٹ ہے۔ بابا تو اب کہیں آ کے گئی ہی نہیں۔"

"اوہ بابا کی بجائے جانے گی؟ بابا تم جو میرے لئے ہو کوئی اور نہیں ہوسکتا۔"

"بس۔ رہنے دیں آپ۔" اس نے ہاتھ جھڑا۔

"پھر اداس ہونے کی کوشش ہو تو مجھکو کھو دو گی تم۔"

"رہنے دیں آپ۔" اس نے جھٹکا ہوا سا اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور وہ خوشی سے مسکرا دیا۔

AANCHAL.COM.PK

"بہت اچھا ہو رہا ہے بھئی، جہاں بانو سے نکلتے تمہیں وہ تمہاری زندگی اور صحت کی منتظر کشتی کرتی ہوں گا اس طرح پارٹی نہیں بدل سکوں گی۔"

وہ شرمندہ نظر آنے لگی۔ "آئی ایم سوری بھیا! میں واقعی بہت تھکی ہوں۔"

"چھوڑو یار، میری کیوٹ Sis کتنی تھکی ہوئی ہے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا؟" اس نے پسینے سے تر پیشانی دیکھ کر پوچھا اور وہ بے وقت مسکرا کر بولا۔

"کچھ خاص نہیں، تمہارے واپس آنے کی خوشی میں وہ شٹ ڈاؤن کر پا رہا کم بخت۔"

"آپ کی طبیعت خراب ہے بھائی، مت جائیں۔" اس نے کندھے پر ہاتھ رکھا اور وہ مسکرانے لگا۔

"تم جانتی ہو نا، اب میں بالکل ٹھیک ہوں، تم نے سات سال تک جو راتیں رو کر جو سات سال گزارے تھے، وہ ایک دن کی خوشی سے یکدم ایک صدی جتنا لمبا ہے ہیں۔ وقت برف بنا ابھی آتا ہوں۔ پھر مل کر ساتھ کھانا کھائیں گے۔"

دانیال نے ڈرتے ڈرتے دل کے ساتھ سے جانے دیا تھا۔ ماما نے اسے شام گئے نکلتے دیکھا تو پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک نہیں لگ رہی؟"

"اوہ ماما! کچھ خاص نہیں، ایک ضروری کام آ گیا ہے، ایک گھنٹے تک واپس آ جاؤں گا۔"

دانیال نے ماما کے کہنے پر سوچا واقعی اس کے ہاتھ کتنے گرم تھے۔ وہ بات بھی نہیں کر سکی۔ سو بار دعا کے قریب ہونے کی بجائے پھر سے محنت کرنی پڑے گی۔ وہ محنت کرنے چل پڑی۔

❁❁❁

انوشے اور عارف کے ساتھ گھر آئی تھی۔ عارف نے اپنے پاپا کا قرضہ چکا دیا تھا۔ مسٹر جاوید سے مسٹر جواد حسن کی بہت گہری چھن رہی تھی۔ مسٹر جاوید سارے چال باز ہیں کے بعد جو جھڑے میں تھے۔ ہاں، بس عارف باپ سے الگ ہو کر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں مارکیٹنگ آفیسر کی جاب کر رہا تھا۔ اس کی زندگی بالکل بدل گئی تھی اور انوشے، عارف کے ساتھ خوش بھی، ایسی ہی بدل گئی تھی کہ اسے حیرت

AANCHAL.COM.PK

ہو گئی تھی۔ حسن کا غرور، دولت کا نشہ، غصہ بہت جبری غصہ، چھین لینا، کوئی بھی تو عادت اس میں زندہ نہیں بچی تھی۔ محبت نے جب سے اس کے اندر سانس لی تھی، باقی ساری باتیں، جیسے اسے خوبیوں کی باتیں لگنے لگی تھیں۔ عارف جو اکا وہ ایسے خیال رکھنے لگی تھی، جیسے وہ اس کا جیون ساتھی نہیں اس کی اولاد ہو۔ اور شاید ہر مرد عورت کے اندر ممتا کو محسوس کرتا ہے اور چاہتا ہے، وہ محبوب بھی ہو اور مشکل میں بالکل ماں بن کر اس کے درد کو چرا لے۔ اور وہ یہ نکتہ سمجھ گئی تھی۔ عارف اب اس کی پروا کرنے لگا تھا۔ اس کے خلوص نے اسے آہستہ آہستہ جیت لیا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا وہ عارف کے سامنے جا کر کھڑی ہو جائے اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس کے دل میں اترے اور پتہ لگائے، کیا وہ اب بھی چھپے چھپے ثانی سے ملتا رہتا ہے؟ جب وہ خاموش ہوتا ہے تو کیا وہ ثانی کی آنکھوں کے گھر میں رہتا ہے، جیسے لگتا ہے؟

مگر شہریار نے ایک بار اس کا یہ خیال سنا تو بہت دلداری سے کہا تھا۔

”مت کرنا سسٹر! ایسا کبھی مت کرنا۔ تم جو اس کی آنکھ میں ہو، اگر وہ تمہارے سوال سے اپنے دل میں اتر گیا، ہمیشہ ہی ان آنکھوں کے گھر میں بیٹھ گیا تو تمہاری چاہت کا کیا ہو گا؟ اسے اپنی آنکھوں اور ثانی کی چھپے چھپے کی جانے والی محبت کے گھر میں کبھی کبھی جانے دیا کرو۔ راستہ روکو گی تو وہ ہاتھ جھٹک کر اسی سمت چل پڑے گا، جس سمت سے تم اسے دھیرے دھیرے واپس لائی ہو۔“

اور اس نے یہ مشورہ مان لیا تھا اور اب ایک خوشی کا رستہ تھا، جو اس کا منتظر تھا۔ ایک نئی زندگی اس کے دل میں محبت لائی تھی اور عارف غیر متوقع ان گن رہا تھا اور وہ خود جو بچوں کی بے حد شوقین تھی وہ خود کی اس خوشی کے استقبال کی تیاریاں کرنے میں پیچھے نہیں تھی۔ ثانیہ، ماما کو ڈاکٹرز نے مینٹل ہاسپٹل بھیج دیا تھا اور اسے اس کا کوئی دکھ نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے پاس عالیہ مام جیسی ماں موجود تھیں، جنہوں نے اس کی ہر تلخ اور نازیبا بات سن کر بھی اس کا ہاتھ نہیں جھٹکا تھا۔ وہ عالیہ مام کی گود میں سر رکھ کر دنیا و مافیہا سے بے پروا ہو جاتی تھی۔ علاوہ ازیں اس کی خیریت پوچھنے کے لیے روز فون آ جاتا تھا۔

اس وقت مزے سے عالیہ مام کی گود میں سر رکھ کر اچھے دنوں کے خواب بن رہی تھی۔ عالیہ مام نے آج آف کیا تھا اور اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں ڈسکس کر رہی تھیں۔ عارف، مراد اور ولائم کے ساتھ کیرم پر گیم کھیل رہا تھا۔ ہر طرف بہت آسودگی تھی۔ وہ بہت مزے سے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک شہریار کھنکھارتا ہوا دھماکے کرتا اندر آ گیا۔

انوشے نے سائیڈ پر چادر پیشتر ہی سے سنبھال کر لیا تھا اور شہریار مجھ عالیہ سے سلام دعا کرتا صوفے پر بیٹھ کر انوشے کی خیریت دریافت کرنے لگا تھا۔ عارف نے اسے خوشخبری دے دی تھی اس لیے وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

"بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو شہریار؟" بیگم عاقب نے ریفریجریٹر سے اس کے لئے جوس کا ٹن نکالتے ہوئے محبت سے سوال کیا اور وہ مسکرا کر جوس لیتے ہوئے اپنے آفس کے دن کی روداد سنانے لگا۔
اس نے جوس کے ٹن کی ٹھنڈک سے اپنے اندر کی تھکن کو ریلیز کیا جو اسے مسز ارسلان راشدی کو ڈھونڈنے میں لگانی پڑی تھی۔ وہ حقیقت انہیں سمجھا چکا کہ شافعہ، وحیدہ اور وجاہت کے لئے واپس ان کے گھر چھوڑنے آیا تھا۔ مسز ارسلان راشدی صرف شافعہ، وحیدہ اور وجاہت کی خاطر واپس لوٹی تھیں لیکن انہوں نے آسٹریلیا کا فیصلہ بالکل ترک کر دیا تھا لیکن کیا اس کی سزا اسے اس کی ماں کی تکلیف میں دی گئی تھی۔ جو زندہ رہتے ہوئے انہوں نے جھیلی اور مرنے کے بعد سے اب تک جھیلتی آ رہی تھیں۔ مسز ارسلان راشدی نے وحیدہ کو اپنے پاس رکھنے کی درخواست کی تھی تاہم ان کے انتقال اور فیصلے کو ماننے کی آرزو کے ساتھ۔ بیگم عاقب نے اس سے مشورہ مانگا تھا اور اس نے بھی کہا تھا وحیدہ کے حق میں بھی بہتر ہے کیونکہ جو آپ کی محبت کھو چکی ہے وہ کبھی اس کا ازالہ کر سکے۔ مسز ارسلان راشدی حقیقتاً ان کے حصے میں کی جانے والی کوتاہی کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہیں تو انہیں ایسا کرنے دینا چاہئے کیونکہ وہ ایسا نہیں کر پائیں تو جاندار سے مر چکی ہیں اپنا بچہ کھو کر نے وہ اندر سے بھی مر جائیں گی اور جدوجہد کرنے کے لئے زندگی میں امید کا ہونا بہت ضروری ہے۔ بیگم عاقب کو یہ بات سمجھ آ گئی تھی اور انہوں نے وحیدہ کو جانے دیا تھا۔

"کیا بات ہے آج بہت چپ لگ رہے ہو شہریار؟"

شہریار نے نیم وا آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا اور آہستگی سے بولا۔ "بیگم! مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی تھی۔"

بیگم عاقب نے چونک کر اسے دیکھا، پھر آہستگی سے اٹھ کر دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم کی سمت بڑھتی چلی گئیں۔ پھر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"ہاں کیا کہنا چاہتے تھے شہریار؟"

"بیگم! آپ کو روشنی نے اپنی بیٹی کے متعلق کیا بتایا تھا؟"

"اس نے کہا تھا میری بیٹی مر گئی ہے۔"

"آپ کو معلوم ہے بیگم انہوں نے ایسا کیوں کہا تھا؟" وہ دھیرے سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔ میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ مطلب سے بھی مجھے یہ بات معلوم تھی کیونکہ انہوں نے بھی یہی کہا میری بیٹی مر گئی ہے۔"

AANCHAL.COM.PK

"آپ نے یہ پوچھا جاذند کس کی بیٹی ہے؟" اس نے اگلا سوال کیا اور نجم عافیہ کے وجود میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" وہ ایک دم کسی چیز نری سے بولیں۔ "وہاں سب کا کہنا تھا وہ ہماری زندگی کی دشمن کی اولاد ہے، جس نے خودکشی کی تھی اور اس کی وجہ......"

"ایک منٹ، آپ پاپا کو غلط جج کر رہی ہیں۔ یہ وہ کہانی ہے، جو جاذند کو پاپا کے سامنے لانے کے لئے بنائی گئی تھی۔ آپ نے بات کی تھی۔ کیا آپ جانتی ہیں ماما، پاپا جیسے انسان نے کس سے سچی محبت کی تھی؟"

نجم عافیہ اس کی طرف مسمرائز ہو کر دیکھے جا رہی تھیں۔ تب شہریار کے لب پھڑپھڑائے۔ "وہ مسز عطیہ سے محبت کرتے تھے۔ ٹوٹ کر محبت۔ آپ جانتی ہیں ماما! کسی سے محبت کی جائے تو یہ محبت اسے کتنا الگ، کتنا مختلف کر دیتی ہے۔ یہ سچی محبت ہوتی ہے جو ایمان بن جاتی ہے، جنون بن جاتی ہے، محبت میں ہر چیز کو بنا دیتی ہے۔ پاپا نے بھی اسی محبت کو سر جھکا کر عزت و احترام کی طرح ارسلان کے حوالے کر دیا۔ کیونکہ مسز عطیہ ارسلان سے جنہیں ارسلان سے محبت کرتی تھیں، میرے پاپا بہت قابل عزت ہیں ماما، وفا اور سنسٹیو ہیں ماما اور آپ بھی، کیا وہ کسی کی جان لینے کا سبب ہو سکتے ہیں؟"

نجم عافیہ ان آنکھوں سے اسے دیکھے گئیں اور وہ بے بسی سے ہنس کر مزید بولا۔ "محبت کی ہی.... ماما! محبت بہت خوبصورت کہانی ہے، اپنی راہوں میں رلا دیتی ہے۔ پھر کون جانے کون کیا، سب ایک ہی وقت میں ان کو جوڑے رکھا۔ باقی کچھ نہیں بچتا، باقی رہ جاتا ہے نام محبت کا۔"

"تم نے محبت کی ہے کیا؟" بہت الگ سوال۔ وہ ان کا سوال سن کر ان کے لہجے میں گم ہو گیا۔ ایسے ہی لہجے میں شاید پہلے کسی نے مذاق سے کہا تھا۔

"مجھے ارسلان راٹھوری سے محبت ہو گئی ہے۔ یہ محبت بھی ماں، انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتی۔ شاید تقدیر کر دیتی ہے۔ شہریار..... ایک نظر کا تقاضا ہوتا ہے محبوب کی ایک جھلک کا منظر۔ وہ بار بار ہو اور دل چاہے اور بس وقت تھم جائے۔ سنا تھا تم نہیں جانتی یہ محبت کیا ہے؟"

اور آج بالکل ویسی ہی، وہ سم کسی اور وقت میں کوئی اور ان محبت کا ذکر کر رہا تھا۔

"تم نے بتایا نہیں، تم نے کبھی کی ہے محبت؟"

شہریار نے گہرا سانس لیا، چہرا آہستگی سے ہوا۔ "محبت..... شاید محبت سے میں نے ٹوٹ کر محبت کی، لیکن اس کا ترجمہ کسی سے محبت نہیں ہو سکی۔ ہاں ماما! کچھ لوگ محبت سے محبت کرتے ہیں

لیکن محبت کا دل ان کی طرف نہیں مڑتا۔ اور کچھ لوگ محبت کو اپنی احتیاجات میں سب سے آخر میں رکھتے ہیں، لیکن محبت ان کی جھولی بھرتی جاتی ہے۔ شہیر بتائیے، یہ بتائیے آپ، آپ میرے پاپا کو مورد الزام تو نہیں ٹھہرا رہیں نا ماں؟"

"لیکن مانی زلفی نے جو کہا، طلعت جہاں نے جو کہا، وہ سب تو سچ نہیں سمجھتا ماں۔"

"بیگم اشفی بیگم نے جو کچھ کہا وہ اس سے دستبردار ہو چکی ہیں کیونکہ انہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ صرف مجبوری کے تحت کہا تھا۔ وہ طلعت جہاں کے رحم و کرم پر تھیں اس لئے انہوں نے وہی کیا جو کہا گیا۔

لیکن پھر بھی انہوں نے آپ کو کچھ نہ کچھ ابہام میں رکھ کر بتانے کی کوشش تو کی پائی تھی۔"

بیگم عافیہ نے پرسوچ آنکھوں سے دیکھ کر کچھ سوچ کر سر ہلایا اور شہریار نے مزید کہا۔

"زرمین طلعت جہاں تو وہ آپ کی اور بیگم عافیہ کی بڑی مخالف تھیں، آپ سے زیادہ کون جانتا ہے۔ پھر پاپا جب بیگم عافیہ کے پاس مراد ملان راشدی کے پیغامات لے کر جاتے تھے تو طلعت جہاں ان کی اس پذیرائی پر جل تل جاتی تھیں۔ وہ واقعی خوب صورت تھیں کہ ایک بار نظر اٹھ کر رکا بھول جاتی تھی مگر پاپا نے انہیں کبھی نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ طلعت جہاں پاپا کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھیں، بس یہ تھا کہ ان کی انا کو ٹھیس پہنچی تھی۔ مسعود کبھی بھی نظر میں آنے کا سوچ گوارا نہیں چاہتی تھیں۔ پھر بیگم عافیہ جو ان کے سامنے مراد ملان راشدی کی محبت کے زعم میں روبرو آنے لگی تھیں تو انہیں لگتا تھا یہ پاپا کی محبت کا زعم ہے۔ سو وہ ان کی مخالف ہوتی چلی گئیں۔ جنگ بڑھتی گئی۔ پھر بیگم! آپ کے فرار ہونے اور مسٹر علیم سے شادی کے بعد منظر عام پر آنے پر طلعت جہاں غم و غصے میں پاگل ہو گئیں۔ اس کام میں بیگم زلفی کی حسن بکن نے آپ کا ساتھ دیا تھا۔ طلعت جہاں نے انہیں بھی مار دیا۔ وہ سفاک عورت ہیں بیگم اپنے مطلب کے لئے، اس مطلب کو حاصل کرنے کے لئے وہ کسی بھی حد تک جا سکتی ہیں، وہ کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ آپ تو اچھی طرح جانتی ہیں ناں؟"

بیگم عافیہ اسے دیکھتی رہیں، پھر آہستگی سے بولیں۔ "تمہاری باتیں سب مان لوں مگر زلفی نے کہا تھا کہ......"

"بیگم پلیز! اقرار اور صرف گواہی کو اپنے ضمیر اور زندگی سے بوجھ اتار لینے سے مجرم معاف کر دیئے جانے کے قابل ہی لگتا ہے اور مظلوم مظالم سے نیچے پا میدان پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ بیگم عافیہ! یہ دنیا ہے۔ یہاں کے ضابطے، کہانیاں ان پر یقین کرنے لگ جائیں ماں تو زندگی جینے کے قابل نہیں لگتی۔ خود وہاں موجود تھیں آپ۔ لیکن آپ بھی انہیں اچھی طرح نہیں سمجھ سکیں۔ آپ کے جانے کے بعد

حشمت جہاں نے بانی زرشی کی یکن کو قتل کروایا جسے خودکشی کا رنگ دیا گیا، سامنے کی بات ہے۔ مدرِ مانی زرشی کی؟ شیم تو میں نے ابھی بتایا وہ محض مجبوری کے تحت کی گئی تھی۔ مگر جب سے ہم زرشی کو دوبارہ دوش کیا ہے وہ بہت سی سچائیوں پر سے پردہ اٹھاتا ہے۔ مانی زرشی کی یکن کو حشمت جہاں نے اپنی یکن شو کیا اور جانا نہ کو شروع سے جتایا کہ ان کی ماں نہاں یکن جو کہ خود اس کی ماں تھیں، کی خودکشی کی وجہ میرے پاپا تھے، جس کا بدلہ اسے ان سے لینا تھا۔ کیونکہ میرے پاپا نے پہلے ان کو بہترین باغ دکھائے اور انہیں تسلیم کرنے کے وقت وہ ان کو اندھیری گلیوں کا طعنہ دے کر چلتے بنے۔ جانا نہ کو انہوں نے یہ بات کر رکھا ہے ہم دونوں کے اشاروں پر اس طرح چلتی ہے، جیسے کوئی کٹھ پتلی ہو۔ وہ جانا نہ کو بہانا کی استعمال نہیں کرتیں اسے اپنے خسارے کا کچھ پتہ نہیں ہے ہم اور میں جان گیا ہوں۔ کیا آپ وہ جانتی ہیں جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں؟"

بیگم ثاقب کے ذہن میں یکدم جھماکا ہوا۔ وہ واقعی اب تک اس کی بات نہیں سمجھی تھیں مگر اس کی ساری باتیں ایک دم سے ان کے اندر بے حد سموں گزر رہی تو انہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے ان کے چہرے پر ہاتھ رکھ کر بے قراری سے کہا تھا۔

"تم....... تم کہنا چاہتے ہو کہ جانا نہ میری بیٹی ہے۔" ان کی آواز بہت تیز ہو گئی تھی۔ اس وقت کھٹکے سے گرنے کی آواز آئی تھی۔ دونوں نے مڑ کر دیکھا تھا۔ بہت خوبرو تیج جانا نہ زرد رنگت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"ممی ہاں...... ممی تو...... میرا دل چاہ رہا تھا آپ سے ملنے کو۔" بے ربط جملے بے تحاشہ بہ رہے تھے......

بیگم ثاقب نے دوڑ کر جانا نہ کو اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔

"مجھے لگتا تھا، جب جب تم مجھے نظر آتی تھیں، میرے اندر میری ممتا ابال کھاتی تھی کہ تم سے کوئی رشتہ ہے میرا، لیکن تم نے حشمت کے سکھائے گئے انداز اور رشتے بنا لیے۔ یکن کی بھی بانہوں سے جب کہا تمہاری ماں ہے۔ تو میرا دل اندر سے بجھ گیا تھا مگر وہ یکن میرا دل کتنا سچا تھا۔"

جانا نہ ان کی بانہوں میں یا لگن سکتے کی کیفیت میں تھی اور شہریار جیسے اس منظر سے لطف اٹھا رہا تھا۔

پھر وہ گھر چلا گیا تھا اور اس کی گاڑی رکتے ہی دانیا بہت تیزی سے سیڑھیاں اتر کر اس تک پہنچی تھی۔

AANCHAL.COM.PK

"یہ ہے آپ کا ایک گھنٹہ؟" وہ غصے سے بھناتی ہوئی تھیں اور اس نے مسکرا کر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔

"پلیز ماما! میں خاصا تھکا ہوا ہوں کہ تمہاری خفگی کا بار نہیں سہہ سکتا۔"

مانیا نے بےقراری سے اس کا چہرہ دیکھا۔ واقعی حد سے زیادہ وہ زرد ہو رہا تھا۔

"آپ انکل حماد سے کہہ کے سر سے چیک اپ کیوں نہیں کروا لیتے؟ آخر مسئلہ کیا ہے، جو میڈیسن مسلسل لینے کے باوجود آپ کی طبیعت سنبھل نہیں رہی؟" اس نے شہریار کے ہاتھ سے اس کا کوٹ لیا جو اے سی کی کولنگ کے باوجود آ جانے والے پسینے کی وجہ سے اس نے اتار لیا تھا۔ مانیا آگے بڑھ کر رہی تھی اور شہریار کا دل چاہ رہا تھا وہ اس چہرے کے ان ٹیڑھے سے یکدم سے غائب ہو جائے۔

"آج کل آپ بہت چپ چپ رہنے لگے ہیں۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس کچھ بزنس کے معاملات ہیں۔"

"بزنس سے یاد آیا، ماما! ویڈیو میں ہم ابھی دیکھ رہے تھے ہیں ماں۔ آپ کا کون سا ایڈ آ رہا ہے؟"

شہریار نے ذرا شش و پنج کے بعد صوفے پر لیٹنے کے انداز میں اس کا سوال سنا، پھر آہستگی سے بولا۔ "جائے گا تمہارے پسندیدہ خوشبوؤں کی مہک گھر بار کی بہتر۔"

مانیا چونکی۔ پھر آہستگی سے بولی۔ "یا شہریار! واقعی مجھے بھی پسند تھا آپ نے اس کے لیے کون سا ماڈل سلیکٹ کیا ہے؟ فضول لڑکی کے ساتھ کیچپ نہ پر کس کا کام کیا ہے؟"

شہریار نے ہولے سے آنکھیں بند کر کے کچھ لمحوں اور قرار سے بولا۔ "اچھا! مجبوری ہے ماں، ان کا کام چکے ہے۔ سے کیا جاتے۔ پاپا نے اعتراض کیا تھا، تمہاری محنت ہے۔ مگر میں نے کہا بھائی کو بھی تھوڑی شہرت مل جائے تو کیا ہے۔"

وہ شرمندہ لگ رہا تھا۔ مانیا نے جواب میں اسے آنکھیں دکھائیں مگر وہ اس وقت سمجھا جب وہ کمرے سے چلی گئی تھی۔ مانیا کس سے مخاطب ہے۔ یہ لازمی تھا سا اور عبدالرحمٰن ضرور سمجھتے آ کے کیونکہ اس کی محبت سے وہ صرف شہریار کو بکھا کرتی تھی اور آج تک شہریار سے اس کا بکا کا تکلیف سے بھاری ہو رہا تھا دونوں گلے ہی ہو گئے۔

"تم اس انسان سے مخاطب ہو...... وہ وہ بھی اس لہجے میں؟ مانیا! یہ تمہاری بے نیازی کے بھی قابل نہیں ہے اور تم اس پہ اپنی خالص محبت لٹا رہی ہو۔"

بابا کچھ کہنا چاہتی تھی مگر سالار عبدالرحمٰن نے اُسے کالر سے پکڑ کر کھینچ لیا تھا۔ "تم خود کو سمجھتے کیا ہو، لوگ تمہارا دیا کھا رہے ہیں، تمہاری دی گئی عزت پہ جی رہے ہیں؟ ایک بزنس کمیونٹی میں مسٹر عبدالرحمٰن کا بیٹا ہوں۔ سالار عبدالرحمٰن۔ آج بھی اپنے بابا کے نام سے نہیں اپنے نام سے بزنس کمیونٹی میں اپنے کام کی وجہ سے جانا جاتا ہوں۔ لیکن تم کیا ہو؟ اگر بابا تمہاری پشت پہ نہ ہوں تو لوگ تم سے یہ ادھار کا نام بھی لے لیں۔ شہریار عبدالرحمٰن! یہ نام بھی بابا کی محبت کی بھیک کی طرح تمہاری جھولی میں ڈالا گیا ہے۔" انہوں نے اسے جھٹکے سے صوفے پہ دھکیل دیا تھا۔ کہاں وہ صرف خفگی کا اظہار کرنے کی بات کر رہا تھا، کہاں اسے اندر سے بلا لیا گیا تھا۔ مگر وہ بت کی طرح صوفے پہ دھنسا رہ گیا تھا۔ ماما کی کوریڈور میں تیز تیز بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

"تم آخر خود کو سمجھتے کیا ہو؟ بڑے مغرور ہو گئے ہو۔ لیکن ابھی بھی میں تمہاری ماں ہونے کا حق برقرار رکھتی ہوں۔"

"مگر آپ آج کل اس حق کو کسی اور پہ بے جا لٹا رہی ہیں۔ وہ آپ لوگوں کی محبتوں کے قابل نہیں ہے۔"

بابا تیزی سے باہر دوڑی تھی اور ماما آج اٹھ کرنے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ سو سالار عبدالرحمٰن کو انہوں نے کندھے سے پکڑ کر دیوار سے لگا دیا تھا۔ پھر غصے سے پھنکاری تھیں۔

"اب تم ہمیں بتاؤ گے کون ہمارے قابل ہے یا نہیں؟...... تم مجھے بتاؤ گے شہریار کس قابل ہے۔ اگر میں کہوں کہ مجھے آج کل تمہاری حرکتوں اور کمترین دماغ سے سوچی ہوئی باتوں کو سن کر تم سے گھن آنے لگی ہے تو تم کیا کہو گے؟ تم نے کون سا الزام ہے، جو شہریار پہ نہیں لگایا۔ مگر اس نے آج تک پلٹ کر تمہیں کوئی جواب نہیں دیا تو کیا یہ اس کی کمزوری ہے؟ نہیں۔ یہ اس کے اچھے ہونے کی دلیل ہے۔ تم ہمیشہ چیخ چلا کر جو خوف کری ایٹ کرتے رہتے ہو تو یہ تمہارا مان ہے کہ لوگ تمہارے آگے چپ رہتے ہیں لیکن سالار یہ صرف تمہارا ڈر ہے۔ تمہارے باتوں اپنی عزت کی دھجیاں اڑ جانے کا ڈر۔ لوگ تمہاری عزت نہیں کرتے تم سے ڈرتے ہیں۔ ہمیشہ غصہ آپ کی طاقت کا اظہار نہیں ہوتا، آپ کی کمزوری کی دلیل بھی ہوتا ہے بیٹا...... اور یہ تمہارے ساتھ اکثر ہوتا ہے۔ تم شہریار سے خود کو ہر لحاظ سے کمتر پاتے ہو اس لئے اس کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دی ہے تم نے۔"

"ماما! آپ...... آپ میری خاموشی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔" سالار عبدالرحمٰن بھنا کر بولے تھے مگر اس شخص کے لہجے میں زور نہیں تھا اور ماما نے اسی لہجے میں کہا تھا۔

"نہیں، میں تمہاری خاموشی کی محتاج نہیں۔ تم جتنی چاہے طاقت سے چلانا چاہتے ہو چلا سکتے ہو۔ لیکن میرا ایک ہی جواب ہوگا۔ شہریار میری ساری اولاد میں سب سے اچھا انسان ہے۔ مجھے اس کی ماں ہونے پہ فخر ہے۔"

"شیری بھائی!" دیبا جو ابھی لوٹی تھی، سکتے کی کیفیت میں دہلیز کا سہارا لیے کھڑے شہریار کو دیکھ کر کانپ گئی تھی۔ "آپ ٹھیک تو ہیں شیری بھائی؟"

شہریار کی نم آلود آنکھیں اس پل بہت بجھی تھیں، پھر اس کے لب کانپے تھے۔

"ان لمحے...... دیبا اگر اس لمحے میں مر بھی جاؤں تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ واقعی محبت رائیگاں نہیں جاتی، آج مجھے یقین آگیا ہے۔"

"ہاں۔ مگر محبت صرف جدائی نہیں ہے۔" دیبا نے اس کو ذو معنی کہانی کا سرا تھمایا تھا اور وہ ماہ کے پیچھے پیچھے اس ہوٹل کے اختتام ... تک میں چلا گیا تھا۔ ماہ اس کے لیے جیکٹ ... میں ڈال رہی تھی۔ وہ پیچھے سے اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ماہ نے ... بہت سے مسکرا کر اسے دیکھا تھا مگر وہ اپنی ہی دھن میں تھا۔ اس نے کسی کی طرف نظر نہیں کی تھی۔ خاموشی سے ماہ کے گرد بانہیں حمائل کر دی تھیں۔

"خیریت، بڑا پیار آ رہا ہے مجھ پر؟"

وہ ہنس دیا تھا۔ "ماہ! آپ پر کب نہیں آتا تھا۔ بس موقع اب مل رہا ہے۔ ورنہ تو آپ تو دیبا کی تھیں شہریار کے لیے۔"

"پاگل!" ماہ نے گردن موڑ کر اس کی بانہوں کا حصار برقرار رکھتے ہوئے اس کے گال کو تھپکا تھا اور وہ اس کے کندھے پر سر ٹکا کر ایک لمحے کے لیے ہر طرف سے غافل ہو گیا تھا کہ بس یہ جاگتی ہوئی آواز نے اسے دوسرے لمحے بے کل کر دیا تھا۔

"سب کچھ چھوڑ دو بس، دیبا، دولت، شہرت، سب کچھ لیکن کیا اس کے لیے ماہ کو چھوڑ کے جانا آسان ہوگا؟ اس کی جان تو ان ہی میں اٹکی رہے گی، ہمارے بعد میری ماہ کا کیا ہوگا؟ مجھے اتنی زیادہ شدت نہیں رکھنی اپنی محبت میں کہ ان کا سانس لینا دشوار ہو جائے۔" یکدم دل نے تنبیہہ کیا اور اس نے بانہوں کا حصار توڑ دیا۔

"خیریت، اچانک کیا ہوا تمہیں؟" ماہ نے اس کے آہستگی سے خود سے الگ ہونے پر حیرت کا اظہار کیا کیونکہ ان لمحے آشنائی کا ساتھ شہریار بے نیازی سے اس کے لمس میں ... "کچھ نہیں ماہ!" کہتا اپنے روم کی طرف بڑھتا چلا آیا تھا، پھر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ جاذب کا فون آگیا۔

"تم بہت الگ انسان ہو سب سے بہت کم۔ میں نے تمہارے ساتھ انصاف کیا اور تم......" شہریار کچھ نہیں بولا تھا اور وہ پھر سے بولی تھی۔ "تم اگر اتنے اچھے انسان ہو جتنا شہریار ہے، پھر تم نے ماہ کے ساتھ مس بی ہیو کیوں کیا؟"

"میں نے ذینی کے ساتھ کیا کس بنا پر کیا جانتے ہو؟" وہ ابھی حیرت میں آ گیا تھا اور جاننا اس کی ذہن میں ہوتی تھی۔

"اگر تمہارے پاپا اتنے بلند کردار انسان تھے تو تم نے اس کی تربیت میں رہتے ہوئے ذینی کی زندگی کیوں برباد کی؟ وہ لڑکی تم سے محبت کرتی رہی تم نے اس سے رشتہ جوڑا، ذینی کا تحفہ بھی ملا اسے تم سے لیکن جذبات اس رشتے کو جسٹیفائی کرنے کی آئی تو تم مکر گئے۔ تم نے اسے ذلیل کیا، اتنا زیادہ اتنا زیادہ کہ اس نے خودکشی کی کوشش کی۔ میں بروقت پہنچی، مگر وہ حادثہ پچی تھی کہ اس صدمے سے باہر نہ آ سکی اور ایک دن ایک ایکسیڈنٹ میں اس کی موت ہو گئی۔ تم اور میں ایک ساتھ پہنچے تھے اس اس موت پر نوحہ گری کرنے، لیکن اس وقت بھی میں نے تمہارے چہرے پر کوئی احساس نہیں دیکھا تھا اور تب میرا دل چاہتا تھا میں تمہیں بھی ایسے ہی مسخ شدہ لاش کی طرح کہیں دیکھوں، تمہیں جان سے مار دوں۔ پھر میرے دل نے کہا نہیں، یہ تو بہت آسان موت ہے۔ اس کے لیے تو یہ بہتر ہے تمہیں جس جس سے محبت ہے، میں تمہیں ہر اس شخص سے دور کر دوں، تم اپنی ہر محبت کھو دو، تم جن سے محبت کرتے ہو وہی تم سے نفرت کرنے لگیں۔ پھر کہیں ذینی کے قتل کی سزا پوری ہو گی۔ میں صرف تمہارے پاپا سے اپنی خالہ کا بدلہ لینا چاہتی تھی، لیکن اس میں اس وقت کے ساتھ ساتھ گرہ پڑ گئی تھی۔ شاید میں گزری بات بھول جاتی مگر ذینی جیسی دوست کی بھیانک موت میں کبھی نہیں بھول سکتی اور تب میں نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ میں شہریار کو سانس سانس وار پر چڑھاؤں گی۔ میں کامیاب بھی تھی مگر تم...... تم نے راستہ کیوں بدل لیا؟"

شہریار بے بسی سے ہنسا تھا پھر نرمی سے بولا تھا۔ "تم نے کبھی یہ نہیں سوچا جانے! جو ہاں اتنا بڑا جھوٹ کہہ سکتی ہے، وہ دوسرا جھوٹ کیوں نہیں کہہ سکتی۔ جھوٹ بولتے ہوئے صرف زبان ایک بار لڑکھڑاتی ہے، ہاں پھر اسے عادت ہو جاتی ہے۔ کیا سمجھیں؟"

"تم...... تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

شہریار نے گہرا سانس لیا تھا اور آہستگی سے بولا تھا۔ "صرف اتنا ہی کہ ذینی مری نہیں ہے، وہ زندہ ہے۔ اگر ملنا چاہو تو میں تمہیں اس کا پتہ دے سکتا ہوں۔"

"تم...... تم جھوٹ بول رہے ہو، تم جانتے ہو کوئی فیلڈ ثابت کرنے کے لیے جھوٹ بول رہے ہو، ہاں؟ میں نے تمہارے ساتھ اتنا برا کیا، اس لیے تم مجھے ذہنی طور پر ٹارچر کرنا چاہتے ہو ہے ناں؟ کیونکہ میں نے...... میں نے خود اپنی ذینی کی لاش دیکھی تھی، وہ ذینی ہی تھی۔ تم سچ نہیں کہہ رہے، یہ بھی ویسا ہی جھوٹ ہے جیسا تم نے ایک بار کہا تھا تم جانتے ہو میرا شیرازی کہاں ہے؟"

"ہاں، میں جانتا ہوں تمہارا شیرازی کہاں ہے۔"

AANCHAL.COM.PK

"تم پاگل ہو، کیوں لال پیلی ہو رہی ہو، جو سب جانتے ہو آج تک میں تمہیں جان سکی، میرا شیرازی کہاں ہے اور تم جانتے ہو، ذرا جھوٹ بولتے ہو۔" وہ ہذیانی ہوگئی اور اس نے پہلے سے بھی آہستہ لہجے میں کہا۔

"ہاں، میں سب جانتا ہوں۔ کیونکہ میں آنکھیں اور کان کھلے رکھتا ہوں۔ میں سچ جاننے کی سٹرگل کرتا ہوں، کسی کے کہے ہوئے سچ کو حرفِ آخر نہیں مانتا، تم دیکھو اپنے گرد تمہیں خبر ہونے جائے گی تم کتنی حماقتوں سے اب تک بچتی آرہی ہو۔ جاؤ نا، مجھے تم پر ترس آتا ہے، رحم آتا ہے۔"

جانانہ کچھ کہنے رہ گئی تھی۔ رشید رکھا ہے خاموش کھڑی تھی اور عین اسی وقت سطوت جہاں کی تیز آواز سنائی دی تھی۔

"میری ماں یہاں سولی پہ لٹک رہی ہے اور تجھے عشق بازی سوجھ رہی ہے۔ یہ ذرا منسٹر کو فون لگا، اس سے کہہ کر اس کی رہائی پہ کتنا ظلم ہو رہا ہے۔"

"کون کر رہا ہے تم پہ ظلم؟"

"کون کرے گا؟ ایک ہے ناں، کم بخت ڈی ایس پی حنظلہ عبدالرحمٰن۔ میرا دل چاہتا ہے کہ عبدالرحمٰن کی ساری فیملی کو شوٹ آؤٹ میں مروا دوں مگر آج کل کسی کی نہیں چل رہی۔ پتہ نہیں کیا ہم اختم پہ حملہ اس خبیث نے ہر کوئی اس کا مکر پڑھ رہا ہے، اندر سے سب ڈر رہے ہیں مگر اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ بل رکھاں، تجھے ضمانت نہیں دے دیا گیا؟" کریڈل پہ ریسیور دے پٹخا گیا۔

تھیار کے لبوں کو زہریلی ہنسی نے چھوا اور وہ آہستگی سے تکیے پہ سر رکھ کر لیٹ گیا۔ آج وہ واقعی بہت تھک گیا تھا۔

❀❀❀

"تم کہنا کیا چاہتے ہو ماموں؟ کیا وہی کہنا چاہتے ہو جو میں سمجھا ہوں؟" ڈی ایس پی حنظلہ عبدالرحمٰن کے چہرے پہ ساری تپش تھی اور ماموں عبدالکریم نے سر ہلا کر کہا تھا۔

"آپ درست سمجھے ہیں، مرا نہیں اس معاملے میں تم مجھے بتا لینے چاہیے تھیں۔ یہی احتیاط اس وقت بہتر ہے۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو؟ شاید تمہیں پریشانی نے تمہارا دماغی توازن برقرار نہیں رہنے دیا۔ ورنہ تم یہ نہیں کہہ رہے ہوتے کہ تمہیں بہت آسانی سے ڈیپ کر لیے جانے والے لیڈی احمد شاہ فیاض اور حسن ابراہیم سے بیک ڈور ڈیل کر لینی چاہیے اور نہ صرف ڈیل بلکہ نوار حسن، جو چوہے کی طرح گرفتاری کے ڈر سے اپنے بل میں چھپا ہوا ہے، اسے بھی تحفظ لگا کر اپنے کنٹرول لسٹ سے نکال کر ملک چھوڑنے میں مدد دینی چاہیے۔ امڑ مجبوراً آپ دیکھ رہے ہیں ماموں عبدالکریم کی سوچ۔ حالانکہ پہلے مجھے ان کی دماغی صلاحیتوں پہ آنکھ بند کر کے یقین تھا لیکن اب مجھے سوچنا پڑے گا۔ مجھے نئے سرے

AANCHAL.COM.PK

سے سوچنا پڑے گا کہ کیا انہیں اپنا فیصلہ بدلنا ہے۔ میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟"

"آپ ماں کو تو قائل کر رہے ہیں مگر اپنے بیٹے کو ساری زندگی کے لیے نہیں، ایک ڈبل رول کرنا پڑے گا۔" ... حسن نے ... کی بات شروع کی ہے۔"

"آپ...... مسٹر سیف! آپ بھی ایسا سوچنے لگے ہیں؟ کیا آپ کو لگتا ہے کسی ایک کی زندگی کے لیے ہمیں الگ الگ ملاقاتوں کی ضرورت ہے؟"

"نہیں میرا یہ مطلب نہیں مگر دنیا میں کبھی ایک ڈبل رول بھی ممکن رہی ہے۔ لیکن مسئلہ نہیں اگر ہم بھی ایک ڈبل رول سے کام لے لیں۔ آپ ہمارا پلان سمجھنے کی کوشش کریں۔" وہ دونوں رو جانے والے ثابت سمجھانے لگے اور جب تھمے تو محمد علی عبدالرحمن کے چہرے پر بہت پیاری مسکراہٹ تھی۔

"تم دونوں...... میرے بس میں ہوتا تو تمہیں اعلیٰ ترین ایوارڈ ضرور دیتا۔ ویری فائن۔ پلان اچھا ہے۔ مجھے ٹھیک ہے۔ معاملات طے کرلیں ماں اور آپ۔" انہوں نے اختیار کل دے کر ان دونوں نے بات ختم کی دنیا اور تینوں مسکرانے سے لطف اندوز ہونے لگے۔

***

"تمہیں کیا لگتا ہے تم نے ساری دنیا فتح کر لی ہے؟" نئے جام میں وسکی ڈالتے ہوئے ازفر نے ... پوچھا تو وہ ... بولے۔

"ساری عمر گزر گئی ہے ... کی ... میں اور مجھے لگتا ہے میں کبھی ناکام نہیں رہا۔"

"لیکن ایک نئی زندگی ... جسے جیے بغیر تمہیں لگے گا تم نے اب تک دنیا میں کچھ نہیں چکھا۔"

"تم...... تم جانتے ہو مجھے استعمال شدہ چیزیں استعمال کرنے کی عادت نہیں ... وہ کون سی چیز رہ گئی ہیں، کیا وہ ... ہے؟"

"شاید تمہیں ... وہ بھی ہے کہ ہم ان کی فہرست میں ... ہیں۔ "ہر بات ... اور چیف ..." ایک لمحے کو رک کر اس نے عمرانی کی طرف دیکھا اور پھر سے گویا ہوا۔ "ایک بار تم جاؤ تو ... ہم بھول جاؤ گے کہ تم بھی دنیا کا حصہ ہو۔ وہ ایک مکمل عورت ہے ... کی ... تمہیں بہت کم لگے گی۔ پلیز کم آن۔" ازفر نے مسٹر عمرانی کا ہاتھ تھام کر اٹھایا اور مارے بندھے انداز میں ان دونوں ... پارٹی کے ساتھ کھڑے ہوئے۔ پھر پارٹی اپنے پیک پر تھی، جب وہ اس محفل میں داخل ہوئے۔

AANCHAL.COM.PK

حسن کا یہ انداز رامیز جنگ۔" وہ کمرے سے لگاتے حسن پر مرتے تھے اور آزر نے جھک کر ان کے کان میں کہا تھا۔

"یہ حسن...... یہ حسن ذوالفقار عالم کا استیک بھی نہیں تم آ کے دیکھو گے تو تمہاری آنکھیں چندھیا کی چندھیا رہ جائیں گی اس حسن کی بارگاہ میں تم گونگے ہو جاؤ گے۔"

"دیکھیں گے تمہارے اس حسن کو بھی دیکھیں گے۔" وہ دونوں کے بازو تھامے وجیہہ سے لگتے ہوئے ترنگ میں بولے۔ ایک فقیہ عالم ان کے قریب تھے اور زندگی اتنی ہی قریب تھی۔ وہ بہت خوب ہنسے تھے، جب آزر نے ان کا شانہ ہلایا تھا۔

"چلو عمرانی! رات کے اس پہر اس حسن کے کمال کو دیکھنے کا بھی الگ مزہ ہے۔"

"تم کیا میرے ساتھ ہو گے؟" عمرانی نے بہت دور سے پوچھا۔

آزر کا قہقہہ بہت طویل تھا، اس نے شوخ نظروں سے انہیں دیکھا اور کہا۔ "پاگل ہو گئے ہو؟ آج کی رات صرف تمہاری...... میں تو صرف تمہارا اس سے تعارف کروانا چاہتا ہوں چلو ذرا۔" گیسٹ ہاؤس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے تحمل کی ایک دروازہ دستک دیا۔

آزر اندر چلا گیا۔ مسٹر عمرانی نے انتظار نہیں کیا تھا۔ آزر کسی کے کندھے پر ہاتھ رکھے لگاوٹ سے بول رہا تھا۔ "بہت خوب صورت ہیں یاسمین! پلیز ان کا خاص خیال رکھنا۔ تم جو چاہو۔"

آزر نے مسٹر عمرانی کو دیکھا اور شرارت سے ہنس کے بولا۔

"میں نے تم سے زیادہ بے صبر انسان آج تک نہیں دیکھا۔ عمران! اندر کے...... خوب صورت۔ آج کی خوب صورت رات میری طرف سے صرف تمہارے نام۔"

کہہ کر لپک کر دہان کے قریب سے نکلتا چلا گیا اور مسٹر عمرانی نے بہت اشتیاق سے اس لڑکی کے کندھوں پر ہاتھ رکھے۔

"یاسمین! تمہارا نام بہت خوب صورت ہے۔ کیا تم واقعی میں بھی اتنی ہی خوب صورت ہو ویل؟"

لڑکی کچھ پوچھنے کی کیفیت میں مڑی تھی اور مسٹر عمرانی......

"تم اس حسن کی بارگاہ میں گونگے ہو جاؤ گے۔ تمہاری آنکھیں چندھیا کی چندھیا رہ جائیں گی۔" آزر کی آواز اب بھی ان کے طرف ناچ رہی تھی۔

AANCHAL.COM.PK

ان کے ہاتھ کو باڈی گارڈ نے کندھوں پر روک دیا تھا۔ "زرش! آئم سوری؟"

"پاپا! چھوڑیں مجھے۔ پلیز پاپا! چھوڑ دیں مجھے۔" زرش پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ پھر وہ کچھ بھی نہیں پائے تھے۔ کمرے کی کھڑکی ایک جھٹکے سے کھلی تھی اور زرش کا وجود جیسے بادل کی تیسری منزل سے سیدھا سڑک کے فرش پہ جا گرا تھا۔

"زرش......!" وہ کھڑکی میں سے لٹک کر چیخے تھے۔ پھر پاگلوں کی طرح نیچے کی طرف دوڑے تھے۔ زرش کا سر اپنی گود میں رکھ کر وہ دیوانوں کی طرح چیخے جا رہے تھے۔ کوئی لفظ، کوئی مربوط جملہ، کچھ بھی نہیں تھا ان کی زبان پر۔ اور کوئی نہ تھا جو زرش سے اب بھی ان کی معافی کی التجا کرتا۔

"چھوڑ دیں مجھے...... پلیز چھوڑ دیں مجھے۔" اس لمحے ان کو فرزانہ کی روح یاد آئی...... آج وہ کتنی غلط راہ سے لوٹنے لگے تھے۔

"وہ مر چکی ہے۔ عمرانی! زرش کو۔ انجم نے ایسا کیا کہ بتایا کہ اس نے خودکشی کر لی؟ عمرانی کون ہے یہ لڑکی؟ کیا تم اسے جانتے ہو؟"

"یہ میری بیٹی ہے۔ زرشہ، میری بیٹی ہے۔ تم سمجھ گئے ہو نا؟"

ازفر کا چہرہ دیکھ کے سب ہی ہکا بکا تھے اور پھر اس کے چہرے پہ شرمندگی تھی۔ سب بت تھے۔ اور شمیم عمرانی صاحب وہاں جملے کے بعد کچھ نہیں بولے تھے۔

پولیس آ چکی تھی۔ تفصیل دی جا رہی تھی۔ لاش کے پوسٹ مارٹم کے لیے لے جا رہے تھے۔ ازفر تفصیل بتا رہا تھا۔ لڑکی تھی جس نے کھڑکی سے فرار ہونے کی وجہ سے گر گئی۔

باقی سب پارٹی کے ارکان پولیس کے آنے سے پہلے ہی غائب ہو چکے تھے۔ مسٹر عمرانی سکتے کی کیفیت میں اب بھی وہیں بیٹھے تھے۔

"یہ عمرانی ہیں اس لڑکی کے باپ۔ بچی کی موت سے انہیں ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ کچھ کہنے کے قابل نہیں ہیں اس وقت۔"

ازفر نے ڈیڈ باڈی ایمبولینس میں رکھے جانے پر مسٹر عمرانی کو کھینچ کر اپنی گاڑی میں بٹھا لیا تھا۔

مسٹر عمرانی بار بار صدمے کی طرح چونک رہے تھے۔ بیٹی مر چکی تھی اور باپ سکتے کی کیفیت میں بیٹھا تھا۔

"تمہاری بیٹی مر چکی ہے عمرانی! انجم نے سنا؟ وہ مر چکی ہے۔ اور کس جگہ مری ہے تم جانتے ہو۔"

مسٹر عمرانی نے پہلی بار بیگم عمرانی کو دیکھا منظر بھر سے رنج بھرے لب ہوا اور وہ ہذیانی انداز میں چیخے۔ "اس نے مجھ سے بدلہ لیا ہے...... وہ کتنی خوش تھی زندگی میں، میں نے جس طرح اسے ستایا ہے، اسے عزت سے جینے نہیں دیا۔ قدرت اس کا انتقام لے گئی۔ وہ مجبور تھی مگر اس کا خدا مجبور نہیں ہے۔ تم نے دیکھا وہ صرف اس کا دوست تھا، اس نے اتنے سالوں تک میری سزا کو دکھا اور آج...... آج اس نے اس عورت کا بدلہ لے لیا۔ وہ مر گئی ہے۔ عجب میں بھی مر گیا ہوں۔ زرش بھی مر گئی ہے۔ وہ سب بھی مر گئی ہے۔ پھر تم زندہ کیوں ہو؟ تم بھی مر جاؤ...... تم بھی مر جاؤ۔" انہوں نے بیگم عمرانی کو جھنجھوڑ دیا تھا اور بیگم عمرانی قالین پر بیٹھ کر بین ڈالنے لگی تھیں۔

"ہم سب مر گئے ہیں...... تمہیں کیوں لگتا ہے میں زندہ ہوں۔ دیکھو میں اسی دن مر گئی تھی جب میں نے اپنے گھر کی دہلیز چھوڑی تھی۔ تمہارے لئے اپنے باپ کا گھر، بابا اور ماں کی دعاؤں سے منہ موڑا تھا۔ انہوں نے کہا تھا تو کبھی شاد نہیں رہے گی اور واقعی میں کبھی شاد نہیں رہی عمرانی! کیا میں زندہ ہوں؟ تمہیں لگتا ہے کیا میں زندہ ہوں؟" وہ بھی بے زبان ہذیانی ہو گئی تھیں۔

شام تک خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ وہ شادی کی تقریب میں شرکت کر کے گھر آئی تھی اور اب اس کے ماں باپ اس بیٹی کو دیکھ رہے تھے جو دس سال پہلے مر چکی تھی۔

"ناصر! تم...... تم زندہ ہو؟"

"نہیں پاپا! میں مر چکی ہوں۔"

"ہاں، میں بھی یہی کہہ رہا تھا وہ مر چکی ہے، پھر سے زندہ کیسے ہو سکتی ہے؟" ان کی دماغی حالت بگڑ گئی تھی اور زرش کی تدفین کے کام ادھورے تھے۔ سارے کام دوستوں نے ذمہ داری سے لے لئے تھے۔ مسٹر عمرانی کو خواب آور دوا دے کر سلا دیا گیا تھا۔ وہ بیٹی کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکے تھے۔

❀❀❀

ہارون عبدالکریم نے اپنے اثر و رسوخ سے طلعت جہاں کو گرفتار کروا کے خصوصی دفتر میں بلوا لیا تھا۔ طلعت جہاں کے ساتھ تھی مگر ایسے جیسے کوئی کمزور بچہ۔

"مجھے کسی بھی طرح جیل سے نکلوا لیا جائے۔ مجھے یہ جگہ پسند نہیں ہے۔"

"یہ جگہ کسی کو پسند نہیں ہوتی میڈم! انہی کے گئے گناہوں کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔" مسٹر عدیل عبدالرحمن نے سخت لہجے میں کہا اور بیگم طلعت جہاں انہیں گھورنے لگیں۔

AANCHAL.COM.PK

چہرہ، چال ڈھال، سب کچھ وہی تھا، بس اس چہرے پہ عمر نہیں گزری تھی۔

"عبدالرحمٰن بیٹا…… تم کب تک میری زندگی کا ایندھن بنتے رہو گے؟"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں عدیل عبدالرحمٰن ہوں۔" عدیل عبدالرحمٰن نے لہجہ برقرار رکھا اور جانانہ کسی بت کی طرح بیٹھی رہی۔

نائمہ کا زندہ ہونا، معاذ بیگم کا ظہور ہونا، ڈی ایس پی شیرازی کی گمشدگی، شیرازی کی اولاد کی طرف سے مایوسی، سب چیزوں نے مل کر تیز طرار رزاق جانانہ کو یکدم سے ذہنی مریض کی طرح چپ کروا دیا تھا۔ وہ عدالت سے بچ بچا کر عدیل عبدالرحمٰن پر کوئی قانونی دعویٰ نہ جتا رہی تھی اور نہ ہی بیگم حشمت جہاں کی آزادی کی چیخ پکار کے لیے فون استعمال کر رہی تھی۔ وہ گم صم بیٹھی تھی، جب عدیل عبدالرحمٰن نے اس کے سامنے دو تصویریں رکھیں۔

"یہ دونوں کون ہیں، آپ جانتی ہیں؟"

جانانہ نے خالی آنکھوں سے عدیل عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا اور آہستگی سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"آپ ان کے نام بتا سکتی ہیں؟" ناصر عبداللہ بٹ نے اگلا سوال کیا۔

اور وہ حشمت جہاں کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"یہ میری خالہ، ماں کی بہن اور میری ماں ہیں۔ مگر کل مجھے پتہ چلا، یہ ان کی کوئی بہن نہیں تھیں۔ انہوں نے خودکشی کر لی تھی کسی وجہ سے۔"

"آپ کو پتہ ہے وہ خودکشی کیوں کی تھی؟" عدیل عبدالرحمٰن نے سوال کیا اور جانانہ کچھ دیر ساکت ہو گئی۔ عدیل عبدالرحمٰن اس کی کیفیت سے بے نیاز بولے۔

"جس طرح یہ آپ کی ماں نہیں ہیں، اسی طرح یہ بھی جھوٹ ہے کہ اس عورت نے خودکشی کی تھی۔ اسے قتل کیا گیا تھا اور وہ بھی حشمت جہاں کے کہنے پر۔ کیونکہ انہوں نے بیگم عاطفہ کی بھاگنے میں مدد کی تھی۔"

جانانہ کی آنکھیں حشمت جہاں پر جا ٹکیں اور وہ غصے سے چیخی۔

"کیا بکتی ہے یہ بڈھا…… سب کہہ رہی ہو ماں، کسی پاگل مسخرے کا فون آگیا، تجھے سمجھ نہیں آئی؟"

ANCHAL.COM.PK

"کس جاتا تھا وہ، وہ بیٹی وہ کس کی ہے؟" جانانہ پیچھے ہٹ کر رجب علی عبدالرحمن کو دیکھنے لگی۔
"شیرازی...... وہ شیرازی ہے۔" آنکھیں یکدم لبالب بھر کے چھلک اٹھیں۔
"آپ کو پتہ ہے حشمت جہاں جنہوں نے آپ کو لاڈ سے پالنے کا ڈھونگ کیا ہے انہوں نے آپ کے شیرازی کو قتل کروایا تھا؟"
"نہیں۔ شیرازی...... شیرازی کیسے مر سکتا ہے؟ ماں کہتی ہیں وہ بے وفا تھا۔ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔"
"یہ ضرور دیکھئے۔ یہ جان زلیخا بائی نے وہاب کیانی کے سامنے بیان دیا تھا اور یہ تصویریں ہیں وہ جن کا قاتل نے بیگم حشمت کو بلیک میل کرنے کے لیے کھینچ کر محفوظ کر رکھی تھیں۔ مگر بیگم حشمت نے اثر و رسوخ سے اس قاتل کو کہا کہ یہ تصویریں حاصل کر لیں اور کسی طرح ہم تک [illegible] ایک وقت میں دینا اور حشمت جہاں کی بہت گاڑھی چھنتی تھی۔ یہ تصویریں اور یہ بیان [illegible] ہیں۔ ہم کا [illegible] نے بھی کسی برے وقت کے لیے اسٹاف کے طور پر بینک لاکر میں [illegible] کروائی تھیں۔ لیکن اب جبکہ وہ بیمار اور موت کے دہانے پر کھڑی ہیں تو انہوں نے قانون کی مدد کرنا ضروری سمجھا۔"
جانانہ کسی بت کی طرح اٹھی اور حشمت جہاں کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔
"کیوں؟"
"کیا کیوں؟" حشمت جہاں نے پتہ کر پوچھا۔ یہ گفتگو بہت دھیمے انداز میں ہو رہی تھی اس لئے حشمت جہاں کی بیٹی بیگم کے معاملے میں زور تھیں۔
"میں نے کیا بگاڑا تھا تمہارا؟ تم نے میرے شیرازی کو کیوں مارا؟"
بیگم حشمت جہاں کا ایک لمحے میں رنگ پھیکا پڑا پھر ابھی تک کی بناوٹ ہوا ہو گئی۔ وہ دہاڑ اٹھیں۔
"کیا بگاڑا تھا؟ شیرازی...... اس نے میرا بنا بنایا کاروبار تباہ کیا تھا۔ میں نے تجھے دولت کمانے کے لئے پالا تھا نفرت کا حساب برابر کرنے کے لئے پالا تھا مگر اس نے تیرے اندر گھر بسانے کے خواب جگا دیے تو اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ مار دیا اس لئے اس ذلیل انسان کو۔"
"وہ ذلیل انسان نہیں تھا، وہ میرا شیرازی تھا۔ میرا شیرازی۔" وہ پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی تصویروں کے پاس بیٹھ گئی۔ مادون نے اشارے سے ماسٹ اہلکار کے ذریعے بیگم صاحبہ کے گھر

نجمہ اماں تو چاہتا اور بیگم طلعت جہاں اپنا سوال کبھی نہ بھرا ہوا استعمال کر رہی تھیں مگر کوئی روحانی آج کام نہیں آ رہا تھا۔

"آج کوئی تمہارا ساتھ نہیں دے گا۔ کیونکہ آج مکافات عمل ہے بیگم طلعت جہاں!"

مدثر عبدالرحمٰن نے نفرت بھرے لہجے میں کہہ کر طلعت جہاں کی طرف سے پشت موڑ لی تھی مگر طلعت جہاں اس حقیقت کو ابھی ماننے سے انکاری تھیں۔

❁ ❁ ❁

آج شہریار دفتر نہیں گیا تھا۔ کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور کچھ اس کا دانیہ کے ساتھ وقت گزارنے کا من تھا۔ آج دانیہ نے مسز عبدالرحمٰن کی آمد کی وجہ سے یونیورسٹی سے آف کیا تھا۔

آج وہ صبح سے مصروف تھی اور نہیں جانتی تھی کہ شہریار نے بھی اس کے لیے وقت چرا لیا تھا۔ سوچ میں وہ لنچ کے لیے چیزوں کی لسٹ ملازم کے حوالے کر رہی تھی تو شہریار چپکے سے ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔

"شہزادی! آپ نے سنا نہیں میں آپ سے کچھ کہہ رہی ہوں۔"

"کہیے نا ہم ابھی آپ کو ہی سننے کے لیے کھڑا ہوں۔"

دانیہ تیزی سے مڑی تھی۔ "شہری بھائی! آپ..... نہیں، میں بھلا آپ سے کام کرواؤں گی؟"

"کیوں، میں کام کے معاملے میں نکما ہوں یا حساب کتاب میں چار سو بیس، جو آپ مجھ سے کچھ نہیں کہتیں؟" دانیہ نے اس کی شوخی کو ایک الگ طریقے سے دیکھا۔ سامنے کی بات تھی، دانیہ کے گھر آنے کے بعد کام شروع سے شہریار ہی کیا کرتا تھا۔ لیکن آج اسے تنگ کر رہا تھا وہ شہریار بے چارہ چھوڑ دو! کیونکہ دفتر کی باہر اور خوبیوں کے کام وہ کتنا تھک جاتا ہوگا۔ آج تک اس نے بھی اف تک نہیں کی۔ بھی اس کے کسی کام آتی، کیا آج نہیں؟ میں بھی کروں گا۔

"کیا سوچنے لگیں ڈیئر سسٹر؟" وہ آگے بڑھ کر لسٹ لے چکا تھا۔

"پلیز شہری بھائی! رہنے دیں نا آپ۔ ویسے بھی آپ کی کل سے طبیعت زیادہ خراب ہے۔"

"اب ایسی بھی زیادہ خراب نہیں ہے۔ مسز مرگی نہیں پہ اصل کے لیے کام خود سے ہی کر لیتے ہیں۔ ویسے بھی فارغ ہے، میں نے چھٹی اسی کی وجہ سے

تمہیں کیا پتا۔ ماموں کے پاپا سے ادا تجارت کے شوق میں کی ہے سب ایک وقت اور وقت ان کی جاگیر ہے۔ مگر اس وقت بات اور نظریہ دونوں واضح اب بات زیادہ ضروری ہے۔"

نانا جان کے چہرے پر گہری تھی۔ شہریار نے دلچسپی سے اسے دیکھا اور لسٹ لے کر باہر نکل آیا۔ پھر تیز کے لئے مطلوبہ سامان کے سٹار کارڈز میں رکھ کر دوبارہ وہیں نظر دوڑانا چیک کرنے لگا۔ ابھی صبح کے دس ہی تو بجے تھے، کچھ دکانیں کھلی تھیں کچھ بند۔ پھر بھی چلتے چلتے اس کی نظر ایک ویڈنگ ڈریس پر جا کر اٹک گئی۔ ریڈ کلر کا خوب صورت کام والا وہ آگے بڑھنے سے رک گیا۔

نانا جان اس ڈریس میں کیسی لگے گی؟ اس نے سوچا اور پھر سوچ سوچ شاپ میں داخل ہو گیا۔ پھر سیلز مین کو ادائیگی کر کے نکلا تو ہاتھ میں بیگ تھا۔ بارہ بجے۔ گھر پہنچا تو نانا جان بے چینی سے اس کا انتظار کرتے پایا۔

"شیری بھائی! آپ بھی ناں...... آپ نے تو لیٹ ہونے کے مارے بڑا کر دیا ہے۔" وہ سامان لے کر تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی طرف دیکھے بغیر۔ شہریار روز بیگ کا پکڑے ان کے کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

ماموں نے اسے بہت دل سے شوق سے اندر کیا تھا اور وہ کھلنڈرے سے انداز میں ان کے بیڈ پر جھولا نما لگا کے ان کے قریب جا گھسا پھر ان کی گود میں سر رکھ کر بولا۔

"ماموں! آپ کو میرا اور نانا کے لئے ایسا فیصلہ ٹھیک لگتا ہے ناں؟"

ماموں نے مسکرا کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور پھر بولے "ہوں۔" "تمہیں اچانک اس فیصلے پر کسی اور کی رائے کی ضرورت کیوں لگی؟ ارے یہ کیسی بات ہے؟"

اس نے بند آنکھیں کھولیں اور ماموں کو دیکھا پھر آہستگی سے بولا۔ "ساری بات یہ ہے ماموں! یہ فیصلہ نانا کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور نانا کے لئے میں بہت کانشس ہوں۔ مجھے کبھی کبھی ڈر لگتا ہے اگر اس فیصلے سے نانا کو وہ خوشیاں نہ مل سکیں جو میں نے اپنے احاطہ فکر میں سوچ رکھی ہیں تو پھر...... پھر کیا ہوگا؟"

ماموں مسکرانے لگی تھیں، پھر نرمی سے بولی تھیں۔

"جہاں ہماری سوچ کا خاتمہ ہوتا ہے، وہاں سے وہ کام اور ذات خالص اللہ پر چھوڑ دینی چاہئے۔ بلکہ مخاطب یہ ہوگا کہ جو کام ہم اپنی محنت سے کر گزرتے ہیں وہ کل پاتے ہیں اور جس میں کامیاب رہتے ہیں وہ کام اور وہ کام جس میں ناکامی ہو محنت کے باوجود نتائج اچھا حاصل نہ کر پاتے، اللہ کا کام ہو جاتے ہیں وہ ہمارے فیصلے پہلے سے خدا طے کر چکا۔ میں آپ کے سمجھے ہوتے ہیں۔ ساتھ

کا خیال ضروری ہے۔ وہاں تو انسان خوشی میں ہو تو اسے یاد رکھتا ہے مگر تکلیف میں بھی اس کی رضا کے آگے جھکانے والا بن جاتا ہے اور جھکانے والے لوگ کا کام بگڑتا نہیں جب بھی ان کا کام نہیں ہوتے۔
کوئی نہ کوئی خاصے کی چیز ان کے لئے کسی نہ کسی طرح پہلے ہی رکھ دی جاتی ہے۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے۔ دنیا میں پالو یا آخرت میں پالو نئی جستجو۔"

"مانو یار! آپ تو بہت اچھی باتیں کرنے لگی ہیں؟ سچ بتائیں! میری صحبت کا اثر ہے ناں؟ اگر ہاں تو آپ کب سے مجھے پتھر دل خیال میں۔"

"جی بہت شکریہ! بہت چڑ چڑا ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے جتنا خاموش رہتے تھے اب اتنا ہی زیادہ بولنے لگے ہو۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ مسکرا کر انہیں دیکھتا رہا۔ پھر مانو کی طرف شاپر بڑھا کر بولا۔

"مانو! ادھر دیکھو، بتاؤ یہ انگوٹھی اسے پہنے گی تو کیسی لگے گی؟"

مانو لباس، ہم رنگ چوڑیاں اور سینڈل دیکھنے لگی تھیں۔

"تمہاری چوائس تو بہت اچھی ہو گئی ہے۔ شاید میری صحبت کا اثر ہے۔"

وہ قہقہہ لگا کر زور سے ہنسا مگر وہ۔ وہ ایک دم سے سہم سے گئے۔ رک گیا تھا۔ مہا مانو اس کے چہرے کی رنگت سے گھبرا سی گئیں۔

"کیا ہوا اب یہ کر کیوں؟ کیا مجھ سے؟ سچ بتاؤ جو ہنستے ہوئے کچھ اتنے زیادہ۔ یہ بھی نہیں لگتے ہو کہ منہ چھپا لیا۔" انہوں نے دوبارہ سے زور دے کر اسے سید ھا کیا اور یکدم گھبرا گئیں۔ "کیا ہوا؟....

تم ایک دم سے ایسے زرد کیوں ہو گئے ہو؟"

اس نے مہندی ہاتھوں میں اب بھی بھینچ رکھا تھا۔

"مجھے یار! تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں، دل میں آیا کیا ہوا ہے؟"

یکدم اس لمحے دروازہ کھلا تھا۔

ماموں اس موقع پہ اندر نہیں آنی چاہیے تھی۔ اس نے زور سے سوچا۔

AANCHAL.COM.PK

"بتایا ہے۔ کچھ دنوں تک ہم جتنے بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ آخر مسئلہ کیا ہے اس کے ساتھ؟" نانو ابھی تک اس کی بیماری سے آگاہ نہیں تھیں۔ اس نے ابھی تک انہیں کوئی ڈھنگ سے جواب ہی نہیں دیا تھا۔ بات ٹالتا رہا تھا۔ وہ نہ کسی وجہ سے بھی خفتی اور ماما نے کی خواہش کو بھی مارک کیا تھا مگر ابھی مجھے.....

ماما بہت تیزی سے اس تک آئی تھیں۔ "شہریار تم ٹھیک ہو نا؟"

"میں آپ کو اب کب سے تکتے لگا ماما؟ [illegible] پوچھوں کہ....." زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ وہ بستر سے لیٹ کر گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

"مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" ماما جتنی تیزی سے کمرے میں آئی تھیں اتنی تیزی سے واپس پلٹی تھیں۔ مگر شہریار نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"ماما وہ ذرا سا ہو جائے گی ماما! میں ابھی ٹھیک ہو جاتا ہوں نا۔" اس نے زبان کے نیچے گولی رکھی۔ پشت کے نیچے تکیے رکھ کر خود کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کی تھی اور نانو کی آنکھیں ان میں ماؤف ہو گئی تھیں۔

"یہ کوئی مرض ہے ایسی تکلیف لگنے لگی۔"

اس نے تسلی آمیز انداز میں نانو کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ماما اس کے قریب بیٹھی تھیں۔ وہ جو ماما کہنے آئی تھیں بیٹھی بھول چکی تھیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ٹھیک ہو سکا تھا اور نانو کو تھرے باتوں کا دکھ مار رہا تھا۔ تمام کوشش کے باوجود آپ نانو کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں چھوڑ سکی تھی۔

"بولیں ناں بس کو نہیں، وہ چھا رہا تھا نانو سے بولا۔ "یہ دیکھیں نا! کچھ نہیں ہوتا مجھے۔ آپ تو ایسا لگ رہا ہے، جیسے میں ابھی کہیں جانے والا ہوں۔"

"کبھی مت کہو، خدا نہ کرے میں دوبارہ دیکھنے کو زندہ بھی رہوں۔"

"اچھا تو آپ وہاں جنت میں مجھ سے پہلے جا کر ماتم سیٹ کریں۔ وہ کچھ میں کمال دکھا جاتی ہیں۔" وہ اچھا، پھر خاموش کر بولا۔ "مسکرانا تو! بنتے ہیں، میں آپ سے بہتر ہی ڈھونڈ رہا ہوں۔ اس لئے میری خدمات حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

نانو ہنسی تب ٹوٹنا نہیں دیا۔ آ گیا تھا۔ ماما جو کہنے آئی تھیں وہ شہریار سے ہی کہنے کا ارادہ تھا۔ مہمانوں کے لئے کھانوں کا ارینجمنٹ کروانا تھا، جو شہریار سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا تھا لیکن اب اس کی طبیعت.....

ماما بھی لوٹ گئی تھیں اور موبائل پر جازی کو کال کرنے کی کوشش میں تھیں۔ شہریار ایک گھنٹے بعد گھر ان کے پاس آیا تو وہ ابھی تک جازی کو کال نہیں کر پائی تھیں۔

"کوئی کام ہے تو مجھے بتا دیجئے ماں۔ جازی آج ایک ضروری میٹنگ میں ہوگا۔ موبائل آف کر دیتا ہے وہ میٹنگ کے وقت۔"

ماما کچھ سوچ رہی تھیں کہ اس نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے تھے۔ پھر مسکرا کر بولا تھا۔ "آپ کے لیے شہریار مرزا کسی سے بھی لڑ سکتا ہے ماما۔ صرف ڈانٹ ہی نہیں۔ بتائیے تو۔ دیکھیے جازی سے بہتر کرنے کی کوشش کروں گا۔"

ماما کچھ نہیں بولی تھیں۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پر ہلکے سے ہاتھ رکھا تھا پھر بولا کہ بتاؤ تو وہ خوش ہو۔

"اوہ ماما! اتنا سا کام؟ یہ کام تو میں گھر بیٹھے چٹکی بجاتے کر سکتا ہوں۔ آپ کے بیٹے کی بہت زور ہے مارکیٹ میں۔" اس نے کرتے کی جانب جیب سے موبائل نکالا اور اپنے جست دکھ بھری منٹ سمجھانے لگا تھا۔

ساڑھے تین بجے تک ہر کام مکمل ہو چکا تھا۔ وہ ماما کو دعا دے کر کمرے میں آ گیا تھا۔ رابعہ بھابی اور عائشہ بھابی اسے تیار کر رہی تھیں۔

"بڑے مزے ہیں ناں جازی...... بھائی! اسامہ کے لیے بھی کچھ تیار رکھے ہیں آپ؟"

"شہری بھائی! تنگ مت کریں آپ ہمیں۔ پہلا موقع ہے مسز عبدالکریم اور مسز عبدالکریم کے سامنے جانے کا اور فرسٹ امپریشن از دی لاسٹ امپریشن۔ آپ سمجھتے ہیں اس بات؟" عائشہ نے مسکراتے ہوئے تیزی سے کہا۔ رابعہ سے جو زیادہ پیاری تھیں وہ دروازے سے ٹیک لگا کے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا بہت پیاری لگ رہی ہوں میں شہری بھائی؟" اس نے شوخی سے اسے دیکھا اور وہ گہرا سانس لے کر مسکراتے لہجے میں بولا۔

"تم ماما! تو میری بہن ہو میری بہن۔ ماما جیسی ہو۔ وہ پیاری تو پہلے ہی تھیں بہت شاندار۔ اب لیکن ٹیڑھا مینڈھا دکھائی دے رہی ہے۔" وہ مسکرا کر عائشہ بھابی کی طرف متوجہ ہوا۔ "ویسے مجھے آپ کی اس بات پر اعتراض ہے کہ مسز عبدالکریم اور مسز عبدالکریم کا فرسٹ امپریشن از دی لاسٹ امپریشن کا ڈائیلاگ ضروری نہیں۔ کیونکہ اسون ڈی گریٹ کو گنڈی ویسے ہی بہت پسند آئی ہے۔"

ماما کچھ جبکہ وہ قدم بڑھاتا اس کے قریب آ گیا۔ کرتے سے والٹ نکال کر اس نے روپے نکالے اور رابعہ بھابی کی طرف دیکھ کر بولا تھا۔

AANCHAL.COM.PK

آپ کے خیال میں وہ کیا کر رہے ہیں؟ آج وہ ان کا قصہ آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا ہوگا۔ مجھے فخر کی بے چارگی محسوس ہو رہی ہوگی......" وہ آگے بھی کچھ کہتا کہ اس کا موبائل بجنے لگا کال سے
اس نے موبائل فون اٹھا کر دیکھا تھا لیکن ان کے سرخ جوابات سن کر اس نے اسے کاٹ دیا تھا۔ فون رکھ کر وہ ان کی طرف شکوے سے دیکھنے لگا تھا۔

"تم نے صبح کا اخبار جان بوجھ کر ڈائننگ ٹیبل پر نہیں رکھنے دیا تھا۔ تم نے ڈاکٹر کا فون بھی مجھ سے کنکٹ نہیں ہونے دیا تھا؟"

نائلہ بھابی اور رابعہ بھابی اس کے لہجے کی تلخی سے گھبرا گئی تھیں اور دانیا سہمی ہوئی تھی۔

"آپ کی طبیعت خراب تھی۔ اس لیے میں نے سوچا ندرت کے متعلق آپ کو پتہ چلا تو آپ بہت ہرٹ ہوں گے۔"

شہریار کچھ کہے بغیر تیزی سے نکلتا چلا گیا تھا۔

❀❀❀

"تم کیا سمجھتی ہو، میں تمہیں یہاں اپنے کسی مصرف کے لیے لایا ہوں؟" وہ نخوت سے بولے تھے اور سامنے کھڑی عورت کی آنکھوں میں خوف پہلے سے کچھ اور بڑھ گیا۔ جو لوگ نرم لہجے میں سزا کی بات کرتے ہیں وہ لوگ عموماً سزا کی بات کیا کرتے ہیں اور اس لمحے وہ اپنی سزا کی منتظر تھیں۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے تک یہی چار گھنٹے پہلے تک بہت ہی سکون تھا سب کچھ کتنا ٹھیک تھا۔ وہ اپنے گھر آنے والے مہمانوں کا چھوٹی چھوٹی تیاری کر رہی تھیں۔ ساتھ میں آموز بھی تھیں۔ ان کی جسمانی، جنہیں معمولی تیاری ہی سمجھا تھا۔ لیکن اب وہ یہاں بالکل اکیلی تھیں۔ وہ سامنے کھڑا شخص فرعون صفت ہو گیا تھا۔ اس نے آواز دی اور نرم قدموں سے ان کی طرف بڑھ آئے تھے۔ تب وہ چیخی تھیں۔

"مت آؤ میرے قریب...... میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔"

قہقہہ پہلے سے بلند تھا۔ "لیکن جان سے میں تمہیں ماروں گا۔ مگر ہر سزا کا انداز ذرا الگ ہے۔" اس نے ان کا چہرہ چھوا اور وہ ... نے سر جھٹک کر اس لمس سے بچنے کی کوشش کی۔

"چھوڑو مجھے...... تمہیں خدا کا واسطہ ہے عرفان! میں ایک عزت دار عورت ہوں۔ میرا گھر ہے، شوہر ہے۔ کیوں تم مجھے برباد کرنے پر تلے ہو؟"

مسٹر عرفان نے دونوں بازوؤں کے گھیرے میں انہیں جکڑا تھا اور غرور سے کہا تھا۔

"میری بہت پرانی عادت ہے عطیہ! میں نئی اور دکھی چیزوں کا استعمال کرنے کا عادی ہوں۔ میں نے تمہیں بھی یہ آفر کی تھی مگر تم میری بات نہیں سمجھ سکیں۔ تمہیں میرے محل کی رانی بننے سے زیادہ ان چند ہزار کمانے والے بیوروکریٹ کی بیوی بننے کا شوق تھا۔ تب میں نے طے کیا تھا۔ میں اگر تمہیں نہیں پا سکا تو تمہیں بھی خوش نہیں رہنے دوں گا اور دیکھ لو آج میں نے یہ موقع پالیا۔ وہ کون تھی؟ ہاں وہ تمہاری جیٹھانی، وہ کوئی اچھی عورت نہیں۔ دولت کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتی ہے جو میں نے اس مقام پر اسے اپنے قدموں پر گرالیا ہے۔ تم یہاں ایک ہفتہ رہو گی اور پھر میرے خاص ملازم تمہیں خود تمہارے گھر کے سامنے چھوڑ آئیں گے۔ پھر کیا تم دوبارہ اس گھر میں یا شوہر کے دل میں جگہ بنا پاؤ گی؟"

"عمرانی!... تم... تم چھوڑو مجھے، چھوڑو۔ تم کیسے انسان ہو۔ لیکن میرا خدا... وہ مجبور نہیں۔ وہ تم سے بدلے لے گا ایسے کہ تم ختم ہو جاؤ گے اس بدلے پر چیخ بھی نہیں پاؤ گے میرا خدا..."

"ہاں تمہارا خدا۔ وہ لوگ مجبور ہوتے ہیں، وہ ایسے ان خداؤں کی پناہ لیتے ہیں۔ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کو بھی کہتے ہیں۔ لیکن دیکھو آج میں... میں کتنا بااختیار ہوں۔ کتنا بااختیار..." مسز عمرانی کے قہقہے بلند سے بلند ہوتے گئے تھے کہ عطیہ بانو زور سے چیخی تھیں۔

"چپ ہو جاؤ کم ظرف شخص۔ ڈرو خدا سے اس کے انصاف سے۔ چپ ہو جاؤ۔"

یہ چیخ پھر سے بلند ہوئی تھی اور وہ یکدم ہڑبڑا کر رہ گئے تھے۔

یہاں وہ گھر تھا نہ عطیہ بانو نہ ہی غرور... محض انصاف... انصاف چاروں طرف پھیل رہا تھا ایک تیز روشنی کی جانب آسمان کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

"مجھے کچھ نظر نہیں آرہا۔" وہ زور سے چیخے۔

"صاحب پاگل ہوگیا ہے۔ کبھی کہتا ہے کچھ نظر نہیں آرہا۔ کبھی کہتا ہے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔ کبھی ایک دم چپ ہو جاتا ہے فل اسٹاپ کے مانند۔" ایک ملازم نے دوسرے ملازم سے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر وہ جب مڑ کر دیکھے تو دونوں ادھر ادھر کھسک گئے تھے۔ پھر صاحب کچھ پوچھتے وہ تھی کہ ایک ملازم نے ایک وزیٹنگ کارڈ دیا۔

"ٹھیک ہے... بھیج دو اندر۔" وہ کسی چہرے کو دیکھے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر نفرت کرتے ہوئے بات سے بات نکال رہا تھا کہ مسز عمرانی دوڑتے ہوئے کمرے کی دہلیز سے آ ٹکرا گئے۔

AANCHAL.COM.PK

"تانی اور گھبو میرے کمرے میں جاکر دیکھو۔ وہاں کوئی عورت ہے، جو مسلسل کہہ رہی ہے کہ اس کے خدا کی پکڑ نے مجھے جکڑ لیا ہے..... تانیہ! مجھے شک ہے جو دکھی نہیں جا رہا سا لگتا ہے، جیسے کسی نے میرے ہاتھ پیر کسی مضبوط رسی سے باندھ دیے ہوں۔"

تانیہ نے مسز عمرانی کو حسرت سے دیکھا اور آہستگی سے بولی۔ "آپ کے کمرے میں کوئی عورت نہیں ہے پاپا! انہوں نے صبح آپ کے ساتھ ملاقات رکھی تھی ان کی نند وہ کون تھا؟"

"نہیں، لیکن اس وقت وہ چھپ گئی ہوگی۔ وہ جس وقت بھی آجاتی ہیں اس تانیہ! وہ تمہیں دیکھ کر چھپ جاتی ہے مگر مجھے دیکھتے ہی سامنے آجاتی ہے کہتی ہے عمرانی! تم غاصب ہو..... غاصب ہو..... میرے خدا کا انصاف..... تانیہ! کیا خدا صرف غاصب کا ہوتا ہے؟"

"نہیں پاپا! خدا سب کا ہوتا ہے لیکن ہم نے اسے اپنا سمجھا کب ہے۔ ہم اسے اپنا کہاں سمجھتے ہیں۔"

شہریار بے چینی سے دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ مسز عمرانی کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ جب شہریار کے کہنے پر تانیہ نے مسز عمرانی کی کہانی کے اس دور سے آگاہ کیا۔

شہریار اسے دیکھنے لگا۔ "یہ سب کچھ گلٹ کی وجہ سے ہے۔ اگر وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرلیں تو ان کی حالت سنبھل سکتی ہے۔ ماہر نفسیات کیا کہتے ہیں؟"

تانیہ نے اس کی بات کو کس کرب سے سنا پھر اس کی بات سنی ہاں وہ بھی یہی کہتے تھی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو پاپا کا یہ ساتھ اعتراف کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لیکن شہریار! وہ عورت کون تھی؟ کہاں ہے؟ اس کے بارے میں کیسے پتہ چلے گا کہ پاپا کی غلطی کا کفارہ ادا ہو۔ پتہ نہیں وہ عورت زندہ بھی ہے یا مرگئی۔"

"وہ عورت مرچکی ہے تانیہ!" اس نے بھرائے لہجے میں کہا۔

"تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اس لئے کہہ سکتا ہوں کیونکہ اتنے وثوق سے کہ وہ عورت میری ماں تھی۔ مسز ارسلان راشدی کی بیوی، میری ماں اور مسز عمرانی کی ان چال سے انہیں مجبور کردیا گیا تھا، پاپا نے طلاق دے دی تھی اور وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کرسکیں کیونکہ وہ بہت ٹوٹ کر میرے پاپا سے محبت کرتی تھیں۔ لیکن تانیہ! اگر مسز عمرانی اس حقیقت کو مسز ارسلان راشدی کے سامنے کہہ گئیں تو رہتے ہیں تو مرنے کے بعد ہی سہی ان کی ذات پر لگا ہوا داغ تو دھل جائے گا۔ پاپا ان کی طرف پوری طرح لوٹ آئے ہیں۔ اچھے ٹھکانے پر ہیں لیکن جب ماما کی تشنگی کا ایک ہفتہ ان کے دماغ میں کسی بخار کی طرح

AANCHAL.COM.PK

میرا نے لگتا ہے تو وہ میری ماں کی محبت سے بہت کم لگتے ہیں۔"

"لیکن تم تو مسٹر عبدالرحمن کے بیٹے مشہور ہو۔" اس نے سکتے میں سے نکل کر سوال کیا۔ وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔

"ہاں اللہ مجھے یہی والا عزیز ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں، میری ماں کی ہمت بہت ہے۔ جو آپ سے کہہ گیا۔ وہ میں نے آج تک کسی سے نہیں کہا، اس لئے مجھے یقین ہونا چاہئے یہ بات صرف آپ کے دل تک محدود رہے گی۔"

اس نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا تھا اور وہ شام ساڑھے سات بجے گھر پہنچا تھا۔

مسز عبدالکریم ہالیا کو پسند کر کے جا چکے تھے اور شادی کی بات ماموں کی والدہ کے آپریشن کے بعد صحت یابی تک موقوف ہو گئی تھی۔ ہاں، منگنی ہونے کے دن طے پا گئی تھی۔ سارا دن طاہرات سے شام کی چائے پر بعد بھائی سے مل رہی تھیں۔ وہ چائے کے ساتھ ... ٹکٹ لے رہا تھا جب اس نے سوال کیا۔

"سالار بھائی کا کیا ہو رہا ہے؟"

رابعہ بھابھی کمرے میں ... آئیں اور وہ خود ... کمرے میں آگیا۔ ... کمرے میں داخل ہوئی، ہاتھ میں تھامے ہوئے ... کے بیڈ پر رکھے تھے۔

"منگنی والے دن تم یہی کپڑے پہنو گی؟"

"لیکن منگنی کے دن ... کپڑے ... کے گھر سے آئے ہیں، شیری بھائی!" عائشہ بھابھی پیچھے سے جانے کب ... کی وضاحت کرنے لگیں۔

اس نے مسکرا کر انہیں پلٹ کر دیکھا ... کون ہے؟ ... میرے کسی حکم سے ... نہیں سکتا، اس لئے آپ بے فکر رہیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

... مسکرا رہی اور یہی مسکراہٹ اب اس کے دل کا موسم تھی۔ ... اس کی مسکراہٹ ... اس کے کمرے سے باہر آگیا۔ وہ عائشہ بھابھی کے ساتھ چل رہا تھا۔

"آج کل سعد بھائی کیا ... بھائی جی؟"

عائشہ بھابھی نے ... مسکراہٹ ... "منگنی کے بارے میں آج کل وہ کافی سرگرم ہیں۔ جاننا چاہتے ہیں منگنی کس کی ہے؟"

"حالانکہ تجھ سے کہہ رہا ہوں وہ بچے ہیں، نجی میری بچی ہے، پھر کیا الجھن ہے؟"
عائشہ بھابی نے شرمندگی سے سائے دیکھا، پھر آہستگی سے بولیں۔ "دراصل غصے میں برداشت آ گئے تھے، لیکن میں جانتی ہوں آپ ہمارے کتنے مخلص انسان ہیں۔"
اس نے مسکراہٹ کے بجائے ظاہر کرنے کے بجائے بولا۔ "اف وہ بس سوچ رہے کہ کس باپ کی اولاد ہے۔ وہ میری لاڈلی فرزند زندگی کی لسٹ کا پہلا ہے کہ جو لگانے کی کوشش کر رہے ہوں گے کہ
ان کی والدہ ماجدہ کون ہے؟"
"شہری بھائی! آپ جانتے تو ہیں بچے صبا کی عادت بغیر ملے کیوں جھجک رہے ہیں؟"
"ارے کہاں، میں تو مزے میں ہوں اور مطمئن ہوں کہ نئے صبا کسی نہ کسی طرح سے صبر رضیہ نہیں۔ سوچیے اگر میں ان کی زندگی سے نکل گیا تو ان کی محرومی زندگی کتنی ہو جائے گی ہاں۔"
"اللہ نہ کرے آپ کیسا اچھا بولتے ہیں۔"
وہ ہنسنے لگا، پھر آہستگی سے بولا۔ "اتنی جلدی میں آپ کے مجازی خدا کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ گن گن کے بدلے چکانے ہیں۔"
"تو آپ کے بدلے کہاں اتار رکھیں گے؟" عائشہ بھابی نے قطعاً سنجیدگی ظاہر کی اور شرارت سے بولیں۔
"آپ کیسی تو مشرقی بیوی ہیں۔ یہ ہماری بچی ہے، کہاں ایک ہفتہ گزرا ہے اسے سرکیمپ سے واپس آئے ہوئے، لیکن ابھی تک اس کی شکل نہیں دیکھی۔"
"وہ آپ کے ساتھ ہوگی یا پھر اپنے کمرے میں، اس کا زیادہ تر وقت اپنی ہی کلاسوں میں گزرتا ہے۔ سچ پوچھیں تو وہ بالکل آپ کی طرح سوفٹ اور کیئرنگ بچی ہے۔"
"اتنی مہربانی...... پھر کیا خیال ہے آپ کی تعریف کی گئی ہے؟"
"زکاوں کا کیا مطلب ہے؟ وہ تو ہم سب کے دلوں میں محبت کرنا اور محبت کرنا خوب آتا ہے آپ کی بچی کو۔"
"قادر سے میری بچی ہے۔" اس نے کالر اکڑا لیے۔
عائشہ بھابی بچی کی طرف مسکرائیں، وہ مڑ گئیں اور وہ بھی کچھ دیر سوچتا رہا، پھر امام کے کمرے میں آگیا۔ امام بہت غیر متوقع طور پر جائے نماز بچھائے بیٹھی تھی۔

"خیریت ماما! آج خاص چیز مانگ رہی ہیں کیا؟"

ماما نے اس کا چہرہ دیکھا اور پھر کمرے کے باہر کھڑکی سے جانے والی اجنبی باتیں ان کے اندر شور مچانے لگیں۔

"کیا بات ہے آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں، سب ٹھیک تو ہے؟"

"ہاں سب ٹھیک لگ رہا ہے، مگر پتہ نہیں مجھے کیوں لگنے لگا ہے، جیسے سب کچھ چھوٹتا جا رہا ہے؟"

"کیا آپ سے چھوٹ جا رہا ہے ماما؟" اس نے چونک کر ماما کو دیکھا۔

ماما نے جائے نماز کو سمیٹا اور مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ "دعا سے سب کچھ مل جاتا ہے ناں شہری؟"

"آف کورس ماما! میں نے بھی یہی سنا ہے کہ دعا سے سب کچھ مل جاتا ہے اور جو نہیں ملتا وہ اللہ تعالیٰ ہمارے حق میں بہتر سمجھتا ہے۔ ویسے میں اس سے زیادہ دعا کے متعلق آپ کو بتا نہیں سکوں گا کیونکہ میں خود بھی ابھی بالکل ریسنٹ ہوا اور نماز کی طرف مڑا ہوں۔ دفتر کے کاموں میں کبھی فرصت ہی نہیں ملتی تھی، لیکن اب سوچتا ہوں کہ نماز کو چھوڑتا تھا فرصت ملتی نہیں، فرصت تو نکالنی پڑتی ہے۔"

"تم نماز پڑھنے لگے ہو؟"

"جی ماما! دو ماہ سے باقاعدگی سے نماز شروع کی ہے۔ دعا کریں پچھلی نمازوں کی کوتاہی معاف ہو جائے۔"

"وہ معاف کرنے والا ہے، بہت معاف کرنے والا۔ تم نے تو پھر بہت جلدی اس کا دامن پکڑ لیا۔ میں نے تو بہت دیر کر دی اس کی بارگاہ میں جانے میں۔"

وہ اٹھ کر ماما کے قریب آ گیا، پھر ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "موت سے پہلے جو بھی ہو جائے معافی مانگنے کی توفیق مل جائے وہ سب سے بڑا انعام ہے۔ کہتے ہیں وہ لڑکھڑاتے قدموں کو بہت محبت سے سہارا دینے والا ہے۔" وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر سنجیدگی کو دور کرتے ہوئے بولا۔ "ویسے آپ مانگ کیا رہی ہیں؟" اس نے سوچنے کا پوز بنا کر پھر شرارت سے کہا۔ "یقیناً عائشہ بھابی کی زندگی میں بہو کی دعا مانگ رہی تھیں ناں؟"

ماما نے اس کا چہرہ دیکھا اور پھر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر ممتا سے بولیں۔ "آج میں نے صرف اپنے لیے کچھ مانگا ہے، اپنی سب سے پیاری اولاد کے لیے کچھ مانگا ہے۔ آج میں نے تمہارے

لئے دعا مانگی ہے، صرف تمہاری خوشیوں کے لئے سجدہ کیا ہے۔"

"ماما.....!" وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا تھا۔ "میں آپ کے لئے اتنا پیارا ہو گیا ہوں؟ مجھے یقین نہیں آتا۔"

ماما نے اس کے سنورے ہوئے بال بکھیر دیئے تھے، پھر لاڈ سے بولی تھیں۔ "جب میری تم سے بات چیت نہیں تھی، میں تمہیں اگنور کرتی تھی تب بھی..... تب بھی دل تمہارے لئے بے چینی محسوس کرتا تھا۔ جب بابا نے تمہارے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہونے کی اطلاع دی تو میں نے بے مروتی سے اس کی بات کا جواب نہیں دیا، پوری طرح تمہیں رد کرنے کی کوشش کی مگر نہیں (?) اس دن دوبارہ تمہیں پا لیا تھا۔ میں نے تمہیں بہت برا بھلا کہا تھا کہ تمہاری وجہ سے میری زندگی خراب ہوئی تھی، لیکن درحقیقت میرے اندر کی ممتا تھی جو مجھے بے چین کر رہی تھی۔ تم نے اپنے ساتھ بہت برا کیا جو تم سے جانے ماں (?) ناراض رہی، تمہیں مجبور کیا۔"

"ماما! جو ہو چکا اسے بھی گزرے زمانوں کیا کرنے سے فائدہ؟ دیکھئے کہ آج آپ میرے ساتھ ہیں نا، سچ پوچھئے تو مجھے کل کے مقابلے میں آج آپ کی محبت کی زیادہ ضرورت ہے۔" وہ اب ماما کی گود میں سر رکھ کر وہیں لیٹ گیا تھا۔ ماما اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں اور وہ ان کے آنچل کو چہرے پر ڈھک کر سونے کی کوشش میں تھا۔

"بہت تھکن ہو رہی ہے؟"

"ہاں ماما! آج کل بہت زیادہ تھکن ہونے لگی ہے۔ سوچتا ہوں کچھ چھٹیاں لے لوں۔ لیکن پھر سوچتا ہوں صمدانی بھائی اکیلے (?) ... بہت بڑا (?) ... سوچ کر رک جاتا ہوں۔"

"تم نے صمدانی بھائی کو بتایا کیا تھا؟"

اس نے چہرے سے آنچل ہٹا کر ماما کو چہرہ دیکھا۔ "کل شام ان سے مل لیا تھا، بس وہ کہتے ہیں سب کچھ ٹھیک ہے۔"

"لیکن تمہاری گرتی ہوئی صحت بتا رہی ہے، جیسے چپکے چپکے کوئی آندھی چل رہی ہے۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "ماما! آپ کو دھوکا ہوا ہے۔ بس مجھے تھکا پن آتا جا رہا ہے آپ کے بیٹے میں۔"

"بکواس۔ کیا جوان تم جیسا ہوتا ہے جو کوئی بچہ کیسا ہو گا؟"

AANCHAL.COM.PK

"سچی بھائی جیسا۔" وہ شرارت سے ہنسا۔ ماہ نے اس کی ہنسی کا ساتھ دیا اور تبھی اسی وقت نجی نے کمرے میں انٹری دی۔

"واہ بابا! کیسا کیسے محبت کھچی جا رہی ہے۔"

"تو پھر فاسٹ ختم، وہ آپ کو دن بھر کا وقت دیا جاتا ہے ماما کے ساتھ رہنے کو۔ شام تو صرف ہماری ہے۔ کیا سمجھیں؟"

"سچی کہ آپ بہت چالاک ہو گئے ہیں۔"

"اچھا جی! کہیں اپنے بابا کو الزام دے رہی ہو؟ ہم جیسے شریف بابا اور کہاں ملیں گے آپ کو؟"

"نہیں، آپ جیسے بابا تو کہیں نہیں ملیں گے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا اور ماما ان دونوں کو چھوڑ کر ان کے لیے کافی لانے کو کچن کی جانب بڑھ گئیں۔

نجی اپنے پہلے جملے کے بعد خاموش ہو گئی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہیں بچے؟"

"آپ دنیا کے بیسٹ بابا ہو بابا!"

"یہ کوئی مقابلہ ہو رہا ہے کیا؟ ابھی تو ہم بھی سب سے بیسٹ بابا کہہ کر خود سے ہی خوش ہو رہے تھے اور ابھی آپ بتا رہی ہو۔"

نجی اس کے قریب بیٹھ گئی پھر آہستگی سے بولی۔ "بابا! آپ نے کبھی سوچا، میں نے جواب سے کہا، وہ جھوٹ بھی ہو سکتا ہے۔"

شہریار چونکا، جبھی تو مراد بھائی نے اسے کہا تھا کہ وہ کہیں ہاں، وہ کچھ خود ہی بیان و سیاق سے ظاہر ہونے والی تھی۔

"بابا! آپ سن رہے ہیں نا، میں کچھ کہہ رہی ہوں؟"

"ہاں سن رہا ہوں، لیکن سمجھ نہیں پا رہا کہ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" اس نے جان کر طرح دی اور وہ رو دینے کو ہو گئی۔

"میں نے اب تک جو آپ کو بات سنائی وہ جھوٹی تھی بابا!"

شہریار نے اسے دیکھا اور کچھ نہیں بولا۔ ابھی کچھ مہینے پہلے ہی تو اس نے کچھ سالوں پہلے کی اتاری ہوئی تصویر سیٹ لے جانے کے بعد اچانک سالار عبدالرحمن کے سامنے ایک فوٹو گراف رکھا تھا۔

"پاپا..... اسے آپ جانتے ہیں؟"

سالار عبدالرحمن نے تعجب، بے یقینی اور رعونت سے بولے۔ "میری سیکرٹری تھی۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"کیا آپ بہت فرینک تھے اس سے؟"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" وہ رک کر گھورتے ہوئے لہجے میں بولے۔ "اگر تم کسی سلسلے میں مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں تم سب کے سامنے میری بے نامی کو بہتر ثابت کرنے کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہو۔ تمہیں پاپا کی گڈ بک میں آنے کا بہت شوق ہے ہاں تو سنو ہاں وہ میری بہت اچھی دوست تھی اب کہو کیا ہے تمہارے پاس؟ کون سا بلیک میلنگ اسٹف ہے؟ بولو؟"

اور شہریار کچھ کہے بغیر وہاں سے پلٹ آیا تھا اور آج اچانک بھی کچھ اور کہہ دی تھی۔

"آپ مجھے ابھی بچی نہیں سمجھیں گے اگر میں نے سچ کہہ دیا تو۔"

"سچ کہنے پر سزا نہیں دی جانی چاہئے، یہ میرا طرز فکر ہے۔ تم کہو تم نے کیا جھوٹ کہا تھا؟"

"پاپا! جب میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا تو مجھے دل نے کہا آپ سے زیادہ اچھا انسان دنیا میں نہیں ہوسکتا۔ میں آپ کو نہیں بتا پائی تھی مگر بس میرا دل کہنے لگا تھا کہ مجھے آپ کو کبھی سچ نہیں بتانا۔ ممی جان نے کہا میں اگر ان کے جھوٹ میں ان کا ساتھ دوں اور یہ کہوں کہ میرے پاپا سالار انکل ہیں تو مجھے جلد ہی دم گھٹتے ہوئے ماحول سے نجات مل سکتی ہے۔ میں ایک بہترین زندگی گزار سکتی ہوں۔ میں نے بھی اس وقت یہی سوچا، میں پانچ سال کی تو تھی پاپا! لیکن آہستہ آہستہ آپ کی اچھائی، آپ کی محبت نے مجھے بتایا کہ عیش و عشرت سے زیادہ محبت ضروری ہوتی ہے۔ پھر میں ممی کے غائب ہونے کے بعد بھی آپ سے جھوٹ بولتی رہی۔ آپ نے ہاسٹل ڈال دیا، ممی کی تو شاید موت ہوگئی ہے تو مجھے لگا میرا سچ بھی ان کے ساتھ مر گیا۔ لیکن جب جب گھر میں میری وجہ سے آپ کو انکل نے برا بھلا کہا تو مجھے لگا میں بہت گندی بچی ہوں جو آپ پاپا کو نہ بتا سکی اس شرمندگی سے بچا نہیں سکی، میں بہت گندی بچی ہوں پاپا! لیکن اب میرا دل بہت زیادہ تنگ آ گیا ہے اس سچ کو چھپاتے چھپاتے۔"

شہریار اس کو بہت دیر تک دیکھتا رہا کچھ نہیں بولا۔

"بابا! آپ مجھے معاف نہیں کریں گے؟"

وہ گلے سے لگ گیا۔

"میں تم سے ناراض ہی نہیں ہوں بابا! پھر معافی کس بات کی؟" اس نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے پیار سے بولا۔ "جو کچھ آپ نے مجھے ابھی بتایا، میں جانتا ہوں، بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ میں نے آپ کو اپنی بیٹی بنایا تھا اور اس رشتے کو نبھایا بھی نہیں۔ سچ مچ بظاہر ہوا سب کچھ میری نظر میں تمہاری قدر میں کمی نہیں آئی کیونکہ تم نے مجھے زندگی کے ان لمحات میں سہارا دیا، محبت سے تھاما تھا جب مجھے صرف مر جانے کے سوا کوئی اور حل نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ سو اب جب کہ زندگی مجھ پر مہربان ہو گئی ہے تو میں تم سے ناراض ہو کر کیوں رہوں؟ ویسے میرے پاس تمہارے لئے ایک گڈ نیوز بھی ہے۔"

"گڈ نیوز؟...... تو بتایئے ناں بابا! جلدی سے، میں بہت بے چین ہو گئی ہوں۔"

وہ اٹھ کر بیٹھا اسی وقت ماہم اس کے لئے کافی لے کر اندر داخل ہوئی، ان دونوں نے تجّی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "گڈ نیوز سننے کی تڑپ دیکھنے کی چیز ہے تم جلدی سے تیار ہو کر آؤ میں تمہیں اس گڈ نیوز سے ملوا دوں۔"

تجّی ننھے ولالے انداز میں دیکھنے لگی، وہ اس نے ماہم کے ہاتھ سے کپ لے کر مسکرا کر کہا۔ "اچھے بابا! بس بس میں جلدی سے ریڈی ہو کر آتی ہوں، جب تک آپ پیاری سی ماہم کے ساتھ کافی پی کر آتا ہوں۔"

تجّی اٹھ گئی اور ماہم نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے ولا سے کہا۔ "تجّی تو اتنا تنگ کر رہی ہے اب پھر یہاں جانے کو، بتاؤ ماہم کیا سوچتے ہو؟"

اس نے گرم گرم کافی کا گھونٹ بھرا اور ماہم کو دیکھا۔ "تجّی کی ممّا کا پتہ چل گیا ہے ماہم اس سے ملوانے لے جا رہا ہوں اسے۔"

"کون ہے تجّی کی ماں؟" ماہم کے لہجے میں خوف آ گیا اور شہریار ہنسنے لگا۔

"ارے ماہم! آپ بے فکر رہیے آپ سے تجّی کو کوئی دور نہیں کرے گا۔ تجّی کو میں اڈاپٹ کر چکا ہوں اس لئے اس کی ماں بھی چاہے تو تجّی کو مجھ سے نہیں لے سکتی اور پھر وہ کہ مجھے اچھی طرح جانتی ہے۔"

AANCHAL

مجھے بھائی کہتی ہے۔ آپ بھی جانتی ہیں ماما!" سومیہ "آپ ٹھیک کہتی ہیں ماما سے، اس لئے بے فکر رہیے۔ اب میری زندگی میں نہ میرے بعد تجھی کو آپ سے کوئی دور نہیں کر سکتا۔ ہاں صرف وہ شہریار نے سومیہ کے پاس جا کبھی ہے۔ اس کا شہزادہ پیدل ہم مل کرنے جائیں گے" وہ کہتے ہوئے رکا نظر اٹھا کر ماما کو دیکھا ان کا موڈ سخت خراب پایا۔ "کیا ہوا آپ کو؟"

ماما نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر خفگی سے بولیں۔ "یہ تم مرنے جینے کی باتوں کے علاوہ بھی کوئی بات ڈھنگ سے کر سکتے ہو؟ باتیں نہ جانا بنا کے کیوں پھرتے ہو؟"

اس نے کپ زمین پر رکھ دیا۔ پھر پیار سے ماما کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹ کر بولا۔ "تو ماما حقیقت میں نے حقیقتاً شہر کے بخت کہا تھا، ورنہ ابھی میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"شہریار!...... میں کہہ رہی ہوں کہ......"

"ماما......!" اس نے ان کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔ پھر بے بسی سے بولا۔ "سوری ماما! زبان بار بار پھسل جاتی ہے، کوشش کروں گا آئندہ ایسا کم سے کم ہو۔ ماما پلیز! آپ مان بھی جائیں۔" اس نے ماما کی تھوڑی اونچی کی۔ ماما کی آنکھوں میں ابھی بھی خفگی تھی لیکن ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ در آئی تھی۔

"رات کے کھانے پر ملتے ہیں پھر۔" وہ اٹھ گیا تھا۔ باہر سے تجھی اسے آواز دے رہی تھی۔ پھر وہ عائزہ بیگم کے گھر میں تجھی کے ساتھ داخل ہوا تو سومیہ، عائشہ اور سب نے بہت احترام دیا اسے۔ سومیہ بار بار تجھی کو دیکھے جا رہی تھی، جب شہریار نے کہا۔

"تم دونوں چاہو تو بچھڑے ہوئے ملوں کی طرح رج رج کے مل بھی سکتے ہو۔ سومیہ تم سے ایک عہد کیا تھا میں نے، وہ عہد آج پورا کیا۔"

سومیہ نے چونک کر اسے دیکھا اور شہریار نے تجھی کو کندھوں سے تھام کر سومیہ کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

"ان سے ملو، یہ تجھی ہیں، میری بیٹی۔ مگر آپ کی گمشدہ بہن کا معتبر بھی ہے اور ان کی امانت۔"

"تجھی شہری بھائی؟"

"ہاں وہی جو تم کبھی... تمہاری بڑی بہنا!"

سومیہ نے بے اختیاری تجھی کو بانہوں میں بھینچ لیا۔ عائزہ بیگم اس کے ملنے کی تفصیل جاننے لگیں اور وہ جبر سے صبر سے شہریار کی اصل کہانی حذف کر کے صرف چلڈرن ہوم سے بازیابی کرنے کی داستان سنانے لگا۔

AANCHAL.COM.PK

"ام بیز شرنگ...... اسے ہم اتفاق کہیں گے۔"

"بہت حسین اتفاق صاحب!" مسز سلیم افسر جو ابھی ابھی ڈنر سے آئے تھے باتوں میں حصہ لیتے ہوئے بولے۔

سب بہت خوش تھے اور اسی خوشی میں سب نے ذوق وشوق سے کھانے کی میز جوائن کی تھی۔ ثمر ام کے لئے ان نے پیٹ میں ایک کونا بچا کر رکھا تھا سو وہ جلدی اٹھا اور مومنہ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"جان بھابی! یہ میری امانت ہے اب چاہے یہ تمہاری بیٹی ہے مگر ماں سے تم سے زیادہ پیار دے کر پالا ہے میں نے۔ سو میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا اس لئے کبھی کبھی ملنا ملانا رہے گا تو دل کو قرار رہے گا۔"

"بے فکر رہیے شہریار بھائی! آپ مجھے احسان فراموش نہیں پائیں گے۔"

"ارے واہ یہ کیسی بھائی میں با احسان کہاں سے آ گیا؟ بابا تو تمہارا حق ہے۔ سرہانے اپنی اتنی قریب تعلق خدا کا فیصلہ تھا اور ہم سب سے پہلے لگتا ہے وہ ہم سے کتنی محبت رکھتا ہے۔ دراصل ٹینشن تو مومنہ نے صرف اس لئے کہا کہ ام اور پاپا کو بیٹی سے بہت لگاؤ ہو گیا ہے سو وہ اب سے زیادہ خوشی کو چاہے گی ان میں سے کوئی بھی بیٹی سے دور نہیں رہنا چاہے گا۔"

"تو یہاں کون اس پر اعتراض کرنے والا ہے شہریار بھائی! ام بیٹی کو محبت سے آپس میں بانٹ لیں گے۔ یہ میری بیٹی ہے لیکن پہلا حق اس پر آپ کا ہے بالکل اسی طرح۔" مومنہ نے محبت سے اس کی بات مکمل کی تھی سو وہ رات دس بجے گھر میں داخل ہوا تھا۔

"کھانا کھانے کی ضرورت تو نہیں ہوگی ہاں تمہیں؟" وہ ام کے قریب سے لیٹ کر نیند سے کرتا وہاں کے قریب آ بیٹھا۔

"آپ کے لئے کچھ بچا کر لایا ہوں۔ جلدی سے جو پکا ہے لے آئیے مل کر کھانا کھائیں گے۔"

ام نے تشکیک سے دیکھا تو اس نے لاڈ سے ام کے کندھوں پر ہاتھ رکھا "بس ام! آپ کے ساتھ کھانا کھانے کا چانس میں نہیں کھو سکتا اس لئے وہاں صرف کھانا کھانے کی ایکٹنگ کر کے آیا ہوں اب آپ جلدی سے ٹیبل پر کھانا لگا دیجئے۔ یقین کیجئے بہت دعائیں دے گا۔"

ام نے کھانا ٹیبل پر رکھا۔ دونوں نے بہت اچھے ماحول میں کھانا کھایا۔ "بہت خوش ہے نا ام؟"

"ہاں! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟"

"مسٹی بھائی کا رد عمل کیا؟"

"کسی سے ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہے۔ عاشر کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے اس نے۔ لیکن وہ بھی کب تک جھکے گی۔ چپ ہو جائے گا۔"

"امام ایسے ہوتے نہیں ہیں۔ دراصل مسٹی بھائی دانیا سے تم سے زیادہ محبت کرتے ہیں اس لئے ان کا غصہ کرنا فطری عمل ہے۔ یاد رہے ایک نادان بات پر ان کی دوستی کم ہو رہی ہے۔" شہر بانو نے سالار کا شکریہ ادا کیا۔

امام کے ہونٹوں کو مسکراہٹ نے چھوا۔ محبت کے بندھن کتنے مضبوط ہوتے ہیں [illegible] کے باوجود زندگی رواں دواں برقرار ہے۔

❀❀❀

مامون عبدالکریم نے ڈیل فائنل کر دی تھی۔ کیونکہ زیادہ سے مومنہ کے ثبوت کے کاغذات تیار ہو گئے تھے۔ زبیر حسن شاہ بھی پاکستان سے باہر جا رہا تھا۔ عدیل عبدالرحمٰن اور مامون دونوں اسے ایئرپورٹ پر چھوڑنے کے لئے آئے تھے۔ شہباز سے زیادہ دے چھوڑا تھا اور مامون نے نوٹس کر لیا تھا۔

"ایک ہم ہیں جو امام کے سامنے کام نہیں آتے۔ بیچارہ بہت بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا جس میں نے بھی اس کی شخصیت ادا کر لی تھی۔ سب اپنا اپنا کام بھی بہترین نہیں تھا کہ پہچان نکل پاتی۔"

عدیل عبدالرحمٰن نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ مارا تھا مگر شرارت سے بولے تھے۔ "دیکھو، یا تمہارے اسے کچھ [illegible] کتنے مزے سے اس نے تمہارے ساتھ بیٹ کا شعلہ دکھایا تھا۔ ساری توجہ اس کی طرف تھی، ہم اسے آسانی سے دیکھتے رہ گئے ہیں۔ لیکن ہاں کوئی اتفاق کرنے والے معاملے نے اس ڈرامے میں ہمارا مجرم پکڑ لیا۔ اب زبیر حسن ہوگا اور انٹرپول کی پولیس۔"

بہت زور سے قہقہہ لگایا تھا دونوں نے مل کر۔ اور مامون نے شرارت سے دیکھ کر عدیل عبدالرحمٰن کی طرف ایک شگوفہ چھوڑا تھا۔ "اگر میں ایک اور بات کی منافی بتا دوں تو آپ دونوں بچے کے لئے بچ نہیں جائیں گے۔"

"مگر بات کی منافی کیسی......" عدیل عبدالرحمٰن نے دلچسپی سے دیکھا اور اس نے کہا۔ "کیونکہ ہم نے انٹرپول سے رابطہ کر کے زبیر حسن شاہ کو دونوں کیسوں میں پھنسایا ہے اس کی وجہ سے وہ ایئرپورٹ پر ہی دھر لیا جائے گا کیونکہ ہم نے طے کیا ہے۔ سوچا جب وہ گرفتار ہوگا تو اس کے سامان کی تلاشی بھی ضرور لی جائے گی اور سامان کی تلاشی میں [illegible] وقت میں رکھی ہوئی [illegible]

کچھ بلیک میلنگ اسٹنٹ برآمد ہوگا۔ یہ وہ سب اسٹنٹ ہے، جو تمہیں امیر شہیر نے دیا تھا۔ اس کی پالیسی کی کاپی تھی۔ سو جب وہ قصہ اخبارات میں لگے گی اگر نیت پہ جاری ہوئی تو ہماری اکثریت سیاست والی حمام میں..... اب آپ سمجھ رہے ہیں ناں۔ دوسرا وہ نکتہ پہلو یہ ہوگا کہ یہاں حسن اور ابراہیم بیٹے کی اس حرکت کی وجہ سے لعن طعن کا شکار ہو کر الگ ہو جائیں گے۔ اس حرکت پر کوئی انہیں یہاں سپورٹ کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔ مسٹر افضل بھی ان کا ساتھ نہیں دے سکیں گے کیونکہ ان کے بیٹے اختر نے کے لیے کافی ہے زیادہ وہ ان ہی ڈیڈ میں مثال ہے۔ گرین فائل یعنی۔ سو سمجھئے حکومتی پریشر کے تحت بھی کوشش کی گئی تب بھی آزاد میڈیا اس مواد کو لے اڑے گا۔ آزادی کی مفاد کے تحت درخواست پر یہ معلومات باہر آنے سے روک گئیں تو بھی آپ جانتے ہیں ہمارا امیر شہیر کا ممبر ہے۔ سادہ اسی لیے میڈیا کے سامنے نہیں آیا۔ ابھی تک کہاں سے اس طرح کے کام نکلوائے جا سکیں۔ کسی بھی میڈیا کو پتہ چلا پارٹی سے اس کی بالادستی گئی تو؟ آپ تو جانتے ہیں، یورپی پاپارازی اخبارات ایسی خبروں کی اچھی خاصی رقم دیتے ہیں اور رقم کی سیونگ تو جناب! اسٹنگ چیک زندہ باد۔ یہ روپیہ ہم اپنی کارکردگی کو زیادہ بہتر کرنے میں استعمال کر سکتے ہیں۔ ویسے فوری تو ایک بہانہ ہے ایک سوٹ کیس۔"

عدیل عبدالرحمٰن نے ماموں عبدالکریم کو کھینچ کر خود سے لپٹا لیا تھا۔ "تم بہت ذہین ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں کسی معرکے میں کام آ بھی گیا تو میری فورس کو تم بہتر انداز میں ڈیل کر سکتے ہو۔"

ماموں نے خفگی سے انہیں دیکھا تھا اور پھر آہستگی سے بولا تھا۔ "میری ساری ہمت، ساری کارکردگی صرف آپ کی پشت پناہی پر منحصر ہے۔ میں اکیلا کچھ نہیں ہوں سر!"

"تمہارے ضمیر میں بھی اکیلا کچھ نہیں ہوں ماموں!" عدیل عبدالرحمٰن نے اس کا کاندھا تھپتھپایا اور دونوں ہنستے ہوئے والی منگنی کے معاملات ڈسکس ہونے لگے۔

"شہریار بھی ہاں، بہت ذہین ہے۔ آپ کو پتہ ہے، مجھے اس کی وجہ سے گھر والوں کے سامنے کتنی باتیں سننی پڑی تھیں۔"

"کیا مطلب؟" عدیل عبدالرحمٰن نے جیپ بیک کرتے مڑ کر پوچھا اور اس کے چہرے پہ سنجیدگی چھا گئی۔

"کہنے لگے تم بابا کے لیے شگن کا جوڑا مت لانا۔ اس کے لیے میں نے ایک بہت خوب صورت سوٹ پسند کر لیا ہے جو اس نے اپنی منگنی پر وہی پہننے والی ہے۔ میں نے کہا، ماما پاپا کو کون سمجھائے گا؟ کہنے لگے تم ہو ناں، سمجھاؤ، کام ہے تو آئندہ اپنی شکل مت دکھانا۔ بس جناب! پھر جو میری واٹ لگی ہے، پاپا کے سامنے تو مرد ہی آگیا۔ کبھی انکار کی وجہ بتاتیں، کبھی پاپا اعتراض اٹھاتے، کبھی میں غلط اعتراض پر روٹھ جاتا۔ بس میں پارلیمنٹ کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ مجھے میرے سر پہ کرسیاں تو نہ لائی گئی تھیں۔ پاپا کے جاگیرداری خوف اور سب نے مل کر بڑا احمق مارا ہے مجھے۔"

عدیل عبدالرحمٰن مسلسل ہنسے جا رہے تھے اور ماموں کی رونی سی شکل نکل آئی تھی۔

"آپ کو مجھ پر یقین نہیں آ رہا ہے؟"

"نہیں..... کیونکہ تم جیتی شہریار کو اپنا دوست بنا کر بھول چکے ہو۔"

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ ماموں نے ان باران کی ہنسی کا دل سے ساتھ دیا۔ پھر ماموں کو لاہور آ کر دو دن ایک ماہ دس دن بعد چند گھنٹوں کے بجائے بہت سارا وقت گزارنے کے خیال سے جیب کر ان سے ملنے لگے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد گھر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے انہیں شہریار کی طلب ہی ہوئی تھی۔

"وہ آج بہت صبح دفتر چلے گئے تھے، کسی اہم کام تھا۔"

عدیل عبدالرحمن جوتوں کے تسمے کھولنے لگے تھے، پھر سر اٹھا کر عائشہ سے بولے "طبیعت کیسی ہے آج کل شہریار کی؟ مصروفیت اتنی تھی کہ فون پر بھی ان سے کوئی رابطہ نہیں کر سکا تھا۔"

عائشہ بھابی کو لگا جیسے انہیں دیکھتے ہیں، پھر مدھم لہجے میں بولیں۔ "جس دن پہلے کوئی طبیعت خراب تھی ان کی، جازب دفتر سے انہیں گھر لے آئے۔ آنے کے بعد میں پوچھتی رہی کیا ہوا؟ طبیعت خراب ہے کیا؟ مگر شہریار بھائی تکلیف چھپا کر ہنستے رہے، پھر بولے "آج کل گرمی اور ملازم ہونے کا موڈ ہو رہا ہے، اس لیے صرف حاضری لگائی ہے اور کچھ نہیں، کیا سمجھیں بھابی آپ؟" میں نے بہت کوشش کی وجہ لگاؤں، لیکن جازب بابا بھی آج کل بہت بدل گئے ہیں پہلے تو وقت سے جو پوچھو بتا دیتے تھے اب بچوں کی طرح باتیں چھپانے لگے ہیں۔"

"باتیں چھپانے لگے ہیں، کیا مطلب؟" کھلتے تسمے پر سے ہاتھ ہٹانے لگے تھے۔

"پتہ نہیں، لیکن شہریار بھائی کو جب میں دیکھتی ہوں تو دل کانپ جاتا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے انہیں؟ بے جان لگتے ہیں، پھر بھی چاہنے سے بھی ان کا سانس پھول جاتا ہے۔ لاؤنج کے ساتھ پہلے کی طرح کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں مگر چند منٹ بعد بالکل بے دم ہو کر لیٹ جاتے ہیں۔ اور اب انہیں کھانسی رہتی ہے مگر وہ ڈاکٹر کو بھی نہیں دکھاتے۔ رابعہ بھی بار بار کہتی ہیں کہ ان کی کھانسی چیک کروانی چاہیے، ایک دم سے لگتا ہے کہ ٹوٹ کر جاتے ہیں۔"

عدیل عبدالرحمن یکدم کھڑے ہو گئے۔ "اوہ میرے خدا آپ محسوس کر رہی تھیں لیکن آپ اور رابعہ نے اطلاع دینا تھا، مجھے فون ہی کر دیتیں؟"

"کیا تھا فون، کئی بار کوشش کی تھی لیکن آپ دفتر میں نہیں ملتے تھے۔"

وہ کچھ کہے بغیر پھر سے جاب پا شا کر جیپ کی طرف بڑھ گئے تھے۔ چوکیدار پھر سے گیٹ کے دونوں پاٹ کھول رہا تھا۔

❀❀❀

وہ اس وقت ایلیٹ فورس کی معیت میں جیل سے پیری ٹی جے کی طرف جا رہے تھے۔ انہیں اس وقت اس کی پروا نہیں تھی کہ وہ کتنی خراب پوزیشن میں تھے، نہ ہی اس کی فکر تھی کہ ان کا کوئی بھی نمبر ٹھیک نہیں لگ رہا تھا، نہ اس کی فکر تھی کہ ان کے پچھلے سارے حسابوں میں انہیں اپنی باقی زندگی جیل کی کال کوٹھڑی میں گزارنی پڑے گی۔ نہ ہی انہیں اپنی سیاسی ساکھ کے ختم ہونے کا غم تھا، نہ سارے اثاثے ضبط ہونے، بینک اکاؤنٹ سیل ہونے کا دکھ۔ وہ صرف اس وقت کچھ سوچ رہے تھے تو صرف ایک انسان کا ایسا اندازہ کون تھا جو ان سے حسن ابراہیم کی طاقت سے اور مسٹر افضل کی جاگیرداری سے ٹکرا گیا تھا؟ وہ کون تھا جو اتنی اندر کی خبر لینے کے باوجود بھی پاک نظروں ان کی پہنچ سے دور رہ گیا تھا؟

سلامہ اور سلمان پر انہیں اس اندر کے بھیدی کا شبہ ہوا تھا جنہوں نے کارروائی بھی کرا دی تھی مگر ان کی خوش قسمتی تھی کہ اس حادثے کے بعد وہ دوسرے حوالوں سے اخبار کی زینت بن گئے تھے۔ عاشق مزاج شروع سے تھے، سیاست میں آکر بھی ان کے اطوار نہیں بدلے تھے۔ محمد حسن ابراہیم مسٹر افضل کا ساتھ بالآخر کھل کر بکھر گئے۔ تو یہ ساری داستانیں بھی منظر عام پر آتی تھیں۔ اخبار سے ہی انہیں زوار حسن کی گرفتاری اور انٹرپول کے ذریعے ملک میں ڈی پورٹ کیے جانے کی اطلاع بھی ملی تھی اور ان کا دل چاہا تھا وہ اس انفارمر کو بس ایک بار اپنی زندگی میں دیکھ لیں۔ آخر یہ انفارمر تھا کون؟ کوئی بھوت، کوئی لال بجھکڑ یا الہ دین؟

”سر! آپ کی ملاقات آئی ہے۔“

مسٹر یوسفی نے بدمعاش بنایا ہوا دنیا میں اس کے صرف دو حوالے تھے۔ ایک حوالہ بہت عرصہ ہوا انہیں طلاق دے کر ان کی زندگی سے جا چکا تھا۔ ان کی بیوی امریکی نژاد تھی۔ گو یہ شادی صرف دو سال سے زیادہ نہیں چلی تھی۔ وہ ان دنوں امریکہ میں ہی مقیم تھے، پھر واپس لوٹنے لگے تو امریکی بیوی نے بچے بھی ساتھ کر دیا۔ ”اسے تم سنبھالو یہ تمہاری ذمہ داری ہے تو بہتر ہے۔“ اور یوں وہ اکیلے زندگی میں بہت ساری رنگ رلیاں کرتے رہے تھے۔ اپنے بیٹے کے مطابق وہ صرف اتنی ہی توجہ دیتے تھے جتنی تو جوان جیسے مصروف شخص کو دینے کا اختیار تھا۔ یہی وجہ تھی ملاقات میں ان کے ذہن میں بیٹے ہی کا خیال آیا تھا۔ وہ ملاقات کرنے میں آگے تھے اور ان کا سوچنا غلط نہیں تھا۔ ان کے سامنے راحم یوسفی ہی کھڑا تھا۔ مگر اس کے ساتھ دوسرے شخص کو کھڑے ہونے کا کیا حق تھا۔ اب شخص کو جس نے انہیں اس حال تک پہنچایا تھا؟

AANCHAL.COM.PK

"میں صرف اپنے بیٹے سے ملنا چاہتا ہوں۔" محمد علی عبدالرحمن رائم بخش کا کندھا تھپکتے ہوئے باہر نکل گئے۔

اب وہ دونوں تنہا تھے اور تنہا ہونے ہی پہلا سوال ان کے معاملات کے متعلق تھا۔ "تم نے کوئی مچلکا کیوں کیا میرے لئے؟"

"نہیں پاپا!" رائم بخش کا سر انداز انہیں دیکھ کر ہی ان کہا۔

"کیوں، کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میں کتنے بڑے طریقے سے اپنے سارے معاملوں میں ملوث ہوں کہ اگر ایک سرا بھی ہاتھ لگ جاتا تو میرا ساری عمر قید ہو گی؟"

"میں جانتا ہوں پاپا! اور میں نے اپنی ساری صلاحیتیں اسی لئے تو آج کی تھیں، کیونکہ اپنے ملک کو آپ جیسے لوگوں سے بچانا چاہتا تھا۔ آپ کی سیاست ہو یا صحافت ہو سب صرف اپنے لئے تھی اور آج میں نے آپ کے اسی زخم پہ ضرب لگائی ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو، تم ہوتے کون ہو یہ سب کرنے والے؟"

"آپ سب کا اور میرا یہ تجربہ ہے آپ سب ہی تھک چکے تھے، وہ سب ہی تھا سامنے اندر کے راز جن میں سے بیشتر صرف آپ ہی جانتے تھے ان رازوں کو طشت ازبام کرنا کسی اندر کے بھیدی کا ہی کام ہو سکتا تھا۔ مجھے حیرت ہے کبھی آپ کے ذہن میں اس حوالے سے میرا نام کیوں نہیں آیا؟"

مسٹر بخش کھڑے سے بیٹھ گئے تھے۔ "ہنہ..... مجھے تم سے ایسی توقع نہیں تھی۔ مجھے لگتا تھا تم جیسا بے عمل شخص اپنی دنیا میں مگن رہنا جانتا ہے اور کھانا کھانے کو زندگی سمجھنے والا انسان اتنا فقر کسی طور نہیں نبھا سکتا۔ دنیا میں سب سے زیادہ ناکام انسان سمجھتا تھا میں تمہیں، جس کے پاس میرے مضبوط حوالوں اور میرے دیئے گئے عیاشی کے پیسوں کے سوا کوئی ذریعہ نہیں تھا شناخت کا۔"

رائم بخش ان کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر اس نے چیک بک نکالی تھی اور ان کے سامنے ڈال دی تھی۔

"یہ وہ اکاؤنٹ ہے جو بچپن سے لے کر آپ میرے لئے اکٹھا کرتے رہے۔ مگر میں نہیں جانتا کس سے چیک کیا صرف اس کا رہن رہا ہوں۔ جس شعور آنے کے بعد میں نے کبھی ایسا ساتھ زندگی گزارا یا وہ کچھ رہا تھا۔ میں نے کبھی آپ کی دی گئی گاڑی استعمال کی نہ دو ہیں۔ میں نے اپنی محنت سے تعلیم حاصل کی، نوکریاں کر کر کے پیسا گزارا کیا۔ لوگ کہتے تھے اتنے دولت مند بخش صاحب کا بیٹا کنجوس اور ٹھرک میں کچھ لگتا ہے وہ صرف تلے میں نظر آتا ہے تو یہ بھی لڑکیوں کو امپریس کرنے کی کوشش ہے بھی۔ پاپا! میں جتنا کماتا تھا ان دنوں اس میں صرف شرٹ اور جینز ہی آ سکتی تھی۔ میں نے ایک ایک سوٹ تین تین سال

تک بھی پہنچا ہے۔ میں نے کبھی ہوٹلنگ نہیں کی، میں نے کبھی کسی بڑے برانڈ یا بوتیک سے شاپنگ نہیں کی، اس لئے نہیں کہ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا، بلکہ اس لئے کہ میں ایک ایک پائی سے ملک کو بچانا چاہتا تھا۔ میرا نفس مجھے بار بار کہتا تھا اس عیش و آرام پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے، جتنا کسی سو کالڈ امیر باپ کی اولاد کا ہوتا ہے۔ لیکن میں نے نفس کو اس احتیاج سے روکے رکھا۔ میں کوئی ولی نہیں تھا، لیکن میں نے پھر بھی زندگی جینے کے لئے کٹھن راستے کا انتخاب کیا تھا۔ میں بہت مخصوص رفتار سے چلنے والا انسان تھا کیونکہ مجھے شہریار صاحب کی کمپنی میں منیجری کی پوسٹ آفر ہوئی، وہیں سے میرے راستے کی سمت مل گئی۔ قدرت خود بخود میرے لئے راستے بناتی چلی گئی۔ منیجر میں کب حاتم یوسفی سے مسٹر منیجر بن گیا، مجھے پتہ نہیں چلا، مگر مجھے خوشی ہے میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔"

مسٹر یوسفی اسے دیکھتے رہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر انہوں نے کہنے سے پہلے ہونٹ بند کر لئے تھے۔

"کیا آپ میڈیا کو بتانا چاہیں گے کہ مسٹر منیجر دراصل آپ کا ہی بیٹا ہے؟"

مسٹر یوسفی نے نفی میں سر ہلایا تھا، پھر نخوت سے بولے تھے۔ "مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں کسی طرح بحیثیت باپ کے، تمہیں بچانا چاہتا ہوں، بلکہ میں یہ چیز میڈیا کو اس لئے نہیں دوں گا کہ میڈیا کے لوگ ہوں، سیاسی لیڈر یا بیوروکریٹ، کسی نے میرا ساتھ دیا نہ مجھے بچانے کی کوشش کی۔ وہ سب اپنی اقتداری کرسیاں بچانے کے لئے مجھے داؤ پر لگا گئے ہیں۔ انہوں نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا ہے اور تم جانتے ہو میں کتنا منتقم مزاج انسان ہوں، بدلہ لئے بغیر خاموشی اختیار کرنا میرا مسلک نہیں، معاف کر دینا میرا شیوہ نہیں۔ سو جو کچھ میرے ساتھ ہوا، میں چاہتا ہوں ان کے ساتھ بھی ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مسٹر منیجر خود کام جاری رکھے، مسٹر حاتم یوسفی! میں اپنے انتقام کے لئے تمہیں آزاد دیکھنا چاہتا ہوں۔"

حاتم یوسفی کے ہونٹوں کو پھیکی سی ہنسی نے چھوا اور وہ سر ہلاتا ہوا ملاقاتی کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ وہ اپنے باپ کے مزاج کو جانتا تھا اس لئے بے فکری سے وہ باہر آ گیا۔ خلیل عبدالرحمٰن نے ہاتھ کے اشارے سے میٹنگ کا ایجنڈا پوچھا اور وہ کچھ کہتا ہوا اپنی بائیک کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ صبر اور ضبط جو باپ کے سامنے برقرار رکھا تھا، اب وہ ٹوٹ گیا تھا۔ آنکھوں میں نمی آتے ہی اس نے سن گلاسز لگا لئے تھے۔ خلیل عبدالرحمٰن نے اسے اکیلا چھوڑ دیا تھا تا کہ وہ دل کی بھڑاس نکال لے۔

❁ ❁ ❁

نیلم حافظ بہت خاموشی سے بیٹھیں سامنے والے کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ پھر بات کی تہہ تک پہنچیں تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی اور جہاں ندامت کے دکھ کے بعد یہ پہلی مسکراہٹ تھی، جو ان

کے چہرے پہ بچھی جاتی تھی۔

"آپ مومنہ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں رام؟ حالانکہ آپ جانتے ہیں مومنہ پہلے سے شادی شدہ ہے اور اس کی ایک بیٹی بھی ہے؟ وہ شہریار کی ذمہ داری ہے، لیکن اس کے حوالے کے ساتھ بیٹی کا ذکر آنا لازمی امر ہے۔"

رام چرن نے مسکرا کر نجم عاقب کو دیکھا پھر نرمی سے بولا۔ "مسٹر شہریار نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی لیکن اس کے باوجود میں زندگی گزارنے کے حوالے سے پہلی بار کسی مومنہ ہی جیسی مومنہ کا دن بہ دن انتظار کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن یہ سمجھ لیجیے گا کہ مومنہ اب آپ کے پاس میری امانت ہے۔"

نجم عاقب نے خوش دلی سے اس کے سامنے چائے رکھی اور بیٹی کو آواز دینے لگیں کہ کافی دنوں کے لئے وہ ان ہی کے ہاں ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ دونوں ملن پر بہت خوش تھی مگر جانانہ ہر طرح کی خوشی سے بے بہرہ کسی اپنے کمرے میں بند ہوئی کسی گہرے دکھ میں تھی۔ جانتی تھی سامنے شیرازی نے مومنہ کی ہر بات قبول کی تھی۔ مگر وہ جانانہ کے ارد گرد گھرا تھا لیکن آج کل وہ مرادوں سے بھی بے بہرہ تھی۔ نجم عاقب بیٹی اور رام چرن کو باتیں کرتا چھوڑ کر دوڑتے ہوئے رام سے نکلیں تو انہیں جانانہ کرب و رنج میں گم صم کھڑی نظر آئی۔

"جانانہ! کیا حالت بنائی ہے؟ خود کو سنبھالو جان!"

جانانہ نے خالی الذہنی سے ان کی طرف دیکھا۔ اسی وقت کسی نے انہیں اپنی طرف موڑا۔

"جانانہ کے مسئلے کا حل ہے میرے پاس۔"

وہ تیزی سے آواز کی سمت مڑیں۔ "شہریار...... تم...... آخر تم کب تک مسائل کا حل نکالتے رہو گے؟"

"جب تک ہوں تب تک ہیں! مجھے اداس اور زندگی کی لوگ تقاضا تجھے نہیں لگتے باہر آنے میں آپ کو بتا رہا ہوں اچانک کس طرح واپس لایا جا سکتا ہے؟"

نجم عاقب اس کے ساتھ ساتھ ڈائننگ ہال کی طرف دوڑتی چلی گئی تھیں۔ وہاں سے فیصلہ کرنا شروع کیا۔

"میں نے بہت کوشش کی مگر جانانہ کے بیٹے کے متعلق کچھ نہیں جان سکا ہوں۔ لیکن ہم اگر ہم مل کر جسے دل دینا ہے... گر مراد کا ہم شیرازی کو بتا کہ کسی طرح یہ بات ثابت کر دیں تو جانانہ پھر سے

AANCHAL

زندگی کی طرف لوٹ آئے گی۔ دیکھئے بیگم! یتیم خانے میں پلنے والے بچے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ یا تو عزتِ نفس کی پامالی سے بالکل بے حس یا اندر کی گھٹن، دنیا کی طرف سے شکوے کے ساتھ عزتِ نفس کا غرور ان میں سب میں ممتاز کر دیتا ہے۔ مراد کا شمار ان ہی بچوں میں ہوتا ہے۔ اس کا انداز بھی شیرازی جیسا ہی ہے۔ اس لئے یہ بات نبھ جائے گی۔"

بیگم حافیہ یہ بات کہہ کر مائی زلیخی کے کمرے کی طرف آئی تھیں۔ پھر کردار تخلیق ہو رہے تھے، جب اچانک جاناں مائی زلیخی کے کمرے کی دہلیز پر آ کر ٹھہر گئی۔

"زلیخی! تمہیں معلوم ہے جاناں، میرے شیرازی کا بیٹا کہاں ہے؟"

جانے ایک دم سے اس کے اندر یہ ہوک کیوں بلند ہوئی تھی؟ وہ خالی خزانہ گھڑی کی طرح کھڑی تھی۔ بس ایک دیے کی ضرورت تھی۔

"زلیخی! بتاؤ میرا بیٹا کہاں ہے؟ کیسا تھا؟" زلیخی بی بی نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا اور خود کو ایک جھوٹ بولنے کے لئے راضی کیا۔ یہ کوئی ناول یا فلم نہیں تھی کہ سب بچھڑے ہوئے کردار اچانک کسی اتفاق سے آن ملیں، ہمیشہ کوئی کرشمہ ہو، یہ ضروری نہیں اور یہی مائی زلیخی کو بھلا کر ایک جھوٹ گھڑا تھا۔ بیگم حافیہ نے مراد کو اس نئی کہانی میں اپنا کردار بنا دیا تھا۔ سو مائی زلیخی نے نرمی سے کہا تھا۔

"تیرے بچے کے گلے میں بڑے پیر صاحب کا تعویذ ڈالا تھا میں نے۔ شاید اب بھی ہو اس کے گلے میں۔"

"تعویذ؟" بیگم حافیہ نے حیرت سے کہا۔

اور زلیخی تعویذ کی ٹھیک ٹھیک شکل بتانے لگی۔ بیگم حافیہ کے چہرے پہ جذبات کا ابال ابھرا اور انہوں نے مراد کو آواز دی۔ "مراد! ادھر تو آنا۔"

مراد اندر آیا۔ بیگم حافیہ نے مراد کے گلے میں پڑے تعویذ کو اس کی شرٹ سے باہر نکالا۔ جاناں کی آنکھوں میں ایک شناسائی کی جھلک چمکی۔ وہ تیزی سے مراد کی طرف آئی تھی۔

"یہ...... یہ وہی تعویذ ہے، جو میں نے شیرازی کو دیا تھا۔" وہ کرلائی، بانہیں کھول کر پورے مراد کو اپنے اندر انڈیل لینے کی سعی کرنے لگی۔ بیگم حافیہ اسے روتے دیکھتی رہیں۔ انہوں نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جی بھر کر رو چکیں تو مراد کو ساتھ لگائے باہر آ گئیں۔ بیگم حافیہ نے اسے جانے دیا اور اس کے جاتے ہی بیگم حافیہ نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

"شیرازی واقعی عبدالرحمن کی سب اولادوں میں سے سب سے بہترین بچہ ہے۔"

مائی زلیخی نے ٹھنڈا سانس بھر کر دھیرے سے بولی۔ "تمہیں عبدالرحمن کی ساری اولاد ہی اچھی ہے۔ بہت دل سے پالا ہے اس نے اپنے بچوں کو۔ بہت خوش قسمت انسان ہے عبدالرحمن۔"

نجم ثاقب نے کھڑکی سے باہر شام کے سائے میں مرال کے ساتھ باغیچے میں چلتے شہریار کو دیکھا۔ شہریار کا ایک بار پھر سے باپ اور پھر سے شہریار کا تاسف ان کے اندر گونجنے لگا۔ "شاید محبت سے میں نے نفرت کر محبت کی وجہ ان کو محبت کو نفرت سے محبت نہیں ہوتی۔ ہوتا ہے اس بیٹا! کچھ لوگ محبت سے محبت کرتے چلے جاتے ہیں لیکن محبت کا دل ان کی طرف نہیں مڑتا اور کچھ لوگ محبت کو اپنی احتیاجات میں سب سے آخر میں رکھتے ہیں لیکن محبت ان کی کھوج میں پھر جاتی ہے بیٹا! یہ محبت بہت خوار کرواتی ہے، ان کی راہوں میں رول دیتی ہے یہ محبت۔"

نجم ثاقب نے دیکھا مسز عبدالرحمٰن کے دل کی سبز موسموں کی دعا دی۔ نجیبہ بانو کے دل پر سونپ ہوا اور شہریار کے لئے ان کے دل میں کچھ محبت اور بڑھ گئی۔

"واقعی عبدالرحمٰن کے دل کو زندگی کی ان کے کھار کرنے کی دعا کی طرح لگ گئی ہے۔" وہ مسکراتی ہوئیں اور ان کی زندگی کی بھری آنکھوں سے دیکھتی رہ گئیں۔

❀❀❀

ثانیہ نے شہریار کی وہ ڈائری جو مسز عمرانی کے سامنے رکھی تو ان پر ردعمل متوقع ہوا تھا۔

"یہی ہے وہ عورت، یہی نرسہ، یہ وہ عورت ہے جو ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے۔ کل رات سے معافی مانگتی ہوں مگر میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ثانی! اس سے کہو مجھے معاف کر دے۔ وہ زرش..... اسے بھی کہو وہ مجھے معاف کر دے۔ پتہ نہیں وہ کہاں چلی گئی ہے؟ پہلے تو میری آوازوں کا جواب دے دیا کرتی تھی۔ پتہ نہیں اب کیوں روٹھ گئی۔"

"پاپا! آپ چاہتے ہیں زرش آپ کو معاف کر دے؟" ثانیہ نے پوچھا۔ مسز عمرانی خصوصیت سے اس بات میں سر ہلانے لگے۔ ثانیہ انہیں کا رستہ دیکھتا ایک چانس بچانے رہنے پر چلنے لگی اس راستے کا پتہ شہریار سے ملا تھا۔ چند روز بعد وہ اس گھر کے سامنے تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں آن بیٹھی تھی۔ ڈرائیو جس نے اسے ذہنی جھٹکا دیا تھا گھر کی ذمہ داری اٹھائی تھی تب ثانیہ نے آہستگی سے کہا تھا۔ "سر! آج میں آپ سے ایک بہت ہی اہم خبر کہنے آئی ہوں۔"

"کیا؟..... آپ عزیز کیا ہو گیا ہے؟" ان کے دل نے سوچا اور انہوں نے تفصیل سے ثانیہ کو بتایا۔ لینے کے بعد مسز عمرانی کی طرف دیکھا جو فرماں بردار بچے کی طرح سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"سر! میں اپنے پاپا کی طرف سے ان کی ایک غلطی کی معافی مانگنے آئی ہوں۔"

"لیکن بیٹا! میں آپ کے پاپا کو نہیں جانتا۔"

"مگر میرے پاپا بیگم عطیہ کو جانتے تھے۔ بیگم صاحبہ بھی میرے پاپا سے واقف ہیں۔"

ثانیہ اپنے پاپا کی ڈائری اور ڈائری میں رکھی گئی تصویر کے حوالے کی پوری کہانی بتانے لگی اور عین اسی وقت مومنہ سونیا کے ساتھ چائے کے لوازمات لئے داخل ہوئی۔ وہ آج ملنے کے خیال سے گھر آئی تھی۔ چائے بنانے میں اس نے سونیا کا ساتھ دیا تھا۔ مگر مسز عمرانی، جعفر ماجد وارثی سے بیٹھے تھے۔ ان پر مومنہ کو دیکھ کر رد عمل بہت اچانک ہوا تھا۔

"عطیہ!..... پلیز عطیہ! مجھے معاف کر دو۔ تم بہت عظیم عورت ہو۔ میں اس وقت بہت پاگل ہو رہا تھا، تم نے مجھے ٹھکرا دیا تھا اس بے وقعت کے لئے اور مجھ سے یہی بات برداشت نہیں ہوئی۔ میری جاگیر دولت سب کچھ تمہیں اس ایک بے وقعت کے آگے کم تر لگا اور میں نے سوچا تم میری نہیں ہو سکتیں تو میں تمہیں اس کا بھی نہیں ہونے دوں گا۔ تمہارے شوہر میں یہی خیال چھپا تھا۔ مگر عطیہ بانو! تم نے پانی بات تم نے اتنا بدلہ لیا؟ محبت کرنے والے لوگ اتنے ظالم تو نہیں ہوتے؟ تم نے ہماری دو بچیاں مجھے کھا لیا۔ میری بچی مر گئی، بالکل ایسے ہی جیسے میں نے کہا تھا۔ تم تڑپ تڑپ کر مرو گی، تم نے میرا غرور مجھے ہی واپس لوٹا دیا۔ تم اتنی کٹھور تو نہیں تھیں عطیہ! مجھے معاف کر دو..... تم کہتی تھیں تم مجھے معاف کر دو گی تو زرش مجھے معاف کر دے گی۔ وہ گھر سے میری آواز پر پلٹ آئے گی۔ مجھے میری زرش چاہئے عطیہ! مجھے میری زرش لا دو۔ وہ میری بچی پتہ نہیں کہاں کھو گئی؟ مجھے ملی نہیں رہی۔ ہمارے گھر میں سب مر گئے ہیں عطیہ! سب مر گئے ہیں۔ پلیز عطیہ! مجھے ایک بار کہہ دو تم نے مجھے معاف کر دیا۔"

مومنہ کے ہاتھ سے ٹرے بار بار لڑکھڑا جاتی تھی۔ مسز عمرانی نے اس کے پیر پکڑ رکھے تھے۔ ثانیہ دکھ اور صدمے سے باپ کو دیکھ رہی تھی اور ارسلان راشدی کا چہرہ بالکل زرد ہو گیا تھا۔

"مجھے اغوا کیا تھا، بھائی وہیں تھیں، ان سے پوچھئے، میں ان میں سے ایک کو نہیں جانتی، انہوں نے مجھے زد و کوب کیا تھا۔ ارسلان! میری بات کا یقین کریں، بھابی میری بے گناہی ثابت کریں گی، بھابی......"

ماضی کا سین پھر سے ری پلے ہونے لگا۔ عطیہ بانو کیسے بلک بلک کر اپنی بے گناہی ثابت کر رہی تھیں اور وہ کیسے فرعون بن گئے تھے۔ "تم کہاں تھیں، کتنی تھیں، میں کیا جانوں۔ گئی ہو گی دولت کے پیچھے۔ تم جیسی عورتیں گھر کب بساتی ہیں؟" ان کا رخ عطیہ بانو کی طرف گھوم گیا تھا اور وہ عبدالرحمن اور ان کے متعلق نازیبا گفتگو کر رہے تھے اور آج اتنے برسوں بعد ایک ایسا شخص آیا تھا جسے وہ نہیں جانتے تھے۔ مگر وہ عطیہ بانو کو جانتا تھا اور وہ مومنہ کے پیر پکڑ کے کہہ رہا تھا۔ "عطیہ بانو! مجھے معاف کر دو، تم بہت عظیم عورت ہو۔" ڈاکٹر صاحب سے بیٹھ گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سمندر آن بیٹھا تھا۔ "تم جیسی عورتیں گھر نہیں بساتیں۔ تم نکل جاؤ میرے گھر سے۔ وہیں چلی جاؤ اسی شخص کے پاس جس کی دولت خوب صورتی تمہیں اٹریکٹ کرتی ہے۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، طلاق۔" کسی درد تھا ہاتھ پکڑ

کیا اسے گھر سے باہر گلی میں کھڑا کر دیا گیا تھا اور اس رات کا عذاب؟ اس رات کا عذاب اب دہرا ہو گیا تھا۔

"عطیہ...... میری عطیہ! میں نے تمہیں کتنا غلط سمجھا؟ میں نے آمنہ کو کیا سمجھا اور وہ کیا نکلیں اور تم کیا تھیں، میں نے اپنی خوش قسمتی کو ٹھوکر ماری ہے۔ میں بھی ظالم ہوں اس شخص سے بڑا ظالم، اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو..... میں نے تو آج تک عطیہ کو...... اپنی عطیہ کو کیا کیا نہیں کہا، اور عطیہ...... کیا وہ مجھے معاف کر دے گی؟" انہیں لگا، وہ وہ ڈرائنگ روم میں بالکل اکیلے کھڑے تھے۔ سونیا نے مسز عمرانی کو اٹھا کر صوفے پر بٹھا دیا تھا اور وہ منت کرنے کے اصرار پر زندگی انہیں معاف کر رہا تھا۔ ثانیہ نے اجازت چاہی تھی۔ ڈرائیور ثانیہ کی ویل چیئر دھکیلتا ہوا باہر لے گیا تھا اور ارسلان راشدی خاموشی سے باہر نکل آئے تھے۔ آج وہ عطیہ بانو کے سامنے بالکل ماضی کے ارسلان راشدی بن کر جانے کے لیے نکلے تھے، لیکن کیا وہاں سے وہ مہربانی انداز میں ان کی راہ دیکھ رہا تھا؟ مٹی ڈھنی کے ڈھیر تلے وہ وجود جو کبھی ان کی زندگی تھا تو آج وہ نہیں تھا لیکن وہ زندہ تھے۔ کیا یہ اظہار وارثی تھا؟ وہ محبت کا دعویٰ کرتے تھے، جینے مرنے کی قسمیں کھاتے تھے مگر ان کی قسمیں کسی اور نے نبھا دی تھیں، ساری کی ساری قسمیں، اور وہ کتنے نیچے پیچھے آن کھڑے ہوئے تھے۔

"عطیہ! مجھے تم سے زیادہ کسی نے نہیں سمجھا اور میری بدقسمتی کہ میں نے تمہیں سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ یہ نہیں، یہ محبت ایک روح میں کیسے اتر جاتی ہے اور ایک وجود کی اس نچلی پرت تک کوئی نہیں پہنچ پاتا؟ ایک غالب رہتا ہے اور ایک مغلوب؟ عطیہ! میں ہار گیا تم جیت گئیں عطیہ! تم نے مجھ سے سچی محبت کی اور میں...... میں تو شاید محبت کے نام سے بھی ناواقف نکلا......" وہ دل ہی دل میں کراہتے ہوئے قبرستان میں داخل ہوئے تھے مگر عطیہ بانو کی قبر کے قریب پہلے سے کوئی بیٹھا تھا۔ کریم کلر کے کوٹ پینٹ پہنے وہ دل باندھے کوئی بہت مدھم انداز میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ یہ لفظ تو انہوں نے بھی سیکھے تھے مگر زندگی میں بہت کم ان لفظوں سے انہوں نے کچھ مانگا تھا شاید ان کے لیے کوئی پہلے ہی اتنے دل سے مانگ لیتا تھا کہ ان کو کبھی اس در کا راستہ پکڑنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

"نماز پڑھا کریں ارسلان! القرآن پڑھا کریں۔ آپ پڑھیں گے تو آپ کی آنے والی اولاد بھی اسی راہ پر چلے گی، اچھی اولاد صدقۂ جاریہ ہوتی ہے۔"

وہ اس بات کو ہمیشہ ٹال جاتے تھے، لیکن آج وہ اس وجود کے پیچھے اور قریب ہوئے اور انہوں نے جان لیا وہ کوئی اور نہیں شہریار عبدالرحمٰن تھا۔

"شہری! تم یہاں؟" انہوں نے ہولے سے پکارا مگر وہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ قرأت کی آواز، اگر بتیوں کی مہک سب ایک ساتھ ان کی روح کو چھو رہی تھی۔

"عبدالرحمٰن خوش نصیب ہے، اس کی ساری اولاد کتنی نیک، پاکباز ہے۔" انہوں نے مسٹر عبدالرحمٰن کو رشک سے دیکھا اور اسی وقت شہریار عبدالرحمٰن نے مڑ کر مسٹر ارسلان راشدی کی طرف دیکھا۔

کیا اسے گھر سے باہر گلی میں کھڑا کر دیا گیا تھا اور اس رات کا عذاب؟ اس رات کا عذاب اب دہرا ہو گیا تھا۔

"عطیہ...... میری عطیہ! میں نے تمہیں کتنا غلط سمجھا؟ میں نے آمنہ کو کیا سمجھا اور وہ کیا نکلیں اور تم کیا تھیں، میں نے اپنی خوش قسمتی کو ٹھوکر ماری ہے۔ میں بھی ظالم ہوں اس شخص سے بڑا ظالم، سامنے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو...... میں نے تو آج تک عطیہ کو...... اپنی عطیہ کو کیا کیا نہیں کہا، اور عطیہ...... کیا وہ مجھے معاف کر دے گی؟" انہیں لگا، وہ ڈرائنگ روم میں بالکل اکیلے کھڑے تھے۔ صوفیہ نے مسز عرفانی کو اٹھا کر صوفے پہ بٹھا دیا تھا اور وہ منہ کو ان کے اصرار پہ زندگی انہیں معاف کرنا پڑا تھا۔ ثانیہ نے اجازت چاہی تھی۔ ڈرائیور ثانیہ کی ویٹنگ چیئر دھکیلتا ہوا باہر لے گیا تھا اور ارسلان راشدی خاموشی سے باہر نکل آئے تھے۔ آج وہ عطیہ بانو کے سامنے بالکل ماضی کے ارسلان راشدی بن کر جانے کے لئے نکلے تھے، لیکن کیا وہاں سے وہ اُسی پرانے انداز میں ان کی راہ دیکھ رہا تھا؟ مٹی کے ڈھیر اور وجود جو کبھی ان کی زندگی تھا تو آج وہ نہیں تھا لیکن وہ زندہ تھے۔ کیا یہ اظہار وارثی تھا؟ وہ محبت کا دعویٰ کرتے تھے، جینے مرنے کی قسمیں کھاتے تھے مگر ان کی قسمیں کسی اور نے نبھائی تھیں، ساری کی ساری قسمیں سارے وعدے کچے دھاگے پیچھے آن کھڑے ہوئے تھے۔

"عطیہ! مجھے تم سے زیادہ کسی نے نہیں سمجھا اور میری بدقسمتی کہ میں نے تمہیں سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ یہ نہیں، یہ محبت ایک روح میں کیسے اتر جاتی ہے اور ایک وجود کی اس نچلی پرت تک کوئی نہیں پہنچ پاتا؟ ایک غالب رہتا ہے اور ایک مغلوب؟ عطیہ! میں ہار گیا، تم جیت گئیں عطیہ! تم نے مجھ سے بھی محبت کی اور میں...... میں تو شاید محبت کے مفہوم سے بھی ناواقف نکلا......" وہ دل ہی دل میں کراہتے ہوئے قبرستان میں داخل ہوئے تھے مگر عطیہ بانو کی قبر کے قریب پہلے سے کوئی بیٹھا تھا۔ کریم کلر کے کرتے پینٹ پہنے، وہ دل باندھے کوئی بہت مدھم انداز میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ یہ لفظ تو انہوں نے بھی سیکھے تھے مگر زندگی میں بہت کم ان لفظوں سے انہوں نے کچھ مانگا تھا، شاید ان کے لئے کوئی پہلے ہی اتنے دل سے مانگ لیتا تھا کہ ان کو کبھی اس در کا راستہ پکڑنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

"نماز پڑھا کریں ارسلان! قرآن پڑھا کریں۔ آپ پڑھیں گے تو آپ کی آنے والی اولاد بھی اسی راہ پہ چلے گی، اچھی اولاد صدقہ جاریہ ہوتی ہے۔"

وہ اس بات کو ہمیشہ ٹال جاتے تھے، لیکن آج وہ اس وجود کے پیچھے قریب ہوئے اور انہوں نے جان لیا وہ کوئی اور نہیں شہریار عبدالرحمن تھا۔

"شہری! تم یہاں؟" انہوں نے ہولے سے پکارا مگر وہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا، قرأت کی آواز، اگربتیوں کی مہک سب ایک ساتھ ان کی روح کو چھو رہی تھی۔

"عبدالرحمن خوش نصیب ہے، اس کی ساری اولاد کتنی نیک، پاک صاف ہے۔" انہوں نے مسٹر عبدالرحمن کو رشک سے دیکھا اور اسی وقت شہریار عبدالرحمن نے مڑ کر مسٹر ارسلان راشدی کی طرف دیکھا۔

"تم یہاں ٹھہری ہو؟" انہوں نے نئے سرے سے سوال کیا۔ تب ہی شہریار عبدالرحمٰن یکدم کھڑا ہو گیا۔

"میں ویسے ہی پاپا سے مام عطیہ کے بارے میں افسوس کر رہا تھا کہ مجھے وہ قطعی اچھی خاتون نہیں لگیں۔ مانتی ہوں میری ماما جیسی ہی ہیں۔ پھر بھی ان کا حق ہے ان کو اچھا کہا جائے۔ وہ جتنی اچھی تھیں، ہم نے اچھے طریقے سے یاد نہیں کیا۔ ہم نے ان کا حق ادا بھی نہیں کیا۔ پیارے انکل!" اس نے گہرا سانس لیا اور مسز رحمان راشدی نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

"عبدالرحمٰن بہت خوش قسمت ہے کہ اسے تم جیسے بچے کا والد ملی۔"

شہریار کے ہونٹوں کی ایک اداس مسکراہٹ نے چھوا اور اس نے قدم پیچھے لیے۔ "محبت خوش نصیبی ہے، جنہیں اکثر لوگ سے دروازے سے واپس لوٹا دیتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے وہ زیادہ بہتر کی تمنا رکھتے ہیں۔ پھر محبت انہیں ساری عمر ڈھونڈتی نہیں جو عمر بھر کے۔ یہ واقعی بے مصرف ہیں۔ اب نہیں بخشتی اور بہت بعد میں لگتا ہے وہ کتنا خسارے کا سودا کر چکے ہیں۔ انکل پاپا بہت نیک انسان ہیں۔ ان کی ساری وفا بھی بہت نیک انسان ہے۔ لیکن میں...... میں تو ابھی بھی بچی کو بچے کی کوشش کرنے والوں میں سے ہوں۔ میں بہت بدانسان تھا۔ ہاں میں اب اچھا بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ہاں امید ہے کہ شاید دیر ہی سہی کسی بچی سے چکھاں کے مجھے بخش دی جائے یہ مختصر۔"

مسز رحمان راشدی کی آنکھوں میں نمی چمکی اور انہوں نے اس کی پیشانی چومی۔ شہریار کو لگا جیسے انہوں نے ٹھیک طرح اس کی ماں کی محبت کے احساس کو چوما تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی تھی سنبھل گئی اور مسز رحمان راشدی بولے۔

"جو لوگ نیک ہونے کا پچھتاوا کرتے ہیں وہی خسارے میں ہیں۔ تم جیسے لوگ جو ہر نیکی کو پہلی نیکی سمجھ کر سمیٹ لینا چاہتے ہیں، تم ہی تو وہ لوگ ہوتے ہو جنہیں وہ معاف کر دیا کرتا ہے۔ جن سے وہ محبت کرتا ہے۔"

شہریار کچھ نہیں بولا تھا۔ آہستگی سے قدم موڑ گیا تھا۔ پھر آہستگی سے چلتے چلتے اس نے مڑ کے دیکھا۔ رحمان راشدی سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"ماما معاف کر دیں پاپا کو۔ یہ بہت دل گیر ہیں۔ انہوں نے بہت آپ کے دکھ اٹھائے ہیں۔ سارے وہ لوگ جو ہوتے ہیں وہ ایک ہی بات میں آ جاتے ہیں بعض باتیں مت جانی ہے ماردو جاتی ہے۔ زخم نہیں بھر سکے۔ لیکن ماما بھولنے کی کوشش کریں اپنے زخم کو ان کی آپ کو بہت دل سے یاد کر رہا ہے۔" اس نے عطیہ تو سے دل کو مخاطب ہونے سے نہیں روکا۔ پھر وہ ذرا سا بچا ہی تھا کہ سالار عبدالرحمٰن

اس کے روم میں پہلے سے ہی وہ جا پائے گئے تھے۔ اس کا کمرہ یوں الٹ پلٹ تھا جیسے کسی نے بہت جان مار کر کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔

"خیریت ہے بھائی؟ کچھ ڈھونڈ رہے تھے کیا؟"

سالار عبدالرحمن نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ اس دن کی ہاسپٹل کی ذات کا قصہ اتنا زیادہ تھا کہ اب وہ اس کی طرف دیکھا بھی نہیں کرتے تھے اور اب اس کے روم میں تھے، کوئی خاص ہی بات تھی۔

"تم نے جس فائل پر میرے دستخط لیے تھے وہ کہاں ہے؟"

"آ آ آپ کو پریشانی کیا ہے؟ میں آپ کا بھائی ہوں، کسی غلط کام کا بہت پہلے کے باتیں کیوں لینے لگا؟"

"تم میرے بھائی نہیں ہو، مائنڈ اٹ۔" وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھے اور اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ "گھر والے بابا اور پاپا تمہارے لیے جتنا بھی اچھا سوچیں، میں تمہارے بارے میں کچھ اچھا نہیں سوچ سکتا۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہیں شوٹ کر دیتا۔ ہم لوگوں کی زندگی میں آئے ہی کیوں ہو؟" نفرت ان کے ایک ایک لفظ سے ٹپک رہی تھی۔ شہریار نے بہت آرام سے ان کے شکنجے سے اپنا آپ چھڑایا تھا اور وہ اپنی لایعنی بات کو پھر سے اپنی بات پر واپس آ گئے تھے۔ "گھر میں ہر شخص یہی سمجھتا ہے، تمہیں دولت سے لالچ نہیں ہے، تم کوئی فرشتہ ہو شاید؟ جبکہ میں جانتا ہوں تم جیسے بچے جن کی نسل کا پتہ نہ ہو، گندگی سے اٹھائے جائیں ان میں خاندانی تجارت رکھنے والوں کے مقابلے میں دولت کی بھوک زیادہ ہوتی ہے۔ تم جیسے بچے دولت ہتھیانے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں، کچھ بھی۔"

شہریار نے بہت مشکل سے خود کو سنبھالا تھا اور وہ پھر سے چیخے تھے۔ "کہاں ہے وہ فائل؟ میں نے تمہارا پورا کمرہ چھان مارا ہے لیکن تمہاری صرف ایک دراز نہیں کھول سکا۔ تم نے اسے کیوں لاک کیا ہے؟ اسے کھولو ابھی میرے سامنے۔ آخر ایسا کیا چھپا رکھا ہے تم نے اس میں جو تالے کی ضرورت پڑ گئی؟"

شہریار کو ہنسی آ گئی۔ اس دراز میں صرف اس کی میڈیکل رپورٹس اور تھوڑی بہت ڈاکومنٹس کے سوا کچھ نہیں تھا اور سالار عبدالرحمن سمجھ رہے تھے اس میں کوئی خاص چیز چھپی ہوئی ہے۔

"ٹھیک ہے، میں وہ دراز نہیں کھولوں گا، آپ کیا کر لیں گے؟ یہ میرا کمرہ ہے، میں یہاں کوئی چیز بھی کسی بھی حالت میں رکھ سکتا ہوں۔"

"تم اتنے با اختیار نہیں ہو، میں پاپا سے بات کروں گا، انہوں نے تمہیں زیادہ ہی سر پر چڑھا رکھا ہے۔"

"یہ بات آپ کئی سالوں سے کہہ رہے ہیں اور جانتے ہیں، آپ میرے متعلق کوئی بھی غلط فہمی نہیں رکھیں گے۔ میں کچھ بھی کہوں، آپ جانتے ہیں۔" آج وہ بھی ان سے ان کے ہی لہجے میں بول رہا تھا اور حقیقت وہ انہیں آئینہ دکھا رہا تھا۔

سالار عبدالرحمن لمحہ بھر کو رک گئے تھے۔ انہوں نے اس کے ہاتھ کا کرسٹل گلدان اٹھا کر چھیننے کی کوشش کی تھی اور غیر متوقع آج اس نے ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ "یہ گفٹ ہے جو بڑے بھیا ابو نے دیا ہے۔ پلیز اسے مت توڑیے۔"

سالار بھائی نے ایک جھٹکے سے گلدان کھینچا تھا اور کرسٹل گلدان ماربل کے فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا تھا۔

عین اسی وقت دروازہ کھلا تھا اور حازق کی ہونق شکل نظر آئی تھی۔

"بڑے بھیا! بات بڑھ رہی ہے...... آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" شہریار بہت لاڈلا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے اتنا غصہ آیا تھا اس نے سالار عبدالرحمن کو بہت غصے سے دیکھا تھا اور سالار عبدالرحمن فاتحانہ انداز میں مسکرا کر بولے تھے۔

"صرف ایک گلدان...... تمہارا دل صرف ایک گلدان کے ٹوٹنے سے ٹوٹ جاتا ہے؟ مجھے معلوم ہوتا تو میں تمہاری ہر پسند کی چیز کا تحفہ ہی ٹوٹوں میں بانٹ دیتا۔ شہریار! تمہارا دل اس گلدان کے ٹوٹنے سے ٹوٹ گیا اور تم نے کسی کا دل ریزہ ریزہ کر دیا، پھر بھی تمہیں کبھی احساس ہی نہیں ہوا؟"

"میں نے کبھی کسی کا دل ریزہ ریزہ نہیں کیا۔ ایک غلطی کا مداوا کرنے کی کوشش کی تھی، جس کی آپ تمام عمر مجھے سزا دیتے آ رہے ہیں۔ آپ کہتے ہیں آپ کو معلوم ہوتا کہ میرا دل صرف ایک گلدان کے ٹوٹنے سے ٹوٹ جاتا، تو آپ میری ہر پسندیدہ چیز کا تحفہ ہی ٹوٹوں میں بانٹ دیتے، تو کئی بھائی! آپ نے بچپن سے لے کر ابھی تک میرے ساتھ ہونے والے اس سلوک کے علاوہ کیا ہی کیا رکھا ہے؟ میری ہر بات کی تحریریں اخباروں میں دی ہوں یا مجھ سے محبت کرنے والے دل مجھ سے جدا کرنے ہوں، آپ نے یہی کام کیا ساری زندگی کیا ہے۔ پھر بھی آپ کو افسوس ہے، آپ مجھ سے نفرت کرنے کا کوئی بہانہ نہیں کر سکے؟ آپ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں بڑے بھیا؟ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟ مجھے جینے دیجئے، پلیز! اتنا بھی وقت ہے جب خوشی سے جینے دیجئے۔ یہ جان کر آپ کی زندگی سے بہت دور چلا جاؤں گا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں ابھی اختیار نہیں کر سکتے میری جدائی کی گھڑی آنے کا؟...... دیکھیے مجھے کے جانا ہے، آسان تو نہیں۔ دل کو راضی کرتے کرتے بھی وقت لگتا ہے، سالار بھائی!"

جازی نے کاٹ کر اس کا شانہ تھپتھپایا تھا۔ مگر وہ اس کی طرف دیکھے بغیر اس بند دروازے کو دیکھنے لگا۔ ڈاکومنٹس اور رپورٹس اس نے ٹیبل پر پھینکی تھیں پھر دل گیری سے بولا تھا۔ "یہ رپورٹس ہیں میری جو کہتی ہیں، میں کبھی بھی مر سکتا ہوں..... کیا آپ اس کمپنی کے درمیان کا وقت مجھے چین سے، محبت سے، جی بھر کے جینے دیں گے؟" سالار عبدالرحمٰن کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ بہت سے لفظ ان کے اندر چکراتے پھر رہے تھے۔ "آپ یہ دولت واپس لینا چاہتے ہیں تو لے لیجیے گا میرے بعد۔ میری زندگی میں کمپنی کی ٹرکیوں کو آنے جانے کی سہولت تو ملنی چاہیے۔"

اس فائل کا کیا تھا جس پر اس نے ان کے دستخط لیے؟ ایک سوال اٹھا اور شہریار ان کے بالکل قریب آ گیا۔ پھر جھک کے اس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تم کل لکھیں آ رہے ہیں مجھے۔ کبھی بھی میرا دل بند ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں نے اپنے لیے میں نے آپ کے دستخط اس فائل پر لیے تھے تاکہ میں نے شیئرز مارکیٹ میں جو اپنی ساکھ کی تھی کمپنی کی طرف سے اس کے تمام تر اختیارات میرے بعد آپ کو مل سکیں۔ اعتبار تھا آپ کا اور جازی کو پتہ ہے میں نے۔ سچی بتائی ہر مرنے والا انسان دولت ہاتھوں میں بھر کر کیا کرے گا؟ آپ بتایے مرنے کے بعد خالی ہاتھ جانے والا کیا کرے گا دنیا میں؟"

سالار عبدالرحمٰن ایک دم تڑپ کے زمین آ گئے تھے۔ اس کی رپورٹس ان کے ٹیبل پر تھیں پھر وہ تجسس بن گئی تھیں۔ آنکھ تک وہ اس سے صرف لڑتے آئے تھے۔ انہیں لگتا تھا وہ ساری زندگی ایسے ہی لڑ کر گزار دیں گے۔ لیکن آج ایک دم سے انہیں لگنے لگا تھا کہ جیسے زندگی نے یہ دن لیا تھا۔ یہ شخص جس سے وہ ہمیشہ نفرت کرتے تھے، یہ شخص مرنے والا تھا کسی بھی لمحے۔ کیا ان کا دل اس کی موت کے لیے تیار تھا؟ وہ جو دن پھر اسے مر جانے کی بد دعائیں دیا کرتے تھے تو کیا وہ ساری بد دعائیں ایک دم سے قبول ہو گئی تھیں۔ اس شخص کے بغیر ان کی زندگی کتنی خالی خالی ہو جائے گی۔ بچپن سے لے کر آج تک ساری توجہ انہوں نے ایک شخص پر ہی تو ضائع کی تھی، وہ کیا کر رہا ہے، کہاں غلطی کرتا ہے کہ اس کی تلاش میں شکست از بام کی جائے ان کو ہمیشہ نہ بات ہوں پھر تو گھر سے رہتے تھے تو وہ اس کے چلے جانے کے بعد کیا کریں گے؟ اتنی توجہ جو اس نے سمیٹی تو کیا یہ نفرت تھی؟ کیا نفرت میں انسان اتنا متوجہ رہتا ہے؟ کہیں یہ محبت تو کا کوئی وار تو نہیں تھا ان کے ساتھ؟" وہ یکدم بوکھلا ہی گئے تھے۔ سوچیں تیزی سے آئے تھے اتنی تیزی سے باہر نکل گئے تھے۔ پھر اپنے کمرے میں سکون سے بیٹھے بھی نہیں تھے کہ پاپا کا فون چلا آیا۔

"زرش کے کنڈولینس کے لیے آپ کو جانا چاہیے سالار، وہ ہماری کمپنی کی بیسٹ ماڈل تھیں۔" پاپا کہہ رہے تھے۔ مگر وہ سن کب رہے تھے۔ پاپا بات ختم کر چکے تھے لیکن وہ پھر بھی ہاتھ میں ریسیور تھامے کتنی دیر تک یونہی بیٹھے رہے۔

"میں مرنے والا ہوں، میرا دل کسی بھی وقت بند ہو سکتا ہے سنی بھائی!" لفظ بار بار ان تک لوٹ آرہے تھے۔ وہ بہت تیزی سے اپنے کمرے سے بھی نکل آئے تھے۔ انہیں لگ رہا تھا یہ آوازیں انہیں مار دیں گی۔ وہ تو کسی اجنبی کے مرنے کی خبر پر بھی افسردہ ہو جاتے تھے تو کیا وہ شیریار کی موت برداشت کر سکیں گے؟ وہ دفتر سے باہر نکل رہے تھے۔ مجبوراً ان کے کمرے کے سامنے سے گزرے تھے، جب انہوں نے جازب کی آواز سنی تھی۔

"آپ کو پتہ ہے کیا ہو رہا ہے ماں شیری بھائی؟ کیوں آپ اپنے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟ سنی بھائی پتھر دل ہیں۔ انہیں آپ کے جانے نہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا، مگر آپ ان کو چھوڑ کر ہمارے لیے کیوں نہیں سوچتے؟ امی تو آپ سے بہت محبت کرتی ہیں ماں۔"

"محبت......" ایک گہرا سانس تھا یا ایک لمبا شکوہ، وہ وہیں جم گئے تھے۔

"یہ محبت ہے مجھ سے؟ کسی محبت نہیں ہو سکی۔ تمام عمر میں اس کے لیے تڑپتا رہا تو یہ مجھے ملی ہی نہیں اور اب جبکہ میں جانے والا ہوں تو یہ محبت میری ہو گئی ہے۔"

"کوئی نہیں جانے والے آپ۔ میں پاپا سے بات کرتا ہوں، آپ کا آپریشن اسی مہینے فکس کرواتا ہوں ماں، انکل سے۔"

"آپریشن اور شیری؟ جازب تیز بات بہت بڑھ گئی ہے اب۔ زیادہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ معافی انکل بھی جانتے ہیں۔ بات اس لیے زور نہیں دیتے۔"

"فضول مت بولیں۔ ٹھیک ہو جائیں گے آپ۔" روتی ہوئی آواز۔ عبدالرحمن کا دل چاہا وہ دروازہ کھول کے پوچھیں کس بات کی تمہیں اچھا اجنبی کی طرح ہی کہ تمہیں دروازہ بند نہیں؟ مگر جانے یکدم ان کے بیچ آن کھڑی ہوئی تو وہ تیزی سے باہر نکلتے ہی چلے گئے۔ پاپا کی بات بھی انہوں نے اس لیے رد کر دی تھی مگر گھر آ کر بھی دل کو ایک بے چینی سی تھی۔ عائشہ کچن میں مصروف تھیں اور وہ بہت خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئے تھے اور پھر نہیں چاہتے ہوئے بھی ایک الماری کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ لاک کھولا تو گتے سارے ہوم ایک دم سے ان کے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔

"یہ شیری کی ماں، آپ کا جنم دن نہیں بھولتا، ہر سال تحفہ رکھتے ہیں آپ اسے، اتارتے ہیں آپ اس سے، پیکنگ 22 تحفے گفٹ سے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ بچپن میں تحفے سنی بھائی کہتا ہوا۔" پوری الماری اس کے تحفوں سے، اس کے کارڈوں سے بھری پڑی تھی۔ انہوں نے آج تک اس کا کوئی گفٹ کھول کر نہیں دیکھا تھا۔ عائشہ شروع سے انہیں جتاتی تھیں کہ ان کا رویہ بہت غلط ہے، چھوٹے بھائی کی طرف تو وہ اتنا کبھی جملہ شیریار تمہارا بھائی نہیں ہے۔ کبھی ٹینشن کرکے کہتے۔ "وہ میرا بھائی نہیں ہے۔" اور آج وہ اسی کے گفٹ نکال نکال کر دیکھ رہے تھے۔ گھڑیاں، کتابیں، پرفیوم، شرٹس، جو بھی تھے۔ وہ دیکھ

دیکھ کر، ان ہوتے رہے سارے ان کے دل کی باتیں کیسے معلوم تھیں انہیں کون سے رنگ پسند ہیں، کون سے رائٹر پسند ہیں، کون سی خوشبو پسند ہے اسے کیسے معلوم تھا۔ کیا محبت کرنے والے لوگوں پر الہام اترا کرتے ہیں؟

وہ پندرہ منٹ سے وہیں پر کھڑے تھے جب عائشہ نے گفٹ پیپر کے درمیان بیٹھے سالار عبدالرحمٰن کو تیسری بار غور سے دیکھا تھا۔

"خدا کا شکر ہے ان تحفوں کی بھی قسمت جاگی۔ کتنے سال پرانے گفٹ اب کھولے جا رہے ہیں۔ ویسے یہ معجزہ ہوا کس طرح؟"

سالار عبدالرحمٰن نے عائشہ کی طرف دیکھا، دل میں آیا پوچھیں۔

"کیا وہ جانتی ہیں شہریار کتنی کنفیوژن کا شکار ہے؟" مگر انہوں نے ارادہ بدل دیا کیونکہ عائشہ شوقی ہوتی تھی وہ اس بات سے بے خبر ہیں۔ ورنہ جتنا وہ شہریار سے پیار کرتی تھیں ان کے گفٹ وہ بند پڑے رہے ہوتے اب تک۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟" انہوں نے عائشہ سے پوچھا اور سالار عبدالرحمٰن نے پھیکی سی ہنسی سے ... سے کہا۔

"شہریار کی چوائس گفٹس کے معاملے میں تو بہت اچھی ہے عائشہ!"

عائشہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئیں، پھر محبت سے بولیں۔ "غور سے دیکھیں تو آپ کو لگے گا شہریار کی تمام چوائس سے کہیں زیادہ اچھی ہے۔ بس آپ نے کبھی غور ہی نہیں کیا، اس بچارے کو ہمیشہ اگنور کرتے رہے۔ ویسے آج بھائی پر اتنا پیار کیوں آ رہا ہے آپ کو؟"

"وہ میرا بھائی......"

یکدم ان کی زبان پہلی بار خود بخود رک گئی تھی۔ عائشہ ان کے جملے کے مکمل ہونے کا انتظار کرتی رہیں مگر وہ ادھورا جملہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ عائشہ نے نرمی سے گفٹ الماری میں واپس رکھنا اور گفٹ پیپرز اٹھا کر ڈسٹ بن کی نذر کر رہی تھیں۔ ابھی آدھے تحفے کھولے گئے تھے، آدھے باقی تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے سالار عبدالرحمٰن شہریار کی طرف کھڑے تھے، آدھے مڑ جاتے تھے۔ مگر وہ مکمل طور پر شہریار کی طرف مڑنے والے تھے۔ یہ عائشہ کا دل کہتا تھا۔ سو وہ گنگناتے ہوئے باقی کا کام کرنے کچن کی سمت مڑ گئیں۔

AANCHAL.COM.PK

❀❀❀

سالار شیر الرحمٰن کو ایک دم سے ہو گیا تھا اسی کیفیت میں۔ آج کل عائشہ سے بھی ان کا رویہ سرد مہری سے بنا ہوا تھا۔ محبت نہیں تھی مگر دل جوئی کا سا انداز تھا۔ آج کل وہ شہریار کی ایک ایک بات یاد کر رہے تھے۔ جہاں جہاں انہوں نے اسے لیٹ ڈاؤن کرنے کے لئے سخت تادیبی انداز اپنایا تھا، جہاں جہاں ان کے لئے آسانیاں پیدا کی تھیں، سب ایک کے بعد ایک یاد آتی جا رہی تھیں۔ وہ دفتر میں بیٹھے تھے کہ یکدم رات کو بہت چھپکے سے دیکھی جانے والی البم انہوں نے دراز میں سے پھر نکالی تھی۔

عائشہ کے سونے کے بعد بہت ساری اَن گنت دفعہ سے یہ البم انہوں نے چوروں کی طرح اٹھائی تھی۔ پہلی تصویر میں شہریار پوری جان سے قہقہہ لگا کر ہنس رہا تھا اور ان کی توجہ سے اس کی آنکھیں اس پہ جمی تھیں۔

کیا یہ نفرت تھی؟...... انہوں نے دوسری تصویر کی طرف دیکھا اور ایک یادوں کے اندر کھو گئے۔ یہ تصویر جازی کی پندرھویں سالگرہ کی تھی۔ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی تھی یہ سالگرہ۔ جازی کا ایک ڈیڈ آیا تھا اور شہریار نے چار دن بعد آنے والی سالگرہ کا چار دن پہلے سے مکمل پروگرام سیٹ کر کے شروع کر دیا تھا۔

"تمہیں چھٹی نہیں ملے گی مگر یہ سالگرہ زبردست مناؤں گا میں۔" اس دن اس نے دفتر سے چھٹی کی تھی اور اپنے کمپنی کے آئیڈیا اور ڈیکوریشن پارٹی کا تھیم بنانے کا کہا تھا۔ ڈیزائن، خوب صورت سجاوٹ...... اور وہ اس کی کارکردگی پر بل کھائے جا رہے تھے۔

"پاپا وہ پیسے کا ضیاع کر رہا ہے آپ اسے روکتے کیوں نہیں؟"

پاپا نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا تھا بلکہ بڑی نرمی سے بولے تھے۔ "تم نہیں سمجھو گے سالار یہ پیسے کا ضیاع نہیں محبت کا ایک انداز ہے۔ جازی ہمارا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔ سو اتنی محبت تو دکھا سکتا ہے۔"

وہ چپ ہو گئے تھے۔ مگر شام کو جب پارٹی میں پہنچے تو ہال کی سجاوٹ دیکھ کر اس کی صلاحیتوں کو انہوں نے دل ہی دل میں سراہا تھا اور وہ ہر گوشے میں ڈالے ہر زاویے سے تصویر کھینچ رہا تھا۔ پھر وہ کیک کاٹ رہے تھے، جب اچانک اس نے ان کے گلے میں پشت سے بانہیں حمائل کر دی تھیں، سامنے ہی کمپنی کے کیمرہ مین کھڑے تھے اس لئے انہوں نے کسمسانے پر اکتفا کیا تھا اور اس نے جازی کو اشارہ کیا تھا۔ "ایک تصویر ہو جائے جازی! ہٹلر ڈیڈی ویسے ہاتھ کہاں آتے ہیں؟"

جازی نے موقع سے دو تین تصویریں اتاری تھیں۔ پھر ایک تصویر پر وہ جو پہلے چہک رہے تھے، آج ہنس پڑے تھے۔ عائشہ ان کی اور اپنی دوسری کا کیک جیسی انہیں کھلانے والی تھیں۔ انہوں نے بھی

AANCHAL.COM.PK

آگے بڑھ کر منہ کھولا ہی تھا کہ آخر کے چند سیکنڈ میں اس نے اعتراض ڈال دی تھی اور کیک ہڑپ کر گیا تھا۔

"سوری بھائی! آپ کے کیک کا ذائقہ بھی ویسا ہی لذیذ ہے نا؟" عائشہ بتانی نے کئی منتوں کے بعد انہیں کیک کھلایا تھا۔ فارشہ نوفل مصنوعی خفگی سے بولیں۔

"شہریار بھائی! آپ نے بھی ہاں، اچھا خاصا مروا دیا ہے ... آپ بچے بھائی کی عادت تو جانتے ہیں ماں۔ پھر بھی شرارتیں ختم نہیں ہوتیں آپ کی؟"

اور وہ جوان کے بھرپور رہنے کے چکر میں مہمانوں میں گھرے ہونے کے باوجود ان کی طرف متوجہ تھے اس کے جواب پر مسکراہٹ کا شکار ہو گئے تھے۔ وہ عائشہ کے کندھوں پر ہاتھ رکھے باقاعدہ جذب سے کہہ رہا تھا۔ "آپ نہیں جانتیں بھابھو! پاپا جتنا بھی ماں ... انہیں اپنی محبت ظاہر کرنے کا طریقہ نہیں آتا۔ سو جب یہ مجھ پر غصے سے چنگھاڑ رہے ہوتے ہیں ماں تو میں ان کی آنکھوں میں محبت محسوس کر رہا ہوتا ہوں۔ ڈانٹتے وقت بھی ... مجھے کہیں تو ... ہوں کہ غصے میں بھی ... میری طرف ... آیا۔"

عائشہ بیگم اس وقت کی ... پاپا ... شہریار کے ساتھ ... ان کا رویہ ... ہوتا تھا۔ آج ......

"پاپا جتنا بھی ماں انہیں اپنی محبت کا ڈھنگ سے اظہار نہیں آتا۔" شہریار کی آواز پھر سے گونجی اور وہ شام گئے گھر لوٹ آئے۔ گھر میں کل کی منگنی کی تیاریوں کی وجہ سے کافی افراتفری مچی ہوئی تھی مگر شہریار ان سب تیاریوں میں شامل نہیں تھا۔

❀❀❀

"ہاں مجید صاحب! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ... بالکل ایسا ہی چاہتا ہوں۔ بس ... موسم نے...... میری بیٹی کی منگنی ہے، جیسی میں چاہتا ہوں، کوئی کمی نہ رہے۔ یہ ایک مکمل تقریب ہو۔"

وہ فون پر مصروف تھا۔ ... ان کی پشت پر پیچھے سے آ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ... کر رہا تھا ... تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس نے موبائل آف کر کے ... بجنے لگے۔ وہ جو پشت موڑے کھڑا تھا یکدم پلٹا اور سرپرائز رہ گیا۔

"ارے بڑے بھیا! آپ؟...... آپ کب آئے؟"

عدیل عبدالرحمٰن اسے جانچنے والی نظروں سے دیکھنے لگے۔ پھر آہستگی سے بولے۔ "ابھی آدھے گھنٹے پہلے جب تم کسی مجید صاحب سے محو گفتگو تھے۔"

"اوہو...... ان سے میں مانیا کی منگنی کی تقریب ارینج کرنے کی بات کر رہا تھا۔"

"میں نے سنی وہ بات۔" وہ ناخوش ہو گئے کیونکہ اسی وقت اس کی سیکرٹری اندر داخل ہوئی۔ "سر! لائن پر مسٹر نقی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں ماہ رخ کے سلسلے میں۔"

اس نے چونک کر ڈیڈی کو دیکھا، وہ بغور اسی سے سر ہلا کر ریسیور اٹھا کر گفتگو ہو چکا۔ "جی! بالکل مجھے آپ کے لئے کام کر کے خوشی ہو گی۔ جی! پلیز آپ اس نمبر پر مسٹر جازمی سے رابطہ کیجئے۔ آج کل وہی نئے کام دیکھ رہے ہیں۔" وہ نمبر لکھوانے لگا۔ ریسیور رکھ کر مڑا تو عدیل عبدالرحمٰن نے بہت بے قراری سے اسے دیکھا تھا۔

"اتنی ہی منگنی سے تمہاری سانس چڑھ گئی ہے۔ یہ اچھی بات تو نہیں ہے شیری!"

"میری زندگی میں اچھی باتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ وہ لیجئے ایک گڈ نیوز ہے۔"

"کیا؟" انہوں نے ناراضگی سے اسے دیکھ کر پوچھا اور وہ دراز سے کارڈ نکالنے لگا۔

عدیل عبدالرحمٰن نے کارڈ دیکھا اور تیزی سے کارڈ میز پر پھینک دیا۔ "یہ گڈ نیوز ہے تمہاری نظر میں؟" وہ بالکل بے بس ہو کر اور وہ انتہائی محبت سے بولا۔

"بحیثیت دوست کے دیکھا جائے تو یہ ایک گڈ نیوز ہی ہے میری نظر میں۔ بڑے بھیا! واثق بیگ کی طرح حماسہ سے نکاح کر رہا ہے ابھی۔ عاطف بیگ کا نکاح حماسہ کے نکاح کے ایک ماہ بعد طے پایا ہے۔ میرے دونوں دوست ایک خوشگوار زندگی جینے جا رہے ہیں تو کیا یہ گڈ نیوز نہیں ہوئی میرے لئے؟"

عدیل عبدالرحمٰن کچھ نہیں بولے اور وہ انہیں خاموشی سے دیکھنے لگا۔ کئی لمحوں تک جب انہوں نے شہریار کو مخاطب نہیں کیا تو وہ ان کے قریب آ گیا۔

"پلیز بڑے بھیا! ناراض تو نہیں ہو رہے۔ آپ جانتے ہیں میں جن لوگوں کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتا ان میں آپ سب سے پہلے نمبر پر ہیں۔"

عدیل عبدالرحمٰن نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ ان کے سامنے چیئر گھسیٹ کر بیٹھتا ہوا بولا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں، مجھے زنجیر ڈال کر رکھیں؟"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کام تم بخوبی کر رہے ہو۔" انہوں نے طنزیہ سگریٹ کیس کی طرف اشارہ کیا اور وہ کان کو چھو کر شرمندگی سے بولا۔

"خدا کا دیا ہے بھیا! یہ صرف مہمانوں کے لیے رکھا ہے۔ دن بھر میں ایک سگریٹ کے علاوہ کچھ نہیں پیتا ہوں۔" انہوں نے بانچھتام کر جیسے دلاسا دیا اور سید علی عبدالرحمن کا گلہ سا لگ گیا۔

"تمہیں بخار ہو رہا ہے۔"

اس نے تیزی سے ہاتھ کھینچ لیے۔ "نہیں تو...... بس ذرا سی طبیعت خراب ہوگئی ہے، کچھ خاص نہیں ہے۔" جھوٹ صاف اس کے چہرے پہ لکھا تھا۔

"تم نے شیشے میں اپنی شکل دیکھی ہے؟"

"روز دیکھتا ہوں بھیا! کافی گڈ لکنگ ہوں وائی ناٹ۔"

"میں اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔ تمہاری شکل اتنی مرجھا کیوں گئی ہے؟ ایک مہینے پہلے اتنی کنڈیشن نہیں تھی، بھرا بھرا جسم......"

"کیا بھیا! آپ تو مجھ پہ بھی اپنی سیکرٹ سروس کی صلاحیتیں آزمانے لگے۔ میں پہلے سے اچھا ہی ہوں۔"

"نو ڈاؤٹ۔ کیا میں تم سے پہلی مرتبہ مل رہا ہوں؟ کئی سال بعد تم سے ملا ہوں کہ تم مجھ سے صفائی سے جھوٹ بولنے پہ تلے ہوئے ہو؟ کیا ہو رہا ہے اندر ہی اندر تم بیمار ہو رہے ہو بالکل صفائی سے رجوع کیوں؟" انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے خود سے قریب کرلیا تھا اور اس نے لمبا سانس کھینچ کر ان کے کندھے سے سر ٹکا دیا تھا۔

کتنی آسودہ...... انہیں تسلیاں کر رہی تھیں مگر لفظ...... لفظ مفقود تھے۔

"شہریار! کیا ہوگیا ہے اس ایک مہینے میں؟"

"کچھ نہیں، یہ جنگل پولیوشن سے اب نکل آیا ہوں نا بھیا!"

"مجھے کسی علاج کے نام کہ جنگل پولیوشن سے کیسے نکل آئے ہو؟" انہوں نے غصے سے سید علی عبدالرحمن نے اسے دیکھا اور شہریار کی آنکھوں میں نمی در آئی۔

"اب علاج کی کوئی گنجائش نہیں بچی ہے۔ بہت دیر ہوگئی ہے نا بھیا!"

"یعنی؟" انہوں نے بے قراری سے اسے دیکھا اور اس نے ان کے وجود میں سمانے کی کوشش کی پھر بہت مدھم لہجے میں ان کی سماعتوں میں انڈیلا۔

AANCHAL.COM.PK

"جلو آپ کے ساتھ جی لیا، بس یہی لمحہ میرا ہے۔ کسی اضافی لمحے کو جینے کا اختیار رکھا ہے میں نے۔ میں کبھی بھی، کبھی بھی مجھے آپ کو چھوڑ کے جا سکتا؟ دل دے بیٹھا!"
عدیل عبدالرحمٰن کو یکا یک کسی نے ان کا دل مٹھی میں پکڑ کر کھینچ لیا ہو۔ انہوں نے جھٹکے سے نگاہ اس کے وجود کو کندھوں سے پکڑ کر خود سے الگ کیا تھا، پھر غصے سے بولے تھے۔
"نہ جانے بھائی مجھے سنجیدہ مذاق کرنے والے بہت برے لگتے ہیں۔"
شہریار رہنما نے مذاق..... زندگی نے بہت مذاق کیا ہے بھیا! اس کی کڑی تنگی ہے، مت کالے۔ زندگی سے جا کر لا۔ بے کر کیا جیئں؟ کیا دے رہی ہے آپ کے بھائی کی محبت، آرزو کی، امید ہی چاہے
جانے کی تمنا سب کچھ پھر اس نے اپنی مٹھی میں دبائے رکھا اور اب جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے تو کتنی ہے ہم کہاں چلے؟ ابھی تو بہت کچھ ہے جہاں ساتھ پیار کرنے والے دل والی مار تحسین.....
کہاں سب سے دامن چھڑا سکتے ہو؟..... عدیل بھائی! میں! ام کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا، میں آپ سے جدا نہیں ہونا چاہتا، میں آپ کے جوشیر کو اپنی بانہوں میں تھام کر، پیار کرنا چاہتا ہوں، ابا کی شادی میں
شرکت کی حسرت ہے۔ مگر ایک ہی سانس میں زندگی سادہ کا سارا وقت بیت گیا ہے۔ مجھے نہیں پتہ میرے حوالے میں، خالی بیٹھنے لئے خالی بانہوں میں امید رکھتے، کیا میں جانا چاہتا ہوں؟"
عدیل بھائی کچھ نہیں بولے تھے۔ خاموشی سے اسے کھینچ کر ڈاکٹر ہمدانی کے کیبن لے گئے تھے۔
وہی سارے نسبت دیا رہے، ہو رہے تھے۔ پھر نتیجہ نیا کیا نکلتا؟
"آپ دیکھئے انکل! کوئی راہ بچی تو ہو گی۔"
ڈاکٹر ہمدانی نے مایوسی سے ان کی طرف دیکھا۔ "اس کا آپریشن پہلے بھی بہت مشکل تھا کامیابی کا صرف ایک فیصد چانس تھا، مگر اب تو یہ چانس اس نے بالکل ختم کر دیا ہے۔ اس کا دل مکمل طور پر ہار مان
چکا ہے۔ دل کے وال بند ہو جانے کی وجہ سے دل نے اضافی محنت کی ہے جس کی وجہ سے وہ ٹھیک تو کبھی نہیں ہو سکا، بلکہ اب بالکل جواب دے گیا ہے۔"
"نہیں مگر..... انکل ابھی بھی کچھ نہ کچھ ہے، آپ کوشش کریں نا۔"
ڈاکٹر ہمدانی نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے تھے۔ "اس کا سارا سسٹم Collapse کر چکا ہے عدیل! یہ چل رہا ہے، بس صرف دل پر ہے۔ جس دن اس کے اندر کی آخری تمنا بھی پوری ہو گئی اس دن
یا ایک دم سے ختم ہو جائے گا۔ گرے جگر لگے۔ ہر چیز اندر سے تباہ کر چکا ہے۔ بیماری نے اس کی جان نکالنے والی بیماری کر کے تو کسی نے اسے مکمل تباہ کر دیا ہے۔ ہم اسے آپریشن کے لیے بھی نہیں لے جا سکتے۔"

ANCHAL.COM.PK

زندہ رہنا ہی آنے کو زندگی جنت جانا بھی نہیں ہے۔"

عدیل عبدالرحمٰن کمرے سے نکل گئے تھے اور دروازہ کھولتا ہوا ڈاکٹر اندر داخل ہو رہا تھا۔ بلڈ ٹیسٹ کے بعد وہ کف نیچے کر کے بند کر رہا تھا۔

"کیا کہا ڈاکٹر نے؟" اس نے یوں پوچھا جیسے وہ خود بھی کسی امید کو تلاش لینا چاہتا تھا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔" عدیل عبدالرحمٰن کے لب کانپے اور وہ بے بسی سے انہیں دیکھ کر ان کی طرف سے پشت موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ابر جیسی دھند سامنے نظر آ رہی تھی اور ابھی کے ابھی ایک گاڑی سے ایک وجود اتر آیا تھا۔

"ڈاکٹر...... آکسیجن......" مختلف آوازیں تھیں۔ پارکنگ اس منظر پر [illegible] رہا تھا۔

"کیا محسوس ہو رہا ہے؟" عدیل بھائی نے جان کر پوچھا اور وہ پیچھے سے نماز میں [illegible]۔ "کچھ نہیں۔ مستقبل کے سینوں کا [illegible] رہی ہے۔ دیکھ رہا تھا۔"

"موت۔ کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔" انہوں نے اسے خود سے قریب کر لیا۔ [illegible] منہ سے کراہیں [illegible] اور وہ آہستگی سے بولا۔

"میں مرنے سے نہیں ڈرتا ہوں [illegible] سمجھا! لیکن جب میں سوچتا ہوں مجھے آپ سے، ماما سے [illegible] اور آپ سب سے الگ ہو کر ایک نئی زندگی جینی پڑے گی جس کا مجھے کبھی تجربہ نہیں، تو مجھے دکھ ہوتا ہے سارا احساس ہوتا ہے [illegible] اس بات سے لگتا ہے کہ مجھے میرے لوگوں میں نہ گزرا [illegible]...... یہ دنیا بھی بری نہیں تھی۔ اگر اس دنیا میں کمی خالی ہاتھ رہ گیا ہو؟"

"شیری! اتنا گھبرا کر [illegible] یہ احمقانہ بات ہے۔ میں کہہ رہا ہوں نا، تمہیں کچھ نہیں ہوگا تو واقعی کچھ نہیں ہوگا۔ ہم کل [illegible] ڈاکٹر سے رجوع کریں گے۔ انگلینڈ میں میرا ایک دوست بہت مشہور ہارٹ اسپیشلسٹ ہے۔ میں تمہاری رپورٹس اسے بھیجوں گا۔ [illegible] ہم کوئی [illegible] کریں گے۔"

شیری پار کچھ نہیں بولا تھا اور وہ شام گئے گھر لوٹ آئے تھے۔ عدیل عبدالرحمٰن ایک سکتے کی کیفیت میں چپ بیٹھے تھے جب بہت دیر بعد رابعہ نے پوچھا تھا۔

"آخر کیا بات ہوگئی ہے عدیل؟ جب سے سالار رفاقی آئے ہیں، وہ بھی سناٹے میں گم ہیں اور آپ بھی بہت چپ چپ ہیں۔ کوئی پرابلم ہے کیا؟"

عدیل عبدالرحمٰن نے رابعہ کو دیکھا اور مصنوعی مسکراہٹ دے کر بولے۔ "کیا مطلب، سالار اور سناٹے میں گم؟ اسے [illegible] اور غصے کے علاوہ بھی کسی موڈ کی خبر ہے کیا؟ میں نے تو ہمیشہ اسے غصے ہی میں دیکھا ہے آج تک۔"

"ہاں...... مگر آج ان کا موڈ کچھ اکھڑا سا ہے سامنے تھی اب سے شہریار کے پیچھے پڑے ہیں مگر تمہیں سے خفا کیوں لگ رہا ہے؟"

عدیل عبدالرحمٰن نے پوچھا کسی کو نہیں دیکھا تھا۔" بڑو مگر ابن سعود تھا سالار عبدالرحمٰن اور شہریار کو پیچھے سے ملے؟"

وہ اٹھ کر خاموشی سے کمرے سے باہر نکلے اور بے ساختہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نے جنم لیا۔ شہریار کارپٹ پر بیٹھا تھا اور ہما اس کے سر میں تیل ڈال کر مالش کر رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ ان پر کمنٹ بھی پاس کر رہی تھیں کہ اسے اپنا بالکل بھی پروا نہیں ہے بال دیکھو کس تیزی سے جھڑ رہے ہیں اور وہ کان دبائے مسکرائے جا رہا تھا۔

"فرصت ہی نہیں ملتی امی جی۔ بنا اپنا خیال رکھے کسی کا دل نہیں چاہتا۔"

"ہاں ہاں ہماری دنیا تمہارے کندھوں پر ہی تو دھری ہے۔" انہوں نے طنز کیا تھا اور وہ شرارت سے آنکھ دبائے جا رہا تھا۔

"آہا آج تو آپ بہت نایاب خوب صورت لگ رہی ہیں کوئی خاص بات؟"

ماتھے پر بل تھیں۔ "تم مت اپنی غلطی کو چھپا۔ مجھے پتا نہیں میں مت چھپایا کرو۔ ہاں جو پوچھ رہی ہے اس کا جواب دو۔ کیوں خود پر توجہ نہیں دیتے؟"

"کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ آپ ہیں نا میرے لیے پھر مجھے اپنی زندگی ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ ہنسا اور ہنستے ہنستے اس نے ماں کی گود میں سر رکھا تھا اور ماں جھینپی تھیں۔

"شہری کے بچے میرے کپڑے سارے تیل میں کرنے ہیں کیا؟"

اس نے ایک ہنسی تھی سالم کو وہ ہنسے لگا پھر چہرے کا تیل صاف کرنے لگا۔ کپڑوں سے بھی تیل پونچھ دیا تھا سالم مسکرائی تھیں۔ مگر انہوں نے احتجاج روک دیا تھا اور وہ اسی طرح ان کی گود میں سر رکھ کر بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا ملتا ہے اس طرح میری گود میں سر رکھنے سے تمہیں؟" ماں نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے اور وہ چہرہ اٹھا کر بولا۔

"یہ بخشش ہے میری زندگی کی امی! کوئی اس کے بدلے جنت ملے تو میں وہ بھی نہ لوں گا۔ آپ کی گود میرے لیے جنت ہے، قیمتی دولت ہے، ساری دنیا ہے۔ یہ حرف ماں اور "باوطن" زمین کی قدر و قیمت خوب جانتا ہے کہ پاؤں تلے زمین اور سر پہ آسمان کتنا قیمتی ہوتا ہے۔"

نام سے مجھے بلا لیا گیا تھا۔ انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر چوم لیا تھا اور عدیل عبدالرحمن کی سیمی آنکھوں سے اس منظر سے آگے بڑھ گئے تھے۔ وہ سالار عبدالرحمن کا وعدہ ہے بیٹے تھے۔ مگر وہ انہیں گھر میں کبھی نہیں ملے تھے اور ایک شام اور وہاں رہتی گئی تھی۔

❁❁❁

ماہا کی منگنی کی تقریب ایک ہوٹل میں منعقد کی گئی تھی۔ شہریار اور منت سب سے آگے آگے تھا۔ عاطف، سونیا، صائمہ، شافعہ، مائکہ اور زہرہ جبینہ وغیرہ سب اس تقریب میں اس کے ساتھ تھے۔ صائمہ ساتھ ان کی طرف متوجہ نہیں تھا جبکہ عاطف کام کرتے ہوئے بھی شہریار کو نظروں میں اس طرح رکھے ہوئے تھا کہ بالآخر اس نے اس کی طرف مڑ کر پوچھا تھا۔

"کیا ہوا برخوردار؟ بہت غور ہو رہا ہے میرے بھائی! ایسی دوستی پر؟" شہریار دیکھ رہی ہوں۔" عاطف نے وریج منت کے لئے پھولوں کا ہار اٹھایا اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"مجھے خطرے کی بو محسوس ہو رہی ہے۔"

"ہم آپکا کیا بگاڑ سکتے ہیں بھلا......" شہریار نے بات شرارت میں بدلنا چاہی اور عاطف نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

"تمہاری طبیعت......" وہ جملہ شہریار نے ہنس کر بات مکمل کی۔

"کچھ پہلے سے عاشقانہ ہے نا اور کچھ؟"

"شہریار تم ٹھیک طرح سے بات بھی نہیں کر پا رہے۔ تمہاری سانس کتنی پھول رہی ہے، تمہیں اندازہ ہے؟"

"بلڈ پریشر لو ہو رہا ہے....." وہ پہلو بچا گیا اور عاطف نے اس کی پیشانی پر آنے والے پسینے کو رومال میں جذب کیا۔

"تمہیں پسینہ کتنا آ رہا ہے اور رنگت بھی پیلی ہو رہی ہے؟"

"کیوں نہیں، یہ سب تقریب کی گرمی کا کمال ہے میرے بھائی!"

"شہریار! میں سنجیدہ ہوں۔" اس نے اب کی بار شہریار کو کندھوں سے تھام کر روک لیا تھا۔ "تم ٹھیک تو ہو؟"

AANCHAL.COM.PK

شہریار نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا پھر نرمی سے بولا۔ "جو محسوس کر رہے ہو ضروری ہے اس پر کوئی ٹاک شو یا پیپ کا پروگرام بھی ہو؟"
"نہیں پاپا۔" گھمبیر لہجہ اور پیچیدہ وہی جیسا بنا ہوا تھا۔ جب وہ کسی طرف سے پیچیدگی کر جاتا تھا۔
"تم اب لہجے سے مجھے دھوکا نہیں دے سکتے ہو۔ تم جانتے ہو میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"
"شاید ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ وہ دوسرے کو بہت اچھے طریقے سے جانتا ہے۔ لیکن بعد میں کھلتا ہے ہم نے خود ہی غلطی پہ ہی لگائی تھی۔"
"ڈاکٹر عدنان کیا کہتے ہیں؟" "یہ اصل بات پہ آیا۔" اس نے ہنس کر کہا۔
"وہ کیا کہیں گے کہ رہے تھے جتنی جلدی ہو سکے دوسری شادی کر لو۔"
"دوسری شادی؟ پہلی کب کرنی تھی؟" عاطف بیگ نے اچنبھے سے دیکھا اور وہ مسکرانے لگا۔
"اس لئے ہی تو کہہ رہے تھے دوسری شادی کرنے کے بعد پہلی کی یاد نہیں آئے گی۔ یہ وہاں تک نہ پہنچ کر۔"
"یہ بتاؤ کہ بیاہ ہونے والا ہے؟" عاطف بیگ نے اسے پھر طرح دی۔
اور اب کی بار شہریار نے اس کی طرف خفگی سے دیکھا۔ "ہم بہت اچھے دوست ہیں کیا تم مجھے ایسا سمجھتے ہو۔ ضرور رکھو گے، یا ضروری ہے کسی میں کسی کی آمیزش بھی ہو، تبھی خوشی کی علامت ملے گی؟"
لہجہ اتنا برا تھا کہ عاطف بیگ جو بہت ٹھنڈے مزاج سے اسے طرح دے رہا تھا یکدم ہی اپ سیٹ ہو گیا۔
شہریار نے ٹکٹ کا ساتھ لیا تھا اور دونوں ہوتے چلے گئے تھے۔ یہاں تک کہ شام کے سات بجے تقریب کا آغاز ہوا تھا۔ عاطف بیگ روٹھا روٹھا پھر رہا تھا۔ "مجھے مناؤ" کی تفسیر بنا مدیل عبدالرحمن کی نظر بار بار شہریار پہ جا کر ٹک جاتی تھی اور سالار عبدالرحمن جو نظروں سے ان نظروں کا تعاقب کر رہے تھے۔
اسٹیج پر بابا اور ماموں عبداللہ تقریب میں بیٹھے بے حد خوب صورت لگ رہے تھے۔ جازی دولہن کے روپ میں کے لئے دیکھ رہا تھا۔ سامعہ پر مکمل گھیرے سے قدم پر کھینچ رہا تھا۔
AANCHAL.COM.PK

جازی کے ساتھ وہ کیمرے کا رخ زیادہ تر شہریار کی طرف تھا۔ یہاں تک کہ اسے کہنا پڑا تھا۔ "اس تقریب کا مہمان خصوصی میں نہیں ہوں، باقی لوگ بھی آپ کی نظر عنایت کے منتظر ہیں۔"

جازی پزل ہو گیا تھا اب وہ ایک پروفیشنل مووی میکر کی طرح تقریب کو کور کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ اچانک شہریار نے سالار عبدالرحمن پر دھاوا بول دیا تھا۔

"سلامہ! ایک تصویر تو لینا۔ آج بڑے بھائی بہت خوب صورت لگ رہے ہیں۔ میں نے سوچا تھوڑی سی ان کی خوب صورتی میں بھی چرا ہی لوں۔"

دونوں بانہیں ان کے گلے میں حمائل کیں اور سالار عبدالرحمن نے کوئی سخت ردعمل نہیں دیا۔ شہریار ایک تصویر کے دوران ان کے کان میں گنگنایا تھا۔ "اس رویے سے میں یہ سمجھ لوں کہ آپ کو مجھ سے پیار ہو گیا ہے۔"

سالار عبدالرحمن نے گھور کر اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ شہریار زور سے ان کے کندھے پر جھکا ہوا تھا۔ جازی اور سلامہ دونوں نے تصویر لینے میں دیر نہیں کی تھی۔

"شہریار! اپنی حد میں رہو۔" اب کی بار وہ اس ٹرانس سے نکل آئے تھے، سو انہوں نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے تھے اور شہریار ہنستا ہوا ایک گروپ فوٹو کے لیے تیاری کر رہا تھا۔

"سارے دوست اکٹھے ہیں، ایک تصویر ہو جائے۔" اس نے موسیٰ، امر، نجمہ، سلامہ، شافع، عاطف بیگ اور سونیا کو اکٹھا کیا۔ اسٹیج سے دادا اور ماموں کو بھی بلوا لیا گیا۔ مگر عاطف بیگ پہلے ہی موڈ میں نہ تھا کنارا کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ شہریار خود اس کے پاس گیا تھا۔ شہریار کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ اچھے پوز میں نظر انداز کر کے کسی سے گپ شپ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ شہریار نے اسے پشت پر سے جا کر تھام لیا تھا۔

بازو اس کی کمر کے گرد کس کر وہ نرمی سے بولا۔

"جانے والوں سے ناراضگی اچھی نہیں ہوتی یار! جب تک میں ہوں، تب تک تو میری بداخلاقیاں برداشت کر لے، میں چلا جاتا ہوں، میں بہت برا ہوں، لیکن ہوں تو دوست نا۔ دوست اچھے ہوں یا برے، وقت نبھانا کمال کا ہنر ہوتا ہے۔"

عاطف بیگ کی سانس سینے میں اٹک گئی تھی۔ "تم ہمیشہ ایسے ہی ڈرامے کرتے ہو، ہر بار ایموشنل بلیک میل کیا کرتے ہو۔" اب کی بار اس نے خفگی سے کہا مگر نرمی صاف محسوس کی جا سکتی تھی اور شہریار نے اب اس کے کندھے سے سر ٹکا دیا تھا مگر بہت جذب سے بولا تھا۔

"یہ ڈرامہ نہیں، ایک حقیقت ہے عاطف! اس کی کبھی تمہاری محبت کے باوجود دنیا چھوڑنے پر مجبور کیا جانے والا ہوں۔ سو مجھے لگتا ہے سزائے موت کے قیدی کی آخری خواہش تو پوچھنی ہی چاہیے۔"

عاطف بیگ کچھ کہہ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ پھر سے بولا۔ "مجھے دنیا میں دنیا سے بڑھ کر کوئی عزیز نہیں۔ شاید اتنی محبت میں نے کبھی خود سے بھی نہیں کی۔ لیکن انکل عبدالکریم نے جو دس سال کا شادی کا نام

میری بیٹی ماشاء اللہ سے اس کی چھت سے میں وداع کر کے رخصت ہو رہے ہیں، یہ ممکن ہی بات ہے۔" عباس نے اس کے کندھے پر بازو حمائل کر کے بولا۔ "لیکن مجھے یقین ہے، میرے جانے کے باوجود تم اور حامد سب کی محفلوں میں ہمیں اسی طرح یاد کیا کرو گے۔ ہاں مگر جب وہ رخصت ہونے لگے تو اس کے آنچل سے ہر سال کی دعا ضرور باندھنا، اس کی آنکھوں کو پوری توجہ سے دیکھ کر کہنا خوش رہو۔" عبدالرحمن وہ تمام سب سے زیادہ جس سے پیار کرتا تھا وہ اس کی جان سے پیاری اس کی بہن تھی۔ شہریار اپنی بہن سے بہت محبت کرتا تھا اور اس سے قطع نظر کہ اس سے وہ اتنی ہی محبت کرتی بھی ہے یا نہیں، عاطف ایم کہتا اس سے لطف تمہاری بہنوں میں سب سے زیادہ رہے گی اور تمہاری یادداشت بھی کمال ہے۔"

عاطف بیگ سنانے میں گم ہو رہا۔

"چلو ایک تصویر کھنچوا لو۔ میں اپنی دوستی کا ایک یادگار ... سے پوری شدت سے جینا چاہتا ہوں۔"

عاطف بیگ کسی معمول کی طرح ان کے ساتھ چلا جا رہا تھا اور جاری ان کی مختلف زاویوں سے تصویریں لے رہا تھا۔ پاپا، ماما سب بے حد خوش تھے اور شہریار کی بہن بھی بہت خوش تھی۔ یہاں تک کہ اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔

"بہت خوش ہو آج۔"

اس نے مڑ کر دیکھا اور مسکرا دیا۔

"بہت سے بھی بہت زیادہ۔" اس نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

عدیل عبدالرحمن مسکراتے ہوئے بولے۔ "تم نے جلد ہی کیسے قابو کر لیا ہے؟ اب پلٹ کر کوئی بات ہو وہ ہی نہیں کرتے۔"

شہریار نے ہنس کر انہیں دیکھا، پھر شرارت سے بولا۔ "ابا چھوڑ جانے کا نقشہ کھینچا تھا ان کے سامنے فوراً ہی تیار ہو گئے ورنہ قائل ہونا تو بات ... سے ان کا کر گئے تھے انہیں کیا سمجھا۔"

شہوار ابھی جواب سوچ رہا تھا کہ عدیل عبدالرحمن نے چونک کر اسے دیکھا اور عین اسی وقت شہریار کا کندھا کسی کے شکنجے میں تھا۔

"تم ... تم خود کو سمجھتے کیا ہو، میں تمہیں بے وقوف نظر آتا ہوں؟ ... تم مجھے موقع جب چاہو گے آؤ گے۔ میں دیکھتا ہوں تمہیں۔ سارے حسابات چکتا کر دوں گا۔ مجھے اب اس پر ہی شک

AANCHAL.COM.PK

ہے کہ تم نے پاپا کی دی گئی مراعات سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے، یہ کیسے ممکن ہے۔"

شہریار پہلے کے مقابلے میں الجھا ہوا تھا پھر آہستگی سے بولا۔ "مجھے ممکنات معاملات میں دخل در معقولات کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے عدیل بھائی!"

سالار عبدالرحمٰن فون آف کرنے واپس مڑ گئے اور عدیل عبدالرحمٰن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "تم نے بات کا رخ کیوں بدلا؟"

شہریار کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی تھی۔ اس نے ضبط سے کہا۔ "مزاج میں عدیل بھائی کسی موڈ میں دکھائی دے رہے ہیں ان موڈ سے ایک اور بات جڑی ہے جو بھی ہو وہ پوچھتے نہیں ہیں۔ اور بس مجھے اندازہ تھا کہ...... وہ ٹوک کرنے والے نہیں سمجھا جاتا۔ مجھے وہی ڈر تھا۔ جو تم نے ابھی اپنی زبان سے کہے تھے ہیں، سے جیسا ان کے لئے بات کو بدلنا ہے۔"

عدیل بھائی نے کھینچ کر اسے خود سے لپٹا لیا۔ کچھ نہیں بولے۔ مگر ان کا پورا وجود جیسے جذبے کا نپ رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

نجم عافیہ نے اسے جمعہ کو صوم کے لئے روکے رکھا تھا اور شہریار کا لگا بندھا بہت زیادہ مصروفیت بھرا تھا۔ ماہ مبین شافعہ اور عاطف بیگ اور سونیا کا نکاح قریب تھا۔ آج ارسلان راشدی نے گیٹ ٹوگیدر دی تھی۔ سارا گھر شامل تھا۔ شہریار بہت خاموشی سے کرسی پر بیٹھا تھا کہ اچانک شافعہ اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

شہریار کو شافعہ کو دیکھتے ہی جھٹکے سے اس کا دل بھی آنکھوں میں آن بیٹھا تھا۔ وہ سچ مچ کہنے کا تمام لحاظ ان کے بالکل پاس آن کھڑی ہوئی...... اتنا پاس کہ وہ چاہتا تو اسے چھو سکتا تھا۔

اس نے شافعہ پر نظر ڈالی۔ کریم کلر پر مہرون ریشمی ایمبرائیڈری کے کام والا سوٹ اس پر بہت کھل رہا تھا۔ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

"کیوں...... پسند نہیں آیا کچھ بھی؟...... میں کب سے تمہارے سامنے ہوں، تم پر کچھ اثر نہیں کیا مگر وہ... وہی مجھے "کلاسی" لگ گیا۔"

شہریار نے گہرا سانس لیا۔ "کلاسی" ان کے رنگ ڈھنگ کی ایک جھلک تھی۔

اس نے مسکراتا ہوا شرارتی سے بولا۔ "تم اس لباس میں اتنی پیاری لگ رہی ہو کہ مجھے تمہاری تعریف میں الفاظ ڈھونڈ کرنے مشکل لگ رہے ہیں۔"

"بکواس شہریار!" شافعہ نے بہت ہی مستانہ انداز میں کہا۔ مگر اس کے شانے پر مکا مارا اور ایک تیز خیال اندر ہی اندر اٹھ کر بیٹھ گیا، تھے وہ مستانہ انداز میں کب پکارا جانا ممکن تھا۔ صرف حامد کے سامنے

سے وہاں سے اب فرق بھی تھی۔ کوشش بے سود اس کا تھا۔

اس نے آنکھیں بند کر کے پھر سے اسے دیکھا اور کوئی اندر گرا تھا۔

ایک شخص سے ملنا ہے مجھ کو

دو چار صدی باب کے بعد

اے عمرِ رواں! آ پاس مرے

رفتار کا پہیہ دھیما رکھ

رفتار کا پہیہ دھیما رکھ......

"کیا ہو گیا اتنے چپ چپ کیوں ہو؟" وہ قریب بیٹھ گئی اور نظریں اٹھا لیں۔ دل جو آنکھوں میں آن بسا تھا، دھڑکنے بھی لگا......

"کچھ نہیں...... بس یونہی فرزانی پاشا جیسی ہستی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کیسے قتل کیے جاتے ہیں۔"

"اب اتنی اچھی تقریب کا اس طرح ضائع مت کریں شہریار کے بچے!" انجم کسی نے اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ساتھ رمضان کے ساتھ کسی کی ہنسی بھی تھی۔"

وہ اسے دلچسپی سے دیکھنے لگا اور سامنے دیوار پر نظریں ٹکا دیں۔ "آپ کیا سمجھ رہے ہو؟ صحیح کہہ رہا ہوں۔ بیٹے جی حوالات فرشتے ہی رہنے جائیں۔ اور یہ نعمت مجھے کس نے ورثہ دی ہے۔ میں نے ابھی تک کام شروع نہیں کیا۔ ویڈیو اب وہ دل کی ہے۔ اگر تم نے سر سے ہی یہ سوچوں کے جال بنے؟"

ثریا ہنسنے لگی اور یکدم اس کی نظر حافظ بیگ پر پڑی۔ وہ بہت خاموشی سے سامنے دیکھ رہا تھا جیسے جانتا ہو وہ یہاں بیٹھے کیا سوچ رہا تھا۔

"حافظ! تم آج یار امسار سے دوست یہاں جب تم وہاں اکیلے کھڑے کیا کر رہے ہو؟" اس نے آواز دی۔ وہ بیٹھا رہا قریب آیا اور شہریار نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وقت سے گم ٹرین چلی گئی۔

"وہ مستقل اُن جہاں میں تم بھی نہیں

مستقل اس جہاں میں ہم بھی نہیں
نہ مسرت ہی مستقل ہے یہاں
مستقل اس جہاں میں غم بھی نہیں
پھر عداوت ہی مستقل کیوں ہو
آؤ کچھ اس طرح زندگی جئیں
ان اندھیروں میں روشنی کر لیں
آؤ دوستی کر لیں، آؤ دوستی کر لیں"

حاشر بیگ کی نئی تحسین کر رہے تھے اور حماد نے شافعہ کو دیکھ کر کہا۔

"دل ہوا خوش خیال تجھے دیکھ کر
پھر ہوئے بے مثال تجھے دیکھ کر
آنکھیں تھیں میرے اشکوں میں روشنی
اور مجھ سے بے کمال تجھے دیکھ کر"

شافعہ کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ پھیلتی گئی تھی اس کا ہاتھ ابھی تک حماد کے ہاتھ میں تھا اور سوہا نے شہریار کا کندھا دبایا تھا۔

"کوئی اور نظم ہو جائے شہریار بھائی!"

شہریار نے سر کھجایا اور سوہا کو دیکھ کر چپ کا چہرہ دیکھا۔

AANCHAL.COM.PK

وہ اس کے دل کا بھی جانتی تھی اور بج جانے والے دل کا اندر تک گونج رہے ہیں۔ بھلے وہ آپ سے کچھ بھی نہ کہیں، لیکن ان کی خاموش آنکھیں آپ کے دل کو چھوتی رہتی ہیں۔

"سنا کیجئے ان کوئی نظم۔" سونیا نے مجھرے سے اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ وہیں کہ سنانے لگا۔

"اے محبت! تری قسمت کہ تجھے مفت ملے
ہم سے سادہ جو کمالات کیا کرتے تھے
خاک میں کبھی مینارات کیا کرتے تھے
اے محبت! تیرا اجنت کی نہیں مول ملے
ہم سے انمول جو ہیروں میں ملا کرتے تھے
ہم سے منہ زور جو بے تحاشا اظہار کرتے تھے
اے محبت مری ناکام سے مگر ٹھہرے
ہم جیسے جو لوگوں سے سوالات کیا کرتے تھے
ہم جو سوغات کی اک بات کیا کرتے تھے
تری ذرا دل میں آنے سے ذرا پہلے تک
ہم بھی اس شہر میں عزت سے رہا کرتے تھے
ہم گزرتے تو کئی کام رکا کرتے تھے
اور اب تیری حماقت کے کھنڈر سامنے ہیں

AANCHAL.COM.PK

انقلاب شہر پناہ بنا شانِ قبر ہے

اے محبت! ذرا انداز بدل لے اپنا

تجھ کو آئندہ بھی عشاق کا خون پینا ہے

ہم تو مر جائیں گے تجھ کو تو مگر جینا ہے"

"اللہ نہ کرے شہری بھائی!" سونیا نے بے ساختہ کہا۔ انداز نے اسی انداز میں گھورا۔ سب نے تیز نظروں سے دیکھا اور عاطف بیگ نے خالی آنکھوں سے اس کے چہرے کا طواف کیا۔

"کیا کر رہا ہے وہ بابا، میرے دوست کو تو چپ ہی لگ گئی ہے۔ کہیں فرماسِ کا پاسپورٹ تو نہیں ڈال دیا ہے اس کی جیب میں؟" شہریار نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنے کی حسرت کی تو وہ دیکھتے سے کھڑا ہو گیا۔

"میں اندر دیکھتا ہوں ولیمے کے انتظامات کیسے چل رہے ہیں۔"

شہریار نے اسے جاتے دیکھا۔ پھر باتیں شروع ہو گئی تھیں۔ سب جتنے مستقبل کی پلاننگ کر رہے تھے کہ آئندہ دس سال میں کون کیا کرنے والا ہے۔

اور مامون عبدالکریم نے جس پر تبصرہ کیا اور ملامہ نے کہا تھا "دس سال میں...... میں نے فیملی پلاننگ کے منصوبہ کا ایک نظر بھی ڈال کر دیکھا۔"

شہریار مامون کی ہنسی اب سمجھا تھا۔ شاید دونوں کے درمیان بہت اچھی طرح اس کا ایک پس منظر ہو چکی تھی۔ مامون، ملامہ کے درمیان ان نئے رشتے پر شہریار نے سکون کا سانس لیا تھا۔ مامون حد درجہ جذباتی تھا اس لیے ضروری تھا کہ کوئی اور بھی دیا جائے کی طرح اس سے قریب ہوتا تو کہ اس کا حادثہ کا تکلیف دہ تھا۔

"کیا سوچنے لگے؟ تم بتاؤ تم آئندہ دس سال میں کیا کرنے والے ہو؟"

شہریار کو ہنسی آنے لگی۔ "آئندہ دس سال......" ایک لمبا سوالیہ نشان۔

"بھائی اتنے نیک ہیں کہ آئندہ دس سال میں بھی نیکیاں ہی کما رہے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے۔" ملامہ نے مامون کے سوال کا جواب دینے جانے پر جواب گھر اور عاطف بیگ ڈرائنگ روم میں جا کر

اندر کا بال نکال کر رخ انگارہ ہو گئیں سب تو ابھی آیا تھا پھر ایک نئی بحث سے گھر نے لگا تھا۔

"تم کیا کرو گے آئندہ بیس سال میں؟"

"کتابیں چھاپوں گا۔" سارہ کا جملہ۔

اور ماموں نے کہا: "اس پر بھی کوئی کتاب چھاپ دینا۔ بہت فضول ہو گیا ہے اپنا شہریار۔ کوئی بائیوگرافی آنی چاہیے اس کی۔ نقل بھی اتنی کر رہے تھے میرے شہریار نے بہت چھوٹی سی عمر میں ذمہ داریاں سنبھالنا یوں سیکھ لیا ہے کہ اب مجھے اپنے کولیگز کی ذمہ داری کا خیال بھی خواب کی بات لگتی ہے۔"

شہریار کو چائے پیتے پیتے پھندا لگ گیا۔ "پاپا کیا سوچنے لگے تھے؟" سب پانی بھرانے لگے تھے۔ حمزہ اکرام کا پھندا کھاتے لیتے کے بین کرنے لگے تھے۔

"او ہو دیکھو...... گہرا سانس لو۔"

الگ الگ انار ہیں۔ وہ بدقت سنبھلا اور کچھ گیا اور ماموں نے غصے سے دیکھا۔

"اتنی جلدی کس بات کی ہے چائے کہیں بھاگی جا رہی ہے کیا؟ ایک نمبر کے ندیدے ہو چائے اور کافی کے معاملے میں۔"

وہ مسکرا دیا اور بات وہیں سے شروع ہو گئی جہاں سے وہ نہیں چاہتا تھا کہ کبھی شروع ہو۔

"کیا کرنے والے ہو آئندہ آنے والے بیس سالوں میں؟" لاڈ سے پوچھا اور وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ "جب آئندہ بیس سال آئیں گے تو مجھ سے پوچھ لیجیے گا۔ پوچھوں گا تو بتائے گا آئندہ آپ نے میرے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا ہے۔"

ماموں نے جیتے ہوئے شہریار کے گلے میں بانہیں حمائل کی ہوئی تھیں پھر لاڈ سے بولا تھا: "اتنا پیارا بیٹا ہو تو آئندہ کے بیس کیا، بیس سال بھی ملے تو آئے، تو تجھے بانہوں میں سمیٹ لینے کو گل جائیں گے۔"

"ہم سے اچھے تو یہاں ہو گئے۔" سارہ نے شرارت دکھائی اور شہریار نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کچھ کہا نہیں۔

بات پھر شاعری پر آ کر رک گئی تھی اور شافعہ نے اپنی پسند کی نظم سنانے کی اجازت کے ساتھ فرمائش کی کہ فوزیہ کی بجنگی ہے جو کہ اسے پسند ہے۔

AANCHAL.COM.PK

شہریار نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ وہ اس کی آواز کو جتنا ہی نہیں دل سے سننا بھی چاہتا تھا اندر اتار کر ہمیشہ کے لئے اپنے پاس چھپا کر رکھنا چاہتا تھا مگر بخاسو تھی اور شافعہ سنانے لگی تھی۔

"بہت ڈھونڈا ہمیں کوئی ہم سا بھی پیاسا لوگو!

جی میں آتی ہے کہ پی جائیں یہ دریا لوگو!

تشنگی اس شہر کے گلیوں کی نہ کی جس بیاں

ہم جو آئے تو کسی نے بھی نہ پوچھا لوگو!

اتفاقات میں یوں کوئی درد کھلتا

جھلملاتے ہیں چلمن کوئی سایہ لوگو!

سب کے سب مست رہے اپنے زبان خانوں میں

کوئی کچھ بات مسافر کی بھی سنتا لوگو!

کس کا دامن، کسی آنچل کی ہوا دیتی؟

جب مرا چہرہ مانند گھٹا تھا لوگو!

اک نقش ورق تھی کیا جانئے کس کی تصویر

نقش وہم سے اور رنگ اڑا سا لوگو!

اک آواز تھی کیا جانئے کس کی آواز

اس نے آواز کا رشتہ بھی نہ رکھا لوگو!

AANCHAL.COM.PK

بکھری ہوئی وحشت ہے وحشت کی تنہائی ہے
وحشتِ دل نے کہیں کا بھی نہ رکھا لوگو!

اس میں بہت سے خزانے ہمارے بے حصار"

شہریار نے پہلی بار آنکھ کھول کر شافعہ کو دیکھا اور شافعہ کے چہرے پہ ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ شہریار نے تھم! کر چہرہ آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کا دل شاید بھر آیا تھا، ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملائے اور شافعہ اس کی آنکھوں کی گہرائی سے اپنی نظم بھول گئی تھی۔

"یہ تو ادھوری ہے۔"

"مجھے یاد نہیں آ رہی۔" شافعہ نے معذرت ظاہر کی اور شہریار نے کہنی سے ٹیک لگا کر عقاب جیسے بال، اس نظم کے ہونے سے لمحے کو جیسے تھام لیا گئے سے شہریار نے سر اٹھا لیا تھا۔

"اس میں بہت سے خزانے ہمارے بے حصار
اپنے گنبد میں ذرا بے خبر پھرو لوگو!
تم کو جن کی تمنا رہی حسرت بھی بادبانوں کی
پہ سفینہ کنارے سے ہی چلا لوگو!
آج کی ہاک سے کیا کوئی انقلاب آیا
کبھی در کشتیاں کبھی بے سہارے کیا لوگو!
کوئی پیغام زبانی بھی نہیں کچھ بھی نہیں
ہم نے اپنے کو بہت ہی سنبھالا لوگو!

AANCHAL.COM.PK

بند آنکھیں ہوئی جاتی ہیں پسارے ہیں پاؤں
نیند ہی نیند ہمیں اب نہ اٹھانا لوگو!
ایک ہی شب ہے طویل اتنی طویل اتنی طویل
اپنے ایام میں امروز نہ فردا لوگو!
اب کوئی آئے تو کہنا کہ مسافر تو گیا
یہ بھی کہنا کہ بھلا اب بھی نہ جاؤ لوگو؟
راہ تکتے ہوئے پتھرائی ہوئی ہیں آنکھیں
اور مرتے ہوئے بخشی ہوا سوز لوگو!
جیت جلتے تھے جو اپنا تھا کسی اور کا کام
اس طرح اور کسی کو نہ ستانا لوگو!"

سب مسحور ہو گئے تھے۔ یکدم ہارون عبدالکریم کا دل بہت تیزی سے دھڑکا تھا۔ وہ سب جیسے بتا گیا کہ وہ شافعہ کی طرف دیکھتا ہے محبت نہیں کرتا۔ لیکن اپنی قسم وہ بدل کی حالت میں رکھی تھی۔

ایک بار ہارون احمد نے کال کی اشعار پڑھ رکھی تھی۔

"بہت خوب، مہرو بیچاری میری جان!"

"سنے ابھی نانو کا پیپر لگوا کر اپنا کو منگوا لوں گا۔"

"تمھی نے تمھیں صاف اس نے یہ سب کہا تھا کہ وہ جمیل بھائی کے سامنے بہت تیزی سے کہہ سکتا تھا۔ اپنا شعر بار شافعہ کے پاس سے نکل آیا ہے۔ پسند کرتا تھا بہت شدید محبت نہیں تھی پر اچھا ہے بھائی

ANCHAL.COM.PK

نے تو دل سنبھال لیا ہے۔" اور جبریل بھائی مجھے اس کے خیال بلکہ شرارت سے ہنس پڑے تھے بیلا کو انداز تھا ان نے اب لگایا تھا؟ تب پہلے سے ان کی ذہنی کیفیت عجیب لگی تھی۔ مگر وہ جبریل بھائی کی ذہنی کیفیت
تمہیں وہ سمجھا تھا اور آج بالکل ایسا کہہ رہا ہے وہ ایک لمحے میں ان جھوٹ میں سے سچ نکال لیا تھا ان کے ہاتھ کے بنا دیے شہریار نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

"کہاں کھو گئے تھے؟" سلام نے بے چینی سے سوال کیا اور وہ بول پڑا۔ "بس وہ بیوفائی یہ نظم مجھے ہمیشہ ہی اداس کر دیتی ہے۔ پتہ نہیں یہ نظم ہے یا افسانہ یا افسانے میں چھپا سچ۔ مگر وہی انداز
مجھے اس نظم میں اس طرح مسرور کر لیتے ہیں کہ میں ان کے دل کا درد بھی اپنے دل میں محسوس کرنے لگتا ہوں۔"

"جھوٹ...... ایک اور جھوٹ۔" ماہ وش عبد الکریم پشت سے سہارا دیتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"پلیز مجھے کمپوز مت کرو۔" جانے یہ شہریار نے کہا بھی تھا اس کے اندر کی ہوک اس میں آن بیٹھی تھی۔ ماہ وش نے فوراً باتوں کا رخ اسٹریچر اور موسیٰ کی شادی کی طرف موڑ دیا۔

"وہ اس ویک اینڈ ہمارے یہاں منتقل ہو جائے گی۔" سلام اور شافعہ کی شادی میں شامل نہیں ہو سکیں گے۔ سلام نے اس کی باتوں کا ساتھ دیا اس کی مدت کی سمت انگلی اٹھائی اور پھر دی پارٹی کے آ جانے پر
باتوں کا رخ مدھم ہو گیا۔

عاطف بیگ اپنے اندر گم تھا۔

اور شافعہ اس منظر میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

یہاں تک کہ اس نے عاطف پر چھاپہ مارا تھا۔ "کون ہے وہ جسے شہریار صاحب چاہتے ہیں اور وہ انہیں پسند نہیں کرتی؟"

"پتہ نہیں۔ دل کی واردات تو دل میں رہتی ہے۔ کسی کو کیا خبر وہ کون ہے؟"

"آپ تو ان کے اتنے اچھے دوست ہیں۔"

عاطف نے ویٹر سے لے کر پلیٹ میں چکن ڈالا تھا اور نرمی سے بولا تھا۔ "اس میں کیا رکھا ہے مس شافعہ! کوئی لڑکی بن گئی۔ دوستی کی بات نہیں کسی کا اچھا دوست نہیں رہا۔ ہاں شہریار شروع سے
ہمارا دوست رہا ہے۔ ہر دوستی کا تعلق ہے وہ صرف شیری نے مضبوطی سے باندھ رکھا ہے۔ ہم لوگ تو کبھی کبھی اس کے حق میں کوتاہی کر جاتے ہیں۔ مگر وہ کبھی بھی نہیں بھولتا۔"

AANCHAL.COM.PK

شافعہ نے اسی سلسلے میں غلام سے بھی بات کی مگر کوئی جواب نہیں ملا تھا۔
اور کھانے کا دور یونہی چلتا رہا۔ یہاں تک کہ عدیل عبدالرحمٰن نے اسے جالیا تھا۔
"بہت خوش لگ رہے ہو۔"
"لگ رہا ہوں؟...... جناب! میں واقعی بہت خوش ہوں۔ نہ صرف ان دونوں کے لیے، بلکہ راحیل رشتی اور حکومت کے تعلق پہ بھی دل گارڈن گارڈن ہے۔"
عدیل عبدالرحمٰن نے محبت سے اسے دیکھا تھا۔ شہریار دونوں کا دوست تھا۔ عدیل عبدالرحمٰن نے مکمل تذکرہ کیا۔ "یہ بھی احسان شاہ کی وجہ سے بہت ناخوش ہیں لیکن بہرحال وہ اب خوش ہوں یا ناخوش آج کل جیل کی ہوا کھا رہے ہیں، اس لیے ان کا بھتیجا اپنی موت آپ مر چکا ہے۔"
شہریار ہنس پڑا تھا، پھر مسکرا کر بولا تھا۔ "صدمہ تو بہت ہوا ہوگا، شہریار کا سے قریب ہونے کا دعویٰ جان کر۔"
عدیل عبدالرحمٰن جواباً مسکرانے لگے، پھر نرمی سے بولے۔ "یہ بات صرف باپ بیٹے کے درمیان ہے کہ کوئی اندر کا بھیدی تھا جو ہمیں لوٹتا رہا۔ ہارون کی کارکردگی کی وجہ سے نواز حسن، احسن اور ابراہیم، اقبال سب اپنے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے جیل کی ہوا کھا رہے ہیں اور عزت بچا رہے ہیں۔ ان کے لوگ بھی اب ان کی مدد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس وقت جو ان کی مدد کرے گا، وہ ان بات اسکینڈل کا حصہ بن جائے گا۔"
"ویری گڈ، آپ لوگ تو کافی عقلمند نہیں ہو گئے ہیں؟" شہریار نے شرارت سے... عدیل عبدالرحمٰن نے اس کے کندھے پر ہلکا سا ہاتھ مارا۔ یہ اوجات کے بولے جان سے نکل گیا تھا۔
"تم ٹھیک ہو نا؟...... آئی ایم سوری میں بول گیا تھا کہ......"
شہریار نے خفگی سے ان کی طرف دیکھا، پھر آہستگی سے بولا۔ "اب آپ تو مجھے پلیز درست کریں، بڑے بابا! آپ پر طبیعت والا رول سوٹ کرتا ہے۔ حالات کیسے بھی ہوں، کوئی بھی حادثہ ہو، میں آپ کو ہمت ور دیکھنا چاہتا ہوں۔"
عدیل عبدالرحمٰن کچھ نہیں بولے اور وہاں سے باتیں کرتے آگے بڑھ گیا۔ شہرکار میں بیٹھے ہوا تھا کہ ماموں نے خطرہ کی سے ان کے کوٹ کی جیب پر ہاتھ مارا تھا۔

"کیا ہے بابا؟" وہ خفا ہو کر مڑا تھا۔ اس کی کارروائی کی وجہ اس وقت سمجھا، جب اس نے اس کا والٹ کھول لیا تھا۔

"تو یہ تصویر ابھی تک میرے والٹ میں ہے۔ سچ بتا کیا حقیقت ہے؟"

اس نے نظر تصویر پر جمائی تھی۔ جھوٹ بہت صفائی سے بولتا تھا اس نے کار سے ٹیک لگائی تھی۔ "ایویں کسی غلط فہمی میں مت پڑ۔ مجھے تو پتہ ہے میں کتنا وکھرا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں تو کتنا وکھرا ہے۔ مگر اب میں تیرے ان ڈھکوسلوں میں نہیں آؤں گا۔ خواہ مخواہ سائیڈ میں ہو جانے کی کوشش مت کر۔"

وہ کچھ کہنے والا تھا کہ اسے پیچھے سے شافع کی مترنم آواز سنائی دی۔ "شہریار صاحب! یہ فائل آپ اندر بھول گئے تھے۔"

وہ مڑا اور شافع کے ہاتھ سے فائل تھام لی۔ یہ فائل وہ دفتر سے آتے ہوئے سیدھا ساتھ ہی لیتا آ رہا تھا۔ کچھ باتوں پر اسے سلامہ کے تحت جانا تھا کیونکہ جس کمپنی سے وہ ڈیل کرنے کی بابت سوچ رہا تھا وہ گروپ آف کمپنیز آج کل سلامہ کے ہوم ورک کی زد میں تھی اور وہاں یہ فائل اس لیے لایا تھا کہ سلامہ سے اس پر رائے لی جا سکے۔ سلامہ نے ابتدائی معلومات کے تحت اس ڈیل کو پوسٹ پونڈ کرنے کا عندیہ دیا تھا۔ شافع وہی فائل لے کر آئی تھی۔ شہریار فائل لے کر اٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ رخصت ہونے کے بالکل ایک شافع نے اسے ٹریپ کر لیا۔

"آپ اتنی شدت سے کس سے محبت کرتے ہیں کہ جب وہ آپ کے سامنے نہیں ہوتی تو آپ کی آنکھوں میں آگ جلتی ہے، آپ کے دل میں ہجر کھلنے لگتی ہے۔ اور جب آپ کے اندر رہتی ہو گی تو آپ اس کو اپنے اندر جینے کے لیے کتنی جگہ دیتے ہیں کہ وہ جیسے چاہے آپ کے اندر سانس لے، آپ کے اندر رہے۔ کتنی خوش قسمت ہو گی...... وہ خوش قسمت لڑکی جسے آپ جیسا ڈیشنگ بندہ محبت کرتا ہے۔"

"محبت...." شہریار ہنسا، پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "عشق کرتا ہوں میں اس لڑکی سے، مگر وہ بھی مجھے میری طرح چاہے، میں اپنے لیے کبھی اس کو نہیں لگا۔ محبت اختیار میں نہیں ہوتی۔ یہ ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ مگر وہ ایسی لڑکی ہے کہ دل خود بخود اس کی محبت کے گھر میں دیے کی طرح جل اٹھتا ہے اور دیے کا کام جلنا ہوتا ہے اس کی شان اندھیرا دور کرنے کی بلکہ یہی کام ہے محبت اور بس میں اسی محبت کا دم بھرتا ہوں۔ رہا دل وہ کون ہے جو اسے جانے دیکھے ناں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں وہ اس سے آشنا بھی نہیں ہے کہ کوئی محبت سے بھی زیادہ وٹ کرتا ہے چاہتا ہے۔ اور یہ چپ کی زبان میں کسی کو پکارنا، خاموشی کے سمندر میں اتر کر ڈوب جانا، یہ ذرا ہم جیسے وکھرے لوگوں ہی کا کام ہے۔"

ماسوں خاموشی سے اسے دیکھے گیا اور پھر سارے راستے اس نے شہریار سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ شہریار خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

❀❀❀

آج اس نے عافیہ بیگم کے سامنے بہت اچانک اپنی ایک دوست کے گھر جانے کی ضد کی تھی۔

"کون ہے وہ دوست؟ کیا میں اسے جانتی ہوں؟"

"نہیں مام! آپ اسے نہیں جانتیں۔ بس اسے صرف میں جانتی ہوں یا پھر میرے سینے میں دھڑکتا ہوا میرا دل۔ کچھ لوگ ہیں جو مجھ سے کہتے ہیں مام! کچھ باتیں ہیں جو صرف دو دلوں کے اندر اترتی ہوئی خاموشی سے دل کے رازدار سیپی کی طرح بند رکھتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن کیا تم اکیلی جاؤ گی؟" بیگم عافیہ نے نیا سوال داغا اور وہ کچھ لمحوں کے لیے چپ ہوگئی۔

"میں اکیلی نہیں ہوں مام! میرے شیرازی کی محبت میرے ساتھ ہے۔ سچ پوچھئے تو میں کبھی بھی تنہا نہیں ہو پائی کیونکہ شیرازی کی محبت میرے لیے تنہا ہونے کی سب سے ... وابستگی کا گہرا تھا، وہ جس سے زندگی کی کٹھنائیاں گھبرا کر دور ہو جاتی تھیں۔"

"میں کبھی کبھی سوچتی ہوں، میں تمہارے ساتھ چلوں؟"

"سوری مام! میں آج خود سے وعدہ ان سے بالکل تنہا ملنا چاہتی ہوں گی۔ پتہ نہیں مام! تنہا ہونے سے غم زیادہ بڑھتے ہیں یا تنہائی کی وجہ سے انسان خود کو اکیلا لگتا ہے۔ آپ کو کیا لگتا ہے مام؟"

بیگم عافیہ نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

"تم تنہا نہیں ہو میری جان! میں ہوں نا ہر وقت تمہارے ساتھ۔ کیا کبھی اس دکھ سے نکلو گی۔ بیٹا میں یہ کیوں کہہ رہی ہوں۔ جانے اب کیا ہو گا اب کوئی دکھ تیرے دل کی زمین کو چھو کر بھی نہ گزرے۔"

"میرا دل کہاں؟" وہ بے بسی سے بولی۔ پھر اپنے لہجے میں بولی۔ "پتہ نہیں اس سینے میں اب کس دل کا لاہر پیار بھی ہے یا محض خلا ہی خلا ہے میرے اندر..... میرے وجود میں جو بھی کسی منزل کی طلب میں سفر کا تاک چکور ہے ہیں۔ مگر ایک عجیب سی گھٹن ہے جو پورے وجود میں بجلی جیسی چل رہی ہے۔"

بیگم عافیہ نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر کی سمت بڑھ گئی۔

AANCHAL.COM.PK

❀❀❀

سالار عبدالرحمٰن ابھی ابھی لنچ میں آ کر بیٹھے تھے۔ ایک عجیب طرح کی خاموشی ان کے اندر چپکے سے آن بیٹھی تھی۔ یہ وہ کون سی بات تھی، جو وہ پھر سے عمران کے فون میں یہاں سے وہاں پھیرتی پھر رہی تھی۔ آج بہت غیر متوقع انہوں نے امامہ اور شہریار کے لئے ناشتہ کرتے دیکھا تھا اور بہت غیر متوقع ان کی نظر ان کے چہرے پر اٹک گئی تھی۔ بہت کوشش کی تھی کہ وہ اسے نظر انداز کر دیں مگر نظر ان سے ہٹے۔ ہزاروں تشبیہیں تھیں، سادگی، معصومیت کہا تھا جو ان کے چہرے پر اس وقت ثبت تھا۔ وہ ڈائننگ روم کے بالکل سامنے والی کھڑکی سے گزرتے گزرتے ٹھہر گئے تھے۔

امام نے اسے پیار کیا تھا۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا ان سے۔ امام اس کے لئے چائے انڈیل رہی تھیں۔ وہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہونے کی شعوری کوشش کر رہا تھا۔ امام نے اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر رکھ دیا تھا اور بس، یہی وہ لمحہ تھا جسے وہ بھول نہیں پا رہے تھے۔ پچھلے پہلے والی بات ان کے اندر وہ ہی حشر مچا رہی تھی۔

انہوں نے عائشہ سے پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ کوئی جانے کیا کہا انہیں، بار بار اسی بات کو دہرانے کی ہے۔ چپ ان کی بے گھر شدہ ان میں گم رہا تھا۔ وہ بالکل ساکت بیٹھا رہا۔ کرسی پر جھول رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی سے ان کی توجہ مرکز سے ہٹ کر کمرے کے اندر گونج گئی تھی۔

"ٹھیک ہے بلوا لیجئے۔" انہوں نے خاموشی کہیں دور انداز میں توڑا تھا پھر چند سیکنڈ بعد عبدالرحمٰن کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

"مسٹر سالار! کیا آپ مسز زروش کے گھر تعزیت کے لئے گئے ہیں؟ وہ ہماری ایک بہترین ماڈل تھیں۔"

"سوری پاپا! مجھے موقع نہیں مل سکا۔ مجھے بہت ضروری کام تھے، جن کی وجہ سے میں ابھی تک تعزیت کے لئے نہیں جا سکا۔"

"تو اس وقت سارے کام چھوڑیے اور مسز زروش کے گھر جا کر تعزیت کیجئے۔"

"جی ٹھیک ہے پاپا! میں جا رہا ہوں ابھی۔" انہوں نے آتے ہی کافی کا آرڈر دیا، اب کیا تھا اس لئے وہ کافی کا انتظار کیا جا رہے تھے۔

جب ان کافی رکھ کر جا چکا تھا انہوں نے کپ اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک شہریار نے آ کر ان کے سامنے رکھا ہوا کپ اٹھا لیا تھا۔

"کافی کیسے پیتے ہیں، مزہ نہیں آتا ہے بھائی! کافی میں محبت اور دوستی کا تڑکا ہو تو ہی مزہ آتا ہے۔"

''بکواس مت کرو، میرا کپ لا کر دو۔'' انہوں نے بالآخر جھڑکا۔

وہ جواباً بڑی شرارت سے بولا۔ ''آپ پیدائشی بد مزاج ہوتے تھے یا دنیا میں آنے کے بعد ایسی تلخ مزاجی آئی ہے آپ میں؟''

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس نے کافی سے دو گھونٹ بھر لئے تھے۔

''اب یہ کافی ختم ہو چکی ہے۔ ختم کر جائیے۔ مجھے جھوٹا کھانے پینے کی عادت نہیں۔''

''یہ بھی غلطی ہے آپ کی، اگر آپ یہ کافی پی لیتے تو محبت کا شکریہ ہو جاتے۔''

''بکواس مت کرو۔'' وہ زور سے چیخے۔ اور پھر اچانک انہیں لگا جیسے ان کے اس طرح چیخنے سے سب کچھ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ کافی سامنے پڑی تھی۔ شہر بانو کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ انہوں نے کپ آگے سرکا دیا۔ کپ ابھی تک اسی مقدار سے لبریز تھا۔

''میں اتنا کیوں حساس ہوتا جا رہا ہوں؟ وہ بھی ان کے لئے جو پیار کے لئے ہیں جس سے میں اتنا ہی سب سے زیادہ نفرت کرتا ہوں، جس کے لئے میں نے سب سے زیادہ مرنے کی دعا نہیں مانگی ہیں۔''

وہ کافی پیے بغیر اٹھ گئے تھے۔ پھر ان کا رخ زرش کے گھر کی طرف تھا۔ مگر وہاں پہنچ کر پتہ چلا وہ ابا کی فوتگی کی خبر سن کر ... سے وہ آخر بہت کے وقفہ کے بعد ملے تھے۔

''آپ تو جانتے ہیں ہم سے ملے بغیر اس گھر میں دوسرے صاحب بھی اپنے خاص ملنے نہیں ہیں اور بیگم صاحبہ بھی اپنا ایک ہفتے کے لئے گئی ہیں۔ ہر وقت سلاخوں کے زیادہ سونے رہتی ہیں۔ جلدی آپ ان سے مل لیں۔'' انہوں نے رابطہ کا ذریعہ پوچھا تو ملازم اس کا موبائل نمبر اور اس کے فلیٹ کا پتہ لکھوانے لگا تھا۔

''آج ہی بیگم صاحبہ اپنے پرانے فلیٹ گئی ہیں، اپنا کچھ ضروری سامان لانے کے لئے۔''

وہ وہاں کا نمبر لے کر موبائل میں سیو کرنے لگے تھے۔ پھر اندر کر باہر نکلے تھے کہ اچانک ان کے وجود نے کسی کے ہونے کا احساس جگایا تھا۔

انہوں نے سامنے نظر ڈالی تھی اور ساکت رہ گئے تھے۔ جہاں زندگی سے سوال جواب کر رہی تھی۔ وہ کب تک اسے دیکھتے جا رہے تھے۔

شہر بانو گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی اور سالار عبدالرحمن نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی گاڑی کا تعاقب کرنے لگے تھے۔ کیا ستم ہے اس کے بعد بھی جانے کی ضد ان پر ایسی حاوی تھی کہ وہ اپنا مکمل کام چھوڑ کر اس

کے پیچھے پیچھے چل پڑے تھے؟

پھر نہیں پتہ کتنا عجیب لگ رہا تھا جب ملازم کے بتائے ہوئے فلیٹ کے سامنے پارکنگ ایریا میں جاناں نے اپنی گاڑی پارک کی تھی۔ وہ جاناں کے جانے کے بعد سنت لعل گارڈن سے باہر نکلے تھے۔ عمران کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ یہاں فرصت کرنے کے لیے آئے تھے یا پھر سے اپنے فریب سمجھنے کے لیے مگر وہ کیسے اندر داخل ہو سکتے تھے۔ انہوں نے یکبارگی سوچا اور دستک کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ مگر دروازے کو ہاتھ لگایا تھا کہ وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ بے دھڑک اندر داخل ہو گئے تھے۔ کوریڈور سے گزر کر وہ ڈرائنگ روم میں آئے مگر وہ دونوں وہاں نہیں تھیں۔ انہوں نے قدم آگے بڑھائے اور ایک کمرے سے آتی آوازوں نے ان کے قدم روک لیے تھے۔

❀❀❀

جاناں فلیٹ کی بیل بجا کر خاموش کھڑی تھی جب اچانک ملازم نے دروازہ کھولا تھا۔ جاناں اس کے اندر آنے کا عندیہ لیے بغیر اندر داخل ہو گئی تھی۔ تانیہ اسے اپنے سامنے دیکھ کر مبہوت رہ گئی تھی۔

"جاناں تم یہاں؟...... تمہیں کس نے بتایا میری رہائش کا پتہ؟"

"کسی نے نہیں۔ میں تو اپنی ماں کے نقش قدم پر چلتی ہوئی تم تک آئی ہوں۔ ہم دونوں جو محبت تلاش کرنے نکلے تھے، اس محبت نے ہمیں کیسا گمنام کر کے رکھ دیا ہے۔"

تانیہ کچھ نہیں بولی تھی۔ اس نے ملازم کو باہر بھیجا تھا اور جاناں کو لے کر اپنے روم میں چلی آئی تھی۔ جاناں نے مانند مجنی پر رکھی تصویر کو دیکھا وہ عجیب سے انداز سے دیکھتا تھا۔ "تمہاری وجہ سے ہماری زندگی ہم دونوں کے گھر برباد ہو گئے۔ اپنی طرح کھینچ کر وقت نے اس آن بھی ہم ایک دوسرے کو جگہ لگا رہے ہیں۔ پتہ نہیں ثریا نے ہمیں کیا بنا دیا۔ ہم نے شہریار کو۔"

تانیہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی مگر جاناں اس کی نمی سے بے پروا اپنا کتھارسس کرنے لگی تھی۔ "جب سے میں نے شعور کی آنکھ کھولی، مجھے میری ماں نے نفرت کا سبق دیا۔ انہوں نے کہا وہ تمہارا بیٹا ہے جس نے میری ماں کی ساری خوشیاں چھین لیں جو مجھے دنیا میں لانا تھا مگر اپنا نام نہیں دیا۔ میں نے کہا تمہیں سے دور رہنا ہے۔ ابا کو کبھی نہیں سمجھنے لگا۔ ان کے مقابلے میں جان بخشی کی روح کو ملے۔ میں نے ماں کی ہر بات مان لی کیونکہ میں ان کی محبت چاہتی تھی۔ شیرازی کے ساتھ محبت کی جنگ رہی تھی۔ شیراز نامبر سے لے کر زندگی کی علامت

تھا۔ تب میری ماں نے پھر مجھے شیرازی سے مخصوص طور پر عبدالرحمٰن کی نفرت کی طرف کھینچا۔ میں نے شیرازی سے کہا تو وہ مجھے سمجھانے لگا تھا۔ اس نے کہا اگر جو تمہاری ماں کہتی ہے کہ وہ سچ ہے تو وہ تمہارا باپ ہے اور تم باپ سے کیسے بدلہ چکاؤ گی؟ کیا تمہاری روح گوارا کرے گی؟ میں نے سوچا اور دل سے کہا، میں کتنی کمی بری ہوں، کہتی کی..... اپنے باپ کو کیسے جیت کروں؟ ماں نے جو شہریار کا نام لیا ہے، اس رشتے کو کیسے مٹی میں ملواؤں؟ نفرت بھاگتی گئی مگر ایک تقدس کا رشتہ تو تھا میرے اور شہریار کے بیچ۔ پھر یوں ہوا شیرازی مجھ سے کھو گیا۔ مجھے ٹھیک اور غلط کا صحیح فرق بتانے والا کھو گیا۔

میں اذیت کی اس چٹان سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو رہی تھی، جب مجھے تمہاری یاد آئی تھی۔ میں تم سے ملنے گئی تھی، مگر تم نے خواب آور گولیاں کھا کر مرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے تمہیں بچانے کی بہت کوشش کی مگر تم اندر سے مر گئی تھیں اور میں تمہارے ظاہری وجود کو سمیٹ رہی تھی۔ پھر یوں ہوا مجھے تمہارے مرنے کی اطلاع ملی اور میں تمہاری لاش سے جب پہلی بار ملی تو مجھے لگا میں نے پہلی بار موت کو اتنے بھیانک انداز میں دیکھا تھا۔ شہریار کا سر پھر کی دوسری طرف کھڑا تھا اور میں نے سوچا تھا جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔

کوئی رشتہ بھی ہو وہ میری نفرت کے آگے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں اور وہ شریک ہو گئی تھی کیونکہ میں ایک غلط کام کر رہی تھی اور وہ شرمندگی سوال اٹھا رہی تھی مجھ سے۔ میں نے سالار عبدالرحمٰن کو ٹریپ کیا۔ وہ معصوم انسان میری چال کو محبت سمجھا اور میں نے بھی یہی چاہا۔ وہ اسے محبت سمجھے۔ کیونکہ میں شہریار کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی۔ اور وہی ہوا۔ وہ حاصل کرنے کے لئے مجھ سے ٹکرا گیا۔ وہ سمجھتا تھا وہ مجھے ٹریپ کر رہا ہے اور میں اس پر چالیں چلتی رہی۔ مگر اب اچانک کہانی بدل گئی ہے۔

میں نے جیسے دل کا سارا زہر نکال دیا۔ وہ اب بھی کہتا ہے، میں نے تمہیں معاف کیا۔ اس نے مجھے معاف کیوں کیا؟ وہ کیوں بدل گئی؟ مسز عبدالرحمٰن۔ وہ عزت کے اعلیٰ مقام پر کھڑے ہیں۔ میں کچھ بھی نہیں تھی، مگر مجھ میں بھی تھی میری نفسیوں پر زندگی کے سارے دھاگے ٹھیک لپٹے ہیں، میں بہت اچھا تماشا دکھا سکتی ہوں۔ مگر زندگی نے ہاتھ پکڑ کر مجھے سب کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا اور کہا تماشہ یہ ہے۔ اور اب زندگی مجھ پر ہنس رہی ہے تانی! وہ شہریار، اس نے مجھے معاف کیوں کیا؟ وہ اگر اتنا ہی اچھا تھا تو اس نے تمہارے ساتھ بے انصافی کیوں کیا تھا؟ تمہیں دھوکا کیوں دیا تھا؟''

تانیہ نے شہریار کی تصویر کو ہاتھ میں لیا تھا اور عینی کی تصویر پر ہاتھ رکھ کر دی۔

''مجھے عینی سے محبت تھی۔ میں اس کے لئے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اور تمہاری ماں نے میری اس کمزوری سے خوب کھیلا تھا۔ اس عورت نے کہا، میں تمہیں عینی دلا سکتی ہوں ساری عمر کے لئے۔ اور اس میں خواب کی حالت میں نیند میں چلنے لگی۔ میں نے سالار کے ہاں نوکری کی، بہت سے مواقع پر اپنی اور ان کی تصویریں کھنچوائیں اور تم جب مجھ سے ملتی تھیں، میں تم سے شہریار کی محبت کا دم بھرتی تھی۔ میں ایک تیر

سے روشناس کروا رہی تھی۔ میں سالار کے معاملے کو شہریار کے سامنے رکھتی چلی گئی تھی اور تمہارے سامنے شہریار کا پتہ۔ ساتھ گئی معاف تجھے پہچان کر پوائنٹ آؤٹ کیا تھا۔ میں نے یتیم خانے پہنچی تھی اور سالار کے نام پر شہریار سے اس بچی کی ذمہ داری کا معاہدہ اٹھایا تھا۔ وہ سادگی سے میرے ٹیسٹ میں آ گیا تھا۔ اور میں اصل میں بچی کے لئے پاگل پن میں آگے سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ اور پھر میں نے عطوت جہاں کے کہنے پر سالار کے ڈرامے کا ڈراپ سین کیا اور تم جو پہلے سے شہریار کی بے وفائی سے تڑپ رہی تھیں، میری اس کام محبت پرستی کر سامنے آ گئیں اور ان لمحوں میں مجھے تم سے کوئی مطلب تھا نہ سالار سے نہ شہریار سے۔ مجھے میری انا چھوڑ کر جا چکا تھا اور تنہائی اور نفرت کی طرح کی گئی محبت میری جھولی سے کہیں اڑا کے لے گیا تھا۔

دنیا میرے لئے ختم ہو چکی تھی۔ قیامت سے پہلے ایک قیامت تھی جو میری زندگی میں در آئی تھی۔ نہ مجھے جنت کا دھیان تھا، نہ جہنم کا خوف۔ میرے دونوں ہاتھ خالی تھے اور ان خالی ہاتھوں میں نیکی کے نام کی کوئی لکیر نہیں تھی۔ اس کی محبت تو کیا نفرت بھی نہیں تھی میرے حصے میں۔ اور آج سوچتی ہوں جب کہ میں خاک ہونے جا رہی ہوں تو وہ شہریار کہتا ہے، میں نے آپ کو معاف کیا۔ کس نے! یہ اپنا دل تو اتنا نرم ہے کہ اگر کوئی مجھ سے محبت چھوڑ کر نفرت کرنے لگتا ہے تو میرا دل محبت سے اس نفرت سے بھی محبت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ میرا کوئی خون بہا نہیں آپ پر...... جانے اس کی یہ عام معافی، اس نے مجھے کانٹوں پر چلنے جیسی اذیت بخشی ہے، جیسے کوئی جنگ پر نکلے اور فتح کرنے کے بعد مفتوح شہر والوں کے باسیوں کے لئے عام معافی کا حکم دے دے۔ مگر میرا دل چاہتا ہے وہ مجھے معاف نہ کرے بلکہ سولی چڑھا جائے۔ بار بار مرا ہے موت دے۔ پھر دار پر کھینچے، پھر لٹکائے۔ اور اس مرا کا کوئی انت نہ ہو۔

جانا کے چہرے پر دھواں پھیلتا جا رہا تھا۔ ثانیہ کے وجود کو بھی ندامت کے آنسوؤں نے بھگو دیا تھا اور دروازے کے دوسری طرف سالار عبدالرحمٰن کھڑے تھے۔ بالکل ساکت و جامد۔

"آپ کون ہیں؟ اندر کیسے آئے؟"

سالار عبدالرحمٰن مڑے اور ملازم کا انداز معذرت خواہانہ ہو گیا۔

"اوہ، آپ ہیں سر! ابھی اندر اطلاع پہنچاؤں کہ آپ آئے ہیں؟"

انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور بہت خاموشی سے باہر نکل گئے تھے۔ پھر گاڑی میں بیٹھے تو بار بار آنکھ میں نمی چھلکتی جا رہی تھی۔ ان کی گاڑی تیز رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔ پھر گاڑی پورچ میں رکی تھی اور وہ تیزی سے اندر داخل ہوئے تھے۔ شہریار نے مانو کے کمرے میں جاتے ہوئے سالار عبدالرحمٰن کو دیکھا تھا۔

اور سالار عبدالرحمٰن...... انہیں کسی کی پروا نہیں تھی۔

وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پھر عائشہ سے کچھ پوچھنے کے بجائے انہوں نے الماری کھولی تھی اور عائشہ کی الماری میں چیزیں کیا ڈھونڈ رہے تھے۔

"کیا چاہیے؟ مجھے بتائیے کیا تلاش کر رہے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیے بغیر الماری کھنگال دی تھی اور پھر ان کی انگلیوں کی پوروں کو کسی چیز نے چھوا تھا۔ انہوں نے ہاتھ باہر نکالا تھا اور جانماز کا کونا ان کی پوروں میں اٹکا ہوا تھا۔

"تم جانماز کب سے جانتی ہو؟" عائشہ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ "میں آپ سے پوچھ رہا ہوں تم جانماز کب سے جانتی ہو؟"

"جب سے وہ آپ کی زندگی میں دوبارہ آئی تھی۔" انہوں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ مگر جواب عائشہ نے نہیں رابعہ بھابھی نے دیا تھا۔

"تم نے شہری کو کہا تھا کہ وہ......" وہ چپ ہو گئے اور رابعہ بھابھی مدھم لہجے میں بولیں۔

"ہم دونوں میں سے کسی نے شہریار کو نہیں کہا تھا۔ عائشہ کے آنسوؤں اور عدیل کی محبت کے چنگل سے بچانے کے لیے شہریار نے یہ [illegible] اس نے وہ دیکھا جو آپ نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ اس نے اپنی ذات داؤ پہ لگا کر [illegible] اور عائشہ کی دل کی خوشی پہ وار دیا، سنی بھائی! آپ نہیں سمجھ سکے تو آپ ابھی تب [illegible] سمجھ سکے تھے، [illegible] سمجھیں گے۔"

عائشہ نے خوف سے رابعہ کو دیکھا تھا مگر وہ اپنی بات کہہ کر چپ ہو گئی تھیں۔

سالار عبدالرحمٰن نے جو سن لیا تھا۔ [illegible] سالار عبدالرحمٰن کے اندر [illegible] گئی تھی۔

"مجھے [illegible] کا فون آیا تھا۔ خیر تو ہے سنی بھائی؟ آپ ایسے اچانک گھر کیوں آئے ہیں؟"

سالار عبدالرحمٰن کچھ کہے بغیر اسے راستے سے ہٹاتے باہر نکل گئے تھے۔ گھر میں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ ان کی گاڑی [illegible] رکھی گئی تھی۔ مگر وہ [illegible] پھر بھی ان کے پیچھے دوڑا تھا۔

"سنی بھائی! پلیز، مجھے غلط مت سمجھئے گا۔ اس ساری بات میں میرا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ پاپا کے سارے بچے خوش رہیں۔ سنی بھائی......!" وہ ان کی گاڑی تک بھاگ کر گیا تھا مگر چوکیدار نے بجائے گیٹ کھول دیا تھا۔ سالار عبدالرحمٰن کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

AANCHAL.COM.PK

وہ شک کر رہی تھی جو شہوار پہ چھوڑ گیا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہاں وقت ضائع کیا کرے۔ وہ ایک دم اسے عدیل بھائی کا خیال آیا تھا۔

اس نے ان کا نمبر ملایا تھا۔ بیس منٹ میں وہ گھر میں تھے۔ رابطہ پورا ہوا تھا فون تفصیل بتا رہی تھیں اور ماموں ان کے ایک مارکیٹ کے فیصلے بیان کے متعلق تلاش جاری رکھے ہوئے تھا۔ شہریار کو اتبا ماما اور جاری سب مطمئن رہنے کو کہہ رہے تھے۔ مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی۔ سالار بھائی بہت جذباتی انسان ہیں کوئی غلط قدم نہ اٹھا لیں۔

پھر یہ تیسرا دن تھا۔ جب اتبا کے فون پہ کال آئی تھی۔

"ہیلو!" گھبرے گھبرے سانس میں کہہ وہ یکدم چیخ پڑی سے بولی تھی۔ "سنی بھائی!!"

عدیل بھائی قریب آ گئے تھے اور اشارہ کر رہے تھے کہ روکے انہیں۔

"آپ..... آپ کہاں ہیں سنی بھائی؟"

"پتہ نہیں میں کہاں ہوں، کہاں نہیں۔ مگر ان لوگوں سے دور جا رہا ہوں میں ایک دم سے سب کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں۔ وہ سارے بے وفا ہیں جو میں نے تصویر کو دی ہیں۔ وہ ساری بے وفا نہیں ایک دم سے مجھے اکیلا چھوڑ جا رہی ہیں۔ شہیرا نے میرے لئے تمہارے لئے عدیل کے لئے سب کے لئے کیسے کیسے نہیں سوچا تھا اور میں...... میں اس کی محبت کو کبھی نہیں پایا۔ وہ میں واقعی ایسا انسان ہے جو تمہیں وہ خوشیاں دے سکتا ہے۔ جو میرے ساتھ رہ کر سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اتبا اگر میں...... میں کیا کروں؟"

"سنی بھائی! آپ...... آپ گھر آ جائیں۔" وہ ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔ شہریار کی جان آنکھوں میں کھینچ آئی تھی اور وہ بکھرے بکھرے آنسو کی جگہ اب مجبوری کی باتیں کر رہی تھیں۔ "سنی بھائی! آپ...... آپ ٹھیک تو ہیں؟"

وہ کچھ نہیں بولے تھے اور عدیل بھائی نے شہریار کو اشارہ کیا تھا۔

ان کی گاڑی گیٹ سے باہر جا رہی تھی۔ انہوں نے موبائل کمپنی کی خاص اطلاعات کے ذریعے لوکیشن جاننے کو کہا تھا اور چند منٹ میں پہنچ گئے۔ وہ لوکیشن ٹرم میں آ پہنچی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ایک فلیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔

ANCHAL.COM.PK

شہریار کا سانس بہت تیز تیز چل رہا تھا۔

"پہلے آپ اندر جائیں۔ مجھے ڈر ہے کہ پتہ نہیں ان کا کیا ردعمل ہو۔"

عدیل بھائی نے بمشکل دبی دبی آواز میں کہا تھا۔

عدیل عبدالرحمٰن نے جب سے ماسٹر کی نکالی تھی اور وقت بعد وہ اندر تھے۔ پھر جو منظر انہوں نے دیکھا وہ مضبوط اعصاب کے باوجود ہل گئے تھے۔

"ڈونٹ شوٹ می!"

سالار عبدالرحمٰن نے بہت بے بسی سے انہیں دیکھا تھا۔

"عدیل...... بہت بزدل ہوں میں ساتھ اس وقت اتنا بس گھنٹوں سے تباہ ہو گئے ہیں بچے ہم۔ میں ابھی تک خود کو شوٹ نہیں کر پایا ہوں۔ میں مرجانا چاہتا ہوں مگر مر نہیں پا رہا۔ میرا دل بھی ٹھیک ہے اور میرے دماغ کی رگ بھی نہیں پھٹی۔ عدیل! موت...... موت بھی مجھ سے شدید نفرت کرتی ہے۔ مجھ جیسے انسان سے وہ بھی دور بھاگتی ہے اور...... اور یہ ان کا حق ہے۔ مجھ سے سب کو نفرت کرنی چاہیے کیونکہ میں خود بھی اپنے آپ سے نفرت کرتا ہوں اب۔ مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ میں شہر بانو کا سامنا کر سکوں۔" ان کا سر جھکا ہوا تھا کیونکہ ان کے کندھوں پر کسی نے ہاتھ رکھے تھے۔

سالار عبدالرحمٰن نے سر اٹھایا تھا وہ شہریار کو اپنے قدموں میں بیٹھے پایا تھا۔

"…بھائی! مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ جو کچھ بھی تھا وہ سب پہلے سے لکھا ہوا تھا۔ اور دیکھئے میری طرف ان آنکھوں میں کیا آپ کو اپنے لئے محبت نظر آتی ہے؟"

سالار عبدالرحمٰن کی نظریں اس کے چہرے پر ٹک گئی تھیں اور اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"جو کچھ ہوا اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔ آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ خود سے نفرت کرنے لگیں۔ آپ سے زیادہ میں نے کسی کو اتنی محبت کے لئے جذباتی نہیں دیکھا۔ آپ بابا کے لئے جب تڑپ رہے تھے تب مجھے بابا کی قسمت پر رشک آتا تھا کہ وہ آپ جیسا محبت کرنے والا بھائی رکھتے ہیں جو ساری دنیا سے ان کے لئے لڑ سکتا ہے۔ مجھے خود سے محبت ہونے لگی تھی کہ آپ کے ... میں شامل ہونے میں اتنی ... تھی کہ ... بھی عدیل بھائی سے نہیں ملی مجھے۔" لفظوں سے دل ہار رہا تھا۔ عدیل عبدالرحمٰن اس کی ذہانت پر خاموش کھڑے تھے اور سالار عبدالرحمٰن وہ یک ٹک

بس اسے دیکھے جا رہے تھے اور وہ بولتا جا رہا اور مدھم ہو کر رہا۔

"جتنا پیار سے تم کرتے ہیں اتنی محبت بھی اپنے حصے کی چاہوں گا۔ دیں گے اپنی محبت؟ تا کہ اتنے ہی بچوں سے محبت کرنے کا رسک لیں گے؟"

سالار عبدالرحمن کی آنکھ میں نم چمکنے لگا تھا۔

"دیکھئے ابا! ابھی نہیں ہوں۔ آپ کی محبت کو بہت سنبھال سنبھال کر رکھوں گا۔" اس نے ان کے گال پر بوسہ دیا تھا۔ کھینچ کر خود سے چمٹا لیا تھا اور سالار عبدالرحمن جو نم رو کے بیٹھے تھے، نم بھیگے ہوئے کندھے کو لگا کر رو لیے تھے۔ شہریار اور عبدالرحمن نے انہیں رونے دیا تھا۔ پھر سالار عبدالرحمن خود چپ ہوئے تھے۔

"اب چلیں گھر، سب پریشان ہوں گے۔ عائشہ بھابی، امامہ، پاپا، اینا کوئی بھی نہیں جانتا اور اس وقت بھی شام کے چھ بج رہے ہیں۔"

اس نے بانہہ پکڑی تھی۔ سالار عبدالرحمن کو کھڑا کیا تھا۔ پھر ان کے ساتھ سیڑھیاں اترتے ہوئے سالار عبدالرحمن کو بہت پیار سے دیکھتے ہوئے شہریار شوخی سے بولا تھا۔

"میں سنی بھائی کے ساتھ بیٹھوں گا آج۔ آج تو بہت تھکی ہے ان کی۔ عائشہ بھابی کو تو انگور خود ہی ہوں گا شوہر واپس کر دوں گا۔"

سالار عبدالرحمن کے ہونٹوں کو خوبصورت سی مسکراہٹ نے چھوا تھا۔

وہاں کے اندر بیٹھا تھا اور اس نے سالار عبدالرحمن کا موبائل کوٹ کی جیب سے نکالا تھا۔ پھر نمبر ملایا تھا کہ ایک ہی بیل پر گھبرائی آواز سنائی دی تھی۔

"سالار!..... کہاں ہیں آپ؟..... آپ ٹھیک تو ہیں؟"

اور اس نے گلا کھنکھارا تھا۔ "عائشہ بھابی! سالار بھائی نہیں، میں ہوں۔ آپ کا چھوٹا دیور شہریار۔"

"او شہری بھائی! آپ..... وہاں سب ٹھیک ہے؟"

"جی ہاں، وہاں کیا یہاں وہاں سب ٹھیک ہے۔ اور یہاں آپ کے شوہر مبارک ہو۔ میں نے تمام معاملہ سلجھا دیا عائشہ بھابی! آپ نے آرام سے انہیں معاف کیا ہے سنی بھائی کو۔ سالار کی بڑی خوشی ملا دی کا گھر کر لیتا ہے اور زندگی میں واپسی کا آپ شہری کی ممنون ہیں نہیں۔" عائشہ بھابی ہنسنے لگی تھیں۔

AANCHAL.COM.PK

سالار عبدالرحمٰن نے موبائل چھین لیا تھا۔ دعا منہ کھولے رہ گئی تھی۔ گاڑی ایک رفتار سے رواں دواں تھی۔

❁❁❁

امامہ کو پاپا نے تین دن پہلے ایک خاص فائل ڈھونڈنے کے لیے کہا تھا۔ وہ کل سے ڈھونڈ رہی تھیں مگر انہیں مل نہیں رہی تھی۔ سو اب آخری کوشش کے طور پر وہ اپنی وارڈروب کھنگال رہی تھیں۔ امامہ نے سالار عبدالرحمٰن کے گھر آنے کی ذمہ داری وہ اب مکمل سنبھال چکی تھیں۔ کل سے بھی انہوں نے جو اور جس طرح تلاش کی تھی وہ فضلی کہنے جیسی بات نہیں تھی۔ کیونکہ ان کی آنکھیں وہ فائل تلاش کر رہی تھیں جو سالار عبدالرحمٰن میں رکھا تھا۔ انہوں نے فائلوں کے کیبنٹ میں سے ایک فائل نکالی تھی۔ تب ایک خاکی لفافہ ان کے قدموں میں آن گرا تھا۔

وہ چونکی تھیں اور چند ہفتے پہلے کی ایک یاد ان میں جھلملائی تھی۔ یہ لفافہ شہریار نے انہیں دیا تھا۔ "کیا ہے اس میں؟" انہوں نے سوال کیا تھا۔

"کچھ خاص نہیں، کچھ ضروری ڈاکومنٹس ہیں۔ مگر اس لفافے کو صرف اس وقت کھولئے گا جب اس کی ضرورت ہو۔"

انہوں نے سر ہلا کر لفافہ رکھ دیا تھا۔ اور آج یہ لفافہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ "کیا ہے اس میں؟" وہ الجھ گئی تھیں۔ انہوں نے لفافہ کھول لیا تھا۔ یہ ایک فائل تھی۔

انہوں نے کاغذات پر نظر دوڑائی اور بے جان سی ہو گئی تھیں۔ بینک کے کاغذات تھے، اپنے حصے کی تمام جائیداد شہریار نے امامہ کے نام کی تھی۔ ان کے ہاتھ سے فائل چھوٹ گئی تھی۔

"یہ فائل ...... یہ فائل میں نے آج کہیں کھو دی؟ ...... میرے اللہ!" ان کا دل بڑی شدت سے دھڑکا تھا۔ "میرا شہریار ...... وہ کیسا ہے؟"

وہ اٹھی تھیں اور جاری کو دیکھ کر گم صم کھڑی رہ گئی تھیں۔

"یہ فائل پاپا کی سٹڈی روم میں تھی، امامہ! کھل گئی ہے۔" وہ قریب آ گیا تھا۔ "امامہ! کیا ہوا؟ سب ٹھیک تو ہے؟"

وہ کچھ نہیں بول پائی تھیں اور شہریار کے نیر اس نے دیکھی تھیں۔

شہریار سالار عبدالرحمٰن کے بہت قریب بیٹا تھا۔ وہ بہت دھیمے لہجے میں مانتے ہوئے گفتگو کرتے تھے۔ مگر شہریار پھر بھی تو لگنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ بھی کہ وہ ان کی معصوم محبت سے خوشیاں کما کر ان کا موبائل بجنے لگا تھا۔

اس نے عاطف کی کال ریسیو کی تھی اور چھوٹتے ہی بولا تھا۔ "اب تو میری جان چھوڑ دے خبیث! سو جا کر دن گزار کر۔"

"آ سکتا ہوں تو فون تب ہی جب دل چاہتا ہے۔ مگر تیری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔"

شہریار ہنس پڑا تھا۔ "اچھا کتنے میں الاٹ ہوا پلاٹ تیری مرضی کی جگہ مل گئی؟"

"بے مروت نامعقول شخص ہے تو۔ تیرے لئے کوئی فکر نہیں کر رہی ہے سب کچھ۔"

وہ تھوڑا سا اور کھلکھلایا۔ "پہلے پتا ہے تو پوچھ لے اسے کوئی اعتراض ہو جائے تو؟"

"نہیں ہوگا کوئی اعتراض شہری بھائی!" عاطف نے ویڈیو سوئچ کر دیا تھا۔ "میری طرف سے تحفہ ہے آپ کی محبت کے لئے۔"

"واہ کیا بات ہے۔" وہ دل سے ہنسا تھا مگر دوسرے ہی لمحے کچھ قدم آگے کو جھک آیا تھا۔ عدیل عبدالرحمن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"تم ٹھیک ہو شہری؟" ان کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔ سالار عبدالرحمن نے ان کی گھبراہٹ پہ چونک کر موبائل کٹ دیا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ گھبراہٹ سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شہریار نے سالار بھائی کا کندھا تھام لیا تھا۔ موبائل چھوٹ کے اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا تھا۔

"عدیل بھائی!" اس کے جسم نے بہت بے قراری سے تڑپ بھرا تھا۔ سالار بھائی نے اسے سنبھالا تھا۔ وہ ان کے بازوؤں میں بے جان مچھلی کی طرح تڑپا تھا۔

"مجھے سانس نہیں آ رہی... سینہ بہت درد...... درد ہے سینے میں۔"

عدیل عبدالرحمن فوراً چیخے تھے۔ "سنی! ان کی کوٹ کی جیب میں ان کی دوا ڈھونڈو اس کی زبان کے نیچے رکھو۔ یہاں سے کون سا ہاسپٹل قریب ہے؟" وہ رو رہے تھے۔ "ملٹری ہاسپٹل...... شہری! سنبھالو بیٹا! دو کلومیٹر دس منٹ کا فاصلہ ہے ہاسپٹل کا۔"

"دس منٹ...... یہاں لگتا ہے دس سیکنڈ نہیں بچے۔ عدیل بھائی! اٹھو شہری دیر ہو رہی۔" شہریار نے بے قراری سے سالار عبدالرحمن کے کندھے سے سر لگایا تھا اور بہت وقت سے سانس کھینچی تھی۔

سالار عبدالرحمن بے قراری سے بولے تھے۔ "تم نے...... تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ تم ٹھیک ہو۔ تمہاری دوا رپورٹس......؟" ان سے مزید کچھ نہیں کہا گیا تھا کیونکہ شہریار سانس لینے کے لئے

بری طرح تڑپ رہا تھا۔

"اس کی جیب میں دوا نہیں ہے اس کی؟" انہوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شہریار نے ان کی بانہوں میں بے قراری سے ایک بار مچلنے کی کوشش کی تھی اور وہ بے قراری سے تڑپ رہا تھا۔

"یہ انصاف نہیں ہے...... اللہ...... اگر مجھے موت کے ایک دن متعین ہونے پر یقین نہ ہوتا تو میں کہتا میں بیٹی! بلکہ مجھے بچا لیجئے، میں ابھی...... ابھی نہیں مرنا چاہتا تھا۔ ابھی تو بالکل نہیں کیا ابھی تو صرف میں نے آپ کے محبت کے شہر میں قدم رکھا تھا۔" بہت مدھم لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ایک اور گہرا سانس لیا۔

سالار عبدالرحمٰن چیخے تھے۔ "تم گاڑی تیز کیوں نہیں چلا رہے ہو؟ شہریار کی سانس بہت تیزی سے چل رہی ہے۔"

محمد علی عبدالرحمٰن نے ساری احتیاط چھوڑ کے رفتار بڑھا دی تھی۔ اب ان کی گاڑی ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔

اسی وقت سالار عبدالرحمٰن کا موبائل بجا تھا۔ وہ شہریار کو سنبھالے بیٹھے تھے سو انہوں نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔ محمد علی عبدالرحمٰن کے موبائل کی بیپ ہوئی تھی۔

"ہیلو!"

"محمد علی! میرا شہریار...... وہ ٹھیک تو ہے؟" انہوں نے امی کی آواز پہچان لی تھی۔

"ماما اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تھوڑی سی۔" اور جب وہ یہ کہہ رہے تھے شہریار کے جسم نے سالار عبدالرحمٰن کی بانہوں میں جھٹکا کھایا تھا۔

"محمد علی...... یہ گاڑی کس طرف جا رہا ہے۔ کب آئے گا صمدانی انکل کا ہاسپٹل؟ تمہارے بابا کب پورے ہوں گے؟"

"شہریار ہوش سنبھالو یار تم...... تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔" محمد علی عبدالرحمٰن نے بے قراری سے چیخ کر کہا تھا مگر اس نے کوئی رد عمل نہیں دیا تھا۔

"اس کی نبض...... وہ...... وہ بہت مدھم ہو رہی ہیں۔ شہریار...... آنکھیں کھولو بیٹا! ادھر دیکھو میں تمہارا حسن بھائی......"

"کوئی ایسی خواہش ہے، جس کے پورا ہونے کی جستجو میں اس کی جان اٹکی ہے۔ جس دن وہ قسمت پوری ہو گئی، یہ اپنی زندگی کی جنگ ہار جائے گا۔" ڈاکٹر صمدانی کی آواز محمد علی عبدالرحمٰن کے اندر گونجی تھی اور اس وقت وہ آندھی اور طوفان کی طرح صمدانی انکل کے ہاسپٹل میں داخل ہوئے تھے۔

ماہا اور عبدالرحمٰن نے ٹھیک طرح سے گاڑی رکنے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا اور گاڑی آہستہ ہوتے ہی باہر آئے۔ بازوؤں میں اٹھائے دوڑے تھے۔ وارڈ والے نے اسٹریچر مہیا کیا تھا اور وہیں سے فوری طبی امداد کے طور پر آکسیجن دی جا رہی تھی۔

مدیل عبدالرحمٰن ڈاکٹر صدانی کے کمرے کی طرف دوڑے تھے۔ وہ دستک کے بغیر اندر داخل ہوئے تھے اور بے قراری سے چیخے تھے۔

"صدانی انکل! وہ شہریار..... پلیز اسے دیکھیے۔"

صدانی انکل کے کمرے میں مہمان بیٹھے تھے۔ ان کی آواز پر ایک مہمان نے پلٹ کر دیکھا تھا اور یکدم جھنجھلا گیا تھا۔

"شہریار..... آپ میرے شہریار کی بات کر رہے ہیں؟"

صدانی انکل باہر نکلے تھے اور مہمان جو بلاشبہ ماسٹر ماوان اور شافعہ تھے، انہی کی بے قراری سے ان کے پیچھے دوڑے تھے۔ صدانی انکل نے ایمرجنسی کال دی تھی۔

ڈاکٹر اسٹریچر کے ساتھ تیز قدموں سے چل رہے تھے جب ماں بہت بے قراری سے چیخی تھی۔ "شہریار صاحب!..... شہریار صاحب!"

ان کی آواز پر جیسے ادھ زندگی نے ایک تیز سانس بھری تھی۔ اس کی آنکھیں پل بھر کو پورے وجود کا ناطہ جدا لینے سے پہلے ہی ڈوب گیا تھا۔

شانی دیوار سے لگی کھڑی رو رہی تھی اور دو ایک بے بس پانی ان ہاس کے، وہ چکرانے لگی تھی۔

"آپ کو کیا لگتا ہے، انسان مر جائے تو دل بھی مر جاتا ہے؟ جیسی شانی! بھر کے دل رک جائے تو بھی دل کے اندر چھپا محبت دل کے وہیں بکھرے لگتی رہتی ہے۔ کون کہتا ہے جسم و روح کی آواز ہر طرف کی گئی ہے۔ محبوب سے لے لی تنہائی ہو کہ ساتھ رہتی ہے۔"

"ماں..... !" یکدم عاطف بیگ اور سونیا پاگل ملتی دوڑے تھے۔ وہ ایک جڑی بار کے قدموں میں ہی رہ گیا تھا اس نے ساری صورتحال واضح کر دی تھی۔ وہیں سے ڈاکٹر مبشر کے پاس آئے تھے۔

"تم یہاں....." عاطف نے سوال کیا اور سلام کر دیا۔

"مس صدانی کی اپنی شادی کا کارڈ دیتے آیا تھا اور اچانک یہ سب..... عاطف! خیریت..... شہری ٹھیک ہے اب..؟"

عاطف بیگ نے شیشے کے پار دیکھا تھا۔ ڈاکٹر صمدانی کسی انداز میں جان توڑ محنت کر رہے تھے۔ اس کی دل کی دھڑکن بہت مدھم تھی۔

"سر! انٹرنل بلیڈنگ نہیں ہے، کبھی ایک دم دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، کبھی مدھم پڑنے لگتی ہے۔"

ڈاکٹر صمدانی نے ڈاکٹر سہیل کو بتایا جیسے وہ بتا رہا تھا مگر ابھی ان کی کارکردگی کا رزلٹ نہیں نکلا تھا کہ شہریار کی دھڑکن پھر غیر متوازن ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صمدانی نے شاک کا حکم دیا تھا۔ ڈاکٹرز شاک کا انتظام کر رہے تھے۔ پھر چند جلد جلد بعد اسے شاک دیئے جا رہے تھے۔ اور پھر شہریار سے جھٹکے میں جیسے پکڑ میں زندگی واپس لوٹی تھی۔ اس نے یکدم بہت غیر متوقع آنکھیں کھولی تھیں۔ اس کی نظر دروازے کے پار جا کر اٹک گئی تھی۔

"تام......!" اس کے ہونٹ ہلے تھے۔ نام جو ابھی ابھی ایک پل بچا نہیں، یکدم بے قرار سے ہو رہے تھے۔ اس سے ان کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ سبھی ان کے اندر کا کوئی چیز باہر آ کر ٹھہر گئے تھے۔

ڈاکٹر صمدانی سب نارمل ہونے پر گہرا سانس لے رہے تھے کہ یکدم شہریار کے جسم نے شدید جھٹکا لیا تھا۔ اس نے بولنے سے پہلے ہاتھ اٹھایا تھا جیسے اس کی روح سے وہ نام کچھ کہنا چاہتا تھا۔ پھر یکدم ڈاکٹر سہیل چیخے تھے۔ "ڈاکٹر صمدانی......!"

ڈاکٹر صمدانی چونک کر مڑے تھے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر پاتے، اس کے جسم میں زندگی خاموش ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر صمدانی اس کے دل کو پمپ کر رہے تھے۔ بار بار وہ سانس دینے، دل کو پمپ کرنے سے ان کا پورا جسم پسینے سے شرابور تھا جب ڈاکٹر سہیل نے یکدم انہیں دونوں بازوؤں سے تھام لیا تھا۔

"ہی از ڈیڈ سر!......ہی از نو مور۔"

"نہیں شہریار...... وہ شہریار ہے...... وہ کیسے مر سکتا ہے؟"

"وہ مر چکے ہیں سر! لائف لائن دیکھئے وہ بالکل سیدھی ہے سر!"

ڈاکٹر صمدانی کے جسم کو ایک جھٹکا لگا تھا۔ وہ بالکل ساکت و جامد ہو گئے تھے۔ ان کے اندر وحشت سے پہلے یکدم بہت ساری تھکن اتر آئی تھی۔ ڈاکٹر سہیل آپریشن روم کا دروازہ کھول چکے تھے۔ باہر دیوانوں کی طرح چیخیں تھیں۔

AANCHAL.COM.PK

"شہربار!"

عدیل عبدالرحمٰن سکتے کی کیفیت میں کھڑے رہ گئے تھے۔ ہام نے ان کی پیشانی چومی تھی۔ "آپ کو دیکھے بغیر مر گیا تو آپ کو دیکھنے کے لئے ایک بار جاگوں گا ضرور۔ پلیز! آنسو نہیں، میرے ہوتے ہوئے تو بالکل نہیں اور میرے بعد بھی نہیں۔ آپ کے آنسو مجھے تکلیف دیں گے۔" شہربار کی آواز ہام کے اندر گونجی تھی۔

ڈاکٹر جمیل نے شہریار کے کمرے سے نکلتے ہوئے [illegible] عاطف بیگ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ایک کونے میں ساکت کھڑا تھا اور سالار عبدالرحمٰن بے بسی سے اس کے [illegible] کیونکہ ان کے جسم نے ان کے وجود کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر گھٹنے فرش پر بیٹھ گئے تھے۔

"آپ چاہتے ہیں کہ میں مر جاؤں؟"

"ہاں...... میں چاہتا ہوں کہ تم مر جاؤ۔ مجھے تمہاری شکل پھر کبھی دکھائی نہ دے۔ میں چاہتا ہوں [illegible] تمہیں تڑپتے دیکھوں۔ اس عمر میں ہزاروں لوگ مرتے ہیں پھر تم کیوں زندہ ہو؟ جان کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟" ان کی آنکھوں کے آگے ماضی کے منظر ناچ رہے تھے۔

"میں کیسے شہریار کا سامنا کروں گا عدیل؟" چند لمحوں کی بات ان میں پھر گونجی تھی۔

"آپ کہتے ہیں نا، آپ میرا ماتم کیسے کریں گے۔ دیکھئے [illegible] میں آپ کی زندگی سے دور [illegible] محبت سے یاد کیجئے گا [illegible] بھائی تھا...... تو......" انہوں نے اپنے اس ہاتھ کو غور سے دیکھا جو شہریار نے تکلیف میں بھینچ رکھا تھا۔ اس کا لمس ابھی تک ان کے ہاتھ میں تھا۔

"سالار!" عدیل عبدالرحمٰن اس کیفیت سے سنبھالے [illegible] سالار عبدالرحمٰن یاد آئے تھے۔

"سالار!" وہ پھر سے پکار رہے تھے۔ سالار عبدالرحمٰن نے خالی آنکھوں سے عدیل عبدالرحمٰن کو دیکھا تھا۔ "کوئی خواب ہے کوئی بہت بھیانک خواب۔ شہریار نہیں مر سکتا...... میرا شہریار نہیں مر سکتا۔"

عدیل عبدالرحمٰن ان کے سامنے بیٹھ گئے تھے اور سالار عبدالرحمٰن بے بسی سے پھر سے بولے تھے۔ "میری محبت...... اس نے اسے مار دیا۔ اگر میں...... میں یہ کہوں کہ مجھے اس سے محبت نہیں ہے تو وہ پھر سے جاگ جائے گا نا؟"

AANCHAL.COM.PK

عدیل عبدالرحمٰن کی آنکھ کا غم چہرے پہ پھیل گیا تھا اور سالار عبدالرحمٰن یک دم کھڑے ہو کر شہریار پہ جھک گئے تھے۔

"آنکھیں کھولو شہری! ادھر دیکھو میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا مجھے تم سے محبت ہے۔ سن رہے ہو، مجھے تم سے نفرت ہے۔ شدید نفرت۔" تیز لہجہ یک دم بے چارگی سے بھر گیا تھا۔ "اب تو اٹھ جاؤ...... دیکھو میں نے کہہ دیا ہے، مجھے تم سے محبت نہیں ہے شہریار!"

عدیل عبدالرحمٰن نے خاموشی سے انہیں بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ جازی بے یقینی سے ان کے قریب کھڑا تھا۔ سب سے چھوٹا تھا مگر اس ایک لمحے میں وہ یک دم بڑا ہو گیا تھا۔

" ملنا تمہیں ایک بار ہمیں
اور زندگی سے دوبارہ نہیں

جازی کو لگا شہریار کا بازو ہولے سے اس لمحے میں بھی ان کا چہرہ بجھ رہا تھا مگر اس کے ہاتھ اس کے پہلو میں پڑے تھے۔

"شہری بھائی! آؤ آپ کی بنی...... وہ آپ کے بغیر کیسے رہے گی؟ پاپا، وہ بھی پائیں گے؟ نانو، دادی، بیجو، ان سب کسی کے بارے میں تو سوچ لیجیے۔ میرے...... میرے بارے میں بھی نہیں سوچا آپ نے؟ آپ کے ساتھ چلنے کی کتنی عادت ہے مجھے۔" وہ دل کے گنبد میں کھڑا ہو کر چیخا تھا۔

عدیل عبدالرحمٰن فون کر رہے تھے۔ دوسری طرف ماسون تھا اور وہ جس سے بولے تھے۔ "تم کہاں ہو؟"

"گھر ہوں...... خیریت ہے؟"

انہوں نے جواب نہیں دیا اور پھر آہستگی سے بولے تھے۔ "تم گھر جاؤ پلیز!"

"میں گھر جاؤں؟ مگر کیوں سر؟" معیز کو کیا پھر آہستگی سے بولا۔ "ابھی ماما کا فون آیا تھا وہ کہہ رہی تھیں سب ٹھیک ہے پھر آج کیا؟"

"ماسون! تمہارا شہریار چلا گیا ہے...... " دوسری طرف ایک لمحہ سناٹا چھا گیا تھا اور وہ مزید بولے تھے۔ "ماسون! گھر میں سب تم نے سنبھالنا ہے۔ ہم ابھی آ رہے ہیں۔" وہ کچھ کہے بغیر فون بند کر چکا تھا۔

AANCHAL.COM.PK

پھر ماموں گھر پہنچا تو دانیال سے اچانک دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

"اچھا! ماموں! آپ گھر آ گئے۔ میں رمشا کے ساتھ ڈاؤن لائبریری گئی تھی۔ واپس آئی ہوں تو دیکھ رہی ہوں ماما بہت پریشانی میں کہیں گئی ہیں۔ وہ دکھی رہی تھیں۔ ماموں ابھی نے عدیل بھائی کو فون کیا، انکران کا فون نہیں آ رہا ہے۔ سب ٹھیک تو ہے؟"

وہ دانیال کو جواب دینے کے بجائے اس کے کندھوں میں جھکا ہوا تھا۔ پھر رندھے لہجے میں بولا تھا۔ "آپ کا چہرہ دیکھنے آیا ہوں۔ آپ کا شہریار مجھ دیا...... بہت ساری محبت، بہت ساری خوشی سے سمجھیں پاپا اس کا دل۔"

دانیال کھڑے کھڑے صوفے پر گر گئی تھی۔ عائشہ بھابی چیخ پڑی تھیں۔ رابعہ بھابی صدمے کی کیفیت میں ماموں کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ وہ سٹڈی روم سے پاپا باہر آئے تھے۔

"کیا ہوا؟ پھر کوئی تماشہ چھوڑا سالار نے؟ آخر سالار صاحب عقل پکڑیں گے؟"

دانیال کو شہریار کی بات سمجھنا بہت بھاری تھی۔ وہ بے یقینی کی کیفیت میں کھڑے ہو رہے تھے۔ پھر ہم نے منت اور گزرے تھے کہ ایمبولینس پھر بنگلوں میں آ کر رکی تھی۔ عدیل بھائی اسٹریچر اٹھا رہے تھے اور دانیال کی آنکھوں سے سب جو دیکھ رہی تھی۔ شہریار اس کے سامنے تھا شہزادوں کی آنکھیں بند تھیں۔

"میں ایک انسان تھا تو بہت بھی تو ملنی چاہیے تھی۔ مگر دیکھا ہوں جتنا زندگی جینے کا مزا اور جس ابھی ہی بار دیکھا ہے۔"

وہ شہریار کے قریب آئی تھی۔ "آپ تو مٹی میں مٹی کے ہونے کا فیصلہ کر گیا ہے۔" اس نے اس کے چہرے کو چھوا تھا۔ "ابھی تو بہت سارا جینا ہے تمہاری شادی کرنی ہے، بس ہے اور بہت سارے کام ہیں، ابھی مرنے کی فرصت نہیں ہے۔"

"آپ جھوٹ نہیں بولتے تھے مگر آپ پھر بھی جھوٹ بولتے رہے۔ آپ تو کہتے تھے ابھی مرنے کی ضرورت نہیں۔ پھر...... پھر کیوں چلے گئے شہری بھائی؟" وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر رو رہی تھی۔

عدیل عبدالرحمن نے اسے رونے دیا تھا۔

عاطف بیگ نے یونیورسٹی کا ہال کھلوایا تھا۔ شادی کی تصویر ابھی تک ہال میں لگی تھی۔ عاطف بیگ نے دیوار کو پکڑا تھا۔

"کل میں نے سب سے پہلے یہ خبر بابر کو دی تھی ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ بہت خوش تھا۔ میں نے اڑتالیس گھنٹے کے مختصر نوٹس پر شادی کا پروگرام بنا لیا ہے۔ تم نے ضرور آنا ہے عاطف!"

سالار۔ سالار اس کی سماعتوں میں گونج رہا تھا۔ عاطف بیگ نے نم آنکھوں کو بند کیا تھا۔

"تم نے "کافی ان" میں ایک دفعہ شافی کا ذکر بہت دل سے کیا تھا۔"

"میں تو ہر ایک کا ذکر بہت دل سے کرتا ہوں۔ ویسے یہ بات اس دن عبیرہ نے بھی کہی تھی کہ وہ ایک مذاق تھا۔"

"یہ صرف مذاق ہے تو تمہارے والٹ میں اس کی تصویر کیا کر رہی ہے؟"

"کیا تصویر والٹ سے نکال دینے سے وہ تمہارے دل سے بھی نکل جائے گی؟"

مگر وہ تو مجبور تھا اپنے دل کے ہاتھوں کہ اس نے دل سے نہ کبھی اپنے والٹ سے بھی نہیں نکالا تھا شافی کو۔ عاطف بیگ تو تب یکدم کسی نے اس کے ہاتھ سے والٹ لے لیا تھا۔ اس نے تصویر کو دیکھا تھا۔ والٹ شافعہ کے ہاتھوں میں تھا اور وہ "سچ" جو وہ چاروں طرف کھوجتی پھر رہی تھی اس کے سامنے تھا۔

"آپ اتنی شدت سے کسی سے محبت کرتے ہیں کہ جب وہ آپ کے سامنے نہیں ہوتی تو آپ کی آنکھیں اس کو ڈھونڈتی ہیں آپ کے دل میں جڑ پکڑنے لگتی ہے۔ اور جب آپ کے اندر رہنے لگتی ہو تو آپ اس کو اپنے اندر جینے کے لیے قربانی دیتے ہیں تو حد سے گزر کر وہ جیسے چاہے آپ کے اندر سانس لے۔ آپ کے اندر بسنے لگتی ہے وہ لڑکی؟ وہ خوش قسمت لڑکی ہے جسے آپ جیسا لڑکا اتنی محبت کرتا ہے؟"

"محبت......" وہ ہنسا تھا۔ "صرف محبت نہیں، عشق۔ ہاں میں اس لڑکی سے۔ وہ بھی میری طرح چاہے مجھے، میں نے اپنا پتہ بھی نہیں لگایا۔"

"شہریار صاحب!" وہ بے قراری سے کرلائی تھی۔ اپنی تصویر اس کی مٹھی میں دبی ہوئی تھی۔

بہت دنیا میں کوئی ہم سا بھی پیدا ہو گا

جی میں آتی ہے کہ پی جائیں یہ دریا ہو گا

تشنگی اس غم کے لمحوں کی تھی باقی بانسا

ہم جو آئے تو کسی نے بھی نہ پوچھا لوگو!
پھر وہی دشت ہے وحشت کی تنہائی ہے
جب دل نے کسی کو بھی نہ رکھا لوگو!

کسی کی آنکھیں اب پر آن جمی تھیں... نظم مکمل ہو گئی تھی اور کسی نے بےخود اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کے نظریں بند کی تھیں۔

ان میں بہت سجے ہوئے لاشے اٹھائے ہیں پر خمار
اپنے گنبد میں تو در ہے نہ دریچہ لوگو!
تو کی تو تھی نہ دری سر میں جلووں کی
پہنچے تو کتنا ہے سبھی چھوڑا لوگو!
کوئی پیغام زبانی بھی نہیں، کچھ بھی نہیں
ہم نے اپنے کو بہت ہی سنبھالا لوگو!
بند آنکھیں ہو گئی جاتی ہیں بیچارہ ہیں پاؤں
نیند کی نیند ہمیں اب نہ اٹھانا لوگو!
ایک ہی شب ہے طویل، ہائے طویل، اتنی طویل
اپنے بام میں سارے روز بیٹھا لوگو!
اب کوئی آئے تو کہنا کہ مسافر تو گیا

AANCHAL.COM.PK

یہ بھی کہنا کہ بھلا اب بھی نہ جاؤ گے کیا؟
ہونٹ جلتے تھے جو لیتا تھا کبھی آپ کا نام
اس طرح اور کسی کو نہ ستاؤ گے کیا

شام اور اس کی آواز جا رہی اور چکرا رہی تھی کہ یکدم ملاہم ارسلان نے اسے بازوؤں سے تھام لیا تھا۔ اس کی مٹھی میں ابھی بھی اپنی تصویر بھینچی ہوئی تھی۔ عاطف بیگ نے تن چہرے سے اسے دیکھا تھا۔ مگر اس نے ملاہم کی نظر بچا کر اپنی تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے سامنے ڈال دیے تھے جس طرح حالات سے شافعہ کی تصویر غائب تھی تو کیا اب وہ شہریار کے دل سے بھی نکل گئی تھی؟

شافعہ کی آنکھیں سمندروں ہونے لگی تھیں۔ اس کا سینہ دھواں تھی تک شافعہ کی محبت سے دھڑک رہا تھا۔ شاید اب بھی اس کے ہر دھڑک رہا تھا۔ دل کی دھڑکن دو دنیا کے لئے زندگی تھی مگر کیا پتہ وہ اپنے اندر باہر کی خاموشی سے زیادہ اپنے اندر دھڑک رہا ہو۔ شافعہ کے نام پر اس کے آخری لمس پر [illegible] ہو جاتے سے اس کی آخری پکار پر شہریار ابھی تک اسی لمحے کو جی رہا ہو۔

اس نے اپنے اندر جھانکا تھا جہاں کبھی شہریار کے لئے ایک اچھے دوست جیسی پسندیدگی تھی۔ کیا وہ اب وہاں ہی دبی تھی؟

ملاہم ارسلان نے آگے بھی خوشبو میں پوچھا کہ "ساری دنیا میں اس نے کس سے شدید محبت کی ہے؟" [illegible] اسے آج عارف بھی بھول گیا تھا۔ ملاہم بھی یاد نہیں آ رہا تھا...... خاموشی میں لپٹا ہوا شہریار تھا جو اس کے دل میں کھٹکتا نظر آ رہا تھا۔ وہی دل...... وہی دل صدق تھا کہاں جہاں [illegible] کس کے آگے ہارا تھا اور کس کی حکومت کا پرچم بلند کر کے جینے کا وعدہ رہتا ہے محبت...... یہ جذبہ ایک احساس ان کی ہاں کی [illegible] زندگی آگے [illegible] شہریار ایک اس مقام پر [illegible] میں قید ہو گئی تھی؟

"شافعہ! ہو کیا گیا ہے [illegible]" ملاہم ارسلان نے اسے بہت پیار سے پکارا تھا تو وہ اپنے حال سے آگہی بے ہوا ہو گئی تھی کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا تھا وہ ہچکیوں سسکیوں سے روئے جا رہی تھی۔ پتہ نہیں وہ کس کمزوری تھی۔ یہاں پر کمرے میں ہر شخص رو رہا تھا۔ انکل عبدالرحمن اس کے پاپا دوست [illegible] جانے وہاں کے [illegible] سب کے رونے کی کوئی نہ کوئی وجہ تھی اور اس کے رونے کی وجہ...... اس کی پوری زندگی تھی۔

وہ ملاہم کے کہنے پر خاموش ہونے کے بجائے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔ پتہ نہیں آج وہ کس کس کمزوری بنی تھی۔ اسے دل شہریار کی موت کا یا محبت کے اس انجام کا؟...... کچھ واضح نہیں تھا۔ سب

ڈھونڈ لایا گیا تھا...... اور وہ جنت ایک ننھی سی جان کی جنت کے لیے چھلی چلی جارہی تھی۔ جانے والوں نے دیکھا بھی کیا اور تھا مگر زندگی کا سب سے بھرپور دن ہو گیا تھا۔

اب وہ کوئی بھی بدلہ، کوئی بھی خواب، کچھ بھی ادا، دیاں جتنے، ہر شخص کو معلوم تھا کہ ان کا دل کتنا طویل، کتنا منجمد تھا، رمضان ہنسنے کے آداب نہیں سیکھ پائے گا...... اور محبت تھی، گھر کے وسط میں لیٹے شخص کے اطراف چکر سے لے رہی تھی۔ بے تکان...... بے تحاشا۔ مگر خاموش لیٹے ہوئے شخص کا دل تھا کہ محبت کی اس علامت پر چڑ سے ہنس پڑا تھا۔ عجیب طرح لیا تھا، تنہائی سے جو ہر گرا آنسوؤں سے بھیگا تھا۔ اور آنسوؤں کے بھیگے موسم کب تھے، اب گھر والے اور کا مقدر تھے...... اب ہر وقت چپ تھا۔ کب تھے یہ موسم اس گھر کا مقدر بنے تھے، وقت اب بھی چپ تھا...... اور خاموشی سے زندگی کا اس کیا گا رہا تھا۔

کب سے کب جس سب نے زندگی کو چھوڑ دیا تھا......

اور زندگی سے موت کا بھی بندھن ملے تھا......

(تمت بالخیر)

یہ ناول کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے

مکتبہ القریش ☆ سرکلر روڈ اردو بازار لاہور۔ فون نمبر 0423-7668958

Email: al_quraish@hotmail.com

ANCHAL.COM.PK

"ارسلان راشدی۔" مومنہ سے بھی پہلے شہریار نے جواب دیا تھا۔ ارشاد نے کپکپاتے ہوئے ان کا ہاتھ پکڑا تھا اور زور سے بھینچی تھی۔

"بابا! بابا آ گئے ہیں۔"

ارسلان راشدی نے اس کی آواز پر لبیک نہیں کہا تھا۔ اس نے مومنہ کا ہاتھ پکڑا تھا اور تیز تیز چلتے ہوئے ارسلان راشدی کے کمرے کے سامنے جا کر رک گئی تھی۔ جبکہ پاپا بھی وہیں موجود تھے اور ارسلان راشدی بت کی طرح اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"بابا یہ دیکھئے، پاپا کی بیٹی، بابا! عطیہ پھپھو کی بیٹی۔" اس کی آواز تیز تھی کہ کمرے سے آصفہ ارسلان راشدی بھی اٹھ کر آ گئی تھیں۔

مومنہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ دیوار سے ٹیک لگا گئیں۔ بھیگی بھیگی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ انہیں لگ رہا تھا عطیہ آپا نے اپنا بدلہ لینے کے لئے پھر سے جنم لیا تھا۔

"بھابی! آپ تو میری بات کا یقین کریں۔ آپ کو پتہ ہے ناں، میں ابھی تک یہیں ہوں بھابی!" انہیں لگا عطیہ آپا نے اب بھی ان کا آنچل مٹھی میں بھینچ رکھا ہے۔

"چھوڑو میرا آنچل۔ مجھے کچھ نہیں معلوم، مجھے نہیں معلوم۔" وہ دیوانوں کی طرح دہرا کر اپنا آنچل جھٹکنے لگیں۔

ارسلان راشدی نے حیرت سے دیکھا۔ مومنہ بھی تو حیرت کا مجسمہ بنی تھی اور شاہدہ اس نے انہیں کندھے سے تھام لیا تھا۔

"امی! کیا ہوا؟ آپ کو خوشی نہیں ہوئی، بابا کی بیٹی ملی ہے؟"

"کون بیٹی؟...... کیسی بیٹی؟...... مت عطیہ آپا۔"

انہوں نے شاہدہ کے ہاتھ جھٹک دیئے تھے اور شہریار حیرت سے انہیں دیکھتا رہ گیا تھا۔ وقت کی الٹی گنتی اور مکافات ایک ساتھ شروع ہو گئے تھے۔ شاید آصفہ ارسلان راشدی کا ذہن کھو گیا تھا اور ارسلان راشدی مومنہ کو دیکھے جا رہے تھے۔

"کتنی محبت کرتے ہیں آپ مجھ سے؟"

"اتنی کہ شمار نہیں ہے۔"